# TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224191
UNIVERSAL
LIBRARY

# آجکل

اگست ۱۹۷۰ء قیمت: ۱ روپیہ

افسانہ نمبر

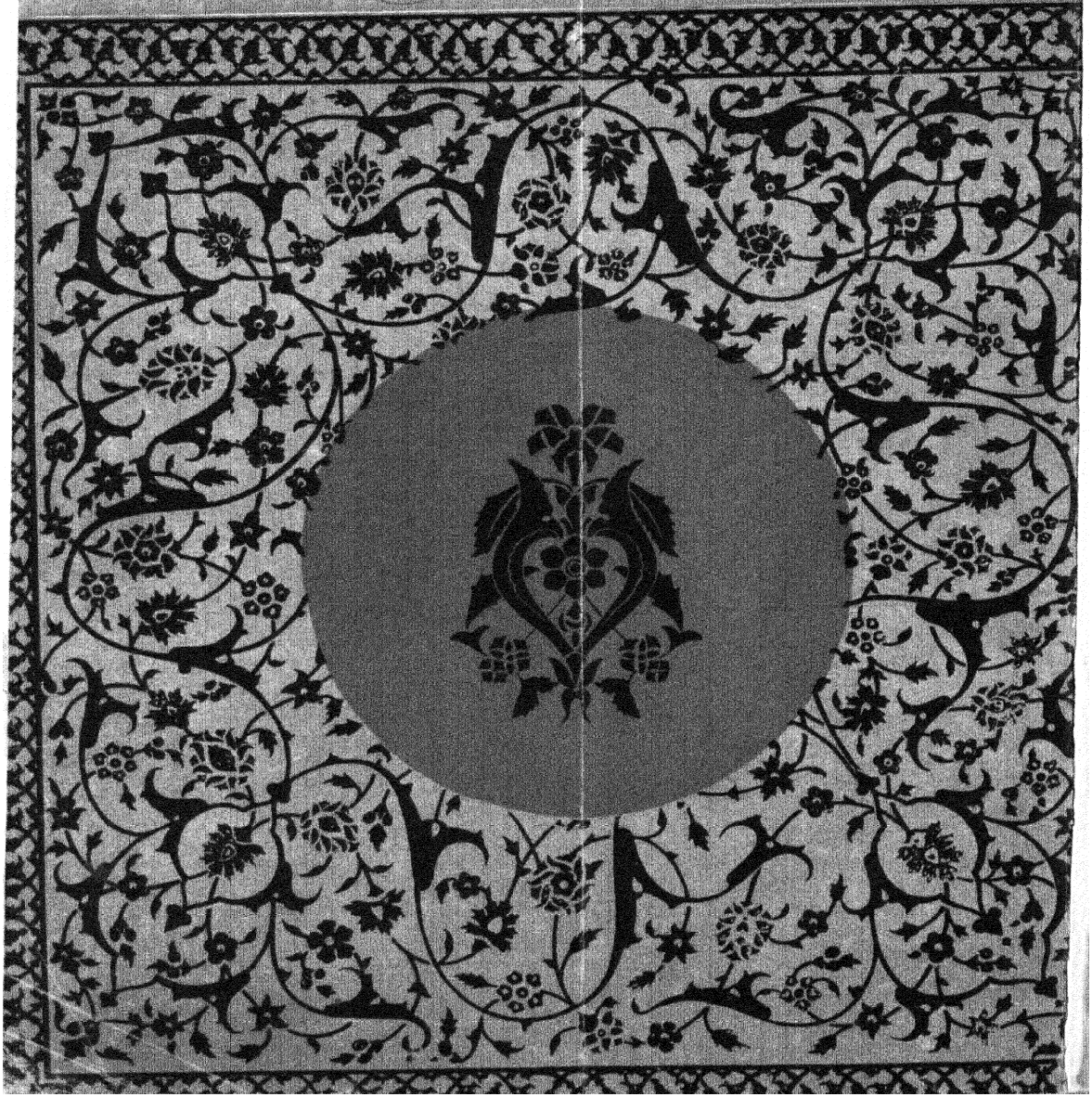



۱۴ جولائی ۱۹۷۰ء کو وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی ریاست جموں و کشمیر کے دو روزہ دورے پر سرینگر تشریف لے گئیں۔ ہوائی اڈے پر کشمیر کے گورنر شری بھگوان سہائے وزیراعلیٰ جناب غلام محمد صادق اور دیگر ممتاز ہستیوں نے اُن کا خیر مقدم کیا۔ وزیراعظم کا ہر جگہ شاندار استقبال کیا گیا۔ اور انہوں نے عوام کو خطاب بھی کیا۔

(تصویر میں) کشمیری عوام وزیراعظم کا بڑی گرم جوشی سے سواگت کرتے ہوئے۔

۸۹/۵ ۲۳۰۵
آج کل

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

# آج کل

نئی دہلی


| | | |
|---|---|---|
| ملاحظات | | ۱ |
| اردو، دل بہ دل | جوگندر پال | ۲ |
| مُردہ آدمی کی تصویر | سریندر پرکاش | ۶ |
| نازو | قاضی عبدالستار | ۱۰ |
| ڑیا : سو بیتے | کشوری چرندداس | ۱۲ |
| امی : تین پہیے کی گاڑی | عبدالمالک | ۱۷ |
| کال : چاندنی | مہر لکھو پادھیائے | ۲۵ |
| اب : گودی کتا | مہندر سنگھ جوشی | ۳۰ |
| : گھنٹے کی آواز | ٹی جانکی رامن | ۳۴ |
| : کڑوا سچ | بی کانتا راؤ | ۴۰ |
| ھی : پچھتاوا | لال پشپ | ۴۵ |
| ری : حُسن ہے زندگی | اختر محی الدین | ۴۷ |
| : سفر | یشونت چتال | ۵۶ |
| ے : تہنیت نامہ | پتا مبر پٹیل | ۶۱ |
| ھی : تعزیتی تجویز | اُوشا پرانڈے | ۶۶ |
| م : ماں | ملیاٹور رام کرشنن | ۷۳ |
| دی : میں | کملیشور | ۷۹ |
| گزشتہ گرمیوں میں | نرمل ورما | ۸۱ |


خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

شہباز حسین ایڈیٹر آج کل، پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۲۹ — شمارہ ۱
اگست ۱۹۷۰ء
شراون بھادر شک سمت ۱۸۹۲

## ملاحظات

آج ہمیں آزاد ہوئے ۲۳ سال ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں ہم نے زرعی اور صنعتی پیداوار میں قابل قدر اضافہ کیا ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی ہے۔ تاہم ابھی ہمارے مطمئن ہو جانے کا مقام نہیں۔ کیونکہ ابھی منزل بہت دُور ہے اور ہمیں بھارتی معیشت کے ہر شعبے کو قابل لحاظ حد تک ترقی دینی ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم ایک متحد قوم کی حیثیت سے مسلسل جدوجہد کریں۔ ہم رواداری، اشتراک عمل اور جذباتی ہم آہنگی کو اپنا منتہائے مقصود بنائیں اور فرقہ پرستی، ذات پات، صوبائی تعصب اور لسانی تنگ نظری کا خاتمہ کریں۔

زیر نظر شمارہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس کے مطالعے سے ہم علاقائی زبانوں کی کہانیوں کے جدید میلانات اور رجحانات کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اُن کے اسالیب اور تجربات سے بھی آگاہ ہوں گے۔ ہمیں یہ بھی اُمید ہے کہ اس سے جذباتی ہم آہنگی اور قومی اتحاد کو بھی تقویت ملے گی۔

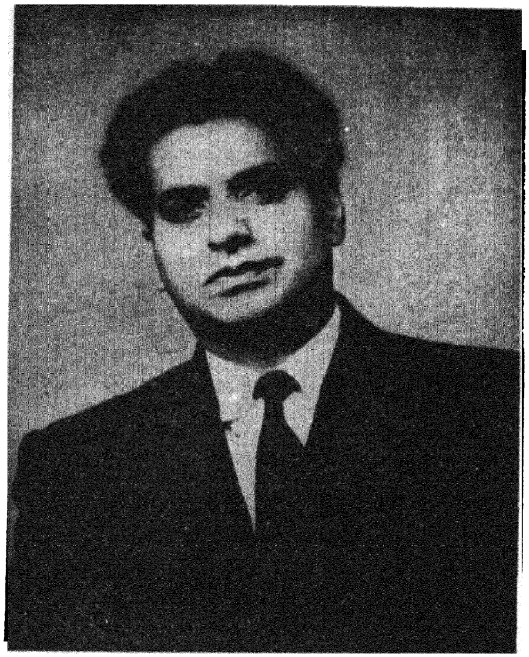

# دِل بہ دِل

جوگندر پال

آج میں اُس کے گھر گیا تو اُس سے مِل کر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

"آخر تم مجھے تنگ کرنے پر کیوں تُل گئے ہو؟"

"تنگ؟"

میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اُسے کیسے سمجھاؤں۔

"میرا پیچھا کرنا چھوڑ دو۔"

کیا یہ وہی لڑکی بول رہی تھی جسے میں نے چند روز پیشتر پہلی بار دیکھا تھا تو بڑی نرمی سی مسکرا رہی تھی، چنبیلی کی نازک اور نوکیلی سی کلی، جس کے کھلنے سے پہلے اُس کی بالائی سرحی میں تازہ دم سفیدی جھلکنے لگتی ہے اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کھِل جاتی ہے اور اس کی پتیوں کی سرخ تہہ نیچے چھپ جاتی ہے اور اس کے رُوپ میں دُودھ کا رنگ آ جاتا ہے جیسے کسی خوبصورت لڑکی کے سُرخ لہو سے اُس کا رنگ اتنا پاکیزہ نکل آیا ہو — میں لڑکی کا تقابل چنبیلی کی کلی سے کر رہا ہوں، یا کلی کا لڑکی سے؟

دراصل یہ لڑکی مجھے اپنی بجائے چنبیلی کی کلی ہی لگ رہی تھی اور چنبیلی کی کلی اس لئے اچھی لگ رہی تھی کہ وہ اپنی بجائے یہی لڑکی ہے۔ اس کے بدن کی میٹھی میٹھی مہک میرے آس پاس بسی ہوئی تھی۔ میں بے اختیار اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"آپ مجھے نہیں جانتیں، پر میں آپ کو جانتا ہوں۔"

"آپ کیا جانتے ہیں؟"

"کہ آپ چنبیلی ہیں۔"

"مگر میں تو سُنیتا ہوں۔"

"نہیں آپ چنبیلی ہی ہیں۔ چنبیلی صرف چنبیلی ہوتی ہے —" کی مہک میں نہا رہا تھا "چنبیلی کا دوسرا نام بھی رکھ لیا جائے تو وہ ہی ہوتی ہے۔"

"آپ گلاب کے بارے میں شیکسپیئر کا مقولہ دُہرائے ہیں، میں جھینپ گیا اور اس کی مسکراہٹ گمبھیر ہو گئی۔ "میرا پھول گلاب ہے۔ کوئی پالتو گلاب نہیں، خاردار جنگلی گلاب، جسے کے لئے آپ ذرا سی غفلت بھی برتیں تو آپ کی اُنگلیاں لہُولہان

ہم دوست بن گئے۔ دو ایک روز میں ہی ہماری دوستی ا ہو گئی جسے اُس کے گھر کے سامنے اُگے ہوئے جنگلی کانٹے دار گلاب کی مائل سرخی۔

پہلی بار میں اُس کے گھر گیا تو گیٹ کھول کر بڑی بے چینی سے اندر داخل ہوا۔ دائیں بائیں دونوں طرف خشکی گلاب کی ٹہنیاں پھیل پھیل کر راستے پر جھکی ہوئی تھیں جس سے اندر آنے والے کو سنبھل سنبھل کر چلنا پڑتا تھا۔ اور جہاں یہ راستہ ختم ہوتا تھا وہاں اس کا کمرہ تھا۔

وہ دُور اپنے کمرے کے سامنے کھڑی میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"لوگ تو چوروں سے بچنے کے لئے گھر میں خونخوار کتے پال لیتے ہیں مگر میں نے اپنے بچاؤ کے لئے یہ سیاہ گلاب کھڑے کر رکھے ہیں۔ دیکھو کس اندھی اندھی روشنی میں کتنے پیارے انداز میں بھیانک معلوم ہوتے ہیں۔"

میں نے مڑ کر اُن کی طرف دیکھا، اُن کے مطمئن سکوت سے واقعی ہی ڈر محسوس ہو رہا تھا جیسے شکاری کتے بھونک رہے ہوں۔

"اُنہوں نے تمہارے بارے میں میرے خیالات سمجھ لئے ہیں، ورنہ ——"

"تو کیا وہ واقعی جا رہی ہے؟"

"کتنا غیر سائنسی سوال ہے! جگدیش چندر بوس نے کیا ثابت کیا؟" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گئی ——"آؤ! جھجک کیوں رہے ہو —— آؤ، بیٹھو!"

میں بیٹھ گیا۔

اور وہ میری طرف دیکھ کر زور سے ہنس پڑی۔

"اتنے اکڑ کر کیوں بیٹھے ہو؟ آرام سے بیٹھو۔"

اُس نے دو سگریٹ سلگا کر ایک میرے حوالے کر دیا۔ "مجھ سے نہ آئے ہو گی، نوکری کی درخواست کرنے کو نہیں آئے۔"

سگریٹ کے دو ایک کش کے بعد میرا موڈ بدلنے لگا اور میں مسکرانے لگا۔ "تم مجھے اس لئے اچھے لگتے ہو کہ تمہیں دیکھتے ہی مجھے اپنے دل میں چبھن کا احساس ہونے لگتا ہے گویا میرے کالے گلاب کا کوئی کانٹا انجانے سے چبھ رہا ہے —— ہلکی ہلکی چبھن کے احساس سے مجھے بڑی راحت ہے —— تمہیں کیا لگ رہا ہے۔؟"

"مجھے لگ رہا ہے کہ تم چنبیلی ہو۔"

"اور چنبیلی صرف چنبیلی ہوتی ہے —— شٹ اپ! میں چنبیلی نہیں ہوں، سنیتا ہوں۔"

"تمہیں اپنے نام سے بڑا عشق ہے، سنیتا۔"

"ہاں، ہے۔ اپنے نام کے بغیر میرے پاس اپنے تک پہونچنے کے لئے کوئی اور راستہ ہی نہیں۔ جانتے ہو مجھے شادی کرنا کیوں پسند نہیں؟"

میں نے اس کی طرف سر جھکا کر اُس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہا۔ "اس لئے کہ تمہارا نام تم سے چھن جائے گا! —— اور جانتی ہو، میں تم سے کیوں محبت کرتا ہوں؟"

"اس لئے، کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو —— کوشش کر دیکھو ویسے اپنی بازی تم کھیل شروع کرنے سے پہلے ہی ہار چکے تھے۔"

مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ مجھے امید تھی کہ بالآخر میں اُسے رام کر لوں گا۔

ایک بار خلافِ توقع وہ مجھے ٹھہری ٹھہری سی نظر سے دیکھ رہی تھی میں نے فوراً کھڑے پانیوں میں اپنی کشتی ڈال دی۔ "آؤ سنیتا، آج ہی شادی کر لیں۔"

"آؤ آج شام کو کہیں دیکھی تیرمن کھانا کھائیں۔"

"نہیں سنیتا میری بات کا جواب دو: آؤ، شادی کر لیں۔"

"تم!" چشم زدن میں قیام پذیر پانیوں میں طوفان اُمنڈ آیا۔ "اگر تم نے اپنی یہ ہانک نہ چھوڑی تو میں تم سے کنارہ کش ہو جاؤں گی۔"

"آخر تمہارے اعتراض کا سبب کیا ہے؟"

"میرے بابا! کئی بار کہہ چکی ہوں مجھے شادی کرنا بالکل پسند نہیں۔ مجھے چاہتے ہو تو مجھ سے صرف محبت کرو ——"

"اور صرف محبت کر کے کیا کروں؟ ——"

"میرے سیاہ گلاب کے کانٹے کو دل میں اُتار کر اس چبھن کو محسوس کرتے رہو۔ میں بڑی بے تاب عورت ہوں اور میری خواہش ہے کہ میرا چاہنے والا بھی بے تاب رہے۔"

میں اپنی ایک ناگہانی سوچ سے ٹھٹک سا گیا۔

سنیتا کہیں اپنی پہلی معصوم اور ناکام محبت کا بدلہ مردوں کی ساری نسل سے تو نہیں اُتار رہی ہے۔ مجھے وہ ایک شفاف رنگدار چٹان سی لگی جس کے آس پاس کی ڈھیروں نرم نرم مٹی کوئی سیلاب بہا لے گیا ہو —— لیکن اگر وہ چٹان ہے تو اتنی بے چین کیوں ہے۔ پتھر تو ساکن ہوتے ہیں، مگر میرے اندھے اندھے پیار نے مجھے سمجھایا کہ شاید اس چٹان کا باطن نرم نرم مٹی سے بھرا ہو۔

چٹان کے اندر مٹی بھری ہو تو کوئی نرم اور جاندار پودا پتھر کی کسی دراڑ سے نکل نکل کر محبت کا پھریرا بن جاتا ہے ــــ لیکن اگر سُنیتا کے اندر اور باہر نرا پُرا پتھر ہی ہے تو بھی کیا ؟ پتھر کا اصل بھی تو مٹی ہی ہے۔ اگر وہ مٹی سے پتھر ہو گئی ہے تو کیا پتھر سے پھر مٹی نہیں ہو سکتی ؟ صرف وقت کی بات ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ دھرتی کی کیفیات بھی بدلتی رہتی ہیں۔

میں نے ہمت نہ ہارنے کا تہیّہ کر رکھا تھا۔

سُنیتا کی ضد میری محبت پر تیل کی بوندیں بن بن کر ٹپکتی رہی اور میں بُجھ بُجھ کر بھڑکتا رہا۔ مگر اُس دن۔ ؟

"سُنیتا، اگر تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں تو آؤ، شادی کے بغیر ہی مرد اور عورت کے مانند ایک گھر بسالیں۔"

"نہیں مجھے ناجائز بچّے پیدا کرنے سے نفرت ہے۔"

"تو پھر شادی ــــ"

"شادی! شادی! شادی!" وہ بھڑک اُٹھی "کیا جانور بنے بغیر تمہارے لئے انسان بننا ناممکن ہے ؟ اگر ایسا ہی ہے تو مجھ سے ملنا بند کر دو۔"

"میری بات تو سنو۔ تم جیسا چاہو گی، ویسا ہی ہوگا۔ اتنی ظالم مت بنو۔"

"ظالم ــــ ؟" اُس کی خشک آنکھوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ کسی سوکھے دریا کے مانند وہ کئی برساتوں کا پانی پی چکی ہے۔ "اگر تم سننے پر اڑ ہی گئے ہو تو سنو میں نے بھی ایک ظالم شخص سے محبت کی تھی، اس سے شادی کرنا چاہا تھا، اس کے بچوں کی ماں بننا چاہا تھا، مگر اُس سنگدل نے میری خواہش کی بھنک پاتے ہی غائب ہو جانا چاہا اور ــــ اور میں نے اُسے ہمیشہ کے لئے ختم کر کے اپنے دل میں آباد کر لیا۔"

میں حیرت آمیز اُداسی سے اُسے دیکھے جا رہا تھا

"اور جانتے ہو، کیا ؟ اِس واقعہ کے بعد میرا ہر فیصلہ یہی ظالم آدمی کرتا ہے جو ابھی تک میرے دل میں جوں کا توں آباد ہے ــــ کیا اب بھی تم مجھ سے ــــ ایک خونی سے ــــ شادی کرنا چاہتے ہو ؟"

"ہاں ــــ" میرے منہ سے پکا ہوا پھل از خود گر گیا

"تو سنو! میرا فیصلہ سُن کر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ میرے دل میں بسا ہوا شخص کتنا جابر ہے۔ ظالم کو اب بھی میری ہر خواہش پر پورا کنٹرول ہے ــــ میرا یہ آخری فیصلہ ہے کہ آج کے بعد ہم ایک دوسرے سے بالکل لاتعلّق ہو جائیں گے۔"

اور آج ؟

"پلیز میرے گھر سے چلے آؤ!"

میں دروازے پر کھڑا سُنیتا کے دل میں اُس ظالم آدمی سے گھُتم گھتا ہوتا رہا۔

"جا ــ ؤ! ــــ ج ــــ ا ــــ!"

غم و غصّہ سے میری بُری حالت تھی۔ سُنیتا کی طرف سے پیٹھ موڑ کر میں تیز تیز بیرونی گیٹ کی جانب ہو لیا اور گیٹ کے قریب اس کے کا گلاب کے کانٹے کا ایک ٹکڑا میرے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں دھنس گ اور سارے راستے اس کانٹے کی چُبھن سے میں بڑا پریشان رہا۔

## (۲)

اور آج ؟

آج طوفان تھم گیا تو میں نے اپنی کھڑکی سے جھانک کر آسمان کی دیکھا۔ مطلع صاف تھا مگر مجھے ڈر سا لگ رہا تھا کہ کالے کالے بادلو کے جھنڈ بجلی کی تلواریں گھماتے ہوئے ابھی کہیں سے آدھمکیں گے، اور پھر افراتفری کا عالم بپا ہو جائے گا۔

میں اب تڑپ نہ رہا تھا، پر تڑپ تڑپ کر میرے اندر کچھ ٹو گیا تھا اور اس کے ٹوٹنے پر اُس پر تھمی ہوئی ہر شے دھڑام سے نیچے آ تھی ــــ میں اس ملبے کے نیچے جانے کتنے گھنٹے، دن، سال یا صد بے ہوش پڑا رہا۔ اور اب مجھے ہوش آ رہا تھا۔ میرے بدن کا سکون م باطن کے کرب سے جاگ جاگ بے سکون ہو جانا چاہتا تھا۔ مگر کرب عادی ہو ہو کر خوابناک سا پڑا تھا۔

میرے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر سُنیتا کے کالے گلاب کے کا وہ ننھا سا ٹکڑا بدستور چُبھا ہوا تھا۔ میں نے اُسے نکالنے کا جتن کر وہ اور نیچے اُتر گیا، اور پھر میں نے اپنی کوشش ترک کر دی اور چُپ چُبھن کو محسوس کرتا رہا اور محسوس کر کر کے میں بھول گیا کہ چبھن محسو رہا ہوں اور یہ بھی بھول گیا کہ یہ چبھن محسوس نہ ہو تو کیا محسوس ہوتا۔ چُبھن کا احساس میرا معمول بن گیا۔

سُنیتا کی ناکام خواہش نے مجھے پیہم خالی کر کر کے بالکل خالی کر دیا تو مجھے مزید خالی کرنے کی کوشش میں اپنے آپ کو خالی کرنے لگی۔

اپنی اس ٹوٹ پھوٹ میں میں خالی پڑا رہا، میری کوئی خواہش میرے اس غیر آباد مسکن میں پاؤں نہیں دھرتی، گویا اس پر بھوت پریت کا سایہ پڑا ہو۔

زندگی میرے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کی چبھن بن گئی ہے اور مجھے معلوم نہیں کہ یہ چبھن کیوں ہے، نہ ہو تو کیا ہو۔

مجھے سُنیتا کی چاہ نہ رہی: اتنی چاہ ہو گئی کہ اگر وہ آ کر کہے، آؤ سُنیتا، شادی کر لیں تو مجھے معلوم نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

سُنیتا کے کانٹے کی چبھن میرے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے اٹھ کر میرے دل میں جا رہی ہے، نہ جانے میرے بدن کے کس راستے سے، اب اس بازو سے گزر رہی ہے، اب چھاتی میں ہے، اب ذہن میں ـــ جس راستے سے بھی گزرتی ہے، آخر دل تک آ پہونچتی ہے۔

سُنیتا، مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے۔ تم میرے روم روم میں سما چکی ہو، میرے لئے تم اپنا آپ نہیں رہی: میں ہی تم بن گیا ہوں۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ مجھے تم سے بے انتہا نفرت ہے سُنیتا ظالم، تم نے میری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔

میں سوچا کرتا تھا کہ شیطان میں اپنے جہنم کا کرب برداشت کرنے کی صلاحیت کیسے آ گئی ـــ تمہارے احساس نے مجھے شیطان کے مانند بے احساس بنا دیا ہے سُنیتا:

## (۳)

اور آج؟

میری نظر اچانک اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر چلی گئی۔

سُنیتا کے کالے گلاب کا کانٹا میری جلد میں بہت اوپر آ چکا تھا۔ انسان کا جسم واقعی ایک حیران کن انسٹی چیوشن ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے جسم میں نیا گوشت اُگ آتا ہے تو پرانے گوشت میں پھنسے ہوئے کانٹے از خود باہر کی جانب آنے لگتے ہیں، چبھن کم ہو ہو کر بند ہو جاتی ہے۔

میں نے معمولی سی کوشش سے کانٹے کو اپنی جلد سے باہر نکال دیا، بس باریک سا ٹکڑا، جو میرے جسم میں گھس کر جہنم بنا ہوا تھا اور اب باہر آ گیا ہے تو ـــ پتہ نہیں کہاں گر گیا ہے۔ ابھی ابھی تو یہیں تھا۔

یہ تو جسمانی کرب کی بات ہوئی مگر میں اپنی رُوح کا کیا کروں؟ ـــ ہم اپنی رُوحانی اذیت سے نالاں ہو کر خودکشی پر اُتر آتے ہیں۔ اور اس عمل میں ہمارے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر کوئی کانٹا چبھ جائے تو مرنے سے پہلے ہماری واحد خواہش یہی ہوتی ہے کہ مرنے سے پہلے اس کانٹے کو نکال لیں پھر موت کا اقدام کریں گے۔

میرا کانٹا نکل گیا تو اپنا جسمانی سبک پن محسوس کرتے ہی میں تیز تیز اپنے دل میں گھس آیا اور اس راستے پر میرا سارا بدن لہولہان ہو گیا۔

میرے دل کا یہ راستہ سُنیتا کے کمرے کی طرف جاتا تھا اور اس راستے پر دونوں طرف سے سُنیتا کے کالے گلاب کی خاردار ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں اور شکاری کتے بنی سُنیتا کی خواہش کو بھانپ کر چوروں پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتی تھیں۔

ان خاردار کالے گلاب کی ٹہنیوں کے سائے میں سُنیتا نے میرے دل میں گھر کر لیا۔ اس سفاک نے میرے دل پر پورا قبضہ جما لیا۔ میری خواہش سُنیتا کے جبڑے تنی ہوئی تھی۔ میں بڑا نیک اور نرم دل آدمی تھا۔ مگر سُنیتا نے میری ہر خواہش کو جابر بنا دیا۔

## (۴)

اور آج؟

آج سُنیتا میرے گھر آئی۔

"میں ـــ میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔"

"مگر معاف کرنے والا میں کون؟ سُنیتا دراصل سُنیتا سے ہی ہم کلام تھی۔

"پلیز، مجھے معاف کر دو!"

"میرا اب تم سے کوئی واسطہ نہیں سُنیتا۔" سُنیتا نے میرے دل سے سُنیتا کو جواب دیا۔

# مردہ آدمی کی تصویر



سُریندر پرکاش

وہ مجھے جس کمرے میں بٹھا کر چلی گئی تھی، اس کی کارنس پر ایک تصویر رکھی تھی۔ کارنس پر صرف تصویر ہی نہ تھی ایک پرانا طلائی ٹائم پیس تھا جو پرندوں کے پنجرے کی شکل کا تھا۔ اندر ڈائیل تھا جس پر رومن میں ایک سے بارہ تک کے ہندسے لکھے تھے اور سنہری رنگ کی دو سوئیاں تھیں جو بڑی سُست رفتاری سے حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ اُس پنجرے نما ٹائم پیس کے گرد ایک چھوٹی سی سنہری چڑیا آہستہ آہستہ دائرے میں چلتی ہوئی دکھائی دیتی۔ جس کے آگے سفید موتی تھے جب وہ آگے بڑھ کر ایک موتی پر اپنی چونچ مارتی تو موتی غائب ہو جاتا اور کڑک کی آواز آتی۔ حتیٰ کہ ساٹھ بار "کڑک" کی آواز آتی اور چڑیا اپنے محور کے گرد اپنا چکر پورا کر کے پھر اپنی اصلی جگہ پر پہونچ جاتی۔ ڈائیل پر بنی بڑی سوئی ایک منٹ اور آگے بڑھ جاتی اور چڑیا اپنا سفر پھر سے شروع کر دیتی۔ کڑک کڑک، کڑک۔

کارنس کے دوسرے کونے پر ایک چاندی کا گُل دان رکھا تھا۔ جس میں مور کے کچھ پنکھ سجے ہوئے تھے۔ جب ہوا کا کوئی بھولا بھٹکا جھونکا کمرے میں آ داخل ہوتا تو مور کے پنکھ یوں ہلنے لگتے۔ جیسے جنگل میں مور ناچ اُٹھا ہو۔

اِن کے علاوہ کچھ کرسمس اور کچھ نئے سال کے گریٹنگ کارڈ رکھے تھے جن پر بھیجنے والوں کی نیک خواہشات چھپی ہوئی تھیں۔

تصویر والا آدمی مجھے برابر گھورے جا رہا تھا۔ وہ اندر گئی تھی۔ شاید میرے لئے (اگر گرمی کا موسم ہے تو کچھ ٹھنڈا اور اگر سردی کا موسم ہے تو کوئی گرم مشروب لینے کے لئے۔ میں وہاں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ اور کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھنے لگا۔ سب طرف سے تھک کر نظر پھر اُس تصویر پر آ کر رُک جاتی اور تصویر والا آدمی پہلے سے زیادہ شدت سے مجھے گھورنے لگتا۔

ایکا ایکی مجھے احساس ہوا کہ تصویر والا یہ آدمی جس کی آنکھیں بڑی بڑی اور چمکدار تھیں، کشادہ پیشانی ذہانت کی غمازی کرتی تھی، موٹے موٹے ہونٹ اور ٹھوڑی کا گہرا گڑھا اُس کی مضبوط قوتِ ارادی کا ضامن تھا، زندہ نہیں بلکہ مر چکا ہے۔

"ہاں، تم نے یہ ٹھیک سوچا ہے یہ واقعی مر چکا ہے!"

میں نے پلٹ کر آواز کی طرف دیکھا۔ وہ اندر سے ایک ٹرے میں چینی مٹی کے کچھ برتن رکھے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا اور میرے قریب آ کر بولی۔

"یہ میرے خاوند کی تصویر ہے، عرصہ ہوا اُس کی موت ہو چکی ہے"

میں نے کہا" عجیب بات ہے تصویر دیکھنے سے میں کیونکر اندازہ لگا لیتا ہوں کہ آدمی مردہ ہے یا زندہ ۔! یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ زندگی میں اس سے پہلے بھی اس قسم کے دو ایک واقعات میرے ساتھ پیش آچکے ہیں"

وہ ہنسی اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹرے اُس نے میرے سامنے بڑی میز پر رکھ دی۔ پھر پلٹ کر اندر جاتے ہوئے کہنے لگی "خیال رکھنا یہاں سے رہائی مشکل ہے۔ یہ ساتواں آسمان ہے اور خلاء میں لاوحک گئے کہیں کے نہ رہو گے!"

میں دم بخود سا اُسے اندر جاتے دیکھتا رہا۔ اُس نے دروازے پر پردہ اپنے دائیں ہاتھ سے اُٹھایا اور پھر اس کے اندر داخل ہوگئی۔

کچھ دیر تو میں اِدھر اُدھر تاک جھانک کرتا رہا۔ پھر میں اپنے آگے رکھے کھانے کے برتنوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ایک تو مجھے یہ خواہش تھی کہ خوردونوش کے سامان سے یہ پتہ چل جائے گا کہ موسم کونسا چل رہا ہے۔

مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے لئے رکھے ہوئے تمام برتن بالکل خالی ہیں۔ میں جھنجلا کر رہ گیا کتنی بدقسمتی ہے کہ صورتِ حال سے واقف بھی نہیں کروایا جا رہا ہوں۔ اور یہ کہہ کر یہاں لایا گیا ہوں کہ "یہ ساتواں آسمان ہے اور باہر بالکل خلاء ہے!"

میں نے چاہا کہ اس کا نام لے کر پکاروں مگر مجھے تو اس کا نام بھی یاد نہیں تھا۔ آواز میرے حلق تک آکر رُک گئی۔ میں بے بسی کے عالم میں اپنی سیٹ پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اچانک میری نظر بھرپور کارنس پر رکھی تصویر پر پڑی۔ تصویر والا مرا ہوا آدمی اب ہلکا سا مسکرا رہا تھا۔

میری جھلاہٹ اور بڑھی اور میں غیر ارادی طور پر پکار اٹھا "اے نام عورت!"

جواب میں اندر سے اس کے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ اور کسی بچی کے گانے کی آواز جیسے وہ کسی بچے کو سلانے کی کوشش کر رہی ہو۔

کمرے کی دونوں دیواریں جس کونے میں ملتی تھیں اس جوڑ میں شہد کی مکھیوں کا ایک چھوٹا سا چھتہ تھا۔ دو تین شہد کی مکھیاں اس پر بھنبھنا رہی تھیں۔ مکمل خاموشی تھی کہ اُن کی بھنبھناہٹ بڑی واضح طور پر سُنائی دے رہی تھی۔ کافی دیر تک میں اُن کا بھنبھنانا سنتا رہا اور اُن کی پرواز کا تماشا دیکھتا رہا۔

اندر سے آنے والی لوری کی آواز آہستہ آہستہ مکھیوں کی بھنبھناہٹ میں گم ہوگئی۔ خالی برتن میری طرف بُرا بُرا دیکھتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ میں نے سوچا اندر جا کر خود ہی بات کر لیتا ہوں۔ ان تکلفات میں تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔

میں نے آگے بڑھ کر پردہ ایک طرف سرکایا تو دیکھا کہ وہ ایک سونے کا کمرہ تھا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک بڑا سا پلنگ لگا ہوا تھا اور باقی دیواروں کے ساتھ بچوں کے چھوٹے چھوٹے پالنے رکھے تھے۔ ہر پالنے میں بچے سو رہے تھے جن کے صرف چہرے ہی دکھائی دیتے تھے۔ باقی جسم ڈھانپ رکھے تھے۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُن پالنوں کے پاس گیا۔ وہ تعداد میں پانچ تھے، اور پانچوں میں ایک ہی شکل اور عمر کے بچے سو رہے تھے۔ بچے بڑے پیارے اور خوبصورت تھے۔ میرے دل میں اُن کے لئے اچانک پیار نے انگڑائی لی اور میں نے اپنا سر جھکا کر ایک بچے کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ مگر میں جھٹ پیچھے ہٹ گیا کیونکہ وہ اصلی بچہ نہ تھا بلکہ مٹی کا بنا ہوا بچے کا مجسمہ تھا۔ پھر میں نے دوسرے پالنوں کی طرف دھیان دیا۔ وہاں بھی مٹی کے مجسمے تھے۔

"سوتے ہوئے بچے کو پیار نہیں کرتے!" ایک طرف سے اس عورت کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ سامنے ایک دروازے میں کھڑی تھی۔ دایاں ہاتھ دروازے کی چوکھٹ سے ٹکا رکھا تھا۔ ساڑھی کس کر لپیٹی ہوئی تھی، اور اُس کا پلّو نیفے میں اُڑس رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ راکھ سے سنے ہوئے تھے، جیسے وہ برتن مانجھتے مانجھتے یہاں آکر کھڑی ہوگئی ہو۔

میں نے اُس کے قریب پہونچ کر اُسے اطلاع دینے کے سے انداز میں کہا "وہ برتن جو تم رکھ آئی تھیں ــ بالکل خالی ہیں!"

اُس نے سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے اندر جاتے ہوئے جواب دیا۔

"ابھی اُنہیں بھی صاف کر دیتی ہوں!"

میں نے ذرا بلند آواز میں پھر کہا "سنو تو یہ بچے نہیں مٹی کے مجسمے ہیں!"

اُس نے بدستور جاتے ہوئے جواب دیا: "مجھے معلوم ہے۔ میں نے انہیں خود سُلایا تھا۔"

وہ اندر چلی گئی، اور میں کافی دیر تک وہاں کھڑا خلاء میں گھورتا رہا۔ پھر لوٹ کر اُسی کمرے میں آگیا جس میں پہلے تھا۔ اب وہاں برتن بھی موجود نہ

تھے۔

میں دھم سے صوفے پر آکر گرا، اور اپنے ہاتھ ملتا ہوا کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ مجھے وقت کا بالکل اندازہ نہ ہوا تھا کہ کب تک بے مقصد بیٹھا بور ہوتا رہا۔ پھر وہ اندر والے کمرے سے نکل کر میرے پاس آئی اور کہنے لگی "اوہ چلیں کافی رات ہو گئی ہے!"

میں نے سر اُٹھا کر نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے دیکھا، وہ اپنا لباس تبدیل کر کے اور خوب بناؤ سنگار کر کے آئی تھی۔ اس کے چہرے پر میرے لئے محبت اور مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

میں اُٹھ کر اُس کی طرف بڑھا۔ پھر اچانک پلٹ کر دیکھا۔ تصویر والا مرا ہوا آدمی ہم دونوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور اُس کی پیشانی پر کچھ شکنیں اُبھر آئی تھیں۔ میں ذرا ٹھٹکا۔

میرے ٹھٹکنے سے اس نے بھی پلٹ کر تصویر کی طرف دیکھا اور بولی "کیا تم میرے مرد سے ملنا چاہتے ہو؟"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو مر چکا ہے!" میں نے حیرانی سے کہا۔

"پھر کیا ہوا ــــ!" اُس نے جواب دیا۔ اور میری کلائی اپنے ہاتھ میں تھام کر مجھے باہر لے گئی ــــ مکان کا برآمدہ عبور کر کے ہم گلی میں آ گئے۔ سب گھروں میں خاموشی تھی اور مکمل اندھیرا۔ آہستہ آہستہ گلی میں چلتے ہوئے ہم بڑی سڑک پر پہونچ گئے۔

"تم نے کہا تھا نا کہ یہ ساتواں آسمان ہے!" میں نے سوال کیا۔

"ہاں! اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"مگر یہ تو شہر ہے اور یہاں مکان ہیں، اور سڑکیں ہیں اور سڑکوں کے کنارے بجلی کے کھمبے لگے ہوئے ہیں، اور اُن پر قمقمے روشن ہیں جو ہمیں تاریکی میں راستہ سجھاتے ہیں!"

اُس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہنے لگی "بدھو کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ آسمان کوئی چیز نہیں ہوتی صرف خلاء ہوتا ہے۔ اور ہم اُسے اپنی سہولت کے مطابق نام اور نمبر دے دیتے ہیں!"

میں بہت پشیمان ہوا کہ میں زندگی بھر سہولت کے مطابق کسی چیز کو اپنی طرف سے نام نہ دے سکا۔

وہ پھر بولی ــــ "ہمارے کچھ سماجی مسائل ہیں۔ تمہیں اُن کا علم ہے"

"نہیں!" میں نے جواب دیا۔ میں اُن سے واقف نہیں ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے میں ایک لمبے سفر پر تھا۔ پھر میں پلٹ کر گھر آیا اور اپنی ذات کی چار دیواری میں قید ہو گیا۔ مجھے باہر کی کوئی بھنک نہیں پڑی۔ ایک دن نہ جانے کیسے پتہ چلا کہ وتینام میں جنگ ہو رہی ہے۔ میں بہت پریشان ہوا۔ پھر میں نے نقشے پر دیکھا۔ وتینام کہاں ہے؟ اور جب وتینام مجھے نقشے میں مل گیا تو میں اُس کی تلاش میں نکل پڑا۔

سمندر کے کنارے چلتا چلتا میں ایک دلدلی خطۂ زمین تک پہنچ گیا۔ ایک چھوٹے سے بچے سے جو ایک پیڑ پر بیٹھا چاقو سے ٹہنی کاٹ کر غلیل بنا رہا تھا، میں نے پوچھا۔ کیا تم جانتے ہو، وتینام کہاں ہے؟"

اُس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیض کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اُس میں سے ایک چھوٹا سا کنکر نکال کر میری طرف اُچھال دیا۔ کنکر میرے ماتھے پر لگا۔ مجھے چوٹ لگی اور خون بہنے لگا۔ میں نے اپنی پیشانی پر اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے سہلایا تو میری انگلیاں خون سے لتھڑ گئیں۔ اُس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر مجھ سے پکار کر پوچھا۔ پتہ چل گیا وتینام کہاں ہے؟"

پھر وہ درخت سے اُترا اور دھیرے دھیرے بھاگتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میرے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا اور پیر دلدل میں دھنسے ہوئے۔ وہ کافی دیر تک میرے چہرے پر دیکھتی رہی۔ پھر بولی بھوکے معلوم ہوتے ہو۔ آؤ ریستوران سے کچھ کھا لیں!"

میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ ریستوران پاس ہی تھا۔ ہم دونوں اس میں چلے گئے۔

کافی بڑا ہال تھا۔ کرسیوں اور میزوں کی دو قطاریں لگی ہوئی تھیں درمیان میں آنے جانے کے لئے کشادہ راستہ تھا جس پر کارپٹ بچھا ہوا اُس پر کئی قسم کے جانور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کچن کی طرف جا رہے تھے۔ سب اُداس تھے اور اُنہوں نے سر جھکا رکھے تھے۔ وہ کہنے لگی۔

"ان میں سے اپنی پسند کا جانور چن لو اور اُس پر نشان لگا کر ٹیبل نمبر لکھ دو، وہ اندر جا کر ذبح ہو کر اور پک کر آ جائے گا۔"

"مجھے تو سبھی جانور پسند ہیں۔ نشان دہی والا کام تم کر دو۔ مجھے بھوک لگی ہے!" میں نے جواب دیا۔

پھر معلوم نہیں اُس نے کیسے کیا کیا۔ کہ بھنے ہوئے گوشت کئی رکابیں ہمارے سامنے سج گئیں۔ اور ہم دونوں اُن پر ٹوٹ پڑے۔

"ہاں تو میں تمہیں بتا رہی تھی نا کہ ہمارے کئی سماجی مسائل ہیں

نے نیپکن سے اپنے ہاتھ اور مونہہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! تم نے بتایا تھا!" میں نے ایک بڑی سی ہڈی خالی پلیٹ میں ہوئے جواب دیا۔

"کیا تمہیں کبھی کسی سماجی مسئلے سے دوچار ہونا پڑا ہے؟" اُس نے کیا۔

"شاید! مگر اب مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو ابھی تم ایک مسئلے سے نپٹنے کے لئے تیار ہو جاؤ!" اُس نے مسکراتے شرارت سے کہا

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

جواب میں اُس نے میز پر چمچ بجا کر بیرے کو بلایا۔ اور کہا "بل لاؤ!"

تھوڑی دیر بعد مؤدب طریقے سے بیرا میرے پاس کھڑا ہو گیا۔ ایک چھوٹی تری میں اُس نے کاغذ کا ایک پُرزہ بھی تھام رکھا تھا اور اُس کا جھکاؤ رف تھا۔

میں گھبرا سا گیا — میں نے گردن آگے بڑھا کر اُس کے کان میں سے کہا "تم جانتی ہو، جانور سر جھکائے اُداس اپنے آپ اندر جا رہے نے اُنہیں منتخب کیا اور وہ ذبح ہو کر اور پک کر ہماری میز پر آ گئے۔ اس کیا قصور ہے؟ اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ جب میں تمہارے ساتھ چلا رے رشتہ داروں نے میری تمام جیبیں خالی کروالی تھیں!"

وہ آہستہ سے ہنسی اور پھر اُس نے اپنا وینٹی بیگ کھول کر اس ٹی نوٹ نکالے اور بیرے کی طشتری میں ڈال دیئے۔

باہر نکلے تو رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ سڑکوں پر قمقمے اپنی پوری ب سے روشن تھے۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ ہمارے لوگ آ جا رہے تھے، اُن کے چہرے واضح طور پر دکھائی نہیں دے تھے۔

کچھ دُور جا کر اُس نے کہا "ہاں تو میں نے کہا تھا نا کہ ہمارے کچھ ائل ہیں؟"

"ہاں۔ تم نے کہا تھا!" میں نے جواب دیا۔

"تو یہ چابی لو اور گھر جاؤ، میں صبح آ جاؤں گی — اور ہاں ذرا بچوں لنا۔ ایسا نہ ہو کہ بیچارے بھوک سے بلک بلک کر ہلکان ہو جائیں!

(افسانہ نمبر)

اُس نے چابیوں کا گچھا میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"مگر تم کہاں جا رہی ہو؟" میں نے چابی ہاتھ میں لے کر اور تمام ہدائتیں سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"او، ہو تم سمجھتے کیوں نہیں یہ سماجی مسائل ہیں اور ہم انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔" اُس نے کہا اور تیزی سے ایک طرف چل دی۔

میں کچھ دیر تو وہیں سڑک کے بیچ میں کھڑا رہا، پھر سر جھکائے کچھ مغموم سا گھر کی طرف چل دیا۔

گھر پہونچ کر بھی یہ سوچتے لگا کہ یہاں اکیلا کیسے پہونچ گیا؟

دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور اسی کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ تصویر والے مُرے ہوئے آدمی نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ چاندی کے گلدان میں مور کے پنکھ ناچے اور سونے کی ننھی چڑیا نے ۴۵ ویں موتی پر جھپٹا مارا۔

میں گم سُم اُن سب کو دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اندر والے کمرے سے بچوں کے رونے کی آواز آئی۔ میں اُٹھ کر اندر گیا۔ پانچوں بچے ننھی ننھی بانہیں ہلاتے ہوئے رو رہے تھے اور دودھ کے لئے اُن کی زبانیں نوٹوں تک آ کر پھر اندر مونہہ میں چلی جاتی تھیں۔

میں بہت پریشان ہوا۔ اُنہیں چُپ کرانے کے لئے میں نے وہی لوری گائی جو وہ بے نام عورت گایا کرتی تھی مگر وہ پھر بھی چُپ نہ ہوئے۔ آخر ہار کر میں نے اپنی قمیض کا پلّو پتلون میں سے باہر نکالا اور اُوپر اُٹھا کر چھاتی ننگی کر کے اُن کے پالنوں کے پاس بیٹھ گیا — وہ باری، باری اُٹھ اُٹھ کر میری چھاتیوں سے دودھ پیتے رہے اور پھر سو گئے۔

صبح سویرے، مونہہ اندھیرے وہ واپس آ گئی۔ میں پالنوں کے پاس ہی فرش پر سویا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے اُٹھایا اور پھر پاس ہی بچھے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا اس کے بال بے ترتیب ہو رہے تھے اور چہرے کے سنگار کا رنگ فق تھا۔

اُس نے اپنے وینٹی بیگ میں سے وہ تمام نوٹ نکال کر گننے شروع کئے جو اُس نے رات ریستوران میں بل چکانے کے لئے دیئے تھے۔

وہ کافی تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ اُس نے مجھ سے سگریٹ طلب کیا۔ میں نے سگریٹ نکال کر دیا۔ اور پھر ماچس جلا کر اُس کا سگریٹ سلگواتے ہوئے پوچھا۔

(بقیہ ص۲۹ پر)

# تازہ

قاضی عبدالستار



"چھن چھن"

آواز نے کانوں کو چُور چُور کر دیا جیسے اُس کے سامنے اُس کی نازو نے سرخ چوڑیوں سے بھرے ہوئے دونوں ہاتھ دہلیز پر پٹخ دیئے ہوں۔ دونوں سفید تندرست کلائیاں خون کی چھوٹی چھوٹی مہین مہین لکیروں سے لالوں لال ہوگئیں۔ کتنی شدت سے جی چاہا تھا کہ اِس بہتے جاگتے خون پر اپنے ہونٹ رکھ دوں آج پھر اُس کی زبان نمکین ہوگئی۔ آنکھیں چیخ پڑیں۔ دونوں زخمی کلائیاں دو بچوں کی لاشوں کی طرح اُس کے پہلو میں جھول رہی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو اُبل رہے تھے۔ دھاروں دھار ہونٹ کانپ رہے تھے۔ عذابوں کی بد دعائیں دے رہے تھے۔ اُسے یقین نہ آرہا تھا کہ یہ وہی عورت ہے اس کی وہی بیوی ہے، جس کی بے مزہ قربت کی چکی میں سیکڑوں راتیں پس کر نابود ہوگئیں طلاق کی چلمن کے پیچھے سے وہ کتنی پُراسرار اور نذر نگار لگ رہی تھی۔

ٹریکٹر پھر چلنے لگا۔ تھوڑا سا کھیت باقی رہ گیا تھا۔ گیہوں کی پوری فصل کٹی پڑی تھی۔ کہیں بڑے بڑے انبار لگے تھے۔ کہیں چھوٹے چھوٹے ڈھیر۔ جیسے بیتے ہوئے سال اور مہینے۔ انہوں نے ایک چھوٹے سے ڈھیر کو اپنی چھڑی سے اُلٹ دیا۔ نہرتے عکسوں اور دھندلکوں کے ہجوم سے کچھ دانے نکل آئے۔ زندہ اور چمکدار۔ جیسے گزرے دنوں کے اَن گنت لمحوں کے بھوسے میں کچھ یادیں چمک رہی ہوں۔۔۔ یادیں ہماری بوئی ہوئی اور کھوئی ہوئی کے دانے۔ ابھی نہ دھوپ تیز ہوئی تھی اور نہ ہوا گرم لیکن وہ اپنے ا بہم کے ساتھ ٹیوب ویل کے پانی سے لبریز سنہتہ نالی کے کنارے کن چلتا ہوا ڈامر کی سڑک پر آگیا۔ اب انجنوں کی آوازیں دُور اور ہونے لگی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف اسکولوں کی زرد عمار امتحانوں کے پڑاؤ پڑے تھے اور شرارتوں کی ٹولیاں نہ جانے کھو گئی تھیں۔ بلاک کے دفتر پر بھیڑ لگی تھی۔ تقاوی اور بیسارے کاغذات بن رہے تھے۔ اب وہ بھیڑ سے ڈرنے لگا تھا۔ اُن کی بے ا نظروں سے کچلے جانے کے خوف نے اُسے ایک گلی میں موڑ دیا، جو کھر شاداب آوازوں سے چھلک رہی تھی۔ شور مچاتے زیوروں اور بھ کپڑوں سے چمک رہی تھی اور ان سب میں شرابور ہوتا اپنے مکا گیا جو اُس کے آبائی مکان کا ایک حصہ تھا۔ دوسرے حصوں میں ہ ڈاکخانہ اور گورنمنٹ اسٹور تھا۔ اُس نے دروازے پر ہلکی دی کہ ہسپتال میں انتظار کرتے مریضوں میں سے کوئی جان پہچان گزار نے اُس کے پاس نہ آجائے۔

پورا گھر جیسے بھونسلے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اُس نے

لے کمرے میں داخل ہو کر پنکھے کا سوئچ آن کیا جو وہاں اجنبی لگ رہا تھا۔
روازے پر کسی نے آواز دی۔

"مہر دیں۔"

اور جب نازو طلاق کے کفن میں لپٹی ہوئی زخمی کلائیوں سمیت
یشہ ہمیشہ کے واسطے رخصت ہونے کے لئے ادّھے میں سوار ہوئی تو
ہ لڑکھڑاتے ہوئے اُس کے قریب گیا۔

"میں تمہارا مہر تمہارے بھائی کو ادا کر دوں گا۔"

جواب ملا

"وہ اپنی ہونے والی کو میری طرف سے منہ دکھائی میں دیدیجئے
" ایک سناٹا سا چھا گیا۔ وجود کے اندر سے باہر تک سب کچھ
سنسان ہو گیا۔ نئی دولھن کے خواب میں بال تو اسی وقت پڑ گیا تھا
ب اُس نے نازو کو آنسوؤں میں نہاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس جملے سے
ٹخ گیا تھا اور جب اُس کی اچانک موت کی اطلاع آئی تو ٹکڑے ٹکڑے
گیا۔

آج پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔ نازو کے جہیز کی اونچی
ہری کے تکئے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا کہ کہیں گر نہ پڑوں اور جب ہاتھ
یا تو بائیں کان کا دُر دامن میں پڑا تھا۔ سونے کے دُر میں بیضاوی موتی
رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتے رہا۔ اور داہنا ہاتھ ہمیشہ کی طرح داہنے
پر لرزتا رہا۔ اس لَو میں بھی سوراخ تھا، اور اس میں بھی بائیں کان کی
ج دُر چمکا کرتا تھا۔ جس رات وہ کھویا گیا۔ کان کی لَو کا سوراخ دل میں
ل ہو گیا۔ ماں نے منت کے دُر اس لئے پہنائے تھے کہ بیٹے جیتے نہ تھے۔
ن لڑکیوں کی طرح برتا گیا۔ دوپٹے اُڑھائے گئے۔ گھروندے بنائے گئے،
کلیاں پکائی گئیں۔ گڑیوں کی شادیاں رچائی گئیں۔ اور سب کچھ تو بھول
پوٹ گیا لیکن کانوں کے دُر شخصیت کا حصہ بن گئے۔ خدوخال کی طرح
میں شامل ہو گئے۔ وہ نوجوانی میں بھی شوق سے پہنتا رہا۔ پھر دروازے
ر سا مچ گیا۔ باورچی خانے سے بوڑھی عورت نے کوّے کی طرح کون
ی رٹ لگا دی ... وہ اطمینان سے سوچنے کے لئے خود باہر نکلا۔
زے پر مندر کھڑی تھی۔ ادھیڑ عمر کی گوری چٹی مندر! جس کی جوان راتوں
ہوں نے اپنے بوسوں کے چراغ جلائے تھے۔

"کیا ہے؟"

"میاں! آج برات آئے رہی ہے آپ کی بیٹو اکی"

"ہاں ہاں پھر"

"سب انتجام آپ کے ری دعا سے پکّا ہے.. مُل مسند نائن
مَل رہی ہے۔"

مسند ہے تو... لیکن معلوم نہیں کہاں ہے۔ جب وہ گئیں نہ
ضرورت پڑی نہ تلاش کی گئی۔ تم باہر سے کسی کو بھیجو میں ڈھونڈھوا دوں۔"
مندر کے جانے کے بعد اُس کے تصوّر نے فراغت کا سانس لیا۔

برناپور کی شادی تھی، اور اُس کی نوجوانی۔ باپ کی موت کے
بعد پہلی بار کسی تقریب میں شرکت کو نکلا تھا۔ آدھی رات کو کھانا ہوا۔
اور پچھلار سے دولھا اندر آیا۔ تلچوری چلی اور ہنگامہ ہوا۔ بوڑھی بوڑھی کٹکھنی
عورتیں جو بولتے جلووں پر بھی کاڑھے بیٹھی تھیں ایک ہی ریلے میں بہ گئی۔
روشنیاں جو دن رہے سے جل رہی تھیں اب سونے لگی تھیں۔ یہاں سے
وہاں تک پھیلی ہوئی عمارت کے کئی حصے تاریک ہو چکے تھے۔ وہ کوئی چیز
لینے اپنے کمرے میں آیا جو اندرونی اور بیرونی عمارتوں کے درمیان دوہرے
دالانوں میں چھپا کھڑا تھا۔ وہ دیا سلائی کی روشنی میں لیمپ ڈھونڈھ رہا
تھا کہ اندرونی عمارت کی صحنچی میں ایک چہرہ چمک اٹھا اور اس طرح کہ
دیا سلائی نے اُسے جلا دیا۔ وہ اتنا روشن تھا کہ اگر تھوڑا سا اور قریب آجاتا
تو اُس کے اپنے کمرے میں روشنی کی ضرورت نہ رہتی۔ وہ اسی طرف دیکھ رہی
تھی۔ وہ جیسے جادو کے زور سے کھنچا ہوا چلا۔ گھاس کے تختوں پر ڈھیر سامان
سے بچتا ہوا صحنچی کے سامنے دالان کی سیڑھیوں پر پہونچ گیا۔

"میاں سامنے والی کوٹھری میں تو مسند ہے نہیں۔ کاجی جی صاحب
کا بڑا بکس کھولیں؟"

"ہاں"

صحنچی اس کے نور سے سنگِ مرمر کی بن گئی تھی.... سانس پھولنے
لگا۔ پہلوؤں میں درد کے نشتر اتر گئے۔ اریبی پائجامے کی چوڑیاں پسینے سے
بھر گئیں کہ ایک آواز طلوع ہوئی۔

"آپ"

اور جیسے ہی وہ آگے بڑھا۔ روشنی نور اور رنگ کا ایک پیکر ایک
ہیولیٰ اس سے ٹکرا گیا اُس پر بکھر گیا۔ داہنے کان پر کنول کا تازہ پھول
لرز گیا، اور اس کا کان اُس کے سینے کی طرح خالی ہو گیا اور وہ ایک

(بقیہ صفحہ ۲۳ پر)



# سو بیٹے

## کشوری چرنداس

**نوجوان** زندہ باد
مادرِ وطن ، زندہ باد
انقلاب، زندہ باد

نعرے گونج رہے ہیں۔ ٹھہرو۔ ذرا ٹھہر جاؤ میں سانس تو لے لوں۔ اتنے قریب سے میں نے تم لوگوں کو کبھی نہیں دیکھا۔ اس لئے اب اچھی طرح دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن ہال جلوسوں میں، کانووکیشن ہال میں، گیراؤ میں، میں نے تم لوگوں کو دیکھا ہے۔ لیکن تم لوگوں کے ساتھ ایک ہی بنچ پر سٹ کر کبھی نہیں بیٹھا تھا۔ تمہاری میلی شرٹ کی بُو سونگھ کر، تمہاری سیٹی جیومیٹری کی کتابوں سے مکھیوں کو بھگا کر تمہاری زبردست قوت سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ یہ سوچتا ہوں تو دل پر چوٹ لگتی ہے۔ ارے کیا آگ کی یہ قربت مجھے جلا کر راکھ کر دے گی؟ کیا میں اپنے آپ کو، اپنی سنجیدگی و متانت کو اور بیچ کی فطری دُوری کو بھول جاؤں گا؟

ایسا سوچتے ہوئے گاندھاری[1] پر غصہ آیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ تم لوگ واقعی بے وقت مر جاؤ گے۔ ورنہ مہابھارت کا کہنا صحیح ثابت کیسے ہوگا؟

گزشتہ کچھ دنوں کی ہی بات ہے . . . . میں چھٹی کے بعد کلکتہ واپس جا رہا تھا میں کلکتے میں ملازم تھا اور وہیں ہے میری گاڑی سب کچھ اس لئے والدین کے ساتھ کچھ دن گزارنے کے بعد اپنے واپس جانے کے لئے میں بے چین ہو اٹھا تھا۔

رات کی ٹرین تھی۔ صبح سویرے کلکتہ پہنچ جاؤں گا۔ اس کے پیشِ نظر میں تھرڈ کلاس سلیپر کے سخت بنچ پر ہی سفر کر رہا تھا۔ سا سفر کرنے والوں کو کسی نہ کسی بہانے میں بتا چکا تھا کہ میں فلاں شدہ اگر میں چھٹی پر نہ ہوتا تو ایر کنڈیشن ہی میں سفر کرتا۔ وہ سب بے فکری سے تھے مگر میری آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ بتی جلا کر گھڑی دیکھتے جا رہا تھا کہ سے کسی اسٹیشن کی بتیوں کی روشنی دکھائی دینے لگی۔ ارے یہ تو پور ہے۔ گڈ، اب تو کلکتے پہونچنے میں صرف دو گھنٹے ہی رہ گئے۔ سانس لی، اور ایک سگریٹ سلگایا۔

لاؤڈ اسپیکر پر کوئی رٹی ہوئی باتیں دہرا رہا تھا۔ فلاں ٹرین وقت پر پہونچے گی یا چھوٹے گی۔ پہلے بنگلہ میں، پھر ہندی میں اور پھر ا میں یہ باتیں دہرائی جاتی تھیں۔ مجھے ایسا لگا کہ اعلان کرنے والا رٹے ان فقروں میں، لیکن، لفظ جوڑ رہا ہے۔ ذرا غور سے سننے کی کوشش تو سنا کہ کلکتہ جانے والی ۷، ڈاؤن، چار بج کر پینتیس منٹ پر چھوٹے لیکن 'پن کنڈا' اسٹیشن پر اس کے رُک جانے کا امکان ہے۔

---

[1] مہابھارت کے کردار دریودھن کی ماں کا نام جس کے سو بیٹے تھے اور جو جنگ کا باعث بنے

'پن کنڈا' رک جانے کا امکان ہے ؟ پن کنڈا کہاں ہے ؛
مکان سے کیا مراد ہے ؛ یہ سُن کر میرے دِل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ
ج ہونے سے پیشتر ہی اٹھنا پڑے گا۔ شاید گارڈ، اسٹیشن ماسٹر یا کسی
کو بتانا پڑے گا کہ میں 'اَنک' ہوں۔ ایک اعلیٰ افسر اور میں اب چھٹی
ہوں چھٹی ختم ہونے میں سات دن باقی ہیں۔ خیر اپنے پروگرام میں معمولی سی
دیلی ہو رہی ہے۔ اس میں کچھ گرما گرمی رہے گی۔ چلو بُرا ہی کیا ہے۔

پن کنڈا آگیا۔ چھوٹا سا اسٹیشن ہے۔ آہستہ آہستہ دن کی روشنی
ہ رہی ہے اور اس روشنی میں پن کنڈا اسٹیشن نے جیسے اپنے آپ کو
سجالیا تھا، ایسا لگتا تھا۔ ڈاؤن ایکسپرس جیسی ٹرین یہاں رُک جائے
اور اس عظیم اور قابلِ فخر واقعہ کی وجہ سے پن کنڈا چھوٹا اسٹیشن نہیں
لگا۔ اسٹیشن پر کھڑے لوگ جلدی میں نہیں تھے۔ اسٹیشن کے بابو پلیٹ فارم
گئے تھے مگر اُن میں سے کوئی بھی بھاگ دوڑ نہیں کر رہا تھا۔ ہاتھ میں
ی جھنڈیوں کو لپیٹے وہ خلاصی بھی کھڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی
یب منعقد ہو رہی ہو۔

ایسا ہی ہوا لیکن گاڑی چھوٹنے سے پیشتر ایک چائے والا اپنے
س پیسے والی چائے کے 'کلہڑ' کو میرے ہاتھ میں تھما کر بڑبڑانے لگا۔

"یہاں سے تو گاڑی چل پڑی مگر اس کے بعد میجیڈا تک چائے
دروہیں تھپ ہو کر رہ جائے گی، بس" میرے ہم سفر اب بستر چھوڑ کر
بیٹھے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر پر جس بات کا اعلان کیا گیا تھا اور پن کنڈا کے
ے والے نے جو کچھ کہا تھا، میں نے مختصراً انہیں بتا دیا تھا۔ ایک مہاشے
ادی پہنے ہوئے تھے، کھلے الفاظ میں سرکار کو گالیاں دے رہے تھے
ے جسم والے ایک مسافر نے، جو غالباً کوئی تاجر تھے، ایک ہی پھٹکار میں
ے ماحول کا تجزیہ کر لیا۔ "دھت تیرے کی"، ایک صاحب پینٹ پہنے
، تھے اور جن کے گال پچکے ہوئے تھے میری جانب ایک ٹک دیکھنے
یسے اُن کا کوئی خوفناک خواب ٹوٹا ہو اور میرا بیاجم ہوا ہو۔

میجیڈا میں ہی صبح ہوئی۔ دیگر مسافروں کے ساتھ میں بھی
فارم پر اُتر آیا۔ قریب ہی کھڑے ایک اسٹیشن کے بابو کو دیکھ کر میں نے

"ایکسکیوزمی، میں ہوں 'اَنک'۔ یہ گاڑی یہاں کیوں رُک گئی ہے؛

کب چھوٹے گی؟" میری آواز میں افسرانہ جھلک تھی۔

لیکن سنجیدگی اور شرافت سے اسٹیشن کے بابو نے جواب
دیا۔۔ "الواڑیا میں گھیراؤ ہے۔"

"یعنی "

"یعنی ریلوے ملازمین لائن پر سوئے ہوئے ہیں۔"

"تو یہ گاڑی نہیں چھوٹے گی نا ؟"

"میں نے عرض کیا تھا نا کہ اس بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا"

غصّے سے میرا سارا جسم گرم ہو اُٹھا۔ اگر اُس آدمی سے یہ پوچھا جائے
کہ جینا چاہتے ہو یا مرنا تو وہ اپنے مُنہ کو اتنا ہی ٹیڑھا کر کے کہے گا "کچھ
کہا نہیں جا سکتا۔"

میں واپس آگیا میں نے سوچا کہ پن کنڈا کے چائے والے کا بڑبڑانا
اس سے اچھا تھا۔ اس کی مستی سے کم از کم ایک خوشی تو مِل رہی تھی۔ نوکر شاہی
کی مُردنی تو اس میں نہیں تھی۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ میں ایک بڑا افسر ہوں، اس لئے چھوٹے
افسر کا تھکانہ انداز برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ خیال بے بُنیاد ہے۔
میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔ لیکن اُسی وقت سے میری بے قراری بڑھ رہی تھی۔
میرے جسم سے جتنا پسینہ بہہ رہا تھا، اُس میں زیادہ تر حصّہ انہیں لوگوں
کی بدولت نکل رہا تھا۔ انہیں لوگوں کی بدتمیزی کا مقابلہ کرنے کے باعث۔
علی الصبح اگر میں نہا دھو کر ایک ریلوے ملازم سے پوچھوں تو وہ مونٹوں کو
چبا چبا کر کیوں ایسا جواب دے۔ کھادی پہنے مسافر کیوں کہے کہ سب بڑے
بڑے سرکاری افسروں کو گولی سے اُڑا دینا چاہئے۔ میں کون ہوں۔ یہ
میں نے اُس سے کہہ ہی دیا تھا۔ کیا وہ بھول گیا ؛ وہ تاجر جو اعلیٰ دھوتی
اور سونے کی گھڑی پہنے ہوئے ہے کیوں چبا چبا کر کشمیری سیب کھائے
اور میری جانب پھینک کر کہے۔ کھائیے کھائیے، یہ بہت ہی اچھی چیز ہے،
صحت بناتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی نفرت و حقارت سے ناک سکوڑے
کہ میں نے اسٹیشن سے دو آنے کی پوری کھائی تھی اور وہ شخص کیوں میری
طرف تیر کی طرح آنکھ مار کر کہے کہ وزیر داخلہ کو خبر دی گئی ہے کہ نہیں اور
جنرل منیجر آئے ہیں کہ نہیں ؛ وہ مجھ سے کیفیت پوچھ رہے ہیں۔ واقعی اسٹیشن
کے بابو سے لے کر میرے ساتھ جانے والے مسافر تک جس طرح میری
انانیت کو ٹھیس پہونچا رہے تھے، اس سے میرا دم نکلا جا رہا تھا۔ میں وہاں

سے بھاگ نکلنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اُس وقت اُس مست رنگیلے چائے والے کو بڑے پیار سے یاد کر رہا تھا۔

میجسٹک اسٹیشن منہ موڑ کر بیٹھا ہے۔ بن کنڈا شاید جانتا تھا کہ مہمان کو عزت و توقیر کے ساتھ روکنا ناممکن ہے۔ گھنٹوں گزر گئے۔ اب تک چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ کب قسمت کھلے گی اور گاڑی آگے بڑھے گی۔ کون جانے؟ لوگ باہر جاتے تھے اور پھر واپس آجاتے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ کوئی چل سکتی ہے، اس لئے فوج کو بلایا گیا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ ٹیلی فون کا تار کٹ گیا ہے، تھوڑی دیر کے بعد بجلی بھی بند ہو جائے گی۔

پکوڑے والے، پوری والے اور کیلے والے اپنی اپنی چیزوں کی قیمتیں بڑھا کر تھک چکے تھے، اب کوئی سامان باقی نہیں ہے سب بک چکا ہے اُن کی ٹوکریاں خالی پڑی ہیں۔

اسٹیشن کے بابو لوگ بھی ڈر کے مارے اندر دفتر کے کمروں میں چھپنے لگے ہیں۔

اس حالت میں کیا کروں؟ کیا ایک بار پھر نہا لوں؟ یہی سوچتے سوچتے مجھے ایک بات سوجھی۔ یہ سچ ہے کہ گاڑی ہوڑہ کی جانب نہیں جا رہی، لیکن کیا کوئی گاڑی دوسری طرف بھی واپس نہیں جائے گی؟

میرا یہ اندازہ غلط نہیں تھا۔ کوئی لوکل ٹرین اگلے اسٹیشن سے واپس آئے گی۔ یہ ٹرین ہوڑہ نہیں جا سکتی۔ اس لئے کھڑگ پور واپس جائے گی میں بھی کھڑگ پور واپس جا سکوں گا۔ ٹھیک ہے۔

اب میں کھڑگ پور جاؤں گا۔ وہاں اپنی بہن کے گھر کچھ کھا پی کر آرام سے اپنا آئندہ پروگرام مرتب کروں گا۔ یہاں کے ریل افسروں کو ٹیلی فون کروں گا۔ تب وہ مجھے پہچانیں گے۔ وقت پر گھیراؤ ختم ہو جائے گا اور میں بغیر کسی اڑچن کے آج یا کل کلکتے پہونچ جاؤں گا۔

اس لئے جب دوپہر کو دوسری جانب جانے والی ٹرین رکی تو میں نے سکھ کا سانس لیا۔ اپنے بکس کو ہاتھ میں لیا اور لائن پار کر کے پہلے ڈبے میں ہی گھس گیا۔

اُس کے بعد سنی میں نے اُن لوگوں کی چیں چیں۔۔۔

اب میں نے اُن لوگوں کی طرف دیکھا جو بحث مباحثہ میں اُلجھے ہوئے تھے۔ چھ سات نوجوان تھے۔ کسی کی عمر بھی سترہ سے کم اور پچیس سے زیادہ نہ تھی۔ چھ سات مونث، آنکھیں اور ہاتھ جیسے مسلسل اپنا کام کئے جا رہے تھے۔

"آئیے سر! ٹھنڈا پانی پئیں گے؟"

یعنی مطلب۔ یعنی یہ لوگ ہیں کون؟ یہ کل کے چھوکرے جو میرے بیٹے کے ہم عمر ہوں گے، کیا میرا بھی مذاق اُڑائیں گے۔؟

میں نے نوجوانوں کی جانب بدرانہ نگاہوں سے دیکھا۔ میری تاؤ بھری نگاہوں سے کوئی بھی نہیں جھینپا۔ لیکن ان ہپی چہروں میں سے کسی نصب العین یا کسی پیغام کی جھلک نہیں دیکھی۔ حکم عدولی کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ میں کسی قدر تھک گیا ہوں، یہ وہ ٹھیک طرح سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس لئے میں پانی پینا چاہوں گا۔ یہ قدرتی بات تھی۔ مجھے اُن کے سوال کا جواب جلد دینا ہوگا۔ نہیں تو سوال کا وقت ہی ختم ہو جائے گا۔ وہ دیکھو اُن میں ایک نے تاش کے پتے نکال لئے ہیں اور اپنے ایک ساتھی کے شانوں کو ہلا ہلا کر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ تیسرا کھڑکی سے سر باہر نکال لیتا تھا اور پھر اندر کر لیتا تھا وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

"دیکھو — وہ دیکھو"

میں اگر جواب نہ دوں تو میرا ہی نقصان ہوگا۔ اس لئے میں نے اور زیادہ دیر نہ کی — بولا "تھینک یو — دو گلاس چاہئیں۔"

ایک لڑکے نے پانی کی ایک سستی سی پلاسٹک کی بوتل میرے سامنے رکھ دی اور بولا — "پیجئے"۔ کچھ وقت پیشتر جس طرح میں نے ایک ہم سفر نے میری جانب سیب پھینکا تھا، ٹھیک اسی طرح اُس نے بوتل رکھ دی تھی۔ اُس کا کوئی مہذبانہ انداز نہیں تھا لیکن میں ناراض نہیں ہوا۔

کھڑگ پور دو گھنٹے کا راستہ ہے۔ تب تک ان لوگوں کے ساتھ ہی بیٹھنا پڑے گا۔ کیا خاموش ہو کر بیٹھوں؟ یا اُن کے ساتھ گفتگو کروں؟ تو اُنہوں نے مجھے "سر" کہا تھا۔ انہوں نے میری بزرگی کا اعتراف کیا لیکن بزرگی کیا شے ہے؟ وہ یہ لوگ جانتے بھی نہیں۔ مجھے پانی پلا کر یہ لوگ شور و غل مچانے لگے ہیں۔ ٹھیک ہے یہ لوگ مجھے پریشان نہ کریں اتنا کافی ہے۔

گاڑی نے سیٹی بجائی۔ اُس کے ساتھ ہی ایک تیز آواز سنائی دی۔ کیا یہ دس دس سال کے بچے ہیں؟ یہی سوچتے سوچتے میں بہت اُداس ہو گیا۔

اگست ۔۔

گاڑی چل پڑی۔ اچانک ایک نوجوان میرے قریب آگیا۔ گہری نیلی
س شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ منہ پر چیچک کے داغ تھے اور بال بکھرے ہوئے
ے۔ پوچھا ــــ "سر آپ اس گھیراؤ میں وشواس کرتے ہیں۔"

اُف میں کس مصیبت میں گرفتار ہوگیا۔ پینتالیس کی عمر ہوئی۔ ابھی
، وشواس کرنے اور نہ وشواس کرنے کی ذمہ داری بہت اچھی طرح سے
تا رہا ہوں، لیکن کیا آج اس غیر ذمہ دار نوجوان کو اس سلسلے میں جواب
ہوگا یا یہ نوجوان ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہ دس سال کا بچہ ہے۔
میں نے جواب دیا ــ "نہیں۔ اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے راستے
رے مسافروں کو پریشان کرکے کون سا فائدہ ہوتا ہے۔"

وہ ہنس پڑا جیسے میں کوئی نوٹ بک نکال کر اس میں لکھی کوئی
سطر پڑھ رہا ہوں۔ اس وقت میرا دماغ بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔

اس نے کہا ــ "سر مسافروں کو تکلیف ہوتی ہے، ہونے دو۔
ئی بڑی بات نہیں ہے۔ لیکن سوال ہے کیا یہی انقلاب کا راستہ ہے۔
کچھ ٹھیک جواب دینے کی تیاری کر رہا تھا، تبھی کوئی عقب سے چلّا چلّا کر
گا۔ اے منٹو تیری بہن اسپتال میں تھی نا۔ کیا ہوا؟"

"اور کیا ہوگا۔ سالے ڈاکٹر نے بڑھیا علاج کرنے کے لئے سو
، رشوت مانگی تھی۔ جب میں نے نہیں دی تو کہنے لگا "چلو چلو اس کو واپس
جاؤ۔ اسے کوئی سخت بیماری ہے ہی نہیں۔"

"پھر"

"پھر کیا میں اب اُس ڈاکٹر سے ملتا ہی نہیں۔ اگر میری بہن کو کچھ
تو کیا میں اُس کی مرمت نہیں کروں گا۔؟ ــــــــــــ
ــ مستان جو اُس کے محلے میں ہی رہ رہا ہے ہمارے گروپ میں ہے ہی۔
جب رات کو ہسپتال سے گھر لوٹے گا تو ایک دم ۔ ۔ ۔ ۔" اُس نے
مارنے کا اشارہ کیا۔

سب ایک ساتھ قہقہہ لگانے لگے۔

میں دم بخود رہ گیا۔ کون ہیں یہ لوگ؟ کس طرح کی زندگی ہے
؟ ہاں یہ نوجوان ہیں۔ ہاتھوں میں پکڑی کتابوں، کاپیوں سے پتہ
ہ کہ اسکول کالجوں میں پڑھتے ہیں۔ شکل و صورت میں بہ میرے
یسے ہیں۔ میں جن لڑکوں کو جانتا ہوں وہ تو اس دُنیا میں سر اونچا
تے ہیں، عینک لگائے لائبریری میں بیٹھے رہتے ہیں، سماجی خدمات
انجام دیتے ہیں اور شعر و شاعری کرتے ہیں۔ کبھی کبھی جوش میں آکر کلب یا ریستوران میں ڈانس کرتے ہیں۔ فکر میں ڈوب کر ایک آدھ بار بغاوت کرتے ہیں یعنی جلوس میں شرکت کرتے ہیں۔ اور پھر اس طرح چلتے چلتے تکمیل کے مرحلے تک پہونچ جائیں گے جس طرح کہ میں پہونچا ہوں لیکن آج جن نوجوانوں کو اس گاڑی میں دیکھ رہا ہوں، وہ کیا بنیں گے؟ ۔ کیا بنیں گے یہ سب؟"

بھئی، زندگی ایک مذاق ہے۔ بہن ہسپتال میں رہ کر جئے گی کہ مر جائے گی؟ اس پر دھیان نہیں ہے لیکن ڈاکٹر کی اچھی طرح مرمت کرنے کے خیال سے ہی ہنس رہے ہو، ناچ رہے ہو، سیٹی بجا رہے ہو اور یہ بھی کہہ رہے ہو کہ بغاوت کریں گے۔ مجھے سر، کہہ کر مخاطب کرتے ہو، پانی بھی پلاتے ہو اور اس کے ساتھ یہ بھی بھول جاتے ہو کہ میں ابھی یہیں موجود ہوں؟"

اب میں نے دیکھا کہ اُن میں سے نہ تو کسی کی بُش شرٹ پریس ہوئی ہوئی تھی، اور نہ کسی کے بالوں کو تیل لگا تھا۔ کچھ ایک کے تو پاؤں میں جوتے بھی نہ تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے پورا یقین ہوگیا کہ یہ سوبیٹے ہیں اور بچ نہیں سکتے۔

اس کے باوجود میں اُن کے بارے میں جاننے کا خواہش مند تھا۔ کس طرح دو دو منٹ میں تاش کھیلے جاتے ہیں، ہاتھ کی لکیریں دیکھی جاتی ہیں، لمبی لمبی باتیں کی جاتی ہیں، یہ جاننے کا میں خواہش مند تھا۔ ماؤ کے عشق کے بارے میں خیالات، کلکتہ میں اچھا مسالے دار مُرمُرا کہاں ملتا ہے، اس طرح بہت سی باتیں میں نے منٹو و شنکو سے سُنیں۔ اُن کی باتوں کا خلاصہ یہ ہے۔

یہ روزانہ آنے جانے والے مسافر ہیں۔ صرف ٹرین سے سفر کرتے ہیں کلکتہ میں یہ پڑھتے ہیں لیکن آج گھیراؤ کی وجہ سے بے وقت گھر جا رہے ہیں۔

اِن میں سے کچھ لڑکے کلکتہ میں نہیں پڑھتے۔ اُن میں سے زیادہ تر مرمت اور اسٹیشنری کی دکانوں پر ملازمت کرتے ہیں۔ "سر امریکہ میں ایسا کرتے ہیں نا؟"

"کچھ لڑکے کلکتہ میں اس لئے نہیں پڑھ پاتے کیونکہ اُنہیں پارٹی کے بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں۔"

کچھ کلکتے میں ٹیچر کا کام کرکے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اور پھر گھر واپس آکر گاؤں کے کالج میں پڑھاتے ہیں۔

یہ سب کون ہیں؟ اشارے سے سمجھ گئے کہ نہیں، چھوڑیئے اب اور

دوسری بات سُننے ـــ اور سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

منٹو کی بہن کئی مہینوں سے شدید بیمار ہے۔ دوسرا نوجوان ایک ولایتی کمپنی میں کلرک ہے مگر لوگ اُسے نکالنے کے لئے دھمکا رہے ہیں۔ اس کی پانچ بہنیں ہیں۔ منٹو شادی نہیں کرے گا اور کوئی لڑکی گھر نہیں لائے گا بدھو ہے نا!"

یہ دُبلا پتلا لڑکا جس کے منہ پر مونچھیں ہیں۔ اس کا نام ہے شنکو۔ اُس کے والد بڑے آدمی تھے۔ بیڑی کی دکان میں دو ہزار روپے کمائے تھے مگر وہ سب روپوں کو ہڑپ کر کے کہیں غائب ہو گئے۔

شنکو بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ایک دن تو وہ پرنسپل کا گلا گھونٹنے جا رہا تھا کیونکہ پرنسپل نے اُسے بیوقوف کہا تھا۔

نوین جو ہاتھ کی لکیروں کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اس کے والد حکیم تھے اور کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر راہی ملکِ عدم ہو گئے تھے۔ اُس نے میرا ہاتھ دیکھ کر بتایا ہے کہ میں پھانسی کے تختے پر ہی مروں گا (جھوٹا کہیں کا میں اگر مروں گا تو گولی سے۔)

وہ سنتو ہے نا۔ وہ فرسٹ کلاس مچھلی پکاتا ہے۔ وہ بہت بڑھیا سیٹی بجاتا ہے۔ ایک دن تو اس نے پولیس کو بھی دھوکا دیدیا۔ بیچارے پولیس والے دوسری جانب دوڑنے لگے۔۔

دیکھا آپ نے۔ آوارہ گردی کے سب فن دیکھ لئے نا آپ نے؟

ایک چھوٹی سی بات اور ہے۔ اُنہوں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ میچیڈا یا کسی دیگر اسٹیشن پر نہ گاڑے یا پوری وغیرہ نہ کھا سکے کیونکہ جیب میں پیسے نہیں تھے مگر کلکتے میں ہوتے تو چنی ہوئی بڑھیا بڑھیا دکانوں سے کھا سکتے تھے کیونکہ اُن دکانوں پر اُدھار اور کمیشن کا انتظام ہے۔

اور کیا باقی رہا؟

ٹرین ہر اسٹیشن پر رُک رُک کر آگے بڑھتی جا رہی تھی مگر ٹرین میں اُف، اتنی ساری مکھیاں۔ مجھے پریشان ہوتے دیکھ کر منٹو نے اپنی جیومیٹری کی کتاب مکھیاں بھگانے کے لئے دے دی۔ میں نے کتاب کا کچھ استعمال کیا مگر آنکھیں بند کر کے میں نے اگلے اسٹیشن کھڑگ پور کا ہی دھیان کیا جہاں میں اپنی بالکونی سے لان کی شان و شوکت دیکھوں گا، اور آج کی مہم بازی کا خیال کر کے جی بھر کے ہنسوں گا۔

ایک اسٹیشن سے گاڑی چھوٹنے پر منٹو چلانے لگا "وہ دیکھو لنگڑا جا رہا ہے۔ لنگڑا۔"

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، وہ کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھ تھا۔ دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ ہنسی میں ہنسی آنکھوں میں آنکھیں ملا کر منٹوں میں ہی فیصلہ ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایک کر کے سب کے سب ڈبے کے مختلف کونوں کو بھاگے اور خطر کی زنجیر کو کھینچ لیا۔

"یہ کیا؟ یہ کیا تماشہ ہے؟ رہنے دو، رہنے دو، زنجیر مت کھینچو۔"

میں نے بہت سمجھایا لیکن میری بات کوئی سُنے تب نا۔ ایک دُوسرے سے کہا ـــ "کھینچو، ارے کھینچو بھی۔ ارے میں کہہ رہا ہوں ا کھینچ نا۔"

میرا حوصلہ پست ہو گیا۔ ابھی گاڑی کھڑی ہو جائے گی۔ پولیس آئے گی۔ مجھ سے جب پوچھا جائے گا تو میں کیا جواب دوں گا؟ کیا اِن لوگوں کو پکڑوا دوں گا؟ یہ تو بڑی مصیبت ہے۔ اس کے علاوہ کیا پولیس کی مانیں گے؟ پھر اُن سے جھگڑا بڑھے گا۔ ہاتھا پائی ہو گی۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔

اُف کیسی بدقسمتی ہے۔ میں کیوں اس ٹرین میں بیٹھا؟ تمہ لڑکے ہنس رہے تھے۔ میں کھڑا ہو کر سب سے پلیز، پلیز، کہہ رہا شاید زنجیر کے سسٹم میں کوئی نقص ہو گیا تھا۔ ٹرین نہیں رُکی کے بعد شنکو میری جانب بھاگا ہوا آیا کہا ـــ "سر، ایک روپیہ دیں جلدی کیجئے۔"

میں حیران تو ہو رہا تھا لیکن ایک روپیہ نکال کر دے بھی شنکو نے اُسے رُومال میں لپیٹ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ ا بعد زور زور سے تالیاں بجیں، سیٹیاں بجیں۔ جیسے ندی میں س آگیا ہو۔ نعرے بھی لگائے گئے ـــ

انقلاب زندہ باد ـــ" لیکن میں کچھ سمجھنے کی پوزیشن میں: شور و غل بند ہو جانے پر منٹو نے مختصراً اتنا ہی کہا ـــ "سر وہ لنگڑا۔ کھرائی کا رہنے والا ہے۔ پڑھنے کے لئے رادھا موہن پور جاتا ہے۔ پاگل تو کیا ہے، دیکھئے۔ ٹرین میں نہ بیٹھ کر پیدل جا رہا ہے۔ اب روپیہ مل گ اس کو ـــ کوئی سواری پکڑ لے گا۔"

(بقیہ ص ۳۳ پر)

# تین پہیے کی گاڑی

عبدالمالک

وہ وہاں کھڑے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ مجھے ٹرین سے
ے ہوئے دیکھ کر وہ دھیرے دھیرے میری طرف بڑھے۔ اُن کی ہرے رنگ
کار اسٹیشن کے باہر کھڑی تھی اس میں سوار ہو کر ہم لوگ گھر پہونچے۔

راستے میں کوئی زیادہ گفتگو نہ ہوئی۔ میں کچھ زیادہ تھکا ہوا بھی
ا۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کرنے سے ویسے بھی کوئی زیادہ تکلیف
تی لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ جاوید صاحب کچھ اُداس سے ہیں۔
ے کے سر پہ کام کا بہت بوجھ ہے۔ آج کل بچوں کو بہت زیادہ
پڑتا ہے۔ اُنہیں ایک دم فرصت نہیں ملتی۔ تاہم میرا تار ملنے پر وہ مجھے
لنے اسٹیشن پر آئے تھے۔

میری لڑکی بچی جاوید صاحب کے چھوٹے بھائی آفتاب سے بیاہی
ے۔ یہی ہمارا اُن کے ساتھ رشتہ ہے۔ آفتاب اُن کے ساتھ نہیں رہتا۔
دلی میں رہتا ہے۔ میری لڑکی بھی اُسی کے ساتھ رہتی ہے۔ اِن کا
ائی حال ہی میں کسی محکمے کا ڈپٹی سیکریٹری ہو گیا ہے اور شیلانگ
ہے

جج صاحب اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہیں رہتے ہیں۔

جب ہم لوگ کوٹھی پر پہونچے تو صبح کے نو بجے تھے۔ اُنہیں ساڑھے
نو بجے کچہری جانا تھا۔ وہ بڑے اخلاص سے میرے لئے سب انتظام کر کے کچہری
چلے گئے۔ یہاں گھر پر کئی نوکر ہیں۔ اُن کی بیوی بچوں سمیت تفریح کے لئے اپنے
دیور کے پاس شیلانگ گئی ہوئی ہیں۔

اُن کی کوٹھی بڑی عالیشان، وسیع اور آرام دہ ہے اور اس میں ہر
جگہ سکون ہی سکون ہے۔ اُن کے مطالعے کے کمرے اور لائبریری کو دیکھ کر مجھے
بڑی خوشی ہوئی۔ کتابیں بڑی الماریوں میں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ قانون،
سوانح، نفسیات اور ناول وغیرہ۔ وہ سبھی موضوعات پر بہت ساری کتابیں
جمع کئے ہوئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جاوید صاحب کی سانسوں اور
ہاتھوں کے لمس کی چھاپ اِن کتابوں پر پڑی ہے۔

شام کے وقت میں اور جاوید صاحب دونوں کوٹھی کے سامنے
لان میں بیٹھے عام گھریلو باتیں چیت کر رہے تھے۔ جاوید صاحب بڑے
خوش گفتار ہیں۔ گھریلو باتوں کے درمیان بھول کر بھی انہوں نے کسی

مقدمے وغیرہ کا ذکر نہ چھیڑا۔

میں زمین جائداد کے مقدمے کے سلسلے میں صلاح ومشورہ کے لئے اُن کے یہاں آیا تھا۔ مقدمے کے ضروری کاغذات میں نے پہلے ہی اُن کے پاس بھجوا دیئے تھے۔ والد صاحب کے زمانے کے جائے باغات کو لے کر ہی ہم دونوں بھائی مقدمہ لڑ رہے تھے۔ میں لوور کورٹ کے فیصلے سے مطمئن نہیں تھا اور اب معاملہ ہائی کورٹ میں لے جانا چاہتا تھا۔ اس مقدمے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اور اس مقدمے میں کامیابی کی کتنی امید ہے؟ مجھے جاوید صاحب سے اس معاملے میں خاطر خواہ امداد ملے گی یہی سوچ کر میں کچھ روز کے لئے اُن کے یہاں چلا آیا تھا۔ ساتھ ہی ایک موٹر بھی یہیں سے خریدنے کا خیال تھا۔

جاوید صاحب نے کہا "آپ دو چار دن یہاں ٹھہر جائیں تو کوئی حرج تو نہیں۔ آپ ایسے وقت میں آئے کہ بچوں سے بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ آپ یہاں دو چار دن تو ضرور قیام فرمائیں۔"

"آپ کے گھر کوئی آدمی نہیں۔ میرے ٹھہرنے سے آپ کو کافی تکلیف ہوگی۔ یوں میں دو چار دن ٹھہرنے کی غرض ہی سے آیا تھا" اُن کے اطمینان کے لئے میں نے کہا۔

جاوید صاحب ٹھیک ساڑھے نو بجے کچہری جاتے ہیں اور ساڑھے تین بجے وہاں سے لوٹتے ہیں تو وہ وقت کے بڑے پابند ہیں۔ دیکھنے میں سنجیدہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سوچ میں اُلجھے ہوئے ہیں ایسے آدمی سے گفتگو کرنے کا ایک الگ مزہ ہے۔ یہ کبھی کوئی بے تعلق بات زبان پر نہیں لاتے اور ہر بات بڑی جچی تلی کہتے ہیں ان کی روشن آنکھوں اور چہرے کو دیکھ کر عبادت گاہ جیسا سکون ملتا ہے۔ جاوید صاحب مجھے بے حد اچھے لگے۔

میرا داماد اُن سے قدرے مختلف قسم کا آدمی ہے۔ اس کی عمر کم ہے اور آمدنی زیادہ۔ اس وجہ سے اس کی فطرت میں استقرار نہیں ہے اور یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ اُس کے نئی نئی موٹریں خریدنے اور بیچنے کے شوق کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے گویا اُس پر اُسی کا بھوت سوار ہے۔ بہرحال اس تعلق سے مجھے کوئی شکایت نہیں کیونکہ میری لڑکی اپنے گھر بڑی سکھی ہے۔ اس کے علاوہ جج صاحب سے بھی اُس کے تعلقات بڑے خوش گوار ہیں۔ اُن کا تعلق بھائی بھائی جیسا نہ ہو کر باپ بیٹے جیسا معلوم ہوتا ہے۔

میں اتوار کے دن سویرے ہی وہاں کے کئی لوگوں سے ملنے کی غرض سے نکل پڑا۔ آج کچہری بند تھی۔ اس لئے میں جج صاحب کی گاڑی میں چلا گیا۔ گیارہ بجے کے قریب میں اُدھر سے لوٹا۔

دروازے پر ہی چپراسی نے مجھے سلام کیا۔ وہ گزشتہ کئی سے مجھے دیکھ رہا تھا اور اب وہ مجھے پہچاننے لگا تھا۔

"کیا حاکم صاحب ہیں؟"

"جی حضور ہیں۔"

"کیا کر رہے ہیں؟"

"گاڑی صاف کر رہے ہیں۔"

میں حیرت زدہ اس کی طرف دیکھنے لگا کیونکہ اُن کی گاڑی تو میں گیا تھا۔ بھلا وہ کس گاڑی کو صاف کر رہے ہیں۔ اتنے نوکر چاکر چپراسی ڈرائیوروں کے ہوتے ہوئے خود گاڑی صاف کرنے کی کیا ضرورت جاوید صاحب بھی عجیب آدمی ہیں!۔

کہاں ہیں حاکم صاحب؟"

"حضور اندر ہیں۔ آئیے میں اُن سے ملاقات کرا دوں۔"

"اچھا آپ آگئے؟ چلئے چلئے۔ یہاں بہت زیادہ گرد و غبار۔ آپ پریشان ہوئے کو یہاں کیوں چلے آئے؟"

"لیکن آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ یعنی یہ کام تو نوکر چاکر بھی ہیں۔"

گرد سے اَٹا ہوا ایک پھٹا کپڑا لے کر جج صاحب وہاں سے نکلے اور زور سے ہنستے ہوئے بولے "یہ سب تو دوسری گاڑیوں کو صاف کرتے ہی ہیں۔ لیکن چلئے خیر! میں غسل کر لوں۔ آپ تشریف رکھئے۔ اچھا نہیں تو بھی غسل کر لیجئے۔"

جج صاحب کی باتیں آج کچھ عجیب عجیب سی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ اس لمحہ میں ملاقات کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ گھریلو کام میں مشغول اُن سے مل کر شاید میں نے اچھا نہیں کیا۔

اپنی اس غلطی پر مجھے افسوس ہوا۔ غسل خانے میں پانی دینے والے نوکر سے میں نے پوچھا۔

"تمہارے حاکم کس گاڑی کو صاف کر رہے تھے۔ مجھے تو وہاں کوئی گاڑی نظر نہیں آئی۔"

"جی سرکار۔ گاڑی معنی موٹر گاڑی نہیں ہے۔ حضور۔ وہ تو تین پہیوں کی
ی ہے۔ اُسے عالم خود ہی صاف کرتے ہیں کسی دوسرے کو صاف کرنے
ں دیتے۔"

نوکر سے زیادہ بات کرنا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ اس لئے میں نے
ل خانے کا دروازہ بند کر دیا اور اندر چلا گیا۔

سبھی بڑے لوگوں میں کچھ نہ کچھ قباحت ضرور ہوتی ہے۔ کئی بڑے آدمی
یاتی کمزوری کا شکار ہوتے ہیں مگر جاوید کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ
کمزوری میں مبتلا نہیں ہیں۔ بیمن میں پڑ سا گیا۔

میں ذاتی طور پر اس معاملے کو چھیڑ کر انہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا
ہماری زندگی میں کتنی ہی ایسی باتیں ہیں جنہیں اپنا کر ہم خوش ہوتے ہیں،
چھوڑ کر رنجیدہ ہوتے ہیں، اُنہیں کے سہارے ہم زندہ رہتے ہیں۔

ہم دونوں گاڑی خریدنے چلے گئے۔ اٹھارہ ہزار میں ہم نے ایک
خریدی۔ جاوید صاحب نے اس گاڑی سے متعلق کوئی ذاتی رائے نہیں
بلکہ گاڑی کو دیکھ انہوں نے بس اتنا ہی کہا "یہ بڑی خوبصورت گاڑی ہے۔
ے ( Gray ) رنگ مجھے خاص طور پر پسند ہے۔"

میرے گاڑی خرید چکنے کے بعد اُن کے روزمرہ کے معمول میں ایک
سی رونما ہوئی۔ شام کے وقت ہم لوگ کافی دور نکل جاتے اور میں
مرپافات اور مقدموں وغیرہ کے جھمیلوں سے چھٹکارا پاکر کچھ اطمینان و
ن محسوس کرتا۔ اِدھر جج صاحب نے بھی اس معمولی ردّوبدل کو قبول
تھا۔

اُس دن ہم لوگ کافی دُور دُور تک اور دیر تک گھومتے رہے۔ ڈرائیور
ی خوشی سے جدھر جی چاہا، لئے پھرا۔ ہم نے گھومتے پھرتے ایک خوبصورت
زار دی۔ مجھے کل یہاں سے گھر کے لئے روانہ ہونا تھا۔ مقدمہ کے سلسلے
ج صاحب نے مجھے مایوس نہ کیا تھا لیکن انہوں نے مجھ سے یہ بھی
ایسے مقدمے کو کچہری میں نہ لے جاکر آپس میں فیصلہ کر لینا ہی بہتر ہے۔
یسا لگا گویا وہ ہمیشہ عدالت میں اس قسم کے مقدموں کو سنتے سنتے اُوب
ئے ہیں۔ اس لئے اس کا فیصلہ میں نے اپنے اوپر لیا اور اس مشورے کے
یں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔

بیساکھ کا مہینہ تھا اور اُس کی آخری راتوں میں سے ایک رات تھی۔
گرمی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ کھانا کھا کر ہم دونوں لان میں آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ مدھم
چاندنی تھی۔ گھاس کے نئے اور ملائم پودے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ ہوا
دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ ملائم گھاس کی مہک کے ساتھ ہی کہیں دور
سے بیلے کی تیز خوشبو آ رہی تھی۔ بغل کی پھلواری سے بھی بھینی بھینی خوشبو
آ رہی تھی۔

"میں نے گزشتہ سال بھی ایک موٹر خریدی تھی اور اس برس بھی ایک
موٹر خرید چکا ہوں"۔ خاموشی کو توڑتے ہوئے میں نے کہا "ایک اچھی گاڑی ہونی
ضروری ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

جاوید صاحب شاید کچھ اور سوچ رہے تھے۔ وہ ذرا ہچکچاتے ہوئے
بولے "ہاں گاڑی! کیوں نہیں؟ ہاں! ..... لیکن کبھی کبھی کوئی گاڑی
کسی آدمی سے بھی زیادہ مددگار ثابت ہوتی ہے۔"

جج صاحب اس قسم کی بات کہیں گے مجھے اس کی توقع نہیں تھی میں
خاموش ہو گیا۔

وہ شاید کچھ متغیر ہو چکے تھے میں نے اُن کی طرف سگریٹ بڑھا دیا۔
اور سگریٹ سُلگا کر وہ کش لینے لگے۔ اُن کی نظروں اور چہرے کو دیکھ مجھے یوں
محسوس ہوا گویا وہ کسی خاص واقعہ پر غور کر رہے ہیں۔ اب بات چیت کرنے
کے لئے ہمارے پاس کوئی موضوع نہیں تھا۔

گھر میں ایک دم سناٹا تھا۔ پیچھے کی طرف باورچی خانہ سے وقفے
وقفے سے برتن بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید کوئی پلیٹ وغیرہ دھو رہا تھا۔ تبھی
جج صاحب نے آہستہ سے کہنا شروع کیا "آپ نے گاڑی کی بات کہی تھی۔
بھئی! کبھی کبھی کوئی غیر جاندار گاڑی ایک جاندار آدمی سے بھی زیادہ کام
کی ہوتی ہے۔"

ایک ہی بات کو اُن کی زبان سے دوبارہ سُنکر مجھے خیال ہوا
کہ وہ کسی خاص واقعے کے تعلق ہی سے ایسا کہہ رہے ہیں۔ لیکن وہ کیا کہنا
چاہتے ہیں اور میں وہ بات اُن سے کیسے پوچھوں۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا
تھا۔ پھر بھی میں نے کہا۔ جناب آپ لوگوں کا طرح طرح کے آدمیوں سے
پالا پڑتا رہتا ہے۔ آپ کے علم میں بہت سے دلچسپ واقعات ہوں گے"
گویا انہیں کچھ کہنے کا ایک بہانہ مل گیا۔ جاوید صاحب نے آہستہ
آہستہ کہنا شروع کیا۔ "عدالت میں جو واقعہ پیش کیا جاتا ہے وہ انوکھا ہو سکتا

ہے۔ مگر سچا نہیں ہو سکتا۔ مقدمے میں کامیابی کے لئے دونوں فریقین اصل واقعہ کو لاگ لپیٹ سے پیش کرتے اور قانون کی نظر میں اُسے سچا ثابت کرنے کا جتن کرتے ہیں۔ اس طرح مقدمے کی کہانی وکیلوں کی اُپج ہو جاتی ہے جس کا اصل واقعہ سے قطعی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

"بھئی۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقت اور سچائی سے کہیں زیادہ طاقت وکیل کی زبان میں ہوتی ہے۔ پھر بھی آپ کچھ خاص اور دلچسپ واقعات جانتے ہیں۔ کہئے۔ یہ بات ہے کہ نہیں؟"

"سبھی واقعے عجیب نہیں ہوتے لیکن عدالت کے باہر بھی کچھ ایسے واقعات رُونما ہوتے ہیں جو سچ مچ عجیب ہوتے ہیں جنہیں سُن کر یقین نہیں آتا۔ کہیں آپ کو نیند تو نہیں آ رہی ہے؟"

"جی نہیں۔ بالکل نہیں۔ پھُول کی کیسی اچھی خوشبو آ رہی ہے؟"

انہوں نے میرے سوال کا جواب نہ دیتے ہوئے کہا۔ "ایک واقعہ بیان کرتا ہوں سُنئے۔"

"خوب۔ ضرور۔" میں نے کہا۔

انہوں نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "یہ بھی زمین جائداد ہی کی کہانی ہے۔ تین بھائی تھے۔ بڑا بھائی ایک دم سیدھا تھا۔ جب تک اُن کے والد زندہ تھے، یہ تینوں مِل جُل کر رہتے تھے لیکن باپ کے مرتے ہی یہ لوگ آپس میں جھگڑنے لگے۔ تینوں کی شادی ہو چکی تھی۔ بڑے بھائی کے تین لڑکے تھے اور کوئی لڑکی نہیں تھی۔ چھوٹے دونوں بھائیوں کے بھی لڑکے لڑکیاں تھیں۔

وہ گویا آنکھوں دیکھا واقعہ بیان کر رہے تھے۔ میں چپ چاپ سُنتا رہا۔

"آخر میں جائداد کا بٹوارہ ہو گیا۔ نقد کچھ نہیں تھا صرف چار بیگھہ زمین تھی۔ تینوں نے اُسے آپس میں بانٹ لیا۔ اس تھوڑی سی زمین میں بڑے بھائی کی گزر نہیں ہوتی تھی کیونکہ وہ سب مِل جُل کر پانچ آدمی تھے کھانے پینے کی بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ اس لئے اُس نے اپنے منجھلے بھائی کے ہاتھوں اپنی زمین بیچ ڈالی۔ اُنہیں دنوں اُس کی بیوی انتقال کر گئی۔ یہیں سے اس کی زندگی کی دُکھ بھری داستان کا آغاز ہوا۔"

جاوید تھوڑی دیر چُپ رہے۔ ایک سگریٹ سُلگایا۔ میں بھی سگریٹ سُلگانے لگا۔ میرا خیال تھا کہ جاوید صاحب کوئی خاصی دلچسپ کہانی سُنائیں گے۔ اس معمولی کہانی کے آغاز پر قدرے مایوسی ہوئی پھر انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"منجھلے بھائی نے زمین خریدی تھی مگر اُس نے زمین کی قیمت نہیں دی۔ دھیرے دھیرے وہ قیمت ادا کرے گا، یہ طے ہوا تھا۔ اُس سیدھے سادے بھائی کو اس پر پورا یقین تھا اور اسی وجہ سے اُس نے کچہری میں جا کر مجھے سارے رقم مِل گئی۔ اس قسم کی ایک دستاویز لکھ دی۔ لیکن منجھلے بھائی نے بعد میں رقم دینے سے انکار کر دیا۔ بڑا بھائی بڑی مصیبت میں پھنس گیا۔ کچھ لوگوں نے اُسے مشورہ دیا کہ تم اس پر مقدمہ کرو۔ لیکن وہ اُس کے لئے راضی نہ کیونکہ اُسے کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔"

مجھے اس انجانے آدمی پر ترس آ گیا۔ "کیا کہا جائے ایسے ایماندار لوگوں کے ساتھ دھوکا کیا جاتا ہے۔"

"آپ اُس پر ترس کھا رہے ہیں لیکن اس گاؤں کے کسی آدمی نے اس سیدھے سادے آدمی پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ آخر میں وہ اپنی مری ہوئی بیوی کی آخری نشانی سونے کا ایک جوڑا بالا صرف پچاسی روپے میں اپنے چھوٹے بھائی کے ہاتھوں بیچ کر اپنے تینوں بچوں کو ساتھ کر گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔

"ہمارا سماج بڑا خود غرض ہے۔" میں نے یونہی کہا۔

"خود غرض ہے۔ لیکن سبھی لوگ ایسے نہیں ہوتے۔ سماج کا ایک طبقہ اگر خود غرض ہے تو دوسرا طبقہ رحمدل ہے۔ ورنہ اس قسم کے سیدھے سادے لوگ اس دنیا میں کیسے زندہ رہ سکتے ہیں؟"

"اس کے بعد پھر کیا ہوا؟"

"ہاں۔ کہتا ہوں۔ سنئے۔ وہ قسمت کا مارا اپنے نامعلوم مستقبل کو لے کر شہر چلا آیا۔ اس کے ساتھ تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ اُن کی کل پونجی ایک سو روپے تھی۔ بچوں کو دنیا کی کچھ سُدھ بُدھ نہ تھی تاہم شہر میں داخل ہوتے ہی اُن کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔"

"اچھا ہوا۔ ورنہ یہ قسمت کے مارے کہاں جاتے کیا کرتے؟"

"اُس شہر میں ادھیڑ عمر کی ایک عورت رہتی تھی۔ رات بھر کے لئے اُن بچوں کو لے کر وہ اسی کے یہاں ٹھہر گیا۔"

"ہاں بھئی۔ شہر میں کسی انجان آدمی کو کون جگہ دے گا۔"

چاند کچھ ڈھل گیا تھا۔ کچی گھاس کی مہک اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ ہاب باورچی نے برتن صاف کرنے کی آوازیں بھی آنا بند ہو گئی تھیں۔ جج صاحب اپنی کو جاری رکھے ہوئے تھے۔

وہ بوڑھی عورت مسالہ کوٹ کر بازار میں بیچا کرتی تھی۔ دوپہر رات تک وہ پرانی اوکھل میں ہلدی، سیاہ مرچ، دھنیا وغیرہ کوٹتی اسے چھانتی اور الگ رکھتی جاتی۔ دوسرے دن سر پر رکھ کر وہ بیچنے جاتی۔ وہ اُسے ہوٹل یا جہاں کہیں موقع ملتا بیچتی پھرتی۔ منافع تو بہت کم ہوتا تھا لیکن وہ اس کی ضروریات پوری کرتی تھی۔ بوڑھی کو اُن کی حالت پر رحم آگیا اور اُس نے اپنے یہاں ٹھہرالیا۔ صرف اسی رات کے لئے نہیں بلکہ پورے گیارہ سال تک۔"

"گیارہ سال کے لئے؟" اُن کی باتوں میں اب میری دلچسپی بڑھنے لگی۔

"بچوں کو لے کر وہ کہاں جائے گا؟" بوڑھی کے کہنے پر وہ چاروں وہیں رہنے لگے۔ اب یہ ایک نیا خاندان بن گیا۔ بچے اور باپ مسالہ پیس بوڑھی کا ہاتھ بٹانے لگے۔ لیکن بوڑھی بچوں سے یہ کام لینا نہیں چاہتی تھی اس نے ان تینوں بچوں کو ٹاؤن کے ایل بی اسکول میں داخل کرا دیا۔"

مجھے نیند کا غلبہ معلوم ہوا مگر میں خاموشی کے ساتھ اُن کی باتیں سنتا رہا کہ وہ ایک عجیب لہجے میں یہ سب کچھ بیان کر رہے تھے۔

وہ دونوں مسالہ کوٹتے تھے لیکن اب بیچاری بوڑھی مسالہ بیچنے کو جایا کرتی تھی۔ وہ اُن لوگوں کے لئے کھانا بنانے کے کام میں جٹی رہتی تھی۔ اب وہ خود اپنے سر پر مسالہ کا بکس رکھ کر بازار میں جانے لگا۔ یہ مرد کی بھی اچھی ہوتی تھی۔"

وہ تھوڑی دیر خاموش ہو گئے اور ایک سگریٹ سلگا کر پینے لگے۔

"ہاں لڑکے پڑھنے میں خوب تیز نکلے۔ یہ گاؤں کے لڑکے تھے۔ شہر کے ماحول میں پروان چڑھنے لگے۔ بڑے لڑکے کو وظیفہ بھی ملا۔"

جاوید اٹھ کھڑے ہوئے اور ٹہلنے لگے۔ مجھے محسوس ہوا۔ وہ کچھ منتظر ہیں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"لیکن ہوا کیا؟"

"اچانک بوڑھی ایک دن بستر پر پڑ گئی۔ اُس کے سینہ میں بڑے زور کا درد اٹھا تھا اور دوسرے دن وہ مر گئی۔"

جاوید صاحب خاموش ہو گئے۔ اُس انجان بوڑھی کی موت کا مجھے بھی افسوس ہوا۔

"بوڑھی کے پاس کچھ نہ تھا لیکن اُس جیسی رحمدل عورتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ وہ اُن بچوں کی جس طرح دیکھ بھال کرتی تھی کوئی ماں اس سے زیادہ نہیں کر سکتی۔ بوڑھی ایک پھوس کی جھونپڑی اور پرانی اوکھل چھوڑ گئی تھی۔ مرتے وقت اُس نے یہ نصیحت کی تھی کہ ان بچوں کو جیسے بن پڑے پڑھانا ضرور اور مسالے کا کاروبار مت چھوڑنا۔ یہ دھندہ ٹھیک ہی چل رہا ہے۔ مسالے کا بکس سر پر تب تک ڈھوتے رہو گے۔ ایک چھوٹی سی گاڑی خرید لو۔"

"دوپہر کے بعد بازار کے قریب، راستہ کے کنارے ایک تین پہیے کی مسالہ گاڑی ہمیشہ کھڑی رہتی۔ ہندو مسلمان سبھی وہاں سے مسالہ خریدتے۔ اس کا مسالہ بہت اچھا ہوتا تھا۔ اُس کے لڑکے، رات میں باپ کی مدد کرتے۔ اوکھل میں مسالہ کوٹتے چھانتے۔ ایک چھٹانک، آدھ پاؤ کے حساب سے پڑیاں باندھتے اور ساتھ ہی پڑھتے بھی۔"

وہ دوبارہ بیٹھ گئے۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ اب چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ رات کچھ زیادہ بیت گئی تھی۔ ایسے میں آدمی تھوڑا اکیلا جاتا ہے اس کا تامل ختم ہو جاتا ہے اور اپنی دکھ بھری داستان وہ بڑی آسانی سے کہہ دیتا ہے۔

دھیرے دھیرے جاوید کہے جا رہے تھے۔ "ان لوگوں کی بڑی مشکل سے گزر بسر ہوتی تھی۔ رات میں ایک وقت یہ لوگ بھر پیٹ کھاتے تھے۔ دن میں صرف ناشتہ کر کے ہی سبھی اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے تھے۔ تین تین بچوں کو پڑھانا لکھانا اور اُن کی دوسری ضرورتیں پوری کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ بڑا لڑکا کالج میں پڑھتا تھا۔"

"کالج میں پڑھتا تھا؟"

"سبھی لوگ تعجب کرتے تھے۔ لیکن بوڑھی کی بات کو یہ لوگ بھلا کیسے ٹھکراتے۔ مسالہ بیوپاری کا لڑکا کالج میں پڑھتا تھا، یہ بنی کی بات تھی۔ لیکن مسالہ بیوپاری کے لڑکے کو میٹرک میں وظیفہ ملا تھا، یہ بھی تو کوئی

کم ہنسی کی بات نہیں تھی۔"

"باپ اپنے متعلق کچھ نہیں سوچتا تھا۔ اس کا ایک لڑکا کالج میں پڑھتا تھا لیکن اس کے لئے وہ کسی کے سامنے فخر بھی نہ کرتا تھا۔ کالج میں پڑھنے والے لڑکے کا باپ ہو کر وہ مسالے کا بیوپار کرتا ہے اس کے لئے وہ کسی کے سامنے شرم بھی نہیں کرتا تھا۔ یہ زندگی تو اس کی اپنی زندگی نہیں ہے۔ وہ تو انہیں کے لئے زندہ تھا۔ ورنہ اس کے پاس اور کیا رکھا تھا۔ لڑکے سال بہ سال امتحان دیتے۔ امتیازی نمبروں کے ساتھ کامیاب ہوتے۔ یہ سُن کر اس کا دل خوش ہوتا۔ اس سے اس کے بازو میں اور زیادہ مسالہ کوٹنے کی طاقت آتی۔ اس کے بیچے مسالہ کی فروخت سے ملے پیسوں یا وظیفوں کے پیسوں سے کپڑا لتہ خریدتے اور باپ کو بھی ایک کرتا بنوا دیتے۔ خوشی سے باپ کا چہرہ کھل جاتا تھا۔

"یہ میرے لئے کیوں لاتے ہو؟" یہ کہتے ہوئے وہ اپنے خوشی کے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے منہ دوسری طرف پھیر لیتا۔ اس کے سر کے بال دھیرے دھیرے سفید ہوتے جا رہے تھے۔ اس کے دانت بھی ٹوٹ گئے تھے۔ اس لئے جب وہ بات کرتا تو اس کے گال قدرے اندر کو پچک جاتے، بینائی بھی کچھ کمزور ہو گئی تھی۔ لیکن بازوؤں کی قوت میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی تھی۔ تین پہیئے کی گاڑی کو ٹھیلتے ہوئے وہ روز مسالہ بیچنے جاتا۔ دھوپ بارش، سردی، گرمی کسی کی بھی اُسے پروا نہ تھی۔ چٹ پٹا کھانے والوں کا بغیر مسالہ کے کام نہیں چلتا۔

میں جج اور منصف لوگوں کو بڑا ہی نیرس اور سب سے الگ قسم کا آدمی سمجھتا تھا لیکن جاوید صاحب تو اس معاملے میں کافی ترقی پسند معلوم ہوتے تھے۔ وہ رحمدل تھے۔ بہتری حاکموں کے رحمدل ہوتے ہی ہیں۔

کچھ لمحوں تک انہیں خاموش دیکھ کر میں سمجھا شاید کہانی ختم ہو چکی۔ ایک جج کو بھلا یہ کہانی کیسے معلوم ہوئی۔ میں اسی ادھیڑبن میں تھا کیسا مقدمہ تھا کس نے کس پر کیا تھا؟ وہ شاید بوڑھی کا کوئی وارث ہوگا؟ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس بات کو لے کر جج صاحب کے پاس کورٹ میں گئے ہوں گے۔

میں اُن سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ انہوں نے کہا "ماں سے بچھڑنے کی بہت سی کہانیاں سننے کو ملتی ہیں، لیکن کوئی باپ اپنی اولاد کے لئے اتنی قربانیاں کر جاتا ہے کہ اُن کے خیال ہی سے حیرت ہونے لگتی ہے۔ ماں کی قربانی اُس کی ممتا کی وجہ سے یاد آتی ہے، اور باپ کی قربانی فرض کی ادائیگی کی وجہ سے یاد آتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

ایسی باتوں پر غور کرنے کا مجھے کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ آج جاوید صاحب کی زبانی اس قسم کی باتیں مجھے بھلی معلوم ہو رہی تھیں کیسی ایک معمولی واقعے سے یہ لوگ کیسی کیسی غیر معمولی حقیقت کا انکشاف کر لیتے ہیں۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے کہا۔ "یہ معمولی آدمی بھی کبھی کبھی اپنے بچوں کے لئے بہت بڑی قربانیاں کر جاتے ہیں۔" شاید اس بات سے انہیں کچھ رنج ہوا۔

"آپ معمولی آدمی کہتے ہیں۔؟ نہیں نہیں۔ یہ لوگ معمولی آدمی نہیں ہوتے۔ ایک معمولی آدمی ایک لاکھ روپیہ دے سکتا ہے، ایک سو بیگھہ زمین دے سکتا ہے، ایک عالیشان کوٹھی دے سکتا ہے لیکن یہ غیر معمولی مسالے بیوپاری جیسے لوگ آپ جانتے ہیں، کیا کرتے ہیں؟ اپنے بچوں کی زندگی بنانے کے لئے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ وقف کر دیتے ہیں۔ جسم کا رواں رواں قربان کر دیتے ہیں۔ ساری خواہشیں، ساری خوشیاں ایک ایک کر کے تیاگ دیتے ہیں، درویشانہ زندگی گزارتے ہیں۔ کوئی بھی معمولی اس طرح مجاہدانہ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ کام تو یہی غیر معمولی کر دکھاتے ہیں۔ جو مسالہ کا بیوپار کرتے ہیں۔"

یہ سب کچھ وہ درد آمیز لہجے میں کہہ رہے تھے۔

جج صاحب کی باتوں کو شاید میں ٹھیک سے سمجھ نہیں سکا۔ مسالہ بیوپاری کی قربانی غیر معمولی اور لاکھوں کی قربانی کرنے والے کی قربانی معمولی ہوتی ہے۔ یہ تو عجیب بات ہے۔

تھوڑی دیر چپ رہ کر انہوں نے کہا "قربانی کے لئے ہی یہ پیدا ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی زندگی میں آرام و خوشی کا کوئی مقام نہیں شاید اوب سے گئے ہیں بھی ہم لوگ ایسی کہانیوں کو سننا پسند نہیں۔"

"نہیں نہیں۔ آپ ایسا مت سمجھئے۔ فرمائیے اس کے بعد کیا ہوا لڑکوں کا کیا ہوا؟"

"اچھی بات ہے سنئے۔ بڑے لڑکے نے فلاسفی میں آنرز کے بی اے پاس کیا۔"

"بی اے پاس کیا۔؟"

"ہاں اس نے بی اے پاس کیا۔ مگر وہ اپنے باپ کو مسالہ کے سے چھٹکارا نہ دلا سکا۔ تین پہیئے والی ٹھیلہ گاڑی سے جدا نہ کر سکا۔ کیونکہ بی اے کرنے ہی سے تو سب کچھ نہیں ہو جاتا۔ کوئی نوکری بھی تو ہونی چاہیئے ابھی اس کے دو بھائی زیر تعلیم تھے۔ اُن کا کیا ہوگا۔؟"

یہ کہتے ہوئے جاوید صاحب کا جی بھر آیا۔ وہ بڑے جذباتی انداز کہے جا رہے تھے۔ جیسے ساری باتیں دل کی گہرائی سے نکل رہی تھیں میں کہا۔ "خیر یہی کیا کم ہے، بی اے پاس کر لیا۔"

"تقریباً چھ ماہ کے بعد رات کو جب وہ لوٹ کر آیا تو اُس نے کہا رے سارے بدن میں درد ہے۔ اگر ہو سکے تو تم لوگ مسالہ کوٹو۔ میں سوؤں۔ رات کو اُس نے کچھ نہ کھایا۔ بخار اور درد بڑھتا ہی گیا۔ ساری ی محنت کرنے کی وجہ سے شاید اس کا خون پسینہ ہو کر بہہ گیا تھا اس کی ی روشنی غائب ہو گئی اور چہرہ مرجھا گیا تھا لڑکوں نے اس کے علاج کا م کیا مگر اس کا نڈھال اور محنت سے چور بدن علاج کا متحمل نہ ہوا اور ہیں ہی وہ ۔ ۔ ۔ ۔"

اب جاوید صاحب بھی عجیب عالم اضطراب میں تھے۔ وہ اُٹھ کھڑے ے۔ انہوں نے ایک دم دھیرے سے کہا۔

"آیئے — اندر چلیں۔ رات کافی ہو گئی ہے۔"

ہم اندر داخل ہوئے انہوں نے لائٹ جلائی۔ میں نے ایک نظر انہیں مجھے یوں محسوس ہوا گویا میرے سامنے جاوید جج صاحب نہیں بلکہ کسی رے سرمایہ سے کوئی انجان بوڑھا آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ اُن کی آنکھیں ی ہوئی اور گال پچکے ہوئے تھے۔ شاید وہ کافی دیر تک روتے رہے تھے۔

"بڑے لڑکے کو ای اے سی (E.A.C.) کا کام مل گیا تھا۔ یداس نے سنی لیکن قوت گویائی اب اُس کے پاس نہیں تھی۔ یہ خبر سنکر آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔ گویا اس کو اپنی ساری زندگی کی ا پھل مل چکا تھا۔ اس کی پیشانی سے گرے ہوئے سارے پسینے کی وصول ہو گئی تھی۔"

میں متعجب ہو کر جاوید کی صورت دیکھنے لگا۔ کیا اب تک یہ اپنی کہانی سنتے رہے لیکن مجھے سوچنے کا زیادہ موقع نہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا اچھا میں کہانی ختم کر دوں۔"

"انہیں کسی دن گاڑی پر سوار ہونے کا موقع نہیں ملا۔ وہ زندگی بھر گاڑی ٹھیلتے رہے۔" ان کی آواز بھی رات جیسی ٹھنڈی اور بااثر معلوم ہو رہی تھی۔

تالا کھول کر وہ اندر داخل ہوئے۔ اور کمرے کی لائٹ جلائی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک وسیع میز پر تین پہیئے کی ایک ٹھیلہ گاڑی رکھی ہوئی ہے۔ کمرہ سسکیوں اور رونے کی آواز سے بھر گیا ہے۔

وہ گاڑی کے پاس گئے اور کہا۔ "یہی میرے بابا کی گاڑی ہے۔ بابا اور اس گاڑی نے ہی ہم تینوں بھائیوں کو زندگی عطا کی ہے۔ آدی بنایا ہے۔ آج بابا نہیں ہیں مگر گاڑی ہمارے پاس ہے۔ ان کی آواز گویا کسی پہاڑی غار سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

انہوں نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔ میں بابا کو نہیں بچا سکا۔ انہیں بچانے کا کوئی انتظام بھی نہ کر سکا لیکن اُن کی نشانی یہ تین پہیئے کی سائے والی گاڑی آج بھی ہمارے پاس ہے۔ اس کی قیمت ہم تینوں بھائی اپنی زندگی دے کر بھی ادا نہیں کر سکتے۔ آج ہمارے پاس قیمتی چار پہیئے کی موٹر ہے۔ لیکن اس تین پہیئے والی ٹھیلہ گاڑی نے ہم تینوں کے لئے جو کچھ کیا، وہ دُنیا بھر کی چار پہیئے والی موٹروں سے نہیں ہو سکتا، لہٰذا اس گاڑی کی میں خود ہی جھاڑ پونچھ کرتا ہوں کیونکہ اس میں بابا جان کا خون پسینہ لگا ہوا ہے۔ دوسرا آدمی اس کی قدر نہیں کر سکتا۔"

میں نے دوبارہ اس گاڑی کو دیکھا۔ پھر جاوید جج صاحب کو دیکھا۔ برقی روشنی میں میں نے دیکھا، اُن کی پلکوں پر آنسو جھلملا رہے تھے۔

وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح اس گاڑی کے ایک پہیئے کو تھامے رو رہے تھے۔

(ترجمہ احمد علی شاہ)


آئینہ غالب: ۲۲ مقالات: بڑا سائز۔
گنجینۂ غالب: ۱۴ مقالات۔ بڑا سائز۔ ٹائپ کی عمدہ چھپائی
صفحات ۱۸۶ قیمت ۴ روپے
پتہ:۔ بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

# J. B. MANGHARAM'S




# *Royal Cream*

## BISCUITS

*Foil wrapped for freshness & flavour*

**J. B. MANGHA RAM & CO. P. LTD.**
**GWALIOR (INDIA)**



# چاندنی

مہر مکھوپادھیائے

بہت دنوں سے اُسے شوق تھا کہ وہ ایک ہارمونیم خریدے ہارمونیم نہ ہونے سے گانا جمتا نہیں اور گانا نہ جمنے سے زیادہ آمدنی نہیں ہوتی۔ پھر جو سنتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ شبو کا گلا بڑا سُریلا ہے۔ اُسے روز صبح سے ت دس بجے تک ریل کے ڈبوں میں گھوم گھوم کر گیت سنانا پڑتا ہے اور ہر گیت کے بعد اُسے چاروں طرف سے پیسے پڑنے کی ٹن ٹن آواز سنائی ی ہے۔ اس آواز کو سُن کر وہ بتا سکتا ہے کہ کتنے پیسے پڑے۔ کس گاڑی ٹی ہوئی اور اسٹیشن پر کیسی بھیڑ ہے ؟

ہر صبح جیسے ماں پکارتی، آج بھی اس نے ویسے ہی پکارا "ارے تو اب مت سو . . . ." شبو اٹھا۔ ہاتھ منہ دھو کر ہاف شرٹ کے پھٹا سویٹر پہن لیا۔ ابھی تک تھوڑی تھوڑی سردی ہے۔ آج پھاگن کی یا ہے۔

" کیسی بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے" بین کا ڈبہ اور لاٹھی سنبھالتے ے شبو نے پوچھا

" دھوپ نکل آئی ماں ؟"

ماں کا روز کا وہی دُہرانا — "صاف ہو گیا۔" کیا صاف ہو گیا شبو سمجھ نہیں سکتا۔

چلتے چلتے لاٹھی ٹھک ٹھک ٹھکاتے ہوئے پہلے چاروں طرف ایک بار مُنہ گھمایا۔ چاروں طرف اندھیرا۔ صرف صبح کا ہنگامہ سن پایا۔ درختوں پر پرندوں کا شور و غل۔ محلے کی بہو بیٹیاں کنوئیں پر گھڑے لے کر چلی آ رہی ہیں۔

شبو کو یاد نہیں آ رہا کہ بچپن میں اس کی آنکھیں کبھی ٹھیک بھی تھیں کہ نہیں، ماں کہتی ہے" فالج گرا تھا۔ بکل کو پیراج کے علاج سے میرے بیٹے کی جان تو بچ گئی، مگر آنکھیں چلی گئیں جو میری قسمت۔" ماں ابھی تک افسوس کرتی ہے، ہائے ہائے کرتی ہے مگر شبو کو کوئی افسوس نہیں ہوتا۔ وہ تو اس اندھیرے میں ہی پڑا ہوا ہے۔ وہ تو انگلی سے چھو کر سب سمجھ سکتا ہے۔ آواز سُن کر سب کہہ سکتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن کے ساتھی اس کے سٹیک اشارے پر حیران رہ جاتے ہیں۔" نانگا مونگ پھلی کی پھیری لگاتا ہے" اور شبو کہتا ہے" ہری چرن کے پاؤں پکڑے ہوئے ہے یعنی بوٹ پالش کرتا ہے۔ بکھائی کب کیا کرتا ہے، وہی جانے۔ کبھی ایک ٹوکری چنا تو کبھی ٹوکری سنگترے لے کر گھومتا ہے اور شاید کچھ دن فلک چُپ کر چاول چینی کا کالا دھندا بھی کرتا رہا ہے۔" یہ سب شبو کے اسٹیشن کے ساتھی ہیں۔ نانگا کہتا ہے" تمہارا پیشہ اچھا ہے شبو۔ تمہارے جیسا گلا اگر میرا ہوتا تو چندہ چندہ گیت گاتا۔"

ٹک ٹک ٹھکاتے ہوئے شبو آدی ناتھ کی دکان کے سامنے آ پہونچا۔

آدی ناتھ کی چائے کی دکان ہے۔ بھگت آدمی ہے۔ روز باہر نکلتے وقت راستے میں شبو آدی ناتھ کو بھجن سنا جاتا ہے۔ بدلے میں شبو کو ایک پیالی چائے اور ایک بسکٹ مل جاتا ہے۔

بنچ پر بیٹھ کر شبو گانے لگا "بھج گورانگ، سب گورانگ، بھائی ہے گاتے گاتے اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے آہستہ سے کوئی اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا ہو۔ میٹھی میٹھی نسوانی بُو اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ بھجن ختم ہوتے ہی آواز آئی "اے شبو کیسے ہو۔۔۔۔" چھبی کی آواز ہے۔ آدی ناتھ کی بیٹی۔ بھجن سُن کر دوڑی آئی ہے۔

"کون؟ چھبی؟ تم کب آئیں؟" سر اٹھا کر شبو مسکرایا۔

"کل رات"

چھبی اپنی مرضی سے ماموں کے گھر گئی تھی اور قریب ایک ماہ کے بعد لوٹی تھی۔ اس نے پوچھا

"شبو دا میلہ دیکھنے نہیں جاؤ گے؟"

"شام تک جاؤں گا" شبو نے کہا۔

گھوش پاڑا کا چھاگن پورنیما کا میلہ اس طرف کا بڑا میلہ ہے۔

چھبی نے پھر کہا۔ "کسی نئی فلم کا گیت یاد کیا ہو تو سناؤ نا۔"

چھبی کی فرمائش سن کر آدی ناتھ نے پھٹکارا "بھاگتی ہے یا نہیں۔ صبح صبح فلمی گیت سننے چلی آئی۔"

"اہا! آپ بھی کیسی باتیں کہتے ہیں۔ جیسے فلم کے سبھی گیت خراب ہوتے ہیں۔ خود رام کے بھاننی کے گیت بھی تو فلم کے ہی ہیں۔" چائے اور بسکٹ شبو کو تھماتے ہوئے چھبی نے کہا۔

چائے کی چسکی لیتے ہوئے شبو سوچتا ہے چھبی کی آواز کیسی بدل گئی ہے۔ کتنی سُریلی، کتنی میٹھی میٹھی معلوم پڑتی ہے۔ نانی کی بیماری کی خبر پر ماموں کے گھر گئی تھی۔ ایک ماہ تک وہاں رہی۔ اس دوران اس میں کتنی تبدیلی آگئی ایک وقت ایسا آتا ہے جب عورت جھٹ بدل جاتی ہے۔ اچانک جوان ہو جاتی ہے۔

"تمہاری ماں کیسی ہے؟" چھبی نے پوچھا۔

"ٹھیک ہی ہے۔ ایک دن میرے گھر آنا" اتنا کہہ شبو اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔

سامنے راستے میں لڑکوں کا شور و غل ہے۔ عبیر کا تہوار شروع ہے۔

شبو کی عمر سترہ سال ہی ہے اور چھبی اس سے دو سال چھوٹی ہے۔ شبو چھبی کے بارے میں سوچتے سوچتے چلا جا رہا ہے۔ تبھی اُسے یاد آیا۔ تین سال ہوئے پتا کو مرے۔ پتا جی درزی تھے۔ ماں پر قرض بہت ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس نے پتا جی کی سلائی کی مشین بیچ دی تھی۔ ماں اب آلو بیچتی ہے اور شبو گھوم گھوم کر گیت گاتے ہوئے پیسہ کماتا ہے۔ ہارمونیم ہونے سے دھندا بڑھتا۔ مگر خریدنے کے لیے پیسے نہیں۔ پیسہ جمع بھی نہیں ہوتا۔ یہ سن کر کرتل گنڈھیشوری آپیرا کے مالک بھوپتی بابو ایک پرانا ہارمونیم بیچنے والے ہیں، شبو فوراً اُن سے ملا تھا۔

"تمہارا گلا بہت سُریلا ہے۔ گانا سیکھنا اچھا ہی ہوتا لیکن ایک بات یاد رکھو" اور ذرا سوچ کر پھر بولے "ہارمونیم تو ہے، پُرانا ہے، مگر چیز اچھی ہے ایک سو روپے سے کوئی بھی خرید لے گا۔ سوچ لو۔ ایک سو روپے۔"

کچھ دیر شبو سوچتا رہا پھر مریل سی آواز میں بولا "دوں گا بڑے بابو۔ لیکن ایک ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ ہر مہینے دس روپے دیکر حساب چکتا کروں گا۔ آج اتنے رکھئے۔" اور پانچ پانچ کے دو نوٹ شبو نے پیشگی کے طور پر دے دیئے تھے۔

"ارے بابا دس دس روپے کر کے دس مہینے میں پانے سے میرا کوئی کام نہیں آئیں گے۔"

بڑے بابو ہنسے تھے "مجھے ایک ساتھ چاہئیں۔"

"میں اندھا ہوں آپکے بیٹے کے برابر ہوں۔ مہربانی کیجئے۔" شبو ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

بھوپتی بابو تھوڑی دیر سوچتے رہے۔ پھر نرم ہو کر بولے "اچھا روپے رکھ رہا ہوں۔ اگر تم ایسے کہہ رہے ہو تو تین قسطوں میں ادا کر دینا۔ ابھی ہارمو میرے پاس رہے گا۔ تم کبھی کبھار آکر بجا لینا۔ اگر چاہو تو تم ہمارے بیٹے سے سیکھ بھی سکتے ہو۔ میں ماسٹر سے کہہ دوں گا۔ شبو کو جیسے سورگ مل ہو۔ ہارمونیم تو مل ہی گیا۔ ساتھ ساتھ بغیر پیسے کے تعلیم بھی ملے گی۔ حساب کر دیکھا کہ ہر مہینے دس دس کر کے بھی جمع کرے تو تین مہینوں میں ایک ہی قسط کی رقم ادا کر پائے گا مگر ہر مہینے دس روپے بچا پانا بھی تو آسان نہ تھا۔ اُسے کا اُسے پورا پورا احساس ہے۔ سارا دن گھومنے پر اس کی کمائی ڈھائی

روپے کے بیچ ہوتی ہے۔ دو روپے روز ماں کو دینے پڑتے ہیں۔ چار افراد کا پیٹ
مرا اُس پر اسی مہنگائی۔

کسی نے عبیر مل دیا۔ پھر ہنسی اور شور۔ منہ بچانے کے لئے شبو نے سر
کالیا۔ کسی نے کہا۔

"اس بیچارے کو چھوڑ دو۔ بیچارہ آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا۔" لڑکوں
گروہ شور و شغب کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اس کے بعد جتنی جلدی ہو سکا شبو اسٹیشن کے اندر گھس گیا۔ پلیٹ
رم پر جس طرف ہری چرن بیٹھا رہتا ہے، اُس طرف بڑھ کر پکارا "ہری ہے کیا"

"ہاں اس طرف آؤ۔ ارے یہ کیا؟ تمہارا سارا جسم رنگ سے بھر پور ہے۔
ن بیٹھی رنگ بتیں تو بالکل بہروپیا بنا دیا ہے۔"

"کیا کیا ہے؟"

تمہارے پورے جسم پر عبیر ہے۔ اور قمیض پر بیٹھی رنگ . . . "

"بیٹھی رنگ کیا ہوتا ہے؟" شبو نے پوچھا۔

"گاڑھا بینگنی رنگ جیسا۔ منہ دھو ڈالو۔"

ہری چرن کی بات سُن کر شبو چند لمحے خاموش رہا۔ گاڑھا بینگنی
ک کیا ہوتا ہے؟ کچھ بھی سمجھ نہیں پایا۔ وہ کئی طرح کے رنگوں کے نام سُن
ا ہے۔ لال، نیلا، ہرا، پیلا، کالا، بینگنی وغیرہ مگر یہ بیٹھی اور عبیر کیا ہے۔ وہ
بھی سمجھ نہ پایا۔ سب بے معنی۔ اندھیرا۔ سب رنگ مٹ جانے پر
یہ کالا ہی ہو جاتا ہے۔ اندھیرا۔ اندھیرا کیسا ہوتا ہے؟ جیسا اندھیرا اس
نظر کے سامنے ہے، ٹھیک ویسا ہی کیا؟

دھیرے دھیرے وہ آگے بڑھا۔ منہ دھونے کے لئے۔ لوٹ کر پوچھا
ہری میلے چلو گے؟"

"نہیں کہیں نہیں جانا ہے۔ طبیعت ٹھیک نہیں۔"

"تمہارے پاس میرے سولہ روپے ہیں۔ یہ دو روپے بھی جمع کر لو اور
ہ روپے ہونے پر ہارمونیم لے آؤں گا۔"

ہری چرن نے کہا "دیکھ رہا ہوں ہارمونیم کے بنا تمہیں نیند نہیں
ی ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو بھائی، رات کو سو نہیں پاتا۔"

بازار کی طرف ڈھولک کھڑتال کے ساتھ پھاگ گانے کی آواز

گونج اٹھی۔ شبو نے کان لگا کر سُنا اور بولا "میں اس کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

اُس وقت شام ہونے کو تھی۔ میلے کی بھیڑ کی ریل پیل کے بیچ جانے کی
ہمت نہیں ہوئی شبو کی۔ بس اسٹاپ سے کچھ آگے بڑھ کر راستے کے کنارے
پر کھڑا ہوا اس کے سامنے سے لوگ گزر رہے تھے۔ دھول کے غبار اُٹھ رہے تھے
سنو پاؤڈر اور عطر کی خوشبو بھی۔

کچھ دیر ستانے کے بعد شبو بھجن گانے لگا۔ بیچ بیچ دو گھنٹے دھوبا بو
کی منڈلی کے ساتھ ساتھ گھوم چکا تھا۔ اس لئے گلا بھر آیا تھا۔ آواز اب کھلنے
لگی ہے۔ بھجن سُن کر راہ چلتے لوگ اُسے گھیر کر کھڑے ہونے لگے۔ لوگوں کی بھیڑ
کا احساس اُسے خود بخود ہی ہو جاتا ہے۔ بھیڑ کی خوشبو سے وہ لوگوں کی قسم
کا اندازہ بھی لگا لیتا ہے اور اس کے مطابق گیت بھی گاتا ہے۔ ٹین کا ڈبہ
بجا کر اُس نے لگاتار دو گیت گائے۔ اس کے بعد جیسے ہی ڈبہ سامنے
رکھا ویسے ہی چن چن کرتے کتنے ہی پیسے آ پڑے۔ ٹھیک اس وقت
آواز آئی۔ "شبو دا او شبو دا۔"

"کون بھجی؟" شبو نے چمک کر منہ پھیرا "کب آئی؟"

"یہی تھوڑی دیر پہلے۔ تمہارا گیت سُن رہی تھی۔"

بھجی کے سامنے ڈبے سے پیسہ نکال کر گننے میں اُسے شرم محسوس
ہو رہی تھی اس لئے اُن کو مٹھی میں بھر کر اُس نے جیب میں ڈال لیا۔ پھر پوچھا
"تمہارے ساتھ اور کون آیا ہے؟"

"گھر کا کوئی نہیں صرف محلے کی لڑکیاں ہیں۔"

"وہ سب کہاں گئیں؟"

"آگے بڑھ گئی ہوں گی۔ میں تمہیں دیکھ کر رُک گئی۔ تم میلے کے اندر نہیں
جاؤ گے۔؟"

"بھیڑ بہت ہے۔"

"میں تمہیں لے چلوں گی۔ میرے ساتھ چلو اور جھٹ سے اس کا ایک ہاتھ
پکڑ کر اُس نے اُسے کھینچ لیا۔ شبو کا جسم کانپ اُٹھا۔"

بھیڑ کے بیچ آہستہ آہستہ دونوں ساتھ ساتھ بڑھتے جا رہے ہیں۔
بھجی شبو کے دائیں طرف ہے۔ اُس نے بائیں ہاتھ سے شبو کا دایاں بازو
کس کر پکڑ رکھا ہے۔ شبو کے دائیں ہاتھ میں لاٹھی ہے اور بائیں ہاتھ میں ٹین
کا ڈبہ۔ مگر لاٹھی ٹھک ٹھکاتے شبو سے بڑھا نہیں جا رہا تھا۔ اس لئے

اُس نے سب چھبی پر چھوڑ دیا ہے۔

بڑھتے بڑھتے شبو نے پوچھ لیا "خوب بھیڑ ہے نا؟"

"اوہ سچ مچ راستے کے دونوں کناروں پر دکانیں ہیں۔ اس طرف آم کے باغیچے میں بیشمار لوگ ہیں" خوشی سے چھبی ڈگمگا رہی ہے۔

چھبی کے بالوں میں ناریل کا تیل ہے اور جسم سے پاؤڈر کی خوشبو آرہی ہے۔ اس کی سوت کی ساڑھی کڑکڑ کر رہی ہے۔ وہ بھیڑ کے دھکے سے بار بار شبو کے جسم سے سمٹی جا رہی ہے۔ شبو کا پورا جسم کانپ رہا ہے۔ سانس رُک رہی ہے۔ اندر ہی اندر پسینے سے چور ہو رہا ہے چھبی خود بخود بولے جا رہی ہے "وہ نامعلوم کدھر چلی گئیں۔ اس بھیڑ میں کون کھو جنے جائے۔"

شبو نے پوچھا "اچھا اب کس طرف جا رہی ہو؟"

"پہلے اپنے لئے کچھ خریدوں گی۔ اس طرف دکان ہے۔ ماں نے ایک کنگھی خریدنے کو کہا ہے۔" کہتے کہتے چھبی کا منہ شبو کے منہ کے بہت قریب آگیا۔

"شاید الائچی چبا رہی ہو" شبو نے پوچھا۔

"الائچی نہیں میٹھا پان" ہنستے ہنستے چھبی نے کہا "کیسے سمجھے؟"

"خوشبو سے"

"واہ تمہاری ناک تو کمال ہی ہے۔ بس سے اترتے ہی ہری داس نے پان کھلایا تھا۔"

شبو صرف ہنس دیا تھا چھبی خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ ایکا ایک جیسے اس سے بہت بے تکلف ہو گئی ہو۔

بھیڑ میں بڑھتے بڑھتے پھیری والوں کی پکار کے بیچ ایک جانی پہچانی آواز سنائی پڑی۔ شبو سہم کر کھڑا ہو گیا۔

"آیئے آیئے گرم گرم پاپڑ۔۔۔۔ چلا گیا، چلا گیا۔۔۔"

لکھائی کی آواز۔ یہی ایک پیٹنٹ بول ہے اس کا خواہ جو کچھ بیچے ہمیشہ کہے گا۔

"چلا گیا چلا گیا" کیا گیا کہاں گیا، بھگوان جانے۔

شبو نے پکارا "ارے لکھائی"

"اے شبو بھائی آؤ ادھر آؤ" کہتے کہتے چھبی کو دیکھ کر لکھائی سہم گیا۔

"یہاں تم کیا کر رہے ہو؟" شبو اور چھبی لکھائی کی دوکان پر جا کھڑے ہوئے۔

"پاپڑ بیچ رہا ہوں آکر دیکھو" لکھائی کی آواز۔ کیسا خاموش طبع شریف آدمی ہو گیا ہے چھبی سے مخاطب ہو کر اپنے پن سے کہا "آپ بھی لیجئے۔"

"نہیں نہیں، میں نہیں کھاتی" چھبی نے کہا "شبو دا کو دے دو، میرے منہ میں پان ہے۔"

"شبو دا تم ذرا یہاں ٹھہرو، میں سودا خرید کر لوٹتی ہوں۔"

شبو کے ہاتھ میں ایک پاپڑ دے کر لکھائی نے پوچھا "اس پنچھی کو کہاں پایا؟"

شبو شرما گیا۔ لکھائی بڑا منہ پھٹ ہے۔ بات بات میں مذاق بیٹھتا ہے۔ دبی آواز میں شبو نے ڈانٹا۔ "بے کار کی باتیں بند کرو۔"

"وہ کتنی حسین ہے۔ اس کی خوبصورتی کی تعریف کر رہا ہوں۔"

"حسین" شبو نے دبی آواز میں پوچھا۔

"ہاں بہت خوبصورت۔ ہرے رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے ہے، کھانے سے ہونٹ لال ہو گئے ہیں۔ اُسے دیکھتے ہی مجھے طوطا یاد آجاتا ہے۔"

"اس کے جسم کا رنگ کیسا ہے؟" شبو نے پوچھا

"سانولا۔ خوب پاؤڈر مل رکھا ہے۔ کافی گوری نظر آرہی ہے۔"

"آنکھیں کیسی ہیں؟"

"سُرمہ کاجل لگائے ہے۔ وہ آرہی ہے۔۔۔"

"چلو شبو دا۔ وہاں کوئی اچھی چیز نہیں ملی چھبی نے پھر شبو کا ہاتھ کئی دکانوں کے چکر لگا کر چھبی نے طرح طرح کے فینسی سامان خریدے۔ بہت خوش ہے تھوڑی سستی قیمت میں ہی بہت اچھی بالیاں خرید لی ہیں چھبی کیسی اچھی ہیں یہ بالیاں۔ سونے کی چمک بجلی کی کوند۔۔۔۔"

"کہاں دیکھوں؟" چھبی کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایکا ایک اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا شبو نے۔

"تم کچھ نہیں دیکھ سکو گے۔ نہ چمک نہ خوبصورتی۔ یہ رہی بالیاں۔ میرا مت بند کرو۔"

چھبی کی آواز میں مذاق یا طنز رتی بھر نہ تھا۔ بلکہ کہتے کہتے اس کا رندھ گیا تھا۔

شبو نے کہا "میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں تم یقین کرو۔ تم ہر

ساڑھی پہنے ہوئے ہو۔ ماتھے پر لال بندی، آنکھوں میں کاجل اور منہ میں پان
ہے۔"

"اوہاں چھبی حیران رہ گئی۔ "کیسے دیکھ پائے؟"

"تم خوب سُندر لگ رہی ہو"

"اُجڈ کہیں کا، بھاگ"

"سچ کہہ رہا ہوں۔"

"لیکن تم کیسے سمجھے؟ دیکھ تو پاتے نہیں؟"

"میں من کے اندر دیکھ پاتا ہوں انگلیوں سے چھو لینے سے میں سب کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ یہ دیکھو" شبو نے پھر چھبی کے چہرے پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔

کئی لمحے سانس روکے کھڑ پتلی کی طرح چھبی کھڑی رہی۔ پھر فوراً اس نے شبو کا ہاتھ ہٹا دیا۔

"چھی چھی تم پاگل ہو گیا؟ چاروں طرف لوگ بھرے کھڑے ہیں۔

شبو جیسے یکایک ہوش میں آگیا ہو۔ سچ مچ ہزاروں لوگ.... ہزاروں آنکھیں۔ جیسے سب چھبی کو نہار رہے ہوں۔ صرف وہ ہی کچھ نہیں دیکھ رہا۔ اس کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

چھبی نے اچانک پوچھا۔ اتنا سوچ کیا رہے ہو؟ کہیں ناراض تو نہیں ہو گئے؟ آؤ چلو ادھر چلیں۔ وہاں جھولا ہے۔ ہم بھی جھولے پر چڑھیں گے"

شبو اور چھبی پاس پاس ہی جھولے پر بیٹھے۔ اس کے بعد بیل گاڑی کے پہیے کی طرح کیں کیں کر جھولا جلدی جلدی اوپر نیچے چکر کاٹنے لگا چھبی خوب ہنسنے لگی۔ ایک بار جب جھولا نیچے آنے لگا، تو چھبی نے اچانک شبو کو آواز دی "او شبو دا لگ رہا ہے۔ کہیں گر نہ جاؤں۔"

چھبی کے بالوں اور اس کے جسم کی خوشبو اور اس کے نرم و نازک جسم کے ن نے شبو کو مست بنا دیا۔ اس کا سر جھنجھنانے لگا۔ چھبی کی پیٹھ پر بایاں ہاتھ لے کر بولا "ڈر کاہے کا۔"

"چار پانچ چکروں کے بعد ہی چھبی چلا اٹھی" میرا سر چکرانے لگا ہے۔ شبو واتے آرہی ہے۔"

"ارے روکو روکو۔" شبو کی چیخ و پکار سن کر لوگ گھبرا گئے۔ جھولا رک گیا۔

چھبی کو تے آنے لگی۔ شبو کے کپڑے قے سے لت پت ہو گئے کسی نے پانی لا کر دیا چھبی نے اچھی طرح ہاتھ منہ دھویا۔ تھوڑی دیر بعد چھبی شبو کا ہاتھ پکڑ کر بولی "اب چلو — لوگ ہمیں کیسی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔"

آم کے باغیچے کے بیچ سے نکلتے نکلتے شبو نے چھبی سے پوچھا "اب کیسا لگ رہا ہے چھبی؟"

"ٹھیک ہے" چھبی نے جواب دیا "ارے میرا بیگ کہاں گیا؟"

شبو چونک اٹھا "کہاں چھوڑ آئی ہو؟"

"کہاں چھوٹ گیا پتہ نہیں" بھرے گلے سے چھبی نے کہا "اوہ کتنا بڑھیا تھا۔" اس کے اندر اور بھی کئی چھوٹی موٹی چیزیں تھیں۔

بے چین ہو شبو نے کہا "اب وہ نہیں ملے گا کہاں جا کر ڈھونڈو گی"

چھبی نے اور نزدیک آکر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بولا۔

"رو مت چھبی۔ میں اس سے بھی اچھا بیگ خرید دوں گا۔ اسٹیشن پر میرے ساتھی ہری کے پاس میرے روپے ہیں۔ اسٹیشن کے پاس ہی نگین بابو کی منیاری کی دکان ہے۔"

چھبی کو تسلی دیتے دیتے شبو کی سینہ فخر سے تن گیا۔ ایک بے سہارا لڑکی کو تسلی دیتے دیتے وہ جیسے مکمل تندرست انسان بن گیا تھا۔

چھبی تھوڑی مطمئن ہوئی بولی۔ "میرے پاس تو بس کا کرایہ بھی نہیں رہا۔"

"میرے پاس ہے" جیب سے ایک مٹھی پیسے نکال شبو نے دکھائے۔

وہ آم کے باغ کو پار کر گئے تھے۔ دونوں کناروں پر جھاڑی جنگل تھے۔ دُور میلے کا شور گونج رہا تھا۔ کوئی کیرتن کر رہا ہے۔ ڈھولک منجیرے کی آواز۔ جھینگر کی پکار، پھول کی خوشبو، بیلوں اور بھیگی مٹی کی خوشبو۔

چھبی نے کہا "کیسی سُندر چاندنی بکھری ہے شبو دا۔ کیسا سندر پورناشی کا چاند نکلا ہے۔ افسوس تم دیکھ نہیں پاتے...."

شبو رک گیا پھر تھوڑا سا ہنس کر بولا "لیکن میں پھول کی خوشبو سے محظوظ ہو رہا ہوں۔"

"کون سا پھول ہے بتاؤ تو ذرا؟"

کئی بار سانس کھینچ کر چھبی نے کہا "میں بھی خوشبو سے محظوظ ہو رہی ہوں مگر پھول کا نام معلوم نہیں۔"

"مہندی کی خوشبو" شبو نے کہا "کیسا چاند نکلا ہے چھبی؟"

(بقیہ ص ۲۹ پر)

پنجابی

# گودی کتا

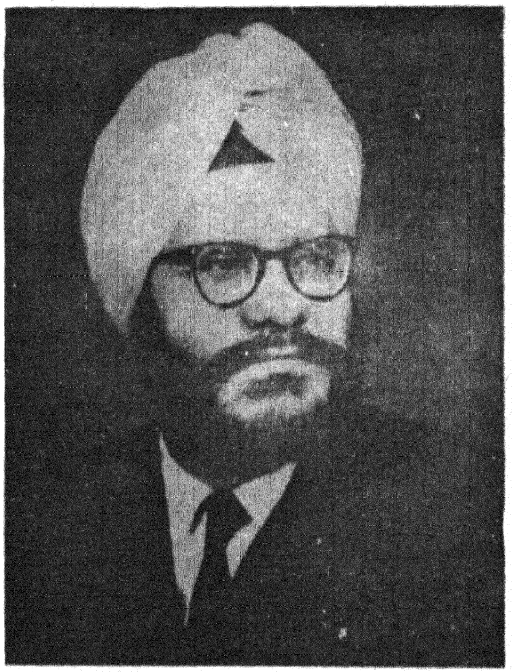

مہندر سنگھ جوشی

انڈیا گیٹ کے ایک دوراہے کے نزدیک، لال پتھر کے بنچ سے ذرا پرے سمنت اور اس کی بیوی چھایا بیٹھے ہوئے ہیں جب کبھی چھایا کا کسی جگہ اکیلے جانے کو جی نہیں چاہتا تو وہ اپنے شوہر کو لے کر یہاں آجایا کرتی ہے۔

فوارے سے بلند ہوتی ہوئی سفید بوندیں اچھل اچھل کر گر رہی ہیں۔ نیچے پاس پاس لگی بتیوں کی روشنی لال سرخ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی مہرشی کا غرور توڑنے کے لئے کوئی بے لباس اپسرا گلاب کی پنکھڑیوں پر رقص کر رہی ہو۔

کان پر بندھی رکھ کر بیٹھی چھایا کے منہ سے لفظوں کی نہ کبھی ختم ہونے والی پھوار گر رہی ہے۔ نہ فل اسٹاپ، نہ کولن، نہ کاما۔ کوئی وقفہ بھی تو اس کی باتوں میں نہیں آتا۔ سمنت حیران ہے۔ چھایا شادی کے دن سے، الگ بھانگ، اسی طرح، بے تکان، بغیر کوئی فرق ڈالے بولتی چلی آرہی ہے۔

اس کی بیوی بول رہی ہو تو اسے خود کچھ کہنا نہیں ہوتا۔ اصل میں اسے باتیں سننے کی بھی کچھ زیادہ ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف "ہوں: ہاں" کہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ شروع شروع میں تو یہ فرض ادا کرنے کے لئے اسے ذہنی طور پر خاصا حاضر رہنا پڑتا تھا۔ لاپروائی کے بھتے کبھی خوش ذائقہ نہیں ہوتے اور ایک لمبے تجربے کے بعد اس کا پوکس دل اب یہ جان گیا ہے کہ کہاں "ہوں" کہنے کی ضرور ہوتی ہے اور کہاں "اوں، ہوں" کہنے کی۔ اور اب تو موقع کوئی ہو، مطلوبہ "ہاں" از خود منہ سے نکل جاتی ہے۔ ایک بار سمنت کے گاؤں میں حجاموں بہو چرخے پر لحاف ڈال کر گھر سے بھاگ گئی تھی۔ کئی گھنٹے بعد جب گھر والا کو چارپائی کے خالی ہونے کی خبر ہوئی تو وہ منزل پر پہونچ چکی تھی۔ اس "ہو ہاں" کے پردے میں سمنت کی سوچ کچھ تھوڑے بہت پاؤں پسار ہی لیتی

پھولوں اور غباروں سے سجی ایک مرسیڈیز کار راج پتھ سے گز ہے۔ اس میں بیٹھے لڑکے اور لڑکی کے ارمانوں کے پنکھ شاید کار کے پہیو سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ حرکت کر رہے ہوں۔ سمنت سوچ میں پڑ جاتا ہے "یوں تو ہماری بھی شادی ہوئی تھی۔ آٹھ دس صدیاں پہلے، لیکن شاید ان ارمانوں کے پنکھ نہیں ہوتے تھے۔

ایک دن مسٹر سکلانی، اس کے مالک نے حکم دیا "رکل سبح کوٹھی پر کام ہے۔"

"منڈی سے پھل وَل لانا ہوگا۔" اس نے سوچا۔ کسی کاروباری سے

زم کے فرائض میں کیا کچھ شامل نہیں! اس کے پہونچنے سے پہلے ہی وہاں ایک
ارت تیاری مکمل کئے بیٹھا تھا۔ نہ مہمانوں کی روانی، نہ کسی اور طرح کی دھوم
عام۔ وہ سوچنے لگا "کسی مرے ہوئے کی رسم ریت ہوگی"۔ لیکن ابھی پورے سات
ٹ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ مسز سکلانی کی سوتیلی بیٹی اس کی بیوی بن گئی۔

یاروں دوستوں میں خوب واہ واہ ہوئی۔ "بھئی کمال ہے۔
ماں بردار تھا، نام کما گیا"۔ "بھاگیہ اور بھوت جب لگتے ہیں تو پوچھ کر نہیں لگتے"۔
سکلانی جیسے دولت مند کے داماد ہونا کوئی ہنسی مذاق نہیں اور پھر جب ہر
ئی یہی کہے تو یقین کا آجانا لازمی ہے، اور پھر آٹھویں ہی مہینے میں چھایا نے اس
پوتے گیارہ پونڈ وزن کے بیٹے سے بھی نواز دیا۔

ایک کٹے ہوئے بالوں والی سندھن دسترخوان بھا رہی ہے۔
نہیں پکنک کے بہانے یہ لوگ کیا کچھ اٹھا لائے ہیں۔ سارا دسترخوان،
ں، پلیٹوں، گلاسوں اور چمچوں سے بھر گیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے، چھایا کو اس عورت کے بالوں کے انداز نے
یا ہے۔ یا پھر بالوں کے کالے پن میں بادامی جھلک اچھی لگی ہے۔ سندھن کی
ں سیاہ کالی ہیں۔ ہو سکتا ہے اُن پر نیل پھیری گئی ہو، اور یہ بھی کہ بال اپنے
ں بازاری ہوں۔ آج کل بھارت کے بال کم یاب بدیسی سکے کے لئے غیر
ں میں فروخت ہوتے ہیں۔ سُنمت کے لئے اپنی بیوی کی اس درجہ گہری
سی سے یہ جان لینا مشکل نہ تھا کہ اب وہ بھی ایسے ہی بال پہنے گی۔

ہر روز ایسا ہی تو ہوتا ہے۔ وہ کبھی وجینتی مالا کی فلم دیکھ لیتی تو
ں اسی کی طرح گاتی، مٹکتی پھرتی۔ اگر ہیروئن، مینا کماری ہوتی تو چہرے
ری معصومیت کا ملمع چڑھا لیتی۔ اگر کسی سہیلی نے ازراہ مذاق کہہ دیا کہ
جو ٹیلر صبح شام کیمفر سوپ سے نہاتی ہے، تو وہ بھری دوپہر میں وہی صابن
چل نکلتی۔

کل بھنگی کو املی کے نرم نرم پتے توڑ لانے کی ہدایتیں دے رہی تھی،
ی طرح کا لیپ شیپ بنانے کے لئے کہ سُنمت مسکرا پڑا۔ اس پر وہ
پے سے باہر ہو گئی۔ بولی۔

"عورتیں، اپنے مردوں کے لئے چاہے کچھ ہی کرتی رہیں، لیکن مردوں
بھی اُن کی قدر نہیں پائی"۔ اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ "اُف، تو
ب کچھ میرے لئے ہوتا رہا ہے۔ بغیر بوجھے اور بغیر جانے کہ میں کیا چاہتا
ہوں، میری کیا خواہش ہے۔"

چھایا کی نظریں شعلے برسا رہی تھیں۔ اُس نے دیکھا اور نظریں نیچی
کر لیں۔

سیر کرنے کو آئی ایک ساڑھے چار فٹ اونچی اور چھ فٹ چوڑی
عورت میڈن گرے کار میں سے نکلتی ہے اور تھوڑا سا چل کر سُنمت کے قریب
آ کھڑی ہوتی ہے۔

"اس عورت نے لیٹے لیٹے مرلہ بھر ہریالی تباہ کر دیتی ہے۔ سُنیت
دوڑ لگا لیتی تو بھی گھاس کی کمی پتی کی نیند نہ ٹوٹتی۔ اُسے خیال آیا۔" لیکن
سُنیت ہی کیوں؟" سُمنت اپنی اس سوچ پر چڑھ سا جاتا ہے۔" دلی
میں اور کوئی لڑکی نہیں۔ اُس جیسی سبک اندام، نازک بدن؟" اس طرح
وقت بے وقت آجانے پر بہانے گھڑنے میں سُنیت کی یاد کتنی تیز ہے۔
شاید یہ میری کمزوری سے واقف ہے آئے ہوئے کو کوئی بھی بُرا بھلا نہیں کہتا۔

سُنیت نے زندگی میں صرف ایک بار اس سے کچھ کہنا چاہا تھا،
لیکن وہ خط اس کے پاس پہونچ کر بھی نہیں پہونچا محض قطبی تارا بن کر
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے ٹنگ گیا۔

سُمنت نے جیب میں سے رومال نکالا اور عینک کے شیشے صاف
کئے۔ اُس کی نظر کمزور نہیں، لیکن برسوں پہلے کے لکھے گم شدہ خط کے لئے نظر
جتنی بھی تیز ہو، اتنی ہی کم ہوتی ہے۔

سُمنت نے اس طرف سے کافی احتیاط برتی۔ خط پتلون کی جیب میں
پڑا پڑا گھل گیا۔ اُس نے اُسے تازہ روزانہ اخبار میں رکھ کر پڑھنا شروع کیا۔
"میرے ان جانے۔ . . . ." لیکن اس کی بیوی ایک بلا کی طرح نازل ہوئی
اور "کس کا خط ہے؟" بعد میں کہا اور کاغذ پہلے جھپٹ لیا۔

اُس بدقسمت خط کے لئے آج تک کتنی ہی بار جھگڑا ہو چکا ہے چھایا
اکثر دن نکلتے ہی برسنے لگتی ہے اور رات گہری ہونے تک آگ اگلتے
اُگلتی رہتی ہے۔ سُمنت کا اندازہ ہے، انتہا کی مٹھاس سُنیت کے لفظوں
میں ہوگی ورنہ اتنا زہر انہیں یاد کر کے اُس کی بیوی کی زبان پر کیوں کر
آتا ہے۔

ایک دن سُنیت کا بڑا بھائی سُمنت کی ماں کے پاس آیا اور
اُس کے رشتے کے لئے منظوری مانگی تھی۔ سُنیت ہر اعتبار سے اچھی تھی اور اس

سے زیادہ سُمنت کو کچھ نہیں چاہئے تھا۔ دونوں طرف شادی کی تیاریاں جاری تھیں اور اُن میں سے ایک تیاری سُمنت کا اپنے مالک سکلانی کو خوش کرتا بھی تھا کہ سُنیت کی آمد سے پہلے اس کی تنخواہ بہتر ہو جائے۔ لیکن اس وقت سب کچھ درہم برہم ہو گیا، جب سُنیت کے لئے تیل ڈالی دہلیز کے اوپر سے چھایا گزر کر آ گئی۔

سُنیت بہت شرمیلی تھی۔ پہلے تو کہیں آتی جاتی دکھائی پڑ جاتی تھی۔ رشتہ طے ہونے کے بعد تو گویا اس نے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ سُمنت کو اپنی شادی کے بعد اس کا خط ملا تو لگا کہ جیسے مایوسیوں کے اندھیرے میں خدا خود اُسے سہارا دینے آ گیا ہو، لیکن . . . . خط . . . .

پھر ایک رات جب بچے سو گئے، چھایا نے اس کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور ماتھے کے، گالوں کے، ہونٹوں کے کئی بوسے لئے۔ پہلے کبھی اس طرح نہیں ہوا تھا۔ اب کیا ہو گا، اس خیال سے سُمنت کا دل بیٹھنے لگا۔

آخر خاموشی کا طلسم ٹوٹا اور اُس نے سُنا "وہ تھی نا جو . . . وہ . . . . کنجری . . . ہیں . . . . سُنیت . . . کہتے ہیں . . . . جمنا میں کود کر خودکشی کر لی ہے۔"

پھر بوسوں کی بوچھاڑ سی آ گئی . . . . سُمنت کا جسم اس بیچ جھرجھریوں سے بے حال ہوتا رہا۔ اُسے محسوس ہوا کہ جیسے قبرستان سے اُٹھ کر آئی کوئی باسی لاش اس کا انچر پنجر جھنجھوڑے دے رہی ہے۔

چھایا عادت کے مطابق جلد ہی سو گئی۔ اپنی نیند بھری آنکھوں سے اندھیری چھت کو گھورتے ہوئے سُمنت سوچنے لگا اگر عورت اچھی ہو تو دیومالا کی عظیم سے عظیم دیویاں بھی اس کی گرد پا کو نہیں پہونچ سکتیں اور بُری عورت ظالم سے ظالم راکھشسنی سے بھی ظالم بن جاتی ہے "توے پر ایک ہی رُخ سے پڑی روٹی اب نہ جلی تو پل کو جلی۔" اس طرح بند مٹھی پر کمان رکھے چھایا کہہ رہی تھی —

سمنت کو نہیں معلوم کہ اُس کی بیوی کی بات کا موقع و محل کیا ہے۔ لیکن چھایا کے اشارے میں اس کے لئے کوئی پیچیدگی نہیں۔ ظاہر ہے بجلیاں میکے والوں کی بے رُخی پر گرنے کے لئے بے قرار ہو رہی ہیں۔

اس کا جی چاہتا ہے کہ جواب دے، "بغیر اٹھائے روٹی، سچ مچ چند لمحوں ہی میں جل جاتی ہے۔ توے کا کچھ نہیں بگڑتا۔" لیکن اس کے چوکس دل نے اس کے بولنے سے کچھ پہلے ہی ہنکار بھر دی "جی"

پچھلی راکھی پر جب وہ گھر لوٹا تھا تو چھایا بڑے بے ڈھنگے پن کے ساتھ، ڈرائنگ روم کی ٹھنڈی دری پر لیٹی ہوئی تھی۔ نہ بال سنوارے تھے، نہ کپڑے بدلے تھے۔ قریب ہی فرش پر بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا "کیوں، کیا بات ہے رانو؟" "کیا بھائی سے راکھی واپس آ گئی؟"

"خیر، پتہ ٹھیک نہیں ہو گا۔"

"کیا جھک مارتے ہو! سُمنت، میرا لکھا ہوا پتہ ٹھیک نہ ہو؟" اس کو لفافہ اچھا بھلا مل گیا تھا۔ اس نے راکھی والی چٹھی اور منہ میٹھا کرنے کو بھیجی چینی کی چٹکی سب کچھ نئے لفافے میں لوٹا دیا۔"

"اوہو! بڑا عجیب آدمی ہے ویریندر!"

"میں تو کہتی ہوں، اس کی راکھی لوٹانے والی انگلیاں جھڑ جائیں" اس کے ہاتھوں پر کوڑھ ہو جائے —"

"حد ہو گئی چھایا! معمولی سی بات پر اس طرح بگڑنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت کا تمہیں کیا پتہ، میرے چلتی جگر سے پوچھو۔ تمہیں تو مجھ سے دشمنی کرنے والا ہر شخص پیارا لگتا ہے۔" اور وہ آنسو بہانے لگی۔

"نا بھئی نا، میں تو مانتا ہوں کہ ویریندر نے گھٹیا بات کی ہے" سمنت نے اس کو پچکارتے ہوئے کہا۔

"ہیں؟ گھٹیا بات کی ہے۔ کس نے؟ میرے بھائی نے؟ تو تمہارے اُجڑے خستہ حالوں نے کون سی بات کی ہے، آج تک ننگے بھوکے کنگال، اُن سے تو سالنسی، سنورے اچھے۔"

پھر اُس نے اور اونچی آواز میں چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

"راکھی میری اُس بیہودہ بھابی نے نہیں رکھی ہو گی۔ دشمنوں نے بدلا بھائی کے سر کر دی۔ پرماتما اس زبان پر کیڑے پڑیں، جو اس بے قصور کو الزام دیتی ہے۔"

سُمنت اُداس، بڑا بے دل سا اندر کے کمرے میں جا بیٹھا۔ چائے کا وقت تو نکل چکا تھا، روٹی پکنے کے بھی کوئی آثار دکھائی نہ دے رہے تھے۔ دودھ کے لئے الگ بلک رہا تھا۔ اس نے اُٹھ کر بوتل میں دودھ ڈالا، لیکن کُکو نے بوتل کو منہ بھی نہ لگایا۔

سُمنت پھر چھایا کے پاس گیا اور منت سماجت کرنے لگا۔

"میری نیت ویریندر کے خلاف کچھ کہنے کی قطعی نہیں تھی۔ جو کچھ ہوا میں اس
لئے معافی چاہتا ہوں۔ بس اب اٹھو۔ ہاتھ منہ دھو لو، اور بچے کو سنبھالو۔"

ایک ہی درخواست سمنت نے کوئی پانچ بار دہرائی تو چھایا نے ایک
نظر اُس پر ڈالنا گوارا کیا۔ اس کا مطلب تھا، درمیں اب تو مانے لیتی ہوں
یاد رکھو، اگر پھر ——"

سُمنت نے خیر منائی۔ لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آج اس سے
کیا ہوئی ہے، جو آیندہ نہیں ہونی چاہئے۔

اپنے گلے میں پڑے موتیوں کے ہار سے کھیلتی ہوئی ایک سترہ سالہ
لڑکی سنگھ روڈ کی طرف سے آرہی ہے۔ اس کا مینی سکرٹ اوپر سرخ
رنگ تک سکڑا ہوا ہے۔ اس کے چست بلاؤز سے جوانی پھٹی پڑ رہی ہے۔

سمنت کی بیوی ایک نگاہ غلط انداز سے اس پر ڈالتی ہے۔

"چل اُٹھ کھڑا ہو۔ چل، یہاں میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔"

وہ بُنائی کی سلائیاں اور اون کا گولہ اٹھاتا ہوا گھر کی طرف چل
دیتا ہے۔ چھایا اس کے پیچھے ذرا سے فاصلے سے چلتی اور پھر برابر آجاتی ہے۔

چلنے کو تو سُمنت چل رہا ہے۔ لیکن جیسے اُس کی ٹانگوں میں جان نہیں
لگتا ہے، جیسے کوئی گودی کُتا چل رہا ہو۔ ——، زنجیر کے ساتھ
بندھا، بے توجہی کا شکار۔ بھوکا پیاسا۔ دُم اور کان ہلاتا۔ (ترجمہ: نرمل)

## بقیہ سو بیسے

اس پر بھی میری زبان نہیں کھل رہی تھی۔ میں صرف سر ہلاتا رہا۔

رادھا موہن پور اسٹیشن پر سب اُتر گئے۔ منٹو نے سب کا لیڈر بن کر
کہا، "سر ہم لوگ جا رہے ہیں۔ پھر کبھی ملیں گے۔"

جواب میں میں نے مسکرا کر کہا مگر دل ہی دل میں سوچ رہا تھا ——
ممکن۔ تم لوگوں کے ساتھ میری ملاقات شاید پھر کبھی نہیں ہوگی۔ اگر ہوئی بھی
تو میں تم لوگوں کو پہچان بھی نہیں سکوں گا۔ بات یہ ہے کہ اگر میں تم لوگوں کو
پہچان لوں تو میرے پانچ پانڈوؤں کا کیا ہوگا؟

ہاں یہ کہنا تو میں بھول ہی گیا کہ اس گروپ کے دو اور نوجوان اس
گاڑی پر بھی چڑھ گئے۔ بالی چک اسٹیشن پر اُترنے سے پہلے ایک نے میرا
بریف کیس واپس کیا اور کہا —— یہ لیجئے شنکر دادا نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ
آپ کا بہت بہت شکریہ۔

## بقیہ نازو

چھلاوے کی طرح اُس کی بانہوں سے نکل گئی اور جب وہ جاگتی آنکھوں کے خواب
سے بیدار ہوا تو کمرے میں سپاہی لیمپ جلا چکا تھا۔

"میاں آپ کے داہنے کان کا دُر۔"

پھر بہت سی روشنیاں، سنجی والا ن اور صحن میں دُر ڈھونڈھتی پھریں
اور بہت دنوں بعد کسی بنت عم نے اس کے حال پر ترس کھا کر بتلا دیا کہ دیبی پور
کی بٹیا نازو سے بیاہ کر لیا۔ لیکن دیبی پور کی بٹیا نازو نے دولھن بنکر ساری
ساری تفتیش کے جواب میں صرف اتنا کہا، کہ میں نے تو وہ صنجی دیکھی بھی
نہیں، اور اسی گھڑی نازو اس کی نگاہ سے گر گئی۔ خواب جتنا رنگین ہوتا گیا۔
زندہ موجود اور معصوم نازو کی حقیقت اتنی ہی پگھلتی چلتی گئی۔ یہاں تک کہ آسودگی
اور فراغت سے خواب دیکھنے کی آرزو اور تعبیر کو دوبارہ پانے کی جستجو میں
نازو کو طلاق دیدی گئی۔

"میاں! بکس کھل گیا"

میاں چونک کر اُٹھے اور خواب میں چلنے لگے۔ لکڑی کا بڑا سا
مٹیالا بکس کھلا پڑا تھا۔

"اے کیوں کھول دیا کم بختو؟"

"جی؟"

اب کھول ڈالا ہے تو ڈھونڈھو۔

جازم پردے، توشک، لحاف، رضائیاں اور دوشالے نکل نکل
کر پھیل گئے، مگر مسند نہ ملی۔ پھر ایک چھوٹا سا صندوقچہ نکلا جس میں بڑا سا
تالا پڑا تھا۔ سامان رکھوا کر وہ اپنے کمرے میں آگئے۔ صندوقچہ کھولا تو چاندی
کے چھوٹے چھوٹے زیور کمسنا کر جاگ اُٹھے۔ گڑیوں کے ننھے منے کپڑے
جگر جگر کرنے لگے۔ سونے کی ٹوٹی ہوئی بالیاں ملیں، جن میں ایک سیپ
پھول پھنسا ہوا تھا۔ معلوم نہیں کتنے دنوں بعد وہ پہلی بار تنہائی میں
مسکرایا۔ نازو اور حسین اور قاتل ہوگئی۔ پھر جواہر خانے سے سونے کا
ایک دُر برآمد ہوا جس میں بیضوی موتی پڑا تھا۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ آنکھوں
کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ وہ اگر کھڑے ہوتے تو گر پڑتے۔ سنبھل کر بیٹھے تو
ہاتھ نے کان سے دُر کھینچ لیا، اور اس طرح کہ سارے میں ننھے ننھے خون
کے نگینے جڑ گئے۔ وہ دونوں کو ایک ہتھیلی پر رکھے دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے
یہاں تک کہ سُن ہو گئے۔

تاملی

# گھنٹے کی آواز

ٹی جانکی رامن



کھانا تیار تھا۔ کشمبو[1] بنانے کے لئے مارگم نے آٹا گھول کر چولہے پر چڑھا دیا اور دو تین مرتبہ ہلا کر نیچے اُتار لیا۔ مٹھی بھر ہرا دھنیا انگلیوں سے توڑ توڑ کر اُس میں ڈال دیا — رائی بھی بھون کر ڈال دی تھی اور پالک کا بھرتا اور چاول تو پہلے ہی تیار ہو چکے تھے۔

"پتے کٹ چکے؟" یہ پوچھتے ہوئے اُس نے پچھواڑے کی طرف چوپال میں جھانکا۔

"ہاں کٹ چکے" کہہ کر اُس کی بیوی نے درانتی اور پتوں کا گٹھا بیٹھے ہی بیٹھے اُس کے ہاتھوں میں پکڑا دیا اور اپنا ہاتھ آنچل سے رگڑ کر نیچے کپڑے پر لیٹے ہوئے بچے کو گود میں لے کر دودھ پلانے لگی۔

مارگم نے کنوئیں پر جا کر جسم کا پسینہ اور رسوئی گھر کا سارا میل دھو ڈالا۔ ماتھے پر بھسم کی موٹی موٹی پٹیاں جمالیں اور آنگن میں کنارے پر بیٹھ کر جپ کرنے لگا۔ سامان کی پیشانی پر شکر تارے کا تلک لگا ہوا تھا۔ آنگن میں بندھا ہوا بچھڑا اُسے پیار سے چاٹنے کے لئے گردن بڑھا رہا تھا۔ لیکن مضبوطی سے بندھے ہونے کی وجہ سے چاٹ نہیں پا رہا تھا پھر گائے کے پیشاب کی بدبو اُس نے محسوس کی۔ بدبو، اکیلا پن، شام کا سناٹا شکر تارا، ان سب نے مل کر اُسے ایک رشی کے آشرم میں بیٹھے ہو کا احساس دلایا۔ اُس نے فوراً انگوچھے میں ہاتھ ڈالا اور بائیں ہاتھ انگلیوں سے گن گن کر گائتری منتر جپنے لگا۔ رہ رہ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ ایک مرتبہ جب اُس نے ایک لمحہ کے لئے آنکھیں بند کیں تو اُسے دہلیز پر کسی کے اُتارنے کی آواز سنائی دی۔

"کھانا ....." آنے والے نے ذرا آواز کھینچ کر کہا۔

"لو تیار ہے"، کہہ کر مارگم نے اپنا جپ ختم کیا اور کوٹھری میں بیٹھنے کی جگہ بنائی اور پتا بھی بچھا دیا۔

اجنبی کے کھانا کھانے کے طریقے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ یہ تھا۔ وہ باقاعدہ گاہک نہیں تھا۔ کبھی مہینے میں دو ایک بار آجاتا تھا۔ یہ سے اتنی ہی واقفیت تھی۔ مندر کے بڑے دروازے کو جانے والے را کے پاس اس کا قیام تھا۔ مقامی ہائی اسکول میں سائنس ماسٹر کا اسٹ تھا۔ شکل و صورت سے بہت ہی بھولا نظر آتا تھا اور حالت سے قابلِ ر پستہ قد، توانا جسم، گندمی رنگ، گول مگر گنجا سر۔ سر کے پیچھے کے با جیسے تھے۔ پانچ چھ بال سفید ہو چکے تھے۔ چاندی کے فریم والا چشمہ

---

[1] ایک سبزی

ے تھا۔ صرف دائیں آنکھ چشمے سے کچھ بڑی نظر آتی تھی۔ ہمیشہ آدھی باہوں
ا ایک موٹا کرتا پہنتا تھا بچوں کی سی چال سے اوپر دیکھتے ہوئے جیسے قدم
م بڑھا کر طواف کر رہا ہو۔ اسکول میں سائنس کے بچوں کی جماعت جہاں
تھی وہیں وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ کر کسی نلاسفر کی طرح کلی میں دیکھتا رہتا
۔ نہ جانے کیوں اُسے دیکھ کر مارگم کے دل میں رحم کا ایک دریا اُمڈ آتا۔

اسی لئے اس کے آتے ہی مارگم بڑی عقیدت سے کھانا پروستا۔
گم جب دوسروں کے لئے کھانا پروستا تھا تو راستہ چلنے والے اس کی
زے اندازہ لگا لیتے تھے، جیسے وہ سینی بھر بھر کر پتلوں پر اُنڈیل رہا ہے۔
ر اصلیت اندر جاکر ہی معلوم ہوتی تھی۔ مارگم قلعی والی پیتل کی سینی میں
دل بھر لاتا تھا۔ سینی کے بیچ کا حصہ ٹوٹا ہوا تھا جس میں سے چاول پتلوں پر ڈالے
سکتے تھے۔ مارگم نے یہی طریقہ سوچ نکالا تھا تاکہ چاول وہاں سے ہو کر آئیں۔ اس
ی میں چاول بھر کر مارگم دو ہی قدموں میں پہونچ جاتا تھا۔ لیکن چاول جانتے تھے کہ
اپنے مالک مارگم کے ہاتھ یا چمچے سے کوئی مطلب نہیں۔ ہمارا واسطہ اس کے
ت ہے، اس لئے تھوڑی تھوڑی مقدار میں ہی گرتے تھے۔ صرف چاول ہی
ساگ، سبزی دال گھی سب مارگم کا دل جانتے تھے۔ سینی اور چمچے اس قدر
رتے تھے، جیسے کہہ رہے ہوں "ہم اتنا شور مچا رہے ہیں اور تم خاموش ہو۔
کرنے کو کیوں نہیں کہہ دیتے؟ اور ہم کیا بے وقوف ہیں کہ خاموش بیٹھے رہیں۔
مارگم جب تک چاہے چاول ڈالتا رہے"۔ لوگوں کی اس خاموشی ـــ کا فائدہ
اکر مارگم گھی کی چمچی سے ساگ سبزی پروستا اور گھی اور اچار پروسنے میں اس کا
استعمال کرتا تھا۔ خبردار زیادہ مقدار میں کھانا کیوں کھلا دیں۔ ہوٹل کا کھانا
کوئی کمر باندھ کر یہاں نہ آئے۔ یہاں گھر جیسا اور متوازن کھانا کھانے کے
جھ داری کی ضرورت ہے۔

لیکن صرف اس شخص کے لئے مارگم کے دل میں جو احترام اور جگہ تھی وہ
کے سلوک سے ظاہر ہے جو دوسرے گاہکوں سے بالکل مختلف تھا۔ یہ اس
رچمچے سے پتہ چلتا تھا جو بغیر شور کئے خاموشی سے کام کرتے تھے۔ یہ منظر
ہی بنتا تھا۔

کشمبو، پروس کر مارگم نے جیسے ہی اسے ایک بار چمچے سے ہلا کر چمچہ اوپر
یا، ویسے ہی اس پر سے کوئی لمبی سی چیز پھسل کر برتن میں جا گری۔ اس نے چمچے
ایک بار پھر اُسے نکالا اور روشنی میں لاکر غور سے دیکھنے لگا۔ یہ کیا ہے؟
لمبا سا چکنا اور چمکدار؟ شاید پک جانے سے اس کا چمکیلا پن کچھ پھیکا پڑ گیا تھا۔
کہیں سانپ کا بچہ تو نہیں ہے یا چھپکلی؟ چھپکلی کے تو پیر ہوتے ہیں مگر اس کے
تو پیر نہیں ہیں۔ سانپ کے بچے جیسا لگتا ہے۔

بادل کے چلتے وقت جس طرح اس کا سایہ زمین پر پڑ کر پھیل جاتا
ہے، ٹھیک اسی طرح مارگم کے سر سے لے کر پاؤں تک سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔
بیوی کو اشارے سے بُلایا۔ چمچے سے اُسے بھی وہ جانور دکھایا۔ دیکھتے ہی اس
کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ منہ کھلا رہ گیا جسے اس نے فوراً ہاتھوں سے ڈھک
لیا۔ مارگم نے بھی اپنے ہاتھ سے اس کا منہ بند کر دیا۔ اس کا بدن کپکپا رہا تھا۔
وہ کھڑی نہ رہ سکی۔ کھمبا پکڑ لیا۔ ہاں سانپ کا بچہ ہی تھا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ بوڑھا ہاتھ دھو کر ڈکار لیتا ہوا چپل پہن کر دہلیز
کو پار کر رہا تھا تو مارگم کی بیوی نے سانپ کو چمچے سے
اٹھا کر، اندھیرے کی پروا کئے بغیر، پچھواڑے کی طرف کوڑے کے گڑھے میں پھینک
دیا اور کوڑے کی پچاس ساٹھ مٹھیاں بھر کر اس پر ڈال دیں۔ پھر اندر آئی۔ کشمبو
کو اٹھا کر نالی میں ڈال دیا۔

"اب کیا ہوگا؟" اس نے پوچھا۔ یہ آواز اس کے دل میں گھٹ کر
رہ گئی۔

"ہے بھگوان ۔ ۔ ۔ ۔" کہتے ہوئے مارگم کے چہرے پر افسردگی چھا گئی
اور آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

ہتھکڑیاں، جیل خانہ، ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے
چکر لگانے لگے۔ اس کے ہاتھ کپکپانے لگے۔

"جا کر بھگوان سے دُعا مانگ لیں"

اور دونوں اپنی سامان والی الماری کے سامنے کھڑے ہو گئے۔
جس کے نیچے والے تختے پر دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی تھیں۔

اتنے دن تک ہماری عزت بنائے رکھی۔ بھگوان اب ایسا کڑا امتحان
نہ لو ـــ" بھگوان کے سامنے بیوی رو پڑی۔

"ہے مگیشور اس کی کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔ ہم آپ کے چرنوں میں
پانچ دھاتوں سے بنا ہاتھ بھر لمبا گھنٹہ ٹنگوا دیں گے۔" مارگم نے بھگوان سے
التجا کرتے ہوئے کہا۔

بیوی کے کانوں میں بھی یہ الفاظ پڑے۔ وہ بھی کہنے لگی "اے

بھگوان کسی دوسرے کے کانوں تک اس کی خبر نہ پہونچے۔ گھنٹہ بنوا کر ٹنگوا دیں گے یگیشور، سروشور، وین بندھو، مارگ بندھو۔ اس پریشانی میں جب اس نے اپنے شوہر کا نام لے لیا تو اُسے شرم سی محسوس ہونے لگی۔

دوبارہ کشمبو بنایا گیا۔ بندھے چوبیسوں گانٹھ کھانا کھا کر چلے گئے۔ خواہ وہ کتنی دعائیں مانگتا پھر بھی خوف اور دہشت سے کیسے چھٹکارا ملے؟ وہ ساری رات آرام سے نہیں سو سکا لیکن اس کی بیوی سارا کچھ بھگوان کے بھروسے چھوڑ کر آرام سے سو گئی تھی۔

مارگم کروٹیں بدلتا رہا وہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے میری کس بات کی وجہ سے یہ واقعہ پیش آیا۔ شاید آدھا پیٹ کھانے والوں کی بددعاؤں کا نتیجہ ہے۔ ایک دن بڑی ہمت کے ساتھ، سوت بیچنے والے بن ماں کے لڑکے نشانی نے کہہ ہی دیا تھا۔

"یہ تم کیسے پروس رہے ہو۔ جیسے مرغی کو کھلا رہے ہو۔ یہ پیسہ مضم نہیں ہوگا۔ پیٹ کی دیوار پر سفیدی پوتنے کی طرح چاول پروس کر کیا کروگے؟" کیا یہ اسی کی بددعا کا نتیجہ ہے۔؟

دوسرے دن خبر آئی کہ سائنس ماسٹر کے اسسٹنٹ کا انتقال ہوگیا ہے۔ رات کو دو مرتبہ پاخانہ گیا، پانی پیا اور سوگیا۔ پھر اُٹھا نہیں۔ ڈاکٹر کے مطابق دل کی دھڑکن بند ہوجانے سے موت ہوگئی۔ محلے میں بھی یہی افواہ ہے۔ اگر دُنیا میں ہونے والے جرائم اور مجرموں کا پتہ لگ جایا کرے تو ممکن ہے ہر گھر ایک قید خانہ بن جائے۔

یگیشور نے بچالیا۔

ایک ہی مہینے میں گھنٹہ تیار ہوگیا۔ پانچ دھاتوں کا بنا یا کسی اور دھات کا کسی کو کچھ خبر نہیں۔ ہاں گھنٹہ تھا خوب بڑا۔ ڈیڑھ ہاتھ لمبا۔ اتنا بھاری کہ دو آدمی مشکل سے اٹھا سکتے تھے۔ دیکھنے میں خوبصورت اور آواز بھی سریلی تھی۔ جس کاریگر نے اسے بنایا تھا وہ بھی کوئی معمولی نہیں بلکہ ایک مشہور کاریگر تھا۔ اُس نے گھنٹے میں جان ڈال دی تھی۔ کاریگر کے کچھ آدمی اسے مارگم کے آنگن میں رکھ کر چلے گئے۔ مارگم نے اُسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ وہ گھنٹہ اپنی خوبصورتی میں کبھی نندی کی طرح لگتا تو کبھی اندھرا پردیش کی خوبصورت عورت سا نظر آتا اور کبھی مندر کے گوپرم سا۔ کاریگر نے اس پر چونے جیسا کچھ مل دیا تھا۔ اس کے نچلے کنارے پر "مارگ بندھو ولاس، مارگ بندھو کی بھینٹ" یہ الفاظ پورے دائرے میں کھدے ہوئے تھے۔

چھ سو روپے سے کم قیمت میں گھنٹہ بن کر تیار ہوگیا تھا۔ اس کے لئے مارگم نے من ہی من میں آپاسوامی انجینئر کا بارہا شکریہ ادا کیا۔ مارگم نے ۲۵ برس تک آپاسوامی کے گھر باورچی کا کام کیا تھا جس پر انہوں نے اُسے تین ہزار روپے دے کر کہا تھا کہ کہیں جاکر اپنا کاروبار شروع کرو جس سے گزر بسر ہوتی رہے۔ انہوں نے اُسے دُعائیں بھی دیں۔ اُن کی دعائیں بے کار نہیں گئیں۔ مارگم نے انہیں کی دعاؤں کے اثر سے ایک لڑکی کی شادی اچھے کھاتے پیتے گھر میں کردی اور ایک لڑکے کو پڑھا بھی لیا جو اب مُدرے کے ایک بنک میں ملازم ہے اس کے بعد چار پانچ بچے پیدا ہوئے۔ لیکن زندہ نہیں رہے۔ اب کوٹھری کی دھول میں روتا چلاتا ہوا ایک مریل بچہ بچا ہے جو ابھی بیماریوں کے شکنجے سے نہیں نکل سکا ہے۔ بہت مالدار نہ ہوتے ہوئے بھی دسروشور نے اس کی عزت و آبرو پر کبھی آنچ نہیں آنے دی تھی۔ اس کے گاہکوں میں کوئی ایسا نہ تھا جسے گھنٹہ دیکھ کر حیرانی نہ ہوئی ہو۔ عام طور پر گھنٹہ بندھوانے کی کسے سوجھتی ہے؟ چاندی کی آنکھ بنوانا یا بڑوں کو مالا پہنانا تو اکثر ہوتا ہے یا کبھی کسی نے چھاؤنی بنوادی یا چندن کی چوڑی پہنا دی، لیکن گھنٹہ لٹکوانے کی کسی کو نہیں سوجھتی۔

"یوں بس، سوچا کہ چلے بھگوان کے نام کے لئے کچھ کردیں۔" پوچھنے والوں کو مارگم بڑے اطمینان سے جواب دیتا تھا۔

گاہکوں نے اس پر ہاتھ پھیر کر، کھینچ کر دیکھا، ذرا زور لگا کر دیکھا کہ ہلتا بھی ہے یا نہیں؟

"دیکھنے میں بڑا خوبصورت ہے" ایسا کہہ کر دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے۔

"عجیب بات ہے کہ آدمی کو ایسا دان کرنے کی سوجھی۔" لوگ حیرانی کا اظہار بھی کرتے۔

"جب خدا ہر طرح سے ہماری مدد کرتا ہے تو ہم کیوں نہ سوچیں۔ راہ چلتا ہوا آدمی اچانک گر کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ خدا قدم قدم پر اپنی ہتھیلی سے ہماری حفاظت کرتا ہے نا؟ ایک مثال لیجئے سائنس ماسٹر کا اسسٹنٹ تھا نا ایراداتم؟ اس نے مرنے سے پہلے رات کھانا یہاں ہی کھایا تھا۔ دوسرے دن صبح موت ہوگئی۔ ڈاکٹر نے آکر دیکھا اور بتایا "ہارٹ اٹیک

نہیں تو لوگ کیا کہتے کہ مارگم کی دُکان سے کھایا اور مرگیا۔ مارگم نے نتھنے پھلاتے
با کو کی گولی منہ میں دباتے ہوئے کہا۔
"چھی چھی لوگوں کی عقل کیا اس قدر خراب ہوجائے گی؟"
"نہیں سوامی پھر بھی کسی کا کیا پتہ لگتا ہے اور پھر میں تو یوں ہی
ہا ہوں۔"
"ٹھیک۔"
"سب لوگ جانتے ہیں کہ مارگم کیسا آدمی ہے لیکن پھر بھی کب
نے والا ہے۔ اور کون شخص کیا کہے گا اس کا کسی کو علم نہیں۔ وقت کا
ہی کچھ ایسا ہے ایراوتم کبھی کبھی کھانا کھانے آتا تھا مجھے تو اس کی چال
ہی ڈر لگتا ہے۔ اس کے کھانا کھا کر بہ حفاظت گھر پہونچ جانے تک مجھے
بینی سی رہتی تھی میں ایشور سے پرارتھنا کرتا رہتا تھا کہ اے ایشور یہ شخص صحیح سلامت
گھر پہونچ جائے اس کے کمزور جسم کو دیکھتے ہی ڈر سا لگتا تھا۔"
"اس طرح بیٹھے بیٹھے گپیں مارتے رہوگے کیا؟ چاول پک کر تیّ
جارہا ہے۔ اُتارنا نہیں ہے؟" بیوی نے اندر سے آواز دی۔
"لو میں آیا" کہتا ہوا وہ اُٹھ کر اندر چلا گیا۔ وہ دونوں گاہک بھی
گئے۔
"بات سنئے۔ پہلے یہ گھنٹہ لے جاکر مندر میں دے آئیے۔" بیوی نے

"میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی۔؟"
"اب تک جو کہہ چکے ہیں وہی کافی ہے۔ پہلے گھنٹہ مندر میں دے
۔اسے دیکھتے رہنے سے ہی لوگ کچھ نہ کچھ پوچھتے رہتے ہیں۔ آپ بھی خاموش
رہ سکتے۔"
"کیا تم نے مجھے اتنا گیا گزرا سمجھ لیا ہے؟"
"آپ تو بڑے ہوشیار ہیں لیکن پہلے دے آئیے۔"
"کیا یہی وقت تمہیں اچھا نظر آیا ہے؟"
"اچھا وقت باندھنے کے لئے دیکھنا ہے۔ دینے کے لئے نہیں۔"
اُس دن شام کو گھنٹہ مندر پہونچ گیا۔ دو دن بعد جمعہ کے دن
رکی چہار دیواری کے منچ تک گھنٹہ چڑھایا گیا۔ اُس میں رسہ بندھوا کر مارگم
کھینچنے کو کہا گیا تو مارگم نے رسہ کھینچا۔

"ٹن ن ن ن ن ن . . . ."
اس جھنکار کو آہستہ ہو کر ختم ہونے میں ایک منٹ لگ گیا۔ وہ آنکھیں
بند کر کے بیٹھا تھا گھنٹہ بجنے کی پھر آواز ہوئی تو اُس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا
رسہ مندر کے ٹرسٹی کے ہاتھ میں تھا۔
صبح دشوروپ درشن کے لئے وہی گھنٹہ بجایا گیا۔ شام کو بھی بجایا
گیا اور رات کو اردھ دھام پوجا کے لئے بھی بجایا گیا۔
صبح جب گھنٹے کی آواز سُنائی دی تو مارگم کا دل مسرت سے
جھومتا ہوا نیلے آسمان کو چومنے لگا۔ تیسرے پہر بھی ایسا ہی ہوا۔
شام کے وقت انگوچھے میں ہاتھ ڈالے ہوئے مارگم نے آنگن کے
دروازے سے آسمان کی طرف دیکھا۔ اُسے شکر تارا نظر نہیں آیا۔ صرف
گھنٹے کی ٹن ٹن کی آواز ہوا میں تیرتی ہوئی آئی۔
"کھانا تیار ہے؟" چپل اُتارنے کی آواز کے ساتھ اُسے یہ سوال
سُنائی دیا۔ خاکی کُرتا پہنے ہوئے یہ ایراوتم تھا جس کے بلی کی مونچھوں جیسے
بال تھے۔ چشمے کے اندر سے اس کی ایک آنکھ بڑی نظر آرہی تھی۔
مارگم ہکا بکا رہ گیا۔ دالان میں کوئی نہیں تھا۔ ایراوتم کو مرے ڈیڑھ
مہینہ ہوچکا تھا۔ مارگم نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔ گھنٹے کی آواز کے
ساتھ تیرتے ہوئے ایراوتم کے آنے کو کیسے روکا جاسکتا ہے؟ ایراوتم
نے دوبارہ جھانک کر کھانا نہیں مانگا۔ دریا کی لہروں میں اٹھتی گرتی لکڑی
کی طرح لیٹتا ہوا وہ ترنگوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ یہ ایراوتم نہیں تھا اس
کی رُوح تھی۔ سمندر کی لہریں نہیں تھیں، کشمبو کی لہریں تھیں۔ مارگم کو اپنی کمر پر
زور سے کسی چیز کے سرکنے کا احساس ہوا۔ جیسے کمر پر برف کا ایک بھاری
ڈھیلا رکھا ہوا ہو — اس نے آنکھیں کھولیں اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر باورچی خانہ
میں پہونچا۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر چولہے کی جانب ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔
"کیا دیکھ رہے ہو؟" بیوی کی آواز آئی۔ "میں دیکھ رہی ہوں آپ
چولہے کی جانب ایک ٹک دیکھے جارہے ہیں۔ کیا رکھا ہے چولہے پر؟"
"کچھ نہیں تو۔"
اس نے پہلے اس کے قریب آکر اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔
"آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔؟"
"کچھ نہیں۔"

"پھر ایسا کیوں . . . . ؟" کہہ کر اُس نے پوجا کی الماری سے تھوڑی سی بھسم لاکر اُس کے ماتھے پر لگا دی۔

"کہتے ہیں کہ آپ نے ہی گھنٹہ لٹکوایا تھا۔" پنساری کی دکان کے بابو نے پوچھا۔

"جی ہاں ـــ"

"اوہ! کیسی آواز ہے۔ کتنی سُریلی۔ میں نے تردوار اور اورملیکوٹے کے گھنٹے سُنے ہیں۔ ان میں ایسا سریلا پن نہیں ہے۔ اس کی آواز تو چکر کاٹتی ہوئی آتی ہے۔"

"اجگر کی طرح چکر کاٹتی ہے نا؟"

"ہاں بڑے اجگر کی طرح۔ اونچی اور بھاری آواز آتی ہے۔"

"تکشک اور واسکی کی آواز جیسی؟"

"کون؟" بابو نے پوچھا گویا کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا۔"

"تکشک نے پریکشت کو کاٹا تھا۔ واسکی کو مندر پہاڑ کے چاروں طرف رسّی کی طرح لپیٹ کر کھارے ساگر کا منتھن کیا تھا، دیوتاؤں نے اور راکشسوں نے مِل کر۔

"ہاں ہاں بھول گیا تھا۔ کیا وہ واسکی تھا؟"

"تب تو دوسرے مندروں کے گھنٹے سانپ کے بچے ہیں۔ ہمارا گھنٹہ بھی بڑا اجگر ہے نا۔" مارگم نے کہا۔

"پتا بھجا دوں؟" مارگم کی بیوی کی آواز آئی۔

"ہاں بھجا دو۔"

"میرا ہاتھ خالی نہیں۔ ذرا اِدھر آئیے تو . . . . "

"یہ میں آگیا۔" کہہ کر مارگم اندر چلا گیا۔

"گھنٹہ لگانے کے بعد آپ کو کیا ایسی ہی چیزیں نظر آتی ہیں، رات کے وقت یہ کیا تکشک، واسکی . . . . ؟"

"ارے اُس نے تو کچھ نہیں کہا۔ میں نے ہی کہا تھا۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔"

بابو کھانا کھا کر چلا گیا۔

رات کے دس بجے گھنٹہ پھر بجا۔

مارگم لیٹا ہوا تھا۔ بار بار وہ اٹھ کر پرانا سہاگ رات والا بستر اُٹھا کر دیکھتا تھا پھر لیٹ جاتا۔

"وہاں کیا ہے؟"

"کہاں؟"

"دیکھ وہاں آنگن میں۔"

"کچھ نہیں تو۔"

"نہیں ـــ دیکھ کچھ ہل رہا ہے۔ ذرا لالٹین اُٹھا لا۔"

لالٹین اٹھاتے ہی وہ غائب ہو گیا۔ نکلے پر پھر دکھائی دینے لگا

"وہاں دیکھ۔"

بیوی نے دیکھا۔ اُوپر اور نیچے دیکھا۔ جیسے اُڑتی ہوئی چڑیا کو دیکھ رہی ہو۔ پھر اُٹھ کر کھمبے کے ساتھ جو رسّی کا ٹکڑا لٹک رہا تھا اسے کاٹ ڈالا

"اس کی پرچھائیں تھی۔"

"ارے باپ رے۔ مجھے کسی اور چیز کا ڈر لگ رہا تھا۔"

اس کے بعد بھی وہ سویا نہیں۔ بتی اور بھی تیز کر دی۔ پھر لیٹ گیا۔

بیوی اور بچہ دونوں سو رہے تھے۔

گائے کے بولنے کی آواز آئی۔ گائے دودھنے کا وقت تھا۔ اتنی جلدی؟ وہ تو سویا ہی نہیں تھا۔

وشوروپ پوجا کا گھنٹہ ٹن ٹن بج اُٹھا۔ مارگم اُٹھا اور دانتن کرنے لگا۔ پھر پان منہ میں ڈال کر متبا کو چباتا ہوا سیدھا ٹرمٹی کے گھر پہونچا۔

"آیئے" پجاری نے خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔ وہ چبوترے پر کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ اُن کی بیوی دروازے پر گوبر کا لیپ کر رہی تھی۔

"ایسا کوئی نہیں جو آپ کے گھنٹے کی چرچا نہ کرتا ہو۔ وہ رات امانپٹے میں سو رہے تھے کتنی دُور ہے؟ قریب تو میل ہوگا؟"

"ہاں صاحب کیسی آواز ہے ٹان ٹان کرتی ہوا میں تیرتی آتی ہے۔ اپنے بھتیجے سے بھی کہا تھا۔ "ہم تو گیانی ہو گئے ہیں، اب لوٹ کر نہ جائیں؟"

"شاباش تم سمجھ گئے۔ کہتا ہے کہ وہ گیانی ہو گیا۔ اپنے باپ زمانے میں وہ عیسائی ہو گیا تھا۔ آپ کے گھنٹے کی آواز سُن کر لو

نے کا ارادہ کر رہا ہے۔ ہے نہ ؟"

"جی حضور ایسا ہی ہے۔"

"چنیار صاحب آپ سے اسی سلسلے میں کچھ عرض کرنے کے لئے ہی حاضر ہوا تھا۔ جب میں اُس کی آواز سنتا ہوں تو دماغ میں غرور آجاتا ہے کہ میں نے اُسے بنوایا ہے۔ یہ تو ایک گناہ ہے نہ ؟" مارگم نے پوچھا۔

"آپ کیسی بات کر رہے ہیں ؟ کوڑا دان لگوانے والے چھوکرے بھی گلی گلی ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اور اس پر لمبے چوڑے مضمون لکھوا ڈالتے ہیں۔"

ٹرسٹی کی بیوی نے ڈبہ کھول کر اس میں سے رنگوٹی نکالی اور بندی لگانے کے بعد صاف صاف لکیریں کھینچنے لگی۔

"نہ معلوم مجھے کیوں اپنا یہ تحفہ معقول نظر نہیں آیا۔ جب بھی گھنٹے کی آواز ہوتی ہے تو میرے ذہن میں یہ خیال اُبھر آتا ہے کہ جیسے میں نے ایک بڑی بھاری بھول کر لی ہے۔ اس سے نجات پانے کے لئے ایک حل میرے ذہن میں ہے۔ آپ سے یہی بیان کرنے کے لئے آیا ہوں۔"

"ایسی کیا بات ہے ؟"

اسی قیمت کی چار پانچ چاندی کی گھنٹیاں لگوانے کا ارادہ ہے۔ ایک وشنو دیشور کے لئے ایک بھگوان کے لئے، ایک دیوی ماتا کے لئے۔ ایک برہما کے لئے، ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ۔ ۔ ۔ اسے میں واپس لے لیتا ہوں۔

"کیا کہتے ہو ؟"

"ہاں چنیار جی، میری کیا ہستی ہے ؟ میں تو اندھیرے کونے میں پڑا ہوا ایک معمولی آدمی ہوں۔"

"آپ چاندی کی گھنٹیاں بنوا رکھئے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اسے واپس مت لیجئے۔ بھگوان آپ کے دل میں بیٹھا کچھ کروا رہا ہے آپ بڑی اچھی بات کہہ رہے ہیں۔ لوگوں نے سن لیا تو کیا تم پر ہنسیں گے نہیں اور کہیں گے نہیں کہ کیا اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں ؟ کیا اسی کے لئے آپ کے سویرے دوڑے آتے ہیں۔ عقلمند ہو کر آپ کم عقلی کی باتیں کر رہے ہیں۔"

مارگم کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

چنیار سے جیسے جیسے وہ باتیں کرتا وہ ویسے ویسے ضد پکڑتے جاتے۔

مارگم نے نہایت مایوس ہو کر گھر کا راستہ لیا۔

جب صبح غسل کرتے ہوئے، صبح کی پوجا کے وقت بجنے والے گھنٹے کی آواز مارگم کے کانوں سے ٹکراتی اور وہ سوچتا بہرے لوگ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں۔

## بقیہ: چاندی

"خوب چمکیلا ٹھیک سونے کے تھال جیسا۔"

"کس طرف ؟"

"وہ دیکھو۔ ذرا اس طرف منہ گھماؤ" اور چھبی نے شبو کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھ کر اس کا منہ تھوڑا اور پرے اٹھا دیا۔

اس بھرپور چاندنی میں چھبی کا ہاتھ پکڑ کر پھول کی خوشبو، جھینگر کی جھنک اور میلے کا شور سنتے سنتے سونے کے تھال جیسے چاند کی طرف آنکھیں گڑائے کھڑا رہا شبو۔

## بقیہ: مردہ آدمی کی تصویر

"یہ سماجی مسائل کیا حل ہو گئے ؟"

"نہیں ابھی نہیں !" اس نے جواب دیا۔ "آؤ دوسرے کمرے میں چل کر اطمینان سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

میں اُٹھ کر اس کے پیچھے چل دیا اور ہم دوسرے کمرے میں پہونچ گئے۔

"تم ذرا غور سے اب اس تصویر کو دیکھو اور بتاؤ کہ کیا واقعی میرا مردہ چکا ہے ؟" اس نے اپنے خاوند کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اُس مرے ہوئے آدمی کی تصویر کی طرف غور سے دیکھا تو میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ کارنس پر جو تصویر رکھی تھی۔ وہ میری ہی تھی۔ میں دم بخود کبھی اُسے اور کبھی اُس تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"کڑک ۔ ۔ ۔ ۔ کڑک ۔ ۔ ۔ کڑک" چڑیا بدستور موتی چگ رہی تھی

"بتاؤ نا ! یہ آدمی مرا ہوا ہے یا زندہ ؟" اس نے مجھ سے پھر سوال کیا۔ اور سگریٹ کا دھواں میرے چہرے پر بکھیر دیا۔

میں عجیب جھنجھلاہٹ میں تھا۔ کوئی جواب بن نہیں پڑ رہا تھا۔ آخر نہ جانے کیسے میرے مونہہ سے آپ ہی آپ نکل گیا۔

"یہ آدمی مر چکا ہے !"

اُس نے میرا جواب سُنا اور کھلکھلا کر ہنستی ہوئی دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔ جہاں اب بچوں نے جاگ کر رونا شروع کر دیا تھا۔

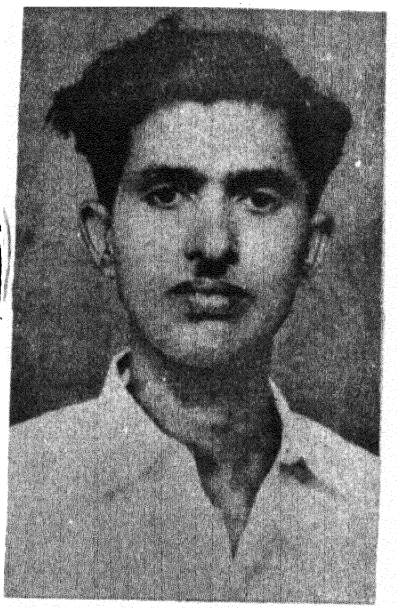

# کڑوا ٹکڑا

بی کانتا راؤ

**میں** جب پہلی بار ایک بڑی فیکٹری میں پرسنل آفیسر، بن کر بمبئی گیا تھا، تب ایک شخص کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سُنی تھیں۔ میرے دفتر کے افسر اعلیٰ سے لے کر چپراسی تک کی باتوں سے میرے دل پر ایک بات نقش ہو گئی تھی اور وہ یہ کہ وہ — ناتھو رام و نائک پاٹل — انتہائی احمق شخص ہے۔

وہ کھلے چھوڑے ہوئے سانڈ کی طرح تھا۔ اُس کو آتے ہوئے دیکھ کر پھاٹک پر کھڑا پہریدار بھی راستہ دے دیتا تھا۔ میری جگہ پر پہلے جو افسر تھے، اُنہوں نے ایک بار پاٹل کو چارج شیٹ دی تھی۔ پاٹل نے اُسے اُنہیں کے سامنے پھاڑ دیا اور پوچھا تھا، "کیا وہ اپنے اکلوتے لڑکے کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتے؟" وہ افسر اپنے بیٹے کو زندہ بچائے رکھنے کی خواہش میں کچھ نہ کر سکا۔ ایسے کتنے ہی واقعات کا ذکر کرتے ہوئے، آخر میں سبھی نے مجھے یہ مشورہ دیا "اس آگ سے مت کھیلئے، کہیں ہاتھ نہ جل جائیں" اس قسم کے لوگوں کے بارے میں جان کر اُنہیں سُدھارنے کی کوشش کرنا،

پندرہ برس کی نوکری میں میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ شکایت اور سو
کرنے والے افسر کی بجائے سُدھارنے کی کوشش کرنے والا ہی زیادہ کا
حاصل کر سکتا ہے۔ یہ میرا پختہ یقین ہے۔

ایک ضرورت ایسی آپڑی تھی کہ میں نے پاٹل کو بلانے کی ٹھانی اور
بلا بھیجا۔ میرا بُلاوا پا کر وہ بڑی روکھی سی آواز میں ہنس دیا تھا۔ بہت دیر کے
دھیرے سے میرے پاس آیا۔ وہ اچانک کمرے میں آ داخل ہوا تھا۔ وہ
رام صاب، کہتے ہوئے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ چھ فٹ اونچے بڑی بڑی بھر
کالی مونچھوں والے اس شخص کی باتوں سے سنجیدگی ٹپک رہی تھی۔ نمایاں
بڑھے ہوئے پودے کو نمک کا پانی لگنے کی مثال اس کے تندرست جسم کو شرا
عادت نے تھوڑا سا جھکا دیا تھا۔ جنگلی سُور کے بکھرے بالوں جیسے اس کے سر کے
سے تیل چُو رہا تھا۔ تمباکو کھانے سے پھُولا ہوا منہ چاک کی طرح چل رہا تھا کٹا
ناک کے دونوں طرف تیز آنکھوں کو اور شام کی ڈھلتی ہوئی دھُوپ کو ڈھکنے
بادل جیسے اُس کے جسم کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

"کیوں میرے چہرے پر کوئی سینما ہے صاب"۔ میں اُس کے اس سوا
چونکا اور مُسکراتے ہوئے بولا "تم بہت خوبصورت آدمی ہو"
زور سے ہنستے ہوئے اُس نے کہا۔ "کئی افسر آئے گئے، لیکن سچی با
کہی تو آپ نے"

"تمہارے جیسا اونچا، مضبوط کاٹھی کا اور تیز آنکھوں والا شخص کبھی د
ہی نہیں۔ اگر میں عورت ہوتا . . . ."

"ارے دُور ڈبا . . . ." چپراسی کی طرف مُڑ کر اُس نے کہا "ا
مذاق کرنے والا صاب میں نے کہیں نہیں دیکھا"

"پاٹل مجھے اس شہر میں آئے پندرہ دن ہونے کو آئے ہیں لیکن تمہیں
کا یہ پہلا موقع ہے، سنا تھا، تم بہت بُرے ہو، لیکن تم سے ملنے کے بعد لگتا
تمہارے جیسا بھلا آدمی شاید کوئی دُوسرا نہیں ہے"

اس نے ایک بار مونچھوں پر تاؤ دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں
طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا "جانتے ہو، تمہیں میں نے کیوں بلایا۔

"چارج شیٹ دینے کے لئے؟

"نہیں۔ پہلے مروت، محبت کی دوا سے مرض کو دُور کرنے کی کوش

ں گا۔ دوا سے ٹھیک نہ ہونے والے مرض کا علاج آپریشن ہے ہی۔ تمہارے شخص کو دوا سے یا آپریشن سے ٹھیک کرنا ہوگا؟"

"مجھے مریض کہنے والے ہی خود مرض میں مبتلا ہیں، صاب۔"

"تمہارا ریکارڈ دیکھا مہینے میں ہفتہ بھر بھی کام پر نہیں آتے ہو۔ آتے کام کئے چلے جاتے ہو۔ ہر ایک کے لئے قاعدے الگ الگ نہیں ہو سکتے، کے ساتھ ایک سا سلوک ہونا چاہئے۔"

بڑی لاپروائی اور روکھے پھیکے میں اس نے جواب دیا "ایسا ہی ہے"

"اتنی کم اُجرت میں کیسے گزارا کرتے ہو؟"

"جو ملتا ہے، وہی کافی ہے۔"

"بیوی بچوں کا کیا کرتے ہو؟"

"صرف بیوی ہے۔ اسے کسی چیز کی کمی نہیں۔"

"میں یہاں تم لوگوں کی خدمت کو آیا ہوں۔ حکم چلانے کے لئے نہیں۔ گوں کی بھلائی ہی میں میری بھلائی ہے۔"

"ایسا .... تو ٹھیک ہے .... ایک پانچ روپے ادھر بڑھائیے"

نے جھٹ سے پانچ روپے نکال کر اُسے دے دیئے۔

"اے دوں دُبا ــــ یہ صاب تو جیسا کہتا ہے، ویسا ہی کرتا ہے،" یہ ہوئے اُس نے مجھے سلام کیا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

شام کو پھاٹک کے باہر بس اڈے کے پاس پی کرمست پڑے پاٹل کو نے دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ناچتے ہوئے سے پہلے کے افسر کو گالیاں دیتے ہوئے میری تعریف کرنے لگا۔ اپنے دیئے پانچ ں کے اس غلط استعمال کو دیکھ کر مجھے بڑی تکلیف ہوئی، پھر بھی اپنے لئے اس دل میں اچھی رائے پاکر میں قدرے اطمینان کے ساتھ وہیں کھڑا رہا۔ میرے تھ وہ بھی بس میں چڑھا۔ کنڈکٹر ٹکٹ کے لئے آیا تو اس نے میری طرف اشارہ کیا چلنے لگی تو وہ مراٹھی میں گنگنانے لگا۔ جب تب لئے ٹوٹنے پر بھی اس کی آواز بڑی رسلوم ہو رہی تھی۔

دوسرے دن جب میں دفتر پہونچا تو وہ برآمدے میں کھڑا تھا مجھے ہی "رام رام صاب" کہا۔ میں انجان بن کر بے رخی سے اندر جانے لگا تو وہ بھی اندر چلا آیا۔ اُسے بات کرنے کا موقع نہ دیتے ہوئے میں نے جھٹ ے سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اُس کی طرف بڑھایا۔ اُسے نہ لیتے ہوئے وہ بولا "کس لئے صاب؟"

"تم نے کل جو کیا تھا اُسی کے لئے؟"

"تم نے کل جو کیا تھا اُسی کے لئے؟"

"جس دن میری بیوی پیسے نہ دے گی، اُس دن آپ سے مانگ لوں گا"

اُس نے پیسے نہ لئے اور اپنے آنے کی وجہ بتائے بغیر ہی چلا گیا۔ ایک ہفتہ تک وہ پھر مجھے دکھائی نہ دیا لیکن میں دفتر میں اور گھر پر بھی اس کے بارے میں سوچتا رہتا۔ میں نے اس کی بیوی کے بارے میں کتنی ہی کہانیاں بنالی تھیں۔ ممکن ہے اچھے گھر کی بیٹی ہوگی یا کہیں کام کرتی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کوئی بیوپاری کرتی ہو۔ ممکن ہے چوری کی شراب شہر میں پہنچانے والی عورتوں سے گروہ میں شریک ہو۔ کسی طرح کی آمدنی نہ ہو تو خاوند کو شراب پینے کے لئے ہر روز پیسے کیسے دے سکتی ہے۔ کسی طرح کے کام کے بغیر اُسے رشوت، کیسے دے سکتی ہے۔ بغیر اولاد کے عورت رُوپ، جوانی کی وجہ سے خوبصورت تو ہوگی ہی۔ اس طرح ایک ہی عورت کے مختلف صورتوں میں میں نے کئی نقش بنا ڈالے تھے۔

خیال کے رنگوں سے مزین تصویروں کو حقیقت کی کنجی سے مٹا دینا مجھے پسند نہیں ہے۔ اس لئے میں نے اس عورت کے بارے میں کسی سے کبھی کچھ پوچھا نہیں۔ دوسرے ہفتے میں نے ٹائم کیپر کو بلایا۔ اس بیچ اتوار کو چھوڑ کر پاٹل لگاتار دس دن نوکری پر آیا تھا۔ یہ جان کر مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ ٹائم کیپر کنک کہنے لگا "آپ کے لئے اس کے دل میں بڑی عزت ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس صاب کی باتوں میں ایک کو بھی نہ مانوں تو میرے لئے اچھا نہیں۔"

"کیا اسی کے لئے وہ ٹھیک سے نوکری پر آرہا ہے؟"

"وہ نوکری پر نہ آئے تب بھی اُسے پروا نہیں۔"

"کیوں؟"

"اس کی بیوی جو کماتی ہے:"

"کیسے؟"

بنا سوچے ہی میں پوچھ بیٹھا۔

"اس کے گھر کے پاس ہی میرا گھر ہے۔ وہ اس کی دوسری بیوی ہے گوری چٹی خوبصورت، تندرست بھرے بھرے جسم والی ہے۔ یہ اس بے چاری کو بھر پیٹ کھانے کو بھی نہیں دیتا تھا۔ بھوک کی بات پر مارنے دوڑتا تھا کبھی کام کرنے کی بات چھڑتی تو بھی نہیں مانتا تھا۔ آگے جائے تو کنواں پیچھے جائے تو کھائی۔ اُسے اندیشہ تھا کہ کہیں بیچ گئی، تو وہ مار ہی ڈالے گا۔ لڑکر اس کے مضبوط ہاتھوں سے بچنا مشکل تھا۔

اگست ۱۹۷۰ء

اُس کے بھی پیٹ ہے۔ اُسے بھرنا ہی پڑے گا نا! سُندرتا ہے، تندرست جسم ہے اس کی بھی خواہش تھی کہ ویسا ہی خوبصورت اور تندرست شخص اس سے محبت کرے۔ آخر اُسے بھی تو کسی طور زندگی بسر کرنا ہے۔ اس لئے وہ ... : بیچ ڈالتی ہے۔"

"کس کو؟"

"تندرست بھرے بھرے جسم کو"

"ہائے! ....." میرے منہ سے ایک لمبی سانس نکلی جیسے کوئی شدید ناانصافی ہوگئی ہو۔

"رشوت دے کر ــــ پینے کے لئے پیسے دے کر ــــ اُس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ یہ بالکل جانور ہے۔ پی پی کر بھینسا بن گیا ہے۔"

میرے ذہن میں جو خیالی نقشہ تھا، اس کے رنگ ایک دم بکھر گئے۔ اس کو عام آدمی بنانا ہے تو بہت محنت کرنا پڑے گی۔ اگر میری محنت پاٹل کو صحیح راستے پر لاسکی تو وہ مفید ہوگی مجھے لگا کہ وہ مزاج کا اچھا آدمی ہے کسی بری صحبت نے یا کسی ناقابلِ برداشت تکلیف نے اُسے اس غلط راستے پر لگا دیا ہے۔ نوکری پہچان تو دے ہی رہا ہے۔ اب پینے کی عادت چھڑانے کی کوشش کرنا ہوگی۔ اگر اُسے کسی قابل بنا دیا جائے۔ تو وہ اس عورت کی عزت کرے گا۔ عزت پاکر وہ پھر سے اچھی گرہستی عورت بن جائے گی۔ پھر اُن کے دن آرام سے کٹ جائیں گے۔ میری محبت کو آزمائش میں ڈالنے والے شخص کی شکل میں پاٹل ہر وقت میرے دھیان میں رہنے لگا اپنے اعضا کو چوٹ سے بچانے کے لئے جتنا محتاط رہتا ہوں، پاٹل کے سلسلے میں بھی اتنی ہی احتیاط برتنے لگا۔ وہ مہینے کے تیسرے ہفتے میں پھر سے کام پر باقاعدگی سے نہیں آیا۔ اُسے بلانے کے بارے میں میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ اچانک آدھمکا۔ میں نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا "پھر کیا ہوگیا تمہیں؟ کام پر باقاعدگی سے کیوں نہیں آرہے ہو۔؟"

"صاب تین دن کے تاش کے کھیل میں جو کچھ کمایا تھا وہ سب کل ختم ہوگیا۔ ہاتھ میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ مجھے کچھ روپے چاہئیں۔"

"کتنے؟"

"دس روپے بس۔"

ذرا سا تامل کرتے ہوئے میں نے اُسے روپے دے دیئے۔

اُس شام اُس نے خوب پی۔ میں نے اُسے اڈے کے پاس نالے میں بے ہوش پڑا پایا۔ کپڑے بے حد گندے ہوگئے تھے۔ پاس جاکر دو تین طمانچے لگائے۔ اسی منٹے کی حالت میں اُس کے منہ سے نکلا "کون ہے؟"

"صاب ہوں" میں نے کہا۔

"صاب ہو" کہتے ہوئے اُس نے آنکھیں اُٹھا کر دیکھا اور رونے لگا۔ روتے روتے کہنے لگا، "صاب اب میں کبھی نہیں پئوں گا۔ پئوں گا ہی نہیں۔ اگر پئوں تو ڈھیس کر دیجئے گا۔"

اس واقعہ کے بعد اتوار کے دن صبح کے وقت میں اپنے گھر کے برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کوئی کتاب ہاتھ میں تھی لیکن میری نظر کتاب پر نہ تھی۔ سامنے کے باغیچے کی چار دیواری پر ایک ہری چڑیا دُم ہلاتی ہوئی چیں چیں کر رہی تھی۔ ایک کالی چڑیا کے پاس آتے ہی وہ ہری چڑیا پرے ہٹ جاتی تھی۔ تبھی میں نے پاٹل کو دیکھا۔ خیالوں کا سلسلہ ایک بارگی ٹوٹ گیا اس کا میرے گھر آنا مجھے بالکل پسند نہیں تھا۔ میں شراب کے نشے میں اپنے گھر کی طرف آنے والے کئی مزدوروں کو دیکھ چکا ہوں۔ پھر پیسے کے لئے آیا ہوگا۔ پیسے دے کر اُسے اور بگاڑ بنانے کا الزام میں اپنے سر نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے اُسے پیسے نہ دینے کا فیصلہ سا کر لیا۔ میرے دل میں اُسے صحیح راستہ بتانے کی ایک شدید خواہش پیدا ہوئی۔

"رام رام صاب" کہتے ہوئے وہ برآمدے کے پاس والے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اُس نے بے حد پی رکھی ہے۔ بدبو بھی آرہی تھی۔ اُسے بولنے کا موقع نہ دے کر میں نے کہا "دیکھو پاٹل، تمہارا یہ طور طریقہ مجھے بالکل ناپسند ہے۔ ہماری زبان میں ایک ضرب المثل ہے۔ کوّا بن کر قیامت تک جینے سے ہنس بن کر چھ مہینے جینا بہتر ہے۔ تمہیں کسی بات کی کمی ہے تو خوبصورت بیوی ہے۔ اچھی نوکری ہے مضبوط توانا جسم ہے۔ تم اپنے عیبوں سے ان سب کو بگاڑ رہے ہو۔ دُنیا میں قاعدے سے سلامت روی سے زندہ رہنے کا فخر یا عزت کہاں سے ملے گی۔ قاعدے سے جیو، دُنیا تمہیں دیکھ کر خوش ہوگی۔"

پاٹل بڑی خاموشی سے میری بات سنتا رہا اور پھر ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے بولا "اس دُنیا میں قاعدہ کہاں ہے صاب؟

"قاعدے کی بدولت ہی یہ دُنیا چل رہی ہے۔"

"قاعدے قاعدے کی رٹ تو سبھی لگاتے ہیں۔ میرے ساتھ اس مہانگر میں چلئے۔ بتاؤں گا قاعدہ کہاں ہے۔ آٹھ آٹھ منزلوں پر جینے والے امیر لوگ پاس کی جھونپڑیوں میں مرنے والوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔ کسی بھی

دکان پر جایئے، دھوکا ہی دھوکا ہے۔ اس چرچ گیٹ یا اسٹیشن کے پاس سو روپے کا نوٹ لے کر کھڑے ہو جایئے۔ کوئی خوبصورت عورت اپنا عریاں بدن دکھا کر، آپ کو کھینچ لے جائے گی۔ قاعدے کی حفاظت کرنے والے پولیس داروغے، سرکاری ملازم، عدالتوں کے حکام سبھی ہیں، لیکن قاعدہ کہاں ہے، بتایئے، دُنیا میں کتنے آدمی دانے دانے کے لئے ترس رہے ہیں۔ اور فیشن کے نام پر کیا کیا نہیں ہو رہا ہے؟ یہ چائے پارٹیاں کیا ہیں؟ یہ سب کون سے قاعدے کی حفاظت کے لئے کیا جا رہا ہے۔ درخت اپنے وقت پر پھلتا ہے، مرغی وقت پر انڈے دیتی ہے، کتے کا اپنا یقین اس کے ساتھ ہے جاندار ہے تو وہ اپنا کام کرتا ہی ہے۔ پھر آدمی؟ اس پیٹ کے نام پر کیسے کیسے اور کتنے کتنے پاپ ہو رہے ہیں، صاب۔ اس نگوڑے پیٹ کو بھرنے کے لئے کیا مٹھی بھر گھاس کافی ہے؟ اس دنیا میں قاعدے سے محروم اگر کوئی جاندار ہے، تو وہ انسان ہے۔ انسان میں قاعدہ کہاں ہے۔ قاعدہ تو صرف کتابوں میں درج ہے۔ صاب۔"

اتنی لمبی تقریر سُن کر میں نے کہا، "قاعدے کی رٹ لگانے والے ہی کو دوسروں کی غلطیاں شمار کرنے کا حق پہونچتا ہے؟"

پاٹل میری بات سمجھ گیا وہ ہنس کر بولا "پینے کی عادت چھوڑنے کے لئے کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں، بس، میں یہی چاہتا ہوں۔"

"پی کر میں اپنے دکھوں کو بھول جاتا ہوں۔ پی کر میں جانور بن جاتا ہوں، خوش رہتا ہوں۔ زندگی میں میرے لئے ایک ہی سکھ ہے۔ اس سے مجھے محروم مت کیجئے صاب،" اُس نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"کہتے ہو کہ پی کر جانور بن جاتا ہوں۔ جانور کو سکھ دکھ کا احساس نہیں ہوتا۔ سکھ دکھ کو محسوس کرنے والا صرف انسان ہے۔ تمہاری عقل اتنے دنوں سے خوابِ غفلت میں محو ہے، اب اُسے جگاؤ حیوانی خصائص کو چھوڑو۔ آدمی بنو، سکھ دکھ کو محسوس کر کے دُنیا کے اس سمندر کو پار کر لو۔ جانور سے آدمی بننے کے لئے پینے کی اس بُری عادت کو چھوڑ دو۔"

خالی خالی نظروں سے وہ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ لیکن اُس نے اس بدعت کو ترک کرنے کی حامی نہ بھری۔ اٹھ کر جاتے ہوئے دس روپے کا نوٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ ایک لمحے کے لئے میں اپنے کو بھول سا گیا۔ پھر بولا، "رکھو . . . . "

"نہیں صاب، اس سے قرضہ نہ لادا ہوا تو آپ کے گھر میں پیدا ہو جاؤں گا۔ مجھ جیسے بُرے آدمی سے بھگوان آپ کو بچائے۔" یہ کہتے ہوئے، وہ نوٹ کو وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔

یہ نوٹ کسی نوجوان عورت کو اپنا جسم بیچنے سے ملا ہوگا۔

اس خیال کے آتے ہی میں نے اُسے خرچ نہ کرنے کے خیال سے ایک جگہ چھپا کر رکھ دیا۔

اس کے بعد دو مہینے تک کام پر اس کی حاضری اطمینان بخش رہی۔ تین بار اوور ٹائم پر کام بھی کیا۔ ایک بار کام پر نہ آیا۔ میں نے اطلاع پاتے ہی اُسے بلایا۔ کہا: "آئندہ کبھی ایسا کرو گے تو ضابطے کے مطابق تمہیں پولیس کے حوالے کرنا پڑے گا۔"

ایک دن دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ پولیس چوکی سے ٹیلی فون آیا! انسپکٹر پاد و نے پاٹل پر مہربانی کر کے اس کی خواہش پر مجھے ٹیلی فون کیا تھا۔

"کیا وہ پینے کے سبب سے حوالات میں ہے؟"

"نہیں"

"پھر کس لئے؟"

"دو آدمیوں کو مار مار کر بے ہوش کر دیا۔"

"کیوں؟"

"کچھ بھی نہیں بتا رہا ہے۔ کہتا ہے اس دُنیا میں سوائے آپ کے کوئی اُس کا نہیں ہے۔ اس لئے ضمانت پر رہا ہونے کے لئے آپ کو بُلا رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

یہ کہہ میں نے فون رکھ دیا لیکن اُلجھن میں پڑ گیا اُس کے ساتھ رہنے والے، اُس کے پڑوسی، دوست، دوسرے سبھی لوگ کیا ہوئے۔ میں ذمہ دار افسر ہوں۔ میری ضمانت پر اُسے رہا تو کر دیں گے لیکن اگر وہ کہیں فرار ہو گیا تو . . . . ؟" رہائی کے بعد پنجرے سے چھوٹے شیر کی طرح کسی اور کا خون کر دے تو . . . . ؟ یہ ذمہ داری لے کر میں ایک بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہوں۔ کتنوں کا مقابلہ کرنے والا طاقت ور پاٹل میرے ساتھ بکری کے سامنے سر جھکائے شیر کی طرح پیش آتا ہے میں پولیس چوکی میں جائے بغیر نہ رہ سکا۔ میری بے چینی نے مجھے یہ ذمہ داری لینے پر مجبور کیا۔

اگست ۱۹۷۰ء

پاٹل سے مل کر میں نے پوچھا: "ارے تم نے ان لوگوں کو پیٹا کیوں؟"

"وہ دونوں بیوقوف میری بیوی پر بُری نظر رکھتے تھے۔ اپنی گھر والی کے بارے میں آپ سے کچھ کہا نہیں تھا، صاب۔ وہ تو آگ ہے آگ۔ میرے گھر کے لئے میکے سے لائے پیسے بھی مجھے دیدیتی ہے۔ وہ اپنا کام کر رہی تھی وہ سیٹی بجا کر اُسے چڑھانے لگے تو گھر میں بیٹھا میں چپ کیسے رہ سکتا تھا۔ اُن کی چمڑی اُدھیڑ دی۔ بے ہوش ہو گئے سالے۔ پھر کبھی وہ لوگ اچھے گھر کی عورتوں کو اس طرح چھیڑنے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔"

"اُنہیں پتہ نہیں وقت پڑے ہوئے تو نہیں تھے۔؟"

"نس نس میں رچی بسی عادت ایک بار گی کیسے چھوٹے گی صاب!"

"آپ میری بھلائی ہی کے لئے تو کہتے ہیں، میرے بگڑنے یا بننے سے آپ کو کیا ملنے والا ہے۔ آپ کا میرا کیا رشتہ ہے؟ کیسا قرب ہے؟ لیکن آپ میرے لئے ہمیشہ تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ چنانچہ اس مصیبت کے وقت آپ ہی میرے سب کچھ ہیں۔"

"میں ایک ذمہ دار عہدے پر ہوں۔ تمہاری ضمانت دینے میں کتنا خطرہ ہے؟ یہ بھی سوچا تم نے....."

"جن پر مجھے بھروسا تھا، اُن میں سے کسی نے میری امداد نہیں کی۔ اب آپ کے علاوہ میرا بھلا چاہنے والا کوئی اور نہیں ہے۔"

"اچھا، تو میں جیسا کہتا ہوں، ویسا کرو گے نا؟"

"کہئے تو" اُس نے میری آنکھوں سے آنکھیں ملائیں۔

"وعدہ کرو کہ آج سے شراب کو چھوؤ گے بھی نہیں" یہ کہتے ہوئے میں نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میرے دائیں ہاتھ میں اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو بھر کر وہ بولا: "اب... کبھی... شراب نہیں چھوؤں گا۔"

میری آنکھیں بھر آئیں۔ اس شیر کو نکیل ڈالنے میں کامیاب ہونے پر میں اچنبھے میں پڑ گیا۔ ضمانت پر اُسے کیا چھڑایا مجھ پر ایک اور ذمہ داری آپڑی۔ اس کی بیوی کا چال چلن بگڑا ہوا ہے۔ پاٹل کو اس پر شک نہ گزرے، اس کی کوئی تدبیر کرنا ہوگی۔ چنانچہ اس معاملے کو عدالت تک نہ جانے دینے کا کوئی طریقہ ڈھونڈھ نکالنا ہوگا۔ کوئی ایسی صورت پیدا کرنی ہوگی کہ اس معاملے میں اس کی بیوی کا ذکر ہی نہ آنے پائے۔ یہ سوچ کر میں نے پاٹل سے کہا: "تم اپنی بیوی کا ذکر چھیڑو گے تو اُسے بلا ضرورت عدالت میں آنا پڑے گا۔ تم کہہ دو کہ وہ (جن کو تم نے پیٹا ہے) اندھیرے میں چور جیسے دکھائی پڑے تھے۔ شبہ ہونے پر پکارا تو کسی نے جواب نہ دیا۔ اُنہیں پکڑنے کے لئے آگے بڑھا تو انہوں نے پہلے مجھے مارا اس لئے میں نے اپنی حفاظت میں اُنہیں مار گرایا۔"

یہ جملہ دو مہینے چلتا رہا۔ میں نے فوراً وکیل مقرر کیا۔ انتہائی کوشش اور نہ چاہنے کے باوجود اُس کی بیوی کا ذکر بیچ میں آگیا۔ عدالت میں گواہ کی حیثیت سے اُسے آنا ہی پڑا۔ خوش قسمتی سے، اُس کی بیوی پر شک و شبہ کا مرحلہ نہ آیا۔ مجھے ان دو مہینوں میں پاٹل کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اُسے دیکھنے پر مجھے غصہ آنے کے بجائے ہمدردی ہی ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا، ہیرے کو کوئلے میں مڑھ دیا گیا ہے۔ اُسے دیکھنے سے ایسا لگتا تھا، اس کے روشن سینے میں نفرت بھر از سر نو ملا دیا گیا۔ پاک صاف رشتہ ڈھیلا کر دیا گیا ہے۔ ان دونوں کے لئے ایسے کتنے ہی خیالات میرے ذہن میں پیدا ہوتے تھے۔

سُور کو گائے ثابت کرنے کی قابلیت رکھنے والے وکیل کے ہونے سے، پاٹل کے ڈر کی وجہ سے، اُس یا اُس کی بیوی کے خلاف، مناسب گواہیوں کے نہ ملنے سے، وہ بغیر کسی جرمانے کے بری ہو گیا۔ یہ خبر پا کر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔

پاٹل اب بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اس نے اب ایک نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ پچھلے برس کے پاٹل اور آج کے پاٹل میں، ظاہری شکل و صورت کو چھوڑ کر، کوئی یکسانیت نہ تھی۔ وہ کام پر ٹھیک ڈھنگ سے آرہا ہے۔ پینے کی عادت بالکل چھوڑ دی ہے۔ آج وہ کوئی احمق نہیں ہے۔ بُروں سے دُور دُور ہی رہتا ہے ضابطے کا خیال رکھتا ہے۔ وہ اب سکھ دکھ کو محسوس کرنے والا ایک دُنیاوی شخص اور قاعدے کی حفاظت کرنے والا شخص ہے۔

میں نے ایک بُرے شخص کی کایا کلپ کر دی ہے۔ کیسے ٹیڑھے کام کو سیدھا کیا ہے۔ میں اس فخر سے مسحور بنا رہا۔ اُس کی بیوی کی حیا اور احسان مندی سے سرشار نظریں میرے ذہن پر نقش تھیں۔ لیکن.....

ایک دن آدھی رات کے وقت کسی نے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں چونک پڑا اور چلایا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں صاب" یہ اُسی کی آواز تھی۔

اتنی رات گئے کیوں آیا؟ یہ سوچتے ہوئے دروازہ کھول کر بتی جلائی۔ تک کر چور ہونے کی وجہ سے ٹھنڈی آہیں بھرتے، خون میں لت پت قمیض پہنے پاٹل کو

(بقیہ صفحہ ۶۵ پر)

# پچھتاوا

لال پشپ

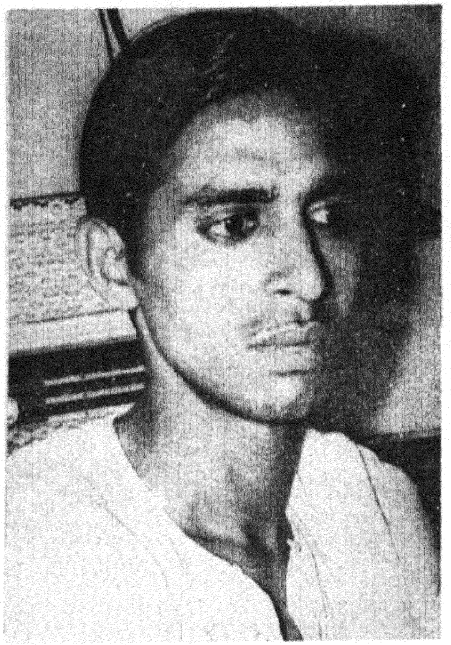

میں چاہتا ہوں کہ جو چیز لگاتار میرے دل کو چیر رہی ہے، اُسے جڑ سے اکھاڑ کر باہر پھینک دوں۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے کردار کی ایک معمولی اور چھوٹی سی بھول ایک خطرناک واقعہ بن کر میری زندگی میں کانٹے کی طرح چبھا کرے گی۔ اُس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ جس چیز کو میں نے معمولی اور عام سمجھا، وہی چیز کسی کی موت کا باعث بن کر بھوت کی طرح زندگی بھر میرا پیچھا کرتی رہے گی۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر زندگی ہے تو جرم بھی ہے۔ ان جانے سے بھی جرم سرزد ہو جاتا ہے۔ اور خواہ وہ عام یا معمولی کیوں نہ محسوس ہو مگر بعد میں یہی معمولی جرم جب کسی کی موت کا باعث بن جائے تو ایسے معمولی واقعات کی وجہ سے تمام زندگی خود کو حقیر، خود غرض اور احسان فراموش ماننے سے فائدہ ہی کیا؟

مگر نہیں . . . . ایسا سوچ کر میں خود کو تسلی نہیں دے سکتا۔ یہ واقعہ میرے دل میں چبھ کر ایک تیز کانٹے کی طرح میری زندگی میں دُکھ، درد اور پچھتاوا پیدا کر رہا ہے۔ اس واقعے کو بھلانے کی میں نے بہت کوشش کی لیکن کیا میں اس میں کامیاب ہو سکتا ہوں؟ جتنا بھولنے کی کوشش کرتا ہوں، اتنا ہی زیادہ صاف روپ لے کر اُس کی یاد رہ رہ کر آجاتی ہے۔

شاید زندگی میں ایسا ہی ہوتا ہے جس چیز کو جتنا بھول جانے کی کوشش کی جاتی ہے، وہ اتنا ہی زیادہ یاد آتی ہے۔

یہ واقعہ کب پیش آیا، یہ کہہ سکوں اس کے قابل تو نہیں مگر کیسے پیش آیا یہ کہہ سکتا ہوں۔

اُن دنوں میں وے پارے میں ایک دوست کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایسا طے ہوا تھا کہ میں رات کا فلم شو دیکھ کر اُن کے یہاں کھانا کھاؤں۔ کسی خاص کام کی وجہ سے میرا دوست فلم دیکھنے میرے ساتھ نہیں جا سکا تھا۔ فلم ساڑھے نو بجے ختم ہوئی۔ وی ٹی سے وے پارے جانے کے لئے دادر پر اُتر کر گاڑی پکڑنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

گاڑی جب دادر سے چلی تب دس بج چکے تھے۔ من میں بار بار ایک ہی خیال آرہا تھا کہ میرا دوست نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا؟ اس کے گھر کے لوگ بھی نہ معلوم کیا رائے رکھتے ہوں گے؟ اس خیال میں محو مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ گاڑی کافی دیر سے باندرہ کے پلیٹ فارم پر کھڑی ہے۔ ہر شخص کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ کچھ دُوری پر لائن خراب ہو گئی ہے اور جب تک یہ ٹھیک نہ ہو تب تک گاڑی آگے نہیں بڑھے گی، ہر شخص یہی باتیں کر رہا تھا۔

اس طرح جب آدھ گھنٹہ گزر گیا اور گاڑی نہ چلی تو میں بے چین ہو کر نیچے اُترا۔ پلیٹ فارم پر پیر رکھنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ سارا پلیٹ فارم آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایک آدمی نے جو سندھی لگتا تھا، پاس کھڑے گجراتی کو ڈھکیل کر میرے کھڑے ہونے کی جگہ بنا دی۔ کیا معلوم اتنی بھیڑ میں کسی گجراتی نے بھی اپنے کسی گجراتی بھائی کے واسطے جگہ بنانے کے لئے پاس کھڑے ہوئے کسی سندھی کو نہ ڈھکیلا ہو اس وقت یہ بات مجھے ذرا بھی نہیں اکھری۔ لیکن آج یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ایک ہی ملک میں ہندو ستائیت کے بدلے لوگوں میں یہ بھید بھاؤ کتنا زیادہ نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔

ذات پات کے یہ تفرقے ہی میری زندگی کے اس ناقابل فراموش حادثے کا باعث ہیں۔ میں، میری ذات، میری زبان، میرا صوبہ، میرا ملک ... آدمی کتنا تنگ نظر اور حدود کا پابند ہو گیا ہے پھر نہ معلوم کتنا وقت گزر گیا۔ بھیڑ بڑھتی گئی۔ پیچھے سے جو گاڑیاں آتی تھیں وہ بھی کھڑی ہو جاتیں۔ جہاں دیکھو وہاں آدمی ہی آدمی، پلیٹ فارم پر آدمی، سیڑھیوں پر آدمی، آدمیوں کی بھیڑ، شور و غل، گرمی، بھیڑ، دھکا مکی، بیڑی سگریٹ کی بدبو، بچوں کی چیخیں ... کسی کے جوتے کی ایڑی سے پیر کچل جانے سے چیخیں اور جھگڑے۔

اسٹیشن کے باہر نکل کر دو لے پارلے پہونچنے کے لئے دوسرے ذرائع کم نہیں تھے۔ بس مل سکتی تھی، ٹیکسی بھی مل سکتی تھی۔ مگر اہم بات — اتنی بھیڑ میں سے باہر نکلنے کے لئے راستہ ہی نہ تھا۔ اپنی جگہ سے تھوڑا کھسک جانے کے قابل جگہ بھی نہیں رہی۔ میرے قریب ایک مہاراشٹرین کھڑا تھا۔ سفید بال، دبلا جسم، بوڑھا، آنکھوں پر چشمہ، چہرے پر بڑھاپے کی لکیریں۔ اس کے ساتھ سات سال کا ایک لڑکا بھی تھا جو آدمیوں کی اتنی بھیڑ بھاڑ دیکھ کر گھبرا گیا تھا، اور ڈر رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا کہ میں ملاڈ میں رہتا ہوں

"بوڑھا جسم ہے مجھے اس کی پروا نہیں۔ فکر اس لڑکے کی ہے۔ یہ بھیڑ میں ریل گاڑی پر چڑھ نہیں سکے گا۔" اس نے کہا۔

"میں نے کہا" لائن ٹھیک ہو جانے کے بعد دو ایک گاڑی نکل جانے دینا۔ بھیڑ کم ہو جائے گی ...."

"یہاں تو ایسے وقت میں پہلی گاڑی آتے ہی دھکم پیل شروع ہو جاتی ہے۔ کون گرا، کون مرا، یہاں کون کسی کی پروا کرتا ہے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد پھر بولا" بڑے شہروں میں تہذیب زیادہ ہے نا"

میں خاموش رہا۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اُس نے کہا" دیکھئے آپ اگر تھوڑی مدد کر سکیں ... آپ کی مدد سے لڑکا چڑھ سکے گا" کہتے ہوئے اُس نے لڑکے کو اپنی طرف کھینچ کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا" میرا یہ ایک ہی لڑکا ہے"

میں نے مدد کا وعدہ کیا۔

قریب بارہ بجے خبر ملی کہ لائن ٹھیک ہو گئی ہے اور فوراً ہی گاڑیاں جائیں گی۔ اس مہاراشٹرین کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے کچھ دیر کے لئے میں اپنی پریشانی بھول چکا تھا مگر دل پھر بے چین ہو گیا۔ اگرچہ جس وجہ سے میں پریشان ہو رہا تھا اس میں میرا ذرا بھی قصور نہیں تھا۔ کسی دوست کے یہاں مہمان بن کر آدھی رات کو جانا نہایت نامناسب تھا، مگر اس وقت میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ کچھ بھی نہیں کر سکتا یہ سوچ کر طبیعت پریشان ہونے لگی۔

اچانک میرے دل میں آیا کہ اس لڑکے کے لئے میں اپنی گاڑی کیوں چھوڑوں اس کا اور میرا کیا رشتہ ہے۔ ذات الگ، رنگ الگ، خون الگ، دو گھڑی کی ملاقات میں احسان لینے اور احسان کرنے کی کیا ضرورت۔ دوسری گاڑی مجھے شاید دس منٹ لیٹ بھی کر دے، آدھ گھنٹہ لیٹ بھی ہو سکتی ہے۔ ایک تو پہلے سے ہی اتنی دیر ہو چکی ہے، اور گاڑی چھوٹنے سے نہ معلوم کتنی دیر اور ہو گی۔ دوست کے گھر والے نہ معلوم میرے بارے میں کیا کیا سوچتے ہوں گے۔ نہ معلوم کیا رائے قائم کر لی ہو اور پھر ایک اجنبی مسافر کے لئے میں ایسا کروں بھی کس لئے؟

میرے خیالات کا سلسلہ انجن کی سیٹی سے ٹوٹا۔ گاڑی سامنے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ آدمیوں کے ساتھ میں بھی دوڑ کر اس بوڑھے کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ آدمی ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ کتنے ہی لوگ گرتے گرتے بچے اور کتنے ہی گر گئے مگر میں اپنے مضبوط ہاتھوں سے ایک دو آدمیوں کو گراتا راستہ بنا کر گاڑی میں چڑھ گیا۔

پھر بھی گاڑی نہیں چلی ... یہ کوئی نہیں سمجھ سکا۔ بیس منٹ اور بھی گزر گئے۔ آدمی پائدانوں اور ڈبوں کے بیچ کے بفر پر لٹک رہے تھے۔

لائن ٹھیک ہو گئی پھر بھی گاڑی کیوں نہیں چلتی، اس کی وجہ جاننے کے لئے ایک انجانے خواہے اور خوف کی لہر میرے دل میں دوڑ گئی۔ دروازے کے پاس اور پائدان پر کھڑے آدمیوں کو ڈھکیلتا میں اُتر کر پلیٹ فارم پر آیا۔ تھوڑی دُوری

(بقیہ ۵۵ پر)

# حسن ہے زندگی

اختر محی الدین

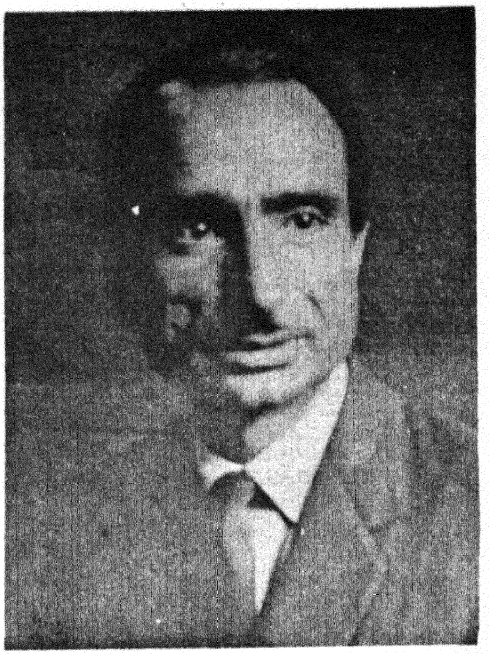

اگرچہ ملہ سبحان اب بھی نہ سمجھ سکا تھا کہ حقیقت کیا ہے لیکن اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس میم صاحبہ کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ ہے۔ اس نے میم صاحبہ کے ساتھ اپنا یہ رشتہ اُس وقت پہلی بار محسوس کیا تھا جب اُس نے پہاڑ کے دامن میں میم صاحبہ کی لاش اپنے بازوؤں میں اُٹھائی تھی اور اُس کے خون سے لت پت ہونٹوں کو چوما تھا۔ اسی وقت ملہ سبحان نے پہلی بار اپنے آپ سے کہا تھا "آج میں بات کی تہہ تک پہونچ پایا ہوں۔ میم صاحبہ کی لاش کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں جکڑ کر اُس نے اپنے دل میں کہا" وہ میری محبوبہ ہے۔ نہیں — یہ میرے بیٹے کی محبوبہ ہے نہیں نہیں یہ ہم دونوں کی محبوبہ ہے — نہیں نہیں نہیں۔ آج میں بات کی تہہ تک پہونچ پایا ہوں۔"

ملہ سبحان تمام چیزیں سمیٹ کر پہاڑ سے نیچے اُترا تھا۔ جس انداز سے وہ میم صاحبہ کے پیچھے پیچھے ایزل بورڈ، برش اور رنگ کندھے پر اُٹھا کر پہاڑ پر چڑھا تھا، بالکل اسی سکون اور اطمینان کے ساتھ وہ یہ سب چیزیں کندھے پر اٹھا کر واپس نیچے پہونچا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جاتے وقت میم صاحبہ چلتے دوڑتے اور ہانپتے ہوئے خود اُس کے ساتھ چڑھی تھی لیکن واپسی پر وہ اُس کے ساتھ نہیں تھی۔ واپسی پر پہاڑ کے دامن سے ملہ سبحان نے اس کی لاش اپنی بانہوں میں اُٹھائی تھی اور اب شالیمار پہونچ گیا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ شالیمار کا باغ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا پڑا تھا۔ دلایت سے آئے ہوئے صاحب اور اُن کی میمیں تھیں، مُلکی سیاح تھے اور کشمیری تو جیسے گھروں کو خالی چھوڑ کر شالیمار باغ میں ہی جمع ہو گئے تھے۔ باغ کے باہر سڑک پر موٹروں، گھوڑے گاڑیوں، سائیکلوں اور پیدل چلنے والوں کی دھکم پیل تھی۔ یہاں پر جمع بہت سے لوگوں نے جب ملہ سبحان کو دُور سے دھان کے کھیتوں میں سے آتے ہوئے دیکھا تھا تو وہ پہلے اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے تھے، مگر جب ملہ سبحان آنکھوں سے آنسو برساتا ہوا میم کی لاش بازوؤں پر اور بہت سا سامان کندھوں پر لے کر نزدیک پہونچا تو دیکھنے والے حیران رہ گئے تھے۔ چلنے والے ٹھٹک گئے تھے اور ایک لمحہ میں خبر چاروں طرف پھیل گئی تھی۔

دو صاحب آگے ملہ سبحان سے لاش چھین لی۔ اُسے اپنی موٹر میں رکھ دیا اور ملہ سبحان کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

ملہ سبحان پر مقدمہ چلا۔ ملہ سبحان نے اپنی طرف سے کوئی صفائی پیش نہیں کی۔ وہ صرف اتنا کہتا رہا۔ "اب میں صرف بات کی تہہ تک پہونچ پایا

ہوں" اُس نے جج کو بھی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں صرف یہی ایک بات کہی تھی۔

آخر ملہ سبحان کو شروع سے آخر تک سارا واقعہ سُنانا پڑا لیکن جب وہ سُنا چکا تو عدالت میں جمع لوگ اس انداز سے مسکرائے جیسے ملہ سبحان کا سُنایا ہوا یہ سارا واقعہ جھوٹ ہو۔ ایک انگریز نے تو جج کو صاف الفاظ میں کہا کہ ملہ سبحان جھوٹ بول رہا ہے۔ دراصل میم صاحبہ کو اسی نے قتل کیا ہے۔

مگر ملہ سبحان کا بیان سُن کر جج سوچ میں پڑ گیا وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ مختلف سوالات اُس کے ذہن میں اُبھرنے لگے۔ کیا ملہ سبحان نے میم پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی تھی، اور میم نے اپنی آبرو بچانے کے لئے پہاڑ سے چھلانگ لگا کر اپنی جان دیدی ـــــ نہیں ملہ سبحان کافی بوڑھا ہے۔ عمر میں اسّی برس سے تجاوز کر چکا ہے۔ پھر بھی اس کا ڈاکٹری معائنہ کرانا ضروری ہے۔ کیا ملہ سبحان نے میم کی دولت ہڑپ کرنے کے لئے ایسا کام کیا ہوگا؟ ملہ سبحان کے بیان سے تو ایسا بالکل ظاہر نہیں ہوتا۔ خیر میم کے والدین سے معلوم کیا جا سکتا ہے، کہ اس کے پاس کس قدر سونا چاندی موجود تھا۔ کیا ملہ سبحان کا بیان واقعی سچ ہو سکتا ہے۔ اس کے چہرے بشرے کے آثار سے اور بولنے کے انداز سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔

معائنہ کرکے ڈاکٹر نے رپورٹ دی کہ ملہ سبحان اتنا بوڑھا ہو چکا ہے کہ اب اُس کو عورت کی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔ میم کے والدین کشمیر پہونچے تو انہوں نے عدالت کے سامنے بیان دیا کہ میم کے پاس بس اتنے ہی پیسے تھے جتنے ملہ سبحان نے عدالت کے روبرو پیش کئے ہیں۔ اور طرح طرح کے جرح کرنے کے باوجود بھی ملہ سبحان نے وہی کچھ کہا جو اُس نے اپنے پہلے بیان میں کہا تھا۔

ملہ سبحان کو بری کر دیا گیا۔ لیکن بہت سے لوگ شکوک میں پڑ گئے۔ کئی سوچ رہے تھے کہ میم پاگل ہو گئی تھی کئی کہہ رہے تھے کہ ملہ سبحان بہت ہوشیار آدمی ہے، نہ معلوم کس نیت سے میم کو مار دیا ہو۔ کئی لوگ کہہ رہے تھے کہ اس پہاڑ پر پریوں کا مسکن ہے اور میم کو انہی کی نظر کھا گئی تھی۔ مگر ملہ سبحان اپنی ہی کہتا جا رہا تھا۔ وہ کسی کے کہے کی طرف دھیان بھی نہیں دیتا تھا۔ اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ میم کا اس کے بیٹے رمضان کے ساتھ اور رمضان کی وساطت سے خود اس کے ساتھ کوئی رشتہ ہے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اصل میں میم اور رمضان اور وہ خود ایک ہیں یا وہ ایک دوسرے کے بچے ہیں، ایک دوسرے کے محبوب ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ملہ سبحان اب صبح سویرے بستر سے اُٹھ کر پہلے پچھم کی طرف اونچے پہاڑوں کے اوپر اور نیلے آکاش کے نیچے بادل کے مرغولوں پر نظریں گاڑتا اور مسکراتا تھا۔ اُس کے بعد ڈل کی سطح پر کسی کنول پتے پر پانی کے قطرے پر اپنی نظریں جماتا تھا۔ وہ ایک قطرے کو کبھی دو میں تقسیم کرتا اور کبھی دو کو ملا کر ایک بنا دیتا اور جب کبھی اچانک کوئی قطرہ کنول پتے سے لڑھک کر جھیل میں کھو جاتا، تو ملہ سبحان زور سے قہقہہ لگاتا اور کہتا "اب میں بات کی تہہ تک پہونچ پایا ہوں" اور جو اکثر صبح کے وقت ملہ سبحان کو اکیلے میں اپنے آپ ہنستے مسکراتے، کنول پتوں سے کھیلتے اور آکاش کی طرف نظریں ٹکا کر باتیں کرتے دیکھتے، وہ اپنے من میں کہتے "بے چارا، پاگل ہو چکا ہے۔ نہ معلوم ان دونوں باپ بیٹوں کو کیا بد دعا لگی ہے۔ پہلے رمضان بھی پاگل ہو گیا تھا اور اُس نے خودکشی کر لی تھی اور اب ملہ سبحان پاگل ہو گیا ہے۔ نہ معلوم اس کا انجام کیا ہوگا؟"

## (۲)

ایچ بی بٹر فلائی اب بھی دُلہن کی طرح سجا سجایا ہوا تھا۔ اب بھی انگریز اپنی بیویوں کے ساتھ اس میں رہنے کے لئے آتے تھے۔ ملہ سبحان نے اب ایک ملازم بھی رکھ لیا تھا۔ وہ اس بڑھاپے میں بھی صاحب لوگوں کی خدمت کرتا تھا اور خوب پیسے کماتا تھا اس پر باقی مانجھی حسد کرتے تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ ایک طرف تو یہ پاگل ہو گیا ہے خود اپنے آپ سے ہنستا باتیں کرتا ہے اور کبھی پانی کے قطروں اور کبھی بادل کے مرغولوں پر فریفتہ ہو جاتا ہے مگر دوسری طرف باقی مانجھیوں کی طرح مزے سے کام کاج بھی کرتا ہے۔

ملہ سبحان آج غریب نہیں تھا۔ وہ کبھی غریب نہیں تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنے مقدور کے مطابق مزے کی زندگی گزاری تھی۔ ہاؤس بوٹ اُس کو وراثت میں ملا تھا۔ اُس کی شادی اُس کے والدین کے جیتے جی ہو چکی تھی۔ اُس کے چار بچے ہوئے تھے۔ دو لڑکیاں اور دو لڑکے۔ دو لڑکیوں کو وہ بیاہ چکا تھا۔ ایک بیٹا سات مہینے کی عمر میں مر چکا تھا مگر دوسرا بیٹا رمضان جوانی کے دنوں میں اُس سے چھن گیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم زوروں پر تھی۔ کشمیر میں بہت سی میمیں اور گورے آئے ہوئے تھے۔ سب ہاؤس بوٹ بھرے پڑے تھے، اور کسی بوٹ کے باہر "ٹو لیٹ" کا منحوس بورڈ آویزاں نہ تھا۔ انہی دنوں رمضان گھر سے

بھاگ کر فوج میں بھرتی ہوگیا تھا۔ ملہ سبحان کو رمضان کے اس اقدام پر بہت افسوس ہوا تھا۔ اُس نے سوچا تھا کہ آخر رمضان کو ہوکیا گیا۔ اپنے ہاں خدا نے گھر بیٹھے روزی بھیجی تھی ہمیں جنگ لڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اور پھر کہتے ہیں کہ جرمن لوگ پیسہ خرچ کرنا جانتے ہیں۔ اُن کے یہاں آنے سے ہمارا بھی بھلا ہوتا۔

لیکن ملہ سبحان کے ان خیالات کے باوجود رمضان بھاگ گیا تھا۔ وہ تھوڑا بہت پڑھا لکھا تھا اور اب اپنے علم کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا تھا۔ وہ پہاڑوں سے گھری ڈل جھیل میں اپنے آپ کو قیدی سا محسوس کر رہا تھا اور باہر کی دُنیا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ آخر یہ صاحب لوگ یہاں کیا دیکھنے آتے ہیں؟ اِن کے ملکوں میں ریلیں، جہاز، کارخانے، بم، جنگ اور بہت سی قابلِ دید چیزیں ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں افلاس کے سوا اور کیا ہے۔ چاروں طرف پہاڑ اور بیچ میں ڈل جھیل، لمبے جاڑے اور کڑاکے کی سردی، دیکھنے کے لائق ایک بازار وہ بھی سُونا سُونا۔

رمضان اِن تمام لوگوں کو بے وقوف سمجھتا تھا جو اپنے ملک کو چھوڑ کر یہاں کا افلاس دیکھنے کے لئے گرمیوں میں آتے تھے۔ اُس کو سارا کشمیر ایک پنجرہ سا دکھتا تھا جس میں وہ اپنے آپ کو چڑیا کی طرح قیدی محسوس کر رہا تھا۔

رمضان نے جب ہوش سنبھالا تھا تب سے کشمیر سے بھاگ کر کہیں دُور جانا چاہتا تھا۔ لاہور، بمبئی، کلکتہ، ولایت یا کہیں اور، مگر رمضان کے پاس کبھی اتنے پیسے نہ ہوئے کہ وہ چھوڑ کر چلا جاتا۔ اب اُسے جنگ کی وجہ سے موقع ملا تھا۔ حضوری باغ کے بھرتی دفتر میں نام لکھا کر وہ گاڑی میں بیٹھا اور بھاگ گیا۔

چار سال رمضان گھر سے دُور رہا۔ چار سال ملہ سبحان پاگلوں کی طرح اس کا راستہ دیکھتا رہا۔ اکلوتا بیٹا، اس کی آنکھوں کا نور۔ لیکن چار سال ملہ سبحان کو محض دو چیزوں نے سہارا دیا۔ ایک رمضان کی تصویر نے، جو اُس نے نہ معلوم کس ملک سے بھیج دی تھی اور دوسری اس کی گاہ گاہ آنے والی چٹھیوں نے۔ چٹھیوں میں کوئی خاص بات لکھی نہیں ہوتی تھی "میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہوں۔ صورت احوال یہ ہے کہ وادیٔ کشمیر جیسی اور کوئی دھرتی میں نے نہیں دیکھی۔ ہر جگہ بربادی اور ویرانی ہے۔" ملہ سبحان کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتی تھیں اور نہ اُس کو یہ باتیں سمجھنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ رمضان زندہ ہے اور وہ اپنے وطن کشمیر کو نہیں بھولا۔ وہ رمضان کی تصویر دیکھ کر خوش ہوجاتا تھا۔ اُس نے اِس تصویر کو فریم کرا کر "ایچ۔ بی۔ میٹر فلائی" کے ڈرائنگ روم میں سجا دیا تھا۔

چار سال بہت مدت تو نہیں جنگ ختم ہوئی اور رمضان رخصت پر گھر پہونچا۔ اپنی تصویر سے ملتا جلتا رمضان، ولایتی طرز کا لباس پہنے، انگریزوں کی طرح داڑھی منڈھائے، لمبا تڑنگا اور کسرتی جسم والا۔ لیکن اس کا رنگ ذرا سانولا ہوگیا تھا، اور نہ معلوم اس کے دماغ کو کیا ہوگیا تھا۔ ملہ سبحان کو رمضان کے دماغ کا حال اُس دن سمجھ میں آیا تھا جس دن میم صاحبہ نے پہاڑ سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرتے وقت کہا تھا "میں رمضان کو ڈھونڈوں گی میں رمضان کے پاس جاؤں گی۔"

رمضان جب فوج سے چھٹی پا کر گھر پہنچا تو اُس کی آنکھوں میں روشنی چمک اٹھی۔ گرمیاں شروع ہو رہی تھیں۔ وہ بہت خوش تھا اور قہقہے لگاتا تھا۔ اُس کو محسوس ہو رہا تھا کہ کشمیر کی نرم نرم اور ڈھیلی ڈھیلی زمین میں واقعی زندگی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ عراق، مصر اور عرب کے ریتیلے میدان بے جان اور مردہ ہیں۔ یورپ کی پتھریلی سڑکیں فیکٹریاں اور ریلیں بے رحم ہیں۔ جیسے مردہ لوہے نے سارے علاقے کو اپنے ٹھنڈے ہاتھوں میں بھینچ کر مردہ بنا دیا ہو۔ رمضان فوج سے چھٹی پا کر اب عجیب سی باتیں کرنے لگا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اُن ممالک کے لوگ بے حس ہیں۔ مردہ ہیں۔ جنگ لڑنا، بستیاں ویران کرنا، گم ہوجانا اور مرنا، کوئی بھی چیز اُن کے دل پر اثر نہیں کرتی۔ کوئی دھرتی دوست نہیں اور کوئی خطہ اپنا نہیں، میں بھی گم ہوجاتا اگر مجھے کشمیر کی حسین دھرتی ہر وقت میرے ذہن میں رہتی۔ میں اس دھرتی پر پھر ایک بار پاؤں رکھنا چاہتا تھا۔ میری آنکھیں کشمیر کے سبزہ زار پھر ایک بار دیکھنا چاہتی تھیں۔ میرا دل کشمیر میں تھا۔ اس لئے مجھے کوئی نہ مار سکا اور میں کہیں بھی گم نہ ہوسکا۔

یہ باتیں سُن کر جب لوگوں نے کہا کہ رمضان پاگل ہوگیا ہے تو ملہ سبحان کو بھی اِن باتوں پر یقین سا آنے لگا۔ وہ آہیں بھرتا اور رمضان کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اُس کی توجہ اِن باتوں سے ہٹانے کی کوشش کرتا تھا لیکن رمضان بیٹھے بیٹھے جھیل ڈل میں کود پڑتا اور تیرتا ہوا دُور نکل جاتا۔ کبھی وہ جلدی واپس لوٹتا اور کبھی دیر تک تیرتا چلا جاتا۔ کبھی وہ پانی کے نیچے ڈبکی لگا کر

غائب ہو جاتا اور کبھی آہستہ آہستہ تیرتا چلا جاتا۔ ملہ سبحان رمضان کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو جاتا، اور آخر جب وہ واپس آتا تو ملہ سبحان اس سے پوچھتا "میرے بیٹے تم کو ہو کیا گیا ہے۔ تم بچے تو نہیں ہو کہ جھیل میں ننگ دھڑنگ کود پڑو۔" رمضان جواب میں کہتا "بابا چھوٹی چھوٹی بہت سی مچھلیاں ایک ہی قطار میں جا رہی تھیں اور میں بھی انہی کے ساتھ تیرتا چلا گیا۔ انہوں نے ایک ساتھ پانی کی تہہ تک ڈبکی لگائی تو میں نے بھی لگا دی"۔ اور وہ انگلی سے جھیل کے ایک طرف اشارہ کرتا "وہاں سے یہ لوٹ آئیں اور میں بھی لوٹ آیا۔ اور انہوں نے مجھے چکمہ دینے کی کوشش کی۔ پہلے سیدھی قطار میں چلے لگیں اور پھر یک لخت دائیں طرف مڑ گئیں لیکن میں تو اُن سے زیادہ ہوشیار نکلا۔ بالکل انہی کے ساتھ ساتھ مڑتا رہا" یہ کہہ کر اُس نے زور سے قہقہہ لگایا۔

رمضان ہر روز صبح چھوٹے شکارے میں بیٹھ کر کبوتر خانے کے قریب پہونچ جاتا تھا۔ یہاں بید کے درختوں کا جھنڈ تھا گھنے بتوں کے بوجھ سے شاخیں ٹیڑھی ہو کر جھیل کے پانی کو چھو رہی تھیں جیسے حسین دوشیزائیں اپنی زلفوں کو بھگو رہی ہوں۔ نیچے اگا سبزہ بھی پانی پر پڑ رہی کرنوں سے بوس و کنار میں مشغول تھا۔ رمضان ہر روز صبح شکارے میں بیٹھ کر اس جگہ پہونچ جاتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے ڈل کا پانی بید کے درختوں اور سبزے سے بہہ بہہ کر نکل رہا ہو یا یہ بید اس دوشیزہ کہانی کی پریاں ہوں جن کے بالوں سے موتی جھڑتے ہیں۔ اور یہ سبزہ اُن پریوں کی یاد دلاتا ہے جو باتیں کرتے وقت منہ سے موتی رولتی تھیں۔ اور ڈل کا پانی دراصل موتیوں کے انبار ہیں جو کہیں کہیں کنول پتیوں پر اپنی اصلی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ رمضان اپنے کپڑے اُتار کر اور کبھی کپڑوں سمیت جھیل میں کود کر اُن موتیوں کو پانے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو انہی موتیوں، سبزے اور صبح کی کرنوں میں جذب کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سارے طلسم کا ایک حصہ بن جائے — اور رمضان کی یہ حرکتیں دیکھ کر لوگ کہتے تھے کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔ آخر ملہ سبحان کو بھی یقین ہونے لگا تھا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ اُس کے لئے تعویذ گنڈے لاتا رہتا۔ لیکن رمضان کی حالت جوں کی توں رہی۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے اس نے کھوئی ہوئی شے پھر سے پالی ہو۔ وہ حیران تھا کہ باقی لوگوں کو اس حسن کا احساس کیوں نہیں، اُس نے بہت دفعہ ملہ سبحان کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ "دیکھئے بابا" اُس نے کہا تھا "وہ — وہ بادل کا ٹکڑا جیسے میری رُوح آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی ہو، بابا۔ بابا کیا ہر موکھ کے سر پر سجنے کا دستار بندھا ہوا ہے؟ نہیں نہ کہنا بابا"

مگر ملہ سبحان ان دنوں یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا تھا اسی لئے اس نے رمضان سے بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔ رمضان بھی اب اُس کے ساتھ پہاڑوں بادلوں، پانی اور بید کے درختوں کی باتیں نہیں کرتا تھا۔ رمضان اب ایسی باتیں خود اپنے ساتھ کرتا تھا۔ صرف کبھی کبھی مایوس ہو کر باپ سے کہتا "بابا۔ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔ میں آپ کو سمجھاتا لیکن منہ میں زبان نہیں — میرے پاس الفاظ نہیں۔ بابا — وہ دیکھئے" اور یہ کہہ کر وہ یک لخت خاموش ہو جاتا اور سر جھکا کر کشتی کے باہر والے سرے کی طرف چلا جاتا۔

اور پھر لوگوں نے کہا کہ رمضان مکمل طور پر پاگل ہو چکا ہے۔ اس وقت ملہ سبحان ایسا نہیں مانتا تھا اور آج جب وہ بات کی تہہ تک پہنچ چکا ہے تو اس کے ماننے نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لوگوں نے خود دیکھا تھا کہ رمضان پاگل ہو گیا تھا۔ وہ اب وزیروں اور صاحب لوگوں کے پاس نہیں جاتا تھا وہ اُن کی خدمت کر کے پیسہ کمانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ وہ صرف اپنی کشتی کے اگلے سرے پر بیٹھ کر کنول پتیوں پر پانی کے قطروں کی طرف دیکھتا رہتا۔ وہ صبح سے شام تک انہی پر نظریں جمائے بیٹھا رہتا تھا۔ وہ کبھی کبھی اپنے آپ سے باتیں کرتا تھا "یہ موتی کہاں سے آئے ہیں؟ انہیں سبز پلیٹوں پر کس نے چن رکھا ہے؟ کاش سب لوگوں کو ان کی پہچان ہوتی۔"

اسی حالت میں گرمیوں کا موسم گزر چکا تھا اور اب خزاں بھی ختم ہونے کو آ رہا تھا۔ فضا میں مختلف رنگ بدلتے رہے اور ہر رنگ رمضان کے لئے خوشیاں لے کر آتا رہا۔ آخر جاڑا آ گیا — جاڑا جو مردہ ہے جس نے کنول پتوں کو مرجھا دیا جس کی وجہ سے بید کی پریوں کی زلفیں اُجڑ گئیں اور سبزہ مر گیا اور ہر طرف ویرانی ہی ویرانی پھیل گئی۔ رمضان کے دیکھتے دیکھتے یہ سب کچھ ہو گیا۔ اس کے سامنے اس کی کوئی بہت پیاری چیز کھو گئی۔ اُس نے ایک دن ملہ سبحان سے کہا "بابا۔ وہ کیا ہوا؟ وہ پانی — وہ سبزہ —"

ملہ سبحان نے محسوس کیا کہ رمضان بخار سے جل رہا ہے۔ اُس نے بڑے نرم اور پیار بھرے انداز میں رمضان سے کہا (جیسے رمضان پانچ برس کا بچہ ہو) "بیٹا جاڑا ختم ہوتے ہی بہار میں یہ سب چیزیں لوٹ آئیں گی۔"

"میں کتنی دیر انتظار کرتا رہوں؟" رمضان نے اس انداز سے کہا جس

طرح کوئی بیمار بچہ اس امید سے ڈاکٹر کا انتظار کرتا ہے کہ وہ آئے اور اُس کو کوئی من پسند کھانا کھانے کی اجازت دیدے۔

ملہ سبحان بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر رمضان نے اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا "جاڑا بہت بے رحم ہے بابا" اور اس کے بعد رمضان نے کچھ باتیں ایسی کہیں جنہیں سُن کر ملہ سبحان کے چہرے پر غم کی سیاہی پھیل گئی۔ ملہ سبحان رمضان کی یہ باتیں نہیں سننا چاہتا تھا مگر رمضان کہتا جا رہا تھا۔ آخر ملہ سبحان نے تھوڑا درشت لہجے میں کہا "ایسا نہیں کہتے بیٹے۔ تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ ابھی تمہیں بہت سی بہاریں دیکھنی ہیں" یہ کہتے ہوئے ملہ سبحان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اُس کو یقین ہو گیا کہ رمضان کو کسی کی بُری نظر کھا گئی ہے۔

اور یہ ملہ سبحان کی رمضان کے ساتھ آخری ملاقات تھی دوسری صبح جب ملہ سبحان کی آنکھ کھلی تو اس کی آنکھ کا تارا ڈل کے یخ بستہ پانی میں مردہ پڑا تھا۔ ملہ سبحان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اس کو رمضان کی وہ سب باتیں یاد آئیں جو کل رات اُس نے کہی تھیں۔

رمضان کے مرنے پر اگرچہ بہت سے لوگوں کو ملہ سبحان کے بڑھاپے پر رحم آیا لیکن رمضان کی موت کی خبر اُن کے لئے اچنبھے کی خبر نہ تھی۔ وہ پہلے ہی جانتے تھے کہ ایک روز رمضان اپنے آپ کو مار ڈالے گا۔ لیکن لوگوں کو اچنبھا اس وقت ہوا جب ملہ سبحان نے اُن سے رُندھی ہوئی آواز میں کہا "میرے بھائیو! اس کو سلیمان پہاڑی پر دفن کرنا اُس کی لحد مشرق کی طرف ہو اور اُس کی آنکھیں جھیل ڈل کی طرف ہوں" یہ سُن کر لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ آخر ملہ سبحان اپنے بیٹے کو قبرستان میں کیوں دفن نہیں کرنا چاہتا؟ وہ ایک ایک کر کے ملہ سبحان سے یہ سوال پوچھنے لگے مگر اُس نے کسی سے دل کی بات نہ کہی۔ یہ بھید ملہ سبحان نے کسی سے نہ کہا۔ اُس نے یہ بھید صرف اُس میم صاحبہ کے سامنے کھولا جس نے پہاڑی سے چھلانگ لگا کر جان دی تھی اور جس کے بارے میں ملہ سبحان سوچتا تھا کہ وہ اس کی بیوی تھی ــــ نہیں ــــ اُس کی بہو تھی ــــ نہیں ــــــ نہیں نہیں اس کی بیٹی تھی ــــ نہیں نہیں نہیں۔

## (۳)

ایچ بی بٹر فلائی جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ اس کے تمام کمروں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ اور "ٹوئیٹ" کا منحوس بورڈ جو جاڑے کے مہینوں میں ہاؤس بوٹوں کے باہر آویزاں رہتا ہے اب اُٹھ چکا تھا۔ ملہ سبحان خوش تھا کیونکہ اُس کے ہاؤس بوٹ میں ایک نوعمر اور معصوم میم صاحبہ ٹھہری تھی۔

یہ میم صاحبہ ایک انگریز کرنیل کی بیٹی تھی جو آج سے سترہ سال پہلے اپنی نوجوان بیوی کو ساتھ لے کر کشمیر آیا تھا اور یہاں اُس کے ہاؤس بوٹ میں دو مہینے ٹھہرا تھا۔ ملہ سبحان اور اُس کی بیوی نے اُن میاں بیوی کی خوب خدمت کی تھی اور دو مہینے گزرنے پر جب کرنیل اور اُس کی بیوی واپس چلے گئے تو اُنہوں نے ملہ سبحان کی بیوی کو بہت سے کھلونے رمضان کے لئے دیئے تھے۔ رمضان اُن دنوں تین برس کا بچہ تھا۔ کرنیل کی بیوی کبھی کبھی اُس کو اپنے کمرے میں بلوا کر اپنے ہاتھوں سے کھلاتی پلاتی تھی۔ ملہ سبحان کے ہاؤس بوٹ میں اگرچہ اُس سے پہلے اور اُس کے بعد بھی بہت سے وزیٹر ٹھہرے تھے مگر اُس کی صرف اُس کرنیل صاحب سے خط و کتابت جاری رہی۔ ملہ سبحان اُس کو ہر سال کشمیر آنے کی دعوت دیتا اور ہر سال کرنیل صاحب یہی لکھتا کہ فرصت نہیں ہے۔ اس سترہ برس کے عرصے میں کرنیل صاحب ایک دو دفعہ پندرہ بیس دنوں کے لئے کشمیر آیا تھا اور ملہ سبحان کے ہاؤس بوٹ میں ہی ٹھہرا تھا۔

ملہ سبحان کو کرنیل کی ایک چٹھی سے معلوم ہو چکا تھا کہ اُس کی میم نے ایک بچی کو جنم دیا ہے۔ مگر ملہ سبحان نے ابھی تک اس بچی کو نہیں دیکھا تھا۔ آج جب یہ میم صاحبہ پہلی بار کشمیر آئی تو وہ سیدھے ملہ سبحان کے ہاؤس بوٹ میں پہونچی۔ وہ اپنے باپ سے ایک چٹھی بھی لائی تھی۔ اس کے علاوہ ملہ سبحان کو کرنیل صاحب نے الگ ڈاک کے ذریعہ بھی خط بھیجا تھا۔

ہاؤس بوٹ میں جس دن سے وزیٹر ٹھہرنے آتے تھے اُسی دن سے مانجھی کے کانوں میں خوشیوں کے باجے بجنے شروع ہو جاتے ہیں۔ مانجھی من ہی من میں چھوٹے بیٹے کا ختنہ، بڑی بیٹی کی شادی، شیر خوار کا منڈن اور پیر دستگیر کی نیاز سوچنے لگتا ہے۔ مگر ملہ سبحان اب مایوس سا ہو چکا تھا اور اب اس کو کچھ بھی کرنا باقی نہ تھا۔ وہ بیٹیوں کی شادی کر چکا تھا۔ اس کا جوان بیٹا مر چکا تھا اور پیر دستگیر پر سے اُس کا اعتماد اُٹھ چکا تھا۔

مگر آج جب پندرہ سولہ برس کی یہ نوعمر میم صاحبہ اُس کے ہاؤس بوٹ میں ٹھہرنے کو آئی تو ملہ سبحان کو، اپنے ملازم پر اعتماد نہ رہا۔ وہ خود

اُس کی خدمت گزاری کرنے لگا۔ ایک اس ناتے سے کہ یہ اُس کے ایک پُرانے جانکار صاحب کی بیٹی تھی اور دُوسرے یہ سوچ کر کہ میم صاحبہ ابھی بالکل نوعمر تھی اور اُس کی رکھوالی تجربہ کار ملہ سبحان ہی کر سکتا تھا۔

ہاؤس بوٹ میں قیام کے دن سے ہی میم صاحبہ اس طرح خوش و خرّم رہنے لگی تھی جیسے اُس نے اپنے من کی چیز پہلی بار پائی ہو۔ وہ صبح سویرے اُٹھ کر بوٹ کے اگلے سرے پر اینرل بورڈ سجاتی اور برش سے پہاڑوں کی چوٹیاں، بید کے جھنڈ اور ارد گرد کے ٹیلے بنانے میں مصروف ہو جاتی۔ ایسی کئی تصویروں کے اُس نے خود فریم بنائے تھے اور اُن کو ہاؤس بوٹ کے کمروں میں سجا کر رکھ دیا تھا۔ جب ایک دن ملہ سبحان کو میم صاحبہ کے کہنے پر اپنے بیٹے رمضان کی تصویر بورڈ کے ڈرائنگ رُوم سے نکالنی پڑی تو اُس کو بہت غصہ آیا۔ میم صاحبہ نے اس جگہ ٹیڑھے میڑھے سفیدوں کی بنائی ہوئی تصویر سجادی تھی۔ ملہ سبحان چاہتا تھا کہ وہ اُس سے پوچھے کہ یہ ٹیڑھے میڑھے درخت اور پہاڑوں کی چوٹیاں بنانے پر اتنا قیمتی رنگ و روغن ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ — لیکن وہ پوچھ نہ سکا۔ کیونکہ میم صاحبہ وزیر تھی اور ملہ سبحان ہاؤس بوٹ کا معمولی مانجھی۔ ملہ سبحان نے رمضان کی تصویر اپنی چھوٹی سی کشتی میں ٹانگ دی تھی۔

میم صاحبہ جھگڑالو نہیں تھی۔ اُس نے کبھی کھانے پینے کے معاملے میں نکتہ چینی نہیں کی۔ اُس نے کبھی صفائی یا گرد کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ صبح سے شام تک یا تو تصویریں بنانے میں مصروف رہتی یا کوئی انگریزی کتاب اونچی آواز میں پڑھتی رہتی۔ کچھ اس بات سے اور کچھ اپنی بزرگی کی وجہ سے ملہ سبحان کے حوصلے بڑھ گئے تھے اور اب وہ میم صاحبہ سے بغیر جھجک کے بات چیت کر سکتا تھا۔

میم صاحبہ ولایت کی کیمبرج یونیورسٹی میں انگریزی ادب کی طالبہ تھی اور ورڈس ورتھ کی شاعری اُسے بہت بھاتی تھی کیونکہ ورڈس ورتھ اپنی شاعری میں پہاڑوں، ٹیلوں، چراگاہوں، کھیتوں اور مرغزاروں کی تعریف و توصیف کرتا تھا اور میم صاحبہ کو انہی چیزوں کی تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ میم صاحبہ کو شوق تھا کہ تصویریں بنانے والا جو کام رنگوں اور روغنوں سے لیتا ہے وہی کام ورڈس ورتھ نے الفاظ سے لیا ہے مگر ملہ سبحان تو میم صاحبہ کی یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ یہ باتیں سُن کر غم میں ڈوب جاتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ کاش آج رمضان زندہ ہوتا۔ وہ ان نزاکتوں کو ضرور سمجھ لیتا اور اس میم صاحبہ کے ساتھ بحث و مباحثہ کرتا۔

ایک دن میم صاحبہ ہاؤس بوٹ کے ایک کمرے میں بیٹھی کھڑکی سے باہر کسی چیز کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ ملہ سبحان نے دوسری کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا کہ وہ کس چیز کو اتنے غور سے تک رہی ہے۔ باہر جھیل کا پانی تھا اور پانی کی سطح پر ایک کنول پتا تیر رہا تھا۔ میم صاحبہ کی آنکھیں شاید اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ ہاں ہاں اسی کنول پتے کے اُوپر، کیونکہ ملہ سبحان نے ایک لمحے کے بعد جب دیکھا تو میم صاحبہ کنول پر کنول پتا بنا رہی تھی اور اس پر روغن کا ایک نشان اس انداز سے لگا رہی تھی کہ جان پڑتا تھا کہ کنول پتے پر پانی کا قطرہ گہر کی مانند چمک رہا ہے۔ یہ دیکھ کر ملہ سبحان کو رمضان یاد آیا اور اُس نے میم صاحبہ سے یکلخت پوچھا "آپ یہ کنول پتا کیوں بنا رہی ہیں؟" میم صاحبہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "جب میری بنائی ہوئی یہ تصویر کسی ایسے ملک میں جائے گی جہاں ڈل جھیل نہیں ہے، جہاں کنول پتے اور کنول پتوں پر گہر جیسے پانی کے قطرے نہیں ہیں، تو وہاں کے لوگوں میں حُسن کا احساس بیدار ہو جائے گا۔ ملہ سبحان ضرور پوچھتا کہ آخر اس سے فائدہ کیا ہوگا مگر میم صاحبہ نے اُس سے پوچھے بغیر ہی کہا "حُسن کا احساس ہی انسان کو انسان بنا دیتا ہے ورنہ حیوان اور انسان میں اور فرق ہی کیا ہے" ملہ سبحان اگرچہ اس بات کو بھی نہ سمجھ سکا تھا مگر پھر بھی اُس نے اقرار میں سر ہلا دیا اور ایک طرف منہ پھیر کر سوچنے لگا تھا۔ "کاش آج رمضان زندہ ہوتا"

## (۴)

ملہ سبحان آج بھی کوئی بات نہ سمجھ سکا تھا لیکن رمضان اور اس کے بعد میم صاحبہ کی اچانک موت نے اس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ کچھ محسوس کر رہا تھا لیکن کیا یہ بتانے کے لئے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ صرف واقعات کو اپنے ذہن میں دُہراتا رہتا تھا اور بس اسے ہر وقت اتوار کا وہ دن یاد آتا تھا جس دن میم صاحبہ نے اُسے بلوا کر کہا تھا "آج میں نشاط اور شالیمار کی سیر کو جاؤں گی تم میرے ساتھ چلنا"

اُس دن ملہ سبحان نے اپنی لمبی سفید داڑھی پر کنگھا پھیرا تھا اور اُجلے دُھلے کپڑے پہنے تھے۔ اس نے شکارے کو اچھی طرح سجوایا تھا اور شکارا کھینے

کے لئے دُومانجی دھاڑی پر رکھے تھے۔ وہ خود شکارے میں میم صاحبہ کے پاس ہی بیٹھا تھا جھیل ڈل کے آئینہ جیسی سطح پر شکارا ہچکولے بھرتا جا رہا تھا اور میم صاحبہ ورڈس ورتھ کی شاعری پڑھتی جا رہی تھی اور کہنیاں مار مار کر ملہ سبحان کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ورڈس ورتھ اسی حُسن کا شاعر ہے۔ ورڈس ورتھ نے جو منظر الفاظ کی مدد سے کھینچنے کی کوشش کی ہے، وہی منظر قدرت نے یہاں اپنے ہاتھوں سے ترتیب دے رکھا ہے۔ ملہ سبحان یہ باتیں سنتا تو کبھی اپنے آپ کو بزرگ جان کر میم صاحبہ کے الہڑپن پر مسکراتا اور کبھی اپنے آپ کو کُند ذہن تصور کر کے سوچتا کاش آج رمضان زندہ ہوتا۔"

میم صاحبہ نشاط باغ میں اس طرح چوکڑیاں بھرنے لگی جیسے کوئی ہرنی بڑی مدّت کے بعد قید سے رہائی پا کر واپس جنگل میں پہونچی ہو۔ وہ باغ کے بیچوں بیچ ندی میں ٹخنوں ٹخنوں پانی میں بہت دُور دُور تک دوڑتی چلی گئی۔ اس کا سانس پھول گیا لیکن وہ تھکی نہیں۔ اس دوڑ دھوپ میں اُس نے اِدھر اُدھر کی کچھ تصویریں بنائیں۔ ٹیڑھی میڑھی لکیریں۔

اس کے بعد وہ شالیمار باغ گئے۔ باغ کے اندر پہونچ کر میم صاحبہ کی چمکدار آنکھوں میں نیند کا خمار چڑھ گیا۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گئی اور اپنی مخمور آنکھوں سے کبھی بڑے بڑے چناروں پر، کبھی سبزے پر، کبھی فوّاروں کی قطار پر اور کبھی سرو کے درختوں پر نظریں گاڑ دیتی۔

چار بجے میم صاحبہ نے ایزل اور بورڈ لگوایا اور کینواس پر ایک ایسا نظارہ کھینچا جو ملہ سبحان کو بھی پسند آیا۔ اُس نے سر اقرار میں ہلا کر منہ سے "ہوں" کہا جیسے میم صاحبہ کو ہنرمندی کا سرٹیفکٹ بخش رہا ہو — اُسے پہاڑوں کی چوٹیوں کے پیچھے سورج کی نوکیلی کرنیں بہت بھائیں۔

یہ تصویر بنانے کے بعد میم صاحبہ باغ سے باہر آئی۔ ملہ سبحان ایزل بورڈ، برش اور باقی سامان کندھے پر اٹھا کر اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ باغ کے باہر میم صاحبہ نے دُور دُور تک نظر دوڑائی۔ ڈل جھیل کی طرف دیکھا اور اردگرد پہاڑوں کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد اس نے ملہ سبحان سے کہا "چلو اس پہاڑ پر چڑھیں؟"

ملہ سبحان کو آج افسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے میم صاحبہ کو پہاڑ پر چڑھنے سے روکا کیوں نہ تھا۔ اس نے اس وقت سوچا تھا کہ میم صاحبہ اب بہت سی تصویریں بنا چکی ہے اور مزید تصویریں بنانے کے لئے اب پہاڑ پر چڑھنا مناسب نہیں لیکن وہ زبان سے کچھ نہ بولا۔ کیونکہ وہ ایک تو میم صاحبہ کا نوکر تھا دُوسرے اُسے میم صاحبہ کی یہ شوخیاں اب بہت اچھی لگنے لگی تھیں۔

گرمی زوروں پر تھی۔ ملہ سبحان تھکاوٹ سے ہانپ رہا تھا۔ میم صاحبہ کا نارنجی چہرہ تمتما رہا تھا اور اس پر پسینے کے قطرے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے جادوگر آگ کے اُوپر ننگے پاؤں چل رہے ہوں۔

میم صاحبہ آگے آگے اور ملہ سبحان پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ شالیمار باغ کے دُوسری طرف اُنہوں نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ میم صاحبہ نے پہلے ہی پہاڑ کی آدھی بلندی پر ایک چھوٹی ہموار سطح دیکھی ہوئی تھی اور اب وہ اسی کی طرف جا رہی تھی۔ اس پر پہونچنے کے لئے ذرا ہٹ کر دُوسری طرف کا راستہ اختیار کرنا پڑتا تھا کیونکہ یہ ہموار سطح اس جگہ پر واقع تھی جہاں پہاڑ ایک سیدھی اور اونچی دیوار کی طرح وہاں کے کھیتوں سے یکلخت اُوپر اٹھتا تھا۔ میم صاحبہ دُور کا راستہ اختیار کر کے اس سطح تک پہونچ گئی اور کندھوں پر بہت سا سامان لئے پسینہ پونچھتا ہوا ملہ سبحان بھی آخر وہاں پہونچ گیا۔

اگرچہ سورج رُو بہ زوال تھا لیکن گرمی کی شدّت میں ابھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ آسمان نے سفید دُھند کا ململیں لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ پہاڑ پر یہ ہموار سطح خاصی کشادہ تھی۔ اس کے ایک طرف لمبا اور اُونچا پہاڑ جیسے ڈل جھیل سے آئی ہوئی ہواؤں سے اپنا جلتا ہوا سینہ ٹھنڈا کر رہا تھا اور دوسری طرف یہ سطح یکلخت ختم ہو جاتی تھی اور اس کے سرے پر جا کر اگر آدمی نیچے کی طرف دیکھے تو محسوس کرے کہ وہ ایک اونچی دیوار پر بیٹھا ہوا ہے۔

اس جگہ پر پہونچ کر ملہ سبحان نے کندھوں سے بوجھ اتار دیا اور سُستانے لگا۔ میم صاحبہ نے اپنا بایاں ہاتھ آنکھوں کو سایہ دینے کے لئے ماتھے پر رکھا اور دُور دور تک دیکھنے لگی۔ لمحہ بھر دیکھنے کے بعد اُس نے ملہ سبحان سے اس انداز میں کہا جیسے وہ گہری سوچ میں مستغرق ہو۔ "ایزل کھڑا کر دو"

ملہ سبحان نے ایزل کھڑا کر کے اس پر بورڈ لگایا۔ میم صاحبہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھا کر اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھی اور دانتوں سے نچلا ہونٹ دبائے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر آنکھوں کے اُوپر ہاتھ کا سایہ کر کے دُور دُور تک دیکھا۔ اس کے بعد ایک آہ بھری۔ ملہ سبحان

کا خیال تھا کہ اب میم صاحبہ اُس سے کچھ پوچھے گی مگر میم صاحبہ نے اُس کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ وہ اُس کو بھلا کر ایک طرف جا کر بیٹھ گئی۔

کچھ وقفے کے لئے میم صاحبہ خاموش بیٹھی رہی لیکن اُس کی آنکھوں کی کیفیت سے یوں لگتا تھا جیسے اُس کی کوئی چیز کھو گئی ہو اور اب وہ یہی چیز دُور پہاڑوں میں، ڈل جھیل کے پانی میں، آسمان میں اور نہ معلوم کہاں کہاں تلاش کر رہی ہو۔ میم صاحبہ کے چہرے بشرے سے پریشانی اور تشویش ظاہر ہو رہی تھی۔

میم صاحبہ نے جیب سے ایک چھوٹی کتاب نکالی۔ اس کے کچھ ورق اُلٹے اور پڑھنا شروع کیا۔ اس کے چہرے پر تقدس کے وہی نشان اُبھر آئے جو کسی دوشیزہ کے چہرے پر قرآن شریف پڑھتے وقت اُبھر آتے ہیں۔ میم صاحبہ اُونچی اور سریلی آواز میں گانے لگی۔ وہ آنکھیں موندھ کر اور جھوم جھوم کر گا رہی تھی جیسے چراگاہوں میں کوئی چرواہن اپنے محبوب کو پکار پکار کر کہہ رہی ہو۔

بھوک لگے تو تمہیں پنیر کھلاؤں گی
پیاس لگے تو تمہیں دودھ پلاؤں گی
آ میرے محبوب میں تیرے انتظار میں ہوں

ملہ سجان کو اس سُریلی آواز نے دُوسری دُنیا میں پہونچا دیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے جسم کو ایسے ہلا رہا تھا جیسے وہ مسجد میں خدا کا نام جپ رہا ہو۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس آواز کے ساتھ اس کا وہی رشتہ ہے جو مین کی آواز کے ساتھ ساز کا۔ خون یا گوشت کا نہیں مگر اس سے بھی زیادہ اٹوٹ رشتہ۔

سورج غروب ہونے جا رہا تھا۔ دُور پہاڑوں کی چوٹیوں کے پیچھے سنہرے مشعلوں کا جلوس جیسے اس کے استقبال کے لئے کھڑا تھا۔ آسمان کا رنگ بدل رہا تھا۔ پہاڑوں کے سرمئی شریر کا اندرونی نور چمک اٹھا۔ چوٹیاں برفیلی پوشاک پہنے قطاروں میں کھڑی تھیں۔ ان چوٹیوں کے بہت اُوپر سنگ نیلے آسمان کے نیچے آسمانی دوشیزائیں بادلوں کے اُڑن کھٹولے میں بیٹھی خوشی سے جھول رہی تھیں۔

میم صاحبہ نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ اُس کی آنکھیں مغرب کی طرف اُس منظر پر لگی ہوئی تھیں۔ اُس سے نظر ہٹائے بغیر میم صاحبہ اُلٹے پاؤں بورڈ کے قریب پہونچی۔ برش اٹھا کر اُس نے بڑی احتیاط سے کنوس کی طرف بڑھایا لیکن اس کا بڑھا ہوا ہاتھ رُک گیا۔ آسمان بہت اُونچا اور وسیع تھا۔ پہاڑ دائیں بائیں بہت دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ پہاڑوں کے قریب نچلی سطح پر سُرخ مٹی کے لاتعداد ٹیلے تھے۔ ہر طرف درخت اور سبزہ تھا۔ ڈل اپنی روپہلی سطح پھیلا کر اس پہاڑ کے دامن کے قریب پہونچ رہا تھا۔ ہری پربت اور کوہ سلیمان ڈل کے اردگرد ایسے تھے جیسے سیاب کی بنی ہوئی سڑک۔ دوسری طرف شالیمار پہاڑ کے دامن میں دھان کے لہلہاتے کھیت اور پہاڑ اور پہاڑ کے اُوپر نیلا آسمان۔ میم صاحبہ کا ہاتھ رک گیا۔ یہ سب کچھ بہت وسیع تھا۔ کیا میم صاحبہ یہ سارا حُسن رنگوں میں سمو سکتی ہے؟ نہیں نہیں نہیں۔

میم صاحبہ کے ہاتھوں سے برش چھوٹ گیا۔ فنکار اپنی ہنرمندی سے حُسن میں اضافہ کرتا ہے وہ نامکمل کو مکمل بنا دیتا ہے۔ لیکن اتنی وسعت؟ اتنا سلیقہ اتنا حُسن؟؟؟ —— کیا میم صاحبہ اس میں کوئی اضافہ کر سکتی ہے؟ نہیں نہیں —— یہ حُسن رنگوں میں نہیں سما سکتا اس کی توہین نہیں کی جا سکتی —— میم صاحبہ پریشان سی ہو گئی۔

ملہ سجان کے دل میں خوف سا پیدا ہوا۔ اُس نے سُنا تھا کہ شالیمار پہاڑ پر پریوں کا مسکن ہے اور وہ کبھی کبھی کسی کو بد دعا دے دیتی ہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ میم صاحبہ ایک مورتی کی طرح کھڑی بے حس و حرکت ہے تو اس کے دل میں خوف سا پیدا ہوا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میم صاحبہ کس سوچ میں پڑی ہے۔ دراصل میم کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس وسیع تر حُسن کی ترتیب دیتے وقت فطرت نے اُس کے لئے یہی جگہ مقرر کی ہے اور اگر وہ اس جگہ سے ہل جائے تو سارا نظام قدرت درہم برہم ہو جائے گا پھر شاید آسمان اور پہاڑ بھی اپنی جگہوں سے ہل جائیں گے اور قیامت آجائے گی۔ وہ ایک جگہ مورتی کی طرح بے حس و حرکت کھڑی تھی۔

"میم صاحبہ" ملہ سجان نے پکارا۔ اور میم صاحبہ جیسے چونک اُٹھی۔ آواز سُن کر اُس نے آہ کھینچی اور جیسے اپنے آپ سے کہا۔ افسوس کہ اس جگہ میرا کوئی رہبر نہیں۔ یہاں ورڈس ورتھ بھی نہ پہونچ سکا۔ یہاں کوئی بھی میری رہبری نہیں کر سکتا۔"

میم صاحبہ کمر کے پیچھے دونوں ہاتھ رکھ کر کبھی ٹہلنے لگی اور کبھی پریشان ہرنی کی طرح دائیں بائیں آنکھیں اٹھا کر دیکھنے لگی۔ ملہ سجان کو رمضان یاد آیا، ملہ سجان کو میم صاحبہ میں رمضان کی صورت دکھائی دے رہی تھی۔

میم صاحبہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ "راستے صرف دو ہیں یا تو میں سارے حُسن کو سمیٹ کر اپنی آتما کے ساتھ چمٹائے رکھو ورنہ آتما کو آزاد کر کے اس

وسیع تر حسن میں تحلیل ہونے دو۔"

میم صاحبہ بالکل اسی طرح کی باتیں کرتی تھی جس طرح کی باتیں رمضان کرنا چاہتا تھا۔ لیکن نہ کر سکتا تھا۔ ملہ سبحان کو محسوس ہو رہا تھا کہ رمضان کو یہی کچھ کہنا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے رمضان آج پہاڑ کی اس ہموار سطح پر یہی باتیں کہنے کے لئے خود آیا ہے۔

ٹہلتے ٹہلتے میم صاحبہ بھی رک گئی۔ دور برفیلی چوٹیوں کے اوپر سرمگیں نیلے آکاش کے نیچے بادلوں کے دھانوں کی طرف انگلی اٹھا کر اس نے ملہ سبحان سے کہا "کیا اس جگہ کسی کی آتما پہونچ گئی ہوگی؟" اس کے بعد اس نے خود ہی کہا۔ "نہیں اس جگہ آدمی جسمانی طور پر نہیں پہونچ سکتا۔ مگر وہاں پہونچ کر روح کو ابدی سکون میسر آتا ہوگا۔ کیا وہاں کسی کی روح پہونچ گئی ہوگی؟" ملہ سبحان نے فوراً جواب دیا "وہاں نہیں لیکن اس پہاڑی پر جس کو ہم کوہ سلیمان کہتے ہیں وہاں ایک روح ہے، وہاں میرا بیٹا رمضان ــــ"

میم صاحبہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی اس کی بات کا جواب دے رہا ہے لیکن وہ جواب ملہ سبحان دے رہا تھا۔ وہ حیرت سے دوڑتی ہوئی اس کے قریب آئی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا "بولو۔ کون رمضان؟ ــ کہاں کا رمضان؟ ــــ" میم صاحب بڑے اضطراب میں تھی۔

ملہ سبحان نے اس کو اپنے بیٹے رمضان کی کہانی سنانا شروع کی ــ رمضان اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ سپاہی تھا۔ وہ دوسری جنگ عظیم میں ساری دنیا گھوم آیا تھا۔ وہ جنگ میں نہیں مرا تھا۔ وہ جنگ سے لوٹ کر ڈل جھیل میں کنول پتوں پر، پانی کے قطروں پر عاشق ہو گیا تھا۔ وہ بادل کے ٹکڑے دیکھ کر پاگل ہو جاتا تھا۔ وہ شام کے سایوں اور صبح کے شفق پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ وہ بہتے پانی کو سینے سے لگاتا تھا۔ وہ ٹھنڈی ہواؤں سے بغلگیر ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ بید کے درختوں کے جھنڈ میں معشوق کی زلفوں کی تلاش کرتا تھا۔ لوگوں نے کہا اس کا دماغ خراب ہو ــ میں نے بھی کہا کہ وہ دماغ کھو چکا ہے "اور پھر اس کا کیا ہوا؟ کہاں ہے وہ؟" میم صاحبہ جلدی جلدی باتیں کر رہی تھی۔ اس کی سانس پھول رہی تھی اور آنکھوں سے وحشت مترشح تھی۔ ملہ سبحان تاڑ گیا کہ وہ بخار سے جل رہی تھی۔ مگر ملہ سبحان نے اس کے بخار کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ آج رمضان کی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ "ایک دن جب خزاں بیت چکی تھی اور جاڑا آ چکا تھا۔ رمضان نے مجھے بلایا وہ جیسے بیمار ہو گیا تھا اس نے کہا۔ "بابا ــ کیا ہوا وہ؟ ــ وہ پانی ــ وہ سبزہ ــ" میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا پھر بھی میں نے اس کا دل رکھنے کو کہا

"جاڑا ختم ہو جائے گا تو میرے بیٹے بہار میں یہ سب چیزیں پھر دیکھنے کو ملیں گی" رمضان نے کہا تھا "بابا ــ جاڑا بہت بے رحم ہے۔ بہار کب آئے گی؟"

میم صاحبہ چلا کر بولی "بہار حسن اور روح کے ملاپ کو کہتے ہیں ملہ سبحان" ملہ سبحان نے اس طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ وہ رمضان کی کہانی پوری کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے بات جاری رکھی۔ "آخر پھر رمضان نے مجھ سے کہا" بابا میں یہ ویرانی برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر میں مر گیا تو مجھے کوہ سلیمان پر دفن کرنا اور قبر میں میری آنکھیں ڈل جھیل کی طرف رکھنا۔ میں وہیں انتظار کروں گا" میم صاحبہ کے جسمانی پنجرے میں جیسے روح پھڑپھڑا رہی تھی اس کے دل پر جیسے کوئی بوجھل شے دباؤ ڈال رہی تھی۔

ملہ سبحان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ کہہ رہا تھا۔ "اسی رات رمضان نے ڈل میں چھلانگ لگا دی اور صبح جب میں نے دیکھا تو وہ مر چکا تھا۔" یہ سنتے ہی میم صاحبہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں جھکا کر اپنے پاؤں کی انگلیوں پر نظریں جمائیں اور کہا "اس پنجرے ہی سے روح کو رہا کر کے وسیع تر حسن میں تحلیل کرنا ہی ابدی زندگی ہے ــ میں زندگی سے بغلگیر ہو جاؤں گی۔"

ملہ سبحان کی آنکھوں میں بجلی سی کوندگئی۔ میم صاحبہ پہاڑ کی ہموار سطح کے اس سرے پر یکلخت غائب ہو گئی۔

ملہ سبحان ایک لمحے کے لئے دم سادھ کر بیٹھ گیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک لمحے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور دور پہاڑوں کی طرف دیکھ کر اس نے سر ہلایا جیسے کسی بات کا اقرار کر رہا ہو۔ وہ بولا "آج میں بات کی تہہ تک پہونچ پایا ہوں۔"

وہ پرسکون تھا۔ بغیر کسی خوف یا ڈر کے اس نے پہاڑ کی ہموار سطح کے اس سرے سے نیچے کی طرف دیکھا۔ میم صاحبہ بانہیں کھولے دامن کی چٹانوں کے بیچ جیسے ایک پٹان سے بغلگیر ہو رہی تھی۔

ملہ سبحان نے سب چیزیں اکٹھی کر کے کندھے پر اٹھائیں۔ اس کے بعد پہاڑ کے دامن سے میم صاحبہ کی لاش اٹھائی اور شالیمار کی طرف چل پڑا۔

(ترجمہ: ایاز رسول)

اگست ۱۹۷۰ء

کنّڑ

# سفر

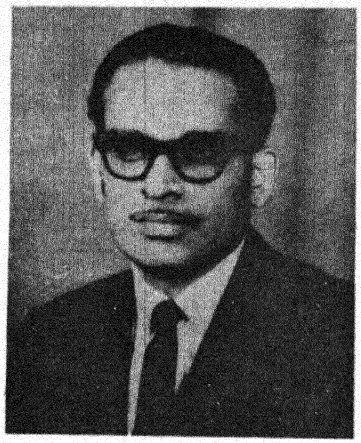

یشونت چتّال

سہ شام ملاقات کے لئے آیا ہوا ابھی کہہ گیا تھا: "کل تڑکے ہی، مرغ کی بانگ سے پہلے ہمیں چل پڑنا ہے تیار رہئے گا۔"

ابھی رات کا کھانا ختم ہوا ہی تھا کہ اُس نے روانگی کی تیاری شروع کر دی۔ پچھلے چار چھ دنوں سے کپڑے اور دیگر سامان کمرے میں بکھرا پڑا تھا۔ اس کو اکٹھا کرتے ہوئے اس کے ہاتھ شیونگ سیٹ سے ٹکرائے۔ اس نے ہاتھ روک لئے۔ وہ بے اختیار گالوں کی طرف چلے گئے۔ رُخساروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس نے سوچا، علی الصبح جب وہ بُلانے آئے گا تو داڑھی بنانے کے لئے وقت ملے گا کہ نہیں، کیوں نا ابھی سے خط بنالوں؟" —— اِس خیال کے آتے ہی وہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ داڑھی بنانے کے لئے اس کی احتیاط اور نفاست اس کے دوستوں میں ضرب المثل تھی۔ وہ جس کمپنی کے ریزر بلیڈ بیچنے پر مامور تھا، اس کے اشتہار میں بھی آپ نے اکثر داڑھی بنایا ہوا صاف ستھرا اس کا چہرہ دیکھا ہوگا۔

باتھ رُوم میں واش بیسن کے سامنے کھڑے ہو کر دیوار پر لگے آئینہ میں چہرہ دیکھتے ہوئے اس نے داڑھی کو تر کیا۔ صابن لگایا اور برش پھیرنے لگا۔ یکایک اُس کے ذہن میں ایک ننھے سے خیال نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ اس کے ہاتھ رُک گئے۔ سب کو قطع نظر کرتے ہوئے اُس نے مرغ کی بانگ سے پہلے کیوں کہا؟ کلکتہ جیسے وشال شہر کے قلب میں بنے اس عالیشان ماڈرن ہوٹل کے قرب وجوار میں مرغ کہاں بانگ دے سکتا ہے؟ —— یہ میں پوچھنا بھول ہی گیا۔ مرغ بانگ کب دیتا ہے، اس کا احساس ہو تب نا! گاؤں چھوڑے کتنا زمانہ بیت گیا! نہ جانے کس گاؤں کا بھکڑ ہے وہ؟ —— مرغ کی بانگ سے پہلے تیار رہنے کے لئے کہہ گیا ہے! —— خیر جو ہو سو ہو۔ صبح تڑکے چار بجے جاگ جاؤں تو ٹھیک ہے گا۔ اگر اس سے پہلے چلا آیا تو؟ آتا ہے تو آنے دو، میری راہ دیکھے گا!"

داڑھی پر جھاگ خوب بنا تھا۔ تیز دھار والے نئے بلیڈ سے نیا بڑھی ہوئی داڑھی کا صفایا بھی کیا جا سکتا ہے اور ایک مرتبہ صابن لگاتے ہوئے ایک اور خیال نے سر اُٹھایا۔ وہ چکرا سا گیا۔ "اگر مجھے علی الصبح

ہی چل دینا ہے تو ہوٹل والوں کو ابھی سے اطلاع دیدینی چاہئے۔ اوہو، میں تو بھول ہی گیا تھا۔"

داڑھی پر صابن لگاتے ہی وہ کمرے میں داخل ہوا۔ ٹیلیفون کا ریسیور اُٹھایا اور کہا Reception please ۔ ریسپشن سے سلسلہ مل گیا تو اس نے کہا: میں کمرہ نمبر ایک سو چھپن سے بول رہا ہوں۔ مجھے علی الصبح ہوٹل چھوڑنا ہے۔ ابھی سے بل تیار کرنے کے لئے کاؤنٹر پر کہہ دیجئے۔ جاتے ہوئے دستخط کر دوں گا۔ میرے پاس "ٹراول ایجنٹ ووچر" ہیں اور سنئے صبح تڑکے مجھے چار بجے ہی جگانے کے لئے کہہ دیجئے۔" نہایت ہی خوش اخلاقی سے اِدھر سے جواب ملا: "معاف کرنا سر، کمرہ تو آپکے نام پر دس دنوں کے لئے ریزرو ہے۔"

وہ جانتا تھا کہ بات کو آگے بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ وہ جھنجھلا سا گیا۔ اُس نے فوراً کہا: "ہاں، میں جانتا ہوں لیکن اچانک ایک ضرورت نکل آئی ہے جس کی وجہ سے مجھے قیام کی مدت میں کمی کرنی پڑ رہی ہے۔ اگر اس سے آپ کو تکلیف ہو رہی ہو تو . . . ."

دوسری طرف سے سہمی سی آواز میں کہا گیا۔" . . . غلط نہ سمجھئے گا، سَر، . . . ." لیکن اس کے پاس وضاحت سننے کے لئے وقت تھا نہ صبر۔ اس نے زور سے ریسیور پٹخ دیا اور باتھ روم میں لوٹ آیا۔ اپنی اس اشتعال انگیزی پر اُسے ایک طرح کی طمانیت محسوس ہوئی۔ دُوسرے ہی لمحے داڑھی پر بلیڈ چلاتے ہوئے اس پر انکشاف ہوا: اگر فون پر بات کرنے والا آدمی آنکھوں کے سامنے ہوتا تو کیا میں اس طرح بات کر سکتا تھا۔؟ — غیر موجودگی میں چاہے کتنا ہی سخت لہجہ اختیار کر لوں لیکن بالمشافہ بات کرتے ہوئے تو میں ایسا لہجہ کبھی اختیار نہیں کر سکتا — ابھی آدھ گھنٹے پہلے کی بات ہے۔"

سرِ شام اس بن بلائے مہمان کی روانگی کے فوراً بعد جو اولین کام اُس نے کیا تھا، وہ تھا ہوٹل کی لانڈری کو فون۔ اُس نے اپنے کپڑے فوراً مانگے تھے۔ حالانکہ کپڑے ایک دن بعد دھل کر آنے والے تھے۔ نوکر نے نرمی سے جب اپنی بے بسی ظاہر کی تو اُس کا پارہ چڑھ گیا۔ اُس نے نوکر کو ڈانٹ پلائی اور فون پر منیجر کو بلانے کے لئے کہا۔ منیجر نے ریسیور سنبھالا تو نہایت گمبھیر آواز میں اس نے کہا کہ فوری بلاوے پر اس کو صبح سویرے چل دینا ہے اس لئے دھلائی کے لئے دیئے گئے تمام کپڑے جیسے بھی بھی ہوں، رات تک کمرے میں پہونچ جانے چاہئیں۔ ابھی منیجر کے منہ سے بول نکلنے ہی والے تھے کہ اس نے فوراً کہا: "اور ہاں، اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو خود کپڑے رکھ لینا، مجھے اُن کی ضرورت نہیں ہے۔" اور اس نے ریسیور کریڈل پر دے مارا۔ حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ دو گھنٹوں کے اندر ہی اندر، اس کے دُھلے دُھلائے استری کئے ہوئے کپڑے خود منیجر لئے ہوئے بھاگا چلا آیا۔ اُس نے بات نہیں کی، اُس کو ڈر تھا کہ فون پر بات کرتے ہوئے جو رعب منیجر پر پڑا ہے اب بات کرنے پر ختم ہو جائے گا۔ منیجر بھی خاموشی سے میز پر کپڑوں کی گٹھڑی رکھ باہر نکل گیا۔ اس کا من اَن دیکھی تشویش سے مرجھا گیا تھا۔

داڑھی بن گئی۔ شیونگ سیٹ سنبھال کر وہ کمرے میں چلا آیا۔ "جانے اتنی سویرے وہ جگائیں گے کہ بھول جائیں گے۔" — اس نے خیال کے پیدا ہوتے ہی اس نے سوچا۔ "بہتر ہوگا اگر رُوم بوائے سے بھی کہہ دیا جائے، اس کو تو بس ٹپ چاہئے۔ ابھی سے دے دوں گا۔ اس طرح صبح کی چائے بھی مل جائے گی۔" اس نے گھنٹی بجائی۔ چند لمحے بعد رُوم بوائے آ حاضر ہوا۔ اس کی طرف پانچ روپوں کا ایک نوٹ بڑھاتے ہوئے اُس نے کہا: "مجھے سویرے ٹھیک پانچ بجے یہاں سے چل دینا ہے۔ چار بجے بیدار کرنے کے لئے میں نے نیچے کہہ دیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ بھول جائیں، تم میرے لئے چار بجے ہی بیڈ ٹی لیتے آنا اور جگا دینا، ضرور، بھولنا نہیں۔"

بوائے نے شکر اور احسان مندی کے ساتھ سلام کرتے ہوئے کہا "حکمت کیجئے سَر۔ بغیر بھولے میں ضرور چار بجے جگا دوں گا۔ گڈ نائٹ سَر۔" بوائے چلا گیا، اپنے پیچھے دروازہ بھیڑ کر۔

پھر جب سوٹ کیس میں سامان بھرا جانے لگا تو ایک نیا سوال اس کے سامنے آیا: "اے اس وقت آئے اجنبی نے جب مرغ کی بانگ سے پہلے چلنے کے لئے کہا تو میں نے 'کہاں؟' 'کیوں؟' پوچھے بغیر ہی چلنے کی حامی بھر لی!" اور اس کے ہونٹوں پر کرب بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ حامی بھر لینے کے بعد وہ وہاں نہیں رکا تھا۔ لیکن۔ اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کلکتہ کو آنے سے ایک دن پہلے کا واقعہ ہے۔

وہ کمپنی کے صف اوّل کا سیلز مین شمار کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے حلقے میں کلکتہ کا دورہ شامل نہیں تھا۔ کچھ دن پیشتر ہی وہ اپنے حلقے کے

دس بیس شہروں کا دو مہینوں تک دورہ کرنے کے بعد یہی ہوتا تھا کہ دوسرے دن باس نے اُسے اپنے کیبن میں بلا کر کہا "تمہیں کل کلکتہ روانہ ہونا ہے" اور اُس کو بولنے کا موقع دیئے بغیر ہی اُس نے مزید کہا:

"تمہاری سیٹ ریزرو ہو چکی ہے، کلکتہ میل میں اور قیام کا انتظام گرانڈ ہوٹل میں کر دیا گیا ہے۔ کلکتہ پہونچ کر وہاں کے برانچ منیجر سے ملو، وہ پروگرام بتا دے گا" اور اس نے چوں و چرا کئے بغیر کلکتہ کے سفر پر روانہ ہونا منظور کر لیا تھا۔ اس کا نہ تو اُسے کوئی غم تھا نہ ہی خوشی۔ بس کچھ اچنبھا کہ اس نے انکار کیوں نہ کیا؟

باس کے کیبن سے باہر آکر اُسے اس ناگہانی سفر پر بھیجے جانے کی وجہ معلوم ہوئی تھی۔ دراصل کلکتہ کے سفر پر اُس کے ایک اور ساتھی کو جانا تھا لیکن اُس نے اپنی شادی رچالی تھی۔ دفتر ہی کی ایک اسٹینو سے، اور اب وہ ہنی مون پر جا رہے تھے۔ دفتر میں ہر طرف یہی پُر لطف داستان چھڑی ہوئی تھی۔ اپنے رومان پرست ساتھی کے اس رُومان کا تصوّر کر کے اس کے ہونٹوں پر واقعی میٹھی مسکراہٹ تیر گئی اور یہ بھی خُوب تھا کہ اپنے ساتھی کے رُومان کا خمیازہ اس کو کلکتہ کے طویل سفر پر روانہ ہو کر بھگتنا پڑا۔ خود اس کی زندگی میں بہار آئی نہیں حالانکہ اس کی عمر چالیس برس تھی لیکن نہ تو اُس کا گھر بار تھا نہ بیوی تھی نہ بچے اور نہ ہی کوئی قریبی رشتہ دار۔ سفر پر جانے کے کوئی قابل تھا تو بس وہی! اسی لئے باس کی نظر انتخاب فوراً اُس پر جاتی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ میں کرب کی پرچھائیں تھی۔

وارڈروب میں ہینگر پر ایک سوٹ لٹک رہا تھا۔ اس کے علاوہ بقیہ تمام کپڑے سوٹ کیس میں بند ہو چکے تھے۔ سوٹ تہہ کرتے ہوئے گزشتہ شام کا ایک واقعہ یاد آگیا جو اس کی واپسی پر کاؤنٹر کے قریب پیش آیا تھا۔

کاؤنٹر پر سفید چمڑی والا رجسٹر میں اندراجات کر رہا تھا۔ ایک کالم تھا، Your next destination (آپ کی اگلی منزل؟) وہ تعجب سے کاؤنٹر کلرک سے اس کالم کا مقصد اور فائدہ پوچھنے لگا۔ ان سوالات کی بھنک جب اس کے کانوں میں پڑی تھی تو اس کو خود اپنا پہلے دن والا تجربہ یاد آگیا تھا۔ جب وہ اس کالم پر پہونچا تھا تو۔ Your next desti- nation کے نیچے لکھ دیا تھا: Not known (پتہ نہیں)

اس خیال کے ساتھ ہی اس کے ہونٹ خود بخود پھیل گئے۔ دو مہینوں کے بعد تو تھکا ہارا وہ لوٹا تھا کہ کلکتہ روانہ کر دیا گیا تھا۔ باس کی مرضی اور ترنگ کا کسی کو کیا پتہ؟ کلکتہ چھوڑنے سے پہلے ہی وہ کہیں اور بھیجدیں۔ ہنہ، تو بھیجدیں:

ساتھ ہی اُس کے من میں ایک اور خیال اُبھر آیا اور وہ بے چین سا ہو گیا: "سفر کے معاملے میں کبھی اس کو اتنی گھبراہٹ یا تردّد نہیں ہوا کرتا تھا۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ آج رہ رہ کر وسوسے اُٹھ رہے ہیں۔ ابھی ابھی جس سفر پر جانے کے لئے اس نے حامی بھری ہے، اس کے سلسلے میں اس کے یہ احساسات کہیں خوف اور اندیشہ کے تو نہیں؟ ہمیشہ اطمینان و سکون کے ساتھ سفر کی تیاری کرنے والے کو آج ایک ایک بات، اپنے آپ، رہ رہ کر کیوں یاد آ رہی ہے اور جھنجھلاہٹ طاری کر رہی ہے۔ ابھی پانچ دنوں تک تو کمپنی کا کام کرنا ہے، ایسی حالت میں کیسے میں نے ایک اجنبی، بن بلائے مہمان کے ساتھ چلنا منظور کر لیا؟ اگر کل باس پوچھے تو میں کیا جواب دے سکوں گا؟..."

دُوسرے ہی لمحہ باس کی پروا کئے بغیر اپنی ذمہ داری کو ادھورا چھوڑ دینے میں اُسے ایک طرح کی راحت محسوس ہوئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے اجنبی کا بلاوا ہی اس خلاف ورزی کا محرک بنا تھا۔ روانگی سے قبل، کیوں نہ باس کو اپنے اس نئے ارادہ کی خبر دیدوں:—— یہ سوچتے ہوئے اس نے ریسیور اُٹھایا اور "ارجنٹ ٹرنک کال" بک کراتے ہوئے اپنے باس کی رہائش گاہ کا فون نمبر اور نام لکھوا دیا۔ وہ سوچنے لگا:

"باس ابھی بستر پر دراز ہوئے ہوں گے، اتنی رات گئے فون کی گھنٹی بجنے پر وہ سخت برہم ہوں گے۔ میں جو خبر انہیں سناؤں گا، اُس سے اُن کے غصّے کا پارہ چڑھ جائے گا۔ بستر چھوڑ وہ کھڑے ہوں گے اور گویا ہوا میں اُڑنے لگیں گے"—— جانے کیوں اس تصور سے اس کو بے انتہا مسرت ہوئی؟

فون کے انتظار میں وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، سب کا سب اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ صبح جس سفر پر وہ روانہ ہو رہا ہے، اس کے لئے نہ تو کسی طرح کی صفائی پیش کرنے کی ضرورت ہے اور نہ وجہ بتانے کی۔ لاپروائی سے کسی کو نظر انداز کر دینا یا کسی کی مخالفت کرنا ہرگز اس کی فطرت میں داخل نہیں تھا۔ زندگی میں اب تک اس کو کبھی ان افعال کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا تھا اور نہ اس کو محسوس کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ یہاں تک کہ جب کبھی اس کے دوست آتے اور سینما چلنے کے لئے کہتے تو وہ فوراً مان جاتا، بالکل اتنی ہی آسانی کے ساتھ وہ اپنے باس کے بنائے ہوئے ہر پروگرام پر عمل کرتا آیا تھا۔ وہ کہا کرتا:

اپنی ذہانت اور عقل کی روشنی میں دوسرے جو پروگرام بناتے ہیں وہ اپنے ہی فائدے کی خاطر تو بناتے ہیں۔ پھر میں کیوں مخالفت کر کے اُن کا دل توڑ دوں اور اُنہیں مایوس کر دوں۔" اس کے ساتھ ہی اس کو اپنے پتاجی کی بات یاد آئی۔

اس کے پتا نہایت ہی با اصول اور سخت گیر انسان تھے۔ اس کو تو یاد نہیں رہا تھا لیکن چچا اکثر اس کے بچپن کا یہ واقعہ دُہرایا کرتے تھے۔

شاید وہ ابھی سات آٹھ سال کا تھا۔ ایک دن پتا نے دکان پر کچھ دیر کے لئے اُسے چھوڑ کر باہر جاتے ہوئے تاکید کی تھی کہ کسی کو یہاں سے ہرگز کچھ نہ دینا اگر کوئی آئے تو انتظار کرنے کے لئے کہنا۔ چند منٹ بعد اس کے مدرسے کا ایک عیسائی لڑکا وہاں آیا وہ اس سے کہیں زیادہ عمر کا تھا۔ اس نے ایک امرود دے کر ایک سکہ مانگا۔ سکوں کے درمیان وہ فرق نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے تین پیسوں کے سکے کے بجائے ایک روپیلا بڑا سکہ اُٹھا کر دے دیا۔ اس حرکت کا علم جب اُس کے پتا کو ہوا تو انہوں نے جم دگنی کا رُوپ دھار لیا۔ (لوگ کہتے ہیں وہ جم دگنی ہی کا اوتار تھے) دکان سے گھر تک اس کو گھسیٹ کرلے جایا گیا۔ پھواڑے میں بیل پھل کے درخت سے باندھا گیا اور اوّل تو بھڑوں کا چھتہ توڑ کر اس کے سر پر رکھ دیا گیا، پھر جب بھڑوں نے کاٹنا شروع کیا اور وہ درد اور جلن سے چلّانے لگا تو درخت سے ایک شاخ توڑ کر اُسے پیٹنا شروع کر دیا گیا۔ بچے کی دردناک چیخوں سے گھر اور محلہ کے لوگ جمع ہو گئے۔ ماں اور پھوپھی نے لاکھ کہا "چھوڑ دو چھوڑ دو، اتنے بے رحم نہ بنو" لیکن پتا کے کان پر جُوں تک نہ رینگی۔ مجمع میں سے محلے کی ایک عورت نے بُرا بھلا کہنا شروع کیا تو پتا نے اس کو منہ توڑ جواب دیا "یہ میرا بچہ ہے۔ اس کو میں نے پیدا کیا ہے میں مارتا ہوں تم کون ہوتی ہو پوچھنے والی!" اسی وقت گوکرن سے چچا لوٹے تھے، وہ بھاگے چلے آئے۔ پتا کو بانہہ سے پکڑ کر دُور چھوڑ آئے اور بچے کو درخت سے کھولا۔ خوف و دہشت سے زرد ننھے بچے نے دس دن تک کسی سے بات نہیں کی۔ وہ جب بڑا ہوا تو اس کی پھوپھی یا ماں اس واقعہ کا ذکر کبھی چھیڑ دیتی اور پھر کہتی: "باپ کے اس سلوک ہی نے شاید بچے کو سیدھی راہ پر ڈالا ہے ورنہ دوسرے بچوں کی طرح وہ بھی آوارہ بن جاتا، اور پھر ان آوارہ بچوں کے قصّے شروع ہو جاتے۔ یہ سُن کر وہ ہنسنے لگتا۔

پتا سے اسے پیار تھا بھی کہ نہیں، وہ کہہ نہیں سکتا۔ ویسے باپ کی مرضی کے خلاف نہ چلنے کا سبب جیسا کہ اُس کے پتا بھی جانتے تھے، ہرگز غلط راہ اختیار کرنے پر مار پڑنے کا خوف نہیں تھا۔ کسی مرضی کے خلاف کچھ کرنے کا وہ مطلب ہی نہیں جانتا تھا۔ یہی اُس کا اصول تھا، عقیدہ تھا۔ کتنی ہی مرتبہ اس اصول پر چل کر اس کو بے پایاں مسرت ملی تھی۔ "اس دن کلکتہ کے سفر پر بھیجنے کے لئے محب باس نے بلا بھیجا تھا تو اُن کے چہرے سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ اس معاملہ میں اُنہیں ذرا تھا کہ میں تکرار کروں گا۔ لگ جاؤں گا۔ لیکن جب میں نے کسی طرح کی اڑچن ڈالے بغیر، بخوشی رضامندی ظاہر کر دی تو اس وقت ان کو نراش ہونا پڑا ہوگا۔" —— فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ تیزی کے ساتھ بستر سے اُٹھ کر اس نے ریسیور اٹھا لیا۔ باس کو دی جانے والی اطلاع من ہی من میں دُہراتے ہوئے اُس نے گلا صاف کیا، نتھنوں کو سکیڑ کر ریسیور کو کان سے لگا لیا۔ آواز آئی۔

"Bombay line is out of order,
Sir delay is indefinite. Should
I keep the call pending, Sir?"

"کینسل اٹ" کے ساتھ ہی اس نے ریسیور زور سے پٹخ دیا، اور "ہو ہو، ہو ہو....." وہ ہنسنے لگا۔ باس پر آیا غصہ اتنی آسانی سے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ قہقہے مارنے لگا اور ہنستے ہوئے وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ گھڑی دیکھی بارہ بج چکے تھے اس نے سوچا "مجھے فوراً سو جانا چاہئے۔ رُوم بوائے وقت پر جگا دے گا۔ ورنہ اجنبی بُلانے کے لئے آئے تو کہیں سوتا نہ رہ جاؤں، چلو بتی ہی گل نہ کر دوں۔ اس طرح جب بھی میری آنکھ کھلے گی گھڑی دیکھ سکوں گا۔" اُس نے بتی نہیں بجھائی صرف آنکھیں موند لیں۔ ہوٹل کی پوری عمارت پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ رہ رہ کر کہیں دُور سے اکّا دکّا ٹرام یا بس کی آواز آ جاتی اور تھکے ماندے دماغ کو لوری سُنا جاتی۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد جب نیند ٹوٹی تو وہ ہڑبڑا کر ایک دم بستر پر اُٹھ بیٹھا۔ باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ گرج اور ہوا کی چیخ و پکار سے کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے تھے چند لمحوں تک تو اس کو محسوس ہی نہ ہوا کہ وہ کہاں ہے؟ کیوں اس طرح اُٹھ بیٹھا ہے؟ —— پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس نے اپنے اردگرد

نظر ڈالی۔ کمرے کی اندر کی روشنی دھیما لگ رہی تھی۔ اس احساس کے ساتھ ہی اس کو اپنا سفر یاد آیا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ اس کے آنے میں کچھ نہیں تو تین گھنٹے ضرور باقی ہیں۔ باہر جو سوٹ رہ گیا ہے اس کو بھی کیوں نہ سوٹ کیس میں رکھ لیا جائے۔" — وہ سوچنے لگا۔ اس کو بڑا ڈر محسوس ہونے لگا: "آخر میں اتنا کیوں گھبرا رہا ہوں؟ صبح جب وہ آئے گا تو کون سا سوٹ پہنوں گا؟ میں نے تو تمام کپڑے اندر رکھ دیئے ہیں۔ اگر یہی سوٹ پہن لوں تو کیسا ہے گا؟" اس خیال کے ساتھ ہی اس کے جسم پر کپکپاہٹ سی طاری ہوگئی۔ "سر شام ملاقات کے لئے آیا اجنبی کپڑے نہیں پہنے ہوئے تھا نا" — اور اس کو یاد آنے لگا: "پریشان بال، چوڑے شانے، کشادہ سینہ، پٹھے دار بانہیں، سیاہ رنگ، چہرے پر کالی کالی خوفناک لمبی مونچھیں، سیاہ چھاتی پر سیاہ گھنے بال۔ دائیں بازو پر سیاہ رنگ ہی کی موٹی ڈور — وہ لو، وہ آگیا دروازہ کھٹکھٹایا، خود ہی دروازہ کھول لیا (اندر سے زنجیر نہیں لگی ہوئی تھی) کمر تک جسم کو اندر ڈال کر جھانکنے لگا۔ 'کل صبح مرغ کی بانگ سے پہلے چلنا ہے۔ تیار رہیے گا — اتنا کہہ پیچھے ہٹا، دروازہ بند کیا اور غائب ہوگیا۔" اور میں نے اس کی بات کو کس قدر آسانی سے مان لیا جس قدر کہ اپنے دوستوں کی "چلو اٹھو یار سینما چلیں" کی خواہش کو یا باس کے "کل کلکتہ جانا ہے تمہیں" والے حکم کو مان لیتا ہوں۔ اسی طرح "ہاں" کہہ کر میں نے اس کی بات مان لی۔ کیا واقعی میں نے مان لی؟" — اس کے من میں پہلی مرتبہ یہ خیال کیا پیدا ہوا کہ اس نے تھکان محسوس کی۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ بستر تک چلا آیا، لیٹ گیا اور آنکھیں بند کرلیں۔

باہر طوفان بادو باراں میں تیزی پیدا ہوگئی۔ شور بڑھ گیا تھا۔

اس کے ذہن پر اس کے دادا کے موت والی رات ناچنے لگی۔ اسی کے بارے میں سوچتا ہوا وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ "دفتر والے یا رُوم بُوائے مجھے جگائیں گے بھی کہ نہیں — ان اندیشوں نے سونے سے پہلے سر اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر اب انہیں بھی نیند آگئی تھی۔ . . . .

رُوم بوائے نے اس کو بیدار نہیں کیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا۔ اپنی لاپروائی کو کوستا ہوا چائے کی ٹرے سنبھالے بھاری قدموں سے کمرے کی طرف بڑھا اور دروازے پر رُک گیا۔ اُس وقت صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ "اب تک شاید وہ چلے گئے ہوں" — اس نے دروازے پر تھپکی دی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ہینڈل پکڑ کر گھمایا۔ دروازہ کھل گیا۔ اندر سے زنجیر جو نہیں لگائی گئی تھی۔ کمرے میں بلب جل رہے تھے۔ "اوہ، وہ یہیں ہیں۔" ڈرتے ڈرتے وہ اندر داخل ہوا۔ بستر کے قریب گیا۔ سوٹ بوٹ میں ملبوس وہ بستر پر چت لیٹا ہوا تھا۔ گہری نیند لگی ہوئی تھی۔ پلنگ سے نیچے لٹکے ہوئے دائیں ہاتھ میں اس نے مضبوطی سے سوٹ کیس تھام رکھا تھا۔ بایاں ہاتھ مقابل کے کونے کی جانب پھیلا ہوا تھا۔ دونوں پیروں میں جوتے تھے پیر ایک دوسرے پر رکھے ہوئے تھے، سر تکیہ پر تھا۔ بال سلیقہ سے جمائے ہوئے تھے۔ ہاں، سر بائیں جانب ہلکا سا ڈھلک گیا تھا۔ رُوم بوائے نے چائے کی ٹرے قریب کی۔ ٹی پائی پر رکھدی اور سلام کیا: "گڈ مارننگ سر" جواب نہیں ملا تو اس نے کہا: "معاف کرنا سر، مجھے دیر ہوگئی" اب بھی جواب نہیں آیا تو اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ آپ کی روانگی میں دیر ہو رہی ہے سر، خاموشی پر وہ ڈر سا گیا۔ اپنے من میں اٹھے اندیشے کی تصدیق کے لئے اس نے اس کا جسم چھوا اور مانو اس کو جھٹکا سا لگا۔ وہاں سے سرپٹ بھاگا۔

ہوٹل کا منیجر جب ڈاکٹر کو لے کر کمرے میں داخل ہوا تو مزید پندرہ منٹ گزر چکے تھے۔ جانچ کے بعد ڈاکٹر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا:

"انہیں عدم کے سفر پر روانہ ہوئے کوئی پون گھنٹہ ہوا ہے۔" خوف سے کانپتے ہوئے رُوم بوائے کے منہ سے نکلا۔

"ٹھیک پانچ بجے مجھے چلے جانا ہے، چار بجے جگا دینے کے لئے انہوں نے کہا تھا، سر!" (ترجمہ: خالد عرفان)


خصوصی رعایت

اس کل کے سالانہ چندے میں رعایت سے

فائدہ اٹھائیے

۲ سال کیلئے: ۱۲ روپے یا ۱۸ شلنگ یا ۲٫۷۵ ڈالر

۳ سال کیلئے ۱۷ روپے یا ۲۵ شلنگ ۶ پینس یا ۳٫۵۰ ڈالر

گجراتی

# تہنیت نامہ



پتامبر پٹیل

دھن سکھ لال کو پدم شری کا اعزاز عطا کیا گیا۔ اخباروں میں اُن کی تصاویر کے ساتھ اُن کی سماجی خدمات کی تعریف و توصیف کی گئی تھی۔ وہ کتنے سماجی اداروں سے وابستہ تھے۔ یتیم خانے کے سیکریٹری کی حیثیت سے انہوں نے برسوں کام کیا تھا۔ اس ادارے کی عمارت کی تعمیر کے لئے انہوں نے انتھک کوشش کی تھی۔ کتنے ہی تعلیمی اداروں سے اُن کا تعلق تھا۔ شہر میں شاید ہی کوئی سماجی خدمت کا ادارہ ہوگا جس سے دھن سکھ لال کا تعلق نہ رہا ہو۔ اندھ شالہ، بہرے اور گونگوں کا ادارہ۔ ریڈ کراس۔ خاندانی منصوبہ بندی کا مرکز، اپاہج سیوا منڈل۔ بوڑھے اور کمزور لوگوں کا آشرم۔ ان سبھی اداروں کے کسی نہ کسی حیثیت سے وہ عہدے دار تھے۔ وہ کتنے ہی اداروں کے اہم رکن تھے۔ اُن کی ایسی ہی سماجی خدمات کو مدِنظر رکھتے ہوئے سرکار نے بھی اُنہیں کئی کمیٹیوں میں مقرر کیا تھا۔ سماجی کارکن کی حیثیت سے اُن کی شہرت چہار اطراف دُھوپ بتی کی خوشبو کی مانند پھیل چکی تھی اور اب دھن سکھ لال کے پدم شری بننے کا اعلان ہوتے ہی مبارکباد کے ٹیلیفون، تار اور خطوط کا تانتا لگ گیا تھا۔

اپنی زندگی کا آغاز دھن سکھ لال نے وکالت سے شروع کیا تھا۔ ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے اُنہوں نے شہرت حاصل کی۔ اسی سے کتنے ہی صنعت کاروں نے اُنہیں اپنا دائمی وکیل بنا لیا تھا۔ بعد میں وہ قانونی صلاح کار کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور باقی وقت سماج سیوا میں صرف کرتے تھے۔ دونوں لڑکے کام دھندے میں لگ گئے تھے۔ ایک نے تو کپڑے کی تھوک تجارت شروع کی تھی۔ اور چونکہ دھن سکھ لال کی جان پہچان کی وجہ سے دو تین بڑی ملوں کی گانٹھیں اُسے آسانی سے مل جاتی تھیں اس لئے اس کا دھندا اچھا چل نکلا تھا۔ دوسرے لڑکے نے اشتراک میں ایک اسٹور قائم کر لیا تھا اور پھر آہستہ آہستہ ایکسپورٹ امپورٹ کا کام بڑھا لیا تھا۔ اُس نے بمبئی میں بھی دکان کھول لی تھی۔ اس کا کام تو بہت ہی اچھا چل رہا تھا۔ دونوں لڑکے اچھے کماؤ ہو گئے تھے جس سے وہ بے فکر ہو کر اپنا سارا وقت سماجی خدمت کے کاموں میں لگا سکتے تھے۔

دھن سکھ لال بڑے شیریں زبان تھے۔ سب کے ساتھ اچھا میل

ملاپ رکھتے تھے جس سے سبھی طبقوں اور پارٹیوں سے اُنہیں اپنی سماجی سرگرمیوں میں پورا تعاون ملتا تھا۔ انہیں میونسپل چناؤ کے لئے اور ایک بار اسمبلی کے انتخاب میں کھڑا ہونے کے لئے بھی درخواست کی گئی۔ لیکن انہوں نے اپنے اصول مقرر کر لئے تھے۔ زندگی میں اخلاقی حد بندیاں کر لی تھیں۔ اس وجہ سے بھی سماج میں ایک سچے خدمت گار کی حیثیت سے اُن کی عزت و توقیر بہت بڑھ گئی تھی۔

ڈاکیئے نے آکر اپنی تھیلی کھولی اور سامنے خطوط کا ڈھیر لگا دیا تھا۔

دھن سکھ لال حیران و ششدر اس ڈھیر کو تاکتے رہے۔ آج اُنہیں اپنی زندگی کامیاب و کامراں معلوم ہوئی۔ انہیں مسرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بھولے میں تکیے کے سہارے بیٹھے ایک کے بعد ایک خط کھولتے جا رہے تھے۔ اچانک ایک خط پڑھتے پڑھتے وہ سکتے میں آ گئے۔ جیسے لاجونتی کے پتے چھوتے ہی سکڑ جاتے ہیں، ایسے ہی اس خط سے اُن کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے پسینہ آ گیا ہو، سانس رک رہا ہو، آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہو اور ہاتھ کانپ رہے ہوں۔ خط ختم کرنے تک وہ پسینے سے تربتر ہو چکے تھے۔ سر پر سُدرشن چکر کی طرح پنکھا چل رہا تھا۔ پھر بھی اُنہیں گرمی لگ رہی تھی۔ انہوں نے پاس پڑے رُومال سے پسینہ پونچھا اور پھر نیچے لٹکتے پاؤں سے جھولے کو تیز کر کے ہوش میں آنے کی کوشش کرنے لگے۔ سرخ آنکھیں بار بار اُس کاغذ پر آ ٹکتی تھیں۔

کیا مالتی ابھی تک زندہ ہے؟ آج تک وہ کہاں تھی؟ نظر بھی ہوئی تو اس موقع پر؟

دھن سُکھ لال دل ہی دل میں سوال کرتے رہے اور لفافے کی مُہر دیکھتے رہے۔ بمبئی کی مہر لگی ہوئی تھی۔ خط پر کسی جگہ بھی پتہ نہ لکھا ہوا تھا۔ خط تھا تو مالتی کا ہی۔ خط نے اُنہیں اپنی زندگی کے کمزور لمحات کی یاد دلا کر دل میں نوکیلا نشتر گھونپ دیا تھا۔ مالتی نے دھمکی دی تھی کہ میں اتوار کو سیدھے تمہارے ہاں آؤں گی اور تمہارے بیٹے کے لئے جائداد میں سے حصہ مانگوں گی۔

مالتی اتوار کو سیدھی اُن کے ہاں آئے گی۔۔۔۔؟ یہ فقرہ اُن کی آنکھوں کے سامنے ایسے جھپکتا رہا، جیسے لال بتی جھپکتی ہے۔ مالتی یہاں آ جائے تو۔۔۔۔؟ تو۔۔۔۔ دھن سکھ لال کی آنکھوں کی چمک بجھ سی گئی۔ اُن کی حالت ایسے ہو گئی جیسے پاگل ہو گئے ہوں۔ وہ ہانپ رہے تھے۔

یتیم خانہ کی منیجر مبارک باد دینے آئی تھی۔ دھن سُکھ لال کی یہ حالت دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ اُنہوں نے دھن سُکھ لال کے لڑکے کو بُلایا۔ پتاجی کو اچانک یہ کیا ہو گیا؟۔۔۔۔ اُنہیں پلنگ پر لٹایا، پانی پلایا، پنکھا تیز کیا۔ گھر کے سب لوگ پلنگ کے چاروں طرف اکٹھے ہو گئے۔ بہو کافی بنا لائی۔ کافی پینے کے بعد دھن سُکھ لال ٹھیک ہوئے۔ انہوں نے سب کو کہا۔ مجھے تھوڑی دیر آرام کرنے دیجئے۔ اور ابھی کسی ملاقاتی کو نہ آنے دیجئے۔

دھن سکھ لال نے دروازہ بند کروا لیا۔ تھوڑی دیر وہ آنکھیں چھت پر گاڑے پڑے رہے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے غیر واضح شکلیں نمودار ہو کر اُن پر غرا رہی تھیں۔ مالتی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح لال سُرخ آنکھیں نکالے جیسے کہہ رہی ہو۔

"تمہیں حکومت ہند نے پدم شری بنا دیا اس لئے فخر محسوس کرتے ہو گے۔ زندگی کو کامیاب اور مبارک سمجھتے ہو گے۔ تمہاری سماجی خدمات کامیاب ہو گئیں تمہیں ایسا محسوس ہوتا ہو گا۔ مگر تم نے مجھے کیسی حالت میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا تھا اور خود بزدلوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ بھی کچھ یاد ہے؟ جو تمہیں بڑا سماجی کارکن مان کر تمہاری تعریف اور تعظیم کرتے ہیں، اُنہیں شاید پتہ نہیں کہ اس ڈرپوک آدمی نے دغا دے کر ایک شریف عورت کی زندگی برباد کی ہے۔ تمہاری کالی کرتوتوں کی یاد تازہ کرانے کے لئے آئندہ اتوار تمہارے یہاں آؤں گی اور سب کو بتاؤں گی کہ جسے پدم شری کا اعزاز بخش رہے ہو، وہ کیسا گناہگار، بزدل اور دغاباز آدمی ہے۔ سمجھ لو تمہارے ساتھ بھوائے ہوئے فوٹو ابھی تک میرے پاس ہیں۔ تمہارے محبت بھرے خطوط تمہاری حرص و ہوس لوگوں کے سامنے ظاہر کریں گے۔ میرے بیٹے کی رگوں میں تمہارا لہو دوڑ رہا ہے، اس کا بھی ثبوت دیدوں گی۔

"گناہگار، بزدل، دغاباز" مالتی جیسے چھاتی پر بیٹھی گلا دباتے ہوئے کہہ رہی ہو۔

دھن سکھ لال آنکھیں بند کرتے ہیں اور کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے ہیں۔

"میں اتوار کو صبح کی گاڑی سے آؤں گی۔ آؤں گی اور تمہاری بے عزتی کروں گی۔ تم نے میری یہ حالت کی اس کا بدلہ لوں گی۔"

"مالتی۔۔۔۔ مالتی! میری بات تو سنو۔ تب میں مجبور تھا۔ میں

قابلِ رحم ہوں . . . میں کمینہ نہیں۔ ظالم نہیں۔ میری بات اطمینان سے سُن لو پھر تمہیں جو کرنا ہے کر لینا۔ میں مجرم ہوں۔ اِس کی سزا میں نے بہت بھگتی ہے۔ تمہیں چھوڑتے ہوئے مجھے انتہائی دُکھ ہوا تھا۔ یہ تو صرف ایک میرا دل اور دوسرا ایشور ہی جانتا ہے۔ میں نے تمہیں ڈھونڈھنے میں کبھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مگر تمہیں کیسے تلاش کرتا؟ تمہاری کچھ بھی خبر نہ ملی کہ تو اس دُنیا میں ہے یا نہیں۔ اس کا بہت تلاش کے بعد پتہ نہ چل سکا۔ ہمارے بیٹے کو بھی شاید تم نے کسی یتیم خانے میں دیدیا ہو ایسا جان کر میں کسی معصوم بچے کے چہرے پر تمہاری یا اپنی شکل و صورت کے نقوش تلاش کرتا رہا۔ مالتی تم مجھے معاف کرنا میرا دل اپنے اس جرم کو ابھی تک معاف نہیں کرتا۔

وہ دل ہی دل میں بہت پچھتا رہے تھے۔ مالتی ملے تو اس کا ہاتھ پکڑ کر معافی مانگنا چاہتے تھے مگر مالتی کبھی بھی نہیں ملی۔ اب یکایک وہ کہاں سے نمودار ہو گئی۔؟

وہ اتوار کو آگئی تو؟ آکر میرے بیٹوں، بہوؤں اور کنبے کے افراد کے سامنے عشقیہ خطوط، فوٹو وغیرہ رکھ دیئے تو؟ "لو رکھو یہ اپنا بیٹا" کہہ کر اپنے بیٹے کو سامنے کھڑا کر دیا تو؟

تو . . . تو . . . یہ "تو" سوال کے ایک بھاری بھرکم پتھر سے ٹکراتا۔ اور پاش پاش ہو جاتا۔ جیسے اُن کی عزت بزرگی اور عظمت سب کچھ تباہ و برباد ہو رہے ہوں، مٹی میں مل رہے ہوں۔ لوگ اُن کی جانب انگلیاں اُٹھا رہے ہیں۔ وہ لوگوں کے "طعنہ و تشنیع کو نہیں سہہ سکتے" اور زہر گھول کر خودکشی کر لیتے ہیں۔

رات کو "نیون" روشنی میں چمکتے اشتہار کی طرح "خودکشی" لفظ اُن کے دل میں جگمگا اٹھا "خودکشی"! ۔ مالتی آئے اور میری بے عزتی کرے اُس سے بچنے کا ایک واحد طریقہ ہے "خودکشی"۔

دھن سکھ لال جیسے "خودکشی" کے حروف کو پڑھ رہے ہوں، اس طرح وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے تاکتے ہی رہے۔ اس وقت اُن کی نبض تیز رفتاری سے چل رہی تھی، دل بھی بُری طرح دھڑک رہا تھا۔

ایک لمحہ تو انہوں نے ایسا بھی سوچا کہ پدم شری کا اعزاز نہ ملا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ اسی سے مالتی چڑ گئی ہے۔ پھر اُن کے سامنے مالتی کا خوفناک چہرہ آگیا۔ اُنہیں مالتی کا چہرہ، خون کا پیاسا ڈراؤنا اور خوفزدہ کر دینے والا لگا۔

"نہیں . . . نہیں نہیں مجھے تم سے نہیں ملنا"

"کس سے نہیں ملنا بابو جی؟" چھوٹے بیٹے نے دروازہ کھول کر پوچھا "پتا جی کیا یہاں کوئی آیا تھا؟"

دھن سکھ لال ہانپتے ہوئے اُٹھ بیٹھے، اُن کا سر چکرا رہا تھا۔ والد کی گھبراہٹ دیکھ کر بیٹے نے پوچھا "پتا جی کون تھا؟ سب کو اندر آنے سے منع کر رکھا ہے۔ آپ گھبرائے ہوئے کیوں ہیں کیا ڈاکٹر کو بلانا ہے؟"

"نہیں . . . نہیں . . . میں ٹھیک ہوں۔ یہاں کوئی نہیں آیا۔ مجھے تنہا پڑا رہنے دو۔ اندر کسی کو نہ آنے دینا۔"

گھر والوں کو بھی انتہائی تعجب ہو رہا تھا کہ دھن سکھ لال کو یکلخت کیا ہو گیا۔ ضرور کوئی ذہنی پریشانی ہے، اُن کا چہرہ بھی کیسا بدل گیا ہے۔

دو دن تو دھن سکھ لال اپنے سلیپنگ رُوم سے باہر نہیں نکلے، بے جان اور کمزور بستر پر پڑے اُن کی نظر بار بار سامنے لٹکے کیلنڈر پر جاتی تھی۔ آج شکروار . . . کل سنیچروار اور پرسوں کے دن تو مالتی آئے گی۔ آئے گی اور بدنامی کرے گی۔" دھن سکھ لال کے ذہن میں خیالات کا تانتا لگا تھا "میں کہیں چلا جاؤں تو؟ مالتی سے ملوں ہی نہیں تو . . . تو اگر وہ سیدھی اخبار والوں کے پاس جا پہونچے اور میرے خطوط اور فوٹو شائع کرا دے تو پھر میں کیا منہ لے کر واپس آسکوں گا؟ وہ آئے اور اسٹیشن سے ہی اُسے غائب کر دیا جائے تو . . . یا اگر اس کا کسی انجانے مقام پر پوشیدہ طور پر خاتمہ کر دیا جائے تو . . . " وہ جیسے بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہوں۔ ایسی حالت میں وہ خیالات کی دُم پکڑے ادھر اُدھر بھٹکتے رہے مگر باہر نکلنے کا راستہ نہیں سوجھ رہا تھا . . .

یا اُس کا پیار سے استقبال کروں اور چائے یا شربت میں ہلکا زہر پلا دوں . . . مالتی کو آنے سے روکنا ہی چاہئے۔ میری شہرت کو خاک میں ملا دینے والے اس اقدام کو روکنا ہی چاہئے۔ اور دھن سکھ لال مالتی کو میٹھی چھری سے ختم کرنے کی تراکیب سوچتے رہے۔ کون سا زہر دیا جا سکتا ہے، اسٹیشن پر ہی اُسے ملوں وہیں سے اُسے موٹر میں بٹھا کر کہیں لے جاؤں میں رنڈوہ ہوں، مالتی کو قبول کرنے کو تیار ہوں۔ ایسا ناٹک رچوں۔ کیا بوروپ میں بوڑھاپے کی شادیاں نہیں ہوتیں؟ بوڑھاپے میں مجھے جیون ساتھی ملے۔ اسی خیال سے اپنی ہم عمر بیوہ کے ساتھ شادی کر رہا ہوں۔ یہ خبر سماج سُدھار کے تحت کھپ جائے گی۔ مالتی یہ بات ضرور منظور کرلے

گی اور پھر اسی حالت میں اُسے زہر دے دوں گا۔

دھن سکھ لال کی عقل تیز ہوتی گئی۔ زہر دینے کا پروگرام دل میں بالکل فٹ بیٹھ گیا۔

سینچر وار کو تو وہ موٹر لے کر شام کو گھر سے باہر بھی نکلے زہر کی پڑیوں کا انتظام بھی کر لیا۔ اگر مالتی نہ مانے تو؟ بدنامی کرنے پر تل جائے تو خود ہی زہر کھاؤں گا۔ یہ بھی پروگرام طے کر لیا۔

سینچر وار کی رات کو دیوار کی گھڑی کے ٹکورے تو کیا اُس کے ٹکن کی ٹک ٹک تک کی آواز بھی وہ ساری رات سنتے رہے۔ رات اُنہیں ربڑ کی طرح لمبی ہوتی معلوم ہو رہی تھی۔ ترنگ بھرا دل طرح طرح کے مناظر دیکھتا رہا۔ ایک دو بار کھڑے ہو کر انہوں نے بنیان کی جیب میں رکھی زہر کی پڑیوں کو بھی بغور دیکھ لیا۔

مصیبت کے ٹل جانے کی پرارتھنا کی دل ہی دل میں دیوی دیوتاؤں کو یاد کرتے رہے۔ انہوں نے کورانہ عقیدت اور توہم پرستی کے خلاف مضامین لکھ کو متعدد وار کئے تھے۔ مگر آج ایک دو دیویوں کی منت مانی۔ ایک دیوی کی یاترا کر اس پر چھتر چڑھانے کا بھی عہد کیا۔

دھن سکھ لال کا دل اب توہرن کی طرح چوکڑیاں بھر رہا تھا جو ترکیب کبھی نہ سوچی تھی، ایسی ترکیب بھی سوچنے لگے۔ اب اُنہیں مالتی نامی کانٹے کو نکالنے کے کئی راستے دکھائی دے رہے تھے۔

سویرے وہ بہت جلدی اُٹھ بیٹھے۔ اشنان کر کے پرارتھنا کی "ایک خاص مہمان سے اسٹیشن ملنے جانا ہے" کہہ کر موٹر نکال کر اسٹیشن گئے۔ اسٹیشن کے پاس باہر نکلنے والے گیٹ کے پاس کھڑے رہے۔ سوا نو بجے میل سے تو مالتی نہیں آئے گی" یہ تو پورا یقین تھا۔ لیکن پھر بھی اُنہوں نے دونوں دروازوں پر چھان بین کر لی۔ جتنا آئی۔ وہ اسی گاڑی سے آئے گی۔ وہ اس طرح کھڑے ہو گئے جس سے وہ باہر نکلنے والے دونوں راستوں پر نظر رکھ سکیں۔ اُن کی آنکھیں ادھیڑ عمر مالتی کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ اکیلی عورت۔ یا ایک نوجوان کے ہمراہ آنے والی عورت کو وہ تلاش کر رہے تھے۔ مسافر نکلتے جا رہے تھے۔ بھیڑ بہت تھی مگر اُن میں مالتی نہیں تھی۔

سبھی باہر نکل گئے۔ گیٹ بند ہو گئے۔ مالتی چلی گئی ہوگی۔ دھن سکھ لال تھک گئے۔ ڈرائیور اُن کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

"ہمیں گجرات میل کا بھی انتظار کرنا ہوگا۔ شاید مہمان اُس سے آئیں"۔

دھن سکھ لال اسٹیشن کے ریستوران میں چلے گئے۔ وہاں چائے پی۔ پھر ہلک ٹیلی فون سے گھر فون کر کے معلوم کیا کہ کوئی مہمان آئے ہیں کہ نہیں۔ وہاں سے جواب ملا کہ کوئی نہیں آیا۔ تو بلا شبہ۔ گجرات میل سے آئیگی۔

گجرات میل آنے ہی والی تھی۔ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔

دو چار جان پہچان کے لوگ بھی ملے۔ آپس میں حسب سلامت بھی ہوئی۔ کس لئے آئے ہیں؟ ایسا سوال بھی کیا گیا۔ انہیں لوگوں کی نظر میں پڑنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس لئے وہ ایک کونے میں رکھے بنچ پر جا بیٹھے اور اخبار سے منہ چھپا کر گجرات میل کا انتظار کرنے لگے۔ گاڑیوں کے مقررہ وقت پر نہ آنے سے اُنہیں غصہ آ رہا تھا۔

گجرات میل بھی آئی۔ دھن سکھ لال ایک ایک چہرے کو بغور دیکھتے رہے۔ مالتی۔۔۔ مالتی۔۔۔۔ دوڑتی نظر پھر پھر کر تی چڑیا کی مانند چاروں جانب اُڑتی رہی۔ مگر مالتی کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ گیٹ سے سب کے نکل جانے کے بعد وہ بھی بھاری قدموں سے باہر نکلے۔

تو مالتی نہیں آئی ہے۔ خیر! نہیں آئی ہے۔ تو اچھا ہی ہے۔ وہ ایسے ہی دل کو تسلی دیتے رہے۔

مالتی کے نام سے کسی نے سازش تو نہیں کی؟ راستے میں جگنو کی طرح یہ خیال اُن کے دل میں کوند گیا۔

شہر کے تمام سوشل ادارے مل جل کر دھن سکھ لال کے اعزاز میں ایک شاندار تقریب منعقد کرنے کا پروگرام مرتب کر رہے تھے۔ گورنر صاحب نے مہمان خصوصی بننے کی منظوری دیدی تھی۔ جو پارٹیاں اس تقریب میں شرکت کرنا چاہتی تھیں، اُن کے نام مانگے گئے تھے۔ اخبار میں یہ خبر بھی شائع ہوئی۔ تیسرے دن مالتی کا پھر خط آیا۔ اس بار خط مختصر تھا۔

"مجھے قطعی طور پر پتہ ہے کہ میرے پہلے خط نے تمہاری نیند حرام کر دی ہے، اتوار کو تم اسٹیشن پر بھی آئے ہوگے۔۔۔۔ شاید مجھے بہلا پھسلا کر وہیں سے واپس بھیج دینے کے لئے۔ مگر میں تمہارا خیال غلط ثابت کرنے کے لئے ہی نہیں آئی۔ مجھے معلوم تھا کہ تمہارے اعزاز میں ایک تہنیتی جلسہ منعقد کیا جائے گا۔ اس تقریب میں اسٹیج پر آ کر دھماکا کرنے کے خیال سے ہی اپنا اتوار کو آنا جان بوجھ کر ملتوی کیا ہے۔ اُن خطوط اور تقاضا دیر کے

ساتھ اسٹیج پر آکر خود تمہاری تعریف و توصیف کروں، یہی بات مجھے قابلِ فخر معلوم ہوتی ہے۔ برسوں پرانی آگ بجھانے کا اس سے اچھا موقع دوسرا کون سا ملے گا؟ مجھے اسٹیشن سے لانے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں ایسی بھی نہیں کہ تمہیں خبر کرکے آؤں جلسے میں میں موجود رہوں گی اتنی خبر دیئے دیتی ہوں۔ تم جیسے عمر بھر سماج کی سیوا کرنے والے کی خدمت میں تو حاضر رہنا ہی چاہیے نا۔"

پھر مالتی آئے گی۔ اور جلسے میں موجود بھی رہے گی۔ ٹاؤن ہال کھچا کھچ بھر گیا ہے۔ گورنر مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے بیٹھے ہیں۔ اسٹیج پر معزز شہری اور مختلف پارٹیوں کے رہنما بیٹھے ہیں۔ ان سب کے سامنے مالتی آکر دھماکا کرے تو . . . . . ؟

دھن سکھ لال کو چکر سا آگیا۔ وہ آنکھیں بند کئے پلنگ پر ہی پڑے رہے۔ انہیں اب اپنے سامنے ٹاؤن ہال اور حاضرینِ جلسہ دکھائی دے رہے تھے۔ ایک عورت کھڑی ہو کر اوپر اسٹیج پر آتی ہے اور مائیک کھینچ کر بولنے لگتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں لفافوں کی گڈی ہے۔ مالتی . . . مالتی ؟ . . . دھن سکھ لال کانپ اٹھے۔ سارا جسم پسینے سے تر بتر ہو گیا۔ دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی کیا؟ پر بھو اب تو اتنی مہربانی کردے تو ٹھیک ہے۔ مالتی . . . مالتی ضرور میری آخرت خراب کرے گی مجھے اعزاز نہیں چاہیئے۔ مجھے تقریب منعقد نہیں کرانی۔ مجھے عزت و شہرت نہیں چاہیئے۔" نہیں . . . نہیں . . . . اپنے اعزاز میں تقریب منعقد نہیں کرانی۔ وہ ٹیلیفون پر اناتھ آشرم کے سکریٹری سے کہہ رہے تھے۔ چاہے سبھی پارٹیوں کی تیاریاں مکمل ہو گئی ہوں۔ لیکن . . نہیں . . . مجھے توقیر اور تعظیم اور اعزاز نہیں چاہیئے۔ میرا ایسا دکھاوے میں اعتقاد نہیں۔ ہاں ..... ہاں بھائی۔ ہاں میں آپ کی عقیدت و محبت سمجھتا ہوں۔ مگر مجھے اعزاز نہیں چاہیئے کیا کہا؟ آپ ملنے آرہے ہیں ـــــ ـــ ہاں . . . . ہاں خوشی سے تشریف لائیے۔

پھر انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ یہ تو میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے: پدم شری بنا دیا، ٹھیک ہے۔ عزت افزائی کرنا ہو تو اس میں سب کچھ آگیا ایسا سمجھئے۔ بلکہ کھلا جلسہ کرنا تو خدمت کے نظریہ سے بھی ٹھیک نہیں۔

دوسرے دن دھن سکھ لال کی تصویروں کے ساتھ ان کی انکساری کو سراہتے ہوئے خبریں شائع ہوئیں۔ اس سے عوام میں ان کی عزت و توقیر مزید بڑھ گئی۔ کئی اخبار والوں نے ان کی بے غرض سماجی خدمات پر اداریئے لکھے۔

ان کے اعزاز میں منعقد ہونے والی تقریب ملتوی کر دی گئی۔ مالتی آتے آتے رک گئی۔ اس سے دھن سکھ لال کو کچھ اطمینان ہوا۔ مگر تبھی مالتی کا خط آیا۔ اس خط نے پھر انہیں پریشانی میں ڈال دیا۔ وہ خط کو ہاتھ میں لئے کافی دیر تک ساکت و صامت بیٹھے رہے۔

"میں نے جو سوچا تھا وہی ہوا۔ مجھے ایسا لگا تھا کہ میرے خط کے بعد تم تقریب ملتوی کرا دو گے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ خاص طور پر ایسی تقاریب کی جاتی نہیں کرائی جاتی ہیں۔ تمہارے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا ہوگا، ایسا مانتی ہوں تمہیں انکساری و عاجزی کے بہانے اور فائدہ ہو گیا۔ یہ تو اخباروں سے اداریوں سے ہی پتہ چل گیا۔ ان سب لوگوں کو اصلیت کی کہاں خبر ہے۔ لیکن میں تمہیں چھوڑنے والی نہیں۔ بھوت بن کر بھی تمہارا پیچھا کروں گی کسی ایسے ہی موقع کی مسلسل انتظار کرتی رہوں گی۔

"آؤں گی ایک بار تو تمہارے مرنے سے پہلے ضرور آؤں گی۔"

کیا مالتی کھڑکی میں بیٹھی بیٹھی بول رہی ہے؟ دھن سکھ لال کھڑکی کی طرف تاکنے لگے۔ مالتی کا سایہ کھڑکی سے اتر کر ان کے پاس آرہا تھا۔ اوپر چھت پر مدھم سپیڈ سے پنکھا گھوم رہا تھا۔ پھر بھی دھن سکھ لال کو پسینہ آرہا تھا۔ انہیں ایسی بے چینی محسوس ہو رہی تھی جیسے ان کی سانس رک رہی ہو۔

(ترجمہ: ایشا شرما)

## بقیہ: کڑوا سچ

دیکھ کر دل دھڑک اٹھا۔ "ارے یہ کیا کیا تم نے؟"

خون میں لت پت چہرے کو اپنی قمیض میں سے نکال کر میرے سامنے رکھتے ہوئے وہ بولا: "جانوروں کی طرح رہنے والا میں آپ کی مہربانی سے آدمی بنا۔ میں نے اپنی زندگی، اپنی محبت، اپنا سب کچھ اسے (بیوی کو) دیدیا پھر بھی وہ دوسروں کے ساتھ جاتی رہی۔ اپنی عادت نہ چھوڑی۔ میں آدمی بن گیا ہوں۔ اس کی بے وفائی کو برداشت نہ کر سکا . . . اس کی چھاتی میں چھرا گھونپ دیا۔" اور یہ کہہ وہ میرے پیروں پر گر پڑا (ترجمہ: جگدیش چندر)

مراٹھی

# تعزیتی تجویز

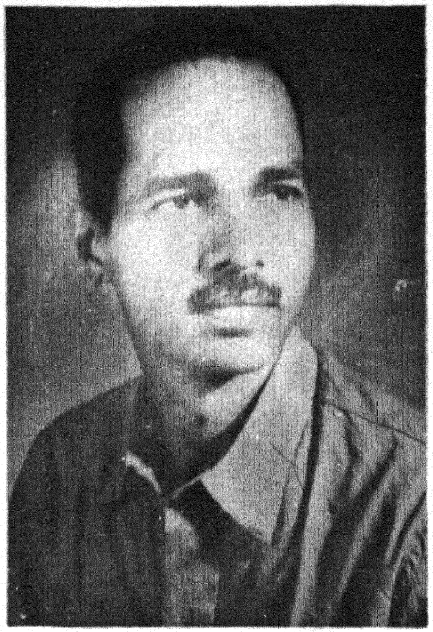

اُوشا پرانڈے

اپنی کالی ٹائی کی گرہ ٹھیک کرتے ہوئے شری پرانجپے کلب کے ہال میں داخل ہوئے۔ اس وقت کلب کے سیکریٹری شری کالے اور خواتین میں شریمتی داتار ٹیبل ٹینس کی ہری میز کے پاس اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ آس پاس کی دس بارہ کرسیاں خالی ہی پڑی تھیں۔ اتنے کم لوگوں کو دیکھ کر شری پرانجپے کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"یہ کیا ہے مسٹر کالے، اور کوئی نہیں آیا۔؟"

خوابوں کی دُنیا سے واپس آتے ہوئے اور صدر کے تئیں احترام کا اظہار کرنے کے لئے کھڑے ہوتے ہوئے شری کالے نے جواب دیا۔ "نہیں ابھی کوئی نہیں آیا۔"

صدر نے خیالات میں ڈوبے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "چار تو بج چکے ہیں۔"

"ہاں"

"شری رانگنے کر کو تو میں نے ...."

"کون جانے۔ میں نے بورڈ پر تو میٹنگ کا نوٹس لگا دیا تھا۔ باقی بھی تیاریاں ہو چکی ہیں۔"

شری پرانجپے کرسیٔ صدارت پر براجمان تھے۔ لیکن خالی کرسیاں اُن کی آنکھوں میں چبھ رہی تھیں۔ من ہی من اُنہوں نے کہا۔ "کمال ہے کوئی تفریحی جلسہ ہو تو سب لوگ پانچ دس منٹ پہلے ہی آجاتے ہیں لیکن چونکہ اس میٹنگ میں تعزیتی تجویز پاس کرنی ہے، اِس لئے کوئی حاضر نہیں۔"

اپنے کالے کوٹ میں سے اُنہوں نے تعزیتی تجویز کا کاغذ نکالا اور میز پر ٹیک دیا۔ ماتھے کا پسینہ رومال سے پونچھتے ہوئے شری کالے سے کہا۔

"یہ تجویز آپ کو کیسی لگی؟"

شری کالے نے کاغذ اپنی طرف کھینچا۔ شریمتی داتار نے جہاں تک ہو سکا جھانک جھانک کر پڑھنا شروع کیا۔

"بہت اچھا"، شری کالے نے کہا "کیا بھاشا ہے۔ لاجواب! ایسی بھاشا پڑھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے!"

میں نے جان بوجھ کر ہندی کے ایک ایڈیٹر سے یہ تجویز لکھوائی ہے کیونکہ اِسے اخباروں کو بھیجنا ہے۔

"کیا یہ تجویز اخباروں میں بھیجیں گے آپ؟ کیوں؟" شریمتی

داتار نے پوچھا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں — ضرور بھیجیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ جب کبھی ہم ایسی تجویز پاس کرتے ہیں تو ہمارا کلب مفت میں مشہور ہو جاتا ہے۔"

"تو کیا ہمارے نام بھی چھپیں گے؟"

"آف کورس، پریس میں خبر ہی ایسی دیں گے۔ فلاں فلاں ممبر موجود تھے۔ اُنہوں نے ہی یہ تجویز پاس کی ہے۔

ہائے شریمتی داتار نے افسوسناک لہجے میں کہا "مجھے پہلے معلوم ہوتا تو میں مسٹر داتار کو بھی لے آتی۔"

شری کالے نے گھڑی میں دیکھا۔ سوا چار بج رہے تھے۔

مسٹر پرانجپے کی آنکھیں پھیل گئیں "لیٹ اَس ویٹ"

اتنے میں دروازے کے پاس ایک کار کھڑی ہوئی۔ شری پرانجپے پر اُمید ہو گئے۔ انہوں نے کہا "شاید مسٹر رانگنیکر آ گئے ہیں۔"

شری کالے نے گردن اونچی کر کے کھڑکی میں سے جھانکا۔ "ہاں وہی پہونچے ہیں۔

"مسٹر چیما، مینار ناڈگیر، گُڈ کافی ممبر اکٹھے آ گئے۔"

شری رانگنیکر نے داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے مسٹر پرانجپے آپ کے کہنے کے مطابق میں کتنوں کو پکڑ لے آیا ہوں۔"

"تھینک یو"

شری چیما نے شری پرانجپے کو سنجیدہ دیکھ کر کہا۔

"کیوں آج مورننگ سوٹ میں؟"

"ہاں آج تعزیتی تجویز پاس کرنی ہے نا۔"

شری چیما نے تعجب سے پوچھا "کس کا شوک؟ ہُو از ڈیڈ۔"

"آپ کو نہیں معلوم؟"

"نہیں میں نہیں جانتا" شری رانگنیکر نے کہا "میں سمجھا میٹنگ ہے اس لئے میں آ گیا۔"

"ہمارے سابق صدر شری ستیہ وان کھوٹے کا پچھلے ہفتے انتقال ہو گیا۔"

شری چیما کے چہرے کی سنجیدگی غائب ہو گئی۔ بے فکر لہجے میں وہ بولے "اچھا وہ ایڈیٹ اوکے پاس کر دیجئے۔ تجویز" پھر ملٹری سیلیوٹ مار کر بولے "میں نے فوجی انداز سے انہیں آخری سلامی پہلے ہی دے دی ہے۔"

"مسٹر چیما بی سیریس۔ ہم لوگ رنج و غم کا اظہار کرنے جا رہے ہیں۔"

"اجی جانے بھی دیجئے مسٹر کالے" شریمتی داتار نے سمجھوتا کرانے کے انداز سے کہا "تعزیتی تجویز محض ایک رسمی چیز ہے۔"

شریمتی داتار کی حمایت کی وجہ سے شری چیما اکڑ گئے۔ انہوں نے کرسی کھینچ لی۔ تب تک باقی لوگ بھی بیٹھ چکے تھے۔

شری پرانجپے نے گھڑی کی جانب دیکھا اور پھر سنجیدگی سے سب کی جانب دیکھا اور کہا "دوستو اس وقت چار پچیس ہو رہے ہیں اس لئے اب کارروائی شروع کی جائے۔

چہرے پر رومال کا ڈسٹر پھیرتے ہوئے انہوں نے تقریر شروع کی "آج ہم سب بڑے دکھی دل سے اکٹھے ہوئے ہیں۔ ہمارے ایک سرگرم ممبر اور سابق صدر شری ستیہ وان کھوٹے کی پچھلے ہفتہ موت ہو گئی۔ اُن کی موت سے ہمارے آنند کلب پر رنج و غم چھا گیا۔ مگر موت سے کس کو رستگاری ہے۔ سوچ کر ہمیں صبر کرنا چاہئے۔ اُنہیں خراجِ عقیدت پیش کرنے اور بے وقت جدائی سے متعلق تعزیتی تجویز پاس کرنے کے لئے ہم یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ اس لئے جن جن صاحبان کو خراجِ عقیدت پیش کرنا ہے۔ وہ تقریر کر سکتے ہیں لیکن وقت تھوڑا ہے۔ ہر کسی کو صرف دس منٹ ہی ملیں گے۔"

شری پرانجپے بیٹھ گئے اور انہوں نے آدھا منٹ انتظار کیا مگر کوئی نہ اُٹھا مایوس ہو کر اُنہوں نے کہا "کیا مطلب، کیا کوئی بھی نہیں بولنا چاہتا"

شری چیما نے جیب سے میسوری سپاری نکالی۔ شری منیار اور شری ناڈگیر نے اُن کے آگے ہتھیلیاں پھیلا دیں۔ کسی کے بھی بولنے کے آثار دکھائی نہ دینے پر ہنستے ہوئے شری رانگنیکر نے کہا "جنابِ صدر رنج و غم کے جذبات کی وجہ سے سبھی لوگوں کے گلے رُندھ گئے ہیں۔ ایسا سمجھ کر آپ پرستاؤ پاس کر دیجئے۔"

یہ سنتے ہی سبھی لوگ ہنس پڑے۔

"سیریس" شری پرانجپے نے ناراضی سے کہا "اِٹ از ناٹ فیر" سب کی تقریروں کے بعد ہونے والی اختتامی تقریر بھی میں تیار کر کے لایا ہوں۔"

گھڑی نے دو منٹ کا وقت اور دکھایا مگر کوئی نہ اٹھا پھر لاچاری سے شری پرانجپے اٹھے۔

"اچھا، تب تو شاید شری رانگنیکر کے کہنے پر ہی عمل کرنا پڑے گا۔"

شری ناٹو گر نے ہلکے سے کہا "جب کوئی بھی تقریر نہیں کر رہا تو اختتامی تقریر کی کیا ضرورت ہے۔ تجویز پاس کر دو۔"

شری پرانجپے نے ادھر دھیان نہیں دیا لیکن ویسے ہی کہا۔

میں جو تجویز لکھ کر لایا ہوں وہ پڑھ کر سناتا ہوں پھر ہم سب اسے اتفاق رائے سے پاس کر دیں گے۔ ذرا توجہ سے سنئے۔"

انہوں نے تجویز کا کاغذ سامنے رکھا۔

ہمارے آنند کلب کے سابق صدر شری ستیہ وان کھوٹے جی بڑے شریف اور نیک انسان تھے اُن کا چال چلن اور نیکی اور ایمانداری مثالی تھی۔ اُنہوں نے اپنے کلب کے لئے بہت سی تکلیفیں برداشت کیں اور کلب کی عزت و توقیر بڑھائی۔ اُن کی موت سے کلب یتیم ہو گیا ہے۔ اس تجویز کے ذریعے کلب ان کی موت پر گہرے دکھ کا اظہار کرتا ہے۔ ایشور اُن کی رُوح کو شانتی دے۔"

شری رانگنیکر پھپھسائے "ذرا تجویز لمبی چوڑی ہو گئی ہے۔"

"تو میں کیا کروں ایسا پرستاؤ تو لمبا ہی ہوتا ہے۔"

پھر سب کی طرف دیکھتے ہوئے شری پرانجپے کہنے لگے "یہ پرستاؤ میں لکھ کر لایا ہوں۔ کسی کو اس میں ترمیم کرنا ہو یا مرحوم کو مزید تعظیم دینی ہو تو براہ کرم کھڑے ہو جائیں۔"

گھڑی میں ۴۵-۴ ہو گئے مگر کوئی نہ اٹھا۔ شری کالے نے جلدی جلدی میں کہا "رکسی کا کوئی سجھاؤ نہیں۔"

"ٹھیک ہے" شری پرانجپے نے کہا "اب ہم اس پرستاؤ پر ووٹ لیں گے۔ شاید کسی کو اختلاف نہ ہو پھر بھی . . . . ."

شریمتی داتار بولیں۔

"اجی تعزیتی تجویز تو ایک رسم ہے اس پر رائے شماری کیا۔"

"ہاں لیکن ہر ایک کام قاعدے سے ہونا چاہئے۔" شری پرانجپے نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"پھر بعد میں کوئی اعتراض نہ اٹھائے۔ ہاں تو سجنو آپ سب لوگ اپنے ہاتھ اُوپر اٹھا کر اس پرستاؤ کی منظوری دیں۔"

شری پرانجپے نے سب پر نظر ڈالی۔ کسی نے پورا ہاتھ کسی نے آدھا ہاتھ اور کسی نے ایک انگلی اُوپر کر رکھی تھی۔ مگر شری منیار بے نیاز تھے۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھے کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔"

"مسٹر منیار ہاتھ اوپر کیجئے نا۔"

"جناب صدر" شری منیار نے ہچکچاتے ہوئے کہا: "مجھے تھوڑا سا اختلاف ہے۔"

"کیا کہا اختلاف ہے؟" سب نے اونچی آواز میں کہا۔

"چاہے تو اختلاف سمجھئے۔ اس تجویز میں بالکل سچ ہی بولنا ضروری ہے یا جھوٹ بھی۔ اگر سچ ہی ہو تو . . . .

"ٹھہریئے مسٹر" شری رانگنیکر نے کہا "پہلے صدر صاحب کو ہمیں ہاتھ نیچے کرنے کے لئے کہنے دیجئے پھر بتایئے اپنا سجھاؤ۔"

"سب ہنسے مگر شری پرانجپے اپنے خیالوں میں مگن تھے۔"

"یس یس ہاتھ نیچے کر لیجئے۔"

شری چمپانے آرڈر دیا "ہینڈز ڈاؤن"

سب خوب ہنسے۔ شری پرانجپے نے شری منیار سے پوچھا "مسٹر منیار آپ کا کیا سجھاؤ ہے"

شری منیار نے کہا "میرا کہنا یہ ہے کہ اس تجویز میں آپ نے کہا ہے کہ ستیہ وان کھوٹے جی کا چال چلن اور ایمانداری مثالی تھی، "آئی ایوز" میرے باس کے ان کھوٹے جی نے بیس ہزار روپے ہڑپ کر لئے تھے . . .

شریمتی داتار نے ہاتھ پھیلا کر کہا "مسٹر منیار تعزیتی تجویز تو صرف ایک فارمیلٹی ہوتی ہے۔"

"ٹرو" شری منیار نے سمجھاتے ہوئے کہا "بٹ اٹ از اے کوسچن آف سروس۔ یہ تجویز اخباروں میں شائع ہوگی۔ یہ کل ہی شری پرانجپے سے مجھے معلوم ہوا۔ یہ تجویز پڑھ کر میرے باس میری کھال کھینچ لیں گے کہ آپ کلب کے ممبر ہیں، کھوٹے جی نے میرے بیس ہزار روپے ہڑپ کر لئے۔ یہ آپ جانتے ہیں پھر بھی آپ نے ایسا پرستاؤ پاس کیا۔"

"تو آپ ایسا کیجئے منیار" شری کالے نے سمجھاؤ دیا "آپ اپنے باس کو کہہ دیجئے کہ یہ صرف دکھاوا ہے۔ ویسے بھی ہم کہاں سنیر ہیں۔"

"تو ایسا کیجئے کہ یہ پرستاؤ پریس کو بھیجئے ہی نہیں۔"

شری پرانجپے کی جان نکل گئی۔

"نہیں نہیں اخباروں میں یہ تجویز بھیجنا ہی چاہئے۔ اس سے ہماری

اور ہمارے کلب کی مفت میں شہرت ہو جائے گی۔ ایسی تجویز پاس کرنے والوں کو سماج میں عزت ملتی ہے۔"

"اور آرڈیننٹو" شری منیار نے سمجھاؤ دیا "میں باہر جاتا ہوں پھر آپ لوگ جو مرضی آئے پرستاؤ پاس کیجئے۔"

"ساری، پرستاؤ اتفاق رائے سے پاس نہ ہو سکا اور لوگوں کو معلوم ہو گیا تو نام ڈوب جائے گا ہمارے کلب کا۔"

"تو پھر یہ تجویز پاس ہی مت کیجئے۔"

"پھر بھی ناک کٹے گی۔ تجویز پاس کرنے آئے اور پاس کئے بغیر ہی چلے گئے۔ اس کا مطلب؟"

شری منیار کا پارا چڑھ گیا۔

"یہ تو ظلم ہے۔ تجویز کا ایک جملہ جھوٹ ہوتے ہوئے میں اس تجویز کی حمایت کیسے کروں؟ میں باہر بھی نہ جاؤں، پرستاؤ پر بس کے پاس ضرور ہی بھیجنا ہے۔ یعنی میرے باس میری حجامت کریں؟"

شری پرانجپے چیخے "کوئی نہیں حجامت کرے گا آپ ٹوپی پہن کر چلے جائیے گا۔"

سب ہنس پڑے مگر شری منیار کا پارا چڑھتا ہی گیا۔

"دیکھو بھائی خاوند کیسا ہے یہ تو بیوی ہی ٹھیک ٹھیک بتا سکتی ہے۔ میرا باس کیسا ہے؟ یہ تو میں ہی جانتا ہوں، آگ ہے آگ۔"

سب سنجیدہ ہو کر سوچنے لگے۔ اتنے میں شری کالے نے مشورہ دیا۔

"آپ کا اختلاف اُن کے چال چلن اور ایمانداری کے بارے میں ہے نا۔ اس جملے کو نکال دیجئے۔" لیکن شری پرانجپے کو یہ بات منظور ہو یہ ناممکن تھا۔

"نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ اٹ از این آرٹسٹک سینٹیں" اس سے تو تجویز بلینڈ ہے۔"

بیٹھے بیٹھے شری ناڈگیر اُوب سے گئے۔

"لیوائٹ"

"لیوائٹ مسٹر پرانجپے" پرستاؤ پاس ہو گا یا نہیں؟

بحالت مجبوری شری پرانجپے نے قلم اٹھایا اور وہ جملہ کاٹ دیا۔ اُن کی شکل ایسی ہو گئی تھی جیسے اُن کے دل کا ٹکڑا ہی کسی نے کاٹ دیا ہو۔

اتنی دیر میں شری رانگنیکر بے چین ہو اٹھے۔ وہ ایک دم بول اٹھے "مسٹر پرانجپے میں کچھ بولنا چاہتا ہوں۔"

"یس مسٹر رانگنیکر"

"شری منیار نے جب سچ بولنے کی ٹھانی ہے اس لئے میں بھی کیوں پیچھے رہوں۔ سب کے چہرے پر ناراضی پھیل گئی۔

اس تجویز میں آپ نے انہیں اچھے چال چلن کا اور شریف انسان کہا ہے۔ اس سے میرا اختلاف ہے۔"

"رانگنیکر جی" شریمتی داتار سمجھانے لگیں "ماتی تجویز صرف فارمیلٹی ہوتی ہے۔"

"یس مسز داتار لیکن جو سفید جھوٹ ہے اُسے میں کبھی مان نہیں سکتا۔"

"سفید جھوٹ"

پرانی یادوں سے شری رانگنیکر گرم ہو گئے تھے۔

"آپ نہیں جانتے اور اتنے دن میں نے بتایا نہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ انہیں کھونے جی نے کالج میں میری مسز کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔۔۔"

"چھوڑئیے بھی" شری چمپانے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

"شری رانگنیکر کا دماغ تپتا ہی گیا" اُن کی باتیں سنا تا جاؤں تو شاید ایک کتاب بن جائے۔ شریمتی سالوی، کماری بھاگوت، شریمتی موہنی اور۔۔۔۔

"بس بس اب گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ؟۔۔۔" شری کالے نے کہا۔ لیکن شری رانگنیکر اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔

"اگر یہ تجویز میری شریمتی نے دیکھ لی تو ایک تو خود وہ مجھے تنگ کریں گی اور میں نے انہیں سمجھا بھی لیا تو وہ جس اسکول میں پڑھاتی ہیں، وہیں کماری بھاگوت اور شریمتی موہنی ہیں۔ ان تینوں کے ہاتھ میں تجویز پڑ گئی تو اصلیت کا ڈھنڈورا پیٹ دیں گی۔ کہیں گی اس کلب کے لوگ اتنے بے شرم ہیں کہ شری کھوٹے کو شریف اور نیک چلن کہتے ہیں۔"

شری منیار کا پلڑا بھاری ہو گیا۔

"میں آپ سے متفق ہوں شری رانگنیکر جی۔"

حیران ہو کر شری کالے نے پوچھا "پھر کیا؟"

"سو واٹ؟" شری منیار کی طرح میرا بھی یہی خیال ہے کہ اس تجویز میں کھوٹے جی کی فالتو تعریف کی گئی ہے۔ کٹ اِٹ شارٹ"

"تو پھر کیا پرستاؤ رد کر دیا جائے؟" یہ خیال ہی شری پرانجپے کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔

"نہیں نہیں" وہ چلائے "پرستاؤ پاس ہونا ہی چاہئے۔ ماتی جملے اس پرستاؤ میں ضرور ہوں گے۔"

شری کالے نے پھر ٹانگ اڑائی "پھر ایسا کیجئے کہ پہلے کی طرح یہ جملہ بھی قلم زد کر دیجئے۔"

"پھر بچا ہی کیا؟" شری پرانجپے نے پوچھا۔

اس سے ہمیں مطلب نہیں" شری رانگنیکر نے واضح کیا "جھوٹی تجویز پاس کرنے سے اچھا یہ ہے کہ چھوٹا سا ہی لیکن جو اصلیت ہے وہی پرستاؤ پاس کیا جائے تاکہ لوگ یہ کہیں کہ کلب کے لوگ جانتے ہیں کہ ستیجائی کیا بلا ہے۔"

شری پرانجپے کی سانس اُوپر نیچے ہونے لگی۔ اب قلم اُٹھانے کی اُن کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ تب شری کالے نے ہی تجویز کا کاغذ اپنے پاس کھینچ لیا۔

"ہاں کہاں ہے؟ ہاں یہ رہا، یہاں سے یہاں تک یہ جملہ میں نے کاٹ دیا ہے۔"

شری منیار اور شری رانگنیکر پھولے نہ سمائے "ہاں بہت اچھا ایک بار اور پڑھئے تو۔"

"ہمارے آنریری کلب کے سابق صدر شری ستیہ وان کھوٹے جی ۴ ستمبر ۱۹۶۸ء کو انتقال کر گئے۔ انہوں نے اپنے کلب کے لئے بہت سی تکلیفیں برداشت کیں اور کلب کی عزت اور توقیر بڑھائی، اُن کی موت سے ہمارا کلب یتیم ہو گیا ہے۔ اس تجویز کے ذریعے یہ کلب اُن کی موت پر گہرے دُکھ کا اظہار کرتا ہے۔ ایشور اُن کی رُوح کو شانتی دے۔"

"شری رانگنیکر خوش ہو گئے "منظور ہے بھیج دو پیپرز کے پاس۔"

شاید شری چیما کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

"ایک منٹ شری کالے یتیم مینز واٹ؟ مائی ہندی از ویک۔ یتیم مطلب نرادھار۔"

"جسٹ ٹیل می دا مینگ۔"

اس کا مطلب ہے "دیٹ وی فیل آرفن"

"نان سینس" شری چیما چیخے۔ "وی ڈونٹ فیل دیٹ وے۔ کون اپنے آپ کو آرفن سمجھنے لگا ہے۔ کس کام میں ڈیفیکلٹی آئی ہے۔ برج، پنگ پانگ، بیڈمنٹن، کلب کے سبھی کھیل اور پروگرام ٹھیک طریقے سے چل رہے ہیں ——"

شری بھتی داتار نے پھر کہا۔

"مسٹر چیما یہ تو صرف فارمیلٹی ہے۔"

لیکن اس پر کسی نے دھیان نہیں کیا۔ شری منیار کو پھر غصہ آگیا، بولے "کیسی خدمت اور کہاں کی عزت۔ اِن کو تو ہم لوگوں نے صدر کے عہدے سے ہٹایا تھا۔"

"بالکل ٹھیک" شری چیما نے کہا "جب وہ صدر تھے تو اُنہوں نے کلب کے پیسے میں غبن کیا۔۔۔ اسی لئے تو ہم نے اتفاق رائے سے اُنہیں صدر کے عہدے سے ہٹایا۔ اور شری پرانجپے کو صدر بنایا۔"

"شری چیما نے ٹھیک ہی کہا ہے۔" شری رانگنیکر بولے۔

"شری کھوٹے نے کلب کی کیا بھلائی کی ہے۔ بلکہ جب سے وہ گئے ہیں تب سے کلب کی حالت بہتر ہو گئی ہے۔ نن از ساری۔"

شری پرانجپے اپنی تعریف سے خوش ہو گئے۔ "وہ تو ٹھیک ہے" زبردستی ہنستے ہوئے اُنہوں نے کہا "مگر ہمارے صدر چلے گئے تو کچھ اچھی باتیں بھی کہنی چاہئیں۔"

"لیکن سچ بولنے پر اصرار کون کر رہا ہے؟ کیا ضرورت ہے تجویز کی؟" شری پرانجپے کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ گرم ہو کر اُنہوں نے کہا۔

"شری منیار یہ سب صرف آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ آپ نے ہی خبریں دینا شروع کیں۔"

"پر میں کہاں کہہ رہا ہوں کہ کوئی میری خبر پر یقین کرے۔" میں چلا، پھر آپ لوگ جو مرضی آئے کیجئے۔"

شری کالے اُوب گئے۔

"شری پرانجپے سچ تو یہ ہے کہ کلب کی بھلائی کے لئے ہم شری کھوٹے کی تعریف نہیں کر سکتے۔ اُن کے ٹائم میں اکاؤنٹس میں اتنا گھوٹالا اتنی گڑبڑ۔۔۔"

"اُف —— اُن کے انتظام کا نہ سر تھا نہ پیر"

شری رانگنیکر بہت تنگ آگئے۔ "کیا کچوڑی پکا رکھی تھی انہوں نے۔

پرابنچے صاحب نے سب ٹھیک کہا ہے۔"

اپنی تعریف سُن کر شری پرابنچے پھول گئے۔ "سبھی مخالفت کر رہے ہیں یہ جملہ بھی کاٹ دیتا ہوں۔ پھر دیکھئے تجویز کیسی ہے۔"

"ہمارے آنند کلب کے سابق صدر شری ستیہ وان کھوٹے ۴ ستمبر ۱۹۶۸ء کو انتقال کر گئے۔ اس تجویز کے ذریعے یہ کلب اُن کی موت پر گہرے دُکھ کا اظہار کرتا ہے۔ ایشور اُن کی رُوح کو شانتی دے۔"

شری جیمانے جماہی لی۔

"اچھا اب جلدی کیجئے۔ سبھی کو جانا ہے۔ مجھے مس پنچ کے ناچ کا پروگرام دیکھنے جانا ہے۔"

شری کالے نے تجویز پھر سے لکھنے کے لئے کورا کاغذ نکالا۔ اتنے میں شری ناڈگیر زور سے ہنسے۔

"یہ تو سب بڑا مزیدار معلوم ہوتا ہے۔"

"مسٹر ناڈگیر آپ کیوں ہنسے"

"کیونکہ سبھی کچھ بڑا مضحکہ خیز ہے۔"

"کیا ہے مضحکہ خیز؟"

شری ناڈگیر ٹھیک سے بیٹھ گئے۔ باہر کی جھاڑیوں کی جانب دیکھتے ہوئے وہ کہنے لگے....

"بھائی میں تو اس کلب میں ابھی ابھی آیا ہوں۔ وہ شری ستیہ وان کھوٹے کا نام میں نے نہیں سُنا۔ مگر اتنی دیر سے آپ لوگوں نے جو تُو تُو مَیں مَیں کی...."

"کیا کہا؟ تُو تُو مَیں مَیں؟"

"چاہے تو آپ اپنی مرضی سے اُسے ذکر کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جو کچھ کہا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ میں سے کسی کے دل میں بھی اُن کے لئے عزت نہیں ہے۔ اُن کی کسی بات کو کسی نے بھی پسند نہیں کیا۔"

شری پرابنچے چلائے: "تو پھر کیا؟"

"کیا مطلب؟" شری ناڈگیر نے کھلے دل سے کہا۔

"جس آدمی میں گُن ہو اُس کے مرنے پر دُکھ کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں کسی کے دل میں بھی اُن کے لئے عزت نہیں ہے۔ پھر اظہارِ رنج کی کیا ضرورت ہے؟"

شریمتی داتار نے ترس کھا کر کہا۔ "ناڈگیر جی یہ ماتمی تجویز تو ایک فارمیلٹی ہوتی ہے۔"

لیکن شری جیمانے اس اطلاع پر کوئی دھیان نہ دیا۔

"شاباش شری ناڈگیر۔ اِٹ از لائک برناڈ شا"

"اور نہیں تو کیا فالتو دکھاوا"

"کیا دکھاوا؟"

"اور نہیں تو کیا؟ شری ناڈگیر نے ناپسندیدگی کے ساتھ کہا۔ "ابھی آپ نے کھوٹے کو بُرا بھلا کہا ہے اور اب دکھ ظاہر کر رہے ہیں۔"

"پھر کیا شری کالے؟"

"وہ اظہارِ رنج والا جملہ نکال دیجئے اور وہ ایشور کی پرارتھنا بھی نہیں چاہئے۔ ایشور انہیں سورگ بھیجے یا نرک۔ ہمیں اس سے کیا مطلب؟ خود بخود پرستاؤ بھی چھوٹا ہو جائے گا اور اچھا ہو جائے گا جس سے اخبار والے ہم سب کے نام اور پورا پرستاؤ چھاپ دیں گے۔" شری منیار کے ساتھ سبھی ہنسے۔

"بڑا اچھا خیال ہے ویسے بھی پہلے شری رانگنیکر نے کہا ہی تھا کہ تجویز لمبی ہے۔ "کاٹ دیجئے وہ جملہ" خوب زور سے ہنستے ہوئے رانگنیکر نے کہا۔

"میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔" شری پرابنچے کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔

"لیکن پھر تجویز میں باقی کیا رہ گیا؟"

شری کالے نے اعتماد سے کہا: "میں بناتا ہوں کہ کیا بچ گیا۔ سنئے۔ "ہمارے آنند کلب کے سابق صدر شری ستیہ وان کھوٹے کا ۴ ستمبر ۱۹۶۸ء کو انتقال ہو گیا۔"

پھر تو وہ خود بھی اپنی ہنسی نہ روک سکے۔

"جب تجویز چھوٹی ہو گئی ہے تو اتفاق رائے سے پاس ہو جانی چاہئے۔"

شری پرابنچے کے سر میں درد ہونے لگا۔

"لیکن بیچ ہی کیا گیا؟"

مگر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ شری منیار اور شری رانگنیکر خوش ہوئے۔ "بڑی اچھی بات ہے۔"

"اب تو کر دو تجویز پاس" شریمتی داتار نے جھوٹی ناراضی سے کہا۔

"ماتمی تجویز صرف فارمیلٹی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں تو اُلٹا معاملہ ہے۔"

جھوٹی سنجیدگی سے شری رانگنیکر نے کہا "ناٹ ورتھ دے۔"

انڈین پینل کوڈ کا یہی دستور ہے۔ سو سچی باتیں نہ لکھیں تو کوئی بھی بات نہیں مگر ایک بھی جھوٹ نہیں ہونا چاہئے۔"

شری کالے تو اب شری پرانجپے سے بھی آگے نکل گئے۔

"تو موئی کہ نہیں یہ تجویز پاس ؟"

شری پرانجپے کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا۔ وہ لال پیلے ہو گئے "شری کالے صدر میں ہوں آپ نہیں۔"

"ضرور ضرور" شری کالے نے پرستاؤ کا کاغذ ہاتھ میں اچھی طرح پکڑ کر کہا۔

"کون منع کر رہا ہے ؟ صرف ممبروں سے پوچھ ہی رہا ہوں۔ سو دوستو اب پرستاؤ سنئے ــــ

ہمارے آنند کلب کے سابق صدر جناب ستیہ وان کھوٹے کا ۴ ستمبر ۱۹۶۸ء کو انتقال ہو گیا۔"

"ہاں ٹھیک ہے" ۔ ۔ ۔ ہی از ڈیڈ "سب ایسے چلائے جیسے کوئی میچ جیت لیا ہو۔"

شری کالے نے کاغذ کو موڑ دیا۔ "چلو اچھا ہوا اجلاس کی رپورٹ لکھنے میں دقت ہوتی۔ سر کھا گئی یہ تجویز۔

اور کیا ؟ شریمتی داتار نے اُٹھتے ہوئے کہا" میں تو پہلے ہی سے کہہ رہی تھی کہ ماتمی تجویز صرف فارمیلٹی ہوتی ہے۔ مگر عورتوں کی کوئی سنے بھی تو۔"

سب لوگ اٹھے مگر شری پرانجپے حیران سے بیٹھے ہی رہے۔

"چلئے شری پرانجپے صاحب اجلاس ختم ہو گیا۔ تجویز پاس ہو گئی۔"

کسی نے کہا۔ اب اُن سے رہا نہ گیا بولے "میں تجویز اتنی محنت سے لکھ کر لایا تھا لیکن آپ لوگوں نے میری محنت مٹی میں ملا دی۔"

"نہیں پرانجپے صاحب" شری کالے نے سمجھایا" جو تجویز پاس ہوئی ہے، وہ آپ کی ہی ہے۔ کچھ جملے ضرور کاٹے گئے ہیں لیکن یہ تو چلتا ہی ہے۔ تجویز اتفاق رائے سے پاس ہو گئی۔ یہی سب سے اہم بات ہے۔"

شری پرانجپے کی صورت رونی سی ہو گئی۔ اُداس نظروں سے انہوں نے ایک بار سب کو دیکھا اور پھر اپنی جانب بھی۔

کالی پینٹ، کالا کوٹ، کالی ٹائی۔

اُنہیں ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ان کپڑوں پر مٹی کے دھبے پڑ گئے ہوں۔ ●●

آج کل دہلی (اضافہ بمبر)




## سیر و سیاحت کے شوقین حضرات

# دلکش گوا دیکھئے

تاریخی مقامات، دلفریب مناظر، صاف ستھرا تاڑ کے درختوں سے آراستہ حسین ساحل، سبز ندیوں، شاندار آبشاروں اور خوبصورت جھیلوں والی روشن سرزمین

آج گوا آپ کو قدرتی مناظر کے درمیان فرحت بخش چھٹیاں منانے کے لئے جدید سہولیات، مکمل تفریح اور مسرت کے سامان فراہم کرتا ہے۔

## گوا کا قدیم فن اور تہذیبی ورثہ

### ملاحظہ فرمائیں

عظیم الشان عبادت گاہیں، پرشکوہ قلعے اور یادگار عمارتیں دیکھئے۔ روزانہ آرام دہ بسیں آپ کو سیر و سیاحت کے تمام مقامات پر لے جاتی ہیں۔ گائڈ کی سہولیات بھی میسر ہیں۔

دریائے مندوی کے پُرسکون پانی میں واٹر سکینگ اور حسین منظر پیش کرنے والے زمردی جزیروں کے اردگرد ولولہ خیز کشتی رانی ایسے جدید کھیلوں سے لطف اٹھائیے۔

## عوامی تہوار

شرقی اور مغربی کلچر کا شاندار امتزاج اور کارنیوال، سگمو اور زاترا کے پُرجوش تہوار سارا سال تفریح کے سامان فراہم کرتے ہیں۔

جاری کردہ

محکمہ اطلاعات و سیاحت

حکومت گوا، دمن اور دیو

پاناجی

ملیالم

# ماں

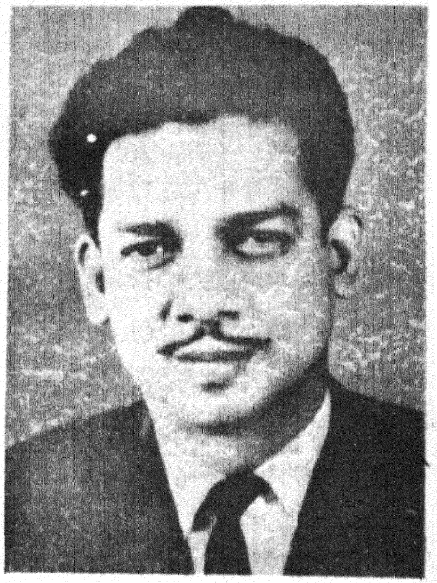

## ملیاٹور رام کرشنن

**ماں** تلسی کی پوجا سے فارغ ہونے کے بعد جھکی، سٹی ہاتھ سے کمر کو سہارا دیتی ہوئی چل رہی تھی۔ ساتھ ہی بڑبڑا بھی رہی تھی۔ برآمدے میں ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ مغرب میں آسمان بالکل سفید ہو چکا تھا۔ مگر اب تک گھر میں کوئی سو کر نہیں اٹھا تھا۔

ستر سالہ بوڑھی ماں صبح چڑیوں کے ساتھ جاگ جاتی ہے۔ راج گوپالن، شانتا، اور بچے کیا کسی دن جلدی جاگے ہیں؟ یہ بچے کیا کبھی باغیچے میں اڑتی چڑیوں کو دیکھ سکیں گے؟

'رات کو انہیں بڑی دیر میں نیند آتی ہے۔ یہ تو جیسے ٹھان چکے ہوں کہ جلدی سونا ہی نہیں۔ ارے سینما جانا بھی ہو تو شام کا شو دیکھنے چلے جاؤ جلتے ہیں دوسرے شو میں اور بعد میں دن چڑھے تک خراٹے لیتے رہتے ہیں۔

راج گوپالن پچاس برس کا ہو گیا ہے۔ جب وہ چھوٹا تھا تو میں اُسے ڈانٹتی تھی۔ مگر آج یہ ناممکن ہے۔ شانتا کہے گی "ماں جی خاموش نہیں رہ سکتیں" ہاں اب وہ مالکن ہے نا۔"

ماں تھوڑی دیر تک برآمدے میں ٹہلتی رہی۔ پھر بڑبڑاتی ہوئی آنگن میں آگئی۔ "نوکرانی پار وکیا تھوڑی دیر پہلے نہیں آسکتی۔ وہ بھی نو بجے کے ہی بعد ہاتھ میں جھاڑو لیتی ہے۔ کم بخت آنگن میں جہاں دیکھو سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑے اور دیا سلائی کی جلی ہوئی تیلیاں پڑی نظر آتی ہیں

راج گوپالن روز کہتے "سگریٹ پھونک ڈالتا ہے اور اس کے پتاجی ناس تک نہیں چھوتے تھے۔ گوپال کرشنن بھی کیا کم ہے؟ فرق صرف ہے تو یہ کہ وہ سگریٹ کی جگہ بیڑی پیتا ہے۔ گوپال کرشنن کی عمر ۴۵ سال ہے۔ پچاس اور پینتالیس سال کے لوگوں کو تو اپنی مرضی پر چلنے دو۔ مگر یہ راج گوپالن کا بیٹا۔ سریندر کیا کرتا ہے۔ اُس نے تو مشکل سے ۱۹ ہی پار کئے ہیں۔ موقع ملتے ہی وہ بھی سگریٹ پھونکتا ہے۔ باغیچے میں کیلے کے پودے کی آڑ میں کھڑا اکھڑا کش لگاتا ہے۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے الائچی چبا لیتا ہے جس سے بدبو پکڑی نہ جائے۔ ابھی سے یہ عادت ہے تو کیا اس لڑکے کا کلیجہ جل نہ جائے گا؟ سریندر کا بڑا بھائی بھی خوب دھواں اُڑاتا ہے۔ بمبئی میں ہے۔ دونوں میں فرق اتنا ہے کہ اُسے اب کیلے کی آڑ یا الائچی کی ضرورت نہیں۔ ایک روز راج گوپالن سے سریندر کی شکایت کی۔ اس نے کیا جواب دیا تھا؟.....

"ہمیں بچوں کو زیادہ ڈانٹنا نہیں چاہئے۔....." بتایئے کیسا جواب ہے؟'

بڑبڑاتی ہوئی ماں گوشالے کی طرف گئی۔ چامی کجری گائے کا دودھ دھنے آیا ہے۔ دودھ دوہتے وقت اس پر نظر رکھنی چاہئے ورنہ وہ سارا دودھ خود پی لے گا اور اُس میں پانی ملا کر میرے حوالے کر دے گا۔ شانتا بالکل بے پروا ہے کتنی دفعہ میں اس سے کہہ چکی ہوں۔ جواب میں اُلٹی ڈانٹ ہی ملتی ہے۔۔۔۔

"بات بات پر شک کیا جائے تو کام کیسے چلے گا؟"

مانو، غلطی میری ہی ہے۔ چامی اگر دُودھ پی جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ نقصان اگر ہوگا تو تمہارا ہی ہوگا میرا کیا؟ صرف چامی ہی نہیں بلکہ سارے گوالے بھروسے کے قابل نہیں۔ ہم گائے کیوں پالتے ہیں؟ تازہ دُودھ پینے ہی کے لئے ہی نا؟ اگر شانتا بے پروا ہے اور خیال نہیں رکھتی تو کیا وہ شری لتا پہرہ نہیں دے سکتی؟ لڑکی سولہ سال کی ہو چکی ہے۔ او... ف.....

شری لتا کا بھی کیا قصور ہے؟ لڑکی کو بھی تو انہوں نے خوب رنگیلی بنا دیا ہے؟ صبح یا شام کبھی کسی وقت اس لڑکی کے منہ سے بھگوان کا نام تک نہیں نکلتا۔ پہلے شام کو جب میں کیرتن کے لئے بیٹھتی تو اسے بٹھاتی تھی۔ بھلے ہی وہ بے دلی سے بیٹھتی تھی مگر بیٹھتی تو تھی۔ تھوڑی دیر ہی سہی۔ مگر اب تو بُلانے پر بھی نہیں آتی۔ بھگوان کا نام وہ اب زبان پر کیوں لائے؟ اب تو سینما کے گانے کافی ہیں۔ زور زور سے گاتی رہتی ہے۔

"اگیات گایکا اروکل ورو[1]

گایک یا کامک[2]

غسل کرتے وقت یہ چھوکری ایک خاص گانا گاتی ہے... کیا ہے...؟

.... ہاں

"کاموکن کاموکن کام دیوے گھولے[3]"

چامی دُودھ دوہ چکا۔ ماں اُسے لے کر رسوئی میں چلی جاتی۔ چولہا جلا کر کافی تیار کرنے لگی۔ بڑبڑاتی بھی رہی۔

کافی لئے ماں کمرے میں پہونچی

"شری لتا۔ اری لڑکی کافی لے"

راج گوپالن کا سونے کا کمرہ بند تھا۔ ماں نے دروازے پر دستک دی اور بولی۔

"گوپی کافی پی لو"۔

ماں نے کافی دروازے کے باہر ہی رکھ دی۔

---

[1] او انجان گانے والے قریب آجاؤ

[2] پریمی

[3] ساجن ساجن سنگار دیو جیسا

شانتا کی کافی بھی مجھے ہی لے جانی ہے.... ہوں.... بڑبڑاتی۔ ہوئی ماں چوکے کو لوٹی۔ ڈیوڑھی کی دیوار پر مکڑی کا جالا لگا ہوا تھا۔ آج پارو کو آنے دو۔ پوچھنے والا کوئی نہیں تبھی تو یوں اکڑتی ہے۔

چوکے کی دیوار کے سہارے رکھے لمبے ڈنڈے والے جھاڑو پر ماں کی نظر پڑی۔ آخر پارو کا انتظار کیوں کیا جائے؟ گھر کو صاف رکھنے کے لئے ہمیں خود ہی محنت کرنی چاہئے۔ ماں نے جھاڑو ہاتھ میں لے لیا اور جالا صاف کرنے لگی۔ پیچھے کسی کی آہٹ پا کر ماں مڑی۔

"شانتا"

"ماں جی آپ یہ فضول کام کیوں کرتی ہیں؟ پارو کو بتا دیتیں تو کام چل جاتا۔" ماں کو ہنسی آگئی۔ کیا پارو کی نظر اس جالے پر نہیں پڑی۔ اُس نے طے کر لیا کہ اسے ایسے ہی رہنے دیا جائے۔ یہ اس کا گھر تو ہے نہیں۔ گندا ہو یا صاف، اس کی بلا سے جھکی جھکی چلتی ہوئی میری نظروں نے یہ جالا دیکھ لیا تو سیدھے تن کر چلنے والی شانتا اور شری لتا نے اُسے کیوں نہیں دیکھا؟

"ماں جی سے ہی پوچھ رہی ہوں.... ایسے فالتو کام کیوں کرتی ہیں.... پارو سے کیوں نہیں کرا لیتیں؟"

"وہ کاہلوں کی رانی ہے۔ یہ سب وہ نہیں کرے گی۔"

"اُسی سے کرانا چاہئے۔"

بغیر جواب دیئے ماں جالا جھاڑتی رہی۔ کرنا کیا ہے یہ سمجھا کر، سمجھائے کون؟ میں؟ میری بات پارو بالکل نہیں مانتی۔ شانتا کو ہی بتانا ہوگا۔ اور وہ اُسے کچھ کہے گی نہیں۔ میں نے ایک مرتبہ شانتا کو مشورہ دیا تھا کہ پارو کو نوکری سے الگ کر دو جس پر وہ بولی تھی۔

"نوکر مالک برابر ہوتے ہیں۔ ہمیں اُن کا خیال رکھنا چاہئے۔"

"مطلب؟"

اور ماں کی جانب گھورتی ہوئی شانتا برآمدے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

ماں جب برآمدے میں واپس آئی تو دیکھا شانتا بیلا کی کرسی پر بیٹھی آرام سے اخبار پڑھ رہی تھی۔ دُنیا کا سُکھ دُکھ جاننا ہے اُسے۔ اس گھر کے معاملوں سے اُسے کیا واسطہ؟

"کیا کہہ رہی تھیں ماں جی؟"

"کچھ نہیں۔"

پھاٹک کھول کر پارو آ رہی تھی۔

"آج اتنی دیر کیوں کی؟" ماں نے پوچھا۔

"نہیں تو، ٹھیک وقت پر آئی ہوں۔" پارو نے جواب دیا۔

ماں نے شانتا کی طرف دیکھا۔ یہ تو صریحاً گستاخی ہے۔ اس میں یہ بہت کہاں سے آئی؟ گھر کی مالکن میں نہیں شانتا ہے۔ وہ اس پر خاموشی اختیار کئے ہے بس یہی وجہ ہے۔

راج گوپالن برآمدے میں پہونچے۔

"ماں۔ ایک گلاس کافی اور۔"

ماں ایک دم خوش ہوگئی۔ "اسے معلوم ہے کہ اگر کافی پینا ہے تو مجھے ہی بتائے گا۔ شانتا سے کیوں نہیں کہتا؟ وہ اخبار چھوڑ کر رسوئی میں نہیں جائے گی اور اگر چلی بھی گئی تو اسے اچھی کافی بنانا ہی نہیں آتا۔

ماں کافی لائی تو پارو جھاڑو لگا رہی تھی۔

"کیوں گوپی تم یہ سگریٹ، جلتی ہوئی دیا سلائیاں چاروں طرف کیوں پھینکتے رہتے ہو۔

"اوہو . . . . پارو اٹھا کر پھینک دے گی۔" شانتا بولی۔

"یوں بے پروائی سے نہ پھینکے تو چننے کی ضرورت نہ ہوتی"

"بات تو ٹھیک ہے۔" ماں کو مطمئن کرنے کی غرض سے راج گوپالن نے کہا۔

"صبح بات کیسی؟" شانتا اب راج گوپالن سے الجھی۔

ماں بڑبڑاتی ہوئی رسوئی کے پیچھے دالان میں پہونچی۔ کیلے کے درختوں کے درمیان کوؤں کا جھنڈ کیسا؟ کوئی گچھا کہیں پک تو نہیں گیا؟ ماں وہاں پہونچی۔ بات صحیح تھی۔ اچھے اچھے کیلوں کا گچھا کوے پہلے سے کتر چکے تھے۔

"ذرا ادھر آؤ نا" ماں نے پکارا۔

برآمدے میں بیٹھی شانتا نے کہا "ماں جی کیوں گلا پھاڑ رہی ہیں۔ ذرا جا کر دیکھئے تو سہی۔"

راج گوپالن کیلے کے پودوں کی طرف چل پڑے۔

کوے کا کٹا ہوا گچھا رسوئی کے کونے میں رکھوا کر ماں پھر سے بڑبڑانے لگی "اتنی بے پروائی سے کام کیسے چلے گا۔ اگر میری نظر نہ پڑتی تو ڈنٹھل کو چھوڑ کر سب کچھ کوے کھا جاتے۔

"اردکل دردو، اردکل دردو" شری لتا گنگنا رہی تھی۔

حکم دینے کے انداز سے ماں اس کے پاس گئی۔

"کیوں ری چھوکری۔ کیا بات ہے؟"

"بھوکی ہوں"

"پسانھوا چاول اور اُرد تیار ہے۔ دوسا بنا کر کھالے۔"

"دادی مجھ سے کیوں خفا ہوتی ہو۔"

سریندر اُدھر آ پہونچا "آج ایڈلی ہے یا دوسا؟"

"ٹوٗ[1]" ماں بولی

"کچھ بھی ہو ذرا جلدی دینا۔"

"واہ! کیا حکم چلا رہے ہیں۔"

"یہاں کیسی بحث چل رہی ہے؟" شانتا اُدھر آ گئی۔

"بحث کچھ بھی نہیں۔" ماں بولی

"بھوک لگی ہے" شری لتا چھوٹے بچے کی طرح تتلائی۔

شانتا چولھے کے پاس پہونچی۔

"تم کاہے کو چولھے کے پاس جا رہی ہو"

"آج میں دوسا بناؤں گی۔"

"نہیں، نہیں میرے رہتے ہوئے تم کیوں بناتی ہو؟" ماں نے کہا

شانتا غسل خانے میں داڑھی بناتے ہوئے راج گوپالن کے پاس پہونچی۔

"ماں جی سے تو میں ہار گئی۔"

"کیوں؟"

"رسوئی میں میرا گھسنا انہیں پسند نہیں۔"

"تو مت جاؤ۔"

"بڑھاپے میں ماں جی کیوں اتنا کام کرتی ہیں۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔"

"کیا کہے گا؟"

"لوگ کہیں گے کہ میں آرام سے بیٹھی رہتی ہوں اور ماں سے کام

---

[1] پاس آجاؤ، پاس آجاؤ

[2] چاول و ناریل سے بننے والا کیرل کا ایک کھانا

کراتی ہوں۔"

"کیا تم آج دفتر نہیں جاؤ گے ؟"

"آج اتوار ہے نا ماں۔"

"تو گوپال کرشنن آج آرہا ہے نا ؟"

"لکھا تھا کہ آج ہی آئے گا۔

"لیکن اس کا کوئی بھروسہ نہیں۔ آیا تو آیا نہیں تو نہیں۔ سوشل ورکر جو ٹھہرا۔

"آئے گا نا۔"

"میں کیسے بتاؤں ماں۔ وہ تو سارے ملک کو سر پر اٹھائے پھرتا ہے اس کا تو آنے پر ہی بتایا جا سکتا ہے کہ وہ آگیا ہے۔"

"کتنے دن ہو گئے اُسے دیکھے۔"

ماں مہمانوں کے کمرے میں دیوار سے پیٹھ لگائے تھوڑی دیر بیٹھی رہی۔ آج گوپال کرشنن آئے گا۔ اس کی پسند کی سبزیاں تیار کرنی ہیں کیسے بھول گئی کہ آج اتوار ہے۔ شاید گوپال کرشنن یہیں ٹھہر جائے۔ اُسے جلدی واپس نہیں جانے دینا چاہئے۔ اتوار . . . آج سارا گھر جھاڑ دھو کر صاف کرنے کا دن ہے۔ منگل شکر کو پارو فرش دھوتی اور صاف کرتی ہے مگر وہ صرف برائے نام ہوتا ہے۔ اگر اتوار کو صفائی نہ ہو تو ہر جگہ گندگی بھبل جائے۔

ماں ہر کمرے میں یہ جاننے کے لئے پہونچی کہ پارو کیا کر رہی ہے ؟

شری لتا کے کمرے میں پہونچ کر ماں یکایک رُکی۔ پارو کمرہ صاف کر چکی تھی۔ پھر فرش پر کا لانشان کیسا ؟ ماں نے زمین پر بیٹھ کر دیکھا . . . . سیاہی ہے۔

"پارو۔"

پارو بغل والا کمرہ صاف کر رہی تھی۔ اُس نے جھانک کر دیکھا۔

"یہ کیا پارو ؟"

"روشنائی"

"اسے صاف نہیں کر سکتی تھی ؟"

"پونچھنے سے مٹتی نہیں۔"

"خالی پونچھنے ہی سے کام نہیں چلے گا۔ لیمو کے چھلکے سے رگڑ کر صاف کرنا ہوگا . . . بھیجیں "

شری لتا نے جھانک کر دیکھا۔ ماں نے پوچھا "تم نے ہی سیاہی چھڑکی تھی نہ ؟"

شری لتا نے منہ پھلا لیا۔ ماں آہستہ سے اُٹھی بھی دیوار پر پنسل سے کچھ لکھا ہوا دیکھا۔

سوال پوچھنے سے پہلے شری لتا بول پڑی "دھوبی کا حساب لکھا ہے۔"

"لکھنے کے لئے کتنی اچھی جگہ چُنی ہے۔"

ماں رسوئی کی طرف بڑھی۔ آج بڑھیا کھانا تیار کرنا ہے۔ اتوار ہے نا۔ آج ہی راج گوپالن شوق سے کھائے گا۔ گوپال کرشنن بھی آ رہا ہے۔

"آپ اور آپ کی ماں . . . . ." شانتا نے راج گوپالن سے کہا۔

"تم کیوں شور کر رہی ہو۔ ؟"

"کہیں رسوئی میں ایسی حکومت چلتی ہے ؟"

"تم بھی حکم چلاؤ نا۔"

"ماں جی مانیں تبھی تو۔"

"ماں سے مِل جُل کر چلنا۔"

"غلطی میری ہی ہے۔"

"ایک باورچی رکھ لیں۔ وہی رسوئی سنبھالے۔"

"مجھے منظور ہے پھر کوئی نہ کہے گا کہ ماں جی سے غلامی کرا رہی ہوں مگر کوئی باورچی یہاں ٹکے گا نہیں۔ ماں جی اس کا پیچھا نہ چھوڑیں گی۔ بڑبڑاتی رہیں گی۔"

دوپہر کا کھانا ختم ہوا۔

سریندر سائیکل لے کر چکر لگانے چلا گیا۔ شانتا بستر پر دراز ہو گئی۔ راج گوپالن ڈرائنگ روم میں آرام کرسی پر آرام کرنے لگے۔ شری لتا فلمی رسائل کے پاس جم گئی۔

ماں نے ڈیوڑھی میں چٹائی بچھائی۔

ذرا جھپکی لی۔

آخر گوپال کرشنن آیا کیوں نہیں ؟ کیا اب بھی بیوقوف بنائے گا ہمکتے دن ہوئے اسے دیکھ نہیں سکی۔

گوپال کرشنن کو یاد کرتی ہوئی ماں چٹائی پر لیٹی رہی۔ برآمدے سے بات چیت کی بھنک آ رہی تھی۔

"کون ہے شری لتا ؟"

بے پروائی سے شری لتا بولی "کوئی پتا جی سے ملنے آئے ہیں۔"

"پوچھ رہی ہوں، ہے کون ؟"

"مجھے کیا معلوم ؟"

"کہیں گوپال کرشنن تو نہیں ؟ شاید نہیں۔ اگر وہ ہوتا تو سیدھا اندر چلا آتا۔ تو کون ہوگا ؟ کیا یہ چھوکری دیکھ نہیں سکتی ؟ دیکھ کر جواب دیتی تو کیا بگڑ جاتا اس کا ؟

"برآمدے میں چلوں ؟"

"نہیں۔"

ایک دن شانتا نے کہا تھا "ان سے ملنے کئی لوگ آتے رہتے ہیں۔ ماں جی کیوں اُدھر جاتی ہیں۔"

ماں کو لگا سب کے سب ہر بات سے مجھے دُور رکھنا چاہتے ہیں۔

تھکاوٹ کی وجہ سے ماں کی آنکھیں تھوڑی دیر کے لئے بند ہو گئیں۔

تھوڑی دیر بعد سامنے والے کمرے سے شانتا اور راج گوپالن کی بات چیت کی آواز کانوں تک پہونچی۔

شانتا ماں کی شکایت کر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ماں جی سو رہی ہیں۔ ماں آنکھیں بند کئے اُن کی باتیں سنتی رہی۔

"ماں جی سمجھتی ہیں کہ جیسے وہی پورا گھر سنبھال رہی ہیں۔ شہتیر کو سنبھالے چھپکلی۔"

"شانتا ماں کا خالی وقت کیسے کٹے اس لئے دوڑ دھوپ کرتی ہیں۔"

"میرا فرصت کا وقت نہیں ہوتا کیا ؟ گڑیا کی طرح بیٹھی رہتی ہوں اور تو اور دیکھنے والے کیا سمجھیں گے ؟ ماں جی کی اگر عمر ڈھل گئی ہے تو خاموش بیٹھی رہیں۔"

"رسوئی میں کوئی چیز "دھڑام" سے گر پڑی۔ آواز سُن کر ماں لپک کر اٹھی اور رسوئی میں پہونچی۔ کوئی بدصورت کتا رسوئی سے باہر بھاگا جا رہا تھا۔ برتن اور چاول فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ ماں نے بلایا۔ "پارو"

شانتا نے آکر پوچھا۔ "کیا ہوا ؟"

"اور کیا ہونا باقی رہ گیا۔ رسوئی میں کتا آ گیا۔"

"کیا کتا چوکے میں گھس سکتا ہے۔"

"یہ تم نے کیسی بات کہی شانتا۔"

"کچھ نہیں۔"

"کیا تم رسوئی کا دروازہ بند نہیں کر سکتی تھیں، پارو۔"

"ماں جی ہی تو رسوئی کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔" (طنزیہ انداز میں)

ماں خاموش ہے۔ میں نے کبھی اُسے منع نہیں کیا۔ اب کس لئے ایسا کہتی ہے۔ میں تو بوڑھی ہو چلی قبر میں پاؤں لٹکائے ہوں۔ جو چاہے کہے۔ جب میں نہ رہوں گی تب دیکھیں یہ گھر کیسے سنبھالتی ہے۔

چامی اور پارو کچھ کانا پھوسی کر رہے تھے۔ ماں اس طرف متوجہ ہوئیں۔ کجری گائے کا بچھڑا گائے کے تھن سے خوب دودھ پی رہا تھا۔

ماں نے پوچھا "چامی کیا آج سارا دودھ بچھڑے کو پلانے کا ارادہ ہے ؟"

چامی کچھ زور سے بولا "اس بڑھیا سے تنگ آ گیا۔"

ماں سے رہا نہ گیا۔

ماں گئوشالہ کی طرف چل پڑی۔ چلتے چلتے کسی مضبوط جڑ سے پاؤں ٹکرا گیا۔ ماں چھاتی کے بل گر پڑی۔

شام کا وقت گزر رات ہو گئی تھی۔ راج گوپالن .... شانتا .... ارے گوپال کرشنن بھی ہے۔ یہ کب آیا ؟

"ماں جی آپ ایک جگہ آرام سے بیٹھی رہ سکتی نہیں۔ کیوں بھٹکتی رہتی ہیں۔ کل اکیس رے سے ہی معلوم ہوگا کہ کہیں ہڈی تو نہیں ٹوٹی۔" راج گوپالن ماں کو مجرم بنا رہے تھے۔

"ارے مجھے کچھ نہیں ہوا رے۔"

شانتا نے کہا۔ "ماں جی کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائے تو دوسروں کو کتنی تکلیف ہوگی۔ کم سے کم اتنا تو سوچنا ہی چاہئے۔"

ماں کی آنکھیں گوپال کرشنن کی رائے جاننے کے لئے اس پر اٹھیں۔

راج گوپالن اور شانتا کی باتیں سن کر کوئی سمجھے گا کہ دوسروں کو تکلیف دینے کے لئے ہی زندہ ہوں۔ لاوارث بڑھیا جسے کوئی نہیں چاہتا بھاری بوجھ۔۔۔۔ جو اتر نہیں سکتا۔

"گوپال کرشنن مجھے کچھ نہیں ہوا۔۔۔۔۔۔ ذرا پیر پھسلا تھا۔۔۔۔ میں تو گری تک نہیں۔ ہتھیلی ٹیک کر بیٹھ گئی۔۔۔۔ بس اتنا ہی۔"

"ماں جی عمر ڈھل گئی۔ اتنے سالوں تک بڑی محنت کی۔ کم سے کم اب کچھ آرام کر لو۔" گوپال کرشنن نے کہا۔

ماں کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

کوئی مجھے نہیں چاہتا۔ سب کی ضروریات سنبھالنے والی میں اب سب کے لئے بوجھ ہوں، کانٹا ہوں۔ سب کے راستے کا روڑا بنی ہوئی بڑھیا۔ "آرام کرو"۔۔۔۔ کیا آرام کرنے کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ ان سب کو جنم دے کر کھلا پلا کر بڑا بنا دینے والی ماں سے یہ ایسی باتیں کہتے ہیں۔

ماں کے جھری دار گالوں پر آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

"آرام کروں گی رے اب آرام کروں گی۔"

ماں سو گئی۔

دن نکلا۔

تب بھی ماں سو رہی تھی۔

ہر روز چڑیوں کے ساتھ وہ جاگ جاتی تھی۔ راج گوپالن نے ماں کو زور سے ہلایا، پکارا "ماں۔۔۔۔ ماں"

ماں ہمیشہ کے لئے سو چکی تھی۔

(مترجم: چندر کانتا آہوجہ)

## بقیہ: گزشتہ گرمیوں میں

بہت رات گئے اُسے محسوس ہوا تھا جیسے وہ اور کیشی سکینگ کے لئے گئے ہیں۔ چاروں طرف برف پھیلی تھی۔ وہ بہت تیزی سے نیچے پھسل رہا تھا۔ کچھ دیر نیچے جا کر اُسے لگا جیسے اُس کی 'سکی' کی نوک کسی کرمی شے سے جا ٹکرائی ہے۔ اُسے تھوڑی سی حیرانی ہوئی۔ وہ وہاں برف پر بیٹھ گیا۔ اور اپنی 'سکی' کی مڑی ہوئی نوک سے برف کھودنے لگا۔ بہت سی برف اوپر آتی تھی اور وہ اُسے دوسری طرف پھینک دیتا تھا۔ پھر اچانک اُس کے ہاتھ ٹھٹک گئے۔۔۔۔ نیچے۔۔۔۔ برف کے بہت نیچے ایک گرد سا دکھائی دیا۔ اور اُسے لگا جیسے اس کے اندر کوئی رو رہا ہے۔ اُس نے نیچے جھک کر گڑھے میں دیکھا لیکن وہاں گڑھے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف ایک ہڈی، درخت کی ایک ٹہنی اور ایک کانچ کا ٹکڑا پڑا تھا۔

اُس کی آنکھ کھل گئی۔ گھر سونا پڑا تھا۔ کہیں بھی کوئی نہیں تھا۔ صرف چھت کی چاندنی ڈیوڑھی پار کر کے اس کے بستر پر سرک آئی تھی۔ اُس نے کروٹ بدلی اور دوبارہ سو گیا۔

(ترجمہ: کیول کرشن)

## بقیہ:- پچھتاوا

پرچاروں طرف اکٹھے ہوئے لوگوں کے ہجوم کو چیر کر میں نے دیکھا اس لڑکے کے جسم سے خون بہہ رہا ہے اور وہ مہاراشٹرین بوڑھا اُسے چھاتی سے لگائے دل دہلانے والی چیخیں مار رہا ہے۔ میں حیران رہ گیا۔ خواہش ہوئی آگے بڑھ کر اس بوڑھے کو تسلی دوں۔ میرے قدم کچھ آگے بڑھے بھی مگر۔۔۔ قدم ہی بڑھے ہاتھ آگے نہ بڑھ سکے۔ چاہنے پر بھی ہاتھ آگے نہیں بڑھ سکے۔۔۔۔ جیسے وہ میرے ہاتھ ہی نہ تھے۔۔۔۔ ان پر جیسے میرا کوئی اختیار ہی نہ ہو۔ شاید میرے دل نے یہ جان لیا تھا کہ میرے ناپاک خون سے سنے ہاتھوں کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں۔

آدمی باتیں کر رہے تھے۔۔۔۔ دوڑ بھاگ میں لڑکا گر گیا۔ بے چارا بوڑھا چلاتا رہا۔ کسی نے سنا ہی نہیں۔۔۔ اتنے سارے آدمی لڑکے کے جسم پر سے گزر گئے۔۔۔۔

اس حادثے کو بیتے کتنا ہی عرصہ گزر چکا ہے مگر ہمیشہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے تازہ واقعہ ہی ہو۔ جیسے ابھی ابھی پیش آیا ہو۔۔۔۔ سوچتا ہوں کیا یہ رشتہ کچھ کم تھا کہ وہ بھی انسان تھا اور میں بھی انسان

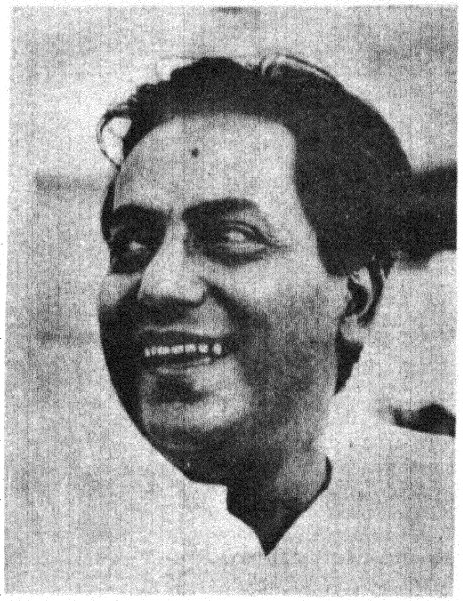

# میں

## کملیشور

یہ قصہ ایک شرابی کا ہے۔ ہوا یہ کہ شراب نوشی کے دوران ایک شام ہلکے سُرور میں یہ قصہ سنایا گیا۔ وہ بڑی عالیشان اور خوش نما ڈرنک پارٹی تھی۔ جو لوگ اس میں شریک ہوئے تھے وہ اپنے اپنے علاقے کے مشہور و معروف لوگ تھے۔ میزبان کا خوبصورت سا چھوٹا سا لڑکا ہر مہمان کو فلیٹ تک پہنچا رہا تھا کیونکہ وہ جگہ نئی تھی اور کسی بھی مہمان کو اپنے میزبان کا گھر معلوم نہیں تھا۔ وہ چست چھوٹا سا لڑکا بلڈنگ کے گیٹ پر بڑی تیز نظروں سے اپنے ان جانے مہمانوں کو رسیو کرتا خود لفٹ چلا کر اوپر پہنچا دیتا۔

یہ علاقہ بڑے لوگوں کا تھا۔ آسمان کو چھوتی ہوئی عمارتیں چاروں طرف کھڑی تھیں۔ ہلکی سردی کی خنکی اور شام کی سندری دھند آسمان پر چھائی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ عمارتوں کی کھڑکیاں دودھیا روشنی سے بھری ہوئی تھیں۔ لیکن چاروں طرف سناٹا تھا۔ بائیں طرف بحیرہ عرب ریت کے میدان کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ اندھیرے اور دھند کی وجہ سے سمندر کی لہریں بھی خاموش لگ رہی تھیں۔

میزبان خود انڈیل رہے تھے اور دین دُنیا کی باتوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ بیچ بیچ میں باتوں کا سلسلہ ٹوٹ جاتا کبھی کبھی فلم فیسٹول کا ذکر چل پڑتا۔ کبھی کبھی اندرا گاندھی اور نجلنگپا کا ذکر آجاتا۔ مگر کوئی کسی کا طرفدار نہیں تھا۔ یہ طبقہ شاید اس لئے ہمیشہ اہمیت اختیار کئے رہتا ہے کہ وہ غلط یا صحیح کسی کا طرفدار نہیں ہوتا۔ باتیں اتنے پہلوؤں سے ہو رہی تھیں کہ وہ صرف باتیں ہی رہ گئیں۔ سُرور جب طاری ہوا تو لوگ پینے کے معاملے میں سست پڑنے لگے مگر باتوں کی تیزی بڑھ گئی۔ رخصت ہونے کا وقت دھیرے دھیرے قریب آ رہا تھا اس دوران جن لوگوں نے خود کو ایک دوسرے کے کچھ بھی نزدیک پایا یا وہ میز کے آس پاس سمٹ آئے تھے اور بوتل سے خود انڈیل انڈیل کر پینے لگے منڈلی چھوٹی ہوتے ہی "اصلی" باتیں شروع ہو گئیں۔ پارٹی جیسے ایک بار پھر گرم ہو اٹھی تھی اور تب یہ قصہ میزبان نے ایک قصے کے جواب میں سنایا۔

"ایک صاحب تھے۔ ایسی ہی پارٹی سے لوٹے تھے۔ چڑھ ذرا زیادہ گئی تھی لیکن اتنی نہیں کہ آؤٹ ہو جائیں۔ ویسے جب بھی وہ ڈرنک پارٹی پر جاتے تھے۔ تو زیادہ تر میزبان کو اُن کی واپسی کا انتظام بھی کرنا ہوتا تھا۔ اس بار جب پارٹی ختم ہوئی تو اُن کی لوکیلٹی کی طرف جانے والے کچھ دوست اور بھی تھے، انہیں کے ساتھ وہ کار میں چلے گئے۔ دوست بھی ذرا موج میں تھے انہوں نے انہیں گھر کے سامنے نہ اُتار کر گلی کے موڑ پر چھوڑ دیا۔ وہاں سے ڈگمگاتے لڑکھڑاتے وہ اپنے گھر کے سامنے پہونچ گئے۔ رات کو گشت پر نکلا ہوا پولیس والا انہیں دیکھ رہا تھا اور غور سے انہیں واچ کر رہا تھا۔

اپنے گھر کی تین سیڑھیاں چڑھ کر انہوں نے دروازے کے ہول میں چابی لگائی۔ چابی ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ اُسے ٹٹول کر انہوں نے اٹھایا اور پھر لگایا۔ چابی ہول میں نہ جا کر ادھر اُدھر ٹکراتی رہی۔

پولیس والے کو کچھ شک ہوا۔ وہ اُن کے پاس پہونچا تو اُنہیں تھوڑا سا ہوش آیا۔ پولیس والے نے مسکرا کر کہا "جناب اپنے گھر تشریف لے جائیے۔"

"یہی میرا گھر ہے" انہوں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

پولیس والے نے انہیں کندھے سے پکڑ لیا، اور ذرا سامنے کرتے ہوئے بولا "یہی کہتے ہوئے یہاں بہت سے آتے ہیں۔ تمہارا گھر یہی ہے تو چابی کیوں نہیں لگ رہی ہے۔"

"آپ اطمینان رکھئے۔ یہی میرا گھر ہے۔ چابی لگ جائے گی۔۔۔۔ وہ ذرا میں اُسے ایسے ہی گھما رہا تھا۔۔۔" انہوں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"کوئی نہ کوئی چابی تو لگ ہی جائے گی۔ کیوں؟" پولیس والے نے ذرا طنز سے کہا۔

"آپ یقین کیجئے۔۔۔ بھلا میں اپنے گھر کو نہیں پہچانوں گا؟ یہ دروازہ جیسے ہی کھلے گا، ویسے ہی میرا ڈرائنگ روم سامنے ہوگا۔ میرے ڈرائنگ رُوم میں ایک بڑا صوفہ ہے۔ دو چھوٹے صوفے ہیں، قالین ہے، کونے میں لیمپ ہے، کارنیس پر گوتم بدھ کی پیتل کی مورتی ہے۔۔۔۔ اس سے زیادہ ثبوت اور میں کیا دے سکتا ہوں" انہوں نے کہا۔

"اچھا کھولو" دیکھتا ہوں جو کچھ تم نے بتایا ہے وہ ہے یا نہیں" پولیس والے نے کہا۔

اُنہیں اب تک کچھ ہوش آگیا تھا۔ اس مرتبہ چابی لگاتے ہی دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ پولیس والے کے ساتھ ڈرائنگ رُوم میں پہنچے اور بجلی جلا دی "دیکھئے ہے نا وہی سب"

"ہاں ہے تو۔ پولیس والے نے کچھ سوچ کر کہا" مگر یہ تو ہر ڈرائنگ رُوم میں ہوتا ہے۔"

"انہیں لگا کہ پولیس والا کچھ بدمعاشی پر اُتر آیا ہے۔ تاہم رات کے تین بجے وہ ہنگامہ کھڑا کر کے مشکل میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ اس نے بولے "خیر اسے چھوڑیئے۔ میری سٹڈی دیکھ کر آپ یقین کر سکتے ہیں۔ میری سٹڈی میں کتابوں کی دو الماریاں ہیں۔ میرا کابرڈ ہے۔ میز پر میری فائلیں ہیں۔ دائیں طرف ایک ڈکشنری رکھی ہوئی ہے۔ کونے میں ایک نیوڈ ہے۔۔۔۔"

"اچھا دکھائیے۔۔۔۔" پولیس والے کی آنکھوں میں شیطانی تھی۔

انہیں کچھ غصہ بھی آیا۔ مگر اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ پولیس والا سٹڈی میں پہونچا تو بے فکری سے اُسے دیکھنے لگا۔ "ہاں ہے تو" پولیس والے نے تھوڑا سوچ کر سر کھجلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ بھی سبھی کی سٹڈی میں ہوتا ہے۔ کتابیں بھی، فائلیں بھی اور نیوڈ بھی۔۔۔۔ پینٹنگ بھی۔۔۔ اچھا یہ بتائیے یہ پینٹنگ کس کی ہے؟" کہتے ہوئے پولیس والا پینٹنگ کی طرف بڑھا۔

"یہ تو مجھے اس وقت یاد نہیں آرہا ہے۔۔۔۔" انہوں نے چڑھتے ہوئے مجبوری سے جواب دیا۔

"پینٹروں کے بارے میں میں کافی جان گیا ہوں۔ پولیس والے نے اپنی ناک کا سکہ جماتے ہوئے کہا ——————

—— "جب جے پور مہاراجہ کے محل میں لاکھوں کی پینٹنگز کی چوری ہوئی تھی تب انچارج انسپکٹر کی جگہ میں ہی تعینات تھا۔ سمجھے آپ" پھر دلی میوزیم سے جب کچھ پینٹنگز اور آرٹ پیس کی چوری ہوئی تھی، تب بھی میں ہی تعینات ہوا تھا۔۔۔۔ ان چیزوں کو میں پہچانتا ہوں۔۔۔۔ یہ پینٹنگ آپ کی سٹڈی میں ہے اور آپ کو ہی پتہ نہیں کہ کس کی ہے۔ یہ مزے کی بات ہے۔" کہہ کر پولیس والے نے مسکراتے ہوئے اُن کو دیکھا۔

"آپ بھی مذاق کرتے ہیں۔" انہوں نے پولیس والے کو پھسلانا چاہا مگر اُس کے تیور دیکھ کر اُن کا حوصلہ پست ہو گیا۔ اور کوئی چارہ نہ دیکھ کر انہوں نے کہا "اچھا آیئے ادھر آیئے۔ اس سے بڑا ثبوت میں نہیں دے سکتا کہ یہ گھر میرا ہے۔"

"کون سا ثبوت؟" پولیس والے نے اُن کے پیچھے جاتے ہوئے کہا۔

انہوں نے تبھی اپنے بیڈروم کا دروازہ کھولا اور لائٹ آن کر دی۔ پھر بے فکری سے بستر پر گہری نیند سوئی اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا "یہ میری بیوی ہے۔"

"ہاں تو" پولیس والے نے ذرا غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا "مگر بستر پر دوسرا آدمی کون ہے۔"

اور تب انہوں نے بہت آہستہ سے کہا "وہ میں ہوں۔۔۔۔

یقین کیجئے وہ میں ہوں" اور انہوں نے لائٹ آف کر دی۔ ●●

# گزشتہ گرمیوں میں

نرمل ورما



وہ دو سیڑھیاں نیچے اُترا اور آخری سیڑھی پر آکر ٹھٹک گیا۔ پاؤں کے انگوٹھے سے اُس نے پانی کو چھوا اور ایک عجیب سی جھنجھناہٹ اس کے جسم میں سرایت کرنے لگی۔ اُسے اپنے کو کھلا چھوڑ دینے کی بے چینی سی ہوئی مگر اس نے اپنے آپ کو رد کے رکھا۔ اُس کی نگاہ تالاب پر ٹک گئی جو اُجلی سفید دھوپ میں ساکن تھا اور کچھ السایا ہوا بھی، جیسے اکثر گرمیوں میں ساکن پانی ہو جاتا ہے۔

وہ اپنے کو اور زیادہ نہ روک سکا اور ایک لمحہ بعد ہی اس کا سفید جسم پانی میں کھو گیا۔

گرمی کے آخری دنوں میں وہ اکثر یہاں آتا تھا۔ وہ دوپہر بھر نیچے پانی کے نیلے اور ٹھنڈے اندھیرے میں رہتا۔ کچھ دیر کے لئے اپنے شہر کو بھول جاتا اور گھر کو بھی۔ پانی کے اندر اُسے محسوس ہوتا جیسے وہ سو رہا ہے۔

جب وہ باہر آیا مہیپ ہوا میں ہاتھ ہلاتا ہوا اُسے بُلا رہا تھا۔ وہ پُل کے کنارے گھاس پر لیٹا تھا۔ کلب کی سفید عمارت کے مقبی حصے پر دھوپ اُتر رہی تھی۔

"کافی ہو گیا... چلو اندر چلیں"

"تم نہیں نہاؤ گے؟"

"آج نہیں تم جلدی کرو۔ تمہاری خاطر میں نے اپنی پیاس روکی ہوئی ہے ——"

وہ چاہتا تھا، کچھ دیر اور پانی میں لیٹا رہے۔ وہ چاہتا تھا کہ رات بھ پانی میں لیٹا رہے۔ —— تالاب کے چاروں طرف بجلی کے قمقمے جلنے لگے تھے۔ دوسری طرف ایک چھوٹی سی لڑکی ڈائیونگ بورڈ پر کھڑی تھی۔ شاید کودتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ وہ تولئے سے اپنا جسم رگڑنے لگا۔

"تم اُوب نہیں جاتے؟"

"کس سے؟"

"میں پانچ منٹ سے زیادہ پانی میں نہیں رہ سکتا"

اس نے گیلا جا اتار دیا۔ مہیپ کا منہ لال ہو گیا۔ اور اُس نے مت

دوسری طرف پھیر لیا۔

"تم بالکل پری ٹو Primitive ہو" ہیپ نے کچھ جھلا کر کہا۔

وہ ہنسنے لگا اس کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ وہ تالاب میں دوبارہ چلا جائے۔ اس بار جانچنے کے بغیر کتنا فرق پڑ جاتا ہے اگر پانی میں جسم بالکل ننگا ہو۔

کچھ دیر بعد وہ کلب کے لان میں چلے آئے۔ دیر تک تیرنے کے بعد تیرنا بھی کوئی چیز نہیں۔ اس نے سوچا بستر طیکہ وہ ٹھنڈی ہو اور کوئی کام نہ ہو۔ گزشتہ کئی دنوں سے اس کے پاس کوئی کام نہیں۔ دیانا سے آتے ہوئے وہ اپنے ساتھ کچھ نہیں لا سکتا تھا۔ پروگرام ٹھیک طے تھا۔ تین برس بعد وہ واپس آیا تھا اور اس عرصے میں یہ اس کی پہلی طویل چھٹی تھی۔

"کیتی کا کوئی خط آیا ہے؟" ہیپ نے پوچھا

"نہیں" اس نے کہا "شاید وہ نہیں آسکے گا"

"جانے سے پہلے ایک بار تو اسے ملو گے؟"

ابھی کچھ طے نہیں ہے۔ مجھے شاید اتنا وقت نہیں مل سکے گا" اس نے کہا۔

اس نے ہیپ کو دیکھا وہ چپ چاپ اپنی بیئر پی رہا تھا۔ کیتی کے وہ بہت سے دوستوں کو جانتا تھا لیکن لوٹنے پر وہ صرف ہیپ کو ہی مل پایا تھا۔ اس کے پہلے بھی دوست کم ہی تھے۔ جو تھے وہ ان برسوں میں کیتی کے اتنے قریب آگئے کہ کبھی کبھار جب وہ ان سے ملتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ اپنے دوستوں سے نہیں بلکہ کیتی کے دوستوں سے مل رہا ہے۔

بیئر پیتے ہوئے جب سب باتیں ختم ہو جاتی ہیں تو وہ کیتی کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔

"سیٹ بک کرالی ہے؟" ہیپ نے کچھ لاپرواہی سے پوچھا۔

وہ شاید یہ سوال تین سو بار پوچھ چکا ہے۔ ہر بار لاپرواہی پہلے سے کچھ زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

"ابھی نہیں" اس نے گلاس میں بوتل کی بچی ہوئی بیئر انڈیل لی۔ "ابھی کافی دن ہیں" اس نے کہا۔ عرصے سے اس نے گننا بند کر دیا ہے۔ پہلے وہ سوچتا تھا۔ یہ دن ہے یہ رات۔ پانی کے نیچے تراشیدہ، نکھرے اور ثابت پتھروں کی طرح وہ چمکتے رہتے۔ وہ اب بھی وہیں ہوں گے، لیکن اب وہ انہیں گنتا نہیں۔ وہ اس کے لئے نہیں۔

"میں ایک بیئر اور لوں گا اور تم؟" ہیپ نے پوچھا

"تم ایک لے لو، میں اسی میں سے تھوڑی لے لوں گا۔"

"سنا ہے دیانا میں "بیئر گارڈ نرز" ہوتے ہیں .... تم کبھی گئے ہو؟"

"میں گیا نہیں ... لیکن ان دنوں کھل جاتے ہیں۔ ان دنوں وہاں باہر آرکسٹر بھی ہوتا ہے ..." اس نے کہا اسے معلوم ہے کہ ہیپ کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر کیتی یہاں ہوتا تو وہ آپس میں باتیں کر سکتے تھے اور وہ چپ چاپ دونوں کی باتیں سن سکتا تھا۔ پہلے ایسا ہوا کرتا تھا۔ مگر ان دنوں یہاں کیتی نہیں تھا۔ ہیپ کو یہ اپنا فرض معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے باتیں کرے۔ اس نے کئی بار ہیپ سے کہنے کی کوشش کی ہے کہ اگر وہ خاموش رہیں تو اسے برا نہیں محسوس ہوگا۔ لیکن یہ ناممکن ہے۔

"تمہارا دل گھر میں اوب نہیں جاتا؟" ہیپ نے پوچھا۔ بیئر ختم ہو گئی تھی اور لان میں اندھیرا چھا گیا تھا۔

"نہیں" اس نے کہا "مجھے اچھا لگتا ہے"

"تمہیں یہاں عجیب تو لگتا ہوگا .... اتنے برسوں بعد"

"اتنا نہیں" اس نے سگریٹ سلگالی۔ اسے اپنی آواز کچھ عجیب سی لگی۔ اسے ذرا خوشی بھی ہوئی کہ ہیپ اندھیرے میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔

"تم نے کبھی یہاں رہنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ تمہیں آسانی سے کوئی پوسٹ مل سکتی ہے۔"

"میں نے کبھی سوچا نہیں" اس نے کہا۔ پہلے وہ کبھی کبھی سوچتا تھا۔ شروع شروع میں جب وہ آیا تھا۔ اب اسے اپنی جرأت پر ہنسی آنے لگتی ہے۔

کچھ دیر بعد جب وہ باہر آئے تو اسے لگا کہ اس کے بال دھیرے دھیرے ہوا میں سوکھ رہے ہیں۔ دہلی میں اسے ہمیشہ اگست کے دن اچھے لگتے ہیں۔ وہ ہم پر چھاتے نہیں اور ہم ان دونوں دوسرے دنوں کے بارے میں سوچ سکتے ہیں جو بیت گئے ہیں یا جو آنے والے ہیں۔ پورے سال میں اگست کا مہینہ ہی ایک پل کی طرح ہے تم اس پر سے گزر جاتے ہو لیکن خود اپنے میں وہ کچھ بھی نہیں۔

وہ ولنگڈن کریسنٹ سے نکل کر کشک روڈ پر آگئے۔ گرم ہوا کا ریلا آتا تھا اور سڑکوں کی دھول اٹھ کر فٹ پاتھ پر، فٹ پاتھ سے اٹھ کر جامن کے

پیڑوں سے چھنتی ہوئی بنگلوں کی بھوری جھاڑیوں پر بچھ جاتی تھی۔ کچھ عرصہ پیشتر وہ شہر کے اس حصے میں رہتے تھے تب اُس کے والد ریٹائر نہیں ہوئے تھے اور کیشی آرمی میں نہیں گیا تھا۔ اُن دنوں وہ باہر گھاس پر سوتے تھے اور رات کو ہوا چلنے سے بیڈمنٹن کا جال بہت دیر تک پھڑپھڑاتا رہتا تھا۔ اُن راتوں میں نیتا ہمیشہ روتی رہتی تھی (وہ اُس کی بہن ہے) اور انہیں پتہ نہیں چلتا تھا کہ اُس نے کوئی بُرا خواب دیکھا ہے یا ہوا میں جال کے پھڑپھڑانے سے ڈر گئی ہے۔

اُس نے سوچا وہ یہ بات ہیپ سے کہے مگر پھر وہ یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ ہیپ سوچے گا، وہ بیئر پی کر یہ سب کچھ کہہ رہا ہے۔ ایسے موقع پر کیشی ہمیشہ چپ رہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ پینے کے بعد اگر تم ماضی کے بارے میں سوچنے لگے تو تم میں ڈیپ فیلنگ نہیں ہے۔

واقعی مجھ میں ڈیپ فیلنگ نہیں ہے۔ اس نے سوچا۔ شاید بچپن میں رہی ہوگی۔ ایک رات اُس نے کیشی سے کہا "دیکھو میں مر رہا ہوں" تب وہ چھوٹا تھا۔ کیشی اُس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ بعد میں اُس نے اُسے کہا تھا "اگر تم اُس رات سچ مچ مر جاتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ تب میں صرف اُداس ہو جاتا۔ مگر تم نے صرف کہا، مرے نہیں۔ یہ ڈیپ فیلنگ ہے۔ یہ بہت ہی ڈیپ فیلنگ ہے۔"

سیکریٹریٹ کی عمارت کے سامنے آکر وہ ٹھہر گئے۔ وہاں بہت سی بسیں کھڑی تھیں۔ لیکن وقت کافی تھا۔ وہ چُپ چاپ کھڑے رہے۔ ہیپ نے ایک لمبی سانس لی۔

"تم ارونا سے ملے ہو؟" اُس نے پوچھا

"ابھی نہیں میں ایک دن وہاں جاؤں گا۔"

"گھر میں ہی بیٹھنا تھا تو اتنی دُور سے آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ابھی کافی دن ہیں" اُس نے جواب دیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے ہیپ اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اُسے تھوڑا سا تذبذب ہوا۔ اور وہ دوسری طرف دیکھنے لگا جہاں پرانے بیرک تھے۔ ان گرمیوں میں اُسے کئی بار وہم ہوا کہ لوگ کچھ دیر اُس کے ہمراہ رہنے کے بعد حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہیں، وہ کہتے کچھ بھی نہیں۔ شاید یہ محض وہم ہے اور کچھ بھی نہیں۔ شاید کچھ پینے کے بعد اُسے ایسا لگتا ہے، بعد میں اُسے خیال تک نہیں آتا۔

ہیپ کی بس آگئی تھی، وہ اُس میں بیٹھ گیا۔ "تم کل آؤ گے؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں میں پُول کے پاس رہوں گا" اُس نے کہا۔

وہ اُسے کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن بس چل دی اور وہ تنہا کھڑا رہ گیا۔

گرمی کی اُن راتوں میں وہ اکثر دیر سے گھر پہونچتا تھا۔ اس سے اس کی والدہ کو کبھی بُرا نہیں لگا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان دنوں اس کے پاس کچھ بھی کام نہیں ہے۔ انہیں صرف یہی فکر رہتا تھا کہ وہ کہیں گھر میں اُوب تو نہیں رہا۔ وہ انہیں یقین دلانا چاہتا تھا کہ وہ بہت سکھی ہے۔ اُن دنوں کے بارے میں آج جب وہ سوچتا ہے تو لگتا ہے کہ تب وہ سچ مچ سکھی تھا، مگر وہ یہ کہہ نہیں سکتا تھا۔ یہ کہنا کہ میں بہت سکھی ہوں بڑا مضحکہ خیز ہے۔ کہیں بھی تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔

اُن گرمیوں میں اُس کے پاس کچھ بھی کرنے کو نہیں تھا۔ اُس کا چھوٹا بھائی کیشی آرمی میں چلا گیا تھا اور جب وہ اپنے کمرے میں اُوب جاتا تھا تو سومنگ پول چلا جاتا تھا۔ وہاں اُسے گھر سے زیادہ اچھا لگتا تھا۔ اُسے گھر بھی اچھا لگتا تھا لیکن وہاں ماں اور بابوجی تھے اور وہ بہت اکیلے تھے اور وہ اُن کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

رات کو جب وہ سو جاتے تو وہ کونیاک پینے لگتا تھا۔ کبھی کبھی ماں اُسے دیکھ لیتی تھی مگر کچھ بھی نہ کہتی تھی۔ ماں کا کچھ نہ کہنا اُسے بہت بُرا لگتا تھا اور اُسے خواہش ہوتی تھی کہ وہ دوبارہ نہانے کے لئے چلا جائے لیکن رات کو ہم پول پر نہیں جا سکتے۔

اُس رات سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اچانک وہ ٹھٹک گیا۔ بابوجی کے کمرے میں ماں کی آواز سن کر وہ چونک پڑا تھا۔ وہ بابوجی کے کمرے میں بہت کم آتی تھی۔

"پتہ نہیں۔ دن بھر وہ کہاں رہتا ہے۔ تم سے کبھی کچھ کہا ہے؟" بابوجی کی آواز تھی۔

"تمہیں ہمیشہ بے کار سا فکر لگا رہتا ہے" ماں نے کہا "وہ تین سال بعد لوٹا ہے۔ تم سمجھتے ہو وہ پہلے جیسا ہی رہا ہے؟"

"نہیں ... نہیں میں نے یہ تھوڑے ہی کہا ہے" بابوجی کی آواز عجیب کھسیانی سی ہو گئی تھی۔

اُس نے آگے نہیں سُنا اور چپ چاپ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

چھت پر آکر اُسے عجیب سا سکون محسوس ہوتا تھا۔ اُس نے وہاں بہت

سے پینٹ اور سفیدی کے ڈبے جمع کر رکھے تھے۔ وہ لکڑی کی سیڑھی کو دیوار کے سہارے کھڑا کر دیتا اور ایک رسّی سے رنگ کے ڈبے سیڑھی سے باندھ دیتا۔ جب چاندنی بڑھنے لگتی تو ہر شے رات کو بھی دکھائی دیتی تھی۔ وہ دیر تک دیوار کے پلستر بھرے کونوں پر برش پھیرتا رہتا۔ وہ بھول جاتا کہ نیچے ماں کھانا لئے انتظار میں بیٹھی ہے وہ چمگادڑ کی طرح دیوار سے چپکا کھڑا رہتا۔ چاندنی رات میں اس کا دھندلا سایہ دیوار پر ایک ہنگم جانور سا دکھائی پڑتا۔

اگست کی ان گرم راتوں میں اس نے چھت اور دیواروں کو قرینے اور صفائی سے لیپ پوت دیا تھا۔ جب وہ اوپر سیڑھی پر کھڑا ہوتا تو کبھی کبھی اسے عجیب سا لگتا۔ چاروں طرف ہوا ہوتی اور وسعت بے کراں۔ تب اسے لگتا کہ کسی شے کو اپنے سے ڈھک پانا اپنے آپ کو محیط کر پانا کتنا اطمینان بخشتا ہے۔ یہ وہی جان سکتا ہے جو کبھی کھلی چھت پر ایک ننگی دیوار پر چڑھا ہو۔ اسے تب کچھ کچھ ویسا ہی محسوس ہوتا تھا جیسا دن کے وقت سومنگ پول کے نیچے تاریکی میں — بہت سکون — بہت خالی۔

جب کچھ دیر بعد وہ نیچے اترا تو اس نے دیکھا اندھیرے میں ماں کھڑی ہے اسے دیکھ کر وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"تم یہاں کب سے کھڑی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں تجھے دیکھ رہی تھی۔ تو کمرے میں نہیں تھا اس لئے یہاں چلی آئی۔"

ماں ایک بہت چھوٹی عورت ہے عمر کے ساتھ ساتھ وہ سکڑتی جاتی ہے۔

"کھانا نہیں کھاؤ گے؟ کب سے پڑا ہے" اس نے کہا

وہ تیزی سے کام کرنے لگا اس نے چونے میں بھیگا برش اور ڈبہ کونے میں رکھ دیا اور سیڑھی کو ٹکا کر بولا "تم چلو میں آتا ہوں"

جب سے وہ آیا ہے اسے ماں کا برتاؤ عجیب سا لگتا ہے۔ شروع شروع میں وہ اس سے بات کرتی تھی۔ مگر جب سے اس کے جانے کے دن قریب آ رہے تھے وہ چپ چپ سی رہنے لگی تھی۔ بولتی اب بھی ہے لیکن کچھ دکھ اور مایوسی سے، نیز اب وہ انہیں باتوں کو دہراتی تھی جنہیں وہ پہلے سن چکا ہے تین سال پیشتر جب وہ گیا تھا تب اس نے کچھ نہیں کہا تھا اب وہ دوبارہ جا رہا ہے تو بھی اس نے اس کے بارے میں کوئی ذکر نہیں چھیڑا۔

وہ اس کے کمرے میں آتی ہے تو دبے پاؤں سے۔ ایک بار آدھی رات کو اس کی آنکھ کھل گئی اسے ہلکا سا احساس ہوا کہ کوئی اندھیرے میں اس کے سرہانے کھڑا ہے۔ اسے اتنا حوصلہ بھی نہ ہو پایا کہ وہ کروٹ لے سکے۔ بعد میں ماں کو پہچاننے پر اسے بے حد غصہ آیا لیکن دوسرے دن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

رات کو وہ کھانا ایک ساتھ کھاتے تھے۔ ماں چارپائی پر اور بابو جی ریڈیو کے پاس دیوان میں بیٹھے رہتے۔ میز کے ارد گرد دو کرسیاں خالی پڑی رہتیں۔ ایک نیتا کی اور دوسری کیشی کی۔ نیتا اپنے سسرال میں رہتی تھی۔ اور کیشی آرمی میں۔ جب کبھی وہ ان کو دیکھتا اسے سارا گھر سونا سونا لگتا۔

بابو جی ریڈیو سننے کے بہانے کافی دیر کمرے میں بیٹھے رہتے۔ ماں کو یہ اکھرتا تھا۔ اسے ان کے سوالات بھی زیادہ سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ وہ حیرانی سے کبھی اس کی جانب دیکھتی تھی اور کبھی بابو جی کی طرف۔

وہ کبھی سمجھ نہ پاتے تھے کہ ان تین برسوں کے وقفے کی بات کیسے کی جائے۔

"یہ سب تو تمہیں وہاں کھانے کو کیا ملتا ہوگا؟" بابو جی ماں کی طرف دیکھتے اور مسکرانے لگتے۔

وہ چاہتا تھا، جلدی سے کھانا ختم کر کے اوپر چلا جائے۔ لیکن وہ بیٹھا رہتا۔ کھانے کی بات سن کر ماں کہتی — اچھا، نیتا کہتی تھی، وہاں گوشت پھل کے سوا کچھ نہیں ملتا — کیوں؟"

ابھی وہ جواب نہیں دے پاتا تھا کہ بابو جی پوچھتے "اچھا سردی تو وہاں بہت پڑتی ہوگی؟"

"ہاں لیکن کمرے میں سنٹرل ہیٹنگ رہتی ہے۔ اندر کمرے میں محسوس نہیں ہوتا۔" وہ دھیرے دھیرے کہتا۔

"میں نے تمہیں اوور کوٹ خریدنے کے لئے لکھا تھا۔"

ماں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ گھر میں ایک بوجھل سا سناٹا گھر آتا۔ وہ انتظار کرتا۔ اسے احساس ہوتا بابو جی اس سے کچھ کہیں گے باہر اگست کی گرمی اور امس رات سمٹ آتی۔ بابو جی کچھ نہ کہتے اور بغیر پلک جھپکائے اس کی طرف دیکھتے رہتے۔ بغلوں کے نیچے سے اس کی قمیص پسینے سے تر بتر ہو جاتی۔ وہ دل ہی دل میں دعا کرتا رہتا کہ وہ کچھ کہہ دیں۔ جس سے برسوں سے کھنچا یہ تنا ٹوٹ سکے مگر آخری سرے پر آ کر بابو اچانک ارادہ بدل دیتے۔

دروازے کے پاس جاکر وہ رُک جاتے اور کہتے "کیا تم چھٹی نہیں بڑھا سکتے؟"

وہ سوالیہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھنے لگتا۔ بابوجی سمجھ نہ پاتے تو وہ پوچھتا "کیا کچھ کام ہے؟"

"نہیں کام کیا ہوگا؟" اُن کے چہرے پر وہی ایک کھسیانی مسکراہٹ رقص کرنے لگتی "میں سوچتا ہوں دیوالی اس بار یہاں ہی منا لیتے کیونکہ ان دنوں کیشی بھی آجائے گا۔"

وہ خاموش رہتا۔ اُسے معلوم ہے یہ ناممکن ہے مگر وہ کہتا کچھ نہیں۔

وہ اُوپر چھت کی برساتی میں چلا آتا۔ اُس وقت گھر پر سناٹا چھا جاتا۔ برآمدے کی بتی بجھ جاتی۔ صرف ماں کے کمرے کی بتی دیر تک جلتی رہتی۔ اُسے بہت کم نیند آتی تھی۔ کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلی جاتی اور وہاں اکیلی بیٹھی رہتی۔

اُسے تھوڑی سی خوشی ہوئی کہ اب کوئی نہیں آئے گا۔ وہ اپنے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ ایک گوشے میں ایک گٹھڑی سی رکھی تھی جس پر برسوں سے آہستہ آہستہ گرد و غبار جمع ہوگیا تھا۔ دیانا جانے سے پیشتر اُس نے اپنے اسکول اور کالج کی کتابیں اس گٹھڑی میں باندھ کر رکھ دی تھیں۔ دیوار پر جواں گری کا ایک پرنٹ لگا تھا جو اُس نے لائی پارزم سے کیشی کو بھیجا تھا۔ کیشی کو بہت سی چیزوں میں دلچسپی رہی تھی۔ پرانی تصاویر، ریکارڈ، کتابوں کے پہلے ایڈیشن۔ دیانا میں اس کی چیزیں خریدتے ہوئے اُسے ہمیشہ پریشانی اُٹھانی پڑتی تھی۔ اُسے خود ان چیزوں سے کوئی لگاؤ نہیں رہا تھا۔ ان چھٹیوں میں بھی جب اُس کے پاس کچھ بھی کرنے کو نہیں بچتا وہ ان کتابوں میں سے ایک بھی نہیں پڑھ پایا۔

اُس دن جب ماں دُودھ کا گلاس دینے آئی تو کچھ دیر اُس کے کمرے میں کھڑی رہی۔

وہ پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اُسے لگا ماں کچھ کہنا چاہ رہی ہے مگر کہنے میں کچھ جھجک رہی ہے۔

"یہاں بیٹھ جاؤ ماں" اُس نے کہا

"نہیں مجھے کام ہے۔" ماں نے کہا "تم ارونا سے ملے تھے؟"

"نہیں ابھی نہیں" اُس نے کہا۔ پھر اُسے اپنے جھوٹ پر تھوڑا سا افسوس ہوا۔

"کسی دن ہو آؤ، جب تم یہاں نہیں تھے، وہ اکثر تمہارے بارے میں پوچھتی تھی۔"

"میں کسی دن وہاں جاؤں گا" اُس نے کہا "ماں تم کب تک کھڑی رہو گی؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ میں اب جا رہی ہوں" ماں بولی لیکن وہ پھر بھی کھڑی رہی۔ وہ شاید سمجھ گئی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ ہمیشہ ہر بات سمجھ جاتی ہے۔

"میں سوچتی ہوں کچھ دنوں کے لئے کیشی کے پاس ہو آؤ۔ وہاں تمہارا دل لگ جائے گا۔"

"میرا دل یہاں لگ بھی گیا ہے ..... اور پھر زیادہ دن بھی نہیں رہے" اُس نے کہا

"ہاں اب زیادہ دن نہیں رہے" ماں بولی۔ اُس کی آواز سُن کر وہ چونک سا پڑا۔ اُس نے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا جسے وہ پڑھ پاتا۔

ماں دروازے کے پاس چلی گئی اور پھر دہلیز پر رک گئی۔

"آئندہ اتوار نیتا آئے گی، تم گھر پر ہی رہو گے۔؟"

"اگر نیتا آئے گی تو میں گھر پر ہی رہوں گا۔" اُس نے کہا۔

ماں چلی گئی اور وہ کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ مکان سے پرے ویران احاطے میں آنکھیں کچھ تلاش کرنے لگیں۔ جھاڑیوں کے پرے لین کی چھایا کے اوپر جہاں اگست کی گرم ریت پھیلی تھی۔ تم اب بھی ڈرتے ہو لیکن کس لئے؟ کچھ دنوں بعد تم چلے جاؤ گے اور کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا۔

کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ دیانا میں کوئی لڑکی تمہارے ساتھ رہی ہے جس کے بارے میں ماں یا ارونا کچھ نہیں جانتیں۔ تمہیں شروع میں کہہ دینا چاہئے تھا اگر تم شروع میں ہی کہہ دیتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ کچھ دنوں بعد چلا جائے گا اور کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا اور اب انہیں معلوم پڑ جائے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

آخر میں .... بالکل آخر میں بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر تمہارے والدین بہت بوڑھے ہوں، اُس نے سوچا۔ اُسے تھوڑی سی خوشی ہوئی کہ

کیشی گھر میں نہیں ہے۔ تین سال بعد اُسے دیکھ کر وہ ضرور کچھ شبہ کرنے لگتا۔ وہ شاید کچھ پوچھتا بھی نہیں مگر ایک دیواری کھڑی ہو جاتی۔

کھڑکی کے باہر ہوا چل رہی تھی۔ وہ واپس آکر پلنگ پر لیٹ گیا اور بتی بجھا دی۔ اس رات وہ دیر تک اپنے بچپن کے بارے میں سوچتا رہا۔ اُن دنوں لوگ مذاق میں کیشی کو چینی مینڈارین کہا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ بہت چپ چپ رہتا تھا۔ وہ اور نیتا اس کے پیٹھ پیچھے اُس کا مذاق اُڑایا کرتے تھے لیکن اُس کے سامنے اُس سے مرعوب سے ہو جاتے تھے۔ اُسے ایک بہت پرانا واقعہ یاد آگیا اور وہ اندھیرے میں ہی ہنسنے لگا۔

تب وہ بہت چھوٹے تھے اُن دنوں وہ ایک پہاڑی مقام پر رہتے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ ایک دن وہ کیشی اور نیتا کاٹیج کے پیچھے ایک باغ میں چلے گئے۔ وہ ایک ویران باغ تھا اور وہاں کوئی نہیں آتا تھا۔ انہیں دم تھا کہ ایسے سُنسان مقامات پر بہت سی بیش قیمت چیزیں پوشیدہ رہتی ہیں۔ انہوں نے کھودنا شروع کیا اور وہ دیر تک کھودتے رہے۔ نیتا اُوب چکی تھی۔ آخر کدال ایک سخت شے سے ٹکرایا۔ وہ ایک سخت، پتھر سا تھا۔ تینوں نے مل کر اسے ہٹایا۔ دھڑکتے دل سے نیچے گڑھے میں دیکھا تو وہ حیران و ششدر دیکھتے ہی رہ گئے۔

گڑھے میں پڑی تھی ایک درخت کی ٹہنی، ایک لمبی ہڈی اور ایک ٹوٹے کانچ کا ٹکڑا۔

اُنہوں نے باری باری ہر شے کو چھُوا، ٹہنی کو، ہڈی کو اور کانچ کے ٹکڑے کو۔ پھر نیتا روتی ہوئی گھر کی جانب بھاگ گئی۔ پھر اُن چیزوں کو اسی جگہ چھوڑ کر وہ چُپ چاپ لوٹ آئے۔

اُس رات سونے سے پیشتر کیشی نے بغیر اس کی طرف منہ موڑے چھت کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا "جانتے ہو نیتا کیوں رونے لگی تھی؟"

"شاید وہ ڈر گئی تھی۔"

"نہیں ڈر تو ہم بھی گئے تھے۔ وہ بہت SENSITIVE ہے"

"پھر؟" اس نے کیشی کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی چھت کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"جب تم اُنہیں چھو رہے تھے تو تمہیں ایسا نہیں لگا کہ وہ Resist کر رہی ہے۔" وہ کچھ دیر تک چُپ رہا۔ پھر دھیمی آواز میں بولا "ری زسٹ" کرتا ایک بڑی چیز ہے۔" کیشی نے ایک لمبی سانس لی اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

کیشی ایسا ہی تھا بچپن سے۔ اُس رات اُسے دیر تک نیند نہیں آئی۔ وہ اپنے دیانا کے اپارٹمنٹ کے بارے میں سوچنے لگا۔ جہاں گزشتہ تین برس اُس نے گزارے تھے۔ وہاں سے ڈینوب کی نہر دکھائی دیتی تھی۔ ان دنوں وہاں پتے جھڑنا شروع ہو گئے ہوں گے، اس نے سوچا۔ پھر اُسے بابوجی کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ جب وہ صراحی سے پانی بھرتے تھے تو اُوپر تک آواز آتی تھی۔ ماں نے زینے کے دروازے کی کنڈی لگائی ہو گی۔ سیڑھیوں پر ہلکے قدموں کی چاپ سُن کر اُس نے اندازہ لگایا پھر سارا گھر خاموش ہو گیا۔ صرف ہوا چلنے سے جواں گرمی کی سٹیل لائٹ پر پرے کا سایہ ڈول جاتا تھا۔

**اُس** شام جب وہ 'سوننگ پول' سے لوٹا تو نیتا اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس نے بوکو چوما۔ اس کی پلکیں بہت لمبی تھیں۔ اور جب وہ اُسے چومتا تو اُس کے گالوں پر گدگدی سی ہونے لگتی۔

"میں نے تمہارے لئے بہت سی چیزیں جمع کی ہیں۔" اُس نے اُس کے بالوں کو سونگھا۔ اُسے بہت پہلے کی وہ عجیب سی بُو یاد آگئی، جو نیتا کے بالوں سے آتی تھی۔

"کون کون سی چیزیں؟" بُوکو نے اس کی طرف دیکھا

"الماری میں رکھی ہیں۔"

"ماموں تم نے کہا تھا تم مجھے چارلز اسٹون سکھاؤں گا۔"

بُوکو نے استفسارانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"جب تم سیکھ جاؤ گی، تو صرف میرے ساتھ ناچو گی کسی اور دوست کے ساتھ نہیں" اُس نے کہا۔

"بڑے ہونے پر بھی؟" بُوکو کی آواز میں ہلکی سی مایوسی تھی۔

"بڑے ہونے پر ہی، ابھی تو تم کچھ نہیں ہو" بڑے ہونے پر بُوکو انیسویں صدی کی کوئی روسی شہزادی دکھائی دے گی" اُس نے سوچا۔ "اتنی ہی حسین اتنی ہی ڈِسٹنٹ"

وہ اُوپر آگئے۔ جب نیتا آتی تھی تو وہ سب کیشی والے کمرے میں بیٹھتے تھے۔ چائے ایک ساتھ پیتے۔ بُوکو کے لئے خاص چاکلیٹ کپ تیار کیا جاتا۔ نیتا بابوجی کے کمرے سے اُن کی آرام کرسی کھینچ لاتی تھی۔ وہ اُس

پر آنکھیں موندھے نیم دراز سے پڑے رہتے۔ بابو جی کے سامنے نیتا اور وہ آج بھی ایک عجیب سی ہچکچاہٹ محسوس کرتے رہے ہیں جب کیشی ہوتا تھا تو یہ ہچکچاہٹ نہیں رہتی تھی مگر اس کے نہ رہنے سے ایک خاموشی سی چھا جاتی تھی۔ وہ خود کبھی بھی ٹھیک ڈھنگ سے بات نہیں کر پاتا تھا۔

"تم آئے نہیں ہمارے جیجا جی تم سے ملنے کے لئے بے حد بے چین تھے" نیتا نے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا کرتے ہو دن بھر؟"

وہ ہنس دیا۔ "میں کبھی کبھی تیرنے چلا جاتا ہوں سیپ کے کلب میں"۔ اس نے کہا۔

نیتا نے ذرا حیرانی سے اس کی طرف دیکھا

"میں نے وہاں سیکھ لیا تھا۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "نیتا تمہیں بھی سیکھنا چاہئے۔ وہاں بہت سی لڑکیاں تیرنے جاتی ہیں"

"اس عمر میں؟ تم پاگل ہو" اس نے ہنستے ہوئے بابو جی کی طرف دیکھا وہ اب بھی آنکھیں موندھے لیٹے تھے۔

"تمہاری عمر تو کچھ بھی نہیں" وہ بولا۔ جب نیتا اس طرح ہنستی ہے تو سچ مچ یقین نہیں ہوتا کہ وہ بُوتُو کی ماں ہے۔ دونوں چھوٹی بڑی نہیں لگتی ہیں۔

اس گھر میں صرف نیتا ہی ایسی تھی جسے یہ درمیانی سال اچھوتا چھوڑ گئے تھے۔ یا اچھوتا لفظ شاید ٹھیک نہیں انہوں نے اسے چھوا ہے، جیسے ہم کتاب کو چھوتے ہیں۔ اوپر کی جلد پرانی ہو جاتی ہے مگر اندر سے سب کچھ ویسا ہی ہے جیسے پہلے تھا۔

آہستہ آہستہ شام کی روشنی پھیکی پڑنے لگی وہ تینوں چپ چاپ چائے کی میز کے ارد گرد بیٹھے رہے۔ بُوتُو چھت پر چلی گئی۔

"آپ کو گرمیوں میں کہیں چلے جانا چاہئے تھا۔" نیتا نے بابو جی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہاں اکیلے بیٹھے بیٹھے تو ویسے ہی جی اچاٹ ہو جاتا ہوگا؟"

"ہاں کیشی نے لکھا تو تھا" انہوں نے کچھ آگے جھک کر کہا۔ "مگر اب ہماری آنے جانے کی ہمت نہیں ہوتی" وہ کچھ جھینپتے ہوئے ہنس دیئے۔

"آپ کہیں تو میں کیشی کو خط لکھ دوں۔ وہ آپ کو لے جائے گا۔" نیتا کہنے لگی۔

بابو کچھ دیر تک سونی آنکھوں سے خلا میں دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے "میں چلا تو جاتا لیکن پھر تمہاری ماں پیچھے اکیلی رہ جائے گی۔ اس کے جانے کے بعد تو گھر خالی ہو ہی جائے گا۔ بعد میں کہیں چلے جائیں گے"

نیتا کی آنکھیں اس کی طرف اٹھیں وہ کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھنے لگا۔ اسے خواہش ہوئی کہ وہ جیب سے سگریٹ نکال لے لیکن پھر اس کے ہاتھ ٹھٹک کر جیب میں ہی رہ گئے۔ بابو جی کے سامنے سگریٹ پینے میں اسے آج بھی عجیب سی جھجک ہوتی ہے۔ وہ کچھ کہتے نہیں لیکن پھر بھی خود ہی خواہش مر جاتی ہے۔

شام کا پیلا پن کمرے میں پھیل گیا۔ آخری دھوپ کی روشنی چائے کی پیالیوں پر سٹ آئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی چڑیا روشن دان سے اڑ کر کمرے کا چکر لگانے لگتی اور اس کا سایہ ان تینوں کے سروں پر منڈلا کر ہوا میں تحلیل ہو جاتا۔

ان گرمیوں میں اسے پہلی بار بابو جی اتنے تنہا تنہا دکھائی پڑے۔

چھت سے اتر کر بُوتُو کمرے میں چلی آئی۔ کمرے کا ماحول اچانک ڈھیلا سا پڑ گیا۔

"ماموں۔ کہاں ہیں ہماری چیزیں؟"

وہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیسی چیزیں؟" نیتا نے پوچھا

وہ اٹھا اور الماری کے پاس چلا گیا۔ نچلے دراز سے اس نے چمڑے کا ایک لمبا بیگ نکال لیا جو اس نے دیانا سے آنے سے پیشتر خریدا تھا۔

بُوتُو میں اتنا صبر کہاں تھا کہ وہ انتظار کرتے۔ اس نے ہاتھ کے جھٹکے سے بیگ چھین لیا اور میز پر رکھ کر اسے کھولنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے بہت سے چمکتے سکے میز پر بکھر گئے۔

ایک لمحے تک بُوتُو یقین نہیں کر سکی "یہ سب میرے ہیں؟" اس کی آواز میں استفسار اتنا نہیں تھا جتنا یقین کہ یہ سب کچھ اس کے ہو سکتے ہیں

اس نے اپنی کرسی میز کے قریب کھینچ لی۔ وہ آہستہ آہستہ اسے سمجھانے لگا۔ آسٹرین شلنگ، پھر وہ آئی لینڈ کا کراؤن، اٹلی کا لیرا۔ وہ جن جن ممالک میں گیا تھا، ان سب کے سکے اس کے پاس جمع ہوتے گئے تھے جرمنی کے مارک دکھاتے ہوئے اچانک اس کے ہاتھ ٹھٹک گئے۔ اچانک اسے وہ رات یاد آ گئی جو اس نے برلن کی سڑکوں پر گزاری تھی۔ لیکن باقی سکوں کو چھوتے ہوئے اسے کوئی خاص بات یاد نہیں آئی۔ ایسا محسوس ہوا

جیسے بُوُ کے ساتھ وہ بھی اُنہیں پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

"تم پھر وآئی لینڈ بھی گئے تھے" نیتا نے ذرا حیرت سے پوچھا "تم نے کبھی خط میں ذکر نہیں کیا؟"

"ہاں وہاں صرف ایک رات ٹھہرے تھے۔" اُس نے کہا

کیا وہ واقعی اتنے چھوٹے ہیں جتنے نقشے پر دکھائی دیتے ہیں؟ بُوُ نے بڑی بے تابی سے پوچھا

اُس نے بُوُ کی ہتھیلی کو اپنے گال سے دبالیا "وہ تمہاری ہتھیلیوں سے چھوٹے ہیں" اس نے جواب دیا۔

"ماموں شروع کریں؟" بولو اس سے سٹ گئی۔

اُس نے نیتا کی طرف دیکھا وہ دیوار کے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ بابو جی بہت پہلے اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ اگست کا دھندلا پن ہر شے پر مٹیالی رات کی مانند بچھ گیا تھا۔ گرم اور کرکرا سا۔

اس نے میز بیچ سے ہٹا دیا۔ بُوُ جلدی جلدی سکوں کو سمیٹنے لگی۔ اُس کے بھورے بال ڈھیلے ہو کر شانوں تک جھک آئے تھے۔

اُسے آج بھی اگست کی وہ شام یاد ہے وہ کچھ لمحوں کے لئے بھول گیا تھا کہ وہ دہلی میں اپنے کمرے میں ہے۔ بُوُ کو چالرز اسٹون سکھانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ انہوں نے ریڈیو پر بہت کھینچ تان کے بعد ایک ایسا اسٹیشن ڈھونڈھ نکالا تھا جہاں سے تھوڑی بہت موسیقی رُک رُک کر آتی تھی۔ چالرز اسٹون سے اُس کا دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ شاید وہ طرز کسی نے گزشتہ جنگ کے دنوں میں بنائی تھی لیکن اُن کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ کیونکہ کچھ دیر بعد وہ ریڈیو کو بھول گئے۔ بھولو جب گھوم کر اس کی طرف دیکھتی تو وہ تنہا سا ہو جاتا۔ پھر وہ پاس آتے۔ بُوُ اُس کی بانہوں میں سمٹ آتی۔ ایک چھوٹی اُڑتی ہوئی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں کو چھو جاتی اور وہ الگ ہو جاتے۔ یہ مسکراہٹ اُس کے لئے نہیں تھی۔ اس عمر میں چالرز اسٹون ناچتے ہوئے لڑکیوں کی یہ مسکراہٹ کسی کے لئے نہیں ہوتی۔ یہ بات وہ دیانا میں بہت پہلے ہی جان چکا تھا۔

"ماموں تیزی سے" بُوُ آہستہ سے اُس کے کانوں میں پھسپھسائی اُس کا چہرہ پیلا سا پڑ گیا تھا اور وہ بہت جذباتی ہو گئی تھی۔ ناچتے ناچتے اس کی آنکھیں بہت روشن سی ہو جاتی تھیں یہ اُس نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ ہر بار وہ کچھ گھبرا سا جاتا تھا۔ کسی لڑکی کی آنکھوں کو برداشت کرپانا جبکہ وہ بالکل چہرے کے سامنے ہوں اور اتنی ہی روشن ہوں جتنی بُوُ کی اکثر ہو جاتی تھیں، اُس کے لئے ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا تھا۔

"اچھا اب بند کرو . . . بہت ہو گیا" کمرے کے تاریک گوشے سے نیتا کی آواز سنائی دی۔ وہ اُسے بالکل بھول گئے تھے۔

"ماموں، ابھی نہیں" بُوُ نے کہا

اُس نے ماتھے سے پسینہ صاف کیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے گزشتہ مہینوں میں اُس کی عادت بالکل چھوٹ گئی ہو۔

"اب نہیں بُوُ پھر کسی دن" اُس نے کہا۔

"پھر کب؟" بُوُ کی آنکھیں اچانک ڈبڈبا آئیں "تم چلے جاؤ گے تو میں سب بھول جاؤں گی" پھر اُسے اپنے آنسوؤں پر شرم سی آگئی۔ اُس نے ہنستے ہوئے کہا "تم نے مجھے پہلے والٹس سکھایا تھا۔ یاد ہے؟" اُس نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا اور اُسے اپنی آواز ہی عجیب سی لگی۔ "بُوُ لیٹ اس ہیو اے والٹس۔"

بُوُ نے نیتا کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگی۔ والٹس کے لئے "بُوُ میں کچھ ایسی چیز تھی جو وہ کبھی نہیں سمجھ پایا۔ کیشی کی ڈیپ فیلنگ نہیں بلکہ ایک خاص طرح کا موہ جسے دیکھ کر وہ ہمیشہ مرعوب سے ہو جاتے تھے۔ مگر اس شام وہ بہت سہمی تھے نیتا بھی دیوان کے آگے کھسک آئی تھی اور مسکراتے ہوئے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ایک بار اُسے بھی اُنہوں نے اپنے ساتھ کھینچنے کی کوشش کی تھی لیکن اُس نے ہنستے ہوئے اپنے کو چھڑا لیا تھا۔ کمرے میں پہلا سا اندھیرا گھر آیا تھا۔ اُن کے قدموں کی رفتار اتنی دھیمی تھی کہ کبھی کبھی اُسے شبہ ہوتا تھا کہ وہ ایک ہی جگہ پر کھڑے ہیں۔ حالانکہ ریڈیو کی گھڑ گھڑاہٹ کے بیچ وہ ٹیون اب بھی سنائی پڑتی تھی۔ وہی ٹیون جو کسی نے پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں بنائی تھی اُس کے نوٹس Notes ماچس کی جلتی سلائی کی طرح ہوا کے چھوٹے سے گھیرے میں سمٹ گئے تھے جب ذرا بھی اوپر اُٹھتے تھے تو لگتا تھا جیسے دیا سلائی سے ہاتھوں کا گھبراہٹ گیا ہو اور وہ ننگی ہو کر اندھیرے کمرے میں پھڑپھڑا رہی ہو۔ اس دھندلکے میں اُسے بُوُ بہت بڑی دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے اپنا سر اُس کے شانوں پر ٹکا دیا تھا لیکن اس کے سانسوں سے لگتا تھا جیسے وہ ابھی بہت چھوٹی ہو۔ اس کے بالوں سے وہی پہچانی سی بُو آرہی ہے بہت

عرصہ پیشتر گری کی چھٹیوں اور پہاڑی مقام کی بُو جو بچپن سے اُس کی ماں یا نیتا کے بالوں سے آتی تھی۔ وہ ٹھہر گئے۔ ریڈیو کی ٹیون اچانک بھٹک گئی تھی۔ نیتا نے اُٹھ کر کمرے کی بتی جلادی۔

"تم تو پورے ایکسپرٹ جان پڑتے ہو" نیتا نے ہنستے ہوئے کہا۔

اُس کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔ سگریٹ سلگا کر وہ اُس آرام کرسی پر بیٹھ گیا جس پر کچھ دیر پہلے بابو جی بیٹھے ہوئے تھے۔

"ماموں۔ تم تو ہر شام کو رقص کے لئے جاتے ہو گے"؟ بُوبُو نے جھک سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے بال پیچھے کی طرف سمیٹ لئے تھے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب سی روشنی سمٹ آئی تھی۔

کھڑکی کے باہر لیمپ پوسٹ روشن ہو گیا تھا۔ ماں نے کسی کام سے نیتا کو رسوئی میں بلا لیا تھا۔ وہ کچھ دیر اکیلا کمرے میں بیٹھا رہا، نیتا کے انتظار میں۔ نیند کے بوجھ سے بُوبُو کی آنکھیں مندھنے لگی تھیں لیکن اب بھی اس کے رخسار جل رہے تھے۔ اس نے دھیرے سے بُوبُو کے جوتے اُتار کر کونے میں رکھ دیئے۔

"ماموں" بُوبُو نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

"کیا بات ہے بُوبُو"۔

"تم جا رہے ہو"؟

"میں کہیں بھی نہیں جا رہا"۔

بُوبُو نے پھر آنکھیں موندھ لی اور دیوار کی طرف کروٹ بدل لی۔ اُس نے کمرے کی بڑی بتی بجھا دی اور صرف ٹیبل لیمپ جلتا رہنے دیا۔ وہ کچھ دیر تک بُوبُو کو دیکھتا رہا۔ اُسے لگا جیسے وہ ترگنیو کی کوئی ہیروئن ہو۔ پھر وہ بے قدموں سے باہر چلا گیا۔

اُوپر کوئی نہیں تھا صرف ہلکی سی چاندنی تھی جو اگست کی اُن گرم راتوں میں پھٹے میلے چیتھڑوں سی ہر مکان کی چھت پر پڑی رہتی تھی۔

سامنے بہت سے مکان تھے، ایک دوسرے سے سٹے ہوئے۔ پانی کے پائپوں کے بیچ بیچ کور دیواریں کسی گھسے پٹے اسکرین سی دکھائی دیتی تھیں جن کے آر پار کبھی کبھی کوئی بے ڈول سا سایہ رینگ جاتا تھا۔

اب شاید کوئی نہیں آئے گا۔ اُس نے سوچا وہ برساتی میں چلا گیا۔ بتی جلائی، پھر اپنا سوٹ کیس کھولا۔ آرکیالوجی کی کچھ کتابیں اوپر رکھی ہوئی تھیں جنہیں وہ اپنے ساتھ دیانا سے آیا تھا۔ نیچے کپڑے تھے انہیں ہٹا کر اُس نے تولئے سے کونیاک کی بوتل نکال لی جو وہ آتے وقت اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

شروع شروع میں یہاں اکیلے بیٹھ کر پینا اُسے بہت معیوب سا لگا کرتا تھا۔ اُسے خواہش ہوتی تھی تو اسے ٹال جاتا تھا لیکن جب کسی رات دیر تک نیند نہیں آتی تھی تو وہ تھوڑی سی پی لیتا تھا۔ ویسے بھی کونیاک وہ ایک ساتھ زیادہ نہیں پی سکتا تھا۔

یوں گھر میں پیتے ہوئے اُسے آج بھی تھوڑی سی جھجک ہوتی تھی تیکن بھی ہوتی تھی لیکن بعد میں کچھ جرعے پی لینے کے بعد وہ ہمیشہ دیانا کے بارے میں سوچنے لگتا تھا۔ لیکن یہ وہ بعد میں سوچتا تھا۔ شروع میں ایک عجیب سا ڈر لگتا تھا لیکن جب پی لینے کے بعد بستر پر لیٹتا تھا تو نہ ڈر لگتا تھا اور نہ دیانا کے بارے میں سوچنا تھا۔ تب صرف سو جانے کو جی چاہتا تھا۔

مگر اُس رات وہ جانتا تھا کہ نیند نہیں آئے گی۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ لیکن جب وہ نیند کے بارے میں بے فکر ہو جاتا تو وہ اُسے کچھ اور دیر کے لئے ٹالنا چاہتا تھا کہ وہ خود اپنی مرضی سے نیند کے گھیرے میں جا سکے جیسے وہ سوئمنگ پول کے نیچے اندھیرے میں دھیرے دھیرے کھو جاتا تھا۔

اُس نے بوتل سے گنی چنی کونیاک کی مقدار گلاس میں انڈیلی۔ تب کچھ لمحے کوئی سایہ دیوار پر پڑا تھا۔ اُس کا ہاتھ رُک گیا لیکن اُسے جلدی نہیں تھی پیچھے مڑنے سے پیشتر اُس نے گلاس سے ایک لمبا گھونٹ لے لیا تھا۔ اُسے بہت اچھا محسوس ہوا۔ اُسے کونیاک ہمیشہ بہت اچھی لگتی تھی۔

اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دہلیز پر نیتا کھڑی تھی۔ "میں سمجھی تھی تم سو گئے" وہ اندر آ کر پلنگ کی پائنتی پر بیٹھ گئی۔ اُس نے دھیرے سے کونیاک کی بوتل پلنگ کے نیچے کھسکا دی۔ اس نے سوچا تھا کہ اُسے پیتے دیکھ کر وہ چلی جائے گی۔ وہ چلی جاتی تو اُسے خاص دکھ نہ ہوتا ——— "بُوبُو سو گئی"؟ اُس نے پوچھا۔

"وہ بہت جلدی جذباتی ہو جاتی ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ زیادہ دیر نہیں ناچنا چاہئے تھا"۔

"وہ ٹھیک ہے۔ وہ ٹھیک تمہاری طرح ہے جب تم چھوٹی تھیں" اس نے کہا۔

"تم ہمارے گھر آئے نہیں، تمہارے جیجا جی نے کئی بار مجھ سے پوچھا تھا" اُس کی آواز میں کچھ رہا ہوگا، طعنہ نہیں۔ پھر بھی برسوں سے اُن کے بیچ کچھ رہا ہے۔ وہ اکثر بھول جاتا ہے ——— کہ وہ اس سے بڑی

ہے۔ صرف عمر میں ہی نہیں، اس کا اپنا ایک ماضی ہے جسے وہ چھو نہیں پاتا۔

"نیتا تمہیں بُرا تو نہیں لگے گا اگر . . . . "

"نہیں نہیں" اس نے کچھ استفسار کیا" لیکن کیا تم ہر رات کو . . "

"ہر روز کہاں ؟" اُس نے کونیاک پلنگ کے نیچے سے باہر نکال لی۔

اس بار جھوٹ بولتے ہوئے اُسے ہلکی سی خوشی ہوئی۔ شروع کے لمحات میں کونیاک آدمی کو اتنا غیر جانبدار بنا دیتی ہے کہ ہم اپنے سے ہی کھیلنے لگتے ہیں۔

"نندی" نیتا کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ اُس نے اس کی جانب دیکھا اس کی آنکھیں اچانک بُوُ کی طرح روشن ہو گئی تھیں۔

"کیا نیتا ؟" اس نے پوچھا

وہ ایک طویل لمحے تک اُسے دیکھتی رہی "تم بدل سے گئے ہو" اس کی آواز بہت دھیمی اور اجنبی سی تھی۔

"تمہیں سچ مچ ایسا لگتا ہے ؟" اس نے مذاق میں پوچھا۔

"تم نہیں سوچتے ؟"

"سوچتا ہوں" اُس نے کہا "جب وہاں تھا تو کبھی خیال نہیں آتا تھا"

کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھے رہے۔

"کیا تم اکثر گھر آتی ہو"

نیتا نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"اب ویسے نہیں جیسے پہلے جب کیشی تھا تو اکثر آتی تھی"

کچھ دیر تک وہ کیشی کے بارے میں سوچتے رہے جو آرمی میں چلا گیا تھا اس کی کتابیں، اس کی تصاویر، اُس کے البم، اس کے پرنٹس۔ اب بھی اُوپر کے دراز میں پڑے تھے۔

اس نے تھوڑی سی کونیاک اور گلاس میں ڈال لی۔ ایک ہلکی گرماہٹ آہستہ آہستہ اپنے میں محسوس ہونے لگی تھی۔

"تم سے ایک بات کہنی تھی . . . میں آج اس لئے یہاں آئی تھی" کمرے کے سناٹے میں اُسے نیتا کی آواز بہت اجنبی سی لگی۔

وہ گلاس سے کھیل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ ٹھٹک گئے۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ بہت پہلے سے اس لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔

"تم رک نہیں سکتے ؟" نیتا کی آواز جذبات سے عاری سی ہو گئی تھی۔

"اس سے کیا ہوگا ؟"

"ماں اور بابو جی بہت اکیلے ہیں، جب کیشی تھا تو مجھے فکر نہیں تھا"

"اس سے کچھ بننے کا نہیں" اس نے کہا" میں چاہوں تو بھی گھر ایسا ہی رہے گا۔"

"تم چاہتے بھی نہیں"

پینے کے بعد اُسے ہر شے ہلکی سی لگ رہی تھی۔

"ہاں شاید میں چاہتا بھی نہیں" اُس نے کہا

کچھ دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"کیشی نے بتایا تھا، کیا یہ سچ ہے ؟" نیتا کی آواز خشک تھی۔

"کیا سچ ہے ؟" اس نے پوچھا

"تم وہاں اکیلے نہیں رہتے . . . "

وہ اُس کی طرف دیکھتا رہا

"ہاں ہم ایک ساتھ رہتے ہیں"

"تم نے اس سے شادی نہیں کی ؟"

"نہیں ہم صرف ایک ساتھ رہتے ہیں" اُس نے کہا

"تم نے اروناسے اس کے بارے میں کچھ کہا ہے ؟

"نہیں" اس نے کونیاک کا ایک لمبا گھونٹ بھر کر گلاس نیچے رکھ دیا "اس سے کوئی فائدہ نہیں"

کچھ دیر تک دونوں بھائی بہن خاموش بیٹھے رہے۔ اُن کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے دل میں عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ نیتا سے وہ سب کچھ کہہ دے جو ان برسوں میں گھر سے باہر بیتا تھا۔ لیکن وہ چُپ ہی رہا۔

'اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا' اس نے سوچا

"مجھے اب چلنا چاہئے۔" نیتا پلنگ سے اُٹھ کھڑی ہوئی پھر اُس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔

"یہ رنگ تم نے کیا ہے ؟"

"تمہیں کیسا لگا ؟" اُس نے ہنستے ہوئے پوچھا اور اُسی سانس میں

بولا "میں نے باہر بھی کیا ہے۔"

"کیشی آئے گا تو پہچان نہیں سکے گا" نیتا اب بھی حیرانی سے دیواروں کو دیکھ رہی تھی، وہ دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی کتابوں کی لمبی الماری کے شیلف کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ یہ شیلف بہت پہلے کیشی اور نیتا نے مل کر بنائی تھی ـــــ "تمہاری کتابیں بھی یہاں پڑی ہیں؟" اس نے نیتا سے پوچھا۔ اسے کبھی کبھی حیرانی ہوتی تھی کہ شادی کے بعد نیتا ایک بھی کتاب اپنے ساتھ نہیں لے گئی۔

نیتا بے دلی سے کتابوں کے ٹائٹل دیکھتی رہی، پھر اچانک ـــ اس نے اس کی طرف دیکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے ایک بہت پرانی یاد اس کے اندر بیدار ہوگئی ہے۔

"تم نے ویانا میں زوایگ کا گھر دیکھا؟" اس نے پوچھا۔

"زوایگ؟ نہیں۔ اتنا وقت کہاں تھا۔ اس نے کہا" اسے کبھی کتابوں اور مصنفوں سے دلچسپی نہیں رہی"

"نندی تمہیں عجیب سا نہیں لگتا۔" وہ شیلف سے منہ پھیر کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیسا عجیب سا؟"

اس رات ـــ اس رات ہم سب گھر میں ہیں۔۔ بہت عرصہ بعد۔۔۔ سوائے کیشی کے۔" اس کی آواز کچھ اس طرح بھرائی ہوئی تھی کہ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اسے اچانک ایسا لگا جیسے وہ دونوں زمین کے ایک ٹکڑے کے سامنے کھڑے ہیں۔ جو بالکل اجنبی اور انجانا سا ہے ـ اُن کے بیچ ـــ اُن بھائی بہن کے درمیان ـ ایک خاموش سمجھوتہ ہے کہ وہ اس پر نہیں چلیں گے۔ وہاں اُن کی بڑھتی ہوئی عمر تھی۔ اُسے ویسا ہی چھوڑ دیں گے۔ جیسا کہ وہ ہے۔ ـــــــــ وہاں وہ اکیلے تھے۔

پھر ستمبر کے دن آئے۔ آسمان کا رنگ دن بھر نیلا رہنے لگا۔ سڑکوں پر پتے جھڑتے رہتے۔ اگست کے دنوں میں وہ بہت چمکیلے اور روشن تھے۔ اب اُن کا رنگ سیاہ پڑنے لگا۔ ہوا میں ایک خشک کرارا پن آگیا۔ لیکن اب وہ بہت سفید اور اجلی تھی۔ جو شہر گرمی میں سکڑ سا گیا تھا اب وہ کھلا کھلا سا دکھائی دینے لگا۔

اُن دنوں وہ اکثر گھر پر ہی رہتا۔ ماں اس کے سامنے زیادہ نہیں آتی تھی۔ والد زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتے۔ وہ ایک بار نیتا کے گھر گیا تھا۔ کُوُو کا اسکول کھل گیا تھا اور وہ اس سے بہت کم وقت کے لئے مل پائی تھی لیکن جس دن وہ جائے گا۔ وہ ایرو ڈرام آئے گی، چاہے اُسے اکیلا ہی آنا پڑے۔ مگر ان دنوں اس کے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔

جب وہ گھر پر رہتا تو اُسے یہی ڈر لگا رہتا کہ کہیں بابو یہ نہ سمجھیں کہ اُس کا دل نہیں لگ رہا۔ اس لئے شام ہوتے ہی وہ کپڑے بدل لیتا تاکہ وہ یہ سمجھ لیں کہ اُسے اپنے دوستوں سے ملنے جانا ہے۔ سگریٹ خرید کر وہ کسی پاس والے رستوران میں جا بیٹھتا اور جب اُسے یقین ہوجاتا کہ وہ سیر کے لئے باہر چلے گئے ہوں گے، تو وہ اپنے کمرے میں لوٹ آتا۔

جانے سے ایک دن پہلے وہ 'سومنگ پول' گیا تھا۔ ہیپ نے اُسے شام کو آنے کے لئے کہا تھا مگر وہ اپنے کو روک نہیں سکا، اور بہت جلدی آگیا۔ وہ شروع ستمبر کا دن تھا۔ موسم میں بھیگا ہلکا پن تھا۔ دھوپ اُن دنوں بھی کافی گرم رہتی تھی لیکن اُس کے تیکھے کونے جھڑ گئے تھے۔

وہ دن بھر پول میں تیرتا رہا۔ جب وہ تھک جاتا تھا تو ہاتھ پاؤں چھوڑ کر دھوپ میں لیٹ رہتا۔ اب پانی کے نیچے وہ سیاہ بوجھل پن نہیں تھا جو اُسے جولائی کے مہینے میں محسوس ہوتا تھا۔ پانی کی جھینی تہہ اُس کے اُوپر کھسک آتی اور اس کے اُوپر سورج پگھلتی موم بتی کی طرح کانپتا رہتا۔

ایک بار اُس نے ہلکی سی سرسراہٹ سُنی تھی جو نہ پانی کی آواز تھی، نہ ہوا کی۔ اُسے جان پڑا جیسے کہیں بہت نیچے ـــ پانی کے اندھیرے میں ـــ کوئی کھٹ کھٹ کر رہا ہو، جیسے ہم کبھی جنگل میں درخت کاٹنے کی آواز سنتے ہیں جب وہ تالاب کے اُوپر آیا تو کہیں بھی کوئی آواز نہ تھی۔ سورج ڈوبنے لگا تھا اور سردی سے اس کے دانت کٹکٹانے لگے تھے۔ وہ کپڑے بدل کر کلب کے ٹیرس پر آگیا۔

ٹیرس کی کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ صرف ایک ـــ گوشے میں ہیپ بیٹھا تھا۔

"تم بھی عجیب آدمی ہو" ہیپ نے کہا۔

"کیا بہت دیر ہوگئی ہے؟" اس نے میز کے پاس کرسی کھسکالی۔

"کچھ پیوگے؟" ہیپ نے پوچھا

وہ آج پینے کے بارے میں زیادہ متمنی نہیں تھا۔ گھر میں پیکنگ کے لئے سب چیزیں بکھری پڑی تھیں۔

"کچھ پی لو، تمہارے ہونٹ نیلے پڑ گئے ہیں۔ جانے سے پہلے سردی سے مرنے سے کیا فائدہ" ہیپ نے کہا۔

اُس نے چائے میں رم ملا ہوا 'گراک' کا ایک گلاس منگوا لیا۔ ہیپ اپنی بیئر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اُسے کچھ یاد آیا اور وہ ہنسنے لگا۔

"آج مجھے 'پول' میں ایک عجیب و غریب آواز سنائی دی تھی"؛ اُس نے ہیپ سے کہا

"کیسی آواز؟" ہیپ نے پوچھا

"میں اب اُسے یاد نہیں کر سکتا" اُس نے ہنستے ہوئے کہا

"تم اب آوازیں بھی سننے لگے ہو؟"

لیکن اُس نے ہیپ کے مذاق کی جانب کوئی دھیان نہ دیا۔ اُسے اب بھی اپنی کنپٹیوں پر ایک دھیمی کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"کل کا پکا ہے؟" ہیپ نے پوچھا

"ہاں" اُس نے کہا "کل صبح"

ٹیرلیس پر اُن کے سوا کوئی نہیں تھا۔ نیچے کلب کی بار تھی اور اُس سے ملحق ڈانسنگ فلور تھا۔ کبھی کبھی باتوں کے کچھ حصے ہنسی کی آوازیں اُسے سنائی دے جاتی تھیں۔ ایک لمحہ تو اُسے یقین ہی نہیں آیا کہ کل اس وقت وہ یہاں نہیں ہوگا۔

نیچے ڈانسنگ فلور سے 'کوارٹرے' کی ابتدائی دھار، اوپر اٹھی تھی، اتنی اونچی اور صبح خراش کہ میز پر رکھے اُن کے گلاس ہلکے سے جھنجھنا اٹھے۔ اُس زمانے میں بھی وہ یہاں کوارٹرے ناچتے ہوں گے، اُس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔

"گراک' پینے کے بعد اُسے اپنے خون میں ایک شیریں سیال سا رینگتا محسوس ہوا۔

"تم ارونا سے ملے تھے؟" ہیپ نے پوچھا

"نہیں وہاں جانا نہیں ہو سکا" اس نے کہا۔

"ہیپ نے بیئر کے گلاس سے اس کی طرف دیکھا "پہلے تو تم اکثر اس کے گھر جاتے تھے۔"

اُس نے ہیپ کی طرف دیکھا اور چُپ رہا۔ تین سال پہلے.... اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اُسے تھوڑی سی حیرانی ہوئی کہ اُسے ان دنوں کے بارے میں پچھتاوا نہیں ہے۔ اُسے خوشی ہوئی کہ وہ ارونا سے نہیں ملا۔ ہم اس سے نہیں مل سکے جس سے کبھی بہت پیار کرتے تھے اور اب نہیں کرتے۔ مگر وہ یہ بات ہیپ سے نہیں کہنا چاہتا تھا۔ اُسے سچ مچ دُکھ ہوگا۔

اُسے پہلی بار ہیپ کے ساتھ کچھ اکیلا پن محسوس ہوا۔ اگر کچھ اور دوست اُن کے ساتھ ہوتے تو شاید اچھا ہوتا۔ تب اپنے کو اتنا غیر محفوظ چھوڑ دینے کا امکان نہ ہوتا۔

"سنا ہے گزشتہ برس تم ہائی کنگ کے لئے گئے تھے؟ اُس نے ہیپ سے پوچھا۔

"ہاں پچھلی گرمیوں میں" ہیپ نے کچھ گرم جوشی سے کہا۔ "ہائی کنگ' ہمیشہ سے ہیپ کے لئے ایک فیشن رہا ہے۔ وہ آج تک اس عجیب پاگل پن کو نہیں سمجھ سکا۔

"ہم درہ روہتانگ تک گئے تھے" ہیپ نے بیئر کا گلاس سامنے سے ہٹا دیا۔ "کیسی ساتھ تھا اس سال اگر تم رہ جاتے تو ایک ساتھ پروگرام بنا سکتے تھے۔" ہیپ نے کہا۔

کچھ لڑکے لڑکیوں کے جوڑے ٹیرلیس پر آ گئے تھے۔ وہ اونچی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ وہ شاید ڈانسنگ روم سے آئے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں کوکا کولا کی بوتلیں تھیں۔ اور وہ کرسیاں کھسکا کر دوسرے کونے میں بیٹھ گئے تھے۔

رقص ختم ہو گیا تھا نیچے بار میں خاموشی تھی۔ دُور اندھیرے لان میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" ہیپ نے پوچھا

"کچھ نہیں" اُس نے ہنس کر کہا

"سنو" ہیپ بھی ہنسنے لگا "میں سوچتا تھا تم ارونا سے شادی کر لو گے۔ ہم سب یہی سوچتے تھے۔" اُس نے ہیپ کی طرف دیکھا۔ اس نے شاید بہت پی لی تھی۔ وہ شاید شام سے پی رہا ہے۔ اُس نے سوچا

ٹیرلیس کے پرے دہلی کا آسمان ہے۔ وسیع اور خاموش۔ کہیں کسی

کونے سے سرچ لائٹ کی روشنی اُوپر اٹھتی تھی اور سمبر کے مٹیالے اندھیرے کو کاٹتی ہوئی غائب ہو جاتی تھی۔ برسوں سے یہ اُس کا اپنا شہر رہا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے اُسے یقین نہیں ہو سکا۔ آس پاس کے مکانوں سے دُھواں اُڑ کر ہوا میں ٹھہر گیا تھا۔ دُور سے دیکھنے پر لگتا تھا۔ جیسے سارا شہر ایک ہلکی نیلی دُھند سے گھر گیا ہو۔

اور تب اُس نے سوچا۔ میں چاہوں تو رک سکتا ہوں کم از کم اس عمر میں ہر شخص تھوڑی بہت فکر کرنے لگتا ہے۔ وہ یہ جان لیتا ہے کہ یہ اُس کی زمین ہے۔ وہ یہاں کھڑا ہے۔ اُس نے کبھی آج تک اس کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ کیشی اُسے جانتا تھا، اور وہ آرمی میں چلا گیا تھا لیکن اُس کے لئے یہ ممکن نہ تھا۔

نیچے بار سے بلیو ڈینوب کی بہت پرانی طرز ٹیریس پر چلی آئی۔ بریس پر بیٹھے لڑکے لڑکیاں سیڑھیاں اُتر کر ڈانسنگ رُوم میں چلے گئے۔

"تم نے تو دیکھا ہوگا ؟" ہیپ نے پوچھا

"کیا ؟"

"ڈینوب کو۔ کیا اُس کا رنگ سچ مچ نیلا ہے ؟"

وہ ہنسنے لگا۔ اُسے دیانا کے وہ دِن یاد آ گئے جنہیں وہ بہت پہلے فراموش کر چکا تھا۔

نیلا ایک بہت اُداس رنگ ہے۔ اُس نے سوچا۔ بلیو پیریڈ۔۔۔ گرو بلیوز۔۔۔۔ وہ ایک رنگ ہے جو تم بناتے ہو۔ جو ہوتا کچھ بھی نہیں ہے۔

"وہاں بہت مزا رہتا ہوگا۔" ہیپ نے بیئر پیتے ہوئے پوچھا

"ہاں بہت زیادہ" اُس نے جواب دیا "تمہیں وہاں کبھی آنا چاہئے میرے اپارٹمنٹ میں دو صوفے ہیں۔ میں نے اُنہیں تمہارے اور کیشی کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔" اس نے کہا۔ گراک پینے کے بعد اُسے گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ اُسے خواہش ہوئی کہ وہ دوبارہ تالاب میں چلا جائے لیکن وہ بیٹھا رہا۔ اُس نے ہیپ کو رنگ سٹراسے کے بارے میں بتایا۔ اُن کی بیئر پبز کے بارے میں بھی بتایا۔ جو اتنی بڑی تھی کہ اُس میں پانچ سو افراد ایک ساتھ بیٹھ سکتے ہیں اور پھر وہاں شاٹ پارک بھی تھا۔ سب سے بڑا پارک۔ وہ اتوار کے دِن وہاں جاتا تھا۔ ان دنوں وہاں دِن رات پتنگ بھڑتے رہتے ہیں۔ شام کے وقت آرکسٹرا بھی بجتا ہے اور تم اپنی فرمائش بھی بھیج سکتے ہو۔۔۔۔ تم جو کچھ سننا چاہو فرمائش بھیج کر سُن سکتے ہو اور تمہارا پنیر بجانے کے بعد کنڈکٹر تمہاری جانب جُھک کر سلام کرتا ہے۔"

وہ رُک گیا۔ بیئر کے گلاس کے سامنے ہیپ کی آنکھیں مندھنے لگی تھیں ——

"ہمیں چلنا چاہئے۔" اُس نے کہا

نیچے بار بند ہو چکا تھا۔ ٹیریس پر وہ اکیلے رہ گئے تھے۔

"تم چاہو تو کچھ دیر کے لئے میرے کمرے میں چل سکتے ہو۔۔۔ میرے پاس کچھ پورٹ ہے۔" ہیپ نے جماہی لیتے ہوئے کہا

"میں اب گھر چلوں گا۔ میں نے ابھی کچھ بھی پیک نہیں کیا ہے۔"

وہ باہر آ گئے۔ سمبر کی رات چاروں اطراف پھیلی تھی۔ آسمان پر اب بھی بادل نہیں تھے۔ صرف تارے تھے جو پالش کئے مُنوں کی مانند چمک رہے تھے۔

ٹیکسی لینے سے پہلے وہ چُپ چاپ فٹ پاتھ پر کھڑے رہے۔

"صبح کتنے بجے آؤ گے۔ ؟"

"بہت جلدی۔۔۔۔ تم بستر پر ہی ہو گے" اُس نے کہا

"میں کوشش کروں گا" ہیپ نے ٹیکسی میں بیٹھ کر کہا اور اپنا سر سیٹ کی گدی پر ٹکا دیا۔ وہ سو رہا تھا۔

وہ اُس رات کافی رات گئے گھر پہونچا تھا۔ ماں دروازے کی کنڈی کھولنے آئی تھی۔ وہ راستہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑی رہی۔ اُسے ڈر تھا اُس کے پاؤں سیدھے نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ بہت لاپروائی سے سیٹی بجاتا ہوا زینہ طے کرنے لگا۔

وہ پہلے غسلخانے میں گیا۔ دیر تک ہاتھ منہ دھونے کے بعد بھی اُسے محسوس ہوتا رہا جیسے گراک کی بُو اُس سے چپکی ہوئی ہے۔ ماں بھانپ جائے گی آج اُسے نہیں پینا چاہئے تھا۔ اس نے سوچا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا سر چکرا رہا ہو۔ اُسے خوشی ہوئی کہ سونے تک اس کا سر اسی طرح چکراتا رہے گا۔

وہ اپنے کمرے میں آیا۔ ماں نے اُس کی چیزیں الگ الگ کونوں سے بٹور کر سوٹ کیس کے پاس رکھ دی تھیں اس کے موزوں اور رُومال کو دھو کر الگ رکھ دیا تھا۔ پیکنگ کے لئے اس کے پاس زیادہ چیزیں نہیں تھیں۔ کچھ دن پیشتر وہ ضروریات کی چند اشیا، خرید لایا تھا۔ سردیوں کے لئے ایک اُونی

سفر، دستانے، جوتوں کا ایک جوڑا، دو جاسوسی ناول جو وہ ہمیشہ سفر میں وقت کاٹنے کے لئے خرید لیتا تھا۔ اُسے کیشی اور نیتا کی کتابوں سے کبھی دلچسپی نہیں تھی۔ ان تعطیلات میں اس نے کئی بار انہیں پڑھنے کی کوشش کی لیکن ہر بار وہ اُوب سا گیا۔

کچھ دیر بعد ماں کمرے میں آئی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا لیبل تھا۔ دانتوں کو سیاہی میں بھگو کر بڑے بڑے حروف میں اس کا نام لکھا تھا۔ نام کے نیچے اُن دونوں شہروں کے نام لکھے تھے۔ جہاں سے وہ جا رہا ہے اور جہاں وہ اُترے گا۔

"اسے بابوجی نے دیا ہے" ماں نے کہا "اُسے اپنے سوٹ کیس پر چپکا لینا۔ گم نہیں ہوگا۔"

"اس کی ضرورت نہیں تھی" اس نے کہا

"ٹکٹ رکھ لیا؟" ماں نے پوچھا

ہاں، وہ میری جیب میں ہے" اُس نے کہا

ایک بٹوا خرید لینا تجھے ہر چیز جیب میں رکھنے کی عادت ہے" ماں نے کہا۔

وہ سوٹ کیس میں اپنی چیزیں رکھنے لگا۔ کونیاک کی بوتل وہ باہر پھینک دینا چاہتا تھا لیکن ماں کے سامنے وہ اُسے باہر نہ نکال سکا۔ اُس نے اُسے سوٹ کیس میں ہی رہنے دیا

"نیتا اور بولو کو کہہ دیا تھا؟" ماں نے پوچھا

"انہیں معلوم ہے" اس نے کہا

کھانا کھاتے وقت بھی ماں سامنے بیٹھی رہی۔ اُسے بھوک نہیں تھی مگر اُس رات وہ جلدی اُٹھ نہیں سکا تھا۔

"کیا ایک دن کے لئے کیشی کے پاس نہیں رک سکو گے؟" ماں نے پوچھا

"دیکھو . . . کوشش کروں گا" اس نے کہا۔ اُسے معلوم ہے یہ ناممکن ہے لیکن یہ بات اُسے ماں سے کہنا بے کار جان پڑا۔

کچھ دیر کمرے میں سناٹا رہا۔ اُسے ماں کی خاموشی کچھ عجیب سی جان پڑی۔ سر اُٹھا کر دیکھا۔ وہ دیوار کی طرف منہ موڑ کر بیٹھی تھی۔ خاموش اور اداس۔ پہلی بار اُس نے ماں کو ذرا دھیان سے دیکھا۔ دیکھتا تو وہ شروع سے آیا ہے۔ لیکن پہلی بار اُسے محسوس ہوا جیسے وہ پہلے سے زیادہ دُبلی پتلی، پژمردہ دکھائی دے رہی ہے۔ وہ سکڑ کر بیٹھی تھی جیسے اُسے اپنی عریانی پر جھجک ہو۔ برسوں پہلے جو چیز اُس میں تھی اب وہ اتنی پیچھے اور دُور سرک گئی تھی کہ اُسے دیکھ پانا بھی ناممکن تھا۔

اچانک وہ چونک پڑا۔ ماں نے کچھ کہا تھا اور اُس کی آواز بہت دھیمی سی ہو گئی تھی۔

"ایک بات کہنی تھی . . . تمہیں بُرا تو نہیں لگے گا" اُس نے ماں کی طرف دیکھا

"کبھی کبھی ارونا کو چٹھی لکھ دیا کرو۔ وہ تمہاری اور کیشی کی بہت عزت کرتی ہے۔"

اس نے کچھ نہیں کہا، انجانے میں ایک دبا دبا سا غصہ اُس کے اندر اُمنڈ آیا۔ دیر تک اُسے پتہ نہیں چل سکا کہ وہ غصہ کس پر ہے۔ لیکن وہ غصہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ اُسے اطمینان ہوا کہ ماں ابھی تک کچھ نہیں جانتی۔

وہ اُوپر آ گیا۔ کل کی چاندنی آج بھی چھت پر بکھری پڑی تھی۔ پھیکی، اور سفید اور بجھی بجھی سی۔ ہوا چلنے سے نیم کے درخت کا سایہ اُوپر ڈول جاتا تھا۔

کیشی کے لئے وہ جو پرانے پرنٹس اور ریکارڈ دیانا سے لایا تھا۔ انہیں پوٹلی میں باندھ کر اُس نے کونے میں رکھ دیا۔ وہ شاید کرسمس میں آئے گا۔ اس نے سوچا۔

دیوار پر جواں گری کی نیل لائف اب بھی ٹنگی رہی تھی۔ . . . پتہ نہیں، کیشی اُسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گیا۔ کمرے میں کیشی اور نیتا کی چیزیں کچھ اس طرح رکھی تھیں۔ جیسے وہ کچھ دیر کے لئے باہر گئے ہوں۔ وہ انہیں چھوتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ اُس نے انہیں ویسا ہی چھوڑ دیا تھا جیسے اُس نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔

اُس نے بتی بجھا دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ وہ اُن گرمیوں کے بارے میں سوچنے لگا جو اُس نے گھر پر بسر کی تھیں۔ مگر وہ اُن کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں کر سکا۔ اس کا دھیان بار بار چھوٹی چھوٹی اور غیر اہم چیزوں کی طرف چلا جاتا تھا جب کبھی اُسے نیند نہیں آتی تھی، وہ ایک ایک کر کے اُن مکانوں کو یاد کرنے لگتا جہاں وہ بہت پہلے رہتے رہے تھے جب مکان ختم ہو جاتے تو وہ یورپ کے اُن شہروں کو گننے لگتا جہاں وہ گیا

تھا۔ گزشتہ گرمیوں میں اور اس سے گزشتہ گرمیوں میں۔

اچانک اسے محسوس ہوا جیسے اُس نے کمرے میں ایک دھیمی سی سرسراہٹ سُنی ہو۔ وہ شاید سو رہا ہوگا۔ اُس نے سوچا۔ مگر وہ پوری طرح طے نہ کر سکا۔ وہ بستر پر پڑا رہا گیا۔ ایک طویل لمحے تک وہ اندھیرے میں پلک جھپکائے بغیر گھورتا رہا۔ اُسے ایسا لگا جیسے ایک سفید سا سایہ اس کے سامنے ہلا ہو۔

"بابو . . . . کیا تم ہو؟"

"ذرا بتی کو جلاؤ یہاں کچھ دکھائی نہیں پڑتا، اندھیرے میں اُسے بابو جی کی آواز سُنائی دی۔

وہ کچھ بُری طرح گھبرا گیا تھا کہ کتنی ہی دیر تک اُسے سوچ نہیں مل سکا۔ جب کمرے میں روشنی ہوئی تو بھی ایک لمحے تک اُسے محسوس ہوتا رہا جیسے یہ اس کا وہم ہے وہ آنکھیں کھولے گا تو کمرے میں کوئی نہیں ہوگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کی آنکھیں بابو جی پر ٹک گئیں۔

"آپ . . . . آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔؟" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز میں غصہ بھر آیا تھا۔

"میں سمجھا تھا تم ابھی جاگ رہے ہو۔" انہوں نے کہا۔ ایک کھسیاہٹ اس کے چہرے پر سمٹ آئی تھی۔ مگر اُسے یقین نہیں آیا۔ اُسے لگا جیسے اس کے جاگنے سے بہت پہلے ہی وہ وہاں اندھیرے میں کھڑے رہے تھے۔ اُسے خیال آیا تھا۔ وہ اب بھی کھڑے ہیں۔

"آپ بیٹھ تو جائیے" اس نے پلنگ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اُس کی آواز میں اب بھی جھلاہٹ تھی۔

"نہیں نہیں تم بیٹھے رہو میں تمہیں صرف یہ دکھانے آیا ہوں۔ ذرا دیکھو۔ . . . . یہ کیسا رہے گا؟"

اُس کا دھیان ایکا ایک بابو جی کے پیچھے چھپی کرسی پر پڑ گیا۔ کرسی کے ہتھے پر ایک پُرانا اوور کوٹ رکھا تھا۔ اُسے سمجھ نہ آیا کہ وہ اسے یہاں کیوں لے آئے ہیں۔

"ذرا پہن کر دیکھو۔ اگر ٹھیک لگے تو اپنے ساتھ وہاں لے جاؤ میرے پاس تو بیکار پڑا ہے۔" انہوں نے کہا

"میرے پاس ایک کوٹ پہلے سے پڑا ہے، میں نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا۔"

"ایک ہے تو دوسرا رکھنے میں بُرائی نہیں ہے تمہیں تین چار سال ابھی وہاں اور رہنا ہے . . . . آج کل ایسے اوور کوٹ نہیں ملتے۔ اس سے برساتی کا کام بھی نکل جائے گا" انہوں نے کہا۔

"سوٹ کیس میں جگہ کہاں نکلے گی؟" اس نے کہا لیکن اُسے خود اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

"اپنے ہاتھ میں لے جانا۔" بابو جی نے کہا "آج کل پلین میں لوگ اپنے ہاتھوں میں نہ جانے کتنی چیزیں لے جاتے ہیں۔"

وہ چُپ رہا۔ جھنجھلاہٹ کی جگہ اب صرف خالی پن تھا۔

"ذرا پہن کر تو دیکھو . . . . "

"نہیں یونہی ٹھیک ہے۔ میں لے جاؤں گا۔"

بابو جی کچھ دیر تک سٹپٹائے سے چاروں طرف دیکھتے رہے . . . اس درمیان انہوں نے ایک بار بھی اوور کوٹ کی طرف نہیں دیکھا۔ جیسے کوئی آدمی اس جگہ کو دوبارہ دیکھنے سے گھبراتا ہے جہاں اُس نے کوئی جرم کیا ہو۔"

وہ زیادہ دیر تک اس کے کمرے میں نہیں رہے۔ بعد میں اُسے تھوڑا افسوس بھی ہوا۔ اگر وہ اُن کے سامنے ہی تھوڑی دیر کے لئے اوور کوٹ پہن لیتا تو شاید انہیں کافی خوشی ہوتی مگر اُس نے اس کے بارے میں زیادہ دیر نہیں سوچا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔

دیر تک وہ بتی بجھانے کی ہمت نہ کر سکا۔ اس کا دل اب بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اُسے خیال آیا کہ اگر وہ نہ جاگتا تو بابو جی اوور کوٹ کرسی پر چھوڑ، چُپ چاپ باہر چلے جاتے۔ آج بھی بابو جی کو کوئی چیز آنے سامنے دینے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ جب وہ چھوٹا تھا تو وہ اُس کے جیب خرچ کے روپے میز پر رکھ جاتے تھے۔ ہاتھ میں کبھی نہیں دے پاتے تھے۔

اُس نے کروٹ بدلی۔ دیر تک وہ گھر کی آوازیں سنتا رہا۔ ماں زینے کی کنڈی لگانے کے لئے نیچے اُتری تھی۔

کہیں ایک چھت سے ریڈیو کی آواز ہوا میں تیرتی ہوئی چھت پر آکر ٹھہر جاتی تھی۔ کبھی بابو جی کے کمرے سے کھانسنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

کچھ دیر بعد سب کچھ خاموش ہو گیا۔ اُس نے بتی بجھا دی۔ دروازہ کھلا تھا باہر کی چاندنی دھیرے دھیرے پھیلتی ہوئی ڈیوڑھی کے اندر سرک آئی تھی۔

(بقیہ صفحہ پر)

دہلی میں
لُطف اندوزی
کی چوٹی پر
ایئر کنڈیشنڈ

# کافی ہاؤس

سُپر بازار، کناٹ سرکس
نئی دہلی ۱

میں کافی کا
چُسکی در چُسکی
مزہ اُٹھائیے

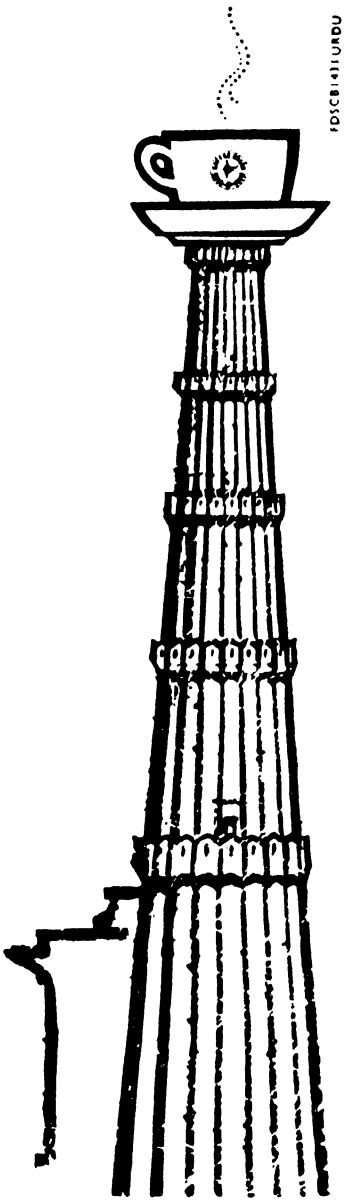



COFFEE BOARD

کافی بورڈ، بنگلور

ہر جگہ، ہر موقعہ ــ کافی میں اطمینان نہاں ہے!

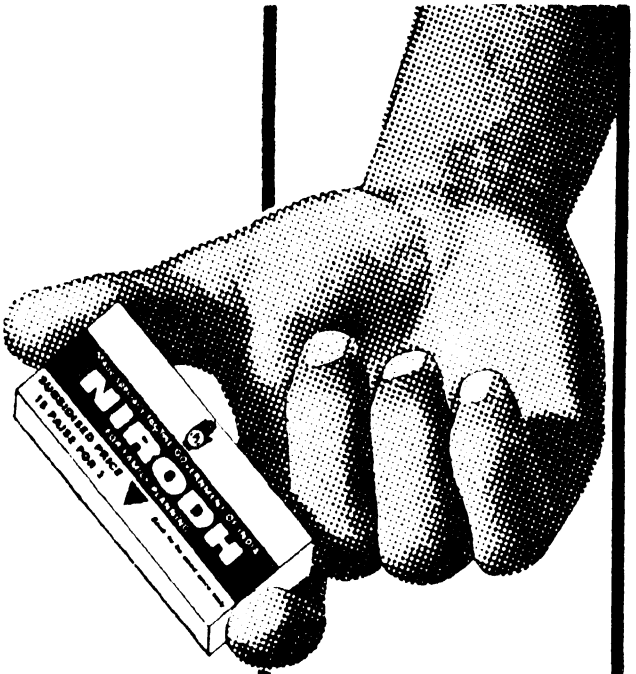


## بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

فی زمانہ بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نِرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچے تبھی ہوگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔

## بچہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نِرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچے کی پیدائش ملتوی کر سکتے ہیں۔

نِرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اِسے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان، و محفوظ طریقہ ہے۔ اِس کے استعمال سے صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔

نِرودھ ہر جگہ ملتا ہے:۔
پرویژن اسٹور، کرانہ فروش، کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔

## نِرودھ استعمال کیجئے

فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
15 پیسے کے 3

سے کارِ امداد سے کم دام

صرف 5 پیسے خرچ کرکے آپ اپنے کنبے کو محدود رکھنے کی طاقت حاصل کر سکتے ہیں

70/61

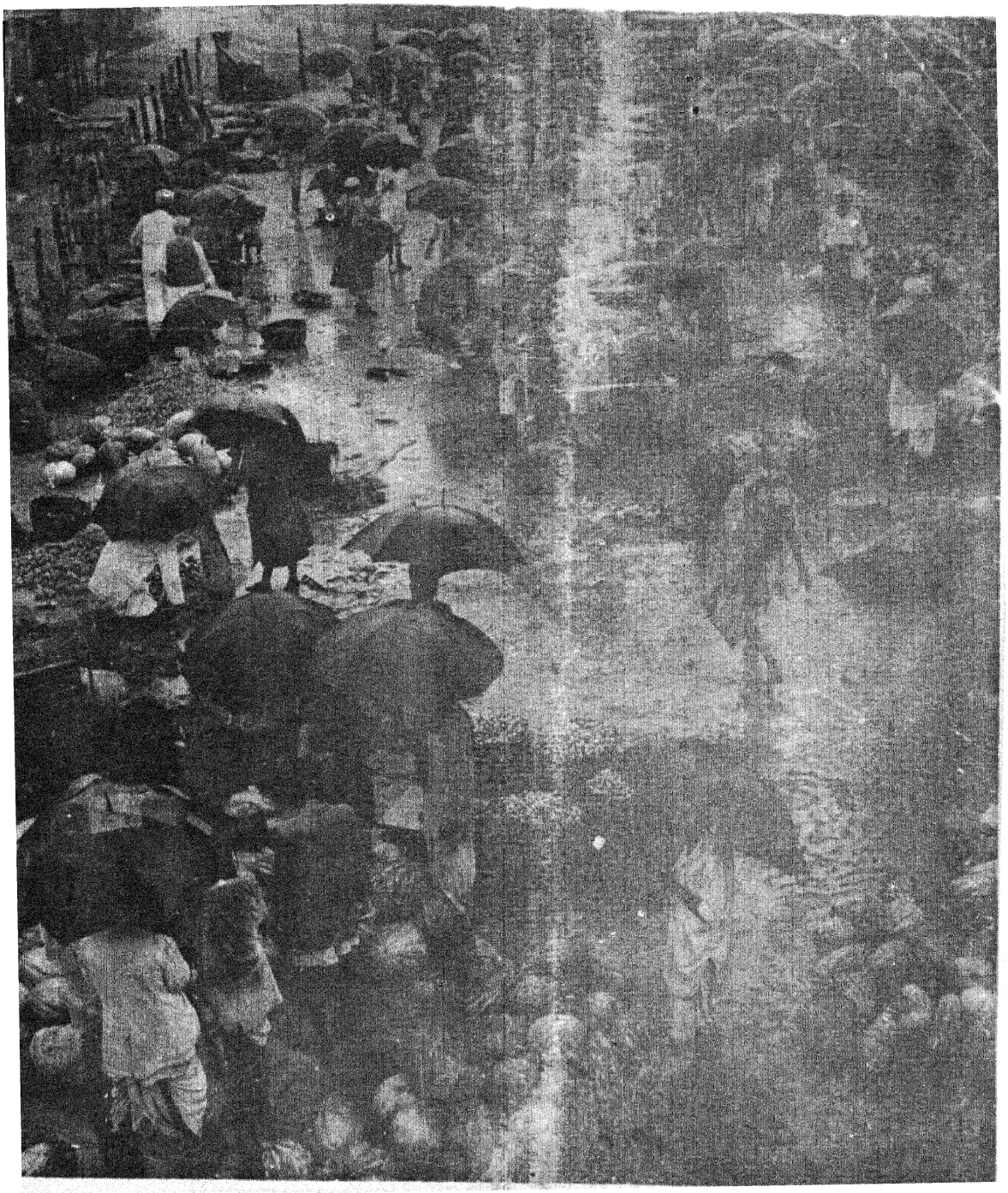

Vol. 29 No. 1 AJKAL (Monthly) August 1970

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55

# آہنگ

ستمبر ۱۹۷۰ء ۶۰ پیسے

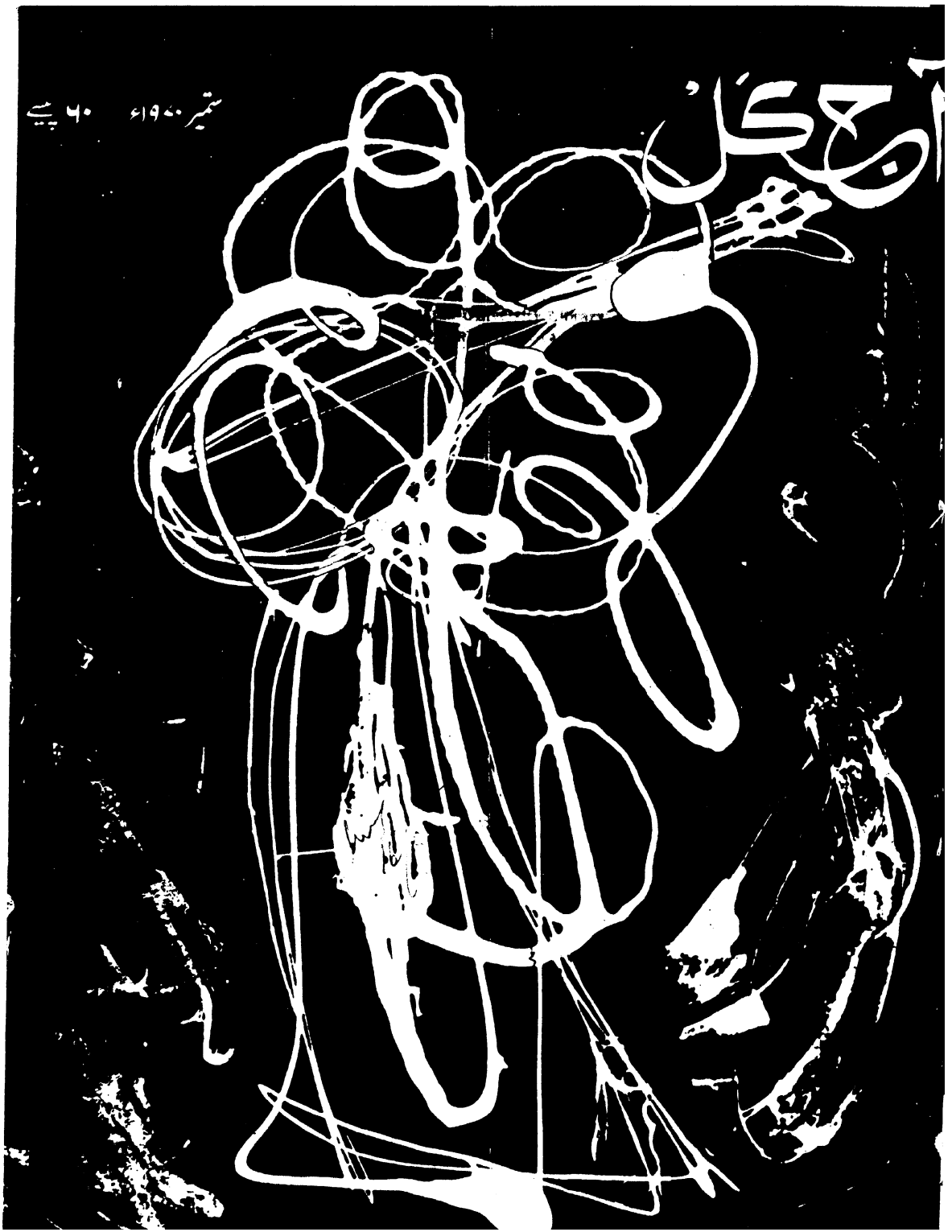

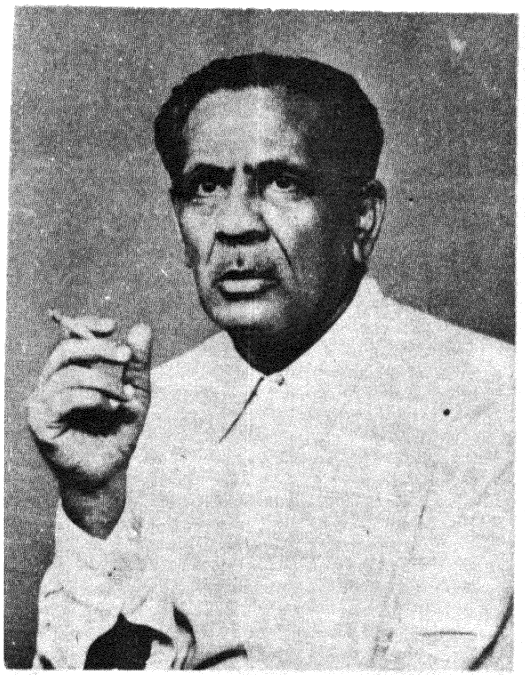

بھارتیہ گیان پیٹھ کا پانچواں ایوارڈ اُردو کے ممتاز شاعر جناب فراق گورکھپوری کو اُن کے شعری مجموعے "گلِ نغمہ" پر دیا گیا ہے۔ گلِ نغمہ کی اشاعت ۱۹۵۹ میں ہوئی تھی۔ اس کتاب پر فراق صاحب کو ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی اور اتر پردیش سرکار کی ہندی سمتی کا انعام بھی مل چکا ہے۔ بھارتیہ گیان پیٹھ نے اس تصنیف کو ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۲ کے درمیان شائع ہونے والی بہترین تخلیق قرار دیا ہے۔ ایک لاکھ روپے پر مشتمل یہ گراں قدر انعام ملک کا سب سے بڑا ادبی انعام سمجھا جاتا ہے اور ہر سال ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں کے کسی ادیب کو اس کی اعلیٰ تخلیق پر عطا کیا جاتا ہے۔ اس سے پیشتر یہ انعام شری شنکر کروپ شری تاراشنکر بنرجی، ڈاکٹر کے وی پٹاپا و ڈاکٹر اما شنکر جوشی (مشترکہ) اور شری سمترا نندن پنت کو دیا جا چکا ہے۔

"گلِ نغمہ" کے علاوہ فراق صاحب کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں انداز ے، اور اُردو کی عشقیہ شاعری کے علاوہ اُن کے شعری مجموعے شعلۂ ساز روپ، شبستان، غزلستان، چراغاں اور پہارستان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ادارہ اس اعزاز پر فراق صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

اردو کا مقبول عوامی ماہنامہ

# آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر

شہباز حسین

سب ایڈیٹر

نند کشور وکرم

جلد ۲۹ ـــــ شمارہ ۲

ستمبر ۱۹۶۹ء

بھادر آشون شک سمہ ۱۸۹۳

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

شہباز حسین ایڈیٹر آجکل پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

سرورق : مدن موہن ملک

سالانہ چندہ ہندوستان میں، سات روپے : پاکستان میں، سات روپے (پاک)
دیگر ممالک میں : ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر
قیمت فی پرچہ ہندوستان میں : ۶۰ پیسے : پاکستان میں : ۷۰ پیسے (پاک)
دیگر ممالک سے : ۱ شلنگ یا ۱۵ سنٹ

مطابع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

## ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| غبارِ کارواں (۷) | اعجاز حسین | ۲ |
| غزلیں | جوشش ملسیانی<br>سکندر علی وجد | ۹ |
| ساگا (کہانی) | رفعت مرزا | ۱۰ |
| فن اور اخلاقیات | بدری پرشاد شنگلو | ۱۶ |
| ستاری نظمیں | باقر مہدی | ۲۰ |
| تاج محل | سعادت نیّر | ۲۰ |
| گزرے ہوئے بالوں کی بات | یوسف ناظم | ۲۱ |
| غزل | محمود خیالی | ۲۲ |
| بیان میرٹھی | مدثر حسین | ۲۳ |
| غزلیں | شاہین غازی پوری<br>عبدالحمید حمید عظیم آبادی | ۲۵ |
| غزلیں | شباب للت۔ شاہد کبیر<br>مہیش پٹیالوی | ۲۶ |
| ہندی پر اردو کا اثر | نریش | ۲۷ |
| پتا (کہانی) | سلام بن رزاق | ۳۱ |
| آہٹیں (نظم) | رؤف خلش | ۳۴ |
| تین مختصر نظمیں (نظم) | پریم وار برٹنی | ۳۴ |
| نئی لڑکی (نظم) | کلیم تسنیم | ۳۴ |
| دنیا کی مشہور پیش گوئیاں (۲) | سیوک شرما | ۳۵ |
| غزلیں | قادر محی الدین ماہر۔ علیم مسرور<br>شمس فریدی۔ اکمل جالندھری | ۴۰ |
| کشمیر کے نابینا شاعر واسدیو رہبر | رگھوناتھ کستور | ۴۱ |
| ایک لمبی لکیر (کہانی) | اچلا شرما | ۴۲ |
| نئی کتابیں | | ۴۵ |

اعجاز حسین

# غبارِ کارواں

(۷)



شخصیت کی تعمیر و تنظیم کے جائزہ لینے میں سب سے پہلے نفسیات کی ان منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے جو خیالات واقعات، جذبات و رجحانات کی تہوں میں نظروں سے اوجھل ہیں۔ مطالعہ و مشاہدہ کی روشنی میں ان کو بیان کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا سمندر کی تہ میں مخلوقات کا جھانکنا۔ یہ دقت اس حالت میں اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ذہنی ارتقاء کی ابتدا اور انتہا کا فاصلہ اتنا ہو جائے کہ حافظہ و ادراک بھی تھکے ماندے مسافر کی طرح تخیل کی تیز رفتاری میں ساتھ نہ دے سکیں۔ چنانچہ آج اپنے متعلق اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے مجھے بڑی اُلجھن ہو رہی ہے۔ میرے ذہنی نشوونما کی بنیاد و بلندی میں ساٹھ ستر سال کا فاصلہ ہے۔ مڑ کے پیچھے دیکھنا اور عمر رفتہ کو آواز دینا تو ممکن ہے، مگر جذبات، خیالات، واردات و تاثرات کی گرمی اور وقتی ہاہی کا احیاء ممکن نہیں۔ بایں ہمہ اس موضوع پر قلم اٹھاتے وقت دقتوں کے باوجود مجھے یہ اطمینان ہے کہ بفضلہ ۷۰ سال کی عمر میں ذہنی بینائی بھی میرا پورا ساتھ دے رہی ہے اور یادداشت بھی وفاداری سے تخیل کے ہمرکاب ہے۔ اس لئے امید ہے کہ اپنے ذہنی ارتقاء و تاثرات و ادبی پسندیدگی احتیاط کے ساتھ قلم بند کرسکوں گا۔ صرف اس کی کوشش کرنا پڑیگی کہ جذبات، حالات بیان کرنے میں حقیقت پسندی و راست گوئی بھی اشہبِ قلم کے ہمرکاب رہے۔

ذہن و شخصیت کے ارتقاء کی ابتداء میرے نزدیک اس وقت سے ہوتی ہے جب بچہ پیدا ہوتا ہے اس لئے ذہنی نشوونما کا سنگ بنیاد ولادت کی سرزمین ہی میں تلاش کرنا اچھا ہے۔ مگر چونکہ یہ وقت نہ خود نوشت حالات لکھنے والے کے سامنے ہوتا ہے، نہ وہ کسی طرح سوچ کر حافظے میں لا سکتا ہے، اس لئے چار و ناچار اِس مقام سے خاموش گزر جانا پڑتا ہے، البتہ بچپن کا زمانہ کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے میں بھی اپنی زندگی کے اس ماحول کا ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اپنی ابتدائی زندگی اور بچپن کی فضا کا بیان جن الفاظ میں مَیں نے اپنی ایک کتاب[1] کے آغاز میں لکھا ہے اسی کو یہاں بھی دہرا رہا ہوں۔

"ماہ و سال کے محور پر گردش کرتے کرتے ۱۹ویں صدی تھک چکی تھی۔ اپنے انقلابات و انکشافات و محاربات سے دنیا کی تاریخ بدل کر اب جا رہی تھی مگر اس پیرزال کا دفتر نظم و نسق ہنوز سرگرم تھا۔ اس کے جاتے جاتے بھی تعمیر و تخریب میں اضافے ہو رہے تھے۔ سیکڑوں قدریں اُبھرتی تھیں، سیکڑوں ڈوبتی تھیں، ہزاروں انسان مرتے تھے اور ہزاروں روزانہ پیدا

[1] میری دنیا ص۹

ہوتے تھے۔ اس کی رحلت اور نئی صدی کی ولادت میں دو ہی ایک سال کا وقفہ تھا کہ میرے وجود کو عدم سے ہستی میں آنے کا حکم ہوا۔ ہزاروں لاکھوں بچوں کی طرح اس جاتی ہوئی صدی نے آخری دور میں مجھے بھی جنم دیا۔ اس کی یہ حرکت خدا جانے تعمیر سے متعلق تھی یا تخریب سے بہر حال اس نے اپنا کام کیا اور میں نے نئی دنیا کو سلام کیا۔"

میں جس خاندان میں پیدا ہوا وہ متوسط الحال گھرانے کا نمونہ تھا۔ زمینداری کے علاوہ، ملازمت وغیرہ کا بھی سلسلہ تھا۔ لوگوں پر عہد ماضی کی روایتوں کا غلبہ تھا۔ انگریزی زبان و ادب کے بجائے فارسی، عربی، شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ میرے نانا سید حسین فوق بہ یک واسطہ خواجہ آتش کے شاگرد تھے۔ خاندان میں سب سے زیادہ صاحب علم و وقار سمجھے جاتے تھے۔ ان ہی کی وجہ سے میری والدہ اور ان کی بہنیں بھی شعر و شاعری سے دلچسپی لیتی تھیں۔ حالاں کہ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھیں مگر اپنے باپ سے ذہنی طور پر اتنی متاثر تھیں کہ مناجات، مراثی، مثنوی گلزار نسیم وغیرہ کے ہزاروں اشعار حفظ تھے۔ اس فضا میں میری ابتدائی تعلیم شروع ہوئی۔ تعلیم سے زیادہ تربیت کا مجھ پر اثر پڑتا رہا۔ اس زمانے کے لحاظ سے گلستان بوستان کے علاوہ مشہور فارسی شعراء کے کلام تک نظر گئی۔ شعر و شاعری کے چرچے اور نشست و برخاست کے آداب بلکہ پورے ماحول و تمدن کے اثرات شعوری و غیر شعوری طور پر میرے ذہن کو متاثر کرتے رہے۔ جیسے جیسے سن و شعور میں بالیدگی آتی گئی شعر و شاعری کی لذت میری روحانی مسرت بنتی گئی۔ حصول علم کی فکر روز بروز تیز ہوتی گئی۔

یہ نہ تھا کہ میرا خاندان، زہد و تقویٰ، علم و مذہب کا ایسا پرستار ہو جیسے کسی مولوی یا مذہب پرست کا ہوتا ہے۔ میرے نانا رنگین مزاج تھے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ طوائف و موسیقی سے بھی ان کو گہری دلچسپی تھی۔ ان کا دائرہ احباب بھی بہت وسیع تھا۔ ہر تماش کے لوگ ان کی بزم میں شریک رہتے۔ اس ماحول سے بہت قریبی تعلق اس فضا کا تھا جو گھر کے باہر تھا۔ جہاں میں پیدا ہوا تھا یہ مقام دیہات و شہر کا سنگم تھا۔ انتظامی و عملی طور پر سول لائن کا جزو تھا۔ میرے لئے اس کی دیہی فضا اہم تھی، یہاں کچھار بھی تھا، دریا اور تالاب بھی۔ کچھار ربیع میں سبزہ زار ہو جاتا گیہوں، ارہر جو، مٹر کے ساتھ سرسوں کا پھولنا اور ہوا کے نرم نرم جھونکوں سے لہرانا میری فطرت پرستی کی صالح بنیاد بن گیا۔ عموماً دوپہر کے بعد سے غروب آفتاب تک میں ان ہی کھیتوں کا چکر لگاتا۔ خریف میں یہ سبزہ زار جوار و باجرے کا جنگل ہو جاتا، مگر میری دلچسپی کم نہ ہوتی، میں لال مینا پنجرے میں پالتا اور پھنساتا۔ کھیت کھیت ان خوبصورت پرندوں کی تلاش میں مارا پھرتا۔ اس دیہاتی فضا اور جغرافیائی خطے میں اس وقت ایسی بنجر زمینیں بھی تھیں جہاں بچے، نوجوان اور جوان لوگ مختلف کھیلوں سے دلچسپی لیتے۔ کبڈی، گلی ڈنڈا سے لیکر فٹ بال، ہاکی کرکٹ کھیلنے کا مظاہرہ محبوب مشغلہ تھا، چنانچہ میں نے بھی قریب قریب ہر رائج الوقت کھیل سے خاطر خواہ دلچسپی لی۔ اس سلسلہ میں اس طبقہ سے بھی دلچسپی ہوئی جس کو اوباش تو نہیں کہہ سکتے مگر علم و ہنر کی دنیا سے بیگانہ ضرور سمجھا جا سکتا ہے۔ اور غالباً یہی سبب غیر شعوری طور پر مجھے اس طبقہ سے جلد علیحدہ کر دیتا۔

خاندان، جائے ولادت، اور ماحول کے مجموعی اثرات کے ہجوم سے باہر نکل کر طلب

علم نے میرے ذہن پر ایسا قبضہ کر لیا تھا کہ لکھنے اور پڑھنے اور اہلِ علم کی صحبت سے فیض اٹھانے کا بے پایاں ذوق پیدا ہو گیا۔ ہر بات سے الگ ہو کر علم و ادب ہی کے میدان میں زیادہ لذت ملتی۔ بغیر اس کے ایک بے چینی محسوس ہوتی۔ میرے خاندان میں ابتک کسی نے انگریزی نہیں پڑھی تھی۔ میں نے جب اسکول میں نام لکھانے کی خواہش کی تو سب سے زیادہ مخالفت میرے نانا نے کی۔ مخالفت کے پردے سے جو جذبہ خیال بن کر ان کی زبان تک آیا وہ گھر والوں کو یہ سنائی دیا کہ ابھی اس لڑکے نے فارسی بہت کم پڑھی ہے صرف شاہ نامہ تک پڑھا ہے۔ ابھی اور کچھ دنوں تک فارسی و عربی پڑھ لے، پھر انگریزی پڑھنے کا خیال کرے۔ مگر میں ابتک یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کی ناراضمندی کا اس سبب وہ تھا جو انیسویں صدی کے مسلمانوں کے دلوں میں عام طور سے گھر کر چکا تھا کہ انگریزی پڑھنے سے مذہبی عقائد پر شبہ پڑتی ہے بہر حال میں نے ایک مشن (Mission) اسکول میں نام لکھا لیا۔ ذہنی لحاظ سے میں ہم جماعت طلباء میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا اس لئے زبان کے علاوہ دوسرے مضامین بھی جلد ہی سمجھ میں آجاتے اور میں بہتر انداز میں اُستادوں کے سامنے اپنی باتیں واضح کر لیتا اس وقت کے قاعدے کے لحاظ سے کبھی کبھی مجھے سال میں دو بار ترقی دے کر اونچے درجوں میں جگہ دی جاتی۔

اسکول کے ماسٹروں کا احترام تو میرے دل میں ہمیشہ رہا مگر ان کی قابلیت کبھی غیر معمولی نہیں محسوس ہوئی۔ جی چاہتا تھا کہ بلند اشخاص کی صحبت نصیب ہو، چنانچہ ابھی دسویں درجے میں تھا کہ شاہ محمد سلیمان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔

حسن اتفاق سے ان کے ایک چھوٹے بھائی شاہ محمد سلمان میرے ہم جماعت تھے۔ مزاج و مذاق کے اعتبار سے میرے اور اُن کے درمیان ذوق و شوق میں بڑی مماثلت تھی۔ ان ہی کی وجہ سے شاہ محمد سلیمان سے قرب نصیب ہوا۔ اس وقت سلیمان صاحب جج نہ ہوئے تھے اسی لئے بڑے عدیم الفرصت بیرسٹر تھے۔ ان کی اپنی قابلیت و اخلاق کی وجہ سے موکل جوق در جوق ان کے پاس آتے۔ پیشہ کی مصروفیت سے ان کو بہت کم پناہ ملتی مگر جو وقت بھی مجھے ان سے ہمکلام ہونے کا ملتا وہ میرے لئے نعمت ہوتا۔ قانونی باتوں سے الگ ہو کر جب وہ دوسری باتیں کرتے تو مجھے محسوس ہوتا کہ جیسے میرے دل و دماغ کسی اور دُنیا میں پہونچ گئے۔ ان ہی سے مجھے زندگی کو زندگی سمجھنے کا شعور عطا ہوا۔ دو سال کے بعد ایک ایسے علمی ادبی پیکر سے شرف ملاقات حاصل ہوا جس نے میری علمی ادبی تشنگی کو بہت کچھ سیراب کیا۔ میں جب ایف اے کی تعلیم کے سلسلے میں میئو سنٹرل کالج میں داخل ہوا تو شیخ مہدی حسن ناصری مجھے درجہ میں عربی پڑھانے کے لئے قسمت سے ملے۔ موصوف درسی کتاب سے الگ ہو کر بہت سے علمی و ادبی نکات بات بات میں ایسے پُرلطف انداز میں بیان کر جاتے کہ نہ نصاب کی خشکی محسوس ہوتی نہ درجے کی پابندیوں سے دم گھبراتا۔ جی چاہتا کہ ابھی کچھ دیر اور گھنٹہ نہ بجے مگر کمبخت گھڑیال بجانے والوں کو جیسے دنیا میں اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ پابندی اوقات سے گھنٹہ بجا دیا کرتے۔ گھنٹہ کی آواز یہ کہکر ہم لوگوں کو اٹھا دیتی کہ با آئندہ۔ اس لذتِ معلومات نے مجھے ناصری صاحب سے روز بروز قریب کرنا شروع کیا۔ اب میں موصوف کے گھر پر بھی حاضر ہونے لگا۔ وہاں وہ بے تکلف ہو کر بغیر وقت کی قید و بند کے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے۔ فارسی

عربی شعرا کے قصّے اور کلام پر تنقید بڑے مزے کے ساتھ سناتے۔ اردو شعراء کے ذکر و کلام سے ایسی نتیجہ خیز باتیں بتاتے کہ میرا تنقیدی شعور بلند ہوتا گیا۔

میرے نانا نقد بصارت سے محروم ہو گئے تھے۔ انہوں نے میرے کلام کی اصلاح بھی ناصری صاحب کے سپرد کر دی تھی مگر اس ضمن میں ناصری صاحب کی رائے سے اکثر مجھے اختلاف ہوتا۔ وہ ناسخ کے خاندانِ شاعری سے وابستہ تھے۔ اُن کا شاعرانہ ذہن الفاظ و ترکیب وغیرہ میں وہی رخ اختیار کرتا جو ناسخ کے گھرانے کا دستور تھا۔ مجھے اس انداز فکر و فن سے گھٹن محسوس ہوتی مگر ناصری صاحب کے احترام سے چار و ناچار اس قسم کی اصلاحوں سے ذہن کو گراں بار کرنا پڑتا۔

اسی زمانے میں میری خوش قسمتی سے یونیورسٹی میں انگریزی پڑھانے کے لئے ایک قابل قدر پروفیسر ستیش چندر دیپ کا تقرر ہوا۔ ان کی معلومات کی تھاہ مجھے کیا اچھے اچھوں کو نہیں ملی۔ انگریزی کی درسی کتابوں پر کلاس میں ان کی نظر رہتی مگر ذہن عرش معلیٰ تک کی خبر رکھتا۔ ان کی وسیع النظری کا یہ عالم تھا کہ انگریزی ادب پڑھاتے پڑھاتے وہ اُردو، فارسی فرانسیسی، ادیبوں کا بھی ذکر کرتے۔ اقتصادیات، تاریخ فلسفہ کی آمیزش سے درس کو پُر اثر و دلچسپ بنانے میں ان کو کمال حاصل تھا۔ وہ بفضلہ تعالیٰ اب بھی حیات ہیں اور وسیع النظری و ادبی و فنی معلومات کا وہی عالم ہے۔ ان کے فیضِ تربیت سے مجھے محسوس ہوا کہ طالب علم اگر صحیح معنوں میں طالب علم ہے تو اس کو دائرہ معلومات کتنا وسیع رکھنا چاہیئے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ کسی ایک علم یا ادب کو سمجھنے کے لئے بڑے ریاض کی ضرورت ہے۔ اس منزل پر پہونچتے پہونچتے میں نے اُردو کی اہم کتابوں اور مصنفوں کا مطالعہ کر لیا تھا۔ مولوی اسمٰعیل کی پہلی، دوسری تیسری چوتھی ریڈروں کا مطالعہ تو ابتدائی تعلیم میں ختم ہو چکا تھا۔ ابتدائی عہد میں میرے ذہنی ارتقاء کو ان کتابوں سے بڑی مدد ملی تھی۔ کیونکہ مصنف نے بچوں کی ذہنی نشوونما کو پیش نظر رکھکر بڑی دور اندیشی و نکتہ رسی سے یہ کتابیں تیار کی تھیں۔ شرر کے ناول کی ایک پڑ سے ڈالے تھے آج ان کی فنی خوبیاں بھی میری نظروں میں ہیں مگر اس وقت صرف تعریف ہی زبان پر تھی۔ لیکن اس توصیف کے پس پشت میرا غیر شعوری اسلامی کارفرما تھا۔ الف لیلیٰ۔ داستان امیر حمزہ کا مطالعہ اس عہد میں عام تفریحی مشغلہ تھا۔ میرے لئے تفریح کے علاوہ ان داستانوں میں زبان و بیان کی لطافت بھی بڑی اہمیت رکھتی تھی۔

چنانچہ برسوں ان سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ افسانوی ادب سے میں نے اتنا اثر ضرور لیا کہ خود بھی ایک ناول لکھنے کا گنہگار ہو گیا۔ مگر یہ بھی نہیں ہوا کہ ذہن داستانوں اور ناولوں کی دلکشی تک محدود ہو کر رہ جائے چنانچہ جب مولانا حالی کی تصنیف مقدمہ شعر و شاعری مجھے ہاتھ لگی تو میں نے بڑی محنت و دلچسپی سے بار بار اس کا مطالعہ کیا۔ مولانا شبلی کی تصنیف شعر العجم بھی بہت پسند آئی۔ میں نے اس سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ لیکن طرز تحریر کی سادرانہ خصوصیت صرف مولانا محمد حسین آزاد کی تخلیقات میں ملی چنانچہ آبِ حیات نیرنگ خیال، دربار اکبری، کی طرزِ تحریر نے اتنا متاثر کیا کہ میری تحریر میں آزاد کی عبارت آرائی کی جھلک آنے لگی۔ اب بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ کبھی کبھی میری تحریر اس اثر پسندی کی غمازی کرتی ہے۔

ذہنی نشوونما یا ادبی رجحانات کو میں نے کبھی نظم یا نثر تک محدود نہیں رکھا۔ میرا خیال ہے کہ شاید آسانی سے یہ علیحدگی ممکن بھی نہیں۔ اردو زبان کی یہ خصوصیت روزِ

ازل ہی سے رہی ہے کہ کسی صاحب ذوق نے نظم کی پسندیدگی کی وجہ سے نثر کا مطالعہ ترک نہیں کیا نہ نثر کی رغبت سے نظم کو دل سے دور کیا۔ کسی ایک صنف سخن سے کم یا زیادہ وابستگی کی بات الگ ہے مجھے بذاتہ نظم سے دلچسپی زیادہ رہی بچپن ہی سے شعر و شاعری کا ماحول گھر میں تھا اٹھتے بیٹھتے اشعار سنائی دیتے۔ میری والدہ وغیرہ صبح سے مناجات و مناقبت ترنم سے پڑھا کرتیں۔ مجھے بھی اس ماحول میں مناجات وغیرہ سے کافی دلچسپی ہوگئی۔ میں نے ہفت بند ملا کاشی حفظ کرلی اور ہر صبح ٹہل ٹہل کر ساتوں بند ختم کرتا اگرچہ بعض اشعار کے معنیٰ سمجھ میں نہیں آتے تھے مگر روں میں مطلع سے مقطع تک پڑھ جاتا۔ میرے نانا زیادہ تر مثنوی مولانا روم کے اشعار گنگنایا کرتے۔ اس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ شاعری کا زیادہ اثر مجھ پر صنف نظم نے ڈالا چنانچہ میں نے ایک مناجات تصنیف بھی کر ڈالی۔ نانا تحت اللفظ مرثیہ اچھا پڑھتے تھے۔ مجھے بھی پڑھنا سکھایا۔ تحت اللفظ پڑھنے کے لئے ضروری ہے کہ مرثیہ بخوبی یاد ہو۔ قریب قریب اشعار حفظ ہوں ورنہ ممبر پر ڈرامائی انداز میں پڑھنا ناممکن ہے۔ اس لئے مرثیہ سے مجھے خاص دلچسپی مطالعہ سے کم، پڑھنے سے زیادہ ہوئی۔ بند کے بند حفظ ہوگئے۔ نظم پرستی کے سلسلہ میں یہ ذکر بھی بیجا نہ ہوگا کہ نوجوانی سے کچھ پہلے ہی مجھے مثنوی زہر عشق نے کافی متاثر کیا اسے بار بار پڑھتا اور لطف لیتا یہاں تک کہ ساری مثنوی حفظ ہو گئی تھی۔ شاعرانہ شعور کی بیداری کے سلسلے میں یہ بھی واضح کردینا چاہتا ہوں کہ دور جدید کے پہلے کی شاعری مجموعی حیثیت سے مجھے ہمیشہ عزیز رہی ہے۔

میر۔ سودا۔ غالب۔ آتش۔ انیس۔ میر حسن۔ دیا شنکر نسیم کی تخلیقات اب بھی میرے مطالعہ کا خاص مرکز ہیں۔ یہی انس مجھے صفی، ثاقب، سائل وغیرہ کی صحبت میں لے جاتا، ان بزرگوں کے خیالات و معلومات سے میرے ذہنی شعور میں بالیدگی ہوتی رہی لیکن تدریجی تبدیلیوں کے لئے میرے ذہن کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہا۔

میرے شاعرانہ مذاق کو ہوا دینے میں وہ ماحول بھی سازگار ہوا جو جاتی ہوئی بہار کا آخری افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ میرا مطلب ارباب نشاط کے رقص و سرود، صورت و سیرت کی کیف انگیزی سے ہے۔ میں نے اوپر عرض کیا کہ میرے نانا زاہد خشک نہ تھے۔ ان کو موسیقی و طوائف سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کے علاوہ خاندان میں اور بھی لوگ اس کاروبار حسن و عشق میں سرگرم تھے۔ میں بچپن ہی سے اس فضا سے مانوس ہو گیا تھا۔ ہنوز میں ایف۔ اے۔ کی تعلیم سے فارغ نہ ہوا تھا کہ اس شاعرانہ مذاق نے مجھ پہ غلبہ پالیا۔ شعر کی تشریح اور اس کی جیتی جاگتی تصویر جو طوائفوں اور بھانڈوں کی نرت میں میں نے دیکھی تھی۔ اس سے یہ بات ذہن نشین ہوگئی تھی کہ شاعری و ساحری میں قریبی رشتہ ہے۔ اگر وہ کسی حسین پیکر یا موسیقی کے اچھے فن کار کی اداؤں کے ساتھ ادا ہو جائے تو سامعین کی رگ و پے میں شعریت خون کی طرح دورنے لگتی ہے۔ شعر کو اس انداز سے سمجھنے کا شوق مجھے اس بازار میں لے گیا جس کی آج کوئی اہمیت تو کیا وقعت بھی نہیں۔ آج کے نوجوان بھی اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ان کو کیا خبر کہ طوائف کا گھر اُس زمانے میں ایک خاص تہذیب کا مرکز تھا جو حسن سیرت و صورت کا سنگم تھا۔ اس بدنام گروہ کا اعلیٰ طبقہ زیور ہنر و علم سے بھی عموماً آراستہ ہوتا تھا۔ باوجود فضا کی آزادی اور تماش بینوں کی خوشحالی کے ضبط نفس و انتظار وقت کی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ بغیر

نیاز مندوں کی فہرست میں داخل ہوئے اور مختلف امتحانات سے گزرے ہوئے جنسی خواہش کا آسودہ ہونا قریب قریب ناممکن تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہاں کی نیاز مندی عشق کے مرادف تھی مگر ہاں یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ تعشق سے کم نہ تھی۔ بہر حال اس کوچہ میں میرا بھی جانا ہوا اور وہاں کے عوامل میں میری شاعری نہ سہی میرا شاعرانہ مذاق فروغ پاتا رہا۔

میرے شعری احساس کو اس دیار سے اچھی خاصی توانائی حاصل ہوئی۔ اس زمانہ میں مجھے اکثر وہاں کے در و دیوار سے کبھی کبھی یہ سنائی دیتا۔

جس نے کچھ کھویا اسی کو کچھ ملا
فائدہ دیکھا اسی نقصان میں

درس و تدریس کے باہر کی دنیا بھی میری دلچسپی کا مرکز تھی، چنانچہ اس زمانے کی سیاسی تحریک نے بھی میرے ذہنی ارتقاء کو متاثر کیا۔ سیاست سے مجھے عملی دلچسپی تو کبھی نہیں ہوئی مگر کانگریس کے اُن جلسوں میں، میں ضرور شرکت کرتا جن میں کوئی مشہور رہنما خطاب کرتا۔ موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالوی، سید حسین، محمد علی جوہر، بپن چندر پال، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کی دلکش و پرزور تقریروں سے میرا جذبۂ وطن پرستی فروغ حاصل کرتا رہا۔ روح میں گرمی اور خیالات میں تازگی آتی رہی۔ رفتہ رفتہ جواہر لال نہرو سے شناسائی ہوئی، جو بڑھتے بڑھتے ایک بے تکلف دوستی کی حد تک پہونچ گئی۔ ان کی شخصیت میرے لئے عزم و استقلال کا مجسمہ تھی۔ سیاسی میدان میں وہ سراپا عمل تھے۔ اور میں بے عمل و تہی دست، لیکن پھر بھی وہ میری باتیں دلچسپی سے سنتے اور ایک خاص انداز سے حسبِ ضرورت میرے خیالات کی تصحیح کرتے۔ غرض ان کی صحبت میں مجھے بلند خیالی و ایثار پسندی کا اچھا خاصا شعور عطا ہوا۔ اسی سلسلے میں یہ بھی ذکر مناسب معلوم دیتا ہے کہ جب جواہر لال نہرو، کل ہند کانگریس کے سکریٹری ہوئے تو اُن کے ساتھ دفتر میں کچھ ایسے لوگ بھی رفیقِ کار کی طرح الہ آباد آئے جن کی وجہ سے مجھے نظریۂ حیات و ادبی تنقید کو نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کا خیال ہوا۔ ایسے جن لوگوں کی صحبت سے مجھے یہ فیض پہونچا ان میں سجاد ظہیر صاحب ڈاکٹر اشرف (مرحوم) ڈاکٹر زین العابدین احمد صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں کا ادبی و سیاسی مطالعہ بہت وسیع تھا۔ دنیا کی نئی ذہنی رفتار پر بھی ان کی نظریں تھیں۔ اُردو فارسی سے بھی ان حضرات کو غیر معمولی دلچسپی تھی۔ زبان و ادب کی ضروریات کے پیشِ نظر سجاد ظہیر صاحب نے الہ آباد میں بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم کی۔ میں بھی اس کا ممبر ہو گیا۔ اس انجمن کی ابتداء ہی سے میں سرگرمی کے ساتھ اس تحریک ترقی پسندی میں، حصہ لیتا رہا۔ اچھے اچھے پڑھے لکھے ہندی اور اردو کے اہلِ قلم ہر نشست میں مضامین، افسانے، اشعار سے لوگوں کو دعوتِ فکر دیتے، بحث و مباحثہ سے مجھے وہ ذہنی عروج ہوا جو اس سے پہلے میسّر نہ ہوا تھا۔

۱۹۲۹ء سے میں الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر ہو گیا تھا۔ حسبِ دل خواہ ملازمت پا جانے کے بعد میرے رفتارِ مطالعہ میں معمول سے زیادہ تیزی آئی۔ حسنِ اتفاق سے دائرہ احباب بھی ایسا بن گیا جو علم و ادب کا مرکز کہا جا سکتا ہے۔ یونیورسٹی کے باہر بھی ایسے لوگ مل گئے جن کو میں اہلِ فکر و نظر سمجھتا تھا۔ یونیورسٹی میں اس قسم کے لوگوں کی کمی نہ تھی۔ پروفیسر احمد، پروفیسر فراق، ڈاکٹر رام کمار ورما پروفیسر پرکاش چند گپت وغیرہ میرے عزیز دوست تھے۔ ہر صحبت میں کسی نہ کسی طرح زبان و خیال

پر کچھ باتیں ہوجاتیں۔ ہندی و اُردو کے لسانی و تنقیدی معلومات سے مجھے روحانی مسرت ہوتی رہی اس سلسلے میں بے جا نہ ہوگا کہ اگر میں یہ اقرار کروں کہ شعبہ اُردو میں مجھے ایسے شاگرد بھی ملے جنہوں نے میرے اُستادوں سے مجھے کم علمی فائدہ نہیں پہونچایا۔ ان ہی طالب علموں میں احتشام حسین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میری ملازمت کو زیادہ سال نہ گزرے تھے کہ انہوں نے بی اے میں داخلہ لیا۔ یوں تو قریب قریب ہر دور میں امتیازی خصوصیات کے طالب علم شعبۂ اُردو میں آتے جاتے رہے لیکن اس نووارد طالب علم میں مجھے وہ علمی و ادبی امتیازی خصوصیات نظر آئیں جو مجموعی حیثیت سے کسی ایک طالب علم میں نہ دکھائی دی تھیں۔ اس وقت بھی زیرِ لب جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔

انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

احتشام صاحب نے بہت جلد اپنی گوناگوں خصوصیات سے پورے شعبۂ اُردو کو متاثر کر لیا۔ دیگر اساتذہ کے مقابلے میں وہ مجھ سے زیادہ قریب ہوئے۔ میرے پڑھے لکھے احباب خواہ یونی ورسٹی کے رہے ہوں یا یونی ورسٹی کے باہر کے ہوں سب کے سب احتشام صاحب کی ذہانت، خطابت اور معلومات سے یکساں متاثر تھے۔ میں نے اس وقت تک اقبال کے بعد کے شعراء کا کلام کسی خاص دلچسپی سے نہ پڑھا تھا۔ احتشام صاحب نے مجھے جوش وغیرہ کی نظمیں سُنا کر نئے شعراء کی فکر و فن سے دلچسپی لینے پر مائل کیا رفتہ رفتہ میری دلچسپی اس حد تک بڑھی کہ میں نے نئے ادبی رجحانات کے عنوان سے عصری نظم و نثر پر ایک کتاب لکھ ڈالی۔

یونی ورسٹی کی ملازمت سے ایک سال پہلے یعنی جب میں ریسرچ کر رہا تھا تو ایک ایسے موضوع کا مطالعہ کرنا پڑا جس نے مذہب کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے اور سوچنے کی دعوت دی۔ میرے تحقیق کا موضوع تھا اُردو شاعری میں تصوف۔ صوفیاء کرام کے اقوال، اُن کی وسیع النظری اور خود تصوف کے فلسفیانہ اندازِ فکر کے مطالعہ نے میرے ذہن کو مذہبی رسوم و تنگ خیالی سے آزاد کر کے خالق و مخلوق کے رشتہ اور انسان کو انسان سمجھنے کی توفیق عطا کی، یہ ذہنی انقلاب ۱۹۲۸ء سے شروع ہوا۔ مذہب سے اب مجھے وہ دلچسپی نہ رہی جو کبھی تھی۔ لیکن رُوحِ مذہب سے واقفیت کی تشنگی بڑھ گئی۔

اس ریسرچ سے فرصت اور مذہبی پابندیوں سے فراغت حاصل ہونے پر میرے حصولِ علم کا دائرہ کچھ اور بھی وسیع ہوگیا۔ جیسے جیسے معلومات زیادہ ہوتی گئیں میرے تاثرات قلم بند ہونے کے لئے بے چین ہوتے گئے۔ خوشی اس کی ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنے خیالات کو کتابی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے علم کو کبھی عمل سے دُور نہیں رکھا صرف اپنے دل و دماغ تک محدود نہیں رکھا بلکہ جو کچھ میں نے دیکھا یا سمجھا اس کو اوروں تک پہونچانے میں بخل نہیں کیا۔ اُس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اب تک ایک درجن کتابیں دُنیائے اُردو میں پیش کر چکا ہوں۔ یونی ورسٹی سے ٹیک دوش ہوتے ہوتے ایک ایسے بزرگ سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا جو میرے نزدیک علم و عمل کا مجسمہ تھا۔ اس عظیم ہستی کو دُنیا سیدنا سیف الدین طاہر کے نام سے جانتی ہے۔ موصوف کو دُنیا کی بے شمار نعمتیں قسام ازل نے عطا کی تھیں مگر باوجود اس کے سیدنا اپنا قیمتی وقت زیادہ تر اشاعتِ علم و تبلیغ مذہب میں صرف کرتے۔ خوش قسمتی سے مجھے اُن کی سوانح عمری لکھنے کا موقع ملا۔ اس لئے قرب بھی کافی نصیب ہوا۔ برسوں میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ اُن کی خدمت میں جب کبھی گیا تو کچھ علمی معلومات لے کر واپس آیا۔ باوجود پیرانہ سالی کے وہ صرف ۴، ۵ گھنٹے سوتے باقی وقت مطالعہ عبادت اور تبلیغِ علم و مذہب کے لئے وقف ہوتا۔ اُن سے مل کر مجھے محسوس ہوا کہ ایک شخص جو ۷۵ سال سے بھی زیادہ عمر کا ہو کس طرح دنیائے علم میں صالح اقدار کو فروغ دے کر اپنی فضیلت و انفرادیت کا سکہ رواں کر سکتا ہے۔ شاید اسی احساس کا زور ہے کہ میرا قلم اب تک کچھ نہ کچھ کاغذات سیاہ کرتا رہتا ہے۔ باوجود دل کی بیماری کے سلسلہ تصنیف و مطالعہ میرے لئے حضرتِ خضر کے اس قول پر ایمان لانے کا حیات افزا اشارہ ہے۔

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی ؛ ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

آج کل نئی دہلی

ستمبر

## غزلیں

### جوشؔ ملسیانی

رقصاں ہے ترے حسن کا جلوہ مرے آگے
اب ہیچ ہے اِندر کا اکھاڑا مرے آگے

باطل ہے یہ نظارۂ دُنیا مرے آگے
آتا ہے جو بن بن کے چھلاوا مرے آگے

بچھڑا ہوا بیٹھا ہے مسیحا مرے آگے
اب نام بھی لے گا نہ دوا کا مرے آگے

ہے عرش سے بھی دُور تخیل کی رسائی
چلتا نہیں جبریل کا دعوا مرے آگے

انوار ہی انوار نظر آتے ہیں مجھ کو
بہتا ہے ترے حُسن کا دریا مرے آگے

گل رنگ نظر آتی ہے ہر ایک تمنا
ہے عشق بھی اک حُسن کی دُنیا مرے آگے

سب اہلِ خرابات ادب کرتے ہیں میرا
جُھک جاتی ہے ہر گردنِ مینا مرے آگے

تردید بھی دُشوار ہے تائید بھی دُشوار
ہوتا ہے ترے جور کا چرچا مرے آگے

قاصد نہیں آیا یہ خط اُن کا نہیں آیا!
آیا مری تقدیر کا لکھا مرے آگے

اے شیخ توجہ سے تری بات سُنوں گا
توبہ کا مگر نام نہ لینا مرے آگے

کیوں کر میں سُناؤں اُنہیں غیروں کی جفائیں
کہتے ہیں بُروں کو بھی وہ اچھا مرے آگے

اے جوشؔ دھرا کیا ہے گلستانِ جہاں میں
اس باغ کا ہر پھول ہے کانٹا مرے آگے

یہ رہِ شوق ہے آزار یہاں اور بھی ہیں
یاس و ہجراں کے سوا سنگِ گراں اور بھی ہیں

غم کی راہوں میں خوشی ڈھونڈ رہی ہے ہم کو
کہیں اِس طور کے خونیں جگراں اور بھی ہیں

نشۂ میخوار بھرے جام سے دِل شاد نہیں
ساقیا، تیری عنایت پہ گماں اور بھی ہیں

اپنی دُنیا سے الگ اپنے زمانے سے جُدا
حیرت انگیز مکاں اور زماں اور بھی ہیں

علم نے یوں تو بہت عقدۂ مشکل کھولے
راز، گنجینۂ فطرت کے نہاں اور بھی ہیں

کوئی خورشید جہاں تاب سے اتنا کہہ دے
بزمِ ہستی میں کئی شعلہ بجاں اور بھی ہیں

منحصر لالہ و گل پر ہی نہیں حُسنِ چمن
کچھ مہکتے ہوئے، قدموں کے نشاں اور بھی ہیں

منزلِ وصل کی پُر نور فضا ہے لیکن
مرحلے عشق کے اے عمرِ رواں اور بھی ہیں

چمنستانِ غزل گونج رہا ہے پیہم
نغمہ زن، میرے ہم آواز یہاں اور بھی ہیں

تیری محفل میں ذرا وجدؔ بہل جائے گا
ایک دیوانہ سہی اور، جہاں اور بھی ہیں

### سکندر علی وجدؔ

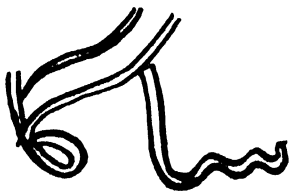

رفعت مرزا

"تم انتہائی نامعقول ہو۔ کسی کام کے نہیں۔ اور اُلّو بھی ہو تھوڑے سے ــــ"

"ریجنل ڈائرکٹر ــــ مائی فٹ!"

ریٹائرڈ میجر رحمٰن قاضی کے اُونچے درختوں اور لمبے ستونوں والے 'کاشانہ' کی شہلا رحمٰن قاضی فون کرنڈل میں پھنس کر پلٹ پڑی۔ سامنے ہی دروازے میں دونوں کولھوں پر ہاتھ رکھے بی بی کھڑی تھیں۔ دونوں ماں بیٹیوں نے چیتوں کی سی خاموش، ٹھنڈی سفاکی کے ساتھ چند لمحے ایک دُوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر شہلا رحمٰن قاضی لاپروائی سے کندھے جھٹک کر دیوان پر چڑھ بیٹھی اور دونوں گھٹنے سمیٹ کر اُن کے گرد بازو لپیٹ دیئے اور ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھ کر ایک ٹک فون کی طرف دیکھنے لگی۔ ــــ "میں کہتی ہوں کیسے کر رہی تھی فون!" بی بی وہیں کھڑے ہی کھڑے بے صبری سے چلائیں۔ شہلا رحمٰن قاضی نے قطعی کوئی نوٹس نہ لیا۔

"لڑکی سُنتی نہیں۔ میں کہتی ہوں کون تھا؟" بی بی اب کے دہلیز کود کر ممنوعہ علاقہ میں داخل ہو ہی گئیں۔ شہلا رحمٰن قاضی نے گھٹنوں پر سے ٹھوڑی اٹھا کر چند لمحے بڑے ہی Disillusioned انداز میں بی بی کی طرف دیکھا۔ پھر کندھے جھٹک کر فون کی طرف دیکھنے لگی۔ "تھا ایک" ــــ اُس نے آخر کار لب ہلائے۔

"کون تھا تیرا وہ ایک یار ــــ؟" اب کے بی بی اِس قدر چیخیں کہ کھانسیوں کا دَورہ پڑ گیا۔

"عورت ــــ!" شہلا رحمٰن قاضی انتہائی بور ہو کر دیوان پر سے کود پڑی۔ "ہم سے مت کوئی ایسے بات کیا کرے۔ زُبان کو لحاظ میں رکھا کرو ــــ سُنا!!" وہ بی بی کو کھانسیوں میں مبتلا، ناک سُکتے اور آنکھوں سے آنسو پونچھنے کی بے بسی میں گرفتار چھوڑ باہر نکل گئی۔ برآمدے میں رُک کر اُس نے لان کی طرف نگاہ کی۔ اوائل سرما کی نرم نرم دُھوپ میں میجر رحمٰن قاضی گارڈن چیئر پر دراز گھٹنوں تک کمبل اوڑھے آج کا تازہ اخبار شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد اب اُس سے منہ ڈھانپے شاید سو رہے تھے۔ "میرے بیچارے ابّا میاں ــــ" اُس نے من ہی من میں پیار اور ترس کی ملی جلی لہروں کو اُمنڈتے محسوس کیا۔ پھر قریب قریب بھاگتی ہوئی اُن کے پاس جا پہونچی۔ وہ واقعی سو رہے تھے۔ چُپ چاپ اخبار منہ پر رکھے وہ ساکت رہے۔ "میرے پیارے ابّا میاں ــــ" پیار میں اُمنڈتی لہروں میں ڈولتی وہ ایک ٹک اُن کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر دبے پاؤں کرسیوں کی طرف بڑھی۔ مگر آدھے ہی راستہ

میں رُک گئی۔ ابامیاں کی محبوب، پُرانے وقتوں کی بنی ہوئی آرام دہ اور مضبوط گارڈن چیرز جو ابامیاں کی خواہش پر ہی لان میں رکھوائی گئی تھیں کہ جن پر سب اُنہیں کے ہم عمر ریٹائرڈ میجر اور کرنل اور جج کون کون اُنہیں ملنے آتے تو، بیٹھ کر حالاتِ حاضرہ پر روشنی ڈالی جاتی — اور نائیلون کی نازک، خوبصورت، ہلکی پھلکی کرسیاں۔ وہ اچانک پریشان ہوگئی۔ خالی الذہن سوچ سمجھ کی ساری قوتیں ساری صلاحیتیں بکھر کر رہ گئیں۔ دوپٹے کے پلو کو انگلیوں پر لپیٹے۔ کھولتے اُس کا جی چاہا وہ اپنی پریشانی انجان پریشان پر پھوٹ پھوٹ کر روئے پھر خود پر اپنی گرفت، کھو دینے کے احساس سے خوفزدہ ہوکر وہ اچانک پلٹ پڑی — میجر رحمٰن قاضی اخبار منہ پر سے ہٹائے اُس کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ہنستی ہوئی ہلکے پھلکے، لاپروا قدم اُٹھاتی اُن کے پاس چلی آئی — جیسے طوفان میں کنارا مل گیا ہو — سہارا مل گیا ہو —

"اوہ ابامیاں — یہ آپ کی کرسیاں!!" اُس نے تھکے تھکے انداز میں اُن کے قریب ہی گھاس پر بیٹھ کر اُن کی پھیلی ہوئی ٹانگوں پر سر رکھ دیا۔ وہ چپکے چپکے مسکراتے رہے۔ اُس کے بالوں کو پیار سے تھپتھپاتے رہے۔

"ایسی مضبوط آرام دہ کرسیاں۔ مگر ابامیاں میں اُن پر بیٹھنے سے ڈرتی کیوں ہوں بھلا — ہیں۔ کیوں بھلا ابامیاں؟؟ مگر سکون، چین آرام نہیں ہے — صرف یہیں ہے — حفاظت اور پناہ کا یہ احساس اور کہیں نہیں — میں جانتی ہوں — کہیں بھی تو نہیں۔

"مگر چاند — یہ نائیلون کی کرسیاں پھر کا ہے کو ہیں — یہ بھی دھیں۔"

"اوہ I loath them ابامیاں: خوبصورت مگر نازک —" وہ چُپ ہوگئی۔ پھر وہی انجان سوچوں کا انحصار — پھر ہی انتشارِ خیالات: Disillusionment میرا بوجھ سہار سکیں گی؟ (خدشہ) اُس نے دھیمی آواز میں اضافہ کیا۔ پھر وہی خاموش لمحوں کا گزران — اور اُنہیں خاموش لمحات میں سے گزرتے ہوئے اُس نے غیر شعوری طور پر سر کو دائیں بائیں جھٹکا دیا اور پلٹ کر میجر رحمٰن قاضی کی آنکھوں میں دیکھ کر بڑے پیار، یقین، اور اعتماد سے مسکرانے لگی۔

"اوہ ابامیاں — ایک بات تو میں بھول ہی چلی — آپ نے میرا Latest Play پڑھا ہے ناں: وہی جو سنڈے میگزین میں شائع ہوا تھا؟"

"ہاں بیٹا — ایک، دم اے ون چیز تھی۔ اچھا تو پھر آپ یہ بتانا بھول چلی تھیں۔ کہ ہم کب اُسے ریڈیو پر سُن رہے تھے؟" وہ بچوں کی طرح جوش میں منہ لال کرتے ہوئے بولے — "کہاں ابامیاں — ریڈیو والے اُسے براڈ کاسٹ کرنے میں حیل وحجت کر رہے ہیں" اُس نے بچوں کی طرح ہونٹ نکال لیے۔ جائیے تو آپ سے اتنا بھی نہیں ہوتا ہمارے لیے اپنا Influence ہی کام میں لائیں"

"مگر بھائی آپ کے اس ڈرامہ کے لیے Influence کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو خود اپنے منہ بولتا، اپنی تعریف آپ تھا" میجر رحمٰن کو واقعی یہ خبر سُن کر حیرت ہو رہی تھی۔ اُن کے خیال میں اُن کی بیٹی سے بڑا اور کامیاب انگریزی ڈرامہ نگار ملک بھر میں نہ تھا۔ دوسری جنگِ عظیم میں لڑنے والے اور پچھلی صدی کی پیداوار میجر رحمٰن قاضی یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ اُن کی بیٹی کی تحریر میں کوئی خامی بھی ہوسکتی ہے۔ اپنی بیٹی کے لڑیری کیریر پر وہ نازاں تھے اور اپنے دوستوں سے بڑے فخر کے ساتھ اُسے انڈر ووڈ یوس کرایا کرتے تھے۔ جی یہ ہماری شہلا بیٹی ہیں۔ جی ہاں سنڈے میگزین کی مشہور و معروف ڈرامہ نگار مس شہلا رحمٰن قاضی"۔ اور ایسے سے اُن کا سینہ فخر سے تن جایا کرتا۔ دسویں پاس میجر رحمٰن قاضی کہ اب جن کا زیادہ تر وقت اپنے گھر میں، شام آبری ہونے تک اپنے ہم عمر، ہم عہد ریٹائرڈ فوجیوں کے ساتھ سیاست پر تبادلۂ خیال کرتے اور اپنے وقتوں کی باتیں کرتے اور موجودہ زمانے کی بے مہری اور افراتفری اور زاروداری کا شکوہ کرتے گزرتا تھا، کے سامنے لڑیچر کی کوئی واضح روایات نہ تھیں اور نہ ہی وہ ادب کی بدلتی اقدار سے واقف تھے۔ مگر اُن کی پیاری بیٹی کہ جس کا نام شہلا رحمٰن قاضی تھا، نیا پُرانا انگریزی ادب پڑھ پڑھ کر اب ڈرامے لکھ رہی تھی، اور اُن کے خیال میں ایک زبردست Literary Figure تھی — وہ واقعی، بجا طور پر حیران ہو رہے تھے۔

"نہ تو کیوں بھی آخر — آخر وجہ کیا ہوئی —"

"تھوڑی دیر ہوئی ریاض کا ٹیلیفون آیا تھا" اُس نے گھاس

کا ایک تنکا توڑا۔ پھر اُسے لاپروائی سے دُور پھینکتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں بتائی۔ صرف اتنا کہا۔ ریجنل ڈائرکٹر سے بات کی تھی، وہ کہتا ہے اس میں چند ریہ بائی خامیاں ہیں۔ وہ دُور ہو جائیں تو پھر ٹھیک ہے۔ کیا خامیاں ہیں۔؟ یہ اُس نے نہیں بتایا۔" اُس نے پھر گھاس کا ایک تنکا توڑا مگر اس بار اُسے پھینکنے کی بجائے دانتوں میں دبا کر برآمدے کی طرف دیکھنے لگی۔ جہاں بی بی کھڑی انہیں دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "ابا میاں Your Old Lady انہوں نے اضطراری طور پر فوراً پلٹ کر برآمدے کی طرف دیکھنے لگی۔ اور کمبل کے اندر اُس کی ٹانگیں بے چینی سے ہلیں۔"

"آج پھر گھٹنوں میں درد ہے۔ اور پاؤں کی انگلیوں میں بھی ۔۔۔"

وہ بے چینی سے پھر کسمسائے۔ بی بی اب انہیں کی طرف چلی آ رہی تھیں۔

(عورت۔ عورت۔ اب بھلا اس طرف کیوں آ رہی ہے؟ ہر وقت، ہر آن، ہر لمحہ میرے باپ کے اعصاب پر سوار۔ جاہل کسی بات کا علم نہیں۔ کسی بات کی خبر نہیں۔ ساری زندگی اُس نے میرے بیچارے غریب باپ کی خراب کر دی۔ ارے یہ اس قدر ہی جاہل ہے یا بنتی ہے) شہلا رحمان قاضی پر سوچ کے یہ لمحے بڑے بھاری تھے۔ نفرت اور Resentment کے ملے جلے جذبات لئے وہ بی بی کی طرف دیکھتی رہی، سوچتی رہی، گھاس کا تنکا چباتی انہیں قریب آتے دیکھتی رہی۔ اور آخری فاصلہ تو جیسے انہوں نے بھاگ کر طے کیا۔ وہ ایک دم ہی اُن کے سر پر آ کر کھڑی ہو گئیں۔ دونوں پاؤں پھیلا کر دونوں کولھوں پر ہاتھ جمائے وہ جیسے بس پھٹ پڑنے کو تھیں۔

"دیکھے اپنی لاڈلی کے کرتوت، گھنٹہ گھنٹہ بھر جانے اپنے کن یاروں سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ اور تم رکھو لاکے اس شیطانی آلے کو گھر میں۔ جوان لڑکی جس دن ماتھے پر کلنک لگا لے گی تو سر پہ ہاتھ رکھ کر روؤ گے ۔۔۔ سنا تم نے؟؟"

ابا میاں نے آنکھیں بند کر کے اخبار منہ پر رکھ لیا۔ شہلا رحمن تانگی تنکا چباتی چندھی آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھتی رہی۔

"اے تم باپ بیٹی کیا اندھے اور بہرے ہو۔ سُنتے نہیں میں کیا کہتی ہوں؟" وہ پھر چیخیں۔

"اچھا تو اگر تم ذرا آہستہ بولو تو ہمارا کیا بگڑ جائے گا، ساتھ کی کوٹھیوں میں بھی لوگ رہتے ہیں۔ اور خود ہمارے نوکر ہی کیا کہتے ہوں گے۔ ۔۔۔ تم مگر کیوں سوچو ۔۔۔ آہ جاہلیت!!" شہلا رحمن قاضی نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ "چپ۔ جرافہ۔ قطامہ!" بی بی اب کے اور بھی زور سے چلائیں۔

"کیا ہے بیگم۔" ابا میاں نے آخر کار اخبار منہ پر سے ہٹایا اور تھکی تھکی آنکھوں سے بی بی کی طرف دیکھا۔

"کیا ہے۔ کیا ہے کہتے ہی کہتے تم مر جاؤ گے اور ہو گا تم سے کچھ بھی نہیں۔ میں تم سے اس یاردں بیٹی کی بات کر رہی تھی۔ مگر ذرا جو تم کو اس کی خبر ہو۔ کسی کا فون آیا ہے۔ شہلا بی بی کا کار میں کون چلا آ رہا ہے۔ شہلا بی بی سے ملنے لاہور سے فلانا آیا ہے ۔۔۔ اور آج فلانا آیا ہے اور آج فلانا۔ اور آج شہلا بی بی خود کسی سے ملاقات فرمانے جا رہی ہیں ۔۔۔ اور روز دیکھو تو یہ ڈھیروں ڈھیر ڈاک چلی آ رہی ہے۔ ہرے نیلے پیلے لفافے۔ اللہ جانے یہ بدذات کیا کرتی پھرتی ہے اور تمہیں خبر نہیں ۔۔۔"

شہلا رحمن قاضی جو چپ چاپ بیٹھی تنکا چبائے جا رہی تھی۔ تنکا پھینک کھلکھلا کر ہنس دی ۔۔۔ "دانت توڑ دوں گی تیرے۔ باپ کے سر پہ ناچتی ہے۔ جس دن یہ نہ رہے گا اُس دن دیکھیو تیرا کیا حال کرتی ہوں ۔۔۔"

"اچھا!! مگر میرے باپ سے پہلے تو میری پیاری بی بی تم مرو گی۔" شہلا رحمن قاضی نے ادھ مچی آنکھوں سے بی بی کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے مستقبل کا فیصلہ سُنا دیا۔ بی بی سہم کر چپکی ہو گئیں۔ پھر جانے کیا سوچ کر اس کی طرف لپکیں۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور ابا میاں کی کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ دونوں ہاتھوں سے کرسی کی پُشت کو مضبوطی سے تھامے وہ جیسے ہر حملے کا جواب دینے کے لئے تیار ہو گئی۔ بی بی چند لمحوں تک چپ چاپ کھڑی اپنے خلاف متحدہ محاذ کو دیکھتی رہیں پھر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔

"تمہارا کیا خیال ہے، میں اُس کی دشمن ہوں۔ اس کے ساتھ والی لڑکیاں بال بچوں والی ہوگئیں۔ اور میں ہوں کہ خاندان والوں میں آنکھ اونچی کر کے بات نہیں کر سکتی۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی خامی ہوگی کہ اب تک ہاتھ پیلے نہ ہو سکے۔ تم خود سوچو میں کوئی اس کی دشمن ہوں۔ سچ بات کہتی ہوں تو تم دونوں باپ بیٹی کھانے کو دوڑتے ہو۔"

"ارے جاؤ۔ میں سب سمجھتی ہوں تمہاری چالیں۔" شہلا نے بی بی کی بات کاٹی۔ وہ اَن سُنی کر گئیں۔ پھر آئے دن اُس کو ملنے کے لئے کوئی نہ کوئی آ رہا ہے۔ گھر میں نوکر چاکر ہیں۔ سونے کا نوالہ دو پھر بھی مالک کے خلاف جب بھی بات کرے گا موقع ہوگا چوکیں گے نہیں۔ باہر جا کر ایک بھی ایسی ویسی بات کہہ دیں تو عزت کہاں رہ گئی۔ مگر تم کیوں سنو۔

میجر رحمٰن قاضی نے پھر اخبار منہ پر رکھ لیا۔ جانے جوان لڑکی کو سینے پر لئے تم کیوں کر چین سے سو سکتے ہو۔ یہ وقت گزر گیا تو پھر کچھ کئے ہاتھ نہ آئے گا۔

"بی بی خدا کے لئے چپ رہو۔ نہ موقع نہ محل اور تم ہو کہ لے کے اپنے دُکھڑے بیٹھ جاتی ہو، کبھی دو باتیں ڈھنگ سے بھی کر لیا کرو۔ جانے ہماری عورتوں کو عقل کب آئے گی۔" شہلا پھر بات کاٹ کر اکتاہٹ سے بڑبڑائی۔ "اور میری فکر کرنے کا تو تمہیں میں کوئی حق نہیں دیتی۔"

"تو چپ رہ۔ یہ زمانہ بھی دیکھنا تھا۔ لڑکی ذات اور اپنے بارے میں ایسی باتوں میں زبان ہلائے"۔ بی بی نے اُسے گھورا۔ شہلا رحمٰن قاضی نے لاپروائی سے کندھے ہلائے اور جھک کر ابا میاں کے کھچڑی بالوں کو انہماک سے دیکھتی۔ شہادت کی اُنگلی اُن پر پھرانے لگی۔

"ابا میاں۔ ہم کل نشاط کے ساتھ چلے جائیں۔ دو ایک دن میں آ جائیں گے"۔ اخبار کے پیچھے سے ابا میاں کی ہنسی کی دھیمی سی آواز اُبھری۔

"ہاؤ سویٹ یو آر۔ آ ابا میاں جان! جان!" اُس نے کرسی کے بازو پر بیٹھ کر اُن کے کندھے پر سر رکھ دیا اور سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔ "اگر آپ نہ ہوں تو زندگی اجیرن ہو جائے"۔ لمحہ بھر بعد اُس نے ایک آنکھ تھوڑی سی کھول کر انگاروں پر بیٹھی بی بی کی طرف دیکھا۔ بی بی کے خلاف دل میں بھڑکتی نفرت کی آگ پر جیسے شبنم کے چھینٹے پڑ گئے۔ وہ دونوں مکمل طور پر بی بی کے وجود کی نفی کرنے پر تُلے ہوئے تھے اور یہی بی بی کے خلاف اُن کا موثر ترین حربہ تھا۔ بی بی پیر پٹخ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "شرم نہیں آتی۔ حرکتیں دیکھو چڑیل کی۔ اور یہ بڈھا۔ ارے میں دیکھ رہی ہوں تم دونوں کے بھیجہ!! غضب خدا کا یہ گھر ہے کہ رنڈی خانہ۔ ارے یہ سوکن میری!! اے خدا اُسے دو گھڑی کی موت دے۔ اے خدا اُس کی جگہ تو نے کوئی پتھر میری کوکھ میں رکھ دیا ہوتا۔ میں رو دھو کر صبر کر لیتی۔ اے خدا۔"

"اچھا بدذات اب چپ کر۔ بس کر۔" میجر رحمٰن قاضی جانے کب سے ضبط کر رہے تھے۔ مگر اب اخبار کے پیچھے سے غصے سے تمتمایا ہوا سرخ چہرہ نکال کر وہ کانپتے ہوئے غراتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ دونوں خاموش ایک دوسرے کی آنکھوں میں گھورتے کچھ سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر بی بی نے دونوں ہاتھوں سے سینہ پیٹ لیا۔ "مولا میری مٹی عزیز کر لے۔ اب نہیں جیا جاتا۔ ڈھائی گھڑی کی دے دے۔ اور پھر ازار بند سے لٹکتے چابیوں کے گچھے کو نیفے میں اُڑستی، دوپٹے کے پلو سے ناک پونچھتی واپسی کے لئے مڑ گئیں۔ ابا میاں نے اخبار سے پھر منہ ڈھانپ لیا اور چپ ہو گئے۔ اور وہ سر اُٹھائے بڑے پُرخیال انداز سے چندھیائی آنکھوں سے اُسی طرف کو دیکھتی رہی جدھر کو بی بی گئی تھیں۔

(تیس سال۔!! اور یہ عورت آج بھی وہیں کھڑی ہے۔ جہاں آج سے نصف صدی سے بھی پیشتر کھڑی تھی۔ نہ ایک انچ ادھر نہ ایک انچ اُدھر۔ تیس سال کی رفاقت کیا کم ہوتی ہے؟ سال بھر میں ہی ایک انسان دوسرے انسان کو پہچاننے لگتا ہے مگر یہاں آتے جاتے سالوں اور موسموں کا کوئی اثر نہیں۔ وہی ضد! وہی ہٹ دھرمی، وہی جہالت، گلیوں میں رچے بسنے والی عورتوں کی سی عادات۔ بائیس سال کی یہ پکی عادتیں جن کا کوئی علاج نہیں۔ یہ ٹھیکرے کی مانگیں، جہالت کا ایک اور نشان۔ جس کے بل بوتے پر ایسی ایسی انمل بے جوڑ شادیاں ہوتی ہیں کہ خدا کی پناہ۔ بچائے میرے ابا میاں۔)

شہلا رحمٰن قاضی کی سوچ کے دائرے۔!

اور سچ تو یہ ہے کہ میجر رحمٰن قاضی نے بھی اپنی بیوی کے سنوارنے کی خواہش میں بہت کچھ کیا تھا ـــ شادی کے فوراً بعد تو اُن کی تربیت کے لئے ایک گورنس رکھی ـــ کلب کی عورتوں میں کم سے کم اُٹھنے بیٹھنے ہی کے لائق ہو سکیں۔ مگر یہ پھر بھی اسی طرح چابیوں کے گچھے کو نیفے میں اُڑسے باورچی خانے سے اناج کی کوٹھری اور اناج کی کوٹھری سے باورچی خانے تک کے چکر لگاتی رہیں اور اینگلو انڈین گورنس نے دوسرے ہی ہفتے جناب کو جا کر اپنا فیصلہ سُنایا کہ جناب آپ کا بی بی ہمارے بس کا نہیں۔ اور باورچی خانے اور اناج کی کوٹھری کے چکر سال اور دن اور مہینوں اور محوں میں ڈھلتے گزرتے رہے۔ اور کبھی انہوں نے پلٹ کر اپنے شوہر سے یہ تک نہ پوچھا کہ کیسے ہو؟ انہیں تو جیسے یہ احساس ہی نہ تھا کہ کھانے کے علاوہ بھی اُن کے شوہر کی خواہش ہو سکتی ہے۔ شادی کے چند ہی سال میں انہوں نے علیحدہ کمرہ جا بجایا مگر بی بی بات کی طرف سے لاپروا اپنے کمرے میں آرام سے سوتی خراٹے لیتی رہیں۔ شروع شروع وہ کروٹیں بدلتے ہی بدلتے صبح کر دیتے پھر گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہر شب کلب میں گزارنے کا ڈھب سیکھ لیا۔ صبح کے پہر وہ گھر آتے اور ایسی بے سُدھ کر دینے والی نیند کہ کسی بات کا احساس، کسی محرومی کا دُکھ ہی باقی نہ رہتا ـــ

گزشتہ تیس برس سے ایک چھت کے نیچے دو اجنبی سانس لے رہے ہیں جو آپس میں کبھی بھی کسی بھی بات پر سمجھوتہ نہ کر سکے۔ میرے خدا!! ساری عمر میرے باپ نے کس اذیت میں کاٹی ـــ اور اب ـــ اب مگر میں ہوں ـــ میں!! شہلا رحمٰن قاضی نے اپنے باپ کے سفید بالوں والے سر پر لمحہ بھر کے لئے اپنا دایاں رخسار رکھا اور پھر اُٹھ کھڑی ہوئی ـــ "کہاں ـــ" وہ اخبار کے پیچھے سے پکارے۔ (فریاد!!) جیسے وہ خوفزدہ ہوں ـــ کہیں وہ اُنہیں چھوڑ نہ جائے۔ چلی ہی نہ جائے۔ وہ پھر خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ کئی دفعہ، جبکہ وہ خود کو بے حد تنہا، اکیلا محسوس کرتے تو آہستہ سے اُس کا ہاتھ تھام لیتے ـــ "بیٹا مجھے چھوڑ جاؤ گی۔ اپنے بوڑھے باپ کو!! جوان ہاتھ بھی بوڑھے ہاتھ کی گرفت چند لمحوں کے لئے بے حد مضبوط ہو جاتی جیسے وہ خوف زدہ ہوں۔ تنہائی اور بڑھاپے اور آنے والے موسموں کا خوف ـــ وہ جواب میں اُن کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیتی اور بی بی اُن کو طعنے دیتیں "تم تو خود غرض ہو خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے، جوان اولاد تمہارے سامنے ہے اور تم تسلی سے بیٹھے ہو۔ مجھ سے پوچھو میری تو رات کی نیندیں حرام ہیں ـــ"

پھر وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر رکھے پام کے گملوں میں چھپی بیٹھی زیجبل ڈاٹر کرڈ کے انکار پر خود سے ہمدردی میں مصروف تھی اور سوچ رہی تھی کہ یہ انکار اُس کی تخلیقی صلاحیتوں کو مفلوج نہ کر دے کہ نیلی مرسڈیز گیٹ میں داخل ہوئی اور آہستہ روی سے پورچ میں آ رکی۔ آپ ـــ!! وہ سکون سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

یہ ریاض تھا۔ "میں مارا مارا کرتا لاہور سے آ رہا ہوں۔ تمہارے ڈرامے کے بارے میں گفتگو کرنا تھی۔" وہ اُسے اندر لے گئی۔ سکرین کے پیچھے سے جھانکتی اُسے بی بی کی دو آنکھیں نظر آئیں۔ اس نے بڑے اعتماد سے سر کچھ اور اُونچا کر لیا۔ مگر عفتہ کی ایک تیز لہر پورے وجود میں پھیل گئی ـــ ابا اور وہ اور ریاض بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ سکرپٹ اُس نے شہلا کے سامنے ڈال دیا کہ اُن کے خیال کے مطابق اس میں جو خامیاں ہیں یا اُن کو دُور کرے یا ان کی خواہش کے مطابق ڈرامہ کو نئے سرے سے لکھا جائے ـــ ابا میاں کو مگر یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ اُن کی شہلا کے ڈرامے میں کوئی خامی بھی ہو سکتی ہے۔ شام ڈھلے وہ اُسے خدا حافظ کہنے اس کی کار تک اس کے ساتھ گئی۔ کار اسٹارٹ کرتے کرتے وہ رُک گیا اور اسٹیرنگ پر دونوں بازو پھیلا کر اُس نے شیشے سے باہر نگاہیں جما دیں۔ پھر لمحہ بھر کے بعد اس کی طرف پلٹا۔ شہلا! وہ اُس کی آواز کی نرمی اور گرمی اور گھلاوٹ اور دھیما پن اور آنکھوں کی چمک جیسے شعلوں کی لپک ـــ وہ خوفزدہ ہو کر فوراً پیچھے ہٹی ـــ دونوں رخساروں پر دونوں ہاتھ رکھے۔ وہ خوف زدہ سی اس کی جگمگاتی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ پھر تیزی سے پلٹی اور قریب قریب بھاگتی ہوئی وہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ گئی ـــ ریاض جیسے گہری نیند سے ایک جھٹکے کے ساتھ جاگ گیا ہو۔ پھر غصہ اور شرمندگی اور بے بسی کی سُرخ لہر اُس کے سر کے بالوں کی جڑوں تک پھیلتی چلی گئی۔ نیلی مرسڈیز ایک زناٹے سے گیٹ سے نکلی اور سڑک پر غائب ہو گئی۔

دو راتیں اور دو دن اس نے خود سے بچ بچ کے گزارے نہ جانے

ے گریز کیا۔ بی بی کی ہر بات، ہر ہٹ اور خشناک نظر کو نظر انداز کر گئی۔ ابا میاں
ہنگ بیٹھی تاش کھیلتی رہی۔ ادھر ادھر کی گپیں لڑاتی رہی۔ دوسری جنگ عظیم
ہزار بار کے سنے ہوئے واقعات بڑی توجہ اور دلچسپی سے ابا میاں سے
سنتی رہی۔ اچھا تو ابا میاں جاپانیوں کی قید میں آپ نے اپنا وقت کیسے
ارا۔ کتنے ؟؟ دو ماہ تک اُن کی قید میں رہے ؟؟ اور ابا میاں ۔۔۔
ر۔۔۔ مگر اندھیرے میں چمکتی دو سیال آنکھیں اُس کی آنکھوں میں گھستی
آئیں۔ وہ اس کا نام لیتا ہوا دھیما لہجہ۔۔۔ مدھم آواز میں پورے یقین اور
تماد سے پکارا ہوا اس کا نام۔ !! وہ خاموش صورت۔۔۔ بے بسی اور
ہسی کی تصویر بنی ابا میاں کے منہ کی طرف دیکھنے لگتی۔۔۔ وہ حیران
کر پوچھتے۔۔۔ "کیا ہے ؟؟" تو وہ سر جھٹک کر ہولے سے کہتی۔ کچھ نہیں۔
ی ابا جان۔۔۔" وہ پریشان پریشان سے، کھوئی ہوئی نظروں سے اُسے
یکھتے رہتے۔۔۔ "بات کیا ہے چاند !!" وہ اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس
انا چاہتے۔ مگر وہ اُن کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیتی۔ ابا اب آپ کے
دوں میں تو کوئی تکلیف نہیں ؟ آج رات سونے سے قبل مجھے یاد دلا دیجئے
میں دوائی کی مالش کر دوں گی۔۔۔ اچھا !" اور پھر اُٹھ کر نوکروں کے
ارٹروں کی طرف چلی جاتی۔ اُن کی بیویوں سے گپ بازی کرتی۔ اُن کے
دں کی گپ بازی۔ اُن کے شوہروں کی باتیں۔۔۔ "اچھا تو تیرا نام جمبے تھا
۔ہیں، جنبے !! اور گلاب بی بی تجھے رحمت نے بنایا ہے۔ بھئی واہ بڑا
اعر آدمی ہے۔۔۔" "ہے فاطمہ تجھے تمیز کب آئے گی ؟ ذرا دیکھ تو
چے کیسے گندے میلے ہو رہے ہیں۔ صاف رکھا کر انہیں۔ اچھا شام میرے
ں کوٹھی آنا"۔۔۔ پھر گلاب بی بی کے ہجوم میں پڑے ٹانگیں چلاتے بچے
ک کو انگلی سے چھوتی۔۔۔ "ہے شیطان ! ٹانگیں چلاتا ہے ؟ کیوں گلاب
ں یہ تجھ پر ہے یا رحمت پر ؟" وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اُس کے ہاتھ
ڑانے کی کوشش کرتا تو وہ خود ہی اُس کے منے منے ہاتھوں میں اپنی انگلی
ا دیتی اور وہ جب اس کی انگلی کو منہ میں ڈال کر چوسنے کی کوشش کرتا تو
جلدی سے ہاتھ چھڑا کر پیچھے ہٹ جاتی۔۔۔ خوفزدہ سی، پھر خود ہی ہنس دیتی
شیطان۔۔۔ ہاتھ گندہ کر دیا۔۔۔" اور جب کچھ اور کرنے کو باقی نہ رہتا تو اپنے
ے سے باہر لان میں بیٹھے ابا میاں کی طرف کبھی ترس اور ہمدردی سے دیکھا
ر کبھی لاتعلقی سے اور کبھی اپنے دل کی حالت، اپنے جذبات کے بہاؤ کا فیصلہ
ی نہ کر سکتی۔۔۔

مگر تیسرے دن کی سہ پہر کو اُس نے آخر کار بجتے فون کو اٹھا ہی لیا۔
دوسرے سرے پر ریاض بول رہا تھا۔ "شہلا بی بی۔۔۔" وہ سانس روکے
دم سادھے چپکی رہی۔

"سن رہی ہو ؟۔۔۔ ریجنل ڈائرکٹر کی خواہش ہے کہ تم کوئی اور
ڈرامہ بھیجو۔۔۔ شہلا بی بی جو مجھ سے ہو سکا میں نے کیا۔ اب کہو میں کیا کروں ؟"
دم بھر کو تھما کر اس نے جواب کا انتظار کیا۔۔۔ وہ چپکی ہی رہی۔

"سن رہی ہو ناں ؟ یہ ڈرامے وامے کا چکر چھوڑو۔ چلو دونوں
مل کر گھر بناتے ہیں۔" سیدھی صاف آواز میں اُس نے بڑے سکون کے ساتھ
اُسے دعوت دی۔ اُس کی آواز میں کھنکتا ہوا یقین اور اعتماد۔۔۔ ! پاس پڑی
کرسی پر اُس نے سہارے کے لئے ہاتھ رکھ دیا۔۔۔ "ہیلو سن رہی ہو ؟"

"ہاں سن رہی ہوں۔۔۔ آگے کہو !!" اپنی آواز کے سکون اور اعتماد
پر اُسے حیرت ہوئی۔۔۔ "آگے کیا کہوں ؟" وہ چڑ گیا۔ "تمہارا کیا خیال
ہے میں سمجھتا نہیں، آنکھیں بند کر کے میرے ساتھ چلی آؤ۔۔۔ اور اُن دونوں
میاں بیوی کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع دو۔ اب بھی وقت ہے
تم کب تک پرانی صدیوں کی مجاور بنی بیٹھی رہو گی۔ کیا کہتی ہو۔ کیا سوچا
ہے تم نے۔۔۔ وہ جیسے دھاڑ کر بولا۔۔۔" شہلا بی بی وہ پھر دھیما پڑ گیا۔
میں کل آ رہا ہوں۔۔۔ سنا !!"۔ اُس نے جواب دیئے بغیر فون کریڈل میں
رکھ دیا۔ اور آہستہ آہستہ جیسے خواب میں چلتی دیوان پر بیٹھ گئی۔

چند لمحے وہ یونہی ساکت و سامت بیٹھی رہی۔ پھر اچانک۔۔۔
اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔۔۔ "طوفان آ رہا ہے۔۔۔" وہ تیزی سے دریچوں کی طرف
بڑھی اور اُن کو ایک ایک کر کے بند کرتی۔ وہ آخری دریچے کے سامنے آئی تو
رک گئی۔ باہر لان کی طرف دیکھا۔ ابا میاں اخباروں کی دوسرا تہ میں گارڈن چیئر
پر دراز تھے۔ گھٹنوں تک کمبل۔ منہ پر اخبار چپ چاپ اور ساکت وجود۔
جانے اخبار پڑھتے پڑھتے سو ہی گئے تھے۔ وہ دیر تک اُن کے سفید بالوں
والے سر کو دیکھتی رہی۔ گارڈن چیئر پر رکھا وہ ساکت وجود اُسے اس لمحہ
ایسا تنہا اور اُداس کُن لگا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔ پیار اور مکمل
دوسرا تھ کا احساس اپنے جی میں بھرے وہ آہستہ آہستہ پنجوں کے بل چلتی لان کی
کی طرف چلی۔ کہیں ابا جاگ نہ جائیں۔ اور ابا کی محبوب پرانے وقتوں کی بنی
ہوئی مضبوط آرام دہ گارڈن چیئر پر لیٹ کر گھاس پر سے اخبار اٹھا کر منہ پر رکھ لیا۔



# فن اور اخلاقیات

بدری پرشاد شنگلو

فنون لطیفہ میں کس حد تک اخلاقیات کو دخل ہونا چاہیئے یہ ایک اہم مسئلہ ہے جس پر قدیم وقتوں سے لیکر ابتک فلاسفروں نے رائے زنی کی ہے بعض کا قول ہے کہ فن سے اگر اخلاقی عنصر کو نکال دیا جائے تو وہ ایک بازاری شے بن جاتا ہے جس کی جادوگری اور دلفریبی انسان کے دل میں گری ہوئی خواہشوں کو برانگیختہ کرتی ہے۔ اس نظریئے کے حامی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ فن کو ہرگز اخلاقی معیار سے گرنا نہیں چاہیئے ورنہ اس کا حسن اپنی روحانیت کو کھو کر نفس کی اسفل مسرتوں کا آلۂ کار بن جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ فن میں کچھ اس قسم کی جاذبیت موجود ہے کہ جس کا انسان کے دل پر فوری اثر پڑتا ہے اور وہ کچھ عرصہ کے لئے مسحور ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر فنکار کا ارادہ بلند اور خیال پاکیزہ ہے تو وہ اپنے فن کی تخلیقی کاوشوں اور حسن آفرینیوں کو وسیلہ بنا سکتا ہے، جذباتِ عالیہ کو روشن کرنے اور ابھارنے کا۔ برعکس اس کے اگر اس کا مذاق صحیح اور سلیم نہیں اور اس میں بد اخلاقی کو دخل ہے تو یقینی طور پر وہ فن کی ساحری کو محض نفس کے اکسانے اور متحرک کرنے کے لئے استعمال کرے گا۔ ایسی حالت میں بہت بُرے نتائج پیدا ہونے کا امکان ہے چونکہ انسان طبعاً ضعیف واقع ہوا ہے اور اس کی فطرت ذرا سی ترغیب سے مائل بہ پستی ہو جاتی ہے اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ علوم و فنون کو ان آلائشوں سے مبرا ہونا چاہیئے جن کی وجہ سے نوجوان طرح طرح کی بد اخلاقیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

فن بصری ہو یا سامعی اپنے اندر ایک عجیب کیفیت رکھتا ہے۔ کسی رسیلے درد بھرے گیت کو سن کر کس کا دل متاثر نہیں ہوتا۔ کسی سڈول مرمریں بُت کو دیکھکر جس کے عضو عضو سے حیاتی حسن کا ترشح ہو رہا ہے کسے مسرت حاصل نہیں ہوتی۔ جب ہم کسی باکمال مصوّر کی بنائی ہوئی تصویر کو دیکھتے ہیں تو کیا اس کے رنگ روپ کا جادو ہماری آنکھوں کو تسخیر نہیں کر لیتا۔ اس سے ظاہر ہے فن ایک ایسے افسوں، ایسی زبردست قوت کا حامل ہے جو انسان کے دل و دماغ کو فوراً اپنے بس میں کر لیتا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ فن کار اس وقت کو خیر کے لئے

استعمال کرتا ہے یا شر کیلئے۔ اخلاقیات والے جو زندگی کے ہر اصول، ہر فعل و عمل کو اپنے نقطۂ نظر سے جانچتے ہیں، ایسے فن کو حقیر اور ناقص تصوّر کرتے ہیں جو اپنے اندر خیر کا عنصر نہ رکھتا ہو۔ ان کی نظر میں اس فن کی کوئی وقعت نہیں جو لوگوں کو نیکی اور بھلائی کی تلقین نہ کرے، جسے دیکھکر انسان کے دل میں خود بخود خیر کے جذبات پیدا نہ ہو جائیں۔ اس فلسفہ کے ماتحت ہر آرٹسٹ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے جذبات و افکار کو تشکیل کے سانچے میں ڈھال رہا ہو تو اس بات کو ملحوظ رکھے کہ کہیں اس کے فن کی دلنواز خوب صورتی وصفِ خیر سے عاری نہ رہ جائے، کہیں وہ نظر فریب جمال آرائیاں اخلاق کی کسوٹی پر باطل ثابت نہ ہوں۔

یہ ہے اخلاقی نظریہ۔ یعنی فن کو اخلاقیات سے منسوب کرنا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ میں آپ پر اس نظریے کی خامیاں کو روشن کروں اور آپکو بتادوں کہ وہ کلاکار جنھوں نے اپنے فن کو اخلاقی مطمحِ نظر پر قائم کیا انہیں دیرپا کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ ان کا فن مصنوعی حد بندیوں میں مقیّد ہو کے رہ گیا۔ نہ ان کے تخیل میں جدت رہی نہ اظہار میں جرأت اور بے باکی۔ وکٹوریہ کے عہد میں بعض انگریز مصوّروں نے خاص طور پر اخلاقیات پر زور دیا۔ کچھ عرصہ کیلئے ان کی تصویروں کو مقبولیت حاصل ہوئی لیکن "اب وہ سب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں"

واٹس (Watts) اسی دور کا مصور تھا اس نے بہت سی تصویریں بنائیں جو پند و نصائح کی ترجمانی کرتی ہیں، یہاں تک کہ اُسے ناصح مصوّر کے نام سے پکارا جانے لگا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے فنی نظریے کا ان لفظوں میں اظہار کیا "میرا مقصد ایسی تصاویر بنانے کا نہیں جن کا حسن و جمال میں آنکھوں کو لبھائے، بلکہ جو قلب و ذہن کو اپنی ہمخیالی سے متاثر کریں اور جن سے بشریت کے اعلیٰ ترین جذبات روشن اور مشتعل ہوں" لیکن جب اُنیسویں صدی میں فرانس کے مشہور و معروف آرٹسٹ سیزان (Cezanne) نے ایک نئے فنی دور کی بنیاد ڈالی تو دنیائے مصوری میں ایک زلزلہ خیز انقلاب آیا۔ پرانے فرسودہ نظریے خاک میں مل گئے۔ لوگ نئے زاویے سے فن پر نظر ڈالنے لگے۔ مصوّری کے قدردانوں اور نقادوں کو پہلی بار معلوم ہوا کہ اخلاقیات یا مذہبیات کو فنون جمیلہ سے کوئی خاص نسبت نہیں۔ فن ان سے بے نیاز ہے۔ اس کی بزرگی، اس کی لاہوتی شان پیدا ہوتی ہے اس کے ذاتی حسن سے، اس کی اندرونی خوبیوں اور لطافتوں سے وہ مذہب اور اخلاق دونوں سے مستغنی ہے۔ اُسے خیر و شر سے سروکار نہیں وعظ و تبلیغ اس کا شیوہ نہیں شروع شروع میں لوگوں نے سیزان (Cezanne) کی قدر نہ کی۔ اس کے انوکھے فن اور اسلوب کو سمجھنا ان کی طاقت کے باہر تھا۔ وہ لوگ پرانے طرز کی مصوّری کے دلدادہ تھے ان کی قدامت پرست ذہنیت نئی انقلاب آور تحریک کی متحمل نہ ہو سکی لیکن رفتہ رفتہ اس تحریک نے زور پکڑا۔ سیزان کی عجیب و غریب تصویروں اور شوخ رنگ آمیزیوں سے لوگ مانوس ہونے لگے۔ وان گوگ (Vangogh) اور گاگاں (Gauguin) بھی اسی دور کے دو رکن تھے بہت دیر تک زمانہ ان کے فن کی اہمیت سے غافل رہا بلکہ لوگوں نے ان کی باغیانہ تصویروں کی مذمت کی آج وہ اقلیم فن کے تاجدار مانے جاتے ہیں اور ان کے نام کی پرستش ہو رہی ہے۔ ان با کمال ہستیوں نے اس رمز کو دنیا پر آشکارا کر دیا کہ مصوّری کو نہ تواریخی واقعات کی اعانت کی ضرورت ہے، نہ دیو مالا اور اسطور کے افسانوں کی، اور نہ اس کی عظمت کا انحصار اخلاقیات پر ہے۔ جب ہم کسی حسین جاذبِ نظر تصویر کا معائنہ کرتے ہیں تو اس

وقت یہ خیال ہم سے کوسوں دور ہوتا ہے کہ آیا اس تصویر سے ہمیں کوئی اخلاقی سبق ملتا ہے یا نہیں وہ لمحے تو لطف اندوزی کے ہوتے ہیں نہ کہ درس گیری کے۔ سب سے پہلے ہماری آنکھوں کو ایک صدمۂ تحیّر ہوتا ہے اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ ذہن میں تصویر کا باطنی حُسن سرایت کرنے لگتا ہے۔ کبھی ہم حسین رنگوں کی ہم آہنگی سے مسرت اندوز ہوتے ہیں، کبھی دھوپ چھاؤں کے پُر لطف اور ملائم کیف کا مزہ لوٹتے ہیں۔ دل اندر ہی اندر خفی حلاوتوں میں گھلنے لگتا ہے اور تمام تصویر آنکھوں کا گیت بن کر اپنے ترنّم خاموش سے ہمیں مسحور کر لیتی ہے

فرض کیجئے کسی فن شناس کے مقابل ایک تصویر لا کے رکھ دی گئی ہے جسے اخلاقی نقطۂ نظر سے بنایا گیا ہے اور جو خیرات کے نام سے تعبیر کی جا سکتی ہے۔ تصویر یہ ہے کہ ایک بھکارن خستہ حال بھوک سے جاں بلب کسی امیر کے دروازے پر کھڑی ہے۔ اندر سے ایک عورت نکل کر اس کی جھولی میں روٹی ڈال رہی ہے۔ اگر یہ واقعی اونچے پایہ کا نقش ہے اور کسی باکمال فنکار کی صناعی اور نازک خیالی کا نتیجہ ہے تو فن شناس فوراً اس سے متاثر ہوگا اور اس پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جائیگی کیونکہ فن کے افسوں کو کارگر ہوتے دیر نہیں لگتی قدر داں سامنے کھڑا ہے اس کا دل تصویر کے حسنِ مجموعی سے بار بار ہمکنار ہو کر لذّت یاب ہو رہا ہے دونوں عورتوں کی شکلیں ان کے جسمانی انداز کی من موہنی موزونیت اور نقشہ کشی کی قوتِ اظہار دیکھکر اس پر جادو کا اثر پڑتا ہے اس کی سرشار روح رنگوں میں ڈوب ڈوب کر تیرنے لگتی ہے اس کی آنکھیں بھونرے کی مانند تصویر کی شگفتہ سطح پر منڈلا منڈلا کر کونے کونے سے مسرت کے نشیلے گھونٹ نوش کرتی ہیں گویا تمام تصویر ایک مجسّم ساقی ہے۔

دریا دل اور سخانہ بردوش، جو اُسے جام پہ جام پلا رہی ہے اور وہ رندانہ وار پی رہا ہے۔ اس لطف و نشاط کے وقت اسے اس بات کی فرصت کہاں کہ وہ تصویر کے اخلاقی پہلو کی طرف متوجّہ ہو اور اس سے فیض حاصل کرے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

یہ تو اسے معلوم ہے کہ تصویر ایک کارِ خیر کی ترجمانی نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کر رہی ہے لیکن اس کے خط اور جذباتی سرور کا دور دراز کا تعلق بھی اس کارِ خیر سے نہیں۔ دوسرے لفظوں میں موضوعِ تصویر کا کوئی علاقہ لطفِ تصویر سے نہیں ہے۔

آرٹسٹ نے دیکھا ایک عورت دروازے سے نکل کر کسی غریب بھکارن کو روٹی دے رہی ہے۔ دروازے کا رنگ شوخ لبنتی ہے۔ دیوار سفید پیلاہٹ لئے ہوئے ہے۔ عورت کی ساری آسمانی رنگ کی روپہری حاشیہ والی اور اس کا سیاہ جوڑا ایک سُرخ پھول سے مزیّن، بھکارن کا ہنگامے رنگ کا آنکھیں کوفت اور نقاہت سے جھکی ہوئی ہیں، بال بکھرے ہوئے ہیں اسی منظر نے آرٹسٹ کے دل میں ہیجان پیدا کر دیا اور اس کی تخلیقی فطرت اس امر کی مقتضی ہوئی کہ وہ اُسے تصویر کا جامہ پہنائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تصویر کا موضوع خواہ وہ خیالی ہو خواہ مشاہداتی صرف اتنی ارتسامی اہمیت یعنی (Pictorial Significance) رکھتا ہے کہ اس نے فن کار کے جذبات اور تخیلات کو بیدار کیا اور اشتعال دلایا۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔ اسے کوئی نسبت نہیں ہے، اُن محاسن اور اوصاف سے جو فن کے ذاتی حُسن کو تعمیر کرتے ہیں۔

وہ لوگ جو فن میں اخلاقیات کو شامل کرنا ضروری سمجھتے ہیں اس بات سے بے خبر ہیں کہ فن کا حُسن و جمال ہی اس کا اخلاق ہے۔ فن کا حسین ہونا ہی اس کی اخلاقیات کی دلیل ہے۔ جب بُت تراش پتھروں اور چٹانوں کو کاٹ کر انہیں جیتی جاگتی شکلوں اور لبریز حیات مجسّموں کا حامل بنا دیتا

ہے یا مصوّر کپڑے کی سفید بنجر خلا کو متبسّم رنگوں۔ شبیہوں اور دل پذیر منظروں سے معمور کر دیتا ہے تو اظہارِ جذبات کے ساتھ ساتھ اس کا اخلاقی فرض بھی آپ سے آپ ادا ہو جاتا ہے کیونکہ اس نے حسن کی تعمیر کی ہے اور فن کی دنیا میں حسن بذات خود جوہر اخلاق ہے۔ اس کے لئے فن کا سب سے بڑا رُوحانی اور اخلاقی فعل یہ ہے کہ وہ حُسن کی قوت اور ساری سے حیاتِ انسانی کے شباب کو برقرار رکھے۔ پژمُردہ اور زرد زندگیوں کو خونِ بہار سے سیراب کرتا رہے اور وہ نامراد دل جو دنیا کے تفکّرات سے پریشان اور خستہ حال ہیں انھیں رنج و غم سے نجات دلاکر روحانی آسودگی اور مسرّت کا پیام دے اور ان کے تیرہ ویرانوں میں محبّت کی قندیلیں جلائے۔

اس سے زیادہ فن کی اخلاقیات کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ایک خوبصورت شاہکار کو دیکھ کر ہم ایک ہی جست میں اپنے مادّی ماحول سے نکل کر الہامِ حُسن کی آسمانی رفعتوں میں پہونچ جاتے ہیں۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری زنجیریں کٹ گئیں اور ہمارا دل دُنیا کی کثافتوں اور شر انگیز کشمکشوں سے پاک اور آزاد ہو کر الوہیت کی اس اونچی اور لطیف فضا سے واصل ہو گیا ہے جس کی آغوش میں مسرّت کی نورانی لہریں کھیلتی ہیں اور جو ظلمتی تشنگیوں اور تازگیوں کی دولت سے مالا مال ہے۔ یہی فن کی اخلاقی اعجاز ہے یہی فن کا روحانی کرشمہ ہے، شگفتہ مرجھائے ہوئے دلوں کو حسن کے چھینٹوں سے نو تازہ کرنا۔ اندھی دلدل میں پھنسی ہوئی زندگیوں کو اُبھار کر نور کی سطحوں پر لانا۔

جو لوگ اہلِ نظر ہیں اور ساتھ صاحبِ دل بھی ہیں، وہ فن میں صرف حسن کو ڈھونڈتے ہیں، اُنھیں اخلاقیات سے کوئی واسطہ نہیں۔ آپ تمام اخلاق جلالی کی تصویریں اُٹھا لائیے اس سے اُنھیں غرض نہیں۔ وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ میزانِ حسن میں تصویر کو کیا وزن حاصل ہے۔

کسی نقش کا فنّی تجزیہ کرتے وقت اس کے موضوع کی طرف وہ سب سے آخیر میں متوجّہ ہوتے ہیں کیوں کہ وہ ایک ثانوی اور سطحی امر ہے جس کا تصویر کے مرکزی اور اندرونی اوصاف سے کوئی ربط نہیں۔ وہ تصویر میں رنگوں کی لطافت اور ان کے حُسن آمیزش کو دیکھتے ہیں۔ سلجھے ہوئے خطوط کی قوّت اور بے ساختگی پر نظر ڈالتے اور اندازہ لگاتے ہیں کہ فنکار کو اپنے قلم پر کس درجہ عبور حاصل ہے۔ وہ شکلوں کی اجتماعی ترکیب اور ان کے باہمی لگاؤ اور تعلق کو دھیان میں لاتے ہیں تصویر کا سراپا ساخت اور اس کی تکمیل اس کے آرائشی پہلو اور طرزِ اسلوب پر غور کرتے ہیں۔ میری مراد یہ نہیں کہ فن میں اخلاقی موضوع کا ہونا جُرم ہے۔ میرا مطلب تو صرف یہ ہے کہ اس کی شمولیت سے فن کی بزرگی اور خوش نمائی میں رتی بھر بھی اضافہ نہیں ہوتا۔ یہی بات ہے کہ عصرِ حاضر کے نامی گرامی مصوّر اخلاقی موضوعات سے گریز کرتے ہیں اور وہ ان کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ایک زمانہ تھا جب یورپ کے فن کار ادبی دینی اور اخلاقی مضمونوں کو تصویروں میں ادا کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد شعبدہ بازوں کی تھی جو فن کی خامیوں کو چھپانے کیلئے اپنی تصویروں کو بڑے بڑے ناموں سے موسوم کرتے تھے تاکہ دیکھنے والے رُعب میں آجائیں اور ان کی بلند خیالی اور نیک دلی کی مدح سرائی کریں لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس مکر و فریب کی حقیقت کھل گئی اور لوگ اس قسم کے فن سے عاجز آ گئے۔ موجودہ زمانے میں اُسی فن کی قدر کی جاتی ہے جو نہ اخلاقیات کا مرہونِ منّت ہو نہ ادبیات کا جس کا وقار اس کے ذاتی حُسن پر قائم ہو جو اپنے سحر رنگیں سے آنکھوں کو دعوت دے اور رس بھرے جذبوں اور بھاؤں کی ہریالی سے دلوں کو سرسبز اور شگفتہ رکھے ●

## باقر مہدی

## ۳ ستاری نظمیں

(یہ نظمیں اُستاد ولایت خاں کے عظیم فن سے متاثر ہو کر کہی گئی ہیں)

### ۱۔ آواز کی چڑیاں

"تاں تنا آں ـــ تاں"
انگلیوں کا لمس پیہم
لمحہ لمحہ
ننھی ننھی
آوازوں کی بوندیں

فضا میں:
اَن دکھی، انجان چڑیوں کی طرح
اُڑنے لگیں:
اور گہری نغمگی کی روشنی
بڑھتی ہوئی ـــ بڑھتی رہی
خامشی کے پھول مہکے

اور پھر ـــ
"برسن لاگی گھنا گھنگھور"
جیسے آوازوں کے اس یلغار میں
بچ نہ پائے گی کوئی شے
لفظ و معنی کے جزیرے
ڈوب کر اُبھرا کئے
ڈوبا کئے
صرف ان دکھی، انجان چڑیاں
اس طلسماتی فضا میں
دیر تک اُڑتی رہیں

### ۲۔ معجزہ

ـــ اور پھر وہ معجزہ ہو کر رہا
ایک ایسی کیفیت چھانے لگی
جیسے رگ رگ میں چاندنی کے ساتھ ساتھ
صبح کی شبنمی کرنیں گھلیں
جسم کے سارے اعضا اُڑ گئے
صرف باقی رہ گئے ـــ :
دو کان

ـــ اور پھر چاند، سورج، وقت کے سارے ستارے
دائرے میں گھوم کر
گھوم کر
ننھی ننھی بوندیوں میں کھو گئے
اور اک آواز کا پیکر جنم لینے لگا

### ۳۔ آواز کے رنگ

انگلیاں سننے لگیں
آنکھوں میں سماعت کی چمک آنے لگی
دل میں دھڑکن کی جگہ
راگنی کی برق رو بہنے لگی
رنگ آوازوں کے رنگ

سبز، پیلے، بینگنی ـــ لال رنگ:
جگمگا اُٹھے کئی پامال رنگ:
اک دھنک سی چھا گئی
"برسن لاگی گھٹا گھنگھور"
رُوح کی ساری حدیں ٹوٹیں
نغمگی کا آبشار
دیر تک گرتا رہا

# تاج محل

## سعادت نظیر

نظر فریب ہے "جمنا میں عکس" تاج محل
جو دُور سے نظر آتا ہے اک سفید کنول
بساطِ ارض پہ سیماب جم گیا تو نہیں
فضائے شب میں ستارا کوئی گرا تو نہیں
نہیں، نہیں، یہ سحر کی ضیا مجسم ہے
شباب حُسن کی انگڑائیوں کا عالم ہے
لئے ہوئے کوئی مہ وش ہے ہاتھ میں چھاگل
کہ اُس کے سینے پہ لرزاں ہے دودھیا آنچل
خیال آتا ہے کس شوخ کے تبسم کا
ادا و ناز سے اک دلنشیں ترنم کا
یہ چھت، یہ طاق، یہ محراب یہ در و دیوار
فنِ لطیف کے غماز ہیں یہ نقش و نگار
بچھی ہے سوزشِ دل جیسے سنگِ مرمر میں
مچل رہے ہیں شرارے ہر ایک پتھر میں
کسی کے خواب کی تعبیر ہے یہ "تاج محل"
کہ حُسن و عشق کی تصویر ہے یہ "تاج محل"
جگا دیا کسی نقاش نے نیا جادو
کہ رُک گیا رُخِ فطرت پہ مشق کا آنسو
دکھائی دیتے ہیں ہر سمت خوش نما منظر
چمک رہے ہیں ابھی تک کمال کے جوہر
فضا خموش ہے، حیرت میں ہیں در و دیوار
سُنا رہے ہیں کہانی کسی کی، نقش و نگار
جمالیات کا اک آئینہ ہے تاج محل
نگاہِ شاعرِ فطرت میں ہے حریمِ غزل
کمالِ حسن و محبت کا شاہکار ہے یہ
کبھی جو مٹ نہ سکے گی وہ یادگار ہے یہ

# گذرے ہوئے

# بالوں کی [redacted] بات

یوسف ناظم

بغیر بالوں کا سر آدمی کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ نہایت ، گول اور بلور کی طرح چمکنے والے سر صرف چند ہی لوگوں کے حصّے میں ۔ کئی سر آدھے یا ایک چوتھائی حصے تک صاف ہو کر تھک جاتے ہیں۔ یہ سفر ہوتا ہے۔ اسے بریک جرنی کہہ لیجئے۔ سر کے سفر کی آخری منزل وہ ہے اُس پر سوائے آسمان کے اور کسی چیز کا سایہ نہ ہو۔ ایسے صاف ستھرے ، جو شخص مالک ہوتا ہے۔ اُس کا دُنیا میں کوئی بھی بال بیکا نہیں کر سکتا ۔ سی لئے کم عمر لوگوں کے حصّے میں نہیں آتے۔ ایسا سر حاصل کرنے کے لئے ، کا بڑا حصہ نیک کاموں میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ سر اُوپر سے خالی ہو تو اس ب ہرگز نہیں ہوتا، کہ وہ اندر سے بھی خالی ہے۔ بعض خوش قسمت لوگوں ں البتہ سری سب سے ہلکی چیز ہوا کرتا ہے۔ اس میں صرف سر کے بالوں ، ہوتا ہے۔ ایسے سرگنتی میں تو زیادہ ہو سکتے ہیں لیکن اُن کی سماجی ، اور علمی حیثیت بس اتنی ہی ہوتی ہے جتنی خط لے جانے والے ہرکارے ہے۔ جو سر اندر سے خالی ہوتے ہیں، اُن کی آرائش و زیبائش پر بھاری ، کی جاتی ہے۔ بالوں کو چمکدار رکھنے، اُنہیں لہریا اور گھنگھریالے بنانے یا سر سے اور زیادہ گمبھان اور زرخیز بنانے کے لئے لوگ کوئی کسر اُٹھا نہیں ، ایسے آدمی جن کے سر پر بال نہیں ہوتے، سب فکروں سے آزاد ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جب اِن کے سر کا وزن کم ہونا شروع ہوتا ہے تو یہ سڑک پر چلنے والے ہر شخص سے اور بس میں سفر کرنے والے ہر بن مانس سے یہ مشورہ کرتے ہیں کہ اِس پت جھڑ کو کیسے روکا جائے۔ وہ ایک ایک دن میں کئی کئی نسخے آزماتے ہیں اور جب ہر نسخہ اُن کے بالوں کی تعداد سے دشمنی پر آمادہ نظر آتا ہے تو وہ اِن نسخوں پر پیسہ خرچ کرنے سے ہاتھ روک لیتے ہیں اور اِن ہاتھوں کو اپنے سر پر پھیرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اِس میدان میں تحقیق کرنے والوں کا کہنا ہے کہ بغیر بالوں کے سر والے آدمی کو اپنی آخری منزل پر پہونچنے کے لئے کم سے کم پانچ سال کی مدت ضرور لگتی ہے۔ اِن پانچ سال کی مدت میں اُن کے سر کا ایک ایک بال اُسے خدا حافظ کہہ دیتا ہے اور اس کا سر ہر طرف سے بیجاپور کے گول گنبد کی طرح دکھائی دینے لگتا ہے۔ ایسے عمدہ اور شریف آدمی کی آخری منزل وہ ہوتی ہے جب دیکھنے والے کو پتہ نہ چلے کہ وہ دیکھنے والے کی طرف آرہا ہے یا مخالف سمت میں جارہا ہے۔ بِنا بالوں کے سر والے لوگ کم خرچ تو ہوتے ہی ہیں لیکن وہ بالانشیں بھی ہوتے ہیں۔ بالانشیں اس طرح کہ کہیں بھی بیٹھیں نمایاں رہتے ہیں۔ وہ آدمی جس کے سر پر بال نہ ہوں مدبر سمجھا جاتا ہے (مدبر اس شخص کو کہتے ہیں جو عمر بھر لوگوں کو دھوکے میں رکھے اور خود بھی دھوکے

میں رہے) پایا۔ وصافی سر رکھنا بڑے آدمی ہونے کی بھی نشانی ہے۔ سیزر جس نے روم کو فتح کیا تھا اپنے سر پر کچھ نہیں رکھتا تھا۔ اُس کے سر پر بال ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے تھے۔ امریکہ کے صدر آئزن ہاور نے بھی بغیر بالوں کا سر حاصل کرنے میں اتنی ہی شہرت حاصل کی تھی جتنی رُوس کے سابق وزیر اعظم خروشچیف نے حاصل کی تھی، اور اتفاق سے یہ دونوں ہم عمر اور عصر بھی تھے۔ وہ وقت بھی ایسا تھا جب سر پر بال لئے گھومنا سیاست دانوں کے لئے تقریباً منع تھا۔

پہلے زمانے میں آدمی کے سر کے بال گننا بہت مشکل تھا لیکن اب یہ کام کسی کمپیوٹر کی مدد کے بغیر بھی آسان ہو گیا ہے۔ مرد آدمی کے سر پر اب صرف اتنے بال رہ گئے ہیں کہ آئینوں اور کنگھوں کی تجارت بس عورتوں ہی کے دم قدم سے باقی ہے۔ آئینوں کی تجارت کو تو خیر کوئی نقصان نہیں پہونچے گا اس لئے کہ آدمی کی صورت چاہے کیسی ہی ہو اسے وہ ضرور آئینے میں دیکھتا ہے۔ نہ صرف دیکھتا ہے بلکہ بار بار دیکھتا ہے اور گھر میں دو چار جگہ تو آئینہ رکھ ہی چھوڑتا ہے تاکہ جب بھی نظر پڑے تو اپنی ہی موہنی صورت نظر آئے۔ ہر شخص کو اپنی صورت میں چار چھ سُرخاب کے پر ضرور لگے نظر آتے ہیں۔ پہلے زمانے میں تو لوگ اپنے آپ کو ہر سمت سے دیکھنے کے لئے آئینہ خانہ بنوانے میں بھی تکلف نہیں کرتے تھے۔ آدمی اب بھی کچھ زیادہ بدلا نہیں ہے اور اُس کی اپنے آپ سے اس قدر گہری محبت اور عقیدت کی وجہ سے آئینوں کو نقصان پہونچنے کا خطرہ نہیں ہے لیکن اگر آدمی کے سر سے بالوں کے رخصت ہونے کی رفتار اتنی ہی راکٹ شکن رہی تو کنگھے البتہ بازاروں سے غائب ہو جائیں گے۔ سر آدمی بغیر بالوں کے سر حاصل کرنے کی طرف اس تیزی سے بھاگ رہا ہے گویا اُسے ڈر ہے کہ اگر اُس کے سر کے بال جلد نہیں گرے تو لاٹری کا پہلا انعام اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ آدمی کے سر کے بالوں کی خوبی یہ ہے کہ اوّل تو یہ سر پر زیادہ دیر رہتے نہیں اور اگر رہتے ہیں تو رنگ بدل کر رہتے ہیں۔ سر کے بال بھی آدمی کے خون کی طرح سفید ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ چودہ پندرہ سال کے لڑکوں کے سر پر بھی سفیدی پھر گئی ہے۔ کسی کالج یا اسکول میں جائیے تو بیسیوں سر وائٹ واش شدہ مل جاتے ہیں اور کلاس میں بیٹھے ہوئے طالب علم خود اپنے والدین نظر آتے ہیں۔

گنجے سر کے بالوں کے غائب ہونے کے متعلق بڑے بڑے حکیم اور ڈاکٹر اب تک شک و شبہ میں مبتلا ہیں۔ وہ بتا نہیں سکتے کہ یہ بیمار ہے یا تندرستی کی علامت۔ کئی حکیم اور ویدجنہوں نے سر پر بال اُگانے کے نسخے بنائے اور تیل ایجاد کئے۔ یہ نفس نفیس خود اپنے سر کے بالوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اب یہ حکیم اور اُن کے خاندان والے دل ہی دل میں اُن لوگوں پر ہنستے ہیں جو اِن کا بنایا ہوا تیل اونچے داموں پر خرید کر اپنے سر کے رہے سہے بالوں کو بھی موت کی نیند سلا دیتے ہیں۔ سر کے بالوں کو ہمیشہ قدرت کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ آدمی کی تباہی کا انحصار اُس کے سر کے بالوں پر نہیں، سر کے اندر کے مغز پر ہوا کرتا ہے●

# غزل

محمود عشقی

دائروں میں سوچ کے سہمے ہوئے
جل رہے تھے بے دلی سے کچھ دیئے
موت سے اُلجھے ہوئے ہیں سر پھرے
زندگی بڑھ کر اُنہیں آواز دے
دشمنوں میں دوستی ہونے لگی
دوستوں میں بڑھ رہے تھے فاصلے
اس قدر یادوں نے کی نشتر زنی
ہو گئے لوگوں کے گھائل حافظے
لے گئیں موجیں اُٹھا کر کشتیاں
اور ساحل ہات پھیلاتے رہے
کروٹیں لیتی رہی بستر پہ نیند
الگنی پر خواب لہراتے رہے
ہو گئے وابستہ ویرانوں سے ہم
وہ گلستاں کی طرح پھولے پھلے

# بیان میرٹھی

مدثر حسین

**بیسویں** صدی کی موجودہ دہائی میں اُردو شعر و ادب پر معتدبہ تحقیقی و تنقیدی کام ہوا ہے۔ اس کے باوجود ابھی تک بہت سے باکمال شعرا ایسے باقی ہیں جو گمنامی کے تاریک گوشوں میں پڑے ہیں۔ اُنہیں میں سے ایک بیان میرٹھی بھی ہیں۔ بیان میرٹھی کے قعرِ گمنامی میں رہنے کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اُن کا کلام ترتیب نہ پا سکا اس لئے اہلِ نظر اُردو شاعری میں اُن کا صحیح مقام متعین کرنے سے قاصر رہے۔

آپ کا پورا نام سید محمد مرتضیٰ تھا۔ بیان تخلص کرتے تھے۔ سنہ ۱۸۵۰ء میں جھانسی میں آپ کی ولادت ہوئی۔ زندگی کا بڑا حصہ میرٹھ میں گزرا اس لئے میرٹھی مشہور ہوئے۔ ویسے اُن کے بزرگوں کا زادبوم قصبہ جارچہ (ضلع بلند شہر تھا) سلسلۂ نسب حضرت امام رضا علیہ السلام سے ملتا ہے۔ آپ کے والد سید گوہر علی صاحب نے موضع اُلدن ضلع میرٹھ کے رئیس سید عمر دراز علی صاحب کی صاحبزادی سے شادی کی تھی جو جھانسی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ وہیں اپنے نانا کے گھر ان کی پیدائش ہوئی۔

گوہر علی صاحب علوم متداولہ پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ بیان نے اُن کے زیرِ سایہ درسی کتب کی تکمیل کی۔ اس کے بعد ذہنِ رسا اور ذاتی جوہر قابل نے استعدادِ علمی میں اضافہ کیا۔ جملہ علوم و فنون کا عمیق مطالعہ کیا اور ایک جیّد عالم، بلند پایہ عالم اور صاحبِ طرز شاعر کی حیثیت سے قرطاسِ شعر و ادب پر اپنی مہر ثبت کی۔ خاص بات یہ کہ کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا۔ سید احمد حسین فرقانی نے ان کے ذوقِ سخن کو جلا دی۔ فرقانی فارسی کے اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور رشتہ میں بیان کے ماموں تھے۔

بیان میرٹھی تمام عمر شعر گوئی کرتے رہے۔ لیکن آپ کا کلام نایاب ہے۔ چند غزلیں جو دستیاب ہو سکی ہیں۔ اُن سے بیان کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بیان میرٹھی نے حالیؔ، آزاد، اور اسماعیل میرٹھی کی طرح غزل، نظم، مثنوی، مسدس، مرثیہ اور رباعی وغیرہ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ انہوں نے نہ صرف اُردو میں شاعری کی بلکہ فارسی میں بھی اپنے رہوارِ قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ وہ فارسی میں یزدانی تخلص کرتے تھے۔ چنانچہ بعض جگہ اُن کا نام بیان یزدانی تحریر ہے۔

بیان یزدانی نے شعر و سخن کی بدلتی ہوئی ہواؤں کا ساتھ دیا۔ وہ اپنے عہد کے باذوق دست نبض شناس تھے۔ اپنے معاصروں میں وہ صفِ اوّل کے شعرا میں شمار کئے جاتے تھے۔ حالی سے معاصرانہ چشمک اور اودھ پنچ

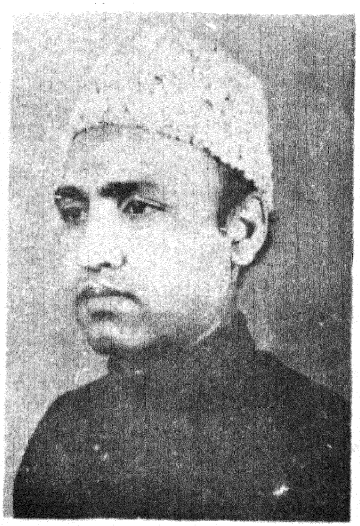

مدثر حسین

سے بھڑوں کی ہمت کسی ایسے ہی شخص میں ہوسکتی تھی، جو زبان و بیان پر قدرت کاملہ رکھتا ہو۔ اعلیٰ پایہ کا شاعر ہو، زبردست ادیب ہو اور صحافی بھی۔ بیان یزدانی میں یہ تینوں صفات مجتمع ہوگئی تھیں۔ شاعر کی حیثیت سے انہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ اُن کا کلام اُس وقت کے معیاری رسائل میں شائع ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک مُدیر کی حیثیت سے کیا اور اُنہوں نے رسالہ "جلوۂ طور" کی ادارت کی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا ذاتی اخبار "طوطیٔ ہند" نکالا۔ طوطیٔ ہند بند ہوا تو ۱۸۸۶ء میں انہوں نے "لسان الملک" جاری کیا جو تقریباً ۴ سال تک اشاعت پذیر ہوتا رہا اور ان کے انتقال کے ساتھ ہی ختم ہوا۔ انہوں نے ایک ظریفانہ رسالہ طوفان بھی جاری کیا تھا۔ تمام عمر صحافت سے وابستگی یہ بتاتی ہے کہ اُن میں وہ تمام صلاحیتیں ہوں گی جو ایک اعلیٰ درجہ کے صحافی کے لئے ازبس ضروری ہیں۔

صاحب خمخانۂ جاوید نے بیانؔ کے متعلق لکھا ہے کہ میرٹھ کے نامور اور قابل شعراء میں تھے۔ استعداد علمی بہت معقول اور فن سخن میں دستگاہ کامل حاصل تھی۔ نظم و نثر پر قادر تھے۔ مبدء فیاض سے شعر گوئی اور سخن فہمی کا نہایت شستہ اور صحیح مذاق آپ کو ملا تھا۔ فارسی میں نہایت قابلیت کے ساتھ داد سخن دری دی ہے۔ جملہ اصناف سخن پر قادر تھے۔ جس رنگ میں چاہتے فکر سخن کرتے۔ اس رنگ میں اپنی زور طبیعت سے وہ وہ اختراعیں کرتے کہ سننے والے حیران رہ جاتے۔ مولانا حالی کے مسدس کے جواب میں آپ نے بھی ایک مسدس لکھا تھا۔ اُردو میں صاحب دیوان تھے۔ مگر ہنوز شائع نہیں ہوا ہے۔ تاہم اکثر غزلیں زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں۔ ساٹھ[1] سال کے قریب عمر پاکر ۱۹۰۰ء میں بمقام میرٹھ انتقال کیا۔

سر عبدالقادر نے ۱۹۲۳ء کے ادبی دُنیا میں بیان کے بارے میں تحریر فرمایا کہ وہ ایک فطری شاعر تھے۔ زبان پر اُنہیں قدرت تھی اور کلام میں بے ساختہ پن تھا۔ اُن کے شاگرد سرور جہاں آبادی کا قطعہ ہے ؎

میر و مرزا سے زیادہ ترا رتبہ نہ سہی
اُن سے کم تھا ترا پلّہ یہ کہیں ہم کیونکر
چوم لیتی تھی فصاحت ترا منہ وقتِ کلام
اے بیاں ختم تھی اعجازِ بیانی تجھ پر

غالب کے رنگ میں شعر کہنا سہل کام نہیں ہے۔ بیان کو دیکھئے زمین بھی غالب کی ہے۔

صبح قیامت آئے گی کوئی نہ کہہ سکا کہ یوں
آئے وہ در سے ناگہاں کھولے ہوئے قبا کہ یوں
کیونکہ جھکے نسیم سے، سوچے تھی نرگسِ چمن
دیکھ کے چشمِ ناز کو آنے لگی حیا کہ یوں
رزق نہیں ہے بن تلاش کہتی تھی تنگیٔ معاش
گردشِ سنگ آسیا دینے لگی صدا کہ یوں

بیانؔ کی ایک اور غزل کے تین اشعار ملاحظہ کیجئے۔ ان پر کلام غالب کا دھوکا ہوتا ہے۔

ان کا منجملۂ ارباب وفا ہو جانا
میرے نزدیک ہے بندے کا خدا ہو جانا
قلبِ ماہیت اشیاء ہے یہ تاثیر فشار
درد کو چاہئے پہلو میں دوا ہو جانا
تھا جو در پردہ بیاں زخمہ زنِ تارِ نفس
مجھ کو ہر پردے میں تھا پردہ سرا ہو جانا

بیان کے کلام میں معنی آفرینی اور نازک خیالی کے بہت سے قابل ملتے ہیں۔ اُن کے تخیل میں کبھی بے اعتدالی یا بے تعلقی پیدا نہیں ہوتی۔ انہوں کی لطافت و شگفتگی کو برقرار رکھا ہے۔ ذیل کے چند اشعار سے بیانؔ کی الکلامی، بلندیٔ تخیل، دقت پسندی، نازک خیالی، اور شوخیٔ بیان کا ہوسکتا ہے۔

اے مرغ، پاؤں دیکھ کے رکھنا زمین پر
پھیلا ہوا ہے کیسا رسوم و قیود کا
بلند پائنچہ، پاشوخ، نازنیں گردن
گیا ہے خون شہیدوں کا رائیگاں کیسا

---

[1] لالہ سری رام کا یہ اندازہ کہ بیانؔ نے ساٹھ سال کی عمر پائی درست نہیں ہے۔ بیان ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳ مارچ ۱۹۰۰ء وفات پائی۔ اس حساب سے اُن کی عمر ۵۰ سال ہوئی۔

ادھر دیکھ لینا ، اُدھر دیکھ لینا
پھر اِس شوخ کو اِک نظر دیکھ لینا
شیخ کے ماتھے پہ مٹی ، برہمن کے بر میں بُت
آدمی دیر و حرم سے خاک بچھرے چلا
غضب کو دم، ادا کو دیں، نگہ کو دل، مژہ کو جاں
غنیمت جانتا ہے حسن افواجِ ستمگراں کو
ہاں لکد کوبِ زمیں ہے تو عنانِ ریزِ فلک
تو سنِ ابلقِ ایام کی شوخی کب تک
سچ مچ وہ شعلہ بن گئے کیفِ شراب میں
کافر نے اور آگ لگا دی شباب میں
نہاں ہے دانۂ تسبیح میں زُنّار کا ڈورا
مبارک اے برہمن شیخ بھی ہے رشتہ داروں میں
شہادت منزلِ مقصود ہے ملاح قاتل ہے
یم تواجِ بیتابی دمِ شمشیر ساحل ہے

رنگِ داغ و امیر میں بیان کی قادرالکلامی کا نمونہ یہ غزل ہے۔

جگر عارض کا شیدا ہے تو دل زلفوں پہ مائل ہے
شہید بدر وہ یہ کشتۂ جنگ سلاسل ہے
چل آتی ہیں نذریں دھوم سے دیدارِ قاتل ہے
کسی کا سر ہتھیلی پر کسی کے ہاتھ میں دل ہے
کہاں لے جاؤں دل دونوں جہاں میں اسکی مشکل ہے
یہاں پریوں کا جھمگٹ ہے وہاں حوروں کی محفل ہے
مرا دل لیکے شیشے کی طرح پتھر پہ دے پٹکا
میں کہتا رہ گیا ظالم مرا دل ہے مرا دل ہے
ہزاروں دل مسل کر پیر سے جھنجلا کے یوں بولے
لو پہچانو تمہارا ان دلوں میں کونسا دل ہے

بیان کا جو کلام دستیاب ہو سکا ہے اس میں غزلوں کے علاوہ چند مرثیے بھی ہیں۔ بیاں نے جدید نظمیں بھی کہی تھیں۔ راقم السطور کو کوئی نظم دستیاب نہ ہو سکی۔ اس لئے نمونہ پیش کرنے سے قاصر ہے

پچاس سال کی عمر میں ۱۳ مارچ ۱۹۰۱ء کو بیان یزدانی نے جاں جاں آفریں کو سپرد کر دی۔ امیر مینائی نے مصرع تاریخ کہا

یزداں بخشد جناب یزدانی را ●

# غزلیں

## شاہین غازی پوری

لغزشوں کا ہی سہارا ہے نہ سنبھلا جائے ہے
ایک چھوٹی آرزو بھی کیا ستم ڈھا جائے ہے
میں اکیلا ہی چلا تھا جمع خلقت ہو گئی
اب چلا ہی جائے ہے یارو نہ ٹھہرا جائے ہے
روشنی ہے تیز اتنی کچھ نظر آتا نہیں
اک اندھیرا ہے کہ آنکھوں میں سمٹتا جائے ہے
دل کی طغیانی سے پتھریلے کنارے کٹ گئے
کس سمندر کے تجسس میں یہ دریا جائے ہے
اس کی بادل آنکھ نے شاہین بے کل کر دیا
ہائے وہ کاجل کہ بے اندازہ پھیلا جائے ہے

## عبدالحمید حمید عظیم آبادی

شمع کی لو بھی آج مدھم ہے ؛ کتنی تاریک یہ شبِ غم ہے
شمع بھی جل رہی ہے میرے ساتھ ؛ یہ بھی سوزِ جگر کی محرم ہے
شمع جلتی ہے دل بھی جلتا ہے ؛ اشتراکِ عمل یہ باہم ہے
حالِ غم میں کہوں تو پھر کس سے ؛ کیا غرض ہے کسی کو گر غم ہے
گر کسی کی نگاہ لطف آمیز ؛ زخمِ دل پر پڑے تو مرہم ہے
آزمائش پہ ہوگا یہ ظاہر ؛ کون دشمن ہے کون ہمدم ہے
کس کے غم میں یہ حال ہے اُن کا ؛ زلف اُلجھی ہے آنکھ پُرنم ہے
دشت صحرا میں ہے یہی کیا یارو ؛ خاک اُڑتی ہے ہو کا عالم ہے

ہنس پڑے دیکھ کر وہ تم کو حمید
یہ کرم بھی کسی کا کیا کم ہے

ستمبر ۱۹۷۰ء



## شباب للت

پُرکیف اس قدر مرے شام و سحر نہ تھے
جب تک حضور مرکزِ فکر و نظر نہ تھے
رنگینیٔ حیات سے ہم باخبر نہ تھے
جب تک تری نگاہ سے ہم بہرہ ور نہ تھے
انداز لطف اُن کے کبھی معتبر نہ تھے
ہر چند مہرباں تھے وہ ہم پر مگر نہ تھے
جب کارواں لٹا تو کھلا ہم پہ ماجرا
سمجھے تھے راہبر جنھیں ہم، راہبر نہ تھے
ہم پر جفائیں کیں جو پسِ پردہ آپ نے
ہم بے خبر تھے اُن سے مگر اس قدر نہ تھے
آئے ہو میرے گھر پہ تو یہ لطف خاص ہے
ورنہ تمہاری راہ میں کیا اور گھر نہ تھے
ملتا ہے مدتوں کے عمل سے کوئی مقام
لعل و گہر ازل سے تو لعل و گہر نہ تھے
منزل سے ہم کنار ہوئے کب وہ راستے
جن راستوں پہ آپ مرے ہم سفر نہ تھے
اللہ کتنا فرق طبیعت میں آ گیا
جانِ حیا! تم اتنے تو بیداد گر نہ تھے
اللہ رے جذبِ شوق کا عالم شباب میں
دیوار و در میرے لئے دیوار و در نہ تھے
ہر آن زندگی کا بدلتا رہا مزاج
ظالم کے رنگ ڈھنگ کبھی معتبر نہ تھے
تھی فکر و فن کی دولتِ بیدار اپنے پاس
ہم لوگ زندگی میں اگر اہلِ زر نہ تھے
دُنیا نے کی نہ قدر تو یہ اور بات ہے
ورنہ شباب اتنے تو ہم بے ہنر نہ تھے۔

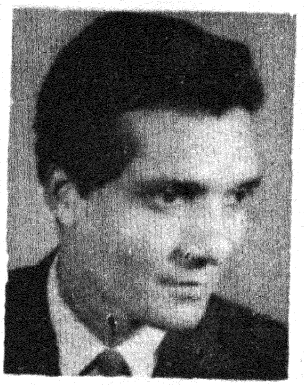

## شاہد کبیر

اُس کو یہ صد ہے کہ انسان بنائے گا مجھے
کیسی مٹی میں وہ لے جا کے ملائے گا مجھے
اُس کی راہوں میں بکھرنا مرا بے سود نہیں
اک نہ اک روز وہ ٹھوکر سے اٹھائے گا مجھے
اپنی اُجرت نہیں چھوڑے گا مہنانے والا
دیکھ لینا وہ کسی روز رلائے گا مجھے
اپنی دانست میں ہر درد سہے شنا سا لیکن
جنبی ہوں میں یہاں، کون بلائے گا مجھے
ہے کوئی مجھ میں ہی شائد جو کھلونے کی طرح
روز توڑے گا مجھے، روز بنائے گا مجھے

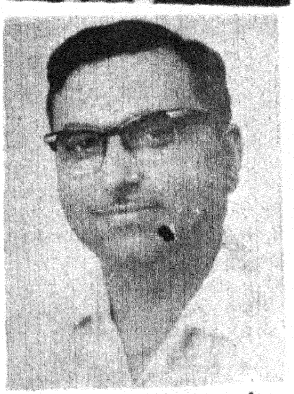

## مہیش پٹیالوی

دریائے جوشِ عشق اُتر ہی گیا نہ ہو
دل میں جو ولولہ تھا وہ مر ہی گیا نہ ہو
جس کی تجھے تلاش ہے اے میری بیخودی
وہ شخص سامنے سے گزر ہی گیا نہ ہو
دل کو تمہاری یاد نے آواز دی تو تھی
از راہِ دل لگی وہ ٹھہر ہی گیا نہ ہو
جس رہ گزر میں دھول ترے نقشِ پا کی ہے
تیرا نیاز مند اُدھر ہی گیا نہ ہو
طغیانِ آرزو نہ کہیں ولولوں کا شور
بستی میں کوئی آدمی مر ہی گیا نہ ہو
ڈھلتی نہیں جو دھوپ ترے انتظار کی
سورج ہمارے سر پہ ٹھہر ہی گیا نہ ہو
افشا کئے تھے جس نے تہیش اسماں کے راز
سودا وہ اپنے سر سے اُتر ہی گیا نہ ہو

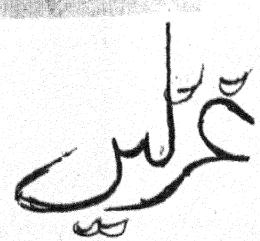

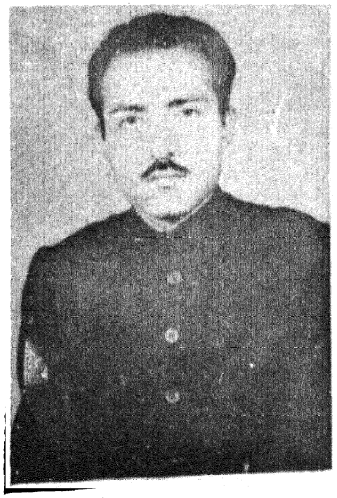

# ہندی شاعری پر اُردو کا اثر

نریش

**ہندی** ادب میں کھڑی بولی کی تحریک ۱۹۰۰ء کے قریب شروع ہوئی۔ اس سے پہلے شاعری کے لئے برج بھاشا کا استعمال کیا جاتا تھا۔ بھارتیندو کے زمانے میں کھڑی بولی کے استعمال پر زور دیا گیا۔ بعض عالموں نے اس تحریک کی مخالفت بھی کی۔ لیکن یہ مخالفت بے اثر رہی اور کھڑی بولی نے اپنے پاؤں جما لئے۔ جب ہندی کی کھڑی بولی کی شاعری نکھرنے سنورنے لگی تب اُردو شاعری اپنے جوبن پر آچکی تھی۔ ابتدائی نظموں کو چھوڑ کر اُردو شاعری کی زبان شروع سے ہی کھڑی بولی رہی ہے جسے ہندی والوں نے بہت بعد میں اپنایا۔ غرضیکہ بیسویں صدی تک اُردو زبان ایک صاف ستھری ادبی صورت اختیار کر چکی تھی اور اُسے کھڑی بولی ہندی کی طرح سیخنے سنورنے کی ضرورت نہ تھی[1] سنوارنے کی ضرورت تھی تو ہندی کھڑی بولی کو۔ ظاہر ہے کہ اس تشکیلی عمل میں ہندی پر اُردو کا اثر ضرور پڑا۔ کھڑی بولی کی تحریک کے اس زمانے میں ہندی والوں میں دو خیالات پائے جاتے تھے۔ ایک طبقہ یہ چاہتا تھا کہ ہندی سے اُردو کے تمام الفاظ نکال دیئے جائیں اور دوسرا یہ چاہتا تھا کہ یہ الفاظ بدستور قائم رہیں۔ مؤخرالذکر لوگوں میں پنڈت ایودھیا سنگھ اُپادھیائے ہری اودھ پیش پیش تھے۔ بقول ان کے "اُردو کا محاورہ بڑا خوبصورت ہے۔ اُس کی نازک خیالی تراش خراش، بندش، محاورہ، مبالغہ، استعارہ معرکے کا ہے۔ ہندی بھاشا کے شاعروں کو خاص طور پر کھڑی بولی میں نظم کہنے والوں کو اُنہیں دیکھنا چاہیئے۔ وہ بڑے کام کی چیزیں ہیں۔ اُن سے بڑی حد تک مستفید ہوا جا سکتا ہے[2]" خود بھارتیندو بابو جب نظم کہتے تھے تو اُن کا طرز اور اُن کی شاعری کا انداز اُردو کا ہوتا تھا یا خالص بنارسی کا[3]۔

ہندی کے قابلِ تعظیم ادیب آچاریہ مہاویر پرساد دویدی کی ہمدردی بھی انہیں لوگوں کے ساتھ تھی۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ "جان بوجھ کر بھاشا کو اونچا درجہ دینا ہندی کے پیروں پر کلہاڑی مارنا ہے[4]"۔ اُردو کے ہندی پر اثر انداز ہونے کا ایک بڑا سبب اُن لوگوں کی اعلیٰ ظرفی اور فراخدلی بھی ہے۔

اُردو الفاظ کو ہندی میں استعمال کرنے کا مسئلہ تو دیر تک زیرِ بحث رہا مگر اس کے حامیوں نے برابر اُردو الفاظ کا استعمال کیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی زبان میں اُردو جیسی روانی اور چستی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جہاں ہری اودھ نے کہا

دیں نہ علوے چین تو کر دے نہیں ؛ ناتھ کب تک دیکھتے جلوے رہیں
کب تلک ولوے رہیں گے دیش میں ؛ کب تلک ہم چاٹتے تلوے رہیں

---

[1] سُدھیدیش۔ راشٹر بھارتی، مئی ۱۹۶۶ء

[2] ہری اودھ۔ تیسرا ہندی ساہتیہ سمیلن۔ کاریہ وِورن۔ بھاگ اوّل۔ صفحہ ۱۴۱

[3] واچسپتی پاٹھک۔ پرساد، نرالا، پنت، مہادیوی کی شریشٹھ رچنائیں صفحہ ۲۰

[4] آچاریہ دویدی۔ وچار وِمرش۔ صفحہ ۴۶

وہاں ڈاکٹر رام کمار ورما نے:

رفی ہوتے ہیں جگت کے سبز رنگ ؛ یہ دُہائی دے رہی ہے سینہدی

ور جناب سوہن لعل دویدی نے کہا۔

یہ میہمان یہ میزبان ساقی صراحی کا سمان
یہ جلسہ محفل سبھی تمان یہ کرنے ہیں کس پرگان

س طرح ان شعرار نے اُردو الفاظ کے استعمال کے حق میں آواز بلند کی یہی روش رتی پسند اور تجربہ پسند شعرار کو بھی مرغوب رہی اور انہوں نے بھی جی کھول کر اُردو لفاظ کا استعمال کیا۔[1]

فارسی الفاظ کا استعمال تو نواز، گوال، رسید بھی نے بھی بہت کیا تھا۔ ہاری کے متعدد دوہوں میں بھی اُردو الفاظ ملتے ہیں۔[2] تلسی اور سُور داس کی نظموں میں بھی اُردو الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فارسی اور اُردو کے الفاظ ہمارے اجتماعی لاشعور میں اتنے گہرے اُتر چکے تھے کہ ہم چاہنے پر بھی انہیں ترک نہ کر سکے۔ ہندی شعرار نے قصداً ان الفاظ کو نظر انداز کرنا چاہا مگر وہ ناکام رہے اس کی ایک مثال ہی کافی ہوگی۔ پدما سُدھی نے اپنی ایک کتاب "بھاؤ لیکھا" کی تمہید میں لکھا ہے۔ "کہیں کہیں مجھے ہندی بھاشا میں وہ الفاظ نہ مل سکے جن سے میں اظہار خیال کر پاتی۔ ایسے مقامات پر میں نے ویدوں کو ٹٹولا اور سچ مچ ہی مجھے اپنے گھر میں وہ چیز مل گئی جس کو ہم اُردو فارسی وغیرہ زبانوں میں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ "مشک" ایک فارسی لفظ ہے۔ رگ وید کے منڈوک سوکت میں اس کا متبادل لفظ "درتی" ملتا ہے جسے میں نے ہندی شاعری میں لانا لازمی تصور کیا۔"[3] لیکن خود ہی اسی کتاب کے صفحہ ۳۹ پر انہوں نے ایک نظم میں لکھا ہے۔

کاندھے پرشٹ اون دھرلایا ؛ مسیگھ مشک میں جل بھر لایا

غور کیجئے جس لفظ کو ترک کرنا چاہتی تھیں وہی لفظ اُن کے شعور میں اتنا گہرا اُتر چکا تھا کہ نظم لکھتے وقت انہیں رگ وید کے منڈوک سوکت سے تلاش کیا وہ لفظ یاد ہی نہیں آیا جس کا سہارا لے کر وہ اُردو کے ایک لفظ کو تیاگ دینا چاہتی تھیں۔ ایسا اکثر شعرار سے ہوا ہے۔ بہت سے شعرار نے فراخدلی سے اُردو کا اثر قبول کیا ہے۔ ہری کرشن پریمی اپنی کتاب "رُوپ ریکھا" کی تمہید میں لکھتے ہیں۔ "ان غزلوں یا گیتوں میں کچھ رچنائیں ایسی بھی ہیں جن میں اُردو الفاظ کثرت سے موجود ہیں۔ جیسے

سمجھ کر خاک اس دل کو کچل کر چل دیئے تم تو
تمہاری یاد نے لیکن بجھے دل کو جلایا ہے

اُردو لفظوں کا استعمال کہیں کہیں میں نے ضرور کیا ہے ... میرا عقیدہ ہے کہ ہندی شاعری میں زور بھرنے کے لئے یہ لازم بھی ہے۔"[4] اسی طرح جناب رمان شنکر شکل رسّاں لکھتے ہیں۔ "اُردو شاعری میں محاوروں کا مناسب استعمال اور الفاظ کا موزوں استعمال ہی اس کی جان ہے۔ اس سے اُردو شاعری عام فہم ہو کر خوبصورت اور دلکش ہو جاتی ہے اور اپنے جذبات کو قاری کے دل کی گہرائیوں تک پہنچا کر مستقل اثر چھوڑتی ہے۔ اسی کو ہندی شاعری میں لانے کی کوشش اس کتاب میں کی گئی ہے۔"[5]

نظم میں ہی نہیں نثر میں بھی اس کا اثر بڑا گہرا دکھائی دیتا ہے۔ بشری تھاکے الفاظ میں اُردو کے عام الفاظ کے بغیر اب تو کام ہی نہیں چلتا۔ یہ آ ہی جاتے ہیں اور انہیں رکھنا ہی پڑتا ہے۔"[6]

اُردو شعرار واحد اور جمع دونوں صورتوں میں "وہ" لکھتے ہیں اور یہاں اور وہاں کی جگہ پر یاں اور واں کا استعمال کرتے ہیں۔ ہندی شعرار پر بھی اس کا اثر پڑا اور انہوں نے بھی "وے" کی جگہ پر وہ کا استعمال شروع کر دیا اور یاں واں بھی لکھنا شروع کیا۔ مثلاً ع

ہے وصنہ وہی پر ما تما جو یاں تک لایا ہمیں

اُپندر ناتھ اشک کہتے ہیں۔ "میں اسے دوش نہیں مانتا۔ کھڑی بولی میں لچک لانے کے لئے اُردو شاعری کے ان اور ایسے دوسرے اصولوں کو اپنا لینا بُرا نہیں۔"[7]

---

[1] ڈاکٹر گوپال دت سارسوت۔ اُدھنک ہندی کویتا میں پرمپرا تھا پرلوگ صفحہ ۴۳
[2] ڈاکٹر ہردیو باہری۔ ہندی کی کاویہ شیلیوں کا وکاس۔ صفحہ ۱۳۷
[3] پدما سُدھی۔ بھاؤ لیکھا۔ صفحہ ۳

[4] ہری کرشن پریمی۔ رُوپ ریکھا تمہید
[5] رمان شنکر شکل رسّال۔ کاویہ تاکی۔ صفحہ ۸
[6] جنارد ھن پرساد جھا۔ انوبھوتی۔ صفحہ ۱۷
[7] اُپندر ناتھ اشک۔ سڑکوں پر ڈھلے سائے۔ صفحہ ۲۲

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندی نے اُردو کے بعض الفاظ تو ویسے ہی لے لئے ہیں جیسے وہ اُردو میں مستعمل تھے اور بعض کو اپنی ضرورت کے مطابق توڑ مروڑ کر ٹھیک کر لیا۔ بعض کو ہندی رنگ میں رنگ کر بھی اپنا لیا۔ پہلی قسم کی چند مثالیں دیکھئے۔

میں نہ بندھا ہوں دیش کال کی زنگ بھری زنجیروں میں

— نیرج۔ پران گیت

آہستہ بول ارے او مذہب کی کتاب

— وہی —

سینہ زوری ہوا کر رہی ہے ناراض اندھیرا

— نیرج۔ مُکتکی

عظیم الشان گہرے پیار کے در نے بلایا ہے

— ماکھن لعل چترویدی۔ یگ چرن

اس کے علاوہ بہت سے شعراء نے اُردو الفاظ کو اپنی ضرورت کے مطابق تبدیل بھی کیا ہے۔ مثلاً

کیوں کشبھنگر سے جگ میں ابھمان سے ایسے جھومتے جاتے

— جگ موہن اوستھی۔ کدمب

ایک بیش قیمتی لہر مجھے اودھار دے

— ویریند مشر۔ لیکھنی بیلا

جی اسی موڑ پر۔ برگد کی گھنگھور شاخاؤں کی گھٹیل اجگری محراب

— مکتی بودھ۔ چاند کا منہ ٹیڑھا ہے

ٹیڑھے منہ کی عیاری روشنی

— وہی —

بحثیلی میزوں پر دھوئیں کے چھلے ہیں

— یادو۔ آواز تیری ہے

مذہب و دھرم کے متوالے بھڑ پڑتے ہیں سینکڑوں دل کے دل

— نوین۔ پرانا رپن

سنہ بیالیس کے دنوں کی یاد تازی دلوں میں ہمارے

— بچن۔ سوت کی مالا

مندرجہ بالا سطور میں جن الفاظ پر نشان لگایا گیا ہے وہ سب اُردو کے الفاظ ہیں جنہیں ہندی شعراء نے اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اُردو والوں کے نزدیک یہ استعمال غلط ہے۔ اُردو شعراء ان الفاظ کو۔ بیش قیمت، شاخوں، عیار، تازہ وغیرہ لکھتے۔

کئی شعراء نے تو فارسی اضافتوں کو فارسی الفاظ کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ مثلاً

دُنیائے فانی شیشے کی مانند ہے مگر

— چونچ۔ چھیڑ چھاڑ

کیا محبت میں اقرارِ وفا کچھ بھی نہیں

— گوپال راٹھور۔ دیپ کے سور

لیکن بعض شعراء نے اُردو الفاظ کو ہندی الفاظ کے ساتھ اس طرح ملا دیا ہے گویا یہ الفاظ خالص ہندی کے ہی ہوں۔ مثلاً ؎

آگے کوئی چھلکاتی مدھو جام ہے

— جوشی۔ آگ اور سمپرن

تم کو کہتی ہیں گھوس خور

— چونچ۔ چھیڑ چھاڑ

جان گیا کیا مجھے پلانے وہ ساقی بالا آتی ہے

— بچن ایکانت گیت

یہ تو خیر اُردو الفاظ کے استعمال کی بات ہوئی۔ اُردو نے ہندی پر وہ اثر چھوڑا کہ ہندی شعراء اپنے الفاظ کو لچکدار بنانے کے چکر میں اُن کا حلیہ ہی بگاڑ بیٹھے — حسب ضرورت اُردو میں لفظ "ایک" کو "اِک" بھی لکھا جاتا ہے۔ ہندی والے بھی ایسا ہی کرنے لگے۔ حالانکہ ہندی میں لگھو گورو کی ماتراؤں کے حساب سے لئے بنتی ہے۔ دیکھئے

تال سُر لئے ہے ہر اک شے ہے نہیں کوئی کمی ہے

— ماکھن لعل چترویدی۔ یگ چرن

"سمُدر" لفظ کو اُردو میں سمندر لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح رُدر، رویندر وغیرہ الفاظ بھی سنسکرت یا ہندی کے مطابق اُردو میں نہیں آتے۔ اُس کا سبب شاید یہ ہے کہ فارسی رسم خط میں الفاظ کے پاؤں میں کوئی حرف لگانے کی رسم نہیں ہے لیکن ہندی والے بھی اُردو سے متاثر ہو کر ویسا ہی کرنے لگے حالانکہ وہ اس کا صحیح رُوپ قائم رکھ سکتے تھے۔ مثلاً ؎ ندی بولی چلو بوندو سمندر نے بُلایا ہے — وہی —

(بقیہ صفحہ ۴۷ پر)

# کتابیں

## قابلِ مطالعہ

| | |
|---|---|
| ہمارا جھنڈا | ایک روپیہ |
| بھارت آج اور کل (جواہر لال نہرو) | ۷۵ پیسے |
| دو شہروں کی کہانی (چارلس ڈکنس) | ۵ روپے |
| جوالا مکھی (ناول) (اننت گوپال شیوڈے) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کا دستور | ۲ روپے |
| آئینۂ غالب | ۵ روپے |
| آج کل کی کہانیاں | ۳ روپے ۵۰ پیسے |
| وطن کے نغمے | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |
| امرجوت | ۲ روپے |
| سائنس کے چند پہلو | ایک روپیہ ۲۵ پیسے |
| ہمارے نہرو | ۳ روپے پچاس پیسے |
| گنجینۂ غالب | ۴ روپے پچاس پیسے |
| ہندوستان کی مسجدیں | ۲ روپے ۵۰ پیسے |

| | |
|---|---|
| ہندوستان کی تاریخ (بچوں کے لئے) | ۳ روپے ۷۵ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ اوّل) | ۲ روپے ۲۵ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ دوم) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ سوم) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| سوامی وویکانند (بچوں کے لئے) | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |
| جواہر لال نہرو (خواجہ عقیدت) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان میں تعلیم کی از سرِ نو تنظیم (ڈاکٹر ذاکر حسین) | ایک روپیہ ۲۵ پیسے |
| ہندوستانی ڈراما (صفدر آہ) | ۳ روپے ۷۵ پیسے |
| پنڈت نہرو سے بات چیت (بیٹر منڈی) | ۲ روپے |
| ندیا کنارے (علی عباس حسینی) | ایک روپیہ |

(محصول ڈاک ہمارے ذمہ ہوگا)

اُردو کے علاوہ انگریزی، ہندی، اور تمام علاقائی زبانوں میں کتابیں شائع ہوتی ہیں

(فہرست کتب طلب کیجئے)

**بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن**

**پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی**

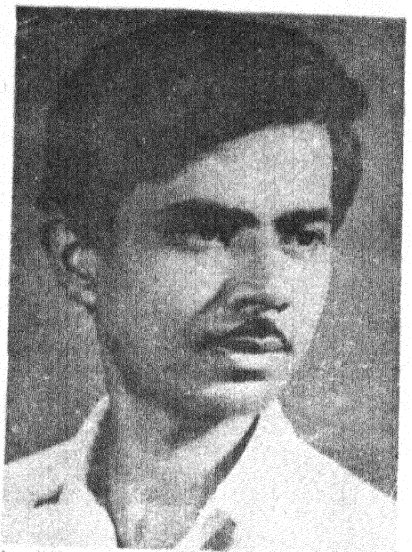

# ناٹک

سلام بن رزّاق

میں کب چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ آئے۔ مگر وہ تو گھر سے ہی میرے ساتھ چلا تھا۔ میں نے دروازے پر ہی اُسے گھڑکا پر وہ اتنی آسانی سے پنڈ چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں نے فٹ پاتھ پر چلتے چلتے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ سر جھکائے، چہرے پر دکھ اور افلاس کا نقاب اوڑھے ڈھیلے ڈھالے قدم اٹھاتا چلا آرہا تھا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ میں اُسے بھیڑ میں جل دے کر نکل جانا چاہتا تھا۔ بائیں طرف کراسنگ تھی۔ اچانک سگنل کی گرین آنکھ کھلی۔ "جائیے" چمک رہا تھا۔ اِدھر اُدھر سے لوگ جھپٹے۔ انداز ایسا تھا جیسے ابھی یہیں سڑک پر ایک دوسرے کی گردنیں مروڑ کر ڈال دیں گے۔ مگر سب کے سب ایک دوسرے سے کترا کر نکل گئے۔ صرف جاتے ہوئے ایک نوجوان لڑکے نے آتی ہوئی ایک پارسی لڑکی کے ابھرے سینے کو دھکا دیا اور تیزی سے آگے نکل گیا لڑکی بھی رکی نہیں صرف "ایڈیٹ" کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ لڑکا دوسری فٹ پاتھ پر پہنچ کر مڑا، لڑکی بھی سامنے والی فٹ پاتھ پر جا کر مڑی۔ اور دونوں کی نظریں ٹکرائیں، لڑکا مسکرایا، لڑکی بھی مسکرائی اور مختلف سمتوں میں چل دیئے۔ دوسری فٹ پاتھ پر پہنچ کر میں ایک کیبن کے شیڈ کی اوٹ سے آگے بڑھ گیا اور بغلی گلی میں گھس گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اسے چکمہ دینے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور سگریٹ کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جیب خالی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے ایک پان سگریٹ کی دوکان تھی۔ میں نے ایک روپیہ کا نوٹ نکالا — دوکان سے ایک پیکٹ چار مینار سگریٹ اور ماچس خریدی۔ پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں داب لی۔ اور جوں ہی اسے سلگانے کے لئے ماچس پر تیلی رگڑی، تبھی ایک لجاجت آمیز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی "مجھے بھی ایک سگریٹ دیجئے نا" میں نے چونک کر گردن اٹھائی۔ وہ میرے بالکل قریب ہی کھڑا تھا۔ چہرہ حد درجہ خوشامدانہ اور آنکھوں میں التجا مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں نے ایک حقارت آمیز نظر اس پر ڈالی۔ اور پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر اسے دیدیا۔ اُس نے بغیر شکریہ ادا کئے سگریٹ لے لی جیسے وہ اس کا حق ہی رہا ہو۔ میں نے اپنی سگریٹ جلا کر سلگتی تیلی سے اس کی سگریٹ بھی جلا دی۔ اس نے ایک گہرا کش کھینچا۔ اس کے منہ کا خارج کیا ہوا دھواں میرے چہرے پر پھیل گیا۔ میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اور تیزی سے ایک طرف بڑھ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اب بھی میرے ساتھ آرہا ہے میں گلی کے انکڑ پر پہنچ کر رک گیا۔ وہ بھی میرے پیچھے ہی آکر رکا۔ میں نے غصے سے مڑتے ہوئے تیز لہجے میں پوچھا۔

"منع کرنے کے باوجود تم کیوں میرے ساتھ چلے آرہے ہو"

اس کے خشک ہونٹوں پر ایک چاپلوسانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی ملتجی نظریں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ مجھے لگا میرے گالوں پر بے شمار لجلجے کینچوے رینگ رہے ہیں۔ میں نے جلدی سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ مگر کچھ نہیں تھا۔ وہ مسکرایا۔ میں جھنجھلا گیا۔

"آخر تم جواب کیوں نہیں دیتے؟ تم میرے ساتھ کیوں آرہے ہو؟"

"میں تمہارا ساتھ چھوڑ کر بھلا کہاں جا سکتا ہوں؟"

"جہنم میں جاؤ، مگر میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

"آخر ساتھ چلنے میں کیا برائی ہے؟"

"مجھے تم سے نفرت ہے۔ دلی نفرت، مجھے تمہاری شکل زہر لگتی ہے۔ اب سیدھے سیدھے میرا اینڈ چھوڑ دو۔ ورنہ یہیں مڑک پر..."

وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ میرے غصے کا اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔

"تم جانتے ہو کہ تمہاری دھمکیوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تمہاری نفرت بھی میرے لئے بے معنی ہے۔ میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا البتہ تمہارے کسی معاملے میں دخل نہیں دوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔"

مجھے غصہ تو بہت آیا۔ مگر میں غصہ کو پی گیا کیونکہ اس چلتی پھرتی گلی میں اسے پٹکارنا یا زدوکوب کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ہرگز میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے میں نے سوچا اگر وہ چپ رہنے کا وعدہ کرتا ہے تو ساتھ لے چلنے میں کیا حرج ہے۔ میں کچھ دیر چپ رہا۔ پھر بولا "دیکھو اگر تم نے وہاں اپنی زبان کھولی۔ تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ تمہیں وہاں بالکل خاموش رہنا ہے۔"

"کیا آج کے دن تک میں نے کبھی تمہارے کسی معاملے میں دخل دیا ہے۔ تم تو ہمیشہ مجھے اپنے پیر کی جوتی کی طرح روندتے رہے۔"

مجھے اس کے احساس مظلومیت سے بڑی خوشی ہوئی۔ میں بولا "تم ہو ہی اس قابل، تم ہمیشہ میری ٹھوکروں میں ہی رہو گے۔ مجھے تمہارے بھکاریوں کے سے انداز اور خوشامدانہ لب و لہجے سے سخت نفرت ہے۔ تم کسی ریل یا موٹر کے نیچے پڑ کے مر کیوں نہیں جاتے؟"

"میں کبھی مر نہیں سکتا۔ تم نے کتنی دفعہ مجھے قتل کرنے کی کوشش کی مگر کیا تم کامیاب ہو سکے؟ میں جانتا ہوں۔ کہ تم مجھ سے طاقت ور ہو۔ میں تمہارے سامنے بہت ہی حقیر اور کمزور ہوں۔ اس کے باوجود تم مجھے نہیں مار سکتے۔ تم نے مجھے ہمیشہ دبایا، کچلا۔ میں وقتی طور پر مر جاتا ہوں۔ مگر پھر نئی طاقت لیکر زندہ ہوتا ہوں۔ میں اب پہلے کی طرح کمزور بھی نہیں رہا۔ مگر میں تم پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ یقین رکھو،

اس کی باتوں سے میرا جسم غصے کے مارے کانپنے لگ گیا۔ جی میں آیا کہ اس سور کا وہیں گلی میں لوگوں کی پروا کئے بغیر گلا گھونٹ دوں۔ نیچے گرا کر اتنی ٹھوکریں لگاؤں کہ اس کے چیتھڑے بکھر جائیں مگر میں صرف پیچ و تاب کھا کر رہ گیا کیونکہ واقعی وہ اب پہلے جیسا کمزور نہیں رہ گیا تھا۔ اور نہ پہلے کی طرح میں اُسے آسانی سے زیر کر سکتا تھا۔ میں نے اس کا گلا گھونٹنے کی بجائے اپنے غصے کا گلا گھونٹ دیا کچھ دیر تک اُس کے چہرے پر نظریں جمائے رہا۔ پھر اپنے لہجے کو ذرا سخت بناتے ہوئے ایک لمبی سانس کھینچ کر بولا۔ تو تم وہاں ایک لفظ نہ کہو گے۔"

"نہیں" اُس کی مسکراہٹ سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"تو پھر چلو۔" میں نے بادلِ ناخواستہ کہا۔ مگر یاد رکھو اگر تم نے چوں و چرا کیا تو آج زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ میں آگے بڑھا۔ وہ بھی میرے ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے اُس کی طرف سے اپنا دھیان ہٹا لیا۔ مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ میری گردن کی پشت پر نظریں جمائے مسکرا رہا ہے۔ مجھے غصہ تو بہت آ رہا تھا مگر میں رکا نہیں۔ میرے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ وہ بھی سائے کی طرح میرے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ گلیاں، سڑکیں فٹ پاتھ اور کراسنگ میں چلتا رہا۔ چلتا ہی رہا۔

آخر میں اُس بلڈنگ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بورڈ دیکھا اور اندر داخل ہوا۔ میں لفٹ کے سامنے جا کر رک گیا۔ میرے آگے دو آدمی اور کھڑے تھے۔ وہ بھی میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ لفٹ نیچے آئی۔ دروازہ کھلا، کچھ لوگ باہر نکلے۔ میرے آگے کے دونوں شخص اندر داخل ہوئے۔ میں بھی گھس گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی اندر آیا۔ دروازہ بند ہوا اور لفٹ اوپر اٹھنے لگی۔ پہلی منزل، دوسری منزل، تیسری منزل، چوتھی منزل اور پانچویں منزل پر دروازہ کھلتے ہی میں لفٹ کے باہر چلا آیا۔ میں نے مڑ کر نہیں دیکھا مگر اُس کے پیروں کی چاپ میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں ایک دروازے کے سامنے رکا۔ باہر چپراسی کھڑا تھا۔ میں نے ایک ٹائپ کیا ہوا کاغذ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اُس نے کاغذ پر ایک سرسری نظر ڈالی اور بغیر کچھ کہے اندر چلا گیا۔ اُدھر میں مڑا۔ وہ مجھ سے چپک کر کھڑا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"دیکھو اگر تم یہیں باہر رک جاؤ تو کیا حرج ہے۔ میں دس منٹ میں

واپس آجاؤں گا۔"

"نہیں، میں بھی تمہارے ساتھ ہی اندر آؤں گا۔"

مجھے اُس کے لہجے کی سختی پر بڑی حیرت ہوئی یہ پہلا اتفاق تھا کہ اُس نے اتنے سخت لہجے میں مجھ سے گفتگو کی تھی۔ میں نے مٹھیاں بھینچ لیں اور قریب تھا کہ میرا گھونسہ اُس کے جبڑے پر پڑتا۔ اتنے میں چپراسی نے آکر کہا۔ چلئے" میری بھنچی ہوئی مٹھی کھل گئی اور میں اندر چلا گیا۔ چپراسی ایک دروازے کے پاس آکر رک گیا 'چق' پر منیجر لکھا تھا میں چپراسی کے اشارے پر چق اٹھا کر اندر چلا گیا۔ وہ بھی ساتھ ہی اندر آیا۔ سامنے ایک بڑی میز تھی۔ میز کے پیچھے گنجے سر اور چمکتی آنکھوں والا ایک تنومند شخص بیٹھا تھا۔ غالباً وہ منیجر تھا۔ اس کے سامنے میز پر کچھ کاغذات بکھرے تھے۔ شاید اُن میں میرے سرٹیفکٹ بھی تھے۔ اس نے میز کے اس طرف رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا وہ میرے دائیں طرف میز کے کونے کی طرف ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر وہی خوشامدانہ بھاؤ تھے اور آنکھوں میں لجاجت۔ غصے کے مارے میرا وجود سلگنے لگا۔ مگر میں چُپ رہا۔ اُس تنومند شخص نے اپنا گنجا سر اٹھایا اور مجھ سے پوچھا۔" نام؟" میں نے اپنا نام بتایا۔

"تاریخ پیدائش؟" میں نے وہ بھی دہرادی۔

موٹا شخص میرے سرٹیفکٹس اُلٹا پلٹتا رہا۔" اُس سے پہلے کہاں سروس کرتے تھے؟"

"کہیں بھی نہیں بے کار تھا۔"

"تمہیں گریجویشن کئے ہوئے تو چار سال ہو گئے۔ کہیں کوشش نہیں کی؟"

اُس کے سامنے میز پر میرا بی اے آنرز کا سرٹیفکٹ تھا۔

"کی کیوں نہیں، پچیسویں جگہوں پر کر چکا ہوں۔ مگر میرے پاس کسی بڑے آدمی کی سفارشی چٹھی نہیں تھی۔"

"اوہو" گنجے سر پر جڑی ہوئی دو چمکدار آنکھیں میرے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تم یہاں سروس پا جاؤ گے۔"

"مجھے پچھلی پچیسویں جگہوں پر بھی یقین تھا کہ میں سلیکٹ ہو جاؤں گا کیونکہ میں فرسٹ کلاس گریجویٹ ہوں اور میرا خاص مضمون اکنامکس ہے۔"

"ٹھیک ہے یہاں تمہارا تقرر ہو جائے گا۔ مگر تمہیں ایک اقرار نامے پر دستخط کرنے ہوں گے۔"

"جی! مگر میں پہلے اُس کی شرائط جاننا چاہوں گا۔"

"صرف ایک معمولی سی شرط ہے۔"

"پھر بھی میں اقرار نامہ پڑھے بغیر دستخط نہیں کروں گا۔"

وہ چند لمحوں تک مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔" تمہیں ڈیوٹی پر رجوع ہونے کے بعد اپنے گلے میں ایک پٹا باندھنا ہوگا اور یہ پٹا ریٹائر ہونے تک تمہارے گلے میں بندھا رہے گا۔"

اس کے ہاتھ میں ایک سنہرے رنگ کا پٹا چمک رہا تھا میں خوب جانتا تھا کہ وہ پٹا کس قسم کا ہے۔ مجھے لگا جیسے وہ پٹا میرے گلے کو جکڑے ہوئے ہے اور میں دُم ہلاتا اُس شخص کے پیچھے پیچھے گھوم رہا ہوں۔ اور لوگ مجھے دیکھ دیکھ کر کہہ رہے ہیں۔ دیکھو وہ جا رہا ہے صاحب کا . . . ." میں نے بڑی سختی سے جواب دیا۔ نہیں مجھے یہ شرط منظور نہیں۔" اور میں ایک جھٹکے سے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ تبھی میز کے دوسرے کونے سے اُس کی گڑگڑاتی آواز آئی۔

"مجھے منظور ہے صاب . . . ."

وہ دونوں ہاتھ جوڑے اپنے چہرے پر چاپلوسی اور خوشامد کے سارے انداز سمیٹے گڑگڑا رہا تھا۔ میرا سارا بدن غصے اور نفرت سے لرزنے لگا۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں نے اسے گھر پر ہی ختم کر دیا ہوتا۔ یا گلی میں گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہوتا۔ نیچ، ذلیل، کتا، مار ڈالوں گا اسے۔ آخر مجھے اس طرح ذلیل کرنے کا اُسے کیا حق ہے۔ کمینہ کہیں کا، بے حیا! میرے ہاتھوں کی دسوں انگلیاں اُس کی گردن کو مروڑ دینے کے لئے بے تاب ہو اٹھیں۔ میں ایک دم آگے بڑھا کہ اس کا گلا گھونٹ دوں اور ہمیشہ کے لئے اس کا خاتمہ کر دوں۔ مگر میں حیران رہ گیا۔ جب میرے دونوں ہاتھ اُس کی گردن پر پہونچنے کے بجائے میری گردن سے لپٹ گئے۔ انگلیاں دھیرے دھیرے میرے گلے میں پیوست ہونے لگیں۔ جیسے میرے ہاتھ میرے اپنے نہ ہو کر میرے کسی ازلی دشمن کے ہاتھ ہوں۔ جو برسوں سے میرے

(بقیہ ۲۶ پر)

# آہٹیں

بوسیدہ کمرے کی فضا
گمبھیر سی کیوں ہے ؟
ٹوٹے روشن دان کے اِن ملگجے شیشوں سے
کرن آتی نہیں چھن کر
خطوں کے ڈھیر کو —
ہر روز دیمک چاٹ جاتی ہے
الگ کر دو بدن سے
سردیوں کی رات میں اوڑھا ہوا کمبل
سلگتا زخم سینے کا ،
گہری تہہ کے نیچے دب نہ جائے
مجھے چونکا رہے ہیں
آنے والے گونجتے لمحے
کھڑکھڑاہٹ ریل کے پہیوں کی
تیز تر ہے
لرزتی وسل کانوں میں
دیر سے چلا رہی ہے

رؤف خلش

# تین مختصر نظمیں

پریم وار برٹنی

## تضاد

آج یوں تصور میں
جا ملے ہیں قبروں سے
سلسلے براتوں کے
جیسے دُودھ پیتے ہوں
چاندنی کے سینے سے
سانپ کالی راتوں کے

## بھوک

بھوک سے بلکتا ہوں
بے بسی سے روتا ہوں
میں کہ ایک بالک ہوں
رات کے خیالوں کا
آسماں کے ہاتھوں میں
چاند کا کٹورا ہے
چاند کے کٹورے میں
دُودھ ہے اُجالوں کا

## رات کی کائنات

یہ آسماں ہے کہ سپنوں کا سرمئی آنچل
زمیں ہے یا کسی سینے کی نرم گولائی
یہ چاند ہے کہ کسی کافرہ کا چہرہ ہے
یہ چاندنی ہے کہ الھڑپنے کی انگڑائی
یہ رات ہے کہ کوئی آبگینہ چھلکا ہے
یہ کائنات ہے یا حسن کا دھندلکا ہے

# نئی لڑکی

ہٹیلی ہے لڑکی :
بہت شوخ ، نٹ کھٹ ، غصیلی ، نکیلی
نہ پڑھنے میں دل ہے
نہ گھر کے کسی کام سے اُس کو رغبت
نہ سینا پرونا ، نہ کھانا پکانا
صبح ، دوپہر ، شام
آئینہ ، کنگھی ، لپ اسٹک کہ پاوڈر
مویافوں کے انبار ، پھولوں کے گجرے
اُسے جب بھی دیکھا ،
تو گاتے ہی پایا
کبھی فلمی گانے ، کبھی داغ صاحب کی کوئی غزل
نہ ماں باپ کا ڈر ، نہ خوفِ خدا
پڑوسن کی لڑکی سے ربطِ جلی
بڑی رات تک اپنے بستر پہ لیٹی
کتابوں کے اوراق ایک ایک اُلٹے
خدا جانے پڑھتی ہے یا دیکھتی ہے
خدا جانے سوتی ہے یا جاگتی ہے .
زمانہ نیا ہے ، تقاضے نئے ہیں
بڑھی بوڑھیوں کے زمانے گئے ہیں

کلیمہ تسنیم

# دُنیا کے مشہور پیش گوئیاں

(۲)

سیوک شرما

ناسٹراڈیمس اگرچہ پیشے سے ایک طبیب تھے۔ لیکن وہ علم الغیب کے ماہر تھے۔ ایک بار وہ اٹلی کے ایک شہر کی ایک سڑک پر جا رہے تھے۔ سامنے سے ایک معمولی پادری کو آتا دیکھ کر یہ رک گئے۔ قریب پہونچنے پر یہ کہتے ہوئے اس پادری کی قدمبوسی کی "میں تقدس مآب پوپ کو سلام کرتا ہوں"۔ فیلس پیڑی نام کا وہ نہایت معمولی اور غریب پادری اس بات پر بہت حیران ہوا لیکن کئی برس بعد وہی معمولی پادری سکسٹس پنجم کے نام سے پوپ آف روم کی گدی پر بیٹھا۔

انگلستان کے شاہ ہنری دوئم کی موت سے متعلق ناسٹراڈیمس کی پیشین گوئی بہت مشہور ہے۔ ملکۂ انگلستان بھیس بدل کر ناسٹراڈیمس کے پاس آئی اور اپنے بیمار خاوند کی صحت کے بارے میں سوال کیا۔ ناسٹراڈیمس نے اپنے "موکل" کو بتایا کہ اس کا خاوند موجودہ بیماری سے تو صحت یاب ہو جائے گا لیکن نیزہ بازی یا تلوار بازی میں زخمی ہونے پر اس کی موت واقع ہوگی۔ اس زمانے میں یہ بات نہایت ناقابلِ یقین اور بے بُنیاد تھی کیونکہ بادشاہ خود کبھی ہتیاروں کے کھیل کے مقابلوں میں کھلاڑی کی حیثیت سے شامل نہیں ہوتے تھے۔ وہ صرف ریفری کے فرائض انجام دیتے۔ لیکن اپنی لڑکی کی شادی کے موقع پر ہنری دوئم کے دل میں اچانک نیزہ بازی کے کھیل میں شرکت کا شوق چرایا۔ کھیل کے دوران لارڈ ماؤنٹ گمری کا نیزہ شاہ ہنری دوئم کے زرہ بکتر کو چیر کر اُس کی آنکھ میں جا لگا۔ آنکھ کے زخم کی وجہ سے بادشاہ راہی ملکِ عدم ہوا۔

ناسٹراڈیمس کے کمال کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے بھی ہوتا ہے اور یہی واقعہ اُن کی عالمگیر شہرت کا سبب بنا۔

ایک دفعہ ایک شکاری کا ایک کتا کھو گیا۔ یہ جانے بغیر کہ مکان کس کا ہے شکاری نے ناسٹراڈیمس کے مکان پر دستک دی۔ ناسٹراڈیمس علم طب کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ اس لئے انہوں نے دستک کی آواز نہیں سُنی۔ شکاری نے دوسری بار دستک دی تو ناسٹراڈیمس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ پیشتر اس کے کہ اجنبی اپنا منہ کھولے۔ ناسٹراڈیمس نے کہا "تمہیں جس کی تلاش ہے وہ سڑک پر ملے گا"۔ یہ کہہ کر ناسٹراڈیمس نے دروازہ بند کر دیا جب شکاری سڑک پر پہونچا تو اُس کا کتا دوڑتا ہوا اس کی طرف چلا آ رہا تھا۔ شکاری نے یہ تعجب خیز واقعہ لوگوں کو سُنایا اور ناسٹراڈیمس کی



(ناسٹراڈیمس)

شہرت ایک طبیب کی بہ نسبت ایک غیب داں کی حیثیت سے زیادہ ہونے لگی۔

انقلاب فرانس اور نپولین کے زمانے میں فرانس کا ایک اور باکمال منجم ہوا ہے جو پادری لاکلارک کے نام سے مشہور تھا۔

نپولین کے زمانے میں پادری لاکلارک کی پیش گوئی ایک مسلمہ تاریخی حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے۔ انقلاب فرانس کے آغاز میں نپولین ایک معمولی سپاہی تھا۔ انہی دنوں نپولین نے پادری لاکلارک کی شہرت سُنی۔ اور ایک دن پادری سے ملنے کے لئے اُس کے مکان پر جا پہونچا لیکن پادری کے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر ٹٹولتے ہوئے پیسوں کی گنتی کی۔ پھر کچھ سوچ کر وہ لوٹنے کے لئے مڑا۔ لیکن جونہی اُس نے اپنا قدم کمرے سے باہر رکھنا چاہا، اس کا پاؤں دہلیز سے ٹکرا گیا۔ اُس پر بوڑھے پادری نے جو اب تک بے خبر مطالعۂ سیارگان میں محو تھا۔ دروازے کی طرف نگاہ اُٹھائی۔ ایک لمحے تک نپولین کے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد پادری نے کہا "بیٹا۔ کیا بات ہے تم لوٹ کیوں رہے ہو" نپولین نے جواب میں کہا "میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا لیکن میرے پاس آپ کو فیس کے طور پر دینے کے لئے رقم بہت کم ہے اس لئے میں واپس جا رہا تھا۔" بوڑھے پادری نے کہا "تمہارے چہرے پر کچھ ایسی بات ہے جو مجھے متاثر کر رہی ہے۔ اس لئے میرے بیٹے آؤ تمہارے پاس اگر مجھے دینے کے لئے پیسے نہیں ہیں تو بھی میں تمہیں مشورہ دوں گا۔" اور اُس نے نپولین کو اپنے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔

نپولین کا نام پوچھنے کے بعد پادری نے اس کی ہتھیلیوں کے خدوخال کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "تم ایک جزیرے میں پیدا ہوئے تھے اور تمہاری قسمت میں لکھا ہے کہ تمہاری موت بھی ایک جزیرے میں ہوگی اور یہ جزیرہ تمہاری جائے پیدائش سے بہت دُور ہوگا۔ ایسا دکھائی پڑتا ہے کہ یہ جزیرہ سمندر کے بیچ ایک الگ تھلگ سی چٹان ہوگی۔"

"حیات اور موت کے درمیانی فاصلے میں اقتدار اور جاہ و جلال کی کوئی منزل ایسی نہیں ہوگی جسے تم سر نہ کر سکو۔ تم جو اب ایک معمولی سپاہی ہو چار سال بعد بڑی بڑی فوجوں کے سپہ سالار بنو گے اور اپنی فتوحات سے دنیا کو چکا چوند کر دو گے۔ تمہاری زندگی کا ستائیسواں سال تمہاری بڑی سے بڑی اُمنگوں اور تمناؤں کے حصول کا آغاز ہوگا۔ لیکن یاد رکھنا کہ قدرت کی طرف سے دی گئی اس طاقت کا غلط استعمال تمہاری اپنی تباہی اور بربادی کا موجب ہوگا۔"

ظاہر ہے کہ نپولین کی زندگی کے واقعات پادری کلارک کی سچی پیش گوئی کی منہ بولتی شہادت ہیں۔

نپولین بڑا احسان شناس انسان تھا۔ جونہی وہ فرانس کے تخت پر بیٹھا اس نے پادری کلارک کو ڈھونڈھ کر ورسیلز میں شاہی محلات کے قریب ایک آرام دہ مکان دے دیا، اور تا زندگی اُس کے لئے معقول پنشن بھی مقرر کر دی۔

پادری کلارک کی زندگی کا آخری سین بڑا رقت انگیز تھا۔ ۱۸۱۴ء میں نپولین کا سالانہ زائچہ تیار کرنے پر اُس نے دیکھا کہ آیندہ سال جون میں نپولین کو زوال اور تباہی کا سامنا تھا۔ فوراً ہی وہ اپنے محسن شہنشاہ کی تلاش میں نکل پڑا جس کی مہربانی کی وجہ سے پادری کی زندگی کے آخری ایام بڑے آرام سے گزرے تھے۔ ۱۸۱۴ء میں نپولین کی مختلف جنگوں اور مہموں میں کلارک پیدل ہی نپولین کا پیچھا کرتا رہا۔ اُمید کے خلاف وہ اُمید کرتا رہا کہ شاید وہ اپنے محسن کو اپنی آخری اور بہت ضروری تنبیہ پہونچا سکے۔ وہ نپولین کو بتانا چاہتا تھا کہ پندرہ سے سترہ جون تک جنگ کرنا اس کے لئے تباہ کن ثابت ہوگا۔ ۱۴ جون ۱۸۱۵ء کو واٹرلو کی جنگ سے پہلی رات تو وہ نپولین کے قریب جا ہی پہنچا۔ لیکن اس کی بارہا منت سماجت کے باوجود نپولین کے محافظ سپاہیوں نے اُسے نپولین کے خیمے میں داخل ہونے سے روک دیا۔ جب کلارک نے بار بار اصرار کیا کہ اس کا نپولین کو ملنا خود نپولین کی سلامتی کے لئے اشد ضروری ہے تو اُسے پاگل سمجھ کر وہاں سے بھگا دیا گیا۔

واٹرلو میں نپولین کی شکست کے کچھ دن بعد پادری کلارک کی لاش میدان جنگ کے قریب ایک خندق میں پڑی ہوئی پائی گئی۔ اور وہ زائچہ اُس کی اکڑی ہوئی مردہ مٹھی میں بھنچا ہوا تھا۔ یہ زائچہ اب بھی پیرس میں فرانس کے قومی میوزیم میں محفوظ ہے۔

نپولین کو خبردار کرنے کے لئے پادری کلارک کی سرتوڑ کوشش، فلم سٹار کیرول لومبارڈ کو ہوائی سفر سے روکنے اور صدر کینیڈی کو ریاست ٹیکساس کا دورہ کرنے سے باز رکھنے کے لئے جین ڈکسن کی سعیٔ ناکام

ے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ کاتبِ تقدیر کی عبارت کافی حد تک پڑھی جا سکتی ہے لیکن اس میں ذرہ بھر بھی ردوبدل ممکن نہیں۔ ہر شخص کی زندگی کے ایک ایک لمحے میں ہونے والا ہر واقعہ قادرِ مطلق کی رضا سے پہلے ہی متعین ہے۔ علم الغیب سے متعلق کوئی بھی تذکرہ شہرۂ آفاق "کیرو" کا ذکر کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ کیرو ایک پیشہ ور پامسٹ اور منجم تھا جس قدر اکیلگر شہرت کیرو کو نصیب ہوئی اتنی کسی بھی زمانے میں کسی غیب داں کو نصیب نہیں ہوئی۔ کیرو کا پورا نام کاؤنٹ لوئی ہامن تھا۔ وہ ایک نارمن



فرانس کے صوبہ نارمنڈی کے باشندے نارمن کہلاتے ہیں) جاگیردار اور اُس کا بیٹا تھا اُس کی ماں یونانی نسل کی تھی۔ اس کی ماں علم الید اور علم رقوم میں کافی مہارت رکھتی تھی۔ کیرو ابھی بارہ سال کا نہیں ہوا تھا کہ اُس کی ماں نے اُس کا ہاتھ دیکھ کر اپنی ڈائری میں لکھا تھا کہ میرے بیٹے کے دونوں ہاتھوں میں سلیمانی کراس کا نشان ہے۔ اس لئے وہ علم الغیب اور خاص طور سے علم الید میں مہارت حاصل کرے گا اور دنیا میں نام پیدا کرے گا۔

کاؤنٹ لوئی ہامن نے بطور پامسٹ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ۱۸۸۸ء کے لگ بھگ کیا تھا۔ کیرو کا لقب اُس نے اسی وقت اختیار کیا تھا اور اُس کے بعد سے دنیا میں وہ اپنے لقب سے مشہور ہوا اور اس کا نام لوگ تقریباً بھول ہی گئے۔ ۱۸۸۸ء سے ۱۹۳۳ء تک کے چالیس برس سے زیادہ عرصے کے دوران کیرو نے دنیا میں اپنے کمال سے تہلکہ مچا دیا۔ اس دور کی دنیا بھر میں شاید ہی کوئی قابلِ ذکر شخصیت ایسی ہوگی جس نے کیرو سے اپنے مستقبل کے بارے میں مشورہ نہ لیا ہو۔ اس کے موکلوں میں یورپ اور امریکہ کے اعلیٰ ترین ہستیاں، شہنشاہ، اور شہزادیاں، وزراء اعظم اور صدر، امیر ترین سوداگر اور تاجر، سیاسی سربراہ، فلمی دنیا کے مشہور ترین اداکار، نامور سائنس داں، مصنف، مصور اور فن کار اور بڑے بڑے جرنیل شامل تھے۔

اس عرصے میں کیرو نے ساٹھ ہزار سے زیادہ ہاتھوں کا مطالعہ کیا۔ لطف یہ کہ جس کو اُس نے جو کچھ بتایا وہ سال، مہینہ اور تاریخ وار حرف بہ حرف صحیح نکلا۔ مزید طرّہ یہ ہے کہ چونکہ کیرو کے زیادہ تر موکل زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ممتاز اور سرکردہ افراد، اعلیٰ ترین حکام اور حکومتوں کے سربراہ تھے اس لئے اس کی پیش گوئیوں کی صداقت کے بارے میں باقاعدہ ریکارڈ موجود ہے۔ اُس کے علاوہ کیرو نے جو کتابیں شائع کی تھیں، ان میں ان پیش گوئیوں کا تفصیل سے ذکر ہے اور کتابوں کی اشاعت کے وقت وہ لوگ بھی زندہ تھے، جن کے متعلق وہ پیش گوئیاں سچی ثابت ہوئی تھیں۔ ویسے تو کیرو کی تقریباً ہر کتاب میں اُس کی مختلف پیش گوئیوں کا تھوڑا بہت ذکر آیا ہے لیکن اس کی کتاب

Confessions:Momoirs of a Modern Seer

میں ان تمام پیش گوئیوں کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔

کیرو کی ہزاروں حیرت انگیز اور معرکہ آلارا پیش گوئیوں میں سے انگلستان کے مشہور جرنیل فیلڈ مارشل لارڈ کچنر کے بارے میں کیرو کی پیش گوئی تو زبان زدِ عام ہو چکی ہے۔ کم از کم پامسٹری سے شغف رکھنے والا ہر فرد اس سے واقف ہے۔ لارڈ کچنر کا شمار انگلستان کے نہایت بہادر اور قابلِ ترین جرنیلوں میں ہوتا ہے۔ جب لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے تھے تو لارڈ کچنر ہندوستانی افواج کے کمانڈر انچیف کے عہدے پر فائز تھے۔ ۱۱ جولائی ۱۸۹۴ء کو لندن میں لارڈ کچنر نے کیرو کو اپنا ہاتھ دکھایا تھا۔ کیرو نے باقی باتیں بتانے کے علاوہ لارڈ کچنر سے کہا تھا کہ اُن کی موت اُن کی چھیاسٹھ برس کی عمر میں یعنی ۱۹۱۶ء میں پانی

میں ڈوبنے سے ہوگی اور یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ لارڈ کچنر کی موت پانچ جون ۱۹۱۶ء کو سمندر میں ڈوبنے سے ہوئی تھی۔ یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ لارڈ کچنر ہمپ شائر جہاز پر سوار ایک خفیہ مشن پر رُوس جا رہے تھے۔ راستے میں ایک خوفناک طوفان کی وجہ سے ہمپ شائر جہاز غرق ہوگیا تھا اس طرح لارڈ کچنر کی موت سے متعلق بائیس برس پہلے کی گئی پیش گوئی سچی ثابت ہوئی۔

۱۸۹۰ء میں جب لندن میں کیرو کے کمال کی دھاک بیٹھ رہی تھی۔ تو وہاں کے دانشوروں کے ایک گروہ نے کیرو کی آزمائش کی غرض سے اُسے ایک دعوت پر بُلایا۔ ہال کے وسط میں ایک میز رکھی تھی۔ اور اس کے اُوپر ایک موٹا سیاہ پردہ لٹک رہا تھا۔ کیرو کو اس میز کے پاس ایک کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا گیا۔ اور سیاہ پردے کے پیچھے سے باری باری ایک ایک ہاتھ مطالعے کے لئے کیرو کے سامنے کر دیا جاتا۔ مقصد یہ جاننا تھا کہ ہاتھوں کے مالک کی شخصیت کو جانے اور دیکھے بغیر کیرو کیا کچھ بتا سکتا ہے۔ مشہور ڈرامہ نویس اور مصنف آسکر وائلڈ کے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کیرو نے کہا تھا "اس شخص کی حالت یہ ہے کہ اُس کا بایاں ہاتھ ایک بادشاہ کا ہے لیکن دایاں ہاتھ ظاہر کرتا ہے کہ یہ بادشاہ خود کو جلاوطن کر دے گا۔ مطلب یہ کہ اعلیٰ ذہانت اور شہرت کا مالک ہوتے ہوئے بھی اس شخص کو نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہئے، ورنہ اسے بدبختی کا سامنا کرنا ہوگا" پردے کے پیچھے سے سوال ہوا "آج سے کتنے برس بعد" کیرو نے جواب دیا "چار برس"۔

آسکر وائلڈ نے اپنے ہاتھ پیچھے سرکائے اور ایک لفظ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس وقت آسکر وائلڈ اپنی شہرت کے عروج پر تھا لیکن اس تاریخ سے پورے چار برس بعد اُس نے مارکوئس آف کوئنز بری کے خلاف تہمت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ مقدمے میں وہ ہار گیا اور اُسے دو سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ رہا ہونے کے چند سال بعد وہ مفلسی کی حالت میں پیرس میں مرا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران جرمنی کی مشہور جاسوس حسینہ ماتا ہری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس حسینہ نے اتحادیوں کے بڑے بڑے جرنیلوں کو اپنے دامِ حسن میں پھنسا کر اہم فوجی راز معلوم کر کے جرمنی کو بتائے۔ آخر ۱۹۱۷ء میں اُسے جاسوسی کے شبہ میں گرفتار کر لیا گیا اور ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو اُسے گولی سے اڑا دیا گیا۔

کیرو سے ماتا ہری کی پہلی ملاقات پیرس میں نومبر ۱۹۰۵ء میں ہوئی اور کیرو نے اُسے اُس کی موت سے پورے سترہ برس پہلے بتایا تھا کہ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں اُسے گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔ ۱۹۰۵ء میں نہ تو پہلی جنگ عظیم کے آثار دکھائی دیتے تھے اور نہ ہی ماتا ہری کو اس بات کا کوئی گمان تھا کہ جنگ چھڑنے پر وہ جاسوسی کا کام کرے گی۔

انگلستان کے شاہ ایڈورڈ ہفتم کے ہاتھوں کا مطالعہ بھی کیرو نے آسکر وائلڈ کے ہاتھوں کی طرح ایک سیاہ اور موٹے پردے کے پیچھے سے سامنے کئے جانے پر کیا تھا۔ ہاتھ دیکھتے ہی کیرو نے کہا تھا کہ اس کا موکل شاہی نسل سے ہے یہ سنتے ہی ایڈورڈ ہفتم نے جو اُن دنوں پرنس آف ویلز یعنی ولی عہد تھے، پردہ ہٹا کر اپنا تعارف کروایا۔ کیرو نے ایڈورڈ کی تاجپوشی کا دن اور زندگی کے دوسرے اہم واقعات بتا کر کہا تھا کہ ولی عہد ایڈورڈ ۶۹ برس تک جئیں گے۔ جب ایڈورڈ ہفتم اپنے اکسٹھویں برس میں جون ۱۹۰۲ء کو قریب المرگ ہوگئے تو ملکہ الیگزینڈرا نے خاص ایلچی کے ذریعے کیرو کو بکنگھم پیلس بلوایا۔ کیرو نے پھر اپنی پہلی پیش گوئی کو دہرایا کہ شاہ ایڈورڈ کی موت اُن کے ۶۹ ویں برس میں ہوگی اور ویسا ہی ہوا۔ شاہ ایڈورڈ ہفتم کی موت اُن کے ۶۹ ویں سال میں ۶ مئی ۱۹۱۰ء کو ہوئی۔

انگلستان کے شاہ جارج پنجم کی زندگی کے حالات ۱۹۲۸-۲۹ء میں خوفناک بیماری کا سامنا لیکن صحت یابی اور موت سے متعلق کیرو نے برسوں پہلے پیش گوئی کی تھی۔

اکتوبر ۱۸۹۳ء میں کیرو نے پہلی بار امریکہ کا دورہ کیا۔ شکاگو سے ایک لڑکی مس میری لیٹر اُسے ہاتھ دکھانے آئی۔ کیرو نے اُسے بتایا کہ وہ کسی غیر ملکی مرد سے شادی کرے گی اور شادی کی وجہ سے اُسے اپنے اور اپنے خاوند کے ملک کے علاوہ کسی تیسرے غیر ملک میں جانا ہوگا، جہاں پر اس کا درجہ ایک ملکہ کا ہوگا۔ اس مس میری لیٹر کی شادی انگلینڈ کے لارڈ کرزن سے ہوئی۔ بعد میں جب لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے بنے تو میری لیٹر کو لیڈی وائسرائے کی بیوی کے ایک طرح

سے ملکہ کا درجہ حاصل ہوا۔

روس کے متعلق کیرو کی پیش گوئی نہایت سنسنی خیز ہے لیکن جیسی کہ تاریخ گواہ ہے نہایت صحیح تھی۔ کیرو نے روس کا پہلا دورہ فروری ۱۹۰۷ء میں کیا تھا۔ روس کے ان دنوں کے وزیر خارجہ الیگزینڈر ازوسکی علم الغیب سے کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے سینٹ پیٹرز برگ میں جس ہوٹل میں کیرو ٹھہرے ہوئے تھے کیرو سے ملاقات کی اور اپنا زائچہ تیار کرنے کے لئے کہا۔ زائچہ تیار کرنے اور اسپر غور و خوض کرنے کے بعد کیرو ڈرتے ڈرتے وہ زائچہ لے کر وزارت خارجہ میں الیگزینڈر ازوسکی سے ملنے گئے۔ کیرو سہمے ہوئے اس لئے تھے کہ وہ زائچہ مستقبل کے بارے میں نہایت خوفناک واقعات کا اظہار کرتا تھا۔

کیرو نے جس وقت زائچہ پڑھ کر سنایا۔ تو روس کے وزیر خارجہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ اور کہنے لگے "کیرو ہو سکتا ہے کہ میری عادات و اطوار کے بارے میں تم نے ٹھیک بتایا ہو لیکن جہاں تک مستقبل کا تعلق ہے تمہاری باتیں نہایت لغو اور بے بنیاد ہیں۔ تم روس کو نہیں جانتے ورنہ تم یہ کبھی کہتے کہ جاپان جیسے ملک سے ہم موجودہ جنگ ہار جائیں گے (ان دنوں جاپان اور روس کے درمیان جنگ ہو رہی تھی جس میں روس کو شکست ہوئی تھی) تمہارا یہ کہنا کہ میری تمام دولت عجم سے چھن جائے گی اور میں کسی غیر ملک میں مفلسی کی حالت میں مروں گا۔ نہایت مضحکہ خیز ہے۔ اور جو تم کہہ رہے ہو کہ روس کے لئے برا وقت شروع ہو جائے گا۔ اور کہ ۱۹۱۸-۱۹۱۷ء میں روس میں ایک خونیں انقلاب ہوگا جس میں زلدا اور زرینہ اور امراء کو قتل کر دیا جائیگا۔ یہ تمام باتیں بکواس پاگل کی بکواس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں،

الیگزینڈر ازوسکی کی اس ترش کلامی کے باوجود کیرو اور ازوسکی میں دوستی ہوگئی۔ اور انہوں نے زلدا اور زاینہ کے ساتھ کھانے کی دعوت پر کیرو کو بلایا۔ کیرو کی پیش گوئی سن کر زاینہ نے بھی مذاق اڑایا۔

تاریخ شاہد ہے کہ کیرو کی ایک ایک بات سچ ثابت ہوئی۔ جاپان کے ساتھ جنگ میں روس کی ہار ہوئی ۱۹۱۸-۱۹۱۷ء میں سرخ انقلاب آیا جس میں زلدا اور زاینہ کے علاوہ بے شمار امراء قتل کئے۔ اور بعد میں نہایت مفلسی کی حالت میں پیرس کے ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں سولہ اگست ۱۹۱۹ء کو الیگزینڈر ازوسکی راہیٔ ملک عدم ہوئے۔

## بقیہ : ایک لمبی لکیر

ہوئے پاپا کی پیٹھ دیکھ رہی ہوں۔ کیا یہ وہی شخص ہے جس نے ایک روز غصے میں آکر کہہ دیا تھا "اب نہیں ٹھیک ہوتی تو کیا کروں؟ اچھا ہے ساری سفید ہونے دو گوری ہو جائے گی" اور ماں حیران اُن کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی۔ پردے کے پیچھے کھڑے میرے ننھے پاؤں مٹھے سے کانپ اُٹھے تھے۔

"ٹھک" شاید وہ اندھا ہے جو ہر روز اس وقت لاٹھی کی ٹھک ٹھک کے سہارے بڑبڑاتا گزرتا ہے۔ اس وقت لیمپ پوسٹ کے پیچھے سے گزر رہا ہے۔ ارے یہ تو دودھیا دائرے سے بغیر وقت کے نکل گیا ہے، تو کیا اس نے اُسے محسوس ہی نہیں کیا؟ ٹھیک ہی تو ہے دیکھ نہیں سکتا تبھی تو اُسے جھیل گیا۔ مجھے لگتا ہے جیسے میرا من اچانک کھل اُٹھا ہے۔۔۔ اندھیرے میں تو کسی سے ڈرنے کا سوال ہی نہیں۔ اور دن میں؟۔۔۔؟ اندھا ہو تو اس کے لئے پھر بھی اندھیرا۔ پھر خواہ وہ میرے انگ انگ کو ٹٹول لے۔ اس کی انگلیاں میرے گال کو چھو لیں گی۔ میری کمر پر کانپیں گی۔ مگر۔۔۔ مگر وہ کچھ نہ پا سکیں گی۔

"تم اندر نہیں آؤ گی؟" ماں نے آواز دی۔ میرا جی چاہتا ہے خوشی سے بھاگتی ہوئی اندر جاؤں اور سب سے اپنی "ڈسکوری" کی کامیابی پر مبارکباد بٹوروں۔ بھیا کے انتظار میں دس منٹ میں ہی اوب جانے والی بھابی کے کان میں کہوں کہ میں سنگ دل نہیں ہوں جو اس لمبی ہوتی انتظار کی لکیر سے اُوب کر ایک ہی جھٹکے میں اُسے توڑ دوں (نہ ہی ایسا کبھی کینوس پر برش چلاتے وقت کیا ہے) پھر اُسے ایک اور موڑ دینے میں کیا حرج ہے؟ اور پھر پاپا کے آگے ہاتھ پھیلا کر کہوں کہ پاپا اور پریشانی اُٹھانے کی ضرورت نہیں۔ بس میرے لئے ایک اندھا تلاش کر دو۔

## بقیہ : پیٹا

خون کا پیاسا رہا ہو۔ میرے ہاتھوں کی گرفت میری گردن پر سخت ہوگئی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ سانس اکھڑ گئی۔ اور آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ اندھیرا گہرا اندھیرا۔۔۔ پھر مجھے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ شاید میں مر گیا تھا۔ اپنی خودداری، غرور اور وقار کو سینے سے لگائے میں نے خودکشی کر لی تھی۔ مگر ہاں وہ آج بھی زندہ ہے۔ اب وہ اُس فرم کا اسسٹنٹ منیجر ہے۔ نفیس کپڑے پہنتا ہے۔ کلب جاتا ہے۔ عمدہ شرابیں پیتا ہے اور کاروں میں گھومتا ہے۔ مگر ہر جگہ وہ سُنہرا پٹا اُس کے گلے میں چمکتا رہتا ہے

## قادر محی الدین ماہر

لب بستہ ہوں بے حس ہوں میں محروم صدا ہوں
اک سنگِ گراں بنکے سرِ راہ پڑا ہوں

ہر گوشۂ ویراں کو میں سیراب کروں گا
میں اشک گہر ریز ہوں، رحمت کی گھٹا ہوں

کھلتے نہیں شہر نگاراں کے دریچے
اک عمر سے میں کاسۂ دل لیکے کھڑا ہوں

ارمان و تمنا کا اٹھائے ہوئے لاشہ
صحرا میں بگولے کی طرح گھوم رہا ہوں

دن بھر غمِ ایام کے صحرا میں بھٹک کر
ہر رات تری یاد کی بھٹی میں تپا ہوں

کل ہم نے نہ ملنے کی قسم کھائی تھی لیکن
کیا جانئے کیا سوچ کے پھر اُس سے ملا ہوں

اک تلخ حقیقت کو چھپائے ہوئے دل میں
ہر صبح و مسا درد کی سولی پہ چڑھا ہوں

# غزلیں

## علیم مسرور

نہیں ہے اب کوئی تمکین و ہوش کی صورت
گھٹا اٹھی اسی مینا بدوش کی صورت

اٹھا لیا ہے یہ کس نے رباب تنہائی
چھڑا ہے نغمہ نوائے سروش کی صورت

گیا ہے دشت غزالاں سے اک چمن آرا
نشانِ پا ہے کفِ گلفروش کی صورت

کہاں تھی فرصتِ نظارۂ جمال تجھے
میں دیکھتا ہی رہا اہلِ ہوش کی صورت

بنا کے حسرت و امید و آرزو کے مزار
کھڑا ہوں دیر سے شمعِ خموش کی صورت

زمانہ آئینۂ صبح نو بدلتا رہا!!
پھبی نہ غازۂ فردا میں دوش کی صورت

خزاں لٹا کے گئی جب سے فرقِ دشت و دمن
جنوں کی شکل سے ملتی ہے ہوش کی صورت

نسیمِ دوش پہ لوٹے چمن اٹھائے ہوئے
مقیمِ دشت ہے خانہ بدوش کی صورت

تجھے خبر نہیں زاہد کہ باب توبہ بھی
کھلائے گا درِ مے فروش کی صورت

کسی نے چھیڑا تو نغمے برس پڑے مسرور
نہیں تو چپ رہا سازِ خموش کی صورت

## شمس فریدی

چاند کی نگری میں جاکر دل لگا پائیں گے کیا
چھوڑ کر دھرتی کو اپنی ہم نہ پچھتائیں گے کیا؟

کیوں بضد ہیں آپ میرے ساتھ چلنے کے لئے
چلتے چلتے پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں گے کیا

اجنبی آنکھوں کی برچھی چبھتی رہتی ہے یہاں
شہر سے ہم دور جاکر تنہا رہ جائیں گے کیا

دھیمی دھیمی آنچ سی رہتی ہے سینے میں مدام
موم کی مانند ایک دن ہم پگھل جائیں گے کیا

سنگ باری سے جو گھبرا کر کچھا میں چھپ گئے
اپنے کاندھے پر اٹھائے وہ صلیب آئیں گے کیا

چلتے بجھتے جگنوؤں کی بھیڑ گرد و پیش ہے
شمس دشتِ آرزو میں ہم بھٹک جائیں گے کیا

## اکمل جالندھری

جب تصور میں ترا پیکر جمال آتا ہے :
دل میں نور آتا ہے چہرے پہ جلال آتا ہے

جس کو آیا نہ کبھی میری تباہی کا خیال
کیوں اسی کا مجھے رہ رہ کے خیال آتا ہے

وہ جو آئے تو کوئی بات نہ نکلی منہ سے
بس اسی بات کا رہ رہ کے ملال آتا ہے

جب کوئی ملتا ہے تقدیر کا مارا تو مجھے
اپنی محرومیٔ قسمت کا خیال آتا ہے

تیری دنیا کی ہر اک شے کی تمنا ہے سود
تیری دنیا کی ہر اک شے کو زوال آتا ہے

جو ترے در پہ عقیدت سے جھکاتا ہے جبیں
چومنے اس کے قدم اوجِ کمال آتا ہے

جس طرف جاتے ہیں تقدیر کے مارے اکمل
خیر مقدم کے لئے جال کے ملال آتا ہے

# کشمیر کے نابینا شاعر

# واسدیو ریہہ

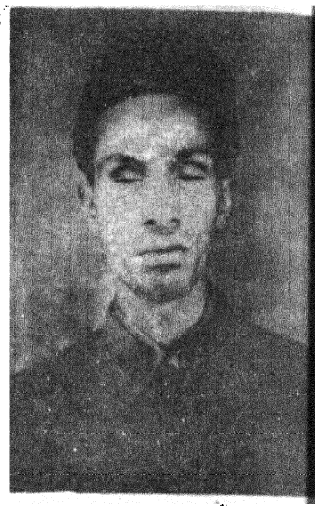

رگھوناتھ کستور

واسدیو ریہہ کشمیری زُبان کے ایک پختہ مشق اور اعلیٰ پایہ کے
حب سخن ہیں۔ یہ سرزمین کشمیر کے شاعروں میں ایک نمایاں شاعر ہیں
کا کلام سننے کے لئے بہت شوق سے ادب نواز حضرات اکٹھے ہوجاتے
۔۔ یوں تو اس جنت نظیر وادی نے ہر زمانہ میں اچھے، نازک خیال
احساس و جذبات رکھنے والے شاعر پیدا کئے جنہوں نے وقت وقت
یک ایسا مقام اور معیار حاصل کیا جو کسی ملک کے لئے باعثِ فخر ہوسکتا
۔ جبھی آج کل بھی کئی نامور اور کہنہ مشق شاعر موجود ہیں۔

کشمیر کی خوبصورتی، یہاں کے مرغزار، پھولوں سے بھرے باغ۔
، اور شفاف چشمے، لہلہاتے کھیت، ٹیڑھے میڑھے جھرنے، آبشاریں۔
رغزار اور پُرفضا ہوا ہر آدمی کے دل میں ایک قسم کا جذبہ پیدا کرتی ہیں اور
انسان بے ساختہ اس وادی کو سدا بہار جنت، پھولوں کی وادی وغیرہ
منسوب کرتا ہے۔ کشمیر میں قدرتی خوبصورتی اور نظاروں کو دیکھ کر ایک
ی کا شاعر بننا اور اونچے معیار تک پہنچنا قدرتی امر ہے۔ لیکن ایک اندھے
، لئے جس کی دونوں آنکھیں ظاہری روشنی سے محروم ہوں ان تمام باتوں
ں میں احساس کرکے شاعر بننا صرف قدرت کی دین ہے۔ واسدیو ریہہ
یسے ہی ایک شاعر ہیں۔ اُن کی آنکھیں اُن کے بچپن میں چلی گئیں جب کہ یہ تین
ں کے تھے۔ تب سے اُنہیں ظاہری آنکھوں سے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔
ن باطنی آنکھیں اس قدر روشن ہیں کہ یہ سب باتوں کو محسوس کرنے
، اور اپنے شعروں میں بیان کرنے لگے۔ اُن کی شہرت ساری وادی میں اُن
کے کلام کی پختگی، جذبات کی ہم آہنگی اور ان کے ترتیبِ سخن سے ہوگئی ہے۔
ادب کے دلدادہ اُن کے نظموں یا غزلوں کو بڑے شوق کے ساتھ سنتے اور
گنگناتے رہتے ہیں۔ ان کی ایک مشہور نظم "شب گرد" یعنی "رات کا
پہرہ دار" کا ہندی ترجمہ معہ کشمیری نظم بھارتی کوتا ۵۷-۱۹۵۶ء میں
چھپ چکی ہے۔

واسدیو ریہہ شمالی کشمیر کے قصبہ سوپور کے رہنے والے ہیں۔ ان
کی عمر اس وقت لگ بھگ چالیس اکتالیس برس کی ہوگی۔ اُن میں
خود اعتمادی، بھروسہ اور جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں اور
اُن کے دل میں درد لگن اور غریبوں کی تڑپ موجود ہے۔

ان کا کلام مناظرِ قدرت، مطالعہ فطرت اور انسانی جذبات کی بڑی
پاکیزہ ترجمانی کرتا ہے۔ شکل و ہیئت کے لحاظ سے اُن کی نظمیں کشمیری ترقی
پسند نظموں میں صفِ اوّل میں شامل ہیں اور عام لوگوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔
کا کلام اُن کے چھوٹے بھائی یا اُن کی چھوٹی بھابی محفوظ رکھتے ہیں اور وہی
اُن کے کلام کو کاغذی صورت دیتے رہتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنا کلام ۱۹۴۸ء
میں لکھوانا شروع کیا۔ انہوں نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ "شب گرد" کے
نام سے چھپوایا ہے لیکن کتابت
کی غلطی سے وہ مقبول نہ ہوسکا۔
ہر ادب نواز اور ادیب ان کی
اس تخلیق میں کتابت کی غلطی کو
بُری طرح محسوس کرتا ہے۔



رگھوناتھ کستور

ریہہ امن اور شانتی کے قائل ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ جب تک دُنیا کے لوگ
آپسی بھائی چارے، محبت اور خلوص کو نہ اپنائیں تب تک دُنیا جھوٹی
اور فریبی ہے۔ اُن سے ایک دفعہ پوچھا گیا کہ آپ نے ریہہ (شعلہ) تخلص
کیوں رکھا تو کہنے لگے۔ "میں چاہتا تھا کہ مرا نام کسی دُوسری زبان کا لفظ
نہ ہو اور خالص کشمیری ہو۔ ۔۔۔ میں نے پہلے "نار" اپنا نام رکھنا چاہا لیکن
سُننے میں آیا کہ یہ عربی لفظ ہے میں نے اُسے چھوڑ دیا اور اُس کے بعد ریہہ نام
رکھا جو خالص کشمیری لفظ ہے اور میں خالص کشمیری میں ہی اپنے خیالات کا
اظہار کرتا ہوں۔"

ہندی کہانی

# آئل لیمپ

اچلا شرما

میرے سامنے اب کچھ باقی نہیں رہ گیا سوائے سڑک پر لگے لیمپ پوسٹ کی خاموش روشنی کے۔ جیسے نظر کی ساری قوت اس روشنی پر ہی مرکوز ہو گئی ہو۔ کسی ہپنوٹائزر کی طرح صاف سڑک پر بڑی سی روشنی کے اس دُودھیا دائرے نے جیسے نظر ہی کو نہیں بلکہ سارے جسم کی قوت کو باندھ لیا ہو۔ سنا ہے مخاطب آدمی اس حالت میں خود کو بھول جاتا ہے۔ کیا یہ وہی حالت نہیں؟ میرے صاف چہرے پر پھیلا یہ دودھیا داغ۔ سچ میرے بائیں گال کو اگر سڑک پر پھیلے اس دائرے کے سامنے کھڑا کر دیا جائے تو کیا یہ جڑواں نہیں لگیں گے؟

مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میری نس نس میں سوئیاں چبھ رہی ہوں۔ ہوا بے شک ٹھنڈی نہیں مگر کچھ تیز ضرور ہے۔ پتہ نہیں جسم کے سُن ہونے کی وجہ کیا ہے۔ اس طرح باہر اتنی دیر تک بیٹھنا یا اپنے آپ میں کھو جانے کی حالت، جو بھی ہو اس وقت تو دماغ بھی اس طرح سُن پڑ چکا ہے کہ اگر چھان بین کے لئے اس سے مدد مانگنے کی کوشش کروں تو بھی مجھے معلوم ہے کہ



وہ کروٹ بدل کر پھر سو جائے گا۔ ہوا کے چھو جانے سے بار بار وہ تیکھا درد اٹھتا ہے۔ جیسے کوئی میرے اندر ہی بیٹھا میری نس نس میں سوئیاں چبھو رہا کاش جسم کے ہر حصے کو کھول کر دیکھ سکتی کہ آخر وہ کون ہے جو اتنی تکلیف دے رہا ہے۔

گھر کے اندر سے بھی اس وقت کوئی آواز نہیں آ رہی۔ لگتا ہے سارا ماحول جیسے سو گیا ہے۔ سوائے اس تیکھے درد کے۔

ابھی کچھ دیر پہلے ڈرائنگ روم میں پانچ جوڑی ہونٹ ہل رہے تھے۔ کبھی وہ باتیں کرتے، کبھی مسکراتے اور کبھی اپنی پوری طاقت سے ہنس پڑتے۔ . . . اور اس سے کچھ دیر پہلے میرا پرو فائل ڈریسنگ ٹیبل کے قدِ آدم شیشے سے جھلک رہا تھا۔ اُس وقت میرا ہر عضو حرکت میں تھا۔ سست نہیں تھا۔ سب سے زیادہ چوکنے تھے میرے کان۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہاں کی چیت کا موضوع میں ہی ہوں۔ میرا آرٹ ہے۔ میرے مشاقی ہاتھ۔ . . . . . میں جانتی تھی کہ کوئی مشرق کی جانب والی دیوار پر لگی پینٹنگ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا ہے، اسے تعریف کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ چھو چھو کر اس کی لکیروں کو محسوس کیا جا رہا ہے۔ . . . . . اور سچ مچ اور میں نے چونک کر میز پر سے لیکوئڈ کیلامائن کی شیشی اُٹھالی تھی۔ لیتے وقت خیال آیا کہ پکار کر کہوں۔ ذرا ان لکیروں کو بھی چھو کر دیکھ کہتی ہیں۔ میری پکار بیچ ہی میں ڈوب گئی تھی۔ . . . کیونکہ کسی کے ہاتھ گ

پچھے نیبل کلاتھ کی تعریف کر رہے تھے "بڑی محنت کا کام ہے بھئی آنکھیں ہی
ہ جائیں بناتے بناتے" ہلکی سی آئی لائننگ کر کے میں نے آنکھیں شیشے میں
ڑی تھیں۔ میرے اندر ہی سے کوئی کہہ اٹھا تھا۔ اب ذرا ان آنکھوں کو بھی
یکھو۔" اور اب کسی کی نظر مسٹل پر پڑی میری تصویر کو چھو رہی تھی۔ میں جانتی ہوں
س کے ہونٹ کیا کہنا چاہتے ہیں ــــ "واٹ اے پرفیکٹ سائڈ فیس"
ــــ "یہ دایاں ہے مسٹر" میں ہنسی تھی۔ اور پھر نئی ساڑھی (جس کا آخری موڈ
ہی پینٹ کیا تھا) کی شکنیں ٹھیک کرتے ہوئے ایک بھرپور نظر چہرے کے دائیں
نے پر ڈالی تھی۔

اس وقت تو اندھیرا کافی گہرا ہو گیا ہے۔ مگر جانے کیوں آج ٹھیک
نہیں لگ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس قد آدم شیشے کے سامنے جا کر ایک بار
اپنے چہرے کا بایاں بھی دیکھ لوں اور کیا ہا اندھیرے میں کیسا ڈر؟ صرف ایک
اندھیرا ہی تو میرا اپنا ہے۔ اس اندھیرے میں میں نے بہت مرتبہ جسم کے وہ
باقی سفید دھبے بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھے ہیں جنہیں دن کے وقت
نی نظروں سے بھی چھپائے رکھنا پڑتا ہے۔ بڑی اچھی چیز ہے یہ اندھیرا بھی۔

چاہتی تھی کہ ڈرائنگ روم میں جا کر کچھ اس طرح بیٹھوں کہ کسی کی نظر
ئیں گال پر نہ پڑے لیکن یہ تو ناممکن تھا۔ اپنی لاچاری پر مجھے غصہ آیا۔ لیکن
س غصے کو ایک ہلکی سی مسکراہٹ میں سمیٹ کر میں نے قدم ڈرائنگ روم
طرف موڑ دیئے تھے۔ "نمسکار" کے لئے ہاتھ اٹھاتے مجھے یہی ڈر لگ
ہا تھا کہ کہیں کمر کے پاس کا ایک ڈودھیا داغ چمک نہ اٹھے۔ جسے میں نے
ڑی کوشش سے بلو سے چھپا رکھا تھا۔

"آپ کالج آف آرٹس میں ہیں نا۔؟"

"جی" میں اس نظر کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی تھی جو برابر میرے
ال کے اس دھبے کو چھو رہی تھی۔

"کس ایئر میں"

"کافی تعریف سنی ہے آپ کی"

"ضرور سنی ہو گی" میں من ہی من میں کہہ اٹھی تھی "ساتھ یہ بھی سنا
ہو گا کہ لڑکی کے بائیں گال پر ایک سفید داغ بھی ہے۔ یہی اس کی
شانی ہے"

"جب یہ چھوٹی سی تھی تبھی سے ...." اس سے پہلے کہ پاپا
اپنی بات پوری کریں میں "ایکسکیوزمی" کہہ کر باہر آ گئی تھی۔ اس وقت واقعی مجھے
بہت غصہ آ رہا تھا۔ یہ کوئی بات ہے بھلا۔ جس چیز کو اتنی کوششوں سے چھپائے
پھرتی ہوں، اس کو یہ شخص اس طرح ننگا کر رہا ہے۔ گویا یہ لڑکا اتنا فراخ دل ہو گا
کہ ان دھبوں کو دیکھ کر بھی مجھ سے شادی کرے گا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع
ہو گئی ہے۔ آنکھوں کے پیمانے سے ناپ کر میں نے دیکھا، برآمدے کا قریب چھ انچ
چوڑا حصہ گیلا ہو گیا ہے۔ اندھیرا بھی کیسا گیلا گیلا لگ رہا ہے۔ جیسے کسی اندھیری
کوٹھی کے گیلے فرش پر کھڑے ہوں جس کی چھت گرنے کو ہو جس کی جہاں
تہاں پڑی دراڑوں سے پانی کی گدلی بوندیں چوچو کر جب تمہیں بھگو دیں تو لگے کہ
متعدد چھپکلیاں کپڑے جسم پر رینگ رہے ہیں۔۔۔۔ جس کی گیلی دیواروں سے جسم کا
کوئی حصہ اسجانے میں اگر چھو جائے تو لگے کہ جیسے سانپ جسم کو چھو گیا ہے۔
اور جس کی ..... بھر گیلی
سڑک پر تو یہ دھبہ اور بھی خطرناک نظر آتا تھا۔ ایسے جیسے کوئی کالا جن
اپنے سفید دانت نکالے کھڑا ہو۔

ہاں اس طرح پچھلے دنوں ایک ڈاکٹر گھر آیا تھا۔ اس نے حال ہی
میں پریکٹس شروع کی تھی۔ کس شان سے بولا تھا کہ آپ کا کیس تو ہوپ فل
ہے۔ "ہوپ فل کے بچے" میرے من میں آیا تھا "میں جانتی ہوں کہ تم کتنے
ہوپ فل ہو۔ ہمت ہے تو ایسے ہی مجھے اپنا لو۔ دنیا بھی دیکھے کہ کتنے پانی
میں ہو"

اس روز ٹریٹ مینٹ کا پہلا دن تھا۔ ایک ٹیوب ہاتھ میں دیتے
ہوئے بولا تھا۔ "یہ افیکٹڈ پارٹس پر لگا لیجئے۔ اس کے بعد انہیں الٹرا
وائلٹ ریز سے ایکسپوز کرنا ہو گا" اس روز پہلی مرتبہ ان دھبوں کو میں نے
دن کی روشنی میں دیکھا تھا۔ اور میری پلکیں کانپ رہی تھیں۔۔۔۔ انھیں
چھوتے ہی میری انگلیاں بھی کانپ رہی تھیں۔ "چھ سات لائٹس میں ٹھیک
ہو جائے گا" اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا میں من ہی من میں مسکرائی
تھی۔ پھر۔۔۔۔ میری آنکھوں پر کالا رومال باندھ دیا گیا تھا۔ میرا دایاں
گال اس نے روم ہیٹر نما لیمپ کے سامنے کر دیا تھا اور پورے ساٹھ سیکنڈ
تک گرم گرم ہوا میرے بائیں گال کو چھوتی رہی تھی۔ ویسے یہ گرم گرم ہوا کافی
اچھی محسوس ہوئی تھی۔

"ہاں اب ساڑھی کا پلو کچھ اوپر کر لیجئے تاکہ کمر کا وہ حصہ ادھر سامنے

ہوجائے۔ میری انگلیاں مجبوری سے کانپیں "جلدی کیجئے میں نے سوئچ آن کردیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

"نو نو" میں نے چیخ کر کالا رومال آنکھوں سے کھینچ دیا تھا۔ تیز گرم روشنی جیسے میری آنکھوں کو چیر کر اندر گھس گئی تھی۔ ۔ ۔ اور میں نے دونوں ہتھیلیوں سے پلکوں کو بری طرح دبا لیا تھا۔

"یہ آپ نے کیا کیا؟ سوئچ آف کر کے وہ قریب آگیا تھا "آپ شاید گھبرا گئی ہیں۔ تھوڑا آرام کر لیجئے" مگر میں بغیر کچھ سنے سیدھی گھر آگئی تھی۔ جس چیز کو میں نے کبھی دن میں دیکھنے کی ہمت نہیں کی تھی اُسے ۔ اُسے کسی اور کے سامنے کیسے ننگا کر دوں؟

اندھیرے کی ایک اور موٹی تہہ ہر چیز پر جم چکی ہے۔ میرے پاؤں کے نیچے تو اتنا کالا کالا ہے کہ لگتا ہے کہ جیسے ننھے منے نے اپنے بوٹ پالش کرتے وقت فرش کو بھی چمکانے کی بات سوچی ہو۔ ۔ ۔ ۔ اگر ایسا ہی اندھیرا اس وقت بھی ہوتا تو مجھے وہ ٹریٹمینٹ لینے میں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ ایسے میں کوئی ننگا بھی ہو جائے تو یہ کالی چادر اُس کی عریانی کو چھپائے رہے۔

"اوہ تو بچپن سے ہی؟" کئی ہمدردی بھری آوازیں ڈرائنگ رُوم کے پردے کو چیرتی ہوئی میرے کانوں سے ٹکرائی تھیں "جی ہاں بچپن سے ہی" غصے اور لاچاری سے میرے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ اور بچپن ۔ ۔ ۔؟ سکول بس میں ایک دم اگلی سیٹ پر بیٹھی میں کبھی ڈرائیور کو اور کبھی خود کو دیکھا کرتی تھی۔ سٹیرنگ پہ جمے اُس کے ہاتھ، اُن پر سفید سفید دھبے اُس کا منہ اس کی گردن اُن سب کے علاوہ مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اور ایک دن ۔ ۔ ۔ "ڈرائیور تم بھی میرے جیسے ہو؟" وہ بے ساختہ ہنستا گیا تھا میں سمجھ نہ سکی تھی کہ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے مگر وہ ہنستا ہی رہا۔

میں ہنس رہی ہوں کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ اس میں ہنسنے کی بات تھی۔ میں نے کہا تھا۔

"ڈرائیور تم بھی میرے جیسے ۔ ۔ ۔ ۔" جبکہ مجھے کہنا تھا"۔ ڈرائیور میں بھی تم جیسی" لگتا ہے اندھیرے کے چپے چپے سے اس کا سفید دھبوں والا چہرہ نکل کر مجھے گھور رہا ہے۔

"تو آؤ پھر تمہیں پیار کر لیں" اس نے ایک جھٹکے سے مجھے گود میں اٹھا کر چوم لیا تھا۔ اُس کے وہ آدھے سفید ہونٹوں کا چھونا ابھی جیسے میرے بائیں گال پر کہیں رینگ رہا ہے۔

"ہمیں نیچے اُتارو" میں گھبرا کر رونے لگی تھی ۔ ۔ ۔ "ارے رے بے بی تو رونے لگی" اور میں بھاگ کھڑی ہوئی تھی وہاں سے۔ مگر بھاگ کر بھی کیا ملا؟ میں تو خود بھی وہی تھی جو وہ تھا "ڈرائیور تم بھی میرے جیسے" ابھی کل ہی جب ساڑھی پینٹ کر رہی تھی تو بینو نے پیچھے سے آکر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر اُسے اپنے سے سٹا لیا تھا۔

"کیوں رے میں تم کو اچھی لگتی ہوں؟"

"بہت"

"تو پھر پیار کر" میں نے اپنا دایاں گال اس کے ننھے ننھے ہونٹوں کے پاس کر دیا تھا۔

"نہیں اِدھر نہیں" وہ چیخ کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

میں نے پوچھا تو، مگر اُس کی چیخ کی گونج نے میرے کان میں خود ہی سرگوشی کر دی کہ یہ میرا بایاں گال ہے اُدھر وہ نہیں چومے گا۔ ورنہ اُسے بھی ہو جائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ اور میں نے جھٹکے سے اسے نیچے اُتار دیا تھا۔ وہ گرتے گرتے بچا تھا اور گھبرا کر رونے لگا تھا "ارے رے بے بی رونے لگی" کسی نے میرے بہت قریب سے کہا تھا۔

اسٹڈی سے کرسی کھسکنے کی آواز آئی ہے۔ پھر کسی کے بھاری قدموں کی آہٹ۔ شاید پاپا ادھر آرہے ہیں۔ میں سنبھل کر بیٹھ گئی ہوں۔ قدموں کی آہٹ کافی قریب آگئی ہے۔ اور برآمدے کا سوواٹ کا بلب بھک سے جل اُٹھا ہے۔ کافی تیز روشنی جیسے آنکھوں کو چیر کر اندر گھس گئی ہے۔

"لیٹنا نہیں ہے کیا؟"

"ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں"

"سن یہ جو آج آئے تھے نا، تیرے علاج کے لئے ایک بہت اچھے ڈاکٹر کا پتہ بتا گئے ہیں" میں اندر ہی اندر ہنسی۔ یہ کیسا مذاق ہے؟ جو بھی لڑکی دیکھنے آتا ہے کوئی نہ کوئی ڈاکٹر ضرور سجیسٹ کر جاتا ہے۔

"میں چلتا ہوں تم زیادہ دیر تک باہر مت بیٹھنا"

"اونھ" میں نے سر کو ایک زوردار جھٹکا دیا مگر تسلی نہ ہوئی میں جاتے

(بقیہ ۳۹ پر)

# نئی کتابیں

**نوائے سرور:** مرتبہ:- حکم چند نیرؔ

ناشر:- ادارہ روزنامہ ہندوستان بنارس

قیمت:- چھ روپے ۔ صفحات:- اصل متن ۱۹۱- ابتدائی تمہیدی صفحات ۴

سرور جہاں آبادی کو ۱۹۱۰ء میں اُن کی وفات کے بعد اکثر ولدادگانِ اُردو نے قریب قریب فراموش کر دیا تھا۔ مرحوم منشی نوبت رائے نظر نے ۱۹۱۰ء میں ایک مقالے کے ذریعے سرور مرحوم کی حیات اور کلام پر تفصیلی روشنی ڈالی تھی۔ اس کے بعد مختلف رسائل میں گاہے گاہے سرور کے بارے میں لکھنے والوں نے تھوڑا بہت لکھا جن میں جگر بریلوی کا مضمون خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مگر اُن کے مضمون کا دارومدار بھی بیشتر نظر مرحوم کے بنیادی اثرات پر تھا۔ دراصل ضرورت اس بات کی تھی کہ سرور ایسے باکمال اور لافانی فنکار کے متعلق ایک تفصیلی تذکرہ قلمبند کیا جائے اور اُن کے کلام کے تجزیہ و تحلیل کے بعد اُن کا صحیح مقام متعین کیا جائے۔ یہ ضرورت ڈاکٹر حکم چند نیرؔ نے بدرجۂ اتم پوری کی ہے۔

اُن کی تصنیف نوائے سرور ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خود اپنے مطالعہ اور دُوسرے ذمہ دار اہلِ الرائے کے اخذ کردہ نتائج کو باہم دیگر منسلک کر کے نیرؔ صاحب نے واقعی سرور جہاں آبادی کا تعارف زمانۂ حال کی اُردو دُنیا میں بڑے انہماک کے ساتھ کرایا ہے۔

نیرؔ صاحب نے نوائے سرور میں سرور کی جو نظمیں شامل کی ہیں ان کی تعداد ۹۱ ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ تعداد ۹۱ سے بھی زیادہ ہے نوائے سرور میں وہ طویل اور کامیاب نوحہ (مسدس) شامل نہیں ہے جو انہوں نے رسالہ زمانہ کے ایک بلند پایہ قلمی معاون لالہ بالمکند گپت کی وفات پر لکھا تھا۔

حق یہ ہے کہ ڈاکٹر حکم چند نیرؔ نے نوائے سرور اور سرور کی حیات اور شاعری اپنی یہ دونوں تخلیقات پیش کر کے مرحوم سرور جہاں آبادی کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ یہ دونوں قابلِ قدر تصانیف ہیں جو اردو میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

(منوّر لکھنوی)

**سیہ برسفید:** مخمور سعیدی

مخمور سعیدی کے اس دوسرے شعری مجموعے میں نظمیں، غزلیں اور رباعیات شامل ہیں۔ بیشتر حصہ نظموں پر مشتمل ہے۔ مخمور کی نظموں میں جو شے قاری کو سب سے پہلے متوجہ کرتی ہے، وہ اُن میں پایا جانے والا وقت کا ماضی، حال، مستقبل کا ہوش مندانہ ادراک ہے۔ ایک ترقی پذیر معاشرے کا فرد ہونے کے ناتے وہ ماضی سے متعلق تو ہے، لیکن اس تعلق سے افسردہ نہیں۔ گو مخمور کے یہاں حال کے خدوخال واضح نہیں، لیکن تشکیل اور تکمیل کا ایک عمل البتہ جاری ہے۔ وہ اپنے حال کو حال سمجھ کر جینے کا آرزومند ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ اُسے اپنا حال مثالی لگا ہو یا یہ کہ اُس نے اُس سے قطعی یا مکمل مفاہمت کر لی ہے۔

مخمور کا یہی ذہنی رویہ اُسے اپنے بیشتر ہم عصروں سے ممیز کرتا ہے

مخمور کا انداز بڑی حد تک استفہامیہ ہے۔ اس کی شاعری ایک سوچتے اور سوال کرتے ہوئے ذہن کی شاعری ہے۔ اس کی نظمیں بڑی مربوط ہیں۔ وہ خیال کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور وقت کے چھوٹے

بڑے لمحوں پر اُن کو مقصود بالذات سمجھ کر توجہ نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں ہمیں اُلجھن میں ڈالنے والی بے ربطی کا احساس نہیں ہوتا اور اس کا ایسی روش نے اس کی نظموں کو محض تاثراتی ہونے سے بچا لیا ہے۔ مخمور کی نظموں کی مثال عکس کی نہیں نقش کی ہے۔ یہ نقش نہ تیز ہیں اور نہ شوخ لیکن ان سے تجسس اور تشکیک کی دھیمی دھیمی آنچ ضرور آتی ہے۔ یہ شاعر کے اعتدال میں لائے ہوئے اضطراب اور کرب کی مظہر ہے اور قاری کے ذہن میں اضطراب و کرب کی ایک خلش پیدا کر دیتی ہے اور جس تجسس اور تشکیک کا نتیجہ یہ اضطراب و کرب ہے اسی کی ایک ہلکی سی کرن قاری کے دل و دماغ میں پھوٹنے لگتی ہے اور وہ بلکے اندھیروں میں راستہ تلاش کرتا ہے، ٹٹولتا نہیں۔

مخمور کی نظمیں ایمائی اور راست انداز کا بڑا اچھا امتزاج لئے ہوئے ہیں۔ اس کا اسلوب نہ نیا ہے اور نہ پرانا ہی۔ لفظ تازہ کی تلاش میں اُس نے بچوں کے سے تحیر پر تکیہ نہیں کیا اور نہ توتلی زبان میں باتیں کی ہیں۔ اُس کی علامتیں اور استعارے جانے پہچانے ہیں، دیکھے بھالے ہیں۔ اُن کا استعمال بھی سامنے کا ہے۔ لیکن استعمال کا انداز تازہ ہے اور اپنے اندر نئے پن کی سی دلکشی رکھتا ہے۔ اس کی نظموں کی دُنیا اور اس دُنیا کی بے جان اشیاء بھی زندہ اور ذی جان ہیں اور اپنے اندر ایک تحریک، ایک گویائی رکھتی ہیں۔ مخمور اُردو کا واحد شاعر نہیں، جس نے اس انداز کو اپنے مجموعی اسلوب کا ایک حصہ بنایا ہو لیکن اس وسیلے سے اثر انگیزی کی جو فضا اُس نے اپنی نظموں میں پیدا کی ہے، وہ فی الواقع اُسی کا حصہ ہے۔ اپنی اس کوشش میں اُس نے جو تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے ہیں، وہ اشارے ہیں لیکن اُن کی ظاہر اور معنوی مشابہت ہمارے دیکھے برتے حقائق کو ایسا اثر اور تاثر بخش دیتی ہے جو ہمارے لئے نیا نہ ہوتے بھی نیا ہوتا ہے۔ یہ ظاہر اور معنوی مشابہت اپنے اندر تصویر کشی کی بے پناہ صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کا بنایا ہوا ہر نقش نہ صرف مکمل ہوتا ہے، بلکہ اپنے اندر ایک جہان بھی رکھتا ہے۔

مخمور کی غزلیں بھی کم یا بیش انہیں خصوصیات کی حامل ہیں۔ سیہ بر سفید میں رباعیات بھی شامل ہیں۔ مخمور اُن معدودے چند نئے شعراء میں سے ایک ہے جنہوں نے صنفِ رباعی پر ڈھنگ سے توجہ کی ہے۔

۱۶۸ صفحات پر مشتمل یہ شعری مجموعہ اہتمام کے ساتھ نازش بک سینٹر پھاٹک تیلیاں، اندرون ترکمان گیٹ، دہلی ۶ نے شائع کیا ہے۔
قیمت ساڑھے چار روپے ہے (راج نرائن راز)

## عبدالحق کے خطوط عبدالحق کے نام

مرتبہ : افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق مرحوم
ناشر : اسلامیہ بک ڈپو، کرنول
قیمت : ۲ روپے

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی نام کے دو یا دو مددوست بھی ہو جاتے ہیں مگر شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ ایسے دو شخص بہم ہو جائیں جن کے نام اور کام بھی ایک جیسے ہوں اور انداز فکر اور طریق عمل بھی ایک جیسا اور مشترک رہا ہو۔ ان سب امور پر مبنی اگر کوئی داستان درد دل بیان کی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق اور افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کی سرگزشت حیات سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہوگی۔ ان دو عظیم محبان وطن میں اُردو میں جو وصف، قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے وہ اُردو زبان کے تحفظ و ترقی اور اس کی ترویج و اشاعت کے تعلق سے ان کا قومی اور ملی جذبہ خدمت ایثار و قربانی، اُن کی شبانہ روز اور نہایت مخلصانہ اور دردمندانہ سعی پیہم سے عبارت ہے جس کو انہوں نے اپنی آخری سانس تک عبادت و ریاضت کی طرح جاری و ساری رکھا۔ اس کی ایک نمایاں جھلک خطوط کے اس قابل قدر مجموعہ میں بھی ملتی ہے۔

دیگر اصنافِ ادب کی بہ نسبت خطوط لکھنے والے کی شخصیت کے زیادہ حقیقی آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اور چونکہ اُردو تحریک کا ہر مرحلہ عبدالحق کا رہین منت رہا ہے اس لئے انجمن ترقی اُردو اور سارے ہندوستان میں اس کی شاخوں کے قیام و استحکام، جلسوں، کانفرنسوں کا اہتمام و انعقاد جائزوں، رپورٹوں، رسالوں کی چھپائی و اجرا، مدارس، کالجوں اور اُردو یونیورسٹی کے بھی قیام کی تجویز۔ اصطلاحات، ترجموں اور سائنسی علمی و فنی کتب کی ترتیب و اشاعت، تعلیمی نصابوں کی منظوری، غرض اُردو زبان اور اس کی بقاو ترقی کی مثالی لگن اور سچی تڑپ ان بے مثل رہبران اولیں کے ان خطوط میں آج بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ ظاہری حسن طباعت و اشاعت

سے قطع نظر اُردو کے ہر بہی خواہ اور خاص کر اُردو انجمنوں کے سربراہوں اور کارکنوں کے لئے اور تحریک کے موجودہ دور میں بالخصوص مولوی عبدالحق کے ان خطوط کا مطالعہ اہم اور ضروری ہے (ابوالفیض سحر)

'جامِ جم' نام ہے ذوالنورین مرحوم کی غزلوں کے مجموعے کا جو تقریباً پونے میں سو اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ تعداد اشعار کے لحاظ سے مختصر مگر افکار کی بلندی اور جذبات کی دلنشینی کے اعتبار سے گرانقدر ہے ـــ ذوالنورین اپنی شاعرانہ فطرت سے مجبور ہو کر شعر کہتے تھے مگر شاعر مشہور ہونے کے خیال سے گھبراتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مدتوں مشاعروں اور ادبی نشستوں میں شعر سنانے سے گریز کیا حالانکہ وہ ان میں ہمیشہ شریک ہوتے اور فراخدلی سے داد دیتے۔

ان کی شاعری کی خصوصیات میں نمایاں خصوصیت جذبات کی لطافت ہے۔ چند شعر درج ذیل ہیں۔

رہزنِ ہوش بھی ہے دشمنِ ایماں بھی ہے عشق
راس آجائے اگر حاصلِ ایماں بھی تو ہے

اشکوں کو مرے اس لئے نسبت ہے گہر سے
وابستہ تصور ہے ترا دیدۂ تر سے

بے خودی میں نہ رہا منزلِ دل کا بھی خیال
ہم نکل آئے تری راہ گزر سے آگے

تھی مہرباں عروسِ بہاراں بہت مگر
جب دل کو امتیازِ بہار و خزاں نہ تھا

گزر ہی جائے گی یہ زندگی مگر اے دوست!
ترے مزاج پر اس جور کا گماں کم تھا

افسوس کہ موت نے ذوالنورین کو اپنا کمالِ فن دکھانے کا موقع نہ دیا اور اس نے ہم سے ایک اچھا انسان اور ایک اچھا شاعر چھین لیا۔

(حبیب احمد صدیقی)

## بقیہ: ہندی شاعری پر اُردو کا اثر

بند کولوں میں سمندر کا شریر

ـ نیرج ـ بادر برس گیو

'و' کا استعمال اُردو فارسی میں ہی ہوتا ہے۔ ہندی میں اس کے لئے تتھا اور ایوم وغیرہ لکھا جاتا ہے۔ لیکن اُردو کا اثر دیکھئے کہ ہندی میں بھی 'و' کا استعمال ہونے لگا۔

آج کے ابھار کے وکل کے اپواس کے

ـ مکتی بودھ ـ چاند کا منہ ٹیڑھا ہے۔

ہری اودھ، آنچل، اودے شنکر بھٹ، موہن لعل دوبدی، گوپال پرساد ویاس، دھرم ویر بھارتی، اجت کمار، شریمن نارائن اگروال، جگموہن اوستھی، استھانا، بھادت بھوشن، ڈاکٹر دیوراج، کیرتی چودھری، دیو راج دنیش، ویریندر مشر، مکتی بودھ، مہیندر بھٹناگر، سرویشور، شمشیر، سُدرشن، کیشو چندر ورما وغیرہ متعدد شعراء نے اُردو کا اثر قبول کیا ہے۔

الفاظ کے علاوہ فارسی اُردو محاورے کو بھی ہندی والوں نے خوب اپنایا ہے۔ بعض نے تو محاوروں کا ترجمہ کر لیا ہے اور بعض نے اُردو کے محاورہ کو اس کی اصلی حالت میں ہی قبول کر لیا ہے۔ پہلی قسم کے محاورے دیکھئے۔

| | |
|---|---|
| انگشت بدنداں | دانتوں تلے اُنگلی دبانا |
| آواز کشیدن | آوازے کسنا |
| دست بر دست نشستن | ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا |
| آب شدن | پانی پانی ہونا |

دوسری قسم کے وہ محاورے ہیں جن میں سے اگر اُردو الفاظ کی بجائے ہندی الفاظ رکھ دیئے جائیں تو محاورے کا لطف ہی ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا قدم لینا، سر قلم کرنا، چراغ تلے اندھیرا، خاک میں ملنا، وغیرہ محاورے اپنی اصلی صورت میں ہی ہندی والوں نے اپنائے ہیں۔ مگر بعض لوگوں نے کچھ محاوروں کا ترجمہ بھی کیا ہے مگر وہ چل نہیں سکا۔

اُردو اور ہندی ایک ہی ماں کی دو بیٹیاں ہیں۔ دونوں کا علاقہ تقریباً ایک ہے لہٰذا دونوں زبانوں کا ایک دوسرے کو متاثر کرنا لازمی ہے۔ اُردو پر بھی ہندی کا کافی اثر ہے۔ یہ آپسی لین دین دونوں زبانوں کے لئے مفید ہے۔ ہمیں امید رکھنی چاہئے کہ آئندہ یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے مزید قریب آئیں گی۔

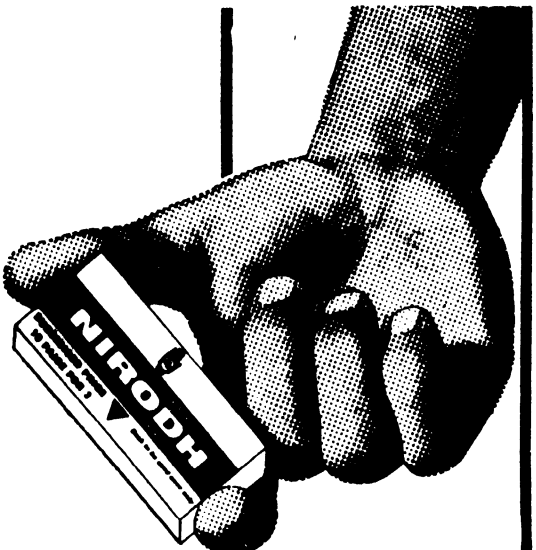


## بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

فی زمانہ بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نِرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچے تبھی ہوگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔

## بچہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نِرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچے کی پیدائش ملتوی کرسکتے ہیں۔

نِرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا 'آسان' و محفوظ طریقہ ہے۔ اِس کے استعمال سے صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔

نِرودھ ہر جگہ ملتا ہے:-
پروویژن اسٹور، کرانہ فروش، کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔

# نِرودھ استعمال کیجئے

فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم

۱۰ پیسے کے 3
سرکاری امداد سے کم دام

صرف 5 پیسے خرچ کرکے آپ اپنے کنبے کو محدود رکھنے کی طاقت حاصل کرسکتے ہیں

70/61

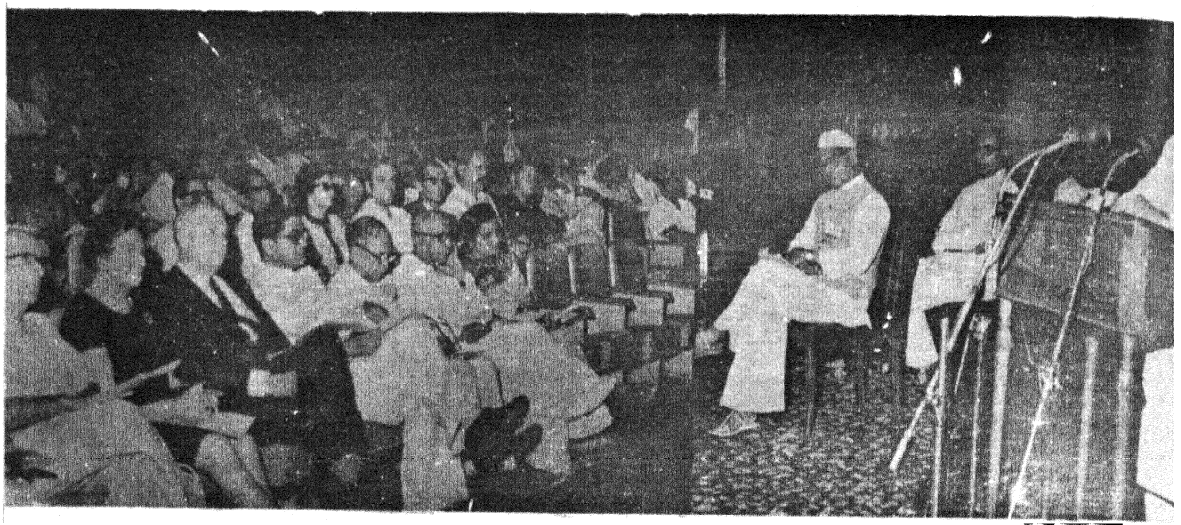

اقوام متحدہ نے ۱۹۷۰ء کو بین اقوامی تعلیمی سال کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان نے تعلیمی میدان میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم کے بڑے بڑے ادارے کھل گئے ہیں اور طلباء کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔
۱۸ جولائی ۱۹۷۰ء کو صدر جمہوریہ ہند نے نئی دہلی میں بین اقوامی تعلیمی سال کے سلسلے میں ہونے والی تقاریب کا افتتاح کیا۔ اس تقریب کا اہتمام مرکزی وزارت تعلیم اور دہلی ایڈمنسٹریشن نے مل جل کر کیا تھا۔

## پنڈت جیون لال مٹو

۱۹ جون ۱۹۷۰ء کو ہندوستانی موسیقی کے ماہر عالم اور استاد پنڈت جیون لال مٹو کا انتقال ہوگیا۔ یہ جامع صفات ہستی اپنی مثال آپ تھی۔ ۲۰ جولائی ۱۸۹۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد پنڈت نندلال مٹو پنجاب میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے دھرپد دھمار کے ماہر تھے بیٹے کو بھی موسیقی کی تعلیم سے نوازا۔ پنڈت جیون لال نے بھائی اروڑہ، استاد مولا بخش اور استاد عبدالوحید خاں سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ یہ کرانہ گھرانے کے فنکار تھے۔ پولیس افسر رہے اور بڑے بڑے اعزاز حاصل کئے۔ استاد عبدالوحید خاں کو اپنے پاس مدتوں رکھا یہاں تک کہ لداخ اور گلگت کے سفر میں ساتھ لے گئے۔ ہاکی کے مشہور کھلاڑی تھے۔ شکار کے شوق میں کینیا، حبشہ، روس، چین اور ہمالیہ کے جنگل چھان مارے۔ آل انڈیا ریڈیو میں آرکسٹرا کی تنظیم کی۔ کانفرنسوں میں تقریریں کیں۔ یونیورسٹیوں میں موسیقی کے ممتحن رہے۔ سینکڑوں شاگردوں کو تعلیم دی۔ محمود مرزا، مادھوری مٹو، رمیش پریم، درشن سنگھ اور ستیش بھاٹیہ ان میں قابل ذکر ہیں۔ آج کل کے لئے انہوں نے فن موسیقی پر متعدد عالمانہ مضامین لکھے۔ اپنے استاد عبدالوحید خاں کی یاد میں کرانہ سوسائٹی آف میوزک قائم کی۔ ایسا دلکش، دلچسپ اور مرنجان مرنج انسان کہاں ملے گا۔



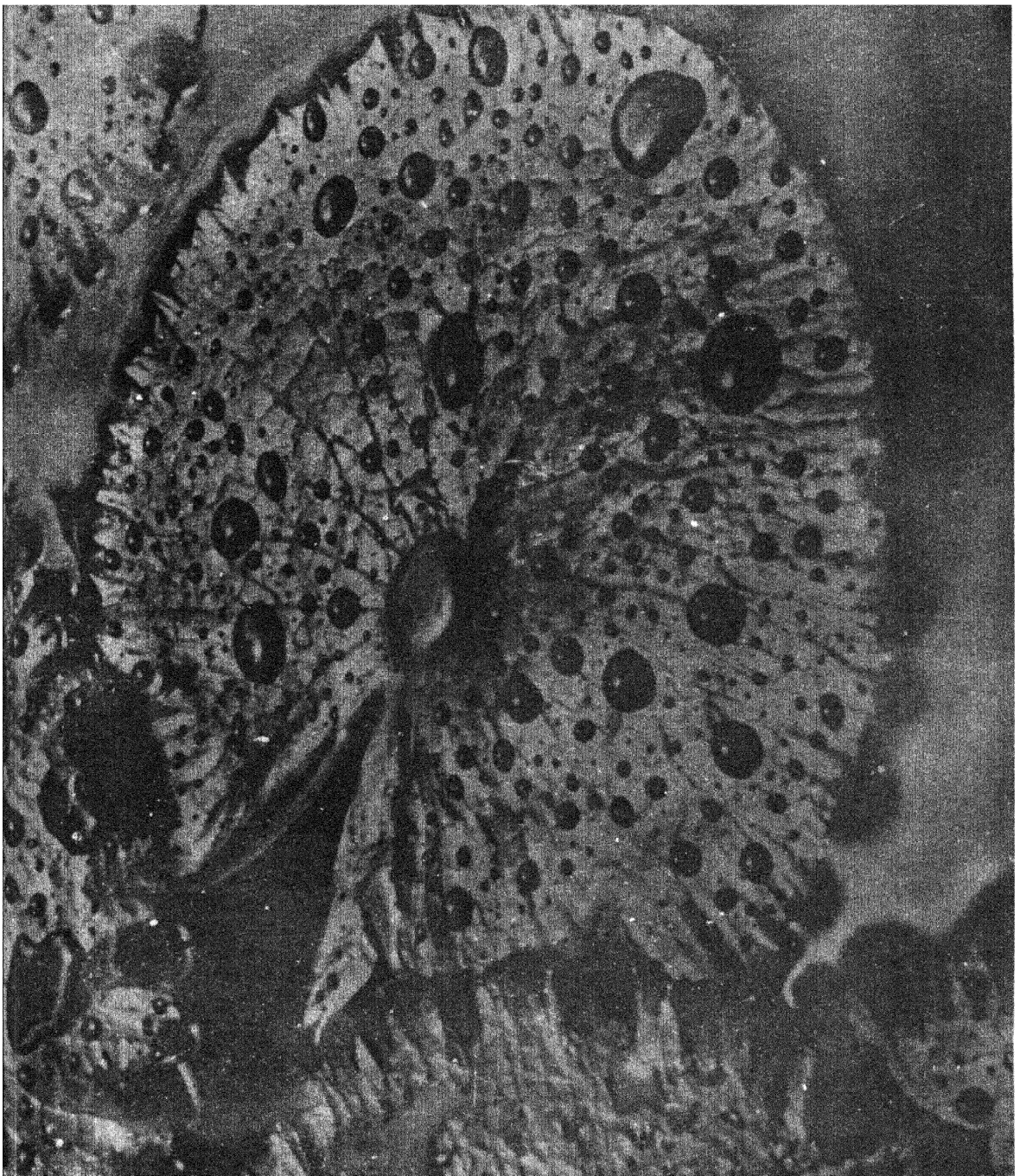

Vol. 29 No. 2 AJKAL (Monthly) September 1970

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55
Regd. No. D-509


آج کل
Osmania University Library,
۶۰ پیسے
اکتوبر ۱۹۷۰ء

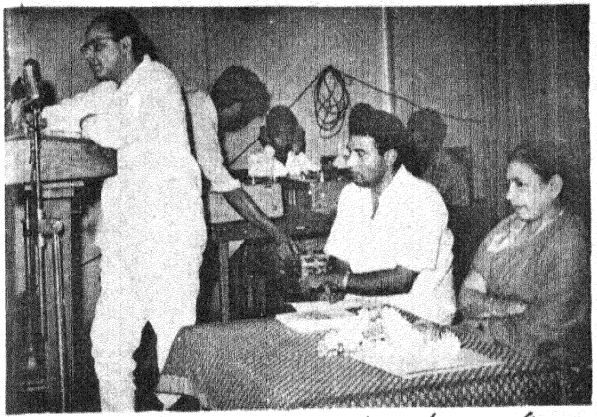

۲۲ اگست ۱۹۷۰ء کو دہلی پبلک لائبریری میں انجمن ترقی اُردو کی شاخ دہلی کی طرف سے مشاعرہ جشنِ آزادی کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت جناب اندر کمار گجرال وزیر مملکت، وزارتِ اطلاعات ونشریات حکومتِ ہند نے کی۔
(تصویر میں) بیگم حمیدہ سلطان اور جناب بہار برنی اسٹیج پر تشریف فرما ہیں اور وزیرِ موصوف تقریر کر رہے ہیں۔

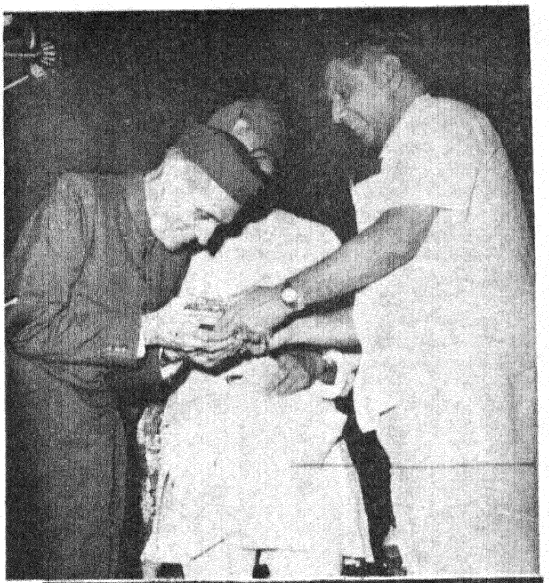



۱۵ اگست ۱۹۷۰ کو ماؤلنکر ہال نئی دہلی میں انجمن عروجِ ادب کی جانب سے جشنِ ساحر منایا گیا جس میں مقتدر ادبا و شعرا نے شرکت کی۔
(اُوپر) جناب وی شنکر جناب ساحر ہوشیار پوری کو ۲۱ ہزار روپے کا چیک پیش کر رہے ہیں۔
(نیچے) اس موقع پر ساحر ہوشیار پوری کے اُستادِ محترم اور اُردو کے بزرگ ترین شاعر جناب جوش ملسیانی کو اُن کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ اُردو کے ممتاز محقق جناب مالک رام نے اُن کی خدمت میں یہ سپاسنامہ پیش کیا۔





۲۹ اگست ۱۹۷۰ء کو غالب اکاڈمی نئی دہلی میں جناب بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی کی یاد میں دہلی کی مختلف ادبی انجمنوں کی طرف سے ایک جلسہ کیا گیا جس کا افتتاح جناب بشیر حسین زیدی اور صدارت شری اندر کمار گجرال نے کی۔

اُردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

# آج کل

(نئی دہلی)


شہباز حسین

نند کشور وکرم



جلد ۲۹ شمارہ ۱ سیریل ۳

اکتوبر ۱۹۷۰ء

آشون کارتک شک سمت ۱۸۹۲



ملاحظات — ادارہ — ۲

رُوحِ انسانیت (نظم) — رفعت سروش — ۴

جامعہ ملیہ اسلامیہ — نند کشور وکرم — ۵

غزل — عطا کاکوی — ۹

غبارِ کارواں (۸) — اسلوب احمد انصاری — ۱۰

غزلیں — مظفر حنفی ۔ نثار احمد فاروقی ۔ کنول پرشاد کنول — ۱۴

خلیج (کہانی) — آمنہ ابوالحسن — ۱۵

غزل — کامل فتح پوری — ۱۹

طلسماس نامہ، سعادت یار خاں کی خود نوشت سوانحعمری ۔ محمد حسن — ۲۰

غزل — شارق — ۲۴

یہ جھوٹ ہے — آوارہ — ۲۵

ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت اور آئین ۔ محمد عمر — ۲۸

غزل — مصور سبزواری — ۳۴

آدمی نامہ (کہانی) — کمار پاشی — ۳۵

غزل — طلحہ رضوی برق — ۳۸

آخری خوابوں کا سفر (نظم) — ایم کوٹھیاوی راہی — ۲۹

پلاسٹک سرجری (نظم) — سخاوت شمیم — ۳۹

سراغ (نظم) — احمد وصی — ۳۹

محمد اجمل خاں — اوصاف علی — ۴۰

غزل — سیف سہسرامی — ۴۳

ایک پیسہ (کہانی) — سچی راوت رائے — ۴۴

غزل — محمد انوار الحسن نور — ۴۶

نئی کتابیں — سیفی پریمی — ۴۷



مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر آج کل (اُردو) پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی



| | | |
|---|---|---|
| سالانہ چندہ | ہندوستان میں | سات روپے |
| غیر ممالک سے | پاکستان میں | سات روپے (پاک) |
| | ۱ شلنگ چھ پنس یا ڈیڑھ ڈالر | |
| قیمت فی پرچہ | ہندوستان میں | ۶۰ پیسے |
| غیر ممالک سے | پاکستان میں | ۶۰ پیسے (پاک) |
| | ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ | |

# ملاحظات

## اقوام متحدہ کے ۲۵ سال

انجمن اقوام متحدہ کا قیام ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو عمل میں آیا تھا۔ ابتداء میں اُس کے ۵۰ ممبر تھے اور اس وقت ممبروں کی تعداد ۱۲۶ ہے۔ کیمونسٹ چین کے سوا دُنیا کا ہر آزاد ملک اس کا ممبر ہے اور مُلک کی وسعت اور آبادی سے قطع نظر ہر ملک کا ایک ووٹ ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ قوموں کی اس برادری میں سب برابر ہیں۔ گزشتہ پچیس برسوں میں اقوام متحدہ نے دُنیا کے ملکوں کو قریب لانے، شک وشبہ اور بے اعتمادی دُور کرنے اور پسماندہ ملکوں کی امداد کرنے کے سلسلے میں غیر معمولی کام انجام دیئے ہیں۔

اقوام متحدہ اپنی بے شمار ذیلی انجمنوں کے ذریعے تمام بنی نوع انسان کی خدمت میں لگی ہے اور صحت، تعلیم، امن عالم، تجارت، انسانی حقوق، پسماندہ اقوام کی ترقی غرضیکہ ہر اُس میدان میں سرگرم کار ہے جو انسان کی فلاح وبہبود کے لئے ضروری ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض موقعوں پر خصوصاً بعض لڑائیوں کو روکنے کے معاملے میں یہ ادارہ کوئی موثر قدم نہ اُٹھا سکا لیکن اُس کی وجہ اس ادارے کی ناکامی نہیں بلکہ متعلقہ ملکوں کی اپنی مصلحتیں ہیں۔ تاہم اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ بعض معاملوں میں یہ ادارہ ناکام رہا تو بھی یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اِس ادارے نے جو خدمات انجام دی ہیں۔ وہ اُس کی ناکامیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اور بیش قیمت ہیں۔

قوموں اور ملکوں میں بٹی ہوئی یہ دُنیا دو عالمگیر جنگوں میں تباہ اور برباد ہو چکی ہے۔ دوسری عالم گیر جنگ کی ہولناکی اور تباہی نے ہی عالم گیر ادارے کے قیام کی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلایا تھا۔ قدیم زمانے سے ہی اوتار، پیغمبر، دانشور اور مفکر یہ پیغام دیتے آئے ہیں کہ نسل، مذہب، زبان اور جائے پیدائش کی بنیاد پر انسان اور انسان میں امتیاز بالکل غلط اور غیر انسانی فعل ہے۔ ساری نسلِ انسانی ایک ہے۔ کسی قوم یا مُلک کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ دوسری قوم کا استحصال کرے۔ اقوام متحدہ کے قیام نے اس تصور کو نہ صرف عام کیا ہے بلکہ اُس کو تقویت بھی پہونچائی ہے۔ اب کسی ایک ملک کے مسائل صرف اُس کے اپنے مسائل نہ رہ گئے ہیں بلکہ ساری دُنیا کے مشترک مسائل بن گئے ہیں جن کو دُور کرنے میں ہر ملک، اقوام متحدہ کے وساطت سے ہاتھ بٹاتا ہے۔ یہ ادارہ وقت کی اہم ترین ضرورت تھی اور آج بھی اس کی اہمیت اور افادیت مسلم ہے۔

## بین اقوامی تعلیمی سال

سماجی ترقی کے لئے تعلیم کی اہمیت بنیادی ہے اور جہالت، بیماری اور غریبی کو دُور کرنے کیلئے وسیع پیمانے پر تعلیمی انتظامات ضروری ہیں۔ تعلیم علم آگہی عطا نہیں کرتی، دردمندی اور رواداری بھی پیدا کرتی ہے۔ واہموں کے ہوش ربا سے باہر لاتی ہے۔ اور تعقل پسندی کو فروغ دیتی ہے تعلیم صحیح معنی میں انسان کو انسان بناتی ہے۔

دُنیا کا بڑا حصّہ تعلیم کی دولت سے محروم ہے خصوصاً ایشیا اور افریقہ
زاد ملکوں میں تعلیمی ترقی کی رفتار تسلّی بخش نہیں ہے اس لئے اقوام متحدہ
۱۹۷۰ء کو بین اقوامی تعلیمی سال قرار دیا ہے تاکہ دُنیا کے ممالک اپنے تعلیمی
کا جائزہ لیں اور تعلیمی سرگرمیوں میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس
و بھی دھیان میں رکھیں کہ اُن کا تعلیمی ڈھانچہ ایسا ہو، جو مستقبل کی ضروریات
ر رکھتے ہوئے بنایا گیا ہو تعلیمی ڈھانچے پر نظر ثانی کی ضرورت خاص اہمیت
کیونکہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی جہاں خواندگی کا تناسب تقریباً سو فی صدی
بار میں ہیجان اور بے چینی پائی جاتی ہے۔

آزادی کے بعد سے ہندوستان میں تعلیمی ترقی کو غیر معمولی اہمیت
ہے اور خامیوں اور کمیوں سے قطع نظر اس میدان میں ہم نے قابلِ
قی کی ہے مثلاً چھ سے گیارہ سال کی عمر والے بچوں کے گروپ میں
ب پانچ میں سے چار بچے اسکول جاتے ہیں جبکہ ۱۹۴۷ء میں اُن کا
ب ایک اور تین کا تھا۔ ۱۱ سے ۱۴ سال کی عمر کے گروپ میں سے
چار میں سے دو بچے اسکول جاتے ہیں جبکہ آزادی کے وقت یہ
ب ایک اور نو کا تھا۔ سیکنڈری درجوں میں تعلیم پانے والے
ر کی تعداد دس لاکھ (۱۹۴۷) سے بڑھ کر اب ۷۰ لاکھ ہوگئی ہے۔
درسیٹوں کی تعداد ۱۹ سے بڑھ کر ۸۷، ملحقہ کالجوں کی تعداد ۲۵۰
ھ کر ۳ ہزار اور طلبا کی تعداد ۲½ لاکھ سے بڑھ کر ۲۵ لاکھ تک
ج گئی ہے۔ مجموعی طور سے خواندگی کا تناسب ۱۴ فی صد سے بڑھ کر
فی صد تک پہونچ گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں تمام ذرائع سے تعلیمی اخراجات
کروڑ روپے تھے جو اب نو سو کروڑ ہیں۔ دُنیا کے چند ہی ملکوں میں اتنی کم
میں اتنی بڑی ترقی ہوئی ہوگی۔

یہ اعداد و شمار ہم میں ہمت و حوصلہ پیدا کرتے ہیں کہ ہم تعلیم
ب قومی نظام تیار کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے جو ہماری ضرورتوں
منگوں کو پورا کرنے میں ممد و معاون ہوگا۔

## تماعی ترقی کی تحریک

ہندوستان کے شہروں اور گاؤں کی حالت میں بڑا واضح فرق ہے
غیر ملکی حکومت نے گاؤں کی حالت سدھارنے اور اُن کی حالت بہتر بنانے
ت کوئی توجہ نہ دی تھی۔ گاؤں کے اہلِ حرفہ کاشتکار اور بے زمین مزدور
اقتصادی بدحالی کا شکار تھے اور شہر کی صاف اور کھلی فضا سے نکل کر شہروں
کی تنگ و تاریک فضا میں روزی کمانے آتے تھے۔ گاؤں سے شہر کی طرف
یہ مراجعت اس وجہ سے تھی کہ کھیتی باڑی کا کام سال بھر نہیں ہوتا تھا۔ کھیتی باڑی
کے علاوہ گاؤں میں روزگار تعلیم اور تفریح کے مشاغل برائے نام تھے۔ رسل
و رسال کی کمی اور پسماندگی نے گاؤں کو بے کیف اور ایک حد تک بے عمل
بنا دیا تھا۔ آزادی کے بعد اس صورت حال کا جائزہ لیا گیا اور گاؤں
کی حالت کو بہتر بنانے کی متعدد تدابیر اختیار کی گئیں جن میں سب سے اہم
اور مفید اجتماعی ترقی کی تحریک تھی جو ۲ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو شروع کی گئی تھی۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ گاؤں کی ہمہ جہت ترقی ہو اور اس کی ترقی میں
خود گاؤں والے شریک اور حصّہ دار ہوں، ان میں اپنی مدد آپ کا جذبہ
پیدا ہو اور آپسی تعاون کا رُجحان بڑھے۔ خود گاؤں والوں میں ایسی
قیادت پیدا ہو جو اپنے مسائل خود حل کر سکے اور ہر معاملے میں حکومت
کی مدد کی محتاج نہ ہو ——— گاؤں انجمن امداد باہمی اور پنچایت
کے ذریعے اس جمہوری ملک کی ایک اکائی بن جائیں اور بتدریج خود اپنے
پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔

یہ سارے کام صرف گاؤں والوں پر نہیں چھوڑے گئے بلکہ ان
کی مدد اور رہنمائی کے لئے حکومت نے مالی وسائل اور ٹیکنیکل عملہ دونوں
مہیا کیا۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا ہے اور گاؤں والوں میں بیداری آئی ہے۔
اسکول جانے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ مل جل کر کام کرنے سے
غرقوں اور ذاتوں کی دیواریں ٹوٹی ہیں صفائی ستھرائی کا خیال پیدا ہوا ہے اور
وبائی امراض میں خاصی کمی آئی ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہوئی ہے کہ
گاؤں والوں نے کھیتی باڑی کے جدید طریقوں کو اپنایا ہے جس سے زرعی
پیداوار میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

ہندوستان میں تقریباً ۵½ لاکھ گاؤں ہیں جن میں ملک کی ۸۰
فی صد آبادی رہتی ہے۔ گاؤں کی ترقی صحیح معنوں میں ہندوستان کی ترقی
ہے اور اجتماعی ترقی کی تحریک اپنی بعض خامیوں کے باوجود اس فرض کو
بخوبی پورا کر رہی ہے۔

# روحِ انسانیت

رفعت سروش

وہ مشعل،
وہ علم و ہدایت کی مشعل
جو روشن ہوئی تھی
غلامی،
جہالت،
نفاق اور حسد کے اندھیرے میں
ہر تیرگی کو مٹانے
عمل کے نئے راستے جگمگانے
وہی مشعلِ نور ہے خندہ زن آج بھی وقت کی تیرگی پر

وہ آواز،
وہ مشفق آواز،
جیسے ہو اک موج مہر و محبت کی،
اخلاص و انسانیت کی،
وہ آواز جس نے دیا درس تہذیبِ وحدت
وہ آواز افشا کئے جس نے اسرارِ الفت،
وہ آواز اٹھی تھی جو سینہ زندگی سے
اس آواز کی جوئے شیریں رواں ہے ہر اک دل کی
وادی میں اب بھی،

وہ دل
جو دھڑکتا تھا ہر غم میں انسانیت کے
وہ دل جس میں ہندو مسلماں
ہر انساں کے واسطے پیار تھا،
جوشِ ایثار کا تھا۔
وہ دل جس میں خوفِ خدا،
جذبۂ بندگی تھا
وہ دل جس میں جلوہ نما
شعلۂ آگہی تھا
وہ دل جس کا ہر نغمہ تھا نغمۂ زندگانی
وہ دل جسم عالم میں گھر کر چکا ہے
وہ دل اب دھڑکتا ہے دنیا کے ہر پاک باطن کے
پہلو میں
ہر زندگی کے مجاہد کے سینہ میں اب بھی

وہ انسان
جو فخرِ انسانیت تھا
وہ انساں جو غازی تھا کردار کا
ایک پیکر تھا عزم و عمل کا
وہ انسان امن و اہنسا کی قوت پر ایماں تھا جس کا
وہ انساں مقابل تشدد کے جس نے اٹھایا بغاوت
کا پرچم
قیادت میں جس کی بڑھا قافلہ ذہن اور دل کی
آزادیوں کا
وہ انسان فتح و نصرت نے قدم جس کے چومے،
وہ انساں امر ہو گیا ہے شہادت کا اک جام پی کر
امر ہے مہاتما ہے وہ قوت
کہ تاریخ تہذیب و آزادی میں نام ہے جس کا گاندھی
وہ گاندھی جو اک مشعلِ نور ہے۔
اک صدائے صداقت ہے



ہر دم دھڑکتا ہوا دل ہے۔
جو روحِ انسانیت ہے۔

آج کل نئی دہلی




جامعہ ملیہ اُس پُرآشوب عہد میں وُجود میں آئی جبکہ ہندوستان کے عوام انگریزی حکومت کے غلبہ وتسلط سے نجات پانے کے لئے برسرِپیکار تھے۔ مہاتما گاندھی اور دیگر رہنماؤں کی قیادت میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد عوام میں جذبۂ حریت وآزادی تیز سے تیز تر ہوگیا تھا۔ اس لئے مستقبل کے خطرے کو بھانپتے ہوئے انگریزوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے رولٹ ایکٹ کا سہارا لیا۔ لیکن اس قانون کے نفاذ سے ہندوستانی عوام غیض وغضب سے بھر گئے اور انگریزی حکومت کی مخالفت میں زیادہ شدت پیدا ہوگئی۔ انہی دنوں ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام نے جلتے پر تیل کا کام کیا۔ اس کے ساتھ ہی ترکی میں خلافت کے خاتمے کے امکانات نے ہندوستانی مسلمانوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑا دی تھی اور علی برادران کی رہنمائی میں لاکھوں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف نفرت وحقارت کا اظہار کیا۔ اس تحریک کو مہاتما گاندھی کی تائید وحمایت بھی حاصل ہوئی جس سے اُسے مزید تقویت حاصل ہوئی۔

ساتھ ہی سودیشی چیزوں کا استعمال اور بدیشی چیزوں کی بائیکاٹ کی تحریک نے بھی زور پکڑا۔ انگریزی لباس اور انگریزی طریق بود وباش کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم دینے والے اسکولوں اور کالجوں کا بھی مقاطعہ کیا گیا۔ علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم کو بھی قومی رنگ ورُوپ دینے کی کوششیں کی گئیں کیونکہ اس وقت اس درس گاہ پر انگریزی اثرات نمایاں تھے۔



مولانا محمد علی

مولانا محمد علی شوکت علی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو نیشنل یونی ورسٹی بنانا چاہتے تھے لہٰذا ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو مولانا محمد علی نے آزادی وحرّیت کے حامی پُرجوش طلباء واساتذہ کی امداد سے دارالعلوم علی گڑھ کی جامع مسجد میں اعلان کردیا کہ اب یہ درسگاہ نیشنل مسلم

یونی ورسٹی ہوگی۔ نماز جمعہ کے بعد دیوبند کے سربراہ شیخ الہند مولانا محمود حسن نے اس شالی ادارے کا افتتاح کیا اور وہ خطبہ دیا جسے جامعہ کی تاریخ میں خطبۂ تاسیس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن پولیس کی امداد سے ان پُرجوش نوجوانوں کو کالج کے احاطے سے نکال دیا گیا اور پھر رنگ بھنگ تین صد طلبا، اُستاذہ نے کھلے میدان میں بے سروسامانی کے عالم میں مستقبل کی اس شالی درسگاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو چند خیموں میں قائم کیا۔ حکیم اجمل خاں اس کے پہلے امیر جامعہ اور مولانا محمد علی پہلے شیخ الجامعہ مقرر ہوئے۔

اس طرح ایک قطعی آزاد قومی درس گاہ وجود میں آئی جس کا نصب العین مسلمانوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ایسی تعلیم سے بہرہ ور کرنا تھا جو صحیح معنوں میں تخلیقی اور عملی ہو اور جس سے دل و دماغ کو بیداری و بالیدگی حاصل ہو۔ نیز طلبا، کو جسمانی اور ذہنی نشوونما کے مواقع حاصل ہوں اور اُن میں خود اعتمادی اور خودداری کے علاوہ خود کفالت کا جذبہ بھی پیدا ہو۔ اُن کی تعلیم ملی اور قومی ضروریات کے مطابق ہو اور انگریزی اثر و رسوخ سے آزاد یہ تعلیم گاہ ملی مصالح کی پابند ہو۔ وہ ملک کی آزادیٔ اتحاد میں مددگار و معاون ہو اور اس کی تعلیم میں اسلامیت اور قومیت دونوں کا امتزاج ہو۔ نیز تعلیم ایسی پُرمقصد ہو جس کے وسیع دائرے میں حکمت، صنعت، سیاست اور معیشت سب کچھ آجائے۔

جامعہ کے قیام کے فوراً بعد فاؤنڈیشن کمیٹی نے نصاب تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی۔ جس کے ارکین کی مدد سے مولانا محمد علی نے ابتدائی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم تک کا نصاب مرتب کیا۔ منظور شدہ نصاب کے تحت مسلمانوں کے لئے دینیات اور ہندوؤں کے لئے ہندو اخلاقیات کی تعلیم لازمی قرار دی گئی۔ چوتھی جماعت سے عربی اور انگریزی کو بھی لازمی قرار دیا گیا۔ نیز اُردو کو زبانِ اول کے طور پر اختیار نہ کرنے والوں کے لئے ہندی کا نصاب تیار کیا گیا اور ہندی کو زبان اوّل کی حیثیت سے اپنانے والوں کے لئے آسان اُردو سیکھنا لازمی قرار دیا گیا۔ خوشخطی کو بھی نصاب میں بڑی اہمیت دی گئی اور اس کے ساتھ ہی درجہ پنجم سے کسی حرفے کا سیکھنا بھی ضروری ٹھہرایا گیا تاکہ طلبا، تعلیم کے ساتھ ساتھ کوئی حرفہ بھی سیکھ لیں اور حصولِ تعلیم کے بعد اپنا من پسند پیشہ اختیار کرسکیں۔

طباعت، فوٹوگرافی، جلد سازی، الیکٹرو پلیٹنگ، پالش، بلاک بنانے، شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ وغیرہ کی تعلیم کا بھی خاطر خواہ انتظام کیا گیا اور پھر قلیل مدت میں جامعہ ایک آزاد قومی درس گاہ کی شکل اختیار کرنے لگی، اور بہت سے اسکولوں نے اُس کے ساتھ اپنا الحاق کرالیا۔

ابتدا میں جامعہ کے زیادہ تر اخراجات خلافت کمیٹی برداشت کرتی تھی لیکن تین چار سال بعد جب یہ تحریک ٹھنڈی پڑ گئی تو جامعہ کو انتہائی مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے اُستادوں اور کارکنوں کو بڑی تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑا اور طلبا کو بھی بہت سی تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔ یہاں تک کہ اکثریت نے درسگاہ کو بند کردینے کی رائے دی۔ اُس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین جرمنی میں زیرِ تعلیم تھے۔ جب اُنہیں بذریعہ تار اطلاع دی گئی کہ مجلس انتظامیہ کے اراکین اسے بند کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں تو اس کے جواب میں ذاکر صاحب نے لکھا کہ وہ اور اُن کے چند ساتھی جامعہ کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کریں گے لہٰذا اُن کی آمد تک کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جائے۔ اس دوران حکیم اجمل خاں کی ایما پر مجلسِ انتظامیہ کے اراکین نے جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کرنے کا فیصلہ کیا اور جولائی ۱۹۲۵ء میں اس فیصلے کو عملی جامہ بھی پہنا دیا گیا اور قرول باغ (نئی دہلی) میں جامعہ کا کام کرایہ کی عمارتوں میں شروع کیا گیا۔

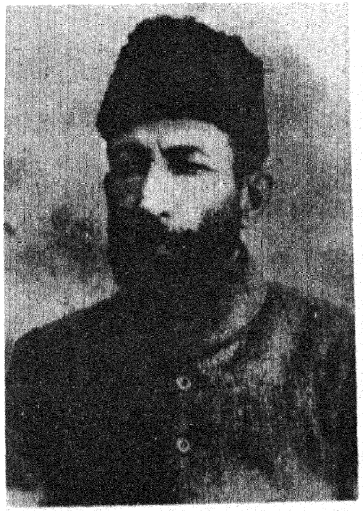

حکیم اجمل خاں

فروری ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد حبیب اور ڈاکٹر عابد حسین کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور آتے ہی ذاکر صاحب کو بجائے طاہر اسیس محمدی کی جگہ شیخ الجامعہ مقرر کردیا گیا پروفیسر محمد حبیب تاریخ کے اُستاد بنائے گئے اور ڈاکٹر عابد حسین نے

سجل کے علاوہ رسالہ جامعہ کی ادارتی ذمہ داری بھی سنبھال لی۔

جامعہ کو دہلی منتقل ہوئے ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ دسمبر ۱۹۲۷ء کو حکیم اجمل خاں کا انتقال ہوگیا اور اُن کی جگہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری امیر جامعہ مقرر ہوئے۔ جب تک حکیم صاحب بقیدِ حیات رہے وہ جامعہ کی مالی مشکلات کو حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے اور جانے کہاں کہاں سے روپیہ فراہم کرتے رہے مگر اُن کی موت کے بعد درسگاہ کی حالت بہت دگرگوں ہوگئی اور وہ کئی ہزار روپے کی مقروض ہوگئی۔ اس نازک دَور میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور جامعہ کے دیگر نوجوان کارکنوں نے 'انجمن تعلیمِ ملّی'

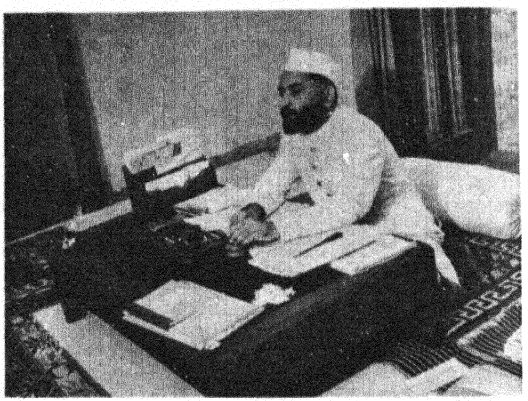

ڈاکٹر ذاکر حسین نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے

کے نام سے ایک سوسائٹی قائم کی جس کے اراکین نے عہد کیا کہ وہ کم از کم ۲۰ برس تک جامعہ کی خدمت کرتے رہیں گے اور اس عرصے میں کبھی ۱۵۰ روپے سے زیادہ مشاہرہ نہیں لیں گے۔ بعالانکہ بعد میں کئی بار ان نوجوانوں کو اپنے مقررہ مشاہرہ سے بھی کم پر گزارہ کرنا پڑا اور مفلسی و عسرت میں دن کاٹنے پڑے۔ اتنا کرنے کے باوجود بھی جامعہ کی حالت نہ سدھری کیونکہ ایک تو سرکاری امداد اُسے منظور نہ تھی دوسرے متمول طبقے سے بھی بہت کم رقوم ملتی تھیں۔ لہٰذا ۱۹۳۲ء میں جامعہ کو اقتصادی بحران سے نجات دلانے کے لئے 'ہمدردانِ جامعہ' کے نام سے ایک نئی تنظیم کی تشکیل کی گئی جس کے ممبر ماہانہ اور سالانہ رقم عنایت کرتے تھے۔ جلد ہی انِ اراکین کی تعداد دس ہزار تک پہونچ گئی اور اس سے جامعہ کی مالی حالت سُدھرنے لگی۔ مئی ۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر انصاری انتقال کر گئے۔ ان کے بعد جناب عبدالمجید خواجہ کو امیرِ جامعہ مقرر کیا گیا اور چونکہ آہستہ آہستہ جامعہ کی مقبولیت و اہمیت کا احساس بڑھتا رہا لہٰذا اداروں کے سربراہوں نے بھی معقول مالی امداد دینی شروع کر دی جس سے جامعہ نے اوکھلا کے قریب جمنا کے قریب زمین خرید کر جامعہ نگر بسایا اور قرولباغ کے کرائے کی عمارتوں کے بجائے اسے اپنا مرکز بنایا۔ دھیرے دھیرے درس گاہ کی عمارتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور آج وہاں دارالعلوم کی متعدد دلکش اور خوبصورت عمارتوں کا جال بچھا ہوا ہے۔

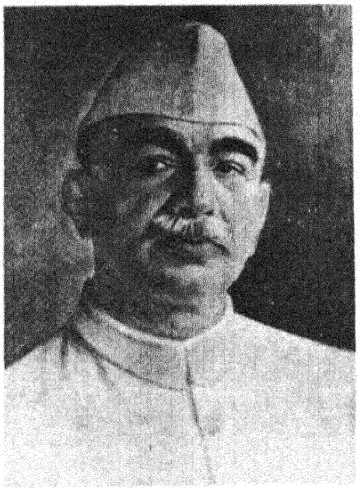

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین علی گڑھ کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ اُن کے بعد اُن کے رفیقِ کار پروفیسر محمد مجیب کو شیخ الجامعہ مقرر کیا گیا



محمد مجیب

اور گزشتہ ۲۲ سال سے یہ قومی دارالعلوم اُن کی رہنمائی و قیادت میں ترقی کی منازل طے کر رہی ہے۔ اُن ہی کے عہد میں یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن ایکٹ ۱۹۵۶ء کے تحت ۱۹ جون ۱۹۶۲ کو اسے باقاعدہ یونی ورسٹی تسلیم کر لیا گیا

شروع میں یہ تعلیمی ادارہ ابتدائی اسکول، ثانوی اسکول اور ایک کالج پر مشتمل تھا لیکن آہستہ آہستہ اُس کا دائرہ درس و تدریس برابر بڑھتا رہا۔ ۱۹۲۸ میں بنیادی مدرسوں کے اساتذہ کی تعلیم و تربیت کے لئے 'استادوں کا مدرسہ' قائم کیا گیا اور اب بیسک ٹریننگ کے علاوہ بی ایڈ اور ایم ایڈ تک کی تعلیم کا انتظام ہے۔ ۱۹۵۱ء میں چھوٹے بچوں کے لئے نرسری اسکول کھولا گیا۔ ۱۹۵۲ میں دیہی تعلیم اور دیہی معاشیات اور سماجیات کے علیحدہ علیحدہ ادارے قائم کئے گئے۔ ۱۹۵۵ء میں ایک ریسرچ ٹریننگ اور پروڈکشن سنٹر کی بنا رکھی گئی جس کا مقصد نوخواندہ لوگوں کی تعلیمی ضرورتوں کا جائزہ لے کر انہیں مناسب امداد دینا ہے۔ دیہی ادارہ بھی یہاں کا ایک قابلِ قدر ادارہ ہے۔ جہاں دیہی خدمات کے لئے تین سال کا کورس ہے۔ اس یونی ورسٹی میں نرسری سے لے کر ایم اے تک کی کلاسوں کا خاطر خواہ انتظام ہے اور فوجی جوان جامعہ کے ملازمین اور خواتین ہر امتحان پرائیوٹ طور پر دے سکتی ہیں اس کے ساتھ ہی طلبا کو سائنس، فنونِ لطیفہ اور دستکاریوں کی تعلیم بھی دی جاتی ہے تاکہ مستقبل میں وہ معاشی پریشانیوں کا شکار نہ ہوں۔

چونکہ لائبریری درس گاہ کا ایک اہم جزو ہوتی ہے۔ اس لئے جامعہ نے اس طرف غیر معمولی توجہ دی ہے۔ اور اس وقت جامعہ کی مرکزی

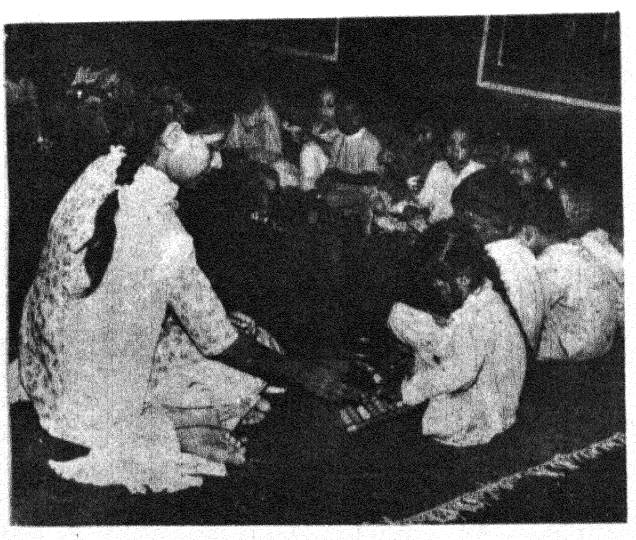

لائبریری میں لگ بھگ ۲۵ ہزار کتابیں موجود ہیں جو طلبا کی تعلیم و تحقیق میں بہت مفید اور مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ان کتب کے علاوہ اُردو اور عربی کے بیش بہا مخطوطات کا ایک گراں قدر ذخیرہ بھی موجود ہے مولانا محمد علی، شوکت علی اور حکیم اجمل خاں کے ذاتی مسودات اور تصنیفات بھی یہاں محفوظ ہیں۔

جامعہ کے قیام کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی کتابوں کی دکان کھولی گئی تھی جس نے بعد ازاں مکتبہ جامعہ کی شکل اختیار کر لی اور آج ایک بہت بڑا اشاعتی ادارہ ہے۔ تقسیم وطن کے بعد کے نا حالات سے دوچار ہونے کے باوجود اس ادارے نے اپنا کام رکھا اور اب یہ ہندوستان میں اُردو کے چند اہم اشاعتی اداروں شمار کیا جاتا ہے۔ حال میں مکتبہ نے حکومت جموں و کشمیر کی مالی امداد سے قدیم معیاری کتابوں کو صحیح متن اور حسن طباعت کے ساتھ آفسٹ شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، جنہیں کم از کم قیمت پر فراہم جائے گا

اس سلسلے کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اب تک یہ ادا ڈیڑھ ہزار کے قریب کتابیں شائع کر چکا ہے۔

کتابوں کے علاوہ جامعہ سے تین ماہنامے جامعہ، پیام اور کتاب نما بھی شائع ہوتے ہیں۔ جامعہ اعلیٰ پائے کے ادبی او مضامین سے آراستہ جریدہ ہے۔ پیام تعلیم بچوں کا رسالہ ہے اُنہیں سے متعلق دلچسپ اور معلوماتی مضامین، کہانیوں اور نظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ 'کتاب نما' میں اُردو میں شائع ہونے وا کتابوں سے متعارف کرایا جاتا ہے اور اس سے لائبریریوں، کتب اور اُردو میں دلچسپی رکھنے والے حضرات کو کتابوں کے انتخاب مدد ملتی ہے۔

جامعہ ہر سال تعلیمی میلہ منعقد کرتی ہے۔ جس میں بچوں کی کو خاص طور پہ مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ بچے مشاعرہ، بیت بازی، ک فائر اور طرح طرح کے دلچسپ کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں اور اپنے اور دکانیں بھی لگاتے ہیں۔ اس تقریب پر نمائش کا بھی اہتمام جاتا ہے جس میں بچوں کے فنون اور حرفوں کا مظاہرہ کیا

ے۔اس میلے میں بچّوں اور اُن کے والدین کے علاوہ ہزاروں مہمان
ی شرکت کرتے ہیں۔

ہر چند کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قوم پرست اور حب الوطن ہندستانی
سلمانوں کے لئے قائم کی گئی تھی تاکہ انہیں اسلامیت اور قومیت کی
نیا پر تعلیم دی جائے، لیکن دوسرے فرقوں کے طلبار کے لئے اس
ے دروازے کبھی بند نہیں ہوئے اور ہزاروں ہندو طلبار یہاں سے
تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ اور آج بھی زیرِ تعلیم ہیں۔



جامعہ ملیہ اسلامیہ صحیح معنوں میں ایک ایسی درس گاہ ہے جس
ر بجا طور پر ملک اور قوم کو فخر ہو سکتا ہے۔

اس ادارے نے اپنی زندگی کے پچاس سال پورے کر لئے ہیں اور
س کا "جشنِ زریں" منایا جا رہا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں جشنِ سیمیں کے موقع پر تقریر
رتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا تھا کہ یہ جوبلی ماضی پر فخر کرنے کا جشن نہیں
ہے بلکہ مستقبل کے عزم کا موقع ہے۔ خدا ہماری مدد فرمائے۔" یقیناً خدا نے
ن کی مدد کی اور جامعہ اب گولڈن جوبلی منا رہی ہے اور یہ تاریخی جملے اس
وقت بھی یاد کئے جائیں گے جب جامعہ کی ڈائمنڈ جوبلی منائی جا رہی ہوگی۔

آزاد ہندوستان نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کے
مواقع فراہم کئے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ آنے والے زمانے میں جامعہ ترقی
کی مزید منزلیں طے کرے گی۔

آج کل نئی دہلی



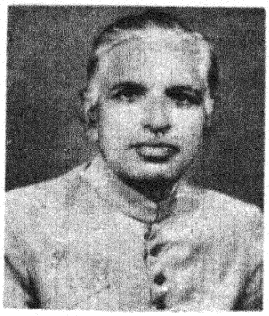

عطا کاکوی

## غزل

ہے زندگی بار دوش اس پر اگر ترا دسترس نہیں ہے
سمجھے اس راز کو کہ جینا فقط شمارِ نفس نہیں ہے

یہ تیلیاں تم جو دیکھتے ہو بنائیں گے آشیاں انہی سے
اگر رہے بال و پر سلامت تو پھر قفس یہ قفس نہیں ہے

سنبھالو جوشِ جنوں کو اپنے چمن کا بھی رنگ ڈھنگ دیکھو
پکار کر کہہ دیا خزاں نے بہار اب کے برس نہیں ہے

نہ کر پریشاں نظر کو اپنی صدائے دل پر بھی کر توجہ
رہے گا کب کارواں منظم اگر نوائے جرس نہیں ہے

ہنسی کو میری ہنسی نہ سمجھو نہ اس کی اتنی ہنسی اُڑاؤ
یہ عشق کا خندۂ غم انگیں ہے گریۂ بوالہوس نہیں ہے

ہے عشق کے آتشیں نفس سے بنا ہوا اپنا آشیانہ
جلائے گی اس کو برق کیا، یہ نشیمنِ خار و خس نہیں ہے

بھروسے پر دوسروں کے جینا سہارا غیروں کا لے کے چلنا
ہزار بار اس سے موت اچھی جو زیست پر اپنا بس نہیں ہے

چلے ستم کی ہزار آندھی نہ یہ بجھی ہے نہ بجھ سکے گی
ہے عشق کی شمع دل میں روشن کوئی چراغ ہوس نہیں ہے

تو آپ کر اپنی چارہ سازی فضول ہے یہ گلہ طرازی
پکارتا ہے عطار یہ کسو کو کوئی بھی فریاد رس نہیں ہے

اکتوبر ۱۹۷۰ء

# غبارِ کارواں

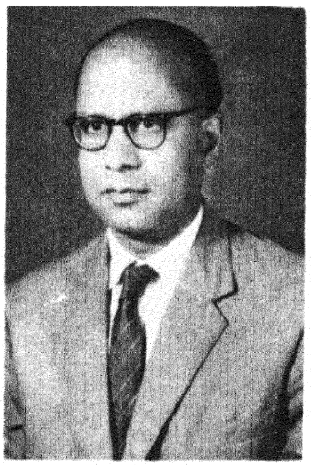

(۸)

اسلوب احمد انصاری

میں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں، ہندوستان میں ہندو مسلم سیاست بہت سے طوفانوں سے گزر چکنے کے بعد ایک نئے موڑ میں پہونچ گئی تھی، یعنی جداگانہ انتخابات کی مانگ ہر طرف سے کی جا رہی تھی، خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں اپنی اندرونی طاقت اور اپنا جواز کھو چکی تھیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی صدائیں، صدائے طاق نسیاں بن چکی تھیں۔ اُردو اور ہندی کی آویزش بھی شروع ہو چکی تھیں۔ گو اس میں جارحانہ رنگ ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ لیکن مجھے کبھی سیاست سے گہری دلچسپی نہیں رہی۔ میری ابتدائی تعلیم و تربیت ایک نیم مذہبی قدامت پسند گھرانے میں ہوئی جہاں مذہب پر عمل تو بہت زیادہ نہ تھا لیکن مذہبی اور اخلاقی قدریں دلوں میں گہرے طور پر پیوست تھیں۔ میرا گھرانہ پرانے طرز کا زمیندار گھرانہ تھا لیکن اس میں زمیندار گھرانوں جیسا ٹھاٹھ باٹھ، اکڑ اور نخوت، کسانوں پر ظلم اور زبردستی اور عیش و عشرت کا دور دور گزر نہ تھا۔ میرے والد معمولی طور پر تعلیم یافتہ اور ڈاک کے محکمے میں سرکاری ملازم تھے اور پنشن لینے کے بعد اپنی زمین اور جائیداد کے معاملات میں پوری طرح اُلجھے رہتے تھے۔ میری والدہ بھی اچھے خوشحال گھرانے کی تھیں اور دونوں میں جو بات مشترک تھی وہ ظاہری دینداری سے زیادہ نیت اور عمل، دل اور کردار کی پاکیزگی، طہارت اور دردمندی اور انسانیت تھی۔ مجھے یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ میرے والد مرحوم نے کبھی کسی حاجت مند کو مایوس نہیں لوٹایا۔ داد و دہش میں اُن کا ہاتھ بہت کھلا ہوا تھا اور اُن میں کنبہ پروری کا جذبہ بدرجۂ اتم تھا۔ یہی حال میری والدہ کا بھی تھا۔ خاموشی اور ہمدردی کے ساتھ ضرورت مندوں کی حاجت روائی غالباً اُن کے صحیفۂ اخلاق میں ایمان کا درجہ رکھتی تھی۔ مجھے اپنے بچپن کے طویل وقفوں کے ساتھ اپنے گاؤں میں بھی جو ضلع سہارن پور میں تھا، رہنے کا اتفاق ہوا اور میں نے کسانوں کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا مگر گاؤں کی زندگی اور اُس کی فضا مجھے کبھی دلچسپ نہیں معلوم ہوئی۔ میری ابتدائی تربیت میں میرے سب سے بڑے بھائی کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ اُن پر مذہبی رنگ شروع سے غالب تھا اور آخر میں اس حد تک گہرا ہو گیا تھا کہ وہ ہر چیز کو اسی آئینے میں دیکھنا پسند کرتے تھے۔ بہت عرصے تک میرا دل اس گہرے مذہبی رویے سے گھبراتا اور اکتاتا تھا مگر اُن کے کردار کی پختگی، اُن کی بے لوث محبت اور اُن کی نیت کے کھرے پن اور معاملات میں عدل اور سچائی کی میں دل سے قدر کرتا تھا۔ اور اُن کی زندگ

پنے لئے ایک نمونہ سمجھتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ حضرت بابا فرید شکر گنج کا
ل دُہرایا کرتے تھے کہ سچا دوست وہ ہے جو اپنے دوست کو فائدہ پہنچانے
بہانے ڈھونڈتا رہے۔ اُن کی پوری زندگی ایک طرح سے اسی نصب العین
ملا برتنے میں صرف ہوئی۔

میں ۱۹۲۵ء میں دہلی میں پیدا ہوا۔ میرا بچپن شروع سے تنہائی میں
ا، چونکہ میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور بہت چھوٹا تھا اسی
ہ ہمیشہ بے حد دُلار اور پیار کا مرکز اور مور دبھی رہتا اور اُن کی دلچسپیوں
بھی شریک نہ ہو سکتا تھا۔ اپنے ہم عمر ساتھیوں میں آزادی کے ساتھ
نے کود نے کے مواقع نہ ملنے کی وجہ سے میری طبیعت میں ابتدا ہی سے ایک
ج کی حزم و احتیاط، ایک طرح کا نامعلوم خوف و ہراس، تنہائی سے محبت
ر حد درجہ کی دروں بینی پیدا ہو گئی۔ معمول کے خلاف میرا ذہنی ارتقا بھی کچھ
ب طریقے سے ہوا۔ شروع میں مجھے ادب سے بالکل رغبت نہیں تھی۔ نہ
نے کہانیاں پڑھنے کا شوق، نہ نئی جگہوں سے لطف اندوز ہونے کی رغبت؛
دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کی طرف میلان، اور نہ اپنے تخیل میں
ہوتی اور واہمہ کی دُنیائیں آباد کرنے کی صلاحیت جو صغر سنی میں اکثر بچوں میں
ا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مجھے ریاضی سے بہت دلچسپی تھی۔ گھنٹوں اس
غرق رہتا اور دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا۔ قصے کہانیوں سے زیادہ
سوانح عمریاں اور خشک قسم کے علمی مضامین پڑھنے کا شوق تھا۔ مذہبی
امین بھی کبھی کبھی دیکھتا۔ البتہ تقریر کرنے کا شوق مجھے ہمیشہ سے رہا۔
عائے ذات کا شاید یہی واحد ذریعہ مجھے اپنے لئے نظر آتا تھا۔ اس کے
ادہ مجھے تصویریں بنانے سے بے حد شغف تھا اور بکروں اور زنگوں
دلفریب کائنات میں ایک عجیب طرح کی ابدیت کا احساس ہوتا
ا۔ اس فن کی تحصیل میں میں نے اپنی زندگی کے بہت سے سال صرف
ے۔

میرے ماحول میں شاعری کا خاصا چرچا تھا۔ خاندان میں بڑے چھوٹے
یوں شاعر تھے۔ ان میں سب سے زیادہ ممتاز میرے چچا حکیم آزاد انصاری
ے۔ جب وہ ہمارے گھر آتے تھے، تو سب اُن کے اردگرد جمع ہو جاتے اور
سنانے کی فرمائش کرتے اور وہ انتہائی سادگی کے ساتھ بلا تامل
فرمائش پوری کرتے۔ آزاد انصاری، جوش ملیح آبادی کے ہم عصر اور
یار غار تھے۔ دونوں ایک زمانے میں میر عثمان علی خاں، والیٔ دکن کے
لڑکوں کے اتالیق رہے، اور ساتھ ہی ریاست سے نکالے بھی گئے۔ شروع
میں صاحبِ ثروت تھے مگر اپنی بے اعتدالیوں کی وجہ سے آخر میں اس
حد تک تنگ دست ہو گئے تھے کہ جگر اور اصغر کی طرح چشمہ فروشی پر اُن
کی معاش کا انحصار تھا۔ اس ماحول میں پرورش پانے کے باوجود غالباً
مجھے شاعری سے کچھ دلچسپی اس لئے نہیں تھی کہ میں غزل کے رموز و
علائم سمجھنے سے قاصر رہتا تھا۔ حکیم آزاد انصاری نہ صرف کہنہ مشق غزل
گو تھے بلکہ سہلِ ممتنع میں کمال رکھتے تھے۔ انہیں حالی سے فیض تلمذ حاصل
تھا اور وہ اس پر اکثر فخر کیا کرتے تھے۔

۱۹۳۹ء میں دہلی سے ہائی اسکول کا امتحان امتیازی کے ساتھ
پاس کرنے کے بعد میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں داخل ہوا، اور ایک
دم مجھے یہ احساس ہوا کہ تہہ خانے سے نکل کر باہر کھلی ہوا میں آ گیا ہوں۔
اب میری دلچسپیاں متنوع بھی ہوئیں، اور اُن کا مرکز و محور بھی بدلا۔ مصوری
کا شوق باقی نہ رہ سکا، اور ریاضی کی تعلیم بھی ادھوری ہی رہ گئی۔ لیکن اُن
کی جگہ منطق اور فلسفہ نے لے لی۔ ادب سے اب ایک گونہ دلچسپی پیدا
ہو گئی، جو برابر بڑھتی رہی۔ میری تنہائیاں البتہ بدستور باقی رہیں۔ یونیورسٹی
میں آنے کے بعد فلسفہ اور ادب میرے باقاعدہ مضامین ہو گئے اور
اب تک ہیں۔ اس منزل پر پہونچ کر میں نے اُردو کے کلاسیکی ادب کا
بالاستیعاب مطالعہ شروع کیا۔ فارسی بھی میں بچپن سے برابر پڑھتا رہا ہوں
سرسید کی شخصیت سے بے انتہا متاثر ہوا۔ میں نے ان کی بیشتر تصانیف
کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور اس دوران میں دن بہ دن اُن کی بصیرت
جذبے اور قوتِ عمل کا قایل ہوتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے راجہ رام موہن
رائے کے خیالات اور کارناموں سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ انگریزی ادب
کی پرکاری نے اب میرے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ بی اے
تک پہونچتے پہونچتے میں نے مختلف اصنافِ ادب میں اچھی اچھی چیزیں
پڑھ ڈالیں اور انہیں اپنے کام و دہن کی تشنگی کو سیراب کرنے کا ذریعہ
بنایا۔ سیاست سے میری دلچسپی زیادہ نہ بڑھ سکی گو نظری طور پر میں
نے ہم عصری سیاست کے دھاروں سے اپنی واقفیت کو تازہ رکھا۔ ایم اے
کے مرحلے پر پہونچ کر میں نے انگریزی ادب کا جم کر مطالعہ کرنا شروع کیا

اور بہت سی دُوسری چیزوں کو بُھلا دیا۔ میں نے اپنے شفیق اور فاضل اُستاد پروفیسر خواجہ منظور حسین صاحب کی رہنمائی سے جو علی گڑھ میں شعبہ انگریزی کے صدر تھے بہت فیض حاصل کیا، خواجہ صاحب، بہت خوب رو، شستہ و شائستہ، نرم دل اور دل کش شخصیت کے مالک تھے خاص دلّی کے رہنے والے تھے۔ انگریزی اور اُردو ادب کا مطالعہ حیرت انگیز طور پر گہرا اور وسیع تھا، اُن کی زُبان کو ثروتِ تسنیم میں دُھلی ہوئی تھی۔ انگریزی گفتگو اور تحریر پر اُنہیں بے حد عبور تھا اور وہ اپنے شاگردوں سے بہت محبت اور تواضع سے پیش آتے تھے۔ مجھے ہمیشہ انہوں نے بہت عزیز رکھا مگر اُن کی غیر معمولی صلاحیتوں اور علمیت پر کسی نفسیاتی اُلجھن کی وجہ سے ایک سایہ سا پڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے اُن کی تخلیقی قوتوں کا کوئی نتیجہ سامنے نہ آسکا۔ البتہ رُوسی اور فرانسیسی کہانیوں کے جو تراجم انہوں نے شروع میں کئے تھے۔ اُردو میں وہ اب تک خاصے کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔

اسی دَوران میں مجھے مشہور مفکر برٹرینڈ رسل کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ تعلیم فلسفے اور سائنسی انداز فکر اور معاشرتی مسائل پر میں نے اُن کی بیشتر کتابیں پڑھ ڈالیں۔ مغربی فلسفے کی تاریخ پر اُن کی کتاب جو غالباً ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے کئی بار پڑھی۔ گو میں رسل کی تشکیک پر پوری طرح ایمان نہ لاسکا اور نہ اخلاق کے معاملے میں ان کی عدم موافقت NON CONFORMISM مجھے اچھی لگی۔ لیکن اُن کے خیالات کی جدت اُن کے جذبے کی تندی اور ہمہ گیری اور سب سے بڑھ کر ان کی حریتِ فکر سے میں بے حد متاثر ہوا۔ اُس زمانے میں اُن کی امن پسندی کے فلسفے کا بڑا چرچا تھا اور آخر وقت تک انہوں نے جس بے جگری اور پامردی کے ساتھ اپنی مقبولیت اور تحفظ کو خطرے میں ڈال کر انسانیت کی بقا کے مسئلے کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ اس کا مجھ پر برابر اثر رہا۔ اسلحہ بندی کے خلاف انہوں نے اپنی مہم کو کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی ختم نہیں کیا۔ رسل کو میں نے ہمیشہ جری، حق گو، اور اپنے عقائد کی توانائی کے جذبے سے سرشار پایا۔ وہ یقیناً اِس دَور کے مفکروں میں ایک دیوزاد شخصیت کے مالک تھے۔ اس کے ساتھ ہی میرا یہ خیال بھی ہے کہ انگریزی زبان میں جو صفائی، تیقن اور لچک، ڈرائیڈن اور سوئفٹ نے پیدا کی تھی، اُسے بالآخر ایلیٹ، برنارڈ شا اور رسل نے انتہا تک پہونچانے کا کارنامہ سرانجام دیا۔ اس اعتبار سے بلاشبہ ان کو جدید انگریزی نثر کے معماروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

۱۹۴۸ء سے اُردو میں میری ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوا یعنی میں نے اُردو میں تنقیدی مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۵۲ء تک میں نے ترقی پسند تحریک کا بھی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ علی گڑھ میں میں ۱۹۵۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا صدر منتخب کیا گیا لیکن رفتہ رفتہ مجھے اس تحریک کے مسلمات کی صداقت میں شبہ پیدا ہونے لگا اور میں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اسی دوران میں شاید ردِ عمل کے طور پر مجھے جمالیات سے خاصا شغف پیدا ہوگیا۔ ۱۹۵۶ء میں بغرض تعلیم دُو سال کے لئے آکسفورڈ چلا گیا۔ وہاں مجھے انگریزی ادب کے مشہور عالم اور نقاد مسٹر بٹیسن کے شاگرد ہونے کی سعادت حاصل ہوئی اور میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ جب کبھی ہمت افزائی کے طور پر میری تعریف کرتے تو میرا دل فخر اور غرور سے بھر جاتا تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ مجھ پر کڑی نظر رکھتے اور میری خامیوں پر مجھے برابر ٹوکتے رہتے تھے۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ آکسفورڈ کے قیام کے دوران میں نے ادب میں جدید ترین تحریکوں کا مطالعہ کیا اور ہم عصر ادبی میلانات سے آگاہی کے ساتھ ہی انگریزی ادب کے بعض مشاہیر سے بھی فیض یاب ہونے کا اتفاق ہوا۔ مسٹر بٹیسن کے علاوہ جنہیں میری ذہنی تربیت میں خاصا دخل ہے مشہور انگریزی ناول نگار ای ایم فاسٹر سے ملاقات اور گفتگوؤں کی یاد ذہن میں اب تک تازہ ہے۔ کچھ عرصے تک میرا ذہن مخالف نظریوں کے بھنور میں گرفتار رہنے کی وجہ سے ایک طرح کے اضطراب، کشمکش اور غیر یقینی کا شکار رہا۔ لیکن ایسا لگتا کہ گویا بادل چھٹتے جارہے ہیں اور میرے نقطۂ نظر میں اعتدال، توازن اور ہم آہنگی پیدا ہونے لگی اور مجھے اس کا یقین ہونے لگا کہ ادب زندگی سے ہر سمت اور ہر سطح پر متاثر ہونے کے باوجود اپنی ایک الگ کائنات رکھتا ہے، جو کسی طرح بھی دُوسرے علوم اور نظام ہائے فکر کے تابع نہیں ہے بلکہ ایک اندرونی نظم اور آزادی کا حامل ہے۔ ادب اور شاعری میں حقیقت پسندی کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن اعلیٰ ترین شاعری کی حدیں، موضوع کے اعتبار سے مابعد الطبیعات سے غیر ممیز ہوتی ہیں۔

میں نے اُردو فارسی اور انگریزی کے علاوہ اور زبانوں کے
کا بھی تراجم کے ذریعے خاصا مطالعہ کیا۔ ابتدائی دَور میں یعنی جب
اے میں پڑھتا تھا میں روسی ناولِ نگار دوستو وسکی کے سحر میں
طرح اسیر رہا لیکن مختلف زبانوں کے ادب میں جہاں تک میری
ئی ہو سکی اُن میں جن دو مصنفین نے مجھے شدید اور گہرے طور پر
لیا، وہ شیکسپیئر اور چیخوف ہیں۔ شیکسپیئر انسانی نفسیات کی آخری
نمایندگی کرتا ہے۔ وہ ایک نادر ترین مظہر فطرت ہے جسے خود فطرت
تک نہیں دُہرایا۔ اُس کے ڈراموں میں جو جہانِ معنی پوشیدہ ہے،
با مشاہدے اور تخیل کا جو حسین امتزاج ہے اور انسانی فطرت
تعداد گوشوں اور امکانات کو اُس نے جس طرح اپنے نفیس، لطیف
ش ادراک کے ذریعے حرف وصوت کی پیچیدہ تنظیم میں ظاہر
ے، اس کی مثال دُنیا سے کسی اور ادب میں تلاش کرنا غالباً فعلِ عبث
چیخوف کے بارے میں اِس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ وہ برسوں
ب سے بڑا رفیق اور مونس رہا ہے اور میں نے اُس کی کہانیوں میں
یرت انگیز ذہنی ترفع، ایک نہ بھلائی جانے والی جذباتی آسودگی
ہے۔ اِن دونوں کے بعد میں نے اقبال، حافظ اور غالب کے سامنے
بین بنیازِ خم کی ہے۔ انگریزی شاعروں میں مجھے سب سے زیادہ
ویں صدی کے صوفی شاعر ولیم بلیک نے اپنی جانب کھینچا۔ میں اس
اعری کی پُرپیچ راہوں میں پچھلی چوتھائی صدی سے بھٹکتا رہا ہوں اور
بھی کبھی اس وسیع، کہر آلود اور مثالی فضائے بسیط میں روشنی کی
لوں کو چند لمحوں کے لئے اپنے کفِ دست میں اسیر کر سکا ہوں۔
ے آگسٹن کے "اعترافات" ( CONFESSIONS ) اِن
ں میں سے ایک ہے، جن کا میری زندگی پر بہت دُور رس اثر پڑا
ہندوستانی مفکروں میں مجھے راد ھا کرشنن سے بہت دلچسپی رہی ہے۔
ں نے ہندو مذہب کی جو فلسفیانہ تعبیر و تفسیر پیش کی ہے اُسے میں
صدی کا بہت بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں انہوں نے بالعموم، مذہب
ر فلسفے کو جس طور پر تطبیق دیا ہے۔ اس سے ہندی فکر
تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ لیکن ہندوستان
ابدی رُوح کا سب سے پاکیزہ، سب سے لطیف اور قابلِ احترام
مجھے مہاتما گوتم بُدھ کی شخصیت میں نظر آتا ہے وہ یقیناً تاریخِ انسانی
کی عظیم ترین شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ اُن کے نام کام اور پیام کا تصوّر
کرکے دل فرطِ عقیدت سے جھک جاتا ہے اور روح میں ایک عجیب
طرح کا اہتزاز، اور سکون پیدا ہوتا ہے۔ میں نے یہ کیفیت برسوں محسوس
کی ہے اور آج تک کرتا ہوں۔ ہندوستان کی زندگی میں میرے لئے سب
سے پُرکشش چیز ہندی ذہن کا تفکر ہے۔ جس نے حقیقتِ مطلقہ کی عجیب
عجیب اور نادر تعبیریں پیش کی ہیں اور انسانی زندگی کی اُن بوجھ پہیلی
کو ہزار دلآویز طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا دل چاہتا
ہے کہ ہندوستان کی واقعی بڑی زبانوں یعنی اُردو کے علاوہ بنگالی،
گجراتی، اور مراٹھی سیکھوں تاکہ اِن زبانوں میں شاعری ناول اور افسانے
کے جو بے بہا خزانے موجود ہیں اُن سے لطف اندوز ہو سکوں۔ معلوم نہیں
یہ تمنا کب پوری ہوگی۔

ہندوستان رنگا رنگ تہذیبوں، زبانوں اور عقیدوں کا ملک ہے
اور یہ بوقلمونی اور دھوپ چھاؤں بہت پرکشش ہے، بشرطیکہ یہاں کی
تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں رواداری کی رُوح پوری طرح حلول کر جائے۔
اسکام میں ہندوستان کے صوفیوں کی زندگی اور تعلیمات، غفلت، ظلم اور
تشدّد کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مشعلِ راہ بن سکتی ہیں۔ میرے دل
میں ہمیشہ سے حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت معین الدین
چشتی اجمیری، حضرت امیر خسرو، کبیر اور گورو نانک کے لئے گہری عقیدت کا
جذبہ موج زن رہا ہے۔ صرف مذہبی نقطۂ نظر ہی سے نہیں، بلکہ خالص قومی
نقطۂ نظر سے بھی میں اُنہیں ہندوستان کی سب سے بڑی نعمت تصوّر کرتا
ہوں۔ اِن سب بزرگوں نے اپنی تعلیمات کے ذریعے نہ صرف صحیح مذہبی
رُوح کو بیدار کیا ہے بلکہ رواداری، انسانی محبت و اخوت اور ہمدردی کے
ایسے چراغ روشن کئے ہیں جن کی ضو افگنی کی بدولت دلوں کے آئینے نفرت
اور بغض و عناد کے غبار سے پاک و صاف ہو گئے۔ اُنہوں نے اپنی پاکیزہ
زندگیوں کے نمونے سے اس احساس کو تازہ کیا کہ تمام انسان بہ حیثیت
انسان ایک ہی برادری کے افراد ہیں اور اُن کے دلوں کو جوڑا جا سکتا ہے
اس کے برعکس جو چیز تفریق پیدا کرتی اور احساسِ یگانگت کو مٹاتی ہے، وہ
چھوٹے اور تنگ مقاصد کی چاکری ہے۔ اُن سے بلند ہو کر اگر ہم دیکھیں اور
سوچ سکیں تو ایک سے زیادہ سطحوں پر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اور ایک
دوسرے کے لئے زندہ بھی رہ سکتے ہیں اور مر بھی سکتے ہیں۔



## مظفر حنفی

تمہارے گھر کا یہ جادہ نظر نہیں آتا
کوئی بھی نقش چمکتا نظر نہیں آتا
نہ جانے رات میں کیا ہو کہ دوپہر ہے ابھی
ابھی سے ہاتھ بھی اپنا نظر نہیں آتا
جھلس رہا ہوں میں تنہائیوں کے خیمے میں
کہ اپنی سوچ کا سایا نظر نہیں آتا
تجھے غرور کہ مجھ سا نہیں زمانے میں
مجھے یہ فخر کہ تجھ سا نظر نہیں آتا
اس آگہی نے عقیدے بھی چور کر ڈالے
کسی بھی نقطے میں دریا نظر نہیں آتا
وہ دل نہیں جو دھڑکتا ہوا دکھائی دے
لہو نہیں جو اچھلتا نظر نہیں آتا
خوشا میں ڈوب رہا ہوں بڑے سکون کیساتھ
کہ دور دور کنارا نظر نہیں آتا
یہ عہد اتنا ہی پیچیدہ ہے کہ دروازہ
طلسم ہوشربا کا نظر نہیں آتا
وجود ذات کا عرفان ہو گیا جب سے
درخت پر کوئی پتہ نظر نہیں آتا

## نثار احمد فاروقی

زندگی میرے لئے وجہ مسرت کب تھی
اتنی بے زار مگر اس سے طبیعت کب تھی؟
اب تو ہر شے عدم محض نظر آتی ہے
بے قراری تھی مگر دل کی یہ حالت کب تھی
زخم رہ جائیں گے اور وقت گزر جائے گا
جب وہ ملتا تھا تو اس فکر کی فرصت کب تھی
وائے آشفتہ دلی یہ بھی نہیں آتا یاد
میری جانب نگراں چشم عنایت کب تھی
اب تو ہر یاد تری یاد ہے، ہر غم ترا غم
اتنی شائستہ بھلا میری طبیعت کب تھی
اب جو کچھ فاصلے حائل ہیں تو ان کا غم کیا
ہم جسے قرب سمجھتے تھے وہ قربت کب تھی
زندگی بھر کے لئے شہر ترا چھوٹ گیا
قیس آوارہ کی قسمت میں یہ غربت کب تھی
روٹھتے تھے کبھی ہم اور مناتے تھے کبھی
وہ بھی اک کھیل سا ہوتا تھا شکایت کب تھی
میں اُسے کھو کے بھی زندہ ہوں تو اکثر دل میں
سوچتا ہوں کہ مجھے اس سے محبت کب تھی
دل کی ویرانی تو اب سیر کے قابل ہے نثار
منہدم ہونے سے پہلے یہ عمارت کب تھی؟

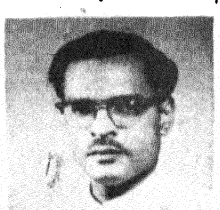



## کنول پرشاد کنول

ہر گھڑی چونک کے یوں آنکھ نہ کھولو، سولو
خواب سے جاگ کے، پہلو نہ ٹٹولو، سولو
رنگ خوابوں کے، بہت چبھنے لگے ہیں اتو
سونا چاہو تو اٹھو، آنکھوں کو دھولو، سولو
ویسے اک جان کو کیا کم ہیں یہ جی کے دکھڑے
کوئی آزار نیا، اور نہ مولو، سولو
دشت دل میں ہے سر شام سے ہو کا عالم
ایسے سناٹے میں خود سے بھی نہ بولو، سولو
صحن گلشن میں برسنے لگے پتھر سر پہ
اب یہ نشتر بھی رگ جاں میں چبھولو، سولو
زیست ویسے ہی جہنم ہے، انہیں کر کے یاد
زہر کے جام میں بس اور نہ گھولو سولو
جانے پھینک آئیں کہاں سوچ کی ظالم لہریں
ایسے طوفان میں لہروں پہ نہ ڈولو، سولو
آب موتی سی ہے اشکوں کی رکھو اس کا خیال
درد کی آن کو پلکوں پہ نہ تولو، سولو
آرزوؤں کی بڑی بھیڑ ہے آنگن میں کنول
اسطرح ساتھ نہ ہر ایک کے ہولو، سولو

سنہ ابوالحسن

# خلش



"میں نے تمہارے لئے شہریار کو پسند کر لیا ہے عذرا۔"

بڑی بہن نے اپنی چھوٹی بہن سے کہا اور چھوٹی بہن نظریں جھکائے رہی۔

"مجھے یقین ہے وہ تمہیں بھی پسند آئے گا۔" بڑی بہن نے پھر کہا مگر خاموش ہی رہی، پھر رکے رکے کافی تھم کر اور جھجک کر بولی۔

"کیا وہ ایک عجیب اور سمجھ میں نہ آنے والا انسان نہیں ہے باجی؟"

"پھر بھی نیکی اور خلوص پر اعتماد زندگی کو سہل بنا دیتا ہے میری بے حد آسان اور یہ بات خود با اعتماد اور دوسروں پر بھروسہ کرنے والے ہی جان سکتے ہیں۔"

"تو گویا وہ فرشتہ ٹھہرا ــــ؟"

"ہاں۔ اگر زمین پر فرشتے ہوتے ہوں تو کیوں کہ اچھے کو اچھا نہ ماننا برا نہیں ہوتا عذرا جتنا اچھے کو خواہ مخواہ برا مان لینا۔"

"مگر وہ ہم سب کے لئے کتنا اجنبی ہے باجی ــ"

"اچھے انسان کسی کے لئے اجنبی نہیں ہوتے پگلی! کیوں کہ ہر روپ صلیت میں جو فرق ہوتا ہے وہی مخلص اور بناوٹی انسان میں بھی۔"

پھر عذرا نے کچھ نہیں کہا اور لپک کر دوسرے کمرے میں چلی گئی بن نے اس کے غائب ہوتے ہوئے ہیولے کو ایک جج ایک متحن رسے دیکھا۔ وہ کچھ دیر کے لئے بے حد گم سم، حیران اور سراسیمہ پھر ایک خیال رہ رہ کے اُن کے دل میں جاگنے لگا۔

کہیں اس لڑکی کو کوئی اور لڑکا تو پسند نہیں ؟ اور اس خیال کی پھانس خود اُن کے اپنے احساس میں گڑ کر رہ گئی۔

"بے وقوف، بے وقوف!!" وہ کچھ بے قرار سی ہو گئیں اور انہوں نے مدھم لہجے میں عزیز موجود عذرا کو مخاطب کر کے کہا۔

"اپنے دل میں غم کو نہ پالنا پگلی۔ کیونکہ غم انسان کو چڑچڑا، بدمزاج، مریض اور بے بس کر دیتا ہے۔ غم سلامت روی، دانش مندی اور صحت کا دشمن ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ زخم اتفاقاً ہی لگتے ہیں مگر جو دانستہ لگائے جائیں پھر اُن کی دیکھ بھال اور فکر کتنی اہم اور ضروری ــــــــــ مگر وہ لڑکا کون ہے؟ میں نے تو اُسے نہیں دیکھا پھر میں کس طرح یہ سمجھ لوں، یہ طے کر لوں کہ وہ تیرے لائق ہے یا نہیں ــ"

وہ اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگیں مگر اُن کے ذہن پر صرف اسی نئے خیال کا قبضہ تھا۔ اپنی بہن کے مستقبل کا اندیشہ۔

سچ ہے۔ انہوں نے سوچا کہ اردگرد دور دور تک نئے زمانے نے پرانے خیالات کو بچپن کے بیکار کھلونوں کی طرح اٹک پٹک کے توڑ دیا ہے، مگر ہمارے گھر میں تو یہ کھلونے ابھی بالکل چکنا چور نہیں ہوئے ہیں۔ ہم ابھی تک قدردانی کے تحت ان ٹوٹے ہوئے کھلونوں کو حتی الامکان جوڑ جوڑ کر جتن سے رکھ رہے ہیں اور دوسروں کو بھی یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ چیز جتنی پرانی ہو جائے اتنی ہی قابلِ قدر اور قابلِ اعتماد ہو جاتی ہے۔ اتنی ہی عزیز اور رفیق جتنی خود اپنی عمر اور اپنا تجربہ جبکہ بے دھڑک ہر چیز توڑ پھوڑ دینے، بلا سوچے سمجھے پھینک پھینک کر ہر دم نئی چیزیں سمیٹنے والوں کے پاس تو سوائے کوڑے کرکٹ کے کچھ اور نہیں ہوتا۔ ہر آن بدلتے

رہنے والوں کے پاس دیکھ بھال کر احتیاط سے منتخب کی ہوئی ایک بھی کام کی چیز نہیں۔ پھر تو اُن لوگوں میں کس طرح جاہلی پگلی جو برسہا برس کی سینے سے لگا کر رکھی ہوئی قیمتی روایات کو منٹوں میں بالکل غلط اور قابلِ فراموش سمجھنے لگتے ہیں۔

نظریاتی تضاد اور حقیقی تصادم کے درمیان اُن کا دم گھٹنے لگا۔ بے حد جذباتی اضمحلال کے ساتھ انھوں نے اپنی دانست میں پھر عذرا کو تاکید کی۔

"جب زندگی گزرنے پر مائل ہوتی ہے تو خوابوں کو خاطر میں نہیں لاتی دیوانی، اُونچے سے اُونچے محل روند کر بڑے آرام اور اطمینان سے گزر جاتی ہے اور جی جان سے خواب دیکھنے والے بھی زندگی کو اندھا دھند گزر جانے کی اجازت دیئے بغیر نہیں رہ سکتے، زندگی کو نہیں روک سکتے۔ اپنی اُمیدوں، آرزوؤں، اپنے نئے خیالات کو بے قیمت پلندے کی طرح کسی اندھیرے کونے میں ڈال دے اور بھول جا۔ بالکل بھول جا میری بہن کہ یہ تیرا طریقہ، تیری زندگی نہیں۔ اپنوں کے سایۂ آرام میں اطمینان اور بے فکری سے سو جا کیوں کہ اطمینان ہی تیری زندگی ہے، بے فکری ہی تیری آرام دہ نیند۔

فکر کو، تھکن کو۔ خدشات کو اپنا ساتھی نہ بنا کیونکہ ان تمام بکھیڑوں کو نپٹانے کے لئے میں جو موجود ہوں۔"

اُنھوں نے تصور میں جیسے عذرا کے سر پر اپنا شفیق ہاتھ رکھ دیا اُس کے تمتماتے ہوئے رخساروں اور متفکر آنکھوں پر نرمی سے اپنا محبت بھرا لمس پھیلانے لگیں اور سوچ سوچ کر انھوں نے پھر کہا۔

"سکون کو اپنے دل میں ڈھونڈ دیوانی، سکون ایک خزانہ ہے اور جب تک اس خزانے کی خود اپنے آپ میں حفاظت نہ کی جائے یہ کسی دوسری ذات کے توسط سے تجھے کبھی نہیں مل سکتا۔"

پھر بڑی خاموشی، بڑی بُردباری، نہایت ظاہری سکون اور تمکنت کے ساتھ وہ عذرا کے کمرے کی طرف چلیں۔ چق سے جھانک کر اُنھوں نے دیکھا۔ عذرا پلنگ پر اُوندھی پڑی ہوئی ہے۔ اور آنسوؤں کے واضح نشان اُس کے رخساروں پر اعلانیہ دکھائی دے رہے تھے بے ساختہ اُن کا جی چاہا۔ آگے بڑھ کر خود اپنے ہاتھوں سے پونچھ دیں مگر پھر وہ ٹھٹک کر رہ گئیں۔ اُنہیں یہ نشان نہیں پونچھنے چاہئیں کیونکہ ہر انسان کی انا ایک متاع ہوتی ہے اور اس کا پامال کیا جانا، اسے ٹھیس پہونچانا کتنا مشکل، ناممکن اور ناگوار۔

انہوں نے کمرے کا دبیز پردہ ٹھیک طرح دروازے پر پھیلا دیا اور اُلٹے قدموں لوٹ گئیں۔

باہر کتنی تیز ہوا ہے۔ کتنی تُند اور چبھنے والی روشنی مگر پگلی عذرا کو توانِ سے محفوظ رہنے اور پردہ ٹھیک طرح سے ڈھکنے کھینچنے کا خیال نہ آیا لیکن عذرا کو اپنی بڑی بہن کی اس توجہ اور پوشیدہ تلخی کا مطلق کوئی احساس نہیں تھا۔

ہائے۔ اُس نے سوچا۔ لطیف آرزوئیں کتنا کم دلیں پیدا ہوتی ہیں مگر جب تمام مٹنے لگتی ہیں تو کیسے کریہہ اور غلط نقوش چھوڑتی ہیں۔ کیوں کہ کوئی آواز اُسے رہ رہ کے خبردار کرنے لگی تھی۔ اُس سے کہتے اُسے جتانے کہ رونا کڑھنا عورت کا شیوہ سہی، اُس کی قناعت کا سرمایہ سہی، عورت کا محبوب راز سہی مگر پھر بھی آخر آنسو کی حقیقت کتنی۔ ؟

جو انسان ایک بار شدید محبت کر چکے پھر اُس کے پاس دوسرے جذبے کتنا مانند پڑ جاتے ہیں اور ناگاہ اگر شدید محبت کھو بھی جائے تو پھر ایسا انسان ایک ایسا چھالہ اور آبلہ ہو جاتا ہے جو کسی علاج اور سکے سے ٹھیک نہیں ہوتا بلکہ پھر وہ اس چھالے کی تکلیف اور جلن کو ہی اپنی ساری ہستی بنا لیتا ہے اور جب انسان سراسر درد ہو جاتا ہے تو خود بخود ان صوفی کے قریب جا پہونچتا ہے۔ ویسا ہی بن جاتا ہے جس کا دُنیا داری سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں رہتا، جو سوائے خدا کے کوئی اور تصور اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔

بھلے ہی لوگ کسی تصور اور مشغلے کے بغیر اپنا وقت گزار لیں اپنی زندگی تج دیں، بھول جائیں، قفع کو خواب اور پُر امید خواہشوں اور کاوشوں کو بچکانہ اُچھل کود سمجھ لیں، اپنی بے خواب آنکھوں کو نیند اور خوابوں سے بے نیاز رکھ لیں مگر کیا ایسے انسان بھی خود اپنے وجود کو محفوظ رکھنے کے باوجود دوسروں کو تگ و دو کرتے ہوئے زندگی کو جیتے ہوئے دیکھنے کی مسرت سے گریز کر سکتے ہیں ؟

لاعلمی سکون سہی مگر واقفیت خود ایک جدوجہد، ایک علم ہے پگلی۔

کتنے نادان ہیں وہ لوگ جو نقاب اوڑھ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ دنیا میں آتے ہیں مگر دُنیا کو کبھی نہیں دیکھتے، کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ زندگی کو ایک فطری عمل نہیں ایک دُنیاوی قانون سمجھتے ہیں، جو اپنی اچھی بھلی سچی خواہشات کو قتل کر کے خوش ہوتے اور اس قید اور جبر کو غیر فطری سکون کے حوالے کر کے اس سکوت کو گھٹن کے بجائے شرافت اور انسانی برتری سے منسوب کرتے ہیں۔

آنسو ہر مسئلے کا حل یا مداوا نہیں ہیں۔ آنسوؤں سے گریز کر۔ اور آرزوؤں کے چہرے پر سے ہر ہر نقاب نوچ کر پھینک ڈال کیوں کہ بے ضرورت ہر چیز اُس غنودگی کی طرح ہوتی ہے جو غیر صحت مندی کی علامت ہوتی ہے۔

آخر روشن آنکھوں پر نقاب کس لئے؟ زندگی کا عنوان قید و بند کس لئے؟؟

سوچ کہ قوتِ عمل کے بغیر ذہانت، طاقت اور اچھائی بھی بے کار اور بے سود ہو جاتی ہے۔ کتنی کند اور بھول، توڑ دے اپنے قیدی وجود کے پاؤں کی ہر زنجیر توڑ ڈال۔ ہر مزاحم ہونے والی چیز کو پاش پاش کر دے۔ کیونکہ ارادے کے بغیر عزم اور استقلال بھی سکون اور آرام نہیں بن سکتے۔

دُنیا میں رہ کر بھی دُنیا سے دُور کسی گمنام ٹاپو میں زندگی بسر کرنا کتنا عجیب اور ناقابلِ قبول ہے کیونکہ کھانا بن ڈھانکنا اور صرف سانس لینا ہی زندگی نہیں۔ شوخی، شرارت اور جوان جذبوں کو محسوس کرنا، نہیں چھو لینا، پکڑ لینا ہی دراصل زندگی ہے۔ حصولِ علم اور عمل کی ترغیب ہی دراصل رشتۂ حیات، کوئی نہ کوئی مقصدِ حیات اور دُنیا میں قربت ہی اصل میں زندگی کا راز ہے۔

اپنے آنسو پونچھ لے کہ زندگی ایک بے پایاں عمل ہے۔ زندگی قید خانہ نہیں۔ محض تختۂ دار و رسن نہیں۔ لپک اور اس حصار کو ڈھا دے جس نے مدت سے تیرا احاطہ کیا ہوا ہے۔ تجھے قید کر رکھا ہے۔

اور ایک مسکراہٹ، ایک موہوم سی مسکراہٹ تیرگی میں اکیلی کرن کی طرح خوف زدہ اور بوکھلائی عذرا کے لبوں پر چمک کر رہ گئی۔

ہائے میرا بے کار وجود ــ! وہ رہ رہ کے بے کلی سے تڑپنے لگی، ٹھیک ہے کہ وہ آزادی، من مانی اور خود مختاری سے واقف نہیں، وقت کی ذہنی، تمدنی اور آئینی تبدیلیوں سے بے بہرہ رکھی گئی، وہ ارد گرد کی ساری تہذیب سے دُور اب تک وہیں ٹھہرائی گئی ہے جہاں نئے علوم اور جدید سائنسی انکشافات سے قبل کا لاعلم اور متحمل ذہن ٹھہرا ہوا ہے۔ غیر واقف اور غیر آگاہ مگر آرزو کی قربت ان سب سے کس قدر جولاں اور تند، کتنی جوشیلی اور طرب ناک ــ

عذرا نے جھنجھلا کر مدتوں سے اپنی خواہشات کے رُخ پر پڑی ہوئی اندھیری اور غیر ضروری نقاب کھسوٹ ڈالی اور تب اُسے ہر چیز دفعتہً بڑی روشن، چکا چوند اور اُجالوں سے پُر نظر آنے لگی۔ بے حد نئی اور جاگتی جگمگاتی ہوئی۔

"شاباش۔ شاباش ــ!!" آواز نے اُسے پھر اُکسایا ــ

"اب غیر معروف گمنام ٹاپو سے نکل کر دُنیا کو دیکھ۔ روشنیوں کی زد میں چمک جانے کی جدوجہد میں مصروف ہر ہر چیز کو پرکھ، اُجالوں کے لئے بے تاب اندھیری خندقوں کی کشمکش محسوس کر۔ کیونکہ دیکھنا اور محسوس کرنا ہی زندگی کی اہم ضرورتیں ہیں۔ اندھا دُھند آگے بڑھنا ایک صریح غلطی مگر صحیح کا تعین اور حالتِ سفر ایک دلچسپ تجربہ، جنونِ منزل ہی زندگی کا اصلی سفر، دوراستوں، سہ راستوں اور چوراستوں پر ٹریفک کی زیادتی انسان کو کتنا ہی گھبرا اور بھٹکا کیوں نہ دے مگر آرزو کی لگن کم نہ ہو تو صحیح منزل کا قدموں تلے آجانا کتنا ناگزیر ہے۔"

اس مسلسل گونج کے بعد بستر سے کود کر عذرا بڑے اضطرار سے خود اپنے مقابل کھڑی ہو گئی، اُس کی سرد، بے رُوح، بے عمل کو روندتا ہوا ایک نیا پُرجوش لمحہ اچانک اُس کے گلے میں اپنی جوشیلی بانہیں ڈالنے لگا، انجانی کیفیت کی ایک تیز چیخ اُس کے خشک حلق کو ترکرتی ہوئی اُس کے سوکھے ہونٹوں تک آئی اور بے اختیار ایک نام بن گئی۔

"اقبال، اقبال ــ آؤ اور میرا ہاتھ تھام لو۔ مجھے میری تاریک دُنیا سے نکال کر اپنی چکا چوند دُنیا میں دُور تک اپنے ساتھ لے چلو، تمہارے ہاتھ کا لمس میری ہمت بن جائے گا۔ پھر میں ہر زنجیر کی جھنکار بھول جاؤں گی، اپنے سنسان قیدی وجود کو کچل دوں گی۔ تم ایک شناسا، مہنی

آرزو مند لڑکی کی بے پناہ آنکھوں میں جھانک کر تو دیکھو۔ پھولوں کی پنکھڑی پر صبح دم اوس سے لکھی ہوئی نم، خوبصورت تحریر پڑھ تو لو۔ پھر تمہیں زندگی میں گلزار ہی گلزار ملیں گے۔ لالہ زار ہی لالہ زار، آبِ حیات ملے گا۔ حلاوت، سکھ، چین اور دُنیا کی تمام تر نعمتیں۔"

کاش باجی بھی میری اُمید کے قریب پہونچ جاتیں۔ مگر۔

میں نے تو ہمیشہ اندھیرے میں چھپ کر تمہیں دیکھا ہے اقبال کیوں کہ مجھے روشنی سے ڈر لگتا ہے نا، لیکن تمہاری خاطر اگر میں روشنی میں آجاؤں، باجی کو سب کچھ بتا دوں، اندھیرا ہمارے درمیان سے ہمیشہ کے لئے ہٹ جائے تو ۔۔۔ ؟

وہ گھبرا گھبرا کر اپنی محبوس خواہش سے بار بار التجا کرنے لگی۔

"خدا کے لئے، میری آنکھوں میں دیکھو۔ میرے دل کو ٹٹولو۔ میری حیات کو سنسان ویرانیوں کے حوالے نہ کر ڈالو۔ گرمی کی تپتی ہوئی اُجاڑ دوپہر نہ بنا دو۔ ہلچل سے خالی، خاموش اور گم سم جس میں لُو اور کڑی مدت کے ڈر سے، تپش کی وجہ سے کوئی متنفس باہر نہیں نکلتا۔ راہیں خالی اور شاہراہیں سناٹوں سے معمور ہوتی ہیں، سارا شہر، ساری رونق پھیکی اور ماند۔ کھوئی کھوئی سی۔

کہہ دو کہ تم میری نرم اور ملائم زندگی کو کرخت اور بے مہر نہیں بننے دو گے۔ تم میری پکار سنو گے، وعدہ کرو، زندگی بھر کی رفاقت کا حسین وعدہ۔"

اور ہمت اور اُمید کے باوجود وسوسوں اور اندیشوں کے درمیان تھوڑی دیر کے لئے عذرا کا وہی حال ہوا جو طویل سفر میں مختصر زادِ راہ کا ہوتا ہے۔ وہ اپنی آرزو کے مقابل کبھی تو خود کو بے حد جری محسوس کرتی اور کبھی بے حد خوفزدہ اور کم ہمت، کبھی اپنی آرزو سے خوش ہوتی، کبھی اپنی ناکامی کے خیال سے پژمردہ و مایوس۔

"میں تمہیں جانتی ہوں اقبال مگر تم مجھے پہچانتے ہو یا نہیں ؟"

اور اُس کی متضاد کشمکش کو محسوس کر کے آواز نے پھر اُسے ہمت دلائی ۔۔۔

"بُزدلی کے ہر ہر خول کے پرخچے اُڑا دے اور ٹوٹے ہوئے خول کے ٹکڑے اتنی دُور پھینک ڈال جو تجھے پھر کبھی نظر نہ آسکیں صرف گھونگے کا حصہ بن جائیں۔ تیرے استقلال، تیرے خیال کو ڈانوا ڈول نہ کر سکیں۔ یہ دل نہیں جو ٹوٹ کر زیادہ قیمتی ہو جائے گا پگلی۔ اپنی آرزو کو پہچان، اس سے کنارہ نہ کر۔"

اور عذرا نے اعتراف کیا کہ دل واقعی بہت اہم، بے حد کارآمد چیز ہے اور اقرار کیا کہ دل ایک نشہ ہے، ایک اُمنگ اور ترنگ جبکہ خول ایک سخت واہیات اصلیت کو چھپانے والی بے کار سی چیز، اور بُزدلی ناقابلِ اعتبار برف کی سِل۔ دل کو ٹوٹنا نہیں چاہئے۔ دل کو پامال نہیں ہونا چاہئے۔ تب اُس کا جی چاہا۔ بن میں کوکتی کوئل کی طرح کسی گھنے سایہ دار درخت پر بیٹھ کر لازوال حیات کا کوئی ابدی نغمہ چھیڑ دے سارے دُنیا کو اِس نغمے سے سرشار کر دے۔ ساری دُنیا کو چاند، ستارے، پھول اور آرزو بنا دے۔

تب وہ لپک کر غسل خانے میں بھاگی اور اپنی سُرخ آنکھوں اور تمتماتے ہوئے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مار مار کر وہ سارے نشان مٹانے لگی جو اُس کی مایوسی اور آزردگی کے نشان تھے۔ پھر آئینے کے آگے ٹھہر کر بڑی دلچسپی سے اپنے بال سنوارے، ٹرنک سے نکال کر ہلکے پھلکے رنگوں کے قوس قزح جیسے دل آویز کپڑے پہنے اور اتنا کر کے وہ اُس گھڑی کا انتظار کرنے لگی، جب شام کے آخری حصے میں ہمیشہ کی طرح اقبال اس کی بڑی بہن سے ملنے آئے۔ اقبال جو اُس کی بڑی بہن کا دیور تھا اور ابھی طالب علم، تو وہ اپنی خواہش کا عکس اقبال کو دکھا ہی دے ۔۔۔

زینے کے اندھیرے حصے پر کھڑی وہ دیر تک قدموں کی چاپ سنتی رہی، اپنے وحشی دل کو برابر سمجھاتی مناتی رہی۔ ہوشیار، خبردار۔ کہیں ڈول اور ڈگمگا نہ جانا۔ اپنی تمنا کا آئینہ اقبال کے ہاتھوں میں تھما ہی دینا، اُسے اپنا ارمان دکھا ہی دینا، آرزو کو حسرت نہ بننے دینا کیونکہ تو نے آنکھیں پالی ہیں۔ اے دل، تو فہم کا زینہ چڑھنے لگا ہے۔ میرے دل۔ میرے دل ۔۔۔ !!

مگر جب اقبال آیا تو سب کچھ بھول بھال کر عذرا گیٹ اندر بھاگی اور اپنے ہیبت زدہ دل کو تھام تھام کر خوفزدہ ہونے لگی۔ !!

"اگر اقبال مجھے دیکھ لیتے تو ۔۔۔ ؟"

اگر خود باجی مجھے اس طرح دیکھ لیتیں تو ۔۔۔ ؟

میں کیا کہتی — کیا —؟ میری زبان کو تو کچھ کہنے کی عادت
ہیں —!

میں سیڑھی لگا کر دیوار پر تو چڑھ سکتی ہوں شاید اور دوسری
کا تماشہ نگاہِ شوق سے دیکھ بھی سکتی ہوں مگر تماشہ بن آجانے
باوجود دوسری طرف کود جانے کی ہمت آخر مجھ میں کیوں نہیں —؟

اور خوبصورت خیالات کے سارے مہکتے ہوئے پھول دفعتہً
کے ذہن کے دامن سے اُچک اُچک کر اُونچی اُونچی ڈالوں پر
چھٹے۔

"کم ہمت، کم ہمت —!!" وہ چیخنے لگے، "تو نے اپنا آپ
دایا ہی ہمارا بھی ناحق ستیاناس کیا۔ اب تو کبھی ہمیں نہیں پا سکے
ہی ہماری طرف ہاتھ نہیں بڑھا سکے گی کیونکہ ہم تیری لپک، تیری
یخ سے بہت پرے۔ دُور جا چکے ہیں اور ہم اُن کے ہاتھ نہیں لگتے
ہیں تھامنا پکڑنا نہیں جانتے۔"

پھر دو گھنٹے کے بعد جب اقبال واپس چلا گیا تو عذرا نے
ت کو فت، جھنجھلاہٹ اور پژمردگی محسوس کی۔

"یہ میں نے کیا کر دیا — کیا —؟"

وہ دیر تک سر تھامے بیٹھی رہ گئی — اور اُمیدوں کے تمام
لک محل اُس کا منہ چڑانے، اُس پر ہنسنے مُسکرانے لگے،

حیات کے نظر نواز فانوس میں خود کو سجا کر تم ایک چراغ
رح ضرور سُلگ سکتی ہو مگر تم آفتاب کی طرح ساری دُنیا کو منور نہیں
یں۔ تم ایک حقیر ذرّہ، سورج کس طرح بن سکتی ہو بھلا۔

اور برہم آواز نے اُس سے کہا —

"ڈرپوک، تو کچھ نہیں کر سکتی — تازہ کھلی ہوا کی افادیت کبھی
جان سکتی۔ تو بالآخر ایک قیدی ٹھہری۔ اطراف گھری ہوئی مضبوط
دیواروں کے حصار میں محفوظ اور مقید رہنے کی عادی۔

تو ایک لکڑی کا ٹکڑا ہے، جسے دوسرے ضرور استعمال
ہیں مگر وقتِ ضرورت خود اپنے آپ کو استعمال کرنا، اپنے لئے
ال سے واقف ہونا شاید تیرا مقدر نہیں۔

اب ہر صبح اُمیدوں کے محل بنا، ہر دوپہر اُس کو روشنی

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر)



# غزل

کامل فتح پوری

اللہ اللہ اُس کے چہرے کی پھبن
پانی پانی ہو گیا حُسنِ چمن
آئینہ بن کر کسی کے حُسن کا
پھر رہا ہوں انجمن در انجمن
اک صدائے حق کا ہنگامہ نہ پوچھ
ہر طرف دار و رسن دار و رسن
تذکرہ میری وفا کا کم کرو
آ نہ جائے اُس کے ماتھے پر شکن
ہنس رہا ہوں آپ اپنے حال پر
کوئی دیکھے تو مرا دیوانہ پن
میں تو دیوانہ ہوں میرے واسطے
ایک سے دونوں ہیں بستی ہو کہ بن
چاک دامانی سے اپنی بے خبر
گریۂ شبنم پہ گُل ہیں خندہ زن
پھر کرم آمادہ ہے اُس کی نگاہ
یہ حقیقت ہے کہ میرا حسنِ ظن
ان پہ شاید تیرا پرتو پڑ گیا
ورنہ پھولوں میں کہاں تھا بانکپن
پھر ضرورت ہے کسی منصور کی
اُٹھ رہی ہے شورشِ دار و رسن
غم کدے میں اپنے کامل آج تک
بھول کر آئی نہ سورج کی کرن

## سعادت یار خاں رنگین کے والد کی خود نوشت

# سوانح عمری



محمد حسن

انشاء اور رنگین ہمارے ادب کی سب سے زیادہ رنگین شخصیتیں ہیں۔ انشاء نے رنگین کو رنگینی کا موجد قرار دیا ہے۔ خود مجلس رنگین، سعادت یار خاں رنگین کی شخصیت اور اُن کے دَور کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ابھی حال میں سعادت یار خاں رنگین کے والد محکم الدولہ اعتقاد جنگ طہماس بیگ خان بہادر کی خود نوشت سوانح عمری طہماس نامے کے عنوان سے شائع ہوئی ہے تاریخ اور تاریخ ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے انتہائی مفید اور ایک اہم دَور کی نہایت دلچسپ اور اہم دستاویز ہے۔

طہماس خاں ۱۷۳۸ء کے قریب ترکی کے کسی دیہات میں پیدا ہوئے تھے۔ پانچ برس کی عمر تھی کہ نادر شاہ کے سپاہیوں نے اغوا کر لیا۔ اور غلام بنا لیا پانچ برس کی عمر ہی کیا۔ نہ بچے کو اپنا نام یاد ہے نہ اپنے ابا و اجداد، وطن اور گھر سے پوری واقفیت۔ بچپن کی چند دھندلی سی یادیں اور اپنے قبیلے اور وطن کے بارے میں سرسری قیاسات کے سوا طہماس خاں کے پاس ماضی کی کوئی یادگار نہ تھی۔ اس لئے طہماس نامے کی تلخیص[1] کے مترجم اور مرتب پی سیتو مادھو راؤ نے کتاب کا ضمنی عنوان ایک غلام کی خود نوشت سوانح عمری" بھی تجویز کیا ہے۔

۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے انتقال کے بعد اس کے کچھ ترک سردار ہندوستان آ بسے اور انہیں کے ساتھ طہماس خاں بھی ہندوستان آیا اُس وقت اُس کا نام ذاکر تھا جو اُس کے اغوا کرنے والوں نے اُسے دیا تھا اس کا ماں باپ کا رکھا ہوا نام اُسے یاد نہیں تھا۔ ترک سردار پہلے ملتان اور پھر لاہور آئے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب پنجاب معین الملک کے زیر نگیں تھا۔ معین الملک کی خدمت میں باریابی حاصل کرنے کے لئے ازبک سرداروں نے تین غلام لڑکوں کو نذر کے طور پر پیش کیا ان میں ذاکر بھی تھا جسے معین الملک نے بعد میں تیمور کا نام دیا ۱۷۵۷ء میں جب احمد شاہ ابدالی کا بیٹا تیمور شاہ پنجاب کا صوبہ دار ہوا تو ذاکر

---

[1] طہماس نامے کی تلخیص کا انگریزی ترجمہ پی سیتو مادھو راؤ نے طہماس ایک غلام کی خود نوشت سوانح عمری کے عنوان سے پاپولر پرکاشن بمبئی سے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا ہے۔ صفحات کی تعداد ۱۵۳ ہے۔ اس مقالے میں انگریزی تلخیص سے استفادہ کیا گیا ہے اور اُن کے ناموں کا املا اسی کے مطابق ہے۔

نام تیمور کے بجائے طہماس رکھ دیا گیا۔ طہماس جگہ جگہ خود نوشت میں اپنے لئے مسکین کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے۔ ممکن ہے یہ محض انکساری درکسرِ نفسی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ طہماس نے یہ تخلص اختیار کر لیا ہو۔

طہماس خاں کی خود نوشت دلچسپ واقعات سے بھری ہوئی ہے دلچسپ بھی اور دل آویز بھی۔ ان میں سرفہرست تو اُس کے اغوا کا واقعہ ہے جسے طہماس نے خاصی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"نادر شاہ اور سلطان ترکی کی جنگ کے دوران میں نادر شاہ کی فوجیں میرے گاؤں سے گزریں، اُنہوں نے لوٹنا، مارنا اور ہر قسم کی ظلم زیادتی کرنا شروع کیا۔ اس وقت میری ماں اور بڑے بھائی مجھے لے کر گھر سے باہر نکل آئے۔ پورے گاؤں میں زبردست ظلم وستم توڑے گئے۔ عین اس وقت ایک سوار ہمارے مقابل ہوا۔ اُس نے مجھے میرے بھائی کی گود سے چھین لیا۔ میری ماں اور بھائی دونوں روتے پیٹتے میرے پیچھے دوڑے۔ اُس وقت ایک دوسرے سوار نے میرے بھائی کو تلوار ماری۔ اُس پر میری ماں میرے بھائی کی دیکھ بھال کرنے کے لئے مڑی۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر سوار نے مجھے گھوڑے پر بٹھایا اور بھاگ گیا۔ اس کے بعد مجھے اپنی ماں اور بھائی کا کوئی علم نہیں۔"

طہماس کو بخارا کے ایک سردار سام نے اپنے بیٹے کی طرح پالا۔ نادر شاہ کے بعد سام فرمانروائے تبریز کی ملازمت میں آگیا۔ نادر شاہ کے مختلف سرداروں میں خانہ جنگی میں طہماس کا آقا مارا گیا اور طہماس امیر ارسلان سے وابستہ ہو گیا۔ اپنے نئے آقاؤں کی قید سے فرار ہو کر مختلف سرداروں کے درمیان غلام کی حیثیت سے منتقل کیا جاتا رہا اور آخر میں دو ازبک سردار شہاب الدین بیگ اور محمد نذیر بیگ طہماس اور چند اور غلام لڑکوں کو ساتھ لے کر پہلے ملتان اور پھر لاہور آئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔

۱۱ مارچ ۱۷۴۸ء کو محمد شاہ کے صاحبزادے احمد شاہ اور وزیر قمرالدین خاں کی سرکردگی میں شاہی فوج کو شکست ہوئی اور قمرالدین خاں مارے گئے۔ اور اُن کے لڑکے معین الملک کو پنجاب کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ ۱۵ اپریل ۱۷۴۸ء کو محمد شاہ کا انتقال ہوا اور معین الملک نے صوبہ دار کی حیثیت سے پنجاب کا نظم ونسق سنبھالا۔

معین الملک کی خدمت میں طہماس کے پیش ہونے کا قصہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ معین الملک نے طہماس کی تربیت اور تعلیم کی طرف خاص توجہ کی۔ "ہندوستانی کے بجائے اُنہیں ترکی زبان پڑھائی جاتی تھی۔ جب معین الملک کی والدہ شولاپوری بیگم لاہور آئیں تو معین الملک نے اُن ازبک غلام بچوں کو اپنے لڑکے کہہ کر متعارف کرایا۔ احمد شاہ ابدالی اور معین الملک کی لڑائی (۱۷۵۱ء) کے بارے میں مصنف لکھتا ہے۔ کہ لڑائی کو چار ماہ ہو چکے تھے کہ احمد شاہ ابدالی کا قاصد یہ پیغام لایا کہ کثیر تعداد میں دونوں طرف سے بہت سے لوگ مارے جا رہے ہیں۔ تم آخر اُس کی کیا جواب دہی کرو گے؟ بہتر ہے کہ میرے پاس آکر گفت و شنید سے معاملہ طے کر لو۔" اس کے جواب میں معین الملک بغیر کسی کے صلاح ومشورے کے احمد شاہ کے خیمے کی طرف چل دیا۔ احمد شاہ نے بڑی عزت واحترام سے استقبال کیا اور دریافت کیا۔

"تم نے میرا مقابلہ کیا ہے۔ تم سے کیسا سلوک کیا جائے۔"

معین الملک نے جواب دیا۔ "اگر تم سوداگر ہو تو مجھے خرید لو۔ اگر تم قصاب ہو تو مجھے قتل کر ڈالو اور اگر تم بادشاہ ہو تو مجھے معاف کر دو"

احمد شاہ ابدالی اس جواب سے خوش ہوا۔ معین الملک سے بغلگیر ہوا اور اُسے اپنی دستار بخش دی۔

معین الملک کی موت کا قصہ طہماس کا چشم دید ہے وہ بیان کرتا ہے کہ شکار سے واپسی پر لاہور سے آٹھ کوس پرٹیکا پور گاؤں کے ایک قلعے میں معین الملک نے قیام کیا۔ کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا۔ سو کر اٹھنے پر طہماس نے معین الملک کو بتایا کہ آپ کا بازو بند کھل گیا ہے۔ معین الملک کو حیرت ہوئی۔ اُس نے بازو بند ایک سردار کو دے دیا۔ اس کے بعد معین الملک چند لوگوں کو لے کر جن میں طہماس بھی شامل تھا کھیتوں میں نکل گیا۔ وہاں اس کو بول وبراز کی ضرورت محسوس ہوئی ان لوگوں کو ہدایت

کی گئی کہ تھوڑی دُور پر منہ پھیر کر کھڑے ہو جائیں مگر کوشش کے باوجود اجابت نہیں ہوئی اور اچانک معین الملک بے ہوش ہو کر گر پڑا اور قوتِ گویائی جاتی رہی۔ آدھی رات کو انتقال ہو گیا۔ طہماس لکھتا ہے کہ چہرے سے سینے تک جسم بالکل نیلا پڑ گیا تھا۔

معین الملک کی موت کے بعد طہماس کی زندگی کا ایک نیا دَور شروع ہوا۔ معین الملک کی بیوہ مغلانی بیگم نے صوبہ داری سنبھالی۔ یہ سب غلام زادے اب تربیت کی سخت بندشوں سے آزاد ہوئے اور طرح طرح کی عیاشیوں میں پڑ گئے۔ اپنے بارے میں لکھتا ہے کہ "میں بھی ایک طوائف زادی موتی" نامی کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ مغلانی بیگم نے آخر کار طہماس اور پانچ دوسرے غلام بچوں کی شادی کرا دی۔ حنا بندی کی رسم ادا کی گئی اور سات کشتیاں مہندی ایک ایک اشرفی اور دوشالہ بخشا گیا۔

مغلانی بیگم کا نہایت ہی جیتا جاگتا نقشہ طہماس نے کھینچا ہے۔ جس سے اس کی بیدار مغزی، ہوش مندی اور جذباتیت کا پتہ چلتا ہے۔ جگہ جگہ پر طہماس اس بات کو جتانا چاہتا ہے کہ اس وقت بھی جب وہ ادنیٰ غلام کی حیثیت سے ترقی کر کے منصب دار اور امیر ہو گیا تھا۔ وہ مغلانی بیگم کا وفادار رہا۔ اور اُنہیں صحیح مشورے دیتا اور اُن کی مدد کرتا رہا۔ ایک جگہ لکھتا ہے۔

"بیگم اکثر اپنی گفتگو میں نازیبا اور غیر مناسب جملے استعمال کرتی تھی مگر میں انتہائی عقیدت کی وجہ سے ان باتوں کی پروا نہ کرتا تھا۔ میں بیگم سے ہمیشہ نصیحت اور مشورے کی باتیں کرتا رہتا تھا اس طرح کوئی نامناسب بات کرنے سے گریز کی راہ نکال لیتا تھا۔ میں بیگم سے کہا کرتا تھا ایسے نازیبا جملے نہ کہا کیجئے۔ یہ آپ کی شان اور وقار کے خلاف ہیں۔ بیگم نے مجھے قیمتی جواہرات دیئے مگر میں نے کبھی بیگم کی بات نہ مانی۔ کچھ عرصے تک یہی صورتِ حال قائم رہی مگر میرے اوپر خدا کا فضل تھا۔ میں نے کبھی ایک بھی نازیبا کلمہ زبان سے نہ نکالا اور بیگم کو ہمیشہ اپنی ماں کی طرح سمجھا۔"

مغلانی بیگم کے التفات کے تذکرے جا بجا بکھرے ہوئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیگم کو طہماس سے رُومانی دلچسپی تھی۔ بعد کو مغلانی بیگم نے ایک امیر شہباز نامی سے شادی کر لی۔

۱۰ جنوری ۱۷۶۰ کو ابدالی کے داخلہ، دہلی کا حال طہماس نے چشم دید مشاہد کی طرح بیان کیا ہے۔ ابدالی کے سپاہیوں نے طہماس اور اس کے ساتھیوں کے ہتھیار چھین لئے تھے اور انہیں مجبور کیا تھا کہ وہ چند امیر آدمیوں کے گھروں کا پتہ نشان بتائیں۔ مجبور ہو کر طہماس نے ایک بڑی عمارت کی طرف اشارہ کر دیا۔ اور جب سپاہی اس عمارت کو لوٹنے میں لگ گئے تو یہ عمارت کے پیچھے سے کود کر فرار ہو گیا۔ شہر کی لوٹ مار سے گھبرا کر مقیم بیگ کے ساتھ پیدل مغلانی بیگم کی جائے قیام پر پہونچا۔ رات وہاں گزاری۔ بیگم شہر جا چکی تھیں۔ صبح کو بیگم کے ملازموں کو لے کر شہر پہونچا۔ بیگم طہماس کو دیکھتے ہی سخت غصہ ہوئی۔

قصہ یہ تھا کہ مغلانی بیگم کی ایک چہیتی کنیز، خواجہ سرا محبت نامی کو چاہتی تھی۔ مغلانی بیگم کو یہ بات سخت ناپسند تھی۔ خواجہ سرا محبت بیگم کے جموں کے قیام کے دوران بھاگ کر دہلی چلا گیا۔ بیگم کے دہلی جانے کی خبریں گرم تھیں مگر بیگم کے ساتھ دہلی جانے والی کنیزوں میں اس کنیز کا نام شامل نہ تھا۔ ایک دن اچانک وہ کنیز بیگم کے ہاں سے غائب ہو گئی۔ مغلانی بیگم کی آتش غضب اور بھڑکی۔ اس کنیز کا سراغ لگانے کے لئے بیگم نے کنیزوں کو اتنا مارا پیٹا کہ اُن میں سے ایک کنیز مر گئی۔ کچھ دنوں بعد بیگم کی بیٹی کی ہم رکابی میں طہماس کو بھیجا گیا۔ مقامی امیر محمد سعید خاں نے نگرانی کے لئے سپاہی مقرر کئے (مغلانی بیگم کی بڑی بیٹی عمدہ بیگم وزیر عماد الملک غازی الدین خاں کی بیوی تھی) اس قافلے کے دہلی پہونچنے پر معلوم ہوا کہ جموں میں جو کنیز غائب ہو گئی تھی وہ اچانک خواجہ سرا محبت کے گھر دہلی پہونچ گئی ہے۔ خواجہ سرا محبت اب متمول اور با اثر آدمی تھا۔ اُس نے طہماس کو ملازمت کی بھی پیش کش کی تھی۔ یہ خبر البتہ مشہور ہو گئی کہ اُس کنیز کو جموں سے دہلی لانے میں طہماس کا ہاتھ ہے اور وہ عمدہ بیگم ہی کے قافلے کے ساتھ دہلی لائی گئی ہے۔ ظاہر ہے مغلانی بیگم کو یہ سُن کر سخت طیش آیا اور اس وجہ سے طہماس کو دیکھتے ہی مغلانی بیگم نے سخت و سُست کہنا شروع کر دیا۔

جہاں تک طہماس کی اولاد کا تعلق ہے۔ اس خود نوشت میں ان میں اکثر کی پیدائش کا سنہ درج ہے۔ طہماس کی اولاد میں سب سے بڑی ایک لڑکی ہے۔ اس کے بعد اللہ یار خاں (۱۷۶۰ء) اس کے بعد مشہور اردو شاعر سعادت یار خاں (جنوری ۱۷۶۳ء) جن کی ولادت سرہند میں ہوئی۔ ۱۷۶۷ء میں تیسرا بیٹا محمد یار خاں پیدا ہوا۔ ۱۷۷۰ء میں چوتھا بیٹا خدا یار خاں پیدا ہوا۔

طہماس نے دو شادیاں کیں۔ ۴۴ سال کی متاہلانہ زندگی میں پہلی بیوی سے ۱۲ اولادیں ہوئیں۔ ان میں سے صرف چار بیٹے اور تین بیٹیاں اس خود نوشت کی تحریر کے وقت یعنی ۲۴ اپریل ۱۷۸۲ء تک زندہ تھیں۔ دوسری بیوی سے دو لڑکے ہوئے اُن میں سے ایک مر گیا۔ دوسرے کا نام حق وردی خاں تھا۔ دوسری شادی کابلی مغل کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ جب کہ طہماس کی پہلی بیوی اور بچے نجیب آباد میں تھے اور طہماس ضابطہ خاں سے متعلق تھا اور ایک مدت سے دہلی میں مقیم تھا۔ (۱۷۷۰ء)

طہماس کی سب سے بڑی لڑکی ماہ خانم کی شادی طہماس کی منہ بولی بہن کے لڑکے عوض بدل خاں سے ہوئی۔ اس کے ہم نام جمعدار طہماس خاں نامی کی لڑکی کی شادی اللہ یار خاں سے ہوئی۔ یہ شادی غوث گڑھ کی لڑائی کی وجہ سے مقررہ وقت پر نہ ہو سکی کیونکہ غوث گڑھ کی لڑائی میں جمعدار طہماس خاں خود بھی شریک تھا۔ طہماس بھی غوث گڑھ گیا۔ وہاں کے لشکر کا حال بیان کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ گیہوں اب پہلے سے قدرے مہنگا ہو گیا ہے۔

سعادت یار خاں رنگین کی شادی بدخشی خاندان کی لڑکی سے اور محمد یار خاں کی شادی مغل خاندان کی لڑکی سے علی گڑھ میں کی گئی اور اس میں ۸ ہزار روپیہ صرف ہوا۔ سعادت یار خاں رنگین کی تعلیم و تربیت پر خاص طور پر توجہ کی گئی۔ سعادت یار خاں اور اللہ یار خاں کو شمشیر زنی، بندوق چلانے اور اس قسم کے دوسرے فنون کی تعلیم دی گئی جو سپاہی کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مولوی عبدالغنی کو جن کی طہماس بڑی تعریف کرتا ہے) اپنے لڑکوں کا اتالیق مقرر کیا۔ ایک مغل عالم حاجی محمد تبریزی ان لڑکوں کو ترکی زبان سکھانے پر مامور تھا۔

اور یہ دونوں اچھی طرح ترکی لکھنے لگے تھے۔ اُن کی تعلیم کے لئے طہماس نے ایک ترکی قواعد کی کتاب تیار کی تھی جس میں ترکی قواعد کے اصول فارسی میں بیان کئے گئے تھے۔ قواعد کی کتاب لکھتے وقت طہماس کو اپنی خود نوشت ترکی زبان میں لکھنے کا خیال آیا۔ لشکر کے ساتھ پڑاؤ کے دوران طہماس نے خود نوشت سوانح عمری لکھنی شروع کی۔ اس کام میں طہماس کے لڑکے بھی مدد کیا کرتے تھے گویا اس خود نوشت کی آرائش و اصلاح میں سعادت یار خاں رنگین کا بھی حصہ رہا ہے۔

اللہ یار خاں اور سعادت یار خاں نجف خاں کی فوج میں ملازم ہو گئے تھے۔ کاماں کی لڑائی کا حال طہماس نے خاصی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس لڑائی میں طہماس اپنے دونوں لڑکوں کے ساتھ شریک تھا۔ نجف خاں ان تینوں کی بہادری اور پامردی سے بہت متاثر ہوا۔

نجف خاں کے دورانِ وزارت میں دہلی کے امن و امان اور عیش و عشرت کی طہماس نے بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہر گھر عیش و عشرت سے مامور ہے۔ ہر طرح کی چیزیں شہر میں بھی اور خریدی جاتی ہیں۔ اور نئی نئی عمارتیں بن رہی ہیں۔ پرانی امرا رباد بیگ خاں ترک جنگ اور نیاز بیگ خاں طالب جنگ مشہور رہیں۔ مؤخر الذکر کا انتقال خود نوشت کی تالیف سے کچھ پہلے ہوا تھا۔ اس کے علاوہ مراد بیگ خاں شمشیر جنگ کے سپرد توپ خانے کی خدمت تھی اور اس کی رسائی شہنشاہ تک تھی اور اس کا قریبی عزیز عاشور علی خاں بھی توپ خانے میں اعلیٰ عہدے پر ممتاز تھا۔ طہماس کو بھی اپنی جنگی خدمات کے صلے میں محکم الدولہ، اعتقاد جنگ کے خطابات اور ہاتھی اور خلعت وغیرہ انعام میں ملے۔

اس خود نوشت سوانح عمری کی تکمیل کے وقت طہماس دہلی کے محلہ بلی ماراں میں اپنے مکان میں مستقل سکونت اختیار کر چکا تھا۔ مکان چھوٹا تھا لہٰذا دوسرے پاس پڑوس کے مکانات لے کر ایک بڑی حویلی اپنے لئے تعمیر کرلی۔ گھی منڈی کے علاقے کو بھی خرید کر وہاں ایک باغ بنوایا۔ اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو الگ الگ مکانات، گھوڑے اور ملازمین دیئے۔ دو لڑکے محمد یار خاں اور خدا یار خاں صوفی بزرگ شاہ امانی کے مرید ہو گئے۔

یہ خودنوشت سوانح عمری نو ماہ میں مکمل ہوئی اور ۲۴ اپریل ۱۷۸۲ء کو دہلی میں پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ اس کی اصلاح طہماس نے منشی میگھ راج سے کرائی۔

اس خودنوشت سوانح عمری کے مطالعے سے اندازہ ہوگا کہ اس کی ادبی اور تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس دور کے بارے میں براہِ راست معلومات کے وسائل بہت کم ہیں۔ یہ دور اردو شاعری کا تشکیلی دور ہے۔ اور میر، سودا، میر درد جیسے عظیم شاعر اس دور میں اردو کے فروغ و جستجو و آرزو میں شریک رہے ہیں۔ پھر ان لوگوں کے دواوین اور تصانیف میں جن امیروں کا اور جن واقعات کا تذکرہ بار بار آتا ہے وہ اس خودنوشت کے جیتے جاگتے کردار ہیں اور اُن سے مصنف کا براہِ راست معاملہ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے تاریخ کے ایک اہم اور اس کے بارے میں مختصر سیاسی معلومات ہی حاصل نہیں ہوتیں بلکہ اس دور کی سماجی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے اور لوگوں کے رہن سہن، طرز احساس اور انداز فکر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اور ادبی تاریخ کے نہایت اہم دور کی بازیافت میں مدد ملتی ہے۔

## بقیہ خلیج

سے چپکا مگر ہر رات خوف زدہ ہو کر انھیں بھول بھال کر سو جا ــــ ہا ہا ہا ــــ"

نامعلوم طنزیہ ہنسی دیر تک گونجتی، گرجتی رہی اور یہ ہنسی کانچ کے تیز ٹکڑوں کی طرح کھچا کھچ عذرا کو چبھتی اُس کی آرزو اور احساس میں پیوست ہوگئی۔ مگر عذرا ــــ ؟

وہ اپنی اس تکلیف پر بھی رو نہ سکی، اُف تک نہ کر سکی۔ محض اس ڈر سے کہ کہیں باجی سُن نہ لیں اور یہ زخم، یہ غم بھی اُس سے چھن نہ جائے۔ اس بھری پُری دُنیا میں وہ خود اپنی نہ سہی مگر کچھ تو اُس کا اپنا ہے۔ درد ہی سہی، زخم ہی سہی، آرزو کا الم ہی سہی ــــ!!!

اور اُس نے اپنے خاموش آنسو خشک کر لئے اور از سر نو تکیوں میں سر دے کر اس طرح چُپ چاپ پڑ گئی جیسے خود اپنے آپ کو بھی جانتی پہچانتی نہ ہو۔




## شارق

ہم غریبوں کا بھلا کیجئے گا
آپ اگر اور جفا کیجئے گا

یہ غنیمت ہے کہ ہم جیتے ہیں
حالِ دل پوچھ کے کیا کیجئے گا

آپ سب پر تو کرم کرتے ہیں
کبھی ہم سے بھی وفا کیجئے گا

جب ہمیں خاک میں مل جائیں گے
آپ پھر کس پہ جفا کیجئے گا

اور دو سانس کی مہلت دیجئے
پھر دوا کیا ہے دُعا کیجئے گا

جس پہ پڑتی ہے وہ جانے اُس کو
آپ کیوں شکر خدا کیجئے گا

اب زمانہ میں کہاں قدرِ وفا
بھول کر بھی نہ وفا کیجئے گا

وقت آئے گا تو اک دن شارق
آپ بھی شکر خدا کیجئے گا

# یہ جھوٹ





آوارہ

اگر ہم خود اس وقت جھوٹ نہ بول رہے ہوں تو کہہ سکتے ہیں کہ پرانے پرانے جھوٹ بولنے والے بھی، قصور معاف، ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتے۔ جھوٹ کی ابتدا کیوں کر ہوئی، پہلا جھوٹ کب بولا گیا، اور بولنے والا کون تھا شریف تھا۔ زیادہ سے زیادہ مواد جو اس فنِ لطیف کے متعلق ماہرین سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے، اتنا ہی ہے کہ جھوٹ پہلے بولا گیا۔ پھر فن کے دھنی نے اسے محفوظ اور زندہ رکھنے کے لئے اتنی ترقی اور دی کہ جھوٹ بھی گیا۔ گویا اسی ادھوری معلومات اور سرسری تحقیقات پر جھوٹ عام پسند انٹی ٹیوشن پر جھوٹ کی تر کی تمام۔ آگے آیت والسلام۔ موقع پر افسوس کے ساتھ اپنی نااہلی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مسلسل کوشش اور کافی مہارت ہونے پر بھی ہمیں ابھی ٹکسالی جھوٹ بولنے کی سند نہیں ملی ہے۔ بڑی سعی، سفارش اور توڑ جوڑ ملانے پر جھوٹوں کی ہر قومی کانفرنس نے سادہ سادہ جھوٹ بولنے کا لیسنس دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ "سیٹی" زیادہ ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ اس "سیٹی" کی جگہ "جھوٹ" ہماری کہاوت ہوتا۔ ایک جھوٹ بولنے ہی کی اتنی قسمیں ہیں کہ آخری سانس تک برتتے رہئے۔ پھر بھی آمدنی میں گولر کا پھول، برکت ہی برکت دکھائی دے۔ جمع کی مد بھری کی بھری رہے۔ ان پر نئے محققوں نے جو کار آمد اضافے کئے ہیں وہ گویا مد محفوظ ہیں۔ ان میں سے بعض کی افادی نوعیت اور مقبول عام حیثیت خاص طور پر تسلیم کی گئی ہے۔ جیسے ایسا جھوٹ، جسے بولنے میں ثواب بھی ہے، اور سہولت بھی۔ ہمیشہ انشاء اللہ سے شروع ہوتا ہے۔ اور آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی پھڑک سے "سچ" کی جھلک دیتا ہوا، "ضرور، ضرور" یا بسر وچشم پر ختم کیا جاتا ہے۔ البتہ یہ فیصلہ بولنے والے کے اختیاری تمیز پر ہے کہ موقع محل کے اعتبار سے بولنے کا رنگ نکھارے۔ اور تیکھا کرنے کے لئے آپ کے سرِ عزیز کی قسم، "واللہ باللہ" کی پٹ بھی اس میں دیتا جائے۔ ایسے ہی جھوٹ کی ایک قسم وہ بھی ہے جو نکاح کے وقت کام آتی ہے۔ نوشہ میاں کسی سرکار کے خدمت گار بھی ہوتے ہیں اور مہینے کے پورے تیس دن صبح شام چلمیں بھرنے کے بعد اگر خوش قسمتی سے نادر شاہی آقا کے جرمانوں سے صحیح سلامت بچ گئے تو اصل خیر سے مہینے پیچھے چھ رپلی کا منہ دیکھتے ہیں، مگر قاضی صاحب قبلہ کے آگے سر موڑھا ہے، سہرے مقنع کی آڑ میں دبی زبان سے چبا چبا کے، لجا لجا کے جب کہتے ہیں کہ مسماۃ فلاں

بنت فلاں کو بعوض مبلغ پانچ ہزار سکۂ رائج الوقت، ایک اشرفی طلائی دین مہر کے قبول کیا میں نے۔" اور سسرالیوں پر اپنی دھاک بٹھانے کے لئے شین قاف کے صحیح مخرج اور زیر زبر کی پوری پابندی کے ساتھ اس قول کی تکرار بھی فرماتے ہیں، تو اس خود اعتمادی کے ساتھ کہ روپے کا ذکر "چوں مد بہ حساب اندر ہے"، نکاح کا خطبہ ختم، رقم بے باق، اور دولھن بطور رسید وصول۔ بدگمانی سے بچنے کے لئے یوں سمجھئے کہ دولھا دولھن کی یہ جوڑی اگر محض ہوا پر جینے کا تہیہ کرلے، اور بیاہی زندگی کے دوسرے واجبات میاں کے گلے نہ پڑیں، تو معمولی ضرب تقسیم کا سوال ہے کہ چھ روپے مہینہ قسط کے حساب سے پانچ ہزار کی خفیف سی رقم صرف انہتر سال پانچ مہینے دس دن کی مدت میں ادا ہو جائے گی۔ رہی ایک اشرفی، تو اسے حسنِ کلام سمجھنے میں کوئی امر مانع نہیں۔

لکھے ہوئے جھوٹ کی ایک مثال وہ سارے دیوان مثنویاں و اسوخت اور کلیات ہیں جو اس مٹی پانی کی دنیا میں وجود پا جائیں تو آپ ایک عجیب ہڑبونگ دیکھیں۔ یعنی عاشقوں کی بھرمار ادھر عطاروں اور کنن فروشوں کی دکانوں پر "تو" بولنے لگیں، اُدھر اسپتالوں اور گورستانوں میں تل رکھنے کو جگہ نہ ملے "حسن رہ گزرے" یا کرشمہ پس دیوار" تعزیراتِ کی کسی نہ کسی دفعہ کے تحت جیل خانے میں ہو، یا حبس دوام بہ عبور دریا رشور، ورنہ پھانسی گھر یقینی اور ازالہ حیثیت عرفی کے مدعی "رقیب" اور "آسمان" وکیلوں کی دربار داری یا عدالت کے کٹہرے میں۔ اس جھوٹ کا ایک نمونہ سروس بک اور بیمہ کمپنیوں کے اقرار ناموں میں عمر کا خانہ ہے جو سوچ سمجھ کے اس حساب سے بھرا جاتا ہے کہ آگے چل کر پنشن دیر سے ملے یا پالیسی کی رقم جلد ہاتھ آئے۔

یہ عام جھوٹ کی ایک مجمل تشریح تھی، اب جھوٹ کے دو ایک نادر نمونے پیش کرنے کی عزت حاصل کی جاتی ہے۔ پسندِ خاطر ہوں۔ شوق سے کام میں لائیں۔ رفاہِ عام کی خاطر میں نے ذاتِ خاص کے لئے ان کا پیٹنٹ کرانا گوارا نہیں کیا۔ ملاحظہ فرمائیے کہ بولنے اور لکھنے کے علاوہ جھوٹ لگایا بھی جاتا ہے اور اُن عمر دراز، شوقین بزرگوں کے کام آتا ہے جو نکاحوں کے عادی ہوتے ہیں اور بیویوں کی اکھاڑ پچھاڑ کرتے کرتے پیشہ ور شوہر سے ہو جاتے ہیں۔ اس جھوٹ کی محرک یا تو وہ مشاطہ ہوتی ہے جو ہر پیغام کے وقت جناب ممدوح کے اور حمیدہ کی فہرست گناتے ہوئے سنِ وسال کو برس پنتیس یا چھتیس پیٹ سے جس میں نزلہ بھی شامل ہوتا ہے، نکلنے نہیں دیتی۔ یا خود کا وہ مغالطہ نفس جو چشم بد دور چالیسویں سالگرہ کے بعد بھی پرچیونٹی کے انڈے دیکھ کر سرکشی کرتا ہے۔ اس جھوٹ کا بازار نام خضاب ہے اور اس لحاظ سے نہایت کامیاب ہے کہ بڈھوں کو بہکا لو، بچوں کو ڈرا لو اور بیوی کو پھسلا لو۔ اس سے عجیب تر جھوٹ ہے جو دانتوں کی شکل میں لگایا جاتا ہے۔ کڑاکے کے جاڑے ہوں، پوپلے منہ میں چوکا جڑا ہو۔ بڑے میاں آپ بیتی کہیں گے۔ یا دانتوں میں لگتا ہے یا سردی کے مارے دانت سے دانت بج رہے ہیں۔

اور تو اور جھوٹ رویا بھی جاتا ہے۔ اس کا مظاہرہ اکثر اوقات کنجوس باپ کی وفات مسرت آیات پر ہوتا ہے۔ جس نے اشرفی تو کی اولاد کو جیتے جی کوڑی کوڑی کو ترسایا ہو اور خود کوڑی کوڑی ہاتھ سے نہیں دانت سے اٹھایا ہو۔ یہ جھوٹ حساب سے رو جاتا ہے۔ یعنی ترکہ اگر بے منت غیرے، مال موذی نصیب غازی والا ہے تو آنسو موٹی موٹی لڑیوں میں گرتے ہیں، اور کم سے کم چہلم تک گرائے جاتے ہیں۔ اور محفوظ سرمائے میں یہ گنجائش بھی احتیاط رکھی جاتی ہے کہ اس تقریب کے سلسلے میں ماتم پرسی کے لئے ہر وارد کی آمد پر یہ جھوٹے موتی آنکھ بھر بھر کے نچھاور کئے جا سکیں۔ اگر والدین کا پس خوردہ حصہ رسدی یا واجبی ہی واجبی ہے تو آہ رسانی کی مشین کوتاہی سے کام کرتی ہے، اور آنکھیں پسیج کر رہ جاتی ہیں کہ یہ جھوٹ ہے۔"


## ضروری اعلان

پبلیکیشنز ڈویژن نے یہ طے کیا ہے کہ اس ادارے کی طرف سے شائع ہونے والے رسالوں کے خریداروں کو ہماری مطبوعات کی خریداری پر ۲۰ فی صد کی رعایت دی جائے گی۔ آرڈر کے ساتھ خریداری نمبر لکھنا ضروری ہے۔

# بیسک لٹریچر کا آٹھواں کل ہند مقابلہ

حکومت ہند کی جانب سے منعقد کئے جانے والے آٹھویں کل ہند مقابلے میں حصہ لینے کے لئے ہندوستانی مصنفین کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ مندرجہ ذیل موضوعات پر مسودے کتاب (بشمول ڈرامہ) بھیجیں۔

(۱) دیہی قیادت اور پنچائتی راج تحریک (دیہی رہنماؤں کی حقیقی مثالوں پر مبنی (۲) پنچائتی راج اور امداد باہمی کے اداروں کا آپسی تعاون اور ان کے کام (۳) پنچایتی راج کے اداروں کو اقتدار و اختیار اور ذرائع کی منتقلی۔ اس طریق کار کو کس طرح تیز تر کیا جاسکتا ہے (۴) دیہی تعمیر نو کے کاموں میں نوجوانوں کا حصہ۔ اس پروگرام کو آگے کیسے بڑھایا جاسکتا ہے۔ (۵) گاؤں والوں کی بے روزگاری اور نیم روزگاری کو دور کرنے کے لئے پنچایتی راج اور امداد باہمی کے اداروں کو کیسے حرکت میں لایا جائے (۶) دیہی علاقوں میں پینے کے پانی کی فراہمی (۷) دیہی ہندوستان کی کہانی جس میں اپنی حالت بدلنے اور بہتر بنانے کے لئے پسماندہ طبقوں کی کوششوں پر خاص روشنی پڑتی ہو۔ (۸) ایک ڈراما جس میں دیہی ترقی میں عورتوں کے رول کو اُجاگر کیا گیا ہو (۹) امداد باہمی کے قرض دینے والے دیہی اداروں میں نئے رجحانات (۱۰) مارکٹنگ کرنے والے امداد باہمی کے اداروں کے طریقۂ کار کو کیسے بہتر بنایا جائے۔ (۱۱) اپنا بازار ـــــ عوام کی خدمت کے لئے (۱۲) ایک ڈراما جس میں امداد باہمی کے اصولوں کے تحت زندگی بسر کرنے پر روشنی ڈالی گئی ہو (۱۳) دیہی علاقوں میں زرعی اور صنعتی ترقی کے لئے بجلی استعمال کرنے کے سلسلے میں پنچایتی راج اور امداد باہمی کے اداروں کا رول۔ (۱۴) دیہی بچت کو تیز کرنے میں پنچایتی راج اور امداد باہمی کے اداروں کا حصہ۔ (۱۵) کوآپریٹو فارمنگ (امداد باہمی کے ذریعے کھیتی باڑی) (۱۶) دودھ کی سپلائی اور دودھ کی بنی دوسری چیزوں کی پیداوار کے لئے انجمن امداد باہمی کی تنظیم (۱۷) کوآپریٹو طریقوں سے مرغی پالن کی ترقی۔

**انعام** :- ہر کامیاب مصنف کو ایک ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔

**زبانیں** :- کتاب/مسودہ وغیرہ مندرجہ ذیل میں سے کسی زبان میں بھیجا جاسکتا ہے۔

آسامی، بنگالی، گجراتی، ہندی، کنڑ، کشمیری، ملیالم، مراٹھی، اڑیا، پنجابی، سندھی، تامل، تلگو اور اُردو

**اسلوب** :- طرز تحریر رواں اور زبان سادہ اور آسان ہو۔ تاکہ پنچایتی راج، اجتماعی ترقی اور امداد باہمی کے کاموں میں مصروف کارکنوں، جن کے لئے یہ کتابیں لکھوائی جارہی ہیں، کی سمجھ میں آسکے اور انہیں متاثر کرسکے۔

**جسامت** :- مسودہ لگ بھگ ۴۰ ہزار الفاظ پر مشتمل ہونا چاہئے۔ کتاب کی ڈیمائی آکٹیو (۲۲×۱۸) سائز میں ہو اور ۱۲ پوائنٹ ٹائپ میں چھپی ہو تو لگ بھگ ۴۰ صفحات پر مشتمل ہونی چاہئے۔ اگر کتاب ہو تو اس میں حسب ضرورت تصاویر بھی ہوں۔

**کاپی رائٹ** :- انعام یافتہ تصنیف کا کاپی رائٹ حکومت کو منتقل کرنا ہوگا۔ جو ہر طرح کے دعوے یا پابندی سے آزاد ہوگا۔ دونوں فریقین کی رضامندی سے طے شدہ مناسب رقم کاپی رائٹ کے لئے ادا کی جائے گی۔

**داخلے کی فیس** :- مصنف کے ذریعہ بھیجی گئی فی کتاب/مسودہ تین روپے

**آخری تاریخ** :- داخلہ بھیجنے کی آخری تاریخ ۲ دسمبر ۱۹۷۰ء ہے۔

ہدایتوں اور قاعدوں کے متعلق مفصل جانکاری کے لئے لکھیں۔

**ڈائرکٹر** (بیسک لٹریچر) وزارت خوراک، زراعت، اجتماعی ترقی اور امداد باہمی

(محکمہ اجتماعی ترقی اور امداد باہمی) حکومت ہند

کرشی بھون، نئی دہلی

# ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت اور آئین

(مرزا محمد حسن قتیل کے بیان کی روشنی میں)

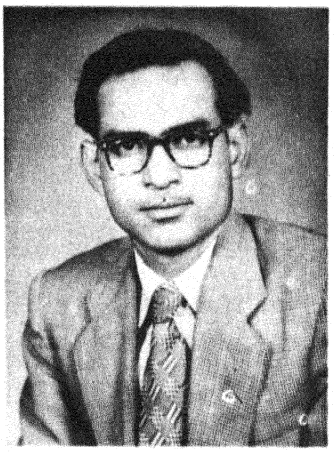

محمد عمر

**مرزا** محمد حسن قتیل، بٹالہ ضلع گورداسپور (پنجاب) کے کھتری بھنڈاری خاندان کے ایک فرد تھے۔ اُن کا خاندانی نام دیوان سنگھ تھا۔ محمد شاہ بادشاہ (متوفی ۱۷۴۸ء) کے دورِ حکومت میں اُن کے والد نے دہلی میں سکونت اختیار کی۔ کچھ دنوں قتیل نے مرزا نجف خاں (متوفی ۱۷۸۲ء) کے لشکر میں بسر کئے اور ۱۷۸۲ء ۱۷۸۴ء میں وہ لکھنؤ چلے گئے اور آخری دم تک وہیں رہے۔ ۱۸۱۷ء میں اُن کا وہیں انتقال ہوا۔ سولہ سال کی عمر میں فیض آباد میں مرزا محمد باقر اصفہانی کے زیرِ اثر انہوں نے مذہبِ اسلام قبول کیا۔ پہلے تو وہ سنّی عقائد کے پیرو ہوئے مگر مابعد شیعہ عقائد اختیار کر لئے۔ ایامِ طفلی سے اُنہیں شعر و شاعری کا شوق تھا۔ اُنہوں نے اپنی تمام زندگی شعر و شاعری، تصنیف و تالیف میں گزاری۔ فارسی کے علاوہ اُن کو ترکی اور عربی زبان پر بھی دسترس حاصل تھی۔ فارسی دیوان کے علاوہ اُن کی تصانیف کی تعداد خاصی ہے۔ وہ فارسی کے بہت بڑے عالم تھے اور اپنے زمانے میں محسودِ روزگار تھے۔ "ہفت تماشا" قتیل کی تصانیف میں سب سے اہم اور قابلِ قدر کتاب ہے۔ اس میں سات تماشے یعنی سات ابواب ہیں۔ چھٹے باب میں اُنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت اور آئین کا تفصیلی بیان کیا ہے۔ ذیل کا مضمون اس کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔

**مسلم سماج کی تشکیل** ہندوستان میں مسلمانوں کے چار فرقے شرفاء میں شمار کئے جاتے ہیں، مغل، سید، شیخ، اور افغان۔ مغل سے مرا اصلی مغلوں سے ہے جن کے کچھ گھرانے ولایت میں ہیں مگر ولایت، اور توران کے لوگوں کی اولاد کو چاہے وہ کسی بھی شہر کے باشند۔ ہندوستان میں اُن کو مغل اور مغل بچہ کہا جاتا ہے۔ اگر وہ شریف الط حلیم الطبع ہیں تو مغل کہلاتے ہیں اور اُس کے برعکس اگر وہ بانکے، شہد ہنگامہ پرور ہیں تو مغل بچہ کہا جاتا ہے۔ جو شخص ایران سے ہندوستا وارد ہوتا ہے تو اُسے بالعموم آقا کہا جاتا ہے۔ مگر بعض کو مرزا کے سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض سادات اور علماء کی اولاد کے اہلکاروں کی اولاد کو بھی مرزا کہا جاتا ہے۔ چونکہ سادات میں اور شرفاء اور دوسرے ارباب فن گزرے ہیں، لہٰذا یہ لوگ انِ چ سے، جو ان کے نام کے ساتھ تعظیماً آتے ہیں، مشہور ہو گئے ہیں۔ یعنی مرزا اور کچھ لوگ سلسلۂ مادری کی بنا پر، جو کسی قزلباش کی لڑکی ہو، ا ہیں۔ مگر اپنی سادہ دلی کی وجہ سے ہندوستان کے لوگ ہر ولایتی کو سمجھتے ہیں۔ سادات کے علاوہ دوسرے لوگ بھی جو قابلیت کی وجہ بادشاہوں کی خدمت میں پہونچ گئے ہیں اور ایران میں مرزا کے سے مشہور ہیں، چاہے وہ دراصل شیخ ہی ہیں۔ ہندوستان میں آ اور اُن کی اولاد مرزا ہی بن گئی ہے توران سے یا تو خواجہ زادے آتے

ہ سید ہوتے ہیں اور کچھ شیوخ، پس جس طرح توران میں خواجہ زادے
ر یا خواجہ یا خوجہ، خوجہ جی، خوجم کہلاتے ہیں۔ ہندوستان میں آکر اسی
ے معروف ہو گئے۔ اس کے سوا کہ وہاں اوزبک کو بیگ اور یہاں
۔ اسی طرح ہندوستان میں چند قسم کے سید ملتے ہیں ایک تو اصلی سید،
سرے دُنبالہ سید، جو توران کے قاعدے کے مطابق سید ہیں۔ تیسرے
ذات بقی ہیں۔ جیسے میر جعفر، میر کاظم تونی۔ تون ایک قبیلہ ہے جو میر کے
ب سے ملقب ہے۔ وہ سید ہونے کے مدعی نہیں مگر اُن کی اولاد جو ہندوستان
آکر بس گئی ہے اور اپنے آبائی القاب سے شہرت پا گئی ہے۔
ں رئیسوں میں عزت حاصل کرنے کے لئے قصداً مرزا کا لقب اختیار کر
ہیں اور سید ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ چوتھے کشمیریوں کا وہ فرقہ
جن کے نام کے آخر میں میر آتا ہے جیسے ابوالحسن میر، اُن کی اولاد
روستان میں آکر سید مشہور ہو جاتی ہے۔ اور میر نام کے شروع میں
ں جاتا ہے۔ پانچویں وہ لوگ ہیں جو تنگیٔ معاش سے مجبور ہو کر نذر و
ز حاصل کرنے کی غرض سے ہندی کے مرثیے پڑھ کر سید ہو گئے ہیں۔
ے سیدوں کے اکثر لے پالک اور غلام بھی سیادت کے مدعی ہو گئے ہیں۔ اسی
ح کچھ دوسرے فرقے بھی سیادت کا دعویٰ کرتے ہیں۔

یہی حال مغل کا ہے۔ اُن کی بھی چند قسمیں ہیں۔ ایک تو ایرانی اور
ر اُن کے لوگوں کی اولاد جو خواجہ زادوں اور سیدوں کے علاوہ ہے۔
سرے سادات شیعہ کے غلام اور لے پالک۔

شیوخ کی بھی چند قسمیں ہیں۔ ایک اصلی ہیں۔ اُن کی دو شاخیں
ں۔ ایک قدیم الاسلام، جیسے صدیقی، فاروقی اور عثمانی۔ دوسرے
ابہ کی اولاد، ۔ دوسرے جدید الاسلام جیسے کنبوہ، پراچے، خوجے اور
دیقان ملتان وغیرہ۔

ہندوستان میں جو افغانی پائے جاتے ہیں وہ روہ کے علاقے
ے آتے ہیں۔ اس لئے وہاں کے افغان، روہیلہ کہلاتے ہیں۔ افغانوں
دو بڑے فرقے ہیں۔ لڑابن اور کلانڑی۔ کلانڑی کی کئی قسمیں ہیں۔
ش آفریدی، دلازاک، خٹک، رک زئی وغیرہ۔ سڑابن کی بھی
شاخیں ہیں۔ علاوہ ازیں غرغشت اور بٹین بھی دو اور فرقے ہیں۔
ندوستان میں ایک اصلی پٹھان پائے جاتے ہیں۔ دوسرے اُن کے
غلام اور یا جو اُن کے زمانہ حکومت میں بخوشی مسلمان ہوئے اور اپنے کو
پٹھان سمجھنے لگے ہیں۔

اس طرح یہ چار فرقے ہندوستان میں اشراف میں سے ہیں بشرطیکہ
اُنہوں نے اپنے آبائی حسب کا تحفظ کیا ہو۔

بہت سے مہاجر ہندوستان میں اپنے آپ کو سید یا مغل
ظاہر کرتے ہیں۔ اور کچھ شیخ یا افغان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مگر اُن کی
رشتہ داریاں آپس ہی میں ہوتی ہیں، اور اُن کی سیادت نامقبول اور
غیر معتبر ہوتی ہے۔ اسی طرح افغانی اگر شیر فروشی کا پیشہ کرے یا بازار میں
حقہ پلانا شروع کر دے تو معیارِ شرافت سے گر جاتا ہے۔ اسی طرح
شیخ بھی جو پیشہ اختیار کرے اُسی سے موسوم ہو جاتا ہے۔ نچلے درجے کے
پیشے کے اختیار کرنے پر اُس کا شمار شریفوں میں نہیں کیا جاتا۔ چاہے وہ
خلفاء میں سے کسی کی اولاد میں ہو۔

صدیقان ملتان میں بیشتر شیعہ ہیں۔ اُن کی قرابتیں اپنی ہی
برادری میں ہوتی ہیں۔ اُن میں سے کچھ نے اسلام قبول کر لیا۔ مگر اپنی
قوم کے سوا کسی دوسرے فرقے میں رشتہ داری کو جائز نہیں سمجھتے۔
پس شہریوں کی قرابت اس بات پر مقید تھی کہ سید اپنی لڑکی ایسے
مغل زادے کو دیتا ہے جس پر مرزا کا اطلاق ہو سکے اور خوجہ زادہ
کو بھی اور شیخوں میں سادات، مرزا اور خواجہ سے قرابت داری نہیں
ہوتی، چاہے خواجہ زادہ کی اصل شیخ ہی ہو، لیکن جس کو شیخ کہہ کر
پکارا جاتا ہے۔ اس کا لڑکا شہر میں کسی مرزا، یا سید یا خواجہ کا داماد
نہیں ہو سکتا اور اگر وہ کسی شیخ کی لڑکی لے لیں تو وہ لڑکی منقولہ بالا
تینوں فرقوں کی کسی لڑکی کی طرح عزت حاصل نہیں کر سکتی اور افغان
کا بھی یہی حال ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ بعضے لوگ قرابت کے موقع پر طرفین
کی شرافت ڈھونڈھتے ہیں اور بعضے والد کی شرافت کو کافی سمجھتے ہیں۔
اور ماں کے نسب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، چاہے وہ کنیز ہو یا
رنڈی ہو یا کوئی اور ہو۔ اور بعضے اپنی حماقت سے اور بہادری کے
غرور میں مولویوں اور طبیبوں کو اپنے گروہ کے باہر سمجھتے ہیں۔ ان
کا کہنا ہے کہ یہ لوگ عزت میں سپاہی لوگوں سے کم تر ہوتے ہیں۔

## نکاح بیوہ کا ان مسلمان بھی، بیوہ لڑکی کو دوسری شادی سے

محروم رکھتے ہیں۔ چاہے وہ سولہ سال یا اس سے کم عمری میں بیوہ ہوگئی ہو۔ اس معاملہ میں ان لوگوں اور قصبات کے شرفاء کا حال تقریباً ہندوؤں کا سا ہے کہ اپنی جہالت کی وجہ سے شریعت کے احکام پر عمل نہیں کرتے بیوہ کا عقد ثانی کرنے والوں کو بے عزت اور کم مرتبہ سمجھتے ہیں۔

## رسوم شادی

ہندوستان کے مسلمان بیٹے اور بیٹی کی شادی میں چند رسموں کو چھوڑ کر مثلاً آگ کے پھیرے، باقی تمام رسمیں ہندوؤں کی طرح کرتے ہیں جیسے لڑکے لڑکی کو زرد کپڑے پہنانا، کلائی میں ریشمی کلاوہ باندھنا، عقد سے فارغ ہونے تک دولہا کے ہاتھ میں لوہے کا ہتھیار پکڑے رہنا، عورتوں کا سٹھنی گانا، تجمل اور آرائش کے ساتھ دولہا کا دولہن کے گھر ساچق لے جانا۔

## ساچق

ساچق کی رسم کے دن دولہا کو مسند پر بٹھاتے ہیں اور چھوٹے اور بڑے اس کے دائیں اور بائیں بیٹھتے ہیں۔ مگر باپ، چچا، ماموں اور بڑا بھائی اس مسند کے قریب نہیں جاتے ہیں۔ ساچق کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مٹکیوں کو پوت کر ان پر پھول بوٹے بناتے ہیں، ان میں نقل بھری جاتی ہے، جو شکر اور چنے سے تیار کی جاتی ہے، پستہ، بادام اور مصری سے پُر کرتے ہیں۔ چار مٹکیوں کو ایک تخت پر رکھتے ہیں۔ تختوں کی کمی و بیشی لڑکے کے والد کی حیثیت پر موقوف ہوتی ہے۔ پھر آرائش کے تختے، جو کاغذ سے بنائے جاتے ہیں، ان تختوں پر جائے جاتے ہیں۔ پھولوں کے علاوہ پری طلعت عورتوں کے کاغذی مجسمے بنا کر سب کو جُدا جُدا ایک تخت پر بٹھاتے ہیں۔ علاوہ ازیں قند اور میوے کے چند خوان ہوتے ہیں پھولوں کے ہار اور دوسرے زیورات دولہن کے لئے ہوتے ہیں۔ اپنے رشتہ داروں کو ساتھ لے کر حسب حیثیت ہاتھی یا گھوڑے یا میانہ اور عورتوں کو چوپالہ اور داولی پر سوار کر کے اور دولہا کو ہاتھی یا گھوڑے پر سوار کر کے شان و شوکت کے ساتھ نقارہ بجاتے دولہن کے گھر جاتے ہیں۔ دوسری چیزوں کے علاوہ ساچق کے دن بایا فرید کا پوڑا بھی دولہن کے گھر جاتا ہے۔ اس پوڑہ کا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں شادی کے معاملات عورتوں کے اختیار میں ہوتے ہیں، لہٰذا عورتیں وہ چیزیں جو شادی کے لوازم سے ہوں، شادی میں ان پر عمل نہ ہو، تو ملول اور کبیدہ خاطر ہو جاتی ہیں اور اس شادی کو منحوس سمجھتی ہیں۔ یہ رسم سُنی و شیعہ دونوں میں جاری ہے اگر لوازم شادی میں کسی بات کی کمی رہ جائے اور شادی کے بعد جو مثلاً دردِ سر، دردِ شکم، بخار، اور اولاد کی موت یا دولہن دولہا کی موت پیش آجائے تو اس کو رسم توڑنے کا سبب سمجھتی ہیں۔ مختصر کہ دولہن کے گھر پہونچنے کے بعد دولہا کو ایک مسند پر بٹھایا جاتا ہے اور خلعت پہنائی جاتی ہے۔ یہ شادی کے جوڑے سے الگ ہوتا ہے۔ چونکہ قاعدہ ہے کہ دولہا کی سواری میں رقاص بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا دولہا کے مسند نشیں ہونے کے بعد رقص و سرود ہوتا ہے۔ دو رات گزرنے کے بعد اُسے گلاب سے معطر کیا جاتا ہے اور مصری کا شربت پلایا جاتا ہے۔ یہ شربت پینے کے لئے نہیں بلکہ چکھنے کے لئے ہوتا ہے کے بعد وہ تھال میں کچھ نقدی ڈال دیتا ہے۔ اگر کوئی کچھ نہ ڈالے تو مجلس کے لوگوں میں مطعون ہوتا ہے۔

صاحب مجلس سے آشنائی کی وجہ سے ہندو لوگ بھی اس مجلس میں شریک ہوتے ہیں۔ اور قاعدہ کے مطابق یا بے خبری میں شربت اُن کے آگے لے جایا جاتا ہے، وہ بنا چکھے حیثیت کے مطابق زرِ نقد تھالی میں ڈال دیتے ہیں۔

## خانہ بندی

ساچق کے اگلے دن یا اس کے تین دن بعد اگر کوئی وجہ مانع نہ ہوتی ہو، تو شبِ خانہ بندی قرار پاتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دولہن کے گھر سے دولہا کے واسطے دوسری طرف کے لوگ مہندی اس طرح لاتے ہیں کہ ساچق کے تختے، جو اسی جگہ چھوڑ دیئے گئے تھے کیونکہ قاعدہ یہی ہے کہ واپسی کے وقت آرائش داماد کے ساتھ نہیں آتی ہے، بلکہ حنابندی کی شب کو دولہن والوں کے ساتھ آتی ہے تاکہ شادی کی رات کو فریق ثانی اُسے دوبارہ برات کے ساتھ لائے۔ بہرحال ساچق دولہا کے گھر سے شام کو جاتی ہے اور حنا رات کو لائی جاتی ہے۔ اس کا وقت مقرر نہیں ہوتا، کہ اوّل شب کو لائیں یا آخری شب میں۔ حنا پہونچنے کے بعد دولہا کو زنان خانے میں بُلاتے ہیں تاکہ رشتے کی سالیاں اس کے ہاتھوں پاؤں میں مہندی لگائیں اور مہندی لگوانے کے بعد دولہا

زم ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق اُن کو کچھ رُوپے دئے جو ہندی زبان میں
ت کہلاتا ہے۔ اُن میں سے جو سالی دولہا سے بڑی ہوتی ہے وہ اُسے
لامی دیتی ہے۔

حنا بندی کی حالت میں باہر دولہا کی طرف کے لوگوں کے سامنے
انہ مجلس میں دونوں طرف کی ناچنے والیاں باری باری رقص کرتی ہیں۔
عورتوں کی مجلس میں ڈومنیاں سرُود بدھائی گاتی ہیں۔ اس رات کو اس
ع کی ہر عورت حسب منشا دولہا کو فحش باتیں سناتی ہے اور دولہا بے چارہ
ٹکائے سُنتا رہتا ہے۔ ضروری مراسم کے بعد اسی طرح شربت پلایا
ہے جس طرح دولہا والوں کی طرف سے سُسرال والوں کو شربت
جاتا ہے جس طرح سُسرال والوں نے دُولہا والوں کو پلایا تھا اور
ں میں روپیہ لے کر سمدھن کو دیدیا جاتا ہے۔ بعد ازیں مرد اور عورتیں رخصت
گھروں کو واپس ہوتے ہیں۔ اُس کے اگلے دن شب عروسی ہوتی ہے۔
ت یاد رکھنی چاہیے کہ ساچق اور حنا بندی کی رات میں فصل ہو جانا تو
رسم ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن مہندی اور شادی کی رات
کوئی فصل نہیں ہو سکتا۔

## رات

جب برات کی رات آتی ہے تو سر شام ہی سے لوگ اور دوست
اب، وضیع و شریف طرفین کے گھروں پر جمع ہونے لگتے ہیں۔ اور اُسی
ت سے دولہا زریں لباس پہن کر مسند پر بیٹھ کر عورتوں کے رقص
اشا دیکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ جب ایک عورت ناچ چکتی ہے
ر دوا مجلس کے معمر آدمی کے اشارے پر اُسے پیسے کا حکم دیتا ہے اور
دوسری طوائف کو ناچنے پر مامور کرتا ہے۔ اس موقع پر یہ لازمی ہوتا
ہ کہ دُولہا اُس طوائف کو جو رقص کر چکتی ہے عطر، پان اور دھنیا، جو
دی کے برتنوں میں ہوتی ہے، پیش کرے۔ بعد ازاں ان برتنوں کو پھر
چیزوں سے بھر دیا جاتا ہے۔ تاکہ دُوسری بار کام آئیں۔ دولہا کے سوار
نے تک یہ ہنگامہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔

بعض گھروں میں یہ رسم ہے کہ دُولہا کو رات کے آخری وقت سوار
تے ہیں۔ قاعدہ کے مطابق پہلے اُسے غسل کرا کر، زر دوزی کا لباس
سہرا کے پراچہ کے گھر سے کرایہ پر آتا ہے، پہنائیں، اُس کے بعد اُس
کے سر سے سہرا لٹکاتے ہیں، گلے اور کاندھوں پر پھولوں کی بدھیاں
ڈالتے ہیں۔ بعد ازیں خاندان کے آئین کے مطابق ہاتھی یا گھوڑے پر
دُولہا کو سوار کر کے بڑے تجمل کے ساتھ یعنی آرائش روشنی، آتشبازی
اور ساز و نوبت اور روشن چوکی کے ساتھ دولہن کے گھر کے لئے روانہ
ہوتے ہیں۔ متذکرہ طوائفیں دُولہا کے پیچھے تختِ رواں پر کھڑے ہو کر
بدھائیں گاتی ہیں۔ دولہا کے گھوڑے یا ہاتھی کے آگے روشن چوکی
بجاتے ہیں۔ دوسرے تمام براتی گھوڑے یا ہاتھی کی سواری پر دُولہا کے
عقب میں ہوتے ہیں۔ اور جب برات دولہن کے دروازے پر پہنچ جاتی
ہے تو بعض لوگ وہاں دولہا کے لئے دروازہ بند کر دیتے ہیں اور جس
وقت تک دھنگانا، جو راجپوتوں کی رسم ہے، کا نیگ نہیں لے لیتے،
دروازہ نہیں کھولتے۔ مابعد دولہا کو مسند پر بٹھا دیتے ہیں اور رقص
شروع ہو جاتا ہے۔ اُس کے بعد اگر شبِ عروسی سے پہلے نکاح عمل میں
آگیا ہو تو دولہا کو حرم سرا میں طلب کیا جاتا ہے ورنہ نکاح کے بعد
بُلایا جاتا ہے اور وہی شربت جس کا ساچق کے ضمن میں ذکر آچکا ہے، پھر
شبِ عروسی کو براتیوں کو پلاتے ہیں۔ اگر نکاح پہلے ہو چکا تھا تو شربت
دوبارہ پلایا جاتا ہے۔ ہر دونوں یا تینوں بار تھالی میں زر نقد ڈالا جاتا
ہے۔ جب دولہا عورتوں کی مجلس میں جاتا ہے تو وہاں ایسی رسمیں ادا
ہوتی ہیں جن کے اظہار سے مردوں میں وہ شرماتا ہے۔ مثلاً رسموں میں
سے ایک رسم یہ ہے کہ بعضے گھروں میں دُولہا کے منہ میں لگام لگا کر لگام
دولہن کے ہاتھ میں دیدیتے ہیں، اور اکثر اس کو گھوڑے کی طرح کھڑا
کر کے اُس کی پیٹھ پر زین رکھتے ہیں اور دُولہن کو اُس پر سوار کرتے
ہیں تاکہ جس طرف کو وہ عنان گھمائے۔ دُولہا بھی اسی طرف کو گھومے۔
اس حرکت کی علت نمائی دولہن دولہا کا استحاد ہے، یعنی تمام عمر
ایک ایسے گھوڑے کی طرح جو اپنے سوار کا تابع ہوتا ہے، شوہر بھی
اپنی بیوی کا تابع رہے۔ کبھی یہ رسمیں صبح تک تمام ہو جاتی ہیں اور کبھی
دن نکلنے تک چلتی رہتی ہیں۔ اس کے بعد سٹھنیاں گائی جاتی ہیں جو فحش

---

لہ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مثنویات میر حسن دہلوی (نول کشور ۱۹۴۵ء) ص ۱۲۶-۱۲۷

سے بھری ہوتی ہیں۔ بعدازیں دولہا باہر آجاتا ہے اور دولہن کو پالکی میں سوار کرتے ہیں جس پر زربفت کا یا سادہ غلاف چڑھایا جاتا ہے۔ پھر اس شان وشوکت دھوم اور دھام سے جیسے گزشتہ رات برات آئی تھی صبح کو براتی رخصت ہوتے ہیں۔ تخت رواں بھی ہوتا ہے اور دولہن کا جہیز بھی۔

## جہیز

جہیز کا حال دولہن والوں کی حیثیت پر موقوف ہے۔ بعض لوگ ایک ہاتھی یا دو ہاتھی معہ نقرئی ہودج کے اور چار پانچ گھوڑے معہ سنہری روپہلی زین واسباب کے اور چند اونٹ جن پر عمدہ لباس اور برتن اور آفتابے، مٹکے، تانبے کے برتن اور چاندی کی ٹھلیاں عمدہ سامان سے بھرے ہوئے صندوق اور سونے چاندی کا چھپر کھٹ بھی جہیز میں دیتے ہیں۔ یہ رسم ہندوستان کے تمام باشندوں میں جاری ہے، کیا ہندو اور کیا مسلمان۔ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق داماد کو جہیز دیتا ہے۔ صرف کنبوہ جہیز نہیں دیتے اور عروس کے گھر ساچق بھی نہیں لاتے کیوں کہ یہ لوگ ان باتوں کو مکروہ سمجھتے ہیں۔

بہرحال شب وصل کو کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ عورتیں ساز کے ساتھ ترانہ تہنیت گاتی ہیں۔ صبح دولہن کے گھر چادر جانے کے بعد پنجیری تقسیم کی جاتی ہے یہ خوشی ماں باپ کے لئے اصل شادی سے زیادہ ہوتی ہے۔

## رسم چوتھا

شادی کے چوتھے دن دولہن دولہا کے ساتھ اپنے میکے جاتی ہے۔ اس موقع پر دونوں خاندانوں کی عورتیں وہاں جمع ہوتی ہیں اور فرط خوشی میں رنگ پاشی کرتی ہیں۔ بعدازیں پھولوں کے زیور معہ چند ٹوکریوں کے جن میں ہری ترکاریاں داماد کے گھر سے لے جاکر دولہا دولہن کو پہناتے ہیں اور فریق ثانی کے زن ومرد متفق ہوکر یہی پھل ترکاریاں داماد اور دولہن اور قبیلے کی عورتوں کو پھینک کر مارتی ہیں۔ یہی حرکت دولہن والیاں بھی کرتی ہیں۔ دولہا بھی زور زور سے پھل ترکاریاں پھینک پھینک کر مارتا ہے۔ چھوٹے بچوں اور دولہا کے چھوٹے بھائیوں کے سوا کوئی مرد وہاں بار نہیں پاتا۔ ترکاریوں کے علاوہ چوب گل یا باریک اور منقش زردوزی کا کام کئے سیاہ وسرخ لکڑی کے گولے یا زردوزی کی گیندیں بھی اس جنگ میں استعمال ہوتی ہیں۔ اکثر اس میں چوٹ چاٹ بھی لگ جا ہے۔ منہ سوج جاتے ہیں اور افغانوں میں تو بعض کی بینائی جاتی رہتی ہ

## نذر ونیاز کی رسمیں

ہندوستان کی عورتیں بعض اکابر صوفیہ کی نذر کا کھانا پکاتی اُن کو شکل کشا تصور کرتی ہیں۔ مثلاً سید جلال بخاری، بچوں کی سلام کے لئے چاول پکاکر مٹی کے برتن میں بھرتی ہیں اور دہی اور شکر اس ڈال کر شریف اور غربا، کو کھلاتی ہیں۔ سید احمد کبیر کی نذر کے گوشت کباب خود کھاتی ہیں اور دوسروں کو کھلاتی ہیں۔ بقیہ گوشت ابدالوں فروخت کیا جاتا ہے۔ یہ ابدال لوگ قربانی کے وقت کو ملے روز کرتے ہیں اور دہکتے انگاروں پر برہنہ ہوکر لوٹتے ہیں۔ یہاں تک کہ بجھ جاتی ہے اور ان کے جسم کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔ اس بنا لوگ ان کے کمال کا لوہا مانتے ہیں۔ یہ سب ان کی چالاکی اور پھرتی بنا پر ہے اور کوئی وجہ قرین قیاس نہیں۔

## نوکر پیشہ لوگوں کا حال

پیادے، جن کا کام امرا کے گھر کی حفاظت کرنا، آقا کی سو کے وقت ہم رکاب ہونا، اور نگہبانی کرنا ہے۔ شاگرد پیشہ خدمت گا دوسروں پر عزت اور شرافت میں ڈینگ مارتے ہیں مگر ان میں اور چوبداروں میں انیس بیس کا فرق ہوتا ہے۔ نسب کے اعتبار سے یہ ہو ہے کہ خدمت گار اور فراش، چوبداروں پر ترجیح رکھتے ہوں۔ خدمت یا فراش ہونا نجیب زادوں سے متصور ہے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شریف زادے اتی ہونے یا افلاس کے باعث خدمت گاری یا فرا کا کام کرنا قبول کرلیتے ہیں۔ پس اس گروہ میں جہاں دس رذیل ہیں ایسے بھی مل جاتے ہیں جو از روئے نسب شریف ہوں۔ اگرچہ حسب اعتبار سے سب برابر ہیں کیونکہ خدمت گار کو کوئی بھی اپنے ساتھ برتن میں کھانا نہیں کھلاتا اور کوئی بھی اُسے اپنے سامنے بیٹھنے کی نہیں دیتا۔ اس کے برعکس اگر شریف آدمی پھٹے پرانے لباس بادشاہ زادے، وزیرزادے، وزیروں اور امیروں کی محفل کے جہاں بھی جائے گا، اُسے بٹھایا جائے گا اور کھانا بھی ساتھ کھائے گا حسب ونسب دونوں اعتبار سے کمتر سمجھا جاتا ہے اور جسی اعتبار

ے صرف اتنا مرتبہ حاصل ہے کہ اگر وہ اپنے فن میں کامل ہے تو آقا کے سامنے
رے خدمت گاروں کے برابر ہوگا۔ کیوں کہ اس کو مجلس میں بیٹھنے اور
کے ساتھ دسترخوان پر کھانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ باورچی بھی
ت گاروں کے رتبے کو نہیں پہونچتا۔ اگرچہ اس فرقے میں بھی شرافتِ نسبی
تمال ہوتا ہے کیوں کہ اکثر امیرزادے اور شریف زادے باورچیوں
بت میں رہ کر کھانا پکانا سیکھ لیتے ہیں اور گردشِ افلاک کے انقلاب
ہاتھوں بے بس ہوکر اس فن کو ذریعہ معاش بنا لیتے ہیں اور رفتہ رفتہ
ہم پیشہ لوگوں میں قرابت کر لیتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی رکاب دار، باورچی
ابی، اور فیل بان بھی کمتر سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو سید
جاتا ہے۔ بعض افغان، شیخ اور مغل بھی خال خال ہیں۔ ان میں سے
ت مند فوج دار کہلاتا ہے اور دوسرے پیش خدمتوں کو چاکر کہا
ا ہے۔ چاہے وہ درحقیقت از روئے شرافت چاکروں سے بھی بدتر
سقہ، سائیس، دیگیں مانجنے والا، کہار، باورچی اور پالکی کے کہار
ب مسلمان ہیں۔ گویے ان فرقوں سے ناتہ داری نہیں کرتے ہیں۔
ں چہ گاؤں اور قصبوں کے لوگ اہل شہر کو شرافت میں اپنے برابر
ں گردانتے۔ شہری بھی بے مقدور اہلِ قصبہ کی شرافت کے باوجود
ے قرابت کرنا جائز نہیں سمجھتے کیوں کہ حسب میں وہ شہریوں سے
ہیں۔ دیہاتوں میں زیادہ معزز وہ آدمی سمجھا جاتا ہے جس کی زبان،
ں ڈھال اور لباس شہریوں کے مشابہ ہو اور اُن جیسا کھانا بھی
نا ہو۔

قصہ کوتاہ، قصبات میں شیخ و سید کی رشتہ داریاں، عربوں
قلید میں اور اصحابِ رسول کے اتباع میں ہوتی ہیں۔ اگرچہ ایران میں
لوگ جنہیں ہم ہندوستانی آقا و مرزا کہتے ہیں اور مغل سمجھتے ہیں،
انکہ دراصل وہ شیخ ہیں، لیکن ہندوستان میں شرفا قصبات کے
دیک شیخ کو لفظ شیخ سے اور سید کو لفظ میر سے یاد کرتے ہیں۔
ں شیخ اور سید کو لفظ میر یا مرزا نہیں کہتے۔ مرزا یا افغان چاہے
نا مرتبہ حاصل کر لیں لیکن اُن کی رشتہ داری شیخ یا سید کے گھرانے میں
نا ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ شہر میں مغل اور شیخ کے درمیان قرابت داری
اتی طور پر ہو جاتی ہے۔ کاشتکار کا شمار شرفا میں نہیں ہوتا۔

قصبے کے باشندوں کی شہریوں سے قرابت داری مشکل ہے وہ
تو سوائے چند قصبوں کے جہاں کے لوگوں سے اُن کی قدیمی قرابت
داریاں چلی آرہی ہیں، دوسرے قصبات میں بھی رشتہ نہیں کرتے بلکہ
اپنے قصبے میں بھی اُن کی رشتہ داریاں چند محلوں تک محدود ہوتی ہیں۔
ان محلوں کے علاوہ، دوسرے محلہ والوں سے بھی سروکار نہیں رکھتے۔
چاہے اس محلے کے لوگ شرافت و شخصیت میں اُن سے اُونچے ہی کیوں
نہ ہوں۔

## عورتوں کا احترام

قصبے کے لوگ خالہ، چچی، اور بڑی بھاوج کو ماں کے برابر سمجھتے
ہیں۔ وہ ہرگز بھتیجے، بھانجے یا دیور سے پردہ نہیں کرتیں، اور شوہر کے
فوت ہو جانے کے بعد ان میں سے کسی سے نکاح ثانی کر لینا بڑی
رسوائی کی بات ہوتی ہے۔ چھوٹی بھاوج کو بیٹی کی طرح سمجھا جاتا ہے۔
اور اُس سے نکاح کرنا اپنی رسم کے مطابق حرام سمجھتے ہیں۔

## قصبات میں قبر پرستی

ہر قصبے میں کسی نہ کسی صوفی کی قبر ضرور ہوتی ہے جو مخدوم صاحب
کہلاتے ہیں اور اس ولایت کے والی سمجھے جاتے ہیں اور وہاں کی آبادی
اُن کے قدموں کی برکت سے سمجھی جاتی ہے۔

## پیر اشرف سلونی [1]

ساٹھ سال کے لگ بھگ ہوئے کہ ایک بزرگ قصبہ سلون میں
گزرے ہیں۔ بعض لوگ اُنہیں سید سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ نانا کے
جانشین اور لے پالک تھے اس لئے خود کو شیخ ظاہر کرتے ہیں اور
اپنی سیادت کا اقرار نہیں کرتے ہیں۔ اس معاملے میں بہت بحثیں کرتے
ہیں۔ بہرکیف وہ چشتیہ فقیروں میں ایک بزرگ تھے۔

---

[1] شاہ پیر اشرف سلونی ابن شاہ پیر محمد مرید پیر کریم مانک پوری
کے پیرزادہ تھے۔ اُن کی وفات ۱۱۶۷ھ میں ہوئی تھی۔ شاہ اشرف
کریمی سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ مفتاح التواریخ۔ ۳۳۵، حضرت
سلون نام کے موضع میں آپ کا مزار ہے اور ۱۱۷۱ھ میں تعمیر ہوا تھا۔ ایضاً
ص ۳۳۹، شاہ پیر محمد پناہ سلونی ان کے بیٹے اور پیرزادہ تھے اُن کی وفات
۱۱۹۳ھ میں ہوئی تھی۔ ایضاً ص ۳۵۷ نیز ملاحظہ ہو۔ خزینۃ الاصفیاء ج اول ص ۴۸

## توہم پرستی :

ہندوستانی مسلمان توہم پرستی کے شکار ہیں۔ مثلاً بعض گھروں میں کنواری لڑکی کا ہونا مبارک نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح مربّہ اور اچار بھی مدت العمر دوست کے گھر سے یا بازار سے خرید کر کھاتے ہیں۔ گھر میں تیار نہیں کرتے علاوہ ازیں عورتوں کے عقیدہ کے مطابق یہ سات مرد مثلاً شیخ سندو وغیرہ اور سات عورتیں سب عورتوں کے معاملات بنانے اور بگاڑنے پر مختار ہیں وہ جس پر مہربان ہوں وہ ہمیشہ آرام اور خوشحالی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر عتاب نازل ہو تو وہ زندگی بھر علیل رہتا ہے۔ بلکہ شب و روز اس پر غشی طاری رہتی ہے۔ اُن کی مہربانی اور نامہربانی کا انحصار اُن کی نذر ادا کرنے پر ہے۔ اگر یہ کسی عورت کے سر پر آجائیں تو دوسری عورتیں شام سے صاف ستھرے مکان میں عمدہ فرش بچھا کر جمع ہو جاتی ہیں اور تمام رات گانا بجانا ہوتا ہے۔ ان سات مردوں کے نام یہ ہیں۔ شیخ سندو، زین خاں، ننھے میاں، صدر جہاں پہلوان، شاہ دریا اور شاہ سکندر اور سات عورتیں۔ لال پری، سبز پری، سیاہ پری، زرد پری، آسمان پری، دریا پری اور نور پری۔ ان میں سے ہر ایک باری باری عورتوں پر حلول کرتی ہیں۔ اس رات بھر کے جلسے کو بیٹھک کہتے ہیں۔ بعض نسوانی خصلت رکھنے والے مرد بھی ان چودہ مرد عورتوں میں سے کسی کو اپنے سر پر سوار کر لیتے ہیں۔ وہ اس دن کے لئے رنگین اور بھڑکیلے لباس اور زیور اور بقچہ رکھتے ہیں۔ مردوں میں شاہ دریا اور شاہ سکندر دوسروں سے بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ انہیں نوری شہزادہ کہا جاتا ہے۔ اُن کو سگا بھائی بتاتے ہیں اور پریاں اُن کی بہنیں ہیں۔ جو ایک ہی بطن سے ہیں۔ یہ عقیدہ عورتوں کے دل سے نکالنا محال ہے۔


### ہمارے ایجنٹ

۱۔ بک ایمپوریم سبزی باغ پٹنہ بہار
۲۔ مکتبہ جامعہ اُردو بازار جامع مسجد دہلی
۳۔ مکتبہ شرقیہ، ابراہیم پورہ، بھوپال


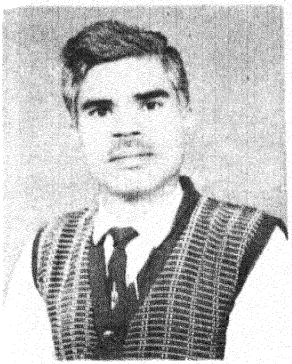

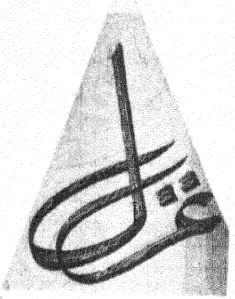


## مصوّر سبزواری

منزل ہے نہ منزل کا دُھواں دیکھتا کیا ہے
اے قافلۂ نوحہ گراں دیکھتا کیا ہے
بیگانہ صفت پھول سے چہروں سے گزر جا
یہ شہر ہے پتھر کا جہاں دیکھتا کیا ہے
چھو کر تو کبھی دیکھ مرے زخمِ جگر کو
طوفان کا ساحل سے سماں دیکھتا کیا ہے
اب خشک بگولوں میں سر ریگ رواں تو
ڈوبے ہوئے قدموں کے نشاں دیکھتا کیا ہے
شاید کسی غرقاب تمنا کی دعا ہو
اک شمع سرِ جوئے رواں دیکھتا کیا ہے
میں تیرا ہی ملبوس ہوں اے اجنبی سائے
تو مجھ کو بہ چشمِ دگراں دیکھتا کیا ہے
وہ غنچہ دہاں سرو قداں لوگ مصوّر
کوئی نہیں مڑ مڑ کے یہاں دیکھتا کیا ہے

# آدمی نامہ



کمار پاشی

میگھ دت کو ٹرین پر سوار کرانے کے بعد، میں اب اسٹیشن کے
طے سے باہر نکل آیا ہوں۔ میگھ دت میرا پُرانا دوست ہے۔ دو روز پہلے
میرے شہر میں مجھ سے ملنے آیا تھا۔ برسوں بعد ہم دونوں ملے تھے۔ ڈھیروں
تھیں، ڈھیروں سوال تھے اب جب کہ وہ پھر مجھ سے ایک نامعلوم
صے کے لئے بچھڑ گیا ہے لگتا ہے کتنی ہی باتیں تھیں جو میں اُس سے نہ کہہ
ا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی ٹرین میں بیٹھا میرے ہی بارے میں سوچ رہا
کا۔ نجانے کتنی اور باتیں ہوں گی جو وہ مجھ سے نہ کہہ سکا۔

میں اب اسٹیشن کے احاطے سے باہر نکل آیا ہوں۔ رات کا ایک
ہے۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہیں۔ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔
ئی کی بارشوں میں بھیگنا بھی ایک ننھی منھی عیاشی سے کم نہیں۔ یہی سوچ کر
رتی پر چھلچھلاتے پانیوں میں گھر کی طرف نکل پڑا ہوں۔ اسٹیشن سے میرا
ان دو فرلانگ سے زیادہ دُوری پر نہیں۔ ایک فرلانگ کا اُجاڑ علاقہ
کرنے کے بعد ایک فرلانگ لمبا بازار ہے جس کے آخری سرے پر
ب تنگ سی گلی میں مجھے مُڑ جانا ہے۔ دائیں طرف ایک چھوٹی سی حویلی
، جس کے باہر والا کمرہ میرا گھر ہے۔ جس کا نہ کوئی دالان ہے۔ نہ آنگن

بس ایک چھوٹا اُداس سا کمرہ ہے جس میں ایک چارپائی ہے۔ ایک میز،
ایک کُرسی۔ اِدھر اُدھر بکھری ہوئی کتابیں، رسالے، اخبار اور دیوار
پر فریم میں لگی ایک پینٹنگ۔ اور اب یہی چیزیں میری ذات کی پہچان بن
گئی ہیں۔ میگھ دت نے سچ کہا تھا:۔ یار! کتنا ہولناک ہے یہ
منظر . . . لگتا ہے تمہارے کمرے میں نہیں بلکہ خود تمہارے اندر بیٹھا
ہوں . . . . .

اسٹیشن کے باہر کا اُجاڑ علاقہ طے کرنے کے بعد اب میں
اپنے بازار سے گزر رہا ہوں۔ پانی اسی رفتار سے گر رہا ہے۔ ہر طرف
گہری خاموشی ہے۔ اور اندھیرا۔ بجلی چمکتی ہے تو بازار کے آخری سرے
تک لمحہ بھر کے لئے روشنی سی بہنے لگتی ہے۔ دونوں طرف کی دوکانیں
بند پڑی ہیں۔ چوکیدار سر پر بوری لپیٹے دکانوں کے تالے چیک کر رہا
ہے۔ دھرتی پر پھیلے پانی کو پاؤں سے اچھالتا ہوا میں آگے بڑھ رہا ہوں۔
بس چند دکانوں کے بعد مجھے دائیں طرف ایک گلی میں مُڑ جانا ہے۔
سر سے پاؤں تک بھیگ رہا ہوں۔ کپڑے جسم سے چپک گئے ہیں۔ سر
کے بالوں سے پانی کی بوندیں رینگ رینگ کر آنکھوں میں گر رہی

ہیں اور ایک عجیب سی ٹھنڈک میری روح میں اتر رہی ہے۔

گھنٹہ بھر پہلے میگھ دوت میرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ آنیوالی ایک نامعلوم عرصے کی جدائی کے دکھوں نے ہم دونوں کو اُداس کر دیا تھا۔ وہ بھی میری طرح بہت جذباتی ہے، کہہ رہا تھا، جاتے ہوئے تمہارا کمرہ ساتھ لئے جا رہا ہوں . . . جو مجھے کہیں بھی چین نہیں لینے دے گا . . . . میگھ دت کی بھرائی ہوئی آواز میرے ذہن کے گنبد میں بار بار گونج رہی ہے۔

میں اس شہر میں تین چار برس پہلے آیا تھا۔ یہاں کی پرانی عمارتیں دیکھنے۔ لیکن اس شہر کے سکون نے مجھے یہاں سے نکلنے نہیں دیا۔ اور اب تو کچھ ایسی بیڑیاں پڑ گئی ہیں پاؤں میں کہ کہیں اور بھاگ نہیں سکتا۔ شاید چاہنے پر بھی نہیں۔

پانی اسی تیزی سے دھرتی کو پیٹ رہا ہے۔ ہر طرف گہری خاموشی ہے اور اندھیرا۔ اچانک گلی میں مڑنے لگا ہوں تو چونک کر ایک دم رُک گیا ہوں۔ اپنے کمرے کے دروازے پر سائبان کے نیچے ایک سایہ نظر آیا ہے۔ خوف کی ایک لہر میرے سارے بدن کو چیرتی ہوئی نکل گئی ہے۔ میں جرأت کر کے آگے بڑھتا ہوں۔ گہرے اندھیروں میں بجلی پل بھر کے لئے چمکی ہے کوئی دروازے پر کھڑا ہے۔

"کون ہیں آپ ؟"

اب میں بالکل اس کے سامنے کھڑا ہوں۔ اگرچہ اندھیرے میں اُس کی شکل نہیں دیکھ پا رہا۔

"کون ہیں آپ ؟ — کیا چاہتے ہیں ؟"

پھر ایک آواز آتی ہے۔

"بھائی مسافر ہوں۔ بارش ہو رہی تھی۔ ذرا آپ کے چھجے کے نیچے رُک گیا . . . . "

میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں اور آگے بڑھ کر کمرے کا تالا کھولتا ہوں۔ "آئیے — اندر آجائیے — بارش تھمے تو چلے جائیے گا . . . "

وہ کچھ کہے بغیر میرے پیچھے ہو لیا ہے۔

چلتے وقت کمرے کی بتی جلتی چھوڑ گیا تھا۔ گہرے اندھیرے سے نکل کر بلب کی تیز روشنی نے آنکھیں چندھیا دی ہیں۔ اب ہم دونوں کمرے کے سُلگتے بلب کے نیچے کھڑے ہیں۔ ہمارے کپڑوں سے پانی پھسل پھسل کر فرش پر بکھر رہا ہے۔ روشنی میں میں نے ایک نظر اُسے دیکھا — ۲۵-۲۶ برس کا ایک دُبلا پتلا سا نوجوان ہے، کھلے رنگ کا تیکھے ناک نقشے والا . . . . میں جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگتا ہوں۔

"اگر چاہیں تو آپ بھی کپڑے بدل لیں، میں اس سے کہتا ہوں۔

اس نے شاید میری بات نہیں سُنی۔ غور سے کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھ رہا ہے۔

کہاں رہتے ہیں آپ ؟ میں پھر پوچھتا ہوں۔

"آوں . . . " وہ چونکتا ہے . . . "کہیں نہیں بس ازلی سا سمجھ لیجئے۔ شہر شہر گھومتا پھرتا ہوں۔ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے اسٹیشن پر گاڑی رُکی تو قلی سے پوچھا "کون سا اسٹیشن ہے ؟ اُس نے کہا: لال دیوار . . . . نام مجھے اچھا لگا . . . بس فوراً گاڑی سے اُتر پڑا۔ اب جو اسٹیشن سے نکلا تو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ شہر میرا دیکھا ہوا ہے۔ حالانکہ سچ پوچھئے تو میں یہاں پہلی بار آیا ہوں . . . لیکن حیرت ہے یہاں کی ہر چیز مجھے جانی پہچانی لگی . . . . بازار . . . گلیاں اور یہاں تک کہ آپ کا کمرہ بھی . . . .

میں نے اُس کی طرف غور سے دیکھا ہے۔ اُس کی باتیں کتنی عجیب ہیں۔ شاید پاگل ہے . . . سوچا پوچھوں — کہیں آپ پاگل خانے سے تو نہیں آرہے . . . لیکن چپ ہو گیا ہوں۔

وہ کہہ رہا ہے آپ کی گلی میں مڑا تو لگا اِدھر پہلے بھی آچکا ہوں . . . . ممکن ہے یہ میرا وہم ہو — لیکن —

اُس کی نظر اچانک دیوار پر اُٹھ گئی ہے۔

"یہ پینٹنگ آپ نے کہاں سے لی ؟"

"یہ میرے یہاں آنے سے پہلے ہی ٹنگی تھی ؟"

"آپ یہاں کب سے رہتے ہیں ؟"

مجھے غصہ آرہا ہے۔ عجیب احمق آدمی ہے۔ اس قسم کے سوالات کا اُسے کیا حق ہے۔

" آپ چائے پئیں گے ؟" میں بات کا رُخ بدلتا ہوں۔

" ہاں — پی لوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

" لیجئے، پہلے تولئے سے اپنا بھیگا ہوا سر پونچھ ڈالئے — اور ہاں اب بھی چاہیں تو کپڑے بدل سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

" شکریہ کہہ کر وہ تولئے سے اپنا سر پونچھنے لگا ہے۔ اس دوران نے کیتلی میں پانی ڈال کر اسٹوو پر رکھ دیا ہے۔ وہ اب بھی کرسی ا دیوار پر لگی پینٹنگ کو غور سے دیکھ رہا ہے۔

" بھائی صاحب! آپ نے بتایا نہیں، کب سے رہتے ہیں آپ ں ؟"

کتنی سادگی ہے اُس کی آواز میں

"یہی کوئی تین چار برس سے"

آپ یقین نہیں کریں گے لیکن یہ سچ ہے کہ بالکل ایسی ہی پینٹنگ ے ایک دوست نے بنائی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اُس کی بات سُن کر میں ایک دم چونک گیا ہوں۔

" کیا مطلب ؟"

مجھے لگتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ لفظ لفظ پر زور دے رہا ہے ۔ ۔ ۔ یہ پینٹنگ ہے جو میرے ایک مصور دوست سرشا نند نے میری ۲۲ سالگرہ پر مجھے تحفے میں دی تھی۔

اس کی بات سُن کر ایک عجیب سا خوف میرے بدن میں سرایت کرنے لگا ہے اگر آپ کو یقین نہ آئے تو دیکھ لیجئے، اس پر ایک نے میں اُس کا نام بھی لکھا ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔

میں فوراً آگے بڑھتا ہوں۔ پینٹنگ کے قریب جاکر دیکھتا ہوں کونے میں واقعی انگریزی حروف میں ایس نند لکھا ہے ۔ ۔ ۔

کیتلی میں پانی اُبل رہا ہے۔ دودھ اور شکر ملا کر میں چائے بنانے لگا ہوں، سوچ رہا ہوں آخر یہ کیا قصہ ہے ؟ کون ہو سکتا ہے یہ آدمی؟ آدھ گھنٹہ سے پہلے یہ یہاں رہتا ہوگا اور اب غالباً مجھے خوف زدہ کرنے کے لئے ۔ ۔ ۔ لیکن کیوں — ؟ کس لئے ؟

میرا خیال ہے مجھ سے پہلے آپ یہاں رہتے ہوں گے؟

چائے کی پیالی میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے وہ جواب دیتا ہے۔

" یہ کیسے ہو سکتا ہے بھائی صاحب! میں لال دیوار پہلی بار آیا ہوں اور اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں یہاں اس سے پہلے کبھی نہیں آیا — شاید میرا وہم مجھے ورغلا رہا ہے — اس شہر سے ذہنی رفاقت، ممکن ہے محض ایک اتفاق ہو — ممکن ہے —

اُسے اچانک کچھ یاد آتا ہے۔

"اس پینٹنگ کے پیچھے ایک ڈائری رکھی ہے —" کہتے ہوئے وہ اُچھلتا ہے اور پینٹنگ ہٹا کر پیچھے دیکھتا ہے، لیکن وہاں کچھ نہیں ہے وہ کچھ اُداس سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا ہے اور اب دھیرے دھیرے چائے کے گھونٹ بھر رہا ہے۔

لیکن میری حیرت اور بڑھ گئی ہے۔ خوف کی لہریں میرے سارے بدن میں سانپوں کی طرح رینگ رہی ہیں۔

شاید بارش تھم گئی ہے۔

اُس کی بات سُن کر میں اپنا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر محسوس کرتا ہوں۔ پانی گرنا بند ہو گیا ہے۔

اچھا میں چلتا ہوں

یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا ہے۔

میں حیران سا کرسی پر بیٹھا ہوں۔ میں نے اُس سے بہت بڑا جھوٹ بولا ہے۔ پینٹنگ کے پیچھے واقعی ایک ڈائری پڑی تھی۔ ابھی چند روز پہلے جب میں پینٹنگ کا فریم صاف کر رہا تھا تو وہ اچانک نیچے فرش پر آگری تھی — ایک پرانی بوسیدہ اوراق والی ڈائری ۔ ۔ ۔

میں نے اُسے اِدھر اُدھر سے کھولا تھا ۔ ۔ ۔ پڑھا کچھ نہیں ۔ ۔ ۔ بس کاغذوں میں پھینک دیا — وہ یقیناً اب بھی کاغذوں کے انبار میں پڑی ہوگی — میں جلدی جلدی اُسے تلاش کرنے لگتا ہوں — تمام رسالے — تمام اخبار اُلٹ پلٹ رہا ہوں — یہیں کہیں ہوگی — یقیناً ہوگی — کہاں جا سکتی ہے ؟ میں بے صبری سے اُسے تلاش کر رہا ہوں — الماری میں — چارپائی کے نیچے — بستر میں — اور اچانک

وہ مجھے مل گئی — میں نے جھک کر اُسے اُٹھا لیا ہے — اُس کے ورق جلدی جلدی اُلٹ رہا ہوں — دِل جیسے کانپ رہا ہے۔ نہ جانے یہ کیسا خوف ہے۔ جو میرے انگ انگ میں سما گیا ہے — پہلے صفحے پر چھوٹے مگر صاف حروف میں یہ چند سطریں درج ہیں۔

"مجھے یقین ہے: میں نے مسیح سے کہیں زیادہ مصائب جھیلے ہیں۔ میں اپنے اندر ایک ایسا دَرد محسوس کرتا ہوں جو مجھے خوف زدہ کر دیتا ہے۔ میری رُوح بیمار ہے — میرا ذہن نہیں — ہر وہ شخص جو یہ اوراق پڑھے گا دُکھی ہوگا میرا جسم نہیں بلکہ میری رُوح بیمار ہے —"

ورق اُلٹتا ہوں۔ دوسرے صفحے پر نظر گئی ہے تو میرا سر گھومنے لگا ہے۔ دُوسرے صفحے پر انتساب ہے جو میرے نام ہے، موٹے حروف میں صاف صاف میرا ہی نام لکھا ہے۔

میں دوڑ کر اُس آدمی کو آواز دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن اب تک وہ نجانے کہاں نکل گیا ہوگا۔

نجانے کون تھا؟

مجھے کیسے جانتا ہے؟

میرا اِس سے کیا رشتہ ہے؟

کیا رشتہ ہے اس کا مجھ سے؟

کمرے میں چاروں طرف خاموشی ہے۔ کتنا ہولناک سماں ہے۔ لگتا ہے میں اپنے کمرے میں نہیں بلکہ خود اپنے اندر بیٹھا ہوں اور لمحہ اپنے ہی وجود کی دیواروں تلے دبتا چلا جا رہا ہوں۔

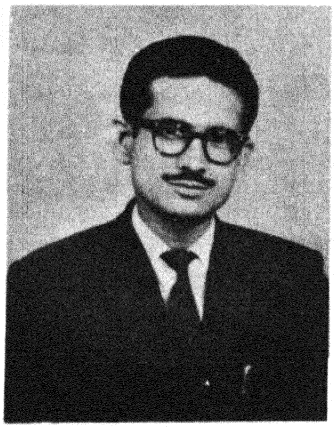

طلحہ رضوی برقؔ

عشق کیوں رُسوا ہو اپنا سر رہا ہے گا ہے
آپ اس طرح جو مِل جائیے گا ہے گا ہے

بے رُخی اہلِ محبت سے روا تم کو نہیں
صدقۂ حُسن سہی مجھ پہ نگا ہے گا ہے

دِل کو مژگاں کا تصوّر ہی بہت کام آیا
ڈوبتے کو ہے سہارا پر کا ہے گا ہے

یاد آتی ہے درازیٔ شبِ ظلمتِ غم
دیکھتا ہوں جو تری زلف سیا ہے گا ہے

آرزو ہے کہ ترے کوچے سے ہم بھی گزریں
پیرہن چاک بہ ایں حال تبا ہے گا ہے

زندگی ختم ہوئی بس اسی حسرت میں کہ وہ
مجھ کو پاس اپنے بلائے مجھے چاہے گا ہے

دل میں تصویر تمہاری نہ اتاروں تو کہو
پردۂ رُخ بھی اُٹھے جلوہ نما ہے گا ہے

برقؔ نمدیدہ ترا مستحق لطف ہوا
سنتے ہیں عرش کو جا لیتی ہے آہے گا ہے


## ہماری کتابیں

| | |
|---|---|
| گنجینۂ غالب | ۴ روپے ۵۰ پیسے |
| آئینۂ غالب | ۵ روپے |
| دو شہروں کی کہانی | ۵ روپے |

ملنے کا پتہ
بزنس مینجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ایم کوٹھیادی راہی

## ذرے خوابوں کا سفر

ک آنکھوں میں جھلک اٹھیں لہو کی جھیلیں
د چہرے پہ چمک اٹھا شفق کا غازہ
نے کس بیتی ہوئی شام کی پھر یاد آئی
ب اک کر کے ہر اک زخم ہوا پھر تازہ

نہ ہونٹوں پہ ٹپکنے لگی آنسو کی شراب
دنے شانوں پہ معطّر عنبریں زلفیں بکھریں
ر دلِ بیتے ہوئے لمحوں میں گم ہونے لگا
وگ میں ڈوبی ہوئی ساعتیں پھر دکھنے لگیں

وم کے زرد اجالے کے تلے شیشۂ زہر
یر سے دیکھ رہا ہے مرے ہونٹوں کی طرف
در میں دور خلاؤں میں اٹھائے ہوئے سر
واب بنتے ہوئے معصوم خیالوں کی طرف

وقت اب ہستیٔ ہجراں کا بہت ہی کم ہے
س گھڑی شہد کے مانند مجھے بھی سم ہے
ں سے پہلے کہ یہ شیشہ مرے ہونٹوں سے لگے
یری محبوب! مری تشنہ نظر میں آؤ
نی بھولی ہوئی اس رہ گزر میں آؤ
م سے کم آخری خوابوں کے سفر میں آؤ
وم رخصت خلشِ وعدۂ فردا نہ رہے!

## سخاوت شمیم

ڈاکٹر تو نے نیا روپ عطا کر کے مجھے
میری خاموش امنگوں کو زباں بخشی ہے
میرے افکار کی دنیا میں نہ تھی خود داری
ذہن اپنے ہی تصور سے ہوا تھا عاری
اپنی ہستی کا تصور جو کبھی آتا تھا
ایک نشتر سا رگِ جاں میں اتر جاتا تھا
بار بار اپنے ہی چہرے پہ نظر جاتی تھی
اور بگڑی ہوئی ہیئت پہ ٹھہر جاتی تھی
نقش کچھ زیر و زبر میرے ہوئے تھے ایسے
خالقِ کل نے بنایا ہو نمونہ جیسے
دیکھتا جب کوئی عبرت کی نظر سے مجھ کو
کوفت ہوتی مرے احساسِ بشر سے مجھ کو
تیری تجویز پہ مٹنے کا ارادہ لے کر
آخرش آئی ترے پاس تمنا لے کر
اک تمنا کہ جو موہوم سی لگتی تھی مجھے
ایک نعمت کہ جو محروم سی لگتی تھی مجھے
تو نے پھر جادو کیا عالم بے ہوشی میں
کیا سے کیا مجھ کو کیا عالم بے ہوشی میں
قابلِ قدر جراحت کا نتیجہ ہی کہوں
مجھ پہ اللہ کی رحمت کا نتیجہ ہی کہوں
سب سمجھنے لگے کچھ اپنی نظر میں مجھ کو
اہمیت ملنے لگی اپنے ہی گھر میں مجھ کو
کبھی خوش فہمیٔ بے حد مجھے ہو جاتی ہے
کبھی بدلی ہوئی حالت پہ ہنسی آتی ہے
دل میں اٹھتے ہیں کبھی چاہ کے ارمان بہت
الغرض ہو گئے اب جینے کے سامان بہت
میری خاموش امنگوں کو زباں بخشی ہے
ڈاکٹر تو نے نیا روپ عطا کر کے مجھے

پلاسٹک سرجری



احمد وصی

## سراغ

اک لمحہ کو سورج کی جانب دیکھا تھا
اور جب پلکوں کا دروازہ بند کیا تھا
آنکھوں کے آگے کچھ دھبے ناچ اٹھے تھے
دھندلے دھندلے سے کچھ سائے رینگ رہے تھے
میرے آگے پیچھے رنگین خاکے تھے
ان خاکوں میں ماضی کی تصویریں تھیں
مستقبل کے ہلکے ہلکے سپنے تھے
اور جب آنکھ کھلی تو کچھ بھی نہ تھا
پتہ چلا کہ وقت مقید ہے کرنوں میں
بھید کھلا کہ لمحے سورج کے قیدی ہیں

# محمد اجمل خاں

## عالم - ادیب - محقق

(۱۹۶۹ء - ۱۸۹۷ء)



اوصاف علی

شہر الہ آباد سے قریب ۳۰ میل دُور گنگا کے کنارے ایک جگہ کڑا مانک پور ہے۔ یہاں اب کھنڈر کے سوا کچھ نہیں ہے، لیکن تاریخ ہند کے طلبار جانتے ہیں کہ خلجیوں کے دَور میں یہ کتنا عظیم الشان شہر تھا۔ جلال الدین خلجی یہیں قتل ہوئے تھے اور یہیں دفن ہیں۔ چودھویں صدی کے وسط میں ابنِ بطوطہ یہاں وارد ہوئے تھے اور اُس کا ذکر اپنے سفرناموں میں یوں کیا ہے۔

"یہ علاقہ ہندوستان میں نہایت سرسبز اور زرخیز سمجھا جاتا ہے۔ گیہوں، چاول اور نیشکر وہاں بہ کثرت پیدا ہوتے ہیں۔ کپڑا بھی: ش قیمت تیار ہوتا ہے اور دہلی میں فروخت کے لئے آتا ہے۔"

شاید یہی شادابی و زرخیزی تھی جو محمد اجمل خاں صاحب کے اجداد کو کوئی تین سو برس پہلے افغانستان سے کھینچ کر کڑا مانک پور لے آئی اور وہ کڑا مانک پور کے سامنے گنگا پار اس جگہ آباد ہوئے جس کا نام اب گنتی ہے۔ اس نو وارد افغان خاندان کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا اور اس لحاظ سے وہ بہت ممتاز تھا، لیکن غالباً اب یہ پرسکون زندگی کی تلاش میں تھا اس لئے خاندان کے اکثر افراد زراعت میں لگ گئے اور صرف چند نے فوج اور میں جانا پسند کیا۔ ۱۸۲۱ء میں جب سید احمد بریلوی رم گنتی پہونچے آصف خاں رسالدار کے یہاں کیا یعنی جو محمد اجمل خاں صاحب کے نھے۔ اس تاریخی واقعہ نے اس خاندان کو ممتاز سے ممتاز تر کر د خاں صاحب اس خاندان کے ممتاز ترین فرد ہوئے ہیں۔ وہ گنتی ۲ر فروری ۱۸۹۶ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم الہ آباد میں ہوئی کے والد اسماعیل خاں ابنِ الہ داد خاں نے انہیں شملہ بھیج تعلیم محمد اجمل خاں صاحب نے لکھنؤ میں اور پھر علی گڑھ مسلم میں حاصل کی اور عالم و ادیب ہوئے۔

محمد اجمل خاں صاحب سے پہلی ہی ملاقات میں یہ بات ہو جاتی کہ اُن کا تعلق ایسے خاندان سے ہے جس کا آبائی پیشہ سپہ تعلیم ہی کے دوران میں انہوں نے سیاسی میدان میں

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید۔ صفحہ ۱۹۵

یا تھا ۲۲ برس کی عمر میں وہ خلافت کمیٹی الہ آباد کے سیکریٹری مقرر ہوئے
دو سال بعد ۱۹۲۳ء میں کانگریس کمیٹی کے سیکریٹری ہوتے ہی وہ چرخے
لائے اور گھر والوں کو دینا چاہا لیکن گھر والوں نے انھیں سر پھرا سمجھ کر
لینے سے انکار کر دیا۔ جب بہت دن تک محمد اجمل خاں صاحب نے
بیچا نہ چھوڑا اور چرخے کی صفات میں مدلل سخنیں اور دل کش تقریریں
گئے، تو گھر والوں نے چرخہ چلانا شروع کر دیا۔ ابتداً محمد اجمل خاں
ب گھر کے کاتے ہوئے سوت ہی سے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے کھدر
ستعمال انہوں نے آخری دم تک جاری رکھا کیوں کہ اُن کا عقیدہ
ہندوستان کے لوگوں کی بے روزگاری دُور کرنے میں چرخے کا استعمال
حد تک مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

۱۹۲۸ء میں محمد اجمل خاں صاحب کو الہ آباد یونی ورسٹی میں عربی و
سی لکچرر کی جگہ مل گئی۔ وہ اس جگہ پر صرف دو سال تک فائز رہے لیکن
دو سال کے عرصہ میں انہوں نے اپنے علم کا ایسا سکہ بٹھایا کہ یونیورسٹی
ے محمد اجمل خاں صاحب کو آج تک یاد کرتے ہیں۔ یونی ورسٹی چھوڑ کر
ں نے میرے والد سید فصاحت علی کے ساتھ وکالت شروع کی لیکن
یشہ اُنہیں راس نہ آیا اور وہ ۱۹۳۵ء میں الہ آباد چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے
ں رابندر ناتھ ٹیگور نے ان کی بڑی قدر کی اور اُن کو شانتی نکیتن میں
رج اسکالر مقرر کیا۔ وہاں بھی وہ دو ہی برس رہے اور ۱۹۳۷ء میں
کی بے چین اور انقلابی طبیعت انہیں مولانا ابوالکلام آزاد کی دائمی
قت نہیں لے آئی۔ وہ مولانا آزاد کے پرائیوٹ سکریٹری ہو گئے اور
لانا آزاد کی ۱۹۵۸ء میں وفات تک اُن کے ساتھ رہے۔ اُن کو مولانا
د سے بڑی عقیدت تھی اور مولانا کو محمد اجمل خاں پر بڑا اعتماد تھا۔ اپنی
ارت کے زمانے میں مولانا قریب قریب تمام دفتری کاغذات
ر اجمل خاں کے سپرد کر دیتے تھے اور اُن کی رائے سے عام طور سے اتفاق
تے تھے۔ اسی طرح مولانا آزاد نے بہت سے اہم فیصلے ان کے مشورے
ے کئے۔ مولانا آزاد کو معلوم تھا کہ محمد اجمل خاں صاحب اُردو، فارسی اور
بی ادب پر اچھی نظر رکھتے ہیں اور امورِ اسلامی سے بخوبی واقف ہیں اسی
ے مولانا ان بے شمار غیر سرکاری خطوط کو بھی جو اُنہیں روز موصول ہوتے تھے
ر جن میں طرح طرح کے سوال اٹھائے جاتے تھے، محمد اجمل خاں صاحب
کے سپرد کر دیتے تھے اور وہ اُن کے جواب دے دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ
ہے کہ جو کتاب محمد اجمل خاں صاحب نے مولانا آزاد کے نام ادبی خطوط
وجوابات آزاد کے نام سے شائع کی، ان میں مولانا کے جواب خال خال
نظر آئیں گے۔ بیشتر خطوں کے جواب محمد اجمل خاں صاحب کی طرف سے
ہیں۔

مولانا آزاد کے انتقال کے بعد محمد اجمل خاں صاحب ۱۹۵۸ء میں مولانا
کے قائم کردہ انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز میں بہ حیثیت او۔ ایس۔ ڈی
آگئے اور دوسرے کاموں کے علاوہ کاؤنسل کے سہ ماہی عربی مجلہ ثقافت الہند
کے مدیر ہوئے۔ کاؤنسل سے علیحدہ ہوتے ہی انہیں ۲۱ مارچ ۱۹۶۴ء کو
راجیہ سبھا کا ممبر نامزد کیا گیا۔ وہ جس وقت مرے پارلیامنٹ کے ممبر تھے۔

اُنہوں نے طویل علالت کے بعد ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو صبح ۵ بجے انتقال
کیا اور اُن کی وصیت کے مطابق انہیں بستی نظام الدین نئی دہلی میں غالب اکیڈمی
کے سامنے آصف علی مرحوم کی آرام گاہ کے برابر اُسی دن چار بجے شام کو دفن
کر دیا گیا۔

## تصنیفات

محمد اجمل خاں کی اہم تصنیفات و تالیفات یہ ہیں:

۱۔ مسیامت:۔ یہ محمد اجمل خاں صاحب کی سب سے پہلی تصنیف ہے جو
۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے متعلق اُنہوں نے دیباچہ



محمد اجمل خاں

میں لکھا ہے۔

"نہ تو یہ کسی کتاب کا ترجمہ ہے اور نہ کسی ایک مدبر کے اصول کو مان کر سلسلۂ مضامین قائم کیا گیا ہے بلکہ بجائے مذہب اور ملک کے عالم گیر اخوت انسانی کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

۲۔ حیات ارسطو ۳۔ حیاتِ امیر خسرو ۴۔ خواجہ چشتی اجمیری
۵۔ حیات مخدوم صابر کلیری ۶۔ آزادی کے اصول۔ یہ میک سوینی (MANSWINY) کی انگریزی کتاب PRINCIPLES OF FREEDOM. کا ترجمہ ہے جو ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔

۷۔ "بھگوت گیتا"۔ یہ اُردو ترجمہ ہے جو ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔

۸۔ "بھگوت گیتا"۔ یہ فارسی ترجمہ ہے جو ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔

۹۔ "پس منظر اسلام"۔ یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔

۱۰۔ "مختصر سیرت سیدنا محمد صلعم"۔ یہ ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔

۱۱۔ "ترتیب نزول قرآن کریم"۔

۱۲۔ "سیرت قرانیہ رسُولِ عربی"۔ یہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔

۱۳۔ "بنیادی ہندوستان"۔ یہ کتاب چار حصّوں میں ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۲ء کے درمیان شائع ہوئی۔

۱۴۔ "جپ جی صاحب یعنی ذکرِ الٰہی اُردو ترجمہ مع مختصر حالات باباگرونانک"۔ یہ ترجمہ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ سرورق پر یہ دلچسپ عبارت ہے۔

"پانسو جلدیں تحفتاً پاکستان کے اہلِ دل حضرات کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۵۔ عنوانِ انقلاب ۱۶۔ پیمانِ انقلاب
۱۷۔ مشکلاتِ قرآن کا انقلابی حل
۱۸۔ HINDI WORDS COMMON TO OTHER INDIAN LANGUAGES

محمد اجمل خاں کی یہ تالیف گیارہ حصّوں میں ہے اور ۱۹۵۴ء اور ۱۹۶۷ء کے درمیان شائع ہوئی۔

۱۹۔ مولانا آزاد کے نام ادبی خطوط و جوابات آزاد

۲۰۔ مراثی اقوام عالم (زیرِ طبع) اس کتاب کا مسودہ محمد اجمل خاں صاحب نے مرنے سے کچھ عرصہ پہلے کاتب کے حوالے کر دیا تھا۔

۲۱۔ سفر نامۂ حج (غیر مطبوعہ) یہ سفر ۱۹۳۵ء میں ہوا۔ مولانا عبید اللہ سندھی محمد اجمل خاں صاحب کے ساتھ تھے۔ اس لئے مولانا سندھی کے متعلق سی دلچسپ باتیں اس سفر نامہ میں ہیں۔

۲۲۔ A SHORT BIOGRAPHY OF MOHAMMAD (غیر مطبوعہ)

۲۳۔ سیرت محمد رسول اللہ مع القران (مع اُردو ترجمہ قرآن) (غیر مطبو
اس کتاب کو محمد اجمل خاں صاحب اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے اس
کتاب کی خوبی یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے حالات تاریخ وار
کے ساتھ ساتھ پورا قرآن بہ ترتیب تنزیل اس میں نقل کر دیا گیا۔
جس سے قرآنِ کریم کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے مانِ کتابوں
محمد اجمل خاں صاحب نے متعدد رسالے اور لاتعداد مضامین مختلف
و فنون پر لکھے۔ بعض مضامین خصوصاً اسلام پر اتنے تحقیقی ہیں اور
دقتِ نظر سے لکھے گئے ہیں کہ محققین انھیں بطور سند پیش کرتے ہیں۔
اُن کا وہ مضمون جو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے
اسٹڈیز اِن اسلام میں اکتوبر ۱۹۶۴ء میں INQUIRY INTO THE EARLIEST COLLECTION OF THE QURAN کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

محمد اجمل خاں صاحب اونچے پایہ کے عالم اور ادیب تھے۔ صاحب
نثر نگار تھے۔ شاعر تھے۔ اُن سے اسلام پر بحث کرنے میں بڑے بڑے علما
گھبراتے تھے۔ قرآن کا جتنا گہرا مطالعہ اُن کا تھا کم لوگوں کا ہوگا۔ عہدِ جاہلیہ
ابتدائی تاریخ اسلام پر بڑی اچھی نظر تھی۔ کثرت مطالعہ کے شوق میں
نے اپنی جائداد بیچ کر گھر کتابوں سے بھر لیا۔ اُن کا یہ بے مثل کتب خا
میں نذرِ آتش ہو گیا۔ علمی تحقیق و تفتیش سے اس قدر دلچسپی تھی کہ جب ش
جواہر لال نہرو نے ۱۹۴۶ء میں اُن سے قونسل بن کر سعودی عرب جانے
کہا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر مولانا آزاد کے ساتھ پیرس جانے کا موقع
آیا تو انہوں نے اپنی تحقیقات اور تصنیفات کی تکمیل کی خاطر دہلی ہی ٹھہرنا ہی
کیا۔ قرآن شریف کی ایک آیت سمجھنے کے لئے تہنیت پر تحقیق شروع کی تو
مہینے تک تحقیق کرتے رہ گئے اور ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں کی
مذہبی کتابیں اور مختلف انسائیکلو پیڈیا کی جلدیں چھان ڈالیں۔ دن

کا غائر مطالعہ کرتے اور کتاب چاہے اُن کی ہو یا دوسرے کی اُسے نشان
گا کر سُرخ و سیاہ کر دیتے۔ اُردو، فارسی، عربی کے ہزاروں شعر اُنہیں یاد
ور ہندی کے سینکڑوں دوہے جو وہ موقع بہ موقع سُناتے رہتے تھے۔
زبان پر اُنہیں بڑی قدرت تھی۔ وہ ایک خاص اسلوبِ نگارش رکھتے
لیکن دُوسرے ادیبوں کی طرز میں بہ آسانی لکھ لیتے تھے۔ بنا بر خاطرِ مقدمہ
مولانا آزاد کی لے کے ساتھ لے ملا دی، اور بہت سے لوگ آج بھی
غا لطے میں ہیں کہ مقدمہ محمد اجمل خاں نے نہیں مولانا آزاد ہی نے لکھا ہے۔

نثر و نظم میں لطیف فرق وہی بیان کر سکتا ہے جو دونوں پر
رکھتا ہو۔ محمد اجمل خاں صاحب انشاء پرداز بھی تھے اور سخن فہم اور
ن گو بھی۔ انہوں نے اپنے تعلیم کے زمانے میں بہت سی نزلیں اور
کہی تھیں۔ اُن کی نزلیں سُنکر اکبر الہ آبادی نے خود داد دی تھی اور
ہ دیا تھا کہ نزل کی جگہ غزل کہا کرو۔ محمد اجمل خاں صاحب کی ایک غزل
انہوں نے ۱۹۱۶ء میں کہی تھی دو شعر یہ ہیں۔

رنگ لایا ہے یہ ضبطِ اُلفت گیسوئے دوست
آخر اپنے پیرہن سے پھوٹ نکلی بوئے دوست
تھک کے جب بیٹھے تو یہ کہہ کر تلاشِ یار میں
اے دلِ حسرت زدہ وہ سامنے ہے کوئے دوست

خاں صاحب کی گفتگو بڑی دلچسپ ہوتی تھی۔ اُن کے تیور ہر آن بدلتے
تھے۔ آواز کا اُتار چڑھاؤ بڑا دلِ فریب ہوتا تھا۔ بحث کرتے تو
، فلسفہ، سائینس، ادب سب کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتے، لیکن اُن
کا پورا لُطف وہی اُٹھا سکتا تھا جسے معلوم ہوتا کہ اُن کی ڈراؤنی آنکھوں
ے نہایت نرم دل ہے۔ وہ بڑی محبت والے آدمی تھے اپنے مخالفوں
انہوں نے کبھی نفرت نہیں کی۔

ایک بار مجھے پتہ چلا کہ محمد اجمل خاں صاحب بھنگی کالونی کے بچوں
تھ کھڑے بندر کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ وہ مجھ
لنے آئے تو میں نے اُس کے متعلق دریافت کیا۔ فرمایا کہ یہ غریب بچے
الے کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے اُن کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ
کراتے۔ میں نے ایک روپیہ خرچ کر کے اتنے بہت سے بچوں کا دل
کیا۔ ایک دفعہ ایک غریب بچے کو پھنسیوں میں مبتلا دیکھا اُن سے رہا

نہ گیا۔ اسپتال جا کر مرہم لے آئے اور بچے کو دے کر اُس کے لگانے کی ترکیب
دیر تک بتاتے رہے۔ اگر اُنہیں اخگر مراد آبادی کا یہ شعر حد درجہ پسند تھا تو ظاہر
ہے اسی لئے کہ ان میں جذبہ ترحم کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

ے وہ دل جو بے کسوں کے شعلۂ غم میں پگھلتے ہیں
چراغِ کعبہ ہیں اللہ کے گھر میں وہ جلتے ہیں

خدا محمد اجمل خاں مرحوم کو اُن کی رحم دلی کا صلہ دے۔

## سیف سہسرامی

کچھ دیر اور عنبریں سانسوں کی باس دے
ہونٹوں کو میرے اپنے لبوں کی مٹھاس دے

مِل جائے گی نظر کو بصیرت کی آب بھی
پہلے تو اپنے جسم کو کوئی لباس دے

مغرور ہو نہ جاؤں سخاوت سے میں تری
دستِ طلب بڑھاؤں تو خالی گلاس دے

منظور تیرا طرزِ تغافل مجھے مگر!
ہے شرط کہ زباں کو وہ التماس دے

مرجاؤں میں خوشی سے اگر، دفن کے لئے
وہ تھوڑی سی جگہ بھی مجھے گھر کے پاس دے

سچ پوچھئے تو آج کا فن کار ہے وہی
جو فکر و فن کو سیف نیا اک لباس دے

اڑیا کہانی

# آپ بیتی

سچی راوت رائے

**نیلامبر** بابو ایک ٹی پارٹی میں شرکت کے بعد گھر لوٹ رہے تھے۔ بھونیشور سے کٹک زیادہ دُور نہیں ہے صرف بیس میل یعنی تقریباً آدھ گھنٹے کا فاصلہ ہے۔ پھر بھی اُن کا دل اُکتاہٹ سے بھر گیا ۔ راستہ ہے کہ ختم نہیں ہو رہا ہے۔ وہ سوچ رہے تھے ۔ آج کی یہ بھیگی شام فضول مباحثوں کے بجائے کٹک میں اپنے گھر پر بیٹھے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے گزار دی جاتی تو بہتر تھا۔ بے کار بحثیں! مغربی بنگال کے اکثر وزیر اعلیٰ مجرّد کیوں ہیں، اُڑیسہ کی نئی وزارت کی پالیسی کیا ہے، اس نئی وزارت میں گرام سیویکاؤں کا مستقبل کیا ہے، اُن تمام غیر اہم باتوں میں حصّہ لینے کی اُن کی بالکل خواہش نہیں تھی۔ اس کے باوجود، اُن کو تین گھنٹوں تک وہاں بیٹھے رہنا پڑا تھا۔

راستہ بارش کی وجہ سے صاف ستھرا اور چکنا معلوم ہوتا ہے۔ اب بھی پھوار پڑ رہی ہے۔ بھیگے پودوں اور دھان کے کھیتوں پر کار کی روشنی پڑنے پر معلوم ہو رہا تھا جیسے ابرق بکھرا ہوا پڑا ہے۔ ایک پھڑپھڑاتا ہوا اُلّو ایک درخت سے دُوسرے درخت کو اُڑ گیا۔ ایک لومڑی بھی راستے کے ادھر سے اُدھر ہو گئی۔ البتہ دائیں سے بائیں کی طرف۔ نیلامبر بابو اِن سب سے بے تعلق ہیں، ایسی بات نہیں بلکہ اِن سب پر غور کرنے کا موقع نہیں ہے وہ تیزی سے کار چلا رہے ہیں۔

سب سے زیادہ بوریت محسوس ہوتی ہے لیول کراسنگ کے نزدیک ک
پہونچ کر بھی نہ پہونچنے کی طرح معلوم ہوتا ہے وہ اپنی جبیں سے پسینہ ا
لگے۔

لیول کراسنگ پار ہو کر بخشی بازار پہونچتے وقت رات کے سا
دس بج رہے تھے۔ تقریباً تمام دکانیں بند ہو گئی ہیں۔ ایک دو دکانیں
ہیں، وہ اب بند ہونے جا رہی ہیں۔ بتی کے کھمبے تقریباً اندھیرے ہیں
خیال آیا کہ ایک اخبار لینے چلیں، کیونکہ ممکن ہے اُن کے نوکر نے آج
نہ خریدا ہو۔ انہوں نے ایک ہاکر کو بُلایا۔ اخبار لے کر پہلے صفحے پر نظر
ہوئے اپنی جیب ٹٹولنے لگے۔ ایک چوّنی نکل آئی۔ اُنہوں نے ہاکر
پر پچیس پیسے کا سکّہ رکھ دیا۔ بارہ پیسے رکھ کر اُسے تیرہ پیسے واپس کر
لیکن ہاکر نے اُنہیں صرف بارہ پیسے واپس کئے ایک دس پیسے کا سکّہ
پیسے کا ریزہ۔ نیلامبر بابو حسبِ عادت بے توجہی سے تمام پیسے جیب میں
جا رہے تھے۔ لیکن اُنہیں اچانک خیال آیا، پیسہ دیکھ لینا چاہئے۔ ہاکر اُس
سائیکل سے دس بارہ گز آگے چلا گیا تھا۔ نیلامبر بابو اُسے پیچھے سے بُلا
اُس کو ایک پیسے کی کمی کے بارے میں اطلاع دی۔ ہاکر نے جواب دیا
کے پاس ایک پیسہ یا تین پیسہ والا سکّہ نہیں ہے اس لئے وہ مجبور ہے
بابو کو خیال آیا کہ اُن کا نوکر ہر روز اُن سے یہی شکایت کرتا ہوا آیا

ی طرح ایک ایک پیسہ زیادہ لیتے ہیں اور اس سے نیلامبر بابو کا کافی نقصان ہے۔ وہ اپنے نوکر کی باتوں پر شک کر رہے تھے لیکن آج اُن کا شک دُور

انھوں نے فرض کر لیا کہ یہ ایک قسم کی سوچی سمجھی منظم سازش ہے۔ ایک ایک پیسہ زیادہ لینے کا طریقہ ہے۔ وہ زور سے چلانے لگے ضرور ایک پیسہ دینا ہوگا لیکن ہاکر اپنی جیب سے تمام پیسے نکال رکھتے ہوئے دکھانے لگا کہ اُس کے پاس تین پیسے یا ایک پیسے کا نہیں ہے لیکن نیلامبر بابو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اُن کا کہنا اس نے پہلے سے ریزگاری کیوں نہیں رکھی۔ ایسا اس نے قصداً کیا ہے اپنی جیب سے مٹھی بھر ریزگاری نکال کر بارہ پیسے ڈھونڈنے لگے۔ لیکن کوشش میں اُنہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ یا تو دس پیسے یا پانچ پیسے سامنے تھے۔ اُنہوں نے چراغ پا ہو کر ہاکر کو چار سو بیس ٹھگ وغیرہ کہہ کر اخبار دینے کا فیصلہ کیا کیونکہ اُن کی رائے میں اس طرح کے منظم فریب کے سر جھکانا کسی قوم پرست کے لئے مناسب نہیں۔ اس سے ملک میں زی روز بروز بڑھنے لگی ہے۔ اُنہوں نے ہاکر کے ہاتھ سے پچیس سکہ واپس لے کر تیزی سے کار چھوڑ دی۔

کچھ دُور جانے پر اُنہیں ایک اور ہاکر ملا۔ یہ لڑکا نہیں تھا بلکہ کٹکی نما، پینٹ اور ہوائی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ نیلامبر بابو نے گاڑی روک کر اس سے اخبار طلب کیا۔ اخبار لے کر جیب سے تمام پیسے نکال کر اس کا معائنہ کرنے لگے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ پندرہ پیسے سے کم اور سے زیادہ کا اُن کے پاس کوئی سکہ نہیں ہے۔ اُنہوں نے ہاکر کی لیے دس پیسے اور ایک پانچ پیسے کا سکہ بڑھا دیا۔ لیکن ہاکر نے واپس نہ کر کے صرف دو پیسے واپس کر دیئے۔ اس نے لاپروائی سے اس کے پاس چھوٹا سکہ نہیں ہے نیلامبر بابو کا خون کھولنے لگا۔ یہ سب ہی زمرہ میں شامل ہیں۔ سب لوگوں نے منظم طور پر ٹھگنے کا منصوبہ بنایا اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ سامنے گھر نظر ۔ اس لئے یہ ہے آج کا آخری ہاکر، کسی اور ہاکر کے ملنے کا امکان نہیں۔ بابو نے سوچا، ایک پیسے کا نقصان ہو تو ہو، وہ بالآخر اخبار خرید لیکن اُن کی وطن دوستی سدِ راہ ثابت ہوئی۔ سب لوگ اگر اسی طرح ناانصافی کو برداشت کرتے رہیں گے تو ملک سے دھوکا اور فریب دُور کیسے ہو سکے گا؟

اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں ڈھیل دینے کی وجہ سے فریب بادل کی دیوار کی طرح آسمان کو چھونے لگا ہے۔ سارا ملک تباہ ہونے پر ہے۔ اُن کو یاد آیا کہ ناانصافی کرنے والا اور ناانصافی کو سہنے والا — دونوں خدا کے آگے یکساں طور پر گنہگار ہیں۔ اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ اس ناانصافی کے خلاف آواز اُٹھنی چاہئے۔ سارے ملک میں کم از کم ایک شخص کو اُس کے خلاف آواز اُٹھانا چاہئے اور وہ شخص ہے ان کی اپنی ذات یعنی خود نیلامبر داس۔

چاہے وہ ایک پیسہ ہو، لیکن وہ اُسے نہیں چھوڑیں گے۔ ہر روز ایک پیسے کے حساب سے مہینہ بھر میں اُن کا تیس پیسے کا نقصان ہوتا ہے۔ چور بازاری ملک بھر میں جڑ پکڑ چکی ہے۔ نہیں، نہیں، اس کا مقابلہ ضرور کرنا ہوگا۔ حالانکہ یہ صرف ایک پیسے کی بات ہے لیکن اس کے پسِ پردہ بہت بڑا اصول پنہاں ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ اس اصول کے تحفظ کی خاطر جان بھی دینے کو تیار ہیں۔ اُن کو پندرہ سال پہلے کلکتہ کے ٹرام کی ہڑتال کے بارے میں یاد آگیا۔ ٹرام کی کمپنی کے صرف ایک پیسہ کرایہ بڑھا دینے کی وجہ سے یہ ہڑتال مہینہ بھر تک چلتی رہی۔ کتنے جلوس نکالے گئے۔ آخر کار کتنی بار گولیاں چلیں۔ کئی لوگ شہید ہوئے۔ اُنہوں نے خود اُن لوگوں کی یادگار میں کئی مرتبہ پُرجوش تقریریں کی ہیں۔ کتنی نظمیں کہی ہیں۔

آج وہ اس ناانصافی کو کیسے سہہ جائیں گے۔ نیلامبر بابو ایام جوانی میں قوم پرست تھے۔ وہ کسی سیاسی پارٹی کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔ کئی جلسوں میں تقریریں کی ہیں۔ کئی بار ہڑتال میں بھی رہنمائی کی ہے۔ اب وہ یہ سب کام چھوڑ کر تجارت میں مصروف ہیں لیکن قوم پرستی اور وطن دوستی کا جذبہ اب بھی اُن کے دل میں موجزن ہے۔ ان کو محسوس ہوا جیسے باپو جی کی طرح ساری قوم کا غم اُن پر سوار ہے۔ ان کی طرح کا ایک خادمِ وطن۔ چور بازاری کی ہمت افزائی کرنا بہت بُری بات ہے۔ صرف بُری ہی نہیں بلکہ بہت بڑا جرم بھی ہے۔

اُنہوں نے زور سے کہا کہ ایک پیسہ ضرور دینا ہوگا۔ ہاکر نے بھی زور سے جواب دیا کہ اس کے پاس ریزہ نہیں ہے اور وہ اخبار واپس

کردیں۔ نیلامبر بابو اس پر الزام لگانے لگے کہ وہ جان بوجھ کر پیسے اپنے پاس رکھ کر دھوکا دے رہا ہے۔ ہاکر نے اپنی پینٹ کی جیب سے سب ریزہ نکال کر رکھ دیا کہ اُس میں تین پیسے کے سکے کی عدم موجودگی چلا چلا کر پکار رہی تھی۔ نیلامبر بابو نے اپنی قمیض کی جیب سے تمام ریزے نکال کر ہتھیلی پر بکھرا کر دیکھا کہ دو پیسے کا سکہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ نیلامبر بابو نے الزام لگایا کہ اگر سکہ نہیں ہے تو اسے رکھنا چاہئے تھا ہاکر نے جواب دیا کہ وہ بینک نہیں ہے۔ بحث مباحثہ سے بات گالی گلوچ تک پہونچی۔ نیلامبر بابو اُسے نالائق بدمعاش جیسے الفاظ سے نوازنے لگے۔ ہاکر نے بھی جواب دیا کہ مجھے جو شخص جو کچھ کہتا ہے وہ خود وہی ہے۔ آخر میں نیلامبر بابو کے ہاتھ سے اخبار چھین کر پیسہ واپس کر کے وہ سائیکل پر چڑھ کر آگے بڑھ گیا۔ کچھ دور جا کر کہنے لگا۔ بڑے آئے اخبار پڑھنے والے، زندگی بھر میں انہوں نے کبھی اخبار پڑھا تھا۔

نیلامبر بابو اس توہین کے لئے تیار نہیں تھے۔ یہ جملہ ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ اگر وہ یہ آخری جملہ زبان پر نہ لا کر چلا گیا ہوتا، تو گویا ان کی جیت ہوتی اور وہ اس جیت پر فخر محسوس کرتے۔ انہوں نے اپنی کار سے اس ہاکر کا پیچھا کیا۔

کچھ دور جا کر انہوں نے دیکھا کہ ہاکر کھڑا ہو کر سائیکل کی بتی روشن کر رہا ہے۔ نیلامبر بابو اپنی کار سے اُتر کر اس کے آگے کھڑے ہو گئے۔ اُن کی آنکھیں غصے سے جل رہی تھیں۔ وہ غصے سے آگ بگولا ہو رہے تھے۔ ہاکر اُن کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ اُس نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ نیلامبر بابو گاڑی سے اس کا پیچھا کریں گے۔ اس کی عقل گم ہو گئی۔

راستے پر لوگوں کا ہجوم نہیں تھا۔ بچاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اُس نے رُکتے رُکتے پوچھا "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

نیلامبر بابو نے کہا۔ "اخبار"

"لے جائیے۔"

"پیسہ؟"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔"

نیلامبر بابو کے غصے پر جیسے اوس پڑ گئی۔ وہ ہاکر کے رویئے میں اس طرح کی اچانک تبدیلی کے لئے تیار نہیں تھے وہ تو باقاعدہ جھگڑا کرنے کے لئے اُس کا پیچھا کر رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں عتاب کا آلہ تھا۔ وہ اس طرح کے انٹی کلائمکس کی توقع نہیں رکھتے تھے۔

اُن کا جوش، غصہ، خون کا دباؤ سب ٹھپ ہو گیا۔ اب تک اُن کی نظر کے سامنے گویا ظلمت کی کالی ردا مسلط تھی، اس میں اچانک جیسے کسی نے جوت جلادی اور روشنی کی کرنوں سے منجمد ظلمت جیسے رفت رفتہ برف کی مانند پگھلنے لگی۔ وہ جیب سے تمام ریزہ نکال کر ہتھیلی پر پھیلا کر دس پیسے اور پانچ پیسے کو چننے لگے۔ ہاکر بھی اپنی جیب سے ریزے نکال کر پہلے کی طرح تین پیسہ کا سکہ کھوجنے لگا۔

نیلامبر بابو اور ہاکر دونوں بیک وقت ہاتھ بڑھا کر پیسے دینے لینے لگے۔ ہاکر کے ہاتھ کی طرف پیسہ بڑھاتے ہوئے تعجب کے ساتھ نیلامبر بابو کہنے لگے۔ دو پیسے کا سکہ کہاں سے مل گیا۔

ہاکر نے بھی یکساں متعجب لہجے میں جواب دیا "ٹھیک ہے، رہنے دیجئے۔ میں نے بھی تین پیسے کا سکہ ڈھونڈ نکالا ہے۔"

نیلامبر بابو اخبار خرید کر کے گھر لوٹے۔

(ترجمہ: کرامت علی کرامت)

## غزل

محمد انوار الحسن نور

یہ عشق کا دستور ہے معلوم نہیں کیوں
مسرور بھی رنجور ہے معلوم نہیں کیوں

اللہ رے عقدہ تری بدمست نگہ کا
جب دیکھئے مخمور ہے معلوم نہیں کیوں

دیکھے کوئی مجھ سے کسی بدخو کا تنفر
سایہ سے بھی اب دُور ہے معلوم نہیں کیوں

مختار طبیعت کبھی بن جائے دلِ زار
ہر وقت یہ مجبور ہے معلوم نہیں کیوں

کیا اور کوئی طالبِ دیدار ہے موسیٰ
پھر جلوہ سر طور ہے معلوم نہیں کیوں

فرماتے ہیں وہ تو رمیں خوبی نہیں کوئی
ہر سمت یہ مشہور ہے معلوم نہیں کیوں

سیفی پریمی


نئی کتابیں

## "سُنہرے سپنے"

افسانہ نگار : رنبیر سنگھ امر
ناشر :- راش بہاری دت، ۱۰ جے بی ۳۷۱۱
سیکٹر ۲۲ ڈی، چنڈی گڑھ۔
سائز :- ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۰۶
قیمت :- تین روپے ۵۰ پیسے

رنبیر سنگھ امر جانے پہچانے، صحافی، شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ "سنہرے سپنے" میں ۱۷ کہانیاں شامل ہیں جن کا مواد نئے ہندوستان کی زندگی سے حاصل کیا گیا ہے۔ بعض کہانیوں میں رُومانی رنگ کی جھلک ہے۔ دوسری کہانیوں کے موضوعات میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی، توہم پرستی، تعلیم قومی ایکتا، سماجی سُدھار اور نوعِ انسانی کی بہبود وغیرہ شامل ہیں جو سُنہرے سپنے کے کہانی کار کی حقیقت پسندی، وطن پرستی اور انسان دوستی کے واضح اشارے ہیں۔

اس مجموعے کی تین کہانیاں اوشا، اچھوت، کایا کلپ زیادہ قابلِ توجہ ہیں۔ اوشا میں تعلیم بالغان، اور سوشل ورک کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اچھوت کا مرکزی خیال توہم پرستی ہے۔ کہانی کے تانے بانے اور کرداروں کی آویزش سے کہانی کار نے آزاد ہندوستان کے بعض طبقوں میں توہم پرستی کے مرض کی نشاندہی کر کے اُسے دُور کرنے کی راہ بھی دکھائی ہے مگر یہاں سماجی عوامل و محرکات کے بجائے اخلاقی کردار کے ذریعہ زندگی کو بدلنے کی کوشش ملتی ہے یہی کہانی کی کمزوری ہے۔

کایا کلپ میں مقصد کے اعتبار سے بلندی پائی جاتی ہے۔ اس میں آزاد ہندوستان کی صنعتی ترقی، گاؤں اور شہر کی شادابی، ہریجن سُدھار، سماجی شعور، پنڈت نہرو اور اچاریہ ونوبا بھاوے کے نظریات کی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔

کتاب میں سردار دربارا سنگھ کا پیش لفظ، راش بہاری دت کا مختصر تعارف، شری یش کا دیباچہ اور حضرت جوش ملسیانی، ڈاکٹر منوہر سہائے انور، علامہ منور لکھنوی مرحوم کی قیمتی رائیں درج ہیں۔

## "چراغ کا اندھیرا" (مطبوعہ اگست ۱۹۶۹ء)

ناول نگار :- شبنم قیوم
ناشر :- شگفتہ شبنم
سائز :- ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات :- ۱۴۴
قیمت :- ایک روپیہ پچیس پیسے

شبنم قیوم نے اس ناولٹ میں معاشی استحصال کی زہرناکی کو پیش کیا ہے۔ پلاٹ، سادہ اور کرداروں کی تعداد کم ہے۔ ہیروئن حلیمہ ایک فعّال کردار ہے۔ ہیرو بشیر اس آئینہ کا عکس ہے جو ہیروئن

کی بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ ذہنی طور پر بدلتا جاتا ہے۔ ہیرو کا نفسیاتی تجزیہ قابلِ توجہ ہے۔ ہیروئن کے مکالمے اور اس کی زندگی کے مختلف موڑ کہانی کو تسلسل کے ساتھ آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔ شک، تجسس اور ہمدردی کی مختلف منزلیں اور ان کی کیفیات کے باعث قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔

ناول نگار نے حلیمہ کے شوہر بشیر مزدور کا کردار غیر متحرک بنا دیا ہے وہ محض غیر قانونی تقریریں کرتا ہے اور جیل چلا جاتا ہے۔ ان لمبی لمبی تقریروں میں ناول نگار کی آواز اور لہجہ سنائی دیتا ہے۔ بشیر مزدور کا کردار جاندار ہونا چاہئے تھا اور سماجی شعور کا نمائندہ۔

اسپتال سے حلیمہ کا فرار اور بچے کی موت سے ٹریجڈی کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ مگر عدالت میں فلمی انداز پر مقدمے کی سماعت، طویل مکالموں اور بحثوں سے وہ تاثر زائل ہو جاتا ہے۔ ناولٹ میں قصے کا انجام بشیر مزدور کے جیل سے رہا ہونے کی مدت پر منحصر کر دیا گیا ہے یہ ایک بڑی کمزوری ہے۔ غیر ضروری تقریروں اور مکالموں کی بجائے سیاسی و معاشی عوامل و محرکات کی روشنی میں کرداروں کی فعالیت کے ذریعہ نئی زندگی کی بشارت دینا چاہئے۔ ہیرو میں طنز کی جگہ آزادی اور جمہوریت کی تمام برکتوں سے جھلاہٹ ملتی ہے جو منفی رویہ کا مظاہرہ ہے۔

ناول نگار نے سماج میں نابرابری اور ہیروئن کے کردار میں بچے کی ماتا کو بقائے نسلِ انسانی کا فطری تقاضا دکھا کر ناولٹ کو پسندیدہ بنا دیا ہے۔ اس لحاظ سے قارئین اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھ سکیں گے۔

**"میگھ دوت"** (مطبوعہ جنوری ۱۹۷۰ء)

شاعر : رانا گنوری

ناشر :- پاپولر پبلیکیشنز، ۹۹۳ بازار چتلی قبر، دہلی-۶

سائز :- $\frac{20 \times 30}{16}$ ، صفحات :- ۹۶

قیمت :- دو روپے

کالیداس کو ہفت شہ پاروں کی بنا پر ایک شہرۂ آفاق فنکار کی حیثیت حاصل ہے۔ ان تخلیقات کے تراجم سے مغربی اور مشرقی ادب میں بیش بہا سرمایہ کا اضافہ ہوا ہے۔

"میگھ دوت" کالیداس کی اہم رچنا ہے۔ اس کے متعدد اردو ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ سب سے زیادہ شہرت پربھودیال عاشق لکھنوی اور علامہ بشیشور پرساد منور لکھنوی کے ترجموں کو حاصل ہوئی۔ گجپت سرن اور سلام مچھلی شہری کی کوششیں یقیناً قابلِ قدر ہیں۔

رانا گنوری کے منظوم ترجمے کی ایک خوبی یہ ہے کہ میگھ دوت کا پورا مواد ایک ہی بحر کے ذریعے اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ شاعر نے مترنم اور مانوس بحر کا انتخاب کیا ہے۔ خارجی شعری عناصر مثلاً قافیہ، وزن روانی، ترنم، وغیرہ پر نظر رکھی ہے۔ تشبیہ اور استعارہ میں دلآویزی ہے۔ تراکیب کی پابندی میں تازگی کا التزام ہے۔ شعری مفہوم یا مواد کی نزاکت کو ذہن میں رکھ کر ذہانت اور ہمدردی کے ساتھ اس کا ابلاغ کیا گیا ہے۔ یعنی شاعر نے ہیئت اور مواد دونوں کے ساتھ انصاف برتنے کی کوشش کی ہے۔ کالیداس کے نازک، اہم، بلند اور گوناگوں مشاہدات کی ترسیل اور تفصیلی معلومات کے ذریعہ قاری کو قدیم ہندوستان کی جغرافیائی کیفیت کے علاوہ ہندوستانی کلچر اور تہذیبی اقدار سے روشناس ہونے کا موقع ملتا ہے۔

**"دوسرا شجر"** (مطبوعہ جنوری ۱۹۷۰ء) قیمت : تین روپے

شاعر : شجاع خاور

ناشر : اردو پبلیکیشنز، ۱۴۸ اردو بازار دہلی-۶

شجاع خاور کو نظم نگاری سے مناسبت رہی ہے۔ پہلے مروجہ شعری سانچوں کو اپنے فکر و خیال کے ابلاغ کا ذریعہ بنایا، آزاد نظمیں کہیں۔ اور اب شعری صلاحیت کو علامتی شاعری کے تجربوں کے لئے وقف کر دیا ہے

"دوسرا شجر" ۴۴ لائنوں پر مشتمل ایک طویل نظم ہے جس میں ارضی بہشت کی تخریب کے بعد ایک جہانِ نو کی تعمیر کا تذبذب آمیز تصور پیش کیا گیا ہے۔

زیرِ نظر تخلیق میں کسی حد تک شکوہ اور جوابِ شکوہ کا انداز پایا جاتا ہے۔ بعض شعراء کے معروف مصاریع کا برمحل استعمال ملتا ہے اور معنویت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ان مصاریع کی نشاندہی حواشین کے ذریعہ کر دی گئی ہے۔

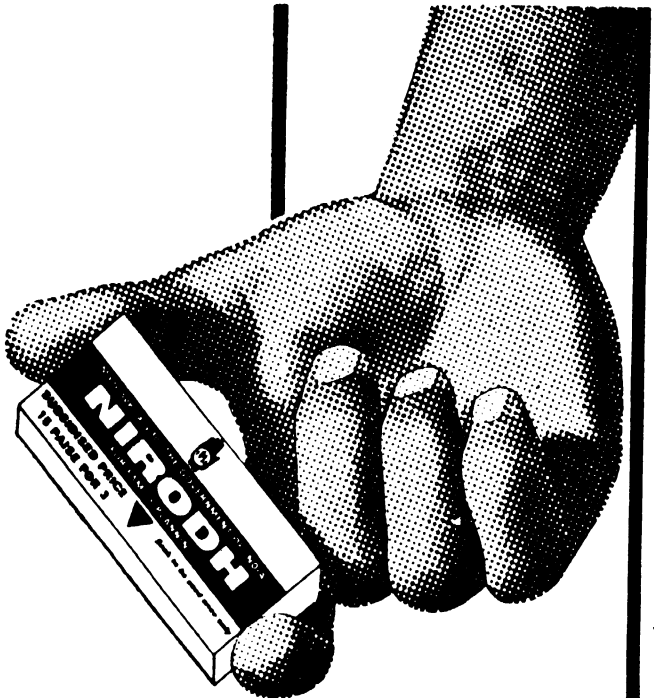


## بچّوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

فی زمانہ بچّوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نِرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچّے تبھی ہوگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔

## بچّہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچّے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچّے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نِرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچّے کی پیدائش ملتوی کرسکتے ہیں۔

نِرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اِسے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان، و محفوظ طریقہ ہے۔ اِس کے استعمال سے صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔

نِرودھ ہر جگہ ملتا ہے:-
پرویژن اسٹور، کرانہ فروش، کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔

## نِرودھ استعمال کیجئے

فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
15 پیسے کے 3
سرکاری امداد سے کم دام

## صرف 5 پیسے خرچ کرکے آپ اپنے کنبے کو محدود رکھنے کی طاقت حاصل کرسکتے ہیں

70/61

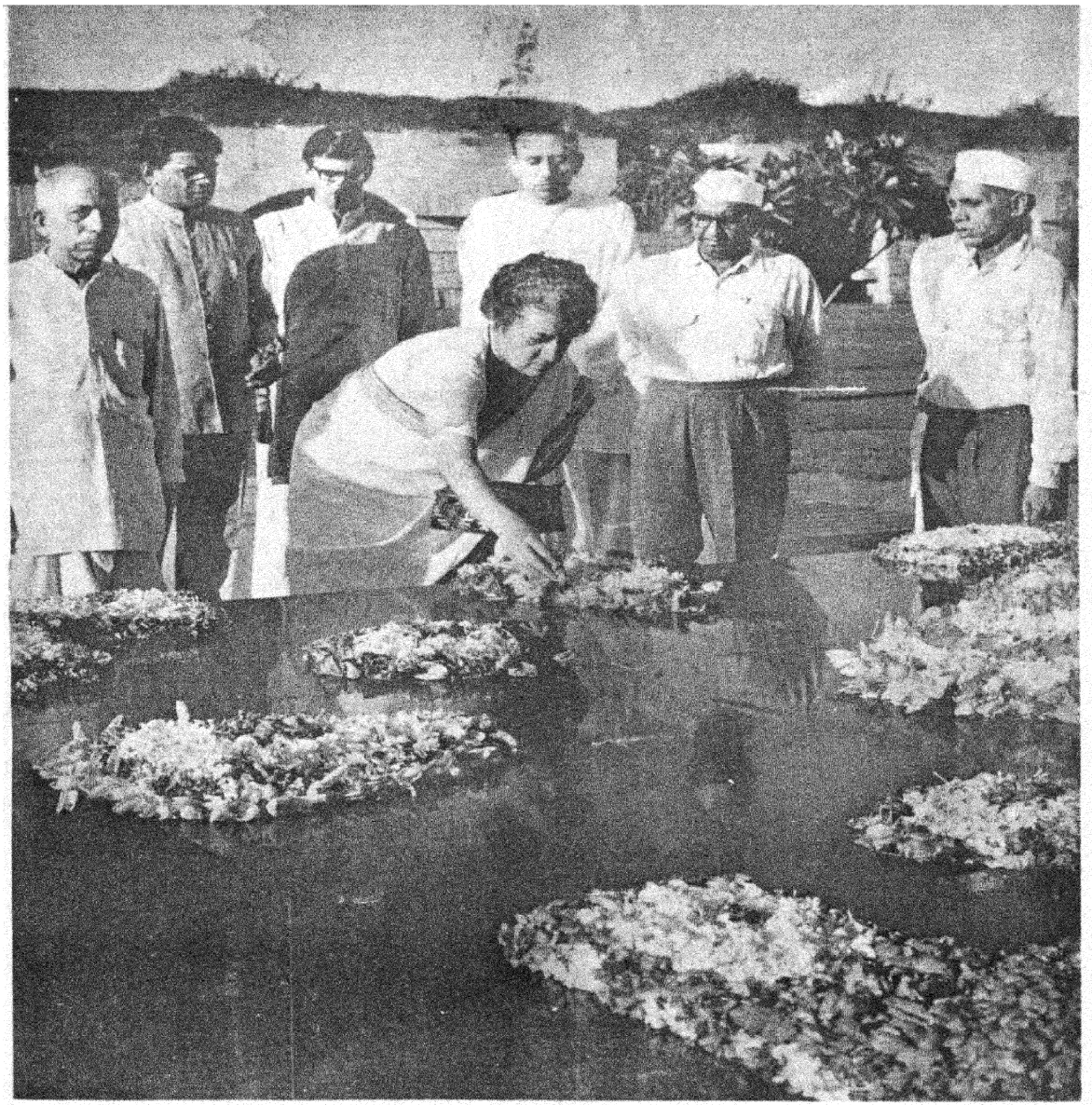

شریمتی اندرا گاندھی راج گھاٹ نئی دہلی میں مہاتما گاندھی کی
سمادھی پر پھول چڑھا رہی ہیں۔

**Vol. 29 No. 3** **AJKAL (Monthly)** **October 1970**

**Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.**
**Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55**
**Regd. No D-509**

# آج کل

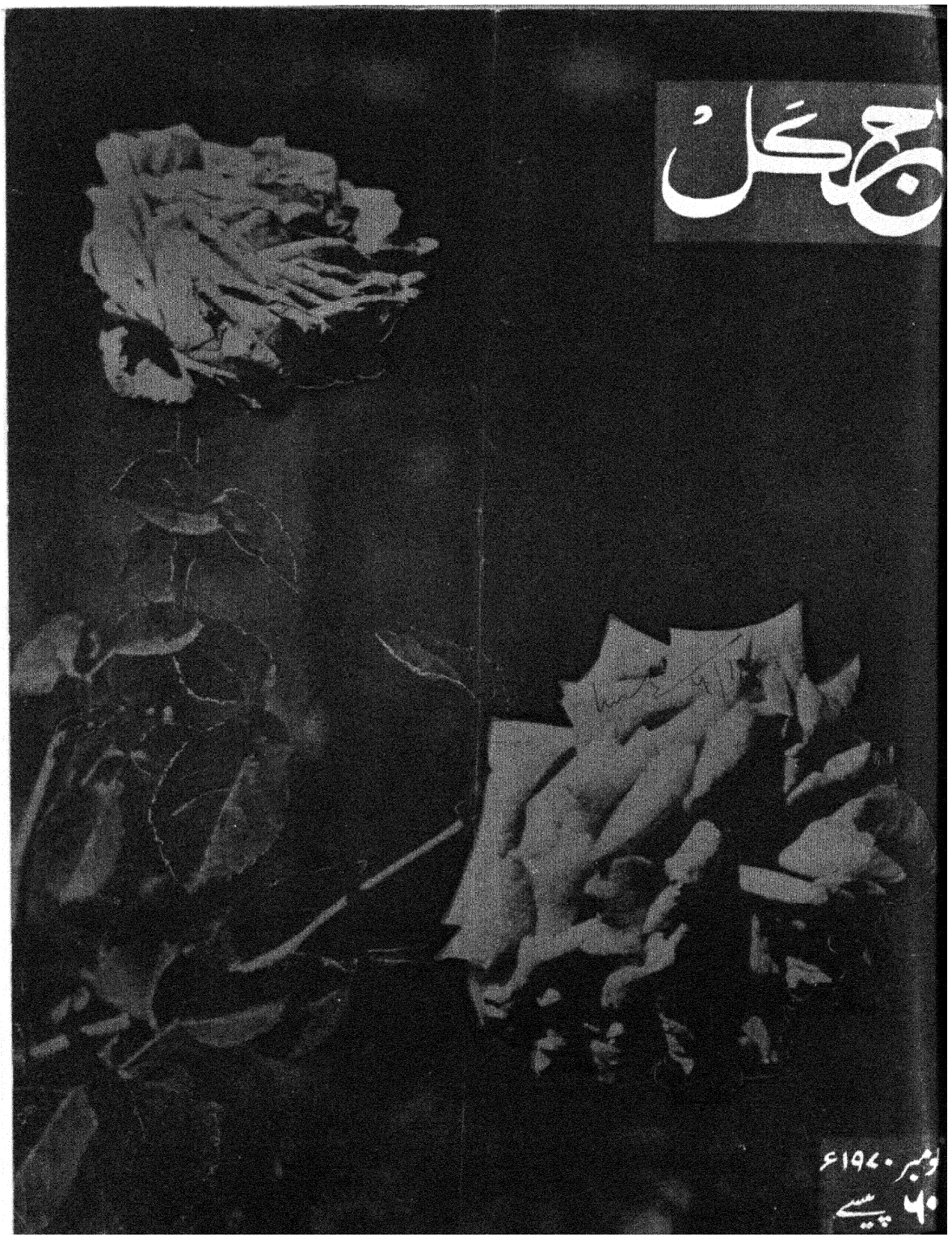

نومبر ۱۹۷۰ء

۶۰ پیسے

۲۱ ستمبر ۱۹۷۰ء کو صدر جمہوریہ ہند شری وی
وی گری اور شریمتی سرسوتی گری رُوس، بلغاریہ او
ہنگری کے دورے پر تشریف لے گئے۔ خیر سگالی کے
ایسے دورے مختلف ممالک کے درمیان اتحاد اور
اعتماد پیدا کرتے ہیں اور اُن کے تعلقات میں مزید
استواری آتی ہے۔ صدرِ جمہوریہ ہند نے اپنے
دورے کا آغاز تاشقند کے تاریخی شہر سے کیا
جہاں معاہدہ تاشقند کے بعد شری لال بہاد
شاستری نے انتقال کیا تھا

(تصویر میں) شریمتی گری شاستری جی کو خراج عقید
پیش کر رہی ہیں

(نیچے) ۲۳ ستمبر کو شری گری رُوس کے صدر
شری این پاڈگورنی سے ماسکو میں باہمی دلچسپی کے
مسائل پر تبادلہ خیالات کر رہے ہیں



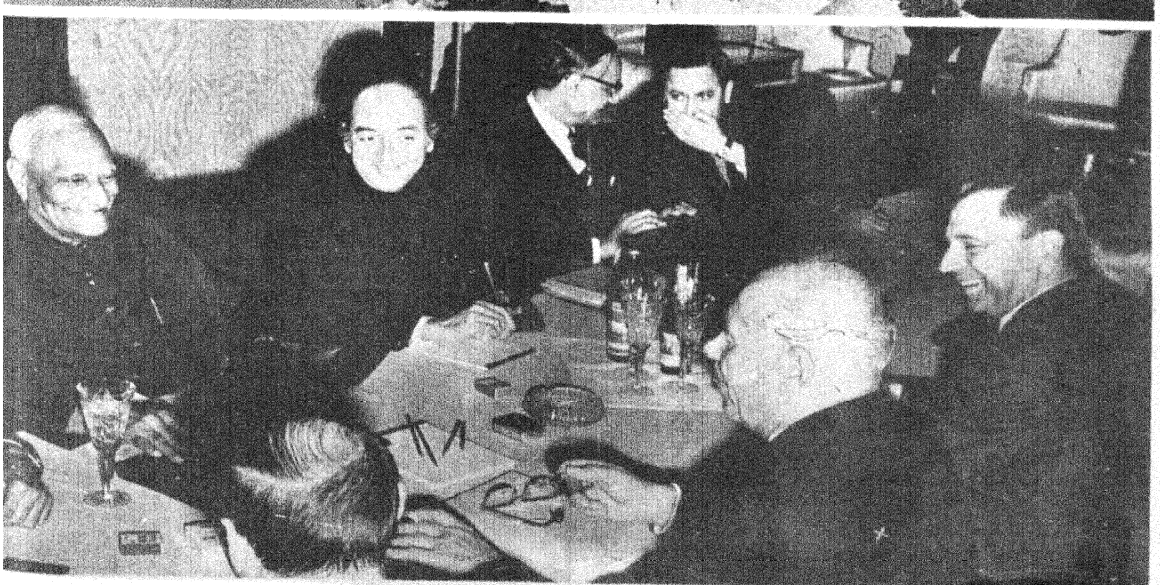

# آج کل

اُردو کا مقبول عوام ماہنامہ

## ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ملاحظات | | ۲ |
| جواہر لال نہرو | آل احمد سرور | ۳ |
| اے نغمہ گرو۔ اے ہم سخنو (نظم) | نازش پرتابگڑھی | ۴ |
| غبارِ کارواں (۹) | عصمت چغتائی | ۶ |
| غزل | صغیر احمد صوفی | ۱۵ |
| شاعر پاس گریباں | مصطفےٰ علی اکبر | ۱۶ |
| دیش بندھو چترنجن داس | نند کشور وکرم | ۱۸ |
| محمد قلی قطب شاہ (نظم) | متین سروش | ۲۱ |
| ایک کلی دو پھول (نظم) | سیدہ شبنم قادری | ۲۱ |
| تلاش (کہانی) | کلام حیدری | ۲۲ |
| حقیقت افسانے کی تلاش میں | دیویندر اسر | ۲۵ |
| شعر و نغمہ (نظم) | مغیث الدین فریدی | ۲۹ |
| عکس جمال (نظم) | بہاء الدین کلیم | ۳۰ |
| ساس کی موت (کہانی) | نریندر کھجوریہ | ۳۱ |
| غزل | معصوم شیر گھاٹوی | ۳۴ |
| غزل | افتخار احمد دھولیوی | |
| آپ اپنے پڑھنے کی رفتار کیسے بڑھا سکتے ہیں۔ | عزیز احتشام الرحمان | ۳۵ |
| لہو پکار اٹھا (کہانی) | اجیت سینی | ۳۹ |
| غزل | امر ابد آبادی | ۴۱ |
| غزل | خلیل تنویر | ۴۱ |
| غزل | ناظر انصاری | ۴۱ |
| غزل | سید احمد شمیم | ۴۲ |
| غزل | سعید عارفی | ۴۲ |
| غزل | حقی حزیں | ۴۲ |
| نئی کتابیں (تبصرے) | بشیر بدر | ۴۳ |



ایڈیٹر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۲۹ —— شمارہ ۴
نومبر ۱۹۷۰ء
کارتک، اگرہائن شک سمت ۱۸۹۲

سرورق عمل: مدن موہن ملک

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
شہباز حسین ایڈیٹر آج کل،
پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات و نشریات پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

# ملاحظات

**متحدہ** عرب جمہوریہ کے صدر جمال عبدالناصر کی موت سے دنیا ایک ایسے مدبّر اور سیاست داں سے محروم ہوگئی ہے جس نے اپنی دُور بینی، ژرف نگاہی اور عزم و عمل سے اقوامِ عالم کی تاریخ میں دوام حاصل کر لیا ہے جس وقت وہ برسرِ اقتدار آئے اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ وہ عرب قومیت اور اتحاد کے ایک ایسے علمبردار بن جائیں گے جس کی نظیر نہیں ملے گی۔ انہوں نے مصر کو جاگیردارانہ نظام سے نجات دلائی، جمہوری اور اشتراکی قدروں کو فروغ دیا، نہر سویز سے غیر ملکیوں کی بالادستی ختم کی اور صحیح معنوں میں مصر کو آزادی سے ہم کنار کیا۔ عربوں کے باہمی اختلافات کو بڑی حد تک ختم کیا اور اُنہیں ایک مقصد اور نصب العین عطا کیا۔ اسی لئے نہ صرف وہ اپنے ملک میں بلکہ تقریباً تمام عرب ملکوں میں بے حد مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ جس کا ثبوت عرب عوام کا وہ بے مثال خراجِ عقیدت ہے جو اُن کی موت کے بعد پیش کیا گیا۔

بین اقوامی سیاست میں اُن کی قامت کی درازی کے دوست اور مخالف دونوں معترف ہیں۔ ناوابستگی اور بقائے باہم کے اصولوں کو انہوں نے ابتداہی سے اپنایا۔ اس لئے ہند اور مصر میں گہرے روابط قائم ہوئے جو روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوئے۔ ان کی موت سے ہندوستان ایک سچے خیر خواہ سے محروم ہوگیا ہے اور ہندوستان اس غم میں اہلِ مصر کا برابر کا شریک ہے۔ صدر جمہوریہ ہند نے اپنے تعزیتی پیغام میں انہیں اس صدی کے ممتاز ترین مدبّروں میں شمار کیا ہے۔ آپ نے ایک نشری تقریر میں اُنہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے یہ کہا کہ وہ ہمارے زمانے کے ایک عظیم مدبر تھے جنہوں نے بین اقوامی معاملات پر اپنی شخصیت کی چھاپ ڈالی ہے۔

وزیراعظم ہند نے صدر ناصر کی اچانک موت پر اپنے گہرے دکھ اور غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ ہندوستان کے ایک سچے اور مخلص دوست تھے اور اُن کی موت ہمارے لئے ایک بہت بڑا نقصان ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ "عرب اتحاد اور سالمیت کے عظیم معمار کی حیثیت سے ان کا نام تاریخ میں ہمیشہ امر رہے گا....

...بین اقوامی سیاست میں انہیں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ انہوں نے عالمی امن اور سجائی جائے کے لئے انتھک محنت کی.... انہوں نے اپنے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے اپنے کو وقف کر رکھا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ایک منصفانہ عالمی نظام کے لئے بھی کوشاں تھے.... مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں اور ساری دنیا میں جہاں جہاں لوگوں نے آزادی کے لئے لڑائی لڑی ہے اور قربانیاں دی ہیں وہاں صدر ناصر کو جرأت و دانش مندی کے حامل ایک عظیم رہنما اور مدبر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔"

—— بلاشبہ نیل کا سورج غروب ہوگیا ہے اور عرب دنیا ایک "آفتاب تازہ" کی منتظر ہے۔

# اے قلم سنبھالو

ہر اک مرکزِ عمل پر وطن کا کوئی بشر نہیں ہے
کوئی بھی اک رنگ ایک جلوہ قبولِ فکر و نظر نہیں ہے
ترا تو ہے صدائے ہستی مگر اک آہنگ پر نہیں ہے
حیاتِ گرمِ سفر کی خاطر کوئی بھی اک رہ گزر نہیں ہے
قدم قدم پر کشیدگی ہے، نفس نفس میں تنا تنی ہے!
کسی کو اس سے غرض نہیں ہے کہ ملک کی جان پر بنی ہے
ہے یہ وقت زندگی پر تمام ماحول جل رہا ہے
وہ زہر گھولا شقاوتوں نے کہ جامِ الفت پگھل رہا ہے
رگ الاپا خباثتوں نے کہ حسن کا دل دہل رہا ہے
وہ آنچ دی ہے درندگی نے کہ جس سے انسان گل رہا ہے
ستم ہے امن و اماں کی دھرتی پر امن کو عافیت نہیں ہے
فغاں کہ اس پاک سرزمیں پر لحاظِ انسانیت نہیں ہے
ستاروں کو اک لڑی میں پروئیں اور کہکشاں بنا دیں
بڑھو کہ موجوں کو ایک دھارے میں لائیں اور بے کراں بنا دیں
بکھرے ہوئے گلوں کو سمیٹ کر گلستاں بنا دیں
تمام لفظوں میں ایسی ترتیب دیں کہ اک داستاں بنا دیں
وہ تمنا کے پیچ و خم سے نہ ڈرنے والا قدم اٹھائیں
کتابِ دل کی ہزاروں تفسیریں لکھنے والا قلم اٹھائیں
رہے ہیں ادھر ادھر جو ہم اُن کو اک منزلِ سفر دیں

## نارش پرتابگڈھی

الگ الگ بجنے والے تاروں میں ایک لے ایک گیت بھر دیں
وطن کی تعمیرِ نو کی خاطر دلوں کو پھر ایک رنگ کر دیں
کہیں جو خونِ جگر بہائیں تو ہم کہیں بڑھ کے اپنا سر دیں
سنو، رفیقو! سنو کہ ہم کو ہماری غیرت بلا رہی ہے
حیات آواز دے رہی ہے وطن کی عظمت بلا رہی ہے
اٹھو رفیقو کہ ظلمتوں کے لئے ہر اک راہ بند کر دیں
قلم کی رفتار تیز کر دیں نئے عزائم کو بال و پر دیں
سخن میں ترکیبیں ایسی رکھیں کہ شر پسندوں کے پر کتر دیں
ڈبو کے خونِ جگر میں انگلی عروسِ بھارت کی مانگ بھر دیں
اٹھائیں قرطاس — آج سیتا کے جسم پر پیرہن نہیں ہے
قلم سنبھالیں کہ ہم میں بھائی تو ہیں مگر بکشمن نہیں ہے
قلم سنبھالیں کہ یہ قلم اک عظیم امانت ہے زندگی کی
قلم سنبھالیں کہ یہ بڑی قیمتی وراثت ہے آدمی کی
قلم جو بہکا تو پھر بہک جائے گی کرن صبحِ آگہی کی
قلم جو ٹھہرا تو نامکمل رہے گی تاریخ روشنی کی
وطن کا خلست کدہ قلم سے تجلی طور مانگتا ہے
ہمارا مستقبل آج ہم سے زبانِ منصور مانگتا ہے



عصمت چغتائی

# غبارِ کارواں

میں زار و قطار رو رہی تھی۔

کوئی کسی کو بڑی بے دردی سے مار رہا تھا۔ مارنے والا بہت دیوزاد تھا اور پٹنے والا منحنی سا کالا کلوٹا بچہ تھا۔ کون مار رہا تھا، کسے اور کیوں مار رہا تھا، یہ قطعی یاد نہیں کیوں کہ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ مگر موٹا بنیت جب پٹنے والے کی ہڈیوں پر بجتا تھا تو بڑی خوفناک چٹاخے دار آواز نکلتی تھی جو اب تک میرے کان میں محفوظ ہے اور اکثر سنائی دیتی ہے۔

شاید جب ہی سے مجھے معلوم ہو گیا کہ بڑا چھوٹے کو مارتا ہے۔

اور طاقتور کمزور کو مارتا ہے۔ طاقتور ایک قدِ آدم ستون کی طرح میرے لاشعور میں کھڑا ہو گیا جس کے پیروں تلے کمزور کوڑے کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ تب میرا سر طاقتور کے حضور میں جھک گیا اور کمزور سے گھن آنے لگی۔

پھر بھی دل میں ایک چور تھا، جو خود مجھ سے چھپ کر بیٹھ گیا جب کبھی میں کسی عالی شان محل کو دیکھتی جس پر کائی جم جاتی اور گھاس بیرحمی سے چھا جاتی تو دل میں دبکا چور چپکے چپکے مسکرا اٹھتا اور گھاس پھونس کی بے بساط طاقت کا رعب میرے دل پر بیٹھ جاتا۔

ہم اتنے سارے بچے تھے کہ ہماری اماں کو ہماری صورت سے قے آتی تھی۔ ایک کے بعد ایک ہم اُن کی کوکھ کو روندتے کچلتے چلے آئے تھے۔ الٹیاں اور درد سہہ سہہ کر وہ ہمیں ایک سزا سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھیں۔ کم عمری ہی میں پھیل کر چھوہارہ ہو گئی تھیں۔ برس کی عمر میں وہ نانی بھی بن گئیں اور سزا در سزا جھیلنے لگیں۔ بچے نوکروں کے رحم و کرم پر پلتے تھے اور اُن سے بے طرح مار کھاتے تھے ——

نوکروں کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک آقا کے سامنے آقا کے پیچھے۔ سامنے وہ ہاتھ پیر چومتے ہیں، پیٹھ پیچھے گالیاں کر دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ گھر کا نوکر سے زیادہ کوئی بدقسمت مجبور طبقہ نہیں۔ خاص طور پر ہندوستان میں جہاں بے کار و غربت نے ایک کثیر تعداد کو ایک محدود طبقے کا محکوم اور غلام رکھا ہے۔ ہمارے ہاں چند ایسے نوکر تھے جو پشتہا پشت سے ہی خاندان کی خدمت کرتے آئے تھے جسم کے ساتھ اُن کا ذہن غلام بن چکا تھا۔ یہ نوکر نہایت نکمے، غبی اور مکار تھے۔ تنگ آکر دیئے جاتے تو ادھر اُدھر دھکے کھا کر پھر کھونٹے پر لوٹ آتے۔ پالتو کتوں کی طرح سے۔ اب تو ملک ترقی کر گیا ہے اور کچھ ہیکا ہو گئی ہے اس لئے اب ایسے غلامانہ ذہنیت کے نوکر نہیں اپنے بچپن میں میں نے نوکروں کی ایسی دُرگت دیکھی کہ اور نوکر کے نظام سے ہی نفرت ہو گئی۔ میری بہت سی کہانیوں نوکروں کے کردار نظر آتے ہیں۔ کمزور و لاچار نوکر، جھوٹے، مکار چالباز نوکر، میری کہانیاں نوکروں سے بھری پڑی ہیں۔

آج کل نئی دہلی

ودِ دنیا میں طبقاتی تفریق نوکر اور آقا کے رشتہ میں نظر آئی۔ اُس نے متاثر کیا۔ جب باقی کی وسیع دُنیا سے سابقہ پڑا تو پتہ چلا اُونچ ذات پات، صرف ڈھونگ ہے۔ اصل چیز امیری اور غریبی ہے ب رویہ ہے۔ امیر خواہ کتنا بھی اللہ والا ہو اور قوم پرست ہو غریب ے ساتھ نوکر جیسا برتاؤ کرتا ہے۔ لاڈ پیار کی کیے فرصت تھی، نوکروں ے سیکھی ہوئی ہوشیاری ہی کارآمد ثابت ہوئی۔ جب کسی چیز کی رورت محسوس کی اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر حاصل کی۔

رونے اور گلا پھاڑ کر چلّانے میں ہم سب بہن بھائیوں کو خاصی ارت حاصل تھی۔ ہماری اماں بوکھلا کر ہمارا کہنا ماننے پر مجبور ہو جاتیں ں اپنی اس طاقت کا شدّت سے احساس تھا، بچے روپیٹ کر ہی ی ناپسندیدگی کا اظہار کر سکتے ہیں۔

ایک دن ایک مجلس میں پہلی بار مرثیوں اور نوحوں کا مطلب ھ میں آیا۔ اور جب علی اصغر کے حلق میں تیر پیوست ہونے کا ذکر آیا وف سے میری گھگی بندھ گئی، میں نے بُری طرح دہاڑیں مار مار کر ونا شروع کیا، ماتم کرنے والی بیویاں ایک دم چُپ ہو گئیں اور ی حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں۔ سمجھیں شاید تبرّک کے انتظار کی زحمتیں ناقابلِ برداشت ہو گئی ہیں یا کہیں چوٹ چپیٹ آ گئی یا کسی کیڑے ڑے نے ڈس لیا۔

"کیوں مارا؟ حلق میں تیر کیوں مارا؟" میں نے حسبِ دت مچل مچل کر پوچھا۔ کسی نے میرے سوال کا جواب نہ دیا۔ مجھے ل اور ضدی سمجھ کر مجلس سے بھگا دیا گیا۔ گھر واپس آ کر فوراً بھائیوں ے میری شکایت کی کہ میں نے مجلس میں فیل مچائے، بدتمیزی کی اور ب کو شرمندہ کروایا۔ سخت ذلت سے نکالی گئی۔

"تیر کیوں مارا؟ ہاتھ میں مار دیا ہوتا بچارے کے حلق میں ں مارا؟" میں اپنی بات پر اڑی رہی۔

"اچھا بس بک بک بند کرو اور سو جاؤ" ڈانٹ پڑی۔

مگر میرے حصّے کی نیند کہاں! جیسے ہی آنکھ بند کرتی سامنے ے کے مُنہ میں چبھا ہوا تیر نظر آتا۔ میں پھر چیخیں مارنے لگتی۔

"ابے غارت ہو بدنصیب، سو جا چڑیل نہیں تو گلا گھونٹ دوں گی" باری باری سب بزرگوں نے مجھے قتل کر کے مجھ سے نجات پانے کی دھمکیاں دیں مگر میری سسکیاں نہ رُکیں۔ تب ڈر کے مارے میں شیخانی بُوا کے پاس گھس گئی کیونکہ اکیلے پلنگ پر مجھے ڈر لگ رہا تھا۔

"کیوں مارا تیر"؟ میں نے شیخانی بوا کی بغل میں سسک کر پوچھا

"اُو اجید حرامی رہے"۔ انہوں نے سمجھایا۔

"تو اُس کے پاس بچّے کو کیوں لے گئے۔؟"

"بچّہ پیاسا رہے۔"

"تو اُسے دُودھ دیا ہوتا؟"

"دُودھ ماں کا کھسک ہوئی گوا رہے"

"تو پانی ہی دیدیا ہوتا۔"

"پانی کہاں رہے؛ نہر پہ تو اُو کی پھوج کا پہرہ رہے"

"کیوں؟"

"اب اسی ہم کا جانیں۔ رہے کچھ گڑبڑ۔"

"پھر؟"

"بچّہ کا پانی پیاسے کھاطر نہر پہ لئے کے گئے۔ توں مار دہس تیر"

"حلق میں؟"

"ہاں۔"

اور میرے حلق میں بڑے بڑے کانٹوں دار گولے پھنسنے لگے۔

"تیر کی بچّی، نہ سوئی ہے نہ سونے دیتی ہے۔" میری اماں نے ایسے کس کس کے تھپڑ اور گھونسے لگائے کہ سچ مچ میری کربلا کر دی۔

برسوں گھر میں میرا اس واقعہ پر مذاق اُڑتا رہا جب کوئی مہمان آتا تو بھائی مجھے ذلیل کرنے کے لئے کہتے۔

"یہ مجلس میں بھوں بھوں روئی بھی تھی۔ نکالی گئی۔ پھر اماں نے اُس کی خوب ٹھکائی کی۔ میں شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ یہ میری زندگی کا پہلا اہم المیہ تھا اور برسوں اثر رہا۔ مجلسوں میں جاتے میرا دم نکلتا تھا، پھر حلق میں تیر مارنے کا ذکر ہو گا اور کانٹوں دار گولے میرے گلے میں اٹکیں گے۔ مجلس کا تقدس بھنگ ہو گا۔

ابھی چند سال ہوئے ہٹلر کے کارناموں کے بارے میں

ایک فلم دیکھی۔ لاکھوں گلی سڑی لاشوں کو دیکھ کر میرے ضمیر میں علی اصغر کے حلق میں اٹکا ہوا تیر کھٹکنے لگا۔ ویت نام میں بارہ سال سے خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ سب کہاں ہیں، کوئی روکتا کیوں نہیں۔ انسانیت کب تک یونہی بے بس تماشہ دیکھتی رہے گی۔ انسان نے انسان کا بظاہر گوشت کھانا بند کر دیا ہے۔ لیکن اس کی موسیائی بنا کر اب بھی ہضم کر رہا ہے۔ مجھے ایسی دنیا سے پیار نہیں اُس کے اصولوں سے گھن آتی ہے۔

ایک اور واقعہ میرے بچپن کا ہے جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ والد کافی روشن خیال تھے۔ بہت سے ہندو خاندانوں سے میل جول تھا یعنی ایک خاص طبقے کے ہندو مسلمان نہایت سلیقے سے گھلے ملے رہتے تھے۔ ایک دُوسرے کے جذبات کا خیال رکھتے۔ ہم کافی چھوٹے تھے جب ہی احساس ہونے لگا تھا کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف ضرور ہیں۔ زبانی بھائی چارے کے پرچار کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی احتیاط کا احساس ہوتا تھا۔ اگر کوئی ہندو آئے تو گوشت و دوشت کا نام نہ لیا جائے، ساتھ بیٹھ کر ایک میز پر کھاتے وقت بھی خیال رکھا جائے کہ اُن کی کوئی چیز نہ چھو جائے۔ سارا کھانا دُوسرے نوکر لگائیں۔ اُن کا کھانا پڑوس کا مہاراج لگائے۔ برتن بھی وہیں سے منگا دیئے جائیں۔ عجب گھٹن سی طاری ہو جاتی تھی۔ بے حد اُونچی اونچی روشن خیالی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ایک دوسرے کی محبت اور جاں نثاری کے قصہ دہرائے جا رہے ہیں۔ انگریزوں کو مجرم ٹھہرایا جا رہا ہے۔ ساتھ ساتھ سب بزرگ لرز رہے ہیں کہ کہیں بچے کہ چھوٹے بیل ہیں کوئی ایسی حرکت نکر بیٹھیں کہ دھرم بھرشٹ ہو جائیں۔

"کیا ہندو آ رہے ہیں؟" پابندیاں لگتے دیکھ کر ہم لوگ بور ہو کر پوچھتے۔

"خبردار چاچا جی اور چاچی جی آ رہے ہیں، بدتمیزی کی تو کھال کھینچ کر بھوسہ بھر دیا جائے گا۔"

اور ہم فوراً سمجھ جاتے کہ چاچا جان اور چچی جان نہیں آ رہے ہیں، جب وہ آتے ہیں تو سیخ کباب اور مُرغ مسلم پکتا ہے۔ لوکی کا رائتہ اور دہی بڑے نہیں بنتے۔ یہ پکنے اور بننے کا فرق بھی بڑا دلچسپ ہے۔

ہمارے پڑوس میں ایک لالہ جی رہتے تھے اُن کی بیٹی سے میری دانت کاٹی روٹی تھی۔ ایک عمر تک بچوں پر چھوت کی پابندی لازمی نہیں سمجھی جاتی۔ سوشی ہمارے ہاں کھانا بھی کھا لیتی تھی۔ پھل، دال موٹ، بسکٹ، اتنی چھوت نہیں ہوتی لیکن چونکہ ہمیں معلوم تھا کہ سوشی گوشت نہیں کھاتی۔ اس لئے اُسے دھوکے سے کسی طرح گوشت کھلا کے بڑا اطمینان ہوتا تھا۔ حالاں کہ اُسے پتہ نہیں چلتا تھا مگر ہمارا نہ جانے کو نسا جذبہ تسلی پا جاتا تھا۔ وہ دن بھر ایک دوسرے کے گھر میں گھسے رہتے تھے مگر بقرعید کے دن سوشی تالے میں بند کر دی جاتی تھی۔ بکرے احاطے کے پیچھے مٹی کھڑی کر کے کاٹے جاتے۔ کئی دن تک گوشت بٹتا رہتا۔ ان دنوں ہمارے گھر سے لالہ جی کا ناتا ٹوٹ جاتا۔ اُن کے ہاں بھی جب کوئی تہوار ہوتا تو ہم پہرہ بٹھا دیا جاتا۔

لالہ جی کے ہاں بڑی دھوم دھام سے جشن منایا جا رہا تھا۔ جنم اشٹمی تھی۔ ایک طرف کڑاہ چڑھ رہے تھے اور دھڑا دھڑ پکوان تلے جا رہے تھے باہر ہم فقیروں کی طرح کھڑے حسرت سے تک رہے تھے۔ بھٹیاروں کی ہوش ربا خوشبو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ سوشی ایسے موقعوں پر بڑی مذہبی بن جایا کرتی تھی۔ ویسے تو ہم دونوں بارہا ایک ہی امرود باری باری دانت سے کاٹ کر کھا چکے تھے مگر سب سے چھپ کر۔

"بھاگو یہاں سے" آتے جاتے لوگ ہمیں دھتکار جاتے۔ ہم پھر کھسک آتے۔ پھولے پیٹ کی پوریاں تلتے دیکھنے کا کس بچے کو شوق نہیں ہوتا۔

"اندر کیا ہے؟" میں نے سوشی سے پوچھا۔ سامنے کا کمرہ پھول پتوں سے دُلہن کی طرح سجا ہوا تھا، اندر سے گھنٹیاں بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ جی میں کھد بد ہو رہی تھی، ہائے اللہ اندر کون ہے۔

"وہاں بھگوان براجے ہیں" سوشی نے غرور سے گردن اکڑائی۔

"بھگوان" مجھے بے انتہا احساس کمتری ستانے لگا۔ ان کے بھگوان کیا مزے سے آتے جاتے ہیں۔ ایک ہمارے اللہ میاں ہیں نہ جانے کہاں چھپ کر بیٹھے ہیں۔ نہ جانے کون سی رگ پھڑکی کہ فقیروں کی صف سے کھسک کے میں برآمدے میں پہنچ گئی۔ گھر کے کسی فرد کی نظر نہ پڑی۔ میرے سنہ پر میرا مذہب تو لکھا نہیں تھا۔ ادھر سے ایک دیوی جی آرتی کی تھالی لئے سب کے ماتھے پر چندن چاول چپکاتی آئیں۔ میرے ماتھے پر بھی لگا گئی گزر گئیں۔ میں نے فوراً ہتھیلی سے ٹیکہ چاٹ

چاہا پھر میری بدذاتی آڑے آگئی۔ سنتے تھے جہاں ٹیکہ لگے اتنا گوشت جہنم میں جاتا ہے۔ خیر میرے پاس گوشت کی فراوانی تھی اتنا سا گوشت چلا گیا جہنم میں تو کون سا ٹوٹا آجائے گا۔ نوکروں کی صحبت میں بڑی ہوشیاریاں آجاتی ہیں۔ ماتھے پر سرٹیفکٹ لئے میں مزے سے اُس کمرے میں گھس گئی جہاں بھگوان براج رہے تھے۔

بچپن کی آنکھیں کیسے سہانے خوابوں کا جال بُن لیتی ہیں۔ گھی اور لوبان کی خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا۔ بیچ کمرے میں ایک چاندی کا پلنا لٹک رہا تھا۔ ریشم اور گوٹے کے تکیوں اور گدّوں پر ایک روپہلی بچہ لیٹا جھول رہا تھا۔ کیا نفیس اور باریک کام تھا۔ بال بال کیا خوبصورتی سے تراشا گیا تھا۔ گلے میں مالا، سر پر مور پنکھی کا مکٹ۔

اور صورت اس غضب کی بھولی۔ آنکھیں جیسے لہکتے ہوئے دیئے۔ میرے ننھے سے دل میں مامتا کی ہوک اُٹھی۔ بچہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور ہمک کر ہاتھ پھیلا دیئے۔ ضد کر رہا ہے مجھے گودی میں لے لو۔ ہولے سے میں نے بچے کا نرم گرم گال چھوا۔ میرا رواں رواں مسکرا دیا۔ میں نے بے اختیار اُسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

ایک دم جیسے طوفان پھٹ پڑا اور بچہ چیخ مار کر میری گود سے اُچھل کر گر پڑا۔ سوشی کی نانی ماں کا منہ پھٹا ہوا تھا، ہذیانی کیفیت طاری تھی جیسے میں نے روپہلی بچے کو چوم کر اُس کے حلق میں تیر پیوست کر دیا ہو۔

چاچی جی نے جھپٹ کر میرا ہاتھ پکڑا بھگاتی ہوئی لائیں اور دروازے سے باہر مجھے مری ہوی چھپکلی کی طرح پھینک دیا۔ فوراً میرے گھر شکایت پہونچی کہ میں چاندی کے بھگوان کی مورتی چرا رہی تھی۔ اماں نے سر پیٹ لیا اور پھر مجھے بھی پیٹا۔ وہ تو کہو اپنے لالہ جی سے ایسے بھائی چارے والے مراسم تھے۔ اس سے بھی معمولی حادثوں پر آج کل آئے دن خون خرابے ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے سمجھایا گیا کہ بُت پرستی گناہ ہے۔ محمود غزنوی بُت شکن تھا۔ میری خاک سمجھ میں نہ آیا۔ میرے دل میں اس وقت پرستش کا احساس بھی پیدا نہ ہوا تھا، میں پوجا نہیں کر رہی تھی۔ ایک بچے کو پیار کر رہی تھی۔

اسی سلسلہ میں لوگوں کو میری عاقبت سنوارنے کا خیال آگیا۔ میرے دل میں اسلام کی برتری کوٹ کوٹ کر بھری گئی۔ اسلام جو دُنیا کے ہر مذہب سے ارفع اور اعلیٰ ہے۔ یہ بھائی بھائی کا نعرہ اپنی جگہ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمان پھر مسلمان ہے۔ بُغدادی قاعدہ بھی شروع کرایا گیا۔ اور الف دو زبر اَن، دو زیر اِن دو پیش اُن رٹتے وقت بڑی شدّت سے نیند آنے لگتی۔ الفاظ کے ترنم میں لوری کا تاثر ہے اور جب مُلّانی جی کی قمچی پڑتی تو ساری نیند رفوچکر ہو جاتی۔ ملانی جی، چُندھی، بہری اور بلا کی بد دماغ تھیں۔ سُنا ہے اُن کے مرحوم شوہر اُنہیں چارپائی سے باندھ کر بھیگی ہوئی رسّی سے اُن کی چمڑی اُدھیڑا کرتے تھے۔ بڑھیا فی لفظ ایک دو تھپڑ رسید کرتی تھی کوئی بیس یا بائیس بچوں کو پڑھاتی تھی اور سب کو مستقل چانٹے تھپڑ گھونسے مارتی تھی۔ سوکھی سوکھی انگلیوں سے میری موٹی موٹی رانوں میں ایسی چٹکیاں لیتی تھی اور ہاتھ نہیں ٹوٹتے تھے۔ ہم آیتیں پڑھ پڑھ کر اُس کے مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ میں نے کبھی کسی انسان سے ایسی شدید نفرت نہیں کی جیسی اُس بڑھیا سے کی۔ ساتھ ساتھ اُس نے جو کچھ پڑھایا وہ بھی مجھے عذاب الٰہی معلوم ہوا۔

بچپن جیسے تیسے بیتا۔ یہ کبھی پتہ نہ چلا کہ لوگ بچپن کے بارے میں ایسے سہانے راگ کیوں الاپتے ہیں۔ بچپن نام ہے بہت سی مجبوریوں کا، محرومیوں کا۔ بڑے ہو کر ایک پوزیشن بنتی ہے جو ناانصافیوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت بخشتی ہے۔ آٹھ بڑے بھائی بہنوں کی شفقتیں جھیلنے کے بعد بڑے ہونے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ جب گھر میں چھوٹے بھانجے بھتیجے پیدا ہونے لگے تو اپنی بزرگی کا احساس نہایت تسلی بخش ثابت ہوا۔ مساوات کا فقدان امیر غریب کے معاملے میں ہی نہیں عورت اور مرد کے مقابلے میں تو اور بھی زیادہ ہے۔ میرے والد تو روشن خیال تھے۔ اصولاً بھی لڑکوں سے لڑکیوں کے حقوق کا زیادہ خیال رکھتے تھے مگر وہی بات تھی جیسے ہندو مسلم بھائی بھائی۔ لڑکا لڑکی برابر۔ چند نعرے تھے جن کی لیپ پوت نہایت ضروری سمجھی جاتی تھی۔

یہ میری خوش نصیبی یا بدنصیبی تھی کہ ہوش آیا تو باقی کی تین بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ کئی بھائیوں میں اکیلی لڑکی گھاٹے میں نہیں رہتی اور پھر ذرا بھی میری حق تلفی ہونے کا اندیشہ پیدا ہوتا تو فوراً ابا کے حضور میں مقدمہ پیش کر دیا جاتا۔ میری بہنیں نہایت سُگھڑ تھیں۔ اُردو فارسی قرآن شریف کے علاوہ کشیدہ کاری بنائی سلائی اور کھانے پکانے

میں مشاق میں نہایت پھوہڑ۔ پتّہ مارنے کی عادت نہ دلچسپی۔ بھائیوں کی نقل میں پیڑوں پر چڑھنا، سائیکل دوڑانا۔ ہر جگہ مجھے اپنی شکست کا احساس ہوتا۔ بھائیوں کے مقابلہ میں نہایت پھسڈی۔ انہیں بھی مجھ پر ترس کیوں آتا۔ میں ابا کی شہ پر اُن کی برابری پر تلی ہوئی تھی۔ باری باری سب کو گھوڑے کی سواری کا موقع ملتا تھا۔ جہاں میں گھوڑے پہ بیٹھی اور بھائیوں نے بڑبڑایا۔ گلی ڈنڈا کھیلتی تو پدتے پدتے بھوسہ نکل جاتا۔ فٹ بال کھیلنے کی ضد کرتی تو سارے کِک میری چاند پر ہی پڑتے۔ بھائی میری اس ڈھٹائی سے سخت نالاں تھے۔ میری بڑی بہنوں کی شادی سے پہلے گھر پر حکومت چلتی تھی۔ گودام کی کنجی قبضہ میں رہتی تھی۔ کپڑے سیتی تھیں۔ اس لئے بھائی اُن کے محکوم رہتے تھے۔ میں تو دردِ سری تھی۔

عظیم بھائی ہمیشہ کے بیمار ہی تھے۔ میں لڑکی ہونے کی وجہ سے بھائیوں کے ساتھ نہ نبھا سکتی تھی اور وہ بیماری کی وجہ سے مجبور تھے۔ اُنھیں کچھ مجھ پر ترس آگیا۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ لڑکے تو بیل ہیں تم بیل کیوں بنو۔ پڑھائی میں تم اُن سے ٹکر لو۔ وہاں تم اُنہیں مار لو گی۔

پھر انہوں نے مجھے بڑی محنت سے پڑھانا شروع کیا۔ دُوبار مجھے ڈبل پروموشن دلوایا اور ایک بار مجھ سے بڑے بھائی فیل ہوئے۔ وہ مجھ سے ڈیڑھ سال بڑے تھے۔ مگر تین درجے آگے تھے۔ پھر ایک دن ہم دونوں جب ایک کلاس میں آگئے اور میں نے اُن کا ہوم ورک کر کے ان کی مدد کرنی شروع کی تب میں اُن سے بڑی ہوگئی۔ عظیم بیگ چغتائی کی شہ پاکر میں نے قرآن کا ترجمہ حدیثیں اور مسلم سٹری پڑھی اور اپنے ابّا کے بزرگ دوستوں کے بیچ میں بیٹھ کر اپنی تازہ تازہ معلومات کا اظہار کرنا شروع کیا میری اماں دھک سے رہ گئیں اور حسبِ عادت جوتی سنبھالی، مگر ابّا کی شہ پاکر میں نے اپنے والد کے معمر دوستوں کی صحبت میں بہت کچھ سیکھا۔

میری اماں کو میری حرکتیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں میرے انجام کی انہیں سخت فکر تھی۔ یہ مرد مار باتیں عورتوں کو زیب نہیں دیتیں۔ وہ اپنی کم عمرائی سے نہ ان باتوں کو سمجھتی تھیں اور نہ سمجھا سکتی تھیں مگر مجھے معلوم ہوا کہ میری اماں کیوں ڈرتی تھیں۔ یہ مرد کی دُنیا ہے، مرد نے بنائی اور بگاڑی ہے۔ عورت ایک ٹکڑا ہے اس کی دُنیا کا جسے اُس نے اپنی محبت اور نفرت کے اظہار کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ وہ اُسے موڈ کے مطابق پوجتا بھی ہے اور ٹھکراتا بھی ہے۔ عورت کو دُنیا میں اپنا مقام پیدا کرنے کے لئے نسوانی حربوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ صبر، ہوشیاری، دانشمندی، سلیقہ، جو مرد کو اُس کا محتاج بنا دے۔ شروع ہی سے لڑکے کو محتاج کرو کہ وہ اپنا ہٹن ٹانکے" شرمائے۔ روئی ٹھوکے" ڈوب مرے۔ آسان سے چھوٹے چھوٹے کام جو نوکر کر سکتے" ہیں اپنے ہاتھ سے کرنا اُس کی زیادتیوں کو سر جھکا کر سہنا کہ وہ شرمندہ ہو کر قدموں پر گر پڑے۔

مگر میں نے تو بھائیوں کے حلقہ میں زندگی گزاری تھی۔ اُن کی ہر کی تھی اور اُن سے سبقت لے جانے کی قسم کھائی تھی۔ یہ نسوانیت مجھے ڈھونگ لگتی تھی بصلاحت مجھے جھوٹ معلوم ہوتی تھی صبر بزدلی اور شکر مکاری ہر نے ہاتھ گھما کر کبھی ناک نہیں پکڑی۔ یہاں تک کہ بننا سنورنا، سنگھار کرنا اور بھڑکیلے کپڑے پہننا بھی مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں اپنے عیوب چھپا دھوکہ دے رہی ہوں۔

"کوئی لڑکا ایسی لڑکی پر جان نہیں دے گا" میری ہوشیار سہیلی نے سمجھایا۔ سہم کر میں نے تھوڑا بہت سمجھنے کی کوشش کی اور میرے بھائیوں کی بن آئی۔ تکلف تو رہا نہیں تھا۔ جو اُلٹی سیدھی بات نہ کہنے میں صاف گو تو وہ چار ہاتھ صاف گو۔ میرے پیچھے دھیری لگ گئی لڑکے پھبتیاں کو پھبتیاں لگا رہی ہوں۔ بھلا پھر میری کیا مجال تھی جو سنگھار کر جاتی۔

اور تجربہ سے مجھے معلوم ہوا کہ سنولا یا بتیس سنگھار قطعی ضروری نہیں۔ مجھے دوستوں کی کبھی کمی محسوس نہ ہوئی یہی دوستیاں اکثر عشق حدوں کو چھو گئی۔ روس میں جب میں ایسی لڑکیوں سے ملی جو مصنوعات میں قطعی دلچسپی نہیں لیتیں اور نہایت سیدھے سادھے کام چلاؤ کپڑے پہنتی ہیں تو میں نے اُن سے پوچھا وہ سنگھار کیوں نہیں کرتیں۔

"ضرورت محسوس نہیں کی، کیوں کیا میں بُری لگتی ہوں؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں، مگر اور زیادہ اچھی لگو گی۔"

"میں کھرا مال پیش کرنے کی قائل ہوں۔ میری اپنی جلد اپنے ہونٹ میری نسوانیت ہی کافی ہے۔" اُس نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔

یورپ میں بھی نوجوان مبنی مصنوعات سے بور ہو چکا ہے۔ عورت
ور مرد کے ازلی رشتہ کو قائم رکھنے کے لئے مرد کا مرد اور عورت کا عورت
ونا کافی ہے۔ مجھے رُوسی لڑکیوں نے بہت متاثر کیا۔ میں نے اپنی کہانیوں
یں عورت کی اقتصادی محکومی اور مجبوری کا ہمیشہ رونا رویا ہے ایک لڑکی
ر اپنے دارثوں کا صرف اس لئے محکم مانتی ہے کہ اقتصادی طور پر مجبور ہے
زماں بردار نہیں دھوکہ باز ضرور ہو سکتی ہے۔ ایک بیوی شوہر سے صرف
س لئے چپکی رہتی ہے کہ روٹی کپڑے کا سہارا ہے تو وہ طوائف سے
مجبور نہیں۔ ایسی مجبور عورت کی کوکھ سے مجبور اور محکوم ذہنیت انسان ہی
م لے سکیں گے۔ ہمیشہ دُوسری ترقی یافتہ قوموں کے رحم و کرم پر اکتفا
یں گے۔ جب تک ہمارے ملک کی عورت مجبور لاچار ظلم سہتی رہے گی،
م اقتصادی اور سیاسی میدان میں احساس کمتری کا شکار رہیں گے۔

رشید جہاں نے مجھے کم سنی ہی میں بہت متاثر کیا تھا۔ میں
نے اُن سے صاف گوئی اور خود داری سیکھنے کی کوشش کی۔

بچپن میں میری ایک اور بڑی پیاری سہیلی تھی۔ ہمارے کوچوان
کی بیٹی منگو تھوڑی سی مجھ سے بڑی تھی اور بڑا رعب گانٹھا کرتی تھی۔ تیرہ
چودہ برس کی تھی کہ شادی ہو کر لکھنؤ چلی گئی۔ جب اپنی پہلی بیٹی لے کر آئی
بڑی بجھی بجھی سی ہو گئی تھی۔ سارا کھلنڈرا پن غائب، ہنسی گم۔ لڑکی
جننے کے جرم میں اس کی ساس اُسے بہت مارتی تھی اور اس کے میاں سے
بھی پٹواتی تھی۔

جب وہ تیسری بیٹی لے کر آئی تو ابا پنشن لے کر آگرہ آ گئے تھے۔
گرے کی گھٹی فضا میں مجھے عورت کی بے کسی کا تجربہ ہوا۔ پاس پڑوس
سب ہی عورتیں مدقوق مرجھائی اور شوہروں اور ساس نندوں کی
ستائی ہوئی تھیں۔ تعویز گنڈوں اور جان توڑ خدمت کے بل بوتے پر لڑکی
ہوئی تھیں۔ مجھے اپنے عورت پنے سے اور بھی گھن آ گئی۔

منگو بھی دق کی مریضہ معلوم ہوتی تھی۔ ساس دوسری بہو لانے
کے پلان بنا رہی تھی۔ جو بیٹا جن سکے۔ منگو کے ماں باپ روپیٹ رہے
تھے۔ منگو اور اُس کی تین بیٹیوں کے بوجھ کے خیال سے کانپ رہے تھے۔
منگو کی تین روتی بھنکتی لڑکیاں عورت ذات کی نااہلی کا کھلا اشتہار تھیں۔
مجھے خدا کی اس ناانصافی پر غصہ آتا تھا کہ اُس نے مجھے بھی لڑکی بنایا تھا۔
میں گڑگڑا کر دُعائیں مانگا کرتی تھی کہ اللہ پاک کسی طرح مجھے لڑکا بنا دے۔

ابا نے لکھنؤ میں پولیس سپرنٹنڈنٹ کے ذریعہ منگو کے میاں پر
زور ڈلوایا کہ وہ اُسے بُلا لے اور اگر اس پر سوت لایا تو تھکڑیاں ڈلوا
دی جائیں گی۔ سال بھر بعد جو منگو آئی تو پہچان نہ پڑتی تھی۔ لڑکا بھی نہیں جنا
تھا پھر بھی چکنی چپڑی ہو رہی تھی۔ معلوم ہوا منگو پر بھوتوں کا سایہ ہو گیا تھا۔
نہایت خطرناک قسم کے مرکھنے بھوت! جو منگو کے جسم میں سما کر اُسے درغلاتے
تھے اور وہ اپنی ساس کی ٹھکائی کرتی۔ میاں تک کی پنڈلی میں ایک دن
کاٹ کھایا۔ سب پر اُس کی دہشت بیٹھ گئی۔ بھوت اُتارنے والے آئے
انہوں نے کہا کہ ساس منحوس ہے اگر بہو اس کے ساتھ رہی تو سات
بیٹیاں جنے گی اور سارے کنبہ کا ناس ہو جائے گا۔ ساس بے چاری کا پٹڑا
ہو گیا۔ منگو کا میاں اُسے اپنی نئی نوکری پر ڈالی گنج لے گیا۔ وہاں وہ صاحب
لوگ کے گھوڑوں پر لگ گیا تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ منگو جاہل اور ان پڑھ
تھی، بالکل احمق نہ تھی۔ اپنی بساط بھر جو کچھ کر سکتی تھی کر ڈالا۔ عورت کمزور
ہو سکتی ہے ناقص عقل ہونا ضروری نہیں۔ میرے دل سے کچھ احساس کمتری
نکل گیا۔ لڑکا ہونا ضروری نہیں لڑکوں جیسی عقل اور سوجھ بوجھ چاہیئے۔ پھر تو میں
نے سینا پرونا اور سگھڑاپا دھر اطاق پر اور پڑھنے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

مذہب ہماری جانوں پر کبھی صرف جنت کی لالچ اور جہنم کا خوف بن
کر لاگو نہیں کیا گیا۔ ابا کے دوست ہر خیال اور عقیدے کے تھے۔ اُن کی باتیں
سُنکر بہت سے وہم اور وسوسے دل سے دُور ہو گئے۔ ہر انسان اپنی قبر میں
جائے گا۔ اپنے خدا سے خود بھگتے گا۔ دُنیا کا بھی کوئی خاص خوف نہ تھا۔ عمل
ویسے ہی سر پھرے اور بھٹکتی ہوتے ہیں اور ہمارا خاندان اتنا لمبا چوڑا تھا کہ
وہیں ساری دُنیا سمٹی نظر آتی تھی۔ ہر شخص اپنی چمڑی میں مگن اور خود مختار۔
لڑکوں کے لئے یہ عام رویہ مناسب سمجھا جاتا ہے، میں لڑکی تھی۔
اماں، خالائیں پھوپھیاں، چچیاں ہیبت زدہ تھیں۔ عورت ذات کو یہ منہ زوریاں
زیب نہیں دیتیں۔ سسرال میں کیسے گزر ہوگی۔ سماج نے عورت کا ایک
ٹھکانا مقرر کر دیا ہے۔ اس سے باہر قدم رکھا تو پر چھانٹ دیئے جائیں گے۔
زیادہ تعلیم بھی بلائے جان ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں قول و فعل پر پابندی نہیں
تھی۔ مگر یہ شرط صرف مردوں تک تھی۔ مجھے ان حرکتوں پر ڈانٹ کھانی پڑتی
تھی۔ پتہ نہیں عظیم بھائی کو کیا مزہ آتا تھا۔ وہ مجھے اور شہ دیتے تھے۔ شام

دفتر سے آکر اب بھی وہ مجھ سے گھنٹہ دو گھنٹہ ادھر اُدھر کی باتیں کیا کرتے تھے۔ بقول کسے مجھے بھڑکایا کرتے تھے۔ اُنہوں نے سنجیدہ و خشک مضامین چھوڑ کر کہانیاں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ جو کام وہ سنجیدہ مضامین سے نہ کر پائے۔ ان کہانیوں نے کر دکھایا مائن کی ہیروئن ایک نہایت شریر اور دلچسپ لڑکی کی مثالی صورت اختیار کر گئی۔ اُن سے میں نے سیکھا کہ اگر کچھ کہنا ہے تو کہانیوں قصوں میں لپیٹ کر کہو، کم گالیاں ملیں گی۔ زیادہ لوگ پڑھیں گے اور متاثر ہوں گے۔ کہانیاں لکھنے سے پہلے میں نے کئی مضامین لکھے جو چھپے بھی مگر کسی نے توجہ نہ دی۔ دو چار ہی کہانیاں لکھی تھیں کہ لے دے شروع ہو گئی۔ جیسے ٹیلی فون پر آپ جو چاہے کہہ دیجئے گا کوئی تھپڑ نہیں مار سکتا۔ ویسے ہی کہانیوں میں کچھ ہی لکھ مارئے کوئی ہاتھ آپکے گلے تک نہیں پہونچے گا۔ دوسرے مجھے شروع میں لوگوں کے ردِ عمل کا پتہ بھی نہ تھا۔ صرف ساتی میں لکھتی تھی۔ اُن کے پاس جو خط میرے نام آتے تھے وہ اُنہیں ضائع کر دیتے تھے۔ بدقسمتی سے 'لحاف' وہ پہلی کہانی تھی جو عین شادی کے بعد چھپی اور شاہد احمد صاحب نے اب مجھے ذمہ دار سمجھ کر سارے خطوط حفاظت سے میرے سپرد کر دیئے۔ ان خطوں کا لہجہ اتنا بھیانک تھا کہ پہلے تو میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں نے سہم کر اپنے قلم کی لگام کھینچی اور اپنی دانست میں تو میں نے اُس کے بعد ڈھیل نہیں چھوڑی لیکن 'براہوائس' ماحول کا جہاں میں نے پرورش پائی۔ دھڑلے سے بات کہنے کی عادت نہیں چھوٹی اور لوگ جھلا کر گالیوں پر اتارو ہو جاتے ہیں۔ تو مجھے اُن سے کوئی ذاتی عناد نہیں ہوتا۔ بہت سی مار پیٹ فوج کھسوٹ کے بعد پھر مل بیٹھنے کی عادت رہی۔ کبھی چٹکی لینے میں مزہ آتا ہے اگر کوئی پلٹ کے تھپڑ مارے تو اس سے بغض نہیں پیدا ہوتا۔

زندگی میں سب سے زیادہ مجھے کتابوں نے متاثر کیا ہے۔ مجھے ہر کتاب سے کچھ نہ کچھ ملا ہے اپنی زیادہ تر الجھنوں کا جواب اُن ہی میں ڈھونڈا اور پایا ہے۔ کتابیں قریب ترین دوست اور غمگسار ثابت ہوئی ہیں۔ ہزاروں محرومیاں، تاریکیاں اِن ہی دوستوں کے سہارے جھیلی ہیں۔ ہر کتاب کے مصنف کو میں نے ایک قسم کا رشتہ دار سا محسوس کیا ہے۔ نام کہاں تک گناؤں، ہارڈی براونٹی سسٹرز سے شروع کر کے برنارڈ شا تک پہونچی۔ مگر رُوسی ادیبوں نے زیادہ متاثر کیا کہ جب عقل و ہوش کو کسی راہبر کی تلاش تھی تب اِن کتابوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ پولیٹکل، فلاسفی خشک مضمون رہی اور رُوسی ادب ذہن کے کونے کونے میں جذب ہو گیا۔ چیخوف کو تو میں آج بھی برکت کے لئے آموختہ کے طور پر پڑھتی ہوں۔ جب کوئی کہانی قابو میں نہیں آتی پتہ نہیں چلتا کہاں سے شروع کروں کہاں ختم کروں تو میں دماغی ورزش کے لئے چند کہانیاں چیخوف کی پڑھ ڈالتی ہوں ایک دم ذہن پر دھار سی رکھ جاتی ہیں اور قلم چل نکلتا ہے۔

پڑھنے کے بعد باتوں کا مزا آتا ہے۔ ہمارا خاندان نہایت بکواس جب ڈوچار مل بیٹھتے ہیں تو بس ہوش ہی نہیں رہتا۔ چلتے پھرتے کھاتے پیتے بس بکے جا رہے ہیں۔ ایک صاحب مجبوراً غسل کرتے جا رہے ہیں باقی میں حصہ لیتے جا رہے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھڑکی سے سر نکالتے ہیں صابن ملتے جاتے ہیں اور باتوں کا سلسلہ چلائے ہوئے ہیں مجھے ہر انسان سے بات کرنے میں مزہ آتا ہے۔ دکانداروں سے سودا سلف والوں سے ٹیکسی والوں سے یہاں تک کہ بھیک مانگنے والوں سے۔ بڑھیوں بڈھوں کو چھیڑ کر اُن کی ملامتیں گالیاں سننے میں بھی عجب لطف آتا ہے۔ تعلیم یافتہ عالم فاضل ہونے کی کوئی شرط نہیں۔ نہایت جاہل اور سیدھے سادے انسان سے بات کر کے بعض وقت دماغ میں کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔ انسان کو پہچاننے کے لئے اس سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔ بات کرنے کی اتم پریکٹس ہو گئی ہے کہ پانچ منٹ میں پوری زندگی کا خلاصہ ہاتھ آجاتا ہے بس چند نہایت سیدھے مختصر سے سوال پوچھ لیجئے۔ ملاقات بھرپور طریقہ پر ہو جائے گی۔

باتیں کرنا دلچسپ ترین مشغلہ ہے۔ صفیہ جان نثار سے تو اُس کی مختصر سی زندگی میں اتنی باتیں ہوئیں کہ اوروں سے برسوں مل کر بھی نہ ہوئی منٹو سے باتیں کر کے احساسات پر دھار آجاتی تھی۔ چھ چھ سات سات گھنٹے منٹوں میں گزر جاتے تھے۔ اس کی بیوی صفیہ بھی ایک لاثانی عورت ہے سلطانہ جعفری سے تو بس گپیں ہوتی ہیں سردار جعفری سے کج بحثی اور جملہ بازی میں مزہ آتا ہے۔ جن لوگوں نے سردار سے بات کی ہے اُنہیں اندازہ ہو گا کہ جتنی تلخی ترشی اور کاٹ اس شخص کی زبان میں ہے اتنی ہی نرمی اور مٹھاس بھی ہے۔ جلانے پر آئے تو بھون کے رکھ دے۔ ایک زمانہ تھا جب محفلوں میں جہاں کی شامت آجاتی، سردار اُسے رُلا کے ہی دم لیتے۔ بس چوکھی چوٹوں پر چوٹ

جب سے بیمار ہوئے ہیں محفلیں کچھ بجھی بجھی محتاط سی ہوگئی ہیں۔ قدسیہ زیدی سے باتیں کرکے جی ہی نہیں بھرتا تھا۔ اب اُن کی بیٹی شمع سے باتیں کرتی ہوں تو اُن کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ سلمہ صدیقی سے بس دو باتیں کرو کام دہن معطر ہوجائے گا۔ تمینی انتہائی بکی واقع ہوئی ہیں۔ نہایت سریٹ بولتی ہیں جیسے بولنے کو بہت ہے اور وقت بھاگا جارہا ہے۔

مگر صاحب باتوں کے معاملے میں میری ماموں زاد بہنوں اختر اور جمیلہ کا کوئی جواب نہیں اُن کے مقابلے میں عام طور پر لوگ گونگے معلوم ہوتے ہیں۔ اُن سے گھنٹوں باتیں کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے میری اپنی زبان پر سے سارا رنگ کھرچ گیا۔ آپ ہی آپ جلے ہونٹوں پر سے پھسلنے لگتے ہیں۔ ٹوٹے ادھورے کٹے جملے مگر معنی سے بھرپور اُن کی زبان میں اپنی ننھیال کے ناتے دلی کی بیگمات کی میٹھی بولی کا عجیب نمکا ہے۔ میری کہانیوں میں مکالمے اُن ہی کی زبان سے نکلے ہوئے ہیں۔ پڑھنے، بگھارنے کے بعد لکھنے کی باری آتی ہے۔ فارسی ہمارے خاندان کی مادری زبان سمجھی جاتی تھی۔ ہمارے نانا فارسی کی حمایت میں اکیلے سپاہی کی طرح ہمیشہ دیوار پاکھوں سے لڑتے رہے۔ اپنے بیٹوں کو انہوں نے انگریزی تعلیم قطعی نہیں دی۔ فرفر فارسی بولتے، پڑھتے اور لکھتے تھے۔ مگر کسی نوکری میں نہیں کھپے، قلاش مرے۔ پھر بھی انہیں ضد تھی کہ سب بھتیجوں کو بھی فارسی ہی پڑھائی جائے۔ ہمارے ابا جو اُن کی ہر بات پر صاد کر دیتے تھے اس بات پر اڑ گئے۔ لڑکوں کو نہیں ہاں لڑکیوں کو فارسی پڑھائیے کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اُس وقت کی بات ہے کہ جب بڑی تین بہنیں فارسی پڑھ کر بیاہی جاچکی تھیں۔ تختۂ مشق بننے کے لئے خاکسار ہاتھ آئی۔ بھائیوں نے اس فیصلے پر اپنی برتری مانی اور مجھے مدِ فاضل قرار دے کر اتنا چڑایا کہ فارسی میری چڑھ ہوگئی۔ مگر تایا ابا کو سوائے نماز پڑھنے کے اور مجھے فارسی پڑھانے کے کوئی کام نہ تھا۔ لہٰذا وہ جیتے اور میں ہاری۔ "پڑھو فارسی بیچو تیل"، بھائی جلے پر تیل چھڑکتے اور میں آنسو بہاتی بالآخر فارسی رٹتی جاتی۔ جونہی میرا بس چلا میں نے فارسی سے بغاوت کر دی، مگر جب تک تایا ابا اتنی پڑھا چکے تھے کہ بعد میں اپنے شوق سے جب قدیم اور جدید فارسی ادب پر طائرانہ نظر ڈالنے کا موقع ملا تو زبان مانوس معلوم ہوئی اس وقت ابا آبا کا انتقال ہوچکا تھا اور میں اُن کا شکریہ بھی ادا نہ کرسکتی تھی۔ پھر بھی انجانے در پر مجھے فارسی الفاظ کے استعمال میں تکلف ہوتا تھا۔ دوسرے جو زبان گھر میں بولی جاتی تھی اتنی سریٹ تھی کہ کہانیاں لکھتے وقت کبھی رُک کر سوچنے کی قباحت نہیں ہوئی۔ انسان اپنے ہر خیال کا اظہار روزمرہ کی بولی میں کرسکتا ہے تب ہری زبان ہندی سے زیادہ قریب تھی کیوں کہ ہندی جب اتنی گاڑھی نہیں ہوئی تھی۔ نہایت رواں اور میٹھی زبان تھی جو اب دلی آگرہ کی عورتوں کے لبوں پر زندہ رہ گئی ہے۔

لکھنے میں میں نے ہمیشہ پڑھنے جیسا لطف محسوس کیا۔ میں نے اپنی زندگی کے نہایت دلچسپ اور نہایت ہی کٹھن لمحے لکھنے کے سہارے جھیلے ہیں۔ کتنے بوجھ اُتارے ہیں اور کتنے بڑھائے ہیں۔ یہ قلم میرا رزاق بھی ہے اور ہمدم، ہمراز بھی۔ تنہائی کا بولتا چالتا دوست بھی۔ اس کی موجودگی میں میں نے کبھی اکیلاپن محسوس نہیں کیا۔ میں جب چاہوں اس اُڑن کھٹولے کے ذریعے سے جسے چاہوں بلا لوں۔ اور جب وہ آجائیں تو جو جی چاہے اُن سے کہوں، ہنساؤں رُلاؤں یا جی جلا کر خاک کر دوں پھر موڈ آجائے تو پُرزہ پُرزہ کرکے فنا کر دوں۔ کٹھ پتلیوں کی طرح پُتلے بنا کر جیسے چاہوں نچاؤں۔ اس وقت مجھے ایک خالق کی سی تقویت محسوس ہوتی ہے۔ اگر یہ بتانے لگوں کہ مجھے کس نے متاثر نہیں کیا تو آسان ہوگا۔ زندگی میں جس سے بھی واسطہ پڑا اُس نے اپنا نقش دماغ پر چھوڑا عظیم بھائی کے بعد میرے دوست، سہیلیاں، اُستاد اور راہ چلتے ملنے والے۔ ڈاکٹر اشرف نے کتنے ہی سوالوں کو سلجھایا۔ ڈاکٹر رام بلاس شرما نے بکھرے ہوئے تاروں کو جوڑ کر ایک سلسلہ قائم کرنے میں سہارا دیا۔ کرشن چندر کی کہانیوں میں عجیب عجیب نازک پتھروں سے ملاقات ہوئی۔

فضل الرحمان پر وولسن چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی سے تو جب بھی ملتی ہوں اُنہیں ڈکشنری کی طرح استعمال کرتی ہوں کسی بھی ڈرامہ یا شعر کا حوالہ دیدیجئے، پھر وہ سناتے چلے جائیں گے۔ انہوں نے انجانے طور پر مجھے بہت پڑھایا ہے۔ شاہد لطیف سے شوہر کے علاوہ ایک رشتہ تھا جب دوستی کے موڈ میں آجاتے تھے تو بہت گھٹتی تھی۔ گو شادی دوستی کی موت ہے مگر ہماری دوستی نے بڑی ڈھٹائی سے ساتھ دیا۔ میری تمام ناولوں و کہانیوں پر وہ نظر ثانی کیا کرتے تھے کبھی انہیں بتانے کی توفیق نہیں ہوئی۔ مگر اُن سے چھپا کر میں اُن کی رائے کو بہت اہمیت دیتی تھی۔ بگڑ لیتے تھے تو بہت رعب گانٹھتے تھے۔

بچوں کی ناول تین اناڑی میں میں نے اپنے تین بھتیجوں کو بجنسہ اٹھا کر رکھ دیا ہے۔ اگر اُسے اُن کی سوانح عمری کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

علی گڑھ میں ہمارے خاندانی دھوبی نتھا رام میرے خاصے گہرے دوست ہیں جب جاتی ہوں خود کپڑے لینے آتے ہیں، گھنٹوں اکڑوں بیٹھے گپیں مارا کرتے ہیں۔ میں نے ان کی زبان سے وہ کہانیاں سنی ہیں جو کتابوں میں نہیں ملتیں۔ زیادہ تر اپنی لرزتی ہوئی بوڑھی آواز میں کتھائیں گا کر سناتے ہیں۔ چاندی کی انگوٹھی والی انگلی سے چوکھٹ پر تال دیتے جاتے ہیں۔ منکارے سے میوزک پیس بھی لگاتے جاتے ہیں۔ اُن کے گرو ایک سقہ ہیں جو بہت گیانی ہیں۔ بیچ بیچ میں گرو کے اقوال دہراتے جاتے ہیں الہ اور دل بڑی دھوم سے سناتے ہیں۔ پانچ روپیہ فیس اور ایک روپیہ — آنے جانے کا رکشا کا کرایہ وصول کر کے چار پانچ گھنٹے سنا جاتے ہیں۔ پوچھو تو ٹھیٹ برج بھاشا میں تشریح بھی کر دیتے ہیں۔ میں نے اُن کے طبقہ کی زبان اُن ہی سے سیکھی ہے۔

کالج میں مختلف مذاہب کے بارے میں ڈاکٹر ٹکر کی کلاس میں لکچر سننے کے بعد اُن کی رہنمائی میں بہت کچھ پڑھنے کا موقع ملا۔ مذہب کے بارے میں جو کچھ جالے دماغ پر تن گئے تھے صاف ہوگئے۔ بدھ مذہب نے بے حد متاثر کیا۔ بی اے کرنے کے بعد جائیداد کے سلسلے میں اپنے آبائی وطن آگرہ جانے کا اتفاق ہوا۔ معلوم ہوا دوسرے دن سوشی میری بچپن کی گوئیاں کی شادی ہے۔ سارے گھر کا بُلاوا آیا ہے مجھے تعجب ہوا لالہ جی جیسے تنگ خیال کٹر انسان سے میرے بھائی کا لین دین کیسے قائم ہے۔ میں خود تو تمام بندھن توڑ کر ایک ایسے مقام پر پہونچ چکی تھی جہاں انسانیت ہی واحد خدا رہ جاتا ہے، میرا اور سوشی کا کیا جوڑ۔ سوشی فراڈ ہے جس سے ماں باپ نے پلّے باندھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُسی کو خدائے مجازی بنانے کو تیار ہوگئی۔ مجھے وہ جنم اشٹمی والا دن یاد تھا گو اُس کے بعد آگرہ چھوٹ چکا تھا اور ہم لوگ علی گڑھ چلے آئے تھے لالہ جی کو پتہ چلا تو جھٹ سے چھوٹے بیٹے سُریش کو بھیجا۔ میں نے ٹالنا چاہا۔

"شام کو آؤں گی۔"

"دیدی کہتی ہے بس دو گھڑی کو آجاؤ پھر رسمیں شروع ہو جائیں گی تو بات نہ ہو سکے گی۔" سریش پیچھے پڑ گیا۔

میں گئی تو سوشی ہلدی لگائے اسی کمرے میں بیٹھی تھی جہاں ایک دن بھگوان کرشن کا جھولا سجایا گیا تھا۔ جہاں سے مجھے بیک بینی اور دو گوشن نکالا گیا تھا۔ جی چاہا اُلٹے قدم واپس چلی آؤں، مگر مجھے دیکھ کر وہ لپکی۔

"کیسی ہے ری چُنی؟" اُس نے میرا پیار کا نام لے کر پکارا۔ بچپن کے ساتھ یہ نام بھی کہیں دُور چھوڑ آئی تھی۔ عجیب سا لگا جیسے وہ مجھ سے نہیں کسی اور سے مخاطب ہو رہی تھی۔ اُس نے ہاتھ پکڑ کے مجھے اندر گھسیٹا اور کنڈی چڑھا دی۔ باہر نانی ماں بڑبڑا رہی تھی۔

"ایسے سمے ہر کوئی کا آنا جانا ٹھیک نہیں۔"

وہ دیر تک بھری بھری آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ میری جھوٹی پر تکلف مسکراہٹ سے اُس نے دھوکا نہیں کھایا۔ اُس نے شرارت سے مسکراہٹ دبا کر دیکھا، جیسے روٹھے ہوئے بچے کو دیکھتے ہیں۔

"ہائے رام کتنی لمبی تاڑ کی تاڑ ہوگئی۔" پھر بھی دیوار میں کوئی شگاف نہ ملا تو اُس نے الماری کھولی اور مٹھائی کی تھالی نکالی۔ میں لڈو ہاتھ میں لینے لگی کہ باہر جا کر کوڑے پر پھینک دوں گی۔ جو ہم سے چھوت کرے ہم اس کا چھوا کیوں کھائیں۔

"اُہنک، منہ کھول۔"

میں نے مجبوراً ذرا سا لڈو کتر لیا۔ باقی کا بچا ہوا لڈو سوشی نے منہ میں ڈال لیا۔ تو وہ بھی نہیں بھولی تھی۔

دیوار نے بانہیں کھول دیں۔ دیر تک ہم سر جوڑے بچپن کی سہانی وہ حماقتوں کو یاد کر کے ہنستے رہے۔ چلتے سمے سوشی نے ایک ننھا سا پیتل کا گھنٹوں چلتا بھگوان کرشن کا مجسمہ میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔

"لے چڑیل! اتو تیرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑی۔"

میں مسلمان ہوں۔ بُت پرستی شرک ہے! مگر دیوالا میرے وطن کا ورثہ ہے۔ اس میں صدیوں کا کلچر اور فلسفہ سمویا ہوا ہے۔ ایمان علیحدہ ہے، وطن کی تہذیب علیحدہ ہے۔ اس میں میرا برابر کا حصہ ہے جیسے اس کی مٹی دھوپ اور پانی میں میرا حصہ ہے۔ میں ہولی پر رنگ کھیلوں دیوالی پر دیئے جلاؤں تو کیا میرا ایمان متزلزل ہو جائے گا۔ میرا یقین اور شعور کہ

اتنا بودا ہے، اتنا ادھورا ہے کہ ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔

اور میں نے تو پرستش کی حدیں پار کر لیں:

غرض کوئی کہاں تک لکھے۔ کھلی آنکھیں، کھلے کان کیا کیا دیکھتے سنتے ہیں۔ دماغ میں ایک نکتہ سا لگ جاتا ہے۔ یہ نکتے جڑ کر الفاظ کی شکل میں ڈھل جاتے ہیں۔ الفاظ سے عبارت کی لڑی بنتی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نکتے کے موتی کی جگہ زخم لگتا ہے۔ زخم سے زخم جڑ کر لفظ نہیں بنتا، عبارت کی لڑی نہیں سنورتی، ایک خلا سا پیدا ہو جاتا ہے۔ جب ہندو مسلم فساد کی ملک کے کسی حصے سے خبریں آتی ہیں تو میرا قلم میرا منہ چڑھاتا ہے۔ اور سوشی کا کھلایا ہوا انڈا حلق میں زہریلا کانٹوں دار گولہ بن کر پھٹنے لگتا ہے۔ تب میں الماری میں رکھے ہوئے بال کرشن سے پوچھتی ہوں۔

"کیا تم واقعی کسی اگلے شاعر کا خواب ہو؟ کیا تم نے میری جنم بھومی پر ہی جنم نہیں لیا۔ بس ایک وہم ایک آرزو سے زیادہ تمہاری حقیقت نہیں۔ کسی مجبور اور بندھنوں میں جکڑی ہوئی ابلا کے تخیل کی پرواز ہو کہ تمہیں رچنے کے بعد اس نے زندگی کا زہر ہنس ہنس کے پی لیا۔

کیا تم اس دھرتی کے حلق میں اٹکا ہوا تیر نہیں نکال سکے؟

مگر پتیل کا بھگوان میری حماقت پر ہنس بھی نہیں سکتا کہ وہ دھات کے خول میں منجمد ہو چکا ہے۔ سیاست کہ دنیا کا سب سے منافع بخش پیشہ ہے دنیا کا خدا ہے۔ سیاست کے میدان میں کھائی ہوئی مات کے سیاہ دھبے معصوموں کے خون سے دھوئے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی نااہلی ثابت کرنے کے لئے انسانوں کو کتوں کی طرح لڑایا جاتا ہے۔

کیا ایک دن پتیل کا یہ خول توڑ کر خدا باہر نکل آئے گا؟


اگلے شمارے میں

غبارِ کارواں سیریز کے تحت

فراق گورکھپوری کا مضمون پڑھئے


صغیر احمد صوفی

# عکس

عجیب نام تھا اُس کا عجیب چہرا تھا
وہ اپنے آپ سے بھی اجنبی سا رہتا تھا!
تمام عمر تھا تنہائیوں کے مدفن میں
وہ اپنے نام کے سائے سے بھی لرزتا تھا
اُتار دیتا تھا پیراہن خموشی جب
وہ گفتگو کے سمندر میں ڈوب جاتا تھا
کبھی بہم نہ ہوئے قربتوں کے طوفاں میں
وہ موج موج سمندر تھا میں کنارا تھا
میں خود بھٹک گیا اُس کی گلی میں کہنے کو
ہر ایک سمت مرے درد کا اُجالا تھا
نفس نفس ہے غمِ انتظار کی خوشبو
کئی برس ہوئے اک شخص آنیوالا تھا
اسی لئے ہوئی تصویرِ زندگی مبہم
کہ اُس میں رنگ حقیقت کا کچھ زیادہ تھا!
ہر ایک شے تھی بدستور، پھر بھی تیرے بغیر
ہمارے گاؤں کا اب کے، اُداس میلا تھا
انا پرستوں نے صوفی کو سنگسار کیا
کہ سرکشی میں زمانے سے وہ نرالا تھا

# شاعرِ پاس گریباں

مصطفےٰ علی اکبر



سلیمان اریب

سلیمان اریب نے کوئی پندرہ سال پہلے ایک شعر سنایا تھا اور اسی وقت میں اس شعر کو صرف پسند کر سکا تھا لیکن آج جبکہ اریب، اپنا یہ شعر سنانے کے لئے ہم میں موجود نہیں ہے، میں اس شعر کا مفہوم خوب سمجھنے لگا ہوں ؎

منزل پہ پہونچ کر پوچھ رہے ہیں لوگ یہ کیسی منزل ہے
ہر موڑ پہ جب ایک قاتل تھا ہر راہ میں اب اک مسئل ہے

اریب نسل کے اعتبار سے عرب تھے لیکن اس میں بسمل بننے کی پوری پوری صلاحیت تھی اور زندگی بھر بسمل ہی بنے رہے۔ اریب کا قد لمبا تھا، رنگت گوری، چہرے پر چیچک کے داغ، بال سیدھے، سرخی مائل اور پوری گردن کو ہمیشہ اپنی آڑ میں چھپائے ہوئے۔ اریب کا وطن حیدرآباد تھا اور دکن کی خاک نے ہی، تیمر کو اپنے سپوت کو اپنے دامن میں چھپا لیا ــــ میں فی الحال بحیثیت ایک شاعر اسے نقادوں کے سپرد کرتا ہوں۔ اور صرف اس کی دوستی اور شخصیت کی طرف آتا ہوں۔ کیونکہ وہ اریب جو ایک انسان تھا میرا خاصا شناسا رہا ہے اور اپنے اپنے میدان میں ہم اگرچہ ایک دوسرے سے کافی دور اور مصروف تر رہے مگر انسانوں کے جمگھٹے میں ہمیشہ پاس پاس اور بہت نزدیک۔ آج جب میں ماضی کے پردے سرکا کر نظر دوڑاتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ میں نے اریب کو ہر دور اور ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ اس سارے عرصے میں زمانہ بدلا، زمانہ کی قدریں بدلیں، رکھ رکھاؤ اور زندگی کے سلیقے بدلے، رجحان اور لباس بدلے اور ایسے بدلے جیسے ہر تین چار ماہ بعد موسم بدلتا ہے، لیکن اگر نہیں بدلا تو سلیمان اریب۔ جیسے وہ کسی جگہ قدم جما کر زمانے بھر سے کہہ رہا ہو "جاؤ میں نہیں بدلتا ــــ"

حیدرآباد میں معظم جاہی مارکٹ پر واقع مجرد گاہ کا کمرہ نمبر ۱۷، صبا، صفیہ اور مسکراہٹ۔ زندگی کی آخری سانس تک اریب نے ان چار چیزوں کو اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ اریب بذات خود ایک ادارہ، ایک رسالہ، ایک انجمن تھا۔ کمرہ ۱۷ میں اس کی محفل اور اس کی مجلس ہمیشہ برقرار رہی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین، کمیونسٹ پارٹی اور صبا کسی نہ کسی روپ میں اریب نے اپنی محفل کو گرم رکھا۔ لوگ بدلتے گئے۔ ایک گیا تو دوسرا آگیا۔ پرانے دوستوں نے منہ موڑا تو نئے چاہنے والے آگئے مگر یہ مجلس گرم ہی رہی۔ اریب نے کبھی ہار نہیں مانی، وہ ہمیشہ ایک مرکز بنا رہا۔ حوصلہ طمانیت اور سکون دینے والے ایک دوست کی حیثیت سے اس نے دوسروں کے دکھ بانٹنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اریب کو بحیثیت شاعر ایک دنیا جانتی ہے مگر بحیثیت دوست وہی چند لوگ جانتے ہوں گے جو اس کے دوست تھے یا جنہیں وہ خود اپنا دوست سمجھتا تھا۔ وہ ایک تاجر تھا۔ دوست

ے اپنے غم اور دکھ بیچتے اور وہ انہیں مسکراہٹ کے عوض خرید لیتا۔ اس نے
ندگی بھر شاید یہی ایک سودا کیا، ورنہ۔ وہ خوب جانتا تھا کہ یہ تبسم ہی
راصل اس کی ہستی کی تمام ترقیت ہے اور جس روز وہ اس تبسم سے محروم ہوجائے
، وہ چاہے جو کچھ بھی باقی رہ جائے۔ مگر اریب باقی نہیں رہے گا چنانچہ اس
نے کبھی اپنے تبسم کو کوئی نام کوئی معنی کوئی مخصوص رنگ عطا نہیں کیا بلکہ تبسم کو
الص تبسم رہنے دیا۔

۵۲-۱۹۵۱ء میں جب ماہنامہ "چراغ" نکلا تو اریب کا نام بھی
س کی مجلس ادارت میں تھا۔ لیکن تیل کی جگہ اپنا خون دے دے کر بھی جب چراغ
، روشنی کو وہ بڑھا نہ سکا تو یہ پرچہ بند گیا۔ پھر اس نے پروفیسر زور کے رسالے
سب رس" کے ادارتی بورڈ میں شرکت کی اور جون ۱۹۵۳ء سے "سب رس"
ے انتظام سے نکلنے لگا۔ لیکن کوئی پندرہ پرچے ہی شائع ہوئے تھے کہ جنوری ۱۹۵۵ء
یں یہ انتظام بھی ختم ہوگیا۔ اسی عرصے میں پہلی اردو کانفرنس ہوئی جس میں
ریب نے جی جان سے کام کیا اور "سب رس" کا اردو کانفرنس نمبر" بھی نکالا۔
س کے بعد اریب نے خود اپنا پرچہ نکالا "صبا"۔ مگر بیچنا کبھی نہ آیا۔ صبا چلانے
ے لئے خود اُسے بہت چلنا پڑتا تب کہیں جاکر صبا کچھ کچھ چلتا۔ ہر مہینے وہ عہد
تا کہ اگلا شمارہ بروقت اور ماہ بہ ماہ شائع کروں گا۔ اور ہر پرچے کو پہلے پرچے
طرح بڑی آرزوؤں اور ارمانوں سے نکالتا لیکن پھر اُسے ایسا لگتا کہ یہ شاید
زی پرچہ ہے۔ صبا اُس کے ذہن میں ایک بچے کی سی محبت، ترتیب، اور
بیت سے نشو و نما پاتا رہا۔ وہ صبا کا آخری وقت تک دیوانہ اور ساتھی رہا
ب کا آدھا حصہ بالکلیہ صبا کے لئے تھا اور اُسے اپنی یہ آدھی شخصیت سب
زیادہ محبوب اور پسند تھی۔

حیدرآباد کی معظم جاہی مارکٹ کے نکڑ پر اخبار نویسوں، شاعروں
یبوں اور دانشوروں کی رات دیر گئے تک جھکیں ہوا کرتیں۔ بادہ خواری بھی

ی، شعر بھی کہے جاتے، پروگرام بھی بنتے۔ علمی بحثیں بھی ہوتیں اور شکوے شکایتیں
۔ اریب بھی اس محفل کی زندگی ہوا کرتا۔ ان محفلوں نے اریب کو محبت
خلوص بھی دیا لیکن بدنامی کے داغ بھی اس کے حصے میں آئے لیکن وہ اپنی
اور خلوص سے برابر کام کرتا رہا۔ پھر اس نے شادی کی اور صفیہ کی
رت میں اُسے صرف ایک بیوی نہیں ملی بلکہ ایک سچا ساتھی ایک دوست
ایک رازدار ملا اور جیسے اُسے نئی کمک مل گئی۔ اُس نے پہلے بھی ہار نہیں مانی
تھی۔ مگر اب وہ اکیلا نہیں رہا تھا پھر کیسے ہار جاتا۔

پھر میں اریب کو ان ہی مختلف اور متضاد کیفیتوں میں چھوڑ، دلی چلا آیا،
لیکن اریب پھر بھی میری نظروں سے اوجھل نہیں تھا۔ اس کے بارے میں
برابر خبریں آتی رہتیں۔ عجیب اتفاق کی بات کہ جب وہ آخری بار دلی آیا
کسی مشاعرے میں شرکت کے لئے تو میرے پاس بھی آیا۔ آخری ملاقات کافی
طویل رہی۔ سنا تھا کہ وہ بیمار ہے لیکن اس ملاقات میں مجھے لگا لوگ اس
کی بیماری کی خبریں پھیلاتے ہیں۔ ورنہ وہ تو بھلا چنگا اسی طرح مسکراتا، چہرہ
میں وہی تاب۔ بات میں وہی زور، مذاق میں وہی ترنگ لئے نظر آیا۔ یہ
بات بھلا بیمار آدمی کے بس کی تھوڑا ہی ہے۔ لیکن میں نے غلط سوچا تھا۔
وہ واقعی بیمار تھا اُسے معلوم تھا کہ غموں، دکھوں اور زخموں کے بعد اب
کینسر کو بھی اُس کے سینے میں پناہ ملی ہے، وہ اس موذی مرض کو اپنے
سینے میں پناہ دے کر خوش تھا۔ پھر خبر ملی کہ اریب کی آواز بند ہوگئی ہے،
وہ بات کرتا تو سرگوشی کے انداز میں آنکھ کے اور ہاتھ کے اشارے سے۔
اب وہ اسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا لیکن مزاج پرسی کرنے کے لئے
آنے والوں سے بھی اس نے دکھ کا اظہار نہیں کیا، مسکراہٹوں کے پھول
ہی بکھیرے۔ آنکھوں میں چاہے اتھاہ غم کی لہریں اُٹھ رہی ہوں لیکن ہونٹوں
نے مسکرانا نہیں چھوڑا۔ موت سے سب ڈرتے ہیں لیکن خود موت ڈرتی ہے مسکراہٹ
سے اور اسی ہتھیار سے اریب نے موت سے پنجہ ملایا۔ تین چار مہینے کی اس
کشمکش کے بعد اریب نے خون کی قے کی اور بے ہوش ہوگیا۔ موت نے
دیکھا مسکراتے ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست ہیں، اس سے اچھا موقع
اُسے کہاں ملتا۔ جس طرح زندگی میں اریب نے نادانستگی میں دوستوں سے
شکست کھائی اسی کمزوری سے موت نے بھی فائدہ اٹھایا اور اس سے پہلے
کہ اریب جاگتا اور مسکراتا، موت نے اپنا کام مکمل کر لیا۔

اریب نے شراب کے تلخ گھونٹوں کے ذریعہ اپنی مسکراہٹوں کی
آبیاری کی۔ کینسر کی موذی بیماری بھی اس کے لبوں سے مسکراہٹ کو جدا نہ کر سکی
اور جس طرح مسکرا مسکرا کر اس نے شعر پڑھے اسی طرح مسکرا مسکرا کر ہی
اس نے جان آفریں کے سپرد بھی کر دی اور یہی ہمت اور جسارت، اریب
کو دوسرے انسانوں سے الگ اور ممتاز کرتی ہے۔

نومبر ۱۹۷۰ء میں دیش بندھو چترنجن داس کی سوویں سالگرہ منائی جارہی ہے۔ دیش بندھو ہمارے ان رہنماؤں میں تھے جن کی خوش گوار یاد آنے والی نسلوں کو خدمت، ایثار، محبت اور بھائی چارے کا درس دیتی رہے گی۔ اگرچہ وہ شروع ہی سے ہندوستان کی آزادی کے حامی تھے۔ لیکن جدوجہد آزادی میں سرگرم حصہ انہوں نے اپنی زندگی کے صرف آخری چھ برس میں ہی لیا اور اس قلیل مدت میں انہیں جو شہرت اور عزت حاصل ہوئی وہ شاید ہی اُن سے پہلے کسی قومی رہنما کو حاصل ہوئی ہوگی۔ اس بات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۶ جون ۱۹۲۵ء کو اُن کے انتقال کی خبر سنتے ہی سارا ہندوستان ایک ماتم کدہ بن گیا۔ اور پھر جب مہاتما گاندھی کی قیادت میں کلکتہ میں ماتمی جلوس نکالا گیا تو اس میں ۵ لاکھ سے زیادہ افراد شامل تھے۔ بھیڑ اتنی زیادہ تھی کہ ارتھی کو کندھا دیتے ہوئے گاندھی جی کا پاؤں پھسل گیا۔ اگر اس وقت والنٹیرز انہیں اپنے شانوں پہ نہ اُٹھالیتے تو شاید وہ اس جم غفیر میں کچلے جاتے۔ اہل کلکتہ نے اُس سے پیشتر سوگواروں کا ایسا جلوس نہ دیکھا تھا۔ ارتھی میں شامل ہونے کے لیے ملک کے گوشے گوشے سے لوگ آئے تھے۔ اُس میں ہر مذہب و فرقہ کے لوگ شامل تھے اور اُسے شمشان گھاٹ تک پہونچنے میں آٹھ گھنٹے لگ گئے۔



# دیش بندھو چترنجن داس

— نند کشور وکرم —

آج چترنجن کی عظمت و اہمیت کا اندازہ لگانے میں ہمیں شاید دشواری ہو لیکن ۱۹۱۹-۲۵ء کے پُرآشوب دور میں وہ ایسے قومی رہنما سمجھے جاتے تھے جن کی قیادت و رہنمائی پر عوام بجا طور پر فخر کرتے تھے اور جنہوں نے جدوجہد آزادی میں غیر معمولی خدمات سرانجام دی تھیں۔ پروفیسر ہمایوں کبیر (مرحوم) نے اُن کے بارے میں بالکل صحیح لکھا ہے۔

"ہندوستان کی یہ بدقسمتی ہے کہ دیش بندھو چترنجن داس کی موت اس وقت ہوئی جب وہ شہرت و عظمت کی بلندیوں پر تھے۔ وہ ۵۵ برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ موت نے اُن کی جدوجہد اور خدمات کا خاتمہ کر دیا اور یہ اُس وقت ہوا جب کہ خصوصاً اُن کی ہی کوششوں سے ہندوستانی سیاست اور انگریزوں کے رویے میں تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ ہندوستان میں اُن کی کوششوں سے دو بڑے فرقے ہندو اور مسلمانوں میں سمجھداری اور خیر سگالی کا ماحول پیدا ہوا تھا۔ اس سے پیشتر کسی بھی ہندوستانی رہنما نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں کو اس طرح نہیں جیتا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ ان کی قیادت میں متحدہ ہندوستان انگریزی حکومت کے سامنے، جو پہلی جنگ عظیم اور اُس کے بعد خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کی وجہ سے ڈگمگا رہی تھی، اپنے مطالبات کو متحدہ طور پر پیش کرتا۔"

دیش بندھو کا نام چترنجن داس تھا اور وہ ۵ نومبر ۱۸۷۰ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد بھوبن موہن نامی گرامی وکیل اور صحافی تھے۔ وہ راجہ رام موہن کے برہمو سماج کے پیروکار تھے اور اس کے ہفتہ وار ترجمان "برہم پبلک اوپینین" کے مدیر تھے۔ وہ بہت ہی ایماندار، محنتی اور وسیع القلب آدمی تھے۔ اور دوسروں کی امداد کرنے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ اس وجہ سے کئی بار انہیں مالی کا بھی شکار ہونا پڑا۔ ایک بار انہوں نے اپنے ایک مصیبت زدہ دوست کو اپنی صفانت پر تیس ہزار روپے دلوائے تھے لیکن بعد میں اُس نے قرض نہ چکایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۶ء میں اس تیس ہزار روپے کے قرض کی وجہ سے وہ دیوالیہ ہوگئے جس سے کنبے کے سارے افراد کو مصیبتوں کا شکار ہونا پڑا۔ ان مصیبت کے دنوں کا اُن کی والدہ نشتارنی دیوی دانشمندی اور ہمت و حوصلہ سے مقابلہ کیا۔ وہ ایک باہمت مہماں نواز اور سمجھدار خاتون تھیں۔ چترنجن اُن سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے اور اُن کا بے حد احترام کرتے تھے۔

چترنجن کی تعلیم و تربیت کلکتہ میں ہوئی اور وہیں سے انہوں نے بیس برس کی عمر میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اُس کے بعد ۱۸۹۰ء میں آ

ں ایس کا امتحان دینے کی غرض سے وہ لنڈن چلے گئے۔ ۱۸۹۲ء میں جب وہ
متحان میں بیٹھے تو انہیں احساس ہوا کہ اُن کے پرچے اچھے نہیں ہوئے لہٰذا
نہوں نے بقیہ پرچے نہیں دیئے۔ آئندہ برس انہوں نے دوبارہ امتحان
یا لیکن اس بار کامیابی کی انتہائی اُمید کے باوجود وہ ناکام رہے۔ دراصل
ندن میں تعلیم سے زیادہ وہ وہاں کی سیاست میں دلچسپی لیتے رہے ۱۸۹۲ء
ں انگلستان میں جو انتخابات ہوئے اُن میں ہندوستان میں اصلاحات کرانے
ور دادا بھائی نوروجی کے حق میں فضا تیار کرنے کے لئے انہوں نے
ڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا اور جگہ جگہ جوشیلی تقریریں کیں۔

آئی سی ایس کے امتحان میں بیٹھنے کی ناکامی سے بھون موہن کو
مدمہ غم ور ہوا مگر وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ عالم مایوسی میں اُن کا بیٹا کوئی غلط
قدم اٹھائے یا ہندوستان آنے کا ارادہ ہی ترک کر دے لہٰذا انہوں نے اُن
کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ایک تار دیا کہ وہ اس ناکامی سے دل شکستہ نہ
ہوں بلکہ آئی سی ایس کے بجائے بیرسٹری کے امتحان کی تیاری کریں کیوں کہ
درحقیقت اُن کا خاندانی پیشہ وکالت ہی ہے۔ چترنجن والد کے کہنے کے مطابق
انر ٹمپل میں داخل ہو گئے اور پھر وہاں سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے دسمبر
۱۸۹۴ء میں کلکتہ واپس آئے اور ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔

ابتداء میں چترنجن کو انتہائی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ
اُن کے والد بال بال قرض میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس پر کلکتہ کارپوریشن
کے انتخابات میں کھڑے ہونے اور ہارنے سے اُن کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔
ان دنوں بیرسٹر ٹرام میں سفر کرنا معیوب سمجھتے تھے لیکن چترنجن داس کی مالی حالت
اتنی خراب تھی کہ کئی بار وہ ٹرام پر ہائی کورٹ جاتے اور واپسی پیدل گھر آتے۔
ایسی حالت میں مجبوراً وہ کم فیس پر بھی مقدمے لے لیتے تھے۔ بہرحال آہستہ آہستہ
انہیں شہرت و کامیابی حاصل ہونے لگی اور مالی بحران دُور ہونے لگا۔

۱۹۰۷ء میں کلکتہ کے چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت
میں بریم بانڈھوپادھیائے پر حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے جُرم میں مقدمہ
چل رہا تھا۔ چترنجن نے اس سیاسی مقدمے کی پیروی کی اور اپادھیائے اور
ارویند چندر پال کو چھڑا کر ایسی کامیابی حاصل کی کہ سارے صوبے میں اُن کی
دھوم مچ گئی۔ اس کے بعد ۱۹۰۸ء میں علی پور بم کیس کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
اس میں مشہور انقلابی آربندو گھوش بھی ایک ملزم تھے۔ اس مقدمے میں
اُن کی مدلل جرح سے اُن کی شہرت کو چار چاند لگ گئے اور ملک کے بڑے
بڑے راجے نواب اپنے مقدمے کے لئے انہیں اپنا وکیل مقرر کرنے لگے، جس
سے ۱۹۱۳ء میں وہ چوٹی کے وکیل بن گئے اور اُن کے پاس دولت اتنی ہو گئی
کہ انہوں نے اپنے اور اپنے والد کے قرضخواہوں کو بُلا بُلا کر منہ مانگی رقم دی۔

چترنجن نے جب ہوش سنبھالا تو ملک کے عوام بیدار ہو چکے تھے اور
وہ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔ اس
سیاسی اُتھل پتھل کا اثر چترنجن پر بھی ہوا اور طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ
سیاست میں حصہ لینے لگے تھے اور وویکانند سنگھ کے سیکریٹری بھی رہے۔
لنڈن میں بھی تعلیم سے زیادہ وہ سیاست میں دلچسپی لیتے رہے۔ ۱۹۰۰ء میں
انہوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک "سودیشی منڈل" قائم کیا جس
کا مقصد لوگوں کو اپنی مدد آپ کرنے اور ملک کو آزاد کرنے کے لئے تیار کرنا
تھا۔ جب ۱۹۰۵ء میں حکومت بنگال نے طلباء پر سیاست میں حصہ لینے پر پابندی
عائد کر دی اور بہت سے طلباء کو جرمانے اور مختلف قسم کی مشکلات برداشت
کرنی پڑیں۔ اس وقت بنگال میں ایک قومی درس گاہ قائم کرنے کے بارے میں
سنجیدگی سے سوچا جانے لگا۔ اس موقع پر ایک امیر بنگالی نے ایک لاکھ روپے
کی رقم دینے کی پیش کش کی تاکہ قوم پرست طلباء اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں اور
پھر شری داس کی انتھک کوششوں سے نیشنل کونسل آف ایجوکیشن کا قیام
عمل میں آیا جس نے تحریک آزادی میں ایک اہم رول ادا کیا۔ اس قومی درسگاہ
کا پہلا پرنسپل آربندو گھوش کو مقرر کیا گیا۔ بعد ازاں ۱۹۲۱ء میں جب تحریک
عدم تعاون کے تحت بہت سے طلباء نے سرکاری کالجوں کو خیرباد کہہ دیا
تو شری داس کی ہی کوششوں سے بنگال نیشنل کالج قائم کیا گیا جس کے
پرنسپل سبھاش چندر بوس مقرر ہوئے۔

۱۹۱۷ء میں چترنجن صوبہ بنگال کے کانگرس اجلاس کے صدر منتخب ہوئے
اور اس کے بعد وہ کانگرس کے اہم رہنماؤں میں شمار کئے جانے لگے اور
انہیں سبھی اہم کمیٹیوں کا ممبر منتخب کیا جانے لگا۔ امرتسر کے جلیانوالہ باغ کے
خونیں حادثہ کے بعد کانگرس نے جو تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا تھا وہ اس کے
بھی ممبر تھے۔ امرتسر میں منعقدہ کانگرس اجلاس میں انہوں نے گاندھی جی کی ستیا
گرہ تحریک کی حمایت کی۔ اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں ناگپور اجلاس میں انہوں نے
گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون کی حمایت و تائید ہی نہیں کی بلکہ خود بھی اس پر

عمل کیا اور اپنی وکالت کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا حالانکہ اُس وقت اُن کی ماہوار آمدنی ۵۰ ہزار روپے تھی۔ وکالت چھوڑنے کے بعد وہ پوری طرح جنگ آزادی میں کود پڑے اور شاہانہ زندگی ترک کرکے ایک معمولی آدمی کی مانند زندگی گزارنے لگے اور چترنجن داس سے دیش بندھو بن گئے۔

۱۹۲۰ء میں احمدآباد میں ہونے والے اجلاس کی صدارت دیش بندھو کو کرنی تھی مگر عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں میں حصہ لینے کی وجہ سے برطانوی حکومت نے اُنہیں گرفتار کرکے چھ ماہ کے لئے نظربند کر دیا۔ اس کے بعد جب چوری چورا میں عوام تشدد پر اتر آئے تو گاندھی جی نے تحریک عدم تعاون واپس لے لی۔ جس سے کانگرس کا ایک بڑا طبقہ گاندھی سے ناخوش ہوگیا اور کانگرس اندرونی طور پر دو گروپوں میں منقسم ہوکر رہ گئی لہٰذا جب دسمبر ۱۹۲۲ء میں گیا میں کانگرس کا اجلاس منعقد ہوا تو دیش بندھو نے کونسل میں داخلے کی تجویز رکھی جو رد کر دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے کانگرس کو چھوڑ دیا اور موتی لال نہرو کے ساتھ مل کر سوراجیہ پارٹی کی بنیاد رکھی۔

۱۹۲۴ء کے انتخابات میں سوراجیہ پارٹی نے بنگال اور مدھیہ پردیش میں اکثریت حاصل کرلی حتیٰ کہ وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے اس پارٹی کو ان دونوں صوبوں میں حکومت بنانے کی دعوت دی مگر دیش بندھو نے ان کی تجویز ٹھکرا دی کیوں کہ اُن کی پارٹی حکومت کی دوسری پالیسی کو کامیاب نہیں بنانا چاہتی تھی اور اُسے ختم کرنے کے لئے کونسل میں گئی تھی۔ بعد ازاں پارٹی نے اس عہد کو پورا بھی کیا۔

۱۹۲۴ء میں سوراجیہ پارٹی نے کلکتہ کارپوریشن کے انتخاب میں بھی غیر معمولی کامیابی حاصل کی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ چترنجن داس کارپوریشن کے میئر بن گئے۔ اس برس انہوں نے کلکتہ میں منعقدہ ٹریڈ یونین کانگرس کے اجلاس کی صدارت بھی کی

اگرچہ دیش بندھو تشدد پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے تاہم انہیں انتہا پسند انقلابیوں سے پوری پوری ہمدردی تھی۔ اس لئے جب مشہور انقلابی گوپی ناتھ سہا کو ڈے نامی انگریز کا قاتل ٹھہرایا گیا تو اُن کی سوراجیہ پارٹی میں انقلابیوں کی ہمدردی میں ایک تجویز پاس کی گئی اور جب سوراجیہ پارٹی پر تشدد کے حمایتی ہونے کا الزام لگایا گیا تو انہوں نے کہا۔

"میں سیاسی قتل اور دوسری طرح کے متشددانہ اقدام کا مخالف ہوں مگر اس کے ساتھ ہی حکومت کو بھی یہ بات ماننی چاہیئے کہ انقلابی کتنی بھی غلطی پر ہوں، اُن کے طریقے چاہے جتنے بھی بھونڈے ہوں اور اُن کا کام چاہے کتنا ہی مجرمانہ اور مذموم ہو، اُن کی زندگی کا منتہائے مقصود ملک کی اقتصادی اور سیاسی آزادی کے لئے قربانی دینا ہے۔"

چترنجن ایک سیاسی رہنما ہی نہیں تھے بلکہ بنگلہ کے ممتاز ادیب اور شاعر بھی تھے۔ شعر و موسیقی کے وہ بہت دلدادہ تھے۔ اُن کے شعری مجموعے، مالنچہ، ساگر سنگیت، انتریامی، اور کشور کشوری بے حد مقبول ہوئے اور آج بھی بنگلہ کا قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔

۱۹۲۴ء میں ایک ٹرسٹ قائم کرکے انہوں نے اپنی تمام جائیداد قوم اور ملک کے لئے وقف کر دی۔ اور آج اُن کی قیام گاہ "چترنجن سیوا سدن" میں منتقل ہوچکی ہے جہاں زچہ و بچہ کا ایک شاندار ہسپتال ہے جس میں ہزاروں عورتوں کا مفت یا رعایتی علاج ہوتا ہے۔ اس چترنجن سیوا سدن کو دیکھ کر دیش کے اس عظیم سپوت دیش بندھو کی یاد آجاتی ہے جس نے آزادیٔ وطن کی خاطر سب کچھ قربان کر دیا تھا، پھر گاندھی جی کے یہ الفاظ کانوں میں گونجنے لگتے ہیں جو انہوں نے اُن کی موت پر کہے تھے۔

"وہ جسدِ خاکی جو چترنجن داس کا تھا، مٹ گیا لیکن اُن کی رُوح امر ہے انہوں نے ملک کی اتنی خدمت کی ہے اور ایسی قربانی دی ہے جس سے نہ صرف اُن کی رُوح بلکہ ان کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔ ایشور کرے اُن کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے اور اُن کی زندگی ہمیں سعی و عمل کی تحریک و ترغیب دیتی رہے۔"


## ہمارے مطبوعات

| | |
|---|---|
| گنجینۂ غالب | ۴ روپے ۵ پیسے |
| آئینۂ غالب | ۵ روپے |
| دو شہروں کی کہانی (ناول) | ۵ روپے |
| ہندوستان کی مسجدیں | ۲ روپے ۵۰ پیسے |

ملنے کا پتہ

مینیجر پبلیکیشنز ڈویژن پیتمپورہ ہاؤس نئی دہلی

اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر

# محمد قلی قطب شاہ

## متین سروش

زمیں کی رفعتیں اُس کی، جبیں کہکشاں اُس کی
نگاہ و دل کو کرتی ہے منوّر داستاں اُس کی
بساطِ شعر و نغمہ پر دیارِ حکمرانی میں
بہار آرائیاں کرتی رہی طبعِ جواں اُس کی
دکن کو خطۂ جنت نشاں اُس نے بنایا تھا
چمن سازی و فاپروری تھی فکرِ گل فشاں اُس کی
شبستانِ شہی میں آدمیت جلوہ فرما تھی
رسولِ خوش دلی تھی ہر نگاہ مہرباں اُس کی
غزل کو بخش دی روحِ نشاطِ آرزو اُس نے
نگارِ جاں نواز و دلستاں اردو زباں اُس کی
قطب شہ نے عروسِ فن کو وہ رنگیں قبائی دی
ہے اقلیمِ سخن میں اک بہارِ بے خزاں اُس کی
عجم کے ساز کو آہنگِ ہندی سے ملایا تھا
نقیبِ امن و الفت، انجمن آرائیاں اُس کی
بہارِ باغِ اُردو میں غزل خواں کیف جاں اس کا
سرورِ اب تک لٹاتی ہے شرابِ ارغواں اس کی
لباسِ نور پہنایا، وہ اصنامِ تخیّل کو
بنی خلّاقِ نغمہ، ہر نوائے شادماں اُس کی
عطا کی نازخوباں کو محبت کی جہاں داری
بہائے بے خودیٔ غم، حدیثِ دلبراں اس کی
وقارِ عشق جو حیدر محل کو اس نے بخشا تھا
فضائے حیدر آباد آج بھی ہے پاسباں اُسکی
رہے شہرِ غزالاں، کعبۂ عشق و جنوں میرے
ہیں تیرے گل عذاروں میں ابھی تک شوخیاں اسکی
تری دلداریاں ہیں عکس اُس کے قلبِ رنگیں کا
چمکتی ہیں فضاؤں میں ابھی تک بجلیاں اس کی
کوئی بنتِ غزل اب بھی تجلّی پاش ہے تجھ میں
میرے خوابوں کی لے پر ہے جوانی نغمہ خواں اس کی
مرے اشکِ رواں پیغام دردِ دل سُنائیں کیا
نہیں ملتی کہیں بھی ہمت و شرحِ و بیاں اس کی
جبینِ شوق میں سجدوں کی اک بارات لایا ہوں
دلِ پُرخون کا پیمانہ پئے سوغات لایا ہوں

حیدر آباد

# ایک کلی دو پھول

## سیدہ شبنم قادری

وہ ایک "پھول" جو پہلے پہل چمن میں کھلا
تو اُس کی خوشبو سے سارا چمن مہک اٹھا
چھڑے خوشی کے ترانے، مسرتیں جاگیں
بر آئی آرزو، خوابوں کا سلسلہ ٹوٹا

نئی حیات لئے آئی تہنیت نامے
ہر ایک سمت سے گونجی صدا، مبارک ہو
ہزار شکر ہوئی آج زینتِ آغوش
اثر دکھا گئی دل کی دعا، مبارک ہو

پھر ایک اور کلی چٹکی، بعد مدت کے
بہاریں جھوم اٹھیں آنکھوں میں روشنی آئی
تصوّرات میں شہنائیاں سی بجنے لگیں
زمیں پہ چاندنی اُتری بلائیں لیتی ہوئی

مگر اک اور بھی غنچے نے کھولیں جب آنکھیں
تو پھر کہیں سے نہ آئی صدا مبارک کی
نہ وہ خوشی تھی، نہ وہ ولولے، نہ ہنگامے
لگی ہو جیسے کہ ہونٹوں پہ مہرِ خاموشی

یہ وہ گریز تھا جس نے دیا سبق ایسا
کہ دو ہی پھول" یہ کافی ہیں ایک "کلی" ہے بہت
انہیں سے رنگِ چمن ہے، انہیں سے شادابی
سُرورِ دل میں ہے آنکھوں میں روشنی ہے بہت

یونہی گزرتے رہیں ماہ و سال خوشیوں میں
خلش نہ بن سکے تہذیب و تربیت کا سوال
کبھی نہ آئے شکن زندگی کے ماتھے پر
خوشی خوشی جئیں آسودگی نہ ہو پامال



# تلاش

بس یوں ہی میں اپنی دوکان میں بیٹھا ہوا سامنے گزرتے ہوئے لوگوں اور ٹریفک کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک سفید سی کار آکر رکی اور مہتہ نے کار کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر پوچھا۔

"تم ابھی آدھ گھنٹے دوکان میں ٹھہرو گے ؟"

کیوں ؟

میں ابھی لوٹتا ہوں

مہتا لوٹ کر آیا تو میں اُس کے ساتھ ہی کار میں اپنے گھر چلا آیا۔ مہتا نے میرے ساتھ ہی کھانا کھایا اور جب دو بج گئے تو ہم نے بنارس چلنے کا پروگرام بنا لیا۔

"ابھی دو بجے ہیں۔ کُل ایک سو ساٹھ میل ہی تو ہے، چار گھنٹے یا پانچ گھنٹے ـــــ ہم سات بجے تک بنارس پہونچ جائیں گے ـــ" مہتا نے اپنی گھڑی پر نظر گڑائے ہوئے حساب لگایا۔

"آج تمہیں بنارس کی کیا سوجھی ؟"

"کام سے جی اُوب گیا ہے یار ـــ روز روز کولھو کے بیل کی طرح کام کام ـــ بس چلو اب پروگرام بن گیا ہے تو بس روانہ ہو ہی جائیں۔"

مگر پروگرام کی تفصیل بھی تو معلوم ہو ـــ"

بس چلے چلو ـــ پروگرام خود بخود بنتے جائیں گے۔"

جب ہم گرینڈ ٹرنک روڈ پر پہونچے تو مہتہ نے پوچھا ـــ

"تمہارے سینا کا کیا ہوا ؟"

"ہاؤس تیار ہو گیا ہے، بجلی لگ رہی ہے ـــ مگر لائسنس ابھی تک حاصل ہو نہیں سکا ہے ـــ"

"خیر وہ تو ہونا ہی ہے ـــ !"

"ہونا ہی ہے کی خوب رہی ـــ"

"ہوگا کیسے نہیں ـــ ؟ تمہارے اتنے سارے دوست آخر کام آئیں گے ـــ"

ہمارے بازو سے ایک گاڑی آگے نکل گئی ـــ

"مہتہ پیارے گاڑی ذرا دھیان سے چلاؤ، یہ سب ڈویژن سڑک نہیں ہے۔ یہ نیشنل ہائی وے ہے۔ بے خیالی میں کسی دس با ٹن کی ٹرک نے لگاوٹ کا اظہار کیا تو بنارس دوسری شکل میں پہونچو گے۔"

پہونچے تو ہم بنارس دس بجے رات میں لیکن مہتہ کے حساب سے ہم وقت کُل پانچ گھنٹے ہی لگا۔

ایک گھنٹہ پنکچر جنوانے میں

تین جگہوں پر چائے اور ناشتے کے لئے رکے ڈیڑھ گھنٹہ ـــ

اور آدھ گھنٹے سے کچھ زیادہ لگا ہارن جنوانے میں ـــ

صبح آنکھ کھلی تو دس بج چکے تھے

مہتہ کا قاعدہ تھا کہ جس ہوٹل میں ٹھہرتا وہاں اس بات کا خاص ہدایت کر دیتا کہ کسی بھی حال میں اُسے جگایا نہیں جائے گا جب تک وہ خود ہی نہ جاگے تیار ہوتے ہی گیارہ بج گئے۔

"اب کیا ارادہ ہے؟"

"احمد علی سے مِل لیں — وہ سب انتظام کرے گا اُس کے یہاں اچھے CONTACTS ہیں"

احمد علی آفس میں نہیں تھا —

احمد علی اپنے کوارٹر میں بھی نہیں —

احمد علی بنارس ہی میں نہیں تھا —

اس تفتیش میں تین بج گئے —

اور تب ہم دونوں ہوٹل میں آ گئے —

کیا یار پورا دن بے کار گیا۔ کھانا کھا کر بھی اکتاہٹ نہ گئی تو سو گئے۔

اٹھے تو پانچ بج رہے تھے، چائے پی کر نکلے —

کدھر چلیں —؟ مہتہ نے پوچھا

گھر —!

مہتہ نے مجھے گھور کر دیکھا

ایک چھوٹے سے پارک کے پاس گاڑی لگا کر مہتہ نے کہا۔

"دیکھو، تم اس پارک میں وہ سامنے والی بنچ پر بیٹھو، میں ذرا ایک چکر لگا کر آتا ہوں پچھلی بار احمد علی نے ایک آدمی سے ملوایا تھا۔ وہ اسٹیشن کے پاس رہتا ہے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں لوٹ آؤں گا ذرا اُسے دیکھ لوں گا پھر گھوم پھر کر بنچ پر آ جانا —"

نہ تو مہتہ کے لئے اس طرح کا فرمان جاری کرنا نیا تھا اور نہ میرا اِن کو قبول کر لینا ہی نیا تھا اس لئے میں معمول کے مطابق بے حد اطمینان کے ساتھ کار کا دروازہ کھول کر اُتر گیا اور کار روانہ ہو گئی۔

پارک میں بیٹھنے کا کوئی مطلب نہیں ہو سکتا تھا اس لئے میں نے پندرہ منٹ تو پارک کے چکر لگانے میں گزار دیئے اور پھر پارک سے نکل سڑک پار کر کے ایک صاف ستھرے سے ریستوران میں چلا گیا۔ کافی پینے میں بیس منٹ لگے ہوں گے، ابھی پچیس منٹ اور گزارنے تھے، میں ریستوران سے باہر آ گیا اور ریستوران کے بازو میں کتابوں اور رسائل کی چھوٹی سی دوکان میں چلا گیا۔

کئی رسائل کی ورق گردانی کے بعد میں نے ایک فلمی رسالہ خریدا تو اب بھی دس منٹ بچ رہے تھے۔ رسالہ ہاتھ میں لے کر میں پارک کی طرف چلا اور مہتہ کی بتائی بنچ پر جو ٹیوب لائٹ کے عین نیچے تھی رسالہ پڑھنے لگا۔

اب ایک گھنٹے بیس منٹ زائد ہو چکے تھے اس لئے میں بار بار نظر اوپر اُٹھا کر سڑک کی جانب دیکھنے لگا۔

پھر ایک گھنٹہ زائد ہو گیا

میری بے چینی بڑھنے لگی۔

اور جب رات کے پورے دس بجے تو مجھے پارک میں اپنے علاوہ کوئی نہ نظر آیا۔ یہاں مجھے کون جانتا ہے اور رات کے دس بج چکے ہیں۔ میں پام ٹری سے لگا کھڑا سوچ رہا ہوں، مہتہ کہاں رہ گیا؟

بابو جی —

میں نے چونک کر دیکھا — دس بارہ سال کا غریب سا لڑکا میرے سامنے کھڑا تھا —

بابو جی — وہ اُدھر میم صاحب بُلاتی ہیں۔

"میم صاب؟" میں نے دیکھا فوارے کے اُس کنارے پر کوئی عورت کھڑی تھی —

"مجھے بُلاتی ہیں؟"

"ہاں —"

"مگر کیوں؟"

میں جب اُس کے نزدیک پہونچا تو وہ کہنے لگی۔

"آپ گھنٹوں سے یہاں ہیں اور بالکل اکیلے —؟"

"میں انتظار کر رہا ہوں —"

"کس کا؟"

"اپنے دوست کا —"

"کیسا دوست ہے آپ کا کہ آپ گھنٹوں سے انتظار کر رہے ہیں اور وہ —"

"لیکن آپ اس پارک میں کیا کر رہی ہیں اس وقت —"

"تلاش —"

"کس کی تلاش ؟"

"دوست کی ــــ"

"خوب ــــ کیسا دوست ہے آپ کا ؟"

"ابھی تو تلاش ہی کر رہی ہوں ــــ کیا پتہ کیسا ہو ؟"

سڑک پر ساتھ چلتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

"کہاں رہتے ہیں آپ ؟

"میں ہوٹل میں ہوں اور کمرے کی چابی میرے دوست کے پاس ہے اور وہ آیا نہیں ہے، اب میں کسی دوسرے ہوٹل میں پناہ گزیں ہوں گا۔"

"کیوں ؟ آپ چاہیں تو میرے فلیٹ میں چلیں۔"

"آپ کے فلیٹ میں ؟"

"کیوں، اگر آپ کو اعتراض نہ ہو، تکلیف تو کچھ ہو گی۔"

"نہیں نہیں، یہ بات نہیں، میرا مطلب ہے آپ کے گھر کے لوگ۔"

"گھر میں کوئی ہوتا تو میں دوست کی تلاش کیوں کرتی چلیں گے آپ ؟ صبح کو یا جب آپ کا جی چاہے، ہوٹل چلے جائیے گا، ظاہر ہے آپ کے دوست اُس وقت تک تو وہاں آ ہی چکے ہوں گے ــ !"

میں دو چھوٹے چھوٹے کمروں کے خوبصورت فلیٹ میں اُس کے ساتھ داخل ہوا تو میرے ذہن میں بے شمار سوالات ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے تھے، اتنے زیادہ اُلجھے ہوئے تھے کہ میں اُن سوالات کو وہاں تک لانے سے مجبور تھا ــــ مجھے وہ اسی حالت میں ایک چھوٹے سے بے حد حسین صوفے پر بٹھا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیا تو خوش مذاقی کا قائل ہو گیا۔

سنٹر ٹیبل کے ساتھ دو اور ٹیبل لگا کر اُس نے کھانا لگا دیا۔

"آپ نے یہ تکلف ــــ"

"تکلف کیا ہے ؟ جو موجود ہے وہ رکھ دیا ہے ــــ"

"لیکن میں اکیلے نہیں کھاؤں گا ــــ"

میں نے کھاتے ہوئے اُسے شب خوابی کے لباس میں غور سے دیکھا تو وہ مجھے بڑے اُبال کی عورت نظر آئی۔ اُس میں بازاری پن کے انداز کی تلاش کی تو بڑی مایوسی ہوئی حالانکہ جس طور پر یہاں آیا تھا اُس کے پیشِ نظر میں نے اپنی مایوسی سے مایوس ہونے پر خود کو تیار نہیں پایا۔

کھانا ختم ہو گیا تو وہ بڑے اطمینان سے میرے پاس کافی کی پیالی رکھ کر بیٹھ گئی ــــ میں نے اُسے مسکرا کر دیکھا جس کے جواب میں وہ بھی مسکرائی پھر میں نے پوچھا ــــ

"آپ کی وہ تلاش ــــ دوست کی تلاش بھی ختم ہوئی ــــ"

"تلاش ــــ" اور وہ کہیں ڈوب گئی ــــ

"آپ چُپ ہو گئیں ــــ ؟"

اچانک کیا ہوا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں بوکھلا سا گیا۔ وہ میری گود میں ڈھیر ہو گئی اور پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی، بلکتی رہی، سسکتی رہی۔ اُس کے آنسوؤں نے میری بُش شرٹ کا دامن تر کر دیا۔

پھر جب وہ چپ ہو گئی تو کہنے لگی۔

"مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے آپ کو تکلیف دی۔ اب میں سونا چاہتی ہوں۔ آپ کی جب خواہش ہو آپ چلے جائیں ــــ شب بخیر!"

وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے بولٹ لگانے کی آواز آئی۔ پھر تیز روشنی بجھ گئی اور شاید ہلکی سی روشنی جل گئی تھی۔

میں بستر پر پڑا پڑا کروٹیں لیتا رہا، ذہن بے شمار سوالات آڑی ترچھی کراس کرتی ہوئی لکیروں کی مانند اُبھرتے اور ڈوبتے رہے ــــ نیند کہاں تھی میں بار بار کھڑکی سے صبح ہونے کے آثار دیکھتا رہا۔ اور جب تھوڑا دھندلکا سا رہا تو میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

کمرے میں مہتہ بے خبر سویا ہوا تھا ــــ میں بھی دوسرے پلنگ پر ڈھیر ہو گیا جیسے میرا ذہن تھک کر اپنی تمام اینٹھن کھول رہا ہو ــــ


**پبلیکیشنز ڈویژن** نے طے کیا ہے کہ اس ادارے کی طرف سے شائع ہونے والے رسائل کے خریداروں کو ہماری مطبوعات کی خریداری پر ۲۰ فیصد کی رعائت دی جائے گی۔ آرڈر پانچ روپے سے کم نہ ہو ــــــــ اور آرڈر کے ساتھ خریداری نمبر لکھنا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں اُردو، ہندی، انگریزی کے علاوہ علاقائی زبانوں کی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں۔ کتابوں کے انتخاب کے لئے فہرست طلب کیجئے جو آپ کی خدمت میں مفت ارسال کی جائے گی۔

**بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی**

دیویندر اسر

# حقیقت افسانے کی تلاش میں

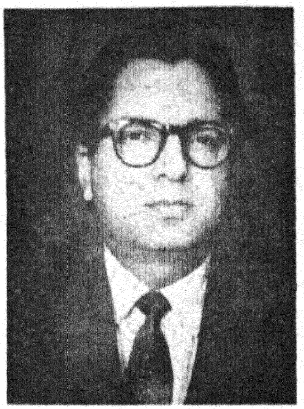

ہم سب اجنبی ہیں، جلاوطن اور تنہا

نطشے نے برسوں پہلے اعلان کر دیا تھا کہ خدا مر گیا اور ہم سب اُس کے قاتل ہیں۔ اور بریشت نے اس صدی میں ایک اور سانحے کی خبر دے دی کہ انسان مر گیا ہے اور وہ اس کا گواہ ہے۔

آج انسان پر کیا بیت رہی ہے یہ ہے اس کی مختصر ترین داستان جو حیرت انگیز تو ہے ہی المناک بھی ہے اور جسے جدید ادب میں بار بار دہرایا جا رہا ہے۔

حالات جس تیزی سے بدل رہے ہیں اور کائنات کے اسرار و رموز نے جس طرح ایک ایک کر کے سب پردے اٹھتے جا رہے ہیں۔ اُس نے جدید ادیب کو احساس و فکر کی کتنی ہی نئی دنیاؤں سے روشناس کرا دیا ہے۔ انسان اور اس کی زندگی میں جو تغیر رونما ہو رہے ہیں اُنہوں نے نہ صرف حیات و کائنات کے تمام تر تصورات کو ہی بدل دیا ہے بلکہ انسان کا ایک نیا ہی رُوپ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اجنبی، جلاوطن، دہشت زدہ، تنہا، خود علیحدگی کا شکار اور گم شدہ ذات کی تلاش میں سرگرداں۔ جدید انسان اقدار کے خلا میں بھٹک رہا ہے۔ اس کی زندگی اور اس کے تمام تر افعال اور اعمال بے معنی اور لغو سمجھے جاتے ہیں۔ جن کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ کوئی انجام، وہ سسی فس کی طرح اپنی پیٹھ پر سنگ گراں اُٹھائے اُٹھائے پہاڑ کی چوٹی پر پہونچتا ہے اور پھر نیچے گہری کھائی میں گر جاتا ہے مسلسل تشنہ تکمیل بے سود محنت کا بار گراں ہی جس کی مشیت ہے۔ اختیار و جبر کی اس کشمکش میں وہ اس صورت حال میں زندہ رہنے کے لئے مجبور ہے۔ انسان کی اس صورت حال کو جدید فلسفے میں ابسرڈ یا لغو قرار دیا گیا ہے جو انتہائی مضحکہ خیز صورت حال ہے جس میں طربیہ اور المیہ کے دونوں پہلو ایک ساتھ کارفرما ہیں۔

یہ ہے وہ انسان جدید افسانے کا جو ایک افسانے سے دوسرے افسانے میں لگاتار بھٹک رہا ہے ذات کی تلاش میں ہجوم میں کھوئے ہوئے لوگ ایک دوسرے کو بانہوں کا سہارا نہیں دے سکے۔ سب گم نام بے چہرہ لوگ ہیں۔ ان کا نہ کوئی نجی وجود ہے اور نہ کوئی ہستی، نہ کوئی یار و مددگار اور نہ سگا سمبندھی اور تنہائی کی اندھی گلیوں میں خائف (خود سے بھی اور اپنے سائے سے بھی) بھٹک رہے ہیں نہ جانے کیوں؟ نہ کوئی راستہ ہے، نہ کوئی منزل، نہ روشنی، نہ مذہب، نہ فلسفہ نہ خدا نہ خضر۔ نہ رہبر نہ دوست، اُن کے سامنے یہی مسئلہ نہیں کہ وہ خارجی دُنیا کے دباؤ سے اپنے وجود کو کیسے محفوظ رکھیں بلکہ یہ بھی کہ وہ تنہائی کی اندرونی دہشت سے کیسے نجات

پائیں۔ اگر نجات ممکن نہیں تو ان کے سامنے خودکشی یا قتل کے سوا کیا چارہ ہے اور ہمارا جدید افسانہ نگار فرانز کافکا کا ہم نوا ہو کر چلا اٹھتا ہے "میرے لئے سب سے قریب صداقت یہی ہے کہ میں ایک ایسی کال کوٹھری میں بند دیواروں سے اپنا سر ٹکراتا ہوں جس کے نہ دروازے ہیں اور نہ کھڑکیاں"۔

یاد رہے یہ الفاظ کافکا نے ۱۹۱۳ء میں اپنے ایک خط میں تحریر کئے تھے۔ رُوس کا انقلاب بھی اُس کے بعد ہوا اور پہلی جنگِ عظیم بھی اور فرائیڈ کا نفسیات بھی اُس کے بعد مقبول ہوئی۔ جدید افسانہ نگار کتنا جدید ہے؟

یہاں اُن تمام سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی تبدیلیوں کا ذکر ضروری نہیں جو جدید صنعتی اور شہری انقلاب سے پیدا ہوئی ہیں اور جن کے باعث انسان کی موجودہ صورتِ حال ظہور پذیر ہوئی ہے کہ وہ ایک ایسے ماحول میں سانس لینے پر مجبور ہے جسے البسرڈ یا لغو کا نام دیا گیا ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں جدید افسانے کی توسط سے البسرڈ کے فلسفۂ حیات کو قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایسے افسانوں میں نقطۂ نظر، کردار کا تصور اور فنی لوازم سب کچھ روایتی فکر اور طرزِ فن سے الگ ہیں۔ ان میں انسان کا تصور بھی بدل گیا ہے۔ دُنیا کی کوئی معنویت نہیں۔ سوائے اس کے جو انسان اُسے عطا کرتا ہے آدمی وہی ہے جو وہ اپنے کو بناتا ہے اور دُنیا کی شکل بھی وہی ہے جو وہ بناتا ہے۔ انسان خیر و شر میں صرف اپنے لئے ہی انتخاب نہیں کرتا بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لئے انتخاب کرتا ہے۔ اس لئے ان افسانوں میں جہاں زندگی کی بے معنویت اور لغویت کا شعور ملتا ہے۔ وہاں فنی نقطۂ نظر سے بھی ایسی تبدیلی آگئی ہے اُن میں کہانی پن اور پلاٹ کا مکمل فقدان ملتا ہے اور ان میں وحدت اور ربط کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ ان میں سے کچھ افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جو زماں و مکاں کا ماورائی تصور اور انسان کا کسی حد تک مابعد الطبیعاتی مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ ان افسانوں کے کرداروں کو بمبئی یا دلّی جیسے بڑے بڑے شہروں سے لے کر نیویارک اور پیرس جیسے میگیلوپالس (Magalopolis) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کرداروں کی تخلیق میں مستند احساس کا کم اور فلسفیاتی فکر کا زیادہ دخل ہے اور تجریدی ہئیت کے حامل ہوتے ہیں۔ نئی حقیقت سے پروردہ نئے احساس اور شعور کے حامل یہ کردار انسان اور سماج کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں رکھتے۔ وہ موجودہ صورتِ حال کو از حد لغو اور مضحکہ خیز سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس صورتِ حال سے کوئی نجات ممکن نہیں اور نہ ہی کوئی تبدیلی یا انقلاب ہی ممکن ہے۔ اگر کوئی تبدیلی ممکن بھی ہے تو بھی انسان کی حالت بدستور پہلے جیسی رہے گی۔ شاید اس سے بھی بدتر ہو جائے۔ ایسے افسانوں میں مایوسی، غصہ اور ایک قسم کا مصنوعی حملہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ یہ کردار سماج اور زندگی سے مکمل طور پر کٹ چکے ہیں اس لئے قارئین ادیب کے احساس و شعور سے ہم آہنگی قائم کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ ان کا فارم بھی انٹی فارم ہے۔ اسی باعث انٹی افسانے کی اصطلاح مقبول ہوئی۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ اگر سب کچھ لغو اور بے معنی ہے۔ انسان اور زندگی البسرڈ ہے تو تخلیقی عمل اور تخلیق کیوں لغو اور بے معنی نہیں شاید یہ ادیب وجودیت پرستوں کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ تخلیق کرنے پر مجبور ہیں۔ He is condemned to create یا Nothing is more real than Nothing.

لیکن یہ بات جدید افسانہ نگار اکثر بھول جاتے ہیں کہ وجودیت نے جہاں انسانی زندگی کی لغویت اور بے معنویت کا ذکر کیا ہے۔ وہاں انسان کی قوتِ ارادی اور آزادیٔ عمل پر بھی زور دیا ہے۔ انہوں نے وجودیت کے فلسفے کے لغویت کے عنصر کو تو تسلیم کر لیا ہے لیکن ارادے اور انتخاب عمل کو تیاگ دیا ہے۔ اس لئے ان کی تخلیقات میں خودکشی اور موت کا رجحان تو غالب ہے۔ منصور کی شہادت کا تذکرہ نہیں۔

جدید افسانہ جس تاریخی موڑ پر ابھرا اس میں ترقی پسندی اور اس سے وابستہ آئیڈیلوجی کے بھرم کھلنے کا شدید ردِ عمل تھا۔ تمام اقدار کا بھرم کھل چکا ہے۔ ایسا کوئی آدرش یا نصب العین یا کاز نہیں جس کے لئے جدوجہد کی جا سکے۔ اصلاح اور انقلاب کے نعرے بیکار ہیں۔ ہم موجودہ طرزِ زندگی اور فکر کے خلاف نفرت انگیز ردِ عمل کا اظہار کر سکتے ہیں۔ انہیں بدل نہیں سکتے۔ یہ ذہنیت اُن ہی حالات کی پروردہ ہے۔ جنہوں نے یورپ اور امریکہ میں برافروختہ نوجوانوں اور بیٹ نسل کو جنم دیا ہے۔ جدید افسانہ عصری فکر و احساس اپنے اندر سمیٹنے والی سب افسانوی تحریروں کا ایک سہل نام ہے۔ ترقی پسند افسانے کے بعد جدید افسانہ کسی مخصوص نظریے یا ادبی فکر کے ترسیل کا ذریعہ نہیں تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے جدید افسانہ

ب مخصوص فکر اور احساس کی کیفیت کی عکاسی کا ذریعہ بن گیا جس میں زندگی کی گھٹن ر ادب کو بار بار دُہرایا جانے لگا جنسی رویے اور افعال کو مقدّم درجہ دیا نے لگا۔ افسانہ واپس اس موڑ پر پہونچ گیا جہاں پندرہ بیس برس پہلے تھا۔ یہاں میں ہئیت اور طرزِ فن کو شامل نہیں کر رہا۔)

فرائیڈ کا اثر اُس دَور کے ادب پر کافی نمایاں تھا۔ اُردو ادب میں ل مارکس اور سگمنڈ فرائیڈ کی تحریروں کا اثر قریب قریب ایک ہی دَور میں ا جس کے باعث ترقی پسند ادب کی ابتدائی تحریروں میں مارکسی اور فرائیڈین رجحانات ساتھ ساتھ ملتے ہیں۔ ان دونوں اثرات کے تحت روایتی تصورات اور قدیم سماج ں تبدیلی اور مروجہ اقدار کو چیلنج کیا گیا تھا۔ جدید افسانے میں جنس کے موضوع کو ش کرنے کے انداز اور نقطۂ نظر میں یہ چیلنج غائب ہے بلکہ ایک قسم کی خود سپردگی ا احساس ہے۔ انسان کی جبلتوں پر جس انداز سے زور دیا جا رہا ہے وہ انسان ی تمام تر تخلیقی ارتقاء کی نفی کرتا ہے۔ جنس کے بارے میں ایک خاص طرح کی لذت پرستی کا عنصر غالب ہے اور اس کے بارے میں اس نقطۂ نظر کا ثبوت دیا جا ہا ہے جو سامنتی دَور کی ہی خصوصیت ہے۔ عورت کو جنسی کھلونا اور تعیش کا ریعہ سمجھا جانے لگا ہے جنسی آزادی کے نعرے کے پیچھے یہی رویہ کارفرما ہے۔ ر اپنی ہر فرسٹریشن کا انتقام افسانے کا کردار اپنی بیوی سے لینے لگا ہے کیونکہ وہ بے چاری اب بھی آزاد نہیں ہو سکی اور جوابی حملہ نہیں کر سکتی۔ ہر عورت ہر لمحہ ہر مقام پر اس لئے موجود ہے کہ وہ جنسی تسکین کا باعث بن سکے۔ اگر امریکہ کی طرح مارے دیش میں بھی کہیں نسوانی آزادی کی تحریک شروع ہو گئی تو دیکھئے گا کہ جدید فسانے کے جدید احساس اور جذبہ والے جنس زدہ کردار افسانے سے کس طرح ب ہو جاتے ہیں۔ ایسے افسانے اپنے مختلف ناموں اور مصنوعی جدید پرستی کے اوجود ایک ہی عنوان کے تحت آتے ہیں۔ انقلاب بستر پر۔ اسی طرح کا مصنوعی لہ انگلینڈ میں برافروختہ نوجوانوں اور امریکہ میں ادیبوں نے کیا تھا (اس ں ان رجحانات کے تمام ادیبوں کو شامل نہیں کیا جا رہا) یہ نظریہ لذت پرست م اور تفریح پسند کلچر کا نظریہ ہے۔ انسان کے تمام افعال کو جنس تک دود کر دینا اس حقیقت کی عکاسی تو ہو سکتی ہے جس کا تجربہ ادیب نے کیا ہے لن یہ تخلیقی حقیقت نہیں ہو سکتا۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ اگر حالات ایسے ہی ہے آج کسی مرد کی جنسی تسکین دُنیا بھر کی تمام ترعورتیں بھی نہیں کر سکتیں۔ ان کردار نے اپنے وجود کو ثابت کرنے اور قوت مردانگی کا یقین حاصل کرنے کے لئے بیوی

پرستم اور آزاد جنسی عمل کو ہی مستند احساس تسلیم کر لیا ہے اور سماجی پروٹسٹ کے جزو کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ستم تو یہ ہوا کہ افسانوی ادب میں سے وہ تمام الفاظ غائب ہو گئے جن کا رشتہ دُور دُور سے بھی سیاست یا انقلاب سے تھا۔ ویسے یہ افسانہ نگار "ہاتھی دانت کے مینار" میں ادب کی تخلیق نہیں کرتے۔ بڑے بڑے شہروں کی بھیڑ میں تنہا گھومتے ہیں۔ اور "ہجوم" کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اجتماعی کار انسان کے خلاف ہی ادب کی تخلیق کرنے لگے ہیں۔ اُن کے کردار تنہائی کے ڈسے ہوئے ہیں۔ دہشت کے مارے ہوئے ایلینشن Alienation کا شکار آڈنٹٹی Identity کی تلاش اور ذات کی پہچان میں سرگرداں اجنبی سیسی فس (پرومیتھیس نہیں) — چاروں طرف سے انٹی ہیرو مختلف ناموں کے تحت جمع ہونے لگے۔ یہ انٹی ہیرو وجودیت پرست نہیں بلکہ الفریڈ ایڈلر کے نظریہ "احساسِ کمتری" کے مارے ہوئے اور حصولِ قوت کے خواہش مند کردار ہیں۔

یہ ہے وہ صورتِ حال جدید افسانے کی جس کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا اور یہ سوال اٹھایا گیا کہ جدید افسانے کا کردار "سیسی فس" کیوں ہے؛ پرومیتھیس کیوں نہیں۔ اور جب اس سوال کے جواب کی تلاش کی گئی تو معلوم ہوا کہ ہم نے وجودیت پرستی کے صرف ایک پہلو کو ہی مقدم سمجھا ہے۔ لغویت کے پہلو کو، اس کے آزادی عمل اور انقلابی پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے اور پھر فرائیڈ کے بھی ابتدائی نظریات پر ہی ہم نے اپنے ادب کی بُنیاد رکھی ہے۔ اس کی فلسفیانہ تحریروں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس طرح مارکس کے اُن پہلوؤں سے خائف ہو گئے ہیں جن میں آمریت اور جبر کے فلسفے پر زور دیا گیا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات میں مارکسی فلسفے میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اُنہیں نظر انداز کر دیا ہے۔ جس کے باعث جدید افسانہ نئے شعور و احساس سے بچھڑ گیا ہے اور ایک روایت بن کے رہ گیا ہے جدیدیت بھی ترقی پسندی کی طرح ایک جامد اور منظم رجحان کی شکل میں ہی اب رائج ہے اس میں متحرک اور جدلیاتی عمل کی تازگی اور قوت اب نہیں رہی

افسانوی ادب میں آج جن نئے رجحانات کو فروغ مل رہا ہے وہ فرائیڈ اور مارکس کے نظریات کی نئی تاویلوں پر مبنی ہیں۔ اس لئے نئے ادب میں نو فرائیڈ پرستی اور نو مارکس پرستی کے ساتھ ساتھ جدید فلسفے اور سائنس اور سماجی علوم کی روشنی میں جو نیا شعور حاصل ہوا ہے، اُسے بھی شامل کر لیا گیا ہے آزادی سے قبل جو افسانہ نگار فرائیڈ کے نظریات سے متاثر تھے اُن کے سامنے فرائیڈین نفسیات کے دو پہلو ہی اہم تھے۔ جنسی جذبہ اور لاشعوری

محرکات انہوں نے انسان کے ذہن کی گہری اور دروں تہوں میں داخل ہو کر اور لاشعور میں گہرے غوطے لگا کر کردار کی عمیق عکاسی کرنے کی کوشش کی۔ فرائیڈ نے اپنے تحلیل نفسی کے عمل میں انسان کی لاشعوری گرہوں، عہدِ طفلی کی محرومیوں اور دبی ہوئی خواہشوں کا بے ضمیر غلام بنا دیا اور اس طرح انسان سے اس کی آزادی، عمل اور اخلاقی ذمہ داری چھین کر اُسے اقدار کے خلا میں پھینک دیا۔ ظاہر ہے کوئی بھی ہیرو ماہرِ نفسیات کے سامنے ہیرو نہیں رہ سکتا اس کا ہیروپن یا اولوالعزمانہ عمل اس کے کسی ذہنی مرض کا دفاعی عمل ہے۔ کردار کے لاشعور پر مبنی ترجمانی اس حد تک بڑھ گئی کہ افسانے اور کیس ہسٹری (کوائف مرض) میں بہت کم فرق رہ گیا۔ یہ ادیب فرائیڈ کی ابتدائی فکر سے متاثر تھے لاشعور کے بہاؤ کے رجحان میں فرائیڈ کے علاوہ جیمس جوائس، ورجینیا وولف ہنری برگساں اور مارسل پروس کی تحریروں کا اثر بھی شامل ہے۔ جدید افسانہ اس معنی میں فرائیڈین نفسیات کے ابتدائی نظریات سے بھی پیچھے چلا گیا جب اس نے لاشعوری اور ذہنی محرکات کے بجائے جنس کے حیوانی پہلو پر زیادہ زور دینا شروع کر دیا۔ فرائیڈ نے سماجی دباؤ یا برتر انا (Superego) پر زور دیا ہے۔ جدید افسانے میں اس سماجی دباؤ کا تجزیہ غائب ہو گیا ہے۔

آج کا افسانہ جدید افسانے کی اس مراجعت کے خلاف فرائیڈین نفسیات کے سماجی پہلوؤں پر زیادہ زور دیتا ہے اور انسان کو از سرِ نو اُس کے سماجی ماحول میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فرائیڈ کے ابتدائی نظریات آج کے افسانے کے لئے اہم نہیں۔ فرائیڈ کی نفسیات نے جہاں انسان کو تہذیب کے بوجھ اور دباؤ سے نجات دلا کر اُس کے نجی وجود کو بحال کیا، وہاں ہیرو کو بھی جبلی محرکات کا غلام بنا کر اُس کے ہیروپن کو چھین لیا اور انجام کار اُسے نفسیاتی جبر کا حقیر اور بے عمل غلام بنا دیا۔ نو فرائیڈ پرستی میں فرائیڈ کے اس پہلو پر زیادہ زور دیا جانے لگا جس میں اُس نے فکر اور شعور کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور تہذیب کے زوال کا عالمانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ فرائیڈ نے خود تحریر کیا ہے کہ بار بار ہم اس حقیقت پر زور دے سکتے ہیں کہ انسانی شعور اُس کی فطری جبلتوں کے مقابلے میں کمزور ہے۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی ہم صحیح ہوں گے لیکن اس کمزوری میں ایک خصوصیت ہے۔ شعور کی آواز نرم ہے لیکن سنائی دینے سے قبل یہ بند نہیں ہوتی۔ آخر کار انسان کے انکار کے بعد بھی یہ سنائی دے ہی جاتی ہے۔ امریکہ میں جنسی آزادی کا مطالبہ نسلی اور طبقاتی امتیاز کے خلاف جاری تحریک کا ہی حصہ بنتا جا رہا ہے۔ ژاں پال سارتر نے تحلیل نفسی اور طبقاتی کشمکش کو اپنے وجودیت کے فلسفے میں شامل کر لیا ہے۔ اب انسان کو پھر سے ایک اکائی کی شکل میں پیش کرنے کا رجحان تقویت پا رہا ہے۔

اسی طرح مارکسیت پر بھی نئی روشنی میں غور کیا جا رہا ہے۔ اب مارکسیت کا کوئی سکہ بند تصور قائم نہیں رہا۔ دوسری جنگِ عظیم سے قبل اور اُس کے بعد کچھ برسوں تک مارکسیت کا اثر اُردو افسانے پر کافی غالب رہا اُس کا باعث بھی فرد کی آزادی اور سچائی کی تلاش ہی تھا۔ مارکس نے طبقاتی امتیاز پر مبنی سماج اور معاشی استحصال میں پستے فرد کو ایک غیر طبقاتی اور انصاف پر مبنی سماج میں آزاد زندگی بسر کرنے کا مژدہ سنایا تھا لیکن گزشتہ تیس برسوں میں بین الاقوامی سیاست میں جو واقعات رونما ہوئے ہیں وہ ایسے تھے کہ ہر قسم کی آمریت کے لئے چیلنج ثابت ہوئے۔ چاہے اُس کے پیچھے کوئی بھی فلسفہ کیوں نہ کارفرما رہا ہو۔ اُردو افسانے میں مارکسیت نے جس سماجی حقیقت نگاری کے رجحان کو راہ کیا۔ افسانہ نگار اُس سے منہ موڑ کر دروں بین اور داخلیت پرست ہو گیا اور ذات کی تلاش شروع ہو گئی۔ مارکسیت سے مایوس ہو کر جدید افسانہ نگار کا اعتقاد ہر قسم کی آئیڈیالوجی سے اُٹھ گیا اور وہ ادیب کی سماجی ذمہ داری کے خلاف انفرادی حقیقت اور صداقت پر زور دینے اور ترقی پسندی کے خلاف جو شدید ردِ عمل ہوا اس کی زد میں ہر قسم کی انسان فکر آئی۔ سماجی پروٹسٹ کا زور ختم ہو گیا لیکن نو مارکسیت کے نئے رجحان میں بیرل بائیں بازو کی نئی تحریک کا احیا ہو رہا ہے جس کا اثر آج کے افسانے پر پڑ رہا ہے۔

نئے افسانہ نگار یہ محسوس کرتے ہیں کہ حالات تیز رفتاری سے بدل رہے ہیں اور جدید افسانہ اپنے مکمل روپ میں کسی بھی فلسفۂ حیات کو نمودینے میں کامیاب نہیں ہو رہا ہم نہ اجنبی ہیں نہ تنہا، نہ جلاوطن بلکہ سیکڑوں سالوں سے مغرور ہیں جو حقیقت پرستی کا دعویٰ کرتے ہیں اور حقیقت سے آنکھیں چراتے ہیں۔ اقدار کے فنا کا نعرہ لگاتے ہیں اور زندگی سے منکر ہو جاتے ہیں موت کی ستائش کرتے ہیں اور زندگی سے حقارت۔ یہ اقدار سے برہمی نہیں بلکہ ایک قدر کو دوسری قدر پر ترجیح دینا ہے۔ اقدار کا خلا ممکن نہیں اور غیر جانبدار تخلیق محض ایک

مفروضہ اور واہمہ ہے۔ ت ہمیشہ انسان کی زندگی کی طبعی حد رہی ہے اور ادب ہمیشہ آزادی کے اُفق کو وسیع کرنے کی انسپریشن زندگی ہیں ڈھونڈھ رہی ہے اور ہم بے معنی الفاظ (لفظ اور معنی کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے) میں فرار کی راہیں پیش کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ الفاظ کو نئے معنی کون عطا کرے گا۔ الفاظ کی شعبدہ بازی اور طلسماتی افسانوں کے خالق جدید افسانہ نگار آرام دہ اور محفوظ پناہ گاہوں میں سر چھپاتا پھر رہا ہے اور زندگی اُسے تلاش کر رہی ہے۔ ان کا افسانہ ایک نئی تحریک کا منشور ہے۔ اس فرار اور مابعد الطبیعاتی داستان گوئی اور انا پرست فکر اور ذات کی مصنوعی تلاش کے خلاف آج کا افسانہ مکمل آزادی اور مکمل انسان کی جستجو ہے۔

آج کے افسانے میں جدید افسانے کے مقابلے میں انسان کی مکمل ذات کی اکائی کو بحال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور سماجی زندگی کی تدریجی حقیقت کے چیلنج کو تسلیم کرنے کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ آج کا افسانہ انسانی زندگی کے تناؤ اور کشمکش اور نیوراتی پہلو کی ہی عکاسی نہیں کرتا بلکہ اس کے خلاف جاری جدوجہد کو بھی پیش کرتا ہے۔ آج کا افسانہ زندگی سے فرار کے بجائے زندگی کی جانب واپسی قدم ہے اور زندگی کو جینے کے قابل بنانے کے لئے خود وابستگی کا ثبوت دے رہا ہے لیکن یہ افسانہ نگار اس بات پر کافی احتیاط برت رہے ہیں کہ اُن کا فلسفۂ حیات کہیں ترقی پسندی کی بازگشت بن کر نہ رہ جائے۔ اس لئے اُسے زندگی کے وسیع اور جامع دائرے میں زندہ رہنے کے لئے مجبور ہونا پڑا ہے۔ خطرہ صرف یہی ہے کہ اس نئی تحریک میں زندہ افسانہ نگار بھی شامل نہ ہو جائیں جنہیں کسی نئے لیبل کی تلاش ہے، نئے فلسفۂ حیات کی نہیں۔

---

**اگست** کے شمارے میں جو جوابی کارڈ چسپاں کیا گیا ہے وہ پُر کر کے ہمیں ضرور بھیجیں۔ اس طرح ہم آپ کے خیالات سے واقف ہو سکیں گے اور اس کی روشنی میں آج کل کو بہتر بنانے کی کوشش کریں گے جواب کے لئے کارڈ پر ٹکٹ لگانے کی ضرورت نہیں ہے (ادارہ)

---

معین الدین فریدی

# شعر و نغمہ

مطربہ! مجھ سے سُلا داد تجھے کیا ملتی
نغمہ و ساز کے آداب سے بیگانہ ہوں
ایک ہی کیف کے دو نام ہیں شعر و نغمہ
اس حقیقت کا پرستار ہوں دیوانہ ہوں
نغمہ، جو روح کی گہرائی سے تب آئے
ساز کے تار میں دل سب کے پرو دیتا ہے
یونہی جس شعر میں ہو خونِ جگر کی تحریر
سیلِ انوار میں ذہنوں کو ڈبو دیتا ہے
میں، کہ ناواقفِ آدابِ سرود و بربط
لحن کے سحر سے مسحور سا ہو جاتا ہوں
نغمہ و شعر کی ہے ایک ہی دلوی، یعنی
دل کھنچے جس کی صدا پر اُسے سجدہ کر لوں
ترے لہجے کی یہ جھنکار، یہ آوازِ کارس
روح میں جیسے کئی جام کھنک جاتے ہیں
اور جب تان لگاتی ہے تو انگڑائی کے ساتھ
بزم میں کتنے ہی شعلے سے لپک جاتے ہیں
تیرے بے ربط سے بولوں میں بھی ایسا جادو
ایسی تاثیر کہ مقبول دعا ہو جیسے
لَے میں وہ بات کہ ہو جیسے نزولِ الہام
خمِ گردن میں وہ پندار، خدا ہو جیسے

●

# بہاء الدین کلیم



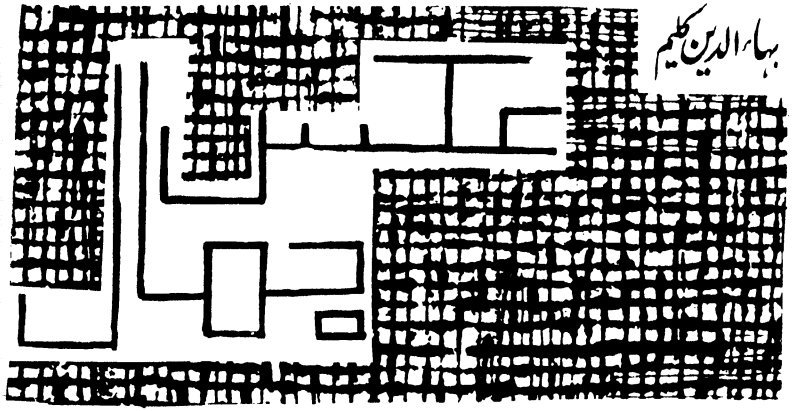

کتنے ہفتے ہوئے کتنے ہی مہینے گزرے
نہ کوئی خط و کتابت نہ پیام اور نہ سلام
میں نے سوچا تھا کہ . . . .
بات یہ ہے میری غدرا، کہ محبت کا مزاج
نکہتِ گل سے بھی نازک ہے، خدا جانتا ہے
اتنی مدت سے نہ نامہ نہ پیام !!
اور ادھر
غم دوری سے دل و جاں کا سنبھلنا مشکل
روحِ قالب سے نکل جانے کو مضطر جیسے
میں نے اس شعر میں گویا کہ تجھے لکھا تھا
"تیرے قدموں سے جدا ہو کے بھی جینا اے دوست
پہلے ممکن ہے کہ آسان ہو اب مشکل ہے"

---

زندگی میری بھی گزری ہے گلستاں بہ کنار
جادۂ شوق کے ہر موڑ سے گزرا ہوں میں
کتنی سلماؤں نے کی سعی کرم فرمائی
کتنی لیلاؤں نے الفت کے مواقع بخشے
ناز اٹھانا دلِ دیوانہ سے ممکن نہ ہوا —
بد دعا گیسوؤں والوں کی بلا ہوتی ہے
زندگی میں جو بہار آئی تھی غدرا بن کر
ہوئی رخصت وہ غبار رہ صحرا بن کر

ساعتیں قرب کی سب دوری میں تبدیل ہوئیں
راحتیں وصل کی مہجوری میں تبدیل ہوئیں
ہائے نیرنگ محبت کا اثر کیا کہیئے
شمع کی لو کہیں، دو دِ پرِ پروانہ کہیں

---

سوز مہجوری سے جل جاتے ہیں دل وجاں لیکن
آتش شوق پہ پڑنے لگی یادوں کی پھوار
تیری زلفوں کی خنک چھاؤں میں پالی ہوئی یاد
جسم وجاں قلب وجگر جس سے معطر ہو جائیں
یاد کے ساتھ ہی آیا جو ترا عکس جمال
نئے عنواں سے مجلیٰ ہوا آئینۂ دل
حسن کے جلوؤں نے جیسے کہ مجھے گھیر لیا
بربطِ جاں نئی صورت سے ہوا نغمہ سرا
تیرے ماتھے پہ وہ بکھری سی وہ الجھی سی لٹیں
یاد جب آئیں میرے شوق نے کچھ یوں سوچا
یہ جو سلجھیں تو در و بام چمک اٹھیں گے
ظلمتیں ہیں تری زلفوں کے سنور جانے تک . .
تیری ہی زلف کی خوشبو میں بسا تھا جو دماغ
جھوم کر شعر قلم نے یہ غزل میں لکھا
"یہ کسی زلف کی خوشبو ہے جو لائی ہے نسیم
بوئے گل ایسی دل آویز کہاں ہوتی ہے

اہل دل جھومنے لگتے ہیں مری غزلوں پر
لوگ سر دھنتے ہیں اور کہتے ہیں
"آج کل کیف تغزل میں ہے سرشار کلیم
ہر غزل نقشۂ جادو نظراں ہوتی ہے"

---

میری غدرا ! میری محبوب ! مری جانِ کرم
تیری جادو نظری مجھ کو کہاں لے آئی
ہر طرف حسن کا شعلہ نظر آتا ہے مجھے
ہر طرف آگ کا دریا نظر آتا ہے مجھے
حد سے بڑھ جاتی ہے دیوانگیٔ شوق تو پھر
صحنِ گلزار بھی صحرا نظر آتا ہے مجھے
اک ذرا سا تری زلفوں نے سہارا جو دیا
رسن و دار کا نقشہ نظر آتا ہے مجھے
اک ذرا سی ترے عارض نے ضیا جو بخشی
اب اندھیرے میں اجالا نظر آتا ہے مجھے

---

آتش شوق میں دل شام و سحر جلتا ہے
اے غم دوست تپا کر اسے کندن کر دے

---

ڈوگری کہانی

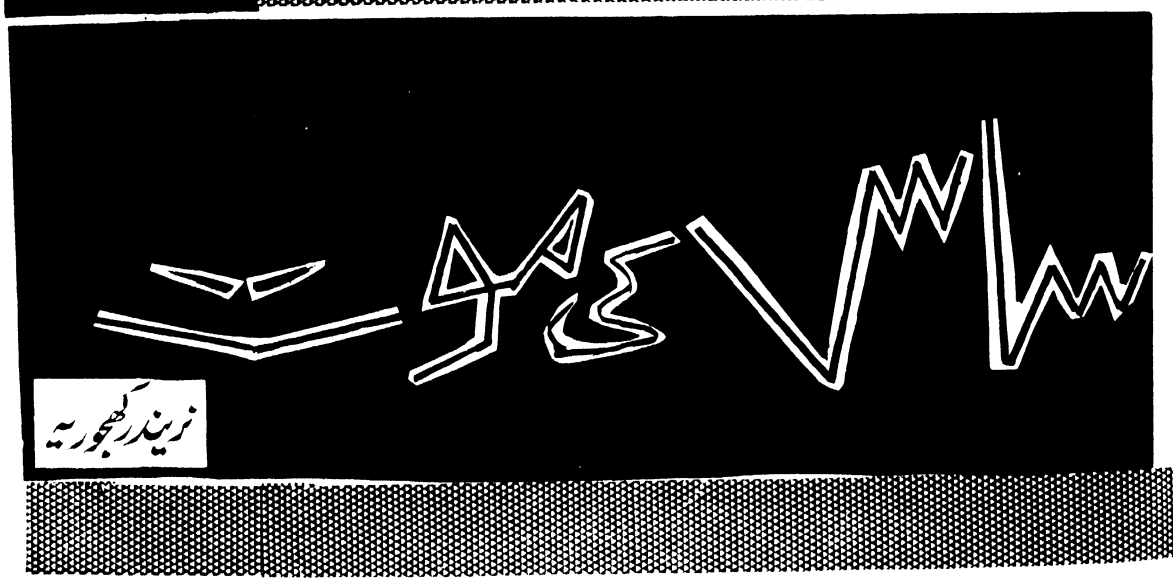


جیٹھ مہینے کی ایک دوپہر تھی۔

میں بھوک اور گرمی سے بے حال دفتر سے لوٹ رہا تھا۔ اپنی گلی کی نکڑ میں پہونچا تو کانوں میں کسی عورت کے دہاڑیں مار مار کے رونے کی آواز سنائی دی۔ حالاں کہ اپنی عمر بھی روتے ہی گزری تھی تاہم کسی کو روتے سن کر دل ٹوٹ جاتا ہے۔ میری چال مدھم پڑ گئی، دل کسی انجانے خوف سے ڈوبنے لگا۔ رونے کی آواز ہمارے گھر کی جانب سے ہی آرہی تھی۔ بجلی کے کھمبے کے پاس کھڑا ہو کر میں یہ سوچنے لگا کہ یہ کون دکھیارو رہی ہے۔ گھر میں تو صرف بیوی ہی تھی۔ وہ بلا ناغہ ہر روز ہمارے سرہانے بیٹھ کر رو لیتی تھی۔ اُس کی آواز اپنی جانی پہچانی تھی یہ اُس کی آواز نہیں تھی۔ پھر ہمارے جیتے جاگتے بھلا اُسے رونے کی کیا ضرورت تھی۔ یوں بھی وہ پنچم سُر میں تو کبھی نہیں روتی تھی۔

اچانک سنتی پھوپھی میرے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ اس سے قبل کہ میں ان سے کچھ پوچھوں وہ پھوٹ پڑیں، "نندو! تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ جلدی گھر جاؤ کملا کی ماں مر گئی ہے۔"

مجھے لگا کسی نے بجلی کے کھمبے پر پتھر دے مارا ہو اور اُس کی گونج میرے جسم سے پیدا ہوئی ہے۔

کملا میری بیوی کا نام ہے۔

گھر پہنچا۔ محلے بھر کی عورتیں وہاں جمع تھیں۔ اُنہیں کے درمیان بیوی کی دہاڑیں مار مار کے رونے اور چھاتی پیٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

بھاری قدموں سے سیڑھیاں طے کر کے میں اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ میری ساس کی اس اچانک موت نے میرے بدن کو نڈھال کر دیا تھا۔ سچ مچ ہی وہ بڑی شفیق اور سمجھ دار عورت تھیں۔ اُنہوں نے اپنی بیٹی یعنی میری بیوی کے نام اپنی تمام جائداد پہلے ہی لکھ دی تھی۔ اگر اس وقت انہوں نے وصیت نہ کی ہوتی تو آج اُن کے قریبی رشتہ دار کئی جھنجھٹ کھڑے کر دیتے۔

معاً سنتی پھوپھی کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ کمر پہ ہاتھ رکھ کر کچھ اس انداز سے مجھے گھور گھور کے دیکھنے لگیں جیسے اپنی ساس کی موت کی ذمہ داری مجھ پر ہی ہو۔ "نندو! یہ وقت پنکھا کھول کر بیٹھنے کا نہیں۔ تمہارے یہ موٹے پنکھے تو بازو پسارے گھومتے ہی رہیں گے جانے

والی بے چاری چلی گئی۔ وہ آنسوؤں سے خالی اپنی آنکھیں چادر سے پونچھتے ہوئے بولیں۔ "کملا نے رو رو کر کیا حالت کر رکھی ہے اور تو آکر مزے سے پنکھے کے نیچے بیٹھ گیا ہے۔ بیٹا! ساس روز روز نہیں مرتی۔ دُنیاداری کے لئے ہی دو ایک دہاڑیں تمہیں بھی مار دینی تھیں۔"

میں نے کہا۔" پھوپھی! میری دہاڑیں سُن کر کیا وہ لوٹ آئیں گی۔"

بغیر کوئی جواب دیئے وہ تیزی سے مڑ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

سوائے چچی جینتی کے ہمارا سارا محلہ پھوپھی سینتی سے ڈرتا ہے۔ لیکن اس وقت میں ان دونوں سے خوف زدہ تھا۔ ایسے سنہری موقع پر اُن کے ہاتھوں میں "فل کمانڈ" ہوتی ہے۔ میں نے فوراً پنکھا بند کیا اور نیچے دری پر سر تھام کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد پھوپھی سینتی اور چچی جینتی میری تلاش میں وہیں پہونچیں۔ چچی جینتی نے پہلے بند پنکھے کو دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں "نندو بیٹا! سب جانتے ہیں کہ ماں جس کی مری ہے، اُسی کی مری ہے، جو گھاٹا ہوا سوائے لیکن وہ تیری بھی تو کچھ لگتی ہے۔ اُس کا بھی تمہارے سوا اپنا کون تھا؟"

اب پھوپھی سینتی کی باری تھی۔ "اپنے کتے بلی کے مرنے پر بھی لوگ "چھم چھم" روتے ہیں، وہ تو تیری ساس تھی۔ . . میری ماں مری تھی تو مہینوں کے پتالے۔ چھ مہینے ایک وقت کھانا کھایا۔ مجھے دیکھ اُن کی آنکھوں سے چھم چھم آنسو بہنے لگے۔ کہتے۔ سینتی! تیرا اس دُنیا میں کوئی اپنا نہ رہا۔ اس بار پھوپھی کی آنکھوں سے سچ مچ کے آنسو بہنے لگے۔ جس کو انہوں نے پونچھا نہیں۔ پھر میری خشک آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے وہ چچی جینتی سے بولیں۔

"بہن یہ آنسو ایسے نہیں بہتے۔ دکھ جب ہڈیوں میں جا کر چبھتا ہے تب کہیں ان پانی کے چراغوں میں جوت جلتی ہے۔"

چچی جینتی نے میرے سر کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! لوگ کیا کہیں گے۔ مرنے والی کی رُوح کیا سوچے گی۔ کملا کیا کہے گی؛ تیری ماں مری تھی تو رو رو کر کملا کا گلا بیٹھ گیا تھا لیکن صدقے جاؤں اُس کے، گرم پانی کے گُلے کر کر کے برابر تیرہ دن تک روتی رہی تھی۔" چچی نے ایک آہ بھر کے پھر کہنا شروع کیا۔" کرنی بھگوان کی دیکھ آج اُس کی ماں مری ہے تو اس گھر میں اُسے رونے والا بھی کوئی نہیں۔ کوئی آباد گھر کے بچھن ہیں؟" چچی نے میری آنکھوں پر اپنے ہاتھ کی پٹی رکھتے ہوئے بڑی نرمی سے کہا۔" شاباش! میرا اچھا بیٹا! میرے کہنے پر صرف دو آنسو۔ دیکھ! میں نے تجھے بچپن میں گود کھلایا ہے روتے کو ہنسایا ہے۔ اب میرے کہنے پر صرف . . . ."

چچی اب میرے سر کو آہستہ آہستہ سہلا رہی تھیں جیسے جھ پھونک کر رہی ہوں۔ جس سے میری آنکھوں سے خود بخود آنسوؤں کی جھڑی لگ جائے

میں نے بڑی عاجزی سے کہا۔" مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ مجھے شرم آتی ہے۔"

پھوپھی سینتی جسے ڈر تھا کہ کہیں میں چچی جینتی کے کہنے پر ہی رو دوں، غصہ میں بولیں۔" چھوڑ جینتی! بھلا اس نے کیا رونا جو سگی ماں کے لئے نہیں رویا تھا۔ آ۔ نیچے چلیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کمل بھی رو دھو کر چپ ہو گئی۔"

مگر چچی جینتی اتنی جلدی ہار ماننے والوں میں سے نہ تھیں بولیں "میں نے بڑوں بڑوں کو خون کے آنسو رُلایا ہے۔ بھلا یہ کیسے نہیں روئے گا؟ ساس مری ہے۔ کوئی مذاق تھوڑا ہے۔

نیچے اب میری بیوی رو نہیں رہی تھی بلکہ رونے کے بہانے مجھے طعنے سُنا رہی تھی۔

"ہائے میری اماں! تیرے مرنے کا کسی کو کوئی دُکھ نہیں جن کو تو نے چوریاں کھلائیں۔ آج اُن کی ہی آنکھیں پتھر کی ہو گئی ہیں۔"

مجھے لگا کہ خواہ میرا رونا میری ساس کے لئے ضروری نہ ہو مگر میرے اپنے لئے یہ بہت ضروری ہے۔ ورنہ ساری عمر کے لئے رونا پڑے گا۔

پھوپھی سینتی اور چچی جینتی ابھی میری جانب یوں تک رہی تھیں

یے عورتیں بندنل کی طرف دیکھتی ہیں۔ میں نے اُن سے دونوں ہاتھ جوڑ کر التجا
ا "آپ کے سامنے روتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ آپ نیچے جائیں۔
رونے کی کوشش کرتا ہوں۔"

پھوپھی کو جیسے کسی نے بچا لیا ہو۔ خوش ہو کر بولیں "جیتے رہو
ا بھگوان تمہیں . . . . ."

مگر چچی نے اُن کی بات کاٹ کر کہا

"مگر دہاڑوں کی آواز اِرد گرد کے چار گھروں تک سنائی دے"

میں نے بڑی عاجزی سے کہا "اپنی طرف سے مجھے پوری
ش کرنا ہے۔ اب چار گھروں میں کوئی نہ سنے اِس میں میرا کیا قصور؟"

وہ دونوں نیچے چلی گئیں۔

نیچے پانچ عورتوں کی ملی جُلی آواز سُنائی دی۔ "مان گیا؟"

چچی بڑے فخر سے کہہ رہی تھیں۔ "ہاں! بھلا۔ مانتا کیسے نہیں؟"

اِس خوشی میں میری بیوی نے ایک زور کی دہاڑ ماری۔ "ہائے
ر میری اماں . . . . !"

حالاں کہ اُسے اِس وقت اماں لفظ کی جگہ میرا نام لینا چاہئے
ا۔

پھوپھی بیوی کو سمجھا رہی تھیں۔ اب تو ذرا دم لے لے۔ اُوپر
ر بھی . . . ."

اب میری حالت کا موازنہ آپ اسٹیج کے اس اداکار سے
ل کر سکتے ہیں جو اسٹیج پر قدم رکھتے ہی اپنا پارٹ بھول جائے۔
رہٹ کے مارے میں کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا۔ رونے کے لئے
دو مرتبہ میں نے اپنا پورا منہ کھولا۔ ٹھیک ویسا ہی ہوا جیسے اکثر
نیما کے پردے پر ہوتا ہے اور تماشائی چلاتے ہیں۔ آواز۔ آواز
نے لاکھ کوششیں کیں مگر بھوکے پیٹ سے کوئی آواز نہ نکلی۔

نیچے چچی جینتی کہہ رہی تھیں۔

"نہیں! وہ بڑا بے شرم ہے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو کہاں؟"

سُن کر مجھے ٹھنڈا پسینہ آگیا۔ مارے ڈر کے جتنا منہ کھل
تھا کھول دیا اور جلدی جلدی کمرے میں تیز چکر کاٹنے لگا۔ اچانک
ر سے ٹنگے بھونپو پر نظر پڑی۔ الیکشن کے دِنوں کا وہیں ٹنگا تھا۔

اُس کو میں نے یوں حسرت بھری نظروں سے دیکھا جیسے کوئی ڈوبتا ہوا
آدمی کنارے کی طرف دیکھتا ہے۔

بھونپو کو مُنہ سے لگا کر میں نے ایک زور کی پھونک ماری۔
پڑوسیوں کا کتا اِس بے سُری آواز کو سُن کر چونک پڑا اور منہ اُوپر
اٹھا کر زور زور سے رونے لگا۔

نیچے چچی جینتی خوش ہو کر سب سے کہہ رہی تھیں "سُنا! کتنی
دردناک دہاڑ ماری ہے۔"

میری بیوی نے اپنی چھاتی پیٹ کر کہا۔

"ہائے! یہ تو وہ بھونپو بجا رہے ہیں!" یہی بات اُس نے اپنی
مرحوم ماں کو مخاطب کر کے بھی کہی۔ "اماں تیرے مرنے کی خوشی میں اِس
گھر میں بھونپو بج رہے ہیں۔"

میں نے فوراً بھونپو کو اُس کی جگہ پر رکھ دیا اور سر پر ہاتھ دھر
کے زور زور کی اصلی دہاڑیں مارنے لگا۔

جب پھوپھی سنیتی، چچی جینتی اور میری بیوی کملا اوپر پہونچیں تو میں
بے ہوش پڑا تھا۔ پانی کے چھینٹوں سے وہ مجھے ہوش میں لائیں۔
آہستہ آہستہ آنکھ اُٹھا کر میں نے اُن کی طرف دیکھا۔ اچانک ایک چیخ
میرے منہ سے اور نکل گئی اِس سے قبل کہ میں ایک بار پھر بے ہوش
ہو جاتا چچی جینتی نے دُلار سے ڈانٹتے ہوئے کہا "بس! بس! بہت
ہو چکا! اب جلدی سے سُسرال جانے کی تیاری کر دو۔ تم لوگوں کے
پہونچنے پر ہی داہ سنسکار ہونا ہے۔"

میں نے تولیہ بھگو کر سر پر رکھا اور گاؤں جانے کو تیار ہو گیا

اُس چلچلاتی دوپہر کو چھ کوس کا پیدل سفر، اُس پر بیوی کا بے
سُرا رونا۔ آدھے راستے تک وہ مسلسل روتی رہی جب اس کا گلا
بُری طرح بیٹھ گیا اور رونے کے بجائے اُس سے بڑی خوفناک آوازیں
نکلنا شروع ہوئیں تو اُس نے خاموشی اختیار کر لی۔ اب راستہ میں جب
کوئی گھر یا دکان آتی وہاں اپنے دِل کے دُکھ کا اظہار کرنے کے لئے
رونے لگتی۔

ایک جگہ ایک دوکان دار اپنی دوکان پر بڑی میٹھی نیند سو رہا
تھا۔ بیوی کے رونے سے ہڑبڑا کے جاگ پڑا اور قریب آکر پوچھنے

## معصوم شیر گھاٹوی

شہر میں تیرے اجنبی سے ہیں
رکھو جس حال میں خوشی سے ہیں
ہائے اُن کی نگاہ جیسے کہتی ہو
ہم مخاطب تو آپ ہی سے ہیں
کارواں دُور ہے بہاروں کا
لوگ کیوں بدحواس ابھی سے ہیں
ایسے جینے سے ہم تو باز آئے
سہمے سہمے سے زندگی سے ہیں
مفت بدنام دشمنی ہے یہاں
چرکے جتنے ہیں دوستی سے ہیں

## افتخار احمد فخر دھولیوی

گلوں کے ساتھ ہی سرسبز خار ہونے دو
کچھ اس طرح بھی نظامِ بہار ہونے دو
یہ زیرِ سایۂ گل ہیں جو خار ہونے دو
جہاں کو کچھ تو یقینِ بہار ہونے دو
لگا ہی ہیں گے کسی روز منزلوں کے سُراغ
نظر سے دُور حجابِ غبار ہونے دو
جنونِ آبلہ پائی کا لُطف آئے گا،
قدم قدم پہ نیا خار زار ہونے دو
چمن پہ آنچ نہ آئے غم نشیمن کیا؟
اگر ہے یورشِ برق و شرار ہونے دو
وہ لوگ جو نہیں کیفِ حیات سے واقف
اُنہیں اسیرِ غمِ روزگار ہونے دو
تمہیں بتائیں گے تنظیمِ گلستاں کیا ہے
چمن پہ ایک ذرا اختیار ہونے دو
تڑپ نہ جائیں جو وہ بھی تو پھر مرا ذمہ
کچھ اور میرے دل کو بیقرار ہونے دو
خلش تو خارِ محبت کی اب نہیں باقی
ہوا جو دامنِ دل تار تار ہونے دو
گلوں سے آگ لگی ہے اگر گلستاں میں
تو برق کو بھی شریکِ بہار ہونے دو
جو وقت آن پڑے خونِ دل سے تم سینچو
کبھی نہ ختم چمن کا نکھار ہونے دو
تمہاری زلف کا یہ دل اسیر ہو نہ سکا
کچھ اور زلف دوتا تابدار ہونے دو
وطن کے نام کو اپنے کلام دلکش سے
اے فخرؔ! باعثِ صد افتخار ہونے دو

---

لگا۔ "یہ بے چاری کیا بیوہ ہوگئی ہے؟" میں نے کہا "نہیں ابھی نہیں!"

تھکے ماندے شام کو ہم سسرال پہونچے۔ سامنے گلی سے سر پہ گھڑا اُٹھائے مسکراتی ہوئی میری ساس آرہی تھیں۔

"اماں ۔ ۔ ۔ ۔!" بیوی نے ایک چیخ ماری اور اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ پانی سے بھرا گھڑا دھڑام سے نیچے آگرا۔

اب ہنس ہنس کر وہ اپنی بیٹی کو سُنا رہی تھیں۔

"۔ ۔ ۔ تو پروہت جی نے یہ خبر شہر بھی پہونچادی۔ ۔ پرسوں ایک موٹی چھپکلی مجھ پر آگری۔ پروہت جی نے اسے "مرتیو یوگ" بتایا اور اس کو ہی ختم کرنے کے لیے یہ بات پھیلائی ۔ ۔ ۔"

میرا دل چاہا کہ اس مرتیو یوگ کو ختم کرنے کی خوشی میں دہاڑیں مار مار کے رونے لگوں۔ (ترجمہ: سرجیت)



# آپ اپنے پڑھنے کی رفتار کیسے بڑھا سکتے ہیں

عزیز احتشام الرحمان

آج کا دَور وہ نہیں ہے جو سو سال پہلے تھا۔ زندگی کی روانی میں فرق آچکا ہے۔ ہر شے کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ آمد و رفت کی سہولتیں کس حد تک بڑھ چکی ہیں۔ یہ کہنے سے نہیں دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتی ہیں جن جگہوں پر انسان جانے کا چند سال قبل تصور بھی نہیں کر سکتا تھا آج وہاں صرف گھنٹوں کی مدت میں پہونچ جاتا ہے۔ ایک حالیہ جائزے کے مطابق شکاگو کے اوہایو ہوائی اڈے سے ہر آدھے سکنڈ پر مختلف نوع کے ہوائی جہاز مختلف جگہوں کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔

ایسے ہی تیز رفتار دَور کی ایک شدید مانگ ہے۔ ہم تیز کیسے پڑھ سکتے ہیں؟ عملی حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں "اپنے پڑھنے کی رفتار بڑھاؤ"۔ ت کی اس مانگ کے پس پردہ کئی وجہیں ہیں۔ اُن میں ایک یہ حقیقت ہے علم حاصل کرنے کے لئے، معلومات فراہم کرنے کے لئے ہمارے پاس مدت وڑی ہے اور اُن کا ذخیرہ وسیع۔ ان دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے لئے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لئے اپنے پڑھنے کی رفتار بڑھانی ہی ہوگی۔ آیئے ہم اس مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالنے وشش کریں۔

آپ خود کو کیسا کتب بین سمجھتے ہیں؟ کیا آپ ایک منٹ میں ۲۰۰ الفاظ پڑھ لیتے ہیں جو بہرحال معمولی ہے، یا ۲۶۰ جسے اوسط خیال کیا جا سکتا ہے یا پھر ۴۰۰، جو ہر اعتبار سے عمدہ رفتار کہی جائے گی؟ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا اندازہ آپ کریں گے کس طرح؟ کسی بھی شخص کو ایک گھڑی دے دیجئے اور اُس سے صحیح وقت معلوم کر لیجئے۔ پھر جب آپ پڑھنے لگیں تو اس سے قبل اُسے ہدایت کر دیں کہ وہ آپ کو ایک منٹ بعد روک دے۔ اب آپ پڑھے گئے الفاظ کا شمار کر لیں۔ اس طرح آپ معلوم کر سکیں گے کہ حقیقتاً آپ کی رفتار کیا ہے۔

تیز رفتاری سے پڑھنا خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ ۱۹۴۰ء کے بعد کتابوں، رسالوں اور اخباروں کی اشاعت بہت بڑھ گئی ہے۔ گھر گھر میں ان کی پہونچ ہو گئی ہے۔ کتابیں بڑے پیمانے پر فروخت ہو رہی ہیں۔ تجربہ گاہوں اور تحقیقی مراکز سے نکلنے والے ٹیکنیکل پیپرز TECHNICAL PAPERS کی ہی تعداد ایک تخمینہ کے مطابق چھ کروڑ صفحات سالانہ ہے۔ دنیا میں سائنسی جرائد کی تعداد اب ایک لاکھ سے اُوپر ہو چکی ہے اعلیٰ حکام اور منتظمین اوسطاً اپنے چار قیمتی گھنٹے ہر روز پڑھنے پر صرف کرتے ہیں مسئلہ

چاہے یہ سیاہی ہو کسی نہ کسی نے کچھ ضرور لکھا ہے جس سے مسئلہ کو سلجھانے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس کے حل کرنے کے لئے مواد فراہم ہو، کوئی نئی راہ نکلے، کوئی نئی روشنی ملے

لیکن سوال یہ ہے کہ آپ معلومات اور ایجادات کے ان پے در پے دھماکوں سے آگاہ اور مستفید ہونے کے لئے وقت کیوں کر نکالیں گے؟ پڑھائی کو آپ کس طرح ذاتی، تجارتی اور اپنے پیشے میں کامیابی حاصل کرنے کا آلہ بنائیں گے؟

فرض کیجئے کہ آپ ابھی ۲۵۰ الفاظ فی منٹ کی رفتار سے پڑھتے ہیں۔ اور پڑھائی پر روز ایک گھنٹہ صرف کرتے ہیں۔ اگر آپ اپنی رفتار بڑھا کر دوگنا کرلیں تو آپ کو ہفتہ بھر میں سات گھنٹے پڑھنے کے لئے زائد ملیں گے۔ اس طرح آپ ۱۴ گھنٹے کی پڑھائی سات گھنٹہ میں کرسکیں گے۔ اگر رفتار تین گنی یا چار گنی کردیں تو آپ کو ایک ہفتہ میں ۲۱ گھنٹوں کا فائدہ ہوجائے گا۔ یہ کس طرح کیا جاسکتا ہے؟ صرف اگر آپ رکاوٹیں ہٹالیں۔ آپ بریک ( BRAKE ) لگا کر کار چلانے کے متعلق سوچنا بھی پسند نہیں کریں گے۔ لیکن جب آپ ایک پڑھنے والے کی صورت میں آتے ہیں تو آپ کے ساتھ کئی روک بھی ہوتے ہیں جو آپ کے پڑھنے کی رفتار کو یقیناً کم کردیتے ہیں۔

ایک روک ( BRAKE ) جو بہت عام ہے پلٹنا ہے۔ ہر مرتبہ پڑھی گئی عبارت کو پلٹ کر پھر سے پڑھنا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ آگے چل کر پھر پیچھے کی طرف لوٹیں اور تب پھر آگے بڑھیں۔ اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہے شاید کوئی شخص بھی اسے تیزی سے آگے بڑھنے کا طریقہ قرار نہیں دے گا۔ بار بار پلٹنا ایک عادت، اعتماد کی کمی یا خزانۂ الفاظ کی کمی ہوسکتی ہے یا پھر حقیقتاً کسی لفظ یا فقرہ کے چھوٹ جانے سے ایسا ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ عادت پڑھنے کی رفتار فہم اور لیاقت کا ستیاناس کردیتی ہے۔

امریکہ میں ایک تجربہ کے مطابق ۱۲۰۰ پڑھنے والوں کی آنکھیں اوسطاً ۱۰۰ الفاظ کے پڑھنے میں پندرہ مرتبہ پلٹتی ہیں۔ ایسا اُن تصویروں کے ذریعہ معلوم ہوا جن میں حرکتِ چشم کو قید کردیا گیا ہے۔ کچھ اور تجربوں کے مطابق سو الفاظ کے پڑھنے میں ہی کچھ لوگوں کی آنکھیں بیس مرتبہ تک پلٹ جاتی ہیں۔ مختصراً پڑھنے کے دوران پلٹنے کی یہ عادت آپ کے قیمتی ادراکات کے چھٹے حصے کی خود مالک بن بیٹھتی ہے اس روک کو ہٹائیے اور تیز پڑھنے کا لطف لیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کی پچھلی رفتار میں سو الفاظ فی منٹ یا اُس سے زیادہ کا اضافہ ہوگیا ہے۔

دوسری روک ادائیگی الفاظ ہے ـــــ پڑھنے کے دوران الفاظ کو زبان سے خود سننے کے لئے ادا کرنا۔ بچپن میں ہمیں قاعدہ پڑھتے وقت الفاظ کی اُن ٹکڑوں کی، یہاں تک کہ تمام حروف کی ادائیگی کی مشق کرائی جاتی ہے، یہ عادت آج بھی ہمارے ساتھ لگی دکھائی دیتی ہے۔ لبوں کی سطح پر الفاظ کی ادائیگ یقیناً پڑھنے کی رفتار کو گراکر گفتگو اور عام بول چال کی رفتار پر لاکھڑا کرتی ہے یعنی اگر پڑھتے وقت ہمارے لب حرکت کریں تو وہ گفتگو کرنے کے مترادف ہوگا۔ اس طرح آپ کی رفتار ۳۰۰ الفاظ فی منٹ سے بھی کم ہوگی۔ لبوں کے پاس پڑھتے وقت انگلی رکھ کر اپنی یہ کمی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس عادت سے چھٹکارا پانے کے لئے پڑھتے وقت اسی نقشہ کو ذہن میں رکھیں۔ جب آپ کو یہ خیال رہے گا کہ آپ کی انگلی آپ کے لبوں پر ہے تو پھر آپ اس طرح الفاظ ادا نہیں کریں گے۔

ادائیگی الفاظ اس سے اونچی یعنی حلق کی سطح پر زیادہ رائج عام ہے لیکن بہت کم ظاہر ہوتی ہے۔ آپ اسے کس طرح روک سکتے ہیں؟ حلق پر ایک جانب انگوٹھا اور دوسری جانب شہادت کی انگلی رکھ کر ہلکے سے دبائیں۔ پڑھنے کے دوران ایسا کرنے سے اگر آپ کو سا ارتعاش محسوس ہو تو اُس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ اپنی مشکل سے واقف ہوگئے اور اپنے مسئلہ سے آگاہ ہوگئے۔

تیسرا اہم روک لفظ بہ لفظ پڑھنا ہے۔ حرکتِ چشم کی تصاویر یہ واضح ہوجاتا ہے کہ پڑھنے کے دوران آنکھیں چھپی ہوئی سطر کے سا کانپتی ہوئی حرکت کرتی ہیں۔ جس سے کئی الفاظ ایک ساتھ پڑھنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ حالیہ تحقیقات کے مطابق بہت سارے طلبا بغیر کسی خاص مشق کے لفظ بہ لفظ پڑھنے والے بن جاتے ہیں۔ وہ ایک جھلک میں صرف ۱ر۱ الفاظ ہی پڑھ پاتے ہیں۔ اپنی رفتار کو دوگنی یا تین گنی کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ ایک جھلک میں دو یا تین الفاظ پڑھ لینے کے عادی ہوجائیں۔

تو یہ ہیں وہ تین رکاوٹیں جو پڑھنے کی رفتار کو کم کردیتی ہیں اور نتیجہ طور پر معلوماتی سطح پر ہم بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ایک اصول ہے جسے اگر ہوشیاری سے برتا جائے تو اُن کمزوریوں پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

امریکہ کی مشہور یونی ورسٹی آف منی سوٹا کے پروفیسر جیمس براؤن نے اس اصول اور چند اور اصولوں کو مرتب کیا ہے۔ ان پر ہم اگر دھیان دیں اور عمل کریں تو ہماری پریشانیاں دُور ہو سکتی ہیں۔

آہستہ کے بجائے تیز پڑھنا ایک ایسا اصول ہے جس پر وہ طلبا، ضرر کرتے ہیں جو تیز پڑھتے ہیں۔ یہ اصول خود بخود پلٹنے کی عادت کو ختم کر دیتا ہے۔ آپ اس قدر تیزی سے آگے بڑھتے ہیں کہ آپ کو پیچھے دیکھنے کی عادت ہی نہیں ملتی اور پھر آپ کو الفاظ کے ادا کرنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ لہٰذا آخر یہ بڑھائی گئی رفتار تحریر کو ٹکڑوں میں دیکھنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔ نہ الگ الگ لفظ کو۔

اس اصول کو آپ نیچے دیئے گئے جیمس براؤن کے بتیس روزہ پروگرام کے مطابق عمل میں لائیں۔

ابتدا میں آپ ایک ہلکی اور دلچسپ سی کتاب لیں، پھر اُسے پندرہ دن روزانہ آہستہ کے بجائے تیز رفتاری سے پڑھیں بغیر اس خیال کو ذہن میں لائے کہ میں تو کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔ آپ آگے چل کر سمجھنا بھی شروع کر دیں گے۔ ایسی ہر نشست کے بعد آپ یہ دیکھیں کہ کومنٹ میں آپ کس قدر بڑھ پاتے ہیں۔ اس سے آپ کو اپنی ترقی کا اندازہ ہو سکے گا اگر آپ آہستہ کے بجائے تیز نشستیں اکتا نہ دیں یا آپ تھک نہ جائیں تو اور بھی بڑھنے کی سعی کریں اس طرح کہ دس دن کے بعد آپ کی رفتار میں کچھ کمی نمایاں ہو۔ بعض اوقات آپ کی رفتار کم بھی ہو سکتی ہے اور اکثر ہو بھی جاتی ہے اور کبھی اتنی بھی ہو سکتی ہے جتنی سے آپ نے شروع کی تھی۔ لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہاں جب لگاتار اسی طرح دو چار دن ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ اپنے آپ اتنا زور نہیں ڈال رہے جتنا آپ کو ڈالنا چاہئے۔

یونی ورسٹی آف منی سوٹا (ریاست ہائے متحدہ) اپنے مطالعوں کی بنیاد پر کہتی ہے کہ اس بتیس روزہ منصوبے کی مدد سے ۷۲ فیصدی پڑھنے والے اپنی رفتار دوگنی ۲۵٪ اپنی رفتار تین گنی اور ۸٪ اپنی رفتار چار گنی کر سکے ہیں۔ آپ اگر اس کے بعد بھی اپنے مقصد کو حاصل کرنے سے عاجز ہیں تو صرف اپنے روزہ پروگرام کو اپنی استعداد کے مطابق طویل کر دیجئے اگر سچائی اور وفاداری سے آپ اس پروگرام پر عمل کریں تو آپ کے لئے یہ ہفتہ میں ۲۱ گھنٹے زاید ہیا کر سکتا ہے۔

ذیل میں کچھ اور نکتے ہیں جن کی مدد سے آپ ماہر کتب بین ہو سکتے ہیں۔

## رفتار بڑھانے پر زور دیں

۲۵۰ الفاظ فی منٹ سے ۴۰۰ الفاظ فی منٹ کی چھلانگ اور تب گھسٹ کر ۳۲۵ الفاظ فی منٹ زیادہ آسان اور ممکن ہے بہ نسبت اس کے کہ شروع سے ہی ۳۲۵ الفاظ فی منٹ کی کوشش کی جائے۔ یہ نفسیات انسانی میں ہے کہ جتنے کی کوشش کی جائے اس سے کچھ کم حاصل ہو ہی جاتا ہے اگر ہم نے کم کی کوشش کی تو انجام کار ہمیں اُس سے بھی کم حاصل ہوگا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو زیادہ رفتار حاصل کرنا ہمیشہ تکلیف دہ محسوس ہوگا۔ جب تک کہ آپ اس سے بھی تیز رفتار کی مشق نہ کر لیں لہٰذا اگر آپ کی منزل ۵۰٪ الفاظ فی منٹ ہے تو آپ ۹۰۰ الفاظ فی منٹ کے اعتبار سے خوب مشق کریں۔

## الفاظ کو مجتمع دیکھنے کی عادت ڈالیں

کئی الفاظ یا مجموعۂ الفاظ کو ایک نظر میں دیکھنا آسان نہیں ہے کیونکہ اوسط انسان اپنے سامنے کی عبارت کا صرف پانچواں حصہ ہی دیکھ پاتا ہے۔ دیکھنے کی مشق ( PERCEPTUAL TRAINING ) ہاتھوں کی مدد سے یا زیادہ بہتر طریقے پر ایک معمولی پوسٹ کارڈ کی مدد سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

یونی ورسٹی آف منی سوٹا کے پروفیسر مسٹر جیمس براؤن کا ایک چھوٹا سا تجربہ ہے جو پڑھنے کی رفتار بڑھانے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

مندرجہ ذیل سیاہ نقطوں میں سے پہلے کے نیچے کے سارے الفاظ کسی پوسٹ کارڈ سے چھپا دیں پھر اس تیزی سے کارڈ کو اوپر نیچے ہلائیں کہ سطور کے نظر آنے کا لمحہ سکنڈ کے کچھ حصوں میں پہنچ جائے یعنی آپ کی نظر اس سطر پر ۱/۴ یا ۱/۴ سکنڈ تک ہی پڑ سکے۔ کیا اس طرح کر کے آپ پورا پڑھ سکے؟ اگر نہیں تو پھر کوشش کیجئے۔ نیچے کے سبھی ٹکڑوں کو اسی طرح پڑھیں۔

اس طرح کام شروع کریں

کہ ایک جھلک میں ہی مکمل لائن کو

یا دو سے لے کر چھ الفاظ تک کو

پڑھ سکیں

آپ اس طریقے کو کسی بھی چھپی ہوئی لائن کے ساتھ عمل میں لا سکتے ہیں۔ طریقہ یہ ہے کہ سطور کو یکے بعد دیگرے تیزی سے نظروں کے سامنے لاتے جائیں یہاں تک کہ آپ اس قابل ہو جائیں کہ ایک ساتھ ایک جھلک میں چھ یا زیادہ الفاظ دیکھ سکیں لیکن اس مشق کو روزانہ پانچ منٹ سے زیادہ نہ کریں کیونکہ آپ کے وقت کا زیادہ مستحق آہستہ کی بجائے تیز پڑھنے والا اصول ہے۔

کچھ حضرات کے ساتھ آہستہ کے بجائے تیز اصول جو بنیاد ہے زیادہ دور اور زیادہ دیر تک چل نہیں پاتا یہ سلسلہ درمیان ہی میں کہیں ختم ہو جاتا ہے آپ کہنے لگتے ہیں "اس سے زیادہ پڑھنے کے لئے میں اپنے آپ پر زور نہیں دے سکتا۔"

یہاں پر تیز قدمی آپ کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے کا سامان مہیا کرتی ہے اور رفتار بڑھانے پر زور دیتی ہے۔ یہ تیز قدمی مشینی تیز کنندہ (MECHANICAL ACCELERATORS) فلموں، اسلائڈ واچ یا ہاتھ سے اشارہ کئے گئے منٹوں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ جدید ترین شے اس عمل کے لئے ٹیپ ریکارڈنگ ہے جس میں مقررہ وقت کے ساتھ رکنے کے اشارات ہوں۔

تیز رفتاری سے پڑھنا بہت فائدہ مند ہے لہٰذا اسے اپنے پروگرام کا اہم جز بنا لیں۔

## ارتکاز

ابتدا میں مطلب سمجھنے کی قطعی فکر نہ کریں۔ یہ خود بہ خود وقت کے ساتھ ساتھ آ جائے گا جیمس براؤن اپنی زندگی کا ایک تجربہ لکھتے ہیں۔ میں ایک لڑکے کو جانتا ہوں جو دو ہفتہ کے کلاس ورک کے بعد بھی ۱۹۵ الفاظ فی منٹ کی رفتار سے زیادہ نہیں پڑھتا تھا۔ جب میں نے اسے ۲۵۰ الفاظ فی منٹ کی رفتار کا مشورہ دیا تو وہ خفا دکھائی دیا۔ میں آہستہ پڑھ کر بھی بہت معمولی سمجھ پاتا ہوں اس نے وضاحت کی اگر اس سے تیز پڑھا تو بالکل ہی نہیں سمجھ پاؤں گا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ جس قدر تیز پڑھتا ہے — ایک خاص حد تک — وہ اسی قدر زیادہ سمجھتا بھی ہے۔ ہچکچاتے ہوئے اس نے ۲۶۰ الفاظ فی منٹ کی رفتار سے شروع کیا۔ اس کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی جب اس نے اپنے سمجھنے کی صلاحیت میں خاطر خواہ اضافہ پایا۔

یہ سمجھنے کے لئے کہ ایسا کیوں ہے۔ پڑھنے کا موازنہ گاڑی چلانے سے کیجئے۔ کسی قصبہ کی غیر آباد سڑک پر اگر آپ ۳۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہے ہیں تو آپ کے ذہن میں بہت طرح کے خیالات — گھر کے مسائل، دفتر کی مصیبتیں وغیرہ — آنا لازمی ہے اور آپ کا دھیان اس طرح بٹ رہا ہوگا لیکن ایک پُر رونق شہر کی آباد سڑک پر اپنی گاڑی چلائیے اور رفتار بڑھائیے اب آپ دیکھیں گے کہ تیز رفتاری کس طرح غیر مطلوبہ افکار و خیالات کو پرے کر دیتی ہے اور آپ کا دھیان کس طرح جمتا ہے۔ یہ سننے یا پڑھنے سے نہیں کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح اپنی عام رفتار سے پڑھنا دھیان کی کمی کو مدعو کرتا ہے۔ اس کے برخلاف تیز رفتاری سے پڑھنا بے جا اور بے وقت واقع ہونے والے خیالات کو ذہن سے نکال باہر کرتا ہے اور دھیان جماتا ہے۔ یہ لفظ بہ لفظ پڑھنے کی بیماری کو بھی دور کر دیتا ہے اور عبارت کو ٹکڑوں میں دیکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے ایک مثال سے یہ بات اور بھی واضح ہو جائے گی۔ ایسے معمے میں جس میں مختلف ٹکڑوں کو یکجا کرنے سے ایک تصویر مکمل ہوتی ہے۔ اگر ۲۰ ٹکڑے ہوں تو زیادہ سہولت ہوگی بہ نسبت اس کے کہ اس میں ۸۰ ٹکڑے ہوں اسی طرح پڑھائی کا مسئلہ ہے۔ ۲۰ اجزائے جملہ کو جوڑنا اور پڑھ کر ان کے معنی کو سمجھنا زیادہ آسان ہے ۸۰ الفاظ کو ایک ساتھ جوڑنے سے۔

اکثر بالغوں کے لئے ۵۰ سے ۱۲۵ الفاظ فی منٹ کی ترقی اپنی اوسط رفتار پر ایک اچھی کامیابی ہوگی اور ان کی سمجھنے کی صلاحیت کو بھی بڑھائے گی اس سے بھی زیادہ تیز رفتار سے پڑھنے کی مشق ڈرامائی انداز میں ان حدود سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔

کس طرح آپ اپنے وقت کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ بات ہر شعبۂ حیات میں ضروری ہے۔ پڑھنے کا مسئلہ بھی کچھ اسی طرح ہے اگر آپ نے اپنے پڑھنے کی رفتار میں اضافہ کیا تو یہ اضافہ آپ کے لئے بہت سے اضافوں کو ساتھ لائیگا اور آپ محسوس کریں گے کہ آپ پہلے کی بہ نسبت بہت خوش اور مطمئن ہیں۔

پنجابی کہانی



# للکار اٹھا

اجیت سینی

شیرے کا ذکر جب کبھی آتا کالے کی بھویں تن جاتیں۔ اس کا خون کھول اٹھتا۔ وہ کہتا۔ "شیرا میرے خون کا پیاسا اور میں اُسے جا کر مناؤں؟"

اس کی بیوی کہتی "کیا ہرج ہے؟ وہ آپ کا بھائی ٹھہرا۔ ناخنوں سے کبھی گوشت الگ ہوا ہے؟"

یہ الگ ہی سمجھو۔ سورج چاہے مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہو جائے۔ میں اسے نہیں منا سکتا۔ ہم ہمیشہ کے لئے الگ ہو چکے ہیں۔ اب ہمارا کبھی میل ملاپ نہیں ہو سکتا۔"

"آپ اپنی مرضی کے مالک ٹھہرے۔ میں تو یہ ہی کہوں گی کہ آپ ایک بار کوشش ضرور کر دیکھیں۔"

"کوشش؟ کتنی بار کوشش کروں؟ تم اس رشتے کو ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔ خبردار اگر پھر کبھی اس کا ذکر کیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

یہ سُن کر کالے کی بیوی چپ ہو گئی۔

کالا اور شیرا دونوں سگے بھائی تھے۔ ایک باپ کے بیٹے۔ ایک ماں کی کوکھ سے جنمے۔ اُن کے اصل نام تو لوگوں کو بھول ہی چکے تھے۔ یہ ان تھی جو بچپن میں پڑ گئی اور اب تک چلی آئی تھی۔

کالے کا رنگ کالا تھا۔ بچپن میں ماں باپ لاڈ سے کالا کہتے تھے اور اب تین بچوں کا باپ بن جانے پر بھی سب اُسے کالا ہی کہتے تھے

وہ بہت سخت طبیعت کا آدمی تھا۔ بہت اڑیل اور ضدی۔ جس ضد پر اڑتا اُسے پوری کر کے چھوڑتا۔ شیرے سے اُس کی بگڑ گئی تو اُس نے بگڑی کو مزید بگاڑنے کی کوشش کی، سُدھارنے کی نہیں۔

شیرا عمر میں کالے سے بڑا تھا۔ طویل ڈیل ڈول کا مالک وہ ایک تنومند آدمی تھا۔ شیر کا سا دل ہونے کے باعث اُس کا نام شیرا پڑ گیا تھا۔ لوگ اُس سے خوف کھاتے تھے لیکن اُس نے ہمیشہ گاؤں والوں سے بنا کر رکھی۔ وہ دیکھنے میں کرخت جان پڑتا تھا لیکن اندر سے بہت نرم اور بُردبار تھا۔ اُس کے سر اور داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے لیکن پھر بھی وہ طاقت میں کسی جوان سے کم نہ تھا۔ کھیتوں میں چاہے کا بوجھل گٹھا دو تین آدمی مل کر اُس کے سر پر رکھتے۔ فصل کاٹنے میں کوئی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ گندم کی کٹائی کے وقت اُس کے ہاتھ پاؤں کی مانند چلتے۔ اُس کے ساتھی ابھی پہلی کیاری سے ہی اُلجھ رہے ہوتے کہ وہ دوسری کیاری پر بھی ہاتھ صاف کر جاتا۔

مثل مشہور ہے کہ فصل کی کٹائی کے دنوں میں جاٹ کے بیٹے سادھو بن جاتے ہیں تاکہ فصل کاٹنے سے بچ جائیں لیکن شیرا تھا کہ ان دنوں میں اس پر عجیب سی مستی چھا جاتی تھی۔ اپنی فصل کاٹ کر وہ دوسروں کا بھی ہاتھ بٹاتا۔ اُس کی درانتی اُس کی چھٹی انگلی بن جاتی۔

چند برس پیشتر گاؤں میں نمبردار کے گھر ڈاکہ پڑا تھا۔ اگر شیرا اس وقت ہمت سے کام نہ لیتا تو ڈاکو سارا گاؤں لوٹ لے جاتے۔ اس نے ایک ڈاکو کو مار گرایا تھا اور باقی بھاگ گئے تھے۔ شیرے کو حکومت کی طرف سے پانچ سو روپے نقد اور ایک گھوڑی انعام میں ملی تھی۔ شیرے کی بہادری کی دھاک دُور دُور تک بیٹھ گئی تھی۔ جب وہ اپنی چھ فٹ اُونچی گھوڑی پر سوار ہو کر نکلتا تو گاؤں والوں کے سر احتراماً جھک جاتے۔

سارا گاؤں شیرے کا احترام کرتا تھا لیکن کالا تھا کہ اُس کا نام سُن کر ہی جل بھن جاتا۔ جب تک اُن کا باپ زندہ رہا دونوں بھائی اکٹھے رہے لیکن باپ کی آنکھیں موندتے ہی زمین جائداد وغیرہ تقسیم ہوگئی۔ شیرے نے کالے کو اپنے ساتھ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اُس نے نہ ماننا تھا نہ مانا۔ جس جس چیز پر کالے نے ہاتھ رکھا۔ شیرے نے بلا چوں وچرا اُسے دیدی۔ کالے نے زمین بھی اُونچی جگہ کی اپنے حصّے میں ڈلوائی کیونکہ وہاں فصل اچھی ہوتی تھی۔ شیرے نے کوئی اعتراض نہ کیا۔

اُس برس برسات کم ہوئی۔ خشک سالی کی وجہ سے اونچی جگہ کے کھیت پیاسے ہی سوکھ گئے۔ لیکن نیچی جگہوں پر فصل اچھی ہوگئی۔ کالے نے سوچا تھا کچھ لیکن ہو کچھ اور ہی گیا۔ اُسے تو روٹی کے لالے پڑ گئے۔ جبکہ شیرے کی فصل بن کی طرح کھڑی تھی۔

فصلیں کٹیں۔ شیرے کے دِل میں کالے کے لئے ہمدردی جاگ اُٹھی۔ آخر سگا بھائی تھا۔ اُس کے لئے دِل میں پیار اُمڈ آیا۔ وہ اُس کے پاس پہونچا اور بولا "تو چنتا نہ کر کالے۔ بٹوارے کو بھول جا۔ تیری فصل کم ہوئی تو کیا؟ میری فصل کیا تیری نہیں ہے؟ آؤ آپس میں پھر مِل جائیں۔ فصل کی گھائی اکٹھی کرلیں۔ کُل اناج بعد میں بانٹ لیں گے۔"

کالے نے سمجھا وہ اُسے چڑانے کے لئے اب ایسا کہہ رہا ہے۔ اس لئے ٹکا سا جواب دیا "جا جا۔ بڑا آیا دیا کرنے والا۔ تو اپنی فصل سنبھال میں اپنا بُرا بھلا خود دیکھ لوں گا۔"

شیرا اپنا سا منہ لے کر لوٹ آیا۔ کالے نے اپنی جو تھوڑی بہت فصل تھی کاٹ کر شیرے کے کھلیان سے دُور ایک جگہ لگا دی۔

اور پھر ایک رات جب سارا گاؤں سو رہا تھا۔ شیرے کے کھلیان میں آگ لگ گئی اور اس کی ساری فصل جل کر راکھ ہوگئی۔ آگ کس نے لگائی تھی؛ یہ بات کسی سے بھی چھپی نہ رہی۔ گاؤں کے کچھ لوگوں نے شیرے کو کالے کے خلاف اُکسایا بھی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور یہ کہہ کر کہ جو ہونا تھا ہوگیا، بات کو ٹال گیا لیکن اس واقعہ نے دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے بہت دُور کر دیا اور جُدائی کی گرہ پکّی ہوگئی۔

شیرے کو جو گھوڑی انعام میں ملی تھی۔ اُس کی بچھڑی ماں سے بھی جوان نکلی۔ اس بچھڑی کا سارے علاقے میں اسی طرح چرچا تھا جس طرح شیرے کا۔ کالے نے اس بچھڑی کو چوری کرلینے کی بھی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا۔

دِن گزرتے گئے۔ کالے کی بڑی لڑکی بیل کی طرح بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہوگئی۔ اتفاق سے ایک کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا مِل گیا اور اُس سے شادی کی بات پکّی ہوگئی۔ کالے کے گھر میں رات دن ڈھولک بجنے لگی۔ سہاگ کے گیت گائے جانے لگے۔ سارے گاؤں میں مٹھائی بانٹی گئی، لیکن شیرے کے گھر نہ مٹھائی گئی اور نہ ہی بلاوا۔

کالے کی بیوی نے اس بات پر زور دیا کہ وہ اپنے بڑے بھائی کو منا لائے لیکن کالے نے جھڑک دیا اور کہا کہ وہ میرے خون کا پیاسا اور میں اُسے جا کر مناؤں؟ میں نے کون سا اس کے گھر بھیک مانگنے جانا ہے جو اُسے مناتا پھروں۔"

یہ الفاظ شیرے کے کانوں تک بھی پہونچ گئے۔ اُس کے ہاں ایک ہی اولاد تھی۔ اکلوتا بیٹا۔ کالے سے بنی رہتی تو وہ اُس کی لڑکی کی شادی پر کالے سے بھی زیادہ خرچ کرتا۔ وہ چھوٹی سی تھی تو شیرا اُسے کندھے پر اُٹھائے کھیت کھیت لئے پھرا کرتا تھا اب وہ خاصی بڑی ہوگئی تھی۔ دشمنی اور نفرت کی ان دیواروں کی طرح جو کالے نے کھڑی کر رکھی تھیں کالا اگر ایک دفعہ اُسے منہ رکھنے کے لئے کسی کے ہاتھ بلاوا بھی بھجوا دیتا تو وہ ضرور شادی پر آجاتا لیکن کالے کے سر پر تو عداوت اور منافرت کا بھوت سوار تھا۔ وہ یہ کیسے کر سکتا تھا۔؟

برات آگئی رات بھر گاؤں میں دُھوم مچی رہی۔ شہنائی اور عورتوں کے گیتوں کی آواز گاؤں کی فضا کو چیر کر شیرے کے کانوں تک بھی پہونچتی رہی۔ شیرا گھر سے نکلا اور اپنے کنویں پر جا کر لیٹ گیا۔ صبح بھی وہ

دہیں رہا۔ اُس کی روٹی بھی وہیں پہنچ گئی۔ دوپہر کو وہ درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں کھاٹ پر لیٹا خیالات کی دُنیا میں کھویا ہوا کروٹیں لے رہا تھا کہ اُس نے موتی حجام کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ اُچھل کر چارپائی پر بیٹھ گیا اس کو لگا جیسے بٹوارے کی سب دیواریں گر پڑی ہوں۔ کالے نے آخر اُسے بلا بھیجا ہے۔ موتی نزدیک آیا تو اُس نے اُٹھ کر اُسے بغل میں کس لیا۔ لیکن موتی نے جو کچھ اُسے بتایا اُسے سُنکر شیرے کا انگ انگ پھڑک اُٹھا اور اُس کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔

بارات خالی ہاتھ لوٹ رہی تھی ڈولی کے بغیر کالے نے جہیز میں گھوڑی نہیں دی تھی۔ شیرے نے موتی کو گاؤں کی طرف بھگایا اور نمبردار کو بُلا بھیجا۔ شام کو کالے کی بیٹی کی ڈولی روانہ ہوئی تو دولہا ۱۶ فٹ اونچی اُس جوان گھوڑی پر سوار تھا جس کا سارے علاقہ میں چرچا تھا۔ باراتیوں کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ کلف لگی اُن کی لال پیلی پگڑیوں کے طرے جھوم جھوم پڑتے تھے۔

بارات کے روانہ ہوتے ہی کالا تیز تیز قدم اٹھاتا کھیتوں کی طرف چل دیا۔ اس کے قدم اپنے آپ اس پگڈنڈی پر بڑھ رہے تھے جو اُس کنویں کی طرف جاتی تھی۔ جہاں درختوں کے پیچھے شیرا کھاٹ بچھائے پڑا تھا۔

(پنجابی سے ترجمہ)

## غزل

### امر ابدآبادی

دن نکل آیا ہے وہ شوخ ابھی آیا تو نہیں
اُس کی آمد پہ ہی دن کا کہیں دھوکا تو نہیں

نہ سہی آہ و بکا تیرے لبوں پر... لیکن
دیکھنا یہ ہے کوئی حرفِ تمنا تو نہیں

سرکِ الفت میں ہے الفت سے کہیں بڑھ کے عذاب
اچھا ہو جانا بھی بیمار کا اچھا تو نہیں

آپ کی شکل شناسا سی نظر آتی ہے
آپ کو آج سے پہلے کہیں دیکھا تو نہیں

اے امر بزمِ سخن میں نہ ہوا میرا حریف
یوں مجھے اپنی سخن گوئی کا دعویٰ تو نہیں

## خلیل تنویر

خون جب سر سے اُتر جائے گا
جسم کا سانپ بھی مر جائے گا

غم کے تپتے ہوئے رستوں سے گزر
رنگ کچھ اور نکھر جائے گا

تیرا سایہ ہوں تو دُوری کیسی
ساتھ آؤں گا جدھر جائے گا

رات! خواہش کی صداؤں کا طلسم
درد آنکھوں میں ٹھہر جائے گا

دل کی پہچان ہے موسم کی طرح
کوئی چپکے سے گذر جائے گا

## ناظر انصاری

جو لوگ غلط دارورسن سمجھتے ہیں
حیات و موت کا وہ بانکپن سمجھتے ہیں

جو سوزِ عشق سے واقف نہیں وہ کیا جانیں
ہم اہلِ درد ہی دل کی لگن سمجھتے ہیں

نہ جانے کتنے کڑے کوس چل کے آئے ہیں
دیارِ غم کو ہم اپنا وطن سمجھتے ہیں

کھلا ہوا ہے گلِ زخم آرزو اپنا
ہمارے درد کو سروِ سمن سمجھتے ہیں

ہر انجمن میں تجھے اہلِ دل نے دیکھ لیا
ہر انجمن کو تری انجمن سمجھتے ہیں

بقدرِ ظرفِ نظر ہی سہی مگر اے دوست
دیارِ ماہ و شاں کا چلن سمجھتے ہیں

بہ فیضِ شعر و ادب ہم بھی آج اے ناظر
بہ قدرِ ذوق رموزِ سخن سمجھتے ہیں

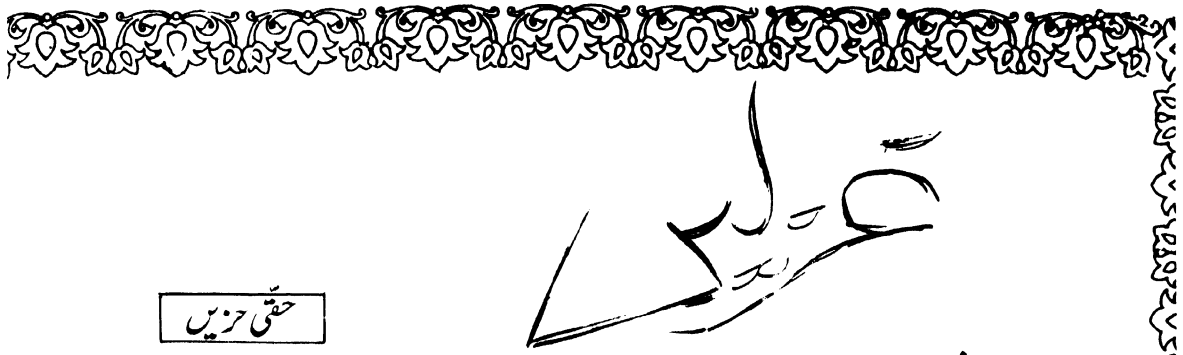

## سید احمد شمیم

نورس کلی کا درد سے سینہ بکس گیا
جنگل کا سانپ رات کی ظلمت میں ڈس گیا

بادل اُمڈ کے آگئے پُروائی جب چلی
تپتی ہوئی زمین پر پانی برس گیا

لائیں کہاں سے رات کے ٹھنڈے سکون کو
اس آگہی کی دھوپ میں چہرہ جھلس گیا

دھرتی کی نرم گود، شجر ہیں نہ آبشار
سانسوں کا زہر اُونچے مکانوں میں بس گیا

تا عمر دشتِ زیست میں شعلے اُگا کیے
ناکام دل میں لیکے چمن کی ہوس گیا

کتنی لطیف ہوگئی، دُھل کر فضائے دل؛
اچھا ہوا کہ ٹوٹ کے بادل برس گیا؛

آئینہ لیکے ہاتھ میں رونے لگے شمیم
ملنے کو اپنے آپ سے اب جی ترس گیا

## سعید عارفی

حسرتِ دید میں ناکردہ گناہوں کی طرح
عشق پامال ہوا شہر کی راہوں کی طرح

فصلِ غم اب کے بہت سخت تھی ہیں جسکے نشاں
دل میں سیلاب سے ٹوٹی ہوئی راہوں کی طرح

تم کو خود پر ہے بڑا ناز کہاں اس کی خبر
ابھی خوددار ہیں دل والے بھی شاہوں کی طرح

دورِ حاضر کے کرشمات نہ ہم سے پوچھو
رہزنِ شہرِ وفا چمکے ہیں شاہوں کی طرح

حُسن بھی دادِ وفا مانگ رہا ہے ہم سے
لیکن انداز کہاں عشق کی آہوں کی طرح

ایک اک گام پہ کھلتا گیا رنگِ اُلفت
اس کی شب رنگ طرحدار نگاہوں کی طرح

گردشِ وقت نے بھی کام دیا ہے اکثر
منزلِ غم میں تری مرمریں بانہوں کی طرح

زندگی ہم سے بہر گام ہوئی ہے روپوش
اک مسافر کی بدلتی ہوئی راہوں کی طرح

ابھی اعجاز طلب کھل نہیں سکتا دل پر
کتنے نغمے ہیں ابھی غم کی کراہوں کی طرح

انقلاباتِ جہاں فکر کے دھاروں کو سعید
ایک لمحہ میں بدل دیتے ہیں راہوں کی طرح

## حقّی حزیں

اک اذیت بھی، ایک راحت بھی
ہائے کیا چیز ہے محبت بھی

شامِ غم بھی ہے صبحِ عشرت بھی
زندگی رنج بھی ہے راحت بھی

کم نہیں اُن کی طبعِ نازک سے
میرے جذبات کی نزاکت بھی

غیرتِ عشق کو نہیں منظور
حُسن کی ہو اگر عنایت بھی

جب بھی اُٹھا ہے کوئی پہلو سے
دل میں اُٹھا ہے دردِ فرقت بھی

بیخودی! کوئی ایسی شکل بھی ہے
بھول جاؤں میں اُن کی صورت بھی

آئے ہیں وہ اک انتظار کے بعد
شکر کے ساتھ ہے شکایت بھی

اور تو اور وقت کے ہاتھوں
چھن گئی ہم سے غم کی دولت بھی

ہے اب اُن کا عجب حالِ حزیں
مجھ سے نفرت بھی ہے محبت بھی

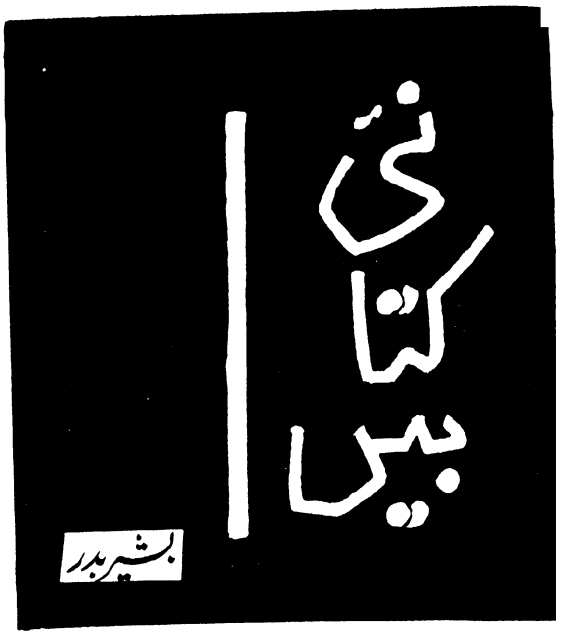


## قومی تہذیب اور ہندوستانی مسلمان

مرتبہ :- عابد رضا بیدار اور ضیاالحسن فاروقی

ملنے کا پتہ :- رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹیل اسٹڈیز ۱۸۰۶، کلاں محل دہلی

یہ ان تقریروں، مذاکرے، اور سوالات (Discussions) کی روداد ہے جو سمینار RELEVANCE OF MAULANA AZAD TO PRESENT DAY INDIA کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ فخرالدین علی احمد کی افتتاحی تقریر کے بعد اس مذاکرے کا بنیادی مقالہ ضیا، الحسن فاروقی نے پڑھا اس مقالے میں ان تحریکات، رجحانات اور حالات کا ذکر کیا گیا ہے جو مولانا آزاد کی ذہنی تربیت و تشکیل پر اثر انداز ہوئے یہ مقالہ مختصر اور جامع ہے۔

مالک رام، نثار احمد فاروقی، تنویر احمد علوی، ریاض شروانی، عتیق صدیقی اور عابد رضا بیدار نے DISCUSSION میں اس طرح حصہ لیا ہے کہ اُن کی تقریروں میں مولانا آزاد کی شخصیت، اور افکار پر، یا موجودہ حالات سے متعلق مختلف گوشوں سے روشنی پڑنے لگتی ہے۔ مولانا آزاد کے فکر و فن، اور موجودہ حالات میں اُن کے افکار کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب خاصی مدد گار ثابت ہوتی ہے۔

کتابت اور طباعت بھی معیاری ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔

## متاعِ فقیر :- مرتب - عابد رضا بیدار

صفحات :- ۱۷۶ - قیمت :- بیس روپے

ناشر :- رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹیل اسٹڈیز

تحقیق کے جان لیوا کام سے جن کا واسطہ پڑا ہوگا وہ ضرور واقف ہوں گے کہ مواد جمع کرنے کی کیا اہمیت ہے۔ سینکڑوں اوراق کے مطالعے کے بعد کبھی کبھی تو دو چار صفحات کے ایسے اقتباسات بھی ملنا دشوار ہو جاتے ہیں جن کے جزو میں کل کا جلوہ ہو۔ یوں تو عابد رضا بیدار نے اپنی شگفتہ تحریر میں ذاکر صاحب کی شخصیت اور فکر و فن پر مختصر مختصر باتیں بھی کی ہیں لیکن مختلف عنوانات کے تحت ذاکر صاحب کی تحریروں سے جو اقتباسات منتخب کر دیئے ہیں وہ اُن کے شخصیت نگار اور اُن کے ادبی و سیاسی افکار کے محقق کے لئے بہت کار آمد مواد ہے۔ اِن اقتباسات کے انتخاب میں جتنی محنت، مطالعے کے ساتھ صاحب نظری کی ضرورت تھی، عابد رضا بیدار نے اس کا ثبوت دیا ہے۔ ذاکر صاحب پر جب بھی کوئی کام ہوگا اس اشاریہ و انتخاب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

جمیل احمد قریشی کے مرتب کردہ ذاکر بلیو گرافی بھی اس کتاب میں شامل ہے جس میں تعلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ، کہانیاں، مذہب، زبان، ادب اور کلچر، دُنیا کی رفتار، معاشیات، دیباچے، نظمیں اور رائیں ملفوظات اور مکاتیب کے عنوانات سے اشاریہ مرتب کیا گیا ہے۔

۱۷۶ صفحات کی اس کتاب کی قیمت بیس روپے ہے جو زیادہ نہیں بلکہ بہت زیادہ ہے مگر کتاب کی اہمیت کے لحاظ سے کم ہے۔

## بھاگ متی کے دیس میں (ناول)

مصنفہ :- فاطمہ یزدانی ، صفحات ۲۶۴ ، قیمت :- چھ روپے

ملنے کا پتہ :- اسٹوڈنٹس بک ہاؤس، چار مینار حیدر آباد دکن

اس ناول کے دو حصے بہت آسانی سے کئے جا سکتے ہیں پہلا حصہ جو تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ناول سے بے تعلق ہے۔ اس حصہ کا نام "حیدر آباد کی سیر" مناسب ہوتا۔ ایک حیدر آبادی جدید لڑکی لعلین جو بمبئی نرملا نکیتن سے INTERIOR DECORATION کا ڈپلومہ لے کر لوٹی ہے۔ اپنی دوست سیتا کو حیدر آباد کے تاریخی محل، تالاب، اسکول کالج اور سڑکیں

وغیرہ دکھائی دیتی ہے۔ اسی سیر میں حیدرآباد کی ادبی محفلیں (جشن مخدوم وغیرہ) بھی درمیان میں آجاتی ہیں۔ کئی مشہور خاندانوں کے ڈرائنگ روم کے منظر سامنے آتے ہیں۔ اس طرح یہ طویل حصہ زیادہ سے زیادہ ایک رپورتاژ ہوسکتا ہے۔ اس کا ناول کی کہانی سے کوئی تعلق نہیں جو بالکل مختصر و مبہم اور جذباتی ہے۔ باقی ۷۰۰ صفحات میں لعلین ایک اپ ٹو ڈیٹ، شاندار اور بے حد عیاش نواب ٹائپ آدمی پر عاشق ہوجاتی ہیں۔ عیاشی جس کا معمول ہے ان گنت عورتوں سے اُس کے تعلقات رہ چکے ہیں۔ ہیروئن صاحبہ سے قبل ایک اور لڑکی اُن پر عاشق ہوکر اور اُن کی بیوی بن کر انہیں سدھارنے کی کوشش میں خود ہی دوسری دُنیا کو سدھار چکی ہے۔ ان صاحب کے پاس ایک نفاسنا گل گوتھنا بھی ہے۔ جو ایک غریب عورت سے دل لگی کا نتیجہ ہے۔ یہ غریب عورت بھی مرچکی ہے۔ عجیب بات ہے کہ اب کے عیاش نواب کے دل میں شرافت جاگ اٹھتی ہے اور وہ لعلین صاحبہ سے پاک محبت کرتا ہے اور انہیں آلودہ نہیں کرنا چاہتا۔ نہ ہی بیوی کی حیثیت سے قبول کرتا ہے کہ وہ خود کو بدل نہیں سکتا۔ بس اپنی یاد دلائے کو وہ اپنا بچہ اُن کے حوالے کر دیتا ہے۔ لعلین اس کی نصیحت پر عمل کرتی ہے۔ بچے کو لے آتی ہیں اور والد صاحب جہاں کہہ رہے تھے وہاں کے لئے ہاں کہہ دیتی ہیں۔

ظاہر ہے یہ کہانی ایک نوجوان ذہن کی خیالاتیت ہے اور اس میں بھی کوئی ندرت نہیں۔ اس لئے مصنفہ کے ادبی مستقبل کے بارے میں اس ناول کی کہانی کی بنیاد پر کسی خوش فہمی سے وابستہ ہونا مناسب نہ ہوگا۔ ہاں اس صفت کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی کہ اُن کی تحریر میں برجستگی اور بے باکی ہے۔ جزئیات نگاری پر انہیں عبور حاصل ہے اور بیان میں شگفتگی ہے۔ وہ اگر کسی کہانی کو اچھے پلاٹ کے ساتھ پیش کریں اور غیر ضروری جزئیات نگاری سے پرہیز کریں تو اُن کی یہ صفات انہیں مقبول خاتون ناول نگار ہونے میں بے شک مدد گار ہوں گی۔

**تارِ وصال** (شعری مجموعہ)

مصنفہ: چودھری عشرت حسین عاشقی

ناشر: ادارہ بزم عاشقی، کمن پور، کان پور

صفحات: ۱۴۴، قیمت ۲ روپے

مصنف کے مختصر حالات زندگی، چودھری قمر حسین نے لکھے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ عاشقی مرحوم کی تاریخ پیدائش ۲۳ جون ۱۸۹۳ء ہے اور ۲۰ جون ۱۹۶۱ء کو اُن کا انتقال ہوا۔ لکھتے ہیں (وہ) "بہت بارسوخ، دریادل، متواضع، مخلص اور باوضع شخصیت کے حامل تھے۔ اعصابی امراض کی بنا پر پبلک زندگی سے کنارہ کش ہوکر ۴۲ء میں شعر و شاعری اختیار کی"۔

آخری فقرے کے یکسر درست ہونے میں شک ہوتا ہے۔ اس لئے کہ عام طور پر یہ ممکن نہیں کہ عاشقی جیسے شاعر نے تقریباً ۴۵ سال کی عمر تک ایک مصرعہ نہ کہا ہو۔ غالباً اُن کا مفہوم یہ ہے کہ مرحوم کو شاعری سے باقاعدہ دلچسپی اور شدید انہماک اُس زمانے میں پیدا ہوا۔

اس شعری مجموعے میں اردو کی نثر اور فارسی کی تیس غزلیں ہیں۔ غزلوں میں روایتی رنگ کے ساتھ ساتھ ترقی پسند شاعری کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ ہر طرح کے اشعار ہیں۔ بہت سنجیدہ، متصوفانہ یا فلسفیانہ لہجہ انہیں راس نہیں آتا۔ غزل کے مروجہ اسلوب میں احساس کی سچائی اور تازگی سے بھرپور اشعار اکثر غزلوں میں ملتے ہیں۔ مثلاً

مرا گواہ اندھیرا ہے، صبح شاہد ہے
کہ میں نے رات گذاری ہے بیقراری میں

گل و شجر تو فقط حادثات ہستی ہیں
جہاں کی اصل تو صحرا ہے اور کچھ بھی نہیں

ہر اک برگِ گل پر ہیں آنسو نمایاں
یہ کون اتنا رویا سویرے سویرے

موتی کا روپ دھارے بیٹھی ہے برگِ گل پر
اور ڈر رہی ہے شبنم سورج کی بھی کرن سے

منھ دھویا ہے اپنے آنسوؤں سے
جس نے بھی سنا ہے قصہ میرا

اس مجموعے میں کئی شعر ایسے بھی مل جاتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ عاشقی مرحوم نئے استعارے اپنانے کی صلاحیت رکھتے تھے جیسے کہ

آنکھ سے ٹپکے برف ہی برف
دل میں بھڑکے آگ ہی آگ

رضا علی حسینی نے "فکر و فن" کے عنوان سے عاشقی مرحوم کا تعارف

تجزیہ لکھا ہے جو مصنف کے کلام اور شخصیت کو سمجھنے میں مددگار ہوتا ہے۔

## ویرانیاں (شعری مجموعہ) مصنف: دور آفریدی

صفحات: ۱۱۲ ، قیمت: ۳ روپے

ناشر: دور آفریدی گھر عثمان خاں، رامپور، یوپی

مقدمے میں مصنف نے اپنی شاعری کے بارے میں کہا ہے: "یہ ذاتی ہے، شخصی ہے ... ایک انسان کی آواز ہے اور پکار ہے۔ اس میں زندگی کرنے کا عکس ہے۔ یہ جذبہ اور احساس کی اساس پر ہے

— ویرانیاں کی شاعری جدید زبان میں ہے۔"

شاعر کی ان باتوں کے ساتھ میں نے اس کی غزلوں کو بڑی دلچسپی سے پڑھنا شروع کیا۔ ان غزلوں میں زبان و بیان کی سادگی، صفائی، برجستگی ہے۔ اور یقیناً کہیں کہیں بھی فارسی زدہ لہجہ نہیں ہے لیکن یہ جدید زندگی کی غزلیہ زبان نہیں ہے۔ دوسرے یہ شاعری شخصی، ذاتی، اور تنہا انسان کی آواز ہونے کے بجائے مقررہ تصورات کی تازہ کاری کا نمونہ ہے۔ غزلوں میں محبوب کا تصور اور اس کی سرمستی، رندی، ہجر کی جانگدازی، وصل کی لذتیں کسی انفرادی احساس کا پتہ نہیں دیتی ہیں۔ یہ سب غزل کی عمومیت کی توسیع ہیں۔ اچھی غزل کے لئے جس رمزیاتی، تہہ داریوں کی ضرورت ہے۔ خود کو محسوس کرنے اور خود میں اترنے کی جاذبیت ہے۔ دور صاحب اس سے کترا گئے ہیں اس لئے ان کی غزلیں ان کے دعوے پر پوری نہیں اترتی ہیں۔ میں ان کی سادگی اور بے ساختگی کی داد پہلے ہی دے چکا ہوں۔

اس مجموعے میں نظمیں بھی ہیں۔ کئی نظمیں خاص طور پر سانیٹ من مندر رمتاعِ مغرب، میں نیا لہجہ اور خوبصورت امیجری اس کا ثبوت ہیں کہ دور آفریدی کے یہاں اچھی اور تہہ دار شاعری کے امکانات ہیں۔ مسئلہ شاعر کے سنجیدہ ہونے کا ہے۔

کتابت اور طباعت میں سادگی اور سلیقہ ہے۔

## دلوں کی مہک کانٹوں کی چبھن (ناول)

مصنف: ایم۔ این۔ خان ایم اے (علیگ)

صفحات: ۲۵۱ قیمت: سات روپے

ملنے کا پتہ: آر، اے، خاں، اینڈ سنس ۱۲ گلاب باڑی الہ آباد

سرسید ہال، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی علامت ہے۔ یہ سب سے قدیم شاندار، وسیع اور تاریخی اہمیت کا مالک ہوسٹل ہے۔ یہ ناول اسی ہال سے شروع ہوتا ہے جن لوگوں کو علی گڑھ یونیورسٹی، یہاں کی اقامتی زندگی سے کوئی دلچسپی ہے۔ انہیں اس میں بہت سی معلومات مل جائیں گی لیکن مجھے ایک تشویش نے خاصا پریشان کیا کہ یہ کس زمانے کا قصہ ہے اس لئے کہ علی گڑھ جو کبھی ذہانت، نوجوانی کی چستی، ذہانت، اعتماد اور کسی حد تک اطمینان کا جزیرہ تھا بڑی تیزی سے تفکرات و بے یقینی کے سایوں میں گھرتا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں جو منفی قوتوں کا زور ہے اس سے ملک کی تمام مثبت اور انسانیت پسند قدریں پریشان رہتی ہیں۔ علی گڑھ اور اس کے طلبا کی روایتی سرمستی اب حالاتِ حاضرہ کو سنجیدگی سے سمجھنے اور اسے برتنے کی صفت میں بدل چکی ہے۔ میں ذاتی طور پر اس تبدیلی کا خیر مقدم کرتا ہوں چستی، ذہانت، اعتماد حسب روایت بن چکے ہوں اور تشکیک، تفکر اور خود شناسی جب خال ہو جائے تو اچھی شخصیت اور اچھے معاشرے کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ اس ناول میں اس علی گڑھ اور اس کے طالب علموں کا عکس نہیں ملتا۔ کرکٹ INTRODUCTION الکشن وغیرہ سے جو دلچسپیاں یہاں کا مزاج ہیں انہیں کا ذکر ضرورت سے زیادہ ہے۔ علی گڑھ کی روح کو ان صفحات میں اس لئے پیش نہیں کیا جا سکا کہ مصنف نے علی گڑھ اور نئے ہندوستان کا وقت کے تسلسل میں گہرا مطالعہ اور تجزیہ نہیں کیا ہے۔ اب یہاں وائس چانسلر تو کیا مسجد کے امام صاحب کا بھی اس پر خون نہیں کھولے گا کہ لڑکے معمولی سا تاریخی ڈرامہ کیوں پیش کر رہے ہیں۔ ہوسٹل اس کے باغات، کمروں، اور بیروں کی جو خاکہ نگاری کی گئی ہے وہ کسی حد تک درست اور دلچسپ ہے۔ لیکن گرلز کالج اور اس کی طالبات کے جو عکس ہیں ان کا اصلیت سے کوئی تعلق نہیں۔ علی گڑھ کے طلبا کا جو ذہین ترین طبقہ ہے، ان کے تصور میں اب ان لڑکیوں کے حسن جہاں سوز سے کہیں زیادہ ان کی ذہانت پر خطر ہوتی ہے اس لئے کہ لڑکیوں کے پاس اتنے مشاغل نہیں ہوتے جتنے لڑکوں کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ اس لئے تعلیمی نتائج لڑکیوں کے حق میں زیادہ بہتر ہیں ۔ مجھے یہ ناول پسند نہیں آیا۔

## آریہ ابھوونے (شعری اُردو ترجمہ)

اُردو ترجمہ: منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی (مرحوم)
صفحات: ۳۰۴ - قیمت: تین روپے
ملنے کا پتہ: رائے صاحب چودھری پرتاپ سنگھ ٹرسٹ
۵۷۱ ماڈل ٹاؤن کرنال۔

"آریہ ابھوونے" ویدِ مقدس کی وہ تخلیقی تفسیریں ہیں جو مہارشی سوامی دیانند سرسوتی نے انیسویں صدی میں، ہندی میں تالیف کی تھیں۔ ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ میں جن چند بزرگوں کے نام بہت اہم ہیں اُن میں سوامی دیانند سرسوتی نمایاں ترین ہیں۔ مہاتما گاندھی بھی ہمیشہ اُن کی عظمت کا اعتراف کرتے رہے۔

اُردو کے بزرگ شاعر منور لکھنوی جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے نظم وغزل پر دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ ترجمے کی ذمہ داریوں سے واقف تھے۔ اُردو فارسی اور ہندی پر اُنہیں عبور حاصل تھا کئی زبانوں کے عالم ہمارے یہاں بہت مل جاتے ہیں لیکن ایسے اچھے شاعر ہمارے یہاں نایاب ہیں جو مختلف زبانوں کے ادب پر گہری نگاہ رکھتے ہوں۔ مرحوم منور لکھنوی کا یہ ترجمہ واقعی اُردو میں اضافہ ہے۔ ظاہر ہے یہ بہت مشکل کام تھا۔ ویدِ مقدس کے منتروں، تعلیم، پرارتھناؤں میں جن حقائق، روایات کے تمثیلی اشارے ہیں اُن کا اُردو میں اور پھر شعر میں منتقل کرنا اس لئے بھی دشوار تھا کہ سینکڑوں نام اور کردار اُردو کی رواں بول چال میں اجنبی اور نئے محسوس ہوتے ہیں۔

منور مرحوم کی شاعرانہ فنکاری نے اکثر مقامات پر اُسے اُردو کے آہنگ میں اس طرح پرو دیا ہے کہ ساری کتاب نامانوس اپنائیت، اور پُروقار اسلوب کے ساتھ پڑھنے والے کو دھیرے دھیرے ایک نئے ذائقے سے روشناس کراتی ہے

یہ تخلیقی شعری ترجمہ، اُردو کے شعری ترجموں میں واقعی اہم اضافہ ہے۔

## غالب اسٹڈیز ۲

مرتب: عابد رضا بیدار
صفحات ۸۰ - قیمت ۲ روپے
ملنے کا پتہ: رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز
۱۸۰۶، کلاں محل دہلی - ۶

غالب پر ایک مخصوص سمینار جس کی دو نشستیں (علی گڑھ اور دہلی) میں ہوئی تھیں عابد رضا بیدار کی کوششوں کا نتیجہ تھا اس سمینار کو خالص ادبی بھی اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اُس میں صرف وہی ادیب و شاعر شریک کئے گئے تھے جو مذاکرہ میں حصہ لے رہے تھے۔ اس مختصر سی کتاب میں غالب کے بارے میں کوئی تحقیقی نکتہ بھلے ہی نہیں پیش کیا گیا ہے لیکن غالب اور ہمارے عہد کے مستند نقاد، محقق، افسانہ نگار، نئی نسل کے شاعر کے درمیان کیسے کیسے رشتے ہیں۔ اُن رشتوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس طرح بہت سی جامد تحقیقوں اور بے سر و پا تشریحوں سے کہیں زیادہ رواں، زندہ اور متحرک گفتگو غالب کے فن کے مختلف پہلوؤں پر اس مذاکرے میں ملتی ہے۔

قاضی عبدالودود، آل احمد سرور، مختار الدین احمد، مالک رام، رشید احمد صدیقی، یوسف حسین خاں۔ آنند نرائن ملا، اور کوثر چاندپوری نے غالب کے کلام کے اُن مختلف گوشوں کی نشاندہی کی جو اُن کی شاعری میں نمایاں ترین ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، وحید اختر، شہریار، وارث کرمانی نے غالب کی اُن صفات کو زیادہ سراہا جن میں محدود عصریت کے بجائے دوامی قدریں ہیں اور اُن کی ہوش مندی اپنے عہد سے اتنا آگے دیکھ لیتی ہے کہ غالب اس جدید دور میں بھی جدید ذہنوں کو مطمئن کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔

یہ مذاکرہ بڑے سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ ہم اس کی رپورٹ نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ اُسے سُن رہے ہیں، دیکھ رہے ہیں۔ طباعت اور کتابت بہت خوبصورت ہے۔ یہ آفسیٹ پر شائع ہونے والے رسالہ علم و فن میں صفحہ ۳۷ سے ۱۰۶ تک شائع ہوا تھا۔ اسی کے آف پرنٹ کو کتابی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ مذاکرے میں حصہ لینے والے اکثر ادیبوں / شاعروں کے خوبصورت دلوں کی خوبصورت تصویریں شامل کی گئی ہیں۔

ایک مزید حسن ہے

## غالب اسٹڈیز ۳

مرتب: عابد رضا بیدار
صفحات ۶۶ قیمت ۵ روپے
ملنے کا پتہ: رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز،
۱۸۰۶ کلاں محل جامع مسجد، دہلی ۶

عابد رضا بیدار لکھتے ہیں۔ "۲۵ اگست ۱۸۶۶ء کو نواب کلب علی خاں

اپنی بیاض اشعار کی ترتیب کے لئے غالب سے اُن کے دیوان کے انتخاب کی فرمائش کی تو، ۱۰ ستمبر تک اسی نسخے کے اشعار پر صاد کر کے غالب نے انھیں نقل کرایا اور ۱۸ ستمبر کو یہ انتخاب نواب صاحب رامپور کی خدمت میں بھیج دیا۔"

عرشی صاحب نے لکھا ہے" (اس) انتخاب میں مثنوی مکمل چُن لی گئی ہے۔ بقیہ اصناف میں سے غزلوں کے ۶۷۴، قصیدوں کے ۹۲، قطعات کے ۴۰ اور رباعیوں کے ۱۰ اشعار انتخاب کئے گئے۔ جن کی تعداد ۸۴۸ ہوتی ہے۔"

اسی انتخاب کی کئی وجوہ سے بڑی اہمیت ہے۔

(۱) غالب کے پسندیدہ اشعار کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

(۲) غالب کے نسبتاً کم پسندیدہ اشعار معلوم ہوجاتے ہیں۔ ان کم پسندیدہ اشعار میں یہ اشعار بھی ہیں جو انتخاب میں نہ آسکے۔

دیر و حرم، آئینہ تکرارِ تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں
ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یہ انتخاب ایسے کئی سوالوں پر سوچنے کو اکساتا ہے۔

(۱) غالب کے ذہن میں اچھے یا بہت اچھے شعر کا تصور کیا تھا؟

(۲) اچھے شعر کہنا اور اچھا شعر سمجھنا کیا دو الگ الگ صفتیں ہیں؟

(۳) ماحول کا جبر اس وقت تو حاوی ہو ہی جاتا ہے جب تخلیق کی رو سرگرم نہ ہو۔ ظاہر ہے شاعر جب شعر کہتا ہے۔ اس وقت وہ اس ہستی سے ملفّ ہوجاتا ہے جو عام حالت میں ہوتی ہے۔

اس کتاب کی کتابت اور طباعت بہت معیاری نہیں، اس لحاظ سے بھی اس کی قیمت خریدنے والوں کے لئے زیادہ ہے۔

## اُردو ادب میں سکھوں کا حصّہ

مرتب : امام مرتضیٰ نقوی

صفحات : ۴۰۴ قیمت : پندرہ روپیہ

ملنے کا پتہ : بک کارنر دانش کدہ امروہہ (یوپی)

اُردو ہندوستان کی ایک ایسی ہمہ گیر زبان ہے جو ملک بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اس کی ترقی اور ترویج میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی سب نے حصہ لیا ہے۔ اُردو کے ہندو شعراء اور ہندی کے مسلمان شعراء اور ادیبوں سے متعلق کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں مگر اُردو ادب میں سکھوں کے حصے کو اُجاگر کرنے کی یہ پہلی کوشش ہے جو قابلِ قدر ہے۔ بعض نام شائع ہونے سے رہ گئے ہیں۔ مثلاً سنتوکھ سنگھ دھیر ایک زمانے میں اُردو کے مشہور افسانہ نگار تھے آخر میں ان کتابوں کی بھی فہرست دی گئی ہے جو اُردو میں سکھ مذہب سے متعلق لکھی گئی ہیں۔ ظاہر ہے اس فہرست کو مکمل نہیں کیا جاسکتا مگر اس سے یہ اندازہ ضرور ہوجاتا ہے کہ سکھ مذہب کی ترویج میں بھی اُردو نے اہم حصہ لیا ہے۔

یہ مجموعہ ایک اچھی کوشش ہے اور تاریخ ادب اُردو سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس سے مفید معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔

کتابت۔ طباعت اور گٹ اپ اچھا ہے۔

(ادارہ)

## افیونی (ناولٹ)

شاد عظیم آبادی اُردو کے مشہور و معروف شاعر ہیں۔ مگر انہوں نے اصلاحی نقطۂ نظر سے ناول بھی لکھے تھے ان کا پہلا ناول "صورت الخیال" تین جلدوں پر مشتمل ہے اس ناول کو مقبولیت حاصل ہوئی اور شاد نے ایک دوسرا ناول "بدھا دا" لکھا ان کا تیسرا ناول "افیونی" کسی وجہ سے شائع نہ ہو سکا۔ ۱۸۹۰ میں لکھے گئے اس ناول کو اب جناب نقی احمد ارشاد نے مرتب کیا ہے اس کا نقطہ نظر اصلاحی اور اخلاقی ہے۔ ناول کی ابتدا اور ارتقا کے سلسلے میں "افیونی کا مطالعہ مفید ہوسکتا ہے۔ یہ ناولٹ نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ سے دو روپے میں مل سکتا ہے

(ادارہ)

## آثارِ محرومؔ

پگڈنڈی امرت سر کا محروم نمبر جس کے چھپنے کی اطلاع کئی سال سے مل رہی تھی آخر چھپ ہی گیا۔ اس کے مرتب ہیں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ قیمت سات روپے ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ اور مکتبے کی اردو بازار دہلی اور بمبئی کی برانچیں۔

ترتیب ایک زمانے سے ہو رہی تھی اس میں جو پیغامات اور مضامین درج ہیں اُن کے لکھنے والوں میں سے بھی چند اس دُنیا میں موجود نہیں۔ محروم صاحب کے متعلق بہت سے مضامین شامل ہیں۔ ترتیب میں ذرا سختی برتی جاتی تو یہ کتاب اور بھی قابلِ قدر ہوتی لیکن مقامِ شکر ہے کہ محروم ایسے قادر الکلام شاعر کی ایک اچھی یادگار شائع ہوگئی۔ پڑھنے والے اپنے مذاق کی تسکین خود کرلیں گے۔

(عرشی ملیانی)

نومبر ۱۹۶۷ء




یہ اطمینان دلانے کے لئے کہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں عمدہ اناج مقررہ قیمتوں پر پا سکیں، ہم کسانوں سے اسے خریدتے ہیں، اسے حفاظت سے سٹور کرتے ہیں اور کنزیومران کو سپلائی کرتے ہیں۔ سال بہ سال فوڈ کارپوریشن بڑی مقدار میں مختلف اناج جیسے کہ گیہوں، چاول، بلٹ، مکا، دالیں خرید کر رہی ہے تاکہ ان کی قیمتوں میں اضافہ نہ ہو اور دیش کے لئے اناج کا ذخیرہ جمع رہے۔

**دی فوڈ کارپوریشن آف انڈیا**

۱۔ بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دلی۔۱

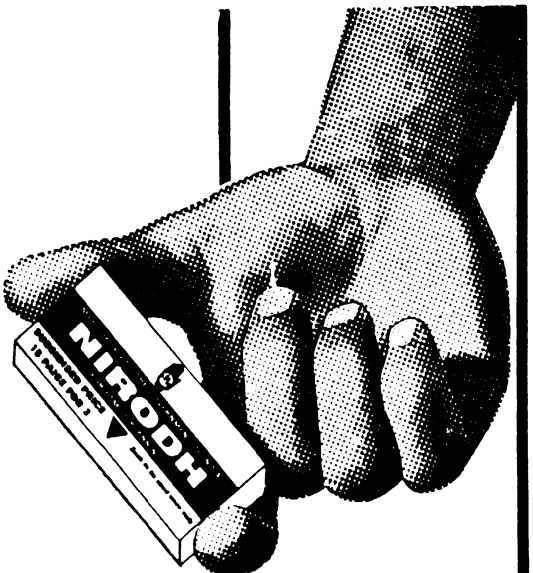


## بچّوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

فی زمانہ بچّوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نِرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچّے تبھی ہوگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔

## بچّہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچّے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچّے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نِرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچّے کی پیدائش ملتوی کر سکتے ہیں۔

نِرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اِسے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان، محفوظ طریقہ ہے۔ اِس کے استعمال سے صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔

نِرودھ ہر جگہ ملتا ہے:-
پرویژن اسٹور، کرانہ فروش، کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔

صرف 5 پیسے خرچ کرکے آپ اپنے کنبے کو محدود رکھنے کی طاقت حاصل کر سکتے ہیں

## نِرودھ استعمال کیجئے

فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم

15 پیسے کے 3

سرکاری امداد سے کم دام

70/61

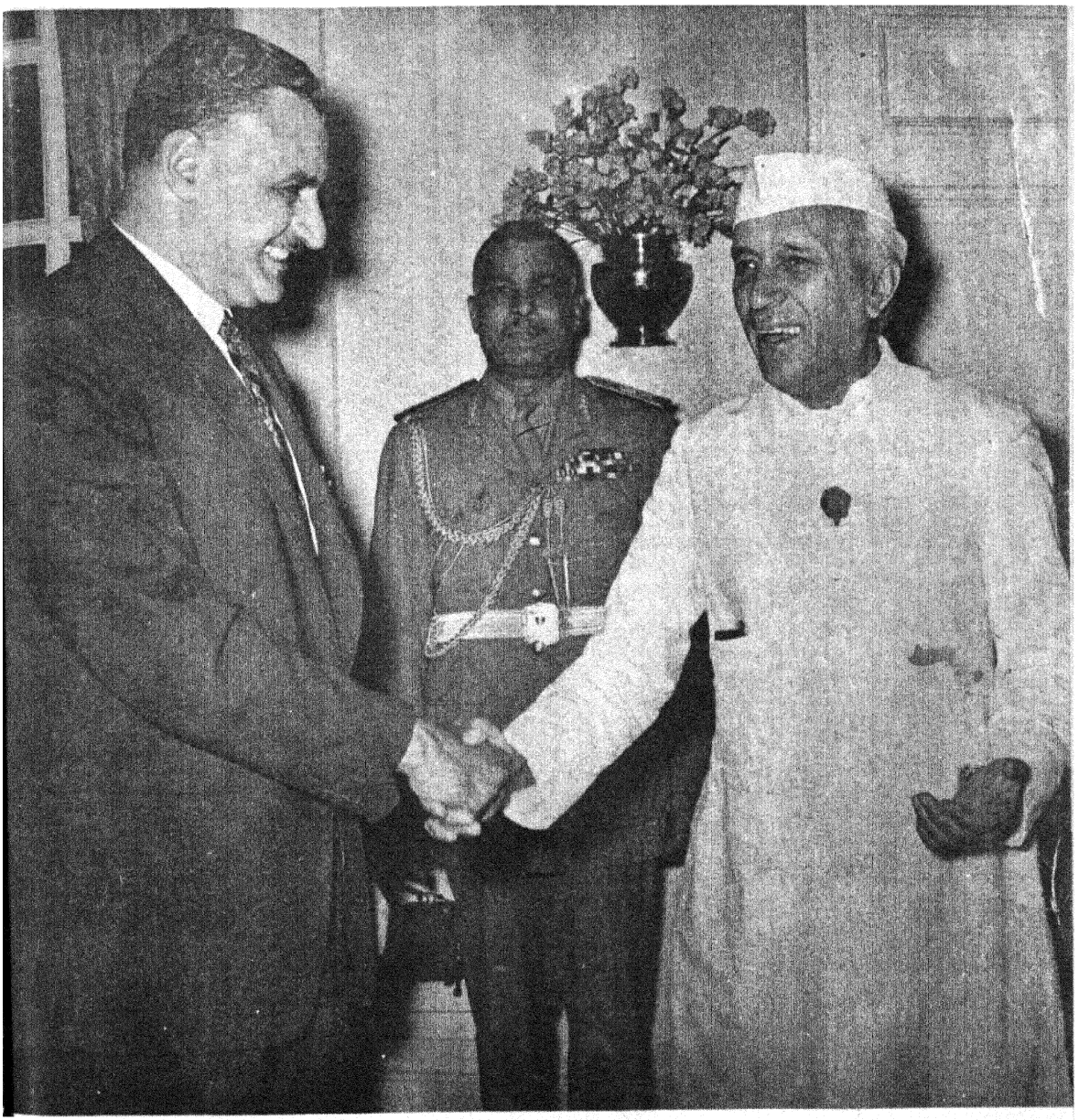

نہرو اور ناصر

Vol. 29 No. 4 AJKAL (Monthly) November 1970

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55
Regd. No. D-509

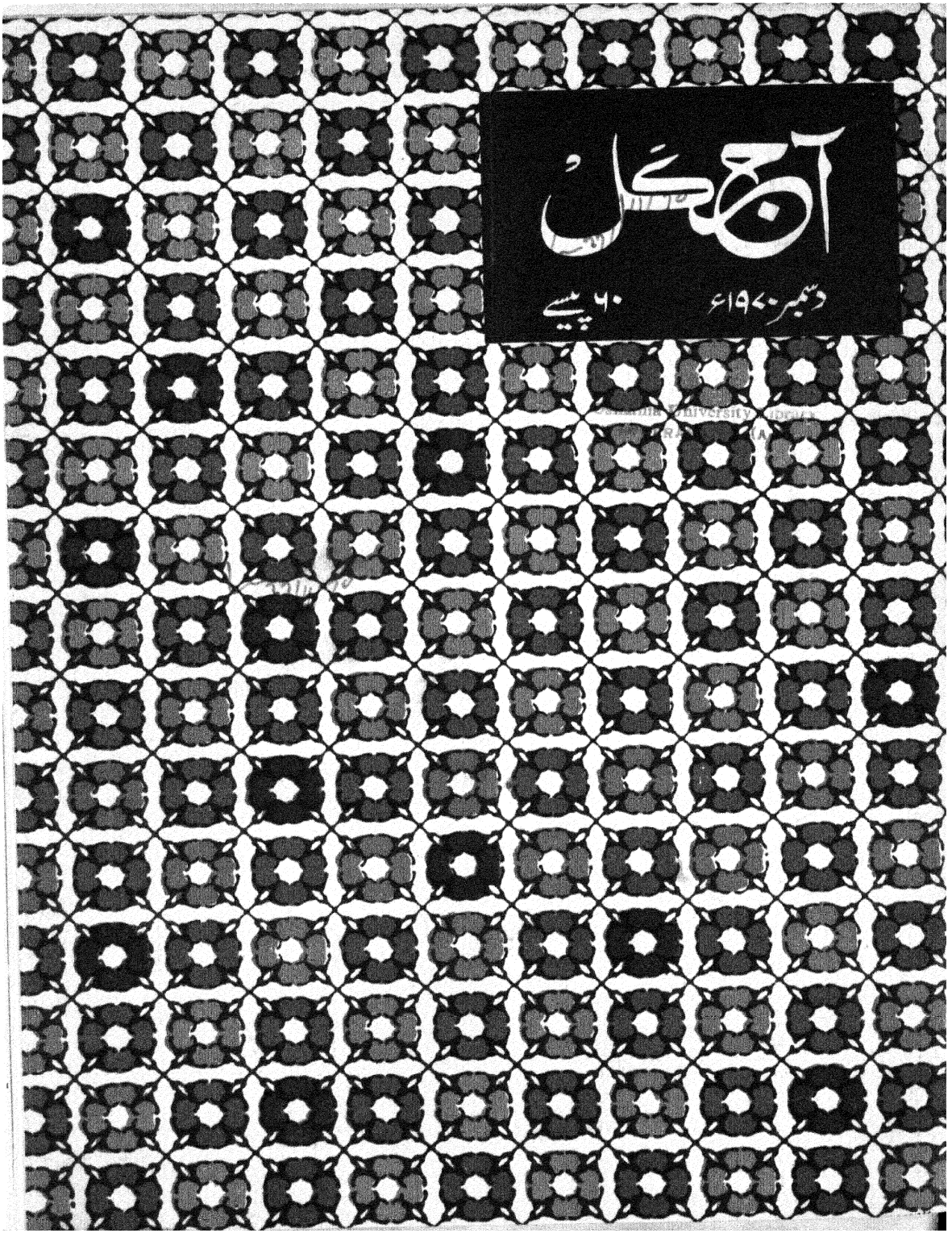
آجکل
دسمبر ۱۹۷۰ء
۶۰ پیسے

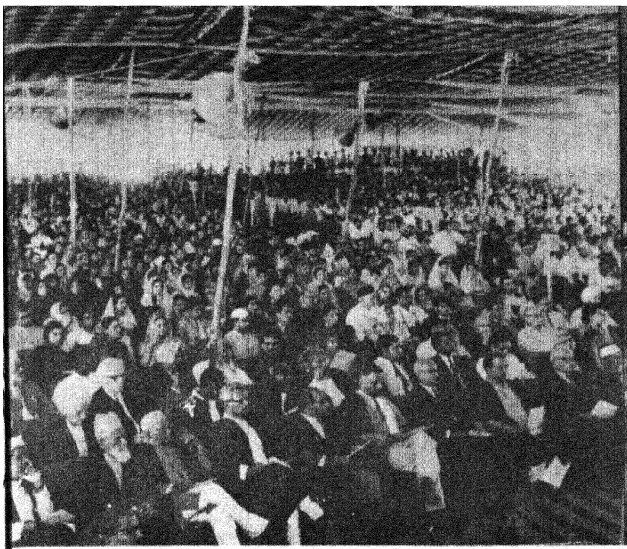

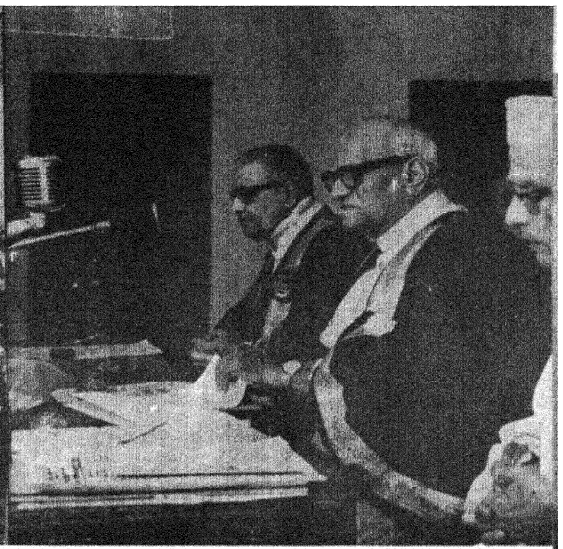

معہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کا جشنِ زرّیں ۲۷ اکتوبر سے ۳۰ اکتوبر ۷۰ء تک منایا گیا۔ آخری دن جلسۂ تقسیم اسناد منعقد کیا گیا جس سے صدرِ جمہوریہ ہند نے خطاب کیا۔
ہنی طرف چیف جسٹس جناب ہدایت اللہ، چانسلر جامعہ اور بائیں طرف جناب پروفیسر محمد مجیب وائس چانسلر جامعہ تشریف فرما ہیں۔

یاست جموں وکشمیر سے لداخ کے بیس افراد پر مشتمل ایک وفد ہندوستان کی سیر و سیاحت کے لئے آیا تھا ایسے دورے ملک کے مختلف حصوں کے باشندوں کو ایک
زدیک لاتے ہیں اور اتحاد اور یگانگت پیدا کرتے ہیں۔ وفد نے نئی دہلی میں مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات شری ستیہ نارائن سنہا سے ملاقات کی اور اپنے تاثرات





اُردو کا مقبول عوام مصوّر رسالہ

# آجکل

نئی دہلی

مدیر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

شمارہ ۵ —— جلد ۲۹
دسمبر ۱۹۷۰ء
اگراہن پوش شک ۱۸۹۲ء

## ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ملاحظات | | ۲ |
| غبارِ کارواں (۱۰) | فراق گورکھپوری | ۳ |
| زمانہ (نظم) | حرمت الاکرام | ۱۰ |
| پانی سے گاڑھا لہو | پریم ناتھ در | ۱۱ |
| راجندر بابو (نظم) | جگن ناتھ آزاد | ۱۴ |
| غزلیں | علقمہ شبلی، شیدا رومانی، افسر القادری سہسرامی | ۱۶ |
| حاذق الملک اور مسیح الملک | کوثر چاندپوری | ۱۷ |
| یوپی کے قبائل | امیر حسن | ۲۱ |
| غزل | شکیب ایاز | ۲۳ |
| غزلیں | خالد رحیم، قیم الحق گیاوی، صبا نقوی | ۲۵ |
| الحاق (پاکستانی نظم) | احمد ریاض | ۲۶ |
| لالٹین (عربی کہانی) | ناز الملکہ | ۲۷ |
| کہانی شمالی ویت نام —— تابوت سے گہوارے تک | مائی سنگو | ۲۹ |
| نئی زندگی کی تلاش میں (نظم) | اگستان منتو | ۳۲ |
| کہانی: جنوبی افریقہ —— پنچ | رچرڈ رائیو | ۳۳ |
| کمانگو (نظم) | پترس لومبا | ۳۶ |
| کہانی: عربی۔ ابھاگا | یوسف الصبائی | ۳۷ |
| تعارف (فلسطینی نظم) | محمود درویش | ۴۱ |
| نئی کتابیں | | ۴۲ |



| | | |
|---|---|---|
| سالانہ چندہ | ہندوستان میں | سات روپے |
| غیر ممالک سے | پاکستان میں | سات روپے (پاک) |
| | ۱۱ شلنگ چھ پنس یا ڈیڑھ ڈالر | |
| قیمت فی پرچہ | ہندوستان میں | ۶۰ پیسے |
| غیر ممالک سے | پاکستان میں | ۶۰ پیسے (پاک) |
| | ۱ شلنگ یا ۱۵ اسینٹ | |

سرورق: مدن موہن ملک

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

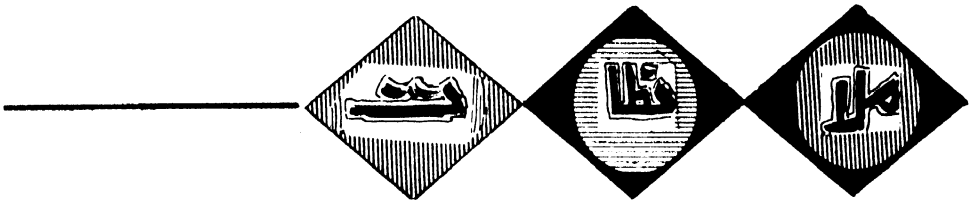


۲۴ اکتوبر ۱۹۷۰ء تاریخ عالم کا ایک اہم دن تھا کیونکہ اُس دن اقوام متحدہ کو قائم ہوئے ۲۵ سال پورے ہو گئے۔ دُنیا کے تقریباً تمام ممالک نے اس عالمی ادارے کی سلور جوبلی کی تقریب منائی ——— ہندوستان بھی اس تاریخی تقریب میں پیش پیش رہا۔ اس موقع پر ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند شری وی وی گری نے ہندوستانی عوام کو تلقین کی کہ وہ اس بین اقوامی ادارے کو مستحکم بنانے کا عہد کریں تاکہ یہ ادارہ عوام کی سماجی آزادی اور عالمی امن کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو سکے۔ اس موقع پر دُنیا کے متعدد سربراہ اقوام متحدہ کے تاریخی اجلاس میں شرکت کے لئے نیویارک تشریف لے گئے اور اپنے خیالات و افکار کا اظہار کیا۔ اس تاریخی اجلاس میں ہندوستان کی نمایندگی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کی اور ۲۳ اکتوبر کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے اُنہوں نے فرمایا کہ نو آبادیاتی نظام کے بچے کھچے آثار کا خاتمہ، نسل پرستی کا قلع قمع، ترک اسلحہ بالخصوص ایٹمی ہتھیاروں کا تیاگ اور ٹیکنالوجی کی بنیاد پر قائم نئے نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ اس عالمی ادارے کا منتہائے مقصود ہونا چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی وزیر اعظم نے چھوٹے اور متوسط درجے کے ممالک کو تلقین کی کہ وہ یکجا ہو کر اس عالمی ادارے کو مستحکم بنائیں نیز طاقتی سیاست سے بالاتر رہ کر اس کے اثر و رسوخ میں اضافہ کریں۔ ہندوستان کی امن پسند پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ ہماری خارجی پالیسی میں جنگ کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ پچاس کروڑ سے زائد لوگوں کو اُن کی آرزوؤں کی تکمیل میں مدد دینے کی ذمہ داری ہمیں امن و آشتی بالخصوص اپنے پڑوسی ممالک سے امن برقرار رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں بڑی طاقتوں کی کے اس رویے کو ناپسند کیا کہ جب بھی ان طاقتوں نے دیکھا کہ یہ ادارہ اُن کے مقاصد کو پورا کرنے کا وسیلہ نہیں رہا انہوں نے اس عالمی ادارے کو نظر انداز کر دیا ——— علاوہ بریں یہ طاقتیں اپنے حلقۂ اثر میں توسیع کرنے کی انتھک سعی کے سلسلے میں طاقت کا توازن برقرار رکھنے، اثرات حلقے قائم کرنے اور بعض ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی ناپ پالیسیوں پر عمل کرنے کی کوشش اب بھی کر رہی ہیں اور گزشتہ ۲۵ میں جو بھی محدود جنگیں ہوئیں وہ انہیں پالیسیوں کا نتیجہ تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ بعض عالمی مسائل حل کرنے میں یہ ادارہ رہا ہے اور بعض جنگوں کو روکنے کے سلسلے میں کوئی موثر قدم نہیں اُٹھا سکا اس کی کامیابیوں کے مقابلے میں ناکامیاں زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں ا نے بنی نوع انسان کی بہتری و بہبود کے لئے غیر معمولی خدمات انجام ہیں اور یہ دُنیا کے تمام ممالک کا اولین فرض ہے کہ وہ اس عالمی ادا اپنا پورا پورا تعاون دیں تاکہ مختلف قومیں ایک دُوسرے کے قریب آ رواداری اور بقائے باہم کو فروغ حاصل ہو، امن کی بنیاد پر عالمی نا قائم ہو سکے اور انسان امن اور خوشحالی کے خوشگوار ماحول میں بہتر ڈھ زندگی گزار سکے۔

---

۱۷-۲۰ نومبر کو نئی دہلی میں افریقی اور ایشیائی ادیبوں کی منعقد ہو رہی ہے جس میں افریقہ اور ایشیا کے ممتاز ادیب اور شاعر حصہ رہے ہیں۔ اس موقع پر ہم افریقی ایشیائی ادیبوں اور شاعروں کی چار کہانیاں اور چند نظمیں پیش کر رہے ہیں۔ اُمید ہے آپ انہیں پسند کر

---

گزشتہ دنوں اُردو کے دو شاعر حق حزیں اور تبیغ الہ آبادی ہمیں مفارقت دے گئے۔ ادارہ اُن کی بے وقت موت پر اپنے رنج و غم کا ا

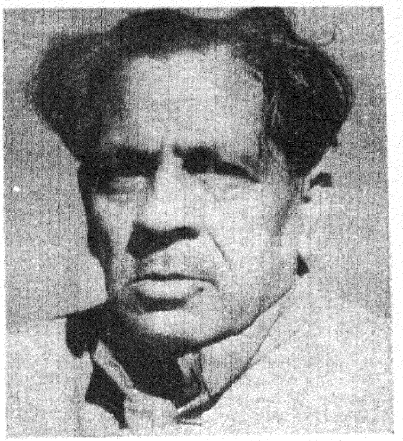

# غبارِ کارواں

## (۱۰)

فراق گورکھپوری

جب میں اپنے لڑکپن کا زمانہ یاد کرتا ہوں تو ایک طرف ایسا محسوس ہے کہ اپنے ہم عمر لڑکوں کی طرح میں بھی ایک لڑکا تھا جو انہیں میں گھلا تا تھا لیکن کچھ چیزیں مجھے خاص طور سے اور ل طور سے متاثر کرتی تھیں مثلاً رات کی ، طلوع و غروبِ آفتاب، دریا، ہرے بھرے ، کڑوے تیل سے جلتا ہوا چراغ، لڑکپن ری گاہ، لڑکپن کے دوست، کھیتوں اور ں میں پانی دینے کا منظر، جانوروں کا اپنے لو دودھ پلانا، دن کو نہیں بلکہ شام کو چولہوں کا روشن ہونا، وہ جانور جن سے ہم مانوس تھے یا جن سے ہم کھیلتے تھے، بستر کا سکون، ے نباتی، رامائن کی کتھا، جس کے متعلق ہوش سنبھالنے کے بعد یہ یقین گیا کہ اس کی کہانی کا مقابلہ دُنیا کی کوئی کہانی نہیں کر سکتی، مہابھارت جس کا مقابلہ بھی کوئی رزمیہ کہانی نہیں کر سکتی، بہت سے لوک در لوک کتھائیں، ہندوستانی موسیقی میں لَے اور سُر کی گھلاوٹ اور ی گھلاوٹ اور ایسی ہی چھوٹی بڑی بہت سی چیزیں۔ پریم چند کی ، مے میرے لڑکپن کو خاص طور سے متاثر کیا۔ مولوی اسماعیل کی دیہی میں غوری اور پرتھی راج کی جنگ کے بیان نے مجھے بہت متاثر ۔

ہم لوگوں کے ایک ماسٹر صاحب تھے۔ رات کو جب ہم لوگوں کا سبق ا تھا تو وہ تلسی داس کی رامائن کا پاٹھ کیا کرتے تھے۔ میرے اور بھائی بہن تو اُن کا رامائن پڑھنا نہیں سنتے تھے لیکن میں دیر تک ماسٹر صاحب سے رامائن کی کتھا سُنا کرتا تھا، اور بہت متاثر ہوتا تھا۔ میں رام کا پجاری تو نہیں بنا لیکن تلسی داس اور اُن کی رامائن کا پجاری اسی وقت بن گیا اور آج تک ہوں۔ تلسی داس کی رامائن کا شمار دُنیا بھر کی سب سے مقبول و محبوب کتابوں میں ہوتا ہے۔ اس کتاب کا ہر لفظ امرت کا ایک گھونٹ ہے۔ اسے برگد کے ایک ایسے درخت سے مشابہت دی گئی ہے جس کے سائے میں کروڑوں انسانوں کی تھکی ہوئی زندگی سکون پا جاتی ہے۔ تلسی داس کی رامائن میں عجیب قوتِ شفا ہے۔ یہ سب اس زمانے کی بات ہے۔ جب میں صرف نو دس برس کا تھا پہلے پہل میرا داخلہ ماڈل اسکول پھر مشن اسکول اور بعد میں جبلی ہائی اسکول میں کرایا گیا۔ جب میں نویں درجے میں آیا تو انگریزی شاعر گرے ( Gray ) کی شہرہ آفاق نظم جو Gray's Elegy کے نام سے مشہور ہے، پڑھنے کو ملی اور میں مہینوں تک اُس کے اشعار گاتا اور گنگناتا رہتا تھا۔ نظم طباطبائی کی "گورِ غریباں" اسی انگریزی نظم کا منظوم ترجمہ ہے۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں مجھے سوامی رام تیرتھ کی انگریزی تقریروں کو پڑھنے کا موقع ملا، جن میں ویدانت کے اصول و فلسفہ پر نہایت دل نشیں دلائل تھے۔ ان تقریروں کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ نویں اور دسویں درجے میں مجھ سے زیادہ نمبر پانے والے کچھ ہندو مسلمان لڑکے تھے لیکن جب کلاس میچرے ضخیم تحریروں کا لب لباب یا نچوڑ انگریزی میں سو سوا سو لفظوں میں لکھنے کو کہا تو درجے بھر میں یہ کام تن تنہا میں کر سکا۔ ۱۹۱۳ء میں سیکنڈ ڈویژن میں میں نے اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کا امتحان پاس کیا اور الہ آباد میں میور سنٹرل کالج میں داخلہ لیا۔ جب میں آٹھویں یا نویں کلاس میں تھا تو میرے پھوپھی زاد بھائی راجکشور لال سحر مرحوم مجھ سے بہت گھل مل گئے۔ وہ میرے ہی یہاں رہتے تھے اور راتوں کو دیر تک

"گلزارِ نسیم" کے اشعار سناتے اور سمجھاتے تھے۔ صدہا اشعار امیر مینائی اور دوسرے شعرا کے بھی سناتے رہتے تھے۔ پھر مجھے چچا کا لکھا ہوا میرے والد یعنی عبرت گورکھپوری کا مسودہ بھی میرے ہاتھ لگ گیا تھا اور ان واقعات سے اور میری طبیعت اور فطرت کی مناسبت سے مجھے اردو شاعری میں گہری دلچسپی ہوگئی۔ اس زمانے کا واقعہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ راجکشور بھیا مرزا فہیم گورکھپوری سے اصلاح لیتے تھے۔ ایک شام کو انہوں نے داغ کا ایک شعر مجھے سنایا یہ کہہ کر کہ اُن کے اُستاد مرزا فہیم اس شعر کا مطلب نہیں لگا سکے تھے۔ وہ شعر یہ تھا۔

دل ہی تو ہے نہ آئے کیوں دم ہی تو ہے نہ جائے کیوں
مجھ کو خدا جو صبر دے تجھ کو حسیں بنائے کیوں!

ابھی میری عمر ہی کیا تھی لیکن شعر کا مطلب میری سمجھ میں آگیا، جسے میں نے یوں سمجھا دیا۔ عاشق معشوق کے برتاؤ سے نہایت بیزار ہو چکا ہے چھڑنے کے لئے معشوق نے ظرافتاً کہا۔ خدا تمہیں صبر دے! عاشق نے جواب دیا صبر کی بات تو الگ ہے، خدا نے تم کو اتنا حسین کیوں بنایا ہے جس کی وجہ سے کہنا پڑتا ہے کہ دل ہی تو ہے نہ آئے کیوں، دم ہی تو ہے نہ جائے کیوں۔ راجکشور بھیا نے مجھے گلے سے لگا لیا۔

میور سنٹرل کالج کے ایف اے کلاس میں تین زبردست ہم جماعتوں کا ساتھ ہوا۔ امرناتھ جھا، للّا رام تیواری اور صحت بہادر۔ یہ سب فرسٹ ڈویژنر تھے اور میں معمولی سیکنڈ ڈویژنر لیکن سہ ماہی امتحان میں مجھے اتنے نمبر ملے کہ میں بھی حلقہ خاصانِ خاص میں شمار کیا جانے لگا اور پروفیسروں کا مرکزِ توجہ بن گیا۔ فارسی پڑھانے کے لئے اسی زمانے میں پروفیسر مہدی حسن ناصری کا تقرر ہوا اور وہ مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان رہنے لگے۔ تاریخ کے مضمون میں لین پول کی کتاب اورنگ زیب پر داخلہ نصاب تھی۔ اتنی خوبصورت انگریزی میں یہ کتاب لکھی گئی تھی کہ ڈیڑھ سو صفحوں کی پوری کتاب مجھے قریب قریب ازبر ہوگئی۔ اس کے جملوں کے مدوجزر میرے دماغ کی رگ رگ میں اُتر گئے۔ دوسرا مضمون جو مجھے بہت مرغوب تھا وہ منطق تھا۔ Deductive Logic میں پروفیسر رے کی کتاب اور Inductive Logic میں آگرے کے ایک مشہور انگریز پروفیسر کے نوٹ نے مجھے گہرے طریقے پر سوچنا سکھایا اور میرے اندر فلسفیانہ رجحانات کو بیدار کر دیا۔ انگریزی میں دو سبق ایسے پڑھنے کو ملے جن میں زبان و بیان، فصاحت و بلاغت عروج کی منزلیں طے کرتے ہوئے نظر آئے۔ ایک سبق تھا رسکن کے مضامین Kings Treasures اور اسی کا دوسرا حصہ Queen's Garden اور دوسرا سبق تھا لارڈ مارلے کا لکچر The Study of Literature یہ دو سبق ایسے تھے جو انگلینڈ اور امریکہ کے بھی ایف اے کلاس کے طلبہ کو لوہے کے چنے ناکوں چبوا دیتے۔ ہم لوگ انہیں سمجھتے تو کیا لیکن کبھی کبھی جملوں اور فقروں کی موسیقیات سے جھوم ضرور اُٹھتے تھے۔

ایک کتاب کا ذکر کرنا میں بھول گیا۔ مجھے کالج سے پھر اسکول کے نویں دسویں درجے تک جانا ہوگا وہ کتاب تھی Smile's Self Help اور اُن کی دوسری تصنیفیں Character اور Duty۔ پہلی کتاب نے مجھے اس لئے بہت متاثر کیا کہ اس کی انگریزی میں دلکش زورِ بیان تھا۔ اس زمانے میں Smils کی کتابیں لاکھ کروڑوں کی تعداد میں دنیا بھر کے نوجوان پڑھتے تھے۔

میں ابھی ایف اے ہی میں تھا کہ میری شادی ہوگئی یہ شادی غلط ہوئی کہ میری زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُجڑ گئی۔ میں شادی کو ایک سچے جیون کا پانا یا زندگی کا سہارا سمجھتا تھا۔ نہ کہ کوئی ایسا لباس گھر جسے تبدیل کیا جا سکے۔ میری دوسری شادی نہ کرنے کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ میں کسی ایسے گھرانے کی لڑکی کو بیوی بنا کر لانا نہیں چاہتا تھا جس گھرانے کے لوگ یہ جان کر اپنی لڑکی مجھے دیں کہ میری پہلی بیوی زندہ ہے۔ شادی کے بعد مجھے سال بھر تک نیند نہیں آئی اور بھیا اور جان لیوا طرح کی سنگرہنی کا روگ ہوگیا۔ اسی کرب اور ناقابلِ برداشت حالت کے عالم میں میں نے ایف اے کا امتحان دیا اور سارے صوبہ میں ساتویں پوزیشن آئی۔ میں جب اس معمے پر غور کرتا ہوں کہ ناقابلِ غم و غصہ کے عالم میں علمی مشاغل کے لئے میرے حواس کیسے قائم رہ گئے تو اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ بچپن سے ہی جو شغف مجھے علم کے ساتھ تھا اس نے مجھے یا میرے دماغ کو بچایا۔ بی اے میں ایک سال کے لئے مجھے تعلیم کو ملتوی کرنا پڑا۔ اور بنارس جا کر سنگرہنی کا وہ علاج کرانا پڑا جس

کلپ کہتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں میں بی اے پاس ہوا اور صوبے بھر میں میری پوزیشن چوتھی تھی۔ تیسری پوزیشن ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی تھی۔ اُن دنوں عرف الہ آباد یونی ورسٹی تھی اور صوبے کی دوسری یونی ورسٹیاں وجود میں نہیں آئی تھیں۔

بی اے کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی میرے والد صاحب منشی گورکھ پرشاد عبرت مرض الموت کا شکار ہو چکے تھے۔ ۱۸ جون ۱۹۱۸ء کو میں دہرہ دون میں اُنہیں علاج کے لئے لے گیا تھا۔ جہاں اُن کا انتقال ہو گیا اس سانحہ کے برسوں بعد میں شاعری شروع کر چکا تھا، مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ جب میرے والد کا انتقال علی الصباح ہوا تو دہرہ دون کے جس مکان میں ہم لوگ ٹھہرے ہوئے تھے، اُس کے باغ میں ہزار ہا رنگا رنگ خوش الحان پرندوں نے نوحہ سرائی کی تھی، اور میری ماں نے کہا تھا کہ تیرا باپ ایک نرچھل آدمی تھا یعنی جس کے دل میں چھل کپٹ نہ ہو، اسی سے پردیس کی موت کے باوجود فرشتے مرگ اتنا سہانا نظر آرہا تھا۔ مسافر سو گیا کیا جاگ اٹھی تقدیر منزل کی"

دہرہ دون میں جہاں ہم لوگ ٹھہرے ہوئے تھے وہاں سے ہمالیہ کا وہ حصہ جہاں مسوری آباد ہے صاف نظر آتا تھا۔ اپنی ماں کی بات اور والد کی یاد سے متاثر ہو کر برسوں کے بعد ایک رُباعی کہی۔

غفلت کا حجاب کوہ و دریا سے اُٹھا
پردہ فطرت کے روئے زیبا سے اُٹھا
کس درجہ سہانا ہے سحر کا منظر
پچھلے پہر فراق کون دُنیا سے اُٹھا

دہرہ دون سے اب ہم لوگ گورکھپور پلٹ آئے۔ اتفاق سے اُن کی رحلت سے کچھ پہلے ہی میری چہیتی چھوٹی بہن کی شادی طے ہو چکی تھی۔ ماتم میں ڈوبی ہوئی حالت کے باوجود مجھے شادی کا انتظام بھی کرنا تھا۔ روپیوں کی کمی کے لئے بہت دوڑ دھوپ کرنا پڑی۔ شادی کے بعد ہی میرا بی اے کا رزلٹ نکلا۔ اور ڈپٹی کلکٹری کے انٹرویو کے لئے مجھے نینی تال بلایا گیا۔ یہ بات بالکل اچانک یوں ہوئی کہ فلسفے کے میرے معلم پروفیسر ریڈفرڈ نے گورکھپور سے خط لکھ کر میری عرضی اپنے پاس منگوالی اور ملازمت دینے والے بورڈ والوں کو میرے لئے پہلے سے راضی کر لیا تھا۔ نینی تال سے میں پھر گورکھپور آیا۔ کچھ دنوں کے بعد چونکہ ابھی پہلی عالم گیر جنگ کا زمانہ تھا، I.C.S. کے صرف انٹرویو سے کچھ لوگوں کو منتخب کرنے کی ضرورت حکومت ہند کو ہوئی۔ یہ انٹرویو لکھنؤ میں ہوا جس میں مجھے پہلی پوزیشن ملی۔ کچھ ہی دنوں بعد مہاتما گاندھی نے تحریک آزادی شروع کر دی تھی۔ میں زندگی سے بیزار ہو چکا تھا اور بہت بددل تھا میں نے سوچا کہ والد نے جو جائداد چھوڑی ہے اُسے بیچ کر خاندان کا گزارہ ہو، اور میں تمام سرکاری عہدوں کو چھوڑ کر جنگ آزادی میں شریک ہو جاؤں۔

گورکھپور میں والد کے زمانے کے قرضے کی ادائیگی اور گھر کے انتظام کے لئے مجھے مہینوں ٹھہرنا پڑا۔ یہی زمانہ میری شاعری کے آغاز کا ہے میں نے کیا سوچ کر شاعری شروع کی اور شاعری کے متعلق میرا نظریہ کیا رہا ——— اس پر جلد ہی کچھ روشنی ڈالوں گا۔

جنگ آزادی میں شرکت کے جرم میں مجھے ڈیڑھ برس کی سزائے قید ملی اور دوسرے سیاسی قیدیوں کے ساتھ آگرہ جیل بھیجدیا گیا۔ جہاں سے ایک برس کے بعد ہم لوگ لکھنؤ جیل میں منتقل کر دیئے گئے۔ آگرہ جیل میں جو قابل ذکر حضرات میرے ساتھ قید تھے اُن میں بعض کے نام یہ ہیں مسٹر جوزف ایڈیٹر انڈیپنڈنٹ، مسٹر زنگا اسسٹنٹ ایڈیٹر انڈیپنڈنٹ، مہادیو ڈیسائی خواجہ عبدالمجید، رائے بریلی کے بزرگ میر صاحب، جناب سید سلطان پور کے بابو گنپت سہائے، الہ آباد کے سب سے بڑے وکیل جنھیں ہم لوگ بھائی جی کہتے تھے ——— اور ہندی شاعر اور لیکھک پانڈے بیچن شرما "اگرجی"۔ مولانا عارف ہسوی صاحب کی ایما سے ہم لوگ کچھ لکچر بھی کرا لیتے تھے اور ہفتہ وار مشاعرہ بھی ہونے لگا تھا۔ ہم لوگوں کے ساتھ ہندی کے وہ شاعر بھی موجود تھے جن کی یہ نظم بہت مشہور ہے اور جو انہوں نے جیل ہی میں کہی تھی ——— جھنڈا اونچا رہے ہمارا! مجھے جیل میں ذاتی اخراجات کے لئے کچھ روپے کی ضرورت پڑ گئی۔ میں گھر والوں کو زحمت نہیں دینا چاہتا تھا۔ ہندی رسالوں کے لئے بعض مضامین لکھ کر میں نے منشی پریم چند کے پاس بھیج دیئے انہوں نے ان رسالوں سے میرے پاس روپے بھجوا دیئے۔

جیل میں ہی مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی وفات کی اندوہناک خبر ملی۔ یہ تین برس سے تپ دق میں مبتلا تھے، بھوالی کا قیام، کرنل اسکراسن اور حکیم اجمل خاں کا علاج اُنہیں بچا نہیں سکا۔ میں نے اس جواں مرگ بھائی کا ایک مرثیہ کہا جو میرے مجموعہ "روح کائنات" میں شامل ہے جب میں جیل سے چھوٹ کر گھر آیا تو میں نے اس چھوٹی سی کاپی کو تلاش کیا جس میں گیتا

کے ایک باب کا میں نے منظوم ترجمہ کیا تھا۔ ترجمے کے اوراق کسی نے پھاڑ لئے تھے۔ اور اس کاپی میں میرے چھوٹے بھائی کا Temprature Chart درج تھا۔ یہ چارٹ مجھے اپنے صنائع شدہ شعری کارناموں سے زیادہ عزیز ہوگیا اور اُسے میں نے اپنے بھائی کی یادگار سمجھا۔

اسی زمانے میں میری ملاقات مجنوں گورکھپوری سے ہوئی۔ اور ہم دونوں بہت جلد ایک جان دو قالب بن گئے۔ پریم چند سے پہلے کی ملاقات تھی میں، مجنوں اور پریم چند اکثر یکجا ہوجاتے تھے اور وہ لمحے بہت قیمتی ہوتے تھے۔ میں نے انگریزی ادب کی تاریخ پر کچھ قیمتی کتابیں منگا رکھی تھیں اور اس سے متعلق مختلف تنقیدی کتابیں بھی فراہم کرلی تھیں۔ میں ان کتابوں کو برابر زیرِ مطالعہ رکھتا تھا۔ ہارڈی، ڈکنس، سر والٹر اسکاٹ، تھیکرے اور جارج ایلیٹ کی تصانیف ورڈز ورتھ، کیٹس اور ٹینیسن کی انگریزی نظمیں اکثر زیرِ مطالعہ رہتی میں ان دنوں اُردو میں شعر تو کہتا تھا لیکن شاعری کے بارے میں سوچتا بھی نہیں تھا۔ میں نے اُردو شاعری میں بہت سے محاسن کو محسوس کیا لیکن مجموعی حیثیت سے ایک آسودگی کا بھی احساس ہوتا تھا۔ مجھے اس بات کا تحت الشعوری طور پر شدید احساس ہونے لگا کہ خیر و برکت کے وہ عناصر جنہوں نے سنسکرت ادب، قدیم ہندی ادب اور ہندوستان کی دُوسری زبانوں کے اَدب کو بسا اوقات امرت بانی بنا دیا ہے، اُردو ادب میں اُن کا قریب قریب فقدان ہے اگرچہ خواجہ میر درد، شاہ تراب، آسی غازی پوری اور مسلمانوں میں کئی سادھو سنت اور فقیر روحانیت و پاکیزگی کے حامل بہت سا کلام چھوڑ گئے ہیں۔ ہندوستان کی اور زبانوں کا ادب تصباتی زبان میں ہے، جس میں ایک بھولا پن ہوتا ہے اور سادگی اور سچائی۔ اُردو زبان وہ تنہا ہندوستانی زبان ہے، جس کی ساخت و لب و لہجہ سو فیصدی شہری ہے۔ شاید اسی وجہ سے اُردو میں ہم کبیر، سور اور دوسرے ویشنو شاعروں کا لب و لہجہ آسانی سے پیدا نہیں کر پاتے۔ ہندی کے لوک گیت اُردو شاعری سے بسا اوقات زیادہ دلکش معلوم ہوتے ہیں شاید اس لئے کہ ان میں سنگیت کا عنصر غالب ہوتا ہے۔

اُنہیں دنوں میرے بے سروسامان مکان میں پنڈت جواہر لال نہرو مہمان ہوئے اُنہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھ لیا کہ میں سخت مالی پریشانیوں میں گرفتار ہوں۔ انہوں نے فوراً مجھ سے کہا کہ تم الہ آباد آکر آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں انڈر سیکریٹری کی حیثیت سے دفتر سنبھال لو۔ مولانا محمد علی کانگرس کے صدر تھے امتحاناً مجھ سے کہا گیا کہ اُن کی دو گھنٹے کی اُردو تقریر کی انگریزی رپورٹ اخباروں کے لئے تیار کردوں میری رپورٹ کی صداقت اور اختصار سے مولانا بہت خوش ہوئے۔ پھر بھی میری رپورٹ تقریباً دو ہزار الفاظ پر مشتمل تھی مولانا نے میرے تقرر کی حامی بھرلی اور مجھے ڈھائی سو روپیہ ماہانہ تنخواہ پر ملازمت مل گئی۔ میں اس عہدہ پر چار برس تک قائم رہا۔ اس دوران میں نے شعر زیادہ نہیں کہے۔ اچھی کتابوں کے مطالعہ میں وقت صرف کرتا تھا۔ ایک کتاب جس نے مجھے بہت متاثر کیا اور جس کا گہرا اثر پچاس برس گزر جانے کے بعد اب بھی ہے وہ تھی

Prince Kropotkin's Mutual Aid

اس کتاب نے زندگی اور انسانیت سے متعلق مرکزی ایمان عطا کیا۔ اُردو کے کچھ مضامین بھی میں نے اسی زمانے میں لکھے جو مشہور رسائل میں شائع ہوئے دفتر میں کام زیادہ نہیں تھا جسے میں گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں پورا کرلیا کرتا تھا۔ باقی وقت لکھنے پڑھنے میں ہی کاٹ دیتا تھا۔ اس زمانہ میں جو اشعار میں نے کہے، اُن میں کئی شعر بہت مقبول ہوئے۔ روا روی میں دو شعر یاد آرہے ہیں۔

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
خیر تم نے تو بے وفائی کی

غرضکہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں، یا تجھے بھلانے میں

کچھ اور بتانے سے پہلے مؤدبانہ یہ گزارش کردینا چاہتا ہوں کہ میری ادبی صلاحیتیں ہشت پہلو رہی ہیں۔ تقریباً ایک ہزار صفحات پر تین جلدوں میرے انگریزی کے مضامین پھیلے ہوئے ہیں۔ قریب قریب اتنی ہی ہندی کی ضخامت ہوگی اور اتنی ہی میری اُردو نثر بھی ہوگی۔ شاعری کے علاوہ میں نے ہندی میں کچھ کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ جو الہ آباد یونی ورسٹی کے بی اے ہندی کورس میں شامل ہوگئی تھیں۔ ایک انگریزی کہانی کو میں نے اُردو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا۔ انگریزی کے کئی مضامین کے ہندی ترجمے شائع کئے۔ ہندوستانی اقتصادیات پر اُردو میں ایک طویل مضمون لکھا۔ ہندی میں مابعد الطبعاتی مضمون اس موضوع پر لکھا کہ 'ترقی کیا ہے'۔ جمالیات پر انگریزی ایک چھوٹی سی کتاب لکھنے کا ارادہ تھا۔ جسے میں پورا نہ کرسکا۔ اس شالی

کو مرکزی موضوع بنا کر ایک ناول لکھنا شروع کیا تھا لیکن اس کام کو بھی آگے نہ بڑھا سکا۔ ٹیگور کی تحریروں اور تقریروں کی رپورٹیں خاص طور پر مجھے اس زمانہ میں متاثر کرتی ہیں۔ گیتانجلی میرے لئے نہایت موثر و دلکش تصنیف تھی جس کا تیس برس بعد میں نے اُردو میں ترجمہ کیا اور ساہتیہ اکیڈیمی کے لئے ٹیگور کی ۱۰۱ نظموں کا اُردو ترجمہ کیا جو ساڑھے چار ہزار مصرعوں پر محیط ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ بسا اوقات ٹیگور کی نظمیں، خاص کر قدرے طویل نظمیں اپنی چستی کھو بیٹھتی ہیں۔

کانگرس کا دفتر ۱۹۲۷ء میں مدراس میں منتقل ہوا، اسی زمانہ میں پنڈت جواہر لال نہرو عالمی سیاست سے اپنی واقفیت کو مکمل کرنے کے لئے یورپ چلے گئے، جہاں سے انہوں نے متعدد خطوط مجھے روانہ کئے۔ کاش میں ان خطوں کو ضائع نہ کرتا! پنڈت موتی لال نہرو نے مجھے مشورہ دیا کہ مدراس نہ جاؤ اور میور کالج میں اپنے قدیم، مربی و مہربان اعلیٰ پروفیسروں نے مجھے ایف اے کے درجے پڑھانے کے لئے لکھنو کرسچین کالج میں لازم رکھا دیا، حالانکہ ابھی میں بی اے پاس تھا۔ لکھنو سے سناتن دھرم کالج کان پور میں انگریزی اور اُردو پڑھانے کے لئے بلا لیا گیا۔ یہیں سے میں نے انگریزی میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ اور میں پہلا امیدوار تھا، جسے آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن ملا میں فوراً الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کا لکچرر مقرر ہو گیا اور تیس برس انگریزی ادب تعلیم دے کر ۱۹۵۸ء میں ریٹائر ہوا۔

یونیورسٹی میں ۲۸ برس کا زمانہ میری شعر گوئی کی پوری نشو و نما کا زمانہ ہے۔ ۱۹۳۶ء میں مولانا نیاز فتح پوری مرحوم نے "نگار" میں مجھ پر سیر حاصل تنقیدی مضمون لکھا جس نے ہندوستان بھر کے ادبی حلقوں کی میری طرف متوجہ کر دیا اس عرصہ میں تقریباً سات سو رباعیاں میں نے تصنیف کیں جن میں "روپ" کی رباعیاں بھی شامل ہیں۔ علاوہ غزلوں کے میں نے جو اُردو نظمیں اس دوران میں کہیں، ان میں چار پانچ ہزار اشعار ہوں گے۔ غزلیں قریب چار سو کے اس عرصہ میں میں نے کہیں۔ بہت سے لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ اکثر میری غزلیں بہت طویل ہو جاتی ہیں۔ میں طویل غزلیں قادر الکلامی، مشاقی اور اُستادی دکھانے کے لئے نہیں کہتا بلکہ جس موڈ میں کوئی غزل شروع ہوتی ہے اسی موڈ کی مختلف جھلکیاں میرے سامنے آتی جاتی ہیں۔ اور جب تک یہ جھلکیاں نظر آتی جاتی ہیں، اشعار ہوتے جاتے ہیں۔ میں اس حقیقت کا بھی قائل ہوں کہ غزل کو مختصر ہی ہونا چاہئے۔ اس امر پر گفتگو کرتے ہوئے ایک بار میرے دوست مجنوں نے کہا تھا کہ تم نظم گو پیدا ہوئے تھے۔ طبیعت کے انتشار کی بدولت غزل گو ہو بیٹھے۔ اس بنا پر تمہاری غزلیں طویل ہو جاتی ہیں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ غزل کہتے وقت میں برتھ کنٹرول کو عمل میں نہیں لا سکا ہوں۔

یونی ورسٹی کی طویل ملازمت سے متعلق کچھ باتیں نہایت اختصار سے آگے بتاؤں گا۔ پروفیسر کی زندگی شروع ہونے سے سات آٹھ برس پہلے کے دو واقعات یادداشت میں عود کر آئے۔ ایک بار مجنوں اور پریم چند میرے گاؤں میں ساتھ ساتھ میرے گھر میں مقیم تھے۔ ایک افسانے کا پلاٹ میرے ذہن میں آیا جسے میں نے ان دونوں دوستوں کو سنا دیا۔ کچھ دنوں بعد کہانی کی شکل میں مجنوں کے نام سے "گہنا" کے عنوان سے اُردو میں میرا یہ پلاٹ شائع ہوا۔ ساتھ ہی پریم چند کے نام سے یہی کہانی "आभूषण" کے نام سے شائع ہوئی۔ بہت سے لوگوں نے حیرت ظاہر کی کہ حقیقتاً یہ پلاٹ مجنوں کا ہے یا پریم چند کا۔ مجنوں نے پریس میں اعلان کر کے سب کی تشفی کر دی کہ پلاٹ نہ اُن کا ہے نہ پریم چند کا بلکہ دونوں کے دوست رگھوپتی سہائے فراق کا ہے۔ کیا میں اس امر پر فخر کر سکتا ہوں کہ دو چوٹی کے کہانی کاروں نے قریب قریب لفظ بہ لفظ میرے بتائے ہوئے پلاٹ کو اپنا لیا؟ دوسرا واقعہ ان دنوں کا ہے جب میں کانگرس کا ایک کارکن تھا۔ گورکھپور سے ہم کئی لوگ گورکھپور ضلع میں واقع کانگرس کے کام سے گولا بازار میں جا کر ایک بڑے دھرم شالے میں ٹھہرے۔ گولا بازار مہاجنوں کی ایک بہت بڑی منڈی ہے۔ دھرم شالہ میں ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ اس کے تہ خانے میں ایک بابا جی آ کر ٹھہرے ہیں وہ پچیس برس سے مون دھارن کئے ہیں۔ ہم سب کو اشتیاق پیدا ہوا اور ہم لوگ تہ خانے میں بابا جی کو دیکھنے گئے، جو سوالات تو زبانی سن لیتے تھے اور جواب ایک سلیٹ پر کھڑیا سے لکھ دیتے تھے۔ گاندھی جی کا نعرہ "ایک سال کے اندر سوراج" ابھی ہم لوگوں کے ذہنوں پر مسلط تھا لیکن اس کی تکمیل میں کچھ دیر ہو رہی تھی۔ ہمارے اس سوال کا کہ ہندوستان کب تک آزاد ہوگا، بابا جی نے یہ جواب لکھا "ابھی بیس برس بعد!" اس وقت ہم سب کو کچھ مایوسی سی ہوئی۔ لیکن بیس تو نہیں تیئس چوبیس برس بعد ۱۹۴۷ء میں ہندوستان

آج کل نئی دہلی

آزاد ہوا۔

یونی ورسٹی کے زمانے میں میں نے کم وبیش گہرے طور پر جن کتابوں کا مطالعہ کیا اُن میں چند کے نام لگے ہاتھوں بتا دیتا ہوں۔

Bergson's Creative Evolution

Benjamin Kidd's Social Evolution

Principles of Western Civilization

Edward Carpenter's Civilization, its cause and cure

My Days Dream اور انیسویں صدی

میں لکھے ہوئے مشہور ترین انگریزی ڈرامے Hamingway's Farewell to Armies مشہور فرانسیسی ناول کا انگریزی ترجمہ All Quiet on the Western Front آنند کار سوامی کی شہرہ آفاق انگریزی تصانیف Chesterton, H.G. Wells G.B. Shaw کی تصانیف

وغیرہ بنے کار سرکار، رادھا کمد مکرجی اور کچھ دیگر مشاہیر کی تصنیفیں۔ پوری فہرست بہت لمبی ہو جائے گی۔

مندرجہ بالا کتابیں خالص ادبی موضوعات پر نہیں تھیں اُن کے موضوعات ثقافتی اور فکریاتی تھے۔ انگریزی ادب کی بہت سی دلکش تصویریں نظر سے گزرتی رہیں۔ انگریزی شاعری ۳۰۔۴۰ ہزار صفحات تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس دشت کی سیاحی کون کرتا۔ اس لئے انگریزی کے نثری اور شعری ادب سے کافی واقفیت حاصل کرنے کے لئے میں نے چار سلسلہ کتب کا سہارا لیا کیولر کوچ کی The Oxford Book of English Verse

The Oxford Book of English Prose

اور Word's English Poets اور کریک

کی مرتب کردہ پانچ ضخیم جلدوں میں Prose Selections ۔ یہ سب تو ایک جھلک ہے ان کتابوں کی، جن کا خائر مطالعہ میں پروفیسری کے دوران میں کرتا رہا۔ انگریزی ادب کی تعلیم دینے میں میری یہ کوشش رہی کہ کلاس کو انگریزی ادیبوں کے وہ محسوسات اور وجدانی کیفیات محسوس کرا دوں، جن کی حامل ان کی تخلیقات تھیں اس کے لئے ایک غیر زبان (انگریزی) میں مجھے غیر معمولی کاوش کرنا پڑتی تھی۔ میرا اصول اور عقیدہ تھا کہ معلم کا سب سے اہم فرض طالب علموں کو کچھ رسمی اور اوپری باتیں بتا دینا یا یاد کرا دینا نہیں ہے۔ بلکہ اُن کے ذہن میں اسباق میں جو داخلی تجربات ہیں، انھیں اتار دینا ہے۔ میں نے اس عمل کا نام انگریزی میں Felt Teaching رکھا۔ میں نے یونی ورسٹی میں یہ دیکھا کہ تھوڑے ہی معلم اپنے کلاسوں کو سوچنے اور محسوس کرنے کی دولت دے پاتے ہیں۔ میں نے ایک بات اور یونی ورسٹی میں دیکھی کہ ٹیچروں میں باہم بیگانگی اور بے تعلقی رہتی تھی۔ ہر ایک ٹیچر اپنا موضوع بُرے بھلے ڈھنگ سے کلاس کو پڑھا دیتا تھا۔ علوم کے باہمی ربط و تعلق کا اندازہ نہ ٹیچر کو ہوتا تھا نہ کلاس کو۔ یونی ورسٹی کی تعلیم ایک پوری کڑی بن ہی نہیں پاتی تھی۔ ٹیچر جب آپس میں ملتے یا کہیں آ بیٹھتے تو مختلف مضامین کے ٹیچر ہوتے ہوئے آپس میں کسی علمی موضوع پر گفتگو کر ہی نہ پاتے۔ یہ خطرناک بے نیازی طلبہ کے سروں میں بھی سمائی ہوئی تھی۔ تمام علوم کی آفاقیت اور ہم آہنگی کے احساس کی پرچھائیں بھی نہ ٹیچروں کے دل و دماغ پر پڑتی تھی نہ طلبہ کے۔ دُنیا کے کلچر اور ہندوستان کے کلچر پر ٹیچروں میں پانچ منٹ تک گفتگو ناممکن تھی اور ہے۔ بہت کم ٹیچروں کو میں نے طالب علموں کے لئے ہمدرد پایا۔ بہت کم ٹیچروں کو میں نے اس امر کا متمنی دیکھا کہ طالب علم اندر سے کچھ بن جائیں یا ہو جائیں یونی ورسٹی کی تعلیم بڑی حد تک دفتروں کا رسمی روزانہ کاروبار بن کر رہ گئی تھی بہت کم ٹیچر ایسے تھے جن کے گھروں پر طلبہ کے گروہ جا کر کچھ حاصل کر سکیں اُردو شاعری میں میری دلچسپی اور میری تخلیقات کی وجہ سے بہت سے پروفیسر مجھے ایک عجیب و غریب آدمی سمجھنے لگے تھے۔ مادری زبان کے ادب سے اور ہندوستانی فکریات سے قریب قریب ہر ایک ٹیچر ناواقف تھا بے خبر تھا۔ بیگانہ تھا۔ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین بھی کچھ دنوں تک کبھی کبھی علمی مشاغل میں دلچسپی کا ثبوت دیتی رہی بلکہ بعد کو وہ اتنی خطرناک ہو گئی جس کا علم ہندوستان بھر کو ہے۔ یہ دیکھ دیکھ کر میرا دل خون ہوتا رہتا تھا کہ کانوکیشن کے زمانے میں تقریباً ہر ڈگری لینے والے کے چہرے پر اس فکر و تشویش کی مہر لگی ہوتی تھی کہ ڈگری تو پا گئے، ملازمت کہاں ملے گی اور رکھائیں گے کیا؟ اور کانوکیشن پر کیا موقوف ہر سال یونیورسٹی

کے ہزاروں طلبہ کے چہرے اس بات کی خاموش گواہی دیتے تھے کہ امتحان کے لئے پڑھ تو ضرور رہے ہیں لیکن امتحان پاس ہونے کے بعد کیا ہوگا ان محسوسات نے یعنی نوعمر طلبہ کے مرجھائے چہروں نے مجھ سے دو شعر لکھوائے۔

ریاضِ دہر میں جھوٹی ہنسی بھی ہم نے دیکھی ہے
گلستاں در بغل ہر غنچہ خنداں نہیں ہوتا

دوسرا شعر یوں ہے

ریاضِ ہند کے نوگل بکس جاتے ہیں کھلتے ہی
یہ ہاتھوں میں کبھی آئینہ شبنم نہیں لیتے

ہائے ہائے کرتی ہوئی صورتیں دیکھئے آج کے ہندوستان میں کیا قیامتیں ڈھا رہی ہیں۔

میں نے کچھ اہم کتابوں کے اپنے زیرِ مطالعہ رہنے کا ذکر پہلے کیا ہے۔ ایک اہم کتاب جس کا اثر میرے دل و دماغ پر بہت دور رس رہا۔

John Stuart Mill's Autobiography

میں مطالعہ میں اپنا زیادہ وقت نہیں لگاتا تھا اور میری زندگی میں کوئی روزانہ مطالعے کے لئے معین نہیں تھا میں جتنا پڑھتا تھا اس سے زیادہ اور کئی بار زیادہ سوچتا تھا۔ اپنے خیالات اور اپنے دماغ کی سیت کو مرتب کرتا رہتا تھا۔

لیکن کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ میں محض ادق اور سنجیدہ ادب کا مطالعہ کیا کرتا کا پھلکا ادب بھی بشرطیکہ وہ کسی قابل ہو، میرے لئے ایک کشش رکھتا تھا۔

P.G. Wood-Ho کے بہت سے ناول اور کہانیوں کے مجموعے میں سے آخیر تک بڑی تعداد میں پڑھ گیا تھا انگلستان کے جاسوسی افسانے سکڑوں دیں پڑھ گیا تھا اور اب بھی اس طرح کا اچھا ادب پڑھے بغیر جی نہیں مانتا۔

یونیورسٹی میں ملازمت کے دوران اور جب سے ریٹائر ہوا ہوں تب سے میں علاوہ اور اہم موضوعات کے شاعری پر اور شاعری کی اصل ماہیت پر پڑھتا اور سوچتا رہا ہوں جن نتائج پر میں پہونچا ہوں ان میں سے چند

۱۔ فصاحت، بلاغت، مضمون آفرینی، غزلیت اور دیگر مانی جانی صنعتوں میرے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت تاثیر کو ہے اور سوز و گداز کو۔ دھوکا ہو سکتا ہے۔ تاثیر شاعر کی ذاتی و انفرادی غم و خوشی، محرومی و کامیابی بالخصوص و محدود اثر ڈالنے والے موضوعات و واقعات کو اچھے شعر کے سانچے میں ڈھال دینے سے بھی پیدا ہوتی ہے اور یہ تاثیر کبھی کبھی بہت گہری ہوتی ہے لیکن میرے نزدیک وہ پُرتاثیر اشعار زیادہ اہم ہے ہیں، جن میں کہنے کو تو موضوع مخصوص ہو لیکن جو ہمیں ایسا آفاقی احساس، کبھی کرائیں، حیات و کائنات کا ایسا تجربہ دیں جو محدود واقعوں کی اثر انگیزی سے بلند ہوں مشہور رومانی ناٹک کار سفوکلیز سے متعلق آرنلڈ نے The Higher Seriousness کا فقرہ اخذ کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ بلند تر سنجیدگی۔ نہ تو بلند آہنگی سے پیدا ہوتی ہے اور نہ محض جلوہ و پردہ کی آنکھ مچولی سے اس سنجیدگی کا ایک غلط استعمال کسی مذہب و ملت کے مقاصد کو بیان کرنا بھی ہے اس سنجیدگی کی میرے نزدیک بہترین مثالیں سنسکرت ادب کے اس حصے میں مل جاتی ہیں، جنہیں اُپ نشد کہا جاتا ہے۔ میری شاعری کے پختہ ہونے سے پہلے اُپ نشدوں کے اثر سے ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ شروع ہو چکی تھی اور میری شاعری کے بلوغ کے زمانے میں وہ آگے بڑھ رہی تھی۔

۲۔ اگر ہم اُپ نشدوں کی تعلیم سے دُنیا کے تصوف کی مماثلت پر زور دیں تو ایک اہم فرق نظر انداز ہو جاتا ہے، وہ ہے ہندوستان کے روحانی کلچر میں مادی کائنات کی الوہیت کا احساس۔ اس لئے میں نے اپنی نیچرل شاعری میں محض مناظرِ قدرت کی خارجی تصویر کشی کو کافی نہیں سمجھا اسی طرح ہم کو فارسی اور اردو شاعری میں عورت کی دیویت اور بچوں کی الوہیت کے احساس کا فقدان نظر آیا۔ رُوپ کی رباعیاں، جگو، ہنڈولہ، میری طویل تخلیقیں ہیں اور میری نظم آدھی رات، دوسری نظم پرچھائیاں، تیسری نظم کارتکی پورنما اردو شاعری کی اس کمی کو، جس کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے۔ پورا کرنے کی کوششیں ہیں۔ ہندوستانی کلچر یا بلند ہندو کلچر نہ کوئی قومی چیز ہے، نہ ملی چیز ہے، نہ سیاسی چیز ہے اور نہ وہ کوئی سطحی چیز ہے۔ وہ ایک آفاقی چیز ہے، جس میں کسی عقیدہ، کسی مذہبی رسم و رواج کو دخل نہیں ہے۔

۳۔ ہندوستان کے مزاج کی وہ گہری تہیں، جنہیں بھوڑ کر ہندوستان کا کلچر نکلا ہے، اس کا کچھ اندازہ میں اپنی شاعری سے اپنے ہم وطنوں کو کرا سکوں اور اُن کے وجدان میں ہندوستان کے لئے ایک ایسا شعور پیدا کر سکوں، جو تنگ نظر قومیت یا فرقہ پرستی سے آزاد ہو۔ یہی کوششیں میری

شاعری کی محرکات رہی ہیں۔

۴۔ شاعری کی زبان کے متعلق کئی مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بہت سے اشعار کی زبان اچھی ہوتے ہوئے بھی اکثر کتابی ہوتی ہے۔ اور ہمارے وجدان کی اوپری سطحوں کو ہی چھو پاتی ہے۔ لغت کی زبان کو زندگی کی زبان بنانا، اسے ایک رچا ہوا ٹھیٹھ پن عطا کرنا، اس سے وہ غنائی عناصر پیدا کرنا کہ خاص و عام گہرے



فراق لال قلعہ کے مشاعرہ جشن جمہوریت میں اپنا کلام سنا رہے ہیں

اور دیرپا طور پر متاثر ہوں، بڑا مشکل کام ہے۔ میری کوشش یہی رہی ہے کہ میں ایسا کر سکوں۔

اس مختصر سے مضمون میں بس اتنا ہی کہہ کر رخصت ہوتا ہوں! یہ پورا مضمون برجستہ بول کر لکھوایا ہے ممکن ہے کہ کہیں کوئی فروگزاشت رہ گئی ہو جس کی معذرت چاہتا ہوں۔


ہندوستان کی مسجدیں

بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پیارا باغ، پرانی دہلی ۱۱۰۰۰۶


حرمت الاکرام

# زمانہ

جلاتا دیئے وقت کی محفلوں میں
جبینوں پہ رُستا سماتا دلوں میں
جگاتا نئی دھڑکنیں قافلوں میں
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے

گزشتہ کو خوابِ فراموش کرتا
ہر امروز کو شاملِ دوش کرتا
فسوں زارِ دوراں کو گلپوش کرتا
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے

بسیرا تغیر کی باہوں میں لیتا
تلون کی امواج پر ناؤ کھیتا
اک اک پل پہ فردا کو آواز دیتا
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے

قدم ماہ و خاور کے زینوں پہ دھرتا
حوادث کی گہرائیوں میں اُترتا
مہ و سال کی ندیاں پار کرتا
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے

اُلجھتا حقائق کے مہر و غضب سے
اُبھرتا بہار و خزاں کے عتب سے
نکلتا ہوا حلقۂ روز و شب سے
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے

روایات کے ذہن و پیکر،
جہاں دار قدروں کے تیور،
مسائل کے اصنام و آذر بہ
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے

بتاتا کہ مڑتی ہے تاریخ کی
یہ کہتا کہ اونچی ہوئی مشعل کی
فضا تا خلا ڈالتا اپنا پر
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے

سناتا کسی کو کہن کا فسا
بناتا کسی سو ہنی کو نشا
سجھائے ہوئے درد کا تا
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے

کسی ساز سے کھیلتا راگ
بھڑکتا اسی انداز سے آگ
کوئی چوٹ کھایا ہوا ناگ
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے

چرائے نظر، کج ادا و بس کی
لئے برق پنہاں، گھٹاؤں کی
بگولے سمیٹے ہواؤں کی مو
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے



# پانی سے کاڑھا لہو

پریم ناتھ در

آخری شہر کی بستی سے بھی اُن بلندیوں تک کافی فاصلہ تھا۔ اس جگہ سڑک کے مغربی کنارے پر گھنا جنگل تھا اور اُسی میں کہیں ایک آرام گاہ چھپی ہوئی تھی وہاں تک چڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا کہ پھیپھڑے کی پھونکنی قدم قدم پر شہر شہر کی دھول نکال رہی ہے۔ تھک تھکا کر اُوپر آ گئے۔ ساتھ ہی شام ہو گئی۔ دم لینے کو اندر بیٹھے ہی تھے، نہ جانے کہاں سے بادل آ گئے اور برسنے لگے۔ بند کھڑکیوں کے اندر ہی ایک نئے ماحول کے گہرے احساس میں کھا پی کر سو گئے۔

صبح کو پہلی دھند کے ساتھ ایک نئی ہوا جھریوں میں سے اندر آ چکی تھی اور ایک جھونکا میری ادھ کھلی آنکھوں میں ایسے لپکا کہ جیسے اس بات کا خیال ہو کہ کہیں اسائے ہوئے پپوٹے پھر بند نہ ہو جائیں۔ جیسے ہوا کے پہلے ایک سوا جھونکے کا جادو ہونا ہو، کہ جیسے آنکھ کے ڈھیلوں کا برسوں پرانا درد چھپا ہوا درد یہیں اُبھر آیا ہو کہ جیسے ڈھیلوں کے اس درد کو پہلے ہی ٹھنڈے پھاہے سے ٹھیک ہونا ہو اور پھر اس ایک جھونکے کے آدھے ٹکور سے ہی پتلیوں کے بیچ میں سے دو آنکھوں کے تارے گھونٹ بھر بھر پینے لگے۔ بدن کے اندر اندر جتنے بھی اپنے راستے تھے، گرد سے اٹے، دبے پٹے، کھنچے تھکے، جلے تپے، راستے ہی راستے، اُوپر نیچے، دائیں بائیں، سب کے سب تر ہو گئے، سب کے سب دُھل گئے، ایک ٹھنڈے پھاہے سے، ہوا کے ایک جھونکے سے۔

کمرے سے باہر روپہلی روشنی میں دُھندلے دھندلے رنگوں کا سب بھرا پُرا خواب تھا جو لمحہ بہ لمحہ اُبھرتا گیا، ٹھوس حقیقت بنتا گیا اور میرے احساسات حیرت کی ابتدائی مشکل سے نکل کر درجہ بدرجہ اس حقیقت کو قبول کرنے لگے اور کہیں اندر رُوح سے گھلنے ملنے لگے۔

میری اونچائی کے عین مقابل، وادی کے اُس پار سر فلک ایک پہاڑ تھا۔ پہاڑ کی ایک چوٹی اُدھر تھی ایک اِدھر۔ بیچ کا گریبان سا ایسے لٹک رہا تھا۔ جیسے پورا کٹا ہوا ہلال ہو۔ ہلال اتنا بڑا کہ خود آفتاب کو گود میں لے لے۔ اسی ہلال کے بیچ میں آفتاب کی آمد کا جلوہ تھا اور اس پیش رو جلوے میں ہی ایک اَن دیکھی دُنیا کا ذرّہ ذرّہ الگ الگ ظاہر ہو رہا تھا لیکن الگ ایسا کہ ایک ذرّے کو بھی دیکھو تو تصویر کی تصویر ذہن میں آ جائے۔ لیکن اس دُنیائے دلگیر اور حسن و مرکب میں گھاس کے تنکے تنکے کا، ہوا کی ہلکی سی اٹھکیلی کا، بوند بوند کی چمک کا، ڈھکی ہوئی اُترائیوں کا ہنیوں کے جال میں سے نیلے دُودھیے آکاش کے ٹکڑوں کا ہری ہری چھتریوں میں سے روشنی کے جزیروں کا، سب کا اپنا اپنا وجود تھا، اپنی اپنی اہمیت تھی۔ ایسی کہ رنگ کی ایک بندیا کو کہیں سے اُٹھا لو، کونپل کی ایک جنبش کو روک لو، یا آواز اور خموشی کے توازن کو اپنی ایک انگڑائی سے بگاڑ دو، اُسی وقت جیسے ایک سنگیت رُک جائے، جیسے کئی تار ٹوٹ جائیں۔

ادھر اپنے پہاڑ کے موٹے پیٹ سے، جنگل کے قدموں پر نہ جانے کن لازوال ذخیروں سے، کن برفیلے پاتالوں سے چھوٹ چھوٹ کر، اور کن نیلے آکاشوں سے چھن چھن کر وہی پانی چھوٹ چھوٹ کر نکل رہا تھا جس

کی پیاس لے کر ہم صحراؤں کی خاک پھانکتے ہوئے آئے تھے۔ قدرت کی اس اندھی سبھا میں آبِ حیات کا یہ متحرک گوشہ بھی تصویر کے مناسب نقطے پر تھا اور پھولے پھولے سبزے میں نیلے سفید کی کناریاں کاڑھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ تصویر کی اُترتی ہوئی لمبائی میں۔ اپنا ایک ساز بجاتا ہوا، اپنا ایک سُر لاپتا ہوا، سُر جو ساری لمبائی چوڑائی میں پھیلا ہوا ہمہ گیر خاموشی میں جان ڈالتا تھا۔ سُر جو اس رُوح خیز خاموشی کا ہی اہم ترین حصہ تھا۔

ہلال کے مرکز میں اب سفید شعلوں کا چشمہ سا بن گیا اور میں نے گردن موڑ کر دیکھا کہ اپنے پہاڑ کی چوٹی پر چیڑ کے اَن گنت درختوں کا جو بھاری چھتر تھا وہ سنہری ہو چکا تھا۔ یہ چھتر، یہاں وہاں، کس مالی نے اُسے تراشا تھا۔ یہ چیڑ ڈھلانوں سے اُٹھ کر آسمان کو چھوتے ہوئے کسی ایک میں کہیں خم نہیں۔ ٹیڑھی مٹی سے نکل کر سیدھی کر کے موٹے ان ڈھلانوں کی پھسلن پر یہ کندھے سے کندھا کیسے ملاتے ہیں، کہیں دستوں کے دستے پہاڑ چڑھتے دکھائی دیتے ہیں، کہیں سنہ کھلی کھائیوں میں رنگ بھرتے ہیں، کہیں تیکھے کناروں کو نرم کرتے ہیں، کہیں پچھلے جاڑوں کی برف پہاڑ کے سینے کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے۔ تو اُسی پر اپنی چادر ڈال رہے ہیں، کہیں بادل کے ٹکڑے دستہ کھول کر نیچے آ گئے ہیں، اُنہی کو گلے لگا کر سہلا رہے ہیں اور جہاں بھی ہیں دُور دُور تک بھینی بھینی خوشبو کا ایک ایسا عالم پیدا کرتے ہیں کہ ہر نئی سانس آدمی کے دماغ کو اس حد تک سُن کرتی جائے کہ آدمی آدمیت ہی کے حدود میں کھویا رہے۔

لیکن ادھر تکونی ٹھڑے پر دھوپ آ گئی ہے اور میں ایک نئے شیر گرم ماحول میں دن کے اس کنوارے منظر کا واحد مالک ہوں۔ ایک نگاہ اٹھاتا ہوں تو پہاڑ کی جنوبی دُم تک وادی کی وادی میری پکڑ میں آ جاتی ہے۔ پانی کے ستارے ہیں یا پتھر کا سُرمئی رنگ، دھان کا ہرا ہرا نملی بچھونا ہے یا سرسوں کا کھرا کھرا سونا، دور کے چیڑوں کا نیلا دُھواں ہے یا پاس کے درختوں کا گیلا گیلا رنگ۔ جہاں جی چاہے وہیں نظریں جماتا ہوں۔ یہاں سے جی بھر جائے وہاں سے پینے لگتا ہوں۔ ادھر نرم نرم پر نظریں لپٹ سی جاتی ہیں، اُدھر سخت سخت پر دوڑ سی لگاتی ہیں۔ ایک آن میں ساٹھ فٹ اونچے چیڑ پر جا بیٹھتی ہیں۔ دُوسری آن میں بہت نیچے اُتر کر چشمے میں ڈبکی لگاتی ہیں — اور اگر ادھر دیکھوں شمال کی طرف۔ درختوں نے نظر کے راستے روک لئے ہیں۔ لیکن یہی بات اچھی ہے کہ جنگل کی چھپی ڈھکی گلیوں میں آنکھ مچولی کھیل لیتی ہیں۔ وہ رہی متنطیل ایک

رنگ کے پانی کی، پانی کہاں یہ تو راکھ اور رنگ کے جنگلی پھول ہیں جو ایک متنطیل میں بکھر رہے ہیں۔ وہ رہی بل کھاتی ہوئی سڑک افق کے پاس، سڑک کہاں؟ یہ تو وہی اپنا پانی ہے جو وہاں تک پہونچ گیا ہے۔

سوچ رہا ہوں کہ اس دھرتی پر یہ بھی ہے ایسا گوشہ بھی جہاں انسان کی ہر بے چینی کو نیند آ جائے۔ جہاں زندگی پکارے تو جواب مل جائے۔ لیکن یہ گوشہ کتنی دُور رہے۔ زندہ انسان کی بستی سے۔ شاید حقیقت یہی ہے لیکن حقیقت تک فاصلے کیوں ہیں۔ فاصلے؟ منزل کی یہی طاقت ہے۔ طاقت ہاں حُسن طاقت ہے۔

میرے سر پر دھوپ آ چکی ہے۔ یہ دھوپ ہوا کی خنکی کو مغلوب کر چکی ہے۔ چیڑ کا مخروطی سایہ اور چھوٹا ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سامنے پہاڑ کے تیور کس گئے ہیں، کہ بیچ میں چیڑوں کی جو میٹھی میٹھی لکیر تھی، وہی لمبی نوکدار اور بٹی ہوئی مونچھ سی بن گئی ہے — یہ پہاڑ — کون چڑھے اس پر؟ چڑھ تو برسوں کی تربیت پا کر، بچاؤ کے پورے سامان کے ساتھ، آزمائی ہوئی ترکیبوں سے، اور پھر بھی ایک ایسی پتلی، ٹیڑھی، بھٹکتی، لڑکھڑاتی لکیر بنا کہ پہاڑ کے اتنے بڑے پھیلاؤ پر اگر ایک جلتی لکڑی کا دھواں بھی کہیں سے اُٹھ ہو، پہاڑ پر دھوئیں کی وہ اُودی لکیر تو دکھائی دے لیکن چار چڑھتے ہوئے انسانوں کی مخنی قطار نہیں دکھائی دے گی۔ پہاڑ ایک ملک گیر وسعت ہی نہیں بلکہ ایک ایسا وزن ہے جو تخیلات پر بھی بھاری ہو جائے۔ انسان اس کے دامن صدیوں تک کترتا رہے، پہاڑ کو کھلی جتنا احساس نہ ہو جائے —

یہ پانی ایک بہتا ہوا راگ ہی نہیں، کہ چھینٹ بھر ہونٹ اُٹھا اُٹھا کر جھونے جھونکے کے ساتھ سُر ہی ملاتا جائے۔ دیکھا جائے تو اب بھی اس کے بہاؤ دھکے ہیں، حملے ہیں، بے حد اضطراب ہے، روڑے روڑے پر دھاوا ہے چٹانوں پر چڑھائی ہے، اور اس میں طاقت ایسی ہے کہ ایک طغیانی نظام عالم کو توڑ دے۔ اور ہوا کے یہ معصوم سے جھونکے جو صبح صبح مرہم گھوم رہے تھے۔ .....

یکایک میرے دماغ میں بات آ گئی کہ آرام گاہ کی کھڑکیاں خوب طرح بند ہیں اور اس کمرے کی طرف دیکھتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں خواہ مخواہ بے لگام وسعتوں میں کھویا ہوا تھا۔ اِدھر ایک نظر میں گھر لوٹ سا یہ کمرہ — درحقیقت حُسن کا گہوارہ یہی تھا۔ مطلب یہ کہ باہر جو حُسن تھا، ہ

بکھرا سا تھا، آوارہ سا تھا، زور رسا اور مغرور سا۔ وہی یہاں میرے کمرے میں آکر سٹا سٹا سا تھا، اپنا اپنا سا تھا، پیار بھرتا ہوا سا، بلائیں لیتا ہوا سا، سامنے پہاڑ تو عظیم الشان ہے، جہانگیر ہے، لیکن یہی اس چھوٹے سے گھروندے میں میری خدمت میں حاضر ہے۔ جگر کے ٹکڑے ہیں اسی کے یہ جو کٹ کٹا کے، گھڑ گھڑا کے قرینے سے جڑ کے میرے قدموں کے لئے زینے بن گئے ہیں۔ میرے کمرے کو استواری کے ساتھ اپنے سر پر بٹھائے ہوئے ہیں اور وہاں دھوپ کی آگ ہے یا بجلی کی کڑک، وہ ہی میرے کمرے کی روشنی ہے۔ اُدھر دوڑتا دہاڑتا پانی پہاڑوں کو چیرتا نکل آئے۔ بڑے بڑے چٹانوں کو بہا تا لائے، جھاگ بھرے منہ سے آسمان سر پر اٹھاتا جائے یہاں میرے کمرے میں رہی نلکیوں میں خم کھاتا، موڑ موڑ پر سجدے کرتا، چپ چاپ چلا آتا ہے اور میں جہاں چاہوں، جتنا چاہوں، جس وقت بھی چاہوں اسی کی مٹھاس سے اپنی پیاس بجھاتا ہوں۔ واقعی قدرت حسین ہے تو یہاں ہے میرے اپنے کمرے میں، جہاں دھوپ کے سات رنگ تو ہیں لیکن اس کی تپش نہیں، جہاں پانی میں ٹھنڈک ہی ٹھنڈک ہے اور زور بالکل نہیں اور ہوا جو اندر ہے اس میں مرہم ہی مرہم ہے۔ آندھی نہیں ہے ــــ

تو پھر اس حسن کی قوت کہاں گئی؟ قوت؟ ہے تو ہمارے بازوئے توانا میں، ہماری اپنی ترکیبوں میں جنگل کا یہ درخت بہت اونچا تو چلا گیا ہے۔ لیکن میرا جی چاہے تو چار چوٹیں اِدھر اور رسی کا ایک پھندا اُدھر۔ تھرتھراتا کانپتا ہوا۔ آسمان کی ٹھنڈی گود میں سے اپنے سر کو کھینچ نکالے گا۔ اور زمین کی لمبائی ناپتا ہوا میرے قدموں میں دھڑام سے آگرے گا ــــ پھر کھڑا تھا تو مجھے ڈھکا ڈھکایا اچھا لگتا تھا۔ اس کی چھال میں بھی ایک کشش تھی لیکن اب تو میرے قدموں میں پڑا ہوا ہے، میرے اشاروں کا منتظر ہے۔ اس کی یہ چھال کتنی بے معنی لگتی ہے۔ چھال ہے تو اس میں سیدھی آری چلے یا کوئی کیل ٹھک جائے۔ ــــ میرا پلنگ ــــ ہاں یہ بھی کبھی ڈھکا ڈھکایا جنگل کا باسی تھا۔

پھر یہ فاصلے ــــ ؟ کس نے کہا یہ قوت ہے؟ پہاڑ ــــ ؟ کس نے کہا یہ دیوار ہے ــــ ؟ ہم چاہیں تو اُن بنی ہوئی موچھوں کے بیچوں بیچ ایک کالی سُرنگ ایسی نکالیں کہ پہاڑ کا چہرہ تو چہرہ اس کے اندر خانوں کی قلعی کھل جائے۔ نہیں تو اوپر اوپر ہی اس کی ہریالیوں میں ہم مٹیالی راہیں کھو دیں گے، اس کی چوٹیوں پر بھاپ پھینکتے ہوئے جہاز اُڑائیں گے اور اس سوئی ہوئی وادی کو ہلا دیں گے، جگا دیں گے۔ اور یہیں انہی ہواؤں پانیوں میں اپنا شہر بسائیں گے۔ بازار سجائیں گے۔ جہاں ہوٹل جگمگائیں گے اور ایک شور اُٹھے گا انسان کی قوتِ تعمیر کا جو صورتِ عالم بدل دے۔ انسان کی محدود خواہش کا جو آسمانوں سے آگے جائے۔ اور جب خیال سے خیال ٹکرائے گا، فلسفے سے فلسفہ، ادارے سے ادارہ، ایک نئے نظام سے دوسرا، جب مناظرے ہوں گے، مقابلے ہوں گے، الگ الگ رنگ لہرائیں گے۔ ان پہاڑوں پر وسعت کا گھمنڈ رہے گا نہ وزن کا۔ اس حسن تک فاصلے رہیں گے۔ نہ فاصلوں کی قوت ــ اور یہ پانی ــــ

ہاں یہ وادی آخر اتنی بے جان نہیں ہے! اس وقت بھی، ہاں، وہ، چشمے کے کنارے پر چشمے کے پانی سے، ایک عورت اپنے برتن مانجھ رہی ہے۔ مُونہہ۔ ایسا لگتا تھا۔ پانی کی چمک برتن کے سائے کو بھی نہیں سہے گی۔ لو۔ جل کر لوں کی نازک سلوٹوں پر، بھاری، بھاری، موٹے موٹے، دائرے پھیل گئے اور وہ رہی دوسری عورت، وہ تو کپڑے دھونے لگی ہے۔ اس طرف تو صابن کی پھولی پھولی جھاگ تیرنے لگی ہے، جھاگ کے نیچے وہ چم چم کرتے ہوئے ہیروں کے نخرے کہاں ــــ ؟ ایک عورت کے ایک کپڑے سے اتنی ساری وہ جھاگ بھی نکل رہی ہے اور جھاگ کے نیچے پانی کی ایک پھیلی پھیلی مونگیائی لکیر بھی مزے مزے چل رہی ہے۔

بہرحال چشمے کا پانی اچھا ہے۔ کہتے ہیں یہاں آکر بھوک بڑھ جاتی ہے کہتے ہیں کہ یہاں کے مرغے بڑے لذیذ ہوتے ہیں۔ خود اس جگہ کا نام مرغا ہے۔ مجھے کل شام آتے ہی اتنی بھوک لگی تھی کہ صبح کے ناشتے کی فکر ہوئی تھی چوکیدار نے کہا تھا کہ تین دکانوں پر شتل بازار میں مرغیاں ہی مرغیاں ہیں اور سب مرغیوں میں ایک ہی مُرغا۔ مجھے مرغیوں سے نفرت ہے۔ میں نے کہا تھا جس دام مُرغا ملے، اُٹھا لاؤ ــــ

ہیں ــــ ؟ وہی تو ہے۔ چوکیدار ــــ نیچے ــــ چشمے پر ــــ مُرغا ہاں مُرغا ذبح ہو رہا ہے ــــ یہ بات؟ کیا جاندار مرغا ہے۔ کیا تاج دار مرغا ہے۔ لہو کی لکیر اتنی گاڑھی ہے کہ دُور تک پانی کی پیٹھ پر سوار ہے۔!

زمیں سارن کی نازاں کیوں نہ ہو اپنے مقدر پر ؛ کہ تجھ سا پیکرِ ایثار اس کی خاک سے اٹھا
نچھاور کر دیا سب کچھ وطن کی راہ میں جس نے ؛ اک ایسا غازیِ کردار اس کی خاک سے اٹھا

---

میں اکثر سوچتا ہوں وہ گھڑی کتنی مقدس تھی ؛ لیا تھا کشورِ ہندوستاں میں جنم جب تو نے
تو اس انداز کا اک پھول تھا اپنے گلستاں میں ؛ کہ سارے دیس کو مہکا دیا تھا تری خوشبو نے

---

میں اکثر سوچتا ہوں کیا کوئی ایسا بھی لمحہ تھا ؛ تری اسّی برس کی جہد پرور زندگانی میں
کسی نے دردِ ملک و قوم سے بیگانہ پایا ہو ؛ تجھے تیرے لڑکپن میں، ضعیفی میں، جوانی میں

---

لگا ہوں میں مری ہے آج اک سیلاب کا منظر ؛ قیامت ڈھا رہی ہے ہر طرف گنگا کی طغیانی
ہیں زیرِ آب دونوں بردواں بھی اور پٹنہ بھی ؛ نہیں محشر سے کم گنگا کی یہ طوفاں سامانی!

---

تجھے آفت رسیدوں کے لئے میں وقف پاتا ہوں ؛ سہارا بے کسوں کا بن کے تو میداں میں آتا ہے
دوا دارو سے کرتا ہے کسی بیمار کی خدمت ؛ کسی مظلوم کی تو پیار سے ڈھارس بندھاتا ہے

---

دوا، سامانِ خورد و نوش، کپڑے ہاتھ میں لیکر ؛ تجھے خدمت کی منزل ہی کا جویا دیکھتا ہوں میں
غریبوں، بے نواؤں کی مدد کے بعد راتوں کو ؛ زمیں کے فرش ہی پہ تجھ کو سویا دیکھتا ہوں میں

---

وہ سارے ملک کی ہو یا فقط تحریکِ چمپارن ؛ نظر آتا ہے تو مجھ کو رفیقِ خاص گاندھی کا
نہ کیوں ہر گام پر ہو کامرانی ہمنوا تیری ؛ کہ تیرے سر پہ ہے دستِ شفیقِ خاص گاندھی کا

---

جگن ناتھ آزاد

نکلتی جا رہی ہے شہر کو آتش تعصب کی ؛ مری نظروں میں ہے جلتی ہوئی ملتان کی دنیا
قیامت ہے کہ انسان خود ہی انساں کا شکاری ہو ؛ الٰہی کیا یہی ہے دھرم کی، ایمان کی دنیا!



جسے میں دیکھتا ہوں بیقرار و مضطرب ہر دم ؛ تو اجمل خان کوئے کرسوئے ملتان آتا ہے
ترے آنے سے رُکتے ہیں بھڑکتی آگ کے شعلے ؛ تو اپنے آنسوؤں سے آ کے یہ شعلے بجھاتا ہے

---

تصوّر نے تجھے اِن سب سے ٹکراتا ہوا دیکھا ؛ وہ رولٹ کے مظالم ہوں کہ ڈائر کی جفاکاری
کہانی حریت کی نامکمل رہ گئی ہوتی ؛ اگر حصّہ نہ ہوتی اس کا تیری حوصلہ داری

---

ہنسا ہے وہ یا ہے اتحادِ ہندو و مسلم ؛ تجھے دیکھا تو ان میں صورتِ رُوحِ رواں دیکھا
لافت کی چلی تحریک جب اپنی سیاست میں ؛ تو اس کا بھی تجھے اک رہنمائے کامراں دیکھا

---

الی ہو کہ چھپرہ، آسون ہو وہ کہ آرہ ہو ؛ نہ بھولیں گے کہ تو آیا تھا ظلمت میں ضیا بن کر
وفانوں کے مارے تا قیامت یاد رکھیں گے ؛ کہ طوفانوں میں تو نکلا تھا اِن کا ناخدا بن کر

---

ہو مونگیر کا بھونچال یا کوسی کی طغیانی ؛ ترا دردآشنا دل تھا مداوا ہر تباہی کا
ے اخلاص ہی کو دیکھ کر رحم آگیا اُس کو ؛ ٹھکانہ ہی کہاں تھا ورنہ اِس قہرِ الٰہی کا

---

ا ساہتیہ سمیلن کا وہ ایک رُکن بنیادی ؛ کہ اُردو کو ہمیشہ تو نے اپنی ہی زُباں سمجھا
اُردو سے بھی، ہندی سے بھی یکساں محبت تھی ؛ خلوصِ دل سے تو رازِ بہارِ گلستاں سمجھا

---

قت آشرم پٹنے میں ہو وہ مظہر الحق کا ؛ نئی دہلی کا یا میلوں میں پھیلا قصرِ سلطانی
نظروں میں یہ دونوں نشانِ راہِ منزل تھے ؛ قناعت کا ملا تھا وہ خزانہ تجھ کو لاثانی

---

اِس دیس میں زنداں کی عزت جس طرح تجھ سے ؛ اُسی صورت بڑھی ایوانِ آئینی کی عزت بھی
دم سے رہا سرمایۂ ایوانِ آئینی ؛ مودت بھی، مروت بھی، اخوت بھی، فراست بھی

---

روستاں تجھ کو بھلا سکتا نہیں ہرگز ؛ کہ وقفِ ہند تھا ہر دم عمل تیرا سخن تیرا
اس جسمِ دِن ہی پر نہیں اے قوم کے رہبر ؛ تجھے ہر وقت دِل سے یاد کرتا ہے وطن تیرا

ل نئی دہلی



## سمہ شبلی

زندگی ہے آج فرسودہ نصابوں کی طرح
ہم پڑھے جاتے ہیں بس درسی کتابوں کی طرح
کون اب کس کو پکارے کس سے ہوں باتیں یہاں
شہر میں ہیں لوگ بے چہرہ نقابوں کی طرح
تھی مری فکر رسا ہی جن کی معراجِ سخن
مجھ سے اب ملتے ہیں وہ عالی جنابوں کی طرح
دور ہے یہ بے یقینی کا کچھ ایسا دوستو!
اب حقائق بھی نظر آتے ہیں خوابوں کی طرح
میرا ذوقِ سجدہ ریزی راس جن کو آگیا
اب چمکتے ہیں وہ پتھر آفتابوں کی طرح
تشنگی جاکر چھپائے سر کہاں اس عہد میں؟
ہو گئے ہیں وقت کے دریا سرابوں کی طرح
پھول صحرا کے بھی ہو سکتے ہیں فخرِ صد ارم
کوئی رکھے تو انہیں شبلی گلابوں کی طرح

## مشید ارومانی

شرابِ غم ہی نہیں صرف آدمی کے لئے
اجل کا زہر بھی پینا ہے زندگی کے لئے
نجانے لوگ یہاں کیسے دل لگاتے ہیں
ہمیں نہ مل سکی فرصت بھی دلگی کے لئے
چراغِ راہ سے منزل تو مل نہیں سکتی
چراغِ دل کی ضرورت ہے رہبری کے لئے
حیاتِ جاوداں بخشی غمِ محبت کو
اب اور چاہیئے کیا آپ کی خوشی کے لئے
جو کر سکے نہ کبھی احترام پیمانہ
چلے ہیں ایسے بھی کم ظرف میکشی کے لئے
فقط خلوص کی باتوں سے کچھ نہیں ہوتا
خلوصِ دل بھی ضروری ہے دوستی کے لئے
خیال و فکر ہی سب کچھ نہیں ہے اے شیدا
خدا کی دین بھی لازم ہے شاعری کے لئے

## افسر القادری سہسرامی

دوش پر رہا بھی ہے سر کبھی گیا بھی ہے
زندگی کی راہوں میں دشتِ کربلا بھی ہے
ہم نے یہ بھی دیکھا ہے ہم نے یہ سنا بھی ہے
اپنا غم چھپانے کو آدمی ہنسا بھی ہے
دشت دردِ انساں میں سایۂ سکوں بنتا
کیا کوئی درخت ایسا راہ میں اگا بھی ہے
خنجرِ الم کھا کر زہرِ رنج و غم پی کر!
آدمی جیا بھی ہے آدمی مرا بھی ہے
کس سے حالِ دل کہئے کس سے حالِ دل سنئے
زندگی کی محفل میں آدمی رہا بھی ہے
خار زارِ الفت میں چل رہا ہوں میں تنہا
مڑ کے دیکھتا بھی ہوں کوئی دوسرا بھی ہے
وادیٔ محبت کے تجربوں سے گزرا ہوں
دل ہی راہ رو بھی ہے دل ہی رہنما بھی ہے
آپ تو رہے افسر سب کے خاکِ پا بن کر
یہ بتایئے ہم کو کوئی آپ کا بھی ہے

# حاذق الملک کو مسیح الملک



کوثر چاندپوری

حکیم اجمل خاں کو حاذق الملک اور مسیح الملک کے خطابات سے نوازا گیا تھا، پہلا خطاب برطانوی حکومت نے دیا تھا دُوسرا قوم کا عطیہ تھا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ وفادار بھی تھے اور باغی بھی۔ حکیم اجمل خاں نے حکومت سے باغی ہو کر قوم کی وفاداری کا اعلان کر دیا۔ اس کی ابتدا پہلے خطاب کی واپسی سے ہوئی فوراً ہی ہندوستانی قوم نے اُنہیں مسیح الملک بنا دیا۔ عمر کے آخری سانس تک وہ اسی لقب سے یاد کئے جاتے رہے۔ آج بھی جب انہیں دُنیا سے رخصت ہوئے نصف صدی گزر چکی ہے وہ مسیح الملک ہی کہلاتے ہیں اسی لقب سے تاریخ میں اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

حکیم صاحب ۱۷ شوال ۱۲۸۷ھ (۱۸۶۳ء) کو شریف منزل دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور رسمی تعلیم کے بعد حکیم اجمل خاں نے کلام پاک حفظ کیا اور مسجد شریف خاں میں محراب سنائی۔ قدرت نے بے شمار ذہنی و دماغی صلاحیتوں کے ساتھ اُنہیں حافظہ بھی بہت اچھا دیا تھا تھوڑی عمر ہی میں انہوں نے مختلف قدیم علوم میں قابلیت پیدا کر لی۔ عربی، فارسی اور اُردو پر اُنہیں اہل زبان کا سا عبور تھا۔ انگریزی اگرچہ پڑھی نہیں تھی، مگر معمولی سی جھجک کے ساتھ انگریزی میں بات کر لیا کرتے تھے۔ طب ان کا آبائی فن تھا۔ اپنے والد حکیم محمود خاں سے طب کی ابتدائی کتابوں کا درس لیا تکمیل حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم غلام رضا علی خاں سے کی عملی زندگی کا آغاز حکیم محمود خاں نے کر دیا۔ اس کے بعد بڑے بھائی حکیم عبدالمجید خاں کی سرپرستی میں طبابت سیکھتے رہے۔ حکیم اجمل خاں دہلی میں کم اور رامپور میں زیادہ رہا کرتے تھے۔ حکیم واصل خاں کی موت کے بعد دہلی میں زیادہ رہنے کا اتفاق ہوا۔



ان کا سب سے انفرادی کارنامہ یہ تھا کہ فنی اور سیاسی سرگرمیوں میں ساتھ ساتھ حصہ لیتے رہے طبیب کی حیثیت سے بھی کامیاب رہے اور سیاست داں کی حیثیت سے بھی اُن کا درجہ کافی بلند رہا۔ قوم پرستوں کی صف میں انہوں نے اپنی اگلی صف میں بہترین مقام مخصوص کرا لیا یہاں تک کہ ہندوستان کی سب سے سرگرم اور فعال جماعت کانگرس کی نہ صرف صدارت بلکہ ڈکٹیٹرشپ بھی حاصل کر لی پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا کہ کانگرس کی قیادت میں انھیں غیر معمولی اور نمایاں مقام حاصل تھا۔

حکیم اجمل خاں نے محبت اور خدمت کی طاقت سے دلی والوں کے دل جیت لئے تھے۔ لارڈ ہارڈنگ اپنے افسران سے کہا کرتے تھے کہ وہ دہلی کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ ایک وقت تھا جب دہلی میں اُن کے اور سوامی شردھانند جی کے الفاظ کو قانون کا درجہ حاصل تھا۔

حکیم اجمل خاں اپنے مخالفین سے کبھی انتقام نہیں لیا کرتے تھے بلکہ اُن کے مقابلہ میں ہمیشہ عفو و درگذر کے عادی تھے۔ اُن کے پڑوس میں ایک اخبار نویس رہا کرتے تھے۔ جو صحیح معنی میں صحافت کی تجارت کیا کرتے تھے جس کے لئے جو چاہتے لکھ دیتے تھے۔ حکیم صاحب کے خلاف بھی لکھتے رہتے تھے کسی ریاست سے اُنہیں کئی ہزار روپے وصول کرنے تھے کافی کوشش کر چکے تھے کامیابی نہ ہوئی تھی۔ حکیم صاحب کے والیٔ ریاست سے مراسم تھے۔ یہ بات اخبار نویس صاحب کو معلوم ہوئی تو وہ بڑی ندامت اور شرمندگی کے ساتھ حکیم صاحب کی خدمت میں آئے اور سفارشی خط کی درخواست کی جواب

ملا کل آئیے۔ دوسرے دن یہ حضرت پھر پہونچے حکیم صاحب نے کہا غالباً آپ جانتے ہوں گے کہ میرے خطوط سکریٹری لکھا کرتا ہے مگر آپ کا معاملہ بالکل ذاتی نوعیت کا ہے۔ یہ بات آپ کو پسند نہ آتی کہ خط میرا سکریٹری لکھے اس لیے میں نے خود ہی لکھا ہے تاکہ آپ کا راز فاش نہ ہو لیکن یہ خط اسی وقت آپ کو دیا جائے گا جب آپ یہ وعدہ کرلیں کہ اب تک جس انداز سے آپ میرے خلاف لکھتے رہے ہیں، اس میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اخبار نویس مجبور تھے وعدہ کرکے خط لے لیا اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوگئے، اس کے بعد وہ پھر آئے غالباً شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے۔ اس مرتبہ حکیم صاحب نے ملاقات سے انکار کردیا۔

حکیم اجمل خاں نے مدرسہ طبیہ کی پرانی عمارت کو ناکافی خیال کرکے قرول باغ میں ایک بڑا رقبہ حاصل کیا۔ اس سلسلے میں دہلی کے چیف کمشنر سے ایک معرکہ بھی ہوا مگر حکیم صاحب کو کامیابی بھی ہوئی اور انہوں نے لارڈ ہارڈنگ ہی سے عمارت کا سنگِ بنیاد نصب کرالیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ناکامی پر ختم ہوگئی تھی۔ اس کی جگہ ایک اور تحریک جنم لے چکی تھی جو آہستہ آہستہ جوان ہوتی جارہی تھی چنانچہ غلامی کے خلاف ایک نئی جدوجہد کا آغاز ہوا اور انقلاب کی گھن گرج صاف سنائی دینے لگی۔ حکیم اجمل خاں عین وقت پر اس ہنگامہ کارزار میں شریک ہوئے۔ اُن کے نزدیک آزادی انسان کا فطری حق تھا جس کو حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ چھین لینے کے لئے ہر قسم کی قربانی جائز تھی۔ انہوں نے وقت کی کسی سیاسی تحریک سے دامن بچانے کی کوشش نہیں کی۔ حکیم صاحب آزادی کی سب سے پہلی شرط ہندو مسلم اتحاد کو قرار دیتے تھے۔ لیکن گائے کی قربانی اور مسجدوں کے سامنے باجہ بجانے کا سوال اس زمانے میں بہت اہم تھا۔ ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کا اجلاس امرتسر میں ہوا تو حکیم اجمل خاں نے اس موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ انہوں نے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں سے کہا کہ وہ گائے کی قربانی نہ کریں اس وقت عوام میں بڑا جوش تھا۔ ملک کے دُور دراز حصّوں سے جو شیلے نوجوان اپنے محبوب لیڈروں کی تقریریں سننے آئے تھے حکیم صاحب، پنڈت موتی لال نہرو، مہاتما جی اور تلک آنجہانی کے جلوس بڑی دھوم سے نکلے تھے۔ استقبال بھی بڑی دھوم دھام سے ہوا تھا، حکیم صاحب کے مشورے کا مسلمانوں پر بہت اچھا اثر ہوا۔ حقیقت میں وہ ہندوستان کی ان دو بڑی اقوام میں محبت اور یگانگت کے جذبات پیدا کرنا ہی اپنی زندگی کا مقصد خیال کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی نے اُن کی اس خصوصیت کا اعتراف کرتے ہوئے کتنے حسین الفاظ استعمال کئے ہیں۔

Hindu Muslim Unity was the breath of his nostrils

بقول ستیہ پال صاحب حکیم اجمل خاں ہی تھے جن کے اثرات سے بقرعید پر گائے کی قربانی رک گئی۔ یہ بھی اُنہیں کا دم تھا کہ سوامی شردھانند جی کو جامع مسجد دہلی میں تقریر کرنے کا موقع ملا اور کوئی شخص مخالفت نہ کرسکا۔ حکیم اجمل خاں کے سینہ میں حب وطن کا جو سمندر موجزن تھا اس کا ایک منظر اُن کے خطبۂ صدارت کے آخری الفاظ میں جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔

"اس حیثیت سے کہ ہم اس خاک سے پیدا ہوئے اور دوسری قوموں کے ساتھ اس ملک کے فخر کرنے والے وارث بنے ہم ان فرائض کو جو ہماری زادو بوم ہم پر عائد کرتی ہے، نہ صرف اچھی طرح سمجھتے ہیں بلکہ دلی خواہش کے ساتھ ان کے ادا کرنے کے لئے ہم ہندو عیسائی پارسی اور دوسرے بھائیوں کے ساتھ آمادہ ہیں۔"

آزاد ہند کا ایسا حسین و جمیل تصور اُن کے ذہن میں موجود تھا جس کے خدوخال ماضی کے مقابلہ میں زیادہ دلکش اور نظر فریب تھے۔ اسی خطبہ میں وہ لکھتے ہیں۔

"ہندوستان کے لئے ایک نادیدہ مستقبل میں وہ عظمت اور شان پنہاں ہے کہ اُس کے ماضی کا زیادہ سے زیادہ مہتم بالشان زمانہ بھی اس کے مقابلہ میں کم اور حقیر نظر آتا ہے۔ آیئے اب ہم سب متحدہ طاقت کے ساتھ اپنے ہاتھ بڑھائیں اور اسی مستقبل کے چہرے سے جو ہمارے ذہنی مگر اعلیٰ تخیل کے ساتھ وابستہ ہے نقاب اٹھانے کی خلوص دل سے کوشش کریں۔"

۱۹۲۰ء میں ہندو مہاسبھا کی مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے جو خطبۂ صدارت پڑھا اس میں حسب عادت ہندو مسلم اتحاد پر

پر زور دیا۔ احمد آباد میں خلافت کانفرنس کے صدارتی خطبہ میں انہوں نے مسلمانوں کو سخت امتحانات کے لئے تیار رہنے کا مشورہ دیا۔ ۱۸ مارچ ۱۹۲۲ء کو مہاتما گاندھی چھ سال کے لئے جیل بھیجدیئے گئے۔ انہوں نے اپنے تمام اختیارات حکیم اجمل خاں کے سپرد کر دیئے۔

اجمل خاں سفر و سیاحت سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اس میں ذاتی مقاصد سے زیادہ علمی اغراض پیش نظر رہتی تھیں۔ ان کی سیاحت تجربات و مشاہدات کا ایک دفتر ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے ۱۹۰۴ء میں سفر عراق کا ارادہ کیا اور بصرہ ہوتے ہوئے بغداد پہونچ گئے۔ پھر نجف اشرف کی زیارت کرنے کے بعد کربلا چلے گئے۔ ۱۹۱۱ء میں انہوں نے انگلینڈ، فرانس، جرمنی، آسٹریا اور ترکی کا سفر کیا۔ اس دورے کا مقصد صحت کی بحالی اور تبدیلی آب و ہوا کے ساتھ یہ تھا کہ انگلستان اور دوسرے ممالک میں طب کی ترقیوں کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا جائے۔ طبی دنیا میں یہ سفر اس لئے بھی بہت زیادہ اہم تھا کہ حکیم اجمل خاں پہلے طبیب تھے جو ان مقاصد کے لئے یورپ جانے کی جرأت کر رہے تھے۔ وہاں ان کا پرجوش خیر مقدم ہوا۔ انہوں نے مختلف اوقات میں طب قدیم کے نظریات اور ان کی قدر و قیمت سے ارباب علم کو روشناس کیا۔ ڈاکٹر انصاری جن کا نام ہمارے ملک کی سیاسی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتا ہے، ان دنوں لندن میں مقیم تھے۔ حکیم اجمل خاں سے ان کی پہلی ملاقات چرنگ کراس ہاسپٹل میں ہوئی۔ ڈاکٹر انصاری ہاؤس سرجن کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ یہ ملاقات سیاسی اور قومی کاموں کی اچھی تمہید ثابت ہوئی۔ چرنگ ہاسپٹل میں حکیم اجمل خاں کی طبی قابلیت کی آزمائش کا ایک بڑا نازک مرحلہ آیا۔ اس کی تفصیل ڈاکٹر انصاری کی زبانی سنئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"حکیم صاحب سے میری پہلی ملاقات لندن میں جب میں چرنگ کراس ہاسپٹال میں ہاؤس سرجن تھا۔ یہ بوساطت ڈاکٹر صاحبزادہ سعید الظفر خاں ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بغرض سیاحت لندن تشریف لائے تھے اُن کو لندن کے مشہور ہسپتالوں کے معائنہ کا شوق تھا۔ چرنگ کراس ہسپتال کا معائنہ بہت چھان۔ بین اور ہر شعبے کی تحقیقات کے ساتھ میرے ہمراہ کیا۔"

"ڈاکٹر اسٹینلے بائیڈ چرنگ کراس کے مشہور اور سنیئر سرجن تھے اور وہ بادشاہ کے بھی آنریری سرجن تھے۔ تشخیص امراض اور فن سرجری میں لندن میں یہ مسلم استاد سمجھے جاتے تھے۔ میں انہی کا ہاؤس سرجن تھا۔ حکیم صاحب سے ان کی ملاقات میں نے کرائی۔ انہوں نے حکیم صاحب کو ہسپتال آنے کی دعوت دی۔ ایک مریض کے مرض کے متعلق مسٹر بائیڈ طلباء کو سمجھا رہے تھے۔ حکیم صاحب سے بھی انہوں نے مریض کو دیکھنے اور تشخیص کرنے کی خواہش کی۔ بعد معائنہ حکیم صاحب نے یہ تشخیص کی کہ مریض کی آنتوں کے ابتدائی حصہ میں کہنہ زخم ہے جس کے باعث درد کی تکلیف اور حرارت تھی۔ ڈاکٹر بائیڈ کی رائے میں وہ پت کی تھیلی کا ورم تھا۔ انہوں نے حکیم صاحب کو نہایت خلق اور اصرار سے دوسرے روز صبح کو اس مریض کے آپریشن کے وقت بلایا اور ہنس کر کہا کہ یہ طب یونانی اور انگریزی طب کا امتحان ہے، آپریشن سے پتہ چل جائے گا، کہ کون سی طب صحیح ہے۔ شکم چاک کرنے پر حکیم صاحب کی تشخیص صحیح نکلی اور ڈاکٹر بائیڈ نے نہایت فیاضی اور کشادہ پیشانی کے ساتھ حکیم صاحب کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دی۔"

تیسری مرتبہ ۱۹۲۵ء میں انہوں نے مختلف ممالک کی سیر کی۔ اس سفر میں ڈاکٹر انصاری بھی ساتھ تھے۔ ۲۲ اپریل ۱۹۲۵ء کو وہ پیرس پہونچے۔ ایک ماہ تک وہیں مقیم رہے۔ پیرس میں ان کی ملاقات مشہور انقلابی مولوی برکت اللہ بھوپالی سے ہوئی جو پیرس میں پناہ گزین کی حیثیت سے ٹھہرے ہوئے تھے۔ پیرس کے دوران قیام میں حکیم صاحب نے سب سے زیادہ دلچسپی کتب خانوں کو دیکھنے میں لی۔ تمام نادر کتابوں کو انہوں نے بڑے غور سے دیکھا۔ پیرس میں حکیم صاحب نے ایک بہت ہی پیچیدہ مریض کا علاج کیا۔ یہ ایک عورت تھی جس کی ٹانگیں سکڑ گئی تھیں اور پیٹ میں درد تھا۔ مقامی ڈاکٹر بہت علاج کر چکے تھے۔ مریضہ کو آرام نہیں ہوا تھا۔ حکیم صاحب نے بہت تھوڑی مقدار میں ایک دوا کھانے کو دی جس سے اُسے حیرت انگیز فائدہ ہوا۔ دراصل اس کی آنتوں میں گرہ پڑ گئی تھی جو حکیم اجمل خاں کی دوا سے ٹھیک ہو گئی۔ مختلف مقامات کی سیر کرنے کے بعد وہ ہندوستان واپس آ گئے۔ ہندوستان پہونچنے کے بعد وہ پھر سیاسی ہنگاموں میں شریک ہو گئے، لیکن اس مصروفیت کو نباہ نہیں سکے اور خرابی صحت کے باعث جلسوں میں شرکت بند کر دی۔ دسمبر ۲۵ء میں کانگرس کا جو اجلاس ہوا اس میں وہ نہ جا سکے صرف پیغام بھیجدیا۔ سیاسیات

سے دلچسپی کم ہوگئی لیکن مطب کا سلسلہ جاری رہا۔ طبیہ کالج کے مسائل پر بھی توجہ کرتے رہے ملک کی عام بیداری کے پیش نظر وہ طب یونانی کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے جولائی ۱۹۳۵ء میں حکیم صاحب نے طبیہ کالج میں شعبۂ تحقیقات قائم کیا۔ ملک کی مشہور اور ممتاز شخصیتیں اُس کالج کی طرف متوجہ ہوچکی تھیں۔ شعبۂ تحقیقات ڈاکٹر سلیم الزماں کے سپرد کردیا گیا۔ بدقسمتی سے ملک میں فرقہ وارانہ ذہنیت اُبھر آئی تھی۔ جگہ جگہ فسادات ہورہے تھے۔ حکیم صاحب ان اندوہناک واقعات سے بے حد متاثر تھے انہوں نے انتقال سے کچھ پہلے سیاسیات سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ انہیں قلبی عوارض کی شکایت تھی۔ اس حالت میں بھی وہ طبیہ کالج، جامعہ ملیہ اور ہندو مسلم اتحاد کو اپنی زندگی کا مطمح نظر خیال کرتے تھے۔ اپریل ۱۹۳۷ء میں طبی کانفرنس کا اجلاس رام پور میں ہوا۔ یہ حکیم صاحب کی زندگی میں کانفرنس کا آخری اجلاس تھا ان کا پیمانہ حیات لبریز ہوچکا تھا۔ بس چھلکنے ہی کی دیر تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے اس اجتماع کا نقشہ اپنی یادداشت میں نہایت موثر انداز میں کھینچا ہے وہ رقمطراز ہیں کہ

"آپ نے فرمایا کہ اپنی زندگی کا بہترین حصہ فن طب کی خدمت میں صرف کرکے اس کی بنیاد مضبوط قائم کردی ہے۔ اب آئندہ آپ لوگوں کا یہ فرض ہے کہ اس کی مستحکم بنیاد پر عمارت بناکر ہمیشہ کے لئے اس کو قائم رکھیں اور اس کی ترقی کے ذرائع پیدا کریں۔ سب سے آخر میں یہ فرماتے ہوئے اٹھے کہ مجھ کو اپنی زندگی کی اتنی امید بھی نہیں ہے کہ سال آئندہ کی کانفرنس میں شرکت کرسکوں۔"

اپنی موت کے متعلق حکیم صاحب کا خیال غلط نہیں تھا۔ رام پور ہی میں ان پر وجع القلب کا حملہ ہوا اور ۲۹ دسمبر ۱۹۳۷ء کی صبح کو سوا دو بجے وہ دُنیا سے رخصت ہوگئے اس وقت اُن کی عمر ۶۴ سال کی تھی۔ یہ کوئی معمولی حادثہ نہ تھا۔ ایک دم ایسا محسوس ہوا جیسے سورج گرہن میں آگیا۔ ہر طرف تاریکی سی چھاگئی۔ تمام مشاہیر قوم نے اس ماتم میں شرکت کی مہاتما گاندھی نے ۵ جنوری ۱۹۳۸ء کے ینگ انڈیا میں نہایت پرسوز اور پُراثر انداز میں خراج عقیدت پیش کیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

حکیم جی کی موت نے مجھ سے صرف ایک دانشور اور ثابت قدم شریک کار ہی کو نہیں چھین لیا بلکہ میں نے ایک ایسا دوست کھو دیا جس پر میں ضرورت کے وقت اعتماد کرسکتا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کے معاملے میں وہ میرے مشیر اور رہنما تھے وہ انسانی فطرت کو پہچانتے تھے۔ اسی صلاحیت نے اُنہیں صحیح قوتِ فیصلہ عطا کی تھی۔ حکیم صاحب خیالی قسم کے انسان نہیں تھے وہ اپنے خوابوں کو حقیقت میں تبدیل کرنے کی قوت رکھتے تھے۔"

اُن کی موت تاریخ، روایت اور ایک دَور کی موت تھی۔ وہ عام انسانی اوصاف کے لحاظ سے عظیم انسان اور اخلاق حسنہ کا نہایت خوبصورت پیکر تھے۔ بہت وضعدار، بامروت اور دوست پرست بھی تھے۔ اگرچہ بے حد سنجیدہ اور متین تھے مگر ظریفانہ حس بھی رکھتے تھے۔ اُن کی ظرافت میں بھی سنجیدگی ہوا کرتی تھی۔ مہاتما گاندھی کے علاوہ ملک کے تمام مشاہیر نے حکیم اجمل خاں کی موت پر بہترین الفاظ میں اظہار ملال کیا، پھر ایک بار ان کی فنی اور قومی عظمت کا اعتراف ہندوستان کی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے ۱۹۶۷ء میں انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ کا افتتاح کرتے ہوئے بہت شاندار الفاظ میں کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ حکیم اجمل خاں صاحب صرف افراد کی بیماری کا علاج ہی نہیں کرتے تھے بلکہ انہوں نے قوم کی بیماری کا علاج کرنے کی بھی کوشش کی۔

حکیم اجمل خاں کے سینہ میں ایک دردمند دل تھا وہ اپنے ماحول کے ہر واقعہ سے متاثر ہوتے تھے۔ زندگی کے متعلق ان کا مشاہدہ بہت گہرا تھا انہوں نے نہایت شگفتہ اور موثر اشعار کہے ہیں۔ خاص طور پر فارسی میں وہ اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کا نہایت اچھا سلیقہ رکھتے تھے۔ ان کا مجموعۂ کلام دیوان شیدا کے نام سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی نگرانی میں ۱۳۴۴ھ میں شرکت کاویالی برلن سے شائع ہوا ہے۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات ہے، ہندوستان میں بھی اسی نام سے ان کا دیوان شائع ہوچکا ہے۔

جواب طلب امور کے لئے مناسب سائز کا لفافہ
اور ڈاک ٹکٹ ضرور بھیجیں۔

# یوپی کے قبائلی

امیر حسن

اگرچہ ہندوستان میں قبائلیوں کی آبادی کُل آبادی کی تقریباً
فی صد ہے، لیکن اُن کی زندگی رہائش اور کلچر کے بارے میں عام
ی کی واقفیت افسوسناک حد تک کم ہے، افسانہ نگاروں، ناول نویسوں
رفلموں سے اُن کی زندگی کو عموماً رُومانی، جذباتی اور غیر حقیقی رنگ میں
ن کیا ہے اور اس کوشش میں انہوں نے اُن کی زندگی کے ٹھوس مسائل
اُن کی تہذیب کے روشن پہلوؤں کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

ہندوستان کے قبائلی اور خصوصاً یوپی کے قبائل ہماری توجہ کے
تحق ہیں اور ذیل کا مضمون اسی کوشش کا ایک حصہ ہے۔

## بادی

یوپی میں قبائلی آبادی ۶ لاکھ کے قریب ہے۔ یہ لوگ صوبہ کے تین
ں حصوں میں رہتے ہیں۔ صوبے کے شمال، مغربی کوہستانی علاقہ میں
ٹیا، راجی، بورا، جونساری اور جولنساری نام کے لوگ رہتے ہیں لفظ
ساری دہرہ دون ضلع کے جولنسار بھابھر پرگنے کے باشندوں کے
استعمال ہوتا ہے۔ ویسے ان میں خاص راجپوت خاص براہمن،
کاریگر لوگ اور ہریجن باشندے سب ہی شامل ہیں۔ پہاڑی قبائلیوں کی
تعداد تقریباً پونے تین لاکھ ہے۔ ترائی اور بھابھر کے علاقہ میں تھارو
اور بُکسا دو آدی واسی قومیں جن کی آبادی قریب پون لاکھ ہے، رہتی
ہیں۔ تھارو گورکھپور سے لے کر نینی تال تک ترائی کے اضلاع میں پھیلے
ہوئے ہیں۔ بُکسا نینی تال کے بازپور کے علاقہ میں کثیر تعداد میں رہتے ہیں
پوڑی گڑھوال، بجنور اور دہرہ دون میں بھی قلیل تعداد میں پائے
جاتے ہیں۔ جنوبی اتر پردیش کے علاقہ میں ڈھائی لاکھ سے بھی زیادہ
کی تعداد میں اس ملک کے سب سے قدیم باشندوں کی فہرست میں آنے
والے آدی واسی لوگ رہتے ہیں۔ ان میں کول، چیر، کھروار، کوروا،
اگڑیا، سہاریا اور راواں خاص ہیں۔ پٹہاری۔ پرہیا۔ گھیا اور بھیل
قومیں بھی کم تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ کول بھیل۔ گونڈ اور سہاریا کو چھوڑ کر
باقی تمام آدی واسی قومیں صرف مرزا پور اور اس سے ملحق وارانسی
ضلع کے پٹھاری خطہ میں رہتی ہیں۔ سہاریا اور بھیل لوگوں کی آبادی صرف
جھانسی میں محدود ہے۔ کول۔ مرزا پور اور وارانسی کے علاوہ باندہ
اور الہ آباد میں بھی کافی تعداد میں رہتے ہیں۔ گونڈ خصوصاً مرزا پور میں



روائیں علاقے کی ایک کولتا لڑکی

ہتے ہیں مگر تھوڑی بہت آبادی باندہ اور جھانسی میں بھی ہے۔

## نسل

کوہستانی علاقہ کے شمالی حصّوں میں رہنے والے بھوٹیا اور راجی ور ترائی کے تھارو اور بکسا منگولی نسل کے ہیں۔ خاص راجپوت اور اص برہمن اور کسی حد تک بورا لوگ رُومی نسل سے تعلق رکھتے ہیں مگر ن میں منگولی خون کی بھی کافی آمیزش ہے۔ جنوبی یوپی کی قومیں کولاری سل کی ہیں جو کہ منڈا، دراوڑی۔ لسانی طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر سہاریا اور بھیل اوروں سے مختلف ہیں۔ ان کی ابتدا ہندی اور دراوڑی نسل کی مشترکہ قوموں سے ہوئی۔ اُن کے مذہبی فریضوں اور عقائد ں توہم پرستی، آسیب پرستی، جادو ٹونا، وغیرہ کو بہت دخل ہے زندگی کی تشکیل تخریب میں ان کا بہت بڑا رول ہوتا ہے۔ عموماً قبائلی لوگ نئے دیوی دیوتاؤں بخوشی قبول کر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کے دیوتاؤں کی تعداد روز بہ روز بڑھ رہی ہے۔ عام طور سے ہندو مذہب کے کچھ چیدہ دیوتاؤں کے ساتھ اپنے خاص قدیم دیوی دیوتاؤں میں اعتقاد رکھتے ہیں۔ بھوٹیا۔ بابلا، چان سدھوا، کنھیا کرن وغیرہ دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ جولساری لوگوں لا خاص دیوتا "بلے ناتھ، گنا ناتھ اور کھولیا ہیں۔ تھارو موٹے بابا، کٹیار بابا گنی بائی کی پوجا خاص طور سے کرتے ہیں۔ جنوبی یوپی کے مرزا پور کے رہنے والے قبایل میں راجہ چندول، برم بابا، بدھی، مائی اور ستیلا مائی کی پرستش عام ہے۔ باندہ ضلع کے کول رام اور سیتا کے پرستار ہیں روایت کے مطابق رام، سیتا اور لکشمن نے اپنے زمانہ جلاوطنی میں کچھ عرصہ تک چترکوٹ میں جو کہ قبائلی علاقہ کی سرحد کے نزدیک واقع ہے قیام کیا تھا گو کہ بھیل اور سہاریا دیگر آدی واسیوں سے کہیں زیادہ ہندو مذہب سے متاثر ہیں مگر اُن کے بھی کچھ خاص قبائلی دیوتا ہیں۔ دیوی دیوتاؤں سے رابطہ قائم رکھنے اور جھاڑ پھونک کے لئے تھاروؤں میں بھرا، اور مرزا پوری قبائل میں "بیگا" ہوتے ہیں۔ اُن کی ذمہ داری ان دیوتاؤں کو خوش رکھنے کی، بدرُوحوں اور آسیبوں سے گاؤں کی حفاظت کرنے کی اور مذہبی رسوم کو باقاعدگی کے ساتھ انجام دلانے کی ہوتی ہے۔

سماج میں نظم کو برقرار رکھنے اور آپسی مسائل کے تصفیہ کے لئے عام طور سے برادری کی پنچایت ہوتی ہے جس کے صدر کو چودھری یا مکھیا کہتے ہیں۔ تھاروں میں صدر کا نام پدھان اور بھکسا لوگوں میں تخت ہے تخت کی مدد کے لئے منصف، داروغہ اور سپاہی بھی ہوتے ہیں۔ پنچایتوں کو تسلیم کرنا لازمی ہے۔ جائداد کے وارث مرد ہی ہوتے ہیں۔ بڑے لڑکے کو کچھ زیادہ حصہ ملتا ہے۔ جسے تھارو "چھٹواس" کہتے ہیں۔ منقولہ جائداد کا کچھ حصہ بیوی اور لڑکیوں کو بھی مل جاتا ہے۔

جائداد کی حقدار نہ ہوتے ہوئے بھی خواتین خاندان اور سماج میں بہت اہم مقام رکھتی ہیں جس کی خاص وجہ ان کا مردوں کی طرح کماؤ ہونا ہے۔ گھر کے سارے کام تو کرتی ہی ہیں۔ زراعت و مویشی پالنے میں بھی وہ مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ کچھ قبائل کے لئے مشہور ہے کہ ان کے مرد، زن مرید ہوتے ہیں۔ تھارو عورتیں چتوڑ کی رانیوں کی اولاد ہونے کا

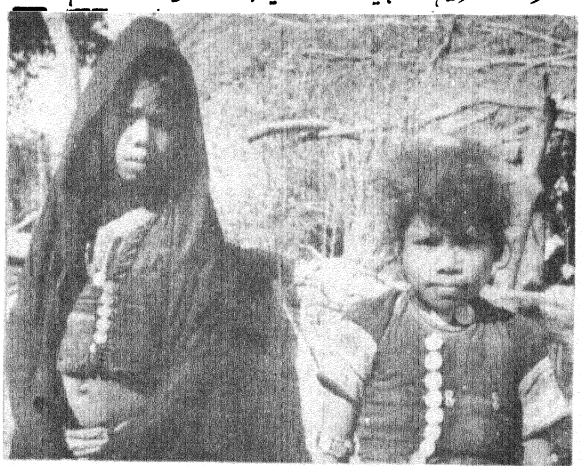

تھارو بچے

دعویٰ کرتی ہیں وہ کہتی ہیں کہ مغلوں کے زمانے میں چتوڑ کی کسی لڑائی میں سارے مردوں کے ہلاک ہونے کے بعد رانیاں محافظ سپاہیوں اور خادموں کے ہمراہ ترائی کے جنگلات میں بھاگ کر پناہ گزین ہوئیں کچھ عرصہ کے بعد انقلاب زمانہ کے تحت راجپوت راجکماریوں کی شادیاں خادموں اور سپاہیوں سے ہوگئیں۔ اور انہی کی اولاد تھارو کے نام سے موسوم ہوئی یہ ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ جہاں تھارو عورتیں خوبصورت اور پُروقار ہوتی ہیں، مرد معمولی شکل وصورت کے منکسر المزاج ہوتے ہیں لیکن تھاروں کے سلسلہ راجپوت ہونے کی بات محض حکایت کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ جیسا پہلے

ذکر آچکا ہے یہ لوگ دراصل منگولائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ کچھ قبائلی اپنی لڑکیوں کی شادی کمسنی میں کرنے لگے ہیں۔ مگر بھوٹیا۔ راجی اور بھیل وغیرہ اب بھی سن بلوغ پر پہونچنے کے بعد ہی لڑکیوں کی شادی کرتے ہیں۔ بھوٹیا لوگوں میں "رنگ بنگ" نام کا ایک ادارہ تھا۔ جہاں غیر شادی شدہ لڑکے اور لڑکیاں بلا روک ٹوک رقص و سرود کے لئے ملاقات کرتے تھے۔ یہ ادارہ موجودہ کلبوں سے کافی مشابہ تھا جن کا خاص مقصد ممبران کے لئے تفریح طبع کا سامان مہیا کرنا تھا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ "رنگ بنگ" کے کچھ قوائد اور حدود تھے۔ جن کے اندر ممبران کو رہنا اور عمل کرنا پڑتا تھا۔ اس ادارہ کے ذریعہ بھوٹیا لڑکے اور لڑکیوں کو اپنے شریک حیات کے انتخاب میں بڑی مدد ملتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ حیات کی ضروری اور ابتدائی ٹریننگ بھی مل جایا کرتی تھی۔ مگر گزشتہ چند سالوں میں مصلحوں اور ناصحوں کی نظر عنایت سے یہ ادارہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔

دہرہ دون کے جونسار بھابھر کے علاقہ میں ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے ہیں۔ ایسا رواج اس علاقہ سے ملحق اتر کاشی کے روائیں اور شہری گڑھوال کے جونپور علاقے میں بھی ہے۔ رواج کے مطابق کئی بھائیوں کی ایک یا ایک سے زیادہ بیویاں ہوتی ہیں۔ کسی ایک بھائی کو کسی ایک بیوی پر اختیار کلی نہیں ہوتا ہے۔ مگر اب یہ طریقہ کم ہوتا جا رہا ہے۔

اس سماج میں لڑکیوں کو شادی سے قبل اور بیویوں کو اپنے مائکے میں کافی جنسی آزادی ہوتی ہے۔ عارضی جنسی تعلقات اور معاشقے کو سوسائٹی عموماً نظر انداز کر دیتی ہے۔

قبائلی لوگوں کے اور بھی بہت سے مسائل ہیں۔ اُن میں خوش حالی کے ساتھ ساتھ تعلیم کا بھی فقدان ہے۔ بیماریوں کے علاج کے لئے معقول شفاخانہ اور ڈسپنسریاں کم ہیں۔ نقل و حرکت کے لئے سڑکوں کی کمی ان ترقی میں حارج ہے۔ پینے کا صاف پانی اکثر علاقوں میں کمیاب ہے۔ ان سب دشواریوں کی طرف حکومت توجہ دے رہی ہے۔ مگر اب بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ملک کی متوازن ترقی کے لئے قبائلی لوگوں کو دوسرے لوگوں کی معاشی سطح پر لانا ضروری ہے۔ اس کام میں سماجی کارکنوں اور اور انجمنوں کو بھی ہاتھ بٹانا چاہئے



شکیب ایاز

سر رکھتے ہی تکیے پہ یہ محسوس ہوا ہے
آہستہ سرہانے میں کوئی بول رہا ہے
بکھری تو ہواؤں نے کھڑے کان کئے ہیں
ڈھائے ہوئے مینارے کی یہ گونگی صدا ہے
ساون کی اُمس آج کے انساں کا مقدر
جو کھل کے نہ برسے یہ وہی کالی گھٹا ہے
نظروں سے تحیّر کی کرن پھوٹ رہی ہے
آئینے کا معصوم بدن کانپ رہا ہے
مُلزم کی طرح شام کٹہرے میں کھڑی ہے
مغرب ہے یہ۔ سُورج کا یہیں قتل ہوا ہے
گرنے لگے دیواروں سے خوابوں کے کلنڈر
دروازہ لگا دو کہ بہت تیز ہوا ہے

## بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

فی زمانہ بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نِرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچے تبھی ہوگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔

## بچہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نِرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچے کی پیدائش ملتوی کرسکتے ہیں۔

نِرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان، محفوظ طریقہ ہے۔ اِس کے استعمال سے صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔

نِرودھ ہر جگہ ملتا ہے:۔
پرویژن اسٹور، کرانہ فروش، کیسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔

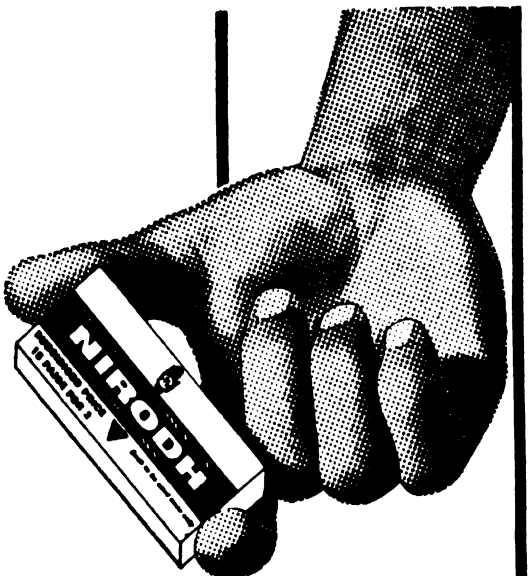


صرف 5 پیسے خرچ کرکے آپ اپنے کنبے کو محدود رکھنے کی طاقت حاصل کرسکتے ہیں

# نِرودھ استعمال کیجئے



فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
15 پیسے کے 3
سرکاری اِمداد سے کم دام

# غزلیں

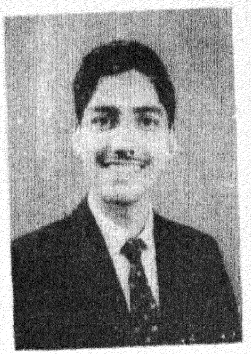

خالد رحیم

زخم کو پھول کہو، درد کو خوشبو سمجھو
دل کو صحرا کا بھٹکتا ہوا آہو سمجھو

دھوپ کی شعلہ فشانی سے پریشاں کیوں ہو
یادِ محبوب کو بھی سایۂ گیسو سمجھو

رات کو اپنے خیالوں کا دریچہ مانو
چاند کو چاند نہیں، ایک پری رو سمجھو

اپنی انگڑائیاں آئینے میں دیکھو تو ذرا
کیا ہے نوخیز خط و خال کا جادو سمجھو

جس کی آغوش میں کھلتے ہیں محبت کے کنول
ایسے ہر شعلے کو محبوب کا پہلو سمجھو

شب کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے موتی ہیں
اے شگوفو! انہیں شبنم نہیں، آنسو سمجھو

ظلمتِ شب سے ہو کیوں اتنے ہراساں خالد
زندگی کو نہیں کچھ اور تو جگنو سمجھو

## قسیم الحق گیاوی

نئی فضا ہے نئی بزم ہے دماغ نئے
جلاؤ دوستو محفل میں اب چراغ نئے

اُجاڑ اُجاڑ سا ہے گلشنِ حیات تمام
اُٹھو کہ ہم کو لگانے ہیں اب تو باغ نئے

پرانے جام و سبو کو اُٹھا دے اے ساقی
کہ مے نئی ہے تو پھر کیوں نہ ہوں ایاغ نئے

نہ منزلوں کا پتہ ہے نہ کارواں ہے کوئی
نئی ہے راہ، نئے راہرو، سُراغ نئے

عجیب رنگ ہے صحنِ چمن کا آج قسیم
کہ بُلبلوں کے مقابل ہیں اب تو زاغ نئے

## صبا نقوی

یہ رندیٔ و مستی کے قصّے، یہ بادہ و ساغر کی باتیں
اے شیخِ حرم ہیں تیرے لئے امکان سے باہر کی باتیں

معلوم نہیں پھر کیوں انساں مجبور و گنہ ہو جاتا ہے
کیا جھوٹ ہیں جنت کے وعدے کیا خواب ہیں کوثر کی باتیں

بے مول ہے جنس مہر و وفا، بازارِ تمدن میں پھر بھی
کیوں چاہنے والے کرتے ہیں اخلاص کے جوہر کی باتیں

آنکھوں میں چھلکتے ہیں آنسو، ہونٹوں پہ ہنسی لہراتی ہے
جب رات گئے دیوانوں کو یاد آتی ہیں دن بھر کی باتیں

میزانِ دلِ انساں میں صبا کیا فرض و محبت کو تولیں
جب اپنے بہلنے کا ساماں ہوں حُسن کے پیکر کی باتیں

پاکستانی نظم

# الحاق

(ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے نام)

ساتھیو، ہاتھ بڑھاؤ کہ ہیں ہم آج بھی ایک
کون کر سکتا ہے تقسیم ادب کی جاگیر
کون افکار کی قندیل بجھا سکتا ہے
کون کر سکتا ہے احساس کی شدت کو اسیر

شہر بانٹے گئے تقسیم ہوئی ہیں گلیاں
قیس و لیلیٰ کی محبت کا فسوں ختم ہوا
کتنے چہرے ہیں جنھیں دیکھ نہ پاؤں گا کبھی
کتنی آنکھوں کی لطافت کا فسوں ختم ہوا

صبح آزادی تو پھوٹ چکی ہے لیکن!
حال و ماضی کے گھروندوں میں اندھیرا ہے وہی
برق خرمن کہیں، کانٹے کہیں دست گلچیں
فکر جاناں، غم انساں، غم دنیا ہے وہی

اب بھی بدلے نہیں آداب جہانداری کے
اب بھی انسان کی پرواز میں حائل ہے غبار
اب بھی سرکش ہیں حوادث کی ہوا کے جھونکے
اب بھی موجوں کے تلاطم میں چھپے ہیں منجدھار

آج بھی زیست کے دوراہے پہ بیٹھے ہیں اداس
مشترک درد کے مارے ہوئے گھبرائے ہوئے
ہم نہ کافر ہیں نہ مومن ہیں نہ افلاک نشیں
قحط و افلاس کے روندے ہوئے ٹھکرائے ہوئے

ساتھیو آؤ ادھورے ہیں ابھی یہ سپنے
ساتھیو آؤ ابھی کام بہت باقی ہے
اپنے بیدار تقاضوں کا پھر اعلان کریں
زندگی اب بھی ہمیں صرف ہمیں تکتی ہے

ساتھیو، ہاتھ بڑھاؤ کہ ہیں ہم آج بھی ایک
کون کر سکتا ہے احساس کی شدت کو اسیر
شہر بٹ سکتے ہیں، ہو سکتی ہیں گلیاں تقسیم
کون کر سکتا ہے تقسیم ادب کی جاگیر

احمد ریاض

# لائٹیں

نازالملکہ

سونے کے کمرے کی کھڑکی کے شیشے پر گھبراہٹ آمیز دستکوں سے نیند اُچٹ
، ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ اچانک بتی جلائی تو اپنی بہن سمیا کو پلنگ کے پاس والی
، منہ سٹائے دیکھا۔

" سائرن"! اُس نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

ایک لمحہ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ پھر اچانک ساری بات سمجھ
ں نے فیصلہ کیا کہ اب یہاں سے بہت جلد بھاگ چلنا چاہئے

کپڑے بدلتے ہوئے میں نے اِن تمام چیزوں پر نظر ڈالی جو مجھے بے حد
میں نے بچپن سے انہیں کس طرح سنوارا اور نکھارا تھا۔ اب وہ میری شخصیت
ہ بن چکی تھیں۔ چاروں طرف ہر چیز میری تھی — مگر میں اپنے ہاتھ میں
کمبل اور تکیہ لئے بھاگ رہی تھی۔

سائرن کی چیخ، گولیوں کی آواز اور دُور کہیں گرتے گولے کے دھماکے
ں تھی۔ دل میں ٹیس سی اٹھی۔

کمرے کو چھوڑتے چھوڑتے میں نے سونے کی زنجیر سے لٹکی قرآن کی ایک ننھی
ے اٹھالی۔ یہ میری اماں کی آخری یادگار تھی۔ میں نے اُسے گلے میں لٹکا
ف کر دی۔ باہر نکل کر ایک لمحہ میں نے سوچا کمرے کو لاک کر دوں!
ر بعد یہ گھر میرا نہیں رہ جائے گا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میں نے اس
ی دیا۔

ے میں کنجی گھماتے وقت لگا ہے۔ سارے فلسطین کا دروازہ بند کر رہی
ہوں۔ دروازے کی سرد چوکھٹ کے سہارے میں نے اپنا رخسار ٹکا دیا اور
سسک سسک کر رو اٹھی۔

میرے پیچھے سے ہلکے قدموں کی آہٹ آئی۔ وہ ننھا وسیم تھا اس
کی صاف شفاف آنکھوں میں حیرانی اور پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔

میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ صرف دھیرے سے اُسے گود میں اٹھایا اور چوم لیا۔

اسے سینے سے لگاتے ہوئے میں نے سوچا — جب تک ہم ساتھ ہیں،
ان تمام چیزوں کی جنھیں ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں، کوئی اہمیت نہیں۔ میں نے
بچے کے معصوم مکھڑے کی طرف دیکھا۔ اُسے کیا معلوم کہ وہ کسی نامعلوم تاریک
مستقبل کی طرف جا رہا ہے۔

باہر باقی لوگ تاریکی میں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہر ایک کے پاس
صرف ایک کمبل اور تکیہ تھا۔ گھوڑی پر زین کسی جا چکی تھی۔ اور اُس کے اُوپر
کچھ کھانے پینے کے سامان، پانی کا برتن اور میرے دونوں چھوٹے بھتیجوں کے
کپڑوں کا بوجھ لدا تھا۔

— سب اپنی چیزوں کو خود لے کر چلو۔ گھوڑوں پر زیادہ وزن مت ڈالو۔
آگے! میں — ابا؟ وسیم نے تتلا کر پوچھا۔

وسیم نے کچھ نہ کچھ لے کر چلنے کی ضد کی۔ اس کی ماں نے رائے دی کہ وہ
اپنا لکڑی کا گھوڑا لے لے لیکن وہ اسماء کی دودھ پینے کی شیشی لے کر چلنے کی
ضد کر رہا تھا۔

"نہیں نہیں! اس کی ماں چلائی تم توڑ دو گے۔ پھر اسما کو بھوکی رہنا پڑے گا۔"

وہ ضد کرتا ہوا رو پڑا۔ ابا نے اسے پیار سے گود میں لے لیا۔

"ارے۔ بہادر بچے کہیں روتے ہیں!"

آخر طے ہوا کہ بوتل اُسے دیدی جائے کیونکہ کاٹھی کی جیب میں ایک بوتل تھی۔

اس سارے ماحول نے میرے قدآور، مست مولا چچیرے بھائی کمال کو جسے گاؤں کی حفاظت کے لئے دوسرے لوگوں کے ساتھ یہیں رہ جانا تھا عجیب طرح سے پریشان کر دیا۔ اس نے حکم بھرے لہجے میں کہا —

اب آپ لوگ جائیے! "خدا حافظ۔"

پھر کچھ بلند آواز میں بولا "آپ لوگ ضرور واپس آئیں گے۔ اپنی زمین ہم کسی بھی قیمت پر چھننے نہیں دیں گے۔ یہودیوں کو کیا، ہم خدا کو بھی نہیں دیں گے!"

سمیا اوپری منزل سے کتابوں کا ایک بنڈل لئے لپکتی ہوئی آئی — میں اُنہیں چھوڑ نہیں سکتی! اس نے معافی مانگنے کے انداز میں لجاجت سے کہا۔ بحث کرنے کا وقت نہ تھا اس لئے میں بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگی تاکہ کچھ تو وقت بچے۔

"ہمیں چلنا چاہئے! سہمے ہوئے لہجے میں ادھر اُدھر جھانکتے ہوئے میں نے کہا۔ دیکھو وہ پاس آتے جا رہے ہیں۔ آہٹ کتنی صاف سنائی دے رہی ہے"

رات کے گہرے اندھیرے میں ہم نکل پڑے۔ کسی کے پاس کچھ بھی تو سامان نہ تھا۔ سوائے ایک کمبل اور تکئے کے۔

ہم چُپ چاپ چل رہے تھے جنوبی سمت میں مصری چوکیوں کی طرف — ٹھہر میں ہم نو کے نو فرد بے گھر پناہ گزین ہو گئے تھے۔

ہمارے قدم تھکے اور بوجھل تھے۔ ہمیں کچھ عجیب طرح سے احساس ہوا۔ جیسے یہ زمین اب ہماری نہ رہی۔ کمر جھکائے اور مضمحل ہم آگے بڑھ رہے تھے جیسے ہم ان تمام لوگوں کے دکھ اور تکلیفوں کا بوجھ ڈھو رہے تھے جنہیں روئے زمین سے اب تک بے گھر کیا گیا ہو۔

آس پاس کچھ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہمارے پڑوسی بھی اپنے گھر چھوڑ رہے تھے۔ ہر خاندان ایک چھوٹی لالٹین لئے تھا۔ ان لالٹینوں کی گنتی سے بے گھر لوگوں کے خاندان کی تعداد آسانی سے بتائی جا سکتی تھی۔

ہم لوگ ایک ویران، سنسان علاقے سے گزر رہے تھے۔ ہر طرف گھور اندھیرا تھا۔ اچانک میری چھوٹی بہن ہدیٰ نے ایک بھیانک چیخ ماری اندھیرے میں ہم بوکھلا اٹھے۔ آگ کی ایک دہکتی گیند نے ہماری آنکھیں چکا چوند کر دیں۔ ایک بھیانک دھماکہ ہوا۔ آگ کا فوارا آسمان کی طرف اُچھلا اور ہم نے اپنے چہروں پر ایک جلن محسوس کی۔ اس سے پہلے کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ کیا ہو رہا ہے سمیر بھیانک آواز میں چلایا۔ و۔ا۔سیم!!!

ہم نے پاگلوں کی طرح اس کے کپڑے میں لگی آگ بجھانے کی کوشش کی۔ ابا نے اُسے اپنے چغے میں لپیٹ لیا۔ وہ بُری طرح گھائل ہو چکا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس کا بچنا ممکن نہیں۔ وہ بار بار چیخ چیخ کر "اماں اماں" پکار رہا تھا۔

داہنی جانب — سمیا نے گھبراتے ہوئے اشارہ کیا۔ پٹرول پمپ میں آگ لگ گئی تھی۔!

ہم لوگ بے تحاشہ بھاگ رہے تھے۔ ابا اپنی بوڑھی باہوں میں وسیم کو اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ پہلا شکار تھا۔ میدان جنگ میں کھیت ہونے والا — پہلا سپاہی!

ہم بھاگتے بھاگتے ایک پہاڑی پر پہونچے۔ جہاں ہم اپنے کو آگ سے زیادہ محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ ننھے وسیم کا حال معلوم کرنے کے لئے ہم سب ابا کو گھیرے ہوئے تھے۔ ابا کے لبادے میں لپٹا وہ آخری سانسیں گن رہا تھا! اس کی دونوں معصوم آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ گالوں پر آنسوں ڈھلک رہے تھے۔ وہ رہ رہ کر کانپ رہا تھا۔ کچھ کہنے کے لئے اس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ لیکن آواز نکل نہ پا رہی تھی۔

اس کی گھومتی نظریں اپنی ماں کے چہرے پر آکر ٹھہر گئیں۔ ہاجرہ نے آنسو بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ بولنے کی کوشش نہ کرو میرے بیٹے! اس کا گلا بھر آیا اور وہ رونے لگی۔

بچے نے بڑی کوشش سے جس میں اُسے بے حد تکلیف ہو رہی تھی اپنا ہاتھ جو ابا کے لبادے میں چھپا تھا، آگے بڑھایا۔ اکھڑے ہوئے اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں بدبدایا — "دیکھو اماں، میں نے اُسے توڑا نہیں۔"

اُسے زوروں کی ایک کپکپی آئی۔ اس کا جسم سکڑنے لگا۔ دھیرے دھیرے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ پتھرائی آنکھیں مند گئیں۔

(بقیہ ص ۴)

# تابوت سے گہوارے تک

مائی نگو

بوڑھے اندھے کی جھونپڑی بانسوں کے جنگل میں تھی۔ خود اس کی جھونپڑی بھی بانسوں کی بنی اور بانسوں سے چھائی ہوئی تھی۔ اور چاروں طرف بھی بانس ہی بانس تھے — اونچے اونچے بھورے رنگ کے، موٹے، سخت مضبوط اور نیچے نیچے، سبز رنگ کے، پتلے پتلے، ملائم نرم، لچکدار — ان ہی بانسوں میں بہت سے لق لقوں نے اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے اور جھٹ پٹے کے وقت سب نر مادائیں اُن کے بچے اتنا شور مچاتے لڑتے اور پھڑپھڑاتے کہ سامنے والے چبوترے پر ایک ہنگامہ سا مچا رہتا۔ بانسوں کے پتے اُن کی بیٹ سے سفید ہو جاتے اور پھر جب خزاں کا موسم آتا تو اتنے پتے جھڑتے کہ اندھے کی جھونپڑی کی چھت ڈھک جاتی —

اسی جھونپڑی کے پاس وہ جگہ تھی جہاں بھینسے چرانے والے لڑکے چشمہ پر نہایا کرتے تھے، اُس کنارے پر ایک سوکھا پیپل کا پیڑ کھڑا تھا جس کی صرف دو شاخیں تھیں جو ادھر اُدھر نکلی ہوئی تھیں، بیچ سے تنا جھک گیا تھا — اور دُور سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے کوئی آدمی دوزانو ہو کر اپنا سر کٹوانے کے لئے تیار، دونوں ہاتھ اٹھائے فریاد کر رہا ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ اُس پار کے اُس پیپل اور اس پار کے اس بوڑھے اندھے کی عمر ایک ہی تھی!

اندھا بوڑھا نہ جانے کب سے یہاں رہتا تھا، اب سے کوئی پندرہ سال پہلے جب اُس کی عمر ستر برس کے قریب تھی تب ایک روز جاڑوں کی ایک رات میں بھٹکتے ہوئے اس کی جھونپڑی میں پناہ لی تھی اور صبح کو اُن کے جانے کے بعد اس نے دیکھا کہ وہ لوگ ایک کونے میں ایک منّی سی بچی کو سوتا چھوڑ گئے تھے۔ اُس وقت اندھے کو تھوڑا تھوڑا سجھائی دیتا تھا۔ اُس نے بچی کو گود میں اٹھایا تو وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی شاید وہ اسی لئے اس کو چھوڑ گئے تھے کہ اس کے مرنے میں بس ذرا ہی سی کسر باقی تھی — مگر اب بوڑھا اس کو رکھنے کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا: بچی کے آجانے سے سنسان جھونپڑی میں جیسے جان سی پڑ گئی۔ اب تک وہ بالکل تنہا رہتا آیا تھا۔ جوانی میں اُس نے ایک آدھ بار عشق لڑانے کی کوشش کی تھی مگر وہ اتنا مفلس تھا کہ کسی عورت نے اس کی بیوی بننا پسند نہیں کیا۔

وہ دراصل گاؤں کا رہنے والا بھی نہیں تھا۔ کہیں باہر سے آیا تھا اُس کے پاس کچھ اوزار تھے، بڑھئی کا تھوڑا بہت کام کر لیتا تھا۔
مگر کام بھی یہاں کیا تھا۔ کبھی بانس کی کوئی کرسی بنا دی، کبھی کوئی دیمک لگا پلنگ یا پایہ ٹوٹی کرسی مرمت کر دی اور بس۔

پھر ایک دن ایک عورت آئی اور اُس نے اُسے ایک نئی چیز بنانے کا آرڈر دیا مگر وہ اس آرڈر سے مطلق خوش نہ ہوا بلکہ اُسے کوفت ہوئی کیونکہ وہ اپنے بدنصیب بچے کے لئے چارپائی تابوت بنوانا چاہتی تھی۔ بوڑھا بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھوں سے کوئی ایسی چیز بنے جو ہمیشہ کے لئے مٹی میں دفن ہو جائے۔ اس لئے اس نے انکار کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ عورت بے چاری اتنا روئی پیٹی اور اس نے بوڑھے کی اتنی خوشامدیں کیں کہ آخر وہ راضی ہو گیا — اور اس کے بعد تابوتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ فرانسیسی شہنشاہیت کے دور میں جتنے بچے پیدا ہوتے تھے اس کی آدھی تعداد موت کا شکار ہوتی تھی! رفتہ رفتہ بوڑھا بڑھئی بچوں کے تابوت بنانے کا ماہر سمجھا

جانے لگا۔ اور اسی کی آمدنی سے وہ ننھی سی بچی پلنے لگی جو بن بلائے اُس کے گھر آگئی تھی، بے کہے اس کی بیٹی بن گئی تھی۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوگ پرانے تابوت لے آتے جو انہوں نے قبرستان کی زمین کھود کر حاصل کئے تھے یا دیمک لگے ہوئے پلنگ کواڑوں کے گھنے ہوئے پلنے جا فریاں اور پارٹیشن — اور اُس کے ہاتھوں میں آکر وہ بہترین تابوتوں کی شکل اختیار کر جاتے۔ بوڑھا بڑھئی دوسروں کے غموں سے گھرا اپنی فنکاری کا مظاہرہ کرتا اور اس کی چھوٹی سی جھونپڑی ہمیشہ اوروں کے دُکھ بھرے آنسوؤں سے نمناک رہتی۔ اسے کبھی کسی کی مسکراہٹ نصیب نہ ہوتی اور اس کا دل ایسا بکھرا ہوا رہتا جیسے گوڑا ہوا مگر ویران کھیت، جیسے بھوئے یا نی برسانے والے بادل کا وہ ٹکڑا جسے تیز ہواؤں نے تتر بتر کر دیا ہو گا۔ رات کو اس کو خوابوں میں دکھائی دیتا کہ ننھے منے ہنستے گاتے کودتے چلتے بچوں کا ایک گروہ اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہے، پھر یک بیک جھپکنے میں سب کے سب زمین پر گر کر تڑپنے لگے، اُن کے ننھے منے دل بیٹھنے لگے اور بیٹھتے بیٹھتے بالکل بیٹھ گئے اور وہ ساکت اور بے جان ہو گئے، پھر اُن کی لاشیں تابوتوں میں رکھی جانے لگیں جو اُس نے بنائے تھے، اُن کی مائیں اُن کی طرف ہاتھ پھیلائے روتی پیٹتی دوڑ رہی ہیں مگر موت کا ظالم ہاتھ اُن سے کہیں زیادہ مضبوط ہے — اندھیرا ہے، کہرا پڑ رہا ہے اور لوگ اپنے بچوں کے تابوت کندھوں پر اٹھائے کیچڑ بھرے، راستے پر لے جا رہے ہیں جس پر گھپ اندھیرا ہے اور جو راستہ کبھی ختم ہی ہونے میں نہیں آتا۔

اس سال جاڑوں کے موسم میں اُس کے اور آس پاس کے گاؤں میں چیچک کی وبا پھیلی، اتنے بچے مرے کہ ٹھیک سے دفن ہونے کی بھی مہلت نہ ملتی تھی۔ نہ جانے کتنے بغیر تابوتوں کے دفن کر دیئے گئے۔ بہت سے مرے ہوئے بلکہ مرتے ہوئے بچوں کو بھی اسی راستے سے قبرستان کی طرف لیجایا جاتا رہا جو بوڑھے کی جھونپڑی کے پچھواڑے سے نکلتا تھا۔ رات کو بوڑھے کی یہی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ جھونپڑی میں چراغ جلائے، اندھیرے میں گھٹنوں پر سر رکھے وہ ساری ساری رات بیٹھے بیٹھے کاٹ دیتا تھا۔ مرنے والوں کی کراہیں، چیخیں، رونے والوں کی آہ و بکا ایسی لگتی تھی جیسے قبرستان میں جنگلی بلیاں رو رہی ہوں بوڑھے کی منہ بولی بیٹی بھی چیچک میں مبتلا ہو گئی۔ بوڑھے نے بانس کی کھپچیوں سے ایک ٹوکری سی بنائی اور اُس میں اُسے لٹا کر کیلے کے پتوں سے ڈھک دیا۔ ننھی سی بچی کی سانس مشکل سے آجا رہی تھی۔ کھانسی کے دھچکے اُس کے سارے وجود کو جھنجھوڑے ڈالتے تھے۔ بوڑھے کا کھانا پینا چھوٹ گیا۔ اس کی ٹوکری پر وہ سر ٹہوکے آنسو بہایا کرتا۔ کیا اُس کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ اپنی بچی کا تابوت بنائے! کیسے وہ چیچک سے زندہ بچ گئی۔ یہ ایک معجزہ تھا بیماری نے اس کے چہرے پر اور جسم پر گہرے نشان ڈال دیئے۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی مگر نہ جانے کیسے وہ مری نہیں۔

پھر جب اُس میں ذرا سی طاقت آگئی تو بوڑھے نے اُسے اٹھایا، اپنے کندھے پر باندھا۔ ہاتھوں میں اپنے اوزار اور کچھ چیتھڑے گدڑے تھے وہ اُٹھائے اور شہر کی طرف چلا گیا۔

اگست انقلاب کی کامیابی کے بعد وہ پھر گاؤں لوٹا۔ جدوجہد آزادی کا پانچواں سال تھا۔ اس چھوٹی سی ندی کے پار والے کنارے پر وہ پیپل کا پیڑ ابھی تک تھا مگر دشمن نے اس کے دونوں ہاتھ کاٹ کر اس کے تنے پر اپنی مشین گن جمائی تھی۔ اور اُس سے وہ بوڑھے کے گاؤں پر گولیاں برساتے تھے۔ بوڑھا گاؤں پہونچا ہی تھا کہ بانسوں کے اس جنگل میں ایک گولہ پھٹا اور وہ اندھا ہو گیا۔ اب وہ اپنے کاریگر ہاتھوں کے استعمال سے معذور ہو گیا۔ اور اپنی بچی کی محنت پر بسر کرنے پر مجبور ہوا۔ وہ اب بڑی ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تو ضرور تھے مگر وہ محنتی، ذہین اور ملنسار لڑکی تھی۔ کھیتوں یا گھروں میں محنت کر کے وہ اتنا لے آتی تھی کہ وہ اپنا اور اپنے اندھے باپ کا پیٹ پال سکے۔ گاؤں میں جو آزادی کمیٹی بنی تھی اس کے لئے پیغام رسانی کا کام بھی کرتی تھی، گوریلا سپاہیوں کی رہبری کرنا بھی اس کا کام تھا اور راتوں کے اندھیرے میں سپاہیوں کے لئے کشتی کھینا بھی اس کے ذمہ تھا۔

دھیرے دھیرے بوڑھا اپنی قسمت پر شاکر ہو گیا۔ اُس کی جھونپڑی گوریلا نوجوانوں کی پناہ گاہ بن گئی اور وہ اُن کی خدمت میں لگ گیا۔ اس میں ایسی گہری کھائیاں بھی وہ کھودتا تھا جس میں دشمن کے حملے کے وقت سپاہی پناہ لے سکیں۔ اس کے لئے رات و دن برابر تھے۔ آنکھوں کا نور کھو جانے کے بعد اُسے تاریکی سے کیوں گھبراہٹ ہوتی! وہ رات کو دریا پر کشتی کھیتا تھا۔

امن قائم ہو جانے کے ساتھ ہی گاؤں کمیٹی نے سب سے پہلے اسکا

اور ہسپتال قائم کرنے شروع کئے"، بوڑھے کی بیٹی کو دائی کا کام سکھانے کی ٹریننگ لینے کے لئے بھیجا گیا اور وہ اسے پورا کر کے واپس آئی تو گاؤں کے زچہ خانے کی نگران بنا دی گئی۔

بوڑھے کی جھونپڑی کے پیچھے جو انتظار گھر تھا اور جہاں بچوں کی لاشیں دفن سے پہلے رکھی جاتی تھیں، وہ دشمنوں کے ہوائی حملوں سے کھنڈر ہو گیا تھا، گاؤں کمیٹی کے والنٹیروں نے مل کر اس کے ملبے سے ایک نئی عمارت کھڑی کی — دو کمروں کا ایک نیا مکان، جس کی اینٹوں کو باہر سے لال رنگا گیا۔ اندر سے سفید پتائی کی گئی اور اس پر ایک بڑا سا سائن بورڈ لگایا گیا — "زچہ خانہ"!

بوڑھے کی لڑکی اس زچہ خانے میں کام کرنے لگی۔ صبح سے شام تک وہ اپنا سفید لباس پہنے، ہاتھ میں قینچی نشتر سوئی کا بکس سنبھالے اپنے بلاوز ایسی سفید روئی کا بنڈل اٹھائے تیز تیز ادھر اُدھر گھومتی رہتی تھی، پرانے نظام نے اس کے جسم پر گہرے داغ اور نشان چھوڑے تھے مگر اس کی رُوح تھی پاک اور صاف! اور بچوں کو جنم دینے والی ماؤں کو اس کی صورت سے بھلا کیا لینا تھا۔

امن ہوتے ہی بچوں کی تعداد بڑھتی گئی اور بوڑھے کے کان میں اکثر بچوں کے رونے کی آوازیں آنے لگیں، وہ ابھی تک اپنی جھونپڑی میں رہتا تھا، وہی جھونپڑی جو بانسوں کے گھنے جنگل کے آغوش میں تھی، ڈھیروں تعلیق اب بھی آکر بانسوں کے جھنڈ پر بیٹھتے تھے اور چاروں طرف کی ہریالی ان کی بیٹ سے سفید ہو جایا کرتی تھی۔ مگر بچوں کا رونا اب اور طرح کا ہوتا تھا۔ تکلیف اور موت کی وہ کراہیں اب نہیں سنائی دیتی تھیں۔ بلکہ بچہ ماں کے جسم سے باہر آکر ایک گہری سانس لے کر زور سے چیختا تھا۔ وہ چیخ ایک پرسکون مسیح کی آمد پر شہنائی کی تان ایسی لگتی تھی۔ جب انسان پہلی بار زندگی کو سلام کرتا ہے۔ اپنے وطن اور پوری انسانیت اور نا پیدا کنار فضاؤں کو صدا دیتا ہے! بچے کی آنکھ کھلتی اور ایک روشن مستقبل کے نور سے مچھا کے پھر بند ہو جاتی۔ اور کمرے میں اس کی پکار گونجنے لگتی۔ اور تھکی ہاری ماں اپنے بچے کی پہلی آواز سن کر اطمینان کا سانس لیتی۔

پھر ایک دن بوڑھے نے ایک نرم نرم ڈالیوں والے بانس کے پیڑ کو کاٹا — اُسے مچھلی پکڑنے کے لئے ایک ٹوکری بنانی تھی۔ ادھر چند دنوں سے دریا کی سطح پر گھاس پھوس اکٹھا ہونا شروع ہو گیا تھا جس کے معنی یہ تھے کہ مچھلیاں اور جھینگے آنے شروع ہو گئے تھے — وہ مچھلی پکڑنے جائے گا،

اب ٹوکری تقریباً تیار ہو رہی تھی۔ اُس کا قطر اتنا بڑا تھا جتنے اس کے دونوں ہاتھ پھیل کر ہوتے تھے۔ اور وہ اتنی بڑی بڑی کھپچیوں سے بُنی گئی تھی جتنی اس کی پہلی اُنگلی۔

دوپہر کو اس کی بیٹی کھانا کھانے گھر آئی اور اپنے بوڑھے باپ کی حیرت انگیز کاریگری دیکھ کر تعجب سے کھڑی کی کھڑی رہ گئی، پھر وہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور بڑی دیر تک ٹوکری کی بنائی دیکھتی رہی، پھر بولی مجھے تو معلوم نہیں تھا آپ اتنی اچھی ٹوکریاں بھی بُن لیتے ہیں۔"

بوڑھا چُپ رہا — اس کی انگلیاں چلتی رہیں — اور وہ مسکراتا رہا۔ وہ اور قریب کھسک آئی "تو پھر، آپ میرے لئے کچھ پالنے کیوں نہیں بُن دیتے؟"

"کچھ کیا نہیں بُن دیتے؟" بوڑھا ششدر رہ گیا، اُس کی بے نور آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔

"ارے پالنے گھوارے، — ہاں ہاں، بچوں کے لئے پالنے — بات یہ ہے کہ میرا جو زچہ خانہ ہے وہاں ابھی سامان کی بہت کمی ہے اور . . . کمیٹی بھی کہتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح کام چلاؤ۔ اتنی جلدی سب کو سب سامان کہاں سے دے دیں — تو میں نے سوچا کہ بچوں کے لٹانے کے لئے . . . ."

"ہوں" بوڑھے نے گردن ہلائی اب اُس کی سمجھ میں کچھ کچھ آرہا تھا۔ سر اٹھا کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا . . . "پالنے . . . ؟ ہوں ہوں۔" جیسے وہ تصور ہی تصور میں ہواؤں پر پالنے کا نمونہ دیکھ رہا ہو پھر اُس نے دونوں ہاتھ آگے کو بڑھائے اور بانسوں کے جنگل کی طرف چلا —

بانس کا ایک نرم لچک دار پودا، پھر ایک اور پھر ایک اور، اور ایک موٹا سا مضبوط بانس، کٹا رہا بنانے کے لئے — دو دن بعد گہوارہ تیار ہو گیا جو نیم بیضاوی شکل کا ہے اور پھر وہ زچہ خانے کے ایک کمرے میں ڈوری سے لٹکا دیا گیا۔ اور آہستہ آہستہ ایسے ڈولنے لگا جیسے پانی پر ناؤ دھیمے دھیمے بہتی ہے۔ اس کے اندر سے بچے کے ہلتے ہوئے پاؤں اور زور زور سے ہوائیں چلتی ہوئی پتواروں کی طرح لگ رہی تھیں۔

پہلے گہوارے کے بعد اندھا بوڑھا گہوارے بنانے میں جٹ گیا —

اس عمر پر آکر، زندگی کے ستراسی برس گزارنے کے بعد تو اُسے اپنی مرضی کا کام ملا تھا۔ بانسوں کا جنگل چھدرا ہوتا گیا اور بانسوں کی ننھی ننھی سفید ملائم پھنگیں اُڑ اُڑ کر بوڑھے کی داڑھی پر بیٹھ جاتیں، جب وہ گھوارے بننے بیٹھتا تو ننھے منے بچے اُسے گھیر لیتے اور وہ اُن کے درمیان ایسا لگتا جیسے کوئی بھگوان اپنے پجاریوں سے گھرا بیٹھا ہے: — اُس نے گھوارے میں کچھ خصوصیتیں بھی پیدا کرنی شروع کر دی تھیں۔ لڑکوں کے لئے سیدھے سادے جالی دار مگر لڑکیوں کو بھی ذرا نخرہ ہوتا ہے، اُن کے لئے جالیوں میں پھول بھی اور کناروں پر بھی ذرا زیادہ سجاوٹ! پھر وہ لکڑی یا بانس کے منے منے کھلونے بنا کر اُن میں لٹکاتا۔ کبھی بھینس، کبھی چھوٹا سا ہل اور یا پھر موٹر کار، ہوائی جہاز، یا کتاب اور یا پھر ستار یا بانسری۔ یہ سب کھلونے بچے پر اثر کریں گے۔ اس کے لئے شگون بنیں گے، وہ بڑا ہو کر کسان بنے گا یا مزدور یا انجینئر یا ہو سکتا ہے وہ کوئی ناچنے والی بنے۔ ستار بجانے والی یا بانسری کی تانیں چھیڑنے والی بنے۔

وہ ابھی تک اسی دریا کے کنارے، اسی گاؤں میں اسی جھونپڑی میں رہتا تھا مگر اب جھونپڑی میں زندگی کی روشنی اور طاقت آگئی تھی لوگ آئے دن اس کے یہاں آتے تھے۔ اپنے بچوں کے لئے گھوارے خریدنے جب اُس نے چوراسیواں پالنا بنا کر ختم کیا تو شہر کی سرکاری دوکان سے کئی سو پالنوں کا آرڈر اس کے لئے آیا۔

اور اسی سال موسم بہار میں یکایک، اُس پار لگے ہوئے پیپل کے پُرانے ٹھونٹھ میں ایک اکھوا پھوٹا — سبز اکھوا — جس کے دو ننھے منے ہاتھ تھے — جیسے کسی ننھے سے بچے کے دو ہاتھ — یہ دو ہاتھ پہلے بھی تھے مگر دشمنوں نے اُنہیں کاٹ کر ٹھونٹھ پر مشین گن جمائی تھی اور اب یہ دونوں ڈالیاں ایسی لگتی تھیں جیسے انہی دونوں ہاتھوں نے اس مشین کو اس زور سے دھکیلا تھا کہ وہ سات سمندر پار جا پڑی تھی۔ جب بوڑھے کو کسی نے خبر دی کہ اُس پار کے پیپل میں پھر دو ڈالیاں نکل آئیں تو اُس نے اپنی بے نور آنکھیں اُوپر اٹھائیں اور پالنا بنتے ہی بنتے خبر لانے والے سے بولا "ہاں میں جانتا تھا مجھے معلوم تھا کہ یہ نئی زندگی ٹھونٹھ کو بھی ہاتھ بخش دے گی۔"

مترجم: رضیہ سجاد ظہیر

## (انگولا)

## اگستان مینتو

مین اقوامی شہرت یافتہ انگولا کے محبوب رہنما اور شاعر اگستان مینتو کی تخلیقات میں یقین، عزم، اور نئی زندگی کا پیغام ملتا ہے۔ اُن کی نظموں کا بہت سی غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

# نئی زندگی کی تلاش میں

میری ماں!
(سیاہ فام مائیں جن کی اولادیں رخصت ہو چکی ہیں)
تم نے مجھے سبق پڑھائے صبر، اُمید اور انتظار کے
جو تم نے کٹھن دنوں میں اپنائے تھے۔
لیکن میری زندگی نے جھوٹی اُمیدوں کے بھرم توڑ دیئے
میں وہ نہیں ہوں جو دوسروں کا انتظار کرے
بلکہ وہ ہوں، جس کا دوسرے انتظار کریں
اور ہم خود اُمیدوں کے پیمبر ہیں
تمہاری اولادیں
جو زندگی دینے والے یقین کی شمع پر قربان ہیں
تمہاری اولادیں
نئی زندگی کی تلاش میں .....

کہانی
جنوبی افریقہ

# نسل

رچرڈ رائیو

ہم اس سماج کے ایک اہم جزو ہیں۔ ایک ایسا سماج جس کی آبادی کا حصہ مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے جس میں کسی انسان کو صرف اس لئے ذلیل کیا جاتا ہے کہ اُس کا رنگ کالا ہے . . . . "

کالری نے اسٹیج پر اپنی نگاہیں جما دی تھیں اور تقریر کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں اتنی بات آ رہی تھی کہ تقریر کا یہ حصہ نہایت اہم ہے اور اُس کی حقیقت میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے۔ عالم مقرر بولتے بولتے رُک گئے تھے اور ایک گلاس سے پانی پی رہے تھے۔ کالری کو اپنا گلا تر ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

اکتوبر کے سورج کی گرم کرنیں بھیڑ میں کھڑے ہوئے لوگوں کو بھی نہلا رہی تھیں۔ آسمان بے حد صاف تھا۔ یہاں تک کہ سامنے کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر بھی بادل نہیں دکھائی دے رہے تھے۔

" یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ہر اُس قانون کو توڑیں جو انسان کو زندہ رہنے کے حق سے محروم رکھتا ہے جو لوگ رنگ کی وجہ سے ہمی اور آدمی کے درمیان فاصلہ رکھے ہوئے ہیں اُن سے ہمیں بہادری کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔ آپ کے بچے عمر بھر اس حق سے محروم رہ جاتے ہیں جو سب کو ملا ہے، ان کو ہر طبقہ میں ذلیل کیا جاتا ہے چاہے وہ سماجی بنیادی ہو، یا کسی اور شکل میں ہو۔ . . . "

کالری اپنے اندر ایک طوفان محسوس کر رہا تھا۔ ایک ایسا طوفان جس سے باہر نکلنے کے لئے اس نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اسٹیج پر اب اور کوئی صاحب نئے نظریات کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ ان مقرر کے نظریات کے تحت کالری کے پاس اور اُس کے بچوں کے پاس بھی کچھ حقوق تھے۔ ان باتوں نے اچانک اُسے چونکا دیا۔

یہ سب سوچتے سوچتے کالری کی بھنویں سکڑ کر پاس پاس آ گئی تھیں۔ اسٹیج پر ابھی اور کئی مقررین تقریر کرنے کے لئے باقی تھے۔ گورے اور کالے دونوں اور دونوں کے تعلقات برابر تھے۔ اس وقت رنگ سے کسی قسم کا فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ نیلی پوشاک پہنے ایک انگریز خاتون اینجلی کو سگریٹ پیش کر رہی تھیں۔ اینجلی اس علاقے کا ایک کالا مزدور لیڈر تھا۔ کالری کو بہت تعجب ہوا۔ اُس نے محسوس کیا کہ یہ سگریٹ گویا اس کو ہی پیش کیا گیا ہے اور تب اس نے جیب سے کوالا کا پیکٹ نکالا۔ اس کو اپنے قصبے کی یاد آئی۔ اگر کہیں اینجلی نے اُس کے یہاں کے بوڑھے انگریز کی لڑکی کو سگریٹ پیش کیا ہوتا تب تو بوڑھا بے ہوش ہی ہو جاتا۔ اُس نے تصور کی آنکھ سے یہ دیکھا کہ اس کا چچا آڈیکیلاس بوڑھے کی بیوی کو سگریٹ پیش کر رہا ہے۔ یہ تصور اتنا دلچسپ تھا کہ وہ قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکا اور ادھر اُدھر کھڑے ہوئے لوگ چونک کر اُسے دیکھنے لگے۔ اپنی جھینپ مٹانے کے لئے وہ سگریٹ جلانے کی نقل کرنے لگا۔

اسٹیج پر ایک گوری خاتون نیلی چست پوشاک پہنے ہوئے تھیں۔ اُس کے گورے بازو کافی اُوپر تک کھلے ہوئے تھے جو کچھ وہ اُن خاتون سے سُن رہا تھا اگر وہ سچ ہے تب تو وہ بھی اتنا ہی اچھا ہے جتنا کہ اور دوسرے لوگ۔

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا لیکن خود ہی وہ ہوشیار ہو گیا کہ کہیں اس کی یہ بات کسی اور نے سن نہ لی ہو اور خوف سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اب وہ گوری خاتون کہہ رہی تھیں "ہر اُس قانون کو چنوتی دینی چاہیے جو ایک انسان کے مقابلے میں دوسرے انسان کو ذلیل سمجھتا ہے۔ کبھی کسی بھی ٹرین میں جا کر بیٹھ جائیے۔ کسی بھی ریستوران میں بے خوف داخل ہو جائیے۔" کالری نے سوچا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہے۔ وہ تو کسی بھی حال میں بہتر سے بہتر فلم دیکھ سکتی ہے۔ بہتر سے بہتر تیراکی کی جگہ میں تیر سکتی ہے۔ خوبصورت سے مکان میں رہ سکتی ہے وہ اس بوڑھے دقیانوس انگریز کی لڑکی سے کئی گُنا حسین اور خوبصورت ہے۔ دُھوپ میں چمکتے ہوئے اُس کے خوبصورت بال کیا غضب ڈھا رہے تھے؟

پھر اُس نے ایک اسکیم بنانی شروع کی۔ ایک خوفناک اسکیم ذہن میں آتے ہی اس کو نکال دینے کی کوشش کی۔ جیسے جیسے اُس کی تقریر ہوتی رہی اس کے دماغ میں وہی اسکیم مضبوطی سے گھر کرتی رہی۔ وہ قانون توڑے گا وہ خود یعنی کالری۔ آج کیلاس اور بوڑھے کو وہ حیرت میں ڈال دے گا اور بوڑھے کی لڑکی نیلی کو بھی چاہے وہ زہر کھانے کے برابر ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ چنوتی اُسے قبول کرنی ہوگی۔ پھر وہ بھی ویسے ہی مسکرائے گا جیسے اخباروں میں چھپی تصویریں مسکرا رہی ہیں۔

جلسہ ختم ہو چکا تھا، وہ اس بھیڑ میں سے راستہ بنا کر نکل رہا تھا اسی وقت ایک تیز آتی ہوئی کار کے بریک لگنے کی زبردست آواز سے وہ چونک پڑا۔ اور اچھل کر سڑک کے پار کھڑا ہو گیا۔ وہ خوف سے گھبرایا ہوا تھا اور کانپ رہا تھا۔ غصے میں بھرا ایک گورا چہرہ کار کی کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا —

"کیوں بے کلوٹے کے بچے؟ ایسے ہی سڑک پر چلتے ہیں؟"

کالری غصے سے اُسے گھورتا رہا۔ اُس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ یقیناً اُس آدمی نے ہی اُس گوری خاتون کو اس کالے انجیلی کو سگریٹ پیش کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا ورنہ وہ اس طرح نہ چیختا۔ کالری کو سخت الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اُس نے سوچا کہ جلدی سے ٹرین پکڑ کر گھر روانہ ہو جانا چاہیے۔ یہ ہی اُس کے حق میں بہتر ہوگا۔

اسٹیشن پر پہنچ کر وہ پھر حیران ہو گیا۔ ہزاروں لوگ ٹہل رہے تھے۔ کالے، گورے، بھورے، سب ہی طرح کے۔ راہج قاعدوں کو چنوتی ضرور دینا چاہیے۔ اُس نے سوچا۔ کالری کو تقریر کے الفاظ یاد آئے لیکن وہ یہ نہیں سوچ پا رہا تھا کہ وہ کس کو اور کس طرح اسے عملی جامہ پہنائے۔؟

وہ خاموشی سے ٹہلتا رہا اسی وقت اُس کی نگاہ پلیٹ فارم کی ایک بنچ پر پڑی جس پر سفید رنگ سے جلی حروف میں لکھا ہوا تھا "صرف گوروں کے لئے" اُس نے سوچا کہ اب کچھ بات بنی اور اس طرح ایک موقع اس کے ہاتھ آیا اتنی معمولی لکڑی کی بنی یہ بنچ اور یہ حکم۔ ایسی سینکڑوں ہزاروں بنچیں اس کے قبضے میں ہیں لیکن اس بنچ میں ساری بُرائیاں ایک ساتھ داخل ہوئیں۔ اس کے اور انسانیت کے درمیان یہ بنچ ایک رکاوٹ کا کام کر رہی تھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ اگر اس بنچ پر وہ نہیں بیٹھا تو اُسے خود کو آدمی کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اُس کے انسان ہونے کا دارومدار اس بنچ پر ہی بیٹھنے سے ہے۔ اس سنہری موقع کو اُسے کسی بھی قیمت پر جانے نہیں دینا چاہیے اور وہ یہ سوچ کر ہی اس بنچ پر بیٹھ گیا۔

بنچ پر بیٹھنے کے بعد بظاہر وہ پُرامن دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ دو متضاد خیالات اُس کے ذہن میں ہیجان پیدا کر رہے تھے۔ ایک آواز کہہ رہی تھی تمہیں اس بنچ پر نہیں بیٹھنا چاہیے پہلا خیال اس کی شخصیت کو جھنجھوڑتا۔ کھیتوں پر اُس کے جان لیوا کام کی دلاتلاس کے باپ کی شکل آنکھوں کے سامنے آجاتی اور اس کے باپ دادا کی تاریخ گھوم جاتی جو خچر کی طرح پیدا ہوئے۔ خچر کی طرح زندہ رہے خچر کی طرح مر گئے۔ دوسری آواز میں مستقبل کے خواب تھے۔ کالری تم ایک ا ہو، تم نے وہ ہمت دکھائی ہے جو تمہارے والد بھی نہ دکھا سکے تم کو انسان کی ملے گی۔

کالری نے جیب میں سے ایک سگریٹ نکالا اور کش لینے لگا۔ کوئی کے اس طرح بیٹھنے پر غور کرتا ہوا نہیں دکھائی دے رہا تھا ایک اینٹی کلا تھا۔ دُنیا اب بھی اسی طرح تھی، لوگ اب بھی پیدا ہو رہے تھے، مر رہے آواز نے چیخ کر یہ نہیں کہا کہ کالری کو فتح ملی ہے۔ وہ بالکل دوسرے عا

ی طرح بھیڑ بھرے پلیٹ فارم پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ کیا یہ اُس کی فتح تھی؟ کیا حقیقتاً عام آدمی ہو گیا تھا۔ اچھے لباس میں سجی ہوئی ایک گوری خاتون پلیٹ فارم پر ٹہل رہی تھی۔ کیا وہ بنچ پر بیٹھے گی؟ تب اُسے ایک آواز اندر کی طرف سے سُنائی دی۔ تمہیں کھڑا ہو جانا چاہئے تاکہ گوری خاتون کو تمہارے بغل میں نہ بیٹھنا پڑے۔ کالری نے اپنی آنکھوں کو ایک خاص انداز میں چھوٹا کرتے ہوئے اور بھی اطمینان سے سگریٹ پینا شروع کر دیا۔ وہ خاتون پلکیں جھپکائے بغیر اُس کے بغل سے گزر گئی اور پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرتی رہی اور اُس کے حقوق کو چنوتی دینے کے سلسلہ میں خوف زدہ تھی یا اُس نے اس طرف دھیان ہی نہ دیا۔

کالری نے محسوس کیا کہ وہ بہت زیادہ تھک گیا ہے۔ اب اُس کے دماغ میں ایک نیا خیال رینگ رہا ہے۔ ایک بہت بڑی قیمت چکانے والا خیال۔ یہ ایک ایسا خیال تھا جو کہہ رہا تھا کہ تم اس بنچ پر چنوتی دینے کے خیال سے نہیں بلکہ اس لئے بیٹھے ہو کہ تمہیں بہت تھکن محسوس ہو رہی ہے۔ وہ اس بنچ سے نہیں اُٹھے گا۔ کیونکہ وہ بہت زیادہ تھک گیا ہے۔ یا اس لئے نہیں اٹھے گا کہ وہ چنوتی دینا چاہتا ہے۔

پلیٹ فارم پر اسی وقت آئی ہوئی ٹرین کی کھڑکیوں سے لوگ باگ ایک دوسرے کے اُوپر چڑھ اور اُتر رہے تھے۔ اتنی دھکم پیل مچی ہوئی تھی کہ کسی نے اُس کی طرف غور ہی نہ کیا۔ اس ٹرین میں وہ جا سکتا تھا۔ دُنیا کا سب سے آسان کام تھا کہ وہ اس ٹرین پر چڑھے اور ان تمام ہنگاموں سے دُور بھاگ جائے۔ چنوتیاں دینا اور بنچوں پر بیٹھنا اور دھوپ میں جلسہ! ہوں . . . یہ تو شکست ہوگی۔ انفرادی شکست۔

" ابے۔ بنچ خالی کر۔"

کالری نے اس سخت آواز پر دھیان دینا بھی مناسب نہ سمجھا اور خیال میں گم رہا کہ آڈیکیلاس اس وقت راشن کی دوکان پر اپنی سستی شراب کی ٹن میں کھڑا ہوا ہوگا۔

" میں کہتا ہوں بنچ خالی کر۔ کمینے۔"

اس بار کالری نے چونک کر حالات کا اندازہ لگایا۔ اور تب اُس نے بے حد نفرتوں سے غصے میں لال ہانپتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔

" اٹھو" اُس نے پھر چیخ کر کہا۔ کالری چپ چاپ اُسے گھورتا رہا۔ "ابے کالے! کیا میری آواز نہیں سُن رہا ہے؟"

کالری نے جان بوجھ کر ایک زوردار کش لیا اور بڑے غور سے سگریٹ کی جانچ کرنے لگا۔ تو اب اس کے امتحان کا وقت آ رہا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف اس طرح دیکھا گویا اکھاڑے میں دو مُکے باز ایک دوسرے کی طاقت کا اندازہ لگا رہے ہوں اور دونوں کو پہلا وار کرتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا ہو۔

" اچھا سالے رکو! میں ابھی پولیس لے کر آتا ہوں۔

کالری نے اب بھی اپنی طویل خاموشی نہیں توڑی۔ بولنے کا مطلب ابھی تک حاصل کی ہوئی عظمت سے ہاتھ دھونا ہوگا۔ ایک غیر معمولی خاموشی قائم رہی۔

" گھبرا مت۔ ابھی میں پولیس لاتا ہوں۔ اپنی زبان تو کیوں نہیں کھول رہا ہے۔"

کالری نے اچانک گورے آدمی کی کمزوری پر غور کیا۔ گورا نوجوان خود کوئی کارروائی کرتا ہوا گھبرا رہا تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ کالری نے بنچ کی جنگ کا پہلا راؤنڈ جیت لیا۔ دھیرے دھیرے بھیڑ وہاں جمع ہوتی گئی۔

" افریقہ" ایک جوکر نما آدمی اپنا انگوٹھا چکا کر چیخا۔

کالری نے اس طنز پر کوئی توجہ نہ دی۔ تمام لوگ دھیرے دھیرے اُسی طرف جمع ہوتے جا رہے تھے۔ سب کی نگاہیں اُس غیر معمولی واقعہ کی طرف جمی ہوئی تھی کہ ایک کالا آدمی گورے آدمی کی بنچ پر بیٹھ گیا۔

" ذرا اس کالے بن مانس کو دیکھو! بے جا حقوق دیئے جانے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے نا۔

" میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اُن کے لئے الگ بنچ بنی ہے . . . "

" آئے دو پولیس کو ابھی سالے کا بھرتہ بن جائے گا۔

" ارے صاحب ان پر کبھی اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ میرے یہاں پر اس طرح کا ایک نوکر تھا . . . "

کالری — سب کچھ سُنی اَن سُنی کر کے وہاں جما رہا۔ اس کی یہ حرکت اب یکے یقین میں بدل گئی تھی جو مرضی آئے لوگ کریں لیکن وہ کسی بھی حالت میں یہاں سے نہیں اُٹھے گا۔

" اچھا! تو یہ ہیں وہ حضرت! چل تو اُٹھ۔ خود تو یہ پڑھ نہیں سکتا۔"

سپاہی گرجا۔ کالری نے سپاہی کے پیتل کے بٹنوں اور بلّوں کی طرف دیکھا۔

"اپنا نام جلدی بول۔"

کالری اپنی خاموشی میں گم رہا۔ سپاہی کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ بھیڑ ہر لمحے بڑھتی ہی جارہی تھی۔

"تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ تم اس طرح کے لہجے میں ایک انساں سے گفتگو کرو۔" ایک بھدی خاتون نے یہ الفاظ کہے۔

"آپ اپنا کام کیجئے" سپاہی نے کہا "جب آپ کی ضرورت پڑے گی تو آپ کو بلوالوں گا۔ آپ ہی لوگوں نے اِن کافروں کا دماغ یہاں تک چڑھا دیا ہے کہ یہ لوگ اب گوری لڑکیاں پسند کرنے لگے ہیں۔"

"میں کہتی ہوں کہ تم اس سے قاعدے سے گفتگو کرو۔"

"دیکھئے مادام .... دیکھئے آپ ....." سپاہی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اُن خاتون کو کس طرح چُپ کرائے۔

"نہیں اُٹھتا ہے تو سالے کو ایک بوٹ لگاؤ۔"

کالری کی گردن پر ہاتھ لگاتے ہوئے گورے نوجوان نے کہا

"اٹھ سالے! اُٹھ حرام زادے۔"

کالری نے احتجاج کے طور پر بنچ کو پوری طرح سے پکڑ لیا۔ کئی آدمی مل کر اُسے اپنی جانب کھینچ رہے تھے اور بربریت کے ساتھ اس پر ظلم کر رہے تھے۔ اچانک اُسے محسوس ہوا کہ کسی نے اس کی آنکھ پر ایک گھونسہ جڑ دیا۔ آنکھ کے پاس سے خون بہنے لگا۔ سپاہی نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی پکڑنی چاہی اور اُسے بھیڑ میں لانا چاہا۔ کالری بھیڑ میں گھستا رہا اور اُس پر لاتعداد ظلم ہوتے رہے۔ اچانک ہی وہ کمزور پڑ گیا اور اس نے سوچا کہ اب لڑنا بے کار ہے۔ ہاں اب اُس کے مسکرانے کی باری ہے۔ وہی مسکراہٹ جو اخبار میں چھپی ہوئی تصویروں کے چہروں میں تھی۔ اس نے ایک غیر انسانی قانون کو چنوتی دی اور فتح پائی۔ نتیجہ کی پروا کس کو ہے۔

"اِدھر آسالے" سپاہی نے اُسے بھیڑ میں گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں..... ہاں . . . شوق سے" کالری نے پہلی بار اپنی زبان کھولی۔ اور سپاہی کی طرف ایسی گستاخ نظروں سے دیکھا جس میں گوروں کی بنچ پر بیٹھنے کی ہمت تھی۔

پیتر سس لومبا

# کانگو

عظیم دریا کے یہ کنارے
یہ سینے لوگل پوش وادیوں کے
ہے جن کو اب بھی اُمید فردا
یہ سب تمہارے ہیں تم ہی جانو
وسیع خطے زمین کے
اور دولتیں زمین کی
یہ سب تمہاری ہیں تم ہی جانو

چمکتے اور مہربان سورج کی گرم کرنیں
ازل سے اب تک
مداوائے درد کر رہی ہیں
شہید بے بس ستم رسیدہ
ہمارے اجداد کے یہ آنسو
چمکتے سورج کے منتظر ہیں
کہ پھر وہی تیز گرم کرنیں
یہ بہتا سیلاب خشک کر دیں

اور اس زمیں پر
اسی زمیں پر
سیاہ افریقی سرزمیں پر
سدا سے ہم تم ہیں جس کے شیدا
عظیم کانگو کی قوم کو تم
سُناؤ گے اب خوشی کے نغمے
اب اس کو آزاد تم کرو گے۔

# ایوہا کا

یوسف الصبائی

یوسف الصبائی :۔ انجمن افرو ایشیائی مصنفین کے سکریٹری جنرل اور قاہرہ کے ادبی کلچرل سوسائٹی کے رُوحِ رواں ہیں۔ آپ صاحب طرز ناول نگار ڈرامہ نویس، نقاد اور افسانہ نگار ہیں انہیں ادب کے بہت سے بین اقوامی انعامات حاصل ہو چکے ہیں۔ بہت سے ادبی، سیاسی جریدوں کے ایڈیٹر ہیں۔ ان کا تازہ ناول "ہم کانٹے نہیں بوتے" ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا ہے بہت سے ناولوں اور مختصر افسانوں کا مختلف غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

ایک دن بحث کے بیچ ایک دوست نے مجھ سے پوچھا "آپ کا کیا خیال ہے، کیا خوش قسمتی انسان کو وراثت میں ملتی ہے یا ہم اسے اپنی صلاحیت اور طاقت سے حاصل کرتے ہیں ؟"

"۔۔۔ میں سمجھتا ہوں خوش قسمتی قسمت سے ملتی ہے، انسان کی کوشش کا اس میں کوئی دخل نہیں۔"

اس نے میری بات سُن کر ایک لمبی سانس لی اور بولا "جیسے آپ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اس امید میں بیٹھے رہتے ہیں کہ اگر قسمت میں خوشی لکھی ہے تو مل جائے گی، کوشش کرنے سے کیا فائدہ!"

"جی ہاں، اور میں اپنے دعوے کے ثبوت میں مثال دے سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"۔۔۔ میرے دوست! اس بارے میں میرا نظریہ تم سے بالکل مختلف ہے میں سمجھتا ہوں قدرت کی طرف سے ہر آدمی کو خوش قسمتی ایک خاص مقدار میں عطا کی جاتی ہے۔ یہ مقدار کم یا زیادہ ہو سکتی ہے، مگر یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص بالکل تشنہ رہ جائے۔ انسان کے خارجی حالات سے خوش قسمتی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ حقیقت میں خوش قسمتی ایک دوا ہے جسے الماری میں بند رکھنے سے مریض کی حالت کبھی سنبھل نہیں سکتی۔ صحت کے لئے ضروری ہے کہ دوا استعمال کی جائے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ پیدائشی خوش قسمتی کو استعمال کرنے کی صلاحیت کچھ لوگوں میں کم ہوتی ہے کچھ میں زیادہ۔"

"معاف کیجئے۔ میں آپ کے خیالات سے متفق نہیں ہوں۔ قسمت میں دکھ لکھے ہوں، تو انسان ان دکھوں سے خوشیاں کیسے کشید کر سکتا ہے ؟" میرے دوست نے انکار میں سر ہلایا۔ میں سمجھ گیا۔ میری بات سے اس کی تسلی نہیں ہوئی۔ بات چیت جاری رکھتے ہوئے بولا "میں ایک بہت اچھے شخص کی کہانی آپ کو سُناتا ہوں۔ اگر ہم اس کے بارے میں آپ سے یہ کہیں۔ کہ اس کو بھی خوش قسمتی کا اتنا ہی حصہ ملا جتنا آپ کو، مجھے یا کسی دوسرے انسان کو، تو اُس سے بڑھ کر بے وقوفی کی بات کیا ہوگی۔"

"ہاں، تو وہ ایک ایسا شخص تھا، کہ ہر وقت اندر ہی اندر جلتا اور کڑھتا رہتا۔ جب دیکھو، غصہ اور شکایت کی سرتاپا تصویر۔ زمانۂ طالب علمی سے اس کی یہی حالت تھی۔ اُسے شبہ تھا کہ مدرس جان بوجھ کر اس پر ظلم کرتے ہیں اور اس سے نفرت کرتے ہیں۔ ساتھیوں سے وہ الگ الگ رہتا کیونکہ اُسے یقین تھا کہ اُن کی طرف سے فریب کے سوا اور کچھ نہیں مل سکتا عملی زندگی میں قدم رکھا تو اُس کے ہونٹوں پر ظلم اور ناانصافی کی شکایت رہنے لگی۔ وہ سمجھتا تھا اس سے بڑھ کر بے عقل اور کم تر خدا نے کسی کو نہیں بنایا، حالانکہ سچائی اس کے برعکس تھی اور وہ بہت عقل مند آدمی تھا۔ کسی کو کوئی چیز ملتی تو وہ جل کر کہتا۔ یہ چیز مجھے کیوں نہ

ل گئی۔ ہر حادثے سے وہ دُکھ اور کوفت سے دوچار رہتا۔ ماحول سے وہ بے زار تھا۔ جب بھی کسی سے ملتا یہی کہتا "آپ نے سُنا فلاں شخص کو یہ کچھ ملا ہے، بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے"۔ اُسے کسی نے خوش اور مطمئن نہیں دیکھا، نہ اُس کی زُبان سے شکریئے کے الفاظ سُنے۔ اُسے کسی پر اعتبار نہ تھا کسی سے وہ مطمئن نہ تھا اس کی ہر بات شکوہ تھی۔۔۔ اُس کی پوری زندگی شکوہ اور دُکھ سے بھری تھی۔ پھر ایک دن اُس نے شادی کر لی۔ جو لوگ اُسے جانتے تھے۔ وہ اُس کی بیوی کے لئے ہمدردی کا اظہار کرنے لگے۔ میں سمجھتا ہوں ایسا کرنے میں وہ حق بجانب تھے۔

وہ عورت اس کے جیون ساتھی کے رُوپ میں زندگی کے دن بتانے لگی۔ وہ اُس کے تلخ دنوں میں ہر وقت ساتھ رہی، اُس نے ہر موقع پر اپنے ہم سفر کے ساتھ زندگی کی کڑی اور بے ہنگم راہیں طے کرنے کا پکا ارادہ کر رکھا تھا۔ لیکن جلد ہی اُسے محسوس ہو گیا کہ وہ اس کے بس کے باہر ہے۔ گھر کے تلخ ماحول میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ جب بھی خالی وقت ملتا وہ گھر سے باہر اپنی سہیلیوں کے پاس دل بہلانے کے لئے چلی جاتی۔

اس شخص کے دماغ میں شبہ پیدا کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کون سی چیز کارگر ہو سکتی تھی۔ وہ تو پہلے ہی کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا کہ شبہوں کی پرورش کر سکے۔ وہ اپنی بیوی کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا! اس خیال سے اس کا دل غصّہ سے بھڑک اُٹھا کہ اسکی مکار بیوی نے اُس کے ساتھ خیانت کی ہے۔ پھر کیا تھا وہ ہر وقت بیوی کی جاسوسی کرنے لگا۔ اب اس کے من میں یہ خواہش زور پکڑنے لگی کہ اس کی بیوی عملی طور سے بد دیانت ثابت ہو جائے تاکہ وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہو کہ وہ دنیا میں ہمیشہ سے تکلیف سہتا آیا ہے لیکن بیوی نے ایسا کوئی موقع نہ دیا اور اُس کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ یا تو اس لئے کہ اُس کی بیوی پاک تھی یا اس لئے کہ وہ بہت چالباز تھی۔

اپنی تدبیر میں ناکامیاب ہونے سے اس شخص کا دکھ بڑھ گیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنے ناخن بیوی کی صراحی دار لمبی اور صاف گردن میں پیوست کر دے تاکہ اس کی سانس بند ہو جائے یا سینے میں چھرا گھونپ دے، مگر ایسا کر سکے کیسے؟ شاید بیوی بہت چالاک اور ہوشیار تھی۔

اس شخص کے ہاتھ پیر میں تناؤ پیدا ہونے لگا اور اس کے سلوک سے بیوی خوف زدہ رہنے لگی۔ اسے اپنے شوہر کی آنکھوں میں وحشت نظر آتی تھی۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ شخص اس کو قتل کر دے گا۔

اس بار اعتبار کر لینے کے بعد کہ بیوی نے بیوفائی کی ہے، اس شخص نے پکّا ارادہ کر لیا کہ ایسا جال بچھائے جس سے اس ابھاگن کو ٹھکانے لگا سکے۔ کسی کو اس پر شبہ نہ ہو اور لوگ یہی خیال کریں کہ وہ قدرتی موت مری ہے۔

وقت گذرتا رہا اور وہ شخص تدبیریں سوچنے اور جال بچھانے میں مگن رہا۔ لیکن ہر منصوبہ میں کوئی نہ کوئی کمی نظر آتی کہ وہ اُسے پورا نہ کر پاتا۔ رات کو جو منصوبہ سوچتا، صبح اُسے رد کر دیتا۔

ایک دن وہ اپنی بیوی کے ساتھ فلم دیکھنے چلا گیا۔ فلم کی کہانی ایک قاتل کے جرم کے متعلق تھی۔ مختصر یہ کہ ایک دُلہن نے اپنے شوہر کو بالکونی سے گرا دیا۔ وہ عورت اور اُس کا شوہر ساحل سمندر پر ایک الگ تھلگ مکان میں ہنی مون منانے آئے تھے۔ شوہر بوڑھا لیکن دولت مند تھا۔ بیوی اس کی جائداد کی جلد از جلد وارث بن جانا چاہتی تھی۔ اُس نے پاس کے ایک ڈاکٹر اور اپنے پڑوسیوں سے کہا۔ میرا شوہر رات کو نیند کی حالت میں چلتا ہے اور اس بات سے خوف زدہ ہے۔ پھر ایک رات اس نے اپنے شوہر کی کافی میں زہر ملا دیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تو اُسے بالکونی کی طرف گھسیٹ کر لے گئی۔ اور نیچے گرا دیا۔ پھر وہ بستر میں جا کر سو گئی۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا دلہن بالکونی میں کھڑی شور مچا رہی ہے، اور نیچے فرش پر اُس کے شوہر کی لاش پڑی ہے۔ سب نے یقین کر لیا کہ وہ شخص رات کے وقت نیند کی حالت میں چلتے ہوئے گر پڑا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

یہ فلم دیکھ کر وہ شخص بہت خوش ہوا۔ اس کامیاب منصوبے نے اس کے من میں ایک نئی اُمنگ پیدا کر دی۔ اُس نے اسی وقت اپنے مکان کی خرابیاں تلاش کیں اور نئے مکان میں تبدیل ہو گیا۔ یہ مکان سمندر کے کنارے پر تھا۔ اس کی شکل فلم والے مکان سے ملتی جلتی تھی۔

مکان کی بالکونی میں کھڑے ہو کر اُس نے نیچے دیکھا تو جھرجھری سی آ گئی۔ بہت دُور نیچے کنارے پر بکھرے ہوئے بڑے بڑے پتھر دیکھ کر اسے اپنی اسکیم پوری ہوتی ہوئی نظر آئی۔ سمندری ہوا کے ایک ٹھنڈے

جھونکے نے اُسے چھوا اور وہ سوچنے لگا، قسمت جرم کرنے کے لئے کسی اچھی جگہ لے آئی ہے۔ اگلے دن وہ نیند کی گولیوں کی ایک شیشی خرید لایا اور اپنی بیوی کو یہ یقین دلانے لگا کہ وہ نیند نہ آنے کی مریض ہے اور یہ دوا نیند لانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

بعد میں وہ شہر کے تفریحی مقامات پر گھوما پھرا اور تفریح کے لئے لائے عموماً سبھی لوگوں سے باتوں میں یہ ذکر کیا کہ سمندر کے کنارے مکان لینے کی وجہ یہ ہے کہ میری بیوی نیند نہ آنے کی مریض ہے اور سمندر کی تازہ ہوا اس کی صحت کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگی۔ کچھ دن گزرے تو لوگوں نے دیکھا، وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہے۔ ہمدردی سے انہوں نے وجہ پوچھی۔ وہ بولا — میری بیوی کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے پچھلی رات میں نے اُسے نیند کی حالت میں چلتے ہوئے دیکھا۔

کئی آدمیوں نے اُسے تسلی دی کہ یہ مرض قابلِ فکر نہیں دھیرے دھیرے ٹھیک ہوجائے گا۔ لیکن ڈاکٹر سے صلاح ضروری ہے۔

وقت گزرتا رہا۔ کچھ ہفتے بعد لوگوں نے سُنا، اُس کی بیوی کی حالت اور خراب ہوگئی ہے اور وہ ابھی تک رات کو نیند کی حالت میں گھومتی پھرتی ہے۔ یہ بھی پتہ چلا، وہ شخص ایک ڈاکٹر سے صلاح لینے والا ہے — کچھ دنوں بعد وہ شخص ڈاکٹر کے پاس گیا اور بولا — میں ایک ایسے شخص کے بارے میں مشورہ لینا چاہتا ہوں جو رات کو نیند کی حالت میں چلنے کے مرض میں مبتلا ہے۔

ڈاکٹر نے پوچھا "کیا آپ تھکن محسوس کرتے ہیں؟"

"میں؟" اس نے پریشان ہوکر سوال پوچھا

"جی ہاں! آپ"

"آپ کو یہ احساس کیسے ہوا کہ مجھے نیند نہ آنے کی شکایت ہے؟"

"میرے دوست! ذرا رکئے؛ آپ کی بیوی نے مجھ سے کہا تھا، میں کسی کو نہ بتاؤں لیکن میرا خیال ہے اچھا ہو آپ اپنی حالت معلوم ہوجائے۔ آپ کی بیوی آج صبح میرے پاس اس معاملے میں صلاح لینے آئی تھیں۔"

"کس معاملے میں؟ کیا اپنی نیند کی حالت میں چلنے کے بارے میں؟ لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے اس روگ کو جانتی ہو۔"

"صبر کیجئے۔ ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ آپ کی بیوی نے مجھے بتایا، اس نے آپ کو دوبارہ نیند کی حالت میں چلتے ہوئے دیکھا اس کا خیال ہے کہ آپ کو اپنی حالت کا پتہ نہیں۔

اس شخص کے ہونٹ جیسے سِل گئے، اور زبان گونگی ہوگئی۔

ڈاکٹر نے کہا "معاف کیجئے گا۔ میرا تجربہ ہے، کئی مریض اپنے مرض کا دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ تعلق جوڑتے ہیں۔ میں نے آپ کی بیوی کو علاج کے طریقوں کے علاوہ ایسے مرضوں کے ماہر ڈاکٹر اپنے ایک دوست کے نام خط بھی دیا ہے تاکہ آپ کی حالت زیادہ خراب ہوجائے تو وہ آپ کو اُس کے پاس لے جائیں۔"

وہ شخص خوف زدہ گھر لوٹ آیا۔ اُس کے چہرے پر خوف اور بے چینی کے نشان تھے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ بیوی اس کے ہتھیار سے اس کا کام تمام کرنا چاہتی ہے۔ اُسے یقین ہوگیا کہ اُس کی اسکیم اب راز نہیں رہی۔ وہ سوچنے لگا، نہ جانے آج کی رات کے بعد وہ قاتل ہوگا یا مقتول۔

اس کی بیوی میز پر سر رکھے اونگھ رہی تھی۔ کھانا سامنے پڑا تھا۔ اس نے آتے ہی میز پر سے چھری اُٹھائی اور ارادہ کیا کہ بیوی کی پیٹھ میں گھونپ دے۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور بالکونی کی طرف کھسک گیا۔ پھر نیچے سمندر کے ساحل کی طرف جھانکا۔ ٹھنڈی ہوا سے اس کی طبیعت میں کچھ سکون پیدا ہوا اور وہ نیچے آگیا۔ بڑی نرمی سے اُس نے اپنی بیوی کو جگایا۔ اسے ڈاکٹر کی بتائی ہوئی باتیں جیوں کی تیوں سُنا دیں اور پوچھا۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟

اُس کی بیوی نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ میں اُسے کیوں نہ بتاتی؟ اس بات نے تو میرے ہوش ہواس گم کردیئے تھے۔ مجھے خبر نہ تھی کہ آپ کو اس بات کا پتہ ہے۔ لیکن خیر آپ بھی اپنی حالت سے واقف ہوچکے ہیں۔ جب سے ہم اس مکان میں آئے ہیں، میں نے کئی بار آپ کو نیند کی حالت میں چلتے ہوئے دیکھا ہے۔ پھر بھی مجھے کچھ پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن کل رات جب میں نے آپ کو بالکنی میں کھڑے اور نیچے دیکھتے ہوئے پایا تو چپ نہ بیٹھ سکی اور ڈاکٹر سے صلاح لینے چلی گئی۔

اُسے اپنی بیوی کی یہ بات صحیح لگی کیونکہ جب سے وہ اس شہر میں آیا تھا، اُس نے بالکنی اور نیند میں چلنے کے سوا کچھ سوچا ہی نہ تھا۔ ہوسکتا ہے بیوی کی بات صحیح ہو اور وہ نیند کی حالت میں چلنے لگا ہو اس کے علاوہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ رات کو کسی وقت اُٹھ کر بالکنی میں گیا ہو کہ اپنا منصوبہ تصور میں پورا ہوتے ہوئے دیکھے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ بات ضرور تھی۔ اُس کا سر درد سے پھٹنے لگا۔ گلا خشک ہوگیا اُس نے پیالے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور سارا پانی ایک ہی سانس میں گلے کے اندر انڈیلنے کے بعد کرسی کی پشت سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

بیوی نے پوچھا۔ "آپ کافی پئیں گے؟"

وہ کرسی پر اس طرح اُچھلا جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو اور خوف زدہ لہجے میں بولا۔ "نہیں میں ہرگز کافی نہیں پیوں گا۔"

"پیارے! کافی سے آپ کی طبیعت میں تازگی آئے گی۔ اور بے چینی ختم ہوجائے گی۔ اس کے علاوہ آپ نیند کی زیادتی سے محفوظ رہ سکیں گے۔ بیوی نے صلاح دی۔"

اس کا جسم بوجھل ہوگیا۔ انگ ڈھیلے پڑگئے اور نیند اس کی آنکھوں میں گھس آئی۔ اُس نے جاگنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ تم مجھے زہر پلانا چاہتی ہو، ہرگز نہیں۔ میں تمہارے جال میں ہرگز نہیں آؤں گا..... تم..... تم.....

اس نے اپنی بیوی کی نرم اور پرسکون آواز سنی۔ میں آپ کو کافی میں زہر پلانا چاہتی ہوں۔ ہ کتنے وہمی ہیں آپ۔ کیا کافی کے سوا کسی چیز میں زہر نہیں ملایا جاسکتا؟ کیا پانی میں زہر نہیں ملایا جاسکتا؟ آپ نے ایسا کیوں نہیں سوچا؟"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے پپوٹے بوجھل ہوتے جارہے تھے اگلے ہی لمحہ وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

دوسری صبح سورج طلوع ہوا تو لوگوں نے دیکھا، وہ عورت بالکنی میں کھڑی شور مچا رہی ہے۔ اس کے شوہر کی لاش نیچے سمندر کے کنارے پتھروں پر پڑی ہے۔ لوگوں کے پوچھنے پر وہ روتے ہوئے بولی میرے شوہر کو نیند میں چلنے کی بیماری تھی۔ رات وہ نیند میں چلتے ہوئے بالکنی سے گر پڑے۔ صبح مجھے پتہ چلا کہ بستر پر نہیں ہیں۔ میں نے نیچے دیکھا تو اُن کی لاش دکھائی دی۔ ہائے ہائے لوگو! میں لٹ گئی۔ میں برباد ہوگئی! اب میرا کیا بنے گا؟

کسی نے اُس کی بات پر شک نہ کیا اور اس طرح وہ ابھاگا اپنے انجام کو پہونچا۔ اب تمہارا کیا خیال ہے۔ اس کی قسمت میں خوش قسمتی کب اور کیسے آئی؟: وہ بے چارہ تو واقعی ابھاگا تھا۔"

میرا دوست بولا۔ "میری رائے تمہارے خیال سے مختلف ہے۔ اگر تم اس کے عمل پر غور کرو تو پتہ چلے گا کہ اس کی ساری الجھنیں خود کی پیدا کردہ تھیں۔ اسے خوش قسمتی ملی ضرور لیکن وہ اُس سے کام نہ لے سکا۔"

مترجم: شاہد ماہلی

## بقیہ:- لالٹین

ابا نے جھٹ کرا سے لبادے میں چھپا لیا۔ اور سب دہاڑ مار کر ایک ساتھ رو پڑے۔

ہم نے اُسے وہیں دفنا دیا۔ ابا نے اپنے ننگے ہاتھوں سے ایک ننھی قبر کھودی، قرآن کی آیتیں پڑھیں اور ایک چھوٹی سی نماز ادا کی۔

گولیوں اور بمباری کی آواز نزدیک آتی جارہی تھی۔ ہمیں لالٹین اٹھائے راستہ دکھا رہی تھی۔ آخری بار میں نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ پہاڑی پر لالٹین ہی لالٹین دکھائی دے رہی تھیں۔


## غالبیات میں اضافہ

غالب کے فکر و فن اور زندگی سے متعلق دو اہم کتابیں

**آئینہ غالب:** ۲۲ مقالات۔ ۵ بڑا سائز ٹائپ کی عمدہ چھپائی صفحات ۲۰۸ قیمت ۵ روپے

**گنجینۂ غالب:** ۱۴ مقالات۔ بڑا سائز ٹائپ کی عمدہ چھپائی صفحات: ۱۸۶ قیمت ۴ روپے

محصول ڈاک ہمارے ذمے تین روپے اور اس سے زائد کی کتابیں وی پی سے منگوائی جاسکتی ہیں۔

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

# تعارف

## ایک فلسطینی نظم

محمود درویش ایک فلسطینی مہاجر ہیں۔ اور یہ نظم فلسطینی مہاجروں کی عکاسی کرتی ہے۔ محمود کو عرب دنیا میں عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ حال میں افرو ایشائی ادیب کی بہترین تخلیقات کے تحت انہیں لوٹس پرائز دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔

نئی دہلی میں منعقد چوتھی افرو ایشائی مصنفین کانفرنس میں ان کی شرکت متوقع ہے۔

محمود درویش

لکھ لو بیشک
میں ایک عرب ہوں
کارڈ نمبر پچاس ہزار
آٹھ بچے ہیں
نواں اگلی گرمیوں میں جنم لے گا
کیوں تم پریشان ہو گئے؟
لکھ لو بیشک
میں ایک عرب ہوں
پیشہ: ہمجولیوں کے ساتھ پتھر تراشنا
روزی کمانا، کپڑے کتابیں
بچوں کے لئے ضروری ہیں
تم جانتے ہو
میں کبھی تمہارے در پر
بھکاری بن کر کھڑا نہیں ہوں گا
کیا تمہیں غصہ آ رہا ہے
میرا کوئی نام نہیں ہے
صابر، جہاں سب کچھ غصہ کی آگ میں دہکتا ہے۔
میں یہاں جڑیں کھودتا ہوں
زیتون اور دوسرے پیڑوں کے آگے
ہل جوتنے والوں کی نسل کا ہوں
میرے والد محض ایک معمولی کسان
کوئی خاندانی باغ نہیں
کوئی پیڑ بھی نہیں
میرا گھر صرف سرکنڈوں کی جھونپڑی ہے
کیسا لگتا ہے یہ ایک انسان کے لئے؟

لکھ لو بیشک
میں ایک عرب ہوں
بالوں کا رنگ گہرا کالا
آنکھیں بھوری
خاص نشان
ایک جذبات بھرا دل اور دماغ میں عقل
ہاتھ پتھر کی طرح سخت اور کھردرے
پسندیدہ کھانا، زیتون کا تیل اور جڑ بوٹیاں
پتہ:- ایک بھولا ہوا بے گناہ گاؤں
جہاں گلیوں کا نام نہیں ہے
اور سبھی لوگ کھیتوں اور کیاریوں میں ہوتے ہیں
کیا اتنا بتانا کافی نہیں؟
تم نے میری انگوری بگیا لوٹی ہے
اوہ وہ زمین جسے میں جوتتا تھا
تم نے میرے بچوں کے لئے کچھ نہیں چھوڑا
سوائے چٹانوں کے
اور میں نے سنا ہے
تمہاری سرکار چھیننے والی ہے
ان پتھروں کو بھی
اچھا تو اب لکھ لو سب سے پہلے
مجھے کسی سے نفرت نہیں ہے
نہ میں کسی کی چوری کرتا ہوں
لیکن جب مجھے بھوکوں مارا جاتا ہے
تو میں اپنے دشمن کو کھا جاؤں گا۔
خبردار!
میری بھوک اور میرے غصے سے

مترجم: شاہد ہالی

# نئی کتابیں

## ذوقِ سفر

غلام ربانی تاباں کا دوسرا مجموعۂ کلام

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی۔

قیمت: پانچ روپے ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۹۲ صفحے

کتابت و طباعت اعلیٰ — کاغذ دبیز، کتاب جلد اور جلد پوش کی حامل ہے۔

تاباں صاحب نے حدیثِ دل سنائی تو رمز شناس دل دھڑک اٹھے تھے اس کے بعد انہوں نے غزل کی ایمائیت، اشاریت اور تابانیوں سے شعر کی دنیا کو ایک جلوۂ تاباں دکھایا۔ ان کا کلام پڑھنے اور غور کرنے کی چیز ہے اس کے باوجود جب یہ مدھم، تحت اللفظ سے شعر سناتے ہیں تو حسبِ موقع آہ اور واہ کا شور اٹھتا ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ تاباں صاحب اپنے جلیسوں کے پیچ میں بھی نہیں آئے اور انہوں نے یہ گوارا نہیں کیا کہ شاعری کو اس کے مروجہ آہنگ اور دلربائی سے بے نیاز کر دیا جائے۔ اُن کی غزل میں عاشق و معشوق دونوں کا درجہ بہت بلند ہے۔ یہ گھٹیا عشق کی ترجمانی نہیں کرتے۔ پاسِ وضع اور غیرت کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔

ایک دن وقت بتائے گا جنوں کی عظمت
یوں تو ہم لوگ ہیں رسوا سرِ بازار بہت
خلوص بچ گیا الزام سے گدائی کے
ہیں دستِ شوق پہ احسان نارسائی کے
یہ چار دن کی رفاقت بھی کم نہیں اے دوست
تمام عمر بھلا کون ساتھ دیتا ہے
بڑے عجیب ہیں آدابِ ترکِ اُلفت کے
چراغ بجھتا نہیں جھلملانے لگتا ہے

زندگی کے معارف و نکات بڑی سلاست سے بیان کر دیتے ہیں

تمام جہد و تجسس تمام درد سہی
سفرِ حیات ہے حاصل سفر کا گرد سہی
چلے چلو کہ ابھی دور ہے دیارِ خلوص
قدم قدم پہ زمانے سے اک نبرد سہی
ہر ایک موڑ پہ جلتے ہیں منزلوں کے چراغ
تھکا ہوا ہے مسافر کدھر کدھر جائے

ان کی شاعری کے بیسیوں رُخ ہیں لیکن وہ دھیما پن جو اُن کے لہجے میں ہے غزل کے لہجے میں بھی ہے۔ گھن گرج، ہاؤ ہو، شور و شر اور آشوب کاری کا نام نہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اچھا شعر ڈھونڈنے کے لئے انتخاب کی ضرورت نہیں۔ اُن کا پیرایۂ گفتار منفرد ہے۔ اس دورِ کم عیاری میں اگر ایسا گراں بہا مال مل جائے تو اہلِ ذوق کی خوش وقتی ہے۔ اس سے جدید تر شاعری اور کہاں ملے گی۔

## جذبہ و آواز

من موہن تلخ کا دوسرا مجموعۂ کلام

ناشر:- ورشا پبلیکیشنز ۷۲۰ نیو راجندر نگر نئی دہلی ۵

قیمت:- ۴ روپے ۵۰ پیسے

تلخ کا یہ دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ پہلا مجموعہ "چراغِ فکر" ۱۹۵۸ء میں چھپا تھا۔ صحافت کی پیچدار اور جانگداز راہوں کا مسافر اگر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو باقی و سالم رکھ سکے تو بڑی بات ہے لیکن تلخ نے اس بادۂ ناب کی تلخی میں اور اضافہ کیا ہے۔ یہ بات بجا اور درست کہ یہ ضرورت سے زیادہ وقت تک "منقار زیرِ پر" رہے اور داغ کے اس شعر کی یاد دلاتے رہے ؎

لگ گئی چُپ تجھے اے داغِ حزیں کیوں ایسی
مجھ کو کم بخت ذرا حال سُنا تو اپنا

تعلق اور بے تعلقی کے درمیان جنگ اُن کی زندگی کا بہت بڑا سانحہ ہے اس کی ترجمانی انہوں نے بہت کی ہے بلکہ وہ اس احساس میں ڈوب گئے ہیں

اک بات کہوں تم سے کہ وہ میں ہوں کہ تم ہو
کوئی بھی تعلق سے بڑا ہو تو بتا دو

اور پھر

کس ربط کی بھولی ہوئی پہچان ہوں میں آج
مجھ کو تو نہیں تم کو پتہ ہو تو بتا دو

اُن کا لہجہ کچھ ایسے ہی تحیرات کا حامل ہے۔ اسی تحیر اور لاعلمی سے وہ شعر میں زندگی کے راز مستور کر دیتے ہیں کھل کر کہہ دیں تو مزہ کیا رہے۔ انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظم کی بساط بھی بچھائی ہے۔ اس بساط پر ہر رنگ کے مہرے ہیں۔ زندگی کا درد بھی ہے اور محبت کی پُرکاری بھی۔ ہملٹ سے یہ بہت متاثر نظر آتے ہیں اور اسی طرح بہکی بہکی باتیں کر کے لُطف اُٹھاتے ہیں کیونکہ ان میں طنز بھی ہوتا ہے اور حقیقت بھی۔ جذبہ آواز کے عنوان سے ایک نظم کے چند شعر سنئے۔ لطف تو جبھی آئے گا جب پوری نظم پڑھیں۔

پو پھٹے کا سماں تھا کچھ ایسے۔ جیسے جوگی بدن پہ راکھ ملے
رُوپ کا جیسے جوگیا ہو لباس۔ مَن میں بھٹکے پیا ملن کی آس
جیسے شہروں سے چل دئے ہوں فقیر۔ جیسے پھر چل بسا ہو داس کبیر

ان تین شعروں سے نظم تو کیا سمجھ میں آئے گی لیکن بیان دیکھئے، زبان دیکھئے، تصویر کشی دیکھئے اور لہجے کی حلاوت دیکھئے۔ دیباچہ انہوں نے خود لکھا ہے اور وہ بھی شائستہ نثر کا ایک نمونہ ہے۔

نظموں میں ابہام زیادہ ہے۔ اس کی زیادتی شاعر کے مفہوم کو کبھی ضربات بھی پہونچاتی ہے اسکو لی حیثیت سے یہ شاعری جدید و قدیم کا امتزاج ہے لیکن فکری اعتبار سے زیادہ تر جدید بلکہ بے جا نہ ہوگا اگر کہیں قطعی جدید۔ تبلیغ اگر لکھتے گئے تو چراغِ فکر اور جذبۂ آواز سے اور آگے بڑھیں گے اور اگر اُن کی رفتار اور تیز ہوگئی تو نہ جانے کون سے ماہ و انجم کو پھاند جائے گی۔

---

## جگر بریلوی

(شخصیت اور فن) کہنہ مشق شاعر اور ادیب شیام موہن لال جگر بریلوی کی زندگی اور فن کے باب میں یہ کتاب مالک رام اور بینی پرمی نے مرتب کی ہے — ناشر: علمی مجلس دہلی ۶۔
قیمت: چھ روپے

جگر صاحب نے اُردو شعر و ادب کی بڑی خدمت کی ہے اور ان کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اگر ادب کے خادموں کی ہمت افزائی ان کی زندگی میں ہو جائے تو ان کے لئے باعثِ استحسان اور عقیدت گزاروں کے لئے لائقِ مبارک باد ہے۔ مالک رام صاحب کے مقدمے کے علاوہ اس کتاب میں بارہ مضامین شامل ہیں جن میں دو خود جگر صاحب کے قلم سے ہیں اور لکھنے والے سب کے سب ایسے ہیں جنہوں نے جگر صاحب کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا ہے۔ اس لئے ان مضامین میں حق بیانی ہے، سچائی ہے۔ کتاب میں جگر صاحب اور اُن کی اہلیہ محترمہ کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر منوہر سہائے انور اپنے مضمون کے شروع میں لکھتے ہیں۔

"حضرت شیام موہن لال جگر بریلوی کی جامع کمالات ذات اپنی انفرادیت کے لحاظ سے یکتائے روزگار متصور ہوتی ہے۔ آپ نے نثر و نظم میں فکر و نظر اور اظہار و ابلاغ کی جو طرز اختیار کی ہے اُس کے واضح آپ ہی ہیں۔ آپ کی طبیعت تقلید سے ہمیشہ اجتناب کرتی رہی ہے۔"

---

## آنکھوں کے شہتیر

مصنف: رفیع الدین احمد
ناشر: رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل سٹڈیز
قیمت: پانچ روپے۔ کتابت و طباعت اوسط

یہ کتاب مصنف کے سات مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس دور میں طنز و مزاح کے میدان میں قدم رکھنے والوں کی یوں تو اچھی خاصی تعداد ہے لیکن کہیں پھکڑ پن مل جاتا ہے اور کہیں علم کی چاشنی نہیں۔ انے گنے چند لوگ ہیں جو اس سلسلے میں معتبر ہیں۔ مصنف کے یہ مضامین شائستہ مزاح کا نمونہ ہیں۔ اُن کی پُشت پر علم بھی ہے اور فن بھی — مضامین کے عنوان ہیں — سفر ہے شرط — ڈاکٹر کی صلاح مانئے۔ جاگتے رہنا۔ ہماری کراکری، مذاق سخن، پان ہماری جان اور ہمارا سنگیت۔ مذاقِ سخن خاصے کی چیز ہے۔ آخر میں نئی شاعری پر بھبتی کسی ہے۔

"نئی شاعری تخیل کی پرواز کو جیوں کا تیوں رکارڈ کرنے کا فن ہے۔ خیالات جتنے بے ربط، بے ہنگم اور بے تکے ہوں گے اتنے ہی فطری قرار پائیں گے۔"

یہ یک طرفہ فیصلہ ہے لیکن مزاح والوں کو کئی خون معاف ہو سکتے ہیں۔

---

## مشاہیر کے اولیں صحیفے

مشاہیر کی پہلی تحریریں

ناشر :- رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز

قیمت :- بیس روپے جو بہت زیادہ ہے

مرتب :- عابد رضا بیدار

اس کتاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور محمد حسین آزاد کی پہلی تحریریں درج ہیں۔ جو نایاب نہیں تھیں۔ پہلی تحریروں سے مصنفین کے قد و قامت کا اندازہ نہیں ہوتا اس لئے اُن کی اشاعت کوئی خاص بات نہیں۔ افسوس ہے کہ کتاب کے باہر جلی قلم سے لکھا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور نیچے نہایت باریک قلم سے لکھا ہے "اور دوسرے" اس سے شبہ ہوتا ہے کہ مرتب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ہیں۔ مرتب نے خود اپنا نام اندرونی ٹائیٹل پر دیا ہے۔ انگریزی میں البتہ جلد پوش پر مصنف کا نام موجود ہے۔

---

## سوغات

شوق سالکی لکھنوی کا مجموعۂ کلام

ناشر :- ادارہ اشاعت اُردو ہند ملاڈ بمبئی ۶۴

مرتبین :- سردار جوہر انجم سہارن پوری

قیمت :- پانچ روپے

شوق کی شاعری ابہام کی شاعری ہے نہ اغراق و غلو کی۔ سادگی میں کہیں کہیں پُرکاری نظر آجاتی ہے جو لطف دے جاتی ہے۔

حوصلہ میرا بڑھتا ہوا دیکھ کر
ظالموں کے ارادے بدلنے لگے

نہ لب پہ موجِ تبسم نہ آنکھ پُرنم ہے
جنوں کی حد میں پہنچ کر عجیب عالم ہے

بیش لفظی کو "مقدمہ" لفظوں کے قاتل اور لفظوں کے مسیحا" کے عنوان سے سردار جوہر صاحب نے نئی شاعری کے بعض علمبرداروں "پر جانب داری کا الزام لگایا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ لوگ دیانت دارانہ تبصرے نہیں کرتے بلکہ اپنی پسند اور اپنے مطلب کے شاعروں کو اچھالتے ہیں۔ آخر میں وہ اتنے برہم ہو گئے ہیں کہ یہاں تک کہہ گئے۔

"نئی شاعری اور نئی تنقید میں ذہنی آوارگی، غنڈہ گردی اور بدمعاشی کے جراثیم ہیں، انسانوں کے درمیان کسی وقت بھی شرافت و سنجیدگی اور خلوص و اخلاص کی فضا قائم نہیں ہونے دیں گے۔"

لہجہ سخت ہو گیا ہے اور متانت و صداقت سے خالی ہے۔ کچھ لوگ نئی شاعری اور نئی تنقید کے غلط اجارہ دار بن جائیں تو بری بات ہے لیکن نئی شاعری اور نئی تنقید تو بحیثیت مجموعی قابلِ الزام نہیں ہو سکتی۔

ہمیں امید ہے کہ سردار جوہر صاحب ان بحثوں میں اُلجھنے کے عوض شوق صاحب کی طرح اور شعراء کا کلام بھی شائع کریں گے۔ نازش پرتاب گڈھی اور فضا ابن فیضی اور بہت اچھے شاعر اس بات کے منتظر ہیں کہ کوئی قدردان اُن کے کلام کو شائع کرے۔

---

## ذکرِ نانک

مرتب :- اندرجیت گاندھی

ناشر :- گوردوارہ پربندھک کمیٹی چاندنی چوک دلّی۔

دیباچہ رہبر مدیر ملاپ کے قلم سے ہے اور تقریظ مفتی عتیق الرحمٰن نے لکھی ہے۔ گورونانک صاحب کے پنج صد سالہ یوم ولادت کے جشن کے موقع پر سائھ اُردو شعراء کا گورو صاحب کو منظوم خراجِ عقیدت اس کتاب میں درج ہے۔ یہ کوشش مرتب کے لئے لائقِ مبارک باد ہے۔ قومی یک جہتی کی ایسی خدمت اگر اہلِ ادب کرتے رہیں تو یہ ملک جسے جنت نشان کہتے ہیں، ابدی راحتوں کی جنت بن جائے۔

---

## کلس

راجندر ناتھ رہبر کا مجموعہ کلام قیمت: ایک روپیہ

ملنے کا پتہ :- انڈین بک ڈپو - دی مال - شملہ - ۱

اس زمانے میں اُردو کلام کا چھپ جانا ہی شاعر کے لئے بڑی سعادت ہے۔ رہبر صاحب کا کلام ہوا رہے۔ وہ نشستریت جس پہ سخن شناس مرتے ہیں، اُن کے یہاں نہیں۔ لیکن پھر بھی سمندر کی تہ میں جائیں تو

کبھی کبھار کوئی گوہر آبدار ہاتھ آ ہی جاتا ہے۔

اپنی تسکینِ بندگی کے لئے
نت نئے بُت تراشتا ہوں میں

**سفینہ** ڈاکٹر موہن سنگھ اوبھرائے دیوانہ کی نظموں کا مجموعہ

ضخامت: ۱۶۸ تقطیع ۲۷×۱۷/۸ کتابت وطباعت گوارا

قیمت: پانچ روپے

ملنے کا پتہ: پروفیسر اوبھرائے 3/4 ماڈل ٹاؤن دہلی-۹

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اُردو کے پرانے بلکہ بہت پرانے خادموں میں سے ہیں۔ انہوں نے پہلے پہل اُردو کو اوڑھنا بچھونا بنایا تھا لیکن جلد ہی تصوف کی کملی اوڑھ لی اور اُن کی متعدد انگریزی کتابیں دنیا بھر میں مقبول ہوئیں۔ بہت سی کتابیں پنجابی ادب کے بارے میں تصنیف کی ہیں۔ ان سب باتوں سے قطع نظر وہ اُردو کے بڑے مشاق شاعر ہیں اور این وآں، مکان و زماں، نور بالذات، ذات وصفات وغیرہ قسم کی بھول بھلیاں میں گھومتے پھرتے ہم لوگوں کو منزل کی راہ دکھاتے ہیں چنانچہ زیرِ نظر کتاب بھی ایسے کلام سے پُر ہے جو اُردو والوں کے یہاں کم ملے گا۔ یہ سوقیانہ قسم کی زلف گرہ گیر کی کہانی نہیں بلکہ حیات وممات کے پُرپیچ مسئلوں کا حل پیش کرتی ہے۔

غزلوں میں سے تو آدمی شعر انتخاب کر لیتا ہے لیکن جہاں ہر چیز پہلے ہی منتخب ہو وہاں انتخاب پیش کرنے کی ضرورت نہیں اہلِ نظر پڑھیں اور داد دیں۔

---

**سحرِ نغمہ** ساحر ہوشیار پوری کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے حسین وجمیل اتنا کہ سحرِ جلوہ بھی کہہ دیں تو غلط نہ ہوگا۔ پہلے مجموعے کا نام سحرِ غزل تھا۔ ساحر صاحب جوش ملسیانی صاحب کے فارغ الاصلاح شاگردوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اُن کا ہر سحر سحرِ حلال ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں اچھے شعروں کی تعداد خاصی ہے۔ دس بیس شعر بھی اگر کسی مجموعے میں ایسے مل جائیں جو نشتر ہوں تو غنیمت ہے۔ سحرِ نغمہ میں تو بہت سے نشتر ہیں۔ جذبات اور نفسیات کی عکاسی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ قدیم رنگِ سخن اُن کا ورثہ ہے لیکن فکر اور ندرتِ اظہار کے لحاظ سے انہیں قدیم نہیں کہا جا سکتا۔ نئی راہوں میں بھی انہوں نے گام زنی کی ہے لیکن اُن کے کلام پر تغزل حاوی ہے۔ چند شعر سنئے۔

دوستی کی جو گل عذاروں سے ؛ دشمنی ہوگئی بہاروں سے
ایک طوفاں سے کیا بچی کشتی ؛ لاکھ طوفان اٹھا کناروں سے
دشمنوں سے بھی دوستی کی ہے ؛ حوصلہ ہے فریب کھانے کا
جھنجھنا اُٹھا ہے دل کا ہر تار ؛ آپ کا نام سنا ہو جیسے

قیمت: دس روپے۔ ملنے کا پتہ: ماہ نامہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی
ماہ نامہ تحریک۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی

---

**گلِ رعنا** مرتبہ:- مالک رام

غالب کے اُردو اور فارسی کلام کا اولین انتخاب۔

ناشر:- علمی مجلس دہلی، چھتہ نواب صاحب، فراش خانہ دہلی

قیمت:- سات روپے پچاس پیسے

کاغذ، کتابت، طباعت، جلد نہایت عمدہ

مرزا غالب ۱۸۲۶ء کے آخر میں کلکتے کے لئے روانہ ہوئے۔ ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو وہاں پہونچے، اور ماہ ستمبر ۱۹۲۹ء میں دلی کے لئے روانہ ہوئے۔ وہ ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو دلی میں وارد ہوئے کلکتے میں اُن کی ملاقات مولوی سراج الدین احمد سے ہوئی۔ اُن سے غالب کو بہت محبت اور عقیدت پیدا ہوگئی کیوں کہ وہ اُن کے بڑے قدردان تھے۔ قیام کلکتہ کے زمانے میں انہوں نے غالب سے فرمائش کی کہ وہ اُن کے لئے اپنے اُردو اور فارسی کلام کا انتخاب تیار کر دیں چنانچہ 'گل رعنا' اسی انتخاب کا نام ہے۔ یہ خطی نسخہ مالک رام صاحب کو عماد الملک سید حسین بلگرامی کے پوتے سید نقی بلگرامی سے ملا۔ مولوی سراج الدین کے ساتھ ہی اس زمانے میں عماد الملک بہادر کے دادا مولوی سید کرم حسین صاحب کلکتے میں موجود تھے اور سفیر اودھ تھے۔ غالباً انہوں نے مولوی سراج الدین احمد سے 'گل رعنا' کی نقل حاصل کی۔ اور وہ اُن کے خاندان میں محفوظ رہی۔ یہاں تک کہ سید نقی بلگرامی تک پہونچی۔ مولوی سید کرم حسین بلگرامی صاحب وہی شخص ہیں جنہوں نے اپنے ہاتھ پر چکنی ڈلی رکھی تھی اور غالب نے فی البدیہہ بارہ شعر کا قطعہ چکنی ڈلی کی تشبیہات کے باب میں کہا تھا۔ محمد حسین آزاد کا یہ قول کہ غالب کے اُردو کلام کا پہلا انتخاب مولوی فضل حق خیر آبادی اور مرزا فانی کوتوالِ شہر نے کیا اس لحاظ سے درست نہیں۔ 'گل رعنا' کی ایک نقل پاکستان میں بھی ہے مگر وہ ابھی شائع نہیں ہوئی۔ مالک رام صاحب کا یہ کارنامہ غالبیات کے سلسلے میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ انہوں نے کتاب کی ترتیب میں متعدد نسخوں اور کتابوں سے مدد لی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب جو پہلی بار منظرِ عام پر آئی ہے غالبیات کے سلسلے میں تحقیق کے نئے دروازے کھولے گی۔

## دلّی جو ایک شہر تھا

از : راجندر لال ہانڈا  ترجمہ : سلیم احمد

ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ پرائیویٹ لمیٹیڈ۔ نئی دہلی  قیمت : چھ روپیہ

راجندر لال ہانڈہ کا نام انگریزی اور ہندی صحافت وادب کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ زیرِ نظر کتاب ہندی کے علاوہ ہندوستان کی اور دوسری علاقائی زبانوں میں بھی شائع ہوکر قبول عام کی سند حاصل کرچکی ہے۔ اُردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس کے اُردو ایڈیشن میں پروفیسر محمد مجیب کا پیش لفظ کتاب کی زینت ہے غلام ربانی تاباں نے کتاب اور مصنف کا تعارف تحریر فرمایا ہے۔ اس کتاب میں دلی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اس زمانہ کے واقعات پر مبنی ہے جب دلّی ایک ہنگامی اور بحرانی دَور سے گزر رہی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دُوسری جنگِ عظیم شروع ہوچکی تھی اور ہندوستان دھیرے دھیرے آزادی کی منزل کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ ہندوستان کی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ تقسیم ملک اپنے جلو میں تباہی و بربادی کا ہیبناک اور خوفناک طوفان لے آتی ہے۔ دس سال کا یہ مختصر عرصہ ہے مگر اس مختصر سی مدّت میں تاریخ کے بہاؤ کا رُخ مڑ جاتا ہے۔ ایک بساط اُلٹ جاتی ہے اور دُوسری بساط بچھائی جاتی ہے۔ تہذیب وتمدن، سیاست وحکمت کے ایک نئے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ تاریخ کے پُرانے کھنڈرات پر نئے ہندوستان کی نیو رکھی جاتی ہے۔ ہانڈا صاحب نے اس دَور کی دلّی کے بدلتے رنگ ورُوپ کو صفحۂ قرطاس پر سمیٹ لیا ہے۔ یہ کتاب آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ افسانہ بھی ہے اور حقیقت بھی۔ جگہ جگہ مزاح کی چاشنی نے اس کتاب کے موضوعات کو اور بھی دلچسپ اور شگفتہ بنا دیا ہے۔ "دلّی مت آنا"۔ "کرفیو کی سائیتیں" "کھنڈر کلب" وغیرہ خاکے طنز و مزاح کے اچھے نمونے ہیں۔ مصنف نے ہندو مسلم جھگڑے اور لسانی تنازع جیسے مسائل پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ زبان کے مسئلہ پر اُن کی دلیلیں کافی مضبوط ہیں اور ہندی پریمیوں کے لئے لمحۂ فکریہ۔ ہندو مسلم مسئلہ پر جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ ایک وسیع ذہن اور ہمدردانہ نقطۂ نظر کی عکاسی تو ضرور کرتے ہیں مگر مسئلے کا حل نہیں ہوسکتے۔ اس سلسلے کے مضمون میں فیاض حسین (مصنف کے ایک دوست) جو باتیں کہتے ہیں وہ جیسے اُن سے کہلوائی گئی ہوں۔ مصنف نے فیاض صاحب کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ اسی لئے شاید پورا مکالمہ مصنوعی معلوم ہوتا ہے۔

ترجمہ سلیس، شستہ اور رواں ہے اور کتاب، طباعت اور گٹ اپ کے لحاظ سے بھی اچھی ہے۔

رئیسہ خانم

## پرچھائیوں کی وادی

مصنف : انور عظیم - قیمت : پانچ روپے

ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ۔ اُردو بازار دہلی ۶

ہماری یونی ورسٹیوں کے کیمپس جو آج کی زندگی کے پیچ در پیچ مسائل کے گہوارے ہیں اور عرصے سے اخبارات، رسائل اور سنجیدہ محفلوں میں گفتگو کا موضوع بنے رہے ہیں، اُن پر ہمارے ادیبوں نے بھی اکثر توجہ دی ہے۔ انور عظیم کا ناول "پرچھائیوں کی وادی" بھی دراصل اسی تبیل کی تخلیقات میں سے ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہاں مصنف نے یونی ورسٹی کی بظاہر رُومانی فضا میں پلنے بڑھنے والے نوجوانوں اور بزرگوں کی بے چین اور بحران زدہ جذباتی زندگی کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ 'پرچھائیں' کی علامت بڑی خوبصورت اور معنی خیز ہے۔ ہماری زندگی کے مسائل اور تضادات ہی دراصل ٹھوس حقیقتیں ہیں۔ اور اُن کے سائے میں پروان چڑھنے والے کردار محض اُن کی پرچھائیاں ہیں۔ ایسی پرچھائیاں جو اپنی اصل سے بھاگتی، کتراتی، منہ چھپاتی، موہوم اندھیروں اور چکا چوند کردینے والی روشنیوں میں کبھی خود سے کبھی غیروں سے آنکھ مچولی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ وہی پرچھائیاں ہیں جنھیں آج کل کی زبان میں انٹلکچوئل کہا جاتا ہے۔ یہ بیک وقت اپنے سماج کے وفادار بھی ہیں اور باغی بھی۔ یہ تنہائیوں میں کچھ اور ہوتی ہیں اور محفلوں اور جمگھٹوں میں کچھ اور۔ جہاں تک اُن کے باہمی رشتے بھی اسی قدر دوہرے بلکہ پیچیدہ ہیں۔ ایک ہی شخص کے ساتھ بے وفائی اور خلوص ایک ہی لمحے میں جرم اور پچھتاوا۔ ہر دلکش چیز کی طرف لپکنا بھی اور اس سے بیزاری بھی، یہ سب ان کرداروں کی خصوصیات ہیں۔ ان کی ذات کے اندر رچا ہوا بے وہ اس ہیجان کا سب سے واضح اظہار ان کی جنسی تمناؤں، محرومیوں اور اُلجھنوں میں ملتا ہے اور اس ناول کی کہانی اِن ہی کے

سہارے اُبھرتی اور تہ بہ تہ کھلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔

ناول کا اہم ترین کردار معمر پروفیسر شیراز ہیں جو سب سے زیادہ پختہ کار ہیں بلکہ لڑکیوں کے معاملے میں تو منجھے ہوئے ہاتھ رکھتے ہیں۔ وہ محبت کی تلاش میں جنسی لذت تک پہونچے اور پھر اُسی کے ہو رہے۔ یونی ورسٹی میں بڑے بڑے جانِ عالم آئے مگر وہ پروفیسر شیراز سے بازی نہ لے جا سکے۔ سچ پوچھئے تو پروفیسر شیراز کی شخصیت نے ہی اُن کے فرسٹریشن میں سرِ لمحہ اضافہ ہی کیا۔ شہناز بے حد حسین اور مقناطیسی کشش رکھنے والی لڑکی ہے۔ باپ کی خواہش کے مطابق ایک نہایت کامیاب ڈاکٹر سے شادی کی۔ اس شادی نے نہ محبت عطا کی نہ جنسی آسودگی۔ مگر پروفیسر شیراز کے ہوتے ہوئے ایسی لڑکی کو کس چیز کی کمی ہو سکتی تھی، اُسے پُرسکون گھر کے سوا اور سب کچھ مل گیا۔ اس کا شوہر برکت الٰہی محض ایک مدِ فاضل ہے۔ پریتم اور چندر موہن نوجوان ہیں، خوبرو ہیں۔ اچھی لڑکیوں کے دیوانے ہیں بمعمولی لڑکیوں سے جان بچائے پھرتے ہیں۔ شہناز کی موجودگی میں شیراز کی بیٹی شہلا اُن کے لئے مسئلہ ہے۔ شہناز کا ایک بچہ بھی تھا جو نہ جانے کس کا تھا اور اچھا ہوا، کہ بچپن میں ہی ختم ہو گیا مگر اس کا موہوم وجود آخر تک دل کو تڑپاتا ہے۔ بیگم صدیقی اور بیگم سلامت اس تصویر کے پس منظر میں وہ گہرے رنگ ہیں جو تضاد کو واضح کرنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں اور نہایت اہم ہیں

یہ ایک دلچسپ اور جاندار ناول ہے۔ ابتدائی حصوں میں ربط تلاش کرنے میں ذرا مشکل پیش آتی ہے۔ مگر جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے، سرے ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ناول میں طنزیہ علامتوں اور اشاروں سے جا بجا کام لیا گیا ہے جس سے مصنف کا اپنا نقطۂ نظر بھی واضح ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس دور کی بے کردار زندگی سے بیزاری اور پرچھائیوں کی جگہ اصل پیکروں کی تلاش۔ انور عظیم کا تخیل بہت رنگین و رعنا ہے اور اکثر پڑھنے والے کو اپنے ساتھ خواب و خیال کی دنیا میں اُڑائے اُڑائے پھرتے ہیں۔ پروفیسر شیراز پر فالج کا حملہ اور شہناز کا پاگل پن ناول کے سب سے موثر حصے ہیں۔ شہلا کا کردار کچھ ڈھیلا ڈھالا سا ہے۔ وہ اچانک اور شاید بلا وجہ ناول سے غائب ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اپنے باپ کی سخت بیماری کے زمانے میں۔ چندر موہن اور پریتم کی پہلی ہی ملاقات ضرورت سے زیادہ Frank بلکہ رقیبانہ لگتی ہے۔ مجموعی طور پر ایک دلچسپ اور خوبصورت ناول ہے۔ اور اس میں ہماری زندگی کے موجودہ المیے کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

صدیق الرحمٰن قدوائی

---

(۱) مقدمہ شعر و شاعری ۔ قیمت ۲/۶۰ لائبریری ایڈیشن ۳/۴۰

(۲) انتخاب سراج اورنگ آبادی " ۱/۲۰ " " ۱/۷۰

(۳) موازنۂ انیس و دبیر " ۳/۲۵ " " ۴/۲۵

مکتبہ جامعہ نے حکومت جموں و کشمیر کے تعاون سے اُردو کے معیاری اور کلاسیکی ادب کو، اصل متن کی صحت و صفائی اور تحقیق و تفحص کے ساتھ شائع کرنے کا عزم کیا ہے۔ اس سلسلے کی جو پہلی تین کتابیں سامنے آئی ہیں وہ بالترتیب اس طرح ہیں۔

## مقدمہ شعر و شاعری مرتبہ:- رشید حسن خاں

خواجہ الطاف حسین حالی کی مقدمہ شعر و شاعری اس سلسلے کی پہلی کتاب ہے۔ یہ سب سے پہلے دیوان حالی کے ساتھ سن ۱۸۹۳ء میں دہلی کے مطبع انصاری سے شائع ہوئی تھی۔ نسخہ جامعہ کی بنیاد اسی متن پر رکھی گئی ہے۔

درحقیقت یہ اُردو کی وہ پہلی تنقیدی کتاب ہے جس میں حالی نے شعر و شاعری سے متعلق لاتعداد گوشوں اور ان گنت مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ حالی نے اپنے استدلال میں عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی شاعری کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب مشرق و مغرب کو قریب لانے کی پہلی شعوری کوشش نظر آتی ہے۔ حالی نے روایتی انداز سے ہٹ کر جدید غزل کی بنیاد رکھی جس کے زیر اثر انہوں نے بھی اور بعد میں آنے والوں نے بھی غزل کو تنگنائے سے نکال کر نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا چند وہ نکات بیان کئے جو انہیں روایت شکن بناتے ہیں۔ اُردو میں آزاد نظم کا جو تصور سامنے آیا اس میں حالی کے افکار و خیالات کو بھی بڑا دخل ہے۔

فی الواقع جس طرح غالب پر کام کرنے والے کے لئے "یادگارِ غالب" سے مفر نہیں۔ اسی طرح اُردو شعر و ادب سے وقوف کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ حالی کی اکثر رائیں صائب و صحیح ٹھہری ہیں۔ تاہم اُن کی چند باتوں سے آج اختلاف کی بڑی گنجائش ہے۔ جس کا سبب حالی کی وہ حد سے بڑھی ہوئی شرافت ہے جو بعض اوقات اُن کی پرکھ میں آڑ بن گئی ہے۔ یہ انداز خال خال ہے جو کسی طرح کتاب کی مجموعی افادیت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

## انتخاب سراج اورنگ آبادی

اس سلسلے کی دُوسری کڑی سراج اورنگ آبادی کے کلام کا انتخاب ہے۔ سراج کی اثر آفرینی کے بارے میں اُن کے کلام کے مرتب ڈاکٹر محمد حسن کی رائے ہے۔

"شمالی ہند کے دورِ اوّل کے بلند قامت شاعروں میں سے کوئی بھی اُن کے اثرات سے آزاد نہیں ہے۔ میر، سودا، دردؔ، مصحفی کے تصورات اور اسلوبِ بیاں پر سراج کے اثرات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔"

یہ بات دوسری ہے کہ خود سراج کے کلام میں نہ شیریں دلآویزی ہے، نہ شبنمی نگاہ۔ جمال و دستی اور اسلوب پرستی ولی کی طرح اُن کے یہاں بھی ہے۔ تصوف کی چاشنی اور مجاز کی رنگینی وہ بھی رکھتے ہیں۔ سراج نے آج سے لگ بھگ ۲۵۰ سال پہلے جب شاعری کی زبان شکست و ریخت سے دوچار تھی مگر اس کا کینڈا بن چکا تھا۔ اس کے باوجود ولی کی طرح سراج نے بھی اُردو کی اس روایت کو دکن سے شمال کی طرف منتقل کرنے میں پُل کا کام کیا ہے۔

کلام سراج کی لسانیاتی خصوصیات کے ذیل میں اتنا اشارہ کافی ہے کہ اس میں دکنیت کے جملہ عناصر موجود ہیں۔ فاضل مرتب کی اس صراحت کے باوجود کہ طرزِ کتابت میں تبدیلی نہیں کی گئی، ہائے دوچشمی کا طرزِ کتابت جدید قاعدے کے مطابق ملتا ہے۔ مناسب ہوتا کہ اس میں بھی تبدیلی نہ کی جاتی اور اگر کی گئی تھی تو صراحت کی جاتی تاکہ لسانیاتی نقطۂ نظر سے جائزہ لینے والوں کو اپنے تجزیئے میں آسانی ہوتی۔

## موازنہ انیس و دبیر

مرتبہ:- رشید حسن خاں

اس سلسلے کی تیسری اہم کتاب ہے۔

یہ کتاب پہلی بار سن ۱۹۰۷ء میں آگرہ کے مطبع مفید عام سے شائع ہوئی۔ نسخہ جامعہ کی بنیاد اسی پر رکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے سامنے آتے ہی شبلی پر جو لے دے ہوئی اس میں اُن کے سر جانب داری کا الزام تھا۔

حالی کی طرح شبلی بھی اُردو تنقید کے معماروں میں سے تھے۔ اُن کی بھی کسی تنقیدی تحریر سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کتاب مرثیہ گوئی کا تفصیلی تعارف، تبصرہ، اور تشریح ہے۔ میر انیس کے محاسن او مرزا دبیر کے معائب کا بیان ہے۔ اتنا ہی نہیں دبیر کے محاسن کا کہیں کہیں دبے لفظوں میں اعتراف بھی ہے۔ ساتھ ہی اُن کے محاسن کی قد وقیمت کا تعین اور بعض دلچسپ توجیہیں بھی ہیں۔

وفورِ عقیدت میں ایک کمی یہ بھی آئی ہے کہ شبلی نے دبیر کو وہ داد نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے۔

اس کے باوجود شبلی کا یہ کام بلکہ کارنامہ عملی اور تقابلی تنقید کا اچھا نمونہ ہے۔ اس میں انہوں نے ایک بڑے موضوع کا احاطہ اور بھرپور محاکمہ کیا ہے۔ تنقید کے کچھ اصول برتے اور متعین کئے ہیں۔ اختراع میں ذہن کی خلاقی اور طباعی سے زیادہ مختلف زبانوں (عربی و فارسی) میں مروجہ تنقیدی اصولوں سے استفادہ کرتے ہوئے اُردو میں ایک اگلا قدم اٹھایا ہے اس طرح کہ کوئی گوشہ تشنہ تکمیل محسوس نہیں ہوتا۔ لہجے میں متانت ہے مگر تقشف نہیں۔ اور نہ رکاکت اور نہ خارا شگافی۔

اُردو ادب کی ان تین معیاری کتب کو مکتبہ جامعہ نے جس سلیقے سے شائع کیا ہے اس کے لئے ارباب مکتبہ، حکومت جموں کشمیر اور اساتذہ اور محققین بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ضرورت ہے کہ ارباب ادب بھی ان گنج ہائے گراں مایہ سے لائبریریوں اور کتابی ذخیروں کو مزین کر کے اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوں۔

امیر اللہ شاہین



کتوبر ۷۰ء کو نئی دہلی میونسپل کمیٹی کے آڈیٹوریم میں ایک کلچرل ادارے "رن دی وو" کی طرف سے "شام سروش" کا انعقاد کیا گیا جس میں مشہور اُردو شاعر رفعت سروش
لام پر مبنی شعر و نغمہ کا پروگرام پیش کیا گیا۔ انور صدیقی اور علی جواد زیدی نے رفعت سروش کی شاعری پر روشنی ڈالی اور حفیظ احمد خاں ، سرلا کپور، اوشا سیٹھ اور نینا دیو
ن کاروں نے اُن کی غزلیں اور نظمیں گائیں (دائیں طرف) نینا دیوی نغمہ سرا ہیں (بائیں طرف) رفعت سروش اپنا کلام سنا رہے ہیں۔

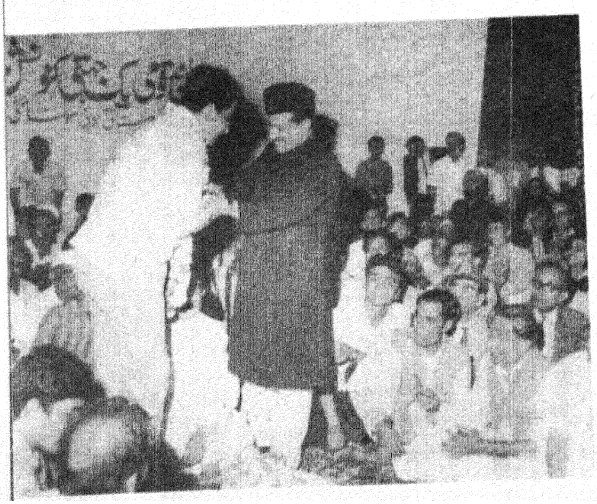

۲۴ اکتوبر ۷۰ء کو ہندوستانی ادبی سوسائٹی کی جانب سے
ؤلنکر ہال نئی دہلی میں قومی یک جہتی سے متعلق ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس
ں نثار اختر، کیفی اعظمی، اختر الایمان، مجروح سلطان پوری اور
ممتاز شعراء نے شرکت کی۔ مشاعرے کی صدارت مرکزی نائب وزیر
یونس سلیم نے کی۔

یسے) جناب محمد شفیع قریشی مرکزی نائب وزیر مشہور اداکار دلیپ کمار
ستقبال کر رہے ہیں جو اس مشاعرے میں شرکت کے لئے خاص طور پر
ے تشریف لائے تھے۔



وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سلور جوبلی اجلاس میں تقریر کر رہی ہیں۔

L 27/11/70

Vol. 29 No. 5 AJKAL (Monthly) December 1970

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55
Regd. No. D-509

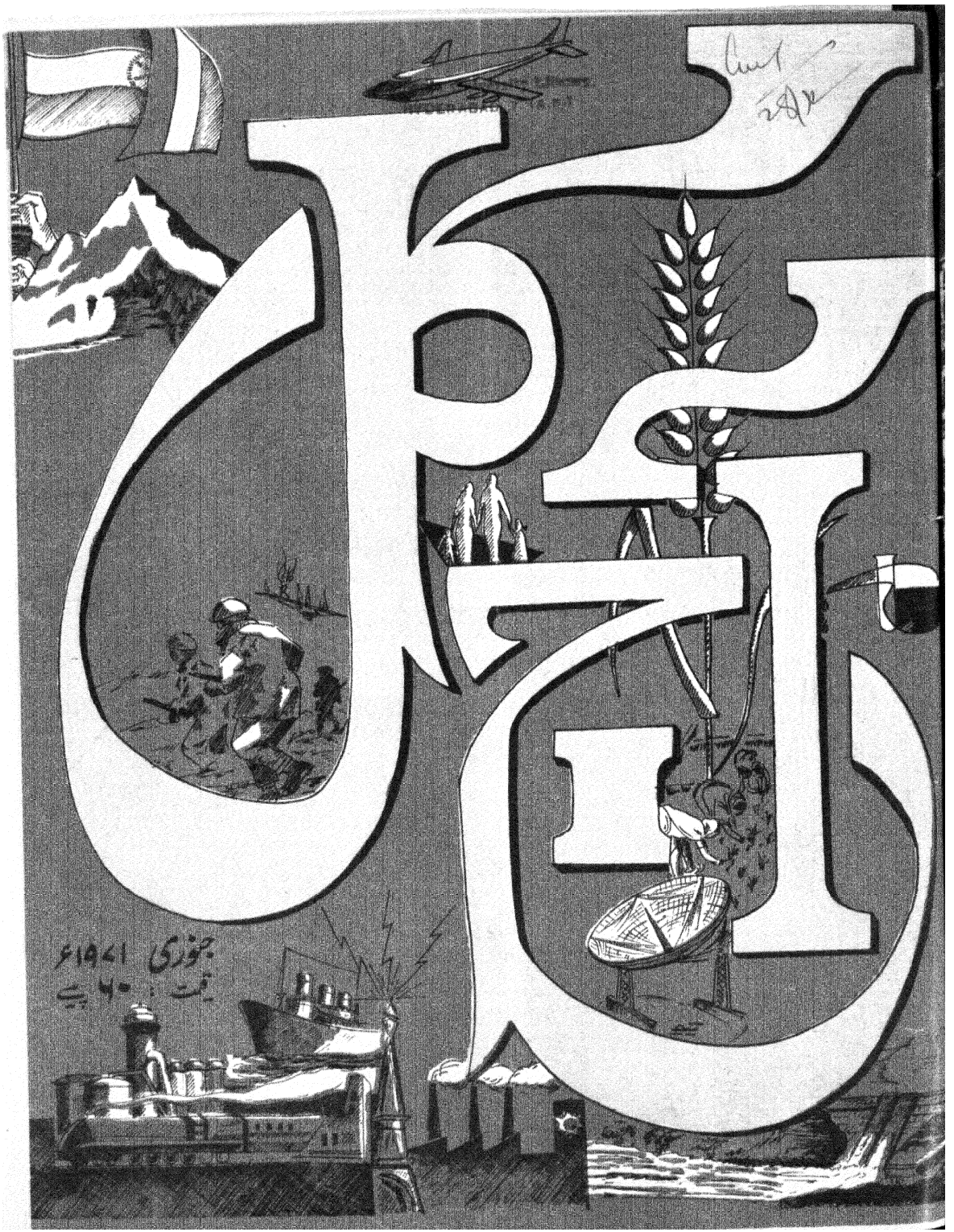
جنوری ۱۹۷۱ء
قیمت : ۶۰ پیسے



ومبر ۱۹۷۰ء کو وگیان بھون نئی دہلی میں بھارتیہ گیان پیٹھ کا ایک لاکھ کا ادبی انعام اُردو کے ممتاز شاعر جناب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کو اُن کے شعری مجموعے "گلِ نغمہ" پر دی
ب میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اُن کی شاعری کے منتخب ہندی مجموعے "بزمِ زندگی۔ رنگِ شاعری" کا اجرا کیا۔ اس موقع پر ان کی شاعری پر مبنی رقص و موسیقی کا پروگرام بھی پ

۲۸ نومبر ۱۹۷۰ء کو وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی نے نئی دہلی میں کچھ مسلم ممبرانِ پارلیامنٹ، سفراء اور ممتاز شہریوں کے ساتھ افطار میں شرکت کی۔



اُردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

# آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۲۹ شمارہ ۶

جنوری ۱۹۷۱ء

پوس ماگھ شک سمت ۱۸۹۲

سرورق - عمل - قیصر سرمست

سالانہ چندہ

ایک سال : ۷ روپے

۲ سال : ۱۲ روپے

۳ سال : ۱۷ روپے

## ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ملاحظات | ادارہ | ۲ |
| غبارِ کارواں (۱۱) | جوش ملسیانی | ۳ |
| غزلیں | اعجاز صدیقی، عزیز قیسی | ۹ |
| ریزہ ریزہ (نظم) | شاذ تمکنت | ۱۰ |
| تصویر (نظم) | زاہدہ زیدی | ۱۰ |
| علی گڑھ - چند یادیں | ضیاء احمد بدایونی | ۱۱ |
| دل بدلی (نظم) | واہی | ۱۷ |
| مغلی عفارا (کشمیری کہانی) | علی محمد لون | ۱۸ |
| غزل | واحد پریمی | ۲۳ |
| تہذیب و تمدن | سلطانہ آصف فیضی | ۲۴ |
| جنگ آزادی میں دارالمصنفین کا حصہ | ضیاء الدین اصلاحی | ۲۷ |
| غزل | سلیمان خمار | ۳۱ |
| کڑواہٹ (کہانی) | فرزانہ احمد | ۳۳ |
| غزلیں | حسرت شادانی - ضیا ساحری، منہاج احمد رہبر - رضا اشک سمتی پوری | ۳۸ |
| دکنی لوک گیت | ابوالفیض سحر | ۳۹ |
| دلی کا پرانا قلعہ (نظم) | رام پرکاش راہی | ۴۵ |
| غزل | یوسف جمال | ۴۵ |
| نئی کتابیں | | ۴۶ |


شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱

# ملاحظات

یوم جمہوریہ کی تقریب ہر سال ہمیں یہ یاد دلاتی ہے کہ ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے جہاں نئے نئے کارخانوں، زیادہ پیداوار، بہتر صحت اور تعلیم کے لئے کوششیں کرنی ہیں وہاں دوسری طرف ہمیں اپنے اخلاق و کردار کا جائزہ بھی لینا ہے۔ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ہمیں اس بات سے زیادہ تکلیف نہیں ہوتی کہ ہمارے پاس آرام و آسائش کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ اس سے زیادہ ہوتی ہے کہ سماج میں اکثر ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے یا دفتروں، اسپتالوں یا تعلیم گاہوں میں ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو بڑی شدت سے ہمیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ ہماری اخلاقی حالت بڑی پست ہوگئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غریبی اور بیکاری بہت سی خرابیوں اور برائیوں کی جڑ ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ خوش حال ممالک یا افراد بھی خرابیوں اور برائیوں سے پاک نہیں۔ مادی ترقی ہمیں آگے تو بڑھاتی ہے اوپر نہیں اٹھاتی۔

ہمارے مشہور سائنس داں ڈاکٹر ہومی بھابھا سے ٹائم میگزین کے ایک نامہ نگار نے سوال کیا تھا کہ ہندوستان میں جو سائنس اور ٹکنالوجی کے لحاظ سے ایک پچھڑا ہوا ملک ہے کس طرح آپ اور آپ جیسے دوسرے سائنس داں پیدا ہو سکے تو انہوں نے بڑا مسکت جواب دیا تھا: "یہ صحیح ہے کہ ہندوستان نے موٹر کار یا ریفریجریٹر ایجاد نہیں کیا ہے اور نہ ہی یہ چیزیں دوسرے صنعتی ملکوں کی طرح ہندوستان میں وسیع پیمانے پر تیار کی جاتی ہیں لیکن سیکڑوں برسوں سے سال کے ان مہینوں میں جب اُسے کام نہیں ہوتا تو ہندوستان کا کسان ایک درخت کے سائے میں بیٹھا سوچتا اور غور و فکر کرتا رہتا ہے۔ اسی فرصت اور فراغت نے ان دستکاریوں کو جنم دیا جن کی صناعی اور کاریگری نے دُنیا سے اپنا لوہا منوایا۔ اسی غور و فکر نے ان فلسفیوں اور فلسفوں کو جنم دیا جنہوں نے انسان کو محبت، بھائی چارے اور رواداری کا پیغام دیا۔ حیات اور کائنات کے اسرار سے پردہ ہٹایا اور انسان کو انسان کی حیثیت سے جینا سکھایا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان اخلاقی قدروں کو اپنی زندگی اور مزاج کا ایک حصہ بنالیں اور ان روایات کے امین بن جائیں جو ہزاروں برسوں کے تجربے اور تفکر کے بعد ہم تک پہونچی ہیں۔ تب ہی ہم صحیح معنوں میں ایک پُرمسرت زندگی گزار سکیں گے۔

---

۲۱ نومبر ۱۹۷۰ء کو ممتاز ہندوستانی سائنسداں ڈاکٹر سی۔ وی۔ رامن کا ۸۲ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔

ڈاکٹر چندر شیکھر وینکٹا رامن ۷ نومبر ۱۸۸۸ء کو تامل ناڈو میں تروچراپلی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ سائنسی تحقیق میں دلچسپی لینے لگے تھے اور سرکاری ملازمت (۱۷-۱۹۰۷ء) کے زمانے میں بھی یہ شوق جاری رہا۔ ۱۹۱۷ء میں وہ فزکس کے پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں انہوں نے پہلا غیر ملکی دورہ کیا۔

۱۹۲۸ء میں روشنی کے انتشار سے متعلق اُن کی مشہور تحقیق پر فزکس کا نوبل پرائز عطا کیا گیا۔ وہ واحد ہندوستانی تھے جنہیں سائنس میں یہ انعام دیا گیا تھا۔

۱۹۳۴ء میں انہوں نے اپنی اکاڈمی قائم کی جس نے سائنس کی ترقی میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ عالمی شہرت کے ہندوستانی سائنسداں ڈاکٹر بھابھا اور وکرم سارابھائی بھی اسی ادارے کے تربیت یافتہ ہیں۔

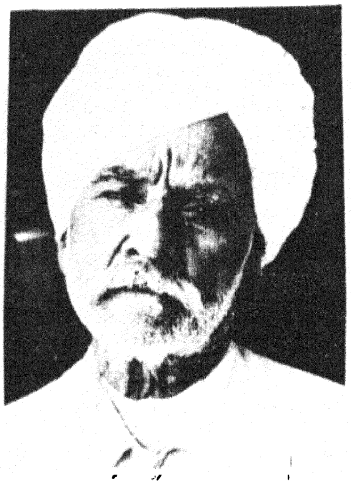

# غبارِ کارواں

## جوشؔ ملسیانی

عالم وجود میں آنے کی تاریخ یکم فروری ۱۸۸۴ء ہے۔ مقام ولادت ملسیاں تحصیل نکو در ضلع جالندھر ہے۔ ملسیاں بہت بڑا گاؤں ہے۔ آبادی چار ہزار کے قریب تھی مگر ننانوے فیصد ناخواندہ۔ دستخط بھی نہ کر سکتے تھے۔ میرے والدین اور رشتہ دار بھی بالکل ان پڑھ تھے۔ کچے مکانات ہی میں آبادی کی بود و باش تھی۔ مشکل سے دس بارہ مکان پختہ ہوں گے۔ گلی کوچے گندے نالیاں متعفن۔ صفائی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ تجارتی لحاظ سے بھی اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ میں جس گھر میں پیدا ہوا اس پر مفلسی اور عسر الحالی کا گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آمدنی کے ذرائع مفقود تھے۔ والد پشاور رہتے تھے۔ بادہ نوشی کی عادت نے یہ سکھا رکھا تھا کہ ؎

پاک خور امروز و زنہار از پئے فردا منہ

کبھی طبیعت موج پر آئی تو کچھ بھیج دیا ورنہ کئی کئی مہینے بالکل خاموش رہتے تھے۔ شاید یہ سمجھتے تھے کہ برہمنوں کا گھر ہے، دان کی چیزیں آتی رہتی ہیں، گزارہ ہو ہی جاتا ہوگا مگر یہ خیال باطل تھا۔ والدہ کو بھی ایک دو گھر یلو دستکاریوں کی مشقت برداشت کرنی پڑتی تھی۔ کبھی چچا بھی جو نزدیک کے گاؤں میں دکان داری کرتے تھے، کچھ امداد کرتے تھے۔ مگر وہ برائے نام تھی۔ البتہ ارزانی کافی تھی۔ دو ڈھائی آنے میں تین چار افراد کا کنبہ دونوں وقت پیٹ بھر سکتا تھا۔ جبری کفایت شعاری سب کے لئے ضروری ہوتی تھی۔ برا بھلا کھانا جو میسر آتا تھا کبھی کھا لیا جاتا تھا کبھی زہر مار کر لیا جاتا تھا۔ مکان بھی بہت چھوٹا تھا اور وہ بھی کچا۔ رقبہ ڈیڑھ مرلے سے زیادہ نہ تھا۔ صرف ایک کوٹھا جس کو کمرا کہنا لفظ کمرا کی تحقیر ہے۔ آگے چھوٹا سا صحن جس کا نصف حصہ سر طرفہ دیواروں پر چھت ڈال کر کچن کے لئے روک لیا گیا تھا۔ باقی کو صحن کہا جا سکتا ہے۔ یہ بھی طول و عرض میں چھ سات فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ کھلے مکانوں میں رہنے کا موقع ملا تو بارہا یہ سوچا کہ میرے بزرگ اتنے تنگ مکان میں کس طرح گزارا کرتے رہے۔ بیاہ شادی کے موقع پر رشتہ دار مہمانوں کو کہاں بٹھاتے ہوں گے۔ مرگ کے موقع پر صف ماتم کہاں بچھی ہوگی۔ مسلسل بارشوں میں کہاں اٹھتے بیٹھتے ہوں گے۔ اسی ڈربے میں میری پرورش بھی ہوئی۔ گاؤں بہت بڑا ہونے کے باوجود اسکول وہاں صرف پرائمری تک تھا۔ پانچ سال وہیں تعلیم پائی۔ فیس چار پانچ آنے سے زیادہ نہ تھی۔ وہ برداشت ہوتی رہی۔ مڈل اسکول چار میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں داخل ہوا۔ ہوسٹل میں رہنے کی استطاعت نہ تھی۔ پیدل جاتا اور پیدل آتا تھا۔ سڑک کچی اور بعض جگہ ریتلی تھی۔ جوتا کبھی نصیب ہو جاتا تھا کبھی ننگے پاؤں ہی چلنے پھرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ ایک دو مہربانوں نے گھر کی غریبی پر ہیڈ ماسٹر کو متوجہ کیا فیس معاف ہو گئی۔ یہ معافی تین سال جاری رہی۔ پڑھنے کے لئے مستعمل کتب نصف قیمت پر خرید لی جاتی تھیں مگر یہ کفایت بھی گھر کے ضروری اخراجات پر بار تھی میرا لباس بھی بہت مختصر ہوتا تھا کھادی کے ایک کرتے، کھادی کے ایک پاجامے اور کھادی کی ایک چادر میں موسم سرما بسر کرتا رہا۔ اگرچہ یہ ماحول تاریک ترین تھا مگر اس کا روشن پہلو اب میرے سامنے ہے۔ اسی ماحول نے صبر سکھایا، قناعت سکھائی، سادہ زندگی اور کفایت شعاری کی عادت کو طبیعت ثانیہ بنایا۔ گویا مفلسی اور ادبار کی زحمتیں عادت بن کر میرے لئے رحمت ثابت ہوئیں۔ خاص کر کفایت شعاری اور سادہ زندگی، آگے چل کر بہت مفید ثابت ہوئی۔ بچوں کی شادیوں اور مکان

وغیرہ کی تعمیر میں کبھی مقروض ہونے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

چودہ سال کی عمر میں والد بھی وفات پا گئے۔ اب مصیبت شدید یتیم کی ہوگئی۔ مستقبل کی فکر کلیجا توڑتی تھی۔ سبیلِ معاش کا غم کھائے جاتا تھا۔ بیس سال کی عمر تک یہی آشوبِ غم شاملِ حال رہا۔ اس آشفتہ حالی میں شاعری کا جوہر اگر اکتسابی ہوتا تو ضرور مٹ کر رہ جاتا مگر وہ وہبی اور خداداد تھا اور پکار پکار کر کہہ رہا تھا ؎

وہ داغ ہوں جو کبھی شست و شو سے جا نہ سکے
وہ نقش ہوں کہ زمانہ جسے مٹا نہ سکے

یہ وہ پھول تھا۔ جو گرم ترین ہواؤں میں افسردہ تو بارہا رہا مگر پژمردہ نہیں ہوا۔ یہ وہ چراغ تھا جسے آندھیوں کے رستے میں رکھ دیا گیا تھا۔ اس کا شعلہ تھرتھراتا تو رہا مگر بجھا نہیں۔

ان صبر شکن اور روح فرسا حالات کو ہر شخص شاعرانہ ذوق و شوق کا جانی دشمن سمجھے گا مگر ان مصائب و آلام کو بھی میں منجملہ محرکات شاعری سمجھتا ہوں۔ انہیں کے احساس نے بیسیوں اشعار ایسے کہلوائے جنہیں براہ راست میرے ذاتی تاثرات کہا جا سکتا ہے۔ مفلس کی عید کے عنوان سے جو نظم کہی، وہ اسی زمانے کی تخلیق ہے۔ مضمون ایک مفلس ہی کی زبان سے بیان کیا ہے۔ اس کے دو تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

جو مجھے دینا تھا وہ دفتر میں پہلے لکھ لیا
اے مرے رزاق حجت میں کروں تو کیا کروں
اک یہی جانِ حزیں صبر آزما، درد آفریں
سوچتا ہوں شکرِ نعمت میں کروں تو کیا کروں
یہ وہ ہے دریائے غم جس کا کنارا ہی نہیں
ناخدا سے عرضِ حاجت میں کروں تو کیا کروں

ایک اور نظم غریبوں کی دنیا کے عنوان سے ہے، وہ بھی اسی زمانے کی دین ہے۔ اس کے دو بند عرض کرتا ہوں ؎

خطا ہو کسی کی خطاوار یہ ہیں
قصور اور کا ہو گنہ گار یہ ہیں
شفا جن سے بھاگے وہ بیمار یہ ہیں
نہیں جن کا چارہ وہ ناچار یہ ہیں
غریبوں کی دنیا میں راحت نہ ڈھونڈو
غریبوں کی دنیا میں راحت نہیں ہے

غریبوں کی حالت سنبھلتے نہ دیکھی
قضا ان کی بالیں سے ٹلتے نہ دیکھی
کبھی پھانس غم کی نکلتے نہ دیکھی
کبھی نبضِ صحت سے چلتے نہ دیکھی
غریبوں کی دنیا میں راحت نہ ڈھونڈو
غریبوں کی دنیا میں راحت نہیں ہے

بعض رباعیات میں بھی یہی رونا رویا ہے۔ ان کا ایک ایک شعر یہاں لکھ دینا کافی ہے۔

۱۔ زر دار کے عیب میں بھی ہے حسنِ قبول
بے زر کا ہنر بھی عیب ہو جاتا ہے
۲۔ زر دار کے گھر میں رنج و غم ہنستے ہیں
نادار کی دنیا میں خوشی روتی ہے
۳۔ طالع کا عروج خوش نصیبوں کے لئے
ہر وقت کی افتاد غریبوں کے لئے

امیروں کی دنیا بھی لکھی۔ صرف عنوان مختلف ہے مگر ہے یہ بھی افلاس زدہ زندگی اور مفلوک الحالی ہی کی آواز۔ افسوس کہ یہ نظم گم ہوگئی۔ بہت سی تلاش کے باوجود دستیاب نہیں ہوئی۔ قوتِ حافظہ نے بھی وفا نہیں کی۔ صرف پہلا بند یاد رہ گیا ہے، وہ لکھے دیتا ہوں ؎

اٹھے ہیں تو ابرِ بلا بن گئے ہیں
چلے ہیں تو بادِ فنا بن گئے ہیں
نہ پوچھو کہ نخوت میں کیا بن گئے ہیں
یہ دنیا کے بندے خدا بن گئے ہیں
امیروں کے دل پر بھروسہ کریں کیا
امیروں کے پہلو میں دل ہی نہیں ہے

اس عسیر الحالی میں بارہا ایسا ہوا کہ گراں خاطری گراں جانی بن گئی اور امیر مینائی کا یہ شعر بارہا زبان پر آیا ؎

غم اٹھانے کو بہت تھے ترے بندے یارب
کیا کمی تھی اگر اک مجھ کو نہ پیدا کرتا

ایک اور شعر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ ایک مدت تک فراموشی کی آغوش میں سویا رہا۔ بیاض میں بھی نہیں تھا مگر شملے کی ایک صحبت میں جب دو تین عزیزوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا سامان کہاں ہے۔ ہم آپ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں تو ناگہانی طور پر یاد آگیا اور انہیں سنا دیا۔ شعر یہ ہے ؎

بے سروساماں ہوں لیکن بے سروساماں نہیں
ساتھ لے کر اپنی بے سامانیاں آیا ہوں میں

بیس سال کی اس مسلسل فلاکت اور زبوں حالی میں بچپن کے کھیل تماشے خواب و خیال رہے۔ عنفوانِ شباب میں بھی رنگینیٔ صحبت کبھی نصیب نہ ہوئی۔ بادِ بہاری کے ہر جھونکے سے یہی کہتا رہا ؎

تجھے اٹکھیلیاں سوجھے ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

خواجہ حافظ کا یہ مشہور مصرع: ہنگامِ تنگ دستی درعیش کوش و مستی کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ نہ جانے اس کا مفہوم اُن کے ذہن میں کیا تھا۔ تجربہ کر رہا تھا کہ یہ مضمون حقیقت کے خلاف ہے، کہاں تنگ دستی اور کہاں عیش۔ یہ تو لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے والی بات ہے۔ یہ قول سراسر نا قابلِ تسلیم ہے۔

اب اس مفلوک الحالی کا بیان چھوڑ کر اپنی دوسری مشکلات کی داستان گزارش کرتا ہوں۔ اسے سن کر بھی اہلِ ادب بہت حیرت زدہ ہوں گے اور کہیں گے کہ اس قسم کے دہاتی ماحول میں ایک آدمی شاعر، ادیب اور نقاد کس طرح بن سکتا ہے۔ خاص کر ایسی تنگ دستی اور زبوں حالی میں، جو نہ کوئی ادبی کتاب خرید سکتا ہے، نہ کوئی ادبی رسالہ منگوا سکتا ہے، جس کو صاحبِ ذوق کی صحبت بھی نصیب نہ ہوتی ہو، جسے کوئی ایسی چیز بھی کہیں سے مستعار نہ مل سکتی ہو جسے چوبیس گھنٹوں میں دو تین منٹ کے لئے بھی اُردو میں بات کرنے یا سننے کا موقع نہ ملتا ہو۔ پنڈت ہری چند اختر نے میری ادبی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "انہوں نے ایسے پس ماندہ علاقے میں زندگی بسر کی ہے کہ جس کی زمین کو کھودا جائے تو کسی ادیب یا شاعر کی ہڈی تک برآمد نہ ہو سکے"۔ صرف ایک فی صدی آبادی اُردو میں شُد بُد رکھتی تھی۔ اس میں بھی کوئی تیسری جماعت تک پڑھا ہوا تھا کوئی چوتھی پانچویں تک۔ اس شُد بُد کا استعمال بھی ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال اور پورن بھگت کے قصے پڑھنے تک محدود تھا۔ پانچویں پاس آدمیوں کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہ تھی چند آدمی کیما پڑھے ہوئے تھے۔ امتیاں کا کوئی نام بھی نہ جانتا تھا۔ صرف دو آدمی ایسے تھے جن کی فارسی دانی گلستاں کے آسان آسان حصوں تک محدود تھی۔ میں صرف انہیں کا ہم صحبت تھا۔ اُن میں ایک تو (یادش بخیر) چودھری اللہ بخش تھے میرا کافی احترام کرتے تھے مگر میرے کسی شعر کو سُن کر دُہراتے تھے تو اُسے ناموزوں کر دیتے تھے۔ تلفظ بھی صحیح نہ ہوتا تھا۔ غلط کالام ساکن کر دیتے تھے۔ ذبح اور نزع کو بہ کسرۂ اول پڑھتے تھے جہم کو بہ ضمۂ اول بولتے تھے۔ انجام کا الف بہ کسرۂ اوّل کہا کرتے تھے۔ میں انہیں ٹوکتا تو غیاث اللغات لے بیٹھتے تھے۔ وہاں وہی کچھ لکھا ہوا پاتے تھے، جو میں انہیں بتاتا تھا۔ اس شکست پر کہہ دیتے تھے کہ تم نے تو لفظ لفظ پر جھونپڑی ڈال رکھی ہے۔ دوسرے صاحب پنشنر ڈاکٹر جھنڈے خاں تھے۔ اُن میں یہ خاص وصف تھا کہ کسی مریض کے لئے دو ڈیڑھ آنے سے زیادہ قیمت والی دوا تجویز نہ کرتے تھے۔ بیماروں کے ہمدرد تھے۔ مولانا رومی کی مثنوی کے شیدائی تھے مگر یہ بھی غلط پڑھتے تھے۔ بعض دفعہ پڑھنے ہی میں مصرع کو ساقط البحر بنا دیتے تھے۔ ایک دو آدمی ایسے بھی تھے کہ فارسی کی ہتھ کتابیں، مینا بازار اور بیع رقعہ بھی اُن کے پاس تھیں مگر دو سطریں بھی سمجھ نہیں سکتے تھے۔ سمجھنا تو درکنار اُن کو صحیح پڑھ ہی نہیں سکتے تھے۔ بس یہ تھی اس آبادی کی تعلیمی کائنات جس میں پرورش پانے کے لئے قدرت نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔

اسکول میں چوتھی جماعت ہی سے فارسی شروع ہو جاتی تھی۔ پانچویں میں گلستاں کے دو باب انتخابی شکل میں شاملِ نصاب تھے۔ مجھے اُردو فارسی کے مضامین سے خاص دلچسپی تھی گلستاں کے بہت سے شعر انہیں دنوں میں مستقل طور پر یاد ہو گئے تھے۔ حافظہ بہت اچھا تھا اُردو کی پہلی کتاب میں مولانا محمد حسین آزاد کی جو نظمیں شاملِ درس تھیں، وہ سب مجھے زبانی یاد ہو گئی تھیں۔ اب بھی اُن کے کچھ حصے حافظے میں ہیں۔ ان میں دو نظمیں تو سالم کی سالم اب تک یاد ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُردو فارسی کی نظم سے مجھے قدرتی لگاؤ تھا اور شاعرانہ ذوق کی یہ بنیادی علامت تھی۔ مڈل سکول میں داخل ہوا۔ تو وہاں ان مضامین سے دلچسپی اور بھی بڑھ گئی۔ باوا سنگت سنگھ بیدی ہیڈ ماسٹر تھے۔ اگرچہ شاعر نہ تھے مگر اچھے صاحبِ ذوق، اچھے نکتہ شناس اور اچھے سخن فہم تھے۔ پڑھاتے تھے تو محاسنِ شعری بھی بیان کرتے تھے۔ فارسی اور اُردو کے مضامین انہیں کی تدریس میں شامل تھے۔ کبھی کبھی تین چار آسان بحروں کے ارکانِ تقطیع بھی بتا دیتے تھے۔ بعض اوقات ایک دو شعروں کی تقطیع بھی کر دیتے تھے۔ انہیں کے ادبی ذوق نے پہلی بار میرے جذبۂ شاعری کو متحرک کیا اور وہ نیم بیداری کے عالم میں انگڑائیاں لینے لگا۔ عمر ابھی بارہ تیرہ سال ہی کی تھی۔ طبیعت نے بُرا بھلا شعر کہنے پر مائل کر دیا۔ میرے ہم جماعت

طلبار نے میرے شعر سن کر پیش گوئی کر دی کہ یہ ضرور شاعر بنے گا۔ دیوانِ ذوق کا کچھ حصّہ بھی اُنہوں نے پڑھایا۔ ایک دن اس دیوان کی ایک غزل پڑھا رہے تھے۔ اس غزل کا یہ شعر ؎

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

پڑھ کر مجھ سے پوچھنے لگے کہ بتاؤ کیا مارا؟ میں نے فوراً کہہ دیا کہ تیر ادا مارا۔ یہ جواب سُن کر وہ اور میرے ہم جماعت بہت خوش وقت ہوئے اور بابا جی نے زندہ باش کہا۔ یہ تھے میرے ابتدائی محرکاتِ شاعری، جن کا سلسلہ یہاں کی تعلیم ختم ہونے پر تہی دستی اور تنگ حالی نے منقطع کر دیا۔ انھیں دنوں میں والد کا انتقال ہوا۔ فکرِ معاش اور بھی رُوح فرسا ہو گئی۔ چچا نے اپنی دکان میں نون نیل بیچنے کا دھندا اختیار کرنے کے لئے مشورہ دیا۔ دو تین مہینے تو میں نے اس مشورے پر عمل بھی کیا مگر یہ مقام ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ملی و ادبی اشتہا نے مجھے بیزار کر دیا۔ آخر یہاں سے اٹھا۔ تین سال سبیلِ معاش کی تلاش میں اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیے مارتا پھرا۔ اس عالم میں بھی شاعرانہ ذوق نے میرا دامن جو اگرچہ صد چاک تھا، نہ چھوڑا۔ دو ڈھائی سو شعر اس مدت میں کہہ ڈالے۔ مگر اساتذہ اُردو کا کلام پڑھنے کا جب بھی موقع ملا، ذوقِ صحیح اور وسعتِ نظر نے کہہ دیا کہ جو کچھ کہا ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں۔ اس آواز کو جو صداقت کا پیغام تھی، سُن کر یہ ذخیرہ چاک کر دیا اور ملسیاں کو خراب آباد سمجھ کر چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا۔ اب بھی میں اُسے خراب آباد ہی کہا کرتا ہوں۔ میری ایک غزل کا مقطع یہ ہے ؎

کیا کرو گے جو شش تم جا کر وہاں ؛ ملسیاں اب بھی خراب آباد ہے

معاشی مشکلات کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش اور مسلسل ناکامیوں کے بعد پیشۂ مدرسی اختیار کرنے کے لئے جالندھر کے ٹریننگ اسکول میں داخل ہو گیا۔ یہاں وظیفہ ملتا تھا۔ ہوسٹل کا بل ڈھائی تین روپے ماہانہ سے زیادہ نہ تھا اس لئے گزارہ ہو جاتا تھا۔ یہاں کی درسی کتابوں میں میر و سودا، ناسخ و آتش اور ذوق و غالب کا کلام پڑھ کر بہت خوش وقت ہوا۔ ان اساتذہ کے کلام نے جذبۂ شاعری کو جھنجھوڑ کر پھر سے بیدار کر دیا۔ اسے نئی زندگی عطا کی۔ ان بزرگوں کے کلام نے مجھے بتایا کہ شعر کیا ہوتا ہے۔ شاعری کی عظمت سے کیا مراد ہے۔ خوش بیانی اور تر زبانی کسے کہتے ہیں۔ شباب کی ابتدا تھی اس لئے طبیعت غزل کی طرف خود بخود مائل ہو گئی مگر فکر کا مقام ہے کہ عنفوانِ شباب اور سنِ بلوغ کے باوجود شبابیات اور عریاں قسم کی شاعری میرے نزدیک نہیں پھٹک سکی۔ یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے ؎

امیر وہ نہیں جس کا کہ دل فقیر نہیں
فقیر وہ نہیں جس کا کہ دل امیر نہیں

یہاں سے فارغ ہو کر اور ڈویژن بھر میں اوّل رہ کر چھاؤنی جالندھر میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں کا ادبی ماحول میرے لئے خوش گوار تھا۔ زبان اور فن کے ادبی نکتوں کو رفع کرنے کے مقصد سے کسی قابل شاعر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ حضرت داغ کے نامور شاگرد نسیم بھرت پوری کا دیوان کہیں سے مل گیا تھا۔ اُسے پڑھ کر اُنہیں سے خط و کتابت شروع کر دی۔ وہ فراخ دلی سے میرے خطوط کا جواب دیتے تھے۔ میرے بعض اشعار کی داد بھی دیتے تھے انہوں نے میرے رنگِ طبیعت کو پسند کیا اور حضرت داغ دہلوی سے اصلاح حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ اگرچہ میں پہلے ہی حضرت داغ کے رنگِ سخن کا گرویدہ تھا مگر رسائی کے لئے وساطت کی ضرورت تھی۔ یہ مشکل بھی موصوف نے اپنی سفارش سے حل کر دی اور ۱۹۰۲ء میں یہ سلسلہ قائم ہو گیا۔ اسی سال مجھے بڑی جماعتوں کی تدریس کے قابل بنانے کے لئے ٹریننگ کالج لاہور میں طلب کر لیا گیا۔ یہ انتخاب بالکل یقینی تھا کیونکہ میں ڈویژن بھر میں اوّل رہا تھا۔ وظیفہ یہاں بھی ملتا تھا مگر اوقات میں کوئی دشواری نہ تھی۔ یہاں پہنچا تو لاہور کی ادبی فضاؤں نے میرے نوعمر جذبۂ شاعری کو بھرپور جوانی عطا کی۔ پہلی دفعہ لاہور ہی میں مشاعرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ شوقِ سخن گوئی خوب اُبھرا۔ ہر مشاعرے میں شامل ہوتا اور پڑھتا رہا۔ کالج میں اُردو فارسی کے پروفیسر بھی شاعرانہ دل و دماغ رکھتے تھے۔ وہ بھی اپنا کلام سُنا کر مجھے متحرک کرتے رہتے تھے۔ یہاں سے فارغ ہو کر ملازمت کے سینے میں پھر دہاتی زندگی میرے حصّے میں آئی۔ چونکہ میں بیس سال ایسی زندگی کا خوگر رہا تھا اس لئے اب یہ بارِ خاطر نہیں تھی۔ وجہ یہ کہ تلاشِ معاش کے تفکرات اب گلوگیر نہ تھے۔ پوری بے فکری سے حسبِ فرصت مشقِ سخن کرتا رہا۔ لکھنؤ کا رسالہ پیام یار اب کالج ہی میں منگوانا شروع کر دیا تھا۔ اس میں مشہور اساتذہ وقت کا کلام بھی جو میرے لئے خضرِ راہ تھا، شائع ہوتا تھا۔ ادبی دل بستگی اور استفادے کے لئے یہ کلام بھی فکرِ سخن کو پر پرواز عطا کرتا رہا۔ اب سکونت بھی ملسیاں سے نکودر ضلع جالندھر میں منتقل کر لی تھی۔ یہ مقام ضلع کی ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔ ادبی لحاظ سے محرکِ شعر و سخن تو نہ تھا

مگر ملیاں کی طرح خراب آباد بھی نہ تھا۔ معاشی اطمینان کی وجہ سے ہر قسم کی ادبی کتابوں کا مطالعہ بھی اب شروع کر دیا گیا۔ منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحان بھی دیئے۔ عروض کی کتابیں بھی غور سے مطالعہ کیں۔ ان میں جواہر العروض اور بحر الفصاحت قابلِ ذکر ہیں۔ اس مطالعہ کے بغیر بھی میری طبیعت ہر بحر میں خواہ وہ سالم ہو یا مزحف۔ بالکل صحیح رفتار سے چلتی تھی پیچیدہ بحروں میں ناکام نہ ہوتی تھی۔ ناموزوں مصرع زبان پر آتا ہی نہیں تھا۔ اس مطالعے سے میں نے محسوس کیا کہ سبب اور وتد کی دو دو قسموں کے ہوتے ہوئے فاصلہ وغیرہ (چار حرفی اور پنج حرفی الفاظ کی عروضی تجزی) بالکل بے ضرورت ہے سبب اور وتد ہی تمام الفاظ پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ ان امتحانوں میں فارسی کی متعدد کتابوں کو مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ گلشنِ راز نے حقیقت و مجاز کا مفہوم سمجھایا۔ عرفان کے راز بتائے۔ شعر العجم نے فارسی ادب کی پوری تاریخ ذہن میں مرتکز کی۔ چہار مقالہ اور درہ نادرہ نے فارسی زبان کے سنگستان دکھائے۔ اس زبان میں چند اور سنگستان بھی طائرانہ نظر سے دیکھے مثلاً مینا بازار، پنج رقعہ، ابو الفضل۔ سہ نثر ظہوری وغیرہ۔ حیرت ہوئی کہ اس قسم کے پتھر فارسی کے دامن میں کیوں بھرے گئے۔ دیوانِ نظیری نیشاپوری قصائد قاآنی۔ قصائد عرفی بھی ان امتحانوں کے لئے پڑھے۔ نظیری کے تغزل اور قاآنی کی بے پناہ روانیٔ کلام نے بتایا کہ شاعرانہ عظمت کیا ہوتی ہے۔ فلسفہ کی ایک کتاب روح الاجتماع بھی اس امتحان کے نصاب میں شامل تھی۔ ایسا خشک مضمون پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کم بخت بار بار رٹنے پر بھی محفوظ نہ رہتا تھا۔ کتاب علم التعلیم میں ایک حصہ علم الحواس بھی تھا۔ ویسے تو یہ بھی خشک تھا مگر اتنا نہیں کہ دماغ کو بالکل خشک کر دے۔ گلستاں بوستاں سالم کے علاوہ سکندر نامہ بری شاہ نامہ، غالب کا فارسی دیوان، امیر خسرو کی ایک مثنوی، یہ کتابیں بھی دیکھیں۔ مگر جزوی صورت میں اخلاق جلالی اور اخلاق ناصری نے انسانیت کا نقش دل و دماغ پر بٹھا دیا۔ انوار سہیلی کے سیاست آموز بیان بہت پسند آئے۔ اردو نثر کی کتابوں میں سے فسانۂ آزاد اور فسانۂ مبتلا زبان کے لحاظ سے سبق آموز ہوئے۔ اس فضیلت میں توبۃ النصوح کو بھی برابر کا حصہ دار پایا۔ آبِ حیات اور نیرنگِ خیال کی تو دنیا ہی دوسری تھی۔ ناقدانہ نثر نگاری کا اعجاز قدم قدم پر مسحور کرتا پایا گیا۔ ناول اور فسانے پڑھنے کی طرف طبیعت کبھی مائل نہیں ہوئی۔

البتہ سراغ رسانی کے بہت سے ناول پڑھے۔ اس شوق کی وجہ یہ ہے کہ شطرنج کا شوق ایسی کتابوں سے لگاؤ پیدا کرتا رہا۔ شطرنج میں بھی تو حسنِ خیال کی جولانیاں لازم ہوتی ہیں۔

اردو میں میر تقی اور سودا نے آہ اور واہ کا منظر پیش کیا۔ سودا کی قصیدہ گوئی کو عرفی اور خاقانی سے ٹکراتے دیکھا۔ ہجویات میں انوری سے مصافحہ کرتے بھی دیکھا۔ دیوانِ ذوق اور دیوانِ غالب کی امتیازی خوبیاں زیرِ غور رہیں۔ غالب کے اردو خطوط میں شاعری ہی شاعری دیکھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ وزن اور بحر سے بالکل بے نیاز ہے۔ فن اور زبان کے بہت سے نکات ان میں حل شدہ پائے جاتے ہیں۔ حضرت داغ کے چاروں دیوان امیر مینائی کے دونوں دیوان بڑے شوق سے مطالعہ کئے۔ ہمگر زبان کا ریاض حضرت داغ ہی کے کلام بلاغت نظام سے ہوتا رہا۔ سب سے زیادہ رہنمائی انہیں کی زبان نے کی۔ دلی کے مشاعروں میں شامل ہوا تو بعض اصحاب نے یہ کہا کہ چھ سات سال تو دلی ضرور رہے ہو گے، ورنہ پنجاب کے ایک گوشے میں رہ کر ایسی زبان کبھی نہ لکھ سکتے۔ میں نے جواب میں کہا کہ میں جب بھی دلی آیا ہوں، تین چار دن سے زیادہ نہیں ٹھہرا۔ یہ جواب سن کر وہ حیران ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ اتنا ریاض تو فوق العادۃ ہی کہا جا سکتا ہے۔ بہت سے تنقیدی مضامین اور فنی مباحث بھی زیرِ مطالعہ رہے اور حالی کی تالیف یادگارِ غالب اور مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف منیف آبِ حیات لاہور میں مجھے دورانِ تعلیم میں بطور انعام ملی تھیں۔ ان کتابوں سے بھی بہت سا استفادہ ہوا اور بہت سی وسعتِ نظر حاصل ہوئی۔ ان کے علاوہ معرکہ شرر و چکبست، مرزا یگانہ کی تصنیف غالب شکن۔ صبر رام پوری اور مولانا احسن کے فنی مباحث بھی پڑھے۔ حضرت داغ کے کلام پر جو اعتراضات مسلسل طور پر اودھ اخبار میں شائع ہوتے رہے اور جن کے جوابات نسیم بھرت پوری نے نہایت قابلیت سے لکھ کر تازیانہ کے نام سے کتابی صورت میں شائع کئے، مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔ ملک بھر کے بڑے بڑے مشاعرے بھی محرک رہے۔ مشاہیر شعراء اردو سے مجالست و موانست کا موقع بھی ملا۔ بے خود دہلوی، نواب سائل، کیفی دہلوی، نوح ناروی۔ دل شاہ جہاں پوری ساحر دہلوی، مہر گویاری ان سب اصحاب سے ادبی تعارف بھی۔ ان اصحاب سے ملاقاتیں بھی ادبی گفتگو تک محدود تھیں۔ یہ میری ادبی زندگی کو خوب

جمکاتی تھیں۔ ساحر دہلوی، کیفی دہلوی، بے نوا اور نواب سائل کی قیام گاہیں ادبی اسکول تھیں۔ انھیں غالب اور ذوق کے زمانے کی مٹی سی یادگار کہا جا سکتا تھا۔ ان بزرگوں کی وفات تو دلی کو ختم کر گئی۔ اب میں کبھی دلی آتا ہوں تو یہی مصرع زبان پر آجاتا ہے۔

؎ دلی میں سب ملے مجھے دلی ملی نہیں

مجھ سے محرکاتِ شاعری پوچھے گئے ہیں۔ چھوٹے بڑے میں نے تمام محرکات بیان کر دیئے ہیں مگر میں تین چار محرکات کو بمراتب بالاتر سمجھتا ہوں۔ سب سے بڑا محرک تو موزونیٔ طبع۔ ذوقِ سلیم اور وجدانِ صحیح ہے جو خداداد تھا اور قدرت نے بڑی فیاضی سے میرے دل و دماغ میں ودیعت کیا تھا۔ اس کے بعد دوسرا بڑا محرک سعدی اور حضرت داغ کا کلام ہے۔ سعدی نے پند و موعظت کے خشک ترین میدان کو اتنا سرسبز و شاداب کیا کہ اس کی بہار کو بہارِ بے خزاں کہنا چاہیئے۔ سعدی کے سیکڑوں جواہر پارے میری کشتِ ادب کی آبیاری کرتے رہے ہیں اس نام ور بزرگ کی رُوح اگر یہ کہے کہ لافتیٰ بعدی۔ تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ سعدی کا جواب پیدا کرنے میں بعض اہلِ قلم نے قلم تو اٹھایا مگر شکستہ پا ہو کر رہ گئے۔ اُن کی محنت شاقہ کا نتیجہ بہروپ ہی کہا جا سکتا ہے۔

دوسرا بڑا محرک ہے حضرت داغ کی سحر نگاری، شوخ بیانی۔ ترزبانی فصاحت۔ بلاغت اور معاملہ بندی یا تغزل میں اُن کا مدِمقابل اس زمانے میں کوئی نہ تھا۔ انھیں کے فیضان نے مجھے پر پرواز عطا کئے۔ تیسرا بڑا محرک لاہور ہے جس کی ادبی زندگی میرے لئے ادب آموز تھی۔ باقی محرکات جو میں نے بیان کئے ہیں، میرے لئے ان کا درجہ ان کے بعد ہے۔ اگرچہ میری تعلیمی ترقی اور ادبی دست گاہ میں وہ محرکات بھی کافی وزن رکھتے ہیں۔ اُن کے فیض و کرم کا بھی مجھ پر بڑا احسان ہے۔

حضرت داغ کی معجز نگاری اگرچہ میرے لئے بہت بڑی محرک تھی مگر میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اپنے میلانِ طبیعت کے زیرِ اثر اُن کا اندازِ سخن اس حد تک اپنی طبیعت میں جذب نہیں کر سکا جس قدر نوح ناروی، ہجر شاہ جہاں پوری اور بے خود بدایونی نے جذب کیا تھا۔ اس میں کوتاہی اور تقصیر کی کوئی بات نہیں غالب کے ۴۶ شاگردوں میں ایک نے بھی ان کا اندازِ سخن گوئی قبول نہیں کیا مگر اس حقیقت کے باوجود میری ہر غزل میں تین چار ایسے شعر ضرور پائے جاتے ہیں جن پر داغ کے رنگ کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ انداز انھیں کا فیضانِ سخن ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

پی لو گے تو اے شیخ ذرا گرم رہو گے ؛ ٹھنڈا ہی نہ کر دیں تمہیں جنت کی ہوائیں

وہ غلط بھی کچھ کہیں گے تو وہی بجا رہے گا
جو نکل گیا زباں سے وہ نکل گیا زباں سے

شوخ طبعی نے کہیں کا بھی نہ رکھا ہم کو
درِ دوزخ پہ بھی رو کے گئے جنت کیسی

سخت جاں ہوں دست و بازو کا ہنر کھل جائے گا
وار کر ناسوچ کر بچ کر سنبھل کر دیکھ کر!

میں نے کہا تو یہ تھا کہ تقصیر ہو معاف
اس کے جواب میں جو سُنا کچھ نہ پوچھئے

ممکن ہے فرشتوں سے کوئی سہو ہوا ہو
میں اتنا گنہ گار کبھی ہو نہیں سکتا

اے پردہ نشیں دیکھ یہ دن رات کے پھیرے
میں گر تو نہیں ہوں ترے کوچے کی زمیں کا

کہا تم نے سُنا میں نے ابے اتنا بتا جاؤ
یہ وعدے ہیں کہ فقرے ہیں یہ باتیں ہیں کہ گھاتیں ہیں

کوئی دم ساز کوئی ہے جاں باز ؛ آپ کے ساز باز نے مارا

باتوں باتوں میں جو میں کچھ کہہ گیا ؛ ہنس کے فرمانے لگے کیا بات ہے

جنت اک چیز ہی سہی لیکن ؛ حشر تک انتظار کیا معنی

اس قدر حورِ حسیناں سے رہا خوفزدہ ؛ حوریں آئیں تو میں سمجھا کہ بلائیں آئیں

بدگمانی کی بھی عادت ہے زمانے کو بہت ؛ مجھ کو اچھا نہ کہو گے تو یہ اچھا ہوگا

گِلہ نہیں ہے اگر آپ مجھ کو بھول گئے ؛ مرے خدا کو بھی عادت ہے بھول جانے کی

جوشؔ یہ دیکھو گنہ گاروں کی فرد ؛ پہلے نمبر میں تمہارا نام ہے

# غزلیں

## اعجاز صدیقی

نظامِ فکر نے بدلا ہی تھا سوال کا رنگ
جھلک اُٹھا کئی چہروں سے انفعال کا رنگ

نہ گُل کدوں کو میسّر، نہ چاند تاروں کو
ترے وصال کی خوشبو، ترے جمال کا رنگ
نظر اشارہ کناں لب حریفِ لفظ و صوت
وہ جذب شوق کا عالم یہ عرضِ حال کا رنگ

بھریں تو اور ہوں گہرے کھلیں تو اور ہوں تنگ
ہے اِن دنوں یہی زخموں کے اندمال کا رنگ
ذرا سی دیر کو چہرے دمک تو جاتے ہیں
خوشی کا رنگ ہو یا ہو غم و ملال کا رنگ

زمانہ اپنی کہانی سُنا رہا تھا، ہمیں،
اُبھر گیا مگر آغاز میں مآل کا رنگ
کوئی زُباں کوئی طرزِ ادا نہ کام آئی
ہے لاجواب ابھی تک ہر اک سوال کا رنگ
پڑے ہوئے ہیں شش و پنج میں سبھی مہرے
جما ہوا نہیں لگتا بساطِ حال کا رنگ
مرے ہی چاکِ گریباں سے روز و شب کی نمود
مرے ہی زخم سے عبارت ہے ماہ و سال کا رنگ
اسیر وقت ہے تو، میں ہوں وقت سے آزاد
ترے عروج سے اچھا مرے زوال کا رنگ
بیانِ تختۂ گُل میری فکر ہے آزاد
مثالِ قوسِ قزح ہے مرے خیال کا رنگ

## عزیز قیسی

سب کو یقیں ہے ہم سا کوئی دوسرا نہیں
تلوتکدوں میں اُن کے کہیں آئینہ نہیں
خود کیوں نہ بڑھ کے سنگ زنوں کو پکاریئے
مدّت سے اس گلی میں تماشہ ہوا نہیں
وہ کھُل کے آگیا تو ہے خنجر لئے ہوئے
ورنہ کس آستین میں خنجر چھپا نہیں
رُکتے ہیں کوچہ کوچہ تو پھرتے ہیں شہر شہر
اب تک تو ہم کو اپنا ٹھکانہ ملا نہیں
تنہائی کا ہے جن کو گلہ کون ہیں وہ لوگ
مجھ کو گلہ ہے میں کبھی تنہا ہوا نہیں
ملتے ہیں ایک ایک سے باہیں پسار کے
کیا کیجئے کہ اپنا کوئی آشنا نہیں
مجبوری کچھ تو ہوگی کہ سجدہ گزار ہیں
گر ہم خدا نہیں ہیں تو تم بھی خدا نہیں
قیسی سدا ملے ہیں، سرِ رہ، یہاں وہاں
گھر کس جگہ ہے اُن کا کسی کو پتہ نہیں

# ریزہ ریزہ

وہ ایک لڑکی کہ طائرِ خوش نوا
خزاں میں، غزالِ وحشت رسیدہ جس پر
خُتن خُتن جیسے ہنس رہے تھے
وہ ایک بدلی کہ جس سے بوندیں
برس نہ پائیں، تو سیپ کے لب ترس رہے تھے
وہ ایک ناگن جو ہر سپیرے کی
دُھن پہ بدمست ہو رہی تھی۔
وہ جاگتی تھی کہ صاحبانِ کہف کے
غاروں میں سو رہی تھی
رواں دواں عمر کے آئینہ کو پیہم
غرور و نخوت کے پتھروں سے
کچل کچل کر، وہ کور چشموں کے جیسے سُرمہ لگا رہی تھی
وہ اب بھی میٹھے برس کے خوابوں سے زندگی کو رجھا رہی تھی

---

وہ چہرہ تھا رائج الوقت سکّہ
مگر کسی ایسی سلطنت کا جو ہاتھ سے کوئی پل میں نکلے
بدن کی قوسیں کہ دستِ پرکارِ سال و سن تھرتھرا کے سنبھلے
میں اُس کی ظلماتِ روح میں کل پئے سیاحت اُتر پڑا تھا
وہ شور تھا، بھیڑ تھی وہ ریلا
وہ کوئی کہرام تھا کہ میلا
میں محوِ نظارہ تھا اکیلا
کہ یوں بھی انجان اجنبی تھا، سراپا حیرت بنا کھڑا تھا

---

پھر اپنی آنکھوں سے میں نے دیکھا
قطار اندر قطار پتھر کے بُت کھڑے مسکرا رہے تھے
وہ دیوداسی بدن چرائے
لجائے، شرمائے، رسمسائے
چٹکتی پوروں کا پیار لے کر
کنواری کلیوں کا ہار لے کر

شاذ تمکنت

# تصویر

## زاہدہ زیدی

رینگتی بے دلی، گھٹن گرمی
سرنگوں فکر، منتشر احساس
مضمحل جسم، منتظر آنکھیں
گرتی مٹی، چٹختی دیواریں
جلتے تلوے، سلگتے راہ گزار
زخمی افکار، ٹوٹتی اقدار
ٹھٹھرے الفاظ، بے کفن معنی

سب لوازم پھر آج یکجا ہیں
ایک سادہ ورق اُٹھا لاؤ
اور پھر خامۂ تصادم سے
نئی تصویر اک بنا لاؤ!

وہ جب چرن چھونے جھک رہی تھی تو بت شوالے سے جا رہے تھے

پھر اپنی آنکھوں سے میں نے دیکھا
بلور کی ہفت رنگ گڑیا
زمین پر چھن سے گر پڑی تھی۔
وجود کا ریزہ ریزہ چُن کر
برہنہ تن، بے کفن کھڑی تھی

# علی گڑھ

## — چند یادیں

ضیاء احمد بدایونی



**وقت** کو گزرتے کیا دیر لگتی ہے۔ کہنے کو تو نصف صدی سے زیادہ زمانہ گزرا مگر کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے جب میں اپنے وطن بدایوں کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ اسی زمانے میں میرے چند عزیز ایم اے او کالج علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے۔ یہ لوگ جب تعطیل میں گھر آتے تو علی گڑھ کی خوشگوار یادیں سوغات میں ساتھ لاتے اور ہم لوگوں کو وہاں کے واقعات سناتے۔ انھیں میں ایک صاحب تھے جو مجھ سے تین چار سال بڑے ہوں گے۔ نہایت سنجیدہ و شائستہ، مہذب و متین، دیندار اور اخلاص شعار وہ جب مجھ سے ملتے تھے تو کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی زندگی کا نقشہ کھینچ دیتے تھے۔ طلبہ کا رکھ رکھاؤ، اساتذہ کا اپنے شاگردوں سے میل جول، انگریز پروفیسروں کا بے تکلف لڑکوں کے کمروں پر آنا، اُن کی مشکلات سننا اور دکھ درد میں بھی اُن کا ہاتھ بٹانا، بیماری میں اپنی کوٹھی سے پرہیزی کھانا پکوا کر خود لانا اور اپنے سامنے پیار اور شفقت سے کھلانا، گاہے گاہے طلبا کو اپنے یہاں چائے پر بلانا، اُن کا اور اُن کی لیڈیز کا کمال محبت سے پذیرائی کرنا اور چلتے وقت برآمدے تک مشایعت کو جانا۔ غرض ایک عجیب اپنائیت کی فضا تھی جس کی نظیر کسی دوسری درس گاہ میں نہیں ملتی تھی۔ عزیز موصوف جب تک یہ باتیں کرتے میں ہمہ تن گوش بن کر سُنتا اور دل ہی دل میں علی گڑھ دیکھنے کا شوق پرورش پاتا۔ سچ پوچھئے تو علی گڑھ میرے خوابوں کی بستی بن گیا تھا۔

کیا خبر تھی کہ یہ خواب ایک دن حقیقت کا روپ اختیار کرے گا اور چند سال بعد مجھے اُستاد کی حیثیت سے اُسی مرکزِ علم و ادب میں آنا ہوگا جو میرے خوابوں کی بستی تھا۔ ہوا یوں کہ جب میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کرنے اور پھر وہاں فارسی ادب میں ریسرچ کے دو سال گزارنے کے بعد وطن آیا تو ایک دن میرے محترم کرم فرما نے جو مجھ سے بے حد خلوص رکھتے تھے فرمایا کہ قریشی صاحب[1] آئے ہوئے ہیں، وہ تمہیں یاد کرتے تھے۔ یہ سُن کر مجھے تعجب ہوا کیونکہ اب تک مجھے قریشی صاحب سے تعارف کی عزت بھی حاصل نہ تھی۔ بہرحال میں اُن کی خدمت میں گیا۔ بڑے تپاک سے پیش آئے اور ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہا کہ ہمارے یہاں ایک جگہ خالی ہوئی ہے۔ آپ آجائیں تو اچھا ہے۔ میں نے موصوف کی پیش کش کو شکریے کے ساتھ قبول کیا اور علی گڑھ جاکر مسلم یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج میں لیکچرار کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ یہ دسمبر ۱۹۲۶ء کی بات ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ قریشی صاحب کون بزرگ تھے۔

---

[1] قریشی صاحب کی زوجۂ ثانیہ بدایوں کے خاندان سادات سے تھیں۔ اسی سلسلے میں موصوف اکثر بدایوں آتے رہتے تھے۔

پروفیسر عبدالمجید قریشی کا وطن تو پنجاب تھا لیکن وہ علی گڑھ میں طالب علمی اور ملازمت کا طویل زمانہ گزار چکے تھے اور نہ صرف یہ بلکہ وہاں کی زندگی میں اس قدر رچ بس گئے تھے کہ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ اور علی گڑھ لازم و ملزوم بن گئے تھے مشہور تھا کہ چکرورتی نے ڈاکٹر ضیاء الدین کو پیدا کیا، ڈاکٹر ضیاء الدین نے قریشی کو اور قریشی نے حافظ عثمان کو۔ یہ سب حضرات ریاضی میں امتیازی مرتبہ رکھتے تھے۔ غرض دو اور دو چار کی ممارست نے قریشی صاحب کو حقیقت پسندی سکھائی اور اسی کی بدولت اُن میں زندگی کے اقدار پر گہری نظر ڈالنے کی ادا آئی۔ اسی کے ساتھ اِن کو فلسفہ و ادب سے بھی خاصا ذوق تھا۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ وہ بہ یک وقت ایک بالغ نظر مدبر بھی تھے اور پاکیزہ جذبات کا پیکر بھی مولانا روم نے جو کہا ہے کہ

کار پاکاں روشنی و گرمی است

خدا نے دماغ کی روشنی اور دل کی گرمی دونوں موصوف کی ذات کے اندر جمع کر دی تھیں۔ کشیدہ قامت، بارعب چہرہ اور شاندار مونچھیں۔ یہ تھے قریشی صاحب جو میرے علی گڑھ آنے کا باعث ہوئے۔ کبھی کبھی ایسا ہوا کہ لڑکوں نے ڈائننگ ہال کے انتظام سے ناراض ہو کر اسٹرائک کر دی اور تمام ارباب حل و عقد اُس گتھی کو سلجھانے سے قاصر رہے مگر قریشی صاحب نے جو سمجھتے تھے کہ کہاں نرمی کا محل ہے اور کہاں گرمی کا، منٹوں میں اپنے ناخن تدبیر سے اُس عُقدے کو یوں حل کر دیا کہ سب دنگ رہ گئے۔ علی گڑھ میں بڑے عظیم الشان مشاعرے ہوئے جن کا سہرا دو شخصوں کے سر رہتا۔ قریشی صاحب اپنی وجاہت سے طلبہ کے جوش و خروش کا بار سنبھالتے اور مولانا احسن مارہروی، نازک مزاج شعرا کی خاطر و مدارات کر کے کام نکالتے۔ میں نے ایسے افراد بہت کم دیکھے ہیں جن سے طلبہ ایک طرف ڈرتے ہوں اور دوسری طرف اُن کا دم بھی بھرتے ہوں۔ یہ بات قریشی صاحب میں پائی۔

جس کالج میں پہلی بار میرا تقرر ہوا اُس کے پرنسپل قریشی صاحب ہی تھے۔ دو کلاس یونی ورسٹی کے اور دو اسکول کے ملا کر انٹرمیڈیٹ کالج کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ یونی ورسٹی اور اسکول کا دائرہ عمل اُس سے الگ تھا۔ کالج کے اساتذہ میں چند اصحاب ایسے تھے جن کے علمی اکتسابات اور مخلصانہ تعلقات کی یاد اب تک دل میں جاگزیں ہے۔ ان میں مشتاق احمد صاحب خلف نواب وقار الملک مرحوم عبدالشکور صاحب، ڈاکٹر ناظم صاحب، محمد حاذق صاحب اور شیخ علی جواد صاحب مرحوم خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

عربی کی کہاوت ہے لِکُلِّ دَاخِلٍ دَھْشَۃٌ (ہر نووارد کو گھبراہٹ کا سامنا ہوتا ہے) اس پر طرہ یہ کہ علی گڑھ کے طالب علموں کی شرارتوں کے قصے سن چکا تھا۔ تاہم کلاس لینا ضروری تھا۔ شروع شروع میں بعض طلبہ نے شوخ طبعی دکھائی مگر جلد ہی اُن کو سمجھ آئی۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ کالج میں (اور کالج کے بعد یونیورسٹی میں) ان کا احترام اور میری شفقت ضرب المثل بن گئی۔ میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ علی گڑھ کے طویل زمانہ قیام میں اربابِ اختیار کا معتمد علیہ۔ اپنے رفقائے کار میں مقبول اور اپنے شاگردوں میں محترم رہا۔ بعد کو قریشی صاحب نے یہ نکتہ سمجھایا کہ علی گڑھ کے طلبہ اپنے اساتذہ کا صحیح جائزہ لینا جانتے ہیں۔ اگر کوئی اُستاد نالائق ہوتا ہے یا خواہ مخواہ رعب جماتا ہے یا کام کرنا نہیں چاہتا تو وہ اُس کو چٹکیوں میں اُڑا دیتے ہیں لیکن اگر کوئی ٹھکانے کا آدمی پاتے ہیں تو اس کی دل سے عزت کرتے ہیں۔

میں جب علی گڑھ پہنچا ہوں تو وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں تھے وہ ایک جمیل و شکیل انسان تھے اور عین مَین انگریز معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ انگریز کا تو صرف رنگ گورا ہوتا ہے۔ صاحب زادہ صاحب ہر طرح ایک پیکرِ جمال تھے۔ بچپن سے اُن کی قابلیت، علمیت، مذہبیت، دیانت داری اور حق پسندی کے چرچے کانوں میں پڑے تھے۔ مذہب سے لگاؤ تو ہمیشہ سے تھا لیکن آخر میں تو مذہب اُن کی پوری زندگی پر چھا گیا تھا۔ وہ قوم اور یونی ورسٹی کی خدمت کی سچی لگن رکھتے تھے اور دونوں کو بامِ عروج پر پہنچانے کے آرزومند تھے بعض لوگ کہتے ہیں کہ مرحوم میں ضد اور اپنی رائے پر اصرار تھا۔ مگر میری ناقص رائے میں ہر اصول پرست اور حق پسند کو یہ مرحلہ پیش آتا ہے۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ مرحوم فالج کے حملے سے صاحبِ فراش اور نشست و برخاست سے معذور تھے ۲۷ء میں اچانک سنا کہ صاحبزادہ صاحب نے ایک زبردست پمفلٹ چھپوا کر تمام ممبران کورٹ اور دوسرے ذمہ دار اعیانِ قوم کو بھیجا ہے۔ پمفلٹ کیا تھا گویا بم کا گولا تھا جس نے علی گڑھ کی ساکن فضا میں قیامت کی ہلچل ڈال دی۔ جو تھا تصویر حیرت بنا ہوا تھا۔ ہر ایک کی زبان پر یہ الفاظ تھے "دیکھئے کیا ہوتا ہے خدا خیر کرے" پمفلٹ کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

" میں نے اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں حد سے زیادہ کوشش کی کہ فلاں فلاں امور میں اصلاحات بر روئے کار لاؤں مگر ہر ہر موقع پر پرو وائس

چانسلر (ڈاکٹر ضیاء الدین احمد) میری کوشش کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہے۔ اپنے انتخاب کے دوسرے روز ہی علی الصباح میں یونی ورسٹی کی مسجد میں گیا (یہ ماہ جنوری کی کوئی ابتدائی تاریخ تھی) اور موذن کی عدم موجودگی میں خود ہی اذان دی۔ امام صاحب بھی غیر حاضر تھے آخر یہ مشکل چار پانچ طالب علم جو آ گئے تھے۔ ان کے ساتھ فریضۂ فجر ادا کیا۔ جب جناب ناظم دینیات سے اس عام بے توجہی کی وجہ پوچھی اور دینیات سے متعلق بعض مسائل پر گفتگو کی تو وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ حد یہ ہے کہ وہ یہ بھی نہ بتا سکے کہ ایک ناظم کے ذمے کیا فرائض ہوتے ہیں۔ ان وجوہ سے مجبور ہو کر میں یہ بمفاد شائع کرتا ہوں تاکہ ارباب اقتدار جلد اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔"

"علیا حضرت سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال ایک دردمند اور بیدار مغز رئیسہ اور علی گڑھ کی چانسلر تھیں اور ممدوحہ کے فرزند نواب حمید اللہ خاں جو اعیان ملک میں ملی حمیت اور گہری بصیرت کا بے مثال نمونہ اور یونی ورسٹی کے اولڈ بوائے تھے اُن کے مشیر کار تھے جب اُن کی نظر سے یہ تحریر گزری تو اُن کے حکم سے ان شکایات مندرجہ بالا کی تحقیق کے لئے رحمت اللہ کمیشن کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر سر ابراہیم رحمت اللہ اور ارکان دو ممتاز ماہر تعلیم انگریز تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کمیشن کے مصارف اٹھارہ ہزار روپے ہوئے جو اس زمانے میں بڑی رقم سمجھے جاتے تھے اور جو بیگم صاحبہ نے اپنی جیب خاص سے عطا فرمائے۔ ڈیڑھ دو سال کی مسلسل تگ و دو اور بند کمرے میں ذمہ دار اصحاب کی شہادتوں کے بعد خدا خدا کر کے کمیشن کی رپورٹ منظر عام پر آئی جس کا ماحصل یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو اُن کی خدمات سے سبکدوش کیا جائے اور ادارے کا چارج بانی کالج کے نامور پوتے سید راس مسعود کو سونپا جائے جو اس زمانے میں مملکت دکن کی تعلیمات کے اعلیٰ افسر تھے۔ منجملہ دوسری اصلاحات کے اساتذہ کا ردوبدل اور انٹرمیڈیٹ کالج کی موقوفی بھی عمل میں آئی۔ اُس موقع پر صرف دو اُستاد کالج سے یونی ورسٹی میں ترقی پر لئے گئے۔ شیخ عبدالرشید اور راقم سطور۔ یہ غالباً ۱۹۳۲ء کی تعطیل گرما کا واقعہ ہے۔

سید راس مسعود کے نام نے درحقیقت جادو کا کام کیا۔ دیکھتے دیکھتے علی گڑھ کی فضا یکسر علمی و تعلیمی ہو گئی۔ اساتذہ میں ذمہ داری کا احساس اور طلبہ میں اپنے فرائض کا پاس پہلے سے دوچند ہو گیا جدھر دیکھو علمی چرچے، جہاں جاؤ یہی تحقیق کے جلوے۔ نئے وائس چانسلر اپنی اصلاحی تجاویز کو روبہ عمل لانے کے لئے ایک مشہور ماہر تعلیم مسٹر ہارن کو پرو وائس چانسلر کی حیثیت سے ساتھ لائے تھے جنہوں نے بڑی سرگرمی کے ساتھ حالات کو سدھارا مگر افسوس کہ ایک سال کے اندر ہی علی گڑھ کی لو کانشکار ہو گئے۔ خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود۔

علی گڑھ آکر راس مسعود نے اپنی پالیسی کے بارے میں جو پہلی زلزلہ فگن تقریر کی وہ عمر بھر بھولنے والی نہیں۔ وہ جس طرح ایک طلیق اللسان Conversationalist تھے اسی طرح ایک جادو بیان مقرر بھی۔ جب بولتے تھے ایسا لگتا تھا کہ ایک لشکر جرار دھاوا مارتا چلا آ رہا ہے۔ اُن کو اُردو اور انگریزی پر بے نظیر قدرت تھی۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اپنے مرحوم دادا کی امانت کی نگہداشت کرتے ہوئے ممکن ہے کہیں مجھ سے فیصلہ کرنے میں غلطی ہو جائے مگر میری نیت ہمیشہ نیک ہوگی۔

اب میں یونی ورسٹی کے شعبۂ فارسی میں منتقل ہو گیا جہاں مدت تک لیکچرر اور ریڈر کے فرائض انجام دیتا رہا۔ یونی ورسٹی کی فضا کالج کی فضا سے ملتی جلتی تھی۔

---

نوٹ: یہ جو کہا گیا محض قول نہ تھا بلکہ پورے طور پر عمل سے ہم دوش۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم کے نعت میں قول بلا عمل کے الفاظ ہی نہ تھے۔ میں نے سرسید اور جسٹس محمود کو نہیں دیکھا۔ البتہ سید راس مسعود کو دیکھ کر کچھ اندازہ ہوا کہ عالی دماغ اور عالی ظرف ایسے ہوتے ہیں۔ ان سے پہلے نواب مزمل اللہ خاں صاحب (بھوپال) جو ایک نرم مزاج، علم دوست اور فیاض رئیس تھے بمنصب وائس چانسلری پر فائز تھے اور تمام سیاہ و سفید کا اختیار ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر ضیاء الدین) کے ہاتھ میں تھا اور یونی ورسٹی کے معاملات پرانے ڈھرے پر چل رہے تھے۔ سید راس مسعود اور مسٹر ہارن کا آنا تھا کہ بالکل کایا ہی پلٹ گئی اور تمام امور میں خواہ تعلیمی ہوں یا انتظامی، کمیشن کی سفارشات کے مطابق عمل ہونے لگا۔ حکومت میں ان کا یہ وقار کہ بڑے بڑے گورنمنٹ آف انڈیا کے یوروپین افسروں کو آدھا نام لے کر پکارتے تھے۔ والیان ملک میں یہ اعزاز کہ اعلیٰحضرت نظام سے یونی ورسٹی کے لئے لاکھوں لاتے تھے۔ پبلک لیڈروں میں یہ دفعت کہ اُن کی دعوت پر کبھی گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال اور کبھی علی برادران اور علامہ اقبال علی گڑھ آتے اور کئی کئی دن ان کے مہمان رہتے۔ یہ بھی سنا دوں کہ سید صاحب مرحوم کی خدمت میں میری باریابی کی تقریب کیونکر ہوئی۔ بات یہ تھی کہ سید صاحب لمبی تعطیل گزار کر یورپ سے تشریف لا رہے تھے اور اُن کے اعزاز میں اکنان کالج نے ڈنر

مگر زندگی یہاں زیادہ بھرپور، مکمل اور ہمہ جہتی نظر آتی تھی۔ گویا کالج دریا تھا اور یونیورسٹی سمندر۔ حکام یونیورسٹی ہمدرد تھے۔ رفقائے کار قدر دان اور طلبہ ادب شناس۔ پھر اور کیا چاہئے۔ اس سے زیادہ کی کبھی ہوس ہی نہ کی۔

---

کا انتظام کیا تھا میرے مخصوص کرم فرماؤں میں مرحوم عبدالعزیز پوری صاحب نے اصرار کیا کہ اس تقریب مسعود پر نظم ضرور ہونا چاہئے۔ مجی حاذق صاحب نے فرمایا کہ میں خوش الحانی کے ساتھ بلند آواز سے پڑھ دوں گا میں کہ بڑے لوگوں کے یہاں حاضر باشی اور معزز مہمانوں کی آمد پر قصیدہ نگاری خلاف وضع سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں معذرت کرنے لگا۔ بالآخر اُن کا اصرار میرے انکار پر غالب آیا اور میں نے ارتجالاً قاآنی کی زمین میں فارسی کے چند اشعار بطور تہنیت و تبریک لکھ لئے جب شب کو مجمع محضر میں پڑھے گئے تو سب نے بے حد پسند کئے اور سید راس مسعود کمال درجہ متاثر ہوئے۔ چنانچہ نظم کے اختتام پر مجھے طلب کیا اور نہایت اخلاق سے پرسش حال کر کے فرمایا کہ مجھ سے ملتے رہنا۔ مرحوم کی عادت تھی کہ جب کسی نئے شخص سے ملتے تو اس کا امتحان ضرور لیتے اور اس خوبی کے ساتھ کہ پتہ نہ چلتا کہ امتحان ہو رہا ہے میں جب پہلی بار کوٹھی پر حاضر ہوا تو یاد ہے کہ انہوں نے مجھ سے غالب کا حسب ذیل شعر دریافت فرمایا۔

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

جب میں نے صحیح مطلب بتایا تو بہت محظوظ ہوئے۔ اُن کے ذہن میں اردو کلاسیکل لٹریچر کو مغربی GET UP کے ساتھ ارزاں قیمت پر گھر گھر پھیلانے کی اور ملک کے گوشے گوشے سے نوادر کتب لاکر علی گڑھ میں جمع کرنے کی ایک بڑی اسکیم تھی۔ جس کو ظاہر کر کے فرمایا کہ آیا تم اس میں مجھے مدد دے سکتے ہو۔ میں نے عرض کی کہ جہاں تک میرے امکان میں ہے حاضر ہوں افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور یہ اسکیم قول سے فعل میں نہ آسکی۔ وہ علی گڑھ سے بددل ہو کر بھوپال تشریف لے گئے اور وہیں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

راس مسعود کے علی گڑھ چھوڑنے پر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد جو پہلے پرو وائس چانسلر رہ چکے تھے۔ وائس چانسلر منتخب ہوئے۔ اگرچہ راس مسعود اور ڈاکٹر صاحب میں نظریاتی اختلاف تھا مگر ڈاکٹر صاحب کے دماغ کے رسائی، معاملہ فہمی اور کارگذاری میں کوئی شبہ نہ تھا۔ وہ ایک غریب گھر سے تعلق رکھتے تھے اور غریب طلبہ کی مشکلات

یہ سمجھ لیا کہ یہ ایک عام درس گاہ نہیں ہے جس میں بڑے چھوٹے افسر اور ماتحت کا سوال ہو۔ بلکہ ایک کنبہ ہے جس کے اندر اُستاد بزرگ خاندان یا باپ کی حیثیت رکھتا ہے اور شاگرد خوردوں یا اولاد کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام طلبہ جن

---

خوب سمجھتے تھے۔ وہ علی گڑھ کی ہر رگ سے واقف تھے اور اچھا کہو یا بُرا معمولی مہتر سے لے کر اعلیٰ پروفیسر تک کا تقرر اپنے ہاتھ میں رکھنا پسند کرتے تھے۔ علی گڑھ والوں کا TACT (محل شناسی) مسلم ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب TACT کا کامل نمونہ تھے۔ TACT پر ایک قصہ یاد آیا جو ایک دفعہ موصوف ہی نے بیان فرمایا تھا۔ کہتے تھے کہ ایک مرتبہ کسی سرکاری کمیشن پر جانا ہوا جس کے میں میرے سوا دو اعلیٰ انگریز عہدہ دار بھی تھے۔ قیام کسی پہاڑی پر تھا جہاں ایک اُجڑے ہوئے ڈاک بنگلے اور ایک بوڑھے چوکیدار کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک ساتھی نے کہا۔ ڈاکٹر! اس وقت چائے کی سخت خواہش ہے۔ تم کہا کرتے ہو کہ علیگیرین بڑے Tactful ہوتے ہیں اگر چائے پلواؤ تو جانیں۔ میں نے جواب دیا ٹھہرئے سب انتظام ہوا جاتا ہے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ چوکیدار نے خبر دی کہ کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ بلایا تو معلوم ہوا کہ علاقے کے تحصیلدار ہیں اور ہم لوگوں کی آمد کی خبر اخبار میں پڑھ کر کئی میل سے ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ یہ کسی زمانے میں علی گڑھ میں طالب علم رہے تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا کیا یہاں چائے کا بندوبست ممکن ہے۔ بولے۔ جی میں لیتا آیا ہوں۔ ذرا دیر میں میز چائے کے سامان، مکھن ٹوسٹ، کیک اور پھلوں سے بھر گئی۔ میں نے دونوں ساتھیوں کو آواز دی اور وہ یہ لوازم دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ڈاکٹر صاحب پر اکثر اصحاب نکتہ چینی کرتے تھے لیکن اعتراض کے ساتھ ہی اُن کے ذو وصفوں کا اعتراف بھی کرتے تھے یعنی اپنے مخالفوں کو بھی نقصان نہ پہونچانا اور علی گڑھ چھوڑنے پر بھی دلی کے زمانہ قیام میں فرزندانِ درسگاہ کے کام آنا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ریل سے اُتر کر گھر آئے اور فوراً لغیر لباس تبدیل کئے اپنے دفتر میں بیٹھ کر کاغذات دیکھنے لگے۔ صدر ہوگئی کہ گھر کے اندر بیوی پر سکرات کا عالم ہے اور وہ باہر دفتر میں بیٹھے ہوئے یونیورسٹی میں کسی آنے والے معزز مہمان کی پذیرائی کے لئے ہدایات دے رہے ہیں۔ سرشار سلیمان کی وائس چانسلری کا دور بھی بڑا شاندار تھا۔ موصوف اُن اعلیٰ اوصاف کے حامل تھے جو کسی قوم کے لئے بھی باعث نازش ہو سکتے ہیں۔ قانون، ریاضی، سائنس عربی اور اردو میں اُن کی ہستی نوادر عصر میں شمار ہونے کے قابل تھی۔ دماغ اور

میں شریف صاحبزادے امیرزادے، نواب زادے، متوسط حال اور غریب ہر درجے کے نمایندے تھے۔ پھر سب کی فطرت جدا، طینت جدا، طبیعت جدا، خصلت جدا۔ تاہم سب میرے خلوص کا جواب احترام سے دیتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ وہ لوگ اپنی درسیات میں مدد لینے یا اپنی ذاتی مشکلات میں مشورہ چاہنے کے لئے میرے مکان پر آئے ہیں، اور میں اپنی تمام مصروفیات چھوڑ

---

زبان اس قدر عجلت سے کام کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ ادھر آپ نے اپنی بات تمام نہیں کی اُدھر انہوں نے آپ کا مافی الضمیر سمجھ کر جواب دینا شروع کر دیا۔ بے مثال قابلیت اور اعلیٰ دُنیاوی اعزاز کے باوجود وہ اسلامیت، مشرقیت اور کسرِ نفسی کا مکمل نمونہ تھے۔ شروع شروع میں جب وہ بیرسٹر ہو کر ولایت سے آئے اور اپنے والد ماجد کی خدمت میں الہ آباد حاضر ہوئے تو لوگوں نے دیکھا کہ جب والد جانے کے لئے اٹھنے لگے تو انہوں نے کمالِ ادب سے اُن کی نعلیں اُٹھا کر سامنے رکھ دیں۔ دیکھنے والوں نے اسی وقت اُن کے روشن مستقبل کی پیش گوئی کر دی چنانچہ وہ جوڈیشل سروس کے اونچے سے اُونچے مناصب پر سرفراز ہوئے۔ علی گڑھ کی وائس چانسلری کے زمانے میں وہ دہلی سے ہر ہفتے میں دو دن کو تشریف لاتے اور اپنے سفر اور قیام کے مصارف کا بار خود اٹھاتے۔ حتیٰ کہ ڈائننگ ہال کے کھانے کے دام اپنی جیب سے دیتے اور رات کو کونسل کے کمرے میں آرام کر لیتے۔ نواب اسمٰعیل خاں ایک بھاری بھرکم پُروقار شخصیت والے وائس چانسلر تھے مگر وہ زیادہ دنوں تک وائس چانسلر نہ رہ سکے۔ اُن کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین آئے۔

ذاکر صاحب جس بلند و بالا شخصیت کے مالک اور دل و دماغ کی جن عظیم صلاحیتوں کے جامع تھے اُن سے ایک دنیا واقف ہے۔ لیکن صحت کے روز افزوں انحطاط نے موصوف کو علی گڑھ چھوڑنے پر مجبور کیا اور بعد کو حکومت ہند کے اصرار نے ان کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ جہاں گورنری نیابت اور صدارت اُن کی پذیرائی کی منتظر تھیں۔ زیدی صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین کے نقشِ قدم پر چلے اور خاصے کامیاب رہے۔ اُن کے بعد بدرالدین طیب جی کا زمانہ آیا اور علی گڑھ کے لئے نئی بشارت لایا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ایک آئی سی ایس یہاں کیا کامیاب ہوگا مگر طیب جی نے اپنی بے لاگ، کھری، مدبرانہ، اور ہمدردانہ روش سے اس طرح کام کیا کہ علی گڑھ والے اُن کو آج تک محبت اور عزت سے یاد کرتے ہیں۔

چھ چھ سات سات گھنٹوں تک اُن کے کام میں منہمک رہا ہوں حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم قومی درس گاہ کو محض اینٹ اور چونے کی عمارت تصور کرنا بڑی غلطی ہوگی۔ یہ سرسید اور اُن کے لائق رفقاء[1] کے خوابوں کی تعبیر ہے۔

یہ وہ درس گاہ ہے جس نے ہر زمانے میں بڑے بڑے مردانِ کار پیدا کئے۔ آفتاب احمد خاں، سید طفیل احمد، سر ولایت حسین اور حبیب اللہ جیسے فرزندانِ ملت۔ ڈاکٹر ضیاء الدین، ڈاکٹر ولی محمد، ڈاکٹر عبدالحق، مولوی عزیز مرزا جیسے فاضلانِ عصر جلی برادران، رفیع احمد قدوائی، راجہ مہندر پرتاپ، خواجہ غلام الثقلین، سر رضا علی، ڈاکٹر محمود، خواجہ عبدالمجید، سابق صدرِ پاکستان محمد ایوب، شیخ عبداللہ، عبدالرب نشتر، نواب صاحب بھوپال جیسے ممتاز رہنما۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ غلام السیدین، لور عبداللہ جیسے ماہرینِ تعلیم۔ مولانا ظفر علی، میر محفوظ علی۔ قاضی عبدالغفار۔ مولوی عنایت اللہ۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری۔ سجاد حیدر۔ سلطان حیدر۔ خوشی محمد ناظر۔ حسرت موہانی، فانی بدایونی جیسے کاملانِ ادب و شعرا اسی کی آغوش کے تربیت یافتہ ہیں۔ یہ وہ درس گاہ ہے جس کو ایشیا میں مسلمانوں کا سب سے بڑا قومی و ثقافتی مرکز کہنا چاہئے۔ یہ دراصل سرسید کی علی گڑھ تحریک کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

سرسید نے کن حالات کے تحت اس تحریک کی بنا ڈالی اُس کی تفصیل میں جانے کا نہ وقت ہے نہ ضرورت۔ کیونکہ سرسید کے سوانح اور درس گاہ کی تاریخ پر لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ البتہ اتنا یاد رکھنا چاہئے کہ ۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکام رہنے کے بعد قوم کا حال سراسر تباہ تھا اور اُس کا مستقبل تمام تر تاریک نظر آتا تھا۔ بالکل یہ کیفیت تھی جیسے گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہو، بجلی چمک رہی ہو، بادل گرج رہے ہوں، سمندر میں طوفان برپا ہو اور ایک شکستہ کشتی بھنور میں پھنس گئی ہو۔ ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں ہائل

---

[1] انہیں مخلصانہ تعلقات کا اثر ہے کہ اب بھی اس زمانے کے طلبہ جو اکثر بفضلہٖ اعلیٰ مناصب علم و عمل پر فائز ہیں جب مل جاتے ہیں تو انتہائی ارادت سے پیش آتے ہیں۔ [2] سید کے رفقاء میں چراغ علی، سمیع اللہ خاں، محسن الملک، وقار الملک، زین العابدین، نذیر احمد۔ ذکاء اللہ، حالی، شبلی، مشہور ہیں جن کو نورتن کہا جائے تو بجا ہے۔ [3] ایشیا کی قید اس لئے لگائی کہ افریقہ میں جامع ازہر مسلمانوں کا سب سے بڑا علمی مرکز ہے۔

سیح ہے ایسی حالت میں کشتی اور اُس کے ملّاح پر جو کچھ گزرتی ہوگی بیکساران ساحل اس کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہ کشتی ملّت کی کشتی تھی اور یہ ملّاح سرسید۔

سرسید نے ۵۷ء کی شورش کے تباہ کن اثرات بچشم خود دیکھے یوں تو تمام ہندوستانیوں کو ناکامی کا خمیازہ اٹھانا پڑا مگر مسلمان خاص طور سے انگریز کے انتقامی جوش کا نشانہ بنے کیونکہ ہر جگہ ہندو مسلمانوں کی شورش کا واحد مقصد حکومت مغلیہ کے اقتدار کو بحال کرنا تھا۔ اُدھر انگریزوں کو مسلمانوں سے نفرت ادھر مسلمانوں کو انگریزوں سے وحشت۔ اس کے علاوہ انہوں نے اندازہ کیا کہ مسلمان مذہب کی جگہ توہمات میں گھرے ہوئے ہیں، جدید تعلیم کو کفر سمجھتے ہیں ادب میں تکلف اور لایعنی خیالات کے عادی ہیں سیاست سے بیگانے اور بیہودہ رسموں کے دلدادہ ہیں اس لئے انہوں نے طے کیا کہ اُن کو مذہب، تعلیم، ادب، سیاست اور سماج کے جدید عملی حقائق سے رُوشناس کیا جائے اسی تحریک کا ایک مظہر ایم اے او کالج تھا جو اب خدا کے فضل سے یونی ورسٹی بن چکا ہے۔ اس پر قوم کی طرف سے جس قدر اُن کی مخالفت ہوئی اس سے کون ناواقف ہے۔ ان امور کی تفصیل کہاں غیر ضروری ہے۔ بایں ہمہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن کے بارے میں جو چند غلط فہمیاں ہیں اُن کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ اُن کا مطمح نظر صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کو بڑے بڑے عہدے مل جائیں۔ ہمارے خیال میں معترض حضرات نے یا تو حقیقت کو سمجھا نہیں یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے اسٹریچی ہال کا سنگِ بنیاد رکھے جانے کے وقت لارڈ لٹن سے صاف کہا تھا کہ "مجھے اُمید ہے کہ یہ پودا کبھی درخت بن جائے گا جس کی شاخیں برگد کی طرح دُور دُور پھیلیں گی اور یہاں سے فارغ ہونے والے ملک کے طول و عرض میں آزاد تحقیق رواداری اور اخلاق کا پیام پہونچائیں گے۔" کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو غلامی کا سبق پڑھایا۔ لیکن اعتراض کرنے والے اُن کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" دیکھ لیتے تو ایسا کہنے کی جرأت نہ کرتے۔

کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندو مسلم تفریق کا بیج بویا مگر یہ الزام بھی عدم واقفیت پر مبنی ہے۔ خود سرسید رقمطراز ہیں "میں نے بار بار کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دُلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دُلہن بھینگی ہو جائے گی۔"

میرے زمانے میں جو اساتذہ یہاں برسرکار تھے اُن میں اکثر کی ہستی کسی یونی ورسٹی کے لئے بھی سرمایۂ مباہات ہو سکتی تھی۔ تاریخ میں پروفیسر حبیب۔ تعلیمات میں پروفیسر حبیب الرحمٰن، فلسفے میں ڈاکٹر ظفر الحسن، معاشیات میں ڈاکٹر ایل کے حیدر۔ سائنس میں پروفیسر بابر مرزا اور کرنا حیدر خاں۔ شعبہ دینیات میں مولانا سلیمان اشرف اور مولانا راغب بدایونی، عربی میں مولانا مبین، اُردو میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور مولانا احسن مارہروی وامثالہم کے علمی و عملی اکتسابات کے بیان کے لئے ایک دفتر چاہیئے، مگر بسخوفِ طوالت چھوڑتا ہوں۔ البتہ جی نہیں مانتا کہ اپنے شعبے (فارسی) کے رفقاء کے بارے میں چند جملے کہے بغیر گزر جاؤں۔ شعبہ فارسی کے صدر ڈاکٹر ہادی حسن تھے جن کو قدرت نے غیر معمولی ذہن اور حافظہ دیا تھا۔ سرو قد، خوبرو۔ خندہ پیشانی کہ بات کریں تو منہ سے پھول جھڑیں۔ نقل کرنے پر آئیں تو روتوں کو ہنسائیں۔ جب وہ اسپیچ دیتے تھے تو ہزاروں کے مجمع پر مکمل سکوت چھا جاتا تھا ——— وہ جو کسی نے کہا ہے "کسی کی آنکھ میں جادو تری زبان میں ہے"۔ شاید ان میں دونوں باتیں تھیں۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ جب وہ انگریزی میں تقریر ختم کر چکے تو فاضل صدر جلسہ مسٹر ریمزبا تھم پروائس چانسلر نے اعتراف کیا I can not express uyself so beautifully as Dr.Hedi Hasan has done اسی طرح جب وہ فارسی میں گل افشانی گفتار پر آتے تو اچھے اچھے ایرانی فضلا تصویر حیرت بن جاتے۔ یونی ورسٹی میڈیکل کالج کے لئے قوم سے پچاس لاکھ کی رقم وصول کر لینا ڈاکٹر ضیاء الدین کی کوشش اور ڈاکٹر ہادی حسن کی کاوش ہی کا ثمرہ تھا۔ ہادی صاحب کی موت تمام احباب کے لئے دردناک حادثہ تھی۔

شعبے کے دوسرے اُستاد الحاج حمید الدین خاں تھے۔ جو بفضلہٖ بقید حیات ہیں وہ علی گڑھ کے عاشق بھی ہیں اور ناقد بھی۔ وقت کے اتنے پابند اور اصول کے اتنے سخت کہ خواہ وائس چانسلر کے ہاں میٹنگ

---

لہ میں سید صاحب کی اکثر تاویلات کو نہیں مانتا۔

ہو یا ایم اے کا کلاس ہو اگر اوّل الذکر کو کوئی کام لگ گیا یا آخر الذکر پانچ منٹ بعد آئے تو آپ قطعاً نہیں ٹھہرتے۔ پورٹ فولیو اٹھایا اور یہ جا وہ جا۔ نہایت بے لوث اور بے حد بے باک۔ لوگ اس کو اُن کی درشت مزاجی پر محمول کرتے ہیں۔ کریں میں تو اصول پرستی کہتا ہوں۔ یادش بخیر۔ محمد حاذق انتہا کے باغ و بہار اور بلا کے بذلہ سنج۔ دوستوں کے دوست۔ ساتھیوں پر شفیق

قارئین شاید ناخوش ہوں کہ میں نے ابتک علی گڑھ کے عام ماحول اور خصوصاً وہاں کے طلبہ کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ مجھے خود اس بات کا خیال ہے مگر کیا کیا جائے کہ بات میں بات نکلتی چلی آئی ورنہ دراصل ٹیپ کا بند تو یہی تھا میں تو یہ جانتا ہوں کہ علی گڑھ کی فضا بے تعصبی میں اور اُس کے طلبہ امن پسندی میں مثالی حیثیت کے مالک ہیں۔ شروع سے علی گڑھ کے دروازے بغیر امتیاز مذہب و قوم ہر ایک کے لئے کھلے رہے ہیں شاید لوگوں کو یہ معلوم ہو کر تعجب ہوگا کہ ایم اے او کالج کے سب سے پہلے گریجویٹ بالو ایشری پرشاد ساکن ضلع علی گڑھ تھے۔ وہاں کے طویل زمانہ قیام میں میں نے اساتذہ کو بھی برتا اور طلبہ کو بھی پرکھا۔ لیکن بات چیت میں۔ برتاؤ میں، رکھ رکھاؤ میں کبھی یہ سوال نہیں اُٹھا کہ فلاں مسلمان ہے اور فلاں ہندو۔ یا عمرسنی ہے اور زید شیعہ۔ غور کیجئے تو یہ بڑی بات ہے۔ جمعہ یا عیدین میں جب اہلِ سنت کا ہم غیر دوگانہ پڑھ کر مسجد سے باہر آتا ہے اور شیعہ حضرات نماز کے لئے داخل ہوتے ہیں تو وہ دلکشا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

آج ہر جگہ نوجوانوں کی قانون شکنی حد سے تجاوز کر چکی ہے۔ علی گڑھ والوں کا ڈسپلن ضرب المثل ہو گیا ہے استثنائی صورتیں کہاں نہیں ہوتیں لیکن فیصلہ سوادِ اعظم کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ جب گاندھی جی اور علی برادران نے ترک موالات کا فیصلہ کیا جب یورپ نے ترکی کے "مردِ بیمار" کا خاتمہ کرنا چاہا جب بہار اور کوئٹہ میں قیامت خیز زلزلہ آیا جب علی گڑھ میں سیلاب نے ستم ڈھایا تو یہی علی گڑھ کے فرزند تھے جو خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار اور سرفروشی کو تیار ہو گئے۔ آخر میں شاعر کا ہم نوا ہو کر مجھے یہی کہنا پڑتا ہے کہ ؎

دارم دلے ز آبلہ نازک نہاد تر
آہستہ پا نہم کہ سرخار نازک است (غالب)

# دل بدلی

واہی

چلتے چلتے دفعتاً پڑی بدلنے کا چلن ؛ ہے سیاست کے قلابازوں کا ایک مشہور فن
فائدہ ہوتا ہے وقتی طور پر اس کھیل میں ؛ گو ثقہ حضرات کہتے ہیں اسے بھٹیارپن
شاعروں نے بھی اسے اپنا لیا ہے آج کل ؛ کارآمد دیکھ کر یہ نسخۂ آہن شکن
ہو رہا ہے اس قدر مقبول یہ نسخہ کہ اب ؛ دل بدلتے رہتے ہیں دن رات ارباب سخن
نت نیا بہروپ لازم ہے پئے اظہار ذات ؛ جب نظر کے سامنے ہو فن برائے مکر و فن
وہ زمانہ جبکہ بزم شعر تھی اک رزم گاہ ؛ چھوڑ دی تھی ہر نئے شاعر نے رفتارِ کہن
گھولتے رہتے تھے وہ حضرات جام شعر میں ؛ نغمۂ بلبل کے بدلے شورشِ دار و رسن
ہوٹلوں میں بیٹھ کر ہوتا تھا ذکرِ انقلاب ؛ اپنے سر سے باندھے رہتے تھے تخیل میں کفن
اُن میں کچھ لیڈر صفت تھے اور کچھ والنٹیر ؛ جھنڈیں سرخاب کے جس طرح ہوں زاغ و زغن

نعرہ بازی میں اگر ہوتے تھے لیڈر پاؤ سیر
اُن کے ہر والنٹیر کا وزن ہوتا ڈیڑھ من

رفتہ رفتہ شور و غوغائے سخن کا جب تھما ؛ لگ گیا جب ماہ نخشب میں حوادث کا گہن
آگئے کچھ اور کرتب باز، بزم شعر میں ؛ اک ذرا سا جانتے تھے جو گرہ بندی کا فن
سونگھ کر موسم کی بُو، اور رُخ ہوا کا دیکھ کر ؛ کیچلی بدلی ہر اک والنٹیر نے دفعتاً
صبحدم دیکھا تو ٹیڈی سوٹ میں ملبوس ہیں ؛ پھینک کر چکے سے اپنا انقلابی پیرہن
سر کے بالوں کی سفیدی ہو گئی غرقِ خضاب ؛ تہہ بہ تہہ غازہ لگا کر دور کی رُخ کی شکن
شاعری کی عمر تھی گو بیس یا پچیس سال ؛ لیکن اپنے فن میں بالقصد لائے بال پن
کر دیا ہر صدارت پیش اپنے آپ کو ؛ جب بنائی چند نوشتوں نے کوئی انجمن
اس طرح گھس بیٹھ کرتے کرتے یہ والنٹیر ؛ بن گئے اب خام ذہنوں کے امام فکر و فن

اُن کا مقصد ہے اگر کچھ تو حصولِ منفعت
انقلابی شاعری ہو یا معمائی سخن

کشمیری کہانی

# مغلی عفارا

علی محمد لون



**لاتھر** آج مرگیا

سلطان سوداگر اور محمد وحلوائی اُس کے جنازے میں شامل تھے۔ سلطان سوداگر کی پگڑی اُسی کے سر پر بڑی ڈھیلی ڈھیلی سی لگ رہی تھی۔ محمد وحلوائی کے سارے بال سفید ہو چکے تھے اور اُس کی کمر دوہری ہو گئی تھی۔ میں نے سلطان سوداگر سے لاتھر کی موت کا سبب پوچھا۔ تو وہ بولا۔

"میرے عفارا کی آہ لے ڈوبی اسے۔"

یہ سُن کر میں نے محمد وحلوائی کی طرف دیکھا۔ جیسے اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ بات کیا ہوئی۔ اُس نے بھی یہی جواب دیا۔

"میرے عفارا کی آہ لے ڈوبی اسے۔"

عفارا سلطان سوداگر کا تھا یا محمد وحلوائی کا۔ اس بات کا فیصلہ میں آج بھی نہ کر سکا اور اُن دونوں بھی نہیں کر سکا تھا جب عفارا ہمارے محلے کے بازاہیں شیر کی طرح دہاڑا کرتا تھا اور سب اس سے خوف کھایا کرتے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کشمیر پر قبائلیوں نے ہلہ بول دیا تھا اور کشمیریوں کو مغل بادشاہوں کی غلامی کے بعد پہلی بار بندوق اُٹھانے کا موقع ملا تھا۔ معمولی فوجی تربیت حاصل کرنے کے بعد کشمیری سپاہیوں کی چھوٹی بڑی ٹولیاں محاذِ جنگ پر جاتی تھیں اور ہندوستانی سپاہیوں کے شانہ بہ شانہ ملک کے بچاؤ میں شامل ہوتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک کے اس حصے کا نظامِ حکومت اور عام لوگوں کی روزمرہ زندگی ایک شدید بحران کا شکار تھی۔ حملہ آوروں کو شکست دینے کا کام ترجیحی طور پر کیا جاتا تھا اور اُس کے بعد دوسرے مسئلوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ حالات اس حد تک بگڑے ہوئے تھے کہ کئی معاملوں میں نراجیت کا سا احساس ہوتا تھا کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہ رہا تھا اس لئے جو سپاہی محاذوں سے گھروں کو لوٹ آتے وہ اپنے ہتھیار ساتھ ہی لایا کرتے تھے۔ تھری ناٹ تھری کی رائفلیں کندھوں سے لٹکائے اور کالے کالے فوجی جوتے پہنے ہوئے یہ لوگ گلیوں اور بازاروں میں شور مچاتے ہوئے گزرا کرتے تھے۔ گلی کوچوں اور بازاروں میں فوجیوں کا یوں گزرنا ہی دراصل اس کہانی کو جنم دینے کا ذمہ دار ہے۔

معلوم نہیں ملک کے دوسرے حصّوں میں پلنے والے عام کتّوں کا کیا عالم ہے۔ لیکن اپنے یہاں کے عام یا بازاری کتّوں کی ایک بُری عادت یہ رہی ہے کہ وہ ہمیشہ موٹر سائیکل اور سپاہیوں کے پیچھے بھونکتے ہوئے دوڑتے ہیں۔ آج بھی ایسا ہوتا ہے اور شاید ہمیشہ ایسا ہوتا رہے گا۔ قبائلی حملے کے دنوں میں بھی ایسا ہی ہوا۔ محاذوں سے واپس آنے والے سپاہی کتّوں کی اس عادت سے واقف تھے اس لئے وہ ہر کتّے کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا کرتے جو ان پر بھونکتا تھا۔ کتّوں نے یہ صورتِ حال دیکھ لی تو وہ کچھ دیر سپاہیوں سے دُور دُور ہی رہنے لگے۔ لیکن اب سپاہیوں کو کتّوں کے شکار کرنے کا چسکہ پڑ چکا تھا اور وہ اس تاک میں لگے رہتے

تھے کہ کب کوئی آوارہ کتا سامنے سے گزرے اور وہ اُسے گولی کا نشانہ بنا دیں۔ اکثر ایسا ہی ہوا کرتا تھا کہ یہ سپاہی دکانوں کے سامنے، گلی کے نکڑ پر، آنگنوں میں سوئے ہوئے کتوں کو ٹھوکریں مار مار کر جگایا کرتے اور اس سے پہلے کہ کتا احتجاجاً بھونکتا گولی اس کے اندر چلی جاتی اور چیخ کے نکلنے سے پہلے ہی بے چارے کی جان نکل جاتی۔

مگر مغلی اور عفارا سپاہیوں کی ذرا بھر بھی پروا نہ کرتے۔ اس لئے نہیں کہ وہ کوئی اونچی ذات کے کتے تھے یا اس لئے بھی نہیں کہ وہ کسی بڑے آدمی کے پالتو تھے۔ وہ دونوں بالکل بازاری کتے تھے، نیچی ذات کے۔ لیکن سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی کے پیار، دلار کی وجہ سے وہ سارے بازار کے مشہور اور جانے پہچانے کتے تھے جس طرح معمولی حیثیت پانے کے بعد ہمارے سپاہی بڑے بھروسے اور اعتماد کے ساتھ محاذوں پر لڑنے جاتے تھے اس طرح سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی کی دیکھ بھال اور محبت سے ان کتوں کو بھی اپنے آپ پر ایک اعتماد سا پیدا ہوا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ عام بازاری کتوں کی نسبت یہ زیادہ باتمیز اور عقلمند بھی تھے۔ اس عقل اور تمیز کی بدولت یہ جانتے تھے کہ سپاہی ان کو چھیڑنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ بازار کے دو لڑاکو دکاندار ان کے مالک تھے اور ان ہی کے برتے پر یہ جہاں بھی اور جدھر بھی جس سپاہی کو بازار میں چلتا دیکھتے، آگا پیچھا دیکھے بغیر اس پر جھپٹتے اور اسے بھگائے میں ایک نامعلوم سی حیوانی خوشی محسوس کرتے۔ سپاہی بھی اس بات سے باخبر تھے اس لئے وہ بھی چپ رہتے اور کوئی خاص قدم نہ اٹھانے میں ہی خیریت سمجھتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی مغلی عفارا کو چھیڑنے کی ہمت نہ کی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی کی موجودگی میں ایسا کرنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے برابر ہوگا۔ اور پھر سارے بازار کے دکاندار اور آوارہ لڑکے سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی کی دیکھا دیکھی اٹھا سپاہیوں کو ہی اپنے طنز و مزاح کا شکار بنا دیتے۔ مغلی اور عفارا جیسے اس بات کو پوری طرح جانتے تھے۔ اس لئے وہ میاں بیوی اپنی دموں کو اوپر اٹھائے سارے بازار میں اس طرح گھوما کرتے تھے جیسے کہ اس بازار کی ساری زینت انہی کے دم قدم سے تھی۔

لیکن وجہ صرف اتنی ہی نہ تھی کہ سلطان سوداگر محمد و حلوائی اور بازار والوں کو ان کتوں سے بہت زیادہ اُنس تھا۔ اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ قبائلی حملے سے ہی جو اتھل پتھل واقع ہوئی۔ اُس میں ہمارے سماج کے سبھی طبقوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن پسماندہ طبقہ کے جوان اور نوجوان خاص طور پر دوسروں کی نسبت زیادہ دل جمعی اور بھروسے کے ساتھ نئے حالات کا ساتھ دیتے ہے کم از کم ہمارے محلے میں تو یہی صورت حال تھی۔ شروع شروع میں تو سبھی لوگ حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لئے کمربستہ ہو کر اٹھے لیکن جوں ہی حالات ذرا سنبھلنے ہونے لگے تو پڑھے لکھے اور کاروباری لوگ واپس اپنی اپنی سابقہ جگہوں اور کام پر چلے گئے۔ روزگار اور تعلیم کے ذرائع سے محروم طبقے کے نوجوان دل جمعی کے ساتھ فوج میں برابر شامل ہوتے گئے اور سچ تو یہ ہے کہ پہلے پہل بھی اسی طبقہ کے نوجوان محاذوں پر زیادہ کامیاب رہے تھے۔ ہمارے محلے ہی کی مثال لیجئے۔ جہاں ہمارے محلے کے چار لڑکوں کو لڑنا تھا لیکن اس کا نشانہ کبھی خطا نہ ہوتا تھا۔ چالیس گز کی دوری سے کانٹے دار تار کو نشانہ بناتا اور اس کے دو ٹکڑے کر کے چھوڑ دیتا۔ اس طرح کمہاروں کا جمال کسی گپھا کے اندر چراغ جلا کر گپھا کے دہانے سے باہر اس کو نشانہ بناتا اور گولی کی آواز نکلنے کے ساتھ ہی چراغ بجھ جاتا۔ اس کے مقابلے میں لاتھر پڑھا لکھا بھی تھا، اور اچھے گھرانے کا بھی لیکن اس کا نشانہ ٹھیک نہ تھا۔ سلطان سوداگر اکثر اس کے نشانے کے بارے میں کہتا تھا۔

"ارے کس کی بات کرتے ہو؟ یہ تو دو گز کی دوری سے ہاتھی کو بھی نشانہ نہیں بنا سکتا۔"

خیر یہ تو بات ہی سے بات نکل آئی تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ سپاہیوں میں اکثر جو ان پسماندہ ذاتوں اور طبقوں سے تعلق رکھتے تھے اس لئے بھی لوگ ان کی کوئی خاص قدر نہ کرتے تھے۔ سپاہی بھی اس بات سے واقف تھے اور اس لئے بھی وہ مغلی اور عفارا کو چھیڑنے کی جرأت نہ کرتے لیکن لاتھر اس لحاظ سے کسی سے کمتر نہ تھا اس لئے وہ کسی کی پروا نہ کیا کرتا تھا۔

لاتھر کا وہ نام نہ تھا جو کہ لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا اس کا اصلی نام حبیب جان تھا۔ وہ لیفٹننٹ لاتھر کیسے بن گیا۔ وہ آگے میں پتہ چلے گا۔ وہ شکل و صورت سے خاصا خوبصورت تھا۔ گلابی رنگ تھا اس کے چہرے

کا اور جسم بالکل صاف شفاف تھا۔ آنکھیں نشیلی اور بال کسی حد تک بھورے۔ قد میں اچھا خاصا تھا اس لئے جب اس نے فوجی وردی پہنی تو سچ مچ بالکل بڑی لام والا گورا سا نظر آنے لگا۔ ایسا لگتا جیسے کہ تازہ تازہ ولایت سے ادھر آیا ہو۔ سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی نے اُسے ایک دن جو فوجی وردی میں بازار سے گزرتے دیکھا تو وہ ایک دوسرے کو آنکھ مارنے لگے سلطان سوداگر نے محمد و حلوائی سے پوچھا۔

"ارے یہ کون لاتھر صاحب آیا ہے ادھر؟"

"بھئی یہ تو اپنا حبیب جان ہے۔"

"کون یہ؟ یہ حبیب جان ہے؟"

سلطان سوداگر کو یقین نہ آیا۔ اس نے ایک بار پھر حبیب جان کو سر سے پاؤں تک دیکھا لیکن حبیب جان تو اتنا اکڑا ہوا جا رہا تھا کہ اُس نے سلطان سوداگر کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا اور چاقی تان کے ناک کی سیدھ چلا گیا۔ اس کی خوش قسمتی یہ تھی کہ اس وقت مغلی اور عفارا وہاں نہ تھے ورنہ سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی حبیب جان کو چٹی کا دودھ یاد دلاتے۔ سلطان سوداگر بیچ و تاب کھائے اور ہاتھ کاٹنے لگا۔ اس نے محمد و حلوائی سے کہا۔

"محمدو دیکھا۔ اُس نے تو میری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔"

"کیسے دیکھتا سلطان۔ یہ تو سوچتا ہوگا کہ بندوق اٹھائی اور بڑا تیر مارا۔"

"افسوس تو یہ ہے کہ مغل عفارا اس وقت یہاں نہیں ہیں۔ ورنہ سارے کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔"

"وقت ہی بُرا آیا ہے نہیں تو کل تک کوئی ٹھوکتا بھی نہ تھا اس پر۔"

سلطان سوداگر غصے میں بل کھاتا رہا لیکن بے بسی کی حالت میں اسے پی کر رہ گیا۔ ہاں اُس نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ اس سپاہی کی اکڑ فوں دور کر دینی چاہئے۔ نہیں تو سلطان سوداگر کی ساری ساکھ مٹی میں مل جائے گی۔ خیر اس وقت تو اس سے کچھ بھی نہ بن سکا لیکن نفرت اور حسد کے مارے اُس نے زور سے آواز دی۔

"مسٹر لفٹین لاتھر!"

بس پھر کیا تھا دو ہی دن میں حبیب جان کا نام لوگ بھول گئے اور وہ لیفٹننٹ لاتھر کے نام سے بدنام ہو گیا۔ حبیب جان کے کانوں تک یہ بات پہونچا دی گئی اور وہ کچھ چوکنا ہو گیا۔

ایک دن لیفٹننٹ لاتھر جانے کس محاذ سے لوٹ کر آیا۔ اب کی بار اُس کے ساتھ اسٹین گن بھی تھی اور اس کی وردی پر ایک پھول بھی لگا تھا۔ بالکل وہی ولایتی گورا سا۔ خوبصورت، سُندر اور سجیلا گورا، لیکن گھمنڈ میں چور۔ اس کے بجائے کہ وہ سیدھے اپنے گھر چلا جاتا، وہ اپنی اسٹین گن وردی اور وردی میں لگے پھول کی نمائش کے لئے بازار میں آیا۔ اپنی کرنی کے لئے کون کس کو دوش دے سکتا ہے۔ سلطان سوداگر نے اُسے اپنی طرف آتے دیکھا تو اُس کے منہ پر شیطانی مسکراہٹ ناچ اٹھی۔ مغلی عفارا دوکان کے سامنے آپس میں کھیل رہے تھے۔ بڑا پیارا تھا ان کا کھیل۔ وہ ایک دوسرے پر پل پڑتے، ایک دوسرے کو گراتے، یوں ہی جھوٹ موٹ ایک دوسرے کو کاٹتے اور دھیرے دھیرے غراتے تھے۔ سلطان سوداگر نے جوں ہی لیفٹننٹ لاتھر کو اپنی دکان کے نزدیک آتے دیکھا، اُس نے کتوں کو آواز دی۔

"مغلی عفارا!"

آواز سنتے ہی کتے اپنا کھیل بھول گئے۔ وہ چوکنے ہو گئے۔ اور اپنی دموں کو اُوپر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ سلطان سوداگر نے اُنہیں شہ دی۔

"ہُس!"

مغلی اور عفارا دونوں ایک ساتھ بھونکنے لگے اور سلطان سوداگر اپنی دکان چھوڑ محمد و حلوائی کی دکان میں یہ کہتے کہتے گھس گیا۔

"میں نے تو اسے چڑانے کے لئے لیفٹین لاتھر کہا تھا۔ یہ تو سچ مچ لیفٹین بن بھی گیا۔"

مغلی اور عفارا بھانپ گئے کہ سلطان سوداگر نے لیفٹننٹ لاتھر کی طرف اشارہ کیا تھا اور وہ دوڑ لگا کر اُس کی اور چل پڑے جیسے شیر شکار کی طرف دوڑتا ہے۔ لاتھر نے دُور سے ہی کتوں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اُس نے کاندھے سے اسٹین گن اُتاری لیکن اس سے پہلے کہ وہ زمین پر پوزیشن لے کر کوئی کاروائی کرتا، مغلی اور عفارا دونوں ایک ساتھ اس پر پل پڑے۔ اسٹین گن ایک طرف جا گری اور لاتھر کے منہ سے بڑی ہی

خوف زدہ چیخ نکلی۔

"میرے خدا - مار ڈالا"

اس پر سلطان سوداگر اور محمد وحلوائی نے زور سے قہقہہ لگایا۔ دوسرے دکان دار بھی زور زور سے ہنس پڑے۔ بچوں اور لڑکوں کی ایک چھوٹی موٹی فوج سی مغلی اور عفارا اور لاتھر کے اردگرد حلقہ بنا کے کھڑی ہوگئی۔ خوش قسمتی سے سدارام کی دکان بند تھی اور لاتھرے اس دکان کے تھڑے پر چھلانگ لگائی اور جب مغلی اور عفار اُس کی ٹانگوں کو کھرچنے اور کاٹنے کی کوشش کرنے لگے تو لاتھر کے منہ سے بڑی بے ہودہ سی چیخیں بلند ہوئیں۔

"ہائے ماں، ہائے ابا۔" لاتھر کی چیخ و پکار سُن کر بازار والے کچھ شرمندہ سے ہوگئے لیکن بچوں اور لڑکوں نے زور زور سے تالیاں بجا کر آواز لگائی۔

"ہے ہے ہے ہے ہے ہے:"

بچوں کی "ہے" سُن کر مغلی اور عفارا نے محسوس کیا کہ شاید کوئی تماشا ہوگیا ہے اس لئے وہ دونوں لاتھر کو چھوڑ بچوں کا حلقہ توڑ کر باہر نکل گئے اور ایک بار پھر پہلے کی طرح ایک دوسرے سے پیار کرنے میں مشغول ہوگئے۔ کتوں اور بچوں کو جانے دیجئے۔ سلطان سوداگر کو یہ احساس ہوا کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہوا۔ گھمنڈی ہے تو کیا ہوا۔ ہے تو اپنے ہی محلے کا۔ لوگ لاتھر کو اس طرح چیختے چلاتے اور ہائے ہو کرتے سنتے تو کیا وہ بھی اپنے لئے ہمدردی کی بات نہ ہوتی؟ سلطان سوداگر ادھر اپنے دل میں ہی یہ سوچ رہا تھا اور اُدھر لاتھر یکبارگی بولا:۔

"ہے سلطان سالے! مزا چکھاؤں گا نہیں بھی اور تمہارے ان ذلیل کتوں کو بھی"

مغلی اور عفارا نے جب لاتھر کو غصے میں بولتے ہوئے سُنا تو وہ ایک بار پھر اپنا کھیل کود بھول بھال کر لاتھر کی طرف دوڑے۔ لاتھر اپنی آستین گن اُٹھا چکا تھا اس لئے اب کی بار اُسے بھاگنے ہی میں اپنی خیریت نظر آئی۔

بازار کے سبھی دکان داروں اور بچوں نے لاتھر کے یوں بھاگنے پر زور زور سے تالیاں بجائیں، سیٹیاں بجائیں اور ہے ہے کی آوازیں دور تک لاتھر کا تعاقب کرتی رہیں۔ پھر اس کے بعد لاتھر جب تک گھر میں رہا۔ بازار کی طرف بھولے سے بھی نہ گزرا۔ گزرتا بھی کیسے۔ ایک طرف مغلی عفارا اُس کی جان کے دشمن، دوسری طرف سارا بازار اور پھر شیطان بچوں کی ٹولیاں۔

اُس کے بعد لاتھر وردی پر دو پھول لگائے چھٹی پر آگیا۔ مطلب یہ کہ وہ واقعی لیفٹننٹ بن گیا تھا۔ سلطان سوداگر اور محمد وحلوائی کو یہ بات ناگوار گزری اور پھر لاتھرے اب کی بار کمر بند سے پستول بھی لگایا تھا اس دن لاتھر بے دھڑک بازار میں آیا۔ مغلی اور عفارا اس وقت نہ جانے کہاں تھے۔ نہیں تو اس کی ساری اکڑ دھری کی دھری رہ جاتی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لاتھر نے پہلے ہی یہ دریافت کر لیا ہو کہ مغلی اور عفارا اس وقت سلطان سوداگر کی دکان کے سامنے نہیں ہیں۔ اس لئے وہ بڑے رعب کے ساتھ آیا اور سلطان سوداگر پر برس پڑا۔

"کہو سلطان کہاں چھپا رکھا ہے کتوں کو؟"

سچ تو یہ ہے کہ سلطان سوداگر کچھ ڈر ہی گیا۔ سوچنے لگا کہ اگر کہیں غصے میں لاتھر نے پستول نکالا اور داغ دیا تو خواہ مخواہ جان پر آبنے گی۔ چاہے گولی نہ بھی مارے لیکن ساری اکڑ تو نکال ہی دے گا۔ اس لئے اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"کہئے لیفٹین صاحب۔ طبیعت کیسی ہے؟"

"طبیعت؟ تمہارے مطلب؟"

"لاتھر نے جل بھُن کر جواب دیا۔ محمد وحلوائی نے محسوس کیا کہ سلطان سوداگر کچھ ڈر گیا ہے اس لئے اس نے اپنی دکان سے چلا کر پوچھا۔

"کیوں بے سلطان؟ تو اس طرح رُک رُک کر بول کیوں رہا ہے؟"

"ارے نہیں تو۔ ہم بھائی آپس میں باتیں کر رہے ہیں"

"شٹ اپ" لاتھر نے چلا کر کہا! تو اور میری برابری کرتا ہے؟ کتا کہیں کا؟"

محمد وحلوائی سے رہا نہ گیا۔ اس نے پہلے سے بھی زیادہ زور سے آواز دی۔

"بات کیا ہے سلطان؟ یہ آدمی کاہے کو انگریزی بگھار رہا ہے"

اب لاتھر محمد وحلوائی کی طرف مڑ گیا اور آنکھوں سے شعلے برساتا ہوا بولا:

"ابے او محمدو سالے! تو چپ رہ نہیں تو مار مار کے تیرا کچومر نکال دوں گا۔ تو کون ہے بیچ میں بولنے والا؟"

اس سے پہلے کہ محمدو حلوائی اس گالی کا جواب دیتا سلطان سوداگر نے بگڑے ہوئے حالات کو محسوس کر کے لاتھر سے کہا۔

"دیکھئے لیفٹین صاحب۔ جانے دیجئے اب جو ہوا سو ہوا۔ ہمارے ساتھ آپ کا کیا لین دین نہیں ہے۔"

"کچھ نہیں۔ لیکن تم نے اُن کمینے کتوں سے میری توہین کرائی۔"

"اچھا ان کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔ بس؟"

سلطان سوداگر ابھی مشکل سے معافی مانگ ہی چکا تھا کہ جانے مغلی کہاں سے آگیا اور اُس نے لاتھر کی ٹانگوں کے درمیان منہ لے جاکر آہستہ سے 'عف' کی۔ لاتھر بچھیری کی طرح بدک گیا اور اُس نے فوراً پستول نکال لیا اور چار قدم دُور جاکر نشانہ ٹھیک کرنے لگا۔ مغلی ایک شیرنی کی طرح سینہ تانے اُس کے سامنے کھڑی رہی۔ سلطان سوداگر اور محمدو حلوائی دونوں نے بیک وقت دکان سے چھلانگ لگائی اور وہ دونوں ایک ساتھ مُغلی کے سامنے ہو گئے۔ سلطان سوداگر اب غصّے میں بھنّا کر بولا:

"او حبیب جان! تجھے کس بات کا گھمنڈ ہو گیا ہے۔ کیا پستول ہاتھ میں لے کر یہ سمجھتا ہے کہ ناحق کسی کا خون کر دے گا۔؟"

لاتھر نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ محمدو حلوائی زور زور سے سب کو سُناتا ہوا بولا۔

"سلطان۔ میں بھی دیکھوں۔ کس مائی کے لال میں ہمت ہے، جو ہماری مغلی پر ہاتھ اُٹھائے گا!"

اب تو سارا بازار اُمڈ پڑا اور لاتھر کے اردگرد لوگوں نے گھیرا ڈال دیا۔ لاتھر بھانپ گیا کہ حالات خراب ہو رہے ہیں اس لئے کچھ کہے سُنے بغیر گھر کی طرف چل دیا۔ مُغلی نے ایک بار پھر زور سے "عف" کی اور نہ جانے عفارا کہاں سے چھلانگتا پھلانگتا ہوا آگیا پھر دونوں نے لاتھر کو آڑے ہاتھوں لیا۔ لاتھر نے پستول نکالا اور گولی داغ دی۔ گولی مُغلی کے سر پر جا لگی اور وہ ڈھیر ہو گئی۔ عفارا نے لوتھر کی گردن کو دبوچنے کے لئے چھلانگ لگائی۔ لیکن لاتھر نے پستول کے کُندے سے اُس کے سر پر زور سے چوٹ ماری۔ عفارا چکرا کر نیچے گر پڑا اور لاتھر دُم دبا کر بھاگ اٹھا۔

عفارا ہوش میں آتو گیا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے پاگل ہو گیا ہو۔ کھانا پینا بھول بھال کر وہ بین کرنے اور رونے لگا۔ انسانوں ہی کی طرح اُداس اور غم زدہ ہو گیا۔ وہ مغلی کی لاش کے اردگرد گھومتا رہا، اُسے سونگھتا رہا، چاٹتا رہا۔ لیکن جب مغلی کے مردہ جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی تو وہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر زور زور سے رونے لگا۔ سلطان سوداگر اور محمدو حلوائی نے لاکھ کوشش کی کہ مغلی کی لاش کو وہاں سے ہٹائیں لیکن عفارا نے اُنہیں ایسا کرنے سے روکا۔ جوں ہی مغلی کے قریب آئے۔ عفارا غرا کر کاٹنے کو دوڑتا۔ جیسے وہ سچ مچ ہی پاگل ہو گیا ہو۔ عفارا کی یہ حالت دیکھ کر سلطان سوداگر اور محمدو حلوائی بھی آپے سے باہر ہو گئے اور انہوں نے لاتھر کو مارنے کا عہد کیا اور وہ اس کے گھر کی طرف چل پڑے لیکن وہ اس سے پہلے ہی بھاگ چکا تھا۔

مُغلی کی موت کے بعد عفارا وہ پہلے والا عفارا نہ رہا وہ چالاک بیدار اور بہادر عفارا۔ اس کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی۔ وہ روز بروز سوکھنے لگا وہ اب کسی کے پچکارنے پر خوش نہ تھا اور نہ ہی کسی کے اکسانے پر دوڑتا۔ اُس کی دم بھی ٹوٹ سی گئی۔ کان لٹک سے گئے اور آنکھیں بھی سکڑتے سکڑتے تقریباً بند ہی ہو گئیں۔ سلطان سوداگر اور محمدو حلوائی نے لاکھ جتن کئے کہ عفارا ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹ آئے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ الغرض سب عفارا کی طرف سے ناامید ہو گئے۔

تین مہینوں تک ایسی حالت رہی اور عفارا دھیرے دھیرے موت کے منہ کی طرف لڑھکتا رہا۔ اسی زمانے میں لاتھر ایک بار پھر گھر لوٹ آیا۔ وہ بازار سے گزرا۔ عفارا سو رہا تھا۔ اُس نے جیسے کچھ سونگھ لیا ہو۔ جوں ہی لاتھر اس کے قریب سے گزرا، عفارا نے منہ اوپر اٹھا لیا۔ پہلے لاتھر کی طرف ٹکٹکی لگا کے دیکھا اور پھر بہ مشکل ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر لاتھر پر بھونکا۔ لاتھر اب وہ پہلا سا بزدل نہ رہا تھا۔ وہ بھی اپنی جگہ پر ڈٹ کر کھڑا رہا اور جونہی عفارا نے اُس کی طرف چھلانگ لگائی۔ لاتھر نے اُسے گردن سے پکڑ کر زمین پر پٹک دیا اور خود کچھ کہے بغیر ہی گھر کی طرف چل دیا۔

عفارا کانپتے کانپتے ایک بار پھر اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہوگیا۔ اس کے سارے بدن میں کپکپاہٹ سی دوڑ گئی اور وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاکر لاتھر کے گھر کی طرف جانے لگا۔ تھوڑی دُور چل کر اُس نے اپنے جسم کو زور سے جھٹک دیا جانے کیا بات ہوگئی۔ کہ اتنی زور سے پوری انگڑائی لی اور زور سے چلایا ــــ

"عف : "

اس کے بعد وہ شیر کی طرح اس کی طرف دوڑا، جدھر لاتھر چلا گیا تھا۔ سلطان سوداگر اور محمد وحلوائی بھی اُس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ پھوڑ چھاڑ کر سارے دکان دار بھی لاتھر کے گھر کی طرف جانے لگے اور لاتھر کے گھر کے آنگن میں جمع ہوگئے۔ عفارا مکان کے اردگرد دوڑ رہا تھا اور اندر جانے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں اور لاتھر دوسری منزل کی کھڑکی سے آنگن کی طرف دیکھ دیکھ کر پستول کی گولیاں بھر رہا تھا۔

عفارا نے جونہی لاتھر کو دیکھا وہ چند قدم پیچھے چل کر دوڑا اور کھڑکی کی طرف چھلانگ لگائی۔ لاتھر نے گولی داغ دی۔ لیکن نشانہ خطا ہو گیا۔ سلطان سوداگر چیخ کر بولا۔

"ہو حبیب جان! او ہتیارے! کیا اب اس بیچارے کی بھی جان لینا چاہتا ہے۔ یہ تو پہلے ہی مر چکا ہے۔"

سلطان سوداگر کی بات سُن کر سب لوگ اس کی طرف داری کرنے لگے اور لاتھر کو گالیاں دینے لگے۔ کچھ لڑکوں اور بچوں نے تو دروازوں اور کھڑکیوں پر پتھر پھینکنا شروع کئے۔ لاتھر نے کھڑکی بند کر دی سلطان سوداگر نے عفارا کو پکڑ کر واپس اپنی دکان کے پاس لے جانا چاہا لیکن عفارا ایک نہ مانا۔ سلطان سوداگر زبردستی کرنے لگا تو عفارا نے اُسے کاٹنے کی کوشش کی۔ آہستہ آہستہ سبھی لوگ چلے گئے لیکن سلطان سوداگر اور محمد وحلوائی رات بھر عفارا کے پاس ہی رہے۔ صبح کا تارا نکلا۔ عفارا مر گیا۔ اس کی نظریں اسی کھڑکی کی طرف دیکھ دیکھ کر جم گئی تھیں جہاں سے لاتھر نے گولی چلائی تھی۔

---

لاتھر مر گیا۔

سلطان سوداگر اور محمد وحلوائی کو یہ یقین ہے کہ اُسے عفارا کی آہ لے ڈوبی۔ میں نہیں جانتا کہ کسی انسان پر کئے کی آہ بھی پڑتی ہے لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ لاتھر کے مرنے کے بعد جب بھی کوئی اس کا نام لیتا ہے تو سب کو وہ دن یاد آتا ہے جب عفارا لاتھر کے برآمدے میں اس کا انتظار کرتے کرتے موت سے ہم کنار ہوا تھا۔

## غزل

مدت سے منتظر ہوں توجہ کچھ اب تو ہو
چشمِ کرم نہیں ہو تو چشمِ غضب تو ہو

بادہ نہیں تو خالی ہی ساغر اُچھال دے
کچھ اہتمامِ محفلِ جشنِ طرب تو ہو

تسکینِ قلب کا کوئی سامان چاہئے
جب "جانِ میکدہ" نہیں بنتِ عنب تو ہو

ہر رات ہی کی گود میں پلتی ہے صبحِ نو
جو طالبِ سحر ہے وہ مانوسِ شب تو ہو

عذرِ گناہ ہے واقعی بدتر گناہ سے
مجرم ہوں یہ بھی سچ ہے مگر کچھ سبب تو ہو

منزل کا پانا غیر یقینی نہیں مگر!
کچھ ذوقِ جستجو تو ہو حسنِ طلب تو ہو

واحد بیانِ ذات ضروری سہی مگر
احساسِ فن ہو، مقصدِ شعر و ادب تو ہو

واحد پریمی



# تہذیب و تمدن

سلطانہ آصف فیضی

ہر دور کا اپنا ایک فیشن اور طور طریقہ ہوتا ہے۔ نہ صرف لباس میں بلکہ معاشرت۔ طرز رہائش، خیال و گفتگو میں۔ ایک عربی کہاوت ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ سے زیادہ اپنے دور سے قریب ہوتا ہے چنانچہ ہمیں آئے دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ سیدھے سادے ماں باپ کا لڑکا زلفیں بڑھانے میں، تنگ لباس زیب تن کرنے میں اور سگریٹ پھونکنے میں اپنے زمانے اور دور سے زیادہ قریب ہے۔ نہ صرف ظاہری تتبع میں بلکہ اپنے خیال، نظریئے اور قدروں میں بھی اپنے دور کی پیداوار ہے۔

آج کل بہت سے لفظ عام طور پر سنائی دیتے ہیں مثلاً کمیونزم۔ سوشلزم۔ کلچر۔ ترقی۔ نفسیات اور ذہنی الجھاؤ جن کو ہم سمجھتے کم ہیں اور بولتے زیادہ ہیں۔ یہ الفاظ اخباروں میں پڑھتے ہیں۔ تقریروں میں سنتے ہیں۔ اور آپس میں بولتے ہیں۔ ان لفظوں کو سن سن کر ہماری الجھنیں بڑھتی جاتی ہیں مگر آج کے دور میں ان الفاظ کے معنی و مطالب سے واقفیت عین تمدن کی نشانی ہے۔

تہذیب کیا چیز ہے۔ جس کو انگریزی میں سوی لائی زیشن Civilisation کہتے ہیں جو ایک لاطینی لفظ Civis سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہوتے ہیں "ایک شہری"، تو گویا تہذیب وہ حالت ہے جو ایک شہری کے شایان شان ہو جو وحشت کے دور سے نکل کر ایک منظم زندگی گزارتا ہو اور جو اپنے اور دوسرے شہری کے حقوق و فرائض سے واقف ہو جس کے اطوار احسن اور طبیعت سلجھی ہوئی ہو۔ جو خلیق، شائستہ اور متواضع ہو۔ جو غیر متمدن حالت سے نکل کر انسانیت کے حدود میں آگیا ہو۔ غرض کہ تہذیب کے دو معنی ہیں ایک تو انسانی ذہن کا ارتقاء و سدھار اور دوسرا انسانوں کے ذہنی نفاست و شعور کی بالیدگی سے بنی ہوئی معاشرت ایسی ہی سوسائٹی متمدن کہلاتی ہے۔

تہذیب کے بعد آیئے کلچر کے معنی سمجھنے کی کوشش کریں۔ کلچر کا ماخذ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی ہیں زمین میں ہل چلانا اور بیج بونا جس کا مطلب ہوا انسان کی ذہنی تربیت۔ اس طرح کلچر گویا مصنوعی عمل ہے۔ جو انسانی ذہن کو بتدریج تربیت دے کر اس کو چمکا دیتا ہے، اس کو جلا دیتا ہے اس کو صحیح مذاق سے آشنا کر کے لطیف و نفیس خیالات سے اس کو مزین کرتا ہے۔ گویا ذہنی ارتقا کی تربیت کلچر ہے۔ بیکن لکھتا ہے کہ انسان کے روحانی وصف کا نام کلچر ہے۔

صحیح معنی میں تہذیب و کلچر وہ چیز ہے جو انسان میں اونچے اقدار پیدا کرے جہاں عقل کی حکمرانی ہو۔ ٹائلر اپنی کتاب Primitive Culture میں اس کی وضاحت کچھ اس طرح سے کرتا ہے کہ کلچر ایک پیچیدہ عمل کا مجموعہ ہے جس میں ایک سوسائٹی کے افراد کی علمیت۔ ایمان و اعتقاد ہنر، اخلاق، قانون، رسم و رواج اور عادت و اطوار سب داخل ہیں۔ اس

---

اس مضمون کا ماخذ A. A. A. Fyzee کی کتاب Islamic Culture Bombay, 1944 ہے۔

طرح سے کلچر کے معنی بہت وسیع اور خارجی ہیں۔ داخلی معنی میں کلچر وہ چیز ہے جہاں انسان اپنے خیالات کو صحیح تناسب میں جانچنے کا سلیقہ رکھتا ہو اور لطیف ذہنی لطافتوں سے محظوظ ہونے کا اہل ہو۔

کلچر کا عمل سے کیا واسطہ ہے؟ انسانی عمل کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو عملی اور دوسری ذہنی و فکری۔ کلچر کا ذہنی اور فکری طریق عمل سے واسطہ ہے۔ لہٰذا ہمارا طریقۂ عمل ہماری اقتدار پر منحصر ہے۔ کلچر اور عملی زندگی ایک دوسرے سے پیوستہ ہونے کے باوجود دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ اپنے دور و وقت کے مطابق علم حاصل کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ مختلف چیزوں کی قدر و قیمت کا اندازہ حاصل کرنا، زندگی کو صحیح زاویے سے جانچنا، خیالات کو متوازن اور بے لاگ طریقے سے پرکھنا کلچر سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ سب سے اہم اور ضروری امر ہے کہ کسی دوسرے کے نظریے اور فکری نصب العین سے آپ کو اختلاف ہو تب بھی اس کے خیال کی قدر کرنا چنانچہ مذہب، زبان، قومیت اور وطن یہ وہ ڈوریاں ہیں جن سے ایک ملک و قوم کی تہذیب و کلچر کا رنگین جامہ تیار ہوتا ہے ایک خاص وقت میں ملک کی جو ذہنی سطح قائم ہو جائے وہ کلچر ہے۔ اسی لئے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مختلف تواریخی دور میں اور مختلف ملکوں میں ہم تہذیب و کلچر کا معیار بھی جداگانہ پاتے ہیں کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کلچر کے کسی ایک پہلو پر ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر دورِ وسطیٰ میں صرف مذہب ہی کو کلچر کا دروازہ سمجھا جاتا تھا۔ فنِ تعمیر میں بہترین کلیساؤں کی تعمیر یا آرٹ میں مذہبی پہلو پر حد سے زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ آج یہ خیال بالکل بدل چکا ہے۔ اس لئے مذہب پر ضرورت سے زیادہ زور دینا یا سیاسی مطالبے کے لئے اس کی اہمیت کو بڑھانا سماج کو متعصب بنانا ہے جس کے نتیجے میں سماجی زندگی میں لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اس بات کی طرف خاص طور پر اشارہ کرنا مقصود ہے کیونکہ آج کل ہمارے ملک میں بھی کچھ لوگ مذہب کو غیر معمولی مواقع دے رہے ہیں اور اس کی بنیاد پر کلچر کی عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ غرض کہ تہذیب کا دائرہ عمل ہماری روزمرہ کی زندگی ہے اور کلچر کا تعلق ہمارے مصفا اور مجلیٰ باطن سے ہے۔ دنیا کی ہر زبردست تہذیب کسی قانون کے تابع رہی۔ چنانچہ دنیا کے کلچر کی عظیم الشان تہذیبیں پھلی پھولیں اور پھر مرجھا گئیں۔ دیکھا گیا ہے کہ ہر تاریخی دور میں تہذیب کا ایک مرکز ہوا کرتا تھا جہاں سے اس کی روشنی ہر طرف پھیل جاتی تھی۔ چنانچہ گزشتہ چار پانچ صدی میں تہذیب اپنے سابقہ مرکز یعنی بغداد، سمرقند اور دہلی سے ہٹ کر مغرب میں روم پیرس اور آکسفورڈ میں پہونچ گئی ہے۔

"اسلامی تہذیب" یا عربوں کی تہذیب صرف خالص مسلمانوں کی یا کسی ایک مذہبی فرقہ کی پیداوار نہ تھی بلکہ اس کی ترقی میں مسلمان، یہودی، عیسائی دہریئے سب کی سعی و کوشش شریک تھی۔ وہ سب کی انتھک محنت کا نتیجہ تھا۔ مسلمان فرمانرواؤں کے درباروں میں عیسائی طبیب و شاعر بھی پوری طرح نمایاں تھے۔ اگر مسلمان عالموں نے اپنے علم سے تہذیب کو چمکایا تو یہودی فلسفیوں کا حصہ بھی کم نہ تھا چنانچہ ایک ہی مذہب نے نہیں بلکہ بہت سے مذہبوں نے مل کے اسلامی تہذیب کی تعمیر میں شرکت کی اسی طرح نہ صرف ایک قوم بلکہ بہت سی قوموں کے افراد کا اس تعمیر میں حصہ تھا۔ عرب سریانی، ایرانی، ترک ہسپانی۔ مصری اور ہندوستانی۔ ہر ایک نے تہذیب کی شمع کی لو تیز کی۔ بہت باریکی سے دیکھا جائے تو شاید ایرانیوں اور ترکوں کا اس میں زیادہ حصہ ہے۔ اس لئے اسلامی تہذیب کی عظمت و ترقی کو صرف عربوں کے قومی اقتدار یا خالص مذہبی جذبے پر محمول نہ کرنا چاہئے۔ اس تہذیب میں ہندوستان کا بھی کم حصہ نہ تھا۔

عام طور پر جو عربی ہندسے رائج ہیں وہ ہندوستان سے لئے گئے ہیں۔ پھر وہ یورپ میں رائج ہوئے۔ علم الجبرا عربوں نے ہندوستان سے سیکھا مغل بادشاہوں کی عالیشان تعمیرات کی خوبصورتی اسلامی اور ہندوستانی فنِ تعمیر کا مشترک عمل ہے۔ ہند کے مسلم صوفیا نے کرام جن کی ہندو اور مسلمان یکساں تعظیم و تکریم کرتے تھے قدیم ہندو فلسفہ سے بھی متاثر ہوئے۔ اسلام کے چند زبردست فقیہ و محدث ہندوستان نے پیدا کئے۔

کسی ملک کے لوگوں کا دوسرے ملک کے لوگوں سے میل جول کلچر کا پہلا ضروری لازمہ سمجھا جاتا ہے۔ جب تک مسلمانوں کے پاس تجارت کے راستے کھلے رہے تو اُن کا ارتقا عیسائیوں سے زیادہ رہا۔ جب یہ راستے اُن کے ہاتھوں سے چھن گئے تو کلچر کی باگ ڈور بھی ان سے چھن گئی۔ کلچر کو بڑھانے میں صرف قومیت یا مذہب ہی کا ہاتھ نہ تھا بلکہ تجارتی میل جول اور قومی جوش بھی شامل تھے۔ اور بقول ایک مستشرق عالم بارٹولڈ اسلامی کلچر کی فوقیت زیادہ تر تجارتی شاہراہوں نے بڑھائی اور لوگوں کے آپس کے میل جول نے اس کے مواقع فراہم کئے۔

اس کی دو مثالیں پیش کرتی ہوں۔ ایک تو دسویں صدی کا بغداد لے لیجئے۔ بغداد کا دوسرا نام "دارالسلام" تھا۔ اس کو خلیفہ منصور نے دریائے دجلہ کے کنارے آباد کیا تھا۔ بغداد کے لفظی معنی ہیں "خدا کا عطیہ" جو عباسیوں

کا دارالسلطنت رہا ہے۔ اس شہر کی تاریخ کے ساتھ بہت سے رومان اور قصے کہانیاں وابستہ ہیں کیونکہ اُس کے نام کے ساتھ ہارون الرشید کا نام ذہن میں آجاتا ہے۔

کوفہ اور بصرہ کے بعد یہاں علم صرف و نحو کا نیا مدرسہ شروع ہوا اور پھر یہاں سے یونانی علوم اور سائنس کی ترقی کی ابتدا ہوئی۔

خلیفہ منصور اور خلیفہ مامون کی علم کی سرپرستی و سخاوت کے زیر سایہ یونانی علوم نے فروغ حاصل کیا۔ اس طرح سے عربی کلچر میں ایرانی، یہودی، عیسائی اور سابعین کی مدد سے یونانی فلسفہ شامل ہونے لگا۔

الجبرا کا علم یونانیوں کے پاس نہیں تھا۔ اس لئے وہ ہندوستان سے لیا گیا۔ کوفہ، بصرہ اور حرّان کے مدرسے بغداد کی تابانی کے سامنے ماند پڑنے لگے۔ یہیں دسویں صدی میں وہ زبردست فلسفیانہ کتاب تصنیف ہوئی جو ۵۰ قطعات پر مشتمل تھی۔ اور جس کا نام "رسائل اخوان الصفا" تھا۔ یہاں سے یہ کتاب پہلے پہل ہسپانیہ پہونچی پھر فارسی میں ترجمہ کی گئی۔ اس کتاب میں دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ نو فلاطونی فلسفہ کے عنصر بھی شامل تھے۔ اس کتاب کے مصنف کا نام ایک معمہ رہا۔

"لوگارتم" (جو علم حساب کا ایک قاعدہ ہے) ایک یوروپی لفظ سے نکلا ہے۔ جو خود "ال خوارزمی" نام کا بگاڑ ہے۔ ال خوارزمی وہ زبردست ترکی ماہر ہندسہ تھا جو خوارزم کا رہنے والا تھا۔ ایک دوسرے عالم ال بطلانی تھے جو حرّان کے رہنے والے تھے۔ اُنہوں نے علم مثلث کو پختگی تک پہنچا کر سائنس کی ایک الگ شاخ بنا دی۔

چار صدی آگے بڑھئے تو چودھویں صدی میں ابن خلدون جیسے مورخ کی عالمانہ تصنیف نظر آتی ہے اس کا مقدمہ عالمگیر شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اور تاریخ نویسی میں ایک ادبی کارنامہ مانا جاتا ہے اس کی علم تاریخ سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ وہ عربوں کی برتری کا سبب اُن کی ذہانت و ذکاوت کے علاوہ اُن کا مختلف قوموں سے میل جول اور تبادلۂ خیالات کو قرار دیتا ہے۔ مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی تعریف کرتے ہوئے وہ یہ بھی پیش گوئی کرتا جاتا ہے کہ اُس کو بھی ایک دن زوال آنے والا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ایک جگہ بتلاتا ہے کہ جس طرح دُنیا کی دوسری قومیں پیدا ہوئیں جواں ہوئیں اور پھر ان پر زوال آگیا۔ اسی طرح تاریخ و قدرت کے اس اٹل قانون سے یہ کلچر بھی بچ نہیں سکتا۔

اب آئیے اپنے گھر کو دیکھیں۔ سولہویں صدی میں بابر ہندوستان آیا۔ اس کے بعد پانچ مغل بادشاہوں نے یکے بعد دیگرے اس دیس میں حکومت کی مگر انہوں نے اس کو اپنا لیا۔ یہیں پیدا ہوئے یہیں رہے اور یہیں مر کر دفن ہو گئے اور آج وہ جو کچھ اپنے بعد چھوڑ گئے۔ فن عمارت۔ آرٹ اور پینٹنگ میں وہ ہندوستانی اور مسلم کلچر کا ایک حسین امتزاج ہے۔ اکبر کے دربار میں جو نورتن تھے اس میں ہندو مسلم دونوں تھے جنہوں نے ساتھ مل کر ہندوستانی کلچر کو مالا مال کیا۔ سنیا ایک یونانی تھا جو ماہر فن تعمیرات تھا۔ اس نے استنبول میں سلطان سلیم کی مشہور مسجد بنائی۔ (۷۴-۱۵۶۶ء) اس نے ایران کے فن تعمیر سے بہت سے اثرات لئے تھے۔ اکبر نے اس کے شاگرد یوسف کو ہندوستان بلایا۔ چنانچہ اس زمانے کی شاہی عمارتیں، ایرانی، ترکی اور ہندوستانی فن تعمیر کا ایک خوبصورت امتزاج ہیں۔ فن تعمیر میں اسی امتزاج کے ارتقا نے تاج محل کی صورت میں فن تعمیر کو انتہا تک پہونچا دیا۔

اسی طرح سے قلمی مصوری کا آرٹ ایران اور ہندوستان میں ترقی یافتہ تھا اور آغا میراک اور بہزاد کی بنائی ہوئی قلمی تصاویر کا مقابلہ فرانجلیکو اور دوسرے عہد وسطیٰ کے اُستادان فن سے کیا جا سکتا ہے چنانچہ ابوالفضل لکھتا ہے کہ جب فتح پور سیکری بن رہا تھا اس وقت شاہی فن کاروں میں میر سید علی مسکیں قلم کے ساتھ بساون۔ بیشونت۔ تارا۔ مہیش اور کیم کرن بھی فن کاروں میں شامل تھے۔

جس طرح تاریخ ایک عہد اور اُس زمانے کے لوگوں کے تجربات کی کہانی ہے اسی طرح تہذیب و کلچر بھی ایک عہد اور دور کی پیداوار ہے۔ اس لئے کلچر خواہ اسلامی ہو یا ہندوی اس کی تعمیر میں مذہب کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہئے۔ صحیح کلچر کی پرکھ اُس دور کے انسانوں کی خوبیوں اور نمایاں کارناموں کے ذریعے کی جانی چاہئے۔ اور اُن کی قومی مذہبی، ادبی اور تاریخی خوبیوں کا اندازہ لگا کر پرکھنا چاہئے۔ ذہانت و ذکاوت فکر و قدر عالمگیر چیزیں ہیں۔ اور انسانیت کے سماجی و اخلاقی مسائل اس قدر یکساں ہیں کہ ہم کو ہر وقت انسانیت کی عام بہبود و اصلاح کی طرف نظر رکھنی چاہئے۔




**دارالمصنفین** (شبلی اکیڈمی) اعظم گڑھ ایک خالص علمی و تحقیقی ادارہ ہے، اس کا اصل مقصد علوم و فنون خصوصاً اسلامی علوم، ہندوستان کی تاریخ، اردو زبان و ادب کی خدمت، اُن کے متعلق تحقیقات اور تالیف و تصنیف، مغربی زبانوں اور جدید علوم کی مفید کتابوں کا ترجمہ و اشاعت اور اعلیٰ مصنفین اور اہلِ قلم کی جماعت تیار کرنا ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کی خالص علمی جماعت کا قوم و ملک کے عام عملی کاروبار اور مشاغل نیز ہنگامہ آرا جد و جہد سے زیادہ واسطہ اور سروکار نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ہر طرح کے مالی طمع و فریب اور دُنیاوی عیش و عشرت سے بے نیاز اور بے پروا ہو کر قوم کی ذہنی نشو و نما، اس کی دماغی تربیت اور علم و فن کی مفید و مقدس خدمت کا فرض انجام دینے میں مشغول رہتی ہے۔

لیکن علامہ شبلی مرحوم اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ اُن کی شخصیت بڑی جامع، ہمہ گیر اور پُرکشش تھی اس لئے ملک و قوم کی کوئی انجمن، کوئی ادارہ، کوئی تحریک اور کوئی جماعت ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتی تھی۔ قدرت نے اُن کو بڑا حساس، ذہین، بیدار دماغ اور دردمند دل عطا کیا تھا اس لئے قوم و ملک کے اہم مسائل و معاملات کو نظر انداز کر دینا اُن کے لئے ناممکن تھا۔ ذاتی طور پر وہ قوم پرورانہ خیالات کے حامل اور ملک و وطن کی آزادی و اتحاد کے نہایت پرجوش حامی تھے۔ انہوں نے اپنے ملی، قومی و سیاسی مضامین اور نظموں میں قوم و ملک کی آزادی کی کوششوں کو سراہا ہے اور ہندو مسلم اختلافات کی خلیج دُور کرنے کی پُرزور کوشش کی ہے۔

قدرتی طور پر اُن کے یہ خیالات اُن کے تلامذہ اور دارالمصنفین کے کارکنوں میں بھی منتقل ہوئے، خصوصاً دارالمصنفین کے منیجر اور اس کے انتظامی امور کے ذمہ دار مولوی مسعود علی ندوی مرحوم کو تو پبلک کاموں اور سیاسی و قومی اشغال کا فطری ذوق تھا، خود علامہ شبلی مرحوم نے اپنے خطوط میں اُن کے ان اوصاف و کمالات کا ذکر و اعتراف کیا ہے، چنانچہ انہوں نے اپنے اُستاد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ملک و قوم کی اصلاح و ترقی کو اپنا نصب العین بنایا اور آزادی و اتحاد کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے دارالمصنفین کے جشنِ طلائی کے موقع پر خطبۂ صدارت دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

"ملکی سیاست کے میدان سے دارالمصنفین کو بحیثیت ایک علمی و ادبی ادارے کے کوئی تعلق نہیں رہا لیکن شخصی حیثیت سے اس کے مراد و مرشد مولانا شبلی نعمانی سچے اور پکے قوم پرست مسلمان تھے اور اُس کے کار ساز و کارپرداز مولوی مسعود علی صاحب ندوی بھی اُن کے ہی نقشِ قدم پر چلتے رہے اور دونوں نے اتحاد و آزادی کا ساتھ دیا اور تفرقہ اور غلامی کے رجحانات کی شدید مخالفت کی، اس لئے دارالمصنفین کے گوشہ نشین کارکنوں

میں قومی آزادی اور قومی یک جہتی کے جذبات رُوح رواں کی طرح سما گئے اور اُن کی تائید اور ہمدردی، اتحاد اور آزادی کے سب علمبرداروں خصوصاً قوم پرور مسلمانوں کے لئے قوت اور فیضان کے سرچشمے کا کام دیتی رہی۔"

علامہ شبلی مرحوم کے علمی جانشین اور دارالمصنفین کے پہلے ناظم مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا ذوق اگرچہ خالص علمی تھا تاہم علامہ مرحوم کی طرح اُن کی شخصیت بھی نہایت جامع تھی اور انہوں نے دارالمصنفین کو نہ صرف ملک گیر بلکہ عالمگیر شہرت بخشی۔ اُن کے گوناگوں کمالات نے اُن کی ذات کو بھی ہر شخص، ہر ادارہ اور ہر جماعت کا مرکز توجہ بنا دیا تھا۔ اِس لئے عملی سیاسیات کی خارزار سے دامن کش رہنا اُن کے لئے بھی ناممکن تھا، انہوں نے اپنے اُستاد کے سیاسی مسلک کو اختیار کرکے اتحاد و آزادی کی تحریک کا ساتھ دیا۔ اس زمانے میں قوم و ملک کی اصلاح و ترقی کی جو تحریکیں اور آزادیٔ وطن کی جد و جہد کرنے والی جو تنظیمیں بھی قائم ہوئیں اُن سب کو سید صاحب کی جانب اور سید صاحب کو ان کی جانب متوجہ ہونا پڑا، یہ الگ بات ہے کہ قومی اشغال اور سیاسی تحریکوں سے وابستہ رہنے کے باوجود بھی وہ اُس کی آلودگیوں اور آلائشوں سے بالکل محفوظ رہے اور انہوں نے علمی شان و وقار کو ہمیشہ قائم و برقرار رکھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں۔

> "سید صاحب نے شروع سیاست میں حصہ لیا اور جنگ بلقان سے لے کر تقسیم ہندوستان تک ہر طرح کی سیاسی اور قومی تحریکوں کی نیچ اُونچ میں شریک رہے، کم خوش نصیب ایسے ہوں گے جنہوں نے سید صاحب کی طرح سیاست میں مسلسل حصہ لیا ہو اور سیاست کی آلائشوں سے پاک رہے ہوں۔ سیاست کے وسیلے سے کسی منصب پر پہنچنے کے کبھی درپے نہ ہوئے، انہوں نے اپنے لئے جو بلند سطح پہلے دن اختیار کر لی تھی اسی پر آخر دم تک قائم رہے۔" (معارف سلیمان نمبر ص۱۲۴)

سید صاحب کی باقاعدہ قومی اور سیاسی زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب ۱۹۱۲ء کے آخر میں ٹرکی نے جنگ عظیم میں شرکت کا فیصلہ کیا، اس کے اس فیصلہ کا اعلان کرنا ہی تھا کہ مسلمانان ہند میں بھی جوش اور ہیجان پیدا ہو گیا اور اُن کے کئی سیاسی لیڈر قید و بند میں ڈال دیئے گئے۔ اس موقع پر جو نیا گروہ اُن کی قائم مقامی کے لئے آگے بڑھا۔ اس میں مولانا سید سلیمان ندوی بھی تھے ۱۹۱۶ء میں علمائے بنگالہ کے کلکتہ کے سالانہ اجلاس کی جس میں تمام رہنمایانِ ہند شریک تھے، انہوں نے صدارت کی اور نہایت موثر خطبہ پڑھا، یہ پہلا خطبہ تھا جس میں جنگ کے ہیبتناک اثرات کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کا نام جو اس زمانہ میں نظر بند تھے، نہایت جرات اور بیباکی کے ساتھ لیا گیا تھا، اس خطبہ سے لوگوں کے دلوں سے انگریزوں کا رعب اٹھنے اور کم ہونے لگا۔

۱۹۱۹ء کا سال ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بڑا پُرآشوب تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اسلامی ممالک خصوصاً ٹرکی پر نہایت سخت وقت آیا، اس کے حصے بخرے کر دیئے گئے، ٹرکی کا سلطان قسطنطنیہ میں اتحادیوں کے ہاتھوں بے بس ہو رہا تھا، ایسے نازک اور پُرآشوب وقت میں ہندوستان کے چند بہادر، غیور اور دردمند مسلمان رہنماؤں نے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر مجلس خلافت کے نام سے ایک مرکزی مجلس بمبئی میں قائم کی۔ جس کی شاخیں آناً فاناً پورے ملک میں قائم ہو گئیں اور جس نے آگے چل کر ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد میں عظیم الشان قربانیاں اور حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے، اس مجلس کی روح رواں تو علی برادران (مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی مرحومین) تھے لیکن مولانا سید سلیمان ندوی ناظم دارالمصنفین اور مولانا مسعود علی ندوی منیجر دارالمصنفین بھی اس میں بہت پیش پیش رہے اور جب ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی اور مجلس خلافت اور کانگرس کے پلیٹ فارم مشترک ہو گئے تو ان دونوں حضرات نے بھی ملک کا طوفانی دورہ کیا، سید صاحب نے قومی و ملی جلسوں میں ولولہ انگیز تقریریں کیں اور اخبارات و رسائل میں نہایت پرجوش انقلابی مضامین لکھے۔

جب مجلس خلافت کا پہلا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا تو اس میں سید صاحب کی موثر اور پُرسوز تقریر نے علماء اور اربابِ سیاست کے درمیان حلقۂ اتصال کا کام کیا اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور چودھری خلیق الزماں کے اختلافات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر ختم کر دیا۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی مرحوم کی سرکردگی میں جو وفد خلافت یورپ کے لئے روانہ ہوا تھا اس کے تین ممبروں میں ایک سید صاحب بھی تھے۔ یہ وفد نیشنلزم اور پین اسلام ازم کو متحد کرکے ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے چلا تھا۔

مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی کی کوششوں سے اعظم گڑھ میں کانگرس کمیٹی قائم ہوئی جس کے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۲ء تک

اوّل الذکر صدر اور موخر الذکر سکریٹری ہے۔ مولوی مسعود صاحب کی سرکردگی میں جب مئو (ضلع اعظم گڑھ) میں ایک لاکھ کے بدیسی سوت کا بائیکاٹ کیا گیا تو گاندھی جی نے اراکین دارالمصنفین کو مبارکباد دی اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اعظم گڑھ کو کھادی کا سنٹر قرار دیا۔ ۱۹۲۱ء میں احمد آباد کی کانگریس نیشنل میں سید صاحب کو اس کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا گیا۔ اور جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس عاملہ کے بھی وہ رکن مقرر کئے گئے۔ مولوی مسعود علی صاحب بھی ان دونوں قوم و وطن پرور جماعتوں کی ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے۔

پہلی ڈکٹیٹرشپ کے موقع پر گاندھی جی نے اپنی گرفتاری کے وقت مولانا سید سلیمان ندوی ناظم دارالمصنفین کو اس رائے کے ساتھ ڈکٹیٹر نامزد کیا تھا کہ "ندوی بڑے جاتر ہیں، ان کو بھی سات آدمیوں میں لے لیا جائے"۔ ۱۹۳۲ء میں آخری نمک ستیہ گرہ کے موقع پر ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اپنی گرفتاری کے وقت مولانا مسعود علی ندوی منیجر دارالمصنفین کو ڈکٹیٹر نامزد کیا تھا۔

جب گورنمنٹ ایڈکی واپسی کی تجویز منظور کی گئی تو دارالمصنفین کے ناظم اور منیجر نے انتہائی مخالفتوں کے باوجود دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کی جس کے اہم عہدوں پر اس زمانے میں یہ دونوں حضرات نہ صرف فائز تھے بلکہ حقیقی اور اصلی کرتا دھرتا تھے۔ پانچسو ۵۰۰ ماہوار کی امداد واپس کر دی۔

دارالمصنفین کے کارکنوں ہی کے اہتمام میں پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک ہزار والنٹیروں کے ساتھ قانون شکنی کی جس کی صوبہ کانگریس کے سیکریٹری کی حیثیت سے وہ خود اور ضلع کانگریس کے سکریٹری کی حیثیت سے مولوی مسعود علی صاحب قیادت کر رہے تھے۔

جب گیا میں سوراج پارٹی کا قیام عمل میں آیا تو اس پر پہلا سلم دستخط مولانا مسعود علی ندوی منیجر دارالمصنفین کا تھا۔ اس کے بعد اعظم گڑھ کو پورے صوبہ میں نمایاں حیثیت حاصل ہو گئی اور پنڈت موتی لال نہرو نے شبلی اکیڈمی کو سوراج پارٹی کا مرکز قرار دیا۔

منیجر دارالمصنفین کے اہتمام اور نگرانی میں احمد آباد کے بعد پہلا پنڈال شدھ کھدر کا اعظم گڑھ میں بنایا گیا جس میں پندرہ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور جس کو تمام اکابر و زعماء نے حیرت اور دلچسپی سے دیکھا۔

دارالمصنفین کے ایک اہم رکن رکین اور مولانا شبلی مرحوم کے ممتاز اور نامور شاگرد رشید مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم بھی تھے۔ ان کو اگرچہ سیاسی، ہنگامی اور عملی کاموں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہتی تھی تاہم نظری حیثیت سے ہم ان کا سیاسی مسلک بھی اپنے استاد کے مسلک کے موافق رہا۔ انہوں نے فرقہ پرور جماعتوں کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور ان کی نگاہ توجہ کا مرکز بھی وہی علم بغاوت تھا جو سرفروشان آزادی نے برطانوی جبر و استبداد کے خلاف بلند کر رکھا تھا۔

دارالمصنفین کے دوسرے تمام رفقاء و مصنفین بھی ہمیشہ ذہنی اور نظری اعتبار سے اپنے برادر مرشد علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے نقطہ نظر سے ہم آہنگ رہے، اور سب قومی تحریکوں اور آزادی و حریت کی راہ میں جد و جہد کرنے والی جماعتوں سے یک گونہ وابستہ رہے۔ خصوصاً مولانا ابو المحاسن ندوی مرحوم، مولانا ابو الجلال ندوی، سید نجیب اشرف ندوی مرحوم، مولانا ریاست علی ندوی، مولوی محمد ادریس ندوی، اور جناب یحییٰ اعظمی وغیرہ قوم پروری اور اتحاد و آزادی کی تحریک میں عملاً بھی نہایت سرگرم تھے۔ مولانا ابو المحاسن کا اگرچہ عین عالم شباب میں انتقال ہو گیا تھا تاہم تحریک خلافت اور ترک موالات کی تائید میں انہوں نے بعض مضامین اور رسالے لکھے تھے۔ مولانا ابو الجلال ندوی کو قوم پروری میں بڑا غلو تھا۔ سید نجیب اشرف ندوی مرحوم جب بی اے کے دوسرے سال میں تھے تو خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں زوروں پر چل رہی تھیں۔ وہ قومی اور ملی جذبے سے اسقدر سرشار ہوئے کہ اپنی تعلیم چھوڑ کر ان تحریکوں میں شریک ہو گئے۔ اسی زمانہ میں وہ دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے جو اس وقت ایک اہم علمی ادارہ ہونے کے ساتھ ساتھ قومی سرگرمیوں کا بھی مرکز بنا ہوا تھا۔ یہاں آکر مرحوم نے خلافت تحریک میں پورا حصہ لیا اور اپنی تنظیمی صلاحیت کا ثبوت بھی دیا۔ کم سنی کے باوجود انہوں نے خلافت اور کانگریس کے کارکنوں کی بڑی اچھی رہنمائی کی۔ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی ان کی والدہ بی اماں، گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو جب جب اس ضلع کے دورے پر آتے تو مرحوم ان کے ساتھ ہوتے، بی اماں تو ان کو اپنے بیٹے کی طرح چاہنے لگی تھیں۔ وہ جلسوں میں تقریریں بھی کرتے۔ بعض موقعوں پر ان کی تقریریں اتنی باغیانہ اور آتش بار ہوتیں تو مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کہتے کہ یہ ایک روز ہم سب کو پھانسی کے تختہ پر پہونچا دیں گے۔ انہوں نے سوراج سے متعلق گاندھی جی کے بعض انگریزی اور گجراتی رسالوں کے ترجمے بھی کئے تھے۔

مولانا سید ریاست علی ندوی، مولانا سید سلیمان ندوی کے شاگرد رشید دارالمصنفین کے مشہور مصنف اور قوم پرور مسلمان ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ قومی و

سیاسی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا۔ اعظم گڑھ میں ضلع کانگرس کمیٹی اور جمعیۃ علمائے ہند دونوں کے برسہا برس تک صدر اور سکریٹری رہے، ہندوستان کے دوسرے وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور الگورائے شاستری وغیرہ اُن کے خاص اور بے تکلف دوستوں میں تھے۔

جناب یحییٰ اعظمی دبستان شبلی و سہیل کے مشہور پختہ مشق شاعر اور عرصہ دراز سے دارالمصنفین سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے اپنے اُستاد مولانا اقبال احمد خاں سہیل مرحوم اور دارالمصنفین کے مصنفین و رفقاء کی طرح ہمیشہ اتحاد و آزادی کی تحریک کا ساتھ دیا نوائے حیات اور نوائے عصر کے نام سے اُن کے کلام کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں، ان سے ان کی قوم پروری اور حب الوطنی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی ولولہ انگیز اور پرجوش قومی، ملی اور سیاسی نظموں کو مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے اکابر رہنماؤں نے بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

دارالمصنفین کی علمی، تحقیقی اور تاریخی کتابوں میں بھی ہندو مسلم ایکتا اور ملک کی آزادی و اتحاد کے جذبہ کو ابھارنے اور فروغ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ علامہ شبلی کے مجموعہ مقالات و رسائل میں اس نوع کے متعدد مضامین شامل ہیں اور مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی مشہور و معرکۃ الآرا کتاب "عرب و ہند کے تعلقات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ان کا وہ عہد زریں یاد دلایا ہے جب دونوں گوناگوں تعلقات میں جکڑے ہوئے تھے، یہ کتاب دراصل ان لکچروں پر مشتمل ہے جو سید صاحب نے ۱۹۲۹ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی دعوت پر دئے تھے۔ اس کا ایک لکچر سنکر پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا تھا: "مولانا آپ نے تو متعدد سنسکرت کتابوں کو اردو میں منتقل کر دیا ہے۔"

دارالمصنفین کی اس اہم خصوصیت کا ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے اس کے جشن طلائی کے خطبہ صدارت میں ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:-

"اس مکتب فکر کے مصنفوں نے جہاں کہیں اسلامی تہذیب کے تعلقات قدیم یونانی ایرانی اور ہندی تہذیب سے دکھائے ہیں وہاں فصل کے بجائے وصل کے پہلو کو ابھارا ہے اور قصۂ سکندر و دارا سنانے پر "حکایت مہر و وفا" بیان کرنے کو ترجیح دی ہے۔ ہندوستان میں تاریخ نگاری کے اس تاریک دور میں جب ہمارے اکثر مورخ اپنے مجازی استاد ازل کے کہے ہوئے کو طوطی صفت دہرا دیا کرتے تھے اور قرون وسطیٰ کے ہندوستان کو ایک بحر طوفان خیز بنا کر پیش کرتے تھے، جس میں اسلامی تہذیب اور ہندو تہذیب کے دھارے ایک دوسرے سے الجھتے اور ٹکراتے رہتے تھے، دارالمصنفین کے مورخوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ ان دونوں کا ملنا تصادم نہیں بلکہ امتزاج، سنگھرش نہیں بلکہ سنگم تھا۔"

دارالمصنفین کی قوم پروری اور وطن دوستی کی وجہ سے قومی و سیاسی رہنماؤں اور آزادی و حریت کے علمبرداروں نے اس کے کارکنوں سے ہمیشہ مخلصانہ روابط و تعلقات رکھے، تحریک خلافت اور نان کوآپریشن کے زمانہ کے تقریباً تمام مشاہیر رہنما اس کے مہمان ہو چکے ہیں اور اب بھی وہ ایسا مرکز ہے جہاں ہندو اور مسلمان لیڈر آنے میں بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں۔

گاندھی جی اپنے دورے کے سلسلے میں جب اعظم گڑھ تشریف لائے تو گو انہوں نے دارالمصنفین میں قیام نہیں کیا تاہم کارکنان دارالمصنفین سے ملنے کے لئے وہ یہاں خود آئے، جس وقت گاندھی جی یہاں آئے اس وقت لوگ مغرب کی نماز ادا کر رہے تھے، چونکہ اس زمانہ میں دارالمصنفین کی مسجد تعمیر نہیں ہوئی تھی اس لئے نماز ایک کھلی جگہ میں ہو رہی تھی۔ گاندھی جی یہ دیکھ کر وہیں کنارے گھاس پر نہایت خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئے اور اپنے ساتھیوں کو بھی اشارے سے مودب اور خاموش رہنے کی تاکید کی۔ بعد میں لالٹین کی روشنی میں اُن کو کتبخانہ دکھایا گیا، دارالمصنفین کے ایک رفیق نے اُن کے سامنے دستخط کے لئے اپنی یادداشت کی کتاب پیش کی تو انہوں نے اردو میں دستخط کیا۔

پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو کا تو دارالمصنفین بے تکلف گھر ہی تھا، یہ لوگ جب یوپی کے مشرقی اضلاع کا دورہ کرتے تو اعظم گڑھ ضرور آتے اور ہمیشہ دارالمصنفین ہی میں قیام کرتے، مولوی مسعود علی صاحب بھی دورے میں ان لوگوں کے ہمراہ ہو جاتے تھے کبھی کبھی پروگرام کی زیادتی کی وجہ سے ان لوگوں کو اعظم گڑھ پہونچنے میں دیر ہوتی اور کھانے کا وقت ہو جاتا تو مولوی مسعود علی صاحب شبلی منزل سے کھانا منگوا کر راستے میں ہی وقت پر کھلا دیا کرتے تھے، ایک دفعہ جواہر لال اور مولانا محمد علی کی اندارہ میں ٹرین چھوٹ گئی تو اعظم گڑھ کے مشہور قومی کارکن امجد علی غزنوی سابق ام۔ال۔اے کے والد اسد علی خان صاحب نے جو سرکاری ملازم اور ریلوے میں اوورسیر تھے، ان قومی رہنماؤں کو اپنے ٹھیلے پر بٹھا کر اندارے سے پھپھنا پہونچا دیا، اس کی وجہ سے اُن لوگوں کے پروگرام میں زیادہ تاخیر نہیں ہوئی، البتہ اسد علی خاں صاحب اس جرم میں معتوب قرار پا کر سرکاری ملازمت سے برخاست کر دئے گئے، مولوی مسعود علی منیجر دارالمصنفین بھی اس سفر

میں ان قومی رہنماؤں کے ساتھ ساتھ تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اس ادارہ سے نفس واپسیں تک اپنا تعلق برقرار رکھا اور اپنے عزیز دوست مولانا مسعود علی ندوی کو ہمیشہ یاد رکھا اور برابر ان کو خطوط بھی لکھتے رہتے تھے۔ پنڈت جی دارالمصنفین کے لائف ممبر بھی تھے۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد دارالمصنفین کی مالی حالت خراب ہوگئی تو پنڈت جی کے ایما اور مولوی مسعود علی صاحب کی کوششوں سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اپنی وزارت تعلیم سے ساٹھ ہزار کی کمیشت رقم اس کو عطا کی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو شروع ہی سے اس ادارہ سے بڑی دلچسپی رہی ہے اس کے اغراض و مقاصد کا خاکہ تیار کرنے میں ان کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ جناب رفیع احمد قدوائی کو بھی اس ادارے سے بڑا تعلق خاطر تھا اور وہ بھی اس کے محسنوں اور لائف ممبروں میں تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم، اس کی مجلس انتظامیہ کے باقاعدہ ممبر تھے۔ انہوں نے اس کے جشن طلائی کی صدارت منظور فرما کر خاص طور پر اس سے اپنے گہرے تعلق اور غیر معمولی اخلاص کا ثبوت دیا۔

اس موقع پر مسز سوچیتا کرپلانی نے جو اس وقت اتر پردیش کی وزیر اعلیٰ تھیں، دارالمصنفین کی قدر دانی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی حکومت کی طرف سے اس کو دس ہزار روپے کی رقم عطا کی۔ اس وقت بھی دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے صدر مشہور قومی رہنما ڈاکٹر سید محمود ہیں۔ مرکزی وزیر جناب فخر الدین علی احمد صاحب اس کی مجلس انتظامیہ کے ممبر ہیں اور اتر پردیش کے موجودہ گورنر ڈاکٹر گوپال ریڈی اس کے لائف ممبر ہیں۔

دارالمصنفین کے گوشہ نشین کارکن پہلے کی طرح اب بھی ملک کی سالمیت اور قومی اتحاد و یکجہتی کا مفید کام نہایت خاموشی سے انجام دے رہے ہیں اور اس کے موجودہ ذمہ دار شاہ معین الدین احمد ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے محبان وطن اور قوم پرور رہنماؤں سے مخلصانہ روابط و مراسم قائم ہیں اور وہ اسلامی علوم و فنون کی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ اتحاد اور یکجہتی کے ضروری اور اہم کام سے بھی غافل نہیں ہیں۔ شاہ صاحب ہر مہینے معارف کے شذرات میں قومی و سیاسی مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے قوم و ملک کو اصلی ترقی، حقیقی آزادی اور ملک کی سالمیت و اتحاد کی جانب برابر متوجہ کرتے رہتے ہیں اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے متعلق تاریخی کتابوں کا جو سلسلہ شروع کیا ہے۔ اُن سے بھی یکجہتی، اور ہندو مسلم میل ملاپ

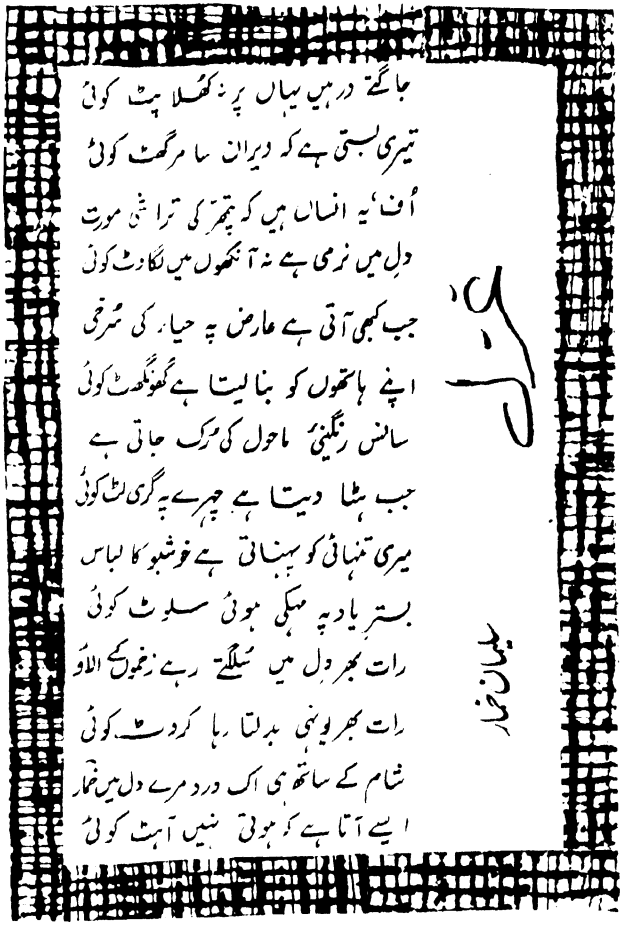


کے کاز کو فروغ دینے میں بڑی مدد مل رہی ہے۔ سوانحی اور سرگذشتی حکومتوں نے اُن کی بعض کتابوں پر انعامات بھی دیئے ہیں۔

دارالمصنفین کے قومی و ملکی خدمات اور اتحاد و آزادی کے بارے میں اس کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں۔ اس کے بانی پہلے ناظم و منیجر نے قوم و وطن کی آزادی اور اتحاد کی جدوجہد میں اس وقت حصہ لیا تھا جب موجودہ سیاستدان اور لیڈر پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ تحریک آزادی کے جو قدیم رہنما باقی رہ گئے ہیں وہ اس کی گزشتہ شاندار خدمات سے پوری طرح باخبر ہیں لیکن نئی نسل کے لوگوں کو اس کی ان گزشتہ خدمات اور کارناموں سے کوئی خاص واقفیت نہیں رہ گئی ہے۔

اس لئے "داستان کہن" دہرانے کی ضرورت پیش آئی ؎

اس واسطے چھیڑا ہے پروانوں کا افسانہ
شاید ترے کانوں تک پیغام عمل جائے



# ہمارا مقصد...
## زیادہ اناج...
## بڑھیا اناج

یہ اطمینان دلانے کے لئے کہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں عمدہ اناج مقررہ قیمتوں پر پا سکیں، ہم کسانوں سے اسے خریدتے ہیں، اسے حفاظت سے سٹور کرتے ہیں اور کنزیومران کو سپلائی کرتے ہیں۔ سال بہ سال فوڈ کارپوریشن بڑی مقدار میں مختلف اناج جیسے گیہوں، چاول، بلٹ، مکا، دالیں خرید کر رہی ہے تاکہ ان کی قیمتوں میں اضافہ نہ ہو اور دیش کے لئے اناج کا ذخیرہ جمع رہے۔

**دی فوڈ کارپوریشن آف انڈیا**

۱۔ بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دلی۔۱

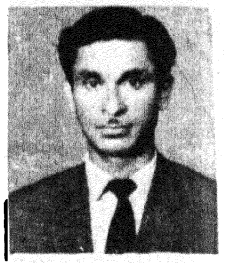

# دکنی لوک گیت

ابوالفیض سحر

عوامی ادب اپنی خاص اصطلاح میں وہ ادب ہے جس کے خالق بہ حیثیت مجموعی خود عوام ہی ہوتے ہیں۔ یعنی جس کا کوئی جانا پہچانا خالق نہ ہو بلکہ جو نسل در نسل، سینہ بہ سینہ تخلیق پاتا منتقل ہوتا چلا آیا ہو اور جو ابھی تک ضبط تحریر میں نہ آیا ہو۔ ہندوستان کے اور علاقوں اور دیگر زبانوں کی طرح دکن اور دکنی کا دامن بھی عوامی ادب کے ہیرے موتیوں سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن ماہرین لسانیات اور محققین علم و ادب کی نگاہ جوہر شناس نے اس طرف ہنوز کوئی خاص اور باضابطہ توجہ نہیں کی ہے۔

بلا کسی خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی تہذیب و تمدن اور علم و ادب کے شعوری ارتقاء سے پہلے انسانی احساسات و جذبات کا وسیلہ اظہار نثر سے زیادہ نظم ہی کے پیرائے میں رہا ہے۔ ایسے اولین دور میں ظاہر ہے کہ ہم علم و فن کے اداروں اور مدارس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس لئے ایسے دور میں تخلیق پایا ہوا علم و ادب انفرادی سے زیادہ اجتماعی نوعیت کا حامل ہوگا۔ جو مختلف ادوار، مختلف علاقوں اور مختلف نسلوں میں تعمیم ہوتا رہا ہوگا۔ اس تعمیم کے ساتھ ساتھ اس میں کمی و بیشی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ دکنی، عوامی ادب اور لوک گیتوں کی تاریخ بھی ایک ایسے ہی دور کی یادگار ہے جس کے آغاز اور ابتدائی مرحلوں کو پوری طرح پردۂ خفا سے باہر لانا مشکل ہے۔ لیکن یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ دکنی بالکلیہ ایک عوامی زبان تھی اور ہے اور اس کا عوامی ادب بالخصوص لوک گیت کسی اور زبان کے سرمایہ کی بہ نسبت کچھ کم مالا مال نہیں ہیں۔ آج بھی دکن کے طول و عرض میں ان کو بالکل صحیح و سالم رنگ و روپ میں نہ سہی مگر کچھ مسخ شدہ حالت یا کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ دیکھا سنا جا سکتا ہے۔ ان میں گھرانوں، فرقوں اور علاقوں کی تبدیلی اور مرور مدت کے ساتھ ساتھ بدلے ہوئے مزاج اور لب و لہجہ کا فرق بھی نمایاں ہوتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ خیال درست ہے کہ گیت مزاجاً نسوانیت کی غنائی اظہار کی ایک صورت ہے اور گیت عورت کے جسم کا اظہار نہیں بلکہ اس کی پکار ہے۔ لیکن اگر گیت کی تعریف یہی قرار دی جائے تو میرے خیال میں گیت کی صنف سخن کے ساتھ پورا پورا انصاف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس میں نہ صرف مردانہ احساسات و جذبات کا گرم گرم تموج ہی ملتا ہے۔ بلکہ ساز دینے کے تال و سُر پر رقص کرتی، عورتوں کی جماعتوں، ٹولیوں اور مردوں کی ٹکڑیوں اور دلوں کے شوخ و سنجیدہ تصورات و خیالات سماجی و مذہبی مسائل و معاملات، تصوف و تشکر، عبادت و ریاضت کی لو اور لگن کے علاوہ انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے والی شوخیوں و شرارتوں اور کھیل کود کی رنگ برنگی دلچسپیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ گیت بہ اعتبار موضوعات و مضامین اور بہ لحاظ اسالیب و آہنگ غزل کی طرح بلکہ غزل سے بھی بہت زیادہ وسیع، متنوع و مختلف ہوتے ہیں۔ یہ لوک گیت وقتی اور عوامی ہونے کی وجہ سے بڑی حد تک زبان و بیان اظہار و ابلاغ کے قواعد و شرائط سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

بے محل نہ ہوگا اگر میں دکنی لوک گیتوں کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کرتا چلوں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ گیت کا دامن بڑا وسیع اور کشادہ اور اس کا آنچل بڑا رنگا رنگ ہوتا ہے۔ یوں تو دکنی لوک گیتوں میں دکنی زبان کی عامیانہ اور دیہی خصوصیات بھی ملتی ہیں۔ مگر ان میں فنکارانہ ذہانت، عالمانہ مہارت کی کمی کے باعث کہیں قواعد و زبان کی غلطیاں پائی جاتی ہیں تو کہیں بے وزن و بے بحر مصرعوں کی تک بندی بھی ملتی ہے۔ جو برسہا برس کے تصرف اور عمومیت کے عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ان گیتوں کو خواہ وقتی جذبات و احساسات کی قلمرو میں بہنے والے چشموں سے تعبیر کریں جو اپنی روانی کے آپ مالک ہوتے ہیں یا طبیعت کی آزاد روی اور مزاج کی بے ساختگی کے پرچموں سے تشبیہ دیں جو اپنی آن بان سے لہراتے ہیں۔ مگر فکر و خیال کے ان مرقعوں میں عوامی زندگی کی چھاپ بڑی گہری ہوتی ہے۔ ویسے تو دکنی لوک گیتوں کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے ہر ایک

قسم ایک علیحدہ مضمون کا مطالبہ کرتی ہے مگر ہم یہاں صرف چند ہی نمونے پیش کریں گے۔

## ڈھولک کے گیت

دکنی لوک گیتوں میں جو گیت آج بھی بخوبی و بآسانی دستیاب ہوتے ہیں اُن میں ڈھولک کے گیت نہ صرف بڑے دلچسپ اور پُرلطف ہوتے ہیں بلکہ یہ ہماری عوامی زندگی کے رسم و رواج کا ایک لازمی جزو بن چکے ہیں۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ ہماری تہذیب میں ڈھولک کب ایجاد ہوا اور پہلا ڈھولک کا گیت کب اور کہاں گایا گیا ہوسکتا ہے کہ یہ حضرت امیر خسرو کے بعد جب کہ ہمارے معاشرے میں موسیقی اور شاعری کے تال میل کا احیا عمل آیا تھا کسی وقت کہیں رواج پا گیا ہو۔ جس کی روایت آج بھی شمال اور دکن میں بلا لحاظ مذہب و ملت تقریباً ہر گھرانے میں چلی آرہی ہے۔ دکھ درد کی حالتوں میں اظہارِ غم کرنا اور نشاط و انبساط کے موقعوں پر اظہارِ مسرت کرنا فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔ خوشیوں کی ہر تقریب مثلاً شادی بیاہ، بسم اللہ خوانی عقیقہ، گل پوشی، عید و تہوار وغیرہ میں اعلیٰ طبقات اور ادنیٰ طبقات میں یکساں طور پر ڈھولک کے گیتوں کا رواج ہے۔ طبقہ امرا و نوابین میں یہ خوشگوار فریضہ مراثنیوں کے حصہ میں آتا تھا جو آج کے بدلے ہوئے حالات میں مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ خوشیوں کے موقعوں پر آج بھی گھر گھر ڈھولک بج اُٹھتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اِن گیتوں کا سلسلہ کم عمر بچیوں سے شروع ہو کر شادی شدہ و عمر رسیدہ شدہ، بوڑھی اور بیوہ خواتین کے بھی ذوق و شوق اور اُن کی گہری دلچسپیوں کے باعث رات رات بھر چلتا رہتا ہے۔

خواہ وہ دولہا ہو کہ دلہن یا کوئی اور پھول پہننے والا اس کی گل پوشی کی رسم کی ادائیگی، تہذیبی روایت کے مطابق صندل لگا کر شروع کی جاتی ہے اور ساتھ ہی شریکِ محفل تقریباً تمام خواتین ڈھولک پر یہ گیت چھیڑتی ہیں ؎

صندل لگاؤ او مرے ہریالے بنے او مرے شہزادے بنے
تیرے صندل کو لاگے ہیرے جولاگے رے
موتی لاگے رے بنے او مرے ہریالے بنے او مرے شہزادے بنے

پھر اُس کے فوری بعد پھول پہناتے وقت گایا جانے والا جو مشہور گیت ہے اُس کے بول یوں ہیں۔

ویلان میں پہنائے ہار۔ کیا خوشنا لگا کے
مالی نے لایا دونا مالن نے لائی ہار
آماں نے پہنائے ہار۔ کیا خوشنا لگا کے

کبھی کبھی یہ گیت بھی گایا جاتا ہے ؎

پھولوا پہنانے آئی آج رے۔
میں تو پھولوا پہنانے آئی
پھولوا پہنانے آئی منجھا بٹھانے آئی آج رے
میں تو پھولوا پہنانے آئی

اور جب گل پوشی کی رسم انجام پا جاتی ہے تو پہلے پھول پہنانے والی خاتون پھر شریکِ محفل تمام خواتین کچھ سکے دولہے دولہن یا پھول پہننے والے پر سے وارتی ہیں اور بلائیں لیتی ہیں۔ اس موقعہ پر سب کو یہ گیت خود بخود یاد آجاتا ہے ؎

بنے پہ سے کیا کیا واروں گے ماں
دولے پہ سے کیا کیا واروں گے ماں
ہیرے بھی واری موتی بھی واری
بنے پہ سے منگا واروں گے ماں

شادی بیاہ کے ایسے سینکڑوں گیت مروج ہیں جن کا پیرایہ، خوبصورت غنایت پُر کیف ہوتی ہے اور پھر ڈھولک کی تھاپوں کا زیر و بم جوان دلوں کی آرزوؤں و امنگوں کی سُریلی رس بھری آوازیں ایک مسحور کن ماحول پیدا کر دیتی ہیں جیسے دلہن کو مانجھے بٹھاتے وقت کا یہ گیت ؎

بھیجے اوپر بھیجا دولن بی کا منجھا
بنا بول کو بھیجا سجاؤ ذرا اچھا
ہاتھاں پاداں لالو، ہتھیلیوں میں تارے
بنا پوچھا بی بی کو، کون سہیلیاں سنوارے
مارس کے بال بڑے، شوکی شال پہ گرے
ہلو کھولو شوبالے، موگرا ڈال کو پالے

اسی قسم کے دو گیت اور ملاحظہ ہوں ؎

تجھے نیند لگی گے ہریالی بنو۔ شہزادی بنو
تجھے منجھا بٹھانے تری اماں کھڑیں گے ہریالی بنو۔ شہزادی

تجھے حمام کرانے تری بہناں کھڑیں گے ہریالی بنو۔ شہزادی بنو
تجھے کپڑے پہنانے تری خالائیاں کھڑیں گے ہریالی بنو۔ شہزادی بنو
تجھے سہرا بندھانے ترے باوا کھڑیں گے ہریالی بنو۔ شہزادی بنو
تجھے گود اٹھانے ترے ماموں کھڑیں گے ہریالی بنو۔ شہزادی بنو
تجھے نیند لگی گے ہریالی بنو۔ شہزادی بنو

دلہن کھڑی جی کمرے میں
ہنسی جی من من میں
پیا کے گھر جانا ہے
گلا ترا نکلس ساجے
چھڑا پیا کے وداع کردوں
پھولوں سے گلا بھردوں
پیا کے گھر جانا ہے

کاناں تیرے جھمکے ساجے
آ ئرن پنا کے وداع کردوں
پھولوں سے گلا بھردوں
پیا کے گھر جانا ہے
ہاتھاں تیرے پہونچی ساجے
جوڑا پہنا کے وداع کردوں
پھولوں سے گلا بھردوں
پیا کے گھر جانا ہے

ان کے علاوہ ڈھولک کے گیتوں میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ خاص کر سمدھنوں کا ایک دوسرے پہ حملہ کرنا مصرعوں مصرعوں میں فقرے کسنا اور طعنے دینا۔ سالیوں اور بہنوئیوں کے مذاق و دل لگی کی باتیں اور بہت ساری دلچسپ باتیں، مختلف تشبیہات و استعاروں کے سہارے بیان کی جاتی ہیں جیسے ڈھولک کی شوخ و شنگ تھاپوں اور ہمجولیوں کے قہقہوں میں خوشی و مسرت کے غیر مغلوب جذبات میں دولہے والے دلہن کی ماں کا مذاق دیکھئے کس طرح اڑاتے ہیں ؎

جھٹکے سے توڑے انار سمدن سالو اوڑے
سمدن کے آنکھاں دیکھو امی کے چنچے دیکھو
کیا خاصہ کاجل لگائے سمدن سالو اوڑے
سمدن کے ہاتھاں دیکھو ادرک کے پنجے دیکھو
کیا خاصہ چھلے جمائے سمدن سالو اوڑے
سمدن کے بالاں دیکھو توئی سو جھاڑو دیکھو
کیا خاصہ گجرا لگائے سمدن سالو اوڑے

جواب میں دلہن کی ماں بھی طیش میں آکر ساری مصروفیات کو بھول بھال کے کمر کس لیتی ہے اور حلق صاف کر کے اپنی ٹولی کے ساتھ ڈھولک کے محفل کی رونق اور دلچسپی کو اور بڑھا دیتی ہے۔ ؎

اگے ماں آگئے بنے کے لوگ
لوگ آتے بولکے فرش کرائی
زمین پہ بیٹھنے کے لوگ
لوگ آتے بولکے بریانی پکائی
ولیے کے کھانے کے لوگ
لوگ آتے بولکے لیمن منگائی
سندی کے پینے کے لوگ
اگے ماں آگئے بنے کے لوگ

## چکی ناموں

چکی ناموں کا شمار بھی دکنی لوک گیتوں کی قدیم اصناف سخن میں ہوتا ہے جنکی ایک واضح روایت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور ان کے بعد اُن کے معتقدین و متابعین کے ہاں بھی مختلف رسالوں اور تصانیف میں ملتی ہے۔ بیسویں صدی کے ایسے سائینسی ترقیات کے زمانے میں آج بھی ہندوستان کے پس ماندہ، کم ترقی یافتہ دیہی رقبہ جات میں رات گئے یا صبح سویرے سکوت اور سناٹے کے عالم میں آبادیوں کے مختلف گوشوں سے چکی پیسنے کی مخصوص و مستقل آوازوں کے ساتھ جفاکش عورتوں کے میٹھے میٹھے بول بھی سُنائی دیتے ہیں۔ ان چکی ناموں میں اکثر و بیشتر عرفان و تصوف، محنت و ریاضت کی زندگی کی عکاسی پائی جاتی ہے۔ گو کہ ان میں تصوف کا رنگ غالب رہتا ہے مگر پھر بھی ان میں ہمیں گھریلو زندگی اور دیہی معاشرت کے روزمرہ کے تجربات بھی مل جاتے ہیں۔ مثلاً

؎ اندھیری رات تاروں میں
بھائی رہنے میں چاند چاندنی میں
اجلی اجلی یہ کون پیر کی درگاہ
سن کے درود بیٹھی خواجہ کا گلرگہ
اندھیری رات تاروں میں
نیونا زنگیوں کی نیوڑگے ماں ڈالی

نکو توڑ و بھائی بھین ہے بچے والی
اللہ کی درگاہ میں فرشتوں کی بھیڑ
اس میں مرے پیر صاحب دستگیر۔
اندھیری رات تاروں میں
دھکالے کی دھوپ نہیں دیتی گے سایہ
بن چھتری کے آیا بھائی کا منہ کملایا
اندھیری رات تاروں میں
سورج منہ پھیرا گو رو گھر کو آیا
میرا جی گھبرایا لال گھر کیوں نہیں آیا
اندھیری رات تاروں میں
بھائی مرا جیو۔ بھاوج میری ناندو
چندن کے ناؤں کو لال گنوائے باندو
اندھیری رات تاروں میں
گھنگرو کی کاٹھیوں کا بیل آیا باڑے میں
دوڑ کے بلا لیوں گی بھائی آیا بولا نے
اندھیری رات تاروں میں
زمین کو اساں کو نیں لگی گے سیڑھی
پیر کی ہمت بڑی دامن پکڑ کر کھڑی
اندھیری رات تاروں میں

چکی نامے ڈھولک کے گیتوں کی بہ نسبت زیادہ طویل نظمیں ہوتی ہیں۔ اس لئے چکی نامے ڈھولک کے گیتوں کی بہ نسبت زیادہ طویل نظمیں ہوتی ہیں اس لئے ایک ہی چکی نامے میں مختلف مضامین باندھے جاتے ہیں۔ جن کو موقع محل کے اعتبار سے گانے والیاں اپنی اپنی پسند سے برتتی رہتی ہیں مثلاً ذیل کے چکی نامے کو دیکھئے۔ اپنے روایتی صوفیانہ انداز سے شروع ہو کر معاشرتی زندگی کی کن کن روایات کو سمیٹتے ہوئے اور کہاں ختم ہوتا ہے ؎

اللہ صاحب کی رات جاگی گے ماں
میرے من کی مراداں میں پائی
خواجہ خضر کے جہاز چھوڑائی گے ماں
تختِ رواں پہ ناچ کرائی
حضرت بی بی کی سینک کھلائی گے ماں
تارا منڈل کے گوے لگائی

پھر شادی بیاہ ہی کے معاملات ؎

بیٹی منگنے گئی تو ذات پوچھیں میری
بچھاؤ چندن چوکھی کھولوں گی سات پیڑی
اللہ صاحب کی رات
شب گشت نکلیا بنا ماں شب گشت میں شہنیاں
بازو سے بھونیاں ماں اڑیں گے رو مالاں

بھائی، بھاوج، دیور، دیورانی اور نند کے تذکرے

بھائی کے گھر کو گئے تو بھاوج اڑی تیڑی
رکھ لے ساڑی چولی بھائی سے بل کو چلی
دیورانیاں جٹھانیاں بل چلے پانی کو
رستے دلیو جائے کو دلیور کی رانی کو
نند کا گے ناطہ مجھے نیں گے بھاتا
سالو کی بھریوں میں سروالے کا کانٹا

اور دامادوں سے شکایت

دامادوں کا کھانا دودھ پہ کی ملائی
گاؤں سارا ڈھونڈئی ایکساں کالی گائی
داماد آتا گھر کو مرغا مرغی کاٹ
اس کے منہ میں ماٹھی ایک نہ چھوڑا بوٹی

جاگیردارانہ نظام زندگی کے ہمارے معاشرے کی بعض تہذیبی جھلکیاں

چوڑی والے داتا چوڑیاں پہناؤ مجھے
کچہری میں راجا انعام دیں گے تجھے
درباری راجے کو دربار میں ہٹیں گے
الماس کے طرے کو جوہری پرکھیں گے
کوٹنا پینا گے ماں نیں ہوتا مرے سے
لال کو تلکھ کو بھیجی باندیوں لاؤ جاگیرے

اور پھر آخر میں اُن کا وہی ابتدائی مذہبی رنگ

اللہ کی بندگی نئیں ہوتی میرے سے
کیا کرتے کیا جانو میں ڈرتیو تیرے سے
اللہ صاحب کی رات

اس طرح مختلف رنگوں اور مختلف مزاجوں کے اور بھی بیسیوں چکی نامے ہیں جو اب تک ہمارے اس ترقی یافتہ دور میں اسلاف عہد رفتہ کی یادگار بن کے رہ گئے ہیں۔ بجز بہت ہی چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں کے اب ہماری شہری زندگی میں گھروں میں چکیوں کے پیسنے کا رواج ہی باقی نہیں۔ رہا اس لئے چکی ناموں کی تعلیق پر اب ایک روک لگ گئی ہے۔

## لوریاں

ڈھولک کے گیتوں اور چکی ناموں کے بعد دکنی لوک گیتوں کی ایک قابلِ ذکر صنفِ سخن، لوریوں پر مشتمل ہے۔ اُن کا بنیادی موضوع محدود ہونے کی وجہ سے اُن میں دیگر لوک گیتوں کا سا تنوع اور تعدد نہیں پایا جاتا اور اس وجہ سے اُن کی بازیافت بھی نسبتاً کم ہی رہی ہے اُن کے اظہار و بیان کا موضوع بچپن اور نیند ہی ہوتا ہے۔ یہ ممتا کے گہرے سمندر اور میٹھے سروں کی دھیمی لہروں پہ ڈولنے والے سپنوں کے سفینوں کے لئے مخصوص ہیں۔ فی الحال دکن میں مروجہ لوریوں کے چند ٹکڑوں کو بطور نمونہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

او او ہائی ماں او او ہائی گے
نیند کو آئیا تانا نیند کے کرتا بھانے
یہ نیند گھونے تانے بادامی نیندوں میں
جھو ہائی ماں

مرے گھر میں نانا گھر دیستا نورانا
اللہ کی درگاہ میں بھیجوں گی شکرانا
نانی کا نواسہ ناریل بن میں پیاسا
نانی بھیجے خاصہ دودھ بھرا بتاشہ
میرے گھر کے پیچھے میرا تن کا گلہ
وہ دن دکھاؤ اللہ تانے کی بسم اللہ: جھو ہائی ماں

ماں کے علاوہ کوئی اور رشتہ دار خاتون جیسے پھوپی وغیرہ بچی کو پالنے میں جھولاتے ہوئے جب کبھی لوری گاتی ہے تو اس میں یوں اضافہ کرتی جاتی ہے

بھائی تیری بیٹی شال اوڑھ کے سوتی
پھوپی بل بل جاتی بھتیجی بہو ہوتی
بھائی تیری بیٹی دے میرے بیٹے کو
کچھ نئیں مانگتی تھوڑا جہیز میں ہاتھی گھوڑا
جھو ہائی ماں

ان لوریوں میں ہمارے بیشتر فن پاروں کی طرح سماج میں طبقاتی رکھ رکھاؤ، رہن سہن اور اونچ نیچ کی دلچسپ کشمکش بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ جیسے یہ لوری کیا ہمارے جاگیردارانہ ماحول کی آئینہ دار نہیں ہے؟

او میرے رانی کے جائیے سو جا للو ہائے
میرے لالہ کو بھوک جو لاگے کیا رے کروں پکوان
چھوٹی بڑی چڑیاں پکڑا منگوائی نونگوں کا دوں کی بگھار
او میرے رانی کے جائیے . .

رانی کا جایا راجا کنور یا باندی کا جایا غلام
گھوڑی کا جایا الل بچھیڑا کھیلے کا چوگان
اور میرے رانی کے جائیے . . .

ان لوریوں کے علاوہ جن میں ماں کی محبت آرزوؤں و ارمانوں کی چٹکی چاندنی اور اس کے خوابوں کی رنگین بہاریں نظر آتی ہیں لیکن ایسی لوریاں بھی ملتی ہیں جو لوری کے بنیادی موضوع سے ہٹ کر کہی گئی ہوں ایسی لوریوں میں بعض اوقات دلچسپ مکالماتی انداز بھی پایا جاتا ہے جیسے ؎

خاتون: پاؤں کے پیزب رکھ لے رے بھوئی۔ ندیا اتا روپار۔ اے بھوئی گنگا اتا روپار

بھوئی: پاؤں کے پیزب نئیں ہونا بی بی چلنا ہمارے ساتھ۔ اجی بی بی چلنا ہمارے ساتھ۔ دن کو کھلاؤں گا بھونی کھچڑی رات کو اڑھوں گا شال۔ اجی بی بی رات کو اڑھوں گا شال۔

خاتون: جل جائے تیرا شال دوشالہ۔ اس میں مچھیوں کے باس۔ اے بھوئی اس میں جھنکوں کی باس۔
پاؤں کے پیزب رکھ لے رے بھوئی . . . .

## الاؤ کے گیت

بہمنی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی دکن میں ہند ایرانی مذہب و

وثقافت اور زبان و تہذیب کا رنگ گہرا ہونے لگا تھا۔ ان علاقوں کے حاکم ایران و ترکستان سے آئی ہوئی نسلوں سے تعلق رکھتے تھے ان کے حلقۂ احباب اور حکومتی نظم و نسق میں ایرانی اور ترکی نسل کے افراد کو نمایاں مقام حاصل رہتا تھا۔ اور خاص کر فارسی علم و ادب کے سلسلے میں بھی ایرانی علماء کی بڑی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ چونکہ شاہی خاندان کا تعلق ہمیشہ اہلِ تشیع حضرات ہی سے رہا اس لئے محرم کی تقاریب کو ان علاقوں میں خاص اہمیت دی جاتی رہی۔ تقریباً سارے ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے بڑے خلوص و پیار اور عقیدت کے جذبات سے ایک دوسرے کے نظریات و عقائد کا احترام کرتے ہوئے محرم جیسے تہواروں کا بھی مشترکہ دلچسپیوں کے ساتھ اہتمام کرنا شروع کیا۔ اس طرح محرم میں آج بھی تقریباً سارے دکن میں ہندو مسلم دونوں دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے کی تحقیق میں ہمیں الاؤ کے گیت (جس کو دکنی میں الاے کے گیت کہتے ہیں۔) دکنی اور دکنی سے زیادہ کنڑی، مرہٹی، تلگو وغیرہ زبانوں میں ملتے ہیں۔ خاص طور پر کرناٹک کے علاقوں میں خصوصی اہتمام سے الاؤ کھیلنے اور اس کے گیت گانے میں بڑے جوش و خروش سے مظاہرہ کیا جاتا ہے جو ایک خالص کرناٹک اثر معلوم ہوتا ہے۔ عاشورہ خانوں میں اور ان کے آس پاس علموں اور تعزیوں کے جلوس و سواریوں کے وقت پُرہجوم میلے لگتے ہیں اور ان میلوں میں رنگ برنگ کے شملوں، سفید کرتے اور دھوتیوں کو بلا لحاظ مذہب و ملت تقریباً سب ہی من چلے لوگ اور زندہ دل انسان زیب تن کرتے ہیں جو باہمی خلوص و پیار یگانگت و اتحاد کی نشانیاں ہوتی ہیں۔ ان دنوں جگہ جگہ عورتوں اور مردوں کی علیحدہ علیحدہ ٹکڑیاں، عاشورہ خانوں کے صحنوں میں الاؤں کے ارد گرد یا افتادہ میدانوں میں الاوہ کھیلتی اور الاے کے گیت گاتی نظر آتی ہیں۔ جن کی زبان مخلوط اور مقامی آب و رنگ، لب و لہجہ الفاظ اور محاورے کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ دکنی لوک گیتوں کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

مثلاً کرناٹک میں ؎

سیاں اللہ بندالا۔ عشق الانا

یا پھر تلنگانہ میں ؎

اماں بی بی فاطمہ لالہ

مہاراشٹر میں نوجوانوں کی محلہ واری ٹولیاں اپنے اپنے مخصوص ملبوسات میں سج دھج آتی ہیں اور الاوہ کھیلنے اور اس کے گیت گانے کے فن میں اپنی مہارت اور خوبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف خود ہی خوشی و مسرت حاصل کرتی ہیں۔ بلکہ دوسروں کو بھی مسرور و محظوظ ہونے کا سامان کرتی ہیں۔

الاؤ کے گیت واقعاتِ کربلا کے علاوہ دیگر مقامی، مذہبی، سیاسی و سماجی حادثات و حکایات پر بھی مشتمل ہوتے ہیں۔ ان میں طنز و مزاح و ظرافت کی دلچسپ آمیزش بھی ہوتی ہے جو دیکھنے اور سننے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ چھٹے نظام حیدرآباد میر محبوب علی خاں کے دورِ حکومت میں ایک بار دریائے موسیٰ میں جو شہر حیدرآباد کے بیچ سے بہتا ہے ایک بھیانک طغیانی آئی تھی جس سے پائیہ تخت کو زبردست دھکا پہونچا تھا۔ اس واقعہ کو بھی الاؤ کے گیتوں میں بیان کیا جاتا ہے

الاؤ کے گیتوں کا تذکرہ "کلفی وطرے" کے بغیر تشنہ ہے۔ دراصل یہ مخصوص قسم کے الاؤ کے گیتوں کی ایک مقامی اصطلاح ہے۔ مختلف تکڑیاں ان کو سوال و جواب کے انداز میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے جذبے کے تحت پیش کرتی ہیں۔ بزرگانِ دین کے معجزات و کرامات کے تذکروں کے علاوہ بعض اوقات ان میں ذہانت و فراست کی آزمائش کی پہیلیاں اور چٹکلوں کے قسم کی چیزیں بھی بیان کی جاتی ہیں جن کا جواب دینا مقابل کی دوسری تکڑی پر لازم ہوجاتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ بعض صورتوں میں کئی دنوں تک جاری رہتا ہے۔ یہاں اس قسم کی کوئی مثال رقم کرنا مشکل ہے

اس طرح دکنی لوک گیتوں کی اور بہت سی قسمیں ہیں جیسے بھجن براکھانا، جھولے اور کھیل کود کے گیت وغیرہ لیکن ملک کی معاشی و معاشرتی علمی و ادبی ترقیات کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیب و تمدن کے دھاروں کی رفتار و روش میں بھی زبردست تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ عوامی اور دیہی زندگی کے ہر شعبہ حیات میں انقلابی تغیرات ظہور پذیر ہو رہے ہیں، اشاعتِ علم، صحافت کی ترقی، ریکارڈس، لاؤڈ اسپیکرز، ٹیپ ریکارڈ، ریڈیو، ٹیلی ویژن کی ایجادات اور ہماری تہذیبی و معاشرتی زندگی کے مختلف رسوم و رواجوں اور تفریحات پر بھی فلمی گیتوں کی بے پایاں اثر اندازی سے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے عوامی گیتوں وغیرہ کی طرح دکنی لوک گیت بھی شدید طور پر متاثر ہو رہے ہیں۔ تعجب نہیں کہ مزید پچاس ساٹھ برسوں بعد ان کی سرچشمے بھی پوری طرح خشک ہوجائیں۔

جنوری ۱۹۷۱ء

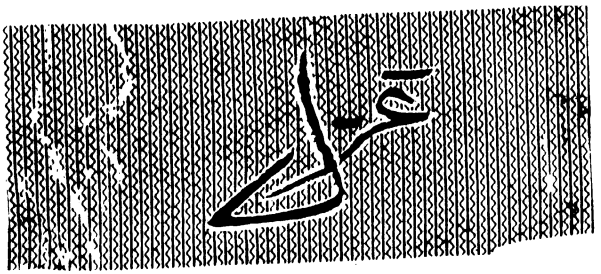


## یوسف جمال

سوز افروز خلش زاروں میں ڈھونڈو مجھ کو
لالہ و گل میں نہیں خاروں میں ڈھونڈو مجھ کو

میں گلستاں کی فضاؤں میں ملوں گا نہ کبھی
کوہساروں پہ کبھی غاروں میں ڈھونڈو مجھ کو

سوز میں ڈوبے ہوئے نغموں کا خالق ہوں میں
ساز کے ٹوٹے ہوئے تاروں میں ڈھونڈو مجھ کو

اونچے محلوں میں ملے گا نہ کبھی میرا وجود
چھوٹے کاشانوں کی دیواروں میں ڈھونڈو مجھ کو

مجھ کو ساحل کی ہواؤں میں نہ پاؤ گے کبھی
آؤ دریاؤں کی منجدھاروں میں ڈھونڈو مجھ کو

حال کے لمحوں کی تصویر دھندلکی ہے بہت
دورِ ماضی کے فسوں کاروں میں ڈھونڈو مجھ کو

کون ہوں میں مرے اشعار بتا دیں گے جمال
سرقِ طاس جگر پاروں میں ڈھونڈو مجھ کو

## دلی کا پرانا قلعہ

رام پرکاش راہی

زمانے ڈھل گئے حالات کی تحریر باقی ہے
پرانے حسن کی ٹوٹی ہوئی تصویر باقی ہے
نہ وہ شمشیر باقی ہے نہ وہ توقیر باقی ہے
مگر تاریخ میں لپٹی ہوئی تعمیر باقی ہے
فضائے ہست کے راہی مقامِ بود پر پہنچے
نقوشِ رہگزر میں پر تو رہگیر باقی ہے
جو شہرت عام تھی پہلے گئی صدیوں کے مدفن میں
مگر آثار میں سمٹی ہوئی تشہیر باقی ہے
بقا کے خواب سارے ڈھل گئے خوابِ مسلسل میں
یہ ان خوابوں کی پتھرائی ہوئی تعبیر باقی ہے
عیارِ عام صرفِ کم نگاہی ہے تو رہنے دو
دلِ شاعر کی آنکھوں میں ابھی تنویر باقی ہے
طلائی نقرئی تحریر کے سانچے میں ڈھلنے کو
رگِ تخیل پر اک نشترِ تاثیر باقی ہے
یہ بنیادوں کی گہرائی یہ دیواروں کی بے باکی
جہاں تمہید قائم ہے وہاں تعمیر باقی ہے
یہ بے ترتیب پتھر جھاڑیاں کھنڈے یہ ہریالی
کہیں تخریب قائم ہے کہیں تعمیر باقی ہے
سرشکِ یادِ ناممکن سہی دنیا کی آنکھوں میں
زبانِ حال پر اک عالمِ تقریر باقی ہے
یہ خلوتِ زار رومانوں سے وابستہ رہے راہی
مگر اب تو فقط اک خوابِ بے تعبیر باقی ہے




## "سرو چراغاں" (شعری مجموعہ)

مصنف ـــــ مقصود عرفاں

ناشر :- قصرِ ادب پبلیکیشنز ، پری گھاٹ بھوپال

قیمت : تین روپے صفحات ۱۴۳

مقصود عرفان کے شعری مجموعہ "سرو چراغاں" سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ترقی پسند نقطۂ نظر کے ایک خوش گو اور کہنہ مشق شاعر ہیں یہ شعری مجموعہ گیارہ نظموں، چھتیس غزلوں اور کچھ قطعات پر مشتمل ہے اور اس میں دو تعارفی مضامین بھی شاملِ ہیں۔ مصنف کی شخصیت پر قمر جمالی کا ایک مختصر مضمون اور شاعری پر اختر سعید کا مضمون۔ اختر سعید کے الفاظ میں "بحیثیت مجموعی ان کے ہاں اجتماعی مقصد کی لگن نظر آتی ہے جس کا رشتہ انسان دوستی سے ملتا ہے۔"

زبان کی روانی اور براہ راست اظہار مقصود عرفان کی شعری تخلیقات کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کی نظموں میں پرجوش خیالات، خوبصورت الفاظ اور کامیاب ترکیبوں کی کمی نہیں لیکن ان میں مرکزی تجربہ اور موضوعات کے اعتبار سے بڑی حد تک یکسانیت اور سطحیت ہے۔ فورم یا ہیئت کے اعتبار سے بھی یہ نظمیں کم و بیش ڈھیلی ڈھالی اور سپاٹ ہیں۔ ان نظموں کے موضوعات، اندازِ بیان اور نقطۂ نظر میں ترقی پسند تحریک کے اکثر سر برآوردہ شاعروں کی جھلک نظر آتی ہے۔ "آج کی رات" میں مجاز کا اثر نمایاں ہے" دو نظمیں "فیض کی نظم "دو عشق" کی یاد تازہ کرتی ہے۔ "کونسا گیت سنو گی" اختر سعید کے الفاظ میں جاں نثار اختر کی "کونسا گیت سنو گی انجم" کے اجمال کی تفصیل ہے اور ہمارے منصوبے اور نشیب و فراز انداز فکر، آہنگ اور ڈکشن کے اعتبار سے سردار جعفری کی نظموں سے قریب ہیں اختر سعید، مقصود عرفان اور ان کے پیش رو ترقی پسند شعراء کے فکر اور اسلوب کی مشترک خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دراصل ان کی یکسانیت کا سبب حالات کی یکسانیت تھی۔ اگر جلتی ہوئی ریت سب مسافروں کے تلوے جھلسا رہی ہو تو آبلوں کا ذکر بھی عام ہوگا۔" لیکن یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ خطرہ اس شاعری میں زیادہ پیدا ہوتا جس کے محرک خارجی تاثرات ہوں اور جس کی بنیاد متعین خیالات یا مروجہ نظریات پر ہو، مقصود عرفان کی شاعری بھی بڑی حد تک اسی قسم کی شاعری ہے۔ اس میں تلاش ذات، تلاش معنی، نفسیاتی کش مکش اور تشکک کے عناصر کی کمی کا احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے، اسی لئے دور حاضر کی نمائندہ شاعری میں اسے جگہ نہیں دی جا سکتی۔ تاہم یہ کہنا سراسر غلط ہوگا کہ مقصود عرفان کی شاعری تمام تر صدائے بازگشت ہے۔ اس شعری مجموعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ ایک پُرخلوص اور کامیاب شاعر ہیں اور ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ان صلاحیتوں کا اظہار ان کی غزلوں میں زیادہ بھرپور ہوا ہے۔ ان غزلوں میں داخلیت اور انفرادیت کی کمی نہیں۔ ان کا مستقل موضوع حسن و عشق کی کیفیات ہیں اور تفکر اور خارجی ماحول کے شعور کی آمیزش نے اس کو ایک خاص توازن اور شگفتگی عطا کی ہے۔ ان کی غزلوں کے اشعار بڑے ترتیب ہوئے ہیں۔ الفاظ کا ترنم، ترکیبوں کا حسن، لہجہ کی شیرینی ایک پُراثر سادگی اور سوز و گداز ان کے اچھے اشعار کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

آخر میں، اُردو شاعری کے ان "پرستاروں" سے، جو تہذیبی روایات سے رابطہ تو قائم رکھنا چاہتے ہیں لیکن شاعری میں کسی نئے تجربے کی تاب نئے احساس کی چوٹ برداشت نہیں کر سکتے۔ گزارش ہے کہ وہ جدید ترقی پسند شاعروں کے کلام سے شعریت کے آخری قطرے نچوڑنے کے ساتھ ساتھ مقصود عرفان جیسے شاعروں کی طرف بھی توجہ فرمائیں۔

(زاہدہ زیدی)

# ور لکھنوی شخصیت اور شاعری

مولف : راج نراین راز
ناشر : نصرت پبلشرز وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنو ۳۰
قیمت : ۷ روپے ۵۰ پیسے

---

حال میں جناب منور لکھنوی کی یاد منائی گئی اور اس موقع پر موصوف کی
ت و شاعری اور علمی و لسانی خدمات کا تجزیہ اور احاطہ کرنے والے مقالات
ل اس کتاب کا اجرا کیا گیا۔ اس تالیف کے مولف راج نراین راز نے تگ
ور کد و کاوش کے بعد ایک معیاری اور وقیع کتاب کو خاصے اچھے ڈھنگ
ور طباعت سے آراستہ کر کے پیش کیا یہ نہ صرف اُن کی ایک علمی و ادبی
ہے بلکہ اُردو ادب میں منور لکھنوی کے حقیقی مقام و مرتبہ کے تعین کرنے
گار بھی ثابت ہوگی۔ منور لکھنوی کی شخصیت، شاعری اور دیگر علمی و ادبی
کے تعلق سے ہر اہم موضوع پر راج نراین راز نے واقعی ان حضرات
لات اکٹھا کئے ہیں جو اپنے اپنے میدان کا خاصہ تجربہ گہرا شعور و
بھی رکھتے ہیں۔ اس طرح مختلف زمروں اور عنوانوں کے تحت ۱۹
ت کو یکجا کر کے منور لکھنوی کی حیات اور ان کے کارناموں کے مطالعہ
بنایا گیا ہے۔ شخصیت کے عنوان کے تحت جو مقالات پیش کئے گئے ہیں
منور لکھنوی کے داستانِ حیات بھی ایک ہے جس کو خود منور صاحب
نہایت پر اثر انداز میں سپردِ قلم کیا ہے۔ گوپی ناتھ امن صاحب نے
مضمون، منور۔ جیسا میں نے انہیں دیکھا میں جو باتیں کہی ہیں اور
راز سے کہی ہیں بڑی دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ سید آفاق حسین آفاق
ن بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ شاعری کے زمرے میں شمیم حنفی،
تر اور راج نراین راز کے مقالات جامع ہیں۔ نظم کے سلسلے میں لکھے
لات و مضامین میں شہاب جعفری اور عطاء اللہ پالوی کے مقالے
منور کی قومی نظمیں اور منور۔ کائناتِ دل کی روشنی میں قابلِ ذکر ہیں۔ تراجم
میں نسیم عرفاں (شارب ردولوی) گیت گووند (علی جواد زیدی)
بھو (جگن ناتھ آزاد) شکنتلا (محمود ہاشمی) سے اس کتاب کی علمی و
یت اور افادیت اور بڑھ گئی ہے۔

وہ مگر خوبصورت گرد پوش، مضامین کا حسن ترتیب، مولف کے
ق و ذوق کی دلیل ہیں۔ کتابت و طباعت بھی مناسب اور گوارا ہے۔

(ابوالفیض سحر)

# گرمیٔ اندیشہ :- صغیر احمد صوفی

گرمیٔ اندیشہ جناب صغیر احمد صوفی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ صوفی صاحب نے اُردو شاعری کے دو ہے دیکھے ہیں۔ یہ صوفی صاحب کی سلامت روی ہے کہ انہوں نے نہ تو ترقی پسندی کی بلند آہنگی سے بے جا اثر لیا اور نہ موضوعات میں ویسی رومانویت برتی اور اب جب کہ نئی شاعری کی جدتوں اور بدعتوں کا دور دورہ ہے، انہوں نے اپنی شاعری کو چلتا سکہ نہیں بنایا۔ اسے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ صوفی صاحب نے اپنے فن کو اپنی ذات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ فیشن سمجھ کر اختیار نہیں کیا۔ ان کے یہاں پایا جانے والا سلامت روی کا یہ جذبہ، اعتدال اور توازن ہی وہ بنیادی عناصر ہیں جنہوں نے صوفی صاحب کے شعری کردار کی صورت گری میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ صوفی صاحب کی غزلوں اور نظموں میں سانس لینے والا شخص اس اعتبار سے صحت مند اور لائقِ رشک ہے کہ وہ حالات و عوامل میں ایک منطقی ربط پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ نہ مایوس لمحوں میں منہ بسورتا ہے۔ اور نہ مسرور لمحوں میں جامے سے باہر ہوتا ہے۔ وہ نہ محض جذبہ ہے اور نہ محض ذہن، بلکہ ان دونوں کا ایسا امتزاج ہے جو نہ صرف صحت مند انسانوں کی پہچان ہے بلکہ جو شعر کی تخلیق کے لئے بھی ازبس ضروری ہے۔

گرمیٔ اندیشہ میں غزلیات کے ساتھ ساتھ نظمیات بھی شامل ہیں۔ اُن کی نظمیں پابند ہیں۔ ان کی غزلوں نظموں کی زبان اور اسلوب کے خدوخال بڑے مانوس ہیں۔ انہوں نے ہیئتی تجربے نہیں کئے۔ اسالیب و تراکیب میں آزادی یا یوں کہیئے کہ بے راہ روی سے کام نہیں لیا۔ شاید اس لئے کہ انہوں نے ان مانوس پیرایوں کو اپنے فکر و فن کے اظہار کے لئے ناکافی نہیں پایا اور اپنی جگہ یہ امر واقعی دامنِ توجہ کھینچتا ہے۔ اس کے باوجود بقول ڈاکٹر خلیل الرحمان "پورے مجموعے کے مطالعے کے بعد جس شخص کے خدوخال ذہن میں اُبھرتے ہیں، وہ آج ہی کا انسان ہے، تنہا، تلاش، مجبوری، محرومی، احساس، اجنبیت، غمِ رفاقت، تشنگی اور مسلسل تشنگی کا شکار ..."

۲۲×۱۸/۸ کے ۱۰۸ صفحات کے اس مجموعے کے دام پانچ روپے ہیں۔

ملنے کا پتہ : پی پی پبلی کیشن ۹۹۳ بازار چتلی قبر دہلی ۶

(راج نرائن راز)

---

**ضروری اطلاع** دسمبر کے شمارے میں صفحہ ۴۲ سے صفحہ ۴۵ تک کی کتابوں پر تبصرہ جناب عرش ملسیانی کا ہے سہواً ان کا نام شائع نہ ہو سکا۔

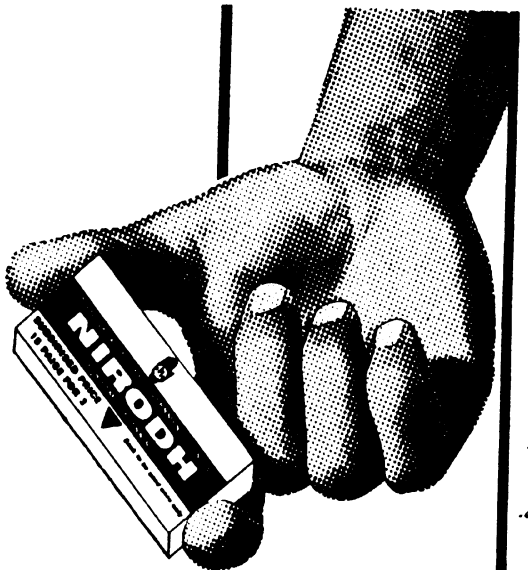


## بچّوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

فی زمانہ بچّوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نِرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچّہ تبھی ہوگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔

## بچّہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچّے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچّے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نِرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچّے کی پیدائش ملتوی کرسکتے ہیں۔

نِرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اِسے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان، و محفوظ طریقہ ہے۔ اِس کے استعمال سے صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔

نِرودھ ہر جگہ ملتا ہے:۔
پروویژن اسٹور، کرانہ فروش، کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بِکتا ہے۔

# نِرودھ استعمال کیجئے

فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
15 پیسے کے 3
سرکاری امداد سے کم دام

صرف
5 پیسے
خرچ کرکے
آپ
اپنے کنبے
کو
محدود رکھنے
کی طاقت
حاصل کرسکتے ہیں

70/61



نومبر ۱۹۷۰ء کو وگیان بھون نئی دہلی میں صدرِ جمہوریہ ہند
ری وی وی گری نے خلائی سائنس کی بین اقوامی
فرنس کے ۶۳ ویں جنرل اجلاس کا افتتاح کیا اور
ا اور خلاء میں غیر معمولی کارنامے انجام دینے والے
راد کو ۱۹۶۹ء کے انعامات دیئے۔

ویر میں بائیں سے دائیں) بی وی وولینو اور
وی گھرونیو (سویت یونین) نیل اے آرم
سٹرانگ اور چارلس کون راڈ (جونیئر) (امریکہ)
رجے ایل ارسٹی (اسپین)



نومبر ۱۹۷۰ء کو فلموں کے سالانہ انعامات کی تقسیم
ستر ہویں قومی تقریب مدراس میں ہوئی جس میں
فلمی فن کاروں کو ایوارڈ دیئے گئے۔ تقریب
رت مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات نے کی
یں) تامل ناڈو کے وزیر اعلا شری کرونا ندھی
ستانی فلموں کی سابقہ مشہور وممتاز اداکارہ
انی کو دادا صاحب پھالکے ایوارڈ دے
ہیں۔



ہندوستان کے مشہور سائنسداں سی وی رامن

(۷ نومبر ۱۸۸۸ء — ۲۱ نومبر ۱۹۷۰ء)

Vol. 29 No. 6 AJKAL (Monthly) January 1971

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55
Regd. No. D-509

# آج کل

Osmania University Library
HYDERABAD (Deccan)



۶۰ پیسے

فروری ۱۹۷۱ء

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار



نکاک میں منعقد چھٹے ایشیائی کھیلوں میں حصہ لینے والے ہندوستانی کھلاڑی
ب بھارت لوٹے تو ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ ۲۴ دسمبر کو تمغے حاصل کرنے
الے کھلاڑی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے ملنے بھی گئے۔

یچے (دائیں طرف) طلائی تمغہ حاصل کرنے والے ہندستانی کھلاڑی جوگندر سنگھ
ر پھینکتے ہوئے

(بائیں طرف) ۴۰۰ کلومیٹر کی دوڑ میں طلائی تمغہ حاصل کرنے والی خاتون
ماجیت سندھو وزیر اعظم کے ساتھ۔



اُردو کا مقبول عام مصوّر ماہنامہ

# آج کل

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

*

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۲۹ شمارہ ۷
فروری ۱۹۷۱ء
ماگھ پھاگن شک سمت ۱۸۹۲

سرورق: عمل گورچرن اروڑہ

شرح چندہ
سالانہ: ہندوستان میں: سات روپے
دیگر ممالک سے: ۱۰ شلنگ ۶ پینس یا ڈیڑھ ڈالر
فی پرچہ: ہندوستان میں: ۶۰ پیسے
دیگر ممالک سے: ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

شائع کردہ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

## ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ملاحظات | ادارہ | ۲ |
| غبار کارواں (۱۲) | جگن ناتھ آزاد | ۳ |
| غالب (نظم) | بسمل سعیدی | ۸ |
| غالب اور شہزادگانِ میسور | ضیاء الدین احمد شکیب | ۹ |
| آساں نہیں غالب ہونا (نظم) | فضا ابن فیضی | ۱۳ |
| تلمیذ و نبیرۂ غالب، خواجہ فخر الدین حسین سخن دہلوی | سمیع الحق | ۱۴ |
| سات نظمیں | حسن نعیم | ۱۷ |
| بلّور کا بنا ہوا آدمی (مولانا آزاد کی کچھ یادیں) | خواجہ احمد عباس | ۱۸ |
| گھستے ہوئے رشتے، آزاد سانسیں (نظمیں) | ندا فاضلی | ۱۹ |
| شاد عارفی - ایک مطالعہ | بلراج کومل | ۲۰ |
| ایک تجزیہ - اپنی آزادیوں کے نام (نظم) | بانی | ۲۴ |
| پتھر کی زبان (کہانی) | احمد یوسف | ۲۵ |
| برطرحِ غالب (غزل) | دینا ناتھ مست | ۲۶ |
| کشمیر اور رواداری | بشمبر ناتھ کول | ۲۷ |
| غزل | اختر نظمی | ۳۰ |
| غزلیں | پیام فتح پوری، شاہد ماہلی، نصیر پرواز | ۳۱ |
| لاوارث (کنٹر کہانی) | الو پمانرنجن | ۳۲ |
| غزل (نذر غالب) | جعفر عسکری | ۳۵ |
| سائنس کا جدید طریقہ، تعلیم | محمد وصی | ۳۶ |
| غزل | فلک مظفر نگری | ۴۱ |
| غزلیں | ہوش نعمانی، صابر اکبر آبادی | ۴۲ |
| نئی کتابیں | صرفی حیدر آبادی، محمد جان اختر | ۴۳ |


مضامین اور ترسیلِ زر کا پتہ
شہباز حسین ایڈیٹر آج کل (اُردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

# اخبارات

مقام مسرت ہے کہ بنکاک میں منعقد چھٹے ایشیائی کھیلوں کے مقابلے میں ہندوستان نے چھ طلائی، نو نقرئی اور دس کانسی کے تمغے حاصل کئے اور وہ پانچویں نمبر پر رہا۔ اس مقابلے میں ایشیا کے ۱۸ ممالک کے تقریباً ۲۰۰۰ کھلاڑیوں نے حصہ لیا۔ ہندوستانی کھلاڑیوں میں پہلا طلائی تمغہ جوگندر سنگھ نے حاصل کیا جنہوں نے ۱۷٫۰۹ میٹر تک گولا پھینک کر ایشیائی ریکارڈ قائم کیا۔ بھارت کے مشہور پہلوان بھارت کیسری، ماسٹر چندگی رام کو بھی کشتی میں طلائی تمغہ ملا۔ کماری کملجیت سندھو واحد ہندوستانی خاتون ہیں جنہیں سونے کا میڈل ملا۔ وہ ۴۰۰ میٹر کی دوڑ میں اوّل آئیں۔ اتھیلٹک پروین کمار نے ۵۲٫۳۲ میٹر کے فاصلے تک چکّہ پھینک کر نیا ریکارڈ قائم کیا۔ پہلا ریکارڈ بھی انہیں کا تھا۔ پانچواں طلائی تمغہ ہندر سنگھ نے ۱۶٫۱۱ میٹر اونچی چھلانگ لگا کر حاصل کیا۔ چھٹا طلائی تمغہ باکسنگ میں ہندوستانی مکے باز ہوا سنگھ کو ملا جنہوں نے مکے بازی میں ایران کے عمر فاطمی کو شکست دی۔ لابھ سنگھ واحد ہندوستانی کھلاڑی تھے۔ جنہیں دو نقرئی تمغے حاصل ہوئے۔

---

ہندوستان میں ہندی کے بعد سب سے زیادہ اخبارات اُردو میں شائع ہوتے ہیں۔ پریس رجسٹرار کی تازہ ترین رپورٹ برائے ۱۹۶۹ء کے مطابق ہندوستان میں ۱۰۲۸۱ اخبارات و رسائل شائع ہو رہے تھے جن میں روزانہ اخبارات کی تعداد ۶۵۰ تھی ان میں سے ہندی اخبارات کی تعداد ۱۸۶ اور اُردو اخبارات کی ۹۸ تھی۔ انگریزی اخبارات کی تعداد صرف ۶۹ تھی۔ گزشتہ برس کے مقابلے میں اس برس ۲۶۳ اخبارات کا اضافہ ہوا علاوہ بریں دنیا میں سب سے زیادہ اخبارات بھی ہندوستان سے ہی شائع ہوتے ہیں۔

تعداد کے لحاظ سے اُردو اخبار و رسائل کی تعداد خاصی ہے مگر اشاعت کے لحاظ سے زیادہ تر اُردو اخباروں کی حالت تسلی بخش نہیں ہے۔ یہ مسئلہ ایسا ہے جس پر بڑی سنجیدگی سے دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

---

حسب سابق ہم نے اس شمارے میں بھی غالب سے متعلق مضامین اور نظمیں شامل کی ہیں۔ اُمید ہے آپ انہیں پسند کریں گے۔

ہم نے "غبارِ کارواں" کا جو سلسلہ شروع کیا ہے۔ اُسے بے حد پسند کیا گیا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا اور ہر ماہ آپ کسی ادیب یا شاعر کے تاثرات و خیالات پڑھتے رہیں گے۔

ہمارے پڑھنے والے سائنس سے متعلق مضامین کی اشاعت کا برابر تقاضا کرتے رہتے ہیں۔ اس موضوع پر ہمیں بہت کم مضامین موصول ہوتے ہیں۔ ایسے اہلِ قلم جو سائنس کے مختلف پہلوؤں پر دلچسپ اور معلوماتی مضامین لکھ سکیں۔ ہمیں ضرور بھیجیں۔

---

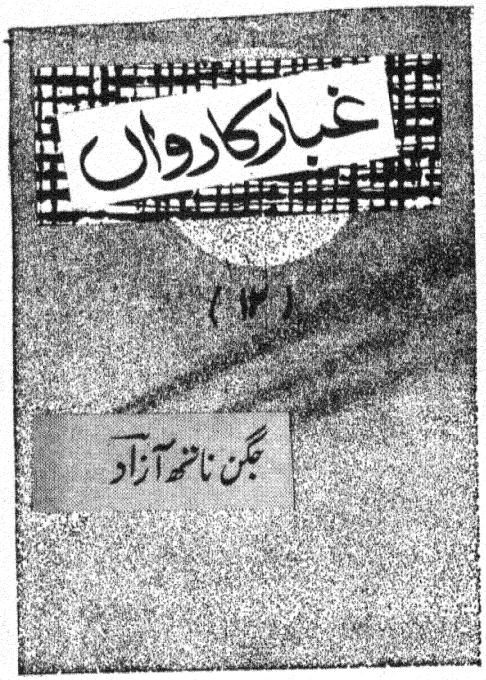


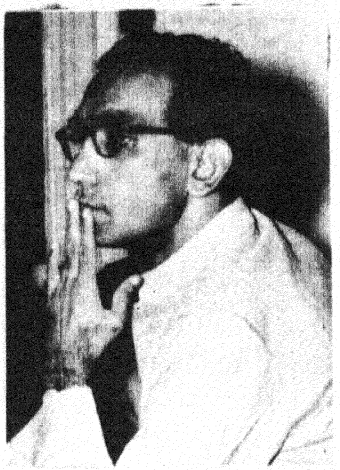

علامہ اقبال کا ایک شعر ہے۔

وہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

اس سوال کا جواب کہ مجھے زندگی میں کن شخصیات اور کون کون سی کتابوں نے متاثر کیا ہے، اسی شعر میں پوشیدہ ہے۔ کتاب بھی دراصل فنکار کی شخصیت ہی کا پرتو ہوتی ہے۔ اس لئے تاثر انسان ہر حالت میں شخصیت ہی کا قبول کرتا ہے خواہ وہ بالواسطہ ہو یا کتاب کے واسطے سے۔ اسی اصول کے تحت جب میں اپنی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ سب سے زیادہ اور سب سے گہرا اثر جو میری زندگی نے قبول کیا وہ میرے والد کی شخصیت کا ہے خواہ یہ اثر میں نے براہ راست قبول کیا ہو گھر کی چار دیواری کے اندر یا ان کی تصانیف کے ذریعے سے۔

ابھی میں بچہ ہی تھا، لفظ شعر کے مفہوم سے بھی شاید آگاہ نہیں تھا شعر کی تہوں تک پہنچنا تو دور کی بات رہی میں والد محترم کو کچھ نہ کچھ گنگناتے سنا کرتا تھا ایک شعر جو سنتے سنتے مجھے زبانی یاد ہو گیا یہ تھا۔

اُڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

اُس وقت مجھے یہ کہاں معلوم تھا کہ یہ شعر کس کا ہے اور یہ بھی کون جانتا تھا کہ یہ شعر آگے چل کے مجھے یہاں تک متاثر کرے گا کہ یہ اپنے خالق (علامہ اقبال) کے تخلیقی شہ پاروں کا مجھے عاشق بنا دے گا اور میری اپنی شاعری کے متعدد پہلوؤں میں سے ایک پہلو یہاں تک پہونچے گا کہ نیاز فتح پوری، عبدالماجد دریابادی، اسد ملتانی، اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی ایسے نقادوں کو اس پر کلام اقبال کا گمان ہو گا۔

اسی بچپن ہی کے زمانے کی بات ہے میں شاید تیسرے درجے میں پڑھتا تھا والد نے ایک کتاب کھول کے میرے سامنے رکھی اور اس میں ایک غزل پڑھنے کو کہا۔ میں نے وہ غزل انہیں پڑھ کے سُنا دی انہوں نے کہا اب تم امتحان میں پاس ہو" میں اس بات کا مطلب کچھ نہ سمجھا لیکن یہ واقعہ مجھے کئی برس تک یاد رہا اور آج بھی یاد ہے چنانچہ ایک بار میں نے والد محترم سے پوچھا کہ اس امتحان کا کیا مطلب تھا تو انہوں نے کہا کہ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم شعر موزوں پڑھ سکتے ہو یا نہیں، اور وہ غزل تھی۔

کوئی اُمید بر نہیں آتی ؛ کوئی صورت نظر نہیں آتی

گویا والد نے سب سے پہلے میری طفولیت بلکہ بچپن کے زمانے میں، شعوری یا تحت الشعوری طور پر جن دو شاعروں کو میرے احساس سے متعارف کرایا وہ غالب اور اقبال تھے۔ وہ یقیناً اس بات سے آشنا تھے کہ یہ عمر نہ غالب کو سمجھنے کی ہے اور نہ اقبال کو لیکن غالباً وہ اس بات پر عمل کر رہے تھے کہ مسلمان گھروں میں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسی وقت اس کے کان اذان سے آشنا کر دیئے جاتے ہیں۔ آخر یہ سب عمل بے مصرف نہیں ہے۔ ہمارے گھر میں اذان نہ سہی غالب اور اقبال کا ذکر ہی سہی۔

ابھی میرے پوری طرح اقبال کے زیر اثر آنے میں بڑی دیر تھی میں پانچویں درجے میں تھا۔ دارالاشاعت لاہور نے حفیظ جالندھری کا مجموعہ نظم "ہندوستان ہمارا"

شائع کیا۔ یہ کتاب بچوں کے لئے تھی — اور میرے علم میں اس وقت آئی جب والد کے ہمراہ میں ایک مشاعرے میں بھیرے گیا اور وہاں اگلے دن حفیظ صاحب نے اس کتاب کی دو ایک نظمیں اپنے مخصوص انداز میں ہمیں سنائیں۔ "ہندوستان ہمارا" کی نظمیں سنانے کی وجہ یہ تھی کہ مشاعرے سے واپسی پر مجھ سے والد نے پوچھا "کہو مشاعرہ کیسا رہا" میں نے صاف صاف بتا دیا کہ میری سمجھ میں کوئی نظم نہیں آئی۔ انہوں نے کہا "حفیظ صاحب کا کلام بھی؟" میں نے کہا "ان کا ایک ہی مصرع میری سمجھ میں آرہا تھا: میرا سلام لے جا" کہنے لگے یہ مصرع بھی معنوی اعتبار سے تم نے نہیں سمجھا ہوگا کیونکہ اس نظم کا جو مرکزی خیال ہے تم اس سے آشنا نہیں ہو چنانچہ اگلے دن جب والد اور میں حفیظ صاحب سے لئے اُن کی قیام گاہ پر پہونچے تو والد نے شکایت کی کہ جگن کا تو اس مشاعرے میں آنا بے کار ہی رہا۔ یہ کہتا ہے کہ کوئی نظم میری سمجھ میں نہیں آئی اس پر انہوں نے مذکورہ کتاب "ہندوستان ہمارا" نکالی اور اس میں سے وہ حصہ اپنے مخصوص انداز سے پڑھ کے سنایا جب لچھمن سروپ نکھا کی ناک کاٹ ڈالتا ہے اور وہ چیختی چلاتی راون کے دربار میں واپس پہنچتی ہے۔ مجھ پر اس نظم کا اتنا اثر ہوا کہ گھر واپس پہنچتے ہی والد سے کہہ کے وہ کتاب میں نے لاہور سے منگوالی اور اسے اتنی بار پڑھا کہ یہ ساری کتاب مجھے زبانی یاد ہوگئی اور جب میں آٹھویں درجے کے ڈویژنل امتحان میں بیٹھا تو تاریخ کے پرچے میں تمام سوالات کے جوابات میں نے نظم میں دیئے اور یہ جوابات "ہندوستان ہمارا" ہی کی نظموں پر مشتمل تھے۔

مجھے اس امر کے اعتراف میں کسی قسم کے تکلف سے کام نہیں لینا چاہئے کہ جہاں میرا زبان و بیان کے اعتبار سے مشکل شاعری کا ایک حصہ، اقبال کے اسلوب سے متاثر ہے وہاں آسان اور سلیس شاعری کا ایک حصہ ایسا ہے جو حفیظ جالندھری کے اثر سے آزاد نہیں۔

اسی زمانے میں والد نے مجھے لاہور سے ایک اور کتاب منگوا کر دی۔ یہ ڈاکٹر عابد حسین کی ترجمہ شدہ مہاتما گاندھی کی خود نوشت سوانح حیات تھی: "تلاش حق"۔ یہ غالباً نثر کی پہلی قابل ذکر کتاب تھی جو میری نظر سے گزری۔ بچوں کے لئے لکھی ہوئی کتابوں کے علاوہ مثلاً سوتے جاگتے کا قصہ، ابوالحسن، حکایات شیریں وغیرہ۔ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ کتاب ہر حالت میں اپنے مصنف کی شخصیت ہی کا پرتو ہوتی ہے۔ جہاں تک "تلاش حق" کا تعلق ہے یہ اصول اور شدت کے ساتھ کار فرما تھا۔ خود ڈاکٹر عابد حسین کی زندگی بھی گاندھی جی کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں جن شخصیتوں نے گاندھی جی سے متاثر ہو کر تیاگ کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کی ہے، ان میں جامعہ کے اساتذہ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کا تیاگ دولتمندانہ تیاگ نہ سہی لیکن برائے نام تنخواہ پر جب کہ بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے بڑی بڑی تنخواہوں کی پیشکش موجود ہو، اپنی ساری زندگی جامعہ کے لئے وقف کر دینا معمولی بات نہیں۔ گویا "تلاش حق" میں مصنف اور مترجم دونوں کی شخصیت کا پرتو موجود ہے اور پڑھنے والے پر یہ کتاب دو آتشہ کا اثر رکھتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ ہی سے میرے دل میں اوّل اوّل اپنے ملک کی تاریخ کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ اگرچہ یہ چنگاری کسی حد تک "ہندوستان ہمارا" کی بدولت بھی سلگ ہی چکی تھی۔

کم عمری میں "تلاش حق" کے مطالعے نے میرے سوچ بچار کے ڈھنگ کو ایک خاص راستے پر لگا دیا اور ایک مدت تک یہی عقیدہ میرا جزو ایمان رہا کہ اس ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد ہی سے مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی حفاظت بھی ہو سکتی ہے اور اس کی روایات میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے لیکن ملک کی تقسیم اور اس کے بعد کے واقعات نے مجھے اسی انداز سے سوچنے پر مجبور کیا کہ مختلف تہذیبی دھاروں کو اگر ہمیں ایک مشترکہ تہذیب کا رُوپ دینا ہے تو اس کے اجزائے ترکیبی میں ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب کو جزو اعظم کے طور پر نہیں بلکہ ساج واد کے نظرئے کو جزو اعظم کے طور پر شامل کرنا ہوگا ورنہ مسلم تہذیب میں لچک کی کمی اور ہندو تہذیب کی قدامت ایک دوسرے پر مسلط ہونے کی کوشش میں اس ملک کے مستقبل کے بخیئے اُدھیڑ دیں گی۔

"تلاش حق" کے بعد میں جس کتاب سے متاثر ہوا وہ ڈانٹے کی ڈیوائن کامیڈی تھی۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ابتدا میں جن دو کتابوں نے مجھے متاثر کیا وہ دونوں ترجمے تھے۔ ڈیوائن کامیڈی کا بھی ترجمہ ہی میری نظر سے گزرا تھا۔ مترجم تھے کارلائل، اوکے زوراک اسٹیڈ اور اگر میں کہوں کہ ڈانٹے انتہائی خوش نصیب تھا کہ اسے یہ تین مترجم میسر آئے تو غلط نہ ہوگا۔

اس نظم میں کئی ایسے مقام آئے جنہیں پڑھ کر میں اکثر آبدیدہ ہو جاتا تھا۔ بالخصوص جب میں اس مقام پر پہنچا جب بیٹرس کو ڈانٹے جنت میں (یا اعراف میں — مجھے اب صحیح یاد نہیں رہا) اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھتا ہے تو میرے آنسو ضبط نہ ہو سکے اور میں کوشش کے باوجود اس کو مکمل طور پر نہ پڑھ سکا۔ اگرچہ میری اپنی زندگی میں بیٹرس بہت آگے چل کے داخل ہوئی لیکن غالباً حسن کے تعلق سے ڈانٹے کے اور میرے احساس میں جو مطابقت موجود تھی وہی ہر بار میرے آبدیدہ ہو جانے کا باعث بنتی تھی۔

لیکن اس کتاب میں رسول اللہ اور حضرت علی کا ذکر جس طرح سے ڈانٹے نے کیا ہے وہ مجھے کبھی پسند نہیں آیا۔ مذہب کی بنا پر کسی شاعر کا اس قدر تنگ دل ہو جانا میری سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا۔ رسول اللہ اور حضرت علی تو خیر مسلمان

تھے اور ڈانٹے کا اُن سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ڈانٹے نے اپنے اُستاد ورجل کو محض اس بنا پر کہ ورجل عیسائی نہیں تھا، معاف نہیں کیا حالانکہ ورجل حضرت عیسیٰ مسیح کی پیدائش سے پہلے ہی اس دُنیا میں آکر واپس جا چکا تھا۔

اس کے باوجود ڈانٹے کے علو تفکر اور سحر بیانی نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میری بڑی خواہش رہی کہ اُردو نظم میں اس طرح کی ایک کتاب لکھوں لیکن اول تو اتنا بڑا کینوس میری سمجھ میں آ ہی نہیں سکا اور اگر کبھی میں نے ذہن میں تانا بانا بُنا بھی تو موضوع کو ہاتھ لگانے کا حوصلہ نہ ہوا۔

پریم چند کا ناول "نرملا" بھی اسی زمانے میں میں نے پڑھا اور پہلی بار اُردو میں میں ایک Powerful قلم سے آشنا ہوا اب مجھے اس ناول کی تفاصیل تو یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ اس ناول میں ایسے حصے بکثرت تھے جنہیں پڑھ کے بے اختیار میرے آنسو اُمنڈ اُمنڈ آتے تھے، بالخصوص لڑکے کا گھر چھوڑ کے بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہونا اور اس کا گھر میں یہ کہلا کے بھیجنا کہ اب مجھے گھر سے کھانا یا دودھ نہ بھیجا جائے۔ انتہائی دردناک قصہ ہے اور اُسے پڑھتے وقت آنسوؤں کو روک لینا میرے بس میں نہ تھا۔

اتفاق کی بات ہے کہ مجھے یکے بعد دیگرے ایسی ہی کتابوں نے متاثر کیا جو المیہ کی ذیل میں آتی ہیں۔ کچھ مدت بعد شیکسپیئر کا ڈرامہ "ہملٹ" میں نے پڑھا۔ اس میں اوفلیا کے کردار نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو ڈیوائن کامیڈی میں بیٹرس نے کیا تھا۔

اس وقت تک اقبال کے کلام سے میرا تعلق خاصا گہرا ہو چکا تھا اور اس کا شاہکار "جاوید نامہ" بھی میری نظر سے گزر چکا تھا۔ "جاوید نامہ" پر ڈیوائن کامیڈی کا اثر بڑی حد تک موجود ہے لیکن یہ دیکھ کر جاوید نامہ کا مرتبہ میری نظر میں ڈیوائن کامیڈی سے کہیں اونچا ہو گیا کہ جہاں ڈیوائن کامیڈی میں ڈانٹے نے غیر عیسائی شخصیتوں کے ذکر میں خواہ وہ رسول اللہ ہوں یا حضرت علی یا ڈانٹے کے اپنے پیر و مرشد ورجل، انتہائی تعصب اور تنگ نظری کا مظاہرہ کیا ہے وہاں اقبال نے جاوید نامہ میں غیر مسلم شخصیتوں مثلاً شیوجی مہاراج، بھرتری ہری، اور نہرو خاندان پر محبت اور عقیدت کے وہ پھول نچھاور کئے ہیں جن کی خوشبو سے عالم انسانیت ہمیشہ مہکتا رہے گا۔ اگر دُنیا کے گنہگار حضرت عیسیٰ مسیح کی قربانی کی بدولت بخشے جا سکتے ہیں تو اقبال کے اس اندازِ فکر کی بدولت ڈانٹے کے تعصب اور تنگ نظری کا گناہ بھی یقیناً اس وقت تک بخشا جا چکا ہوگا۔

اقبال کی تصانیف ہی نے مجھے تمام تصانیف سے زیادہ متاثر کیا اور اُنہی کا ذکر میں بڑی تفصیل سے کرنا چاہتا ہوں مگر ع تابِ گفتار کہتی ہے بس۔ یوں تو اقبال اور اقبال کی تصانیف پر میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں نثر میں بھی اور نظم میں بھی۔ "اقبال اور اس کا عہد" کے نام سے ایک کتاب بھی موجود ہے لیکن بقول غالب حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ اور پھر اقبال کی تصانیف کا ذکر ایک ایسے مقالے کا جزو کیسے بنے جو مختلف شخصیتوں اور تصانیف کے بارے میں لکھا جا رہا ہو۔

اسی طرح اپنے والد کی شخصیت کا جو اثر میں نے قبول کیا ہے اس کے ذکر کے لئے بھی ایک علیحدہ مقالہ ہی درکار ہے۔ جس دامنِ شفقت میں میں نے پرورش پائی ہے اس کے اثر سے میری زندگی اور میرا ذوق کیونکر بیگانہ رہ سکتا ہے۔ شعر و ادب کی بات تو الگ رہی۔ میرے گھر کے لوگ اور میرے احباب اکثر مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ میرے اُٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا اندازہ بالکل وہی ہے جو میرے والد کا تھا بلکہ حیرت کی بات یہ ہے کہ اب جبکہ میری عمر پچاس سے تجاوز کر چکی ہے اکثر وہی ادویہ میرے استعمال میں آ رہی ہیں جو والد استعمال کیا کرتے تھے۔

یہ مقالہ میرے اساتذہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (مرحوم) پرنسپل اورنٹیل کالج ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، سید عابد علی، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور آقا بیدار بخت کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا جن کے قدموں میں بیٹھنے کا اگر مجھے اتفاق نہ ہوتا تو میں فارسی ادب سے قریب قریب بیگانہ ہی رہتا اور میری شاعری کا شاید وہی انداز ہوتا جو فارسی نہ جاننے والے اُردو شعراء کا ہے اور جو مجھے بڑی حد تک ناپسند ہے۔ اسی طرح سے مولینا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، شیر محمد اختر، قیوم نظر، یوسف ظفر اور قتیل شفائی کا ذکر بھی یہاں میں ضروری سمجھتا ہوں جن کے بغیر لاہور کی ادبی زندگی میرے لئے اتنی پُرکیف نہ بن سکتی جتنی پُرکیف اور دلکش وہ بنی اور جس کی یاد آج بھی میرے دل میں چٹکیاں لے رہی ہے۔

موجودہ دور کے شعراء میں میں جوش سے بھی متاثر ہوا ہوں۔ جگر سے بھی اور فراق سے بھی۔ ان تینوں کی شخصیت سے بھی اور اُن کی شاعری سے بھی اور اُن کی زندگی کے اس پہلو کو میں نے ہمیشہ ان کی کمزوری پر محمول کیا ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے کے حق میں کبھی کلمۂ خیر نہیں کہا سوائے ایسے موقعوں کے جہاں کوئی مصلحت کارفرما ہو۔ ان تینوں کو یہ گمان رہا اور جوش اور فراق کو ابھی تک ہے کہ اُردو نے اُن سے بڑا شاعر پیدا نہیں کیا ہے۔ ویسے مروتاً انہوں نے غالب کو اپنے پر ترجیح دی ہے۔ اگرچہ اس میں بھی میرے نزدیک کبھی خلوص شامل نہیں رہا۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت کو انہوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا، لیکن میں سمجھتا

---

لہ اگرچہ ڈانٹے نے اپنی کتاب کا نام "طربیہ" رکھا ہے لیکن دراصل وہ ہے المیہ ہی۔ (ج ف ۔ ا)

ہوں کہ اقبال کے بارے میں وقت اپنا فیصلہ دے چکا ہے اور اُسے اُردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جا چکا ہے۔ جوش، جگر اور فراق کا شمار اچھے شعراء میں ہے اور ہوتا رہے گا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی دور میں بھی فردوسی، سعدی۔ رومی، کالی داس تلسی داس بھرتری ہری، شیکسپیر، ڈانٹے، گوئٹے، ٹی ایس ایلیٹ، غالب اور اقبال کی طرح بڑے شاعر تسلیم کئے جائیں کیونکہ ادب کے بڑے ہونے کی مسلّمہ طور پر ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ بڑی فکر کا حامل ہو اور بڑی فکر سے ان تینوں کا کلام خالی ہے۔

لیکن یہ سب کچھ کہنے کے باوجود یہ دعویٰ کہ میں فراق کے کلام سے متاثر نہیں صحیح نہیں۔ فراق کی غزل سے (نظم سے نہیں) میں یقیناً متاثر ہوا ہوں اور اپنے ہر پسندیدہ شاعر کی طرح اُن کے بھی اکثر اشعار مجھے یاد ہیں۔ مثلاً

یونہی سا تھا کوئی جس نے مجھے مٹا ڈالا
نہ کوئی نور کا پُتلا نہ کوئی زہرہ جبیں
نہ کوئی وعدہ نہ کوئی یقیں نہ کوئی اُمید
مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا
کچھ آدمی کو بھی مجبوریاں ہیں دُنیا میں
اے وہ دردِ محبت سہی تو کیا مرجائیں
ہزار بار زمانہ اِدھر سے گذرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی
مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بے جا بھی نہیں
ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا
کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی
اُمیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی
کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھتا ہے
کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی
فضا تبسم صبحِ بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے شباب کی دوشیزگی نکھر آئی
تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں
اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہوگئی ہے

یہ فراق کے کمالِ شعر کی انتہا ہے اور اُردو کا کون طالب علم ہے جو ان اشعار سے متاثر نہ ہوگا لیکن یہاں اس پر روشنی ڈالنا ضروری ہے کہ یہ فراق کی عام سطح نہیں۔

اچھے اشعار جدید شاعروں کے یہاں بھی بہت مل جاتے ہیں اور اُن سے بھی میں اثر پذیر ہوا ہوں۔ مثلاً

پھیلا ہوا تھا شہر میں تنہائیوں کا جال
ہر شخص اپنے اپنے نقاب میں غرق تھا (سلطان اختر)
وہ جو رات مجھ کو بڑے ادب سے سلام کر کے چلا گیا
اُسے کیا خبر مرے دل میں بھی کبھی آرزو ئے گناہ تھی (احمد مشتاق)
انہی لوگوں سے مل کر خوش ہوا ہوں
انہی لوگوں سے ڈرتا بھی رہا ہوں (محمد علوی)
لوگ کہتے ہیں سیاہی کے سمندر میں کہیں
اور بھی ایک چمکتا ہوا دن ڈوب گیا (خورشید احمد جامی)
وہ نہیں ہے نہ سہی ترکِ تمنا نہ کرو
دل اکیلا ہے اُسے اور اکیلا نہ کرو (محمود ایاز)
کبھی مائل بہ رقابت کبھی مائل بہ گریز
زندگی ہم سے ملی تیری اداؤں کی طرح (ممتاز ارشد)
دامِ خوشبو میں گرفتار صبا ہے کب سے
لفظ اظہار کی الجھن میں پڑا ہے کب سے (مجید سلام امجد)
اگر میں نے تجھے دُنیا پہ قرباں کر دیا تو کیا
یہاں انسان جینے کے لئے کیا کیا نہیں کرتا (نثار ناسک)
عظمت کی بلندی پہ میں جس سمت گیا ہوں
دیکھا ہے ترے پاؤں کا پہلے سے نشاں ہے (خاقان خاور)
چراغِ بزم ابھی جانِ انجمن نہ بجھا
کہ یہ بجھا تو ترے خدّ و خال سے بھی گئے (حامد عزیز مدنی)

اے دوست! ترا شہر بھی ہے شہرِ طلسمات
چھو کر جسے دیکھا وہی پتھر نظر آیا (خالد احمد)

ایک لمحے کا تعلق عمر بھر کا روگ ہے
دوڑتے پھرتے رہو گے بھاگتے لمحوں کے ساتھ (افتخار نسیم)

اس مکاں میں دیر سے شاید کوئی رہتا نہیں
در کھلے والان سارا کائی میں ڈوبا ہوا (حامد جیلانی)

نزدیک بھی آ جھانک کے دل میں بھی ذرا دیکھ
ملبوس ہی انسان کا معیار نہیں ہے (محمد جلیل عالی)

کسی بھی سمت سے ابھرے ستارۂ آواز
نہیں یہ قید کہ وہ آسماں سے ظاہر ہو (اعجاز آصف)

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے (البشیر بدر)

مری آنکھیں سلامت ہیں تو پھر میں
پرائے خواب لے کر کیا کروں گا (اعجاز گل)

شہرِ دل میں رات کوئی سوداگر بن کر آیا تھا
فقرِ دل و جاں سونپ کے اس کو صبح بہت پچھتائے ہم (زبیر رضوی)

کچھ تو یاروں سے بلا سنگِ ملامت ہی سہی
کس نے اس شہر میں یوں دادِ وفا پائی ہے (رضی اختر شوق)

یہ اشعار زیادہ تر، میرے بعد کی نسل کے شعراء کے ہیں اور میں اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ نئی نسل کے شعراء کی یہ فہرست مکمل نہیں ہے اور فہرست مکمل کرنا میرا مقصد بھی نہیں ہے۔ یہ تمام اشعار مجھے پسند ہیں اور ظاہر ہے کہ زبانی وہی اشعار یاد رہیں گے جو پسند ہوں گے اور ساتھ ہی یہ کہنے کی بھی اجازت چاہتا ہوں کہ یہ اشعار یا فراق صاحب کے جو اشعار میں نے درج کئے ہیں میرے نزدیک عظیم شاعری کے نمونے نہیں ہیں اور یہی فرق ہے جو میری نظر میں ایک بڑے شاعر کو محض اچھے شاعر سے ممتاز کرتا ہے۔ بڑی شاعری کے دو ایک نمونے میرے نزدیک یہ ہیں۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے (اقبال)

تو کفِ خاک و بے بصر میں کفِ خاک و خود نگر
کشتِ وجود کے لئے آبِ رواں ہے تو کہ میں (اقبال)

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں (اقبال)

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی (غالب)

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں (غالب)

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے (غالب)

ہماری شاعری کو عظیم بنانے کا سہرا بحیثیت مجموعی نظم کے سر ہے غزل کے سر نہیں۔ اگر عظیم شاعری کے تعلق سے نظم اور غزل دونوں موضوعِ بحث ہوں تو غزل چاہے حافظ کی ہو یا غالب کی نظم کے مقابلے میں ایک فروتر صنف قرار پائے گی۔

اب آخر میں اپنے اُستاد شمس العلماء مولینا تاجور نجیب آبادی مرحوم کا ذکر کر کے رخصت ہوتا ہوں۔ مولینا تاجور مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف مجھے سب سے پہلے ۱۹۴۱ء میں حاصل ہوا اور ۱۹۴۷ء تک میری اُن کی خدمت میں حاضری کا یہ عالم رہا کہ اگر وہ بھی لاہور میں ہیں اور میں بھی تو شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جب میں اُن کے یہاں حاضر نہ ہوتا ہوں۔ جہاں تک اشعار میں تصحیح کا تعلق ہے مولینا نے میری دو یا تین غزلوں یا نظموں کو اس انداز سے دیکھا ہو اور وہ اس انداز کی تصحیح کے قائل ہی نہیں تھے جسے "اشعار بنانا" کہتے ہیں۔ ہاں بات بات میں انہوں نے مجھے ادب اور ادب کی باریکیوں سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔ "بالِ جبریل" انہوں نے مجھے سُنانے کی خاطر اوّل سے آخر تک پڑھی اور اقبال کی خوبیوں اور خامیوں سے مجھے آگاہ کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ یہ خامیاں اقبال کے سیلِ شعر میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گی لیکن تمہارے کلام میں ہونگی تو سطح پر تیرتی نظر آئیں گی اس لئے تم ان سے اجتناب کرو۔

مولینا مرحوم کا کوئی مجموعۂ کلام یا مجموعۂ نثر آج یادگار کے طور پر ہمارے سامنے نہیں ہے یہ بھی ہم لوگوں ہی کی خطا ہے جو اپنے آپ کو ان کا شاگرد کہتے ہیں لیکن حقِ شاگردی ادا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ خدا کرے پاکستان میں اُن کے کسی شاگرد کو ان کا کلام اور مقالاتِ نثر جمع کرنے کی توفیق حاصل ہو اور وہ یہ کام سرانجام دیدے کیونکہ ان کی نظمیں، غزلیں اور مقالات وہاں کی لائبریریوں میں تو دستیاب ہو جائیں گے لیکن اگر یہ کلام نہ بھی حاصل ہو سکے تو مولینا کی تصانیف ان کی وہ جیتی جاگتی تصویریں ہیں جنہیں دُنیائے ادب اختر شیرانی، کرپال سنگھ بیدار، ناخر سریانوی اور احسان دانش کے نام سے جانتی ہے اور اگرچہ میں اپنے آپ کو مولینا کی خاک پا کے برابر بھی نہیں سمجھتا لیکن:۔

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ
ذرہ آفتاب تابانیم

کے مصداق چاہتا ہوں کہ اپنا نام بھی اس فہرست میں شامل کر لوں۔

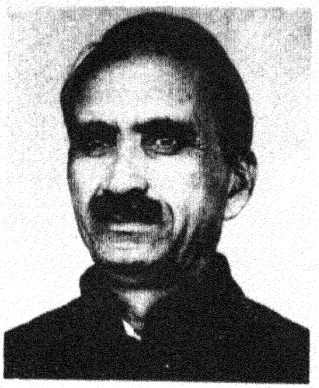

اے شاعرِ یکتا، اسد اللہی و غالب
اے قلزمِ مواجِ معانی و مطالب
تھی فکر میں تیری پرِ جبریل کی پرواز
تھا مُلہمِ غیبی کا ہم آہنگ ترا ساز
ہر فلسفہ و منطق و افسانہ و افسوں
آتے تھے ترے ذہن میں یوں غیب سے مضموں
جس طرح دمِ فکر برستے ہوں مسلسل
میخانۂ تخیل پہ الہام کے بادل
فطرت کا ہر اک راز تری فکر میں ضم تھا
کیا خامہ و قرطاس ترا، لوح و قلم تھا
اسرارِ مشیت کہیں ہوتے ہیں رقم بھی
کیا تیرے نہاں خانے کا گوشہ تھا عدم بھی
اُس فکر کے عالم میں قلم تیرا رواں تھا
جس فکر کے عالم میں زماں تھا نہ مکاں تھا
پیدا ہے ترے شعر سے اک شرعِ محبت
وہ شرع کہ مستغنیٔ ہر مذہب و ملت
تھا وحدتِ ادیان کا حامل ترا مسلک
ایمان کا ہر جادۂ منزل ترا مسلک

## بسمل سعیدی

آتا جو صحیفہ کوئی قرآں کے علاوہ
کچھ اور نہ ہوتا ترے دیواں کے علاوہ
با وصفِ کہن، تازہ مئے نابِ غزل ہے
ساقی ترے میخانے کا ساقیٔ ازل ہے
اللہ رے یہ نشہ و جوش مئے گلفام
ساغر ہے ترا، میکدۂ حافظ و خیام
دلی میں ترے دم سے ہوں جیسے سخن آرا
شیراز و سمرقند و صفاہان و بخارا
گویا ترے اشعار میں ہیں تیری زبانی
عرفی و ظہوری و نظیری و فغانی
فردا ترا یوں تھا ترے امروز میں مستور
جس طرح رگِ تاک میں افشردۂ انگور
صد بار ترا کوکبِ عظمت ہے ترے بعد
دنیا میں ترے شعر کی شہرت ہے ترے بعد
جو نقش نظر میں سجے تری، رنگ کے اثر رنگ
مجموعۂ بے رنگ سے اردو کے ہیں وہ رنگ
باعث تری شہرت کا ہے اردو کا وہ دیواں
تھا جس میں تجھے مطلع و مقطع بھی نہ آساں
معراج تو معلوم نہیں تیری غزل کی
افلاک سے اونچی ہے زمیں تیری غزل کی
نالوں سے تری نے کے فلک ہیں متاثر
الہام کے نغموں سے ملک ہیں متاثر
ہر چند کہ جبریلِ امیں کی ہے زباں اور
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

# غالب

اور

# شہزادگان میسور

ضیاء الدین احمد شکیب

مئی ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد سلطان شہید کے اہلِ خاندان کو گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن اس کے فوری بعد ملک کے دوسرے علاقائی حکمرانوں سے کئے گئے معاہدوں سے استحصال کے طور پر انگریز حکمراں جنوبی ہند میں مختلف ریاستوں کے حصے بخرے کرنے میں مصروف تھے ان ہی حالات میں ۱۸۰۰ء میں میسور میں آزادی کی ایک دوسری لہر اٹھی جو ٹیپو سلطان کے بیٹے شکراللہ سلطان کے زیرِ سایہ تھی لیکن یہ لہر بھی فرو کر دی گئی۔

اس کے بعد لارڈ منٹو نے ٹیپو سلطان شہید کے تمام اہلِ خاندان کو کلکتہ میں منتقل کر دیا - جن میں خواتین کے علاوہ سلطان شہید کے بھائی کریم شاہ بہادر اور بارہ لڑکے شامل تھے ان لڑکوں کے نام بہ اعتبار عمر یہ ہیں - ان میں سے ہر ایک کی تاریخ وفات بھی نام کے آگے درج کی جاتی ہے۔

| اسماء | تاریخ وفات |
|---|---|
| ۱- فتح حیدر سلطان | یکم شعبان ۱۲۳۰ھ / ۹ جولائی ۱۸۱۵ء |
| ۲- عبدالخالق سلطان | یکم شوال ۱۲۲۲ھ / یکم دسمبر ۱۸۰۶ء |
| ۳- محی الدین سلطان | ۴ ربیع الثانی ۱۲۲۶ھ / ۲۸ اپریل ۱۸۱۱ء |
| ۴- معز الدین سلطان | ۲۲ جمادی الاول ۱۲۳۳ھ / ۳۰ مارچ ۱۸۱۸ء |
| ۵- محمد یاسین سلطان | |
| ۶- محمد سبحان سلطان | ۲۴ رمضان ۱۲۶۱ھ / ۲۷ ستمبر ۱۸۴۵ء |
| ۷- شکراللہ سلطان | ۲۴ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ / ۲۵ ستمبر ۱۸۳۷ء |
| ۸- سرور الدین سلطان | ۶ جمادی الثانی ۱۲۴۹ھ / ۲۰ اکتوبر ۱۸۳۳ء |
| ۹- جامع الدین سلطان | ۱۷ شوال ۱۲۵۸ھ / ۲۱ نومبر ۱۸۴۲ء |
| ۱۰- منیر الدین سلطان | ۲ رمضان ۱۲۵۳ھ / یکم دسمبر ۱۸۳۷ء |
| ۱۱- محمد سلطان | ۱ جمادی الثانی ۱۲۸۹ھ / ۱۱ اگست ۱۸۷۲ء |
| ۱۲- احمد سلطان | ۱۰ شعبان ۱۲۳۹ھ / ۱۱ اپریل ۱۸۲۴ء |

اس فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان شہید کے صرف دو بیٹے شہزادہ یٰسین سلطان (پانچویں فرزند) اور شہزادہ محمد سلطان (گیارہویں فرزند) ۱۸۴۳ء تک بقیدِ حیات تھے - ان شہزادوں کو کلکتہ میں نہایت عزت و احترام اور آرام و آسائش کے ساتھ رکھا گیا تھا - ان میں سے بعضوں نے ادبی اور مذہبی امور میں خاصی دلچسپی لی - غالباً غدر کے بعد انگریزوں نے ان پر سے بہت سی پابندیاں اٹھا دی تھیں یہی وہ زمانہ ہے کہ خانوادۂ سلطان شہید سے مرزا کے مراسم پیدا ہوتے ہیں - اس خاندان کے دو افراد کے نام ہمیں مرزا غالب کے خطوط میں بھی ملتے ہیں - ان میں سے ایک تو اشرف شاہزادگان میسور اعلحضرت سلطان محمد بہادر کا نام ہے - دوسرا سلطان زادہ بشیر الدین میسوری کا ہے - القاب " اشرف شاہزادگان - اعلحضرت سلطان محمد بہادر " ہے - یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ شہزادہ تھا نہ کہ سلطان زادہ - شاید یہی وجہ ہے کہ شہزادہ سلطان محمد کے نام اپنے خط کو مرزا نے عرضداشت کہا ہے - یہ شہزادہ سلطان محمد ٹیپو سلطان



محمد سلطان عرف شہزادہ غلام محمد

شہید کے وہی بیٹے ہیں جن کا نام مذکورہ بالا فہرست میں گیارہ نمبر پر محمد سلطان دیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ مغل شہزادے سلطان کا لفظ اپنے نام سے پہلے لکھا کرتے تھے اور شہزادگان میسور اپنے نام کے بعد مرزا غالب کے دوسرے مکتوب الیہ سلطان زادہ بشیر الدین میسوری ہیں۔ سلطان زادہ بشیر الدین میسوری، سلطان شہید ٹیپو سلطان کے ساتویں بیٹے شکر اللہ سلطان کے فرزند تھے۔

خانوادہ سلطان شہید سے غدر کے بعد کے حالات میں مرزا کا تعلق پیدا کرنا کئی لحاظ سے اہم ہے۔ ایک تو یہ کہ اس زمانہ میں مرزا انگریزوں کی نظر میں مشتبہ تھے اور دستنبو میں مختلف مصلحتوں کے ذریعہ انہوں نے اس کی کوشش کی تھی کہ حکومت برطانیہ کے عتاب سے اس ضعیف العمری میں محفوظ رہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر مرزا کی گزر بسر مشکل تھی۔ اس زمانہ میں مرزا نے ہر طرح کی سیاسی احتیاط سے کام لیا تھا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب انھیں شہزادگان میسور کی علم دوستی کا علم ہوا تو انہوں نے ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کے ان شہزادوں سے بے تکلف خط و کتابت شروع کر دی۔

افسوس ہے کہ مرزا اور شہزادگان میسور میں خط و کتابت کب اور کن حالات میں شروع ہوئی اس کا پتہ نہیں چلتا۔ ہمارا قیاس ہے کہ یہ تعلق ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ پیدا ہوا اور مرزا کے آخری دم تک باقی رہا۔ مرزا کی خط و کتابت سب سے پہلے سلطان شہید ٹیپو سلطان کے پوتے شہزادہ بشیر الدین ابن شہزادہ شکر اللہ سلطان سے شروع ہوئی۔ یہ تعلق خالص ادبی تھا۔ شہزادہ بشیر الدین توفیق تخلص کرتے تھے اور اردو و فارسی نظم و نثر میں خاصی دستگاہ حاصل تھی۔ خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ توفیق اپنا فارسی کلام مرزا سے رجوع کرتے تھے۔

شہزادہ بشیر الدین توفیق میسوری کے نام مرزا کے خطوط اگرچہ بے تکلف ہیں لیکن ایسی عقیدت اور ایسے احترام میں ڈوبے ہوئے ہیں جیسے یہ خطوط کسی برسر اقتدار خاندان کے شہزادہ کو لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط میں مرزا شہزادہ بشیر الدین میسوری کو پیر و مرشد اور بندہ پرور سے مخاطب کرتے ہیں۔ شہزادہ بشیر الدین میسوری کے نام اگرچہ ہمیں کل چھ خط مل سکے ہیں جن میں سے پانچ اردو میں ہیں اور ایک فارسی میں لیکن غالباً مرزا نے ان کے علاوہ اور کئی خطوط شہزادہ بشیر الدین کو فارسی میں لکھے تھے جو نہیں مل سکے۔ ۱۹ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو مولوی نعمان احمد ساکن مہوہ ضلع سیتاپور کے نام غالب اپنے ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں۔

"برسوں سے خطوط فارسی لکھنے چھوڑ دیئے۔ اب شہزادہ بشیر الدین نبیرۂ ٹیپو سلطان مغفور کے سوا کسی کو فارسی خط نہیں لکھتا اور یہ موافق ان کے حکم کے ہے اور وہ مطاع ہیں اور میں مطیع"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان زادہ توفیق میسوری کی یہ خواہش تھی کہ مرزا انھیں فارسی ہی میں خط لکھا کریں۔ توفیق میسوری کے نام مرزا کا ایک ہی فارسی خط ملتا ہے جو غالباً مراسم خط و کتابت کے ابتدائی زمانہ کا ہے۔ اس خط میں غالب نے نبیرہ سلطان شہید کو "جم مرتبہ"، "سلطان محمد آستاں" جیسے القاب سے مخاطب کیا ہے اور اپنے آپ کو، "مورکف دست سلیمان" جیسے انکسار آمیز الفاظ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پورا خط (اردو ترجمہ) درج ذیل ہے۔

بنام سلطان زادہ بشیر الدین میسوری

رباعی

عشق است رخش سرخ گل و نسرین را ؛ وز تیر گمی سپہامہ و پروین را
وزمن کہ گدائے کوچۂ میکدہ ام ؛ جم مرتبہ شہزادہ بشیر الدین را

مورکف دست سلیمان یعنی بندہ کہ سلطان بلند آستاں کا نظر کردہ ہے۔

نوید وصول و بشارت قبول کے ہو پہنچنے پر اس فکر میں پڑا ہے کہ زمانے کو کس قدر آفرین کہا جائے اور قسمت پر کس قدر ناز کیا جائے۔ سلطان کی سپاس گزاری یہ ہے کہ نامہ شرف افزا کا راست ورد ہونا گویا شہر ہما کا سایہ پڑنا تھا کیونکہ اس نے اس غمزدہ کو مصر شادمانی کا فرماں روا بنا دیا بیشک جیسا کہ ہمائے ہمایوں نشاں کا سایہ مرحلۂ آب و گل کا اقتدار ہے یہ تحریر بھی قلمرو جان و دل کے لئے طغرائے دارائی ہے۔ اشعار کا ورق ایک ابر تھا جو دریا دریا موتی موتی برسا رہا تھا۔ اس قدر موتی برسائے کہ قلم میں گوہر معنی کا گنجینہ سما گیا اور یہ زمانہ ہے کہ اگر دانشور سخن کی داد دے تو میدان سخن کی شہسواری نامہ نگار خود ایک زمانہ سے سر سخن سنجی نہیں رکھتا۔ نہ ترازو میں گہر ہے نہ بازو میں زور۔ عمر سبک سیر کے بہترین حصہ کے چھ مرحلے گزر گئے۔ پچاس سال دہلی کے نیک محضروں کے ساتھ مہر ورزی اور عشق بازی کا ہنگامہ گرم رکھا اور اس میں کتنے دوستان یکدل فراہم ہوئے۔ ناگاہ چرخ تیز گردان نے ان پیوندہائے روحانی کو اس طرح قطع کیا کہ رگ جان سے خون بہہ نکلا اور وہ بے شمار عزیز کہ جن کی گنتی نہیں کر سکتا حوادث کی اس تیز بارش اور اس ناسزا کارزار میں باقی نہیں رہے۔ سگ دیکھو چند خستہ تن اور میں کہ مرنے والوں کے داغ سے افسردہ تباہ و بیمردہ ہوں۔ بس جینا ہے اور خستہ حالوں پر خون رونا ہے۔ زمانہ کا مارا ہوا ہوں۔ شہر اور اہل شہر کا ماتم دار ہوں۔ گزشتہ نقوش میں نثر کے تین مرقعے پنج آہنگ، مہر نیمروز اور دستنبو۔ ان میں سے دو جناب والا منظر کی نظر سے گزر چکے ہیں تیسرا بھی تعجب نہیں ہے کہ وہاں پہنچ چکا ہو اور اگر نہ پہنچا ہو تو اس کی رسید سے آگاہ کروائیے۔ اردو شاعری ایک سفینہ سے زیادہ نہیں ہے اردو

اکلیات خود اس قابل نہیں ہے کہ میدان فارسی کے شہسواروں کے سامنے اس کا نام لیا جاسکے۔ رہا کلیات فارسی تو خاطر عالی میں یہ نہ گزرے کہ کلیات فارسی میرے پاس ہے۔ اگر ہوتا تو وہی دیوان مطبوعہ ہوتا کہ وہ کلیات کا آدھا ہے۔ سخن کوتاہ اگر کوئی دستنبو ہے تو یہی گلدستہ رنگ و بو یعنی مجموعہ نظم فارسی اور اگر یہی ہے تو دونوں نسخے یکجا فراہم رکے بھیجے جائیں۔ چشم براہ ہوں کہ کیا فرمان ہوتا ہے۔ اس فقیر کی ہرزہ گوئی کی طلب میں مقدار قیمت کا پوچھنا زبان قلم پر کس لئے آیا۔ نیاز مندان بے نوا کو نوازنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ بے سرمایہ ہوں نہ کہ فرومایہ۔ سخنور ہوں نہ کہ سوداگر۔ موئینہ پوش ہوں نہ کہ کتاب فروش۔ عطا قبول کرنے والا ہوں نہ کہ بہا وصول کرنے والا مردان آزاد جو کچھ شہزادوں کو بھیجتے ہیں وہ نذر ہوتی ہے۔ اور شہزادے جو کچھ آزادوں کو بخشتے ہیں وہ تبرک ہوتا ہے۔ بیع و شری نہیں ہے۔ چوں وچرا نہیں ہے۔ جو کچھ کہ میں نے بھیجا ہے وہ ارمغان ہے اور جو کچھ بھیجوں گا ارمغان ہوگا۔ شبہا شب عید و روزہا روز نوروز بالخیر (ترجمہ)

سلطان زادہ توفیق میسوری کے خط کے ملنے پر مرزا کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ اس کے وارد ہونے کو "شہپر ہما" کا سایہ پڑنے کے مترادف سمجھتے ہیں اور اس کی وصولی سے اپنے آپ کو "مصر شادمانی" کا فرماں روا جانتے ہیں اور سلطان زادہ کے خطوط کو "طغرائے دارائی" کہتے ہیں۔

یہ خط مرزا نے اس وقت لکھا جب بقول اُن کے "عمر سبک سیر کے بہترین حصہ کے چھ مرحلے گزر گئے" گویا یہ خط انہوں نے ۱۸۵۷ء کے اواخر یا ۱۸۵۸ء کے اوائل میں لکھا۔ ممکن ہے کہ مرزا کے علمی مرتبہ اور ان کی شہرت کے پیش نظر سلطان زادہ توفیق نے مرزا کو خط لکھنے میں خود پہل کی ہو اور اس کے جواب میں مرزا کا یہ پہلا خط ہو۔

گویا مرزا نے قیمت لینا پسند نہیں کیا اور سلطان زادہ کے مقام کے اعتراف کے طور پر کتابیں تحفتاً بھیجیں۔

خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان زادہ توفیق کے تعلقات مرزا شہاب الدین خاں ثاقب سے بھی تھے۔ توفیق میسوری نے ایک دفعہ بجائے غالب کو خط لکھنے کے ثاقب کو خط لکھا جس میں مرزا کی بابت کچھ لکھا تھا۔ مرزا پر اس کا بہت اثر ہوا۔ انہوں نے فوراً ایک معذرت نامہ لکھا جس میں اس کا اظہار کیا ہے کہ توفیق کا خط نہ آنے سے جی گھبرا رہا ہے اور جب تک انھیں اپنے خط کا جواب نہیں ملے گا انھیں آرام نہ آئے گا اور خدا اور رسول کے واسطے مرزا نے معافی چاہی۔ توفیق میسوری کا خط وصول ہونے پر مرزا کو جو مسرت ہوتی اور خط نہ ملنے اور ڈاک میں کھو جانے پر جو اذیت ہوتی اس کا اندازہ توفیق کے نام مرزا کے ایک خط کے جملوں سے لگایا جاسکتا ہے۔

"آج منگل ۱۶ جون ۱۸۶۷ء بارہ بجے عنایت نامہ آیا۔ سرنامہ دیکھ کر سفینۂ صبح مراد سمجھا۔ ننگا ایک چھوٹی سی ٹٹی کے پاس بیٹھا ہوا تھا خط پڑھ کر وہ حال طاری ہوا کہ اگر ننگا نہ ہوتا تو گریبان پھاڑ ڈالتا۔"

کہنے کو یہ صرف چند ہی خطوط ہیں لیکن ان میں عقیدت، محبت، لطف و عطا، علمی مباحث، دل کش لطائف مرزا کی علمی زندگی، ان کی تصنیف، ان کے مزاج اور ان کی سوانح کے کتنے ہی گوشے ان چند سطروں میں سموئے گئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان خطوط کا ایک ایک حرف غالبیات کا ایک گنجینہ ہے اور جداجدا طور پر تحقیق و تجزیہ کا مستحق ہے۔ ان میں جو شخصی اور تاثراتی گہرائی ہے وہ سلطان زادہ میسوری سے غالب کی گہری عقیدت کی غماز ہے۔

توفیق، سلطان شہید ٹیپو سلطان کے پوتے تھے۔ مرزا سے ان کے مراسم قائم ہونے کے تقریباً دس برس گزر جانے کے بعد مرزا نے ایک خط بعنوان عرض داشت شہزادہ محمد سلطان کو لکھا۔ اس مراسلہ نگاری میں پہل مرزا ہی نے کی ہے۔ شہزادہ محمد سلطان ٹیپو سلطان شہید کے گیارہویں فرزند تھے جو مارچ ۱۷۹۵ء کو میسور میں پیدا ہوئے۔ شہزادہ محمد سلطان جن کو غالب اعلیحضرت سلطان محمد بہادر لکھتے ہیں۔ عام طور پر شہزادہ غلام محمد کے نام سے علمی دنیا میں معروف ہیں۔ شہزادہ غلام محمد کا انتقال ۱۱ اگست ۱۸۷۲ء کو کلکتہ میں ہوا۔ یہی شہزادہ محمد سلطان ہیں جنہوں نے ۱۸۴۲ء میں اپنے دادا حیدر علی اور اپنے والد سلطان ٹیپو کے عہد کے میسور اور خاندانی حالات پر مشتمل ایک ہزار صفحات کے لگ بھگ تاریخ مرتب کی اور مشن پریس کلکتہ سے چھپوا کر شائع کی۔ یہ کتاب کارنامہ حیدری یا "سیر سروری" یا "ناصر صفدری" یا "تواریخ گذیدہ" کے مختلف ناموں سے محول کی گئی ہے۔ لیکن ان سب میں یہ کتاب "کارنامہ حیدری" ہی کے نام سے زیادہ مشہور ہے اس کتاب میں شہزادہ محمد سلطان کی ایک بہت واضح اور خوبصورت شبیہ بھی شامل ہے جو اپریل ۱۸۴۳ء کو تیار کروائی گئی تھی۔ یہ کتاب شہزادہ محمد سلطان نے اپنے انگریز دوست سر تھامس میڈوک جو کونسل آف انڈیا کے صدر نشین اور بنگال کے ڈپٹی گورنر تھے، کو ہدیتہً پیش کرنے کے لئے لکھی تھی۔ چنانچہ اس کا انتساب بھی سر تھامس میڈوک کے نام ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۸۴۳ء میں اس کتاب کی اشاعت کے بعد شہزادہ سلطان محمد بہادر کی شہرت ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔

مرزا غالب نے بھی اپنی ستر برس کی عمر میں یعنی ۱۸۶۷ء کے اواخر یا ۱۸۶۸ء

کے اوائل میں شہزادہ سلطان محمد بہادر کو خط لکھا اور اپنی تصنیفات بطور پیش کش پارسل کے ذریعہ سے بھیجیں اور یہ چاہا کہ اس سلسلہ جنبانی سے خط و کتابت کا آغاز ہو۔ پتہ نہیں اس سلسلہ جنبانی کا نتیجہ کیا نکلا۔ تاہم اس معاملے میں مرزا کا پورا خط حسن طلب ملاحظہ ہو۔

عرض داشت بہ اسم سامی اشرف شاہزادگان میسور بہ اعلیحضرت سلطان محمد بہادر

رباعی

"سبحان اللہ شان اعلیحضرت ÷ بادشاہ فلک آعلیحضرت
خواہم کہ بر آن عتبہ نہم روی نیاز ÷ در زمرہ بندگان اعلیحضرت

اس سبب سے کہ اس نگارش کا آغاز "تسبیح اسم مقدس باری" ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ عریضہ ذریعہ ہزارگونہ امیدواری ہے۔ ان سب (امیدوں) کے جملہ آنکھیں اس ایک پر لگی ہیں کہ بس فلک زدہ سخنور کو معاف فرمائیں گے اور اس پر عتاب نہیں فرمائیں گے کہ جب وہ میرا روشناس نہیں تو اس نے اندازہ ادب پر نظر کیوں نہیں رکھی اور جس جرأت کے تحت یہ خط لکھا" یقیناً چند ورق دو دو دل کی روشنائی سے سیاہ کیے اور اُن کے نظارے کے لیے کسی والا نظر کی تلاش کی عقل نے خدایگان ہمہ داں (یعنی شہزادہ سلطان محمد بہادر) کی نظرگاہ کی نشاندہی کی اور کہا کہ" اگر پیش کش لے جانے کی تاب نہیں ہے تو سر رشتہ ڈاک سے بھیج" شوق کی گرم خونی نے خرد کی مزید رہنمائی کی اور اس ارمغان کے بھیجنے والے نے دور سے زمین بوسی کی اور آستانہ پر اپنی پیشانی گھسی۔

شادم کہ توی ما تبو ہنگامہ کنم گرم
ورنہ زکجا یافتمی قیصر و جم را

واضح ہے کہ دس سال کی عمر میں موزونی طبع کے آثار نے ظہور پکڑا یہاں تک کہ خبرہ نظر کا تھوڑا سا سرمایہ اکٹھا ہو گیا۔ زبان نے انداز گزارش اور قلم نے آئین نگارش پایا۔ اب جبکہ عمر گزران ستر کو پہونچ چکی خاطر ناشاد میں خیال گزرا پچاس سالہ مسودوں کو لکھوایا اور مصارف طبع کی عدم استطاعت کے باوجود اُن کو چھپوایا اور اُن ہی مطبوعہ نسخوں میں سے ایک نسخہ بہ سبیل پارسل بھیجا۔

عرضداشت اور پارسل کی روانگی کا دن ایک ہی ہے میں سمجھتا ہوں کہ خط پہلے پہونچے گا اور پارسل اس کے بعد۔ اگر پارسل پہنچنے کے بعد خط اور پارسل دونوں کے پہنچنے کی مجھ کو آگہی نہ ہو تو ان کے پہنچنے اور نہ پہنچنے کے بارے میں دو دل رہوں گا۔ مجھ پر اور میرے روزگار پر افسوس یہ ہے کہ صاف جواب نہیں مانگتا۔ یہ آزادی ہے۔ نہیں نہیں یہ تو عریضہ کے جواب کے لیے حسن طلب کا عنوان ہے۔ وجود مسعود خدایگانی کی برکت سے تخت عزوجاہ کا پایہ اورنگ سلیمانی سے برتر رہے۔"

مرزا غالب کے اس خط کے عنوان میں شہزادہ سلطان محمد بہادر کو اعلیحضرت کے القاب سے مخاطب کیا ہے اور ابتدار میں جو رباعی لکھی ہے اس میں ان کو بادشاہ فلک آستاں کہا ہے اور یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ اُن کی بندگی کے زمرہ میں شامل ہو جائیں۔ اور اُن کی چوکھٹ پر اپنا روئے نیاز مندی رکھنا چاہتے ہیں۔

خانوادہ سلطان شہید سے مرزا کے یہ تعلقات کسی صلہ یا ستائش کے لیے نہیں تھے بلکہ قطعاً بے غرضانہ تھے۔ یہ تعلقات سلطان شہید سے مرزا کی عقیدت و محبت کے آئینہ دار ہیں اور اہل میسور اس تعلق پر بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔


ہمارے نہرو ... ۳ روپے ۵۰ پیسے
ہندوستان کی تاریخ ... ۳ روپے ۷۵ پیسے
ہندوستان کی نامور ہستیاں حصہ اوّل ۲ روپے ۲۵ پیسے
ہندوستان کی نامور ہستیاں حصہ دوم ۲ روپے ۵۰ پیسے
ہندوستان کی نامور ہستیاں حصہ سوم ۲ روپے ۵۰ پیسے
سوامی وویکانند ... ایک روپیہ ۵۰ پیسے
مہاتما گاندھی (رنگین تصویروں میں) ۲ روپے ۵۰ پیسے
اچھا شہری ... ایک روپیہ

محصول ڈاک ہمارے ذمہ ہوگا
آج کل کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت دی جائیگی

اُردو کے علاوہ انگریزی ہندی اور تمام علاقائی زبانوں میں کتابیں شائع ہوتی ہیں۔

فہرست کتب طلب کیجئے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی-۱



# آساں نہیں غالب ہونا

فضا ابنِ فیضی

میرے دیدہ ور! آساں نہیں غالب ہونا
بڑی پے چیدہ و دشوار ہیں راہیں اُس کی
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
اُسنہ تو نہیں، ذہن اُس کا نگاہیں اُس کی

وہ سخن شیوہ وہ صورت گر وجدان و شعور
اُس نے لفظوں کو معانی کے خط و خال دیئے
رکھ سکا اپنی تراشوں پہ نہ مرہم، لیکن
غالبِ شعر میں لوح اور قلم ڈھال دیئے

پہلے اتنا تھا کہے عظمتِ فن کا احساس
فکر کو اس نے یہ پہنائی و گیرائی دی
اپنی خاطر نئے معیار تراشے اُس نے
شاعری کو نیا افسوں، نئی رعنائی دی

اس کے پاس آئی تو تخیل کو معراج ملی
اُس کے آہنگ کے کانٹے پہ تُلی صنفِ غزل
گرد گرد اُس کی نگاہوں میں رہا جلوۂ گُل

اس کی گفتار کی موجوں سے دھلی صنفِ غزل

دی "حکیمانہ نظر" اُس نے سخن دانوں کو
معجزہ اس کا ہے اُردوئے معلّٰی کی تراش
بن سکا کون یہاں اس کی ذہانت کا حریف
یہ بداعت یہ بلاغت یہ توازن یہ تلاش

"خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے"
اس کی شوخی میں متانت کے جو پہلو نکلے
کتنی طرّار ہے آرائشِ معنی کی نمود
جیسے اترا کے کسی کنج سے آہو نکلے

گرمیٔ جوشِ قدح سے ہے چراغاں اس کا
اُس کی آشفتگی شبنم میں شرر گھول گئی
آنکھیں ملتے وہ مرے عہد کے فن کار اٹھے
اس کی آواز تو صدیوں کی گرہ کھول گئی

حسنِ اظہار کی یہ شیوہ گری عام کہاں
اک نیا طرزِ بیاں ڈھونڈھ نکالا اس نے
کچھ اُسے دے نہ سکا جز اک جبرِ حیات
اپنے آغوش میں اس دَور کو پالا اُس نے

اپنے "حسرت کدۂ جاں" کا وہ زندانی تھا
اُس کے لہجے میں غمِ زندگی لو دیتا ہے
کر گئی اس کو گداز اس کی برشتہ نفسی
شمع جلتی ہے تو فانوس بھی لو دیتا ہے

اُس کے چبھتے ہوئے تیور کی کھنک میں گھُل کر
اک نئی لَے، نئی آواز، غزل میں اُبھری
ایک بھرپور توانائی معیار لئے
اک نئے عہد کی آواز غزل میں اُبھری

شوخیٔ نغمۂ بیدل کی بہار ایجادی
سامنے اس کے اب آتے ہوئے شرماتی ہے
جو مرے جسم میں ہے شعور و بصیرت کی وہ رُوح
اس کے جذبے کی صداقت کی قسم کھاتی ہے

میرا ہم پیشہ و ہم مشرب و دمساز تھا وہ
بوسۂ لب کی طرح شہد ہیں باتیں اس کی
جس کے بازو پہ کھلیں اس کے سخن کے گیسو
نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی

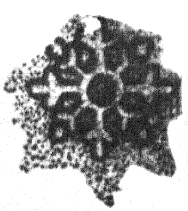

تلمیذ و نیرۂ غالب

# خواجہ فخرالدین حسین سخن دہلوی

**خواجہ** سید فخرالدین حسین سخن تلمیذ و نبیرۂ غالب کے متعلق اب تک جتنے مضامین میری نظروں سے گزرے ہیں وہ نہ صرف قطعی تشنہ ہیں بلکہ تضاد سے بھرپور ہیں۔ تشنگی کا سبب تو یہ ہے کہ کسی نے پوری یکجہتی کے ساتھ سخن کی پوری زندگی کی تفصیل کو جمع کرنے کی کوشش نہیں کی لوگوں کے پاس جو ماخذ ہیں وہ سروش سخن اور دیوان سخن کے علاوہ مرقع فیض مصنفہ صغیر بلگرامی (بنام سلطان مرزا) تنبیہ صغیر مصنفہ سخن (بنام سردار مرزا) اور مخزنۂ جاوید جلد چہارم کا صفحہ ۱۳۹ ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرقع فیض اور تنبیہ صغیر سے بڑھ کر ناقابل اعتماد کوئی کتاب نہیں ہو سکتی اور ساری الجھنیں انہیں کتابوں کو حقیقی ماخذ تسلیم کر لینے سے ہے۔

ستمبر ۱۹۵۵ء کے فروغ اردو کے سہارے عابد علی عابد نے بھی سخن پر کچھ رائے زنی کرنی چاہی لیکن وہ خالی ہاتھ میدان میں کود پڑے تھے۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی مخزنۂ جاوید جلد چہارم صفحہ ۱۳۹ کی بدولت ایک مضمون لکھ سکتے تھے (ملاحظہ ہو نوائے ادب بمبئی جولائی ۱۹۵۰ء) مگر جب انہوں نے لکھا کہ خود سخن کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۹۹ھ تک دہلی میں رہے اس کے بعد لکھنؤ چلے گئے" تو ظاہر ہو گیا کہ انہوں نے مضمون لکھنا ہی اپنا مقصود رکھا ہے انہوں نے سخن کے بارے میں جاننے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔

پاکستان میں ترقی ادب لاہور کی طرف سے اردو کے کلاسیکی ادب کے عنوان سے سروش سخن کا نیا نسخہ ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ اس پر مقدمہ خلیل الرحمٰن داؤدی نے لکھا ہے یہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے معقول ڈھنگ سے سوچنے کی کوشش کی ہے لیکن شاید وہ جفاکوشیوں سے تنگ آ گئے اور نہایت مختصر باتوں کے باوجود مضمون کو تشنۂ تکمیل چھوڑ کر متن کی ادارت میں لگ گئے۔

تنبیہ صغیر کی عبارتوں سے ہی واضح ہے کہ یہ کتاب مرقع فیض سے مشتعل ہو کر لکھی گئی تھی یہی وجہ ہے کہ سردار مرزا کے نام کی مہر کے باوجود کوئی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ یہ سخن کے علاوہ کسی اور کی تصنیف ہے۔ مرقع فیض میں جذبات غضب کی نمائش نہیں ہے۔ اس سے اس کی واقعیت کا دعوٰی ہو سکتا ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ تنبیہ صغیر کی دوسری قسط توضیح مقال تھی اور مرقع فیض کی دوسری قسط محشرستان خیال۔ توضیح مقال کی اشاعت کے بعد صغیر نے تہذیب المقال لکھی۔ یہ کتاب اس قضیہ کی آخری قسط ہے۔ اس میں صغیر صاحب یوں رقمطراز ہیں۔

"بنائے اول گلدستۂ سخندانی ہے جس کے لئے مرقع فیض لکھا گیا، ایک کتاب تنبیہ صغیر لکھ کر شائع کی گئی ہیں نے جواب میں نو جلدوں میں ایک رسالہ لکھا مگر اس کو مشہور نہ کیا کہ تہذیب مانع آئی . . . . ایک رسالہ لکھا . . . اس میں کسی کا نام نہیں جو کوئی چاہے اپنے اوپر ڈال لے"! اس سے یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ مرقع فیض بھی مشتعل ہو کر لکھا گیا ہے اگر ایسا ہے تو گلدستۂ سخندانی کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔

گلدستۂ سخندانی کو پہلی بار جو میں نے شروع سے آخر تک دیکھا تو کہیں پر کسی نقطۂ نظر سے کوئی اشتعال انگیز بات نظر نہیں آئی۔ بادی النظر میں ہر قاری یہی سمجھ سکتا ہے کہ یہ گل دستہ صغیر اور سخن کی مشترک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ سرورق پر جو عبارت ہے وہ اس طرح ہے۔

"الحمدللہ کہ ایں گلشن بے خزاں یعنی اشعار میر فرزند احمد صاحب صغیر بلگرامی شاگرد میر امان علی سحر مرحوم و نظم گہربار جناب مولوی خواجہ سید محمد فخرالدین حسین خاں صاحب بہادر سخن دہلوی تلمیذ رشید جناب نواب اسداللہ خاں غالب

مرحوم ومغفور المعروف یہ گلدستۂ سخندانی باہتمام سید محمد فضل کریم مہتمم مطبع محمدی چھپ کر شائع ہوا۔"

اس اشاعت کے پیچھے ایک کہانی ہے۔ یہ کتاب ۱۲۹۴ھ میں چھپی تھی یہ وہ زمانہ تھا جب پٹنہ میں بڑے اہتمام کے ساتھ کنور سکھراج بہادر رحمتی کی سرپرستی میں مشاعرے ہوتے تھے ۱۲۹۵ھ کے پانچ مشاعروں کے گلدستے تحفۂ انجمن رحمتی کے عنوان سے شائع بھی ہوئے تھے۔ ان مشاعروں میں شاعروں کی جو ترتیب قائم کی جاتی تھی ان میں شاد کو اول درجہ حاصل تھا۔ سخن کا شمار شاد کے بعد تھا جبکہ صفیر کا مقام اساتذہ کی صف میں سب سے نیچے تھا۔ اس کا سبب یہی تھا کہ صفیر بہت زیادہ بگلاتے تھے ممکن ہے یہ خیال رہتا ہو کہ ان کا کلام سننے سے اول شب میں ہی فراغت حاصل کر لی جائے۔ صفیر اس سے آزردہ ہوتے تھے وہ رحمتی جیسے رئیس کی شکایت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ البتہ یہ علی الاعلان کہتے تھے کہ استادی میں ان کا مقام سخن اور شاد سے بلند ہے۔ سخن نے ایک ہی طرح میں کہی ہوئی اپنی اور صفیر کی غزلوں کو یکجا کر کے ایک یکدستہ کی شکل میں چھپوا دیا اور ارباب ذوق میں مفت تقسیم کرا دیا۔ مقصود یہ تھا کہ سخن سنج حضرات خود ہی فیصلہ کر لیں کہ دونوں میں کون بہتر شاعر ہے۔ سب سے پہلی غزل دونوں کی درج کی جاتی ہے۔

## صفیر

جوانانِ مضامیں پر ہے سایہ رب سبحاں کا
بنا طغرائے بسم اللہ ہے تاج اپنے دیواں کا
سراپا بندھ گیا جس وقت مضمونِ قدِ جاناں کا
لقب ہو جائے گا دیوان محشر اپنے دیواں کا
حسینوں نے لیا دل اٹھتے اٹھتے بزمِ عشرت سے
چلا ہے تخت یہ پریوں کے جھرمٹ میں سلیماں کا
الٰہی ہو صفیر خستہ کو حسنِ قبول ارزاں!
رہے منظورِ اربابِ نظر ہر شعر دیواں کا

## سخن

مرا سینہ تجلی گاہ ہے انوارِ یزداں کا
فروغِ داغِ دل خورشید ہے گردونِ عرفاں کا
بہارِ خلد اک کانٹا جنوں میں میرے داماں کا
فضائے لامکاں گوشہ مرے چاکِ گریباں کا
خیال کوچۂ جاناں پہ تفریح کیا کم ہے
کہ ناحق تذکرہ کرتے رہیں گلزارِ رضواں کا
سخن ملکِ سخن میں شاہِ معنی نے کیا جلوہ
ہوا موزوں لقب دیوانِ خاص اب اپنے دیواں کا

## مختصر حالاتِ زندگی

سخن ۱۸۲۹ء میں ۱۰ جولائی کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابھی چھوٹے تھے کہ والدہ نے انتقال کیا اور والد (خواجہ جلال الدین حسین عرف حضرت صاحب سجادہ نشین خانقاہ چشتیہ لکھنؤ) نے لکھنؤ میں دوسری شادی کر لی۔ نانی قلعۂ معلیٰ سے وابستہ تھیں وہیں چودہ برسوں تک ان کی پرورش ہوئی۔ نانی کی طرف سے مرزا غالب سے اُن کی خونی قرابت مندی تھی جس کی وجہ سے وہ غالب کو نانا کہتے تھے اور ان کے ساتھ تمام عمر پرستش کی حد تک عقیدت رکھتے رہے۔ غالب بھی ان پر مشفق و مہربان تھے۔ سخن کی ذہانت کو دیکھ کر غالب نے اُن کی تربیت میں بھی حصہ لیا اور نہ صرف شاعری میں غالب کا تلمذ اُن کو حاصل ہوا بلکہ غالب کی مصنفہ کتابوں کے سمجھنے میں بھی خود مصنف سے استفادہ کا ان کو موقع حاصل ہوا۔ سوانح باقر میں مولوی سید مطاحسین لکھتے ہیں: "خواجہ صاحب (سخن) سے حضرت باقر کی ملاقات ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۸ء) میں شروع ہوئی۔ اس وقت تک حضرت غالب کی تصنیفیں شائع نہیں ہوئی تھیں لیکن خواجہ صاحب ان کے عزیز اور شاگرد تھے اس لئے استاد کی تصانیف کی نقلیں اُن کے پاس تھیں جب آرہ آئے اپنے ہمراہ لائے تھے ۱۲۷۴ھ یا ۱۲۷۵ھ میں حضرت باقر کو خواجہ صاحب سے حضرت غالب کی مہر نیمروز اور دستنبو ملی اور نظر سے گزری۔ اسی زمانہ میں انہوں نے خواجہ صاحب کے پاس اردو اور فارسی کلام کا ایک مجموعہ بھی دیکھا (کلیات نظم غالب فارسی ابھی شائع نہیں ہوئی تھی۔)"

۱۲۶۹ھ میں جب اُن کی نانی کا انتقال ہو گیا تو وہ دہلی سے لکھنؤ اپنے والد کے پاس چلے آئے۔ یہاں سوتیلی ماں سے نباہ نہ ہوا تو مشفق چچا خواجہ بشیر کے پاس چلے آئے۔ فارسی ادب کی تکمیل انہیں سے کی۔ عہد واجد شاہی میں خواجہ بشیر مہتمم فوجداری کل ممالک محروسۂ اودھ تھے۔ ۲ مارچ ۱۸۵۶ء کو جب واجد علی شاہ جلا وطن کر دیئے گئے تو خواجہ بشیر بھی اپنے عہدہ سے برطرف کر دیئے گئے۔ انہیں دنوں مرزا ابراہیم جو سخن کے حقیقی چچو پھا تھے لکھنؤ گئے ہوئے تھے انھیں کے ساتھ یہ بھی آرہ چلے آئے۔ فوراً ہی ۱۸۵۷ء کا انقلاب رونما ہوا۔ سخن کی پرورش قلعۂ معلیٰ میں ہوئی تھی اس لئے آرہ میں یہ صلاح ٹھہری کہ جب تک حالات ناسازگار رہتے ہیں، انھیں روپوش رکھا جائے۔ مرزا ابراہیم

کے والد مرزا صدیق سارن میں صدر اعلیٰ کے عہدہ پر فائز تھے۔ انہوں نے اپنی وفاداری سے ارباب حکومت کا دل جیت لیا تھا اس لئے زیادہ دنوں تک سخن کو گوشہ نشیں رہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ۱۷ رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ مطابق ۲۲ مئی ۱۸۵۸ء کو سخن کا عقد مرزا ابراہیم کی بڑی صاحبزادی تحفہ بیگم سے ہوگیا۔

شعرائے آرہ میں مولوی باقر علی باقر سے سب سے پہلی ملاقات ۱۲۷۴ھ میں ہوئی۔ مولوی باقر ایک خدا ترس اور عابد و زاہد انسان تھے وہ علم دین میں خصوصی درک رکھتے تھے۔ سخن اگرچہ رند مشرب تھے لیکن مولوی باقر کی صحبت کے اثر سے وہ حضرت قیام الصدق چشتی کے مرید ہوگئے۔ مرقع فیض کی روایت کے مطابق ۱۲۷۵ھ میں سخن اور صفیر کا تعارف ہوا۔ سخن نے ۱۲۷۶ھ میں سروش سخن کی تصنیف کا کام تمام کر دیا تھا۔ باقر نے پوری داستان بالاستیعاب پڑھ کر تاریخ تصنیف لکھی تھی "زہے سرچشمہ حسن و لطافت"۔ سخن کے ہی توسط سے حضرت باقر نے ۱۲۷۶ھ میں مرزا غالب سے باضابطہ تلمذ اختیار کیا۔

۱۰ جولائی ۱۸۶۱ء کو سخن سینئر پلیڈر کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور ۴ ستمبر سے وکالت شروع کرنے کی ان کو اجازت مل گئی۔ وکالت کے پیشہ میں ان کو کوئی کامیابی نہیں ملی اس لئے وہ ملازمت کی طرف مائل ہوئے ایک قصیدہ شاہ آباد کے ضلع مجسٹریٹ مسٹر جی الیف بلگرلڈ کی خدمت میں صنعت توشیع میں پیش کیا جو سروش سخن کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۷۱ء میں صفحہ ۲۳ر ۲۲ر ۲۱ر پر درج ہے پہلا مطلع اور مقطع یہ ہیں۔

جوش پر ابکے جنوں خیز وہ آئی ہے بہار
نکہت گل سے ہوا نشۂ جام سرشار
دل گرگاہ خیال سخن آرائی ہے
اب سنے مطلع نو باعزد وقار

دوسرا مطلع

اے شہ تخت نشیں اے مہ خورشید عذار
فیض سے تیرے ہوا سارا جہاں پُر انوار

آخری شعر:

تو سلامت رہے دنیا میں بعد جاہ و حشم
ترے احباب رہیں شاد ترے دشمن خوار

نومبر ۱۸۶۲ء سے دسمبر تک دو مہینوں کے لئے خواجہ صاحب نے ایک عارضی جگہ پر منصفی کی خدمت انجام دی لیکن باضابطہ تقرر کی صورت نہ نکلی تو وہ خواہشمند ہوئے کہ ان کو لکھنؤ میں جاکر وکالت کرنے کی اجازت دی جائے۔ اپنے موافق فضا کا جائزہ لینے کے لئے وہ ۱۸۶۴ء میں لکھنؤ پہنچے۔ وہیں رہ کر سروش سخن کی طباعت مطبع نولکشور میں کرائی اُن کے چچا خواجہ بشیر نے "گل گلستان بے خزاں" سے اس کی طباعت کی تاریخ نکالی قطعہ کا آخری شعر یوں ہے ؎

۱۲۸۱ھ
بصد اے ہاتف خوش بیاں پئے سال یافتہ ام نشاں
گل گلستان بے خزاں شدہ طبع سال برائے آں

اس کے علاوہ آٹھ اور شاعروں کے قطعات تاریخ طباعت موجود ہیں

سخن کو ۱۸۶۶ء میں اودھ کی عدالتوں میں وکالت کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس وقت برہان قاطع اور قاطع برہان کی بحث زور پر تھی مولوی احمد علی اور ان کے شاگرد مبدالصمد فدا کے مقابلہ پر سخن اور باقر خم ٹھونک کر بھڑے ہوئے تھے غالب کے پاس ان کی ایک ایک تحریر پہنچتی رہتی تھی۔ غالب ہر چہار طرف کے یلغار سے بوکھلا گئے تھے لیکن ان دونوں دور افتادہ شاگردوں کی وفاداری سے دلی طمانیت محسوس کر رہے تھے۔ سخن نے ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ میں ہنگامۂ دل آشوب حصہ اول اور حصہ دوم کے عنوان سے سارے قطعوں اور جوابوں کو جمع کر کے منشی سنت پرشاد کے مطبع واقع آرہ سے شائع کرا دیا۔ اسی میں جوشمس لکھنوی کو سخن نے جواب دیا ہے تو اپنے صاحب دیوان ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ غالب سے اپنے دیوان کے لئے تقریظ بھی اسی وقت لکھوائی ہوگی۔ تنبیہ صفیر میں بھی یہی کہا ہے کہ ۱۲۸۲ھ تک دیوان مکمل ہو چکا تھا۔

۱۸۷۰ء میں سخن منصف سوم کے عہدہ پر فائز ہوئے ۱۸۷۱ء کی مئی میں انہوں نے تہذیب النفوس حصہ اول کی تالیف کا کام شروع کیا ۱۸۷۲ء میں یہ کتاب چھپ کر بازار میں آئی اور ڈائرکٹر تعلیمات صوبجات مغربی و شمالی ہند (یوپی) نے اس کو نصاب تعلیم میں داخل کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ دو برسوں کے بعد دوسرا حصہ بھی چھپ گیا اور محکمہ تعلیمات میں اس کو بھی وہی مقبولیت حاصل ہوئی۔

۱۲۹۴ھ سے ۱۲۹۶ھ تک صفیر اور سخن کے معرکے گرم رہے پھر خود سخن ٹھنڈے پڑ گئے ؎

معرکہ جب ہوگیا ہے اے سخن
فکر سے حال سخنداں کھل گیا

سخن ۱۸۶۲ء سے ۱۸۸۸ء تک ہزاری باغ میں منصف اول کے عہدہ پر رہے۔ یہاں شاعروں کی سرگرمی کا امکان تھا اور نہ علمی اور ادبی مباحث۔ سو اقع تھے اس سے سخن آزردہ تو ہوئے۔ لیکن یہاں رہ کر انہوں نے اپنی آگہی کی استعداد بڑھالی یہیں رہتے ہوئے ان کی زوجۂ اول تحفہ بیگم کا انتقال ۱۸۸۸ء ہوا اور ۱۸۸۶ء میں دیوان کی طباعت سے فارغ ہوئے۔

درجہ سوم کے صدر اعلیٰ ۱۸۹۲ء میں ہوئے اور ۱۸۹۵ء میں ان کو درجہ اول کے اختیارات حاصل ہو گئے۔ اس وقت وہ گیا کی عدالت میں تھے۔ یہاں انہوں نے تہذیب النفوس کے تیسرے حصہ کی تالیف کا کام شروع کیا۔ جولائی ۱۸۹۶ء میں ان کے ریٹائر ہونے کا وقت آگیا لیکن ضلع جج مسٹر ایچ پالموو ڈ کی پُرزور سفارش کی وجہ سے ان کی ملازمت کی مدت میں ایک سال کی توسیع ہو گئی۔

بہرحال ۱۸۹۷ء کی پہلی اگست کو وہ ریٹائر ہو چکے تھے اب بحیثیت پنشن یافتہ صدر اعلیٰ پٹنہ میں مقیم ہو گئے۔ ۱۸۹۸ء میں تہذیب نفوس تیسری جلد شائع ہوئی اور یوپی کے انٹرنس کے امتحان کے نصاب میں داخل ہو گئی۔

سخن ۱۹۰۱ء مطابق ۱۳۱۸ھ میں اپنے دولت کدہ واقع پٹنہ سیٹی میں اس دار فانی سے رخصت ہو گئے اور مشہور شاعر اشکی کے پہلو میں دفن ہوئے۔

سخن کے تصانیف میں دیوان اور تہذیب النفوس بہت ہی کمیاب ہیں۔ اگر ان کی مستقبل قریب میں کوئی اشاعت نہ ہوئی تو ان کے نایاب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

سخن کی تصنیفات

۱۔ سروش سخن (داستان بجواب فسانۂ عجائب)
۲۔ دیوانِ سخن
۳۔ تہذیب النفوس۔ تین جلد
۴۔ تنبیہ صغیر
۵۔ توضیح المقال
۶۔ گلدستۂ سخندانی

پس ماندگان:۔ پہلی بیوی تحفہ بیگم کے بطن سے شادی ۱۸۵۸ء

(۱) دختر (زوجہ مرزا محمد سعید آروی (۲) خواجہ محی الدین پیدائش ۱۸۶۴ء
(۳) خواجہ سراج الدین پیدائش ۱۸۷۵ء وفات ۱۹۲۴ء
(۴) سردار بیگم متوفی ۱۹۰۵ء (۵) محمودہ بیگم متوفی ۱۹۳۲ء

(۶) دوسری بیوی دختر بخت علی کے بطن سے (شادی ۱۸۹۰ء)

(۱) خواجہ معین الدین (۲) خواجہ رضی الدین (۳) خواجہ حمید الدین (۴) خواجہ حفیظ الدین (۵) عمدہ بیگم زوجہ شاہ محمد یعقوب مونگیر (۶) زوجہ خلیل احمد ریٹائرڈ چیف جسٹس اڑیسہ

# سات نظمیں



حسن نعیم

(۱)

شہر یار وقت کا یا عشق کا حملہ ہوا
باوفا لوگوں کا گھر ہر دور میں لوٹا گیا

(۲)

یہ غنیمت ہے کہ سر ہے زیر مہر و ماہتاب
آندھیاں اُٹھیں تو خیمہ ناچ گا کر اُڑ گیا

(۳)

کچھ خطوطِ دست میں تھا کچھ کتابِ نجم میں
جو نہ ہونا تھا وہ اپنے پاس تھا لکھا ہوا

(۴)

اُن کی حسرت بھی وہی تھی جو تھی اپنی آرزو
اتفاقاً ایک دن اس بات کا شبہ ہوا

(۵)

اس کی اپنی طول عمری کس قدر بے کیف تھی
وہ مرا تو کن دھنوں میں رات بھر باجہ بجا

(۶)

جب ہوا میں رقص کرتی جا رہی تھی اک پتنگ
جانے کس کے دل کا ٹکڑا چھت سے گر کر مر گیا

(۷)

کس طرح قطبین ملتے، مل گئے پھر بھی حسنؔ
حُسن کا اُن کو نشہ تھا، عشق کا مجھ کو نشہ

# بلور کا بنا ہوا آدمی

## (مولانا آزاد کی کچھ یادیں)

خواجہ احمد عباس

**مولانا** آزاد کا نام تو ہم بچپن سے سنتے آئے تھے۔ اُن کے بارے میں مشہور تھا کہ چودہ برس کی عمر میں وہ مکّہ سے عربی، فارسی، فلسفہ اور دینیات کی مذہبی تعلیم پوری کر کے اور عالم کی پگڑی بندھوا کر ہندوستان آ گئے تھے اور اٹھارہ بیس برس کی عمر میں "الہلال" اور "البلاغ" جیسے مشہور اُردو اخباروں کے ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ اِن اخباروں کے سیاسی مضامین نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دُنیا میں پڑھے جاتے تھا۔

مولانا کے بارے میں اتنی باتیں اتنے برسوں سے سنتے آ رہے تھے کہ اُن کی تصویر جو ہم نے اپنے دماغ میں بنا رکھی تھی وہ یہ تھی کہ لمبی سفید داڑھی ہے اُن کی، اُونی جبوں قسم کی عبا قبا پہنے ہیں اور سر پر مولانا وں کی شاندار سفید پگڑی ہے۔



ایک بار طالب علمی کے زمانے میں سوجھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو سے ملاقات کی جائے۔ سو ہم علی گڑھ سے خورجہ چلے گئے تاکہ دہلی سے الہ آباد جاتے ہوئے پنجاب میل میں ہم پنڈت جی کے درجے میں چڑھ جائیں اور علی گڑھ تک اُن سے باتیں کرتے جائیں۔ فرسٹ کلاس کا درجہ تھا اور اُس میں پنڈت جی کے علاوہ ایک اور صاحب تھے۔ کھدر کا کرتا پاجامہ، کھدر کی شیروانی، سر پر قراقلی ٹوپی۔ ازحد گورے چہرے پر ایک فیشن ایبل فرنچ کٹ کھچڑی داڑھی۔

پنڈت جی نے کہا۔ "بھئی ان سے ملو۔ یہ مولانا آزاد ہیں۔"

ہم سب نے بڑے ادب سے مولانا کو سلام کیا اور اُن کے سامنے قاعدے سے خاموش بیٹھ گئے حالانکہ ہم پنڈت جی سے بڑی بے تکلفی سے بات چیت کرتے تھے جیسے وہ ہماری ہی عمر کے نوجوان ہوں۔

پنڈت جی نے یہ بات بھانپ لی اور کہا۔

"بھئی مولانا آزاد سے مت گھبراؤ۔ دراصل اُن کی عمر تقریباً وہی ہے جو میری ہے۔ صرف لوگوں پر رعب جمانے کے لئے انہوں نے داڑھی رکھ چھوڑی ہے۔"

اور اس پر سب ہنس پڑے اور مولانا بھی بے اختیار مسکرا دیئے اور اُس کے بعد ہم باتیں کرتے رہے، پنڈت جی سے سوال و جواب ہوتے رہے بے تکلفی کے ساتھ جیسے کوئی اپنے ساتھی سے بات چیت کرتا ہے کچھ سوال مولانا سے بھی کئے۔ مگر اس طرح جیسے کسی عالم سے، پروفیسر سے گرو سے سوال پوچھتا ہے، بڑے ادب کے ساتھ۔

اور مولانا بھی ہمیں جواب دیتے رہے، سمجھا کر جیسے چھوٹوں کو سمجھاتے ہیں۔ وہ ہر بات کہنے سے پہلے "میرے بھائی" ضرور کہتے تھے۔ "میرے بھائی یہ تو صحیح ہے"۔ "میرے بھائی یہ تو سراسر غلط ہے"۔ لیکن انداز اُن کا ایسا ہی تھا جیسے مبر پر بیٹھے وعظ کر رہے ہوں یا کالج میں کرسی پر بیٹھے لیکچر دے رہے ہوں اور ہم اُن کے سامنے بیٹھے ہوئے طالب علم ہوں۔

ہم پنڈت جی سے باتیں کر رہے تھے اتنے عرصے میں مولانا قریب رکھی ہوئی پھلوں کی ٹوکری میں سے سیب نکال کر اُن کو ایک خوبصورت ہاتھی دانت کے دستے کے چاقو سے چھیلنے لگے۔ ہم کن انکھیوں سے اُن کی طرف بلکہ سیب کی طرف دیکھ رہے تھے منہ میں پانی آ رہا تھا لیکن دیکھتے دیکھتے ہم نے یہ محسوس کیا کہ مولانا قاعدے سے اور بڑی نفاست سے سیب چھیل رہے تھے۔ کاٹ کر انہوں نے چاقو کی نوک پر لگا کر ایک ٹکڑا پنڈت جی کی طرف بڑھایا جس پر پنڈت جی نے کہا کہ یہ تو ڈومینین اسٹیٹس ( Dominion Status ) ہے جو سنگین کی نوک پر رکھ کر انگریز ہمیں دینا چاہتے ہیں! مولانا نے برجستہ جواب دیا۔ "سنگین کی نوک سے ہاتھ بچا کر سیب کا ٹکڑا لیجئے۔"

ایک بار شملہ کانفرنس کے موقع پر جب مولانا کانگرس پریذیڈنٹ تھے میں نے کہا آپ کا ایک انٹرویو چاہیے۔ بولے "میرے بھائی پھر تو سویرے پانچ بجے آنا پڑے گا آپ کو؟" پانچ بجے صبح وہ بھی شملہ میں! پھر بھی میں کسی نہ کسی طرح وقت پر پہونچ ہی گیا۔ دیکھا کہ مولانا نہائے دھوئے برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ فوراً میرے لئے بھی چائے بنائی۔ دونوں پیالیوں میں نہ دُودھ نہ شکر۔ صرف سنہری رنگ کی سبز چائے۔

میں نے پوچھا "مولانا۔ آپ چائے میں دُودھ نہیں ڈالتے؟"

کہنے لگے "دُودھ سے چائے کا رنگ خراب ہو جاتا ہے۔"

اور میں نے کہا "اور شکر؟"

وہ بولے "اس سے چائے کا مزا خراب ہو جاتا ہے۔ چائے پینی ہے تو کسی ملاوٹ کے بغیر صاف شفاف چائے ہی پینی چاہیئے۔"

یہ اُن کا مسلک چائے ہی کے بارے میں نہیں تھا۔ اُن کی زندگی کا فلسفہ بھی یہی تھا کہ سیاسی زندگی ہو یا ذاتی زندگی اُس میں مکر، جھوٹ، کھوٹ ملاوٹ، ریاکاری، فریب کا دخل نہ ہونا چاہیئے۔

مولانا کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی یہی نفاست اور وضعداری تھی۔ اتنا صاف شفاف آدمی میں نے اور نہیں دیکھا جب بھی ملو لگتا تھا کہ ابھی ابھی نہا دھو کر نکلے ہیں۔ یہ صفائی اور نفاست جسم یا شریر کی ہی نہیں دل کی آتما کی بھی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ آدمی گوشت پوست کا نہیں بلور کا بنا ہوا ہے جس میں سے علم کا نور اور گیان کی روشنی جھلکتی ہے●

## ندا فاضلی

چار چھ دن میں
میری آنکھوں نے
پی لیا اس کے پورے چہرے کو
وہ بھی شاید مری طرح مجھ کو
اپنی آنکھوں سے پی چکا ہوگا
وہ بھی بے چہرہ
میں بھی بے چہرہ
صرف آنکھوں کے خول باقی ہیں
جن کے اندر جمی ہوئی آنکھیں
بس یونہی چند بار دیکھیں گی۔
اور پھر رفتہ رفتہ
کچھ دن میں
یہ بھی اک دوسرے کو پی لیں گی



کتنے دن بعد ملے ہو
چلو اس شہر سے دُور !!
کسی پربت کے کنارے
کسی جھرنے کے قریب
ٹوٹتے پانی کو پی کر دیکھیں
بھاگتے دوڑ لمحوں سے چرا کر کچھ وقت
صرف اپنے لئے جی کر دیکھیں
کوئی دیکھے نہ ہمیں
کوئی نہ سنتے پائے
تم بھی جو چاہے کہو
میں بھی بلا خوف و خطر
ان سبھی لوگوں کی تنقید کروں
جن سے مل کر مجھے ہر روز خوشی ہوتی ہے۔

# شاد عارفی

## ایک مطالعہ

بلراج کومل

**شاد عارفی** کے نام کے ساتھ آج تک ان کا ایک مخصوص کردار وابستہ رہا ہے اور شاد عارفی کے مداحوں، دوستوں اور اُن کے کلام کا مطالعہ کرنے والے اکثر لوگوں نے شاد عارفی کو عام طور پر اس مخصوص کردار کے چوکھٹے میں رکھ کر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے ذہنوں میں شاد عارفی کی ایک غیر حقیقی تصویر مرتب ہوگئی ہے۔ یہ غیر حقیقی تصویر کچھ اس قسم کی ہے ۔ شاد عارفی بہت بڑے طنز نگار ہیں، وہ سماجی برائیوں کو اپنے تیز و تند نشتر کا نشانہ بناتے ہیں، ان کی طبیعت میں برہمی اور جھنجھلاہٹ کے عناصر غالب ہیں وہ اخلاقی زوال کے نوحہ خواں ہیں، وہ ہماری قومی سماج کے ناسوروں اور اس کے گلے سڑے عناصر پر مرکوز کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کا اسلوب لاثانی ہے۔ اُن کی زبان و بیان پر قدرت بے مثال ہے وغیرہ وغیرہ۔

مندرجہ بالا جملوں میں سے قریب قریب ہر جملہ اپنی اپنی جگہ صحیح ہو سکتا ہے لیکن شاد عارفی کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ ان کا طنز نگار کا رول نہایت مشکوک ہے اور محض اسلوب کا لطف اور چٹخارہ ہے اس دعوے کو ثابت کرنے سے پہلے میں اپنی پوزیشن کو مختصراً واضح کرنا چاہتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ انسان چونکہ سماجی جانور ہے اس لئے اس کی فکر پر اس کی نجی اور سماجی زندگی اثر انداز ہوتی ہے اور اس کے کردار کی تشکیل کرتی ہے۔ اس کا ردِ عمل اثر اندازی اور تشکیل کے عمل میں جنم لیتا ہے۔ شاعر بھی چونکہ انسان ہے اس لئے اس اصول کی زد سے باہر نہیں ہے لہٰذا اس کا کلام نجی اور سماجی ردِ عمل کی پیداوار ہے لیکن میں اپنے عقیدے کو تنقیدی معیار کے طور پر استعمال کرنا نہیں چاہتا ہوں شاد عارفی کے سلسلہ میں یہ احتیاط اس لئے ضروری ہے کیونکہ ان کا مقبول عام Image امیج ان کی Legend کا پروردہ ہے حقیقی نہیں ہے۔ طنز نگار، مزاح نگار، صاحب اسلوب وغیرہ الفاظ اور اصطلاحات کو تھوڑی دیر کے لئے بے مصرف سمجھ کر میں الگ رکھ دینا چاہتا ہوں۔ تاکہ شاد عارفی سے ملاقات کرتے وقت میرے اور اُن کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ ہو۔

شاد عارفی آخر کیا چاہتے ہیں؟ اُن کو کون سی باتیں اور قدریں عزیز ہیں؟ اُن کے غصے اور جھنجھلاہٹ کا منبع کہاں ہے۔ میں ان غیر شاعرانہ سوالوں سے اپنے اس مختصر مطالعے کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ شاد عارفی کے کلام میں ان سوالات کے "جوابات" دو مختلف اور متضاد سطحوں پر موجود ہیں پہلی قسم کے جواب، کی مثال ان کی نظم "نصف بہتر" ہے۔ شاد عارفی اپنی بیوی کے طور پر وہ عورت پسند کرتے ہیں جو مغربی طرز زندگی کی خلاظتوں سے پاک ہو۔ معمولی طور پر خواندہ ہو۔ گھر گرہستی کے کام کو اپنی مکمل زندگی سمجھتی ہو اور شاد عارفی کے اپنے الفاظ میں: "ذہن آزادی بے باک سے قطعاً خالی ہو" اس قسم کی بیوی صرف ایسے گھروں سے دستیاب ہو سکتی ہے جہاں لڑکیوں کو ہر قسم کے خارجی اثرات سے محفوظ رکھا گیا ہو اور لڑکیوں نے ہر قسم کے ضبط کو بخوشی قبول کر لیا ہو۔ یہ آدرش صورتِ حال ہے لیکن یہ آدرش صورتِ حال غیر حقیقی ہے اور شاد عارفی کا Obsession ہے اس لئے ان کی تمام مصیبتوں کا منبع ہے۔

شاد عارفی کا دوسرا جواب "گنگا اشنان" کے شاعر کا ہے۔ یہ انسان کا جواب ہے۔ یہ جواب "گنگا اشنان" کے علاوہ "دسہرا اشنان"، "واپسی"، "فروز"، "دیوالی"، "بسنت"، "نظم" اور "شکار ہاے" میں بڑے حسین اور دلفریب شاعرانہ مذہبے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ شاد عارفی کے دوسرے "جواب" کا تجزیہ میں بعد میں پیش کروں گا۔ ان کے مقبول عام جواب کا تجزیہ غالباً ان کے دوسرے جواب، کو صحیح پس منظر میں پیش کر سکتا ہے۔

شاد عارفی سماج کے جس طبقے کا عام طور پر ذکر کرتے ہیں وہ عرفِ عام میں "نام نہاد شریفا" کا طبقہ کہلاتا ہے۔ شاد عارفی کی شاعری میں یہ طبقہ ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرتی مشکلات اور تضادات کا مظہر ہے۔ اس طبقے کے مسائل شاد عارفی کی شاعری میں بار بار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ میاں بیوی کا مسئلہ اور غیر ازدواجی جنسی تعلقات کا مسئلہ۔ شاد عارفی کو احساس ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا وہ طبقہ جو اخلاقی بحران کا شکار ہے یا تو اقتصادی طور پر پچھڑا ہوا ہے یا اقتصادی فارغ البالی کی خلاظتوں سے آلودہ ہے۔ شاد عارفی اپنے پورے طنزیہ کلام میں یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ وہ 'لذتِ گناہ' کے خلاف ہیں یا 'عذابِ گناہ' کے خلاف ہیں۔ وہ مسلمانوں کے اخلاقی نظام کو معاشرے کے لئے مکمل سمجھتے ہیں اور اس نظام سے انحراف کے تمام مظاہر کو ہدف بناتے ہیں حالانکہ اخلاقی نظام چاہے مسلمانوں کا ہو یا ہندوؤں کا یا کسی اور مذہب کا زیادہ تر اقتصادی مجبوریوں کے تابع ہوتا ہے۔ مسلمان گھرانوں کی لڑکیاں اگر تعلیم حاصل کر لیں،

آزادی سے سماج کے دُوسرے لوگوں سے ملیں اور اپنی مرضی سے شادی کرلیں تو وہ یقیناً کسی اخلاقی جرم کا ارتکاب نہیں کرتیں، محض انتقادی فارغ البالی سے فیض یاب ہوکر سماج کا مفید عنصر بننے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ گھٹا ہوا معاشرہ جس کی پیداکی ہوئی حیا کی پتلی، وفاشعار، نصف بہتر، شاد عارفی کو پسند ہے دراصل ان تمام غلاظتوں کو پیدا کرتا ہے جو شاد عارفی کو سمت ناگوار گزرتی ہیں اور جن کے خلاف وہ مسلسل اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتے ہیں۔

غیر ازدواجی تعلقات، اغوا، کھوکھلی اخلاقی اقدار بذاتِ خود قطعی طور پر اہم نہیں ہیں۔ ان کی اہمیت صرف اس لئے ہے کیونکہ اُن سے معاشرے کی مخصوص صورتِ حال پر روشنی پڑتی ہے۔ شاد عارفی اصل مرض کو اپنی توجہ کا مرکز بنانے کی بجائے ظاہر پر اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں اس لئے اُن کا طنز نگار کا رول بنیادی سطح پر ہی مشکوک اور کمزور ہوجاتا ہے۔ مزید یہ کہ وہ جن باتوں کے خلاف ہیں ان کو پسند بھی کرتے ہیں اور ان کا ذکر بڑے چٹخارے سے کرتے ہیں۔ ان کا غم وغصہ حقیقی ہوتے ہوئے بھی غیر حقیقی محسوس ہوتا ہے اور محض اسلوب کا انتظام نظر آتا ہے۔

میں شاد عارفی کے عام Obsessions میں سے صرف دو کا ذکر کروں گا۔ غیر ازدواجی جنسی تعلقات کا ذکر ان کے اعصاب پر سوار ہے۔ وہ غیر ازدواجی جنسی تعلقات کا ذکر نہ صرف بار بار کرتے ہیں بلکہ چٹخارے سے کرتے ہیں۔ ان کا دوسرا Obsession یہ ہے کہ ہر وہ عورت جو دلکش یا کسی حد تک نیم عریاں لباس میں رہ گزر پر یا میلے یا نمائش میں نظر آتی ہے، رنڈی یا بیسوا ہے اور اخلاقی گراوٹ کی کسی انتہائی صورتِ حال کی مظہر ہے۔

شاد عارفی کے پہلے Obsession کی کچھ مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

ہفتہ بھر میں اک دن "ایسی لغزش" عیب نہیں
ظاہر ہے پاپا، مامی کو حاصل علم غیب نہیں
کالی راتوں کی باتوں سے واقف "صبح وشام" نہیں

جانتی ہوں گھبراتے کیوں ہو کیا اندھیاری گھور نہیں
دو دلِ راضی کے بارے میں قاضی کا کچھ زور نہیں
لو۔ یہ دس کا نوٹ تمہاری اُجرت ہے انعام نہیں
(شوفر)

بڑی ماسٹرنی . . . . ہے شوفر کی . . . وہ
سپیدہ . . . غلام مکرّر کی . . . . وہ
سکندر کی یہ ہے ۔ مہندر کی . . . وہ
یہ خلاصنیں . . . . سارے دفتر کی . . . وہ
(نمائش ۱)

"ہمہ تن خلق واطاعت ہے مری گھر والی
کل جو موقعے کی نزاکت سے کھلی شہ پالی
بام پر جاکے ذرا دیر ہوا کھا آؤں
اور پھر پیٹ کا ہلکا نہیں، کمرہ خالی
(سالی)

غیر ازدواجی جنسی تعلقات کا ذکر شاد عارفی کے ہاں زیادہ تر نظموں میں ملتا ہے۔ مندرجہ بالا نظموں کے علاوہ یہ ذکر 'نمائش ۱'، '۲'، '۳'، '۴'، 'کشمیری بھکارن'، 'مال روڈ'، 'مرے محلے کے دو گھرانوں سے ہے گناہوں کا فیض جاری'، 'مال زادیاں اور دلال' غمازہ، ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے'، 'مرید کی بیوی'، 'مہترانی اور دعویٰ اور خان صاحب کے مکالمے میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ غیر ازدواجی تعلقات کے محرموں میں سالی، بیوی، سالی، سلہج، مہترانی، ملازمہ، ملازم، شوفر، بھکارن، بیرا، افسر کی بیوی، ماتحت کی بیوی وغیرہ وغیرہ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ شاد عارفی کے اس کلام کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس سماج کے اخلاقی زوال کے وہ نوحہ خواں ہیں بکل طور پر جنسی بے راہ روی کا شکار ہوچکا ہے۔ مجھے غیر ازدواجی تعلقات کے ذکر پر قطعاً اعتراض نہیں کیونکہ طنز نگار کے طور پر شاد عارفی کا فرض ہے کہ وہ سماجی غلاظتوں کی عبرت ناک تصویر پیش کریں۔ مجھے اعتراض اس بات پر ہے کہ ان کا غم وغصہ غیر حقیقی ہے۔ ان کی اصل مشکل ان کی محرومی ہے۔ اس لئے جنسی تعلقات یا فعل کی تفصیل جہاں بھی ان کے کلام میں آتی ہے چٹخارے کا واضح عنصر اُبھر کر سامنے آجاتا ہے اور ان کے طنزیہ کردار کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ دو مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

کروٹیں سی کروٹیں بستر پہ میرے سامنے
اور ٹھنڈے سانس ہر ہر بار تیرے سامنے
ہونٹ دانتوں میں دباکر آنکھ دے کر بار بار
چاہتی تھی مجھ سے تنہائی میں قرب ناگوار
تیز بوسوں کے لئے پیاسے ارادے بے قرار
(غمازہ)

سناؤں کیا وہ کیا ساعاتِ رنگین محبت تھے
مجسم رونقِ شمع مجسم تھی جہاں میں تھا
قدِ بالا پہ "باڈی"، اور پیٹی کوٹ نارنجی
مگر سورج مکھی سروِ چراغاں تھی جہاں میں تھا

محبت دلنواز و حسن محو ناز برداری
جفائے ہر حسیں افواہِ عریاں تھی جہاں میں تھا
(وہ کافرہ)

شاد عارفی کے کلام میں "باڈیوں" کا ذکر کئی مقامات پر ہے۔ میں نے دوسری مثال شاد عارفی کے سلسلے میں ایک نکتہ ثابت کرنے کے لئے پیش کی ہے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ وہ رومانی محبت، جنسی محبت، اور غیر ازدواجی جنسی تعلقات اور زندگی کی سبھی لذتوں کو پسند کرتے تھے۔ جوں جوں وہ اس سے محروم ہوتے گئے ان کی تلخی میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ اس Pretence کو حقیقی سمجھنے لگے جو نہایت سطحی، غیر حقیقی اور بے کار تھا۔ وہ نہ تو مجسم اخلاق تھے نہ مصلح قوم و ملت، صرف شاعر تھے۔ ان کے شاعرانہ کردار کا حقیقی جلوہ ان کے طنزیہ کلام میں نہایت مجروح شکل میں نظر آتا ہے۔ شاد عارفی اس LEGEND کا شکار ہو گئے جس کا آغاز انہوں نے خود کیا اور جس کا پھیلاؤ ان کے نقادوں اور مداحوں کے ہاتھوں میں آیا۔ 'وہ کافرہ'، اس تضاد کی نمایندہ مثال ہے، جس نے ان کی شخصیت کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے اور تمام عمر غلط ٹکڑے کی نمائش اور پرورش میں مصروف رہے۔

شاد عارفی کا دوسرا Obsession ان کے پہلے Obsession سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے — ہر عورت کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے کا Obsession۔ شاد عارفی کی نمائش کے سلسلے کی نظمیں پڑھ کر اکثر محسوس ہوتا ہے کہ راہ گذر، بازار یا نمائش میں کام یا تفریح کے لئے جانے والی ہر عورت بیوا ہے اور انتہائی اخلاقی انحطاط کی علامت ہے۔ یہ Obsession ہمارے دور کے کچھ جدید شاعروں کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔ کام یا تفریح کے لئے آزادی سے گھومتی ہوئی خوبصورت عورتیں مجموعی طور پر ایک حسین منظر پیش کرتی ہیں جو یقیناً کسی قابلِ مذمت اخلاقی قدر کی مظہر نہیں ہے۔ اس Obsession کی تہ میں بھی شدید محرومی کا جذبہ کارفرما ہے۔ یہ Obsession ہرگز شعری رویہ نہیں ہے اور کسی مثبت یا منفی اخلاقی قدر کو ثابت نہیں کرتا۔

شاد عارفی کے غیر حقیقی کردار پر ہماری توجہ چونکہ مسلسل رہی ہے۔ اس لئے ان کی شاعری کا ایک اہم حصہ ہماری نظر سے اوجھل ہو گیا ہے۔ اس حصے میں جو کلام شامل ہے وہ حقیقی شاد عارفی کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ شاد عارفی موسم سے لذت یاب ہو سکتا ہے، دوستوں کی محبت کو پسند کرتا ہے، دردمند دل رکھتا ہے، عورت کو بیوا یا رنڈی نہیں سمجھتا، غیر ازدواجی جنسی تعلقات کو برا نہیں سمجھتا اور بہ قدرِ توفیق ان سے لطف اندوز ہوتا ہے یا ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔ یہ ایک Genuine انسان کا کردار ہے جو نہ تو کسی مصنوعی Obsession کا شکار ہے اور نہ ہی کسی Legend کا۔ اس کردار کی پہچان، جذبے کی معصومیت اور لذت ہے۔ میں شاد عارفی کے اس کردار کو چند مثالوں سے واضح کرنا چاہتا ہوں شاد عارفی کی نظم 'واپسی' کا آخری بند دیکھئے۔

والد کی جانب یہ اشارہ تاڑ نہ جائیں دور رہو
مجھ سے مخاطب چھوٹے بھائی کو یہ ایما سنبھلو ٹھہرو
میری طرف نظریں لیکن نوکر کو حکم: سہارا دو
ماما کی خدمت پہ کنایہ، خط لانے لے جانے کو
آکے برابر کچھ یونہی سا یہ فقرہ۔ آج آنا تو
شاد بس اب خاموش کہ دُنیا نظر لگانے والی ہے

کس قدر معصوم اور دلفریب ہے یہ منظر! لیکن اگر مقبول عام طنز نگار، شاد عارفی کی نظر سے اس منظر کو دیکھا جائے تو اس میں غیر ازدواجی تعلقات اور اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی کے عناصر نظر آ سکتے ہیں۔

پھڑ پھڑاتی ہیں بطیں تالاب میں
بہتے ہیں ساغر شراب ناب میں
رحمتیں ہیں عام سب کے باب میں

پھولنس کے چھپر میں ہم ہیں اور آم
کر رہے ہیں تیز چاقو اپنے کام
ذائقہ کھنچے ہے۔ تیغِ بے نیام
(نوروز)

کس قدر روشن اور صحت مند ہے یہ منظر! یقیناً یہ کوئی دوسرا شاد عارفی ہے۔

شام کا گیسو کھلی آنکھوں پہ جادو کر گیا
آنکھ ملنا تھی کہ نظارہ پلٹ کر رہ گیا
طور کا جلوہ چراغوں میں سمٹ کر رہ گیا
مختلف آنچل ہوا کے رخ پہ بل کھانے لگے
روشنی میں ساریوں کے رنگ لہرانے لگے
یہ دوالی کے مناظر یہ لگا ہیں کامیاب
یا الٰہی تا قیامت بر نہ آید آفتاب
(دیوالی)

یہ شاد عارفی کسب نور، کسب مسرت کے معصوم فن سے واقف ہے!
ایک اور مثال دیکھئے۔

جھر بیریوں کی آڑ میں میلے کی حد سے دور
پہنچا ہوں اس امید میں آئے گی وہ ضرور
کھو جائے گی کہیں۔ مجھے پانے کے واسطے

یہ ناؤ رہ گئی جو کنارے پہ ٹوٹ کے
ریتی میں دب چکی ہے جو کوسی میں چھوٹ کے
کافی ہے ولولوں میں بہانے کے واسطے

(دسہرہ اشنان)

غیر ازدواجی جنسی فعل کنار دریا شکستہ ناؤ میں شاعر کو ولولوں میں بہر حال بہا سکتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی اس کے خلاف کیوں نہ ہو۔ یہ شاد عارفی محض انسان ہے۔ نقاب نہیں اس لئے معصوم ہے۔

شکار ماہی، نظم، بسنت۔ یہ سب نظمیں ایک حقیقی شاد عارفی کی تصویریں ہیں جو کسی PRETENCE کا شکار نہیں ہے۔ شاد عارفی کے کلام کا ایک اور قابل ذکر حصہ ابھی باقی ہے، اس کا ذکر نہ کرنا اس کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ شاد عارفی، طنز نگار، شاد عارفی گوشت پوست کا انسان ــــ شاد عارفی کی کچھ نظمیں ایسی ہیں جہاں شخصیت کا تضاد ختم ہوگیا ہے۔ "اندھیر نگری، اور" ابھی جبلپور جل رہا ہے" حقیقی جذبے، ردعمل اور اظہار کی نمائندہ مثالیں ہیں۔ اندھیر نگری، اقدار کی شکست اور ان کے کھوکھلے پن کی نظم ہے، اور ابھی جبلپور جل رہا ہے" ایک مجروح جذبے کی پراسرار اور کربناک تصویر ہے۔ یہ غصے اور جھنجھلاہٹ کی نظم نہیں بلکہ دل کی آواز ہے۔

شاد عارفی اسلوب کے سلسلے میں بہت سی غلط فہمیوں کا شکار تھے۔ کاریگری اور شاعری بہر حال دو الگ الگ کام ہیں۔ انہیں عمر بھر اپنی استادی کا رعب جمانے کا شوق رہا۔ یہ شوق غالباً ان کے شاگردوں کے لئے مفید رہا ہو لیکن ان کے اپنے اسلوب پر کچھ مستقل اثرات چھوڑ گیا۔ زیادہ سے زیادہ اجنبی اور کھردرے الفاظ کو باندھنے اور کھپانے کی خواہش اُن پر اکثر حاوی ہو جاتی ہے۔ یہی شوق ان سے ضرورت سے زیادہ تفصیلات کا مطالبہ بھی کرتا ہے اور وہ اسے پورا کرنے میں کوئی مشکل محسوس نہیں کرتے۔ کچھ جذباتی اور اسالیبی Obsession کی طرح Inverted Commas بھی ان کا مستقل Obsession ہیں۔ وہ الٹے کاماز کا استعمال متواتر کرتے ہیں اور بلا ضرورت کرتے ہیں۔ اکثر اوقات اس استعمال کا کوئی محل نہیں ہوتا۔ شاعری کی زبان ہر قسم کی لچک کی اہل ہے۔ کسی مخصوص مفہوم کی نشان دہی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ الفاظ مختلف اور متضاد مفاہیم کے خود متحمل ہوتے ہیں۔ شاد عارفی غالباً اس بات سے پوری طرح واقف نہیں تھے کہ کوئی لفظ دوہرے Inverted Commas کے اندر رکھا جاتا ہے تو اس کا مفہوم الٹا ہو جاتا ہے۔ شاد عارفی اکثر اوقات صرف مخصوص الفاظ کی نشاندہی کرنے کے لئے کاماز لگا دیتے ہیں جو قطعی طور پر غیر ضروری ہوتے ہیں۔

۱۔ چاہتی ہے مجھ کو "تشہیر ہوس" میں گھیر دے
۲۔ اس ساری میں "سلوٹ" اس سائے" میں جھول نکالا جائے۔
۳۔ وہ "سوریا پوجا" وہ "ہری اوم" کی جاپیں

شاد عارفی کے کلام میں سینکڑوں مصرعے ایسے ہیں جن میں کاماز کا استعمال سراسر غیر ضروری اور بے کار ہے۔

شاد عارفی کے طنز یہ کلام کا سب سے بڑا عیب مزاح کی کمی ہے۔ مزاح طنز کو قبولیت کا جوہر بخشتا ہے۔ تلخی مخالف ردِ عمل پیدا کرتی ہے۔ شاد عارفی کے بیشتر کلام پر تلخی، جھنجھلاہٹ اور اخلاقی Obsession کا غلبہ ہے اس لئے بیشتر کلام مجروح ہوگیا ہے۔ اسلوب کا چٹخارہ ان کی زبان پر مستقل طور پر موجود رہتا ہے اور وہ اکثر اسلوب کی مجبوریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے کلام کا وہ حصہ جن میں تلخی کم ہے اور اس کی جگہ بذلہ سنجی، بردباری، دردمندی، معصومیت اور مسرت نے لے لی ہے۔ شعری حسن سے روشن اور منور ہوگیا ہے۔ حقیقی شاد عارفی سے ہماری ملاقات ان کے پورے کلام کے اسی حصے میں ہو سکتی ہے۔

نوٹ:۔ یہ مقالا میں نے مظفر حنفی کے ایما پر لکھا تھا اسے وہ شاد عارفی کی شاعری اور شخصیت سے متعلق ایک زیر ترتیب مجموعہ مضامین میں شامل کرنا چاہتے ہیں: مظفر حنفی کا شاد عارفی سے قریبی تعلق تھا اور وہ ایک عرصہ سے اُن کی شاعری اور شخصیت پر کام کر رہے ہیں۔ اس مقالے کے بارے میں اپنے ردِ عمل کا اظہار مظفر حنفی نے میرے نام ایک خط میں کیا ہے یہ خط قارئین کی دلچسپی کے لئے اور شاد عارفی کی شاعری کو مناسب پس منظر میں رکھنے کے لئے مقالے کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

مظفر حنفی کا خط

"پہلے تو عید کے سلسلے میں مبارکباد قبول فرمائیے اور پھر مضمون کے لئے بہت بہت شکریہ۔ شاد مرحوم پر بہت سے مضمون لکھے گئے لیکن جس مخصوص زاویئے پر آپ نے روشنی ڈالی ہے وہ اب تک اچھوتا تھا۔ بحیثیت مجموعی مجھے مضمون بے حد پسند آیا اور اس کی بیشتر باتوں سے مجھے اتفاق ہے۔ واقعی شاد عارفی عملی طور پر جنسی ناآسودگی کا شکار تھے۔ کٹر مذہبی ماحول نے انھیں غیر ازدواجی جنسی تعلقات سے بچائے رکھا اور ازدواجی زندگی کے انھیں بارہ چودہ مہینے میسر آئے ان میں سے زیادہ عرصہ ان کی اہلیہ کی بیماری

اور علاج میں ضائع ہوا۔ یہاں یہ بھی ملحوظ ہے کہ انہوں نے کم و بیش ۶۳ سال کی عمر پائی پھر یہ بھی ہے کہ ان کی نظموں کے مجموعہ "اندھیر نگری" میں "سویرا" والوں نے بیشتر وہی نظمیں انتخاب کی ہیں جو براہِ راست یا بالواسطہ جنس سے متعلق ہیں۔ مرحوم کے منظوم کلام کا ۱/۴ حصہ نظموں کی شکل میں ہے اور ۳/۴ غزلیات کی شکل میں ہے۔ ان نظموں میں ایسی نظمیں جو "اندھیر نگری" میں شامل ہیں۔ (نمائش وغیرہ کے قبل کی) ان کا اوسط پانچ سات فیصد سے زائد نہیں ہے۔ "واپسی" "دسہرہ اشنان" "دیوالی" جیسی نظمیں ساٹھ فی صد اور باقی ماندہ خالص طنزیہ نظمیں ہیں (از قبیل نظم "اندھیر نگری") مثلاً پرانا قلعہ، سماج، روٹی، اختلافات حیوان ناطق، شہر اور دیہات، رسمی قید خانے، جبر و قدر، گاؤں، گربہ دریا، مالن، گوالن۔ بحث، دیہاتی لاری، مندر جانے والا، سبق، نفسیات سر، غدار، حریت، شہر سے دور، گیہوں نے کہا، دیکھنے والا ہو تو، ایک تصویر دیکھ کر، آج کل، موج تبسم، اور ایسی ہی تقریباً ڈیڑھ سو نظمیں۔ میں نے ان کی ایسی نظموں کا مجموعہ ترتیب دیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ عام طور پر شاد عارفی کے سلسلے میں جو مضامین لکھے گئے ہیں وہ ان کی غزلیات کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں اور وہ بھی آخری دور کی غزلیات جن میں خالص طنز برتا گیا ہے چنانچہ ناقدین کی نگاہ میں وہ ایک طنز نگار ہی ہیں ان کی نظمیں بہت کم زیرِ بحث آئیں۔ خیال یہ ہے کہ اُن کا پورا کلام منظرِ عام پر آنے کے بعد ایک مربوط اکائی کی شکل میں سچی تنقید کا مطالبہ کرے گا اس تفصیل سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں شاگردانہ عقیدت کے تحت مرحوم کی وکالت کر رہا ہوں، مجھے آپ کا یہ مضمون حد درجہ پسند ہے۔

البتہ میں آپکے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ مزاح کی کمی طنزیہ کلام کی خامی ہے اور یہ بات میں محض غزل کی حد تک محدود رہتے ہوئے کہہ رہا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اُردو غزل میں خالص طنز (اکا دکا چھینٹے تو ہر شاعر کے کلام میں مل جاتے ہیں) سے بہت کم کام لیا گیا ہے اور جہاں اُسے برتا بھی گیا ہے تو مزاح کی آمیزش کے ساتھ جس نے طنز کی دھار کو کند کر دیا اور چٹخارہ بڑھا دیا۔ اگر میرا خیال غلط ہے تو خود مجھے بھی اپنے کلام میں محتاط رہنا ہوگا۔"

مظفر حنفی


## خصوصی رعایت

آج کل کے سالانہ چندے میں رعایت سے فائدہ اُٹھائیے

۲ سال کے لئے ۱۲ روپے یا ۱۸ شلنگ یا ۲٫۷۵ ڈالر

۳ سال کے لئے ۱۷ روپے یا ۲۵ شلنگ ۶ پینس یا ۳٫۵۰ ڈالر


# ایک تجزیہ ..... اپنی آزادیوں کے نام

## بانی

تمام پیڑوں کو کاٹ کر
ڈھیر سا لگا کر . . . .
اب اُس پہ بیٹھا میں چیختا ہوں
مجھے کسی سائے میں بٹھاؤ
کہ میرا سارا بدن بُری طرح جل رہا ہے
سمندروں کا تمام پانی
سرابِ صد عمر میں بدل کر . . .
میں چیختا ہوں
وجود کا میرے ایک اک حصّہ
لمسِ نم کو ترس گیا ہے۔
تمام فصلوں کی جڑ کو سیلابِ زہر دے کر . . .
میں دن چڑھے خوب چیختا ہوں
کہ پیاسے سورج نے . . .
مٹیوں کا ہرا لہو چاٹ کر مرے قیمتی پسینے کو پی لیا ہے
تمام سمتوں میں آگ کا خیمہ فلک بوس تان کر . . .
اب میں چیختا ہوں
مجھے بچاؤ
کہ موم کا اک مکانِ صد نقشِ بے بہا ہوں۔
ہرے بھرے موسموں کی ساری ہواؤں کو
برف کی چٹانوں میں قید کر کے . . .
میں چیختا ہوں
کہ نیلے اور منجمد سے کہرے کا نام، آکاش رکھ دیا ہے
یہ کس رشی نے
تمام تہذیبِ لفظ و معنی کو
ایک پیرایۂ بیاں میں اسیر کر کے . . .
میں چیختا ہوں
مجھے مری ذات سے نکالو
کہ میں نے آزادیوں کا مطلب غلط لیا تھا

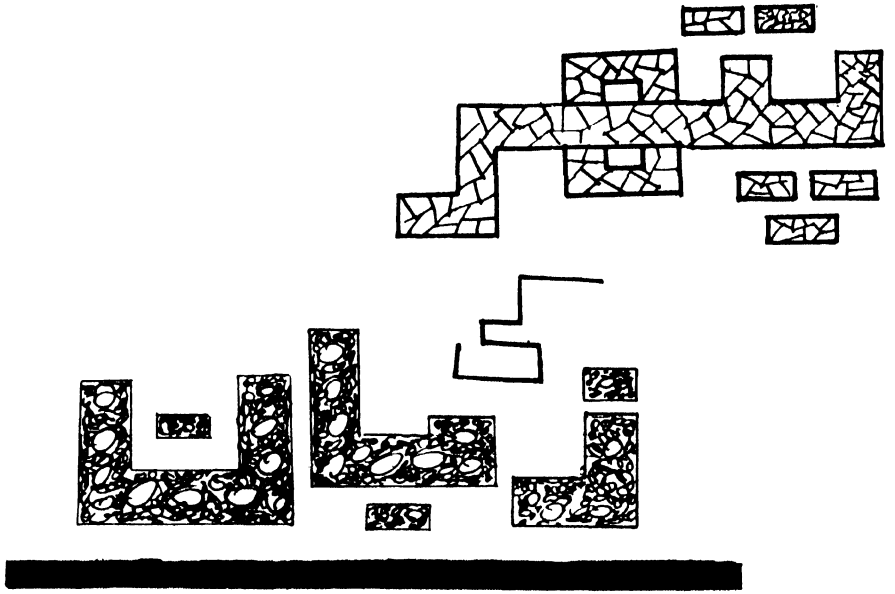

## احمد یوسف

قدموں کی نیچے کی دُنیا نے کہا۔ "کوئی دم میں دلیزاد آتے ہی ہوں گے ۔
وہ گھمسان کا رن پڑے گا کہ میرا سینہ پھٹ جائے گا اور آسمان ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ گرد و غبار خون کے دریا میں بہہ جائیں گے۔"

"تب ہی میں اپنے بچّوں سے کہوں گی کہ وہ اپنی اپنی قبروں میں جا بسیں"
"کل بھی یہی ہوا تھا ۔ لذتیں عروج پر پہنچ کر منہ کے بل گرتی ہیں۔"

"بس اب دلیزاد آتے ہی ہوں گے ۔ میں مسلسل جاگ رہی ہوں اور اب لمبی تان کر سونا چاہتی ہوں کہ نیند اور تھکن سے میرے پپوٹے بے حال سے ہو گئے ہیں۔" ۔

صبحدم میرے بچے کہیں نہ کہیں سے آ ہی جائیں گے اور یہ کھیل پھر سے شروع ہو جائے گا۔"

"لیکن اب کہ دلیزاد آتے ہی ہوں گے۔"

سنگی محافظوں نے اپنے سینے اس کنارے سے اس کنارے تک پھیلا رکھے ہیں جن پر کہانیاں سینکڑوں اور ہزاروں قلموں نے محفوظ کر دی ہیں۔

سوچنے والی آنکھیں آمر بادشاہ، قوم ربا ڈشی، تو مار بازی کے بعد ایک بڑا سوالیہ نشان بنا دیتی ہیں لیکن ایک بڑی مترنم سی ذہنی رو دوالہانہ انداز میں آتی ہے اور اسے ایک خوبصورت سے بول میں بدل جاتی ہے۔ پھر ایک دوسری رَو جو اس کا تعاقب کرتی ہوتی ہے، کوچہ و بازار سے ہوتی ہوئی ایک دوڑتے بھاگتے شہر کی شاہراہ بدل کر پہنچ جاتی ہے ۔ بغلوں میں سرخ صحیفے دبے ہیں آنکھیں اپنے اندر کے دھڑکتے دلوں کو باہر کھینچ لائی ہیں۔ ۔

جہاں انگڑائیاں لیتا ہوا اپنا کل ہے۔ ہاتھوں میں مچلتی ہوئی صبح کا نقیب ۔ الجھے الجھے بالوں والے نوجوان مشرق کے اس شہر میں ہیں اور بعید مشرق میں بھی ہیں جہاں کا آسمان شہبازوں کی زد میں آگیا ہے اور اب وہ ان کی تلاش میں ہیں۔

مسلسل تعاقب ۔ ازل سے ابد تک ۔

اور وہ سنگ و آہن کی بلند و بالا عمارتیں، جہاں آنکھیں اگر نیچے سے اوپر تک کا سفر کرتی ہیں تو ٹوپیاں فٹ پاتھ پر آ رہتی ہیں لیکن اُن کے سائے میں پناہ بھی ملتی ہے اور عصرِ نو کے ایک حکیم کے اقوالِ زرّیں بھی ملتے ہیں پر یہ کہ سنگ و آہن کی دیواریں طور نہیں بن سکتی ہیں۔ ۔ وہی ایک عام آدمی کے روز و شب ۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ جہاں آبادی کے ایک چھوٹے سے حصے کے دلوں میں بے اطمینانی کے سائے رینگ رہے ہیں، وہاں ایک بڑے حصے کے دل میں شادمانی کے نقارے بھی بج رہے ہیں۔

دوسری رائے یہ ہے کہ ایک چھوٹا حصہ اگر سرخوشی کے عالم میں جھوم رہا ہے تو ایک بڑا حصہ کرب و آلام کی وادیوں میں گم ہے —

آگے —

میرے گھر میں بس ایک بول چال۔ کھانا پینا، رہن سہن ایک —

اندر اور باہر کے عقیدے ایک — "میرے گھر میں" —

سارا زور میرے پر ہے —

یہ آواز سنی سنائی سی کیوں لگ رہی ہے —

خنجر بکف خیالوں والے نوجوانوں کا ایک گروہ — دلدل میں ایک گم کردہ تاریخ کے چند اوراق پریشاں — سروں پر بنئے کی کتابیں —

چمکتے چاقوؤں کی زبان کہہ رہی ہے — فاسد لہو بہہ جانے دو، تب ہی ایک جیسی صورتیں پیدا ہوں گی۔

گاتے بجاتے — میرا گھر، میرا گھر کرتے ہوئے رواں دواں ہیں۔

دو قدم اور —

اس کی پیٹھ پر ایک تھیلا بندھا ہے، جس میں پیپسی کولا، کوکا کولا اور بیئر کی ٹھنڈی بوتلیں سجی ہیں۔ اسی کی نوکیلی داڑھی قدرے اوپر کو اٹھی ہے اس کے خوش وضع لانبے کوٹ میں کتنے ہی رنگ صف بہ صف کھڑے ہیں۔ اس کی چمچاتی ٹائی اس کے سینے پر چمک رہی ہے اور اس کے ہلکے پھلکے جوتے خاموشی سے سفر کر رہے ہیں۔

وہ چمکتی آنکھوں سے چاروں اور دیکھتا ہے۔ تب گائی گائی کرتا کاندھے اچکاتا — آزاد تصور، اعلیٰ اخلاقیات اور 'خواب جھوٹے ہیں' کے درس دیتا ہے۔

بالآخر وہ سیٹیاں بجا کر، اور اونچی فیلٹ کو دھیرے سے اٹھا کر 'بائی' کرتا ہوا ایک طرف کو روانہ ہو جاتا ہے۔

اور آگے —

سینما کے پوسٹر۔

مخصوص کمزوریوں کے علاج —

دو یا تین بچے —

ایک جہانِ معانی سے آگے ایک جہان معانی —

سناٹے کے جگر کو چیرتی ہوئی ایک سائیکل وہیں پر آرکی۔ ایک نوجوان نے سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کیا — پینٹ کے بٹن کھولے اور نہایت ہی جارحانہ انداز میں خشک پتوں کو روندتا دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا — وہ اردگرد سے بالکل ہی بے تعلق تھا۔

یہ تک نہیں دیکھا اس نے کہ ایک اور شخص بھی اس سے قریب ہی بیٹھا ہوا پیشاب کر رہا ہے۔

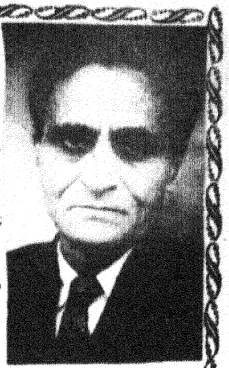

# برطرحِ غالب

دینا ناتھ مست

دل نشیں یوں ہو گیا ہے چہرۂ ضوبارِ دوست
سینہ اپنا بن گیا ہے مطلعِ انوارِ دوست
یہ شگفتہ روئی یہ گلرنگیٔ حسن و جمال
گلشنِ کشمیر ہے یا پیکرِ گلبارِ دوست
دید سے اس کی طبیعت سیر ہوتی ہی نہیں
دیکھ کر بھی رہتی ہے پھر حسرتِ دیدارِ دوست
بے نیازِ گردشِ ایام وہ ہوگا نہ کیوں
وقت کی رفتار ہے جس کے لئے رفتارِ دوست
اُس مسیحا دم کا ایسا کچھ ہے اعجازِ کرم
ہے شفا بخشِ جہاں جو ہے یہاں بیمارِ دوست
پھول سے لے کر ستاروں تک میں آتا ہے نظر
اور ہوں گے جن کو ہوگی حسرتِ دیدارِ دوست
دم تو لیتے ہیں کبھی ہم جا کے اس کی چھاؤں میں
سایۂ سدرہ ہے ہم کو سایۂ دیدارِ دوست
رنجش و آزردگی بیگانوں سے ہوتی نہیں
دوست ہی ہوتے ہیں وجہِ خاطرِ بیزارِ دوست
نظروں نظروں ہی میں گم ہوتے ہیں سب ہوش حواس
"کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست"
آدمی برحق اگر ہو اک نہ اک دن بالضرور!
آتی ہے دشمن میں بھی پھر خوبیٔ کردارِ دوست
بے نیازِ رنج و غم ہیں بے نیازِ روزگار
مست رکھتی ہے ہمیں وہ چشمِ صہبا بارِ دوست

بشمبر ناتھ کول

# کشمیر اور رواداری



اہل کشمیر کی ایک اہم قومی روایت رواداری کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے یہ واضح کرنا بیجا نہ ہوگا کہ کشمیریوں نے رواداری کے اُس منفی تصور کو اپنانے پر ہی قناعت نہیں کی جس کا ماحصل بس یہی کچھ ہے کہ مختلف خیالوں، نظریوں اور عقیدوں کے پیروکاروں کو ایک دوسرے سے اُلجھنا اور دست و گریباں نہیں ہونا چاہیے" ایک دوسرے کے معاملوں میں دخل اندازی سے پرہیز کیا جائے اور اپنی اپنی راہ پر چلتے ہوئے دوسروں کے عقائد کو بھی "برداشت" کیا جائے۔ مرنجان مرنج قسم کے منفی تصور سے مختلف نسلوں، مذہبوں اور عقیدوں کے ماننے والوں میں اگرچہ آویزش اور باہمی چپقلش کا اندیشہ تو باقی نہیں رہتا لیکن پھر بھی بیچ کی خلیج برابر منہ کھولے قائم رہتی ہے اور مغائرت کے پردے، دلوں کے میل بھائی چارہ اور یگانگت میں حائل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی کو محسوس کر کے اہل کشمیر نے شعوری طور پر رواداری کے تصور کو ایک اثباتی تصور بنانے کی کامیاب کوشش کی۔ نسل، مذہبی اور فکری اختلافات کو ایک طرف رکھ کر انہوں نے آگے بڑھ کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما اور ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ اس طرح ایک دوسرے کے دل کو ٹٹولنے، کچھ سیکھنے، کچھ سکھانے کا وہ عمل شروع کیا جس میں افضل اور اشرف قدریں قبول عام کی سند حاصل کر لیتی ہیں۔ اس عمل کی بدولت اہل کشمیر ایک ایسے ملے جلے کلچر کی بنیادیں استوار کر سکے جس کا ڈھانچہ مقامی ضرور ہے لیکن جس کا گوشت پوست اور رنگ و روپ جانے کہاں کہاں کے خمیر سے تیار ہوا ہے۔

محل وقوع کے اعتبار سے کشمیر اگرچہ ہمالہ کے سلسلہ ہائے کوہ سے گھرا ہوا ایک الگ تھلگ خطۂ ارضی دکھائی دیتا ہے لیکن ہندوستان کے شمال میں سرحدی ریاست وسط ایشیا میں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ اور اس کی سرحدیں کئی ملکوں سے جا لگتی ہیں۔ پہاڑوں سے محصور ہونے کے باوجود زمانہ قدیم سے تجارتی قافلے کشمیر سے ہو کر ہی چینی ترکستان اور وسط ایشیا کو بھی جایا کرتے تھے اور چین، تبت اور دوسرے ممالک کو گلگت، سرینگر اور لداخ تو خاص طور پر ہندوستان کے بیرونی ممالک کے ساتھ تجارت میں FORWARD POSTS مانے جاتے تھے۔ اطراف و اکناف سے آئے ہوئے تجارتی قافلے یہیں اُترتے تھے اور تجارتی مال کا تبادلہ کرتے تھے۔ ظاہر ہے جہاں دیش دیش سے آئے ہوئے لوگ آکر مل جائیں۔ وہاں تجارت کے ساتھ ہی ساتھ خیالات و نظریات و دیگر ثقافتی قدروں کا تبادلہ بھی شروع ہو جاتا ہے اور تاجروں کے پیچھے پیچھے سیاحوں، جہاں گردوں، محققوں اور مورخوں کے قافلے بھی چل پڑتے ہیں۔ چینی سیاح ہوئن سانگ اور شہرۂ آفاق ابن بطوطہ جیسے جہاں گرد کشمیر کے راستے ہی سے ہندوستان آئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آریوں کے ہندوستان میں داخل ہونے سے پہلے کشمیر میں ناگ قبیلوں کے لوگ رہتے تھے جو بظاہر کھیتی باڑی کے ہنر سے آگاہ تھے بلکہ بھیڑ بکریاں پال کر اور مچھلیاں پکڑ کر زندگی گزارتے تھے۔ ان کی بولی پشاچی تھی۔ چشموں، جھیلوں، دریاؤں کے علاوہ خاص خاص قسم کے درختوں کو بھی پوجتے تھے۔ ان لوگوں کی معاشی زندگی کی جھلکیاں ہمیں اُن کی ایک مقدس کتاب نیل مت پران سے ملتی ہیں جو خوش قسمتی سے زمانے کے دست بُرد سے بچتی بچاتی ہم تک پہنچ پائی ہے۔

جب آریوں نے ہندوستان میں داخل ہو کر سپت سندھو میں ڈیرے ڈال دیئے۔ تو کشمیر بھی آریوں کی یورش سے بچ نہ سکا۔ کچھ آریہ تو پنجاب اور اس کے نواحی علاقوں سے کشمیر میں داخل ہو گئے اور کچھ پامیر کی بلندیوں کو پھاند کر براہ راست وسط ایشیا سے وادیٔ کشمیر میں پہنچ گئے۔ اور لداخ۔ بلتستان اور دردستان میں آباد ہو گئے۔

آریوں کا کشمیر میں وارد ہونا دو مختلف تہذیبوں کی شاید پہلی ٹکر تھی لیکن ایسا لگتا ہے کہ خوش قسمتی سے یہ ٹکر جنگ و جدل اور کشت و خون پر منتج نہ ہوئی بلکہ دونوں تہذیبوں نے آگے بڑھ کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ایک دوسرے کے دل میں جگہ پیدا کر لی۔

چونکہ آریوں کی ویدک تہذیب نسبتاً توانا تر تھی۔ اس میں نیا پن بھی تھا اور ترقی پسندی کے عناصر بھی۔ قدرتی طور پر یہ تہذیب ناگوں کی تہذیب پر حاوی ہو گئی چنانچہ ناگوں نے ویدک دیوی دیوتاؤں کی پرستش شروع کر دی۔ گلہ بانی چھوڑ کھیتی

باڑی کو اپنایا، وید مقدس کو مذہبی کتاب بنایا گیا اور اپنی سماجی زندگی کی تنظیم بھی آریوں کی سماجی زندگی کے ڈھنگ پر کی لیکن اگر ناگوں نے آریوں سے بہت کچھ لیا تو آریوں نے بھی ناگ تمدن کی بہت سی باتیں قبول کرلیں۔ چشموں اور دریاؤں کی پرستش اور ناگ پوجا کے علاوہ پشاچی بولی اور اس کے رسم الخط کے علاوہ بہت سے مقامی رسم و رواج آریوں نے قبول کرلئے جن کی شہادت آج تک کشمیریوں کے ریتی رواج میں ملتی ہے۔ رفتہ رفتہ نسلی اختلاط کی خانہ بندیاں ٹوٹ گئیں اور دو تمدنوں کے ادغام و امتزاج سے ایک نئی چیز اُبھر آئی جسے ہم کشمیر کے مشترکہ تمدن کا نقش اول کہہ سکتے ہیں۔

پھر بدھ مت کے سیلاب نے سالم برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا الوالعزم اور عقیدت مند بودھ بھکشوؤں کا کشمیر میں بھی خیر مقدم کیا گیا۔ ان کے اپدیشوں کو گوش ہوش سے سُنا گیا۔ جو قائل ہوئے وہ بدھ مت اختیار کر بیٹھے جو زیادہ راسخ تھے اور برابر اپنے دھرم پر قائم رہے انہوں نے بھی بدھ مت کو عزت و احترام کی جگہ دی۔ اشوک اعظم کے عہد حکومت میں تو کشمیر اس شہنشاہ کی وسیع و عریض سلطنت کا ایک انگ بن گیا اور بودھ مت کو کشمیر میں خاصہ عروج حاصل ہوا۔ بدھ مت پہلا تبلیغی مذہب تھا جس سے اہل کشمیر کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ لیکن کشمیر کے عوام اور حکمراں دونوں نے نہایت وسیع القلبی کے ساتھ اس نئے مذہب کا خیر مقدم کیا ۔ رواداری کا عالم یہ تھا کہ ہندو بھی گوتم بدھ کو بھگوان وشنو کا اوتار مان کر دیگر ہندو دیوی دیوتاؤں کے ساتھ پوجنے لگے۔ کشمیر کی تواریخ میں جگہ جگہ اس کا ذکر ہے کہ ہندو حکمرانوں نے بہت سے بودھ وہار تعمیر کروائے اور ان وہاروں کے لئے جاگیریں مقرر کیں۔ کلہن اپنی راج ترنگنی میں لکھتے ہیں کہ راجہ ہرش ہندو دھرم کا پکا معتقد تھا لیکن اس کے باوجود وہ اور اس کے خاندان کے سبھی افراد بلاناغہ ہندو دیوی دیوتاؤں کو پوجنے کے ساتھ ہی ساتھ بدھ وہاروں میں جاکر پرستش کیا کرتے تھے۔

کوشان خاندان کے سب سے بڑے حکمراں کنشک کے عہد حکومت میں تو کشمیر بدھ مت کا ایک اہم ترین مرکز ہی بن کے رہ گیا۔ تخت نشین ہوتے ہی کنشک نے کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا جس کا پایۂ تخت پرش پور یا پشاور تھا۔ فتوحات کے ذریعہ کنشک نے مشرقی ترکستان، کاشغر، ختن اور یارقند کو بھی اپنی سلطنت میں ملا لیا اور شمالی ہند میں بنارس کے علاقے تک اپنی قلمرو میں شامل کرلئے۔ اتنی بڑی سلطنت میں ـــ جہاں کئی ایک نسلی و لسانی گروپ اور کلچرل اکائیوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کرلیا گیا ہے، مختلف تمدنی تحریکوں کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا ایک قدرتی بات ہے۔

اس عہد میں بدھ دھرم کے فلسفہ اور عمل میں پیدا ہوئے تضاد کو ختم کرنے کے لئے کشمیر میں ہی کنشک دن کے مقام پر تیسری بڑی بودھ مجلس بلائی گئی جس کی نگرانی اور رہبری اشوگھوش، واسومترا اور چرک جیسے بلند مرتبہ عالموں نے کی۔ اس بودھ مجلس میں کشمیر کے بہت سے جید ہندو عالموں نے بھی حصہ لیا اور اسی مجلس کی کاوشوں سے بدھ دھرم ایک محدود دائرے ہنایانا سے نکل کر وسیع تر دائرے مہایانا میں داخل ہوگیا جس کے باعث بدھ دھرم کی تبلیغ و اشاعت آسان تر ہوگئی۔ عالموں اور مورخوں کا قول ہے کہ ہنایانا کے جکڑ بند سے آزاد کرنے بدھ مت کو مہایانا کی لبرل شکل دینے میں کشمیر کے ہندو فلسفیوں نے اہم رول ادا کیا ہے اور اگر مہایانا کو کشمیری شیوازم اور بدھ مت کا حسین امتزاج کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

کنشک علم دوست۔ غیر متعصب اور ہوش مند حکمراں ہونے کے ساتھ ہی فن تعمیر کا بھی بہت دلدادہ تھا۔ پشاور اور دیگر مقامات پر بودھ خانقاہیں بنانے کے علاوہ اس نے کشمیر میں بھی بودھ وہار تعمیر کرائے اور بارہمولہ کے پاس کنشک پور (کانسی پور) نام کا ایک شہر بنوایا۔ ان عمارتوں کی تعمیر میں فن تعمیر و سنگتراشی کی وہ تمام خصوصیات سمو لی گئیں جن کو گاندھارا آرٹ فارم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس طرح ادب اور فن کے نئے رجحانات سے اہل کشمیر فیض یاب ہوگئے۔

بودھ اور ہندو تمدنوں کے اس خوش گوار امتزاج کے متعلق ہیون سانگ اور اوکانگ رقمطراز ہیں۔

گو کشمیر کی سماجی زندگی کے مختلف شعبوں پر بدھ مت کی گہری چھاپ پڑی اور یہاں بدھ عبادت گاہیں اور عمارتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بدھ مت اور شیومت آپس میں گھلے ملے ہوئے ہیں۔ ایک سو سے زائد بدھ خانقاہیں تو ایسی ہیں جن میں بدھ اور شیو دونوں کو پوجا جاتا ہے۔

چودھویں صدی کے آغاز میں کشمیری معاشرے کو ایک اور تمدن اور عقیدے سے سابقہ پڑا جو بدھ مت کے برعکس ایک بیرونی ملک میں پروان چڑھ کر کشمیر آیا تھا۔ یہ عقیدہ تھا اسلام۔

ویسے تو مسلمان للتا دتیہ مکتاپید کے عہد حکومت سے پہلے ہی کشمیر پہنچنے لگے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کشمیر کی سرزمین پر قدم رکھنے والا پہلا مسلمان حمیم بن سمع تھا۔ جو سندھ کے حکمراں راجہ داہر کا ایک وفادار عرب سردار تھا جب محمد قاسم نے سندھ پر چڑھائی کی اور داہر کو شکست دے کر ہلاک کر ڈالا تو راجہ داہر کا بیٹا جے شی حمیم کے ساتھ بھاگ کر کشمیر میں پناہ گزین ہوگیا۔ حمیم کے کشمیر پہنچنے پر اور چودھویں صدی کے آغاز تک اکا دکا مسلمان کشمیر آتا ہی رہا لیکن اس دوران میں مسلم فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۳۱۵ء میں مسلمانوں نے بھلگت کو چینی تغلب سے نکال کر اپنے زیر نگیں کرلیا تھا۔ اور رفتہ رفتہ اسلام وردستان پر چھا گیا۔ تاہم مسلمانوں کی منظم

تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز کشمیر میں چودھویں صدی عیسوی لگتے ہی اس وقت ہوا جب تبت سے آئے پناہ گزیں بودھ شہزادہ رنچن نے کشمیر کے تخت و تاج پر قبضہ جما لیا اور اسلام قبول کر کے سلطان صدرالدین کا لقب اختیار کیا۔ اور جب کچھ ہی وقفے کے بعد سورت سے آئے ہوئے ایک مسلمان سردار شاہ مرزا نے اویان دیو اور کوٹہ رانی سے سلطنت چھین کر سلطان شمس الدین کے لقب سے تاج شاہی اپنے سر پر رکھا تو اس طرح سلاطین شہمیریاں کا سلسلہ شروع ہو گیا جنہوں نے ۱۳۳۹ء سے لے کر ۱۵۵۵ء تک حکومت کی۔

اسلامی سلطنت قائم ہوتے ہی مسلمان مبلغ جوق در جوق کشمیر پہونچنے لگے۔ ان میں علماء بھی تھے مفتی بھی۔ کشف و کرامات والے درویش بھی اور حنونی مولوی بھی۔ ان پہلے پہلے آنے والوں میں سہروردی سلسلے کے صوفی بھی شامل تھے اور وہ سادات بھی جن کو آزاد خیالی اور تصوف کے باعث تیموری شاہی نظام میں شک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا اور جو تیموری عتاب سے بچنے کے لئے اپنا وطن چھوڑ کر کشمیر بھاگ آئے۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید جلال الدین بخاری، سعید تاج الدین، سعید حسن سمنانی، امیر کبیر میر سید علی ہمدانی اور اُن کے فرزند ارجمند میر محمد ہمدانی جیسی برگزیدہ ہستیاں اسی دور میں کشمیر آئیں۔ ان نو واردوں اور کشمیر میں رہنے والوں کا دینی عقیدہ مختلف تھا، زبان مختلف تھی، رہن سہن کھانا پینا اور لباس مختلف تھا اور اندازِ فکر و بیان بھی مختلف تھے۔ ظاہر کہ جہاں دو یکسر جداگانہ اور مختلف معاشرے تواریخی حادثہ کے باعث ایک دوسرے سے مل جائیں ابتدائی دور میں ان کے درمیان کشاکش پیدا ہونا کوئی اَن ہونی سی بات نہیں ہے خاص کر جب دونوں فریق اپنے اپنے معاشرے کو عقیدے اور فلسفے کو افضل تر اور دوسرے سے فائق سمجھتے ہوں چنانچہ تبلیغ اسلام نے شدت اختیار کر لی جو ہندو اپنا مذہب ترک کرنے پر رضامند نہ ہوئے، انہیں ذمی قرار دیا گیا اور ان سے جزیہ وصول کیا جانے لگا۔ ردعمل کے طور پر بہت سے ہندو وطن چھوڑ کر چلے گئے اور اس طرح دار و گیر کا ایک چکر چل پڑا۔ دین اور دھرم پر جب دنیاوی مفادات، مادی اغراض اور سیاسی مصلحتیں حاوی ہو جائیں تو قدرتی طور پر مذہب، تلاشِ حق اور روحانی ترقی کے جادۂ مستقیم سے ہٹ کر مفاد خصوصی کا آلہ کار بن کر رہ جاتا ہے اور انسانی زندگی کے تاریک گوشوں کو حق و صداقت کے نور سے منور کرنے کے بدلے دین و مذہب تفریق و نزاع کا سرچشمہ بن کر رہ جاتا ہے لیکن چونکہ حقیقت لاکھ پردوں میں چھپانے پر بھی چھپ نہیں سکتی اور دیر سویر ہمیشہ حق کو باطل پر فتح لازمی ہے کشمیر میں بھی یہی کچھ ہوا اور دین کے نام پر بھڑکائی ہوئی آگ آہستہ آہستہ بجھ گئی۔

ہوا یوں کہ آبادی کا بہت سا حصہ اسلام تو قبول کر چکا تھا لیکن محض کلمہ پڑھنے سے اُن کے سارے طور طریقے اندازِ فکر اور خیالات بدل نہ پائے۔ وہ مشرف بہ اسلام ہوئے لیکن اپنے آبائی مذہب کی بہت سی باتیں ساتھ لے کر۔ نتیجے کے طور پر کشمیر میں اسلام کا ایک نیا روپ اُبھرنے لگا۔ جو اس کے عربی روپ سے قدرے مختلف تھا۔

آبادی کے اجزائے ترکیبی میں اس انقلاب کے باعث جو فی قسم کے مسلموں کے تعصب کی دھار بھی کند ہونے لگی اور وہ بھی کثیر تو مسلم آبادی کے مذہبات سے متاثر ہونے لگے۔

چونکہ اسلامی حکومت کی جڑیں بھی دریں اثنا مضبوط ہو چکی تھیں حکمراں طبقہ کو بھی اب اس بات کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی کہ مذہب کو سیاست کا آلہ کار بنا دیا جائے۔

عرصہ تک ایک ساتھ رہتے سہتے کے باعث ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کی زبان بھی سیکھ لی اور ایک دوسرے کے خیالات سے بھی واقف ہو گئے، اس طرح تفہیم و مفاہمت کی راہیں کھل گئیں۔

سہروردی، نقشبندی اور قادری سلسلے کے صوفی بزرگوں کا جو بڑا گروہ کشمیر آیا اُن کے فلسفۂ تصوف اور ویدانت اور مدھومت میں بہت سی باتیں مماثل تھیں۔ ان عالم باعمل بزرگوں نے ہندو سنتوں اور بھگتوں سے راہ و رسم بڑھائی، خیالات کا تبادلہ کیا۔ جلد ہی ایک نہایت خوش گوار اور توانا تحریک شروع ہو گئی جس نے رواداری، یگانگت، پاکیزہ زندگی اور اخوت کی لافانی قندیلیں فروزاں کر دیں۔ اسی تحریک کی پیداوار ہے وہ رشی سلسلہ جس کی بنا پر کشمیر کو "رشیوں کی سلواری" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کے بانی مبانی للعارفہ اور شیخ نورالدین ولی کو مانا جاتا ہے۔ نکتہ سنج مفکروں کا خیال ہے کہ رشی سلسلہ درحقیقت ایک بغاوت تھی جس کا پرچم رواداری کے کشمیری متوالوں نے تعصب، تنگ نظری اور انسان اور انسان میں تفریق روا رکھنے والوں کے خلاف بلند کیا۔ سکندر بت شکن جیسے متعصب اور سلطان نورالدین ولی جیسے صوفی کو شک اور ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھنا اس سلسلے میں ایک معنی خیز بات ہے۔

لیکن دار و گیر، کشت و خون اور مناقشات و منافرت کے ایک جاں گسل دور میں سے گزرنے کے بعد کشمیریوں کا اصلی کردار پھر اُبھر چکا تھا۔ اہل کشمیر نے اپنے مستقبل کی راہیں متعین کر لی تھیں چنانچہ وادی کے گوشے گوشے میں رشیوں نے اپنے اڈے جمائے اور صلح کل اور امن و آشتی کا پرچم بلند کیا۔ ایسے بزرگوں میں مل دید اور شیخ نورالدین کے علاوہ سیدہ مول، بابا نصیرالدین روپہ سمجھوانی، بابا بام الدین، شیخ حمزہ مخدوم پیر پنڈت بادشاہ مشکل کشائے ہر دو جہاں ریشہ پیر بابا زین الدین، بابا شکر الدین، بابا لطیف الدین اور کئی اور اولیا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ایسے ہی ماحول میں سلطان علی شاہ کے جانشین شاہی خان نے آنکھ کھولی جو بعد سلطان زین العابدین کے نام نامی سے تخت نشین ہوئے۔ تخت نشین ہوتے ہی بڈشاہ نے مذہب کی بنا پر رعایا کے مختلف فرقوں کے درمیان امتیاز برتنے کی پالیسی ترک کر دی۔ جزیہ وصول کرنے کی بدعت ختم کی۔ گاؤکشی ممنوع قرار دے کر ہندو رعایا کے مذہبی احساسات کی تشفی کی جو ہندو اس کے باپ دادا کے عہدِ حکومت میں وطن چھوڑنے

پر مجبور ہو گئے تھے، اُن کو واپس بلالیا اور ہندوؤں کے مذہبی رسوم پر لگی ہوئی پابندیاں ہٹالیں۔ تصوف اور بھگتی مارگ پر چلنے والے لوگوں اور ان کے طرزِ عمل کی حوصلہ افزائی شروع کر دی۔ سلطان زین العابدین ایک ایسا فرمانروا تھا جس نے اپنی رعایا کی زبان کشمیری نہ صرف خود سیکھی بلکہ اس میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ مختلف فرقوں کو ایک دوسرے کے قریب تر لانے کی غرض سے فارسی کی بہت سی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کروایا۔ خود بھی بادشاہ کو سنسکرت پر اچھا عبور حاصل تھا اور سلطان اکثر لوگ وششٹ اور دیگر مقدس ہندو گرنتھوں کی تفسیریں ہندو عالموں سے سنا کرتے تھے۔ ہندو، بودھ اور جین تیوہاروں میں سلطان خود بھی شریک ہوتے تھے اور ایسے موقعوں پر یاتریوں کو سرکار کی طرف سے کھانا مفت تقسیم کیا جاتا۔ اس منصف مزاج سلطان نے رعایا کی سود و بہبود کے لئے دست کاریوں کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ بیرونی ممالک سے ماہر کاریگر منگوا کر قالین بافی، پیپر ماشی جیسی دست کاریوں کی بھی ترویج کی۔ زراعت کی ترقی کے لئے نہریں کھدوائیں۔ کئی قسم کے پھلدار درخت باہر سے منگوا کر کشمیر میں اگائے۔ علم و ادب کو فروغ دینے کے ساتھ ہی فنِ تعمیر کو بھی بڑھاوا دیا۔ نوشہر میں عالی شان عمارتوں کا ایک محلہ تعمیر کیا۔ اسی میں سلطان نے محل سرا اور محلات دربار بھی تعمیر کرائے جس کو زینہ دب یا رازدانی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ زینہ گیر، زینہ پور، زینہ کوٹ اور دیگر بہت سے مقامات آباد کئے۔

بڈشاہی دور کو کشمیر کے مرکب تمدن کے ارتقار میں ایک سنگ میل مانا جاتا ہے کیونکہ یہی وہ زمانہ ہے جب نفاق و تعصب کے بیرونی اثرات کے خلاف اہلِ کشمیر کی بغاوت واضح طور پر سامنے آئی اور اہلِ کشمیر نے بھائی چارہ یگانگت، رواداری اور امن و آشتی کا نیا شوالہ تعمیر کرنے کی کوشش شروع کی۔ اس کوشش کو کامیاب بنانے میں کشمیری زبان نے گاڑی کے پہیوں کا کام سرانجام دیا۔ کشمیری ادیبوں اور شاعروں نے اسی عوامی زبان میں صلح جوئی، امن و آشتی اور میل ملاپ کے لافانی گیت گائے۔ رہن سہن میں، لباس و سنگھار میں، تذہیب اور شادی غمی کے رسوم کے معاملے میں دونوں فرقے ایک ہو گئے۔ اندازِ فکر میں یکسانیت پیدا ہو گئی، اور دین کی حقیقی روح کو ذہن نشین کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے پہلو بہ پہلو عبادت گاہیں تعمیر کیں۔

گو بڈشاہ کے بعد سلطان حیدر شاہ کے عہدِ حکومت میں اور پھر افغانوں کی ہولناک حکومی کے دوران اتحاد و اتفاق کی اس تحریک کو ختم کرنے کی کئی بار کوششیں ہوئیں لیکن انتہائی مظالم برداشت کرنے کے باوجود کشمیریوں کو جادۂ مستقیم سے ہٹایا نہ جا سکا۔ اس کے بعد بھی سکھا شاہی کے ایام میں اور پھر برطانوی سامراج کے دوران کشمیریوں کو فرقوں کی خانہ بندی میں تقسیم کرنے کی ریشہ دوانیاں جاری رہیں چنانچہ اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لئے برطانوی ہند کے پولیٹیکل آفس اور کشمیر کے کچھ انگریز رئیڈیٹوں نے DIVIDE AND RULE کا نسخہ کشمیر میں بھی آزمایا لیکن اہلِ کشمیر ان کے جھانسے میں نہ آسکے۔

۱۹۴۷ء میں کشمیریوں کی رواداری نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا جب انتہائی ہیجانی دور میں بھی انہوں نے اپنے دل اور دماغ کو ٹھنڈا رکھا اور وادیٔ کشمیر کو وحشت اور بربریت کے اُن شعلوں سے محفوظ رکھا جن کی لپیٹ میں برصغیر تقسیمِ ملک کے فوراً بعد آگیا تھا۔



جو مجھ کو چھوڑنے کل رات گھر تک آئے تھے
مجھے خبر ہے وہ رسوائیوں کے سائے تھے
چمن کے گرد جو خیمے دکھائی دیتے ہیں
یہ قافلے بھی تو صحرا سے ہو کے آئے تھے
تمہارے آتے ہی سب روشنی میں ڈوب گئے
مرے قریب ابھی بے شمار سائے تھے
تمہارے پاؤں کے کانٹے نکال دوں آؤ
مگر یہ راہ میں کس کے لئے بچھائے تھے
اب اور چھائیں گھٹائیں تو دورِ جام چلے
برس کے کھل گئے بادل جو گھر کے آئے تھے
تمہیں کو اب مری بے باکیوں کا شکوہ ہے
کبھی تمہیں نے مرے حوصلے بڑھائے تھے
زمانے بھر کی تو باتیں پڑوسیوں سے ہوئیں
کسی نے یہ نہ بتایا کہ آپ آئے تھے
انھیں بھی راہ نماؤں کو سونپ آیا ہوں
جو راستے کبھی اپنے لئے بنائے تھے
نہ تھا یقین جو نظمی کسی کے آنے کا
تو پھر یہ پھول شبستاں میں کیوں سجائے تھے

# غزلیں

## پیام فتحپوری

رُخِ حیات پہ اک نو بہ نو نکھار آیا
نصیبِ عشق، ترا غم بھی سازگار آیا

وہ دشتِ عشق ہو صحرائے غم کہ مقتل ہو
ہمیں حیات کی ہر اک ادا پہ پیار آیا

جنوں کی رسم چلی، ہر طرف چراغ جلاؤ
منا و جشن کہ پھر عشق سوئے دار آیا

مژہ سے پھول برستے ہیں آج دامن میں
غمِ حبیب ہے یا موسمِ بہار آیا

جو بوالہوس تھے وہی جان و دل بچا کے چلے
میں انجمن میں تری زندگی بھی ہار آیا

ہمارے ایک تبسم سے کھا گیا ہے شکست
کبھی قریب اگر رنجِ روزگار آیا

فسانہ تھا مری بربادیوں کا محفل میں
خبر نہیں ترا کیوں نام بار بار آیا

ہزار غم تھے پہ احساس بے کسی تو نہ تھا
میں رو پڑا جو کوئی یار غم گسار آیا

پیامِ عشق میں جینا تو راس آ ہی گیا
ہم اہلِ عشق کو مرنا بھی سازگار آیا

## شاہد ماہلی

رگ رگ میں میری پھیل گیا ہے یہ کیسا زہر
کیوں ڈوبنے لگا ہے دھندلکوں میں سارا شہر

مجھ کو جھنجھوڑ دیتی ہیں لمحوں کی آہٹیں
اُٹھتی ہے میرے جسم میں اک بے بسی کی لہر

یہ شب مرے وجود پہ یوں ٹوٹ پڑتی ہے
جیسے کوئی بلا ہو کہ آسیب ہو کہ قہر

پھوٹا نہ مدتوں سے کوئی چشمۂ اُمید
سوکھی پڑی ہوئی ہے مری خواہشوں کی نہر

چہرے پہ وقت کی میں سیاہی ملا کروں
مجھ کو یہی ملا ہے مشیت سے کارِ دہر

## نصیر پرواز

آنکھوں میں اضطراب کا منظر نہ پھینکئے
موجیں خموش ہیں کوئی کنکر نہ پھینکئے

مانا کہ آپ کو بھی غم تشنگی نہیں!
اوروں کی طرح ہاتھوں سے ساغر نہ پھینکئے

چہرے کو نفرتوں کا لبادہ اُڑا ہیئے
مجھ کو یقیں کی غار میں ہنس کر نہ پھینکئے

اجزائے ذوق و شوق کہاں منتشر ہوئے
خاکِ خودی میں مجھ کو مکرر نہ پھینکئے

پھر گھر میں گھس پڑے گا ہوا تیز گر چلی
لمحوں کا خوف گھر کے برابر نہ پھینکئے

کچھ تو خیال کیجئے اُجلے لباس کا
کیچڑ میں نیک نامی کا پتھر نہ پھینکئے

مانا کہ زندگی کا الم لازوال ہے
رسوائیاں حیات کی گھر گھر نہ پھینکئے

رقصاں گلی گلی ہیں اندھیروں کی تلخیاں
یہ روشنی شعور کے اندر نہ پھینکئے

حیرت میں پڑ گیا ہے میرا خواب آگہی
دریائے دل میں غم کا سمندر نہ پھینکئے

جسموں کے ہمرکاب رہی لذتِ گناہ
روحوں پہ تو عذاب کا محشر نہ پھینکئے

بچپن کے چند ٹوٹے کھلونوں کو دیکھ کر
کہتے ہیں دوست ہے یہی بہتر نہ پھینکئے

بے نام خواہشیں جو ازل سے خموش ہیں
گہرا کے اُن کو ذہن کے باہر نہ پھینکئے

بھرنے لگے ہیں پھر مری بے چارگی کے زخم
حاضر ہے پھر بدن مرا نشتر۔ نہ پھینکئے

پرواز گھل نہ جائے پشیمانیوں کا زہر
اس روشنی میں جسم سے چادر نہ پھینکئے

انوپما نرنجن



# لاوارث

"آخر سویرا ہوا" نرس سندراما کی زبان سے نکلا۔ ہاں صبح ہوئی، ہلکا اُجالا برف کے پتلے پردے کے اندر سے جھانکتا ہوا کھیل رہا تھا۔ ہاسپٹل کے آنگن کے فوارے سے لان کی طرح پانی اونچائی تک اُڑ کر نیچے گر رہا تھا وہ پانی اس پاس ہریالی پر گلاب چھڑک کر سوئے ہوئے پھولوں کو جگا رہا تھا۔ پھولوں کی پنکھڑیاں ننھے بچوں کی آنکھوں کی طرح ڈرتے ڈرتے کھل رہی تھیں۔ سفید، لال، پیلے پھولوں سے بھری رنگ برنگی دنیا نرس اپنی نیند اُڑی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

یکایک اس کے پاس ایک سفید بادل آیا، وہ بادل نہیں تھا، سفید ساری تھی۔ وہ پاس والے وارڈ کی نرس شاردا تھی۔

"اوہ ہو، کیا سویرا ہو گیا؟" بیماروں کا ٹمپریچر دیکھنے کے لئے شاردا پاس کے وارڈ میں چلی گئی۔ بالٹی کی کھڑکن کے ساتھ آواز آئی۔ "نرس ماں، کافی" وہ ہاسپٹل کا ملازم تھا اور بیماروں کے لئے صبح کی کافی لایا تھا۔ کونے والے نل سے پانی بہہ رہا تھا۔ جمائی لیتے ہوئے ایک ایک کر کے سب بیمار جاگ اٹھے۔ "اماں، نرس ماں، کہہ کر کوئی عورت زچگی کے وارڈ میں تڑپ رہی تھی۔

سندر اما زچگی کے وارڈ کے دروازے کے پاس ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ آدھی سوئی اور آدھی جاگتی ہوئی اپنا کام ختم کر کے آئی ہوئی شاردا سندراما کو ہلا کر پوچھنے لگی؟ "کیوں رہی رات کو سوئی نہیں کیا؟"

سُندر اما نے آنکھیں کھولدیں۔ بھنویں سکوڑ کر چڑچڑاہٹ سے اس نے جواب دیا۔ "نیند! کہاں ہے نیند؟ لیبر وارڈ میں مردہ رکھ کر کیسے سو سکتی ہوں۔"

سننے والی کے سینے سے ہمدردی کا دریا بہہ نکلا۔ "ہائے! کیا وہ مر گئی؟" شاردا سے ہمدردی کے بول سُن کر غصہ پر قابو پاتے ہوئے سندر اما نے غصے سے جواب دیا۔ صبح کے تین بجے۔ نہ جانے سینچر کا سایہ کیسے پڑ گیا۔ مہینے بھر رات کی ڈیوٹی پر لگی رہی، کوئی نہیں مرا، لیکن ڈیوٹی کی اس آخری رات؟"

نوزائیدہ بچی زور سے رونے لگی۔ "رونے دو" کہتی ہوئی وہ وہیں بیٹھی رہی۔ رات جاگی ہوئی سُندر اما کا بے چین من کہہ رہا تھا "منحوس کو نامش ہونے دو۔ تم یہیں بیٹھی رہو۔"

وہ پھر اونگھنے لگی، بچی اور بھی زور سے رونے لگی۔ غصہ سے اٹھ کر سندراما پالنے کے پاس آئی۔ زور سے جھلانے لگی۔ آنکھیں بند کئے لیٹی بچی کے منہ پر اُجالا ناچنے لگا۔

بچی بہت سندر تھی۔ لیکن پیدا ہوتے ہی اس نے اپنی ماں کو کھا لیا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے سُندر اما کے من نے کہا تھا "چلی پردیسی"۔

پالنے سے تھوڑی دور پر اس کی ماں سوئی تھی، بغیر سانس لیتے ہوئے، اس کے منہ پر سفید چادر اڑھا دی گئی تھی۔ اس بے جان جسم کو دیکھ کر سندر اما کا جسم کانپ اٹھا۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جلدی وہ باہر آئی اور زور سے چیخنے لگی۔ "شاردا اس مریض کا پتہ لادو۔"

پتہ لانے کے لئے شاردا چلی گئی، سندرا ماکی نظر باہر آنگن میں کھلے پھولوں کی جانب گئی۔ ایک سرخ پھول کے پاس ہی ایک اور پھول کھلنے کے بعد مرجھا گیا تھا اور زمین کی طرف جھک گیا تھا۔

سُندر اما نے "ہوں" کہتے ہوئے سانس چھوڑی۔

پیچھے سے شاردا نے کہا "پتہ نہیں ہے، سسٹر مریض کے لوگوں نے پتہ نہیں دیا ہے۔"

"یہ عجیب بات ہے کیا اس کا کوئی نہیں ہے؟ — پتی، ماں، باپ، دوست کیا کوئی نہیں تھا؟" اس طرح کے بے شمار سوالات اس کے ذہن میں اُبھرے سات بجے گئے صبح کی ڈیوٹی کی نرس آپہنچی۔

"دیکھو بہن ایک مریض مرچکا ہے، پتہ نہیں کہاں کا ہے؟ ڈاکٹر کے آتے ہی بتا دینا — اس وارڈ کی میری ذمہ داری ختم ہوئی، اب میں چلی، کہتے ہوئے سندر اما وارڈ کے باہر آئی۔

نامعلوم کیوں اس کا من اُداس تھا: تیرا من پتھر کی مانند کٹھور ہے" — اکثر اس کی سہیلیاں کہا کرتی تھیں اس نے کئی مریضوں کو مرتے دیکھا تھا۔ سکرات کے کرب کے بعد مریض دم توڑتا تو اس کو لگتا کہ یہ اچھا ہوا اس کی جان چھوٹی۔

تیسرے دن وہ دوسرے وارڈ میں گئی۔ ایک بار سارے وارڈ کو دیکھ کر اس نے فخر سے کہا تھا "ٹھیک ہے" — وہ وارڈ زچگی کے بعد ماں بچہ کی دیکھ ریکھ کا تھا۔ وارڈ کے دونوں طرف پندرہ پندرہ پلنگ تھے۔ ان بستروں پر صاف چادر اوڑھے بچوں کی دنیا میں اپنے کو بھلا کر سوئی ہوئی مائیں تھیں۔ ان کے پیروں کے پاس ہی بیڈ سے لگے پالنے تھے۔ ان پالنوں میں روتے، ہنستے، کھیلتے کھیلتے سوئے ہوئے ننھے ننھے بچے تھے۔ یہ پالنے ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر جھول رہے تھے ایسا لگتا تھا مانو روتے ہوئے بچوں کو لوری سُنائی جا رہی ہے۔

اس کو دیکھتے ہوئے سندرا ما کی نظر آخری پالنے پر گئی جس کے قریب کوئی بیڈ نہیں تھا۔ تعجب سے وہ اس کے قریب گئی اور جھانکنے لگی۔ ایک ننھی بچی مست سو رہی تھی۔ اس وارڈ کی پچھلے مہینے والی نرس سُندرا ما کو چارج دے کر جانے والی تھی۔ اس سے سُندر اما نے پوچھا "یہ کس کی بچی ہے؟"

اُس نے جواب دیا "یہ ہاسپٹل بے بی ہے اس کی ماں مرچکی ہے۔ دیکھو بہن، اس کے بعد اس بچی کی دیکھ ریکھ تمہارے ہاتھ میں ہے، اس بات کو آپ سے کہنے کے لئے ڈاکٹر نے کہا تھا۔"

سندر اما نے بے چینی سے ناک سکوڑی۔ بار بار اس بچی کو دیکھا، سے یاد آگیا۔ لیبر وارڈ میں پڑا ہوا مردہ، رونے والا بچہ۔

"شاردا اس مریض کا پتہ لادو۔"

"پتہ نہیں ہے سسٹر، مریض کے لوگوں نے پتہ نہیں لکھوایا تھا"

کیا یہ وہی بچی ہے؟

"کاشی یاترا کے بعد بھی سنیچر کا سایہ دُور نہیں ہوا . . . . اس طرح کہتی ہوئی سندرا ما وہیں رہ گئی۔

وارڈ سے تقریباً ملا ہوا رتن گندھ کا پیڑ تھا۔ ڈال ڈال کھل کر مسکراتے ہوئے پیلے پیلے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ ہوا کے جھونکے کے ساتھ ہی سارا پیڑ ایک ساتھ مسکرا اٹھتا اور پھولوں کی بارش ہونے لگتی۔

وارڈ کی کھڑکیوں کی راہ سے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہی پھول اور روشنی اندر آجاتے۔ جب کبھی پھول بچوں پر پڑتے، مائیں اُن کو ہٹا دیتیں۔ مگر زیادہ تر پھول اس اکیلے پالنے پر ہی گرا کرتے تھے۔ اس وقت بچی رونے لگی۔ اس وقت راگ اور سُر ملانے کے لئے دوسرے بچے بھی اپنے مختلف ساز بجانے لگے۔

سندر اما وارڈ میں تھی نہ بچوں کا رونا سنتے ہی غصہ میں آگئی۔ "کیا کر رہی ہو بچوں کو خاموش کراؤ" وہ چلائی۔

مائیں ہوشیار ہو کر اپنے اپنے بچوں کو سمجھانے لگیں۔ ایک گاؤں کی عورت اپنے قریب کے بستر پر لیٹی ہوئی دوسری عورت سے کانا پھوسی کرنے لگی۔ "یہ نرس بہت غصے والی ہے۔"

مگر رونے کی آوازیں نہ رکیں۔ یہ دیکھ کر سندر اما اُٹھ کر چلی آئی۔

"کون رو رہا ہے، کس کا بچہ ہے۔ میری آواز سے نہیں ڈرنے والا بچہ کون ہے۔"

وہ چلتی ہوئی آئی اور آخری پالنے کے پاس رک گئی۔ "اہا، کتنی ہمت ہے لڑکی کی — اس بچی پر اس کو بے حد غصہ آیا۔ روتی ہوئی بچی کو وہ اپنے کھردرے ہاتھ سے تھپکنے لگی۔ اس کے جواب میں بچی چیخنے لگی۔ ایک ماں نے جو لیٹی ہوئی تھی، دھیرے سے کہا۔ "نرس ماں، گود میں لے لو۔"

سندر اما آپے سے باہر ہو گئی اور غصہ سے اس نے کہا۔

"چپ، سوجا"۔ اس یتیم بچی کی طرف اس کی بے مروتی کو دیکھ کر وارڈ کی سبھی مائیں مایوس ہو گئیں۔ بچی روتے روتے تھک کر سو گئی۔ تب ایک ماں نے کہا۔

"نو مہینے بچی کو کوکھ میں لئے ہوتی تو پتہ چلتا!"

دوسری نے کہا "یتیم بچی ہائے افسوس، یتیم بچی"

سندر اما اسی طرح کھڑی رہی گویا اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ نہ چاہنے پر بھی یہ آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی۔ نہ مٹنے والی کسک چھوڑ گئی۔

کام ختم ہوا، سانجھ آئی اور رات بھی آگئی لیکن دن کو سُنی ہوئی بات کیڑے کی طرح اس کے من کو کریدنے لگی۔ اس رات اس کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔

بیاہ اور بچوں سے اس کو ازلی نفرت تھی اس طرح اس نے جھیس برس بتا دیئے تھے۔ یہ بھی ایک زندگی تھی! — اس طرح سوچتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی۔

دن بیت گئے، بچی کو نہلانا، کپڑے پہنانا، پالنے میں سلانا اور جھلانا، سب کام اس کی قسمت میں لکھا ہوا تھا۔ پہلے دو دن کا کام میکانکی انداز میں پورا ہوگیا تھا ایک دن ایسا ہوا کہ وارڈ میں آتے ہی ایک لمحہ کے لئے سُندر اما پالنے کے پاس کھڑی ہوگئی۔ آنکھ پھاڑ کر دیکھتی ہوئی بچی مسکرا رہی تھی۔ وہ مسکراہٹ چاندنی کی طرح تھی اس کے گالوں میں گڑھا پڑ رہا تھا۔ سیاہ آنکھیں، گھنگھریالے بال — من کے تاروں کو کسی نے چھیڑ دیا۔

بچی کو سندر اما نے گود میں لے لیا: بچی کا ہاتھ اُس کے سینے پر کھیل رہا تھا اس کا من کسی چیز کی تلاش کر رہا تھا: بچی کے اس عمل سے سُندر اما کو ایک عجیب انجانا تجربہ ہو رہا تھا۔ پھر بھی اپنی ہار کو چھپانے کے لئے سندر اما سب پر خفا ہوئی۔

"آج مجھے کیا ہوا ہے؟" اس بات کو سوچ کر وہ اپنے آپ کو کوسنے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو صرذر کو سالیکن پھر بھی ہار اس کی تھی۔

ایک دن سُندر اما بچی کو کھلا رہی تھی۔ اتنے میں کسی کی پکار سُنائی دی۔ گھبرا کر سندر اما نے بچی کو پالنے میں لٹا دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی اجنبی کی نگاہ اس پر اس کی ایسی حالت میں پڑے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اسے کسی نے نہیں پکارا تھا وہ اس کے من کا واہمہ تھا۔

دوسروں کی آنکھ بچا کر بچی کو پیار کرنے والی کو خود پر غصہ آتا اس سے اس کا منھ سرخ ہو جاتا۔

"کیا میں اس ننھی بچی کی دامی ہوں" ایک لمحہ کے لئے اس خیال نے اس کے من کو ٹھیس پہونچائی۔

"اس بچی کو میں کبھی پیار نہیں کرتی" سندر اما نے اپنے من میں فیصلہ کر لیا۔ اپنے اس خیال کو تقویت دینے کے لئے بچی کے گال میں چبھونے کے لئے اپنا ہاتھ اس کی طرف لے گئی۔ آگے بڑھی ہوئی انگلیاں دھیمے سے بچی کے گال تھپتھپانے لگیں۔

بچی روئی نہیں مسکرانے لگی۔

اپنی اس غیر یقینی حالت سے بچنے کے لئے کام کا بہانہ کر وہ وہاں سے چل دی۔

پتھر پگھل کر موم بن گیا۔ اس کے کٹھور آہنی سینے میں اب پریت اور ممتا چھلکنے لگی۔

اس بچی سے سندر اما کو پیار تھا جب کبھی وہ بچی ہنستی تو اس کو لگتا کہ اس کے منہ سے پھول برس رہے ہیں بچی کی آنکھیں اس کو دو ستاروں کی طرح نظر آنے لگیں اب وہ بچی کا رونا سہہ نہیں سکتی تھی۔ سارا کام چھوڑ کر وہ اُسے بہلانے آجاتی تھی . . . .

وہ پیاری بچی ہاسپٹل میں ایک مقناطیس بن گئی۔ اسے دیکھنے کے لئے دوسرے وارڈوں سے نرسیں آیا کرتی تھیں۔ کوئی اسے اٹھا کر پیار کرنا چاہتی تو سُندر اما اُسے زور سے ڈانٹتی "اُس کو چھوؤ مت"

"نہایت غصہ ور" کے نام سے مشہور سندر اما کے حکم کی کوئی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تھا پھر بھی کوئی ایک نرس چھیڑ چھاڑ کے لئے کہا کرتی "ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟ کیا بچی کا نام نہیں رکھا گیا سندر اما"

بچی کا نام رکھنے کا حق اس کا ہے یہ سن کر سندر اما کو بے حد خوشی ہوئی

"نام کیوں نہیں ہے؟ ہاسپٹل بے بی کا میں نے نام رکھا ہے جو ہی دیکھو تو ہی اس کا دہانہ کلی کی طرح ہے کہ نہیں۔"

ایک نرس نے مسکراتے ہوئے اس کو چھیڑا "کیا سچ مچ جو ہی ہے؟"

"ہاں یقیناً اس کا نام 'جو ہی' ہی ہے۔"

اس کے بعد بھی وہ سب بچی کے نئے نئے نام تجویز کرنے لگیں جن کو سن کر اس کے غصہ کا پارہ چڑھ گیا اور اس نے کہا "بس چلی جاؤ" "بچی کا نام رکھنے کا حق میرا ہے بچی کو پالنے والی میں ہوں۔ تم نہیں۔"

سندر اما نے بچی کے کپڑے سلانے کے لئے سوچا، بچی مسکرائی۔ مانو اس اس کو اس بات کا پتہ چل گیا۔ بڑی ڈاکٹر نے ایک دن بچی کا نیا فراک دیکھ کر کہا تھا "گھر میں ریشم کے دو ایک ٹکڑے ہیں بھیج دیتی ہوں، بچی کو فراک سلوا کر پہنا دو —"

سندر اما نے ان کپڑوں کو بھی سلوا لیا، اس سے اُسے تشفی نہیں ہوئی اپنے پاس جو روپیہ تھا اس میں سے کچھ روپے لے کر بچی کے سوئٹر کے لئے اُون لانے کے لئے سندر اما دکان گئی۔ گلابی رنگ کا اُون اس کو پسند آیا۔ وہ رنگ بچی پر کھلتا تھا گلابی سوئٹر پہنی ہوئی بچی کا تصور کرتی ہوئی اس نے اُون خرید لیا: بچی کا سوئٹر تیار ہوگیا۔ ایک نرس نے رنگین کپڑوں کا ایک فراک لا دیا۔ اسی طرح سے ایک ماں نے جو وارڈ میں تھی ٹالکم پوڈر کا ایک ڈبہ دیا اور کہا کہ یہ

ہاسپٹل بے بی کے لئے ہے۔" یہ دان سُندرا آما کو پسند نہیں تھا مگر بچی کے سکے کے پیشِ نظر اس نے لینے سے انکار نہیں کیا: بچی کی چیزیں دن بہ دن بڑھنے لگیں۔ دواؤں کی بڑی الماری کا ایک حصہ اس کے لئے کافی نہیں ہو رہا تھا۔

بچی گول مٹول ہوتی جا رہی تھی اپنے دبلے پتلے بچے کا موازنہ کرتے ہوئے ایک بی بی نے کہا تھا۔ ماں نہ رہنے پر بھی یہ بچی کتنی سندر ہے! اس بات کو سن کر سندرا آما شیرنی کی طرح بپھر گئی "چپ رہ نظر نہ لگا!"

مہینہ بیت رہا تھا۔ ڈیوٹی کا آخری دن قریب آ رہا تھا۔ سندرا آما کے من میں ہلچل مچنے لگی۔ کوکو میں نہ معلوم کیوں درد کی ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔ صبر کو وہ بھول چکی تھی اپنے درد کو چھپانے کے لئے اس نے غصے کا سوانگ رچا لیا۔ ہر دن سے زیادہ وہ مریضوں پر غصہ کرنے لگی۔ اگلے مہینے اُسے دوسرے وارڈ میں جانا تھا۔ پیاری جوہی، جس کو اس نے متن سے پالا تھا۔ "اب میں اُسے پیار نہیں کر سکتی۔ کھلا نہیں سکتی۔ کل سے میں اجنبی ہوں، یہاں دوسرے وارڈ کی نرس آجائے گی" اس خیال سے وہ کانپ گئی۔

اتنے سال میں اکیلی رہی اس کے بعد میں کیوں اکیلی نہیں رہ سکتی۔ اس بچی کو بھولنا کون بڑی بات ہے۔"

مگر وہ جہاں بھی بیٹھتی اس کے سامنے بچی ہی کی تصویر گھومنے لگتی۔ وہ کسی بھی بچے کے رونے کی آواز سنتی تو لگتا کہ جوہی رو رہی ہے۔ من میں بچی کے کھیلوں کا تصور آتا۔

"نہیں میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتی" سندرا آما سے کھانا نہیں کھایا گیا۔ رات میں نیند تک اس کے پاس نہیں پھٹکی۔

آخر وہ دن بھی آگیا۔ سندرا آما سینہ میں جذبات کا طوفان چھپائے اس پالنے کے پاس آکر رک گئی۔

معصوم جوہی منہ میں انگلی لئے روشنی کو تک رہی تھی: بچی کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے من میں دکھ اُمڈ آیا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"اب تک میں اس بچی کی ماں تھی آج سے جوہی یتیم ہو گئی۔ پالنے پر ہاتھ رکھ کر سندرا آما وہیں کھڑی ہو گئی۔ اُسے ایسا لگا مانو اس کے سینے میں دھڑکن سدا کے لئے رُک گئی ہو۔ سنسار کے سارے کاروبار سدا کے لئے رک گئے ہوں۔

نہ معلوم اس طرح کتنا سمے بیت گیا۔ سندرا آما سنبھل کر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی بڑے ڈاکٹر کے کمرے کی اور چلی۔ سوکھے ہونٹوں کو تر کرتی ہوئی سندرا آما نے کہا

"ڈاکٹر اس ہاسپٹل بے بی کو مجھے دیدو، میں اسے پال کر بڑا کروں گی۔"

ڈاکٹر کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا، وہ غیر یقینی سے ایک لمحہ کے لئے سندرا آما کو دیکھتی رہیں اور پھر اُن کے ہونٹوں پر دھیمی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ (ترجمہ: اعجاز الدین فیروز)

# غزل

## (نذرِ غالب)

مکاں میں قید ہیں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
عجیب لوگ ہیں بس اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

کوئی تو آشنا چہرہ نظر سے گزرے گا
ہم اپنے شہر کی ہر رہ گزر کو دیکھتے ہیں

نہ قافلوں کا پتہ ہے نہ دشت و صحرا میں
ہے گرد چار طرف ہم جدھر کو دیکھتے ہیں

کسی کے منتظر وہ بھی تو ہیں ہماری طرح
ہم اپنی راہ کے ہر اک شجر کو دیکھتے ہیں

سفر طویل ہے دشتِ وفا ہے اور تو ہے
ہم ایک بار تجھے پھر سفر کو دیکھتے ہیں

ہمارے واسطے نکلے گا آفتاب نیا
یہ سب سے پہلے ہم اُٹھ کر سحر کو دیکھتے ہیں

جعفر عسکری




گزشتہ سال جون جولائی میں ایک سمینار منعقد ہوا تھا جس میں پرائمری، سیکنڈری اور ٹیچرس ٹریننگ اسکولوں کے اساتذہ اور محکمہ تعلیم کے سائنس سے متعلق افسران کو سائنس پڑھانے کے جدید طریقوں کی تربیت دی گئی۔ اس کام کے لئے جناب ڈاکٹر ریچرڈ نیزل ( Dr. Richard Netzel ) اور پروفیسر گارڈن پیٹرسن (Gordon Peterson) صاحب امریکہ سے تشریف لائے تھے۔ یہ حضرات دو مختلف نصابوں کی نمایندگی کرتے ہیں جن کا تجربہ اس وقت امریکہ کے کنڈر گارٹن اور پرائمری اسکولوں میں کیا جا رہا ہے۔ ابھی تک ان کے جو نتائج نکلے ہیں وہ نہایت

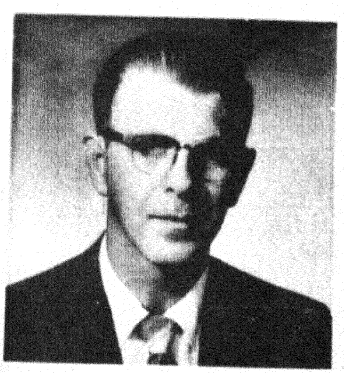

گارڈن پیٹرسن

تسلی بخش ہیں۔ ان میں خاص بات یہ ہے کہ بچوں کو نہ تو کتابیں پڑھنی پڑتی ہیں اور نہ کچھ رٹنا پڑتا ہے۔ پھر بھی وہ دوسرے بچوں کے مقابلے میں زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں۔

یہ نصابات سائنس کے موجودہ تصور پر مبنی ہیں جو قدیم تصور سے بالکل مختلف ہے۔ پہلے مظاہر قدرت کے باضابطہ علم کو جس میں اصول، قانون، فارمولے اور مساوات وغیرہ شامل ہوتے، سائنس کہا جاتا تھا۔ دراصل یہ علم ایک مخصوص طریقہ کار سے حاصل کیا جاتا ہے جو سائنس کی قدیم تعریف میں شامل نہیں تھا۔ سائنس کے جدید تصور میں انسان کے قدرتی ماحول کا علم اور وہ طرز عمل جس سے یہ علم ظاہر کیا جاتا ہے، دونوں ہی شامل ہیں۔

اس وقت تک سائنس کے جو بھی نصابات تیار کئے گئے اُن کا مقصد بچوں کو سائنس کے اصولوں، فارمولوں، نظریات وغیرہ سے واقف کرانا تھا۔ سائنسی طریقۂ کار یا طرز عمل کا کہیں کوئی ذکر نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طلبا نے سائنس کا علم تو حاصل کر لیا لیکن سائنسی طریقۂ کار نہ سیکھ سکے جس سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ یہ آگے چل کر کسی تحقیقی کام کے قابل نہ بنے اور نہ اُن کی روزمرہ زندگی پر سائنس کا کوئی اثر پڑا۔ اُن کے انداز تفکر اور طرز عمل میں کوئی نمایاں فرق نہ آیا۔

موجودہ دور میں سائنس ترقی یافتہ ممالک کے کلچر کا ایک حصہ بن چکی ہے اور ترقی پذیر ممالک کے کلچر میں رفتہ رفتہ شامل ہوتی جا رہی ہے۔ ان ممالک میں ایک صنعتی سماج کی تشکیل ہو رہی ہے جس میں صرف وہی افراد مناسب جگہ حاصل کر سکیں گے، جن کا انداز تفکر اور طرز عمل سائنٹفک ہو کیونکہ صنعتی سماج کی بنیاد سائنس پر ہے۔ اس لئے صرف یہی افراد اس سماج کی ترقی میں بھی معاون ہو سکتے ہیں۔ اب معمولی خواندگی کافی نہیں ہے بلکہ سائنسی خواندگی (Scientific Literacy) کی ضرورت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر فرد کو سائنس کا بنیادی علم ہو جس سے وہ اپنی روزمرہ زندگی میں فیض حاصل کر سکے اور ساتھ ہی ساتھ اس کا انداز فکر اور طرز عمل سائنٹفک ہو۔

اسی ضرورت کے پیش نظر دو منصوبے تیار کئے گئے، جو S.A.P.A. (Science, A Process Approach) اور S.C.I.S (Science Curriculum Improvement Study) کے نام سے مشہور ہیں۔

S.A.P.A. کنڈرگارٹن سے درجہ ششم تک سائنس کی تعلیم کا ایک بالکل اچھوتا طریقہ پیش کرتا ہے۔ یہ طریقہ تعلیم گانے (Gane) کے نظریہ پر مبنی ہے۔ اس ماہر تعلیم کا نظریہ یہ ہے کہ سائنس داں اپنی تحقیقات کے لئے کچھ مخصوص طریقوں کو استعمال میں لاتا ہے۔ مثلاً مشاہدہ کرنا (Observing)

خصوصیات کے لحاظ سے درجہ بندی کرنا (Classification) پیمائش کرنا (Measuring) پیشگوئی کرنا (Prediction) مفروضات قائم کرنا (Formulating Hypothesis) انھیں تجربوں کی کسوٹی پر کسنا اور آخر میں نئے قوانین مرتب کرنا۔ وہ ان ہنرمندیوں (Skills) کو برسوں کی مشق کے بعد سیکھتا ہے اور اُن ہی کی مہارت پر اس کی کامیابی منحصر ہے۔ اس لئے گائے تجویز کرتا ہے کہ بچوں کو یہ ہنر اپنی بہت سادہ اور آسان شکل میں کنڈرگارٹن ہی سے سکھانے شروع کر دیئے جائیں۔ چند سالوں کی مشق سے وہ انھیں سیکھ جائیں گے اور بنیادی طور پر ایک سائنسداں کی طرح سے کام انجام دینے لگیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہر بچہ آگے چل کر سائنسداں بن جائے گا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ سائنس کے طریقۂ کار سیکھ جائے گا جو سائنس کو سمجھنے کے لئے اشد ضروری ہے۔ دوسرے یہ طریقۂ کار جن کا تعلق ذہن سے ہے رفتہ رفتہ بچے کے دماغ کا ایک جزو بن جاتے ہیں جس کی وجہ سے اُسے دوسرے مضامین کو بھی سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اس کے علاوہ یہ ذہنی ہنر زمانہ حال اور مستقبل دونوں ہی میں بچے کو زندگی کے روز مرہ مسائل حل کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔

ماہر تعلیم، ماہر نفسیات اور سائنسدانوں نے کافی غور و فکر اور تحقیق کے بعد آٹھ بنیادی طریقۂ کار (Basic Process) اور پانچ مجموعی طریقۂ کار (Integrated Process) تلاش کئے ہیں۔ مذکورہ طریقے کنڈرگارٹن سے چھٹی جماعت تک سکھا دیئے جاتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں وہ سائنسی طریقۂ کار سیکھ جاتا ہے اور ایک تجربے سائنسداں کی طرح کام کرنے لگتا ہے۔ یہ بنیادی اور مجموعی طریقۂ کار اور اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

## بنیادی طریقۂ کار

۱۔ مشاہدہ (۲) خصوصیات کے اعتبار سے درجہ بندی کرنا (۳) اعداد کا استعمال (۴) پیمائش (۵) وقت اور مکان کا تعلق (۶) ترسیل (۷) پیشگوئی (۸) نتیجہ اخذ کرنا

## مجموعی طریقۂ کار

۱۔ افعالی تعریف مرتب کرنا (Defining Operationally)
۲۔ مفروضہ ترتیب دینا (۳) متعلقہ مواد کی تشریح کرنا
۴۔ متاثر کرنے والے حالات کو منضبط کرنا (Controlling Variables) (۵) تجربہ کرنا

### مشاہدہ :۔

وہ علم جو انسانی حواس خمسہ کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے مشاہدہ کہلاتا ہے اُس کی مشق کرانے کے لئے ایسے مشاغل تجویز کئے گئے ہیں جن میں بچہ کو اپنے حواس کو استعمال کرنے کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً چیزوں کا رنگ، اُن کی شکل و صورت اور چمکدار ہونے یا نہ ہونے میں تمیز کرنا۔ دو چیزوں کو چھو کر یہ معلوم کرنا کہ کس کا درجۂ حرارت کم ہے اور کس کا زیادہ، یا یہ بتانا کہ ان میں کونسی چیز چکنی کونسی کھردری، سخت یا ملائم ہے۔ مختلف ذائقوں اور آوازوں میں فرق کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح اسے اپنے حواس کا ٹھیک استعمال آجاتا ہے۔ ان مشاغل کی ترتیب کچھ اس طرح ہے کہ اُن کا آغاز مختلف اشیاء اور اُن کی خصوصیات کی تمیز کرنے سے کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد طبیعیاتی نظاموں میں تبدیلی مثلاً پانی کا بھاپ بننا یا بھاپ کا پانی بننا وغیرہ دیکھنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ پھر منضبط مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ جیسے دو برتنوں میں برابر مقدار میں پانی لے کر ایک میں نمک ملا دیتے ہیں اور دوسرے کو سادہ رکھتے ہیں دونوں برتنوں میں پانی کو اس حد تک گرم کرنے کو کہا جاتا ہے کہ وہ اُبلنے لگتا ہے۔ تھرمامیٹر کی مدد سے دونوں کا نقطۂ اُبال معلوم کرنے کو کہا جاتا ہے۔ اس تجربے سے بچے کو پتہ چلتا ہے کہ جس پانی میں نمک گھلا ہوتا ہے وہ کم درجۂ حرارت پر اُبلتا ہے اس قسم کے مشاہدات کو ہی منضبط مشاہدہ کہتے ہیں۔ اس سے اگلا قدم مختلف مشاہدات کو ترتیب دینے کی مشق کرانا ہوتا ہے۔ انجام کار بچہ مشاہدہ کا فن سیکھ جاتا ہے۔

### درجہ بندی کرنا

خصوصیات کے اعتبار سے اشیاء کی درجہ بندی کرنے اور سمجھنے کی ضرورت قدم قدم پر پڑتی ہے۔ کیونکہ سائنسدانوں نے پیڑ پودوں، کیڑے مکوڑوں، جاندار اور بے جان چیزوں کی درجہ بندی مختلف طریقوں سے کی ہے مثلاً پھول اگانے والے اور نہ اگانے والے پودے، گھاس پھوس، جھاڑی اور درخت وغیرہ۔ اسے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچوں کو یہ علم ہو کہ ایک ہی قسم کی چیزوں کی درجہ بندی ان کی مختلف خصوصیات کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے

اس مشق کی ابتدا بالکل سادہ طریقہ سے کیجاتی ہے مثلاً کنڈرگارٹن کے بچوں کو مختلف رنگوں، شکل و صورت وغیرہ کے بٹن دے دیئے جاتے ہیں اور اُن سے ایک قسم کے بٹنوں کو الگ کرنے کو کہا جاتا ہے وہ مختلف طریقوں سے ان کی چھٹائی کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی ایک ہی رنگ کے بٹن الگ کرتا ہے، کوئی شکل و صورت کے لحاظ سے اور کئی بچے مختلف خصوصیات کا ایک ساتھ خیال رکھ

کرانھیں چھانٹتے ہیں۔ آخر میں اُستاد دریافت کرتا ہے کہ کس نے ٹھیک چھٹائی کی ہے۔ بچے اس سوال کا مختلف جواب دیتے ہیں لیکن پھر استاد کی مدد سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ درجہ بندی مختلف خصوصیات کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے۔

اس طرح یہ مشق معمولی چیزوں، طبیعیاتی اور حیاتی نظاموں سے شروع ہو کر کئی درجات میں تقسیم تک پہونچکر تدوین اور جدول تیار کرنے تک پہونچتی ہے۔ اس کی ابتدا مادّی چیزوں کو جسامت کے اعتبار سے ترتیب دینے اور شمار کرنے سے کی جاتی ہے۔ اس کے بعد جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم کرنا یا اوسط لگانا اور اعشاریہ وغیرہ کا استعمال سکھا دیا جاتا ہے۔

## پیمائش

عملی طور پر مختلف لمبائیوں کو ترتیب دینے سے شروع کر کے، لمبائی، رقبہ، حجم، وزن، درجہ حرارت اور رفتار وغیرہ معلوم کر کے طریقے اور اُن کے پیمانوں تک کے استعمال سے واقف کرا دیا جاتا ہے۔

## وقت و مکان کا تعلق

ریل گاڑی زمین پر چلتی ہے، ہوائی جہاز ہوا میں اُڑتا ہے اور راکٹ خلا میں سفر کرتا ہے۔ ان سب کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچنے میں وقت لگتا ہے اس طرح حرکت، وقت اور مکان ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔ اس تصوّر کو واضح کرنے کے لئے پہلے چیزوں کی صورت شکل سے آشنا کرایا جاتا ہے پھر مختلف حرکات دیکھنے کا موقع دیا جاتا ہے جیسے چیز کا نیچے حرکت کرنا، ایک طرف سے دوسری طرف جانا، سیدھے ٹیڑھے میڑھے راستے پر گولائی میں یا سیدھے خط پر چلنا۔ اس کے بعد خطی اور زاویائی رفتار نکالنی سکھائی جاتی ہے جو تجربات اس سلسلے میں کئے جاتے ہیں وہ وقت و مکان کے تعلق کی وضاحت کر دیتے ہیں اور بچہ اس رشتہ کو بخوبی سمجھ لیتا ہے۔

## ترسیل

جو بھی علم حاصل کیا جاتا ہے اُسے دوسروں تک پہونچانے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس کا ایک طریقہ زبان ہے۔ الفاظ کے ذریعہ اُسے دوسروں تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ سائنس کا کام صرف اس واحد ذریعہ سے نہیں چل سکتا۔ سائنس کے حقائق کی ترسیل گراف، مختلف شکلوں اور تصویروں وغیرہ سے بھی کی جاتی ہے چنانچہ آسان مشاغل کے ذریعہ یہ سب چیزیں بچے کو سکھا دی جاتی ہیں۔

## پیش گوئی

ڈاکٹر تھیئر نے پیش گوئی کی ایک دلچسپ مثال دی ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ جانتے ہیں کہ ایک شخص کی جیب خالی ہے اور وہ کسی ریستوران میں جا کر کھانا پینا شروع کر دیتا ہے تو آپ پیش گوئی کر سکتے ہیں کہ اُسے کس قسم کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آپ کی یہ پیش گوئی دو مشاہدات پر مبنی ہوگی۔ اول اس شخص کی جیب خالی ہے، دوم ریستوران میں کھانے پینے کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اس کی حیثیت صرف امکانی ہے۔ اگر اس ریستوران میں اس کا اُدھار کھاتا ہے تو اُسے کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ سائنس کی سب ہی پیش گوئیاں امکانی ہوتی ہیں۔

ابتدا میں بچوں کو پیش گوئی کی مشق کے لئے حاصل کردہ مواد کو گراف کی شکل میں ظاہر کرنا سکھایا جاتا ہے۔ اس گراف کو آگے یا پیچھے کی طرف بڑھا کر وہ بات بھی بتائی جا سکتی ہے۔ جس کا مشاہدہ براہ راست نہیں کیا گیا مثلاً اگر ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۵ء تک گیہوں کی فی کیلو قیمتوں کا جو اس دوران گھٹتی بڑھتی رہیں ایک گراف بنا لیں تو اس کی مدد سے ۱۹۶۶ء میں گیہوں کے بھاؤ کی پیش گوئی کی جا سکتی ہے اور یہ بھی بتایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۶ء میں کیا بھاؤ رہا ہوگا۔ بشرطیکہ باقی حالات یکساں رہے ہوں۔

## نتیجہ اخذ کرنا

مشاہدات کی بنا پر نتیجہ اخذ کرنا معمولی تجربات سے سکھایا جاتا ہے مثلاً بچوں کو چینی، نمک، کوئلہ، کھریا وغیرہ کو الگ پانی میں ڈالنے کو کہا جاتا ہے۔ چینی اور نمک تھوڑی دیر میں غائب ہو جاتے ہیں لیکن کوئلہ تیرتا رہتا ہے اور کھریا بھی غائب نہیں ہوتی۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ چینی اور نمک پانی میں گھل جاتے ہیں لیکن کوئلہ اور کھریا نہیں گھلتے ہیں۔

## افعالی تعریف مرتب کرنا

افعالی تعریف ایسی تعریف کو کہتے ہیں جو ایسے تجربات کی طرف اشارہ کرتی ہے جس سے وہ شئے بلا مغالطہ پہچانی جا سکے۔ مثلاً کاربن ڈائی آکسائڈ کی غیر افعالی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ یہ ایک گیس ہے جو کاربن اور آکسیجن کے کیمیاوی امتزاج سے بنتی ہے جس میں ان کا تناسب ۱:۲ ہوتا ہے۔ اس تعریف سے کاربن ڈائی آکسائڈ کا آسانی سے پہچاننا بہت مشکل ہے چنانچہ اس کی افعالی تعریف یہ ہوگی کہ یہ ایک گیس ہے جس میں شفاف چونے کا پانی ڈالنے سے دودھیا ہو جاتا ہے۔ اس طرح بچہ کاربن ڈائی آکسائڈ کی شناخت فوراً کر سکتا ہے اس قسم کی تعریفات مرتب کرنے کے لئے بچوں کو عملی مسائل دیئے جاتے ہیں مثلاً بجلی کے ایک سرکٹ میں سوئچ لگانے کو کہا جاتا ہے اور پھر سوئچ کی افعالی تعریف

دریافت کی جاتی ہے۔ بچہ اس کی تعریف بیان کرتا ہے کہ سوئچ ایک ایسی چیز ہے کہ اگر اسے اس قسم کے سرکٹ میں لگایا جائے جیسا اس نے تیار کیا ہے تو اس کے ذریعہ بلب کو جلایا بجھایا جا سکے۔ اس تعریف سے دوسرا شخص سوئچ فوراً شناخت کر سکتا ہے

## مفروضہ مرتب کرنا

مشاہدات کی بنیاد پر جو قیاس کیا جاتا ہے اسے مفروضہ کہتے ہیں۔ اس کی تصدیق مزید مشاہدات اور تجربات سے کی جاتی ہے۔ اگر یہ اُن پر پورے اُترتے ہیں تو مفروضہ قائم رہتا ہے ورنہ اس میں ترمیم کر دی جاتی ہے یا اسے رد کر دیا جاتا ہے۔ مفروضات مرتب کرنا اس طرح سکھایا جاتا ہے کہ بچہ تجربوں کے دوران جو واقعات دیکھتا ہے اُسے اُس کی وجہ کا اندازہ لگانے کو کہا جاتا ہے اور پھر اس قیاس کی تصدیق تجربات سے کرائی جاتی ہے تو وہ تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً بچہ تجربہ کر کے یہ مشاہدہ کرتا ہے کہ لوہے، تانبے اور نکل میں سے بجلی آسانی سے گزر سکتی ہے۔ اس مشاہدہ کی روشنی میں یہ مفروضہ مرتب کرتا ہے کہ دھاتوں میں سے بجلی آسانی سے گزرتی ہے۔ اس کی جانچ کرنے کے لیے وہ مزید دھاتوں کے ساتھ وہی تجربات کرتا ہے اور اس طرح اپنے مفروضہ کو قابلِ اعتماد بنا دیتا ہے۔

## متعلقہ مواد کی ترجمانی کرنا

مشاہدہ سے حاصل شدہ مواد کو مختلف صورتوں میں منظم کیا جاتا ہے۔ کبھی یہ بیانیہ ہوتا ہے۔ کبھی گراف کی شکل میں۔ کبھی اعداد و شمار کی صورت میں چنانچہ اس کی مشق گراف کی شکل سے رجحان دریافت کر کے، یا بیان کی ہوئی باتوں سے مساوات بنوا کر یا اسی قسم کے دوسرے طریقوں سے کرائی جاتی ہے۔

## متاثر کرنے والے حالات کو منضبط کرنا

اگر کسی واقعہ پر کئی چیزیں اثر انداز ہوتی ہے۔ ان میں جن چیزوں کا اثر بیک وقت دیکھنا ہوتا ہے صرف انہی کو اثر انداز ہونے دیا جاتا ہے اور اُسے باقی چیزوں سے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً بیج سے انکر پھوٹنے کے لیے گرمی، ہوا اور پانی کی ضرورت ہوتی ہے اگر بیج پر صرف گرمی اور ہوا کا اثر دیکھنا ہوتا ہے تو اُسے پانی سے دُور رکھنا ہوگا۔ چنانچہ اسی قسم کے مسائل سے دوچار ہونے پر بچہ ان چیزوں پر قابو پانا سیکھ جاتا ہے جن کے اثر کو اس تجربہ میں دور رکھنا ہے اس ہی قسم کے عملی تجربات کی کارکردگی متاثر کرنے والے حالات کو منضبط کرنا کہلاتی ہے۔

## تجربات کرنا

مسائل کو حل کرنے کے لیے تجربات کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے اس فن کو سکھانے کے لیے شروع میں آسان اور پھر مشکل مسائل بچہ کے سامنے رکھے جاتے ہیں جنھیں حل کرنے کے لیے وہ تجربات خود سوچتا ہے اور کرتا ہے مثلاً یہ مسئلہ ہو سکتا ہے کہ کھانا پکانے کے برتن جلد گرم ہونے کے اعتبار سے پتیلی کے مناسب ہونگے یا تانبے کے۔ اس کا جواب دینے کے لیے ایسا تجربہ کرنا پڑے گا جس سے یہ پتہ چل سکے کہ ان دھاتوں میں سے کون سی دھات جلد گرم ہوتی ہے اور کون سی دیر میں۔ چنانچہ اس کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک ہی موٹائی اور لمبائی کے تانبے اور پیتل کے تار لیے جائیں اور ان میں ایک ہی دوری پر موم کی ایک ایک گولی چپکا دی جائے۔ اس کے بعد ان دونوں کے ایک ایک سرے کو بیک وقت ابلتے پانی میں ڈبو دیا جائے جس تار سے چپکی ہوئی گولی پہلے گر جائے وہ جلد گرم ہوا۔ اس تجربہ سے انہیں اپنے مسئلہ کا حل مل جائے گا۔ اسی طرح کے مسائل کے حل تلاش کرنے کی کوشش سے بچے تجربات کرنا سیکھ جاتے ہیں۔

## تدریسی ادب (Instructional Literature)

استادوں کے لیے مضمون اور درس و تدریس سے متعلق مخصوص کتابیں لکھی گئی ہیں اور ہر طریقۂ کار کو سکھانے کے لیے بہت سی مشقیں تیار کی گئی ہیں جن کی خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ سرورق پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس مشق کے کرانے سے پہلے پھیلی کون کون سی مشقیں ضروری ہیں اور یہ مشق آگے آنے والی کن مشقوں کے لیے تیار کر دیتی ہے۔

۲۔ ہر مشق کے مقاصد عملی ہیں اور عموماً اس کے اختتام پر حاصل ہو جاتے ہیں

۳۔ مشق میں کام آنے والے ضروری سامان کی فہرست دی گئی ہے تاکہ اسے پہلے ہی سے فراہم کر لیا جائے۔

۴۔ وہ نئے الفاظ لکھ دیئے گئے ہیں جن کا مشق میں استعمال ہونے کا امکان ہے تاکہ استاد ان کی تشریح کے لیے تیار رہے۔

۵۔ اس کے بعد بہت تفصیل کے ساتھ اس مشق کو بچوں سے کرانے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے جو صرف استاد کی رہنمائی کے لیے ہے اس میں موقع و محل کے مطابق ترمیم کی جا سکتی ہے۔

۶۔ ہر مشق کے آخر میں بچوں کا امتحان لینے کے لیے دو قسم کے آزمائشی مسائل تجویز کیے گئے ہیں۔ پہلے مسئلہ کا حل کئی بچے مل کر خود تلاش کرتے ہیں اور دوسرے مسئلے کا حل بچہ انفرادی طور پر تلاش کرتا ہے۔ یہ دونوں ہی قسم کے مسائل بچہ کے لیے نئے ہوتے ہیں اور انھیں حل کرنے کے لیے دوران مشق حاصل کردہ واقفیت اور تجربہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان مسائل کو کامیابی کے ساتھ حل

کرلینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مشق کے مقاصد حاصل ہو گئے۔

## نصاب کی خصوصیات

۱۔ بچہ کو کسی کتابچے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ کسی مضمون کو یاد رکھنے کی شعوری کوشش کرنی پڑتی ہے وہ سب کچھ عملی طور پر سیکھتا ہے۔ اس وجہ سے زبان کی استعداد اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔

۲۔ ہر مشق کے مقاصد کچھ عملی کام سیکھنے سے متعلق ہیں اس لئے مشق کے فوراً ہی بعد اس بات کی جانچ کی جاسکتی ہے کہ بچے نے عمل مقصود کہاں تک سیکھا۔ عموماً یہ مقاصد حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اگر کوئی کمی محسوس کی جاتی ہے تو مشق پھر سے کرائی جاتی ہے۔

۳۔ ہر مشق میں بچہ کا امتحان بھی شامل ہے۔ آخر میں ایسے مشاغل تجویز کئے گئے ہیں جن سے بچے کی کامیابی کا بخوبی پتہ چل جاتا ہے۔

۴۔ باوجودیکہ سائنس کی واقفیت پرزور نہیں ہے پھر بھی بچہ فزکس، کیمسٹری بائیلوجی، اسٹرالوجی وغیرہ کا کافی علم حاصل کرلیتا ہے۔

۵۔ مذکورہ طریقہ کار سیکھنے سے بچہ ایک ننھے سائنسداں کی طرح کام کرنا سیکھ جاتا ہے اس کا یہ طرز عمل اسے خود علم حاصل کرنے کے قابل بناتا ہے اور روزمرہ زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں معاون ہوتا ہے۔

## دوسرا نصاب۔ ایس۔ سی۔ آئی۔ ایس

(Science Curriculum Improved Study)

منصوبہ کے تحت تیار کیا گیا ہے۔ سائنسی تعلیم کے متعلق دونوں کا ایک ہی فلسفہ ہے اور دونوں اس خیال کے حامی ہیں کہ ابتدائی درجوں میں تعلیم بچوں کے ذاتی تجربات پر مبنی ہونی چاہئے۔ استاد کو زیادہ زور بچوں میں حصول علم کا شوق پیدا کرنے اور ان طریقوں پر دینا چاہئے جن سے بچے خود علم حاصل کرسکیں فرق اتنا ہے کہ ایس۔ اے۔ پی۔ اے سائنسی طریقہ کار پر زیادہ زور دیتا ہے اور ایس سی آئی ایس معلومات کو زیادہ اور طریقہ کار کو کم اہمیت دیتا ہے لیکن انہیں نظرانداز نہیں کرتا البتہ اس کی حیثیت ثانوی ہے۔

اس نصاب کو اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ پہلے سائنس کے اس مواد کو منتخب کرلیا گیا جسے بچوں کے لئے ضروری اور مناسب سمجھا گیا اور بعد ازاں یہ سوچا گیا کہ ان کے لئے کون کون باتیں سکھائی جاسکتی ہیں طریقہ تدریس میں انہیں سکھانے کی طرف پوری توجہ کی گئی ہے۔ چونکہ اس نصاب میں زیادہ زور سائنسی واقفیت پر ہے اس لئے یہ ہمارے موجودہ نصاب کے قریب ہے۔ اس کے دو اہم مقاصد ہیں۔

۱۔ بچوں کو اس قابل بنانا کہ وہ حیاتی اور طبیعاتی سائنس کے بنیادی تصورات بخوبی سمجھ سکیں اور یہ بھی جان لیں کہ سائنسی نظریات مظہرات قدرت کے مشاہدات انسان کی تخلیقی صلاحیت و تخیل پر منحصر ہیں۔

۲۔ کسی نظریہ کے قائم رہنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے مزید تجربات سے پرکھا جائے۔ ان مقاصد کے مدنظر جو طریقہ تعلیم تجویز کیا گیا ہے وہ کچھ اس طرح ہے۔

کلاس روم کو ایک تجربہ گاہ کی شکل دیدی جاتی ہے۔ جہاں بچے تجربہ کرکے خود علم حاصل کرتے ہیں۔ انھیں ضروری سامان دیدیا جاتا ہے جس کی مدد سے وہ کبھی استاد کی رہنمائی میں اور کبھی اپنی مرضی کے مطابق مشاہدات اور تجربات کرتے ہیں۔ ہدایت دینے کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب بچوں کے بھٹک جانے کا اندیشہ ہوتا ہے ورنہ وہ عموماً اپنی عقل و فہم کے مطابق جو بھی مناسب سمجھتے ہیں کرتے ہیں۔

سامان کا انتخاب اس ہوشیاری سے کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ جو تجربات اور مشاہدات ممکن ہیں وہ بچوں کو اس مضمون کی طرف لے جائیں جس کا علم حاصل کرانا اس سبق کا مقصد ہے۔ اس قدم کو تفتیش (Exploration) کہتے ہیں مثلاً مقناطیسی تفاعل (Magnetic Interaction) سے متعارف کرانا ہوتا ہے تو بچوں کو دو دو مقناطیسی سلاخیں (Bar Magnets) دیدی جاتی ہیں اور ایک ایک گھنے کی بنی ہوئی گاڑی۔ انھیں ہدایت کی جاتی ہے کہ ایک مقناطیس کو گاڑی میں رکھ دیں اور دوسرے کو رفتہ رفتہ اس کے قریب سامنے سے لائیں۔

مقناطیس کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر اس کی ایک سلاخ کو کسی دھاگے سے باندھ کر اس طرح لٹکایا جائے کہ وہ گھوم سکے تو جب بھی یہ ٹھہرے گی اس کا ایک سرا شمال اور دوسرا جنوب کی طرف رہے گا۔ اس لئے انھیں مقناطیس کے شمالی اور جنوبی قطبین کہتے ہیں۔

مقناطیسی قطبین یعنی شمالی اور جنوبی ایک دوسرے کے لئے کشش رکھتے ہیں اور یکساں ایک دوسرے کو دور بھگاتے ہیں۔ چنانچہ جن بچوں کے مقناطیس کے متضاد سرے ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں ان کی گاڑی دھاگے کی طرف حرکت کرتی ہے اور جن کے یکساں سرے قریب آجاتے ہیں۔ ان کی گاڑی دور بھاگتی ہے اب ان کا تجسس بیدار ہوجاتا ہے اور وہ مزید تجربات کرتے ہیں۔ ان کے ذہن میں مختلف سوالات اٹھتے ہیں مثلاً یہ سلاخیں لوہے کی ہیں یا کسی اور دھات کی۔ گاڑی کیوں سلاخ کا ایک سرا

نے لانے سے اسکی طرف بڑھتی ہے اور دوسرے سے دور بھاگتی ہے۔ وہ آپس
بحث مباحثہ کرتے ہیں اور مختلف مفروضات قائم کرتے ہیں۔ اب استاد انھیں
کی دو اسی شکل و صورت کی سلاخیں دیتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ وہی تجربات
تے ہیں لیکن اس دفعہ وہ پہلا جیسا تغافل نہیں دیکھتے۔ اس طرح وہ اس نتیجہ پر پہنچ
تے ہیں کہ جو سلاخیں انھیں پہلے دی گئی تھیں۔ وہ ان لوہے کی سلاخوں سے مختلف
۔ اس دوران کئی بچے اپنی سابقہ واقفیت و تجربہ کی بنیاد پر یہ بتا سکتے ہیں کہ پہلے
سلاخیں مقناطیسی ہیں۔ اگر وہ نہیں بتا سکتے تو استاد بتا دیتا ہے کہ وہ پختہ لوہے
ی ہیں اور انھیں مقناطیسی بنایا گیا ہے۔ پھر انھیں مزید تجربات کرائے جاتے
جس سے مقناطیسی تغافل کا تصور واضح ہو جاتا ہے۔ اسے ایجادی قدم کہتے ہیں۔
کہ یہاں پر بچے نئے اصول و قوانین معلوم کرتے ہیں۔

آخر میں کچھ ایسے مسائل دیئے جاتے ہیں جن کے حل کرنے کے لئے اس سے
حاصل شدہ واقفیت و تجربہ سے استفادہ کرنا پڑتا ہے

ان نصابات کا مطالعہ ہمیں اپنے تعلیمی نظام کے متعلق جن باتوں کی ترغیب
ہے۔ اُن میں زیادہ اہم حسب ذیل ہیں۔

(۱) تعلیم کے سب ہی مدارج کے مقاصد نہایت واضح طور پر طالب علموں کے
در طرز عمل کے اعتبار سے متعین کئے جائیں۔ ہر تعلیمی ادارے کو یہ معلوم
ہیئے کہ اس کا طالب علم فارغ التحصیل ہونے کے بعد کیا کر سکے گا نہ کہ یہ کہ وہ
جانتا ہوگا۔ صرف مضمون سے واقفیت کا معیار کافی نہیں۔ اس بات کی جانچ
کے لئے کہ اس کے طرز عمل اور کردار پر کیا اثر پڑا، ادارے کے پاس مناسب
ہونے چاہئیں۔

۲۔ مضمون کے واقفیتی پہلو پر کم اور اس سے متعلق ہنرمندیوں پر زیادہ زور
دینا چاہئے۔

۳۔ تمام نظام تعلیم کو زیادہ جمہوری بنانے کی ضرورت ہے جس میں طالبعلم
کرنے، استاد سے متفق ہونے یا نہ ہونے کی پوری آزادی ہو۔ اس کے بغیر اس
ں صلاحیت اُجاگر نہیں ہو سکتی۔

۴۔ طالب علم کو ہر درجہ پر سبق میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کا موقع دیا جائے
ئیں اس قابل بنایا جائے کہ وہ خود علم حاصل کر سکیں۔

۵۔ سائنس کی تعلیم عام تعلیم کا ایک جزء ہونی چاہیے اور بالکل ابتدائی
سے دی جانی چاہئے۔ تاکہ وہ سائنسی طریقۂ کار جلد از جلد سیکھ جائیں۔ اب
ں تعلیم کا مقصد صرف خواندگی نہیں بلکہ سائنسی خواندگی ہونا چاہئے۔

# غزل

فلک مظفر نگری

ہم پر الزام ہیں آپ ہی کے لئے
یہ بھی تسلیم ہے دوستی کے لئے

گلستاں میں شباب بہاراں رہا
گل ترستے رہے اک ہنسی کے لئے

بات اک روز آکر قضا پر رکی
کتنا سوچا گیا زندگی کے لئے

خونِ دل بہہ گیا اشک بن کر سبھی
کیا جلاؤں میں اب روشنی کے لئے

ہائے اس کو اندھیرے میں رکھا گیا
خون جس نے دیا روشنی کے لئے

خون کرتے رہے ہر تمنا کا ہم
کیا یہ کم ہے تمہاری خوشی کے لئے

ہم غریبوں کی کیا آبرو ہے فلک
ہم نے کچھ بھی کیا ہو کسی کے لئے

# غزلیں

## ہوش نعمانی

تہمت تری چاہت کی یوں ہے مرے جینے پر
اک سنگِ گراں جیسے تالاب کے سینے پر
معصوم سی موجوں نے چھیڑا تھا شرارت سے
کس بات پہ ڈوبا ہے حیرت ہے سفینے پر
یہ سنگ کی بارش بھی اک قدر شناسی ہے
حیرت نہ کرو لوگو چاہت کے قرینے پر!
اشعار کی صورت میں شاید تری یاد آئی
کچھ آہٹیں پاتا ہوں میں ذہن کے زینے پر
میں ذہن کے صحرا کو گلزار بناتا ہوں
یوں طنز نہ کر واعظ مجھ پر مرے پینے پر
فن کار کے مرنے پر بیدرد عزا دارو!
ماتم کی ضرورت ہے فن کار کے جینے پر
یہ صبح کی بے ہوشی۔ یہ رات کی مے نوشی
اے ہوش نہ حرف آئے ساقی کے قرینے پر

## اے فلپس صابر اکبر آبادی

کیوں دوں نوید دید کسی دیدہ ور کو میں
آنکھوں میں بھر لوں جلوۂ مفتِ نظر کو میں
یہ بھی تو ممکناتِ نظر سے محال ہے
اپنی نظر سے دیکھ لوں اپنی نظر کو میں
شمس و قمر کو دیکھ کے دیکھا تھا آپ کو
اب دیکھتا نہیں کبھی شمس و قمر کو میں
جھکنی تھی آستاں پہ ترے جھک گئی جبیں
اب خاک اس زمین پہ رکھوں گا سر کو میں
کچھ لفظ منہ سے بے خبری میں نکل گئے
اب کیا دعا کے بعد پکاروں اثر کو میں
صابر تجھے نصیب ہو علاجِ غمِ حیات
زحمت تمام عمر نہ دوں چارہ گر کو میں

## صرفی حیدرآبادی

ہر نفس اک سانحہ ہے اب مرے دل کے لئے
جانے کتنے مرحلے ہیں اور منزل کے لئے
میں وہ دہقاں ہوں کہ جس کو زندگی اک کھیل ہے
برق کا بھی سامنا کر لوں گا حاصل کے لئے
قطرہ قطرہ بحرِ ہستی کا ہے محرِ جستجو
ماہیٔ بیتاب ہے ہر موج ساحل کے لئے
کیسے کیسے مرحلے ہم نے کئے ہیں طے نہ پوچھ
کچھ تو اُن کے واسطے اے دوست کچھ دل کے لئے
گم شدہ کی اہمیت سمجھو کہ ذوقِ جستجو
خاک چھانی دو جہاں کی میں نے اک دل کے لئے
دولت کونین سے قطع نظر صرفی نے کی
صرف اک تیرے فریبِ لطف شامل کے لئے

## محمد جان اختر

بھر پہ ہو لطفِ نظر یہ بھی تو ہو سکتا
کچھ ملے غم سے مفر یہ بھی تو ہو سکتا
لوگ سمجھے ہیں جسے ابرِ بہاراں اب کے
وہ بھی برسائے شرر یہ بھی تو ہو سکتا
دیر و کعبہ کی حقیقت کو سمجھنے کے
میکدے میں ہو سحر، یہ بھی تو ہو سکتا
آپ کے جلوۂ رنگیں میں کسی دن مر
ہو مرا ذوقِ نظر یہ بھی تو ہو سکتا
روز و شب اور نئے جور و ستم کی پور
ہو وفاؤں کا ثمر یہ بھی تو ہو سکتا
گر کے آنکھوں سے مری آپ کے دامن
اشک بن جائیں گہر یہ بھی تو ہو سکتا
محفلِ حسن میں ہو ضبط بھی لاکھ اے اخ
عشق کی آنکھ ہو تر یہ بھی تو ہو سکتا

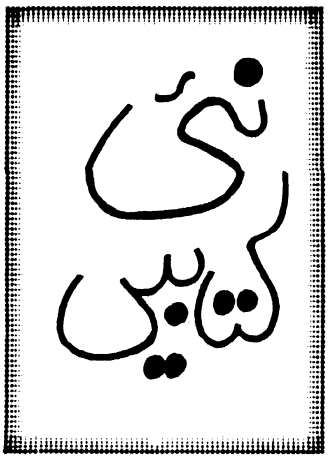


**حلوۂ صد رنگ** :- عبدالمجید شمس :

ضخامت: متوسط سائز کے ۸۸ صفحات — قیمت : ۴ روپے

ناشر :- سائنٹفک پبلشرز، مجیدولا۔ پٹنہ ۶

"حلوۂ صد رنگ" بیسویں صدی میں لکھی جانے والی مثنوی میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ ویسے تو نظم کی ہر دلعزیزی اور پیچ در پیچ نئے تجربات کے ہجوم میں قدیم اصناف سخن بالخصوص مثنوی کی چمک دمک ماند پڑ گئی تھی لیکن پھر بھی قدیم و جدید شعراء اس صنف میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ موجودہ دور میں عبدالمجید شمس نے اس صنف کی طرف خصوصی توجہ کی ہے اور مثنوی "حیات و کائنات" کے بعد اُن کی یہ دوسری مثنوی ہے۔

"حلوۂ صد رنگ" ایک اعتبار سے قدیم بارہ ماسہ کی روایت کو آگے بڑھاتی ہے اس اعتبار سے یہ بارہ ماسوں سے مختلف ہے کہ اس کا موضوع فراق و عشق نہیں بلکہ فطرت کی عکاسی ہے۔ ایسی مثنویاں جن میں موسموں کا حال بیان کیا گیا ہو اردو اور فارسی میں لکھی گئی ہیں۔ سرما، گرما اور برشگال پر کئی مثنویاں نظم ہوئی ہیں۔ بہار کی رتوں کی بھی منظر کشی کی گئی ہے لیکن بارہ ماسے کی یہ روایت کم ہوتی گئی ہے کہ ہر مہینے کے موسم کا الگ الگ بیان ہو۔ جہاں ہر مہینے کا حال بیان کیا گیا ہے وہاں بھی تقلید اور روایت ہے۔ شمس نے یہ التزام کیا ہے کہ ہر ہندی مہینے کی مصوری اس انداز سے کی جائے کہ اس کی فضا اور سارا ماحول آنکھوں میں پھر جائے۔ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں موسم بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کشمیر سے کیرالا تک اور پنجاب سے کلکتہ تک موسموں کی کیفیت جداگانہ ہے۔ بعض اوقات ایک ہی ریاست مثلاً اتر پردیش میں کمایوں کے علاقوں میں پہاڑی موسم ہے۔ گنگ و جمن کی وادی میں میدانی اور جنوب میں ونڈھیائی۔ شمس جو سنی سنائی باتوں پر یقین کرنے کے بجائے ہر چیز کا خود مشاہدہ کرنے کے عادی ہیں اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں اور انہوں نے مقدمے میں یہ تشریح کر دی ہے کہ بہار کے گیا، پٹنہ اور آرہ نامی شہروں اور شاہوبگہ گاؤں کے قدرتی مناظر اور فطری کوائف پر اس مثنوی کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔ مقامی رنگ صرف مناظر کے بیان میں نہیں بلکہ بول چال میں بھی باقی رکھا گیا ہے۔ بیان میں تسلسل قائم رکھنے کے لئے شمس نے ہر جگہ ساقی سے تخاطب کا سہارا لیا ہے۔ یہ روایتی اسلوب برا نہیں لیکن غیر ضروری ہے دوسرے طریقوں سے بھی تسلسل قائم رکھا جا سکتا ہے۔ ایسی روایتوں سے کنارہ کشی میں مضائقہ نہیں بلکہ یہ مفید نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔

شمس نے مناظر کے بیان میں گہرے مشاہدے اور جزئیات سے باخبری کے اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ مناظر کے بیان کو انہوں نے شاعرانہ عکاسی تک محدود نہیں رکھا اور تکرار و مبالغہ و تشبیہ و استعارہ کی مدد سے ایک خیالی ماحول کی تخلیق کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ وحوش، طیور، درخت، پھل، پھول پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ اور ان سب کے مرکزی کردار انسان پر بھی۔ ان انسانوں میں بھی وہ ایک طبقے کے محسوسات نظم کرنے کے بجائے امیر، غریب، کسان، مزدور سب کا قریب سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ عالیشان مکان، جھونپڑے، کہنہ و بوسیدہ عمارتیں اور آثار الصنادید کوئی اُن کی نظر سے بچ نہیں پاتا یہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔

زباں رواں اور انداز بیاں سادہ و دلکش ہے۔ بے جا تکرار سے پرہیز کیا ہے اور شروع سے آخر تک دلبستگی کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ نظم کہیں بھی سست ہونے نہیں پاتی۔ حشو و زوائد شاذ ہیں۔ البتہ کہیں کہیں پر تعقید کھٹکتی ہے اس سے بآسانی چھٹکارا پایا جا سکتا تھا۔ مثلاً

ع قلم سے مرے ہو خزاں میں بہار — اسے بآسانی یوں نظم کیا جا سکتا تھا ع ہو مرے قلم سے خزاں میں بہار یا ع وطن میں بھی اپنے ہے یہ بے وطن، کو ع "خود اپنے وطن میں ہے یہ بے وطن" بنایا جا سکتا تھا۔ یا ع کہیں برف سے ہے ڈھکی کل زمیں، کا نعم البدل ع ڈھکی ہے کہیں برف سے کل زمیں، ہو سکتا تھا۔ کچھ اور تسامح بھی ہیں مثلاً "ہر ہر" کے مقابلے میں "ہر ایک" مرجح ہے۔ "بہت طرح" کی جگہ "کئی طرح" بہتر ہے۔ بعض مقامات بڑی ہی صناعانہ اور فن کارانہ خوش اسلوبی سے نظم ہوئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی مثنوی قابل مطالعہ ہے۔

## تمنا کا دوسرا قدم  صہبا وحید

ضخامت: متوسط سائز کے ۱۶۰ صفحات، قیمت: پانچ روپے

ناشر: نیو لٹریچر، ۵۵ بستی نظام الدین، درگاہ، نئی دہلی ۱۳

اُردو میں شعری مجموعے اس کثرت و سرعت سے شائع ہوتے ہیں کہ ان کا تعاقب مشکل ہو گیا ہے اسی لئے بعض اوقات قارئین کو متوجہ کرنے کے لئے "جشنِ اجراء" کی بدعت چل پڑی ہے۔ مجموعوں کی اس ریل پیل میں کئی نوجوان شعراء محروم توجہ ہی رہ جاتے ہیں۔ صہبا وحید کچھ ایسے نوجوان بھی نہیں ہیں لیکن بزمِ شہرت میں نو وارد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تقریباً ایک دہائی سے شعر کہہ رہے ہیں۔ اس مدت میں اُن کا ذہن برابر ارتقائی منزلیں طے کرتا رہا ہے اور ان کا فن بھی بنتا سنورتا رہا ہے۔

"تمنا کا دوسرا قدم" اُن کے دوازدہ سالہ تخلیقی کارناموں کا نچوڑ ہے اس میں نظمیں زیادہ اور غزلیں کم ہیں۔ نظموں میں طویل نظمیں، منظوم افسانے اور تراجم شامل ہیں۔ مجموعے کی طویل تر نظم "تمنا کا دوسرا قدم" ہے اور اسی کو صہبا نے عنوان کتاب کے لئے منتخب بھی کیا ہے۔ یہ ایک خوبصورت نظم ہے جسے شاعر نے فنکارانہ چابکدستی سے ایک تخیلی تسلسل میں پرویا ہے طنز اظہار میں جدت، محض تجرباتی نہیں ہے بلکہ بعض مقامات پر تخیلی بھی ہے۔ کچھ اچھی تشبیہیں فراہم کی ہیں۔ لفظوں کی طرح بکھرے ہوئے آرزو کے روپ" کچھ اچھی ذہنی تصویریں ابھاری ہیں۔ "نیلی پیلی روشنی کے ٹیڑھے میڑھے نقوش"، "روح کی گہرائیوں میں تیرتی تنہائیاں" "کشکول آرزو میں شکستہ سے خواب تھے"۔ مختلف بحروں کا استعمال، قوافی کی مختلف ترتیب، اسلوب کی ناہمواری، سبھی چونکاتے ہیں۔ لیکن وحدتِ اثر میں مخل نہیں ہوتے۔ بعض مقامات محلِ نظر ہیں۔ مثلاً "ایک گہری دھند میں کھوتے چلے ہیں"۔ شاید وہ "کھونے لگے ہیں یا کھوتے چلے جاتے ہیں" کہنا چاہتے تھے اس طرح شیکسپیئر کے ALL THE PERFUMES OF ARABIA کا ترجمہ "عرب کی ساری خوشبو" درست نہیں غالباً وہ "اور عرب کی سب خوشبوئیں" کہنا چاہتے تھے لیکن یہ جزوی تسامح حسنِ نظم پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

شاعر نے ارادھنا کا کردار بھی تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے اور اسے ارادھنا میں استعمال کیا ہے اگرچہ ماحول نائٹ کلب اور بال روم کا سا ہے لیکن یہ محبوبہ عام ہندی محبوباؤں سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ وہی گرمی و نرمی اس کے قرب میں بھی محسوس کی جاتی ہے۔ نئی فضا کا احساس ارادھنا کے علاوہ 'غانیہ اور نہ شبم نہ شب پرستم' میں بھی ہوتا ہے۔

کئی غزلوں میں نیا پن تو ضرور ہے لیکن وہ رچاؤ اور گیرائی نہیں ہے جو غزل کو دوسرے اصناف سے ممتاز کرتی ہے۔

بعض اوقات صہبا کے یہاں گراں بار ترکیبیں ملتی ہیں مثلاً (۱) گرفتارِ سجّین ہے ورجا ہے (۲) موجبِ گریۂ عندلیبانِ ہستی (۳) الم زارِ ہستی میں خفتہ ارادت کی برنائیاں (۴) صیرفیِ عمرِ رواں کشمکشِ خیر و گنہ بعض اوقات ناہمواری کا بھی احسا ہوتا ہے لیکن مجموعی حیثیت سے صہبا کافی امید افزا مستقبل کے پیامی ہیں۔

## مزاج آب و گل  مصنف: حسن شہیر

ناشر: گلستاں آرٹ اکیڈمی، معرفت سید حبیب احمد، مسولی، بارہ بنکی (اتر پردیش) قیمت: چھ روپے ضخامت: ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۴۴ صفحے

حسن شہیر طباع بھی ہیں اور ایک بے چین طبیعت کے مالک بھی، شاعر بھی ہیں اور مصور بھی اور فنونِ لطیفہ کے دونوں میدانوں میں وہ بڑے انوکھے انداز میں وارد ہوتے ہیں۔ میں ان کو بہت دنوں سے جانتا اور ان کی صلاحیتوں کو مانتا ہوں اس لئے میں اُن کے اس نئے مجموعے میں اُن کی بے چین شخصیت کی نشان دہی آسانی سے کر سکا۔

اشتہار کی زبان میں افراط و تفریط جائز ہے لیکن ایسا اشتہار جو جزو کتاب ہو محض اشتہار نہیں رہ جاتا۔ بلکہ ایک تعارف بھی بن جاتا ہے اور افراط و تفریط کی پرکھ کا سامان بھی۔ بہرحال، اس اشتہار میں کتاب کو "اُردو شاعری کا حیرت انگیز کارنامہ" کہا گیا۔ اس میں "عالمی ادب کی تمام تر رعنائیاں موجود ہیں جو آپ کی نگاہ کو حیرت اور استعجاب میں ڈالنے پر مجبور کریں گی۔ آپ انگشت بدنداں ہو کر اس کتاب کی ہر سطر پر اپنی نگاہ ڈالیں گے"۔ عبارت کے نشیب و فراز سے قطع نظر اس قسم کی افراط، استعجاب زیادہ تشکیک کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔

ابتداء میں اس کتاب کو ڈانس ڈرامہ بھی کہا گیا ہے جو موسیقی اور رقص کے سا پسِ پردہ یا اسٹیج سے پڑھا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ اِن دعاوی کے پسِ منظر میں ہی کرنا چاہئے۔ مزید رہنمائی لئے مصنف نے شروع میں ایک مقدمہ بھی عرض مصنف کے عنوان سے تحریر کیا۔ شروع ہی میں یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شاعری بول کی زبان میں نہیں ہوتی"۔ ظاہر ہے کہ اسٹیج اور فلم کے لئے لکھی گئی طویل نظم کو بول چال کی زبان ہی میں ہونا چاہئے۔ اس زبان کے کچھ نمونے دیکھئے۔

(۱) تاریخ کے ہونٹوں پہ یاد کی قندیلیں اُگتی ہیں۔

(۲) سفید سفید راتوں میں قہقہے لٹکے ہوئے ہیں
— پھول ٹنکے ہوئے ہیں
برق پا آواز ہوتی ہے

فروزاں ہوتی ہے قندیل
برہنہ ہوتی ہے قندیل

(۳) تاج محل سے بیمار انسان کی رعونت ٹپکتی ہے

(۴) تاریخ ابھی تخلیق کے قہقہوں سے محور نہیں ہے۔

اور اس کے بعد اس "عرض مصنف" کو تبصرہ نظر کھئے کہ اُردو اور ہندی دونوں کی شاعری ماضی کے قید خانے میں بند ہے لیکن قندیل اور سفید ران رعونت وغیرہ بھی حال کے آزاد خانے نہیں ہیں۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس قسم کے متغزلانہ اور شاعرانہ گوشے شہیر کے یہاں کم ہیں۔ وہ علی العموم اپنے بنائے ہوئے پیمانوں کے اندر ہی رہتے ہیں۔

(۱) محنت کش طبقہ کے ہمدرد اور بہی خواہ چائے خانوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔
لوگ ان کے مسائل پر غور کر رہے ہیں۔

(۲) کروڑوں انسانوں کے خون سے نفع اکٹھا کیا گیا ہے۔
تمہاری دوکانوں میں یہ خون بہت آسانی سے مل سکتا ہے۔

شاعر نے اپنے کو قدیم ڈکشن سے ہی آزاد نہیں کیا ہے بلکہ تمام عروضی پابندیوں سے بھی آزاد کر لیا ہے اور اس میں نظم آزاد اور نثر لطیف کا فرق بھی ختم ہو گیا ہے۔ یہ ایک نیا تجربہ ہے جس سے وہ لوگ ضرور بدکیں گے جو شاعری کو صرف خیال و موضوع سے نہیں بلکہ ہیئت اور مجموعی جمالیاتی تاثر کے پیمانوں سے بھی ناپتے ہیں۔

اس طویل تخلیق کو جس صنف ادب کا بھی نمائندہ مانا جائے لیکن اتنا تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس میں اسٹیج کے گائے جانے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اسٹیج کے لئے اُردو شاعری میں جدید سرمائے کا فقدان ہے لیکن اسٹیج کی ضرورتوں تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر کی جانے والی شاعری کے عناصر ترکیبی کیا ہوں، اس پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ شہیر کا کام اس سمت ایک قدم ہے لیکن ایسا قدم جس میں لغزشیں زیادہ ہیں۔ اُردو شاعری جن عروضی فنکاری اور غنائی آثار کا مجموعہ ہے اس سے یکسر نگاہ موڑ کر شعر کو نثر نما بنا دینا اس صنف ہی کو فوت کر دینا ہے جس کو لے کر شاعر نے آغاز سفر کیا تھا۔ جس شہیر کے یہاں شاعرانہ احساس ہے لیکن ہیئت سے کلیتہً اغماض اور مقصدیت کی بہتات فن کو مجروح بھی کر دیتی ہے۔

اس مجموعے میں نئے ڈکشن کا استعمال خصوصیت سے قابل توجہ ہے۔ شہیر نے اس سلسلے میں کامیاب تجربہ کیا ہے اگر وہ غنائی اور وہ عروضی پہلوؤں پر نظر ثانی کر کے نئی نیا پیمانہ یا سانچا بنا سکیں تو زیادہ توانا تخلیقیں اُبھر سکتی ہیں۔

(علی جواد زیدی)

## سرابوں کے سفیر شعری انتخاب

قیمت — تین روپیہ

ناشر — مولانا آزاد لائبریری، برج راجپورہ، کوٹہ نمبر ۶

"سرابوں کے سفیر" راجستھان کے جدید شعراء کا شعری انتخاب ہے جس میں ابن رضا، احتشام اختر، خلیل تنویر، شاہد عزیز، ظفر غوری، ظفر احمد پرواز، عابد ادیب، عقیل شاداب، فضل المتین، محمود سعیدی اور ممتاز راشد کے منتخب کلام پیش کئے گئے ہیں۔ کتاب کی ابتدا میں "آئینہ داران دشت" کے عنوان سے شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ قابل توجہ ہے جس میں موصوف نے شعری انتخاب پر تبصرہ کم اور اپنی عظمت کا مظاہرہ زیادہ کیا ہے۔ یہ سوال اٹھانا ہی غلط ہے کہ شاعری کس جگہ سے ہو رہی ہے۔ اُردو شاعری کا حلقہ ہمیشہ وسیع رہا ہے جس کا سلسلہ حیدرآباد سے لاہور اور کلکتہ سے گجرات تک پھیلا رہا ہے۔ پھر موصوف نے ان جدید تر شعراء پر کچھ جدید شعراء کا اثر تلاش کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ ریمارک قبل از وقت ضرور ہے — "سرابوں کے سفیر" صاف ستھرا انتخاب ہے جس میں نظمیں اور غزلیں شامل ہیں مگر غزلوں کا انتخاب نظموں سے عمدہ ہے۔ کچھ نظمیں بے حد کمزور ہیں۔ خلیل تنویر، شاہد عزیز کی نظمیں اور احتشام اختر، ممتاز راشد کی غزلیں قابل توجہ ہیں۔ محمود سعیدی کا کلام اپنی پختگی اور برجستگی کی وجہ سے سب سے بہتر ہے۔ اس خوبصورت انتخاب کے لئے مرتبین مبارک باد کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے کچھ ابھرتے ہوئے نوجوان شعراء کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

کتابت اور طباعت میں سادگی اور سلیقہ ہے۔

## تنقید اور تشخیص (تنقیدی مضامین)

مصنف: ارشد کاکوی ناشر: عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ ۶

قیمت: پانچ روپے پچاس پیسے

"تنقید اور تشخیص" ارشد کاکوی مرحوم کے چودہ مضامین کا مجموعہ ہے جو اگست ۱۹۷۰ء میں پہلی بار شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ "پیش گفتار" کے عنوان کے تحت جناب عطا کاکوی نے پیش لفظ لکھا ہے۔ اس مجموعے میں ارشد مرحوم کے ان مضامین کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ہندو پاک کے مختلف ادبی جریدوں میں بکھرے پڑے تھے۔ پہلا مضمون "نشاط رفتہ" کے عنوان کے تحت ہے جس میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کے مجموعۂ کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد تین مضامین "جمیل مظہری ایک مطالعہ"، "غلط بہ لفظ" اور "شعلۂ ندا" علامہ جمیل مظہری سے متعلق ہیں۔ آخری مضمون یعنی "شعلۂ ندا" ایک مکتوب ہے جو جمیل مظہری کو لکھا

گیا ہے جس میں رضوی صاحب کی شاعری پر بحث کی گئی ہے۔ جگن ناتھ آزاد اور شکیل بدایونی کی شاعری پر دو مضامین بڑی کاوش سے لکھے گئے ہیں۔ "ایک نئی آواز" کے عنوان سے اعظم آبادی کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ شعر یا ترنم" کے عنوان کے تحت مصنف نے ماہنامہ "آج کل" میں چھڑی ہوئی بحث پر تبصرہ کیا ہے جس میں شاعروں کی اہمیت اور شعر کو ترنم سے پڑھنے کی افادیت پر بحث کی گئی ہے۔ "غالب کے دو شعر" کے عنوان کے تحت ان کے دو مشہور شعر

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اور

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

کی تشریح کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ "مکتوب نیاز" شیفتہ کی شاعری" "کچھ وحشت (کلکتوی) کے بارے میں" "اثر لکھنوی کی غزل گوئی" اور "رباعیات شاد" (عظیم آبادی) پر مصنف نے طبع آزمائی کی ہے۔

ارشد کا اسلوب بڑا دلکش ہے، جس موضوع پر بھی بحث کا آغاز کیا ہے۔ اُسے بڑے مدلل اور فکر انگیز انداز میں انجام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ مجموعہ اُردو ادب کے طالب علموں کے لئے سود مند ثابت ہوگا۔

کتابت اور طباعت گوارا ہے۔ قیمت کچھ زیادہ ہے۔

## بھول ہی بھول (مزاحیہ ڈراموں کا مجموعہ)

مصنف: اظہر افسر قیمت: تین روپیہ

ناشر: نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ

"بھولے ہی بھولے" اظہر افسر کے مزاحیہ ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ یہ ڈرامے ملک کے مختلف سماجی اداروں کی جانب سے اسٹیج کئے جا چکے ہیں۔ ان میں بیشتر ملک کے مختلف ادبی جریدوں میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ اظہر افسر اُردو زبان کے جانے پہچانے ڈرامہ نگار ہیں۔ یوں تو اُردو ڈرامہ نگاری بہت پیچھے ہے مگر چند نام ایسے ضرور ہیں جنہوں نے کچھ قابل تعریف کوششیں کی ہیں۔ ان میں اظہر افسر بھی ہیں۔ ڈراموں کے ساتھ یہ ٹریجڈی ضرور ہے کہ جو ڈرامہ اسٹیج پر نہایت کامیاب رہتا ہے۔ وہی پڑھتے وقت نہایت پھیکا سپھیکا معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی اس مجموعے کے کچھ ڈرامے نہایت دلچسپی سے پڑھے جائیں گے جن میں بھولے ہی بھولے، عید بھی آئی تو، حضرت پیمانہ وغیرہ خاصے دلچسپ ہیں۔

کتابت طباعت اچھی ہے۔ گیٹ اپ گوارہ ہے۔

## گل ہائے رنگ رنگ (مجموعۂ کلام)

مصنف: عطا کاکوی قیمت:

ناشر: عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ ۶

"گل ہائے رنگ رنگ" عطا کاکوی کے متفرق اشعار کا مجموعہ ہے جس میں شاعر نے عنوانات کے تحت اشعار کا انتخاب کیا ہے جیسے آنسو آہ و فغاں قفس اور آشیاں، بلبل اور چمن، حسن و عشق، شمع اور پروانہ وغیرہ وغیرہ۔ ان فرسودہ اور روایتی مضامین کو شاعر نے اپنے طور سے محسوس کرنے کی کوشش کی ہے چونکہ غزل کے اشعار معنوی طور پر منفرد ہوتے ہیں اس لئے ایک ہی موضوع پر ہر شعر اپنے اندر ایک الگ گنجینۂ معنی کا طلسم رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے عطا کاکوی صاحب کامیاب ہیں اور ان کا یہ تجربہ ادبی حلقوں میں سراہا جائے گا۔

## جمالِ غزل (مجموعہ کلام) مصنف: عطا کاکوی

"جمالِ غزل" عطا کاکوی صاحب کی غزلوں کا مجموعہ ہے غزلوں میں روایتی رنگ ہوتے ہوئے بھی موجودہ دور کے مسائل سے شاعر بالکل ناآشنا نہیں ہے۔ ہر قسم کے اشعار ہیں مگر لہجہ سنجیدہ، متصوفانہ اور فلسفیانہ ہے۔ غزلوں کا اسلوب دلکش ہے جس میں احساس کی سچائی اور تازگی جھلکتی ہے مثلاً

ترے حضور زماں و مکاں کی قید نہیں
یہ شش جہات ہیں کیا ماہ و سال ہے کیسا

## دو دل درد بھرے (ناول)

مصنف: صالح محمد نائب قیمت: ایک روپیہ ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ: شنکر بک اسٹور ڈبوک (راجستھان)

"دو دلِ درد بھرے" صالح محمد نائب کا مختصر ناول ہے جو قومی یک جہتی جیسے اہم موضوع کو لے کر لکھا گیا ہے۔ ناول کا فن جتنا آسان معلوم ہوتا ہے اتنا ہی مشکل ہے۔ ایک مضبوط اور مربوط پلاٹ کے ساتھ ساتھ ناول میں پُرکشش اسلوب کی بھی ضرورت پڑتی ہے جو کہانی کو حقیقت کے قریب لانے کے کسی

آدرش یا اخلاق کے سہارے ناول نگاری کے فن کو کامیاب نہیں بنایا جاسکتا۔ ضرورت ہوتی ہے جیتے جاگتے کرداروں کی جو کہانی میں زندگی کی حقیقی عکاسی کرسکیں۔ دو دل درد بھرے کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ اس میں کرشن اور گیتا جیسے مثالی کردار بھی متحرک نہیں بن سکے ہیں۔ پھر بھی صالح محمد نائب کا یہ ناول قابلِ قدر ضرور ہے کیونکہ اس پُرآشوب دور میں ایسے ناولوں کی سخت ضرورت ہے جو قومی یک جہتی کو فروغ دے سکیں۔ ناول کی کتابت، طباعت اور گٹ اپ خوبصورت ہے۔

## فغانِ درد (مجموعہ کلام) مہتہ درد دہلوی

قیمت : تین روپے پچیس پیسے

ملنے کا پتہ: نیشنل پبلشرز ۱۲/۲ پریم نگر ڈبل اسٹوری نئی دہلی ۱۸

"فغانِ درد" مہتہ درد دہلوی کا مجموعہ کلام ہے۔ جس میں نظمیں، غزلیں، قصیدے، نعتیں، قطعات اور رباعیات وغیرہ شامل ہیں۔ درد صاحب، کہنہ مشق شاعر ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ایک پرانے قومی کارکن بھی ہیں اس لئے ان کی شاعری اُن کے قومی شعور اور حب الوطنی کے جذبے سے لبریز ہے۔ چونکہ آدمی پرخلوص ہیں اور دل محبت اور ہمدردی سے سرشار ہے اس لئے انہوں نے ملک و سماج میں جو کچھ دیکھا ہے اُسے سیدھی سادی زبان میں پُرخلوص ڈھنگ سے بغیر کسی تصنع کے بیان کردیا ہے۔ جہاں انہوں نے خارجی موضوعات سے ہٹ کر داخلی موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے وہاں وہ زیادہ کامیاب ہیں ان نظموں میں اثر بھی ہے اور زبان و فن کے لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہیں۔ بشکوہ، سچی بات، حسن اور ایمان، سرزمینِ کربلا، جمنا دہلی، نالۂ درد وغیرہ قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔

غزلیں روایتی انداز میں کہی گئی ہیں۔ چونکہ وارداتِ قلب بیان کئے گئے ہیں اس لئے اس میں خلوص بھی ہے اور کہیں کہیں اثر بھی ہے مگر انفرادیت نہیں ہے جسے اُن کا مخصوص لہجہ کہا جاسکے۔ محسوسات کو پُرخلوص ڈھنگ سے بیان کردینا ہی اچھی شاعری نہیں ہے بلکہ ان محسوسات کو انفرادی ڈھنگ سے مخصوص لب و لہجہ کے ساتھ بیان کرنا بھی اچھی شاعری کے لئے ضروری ہے پھر بھی کچھ شعر ایسے مل جائیں گے جو دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

## تابشِ انجم (مجموعۂ کلام)

مصنف: انجم لدھیانوی قیمت : تین روپیہ

ملنے کا پتہ:- ادارہ ایالی عیسیٰ نگر ی لدھیانہ

"تابشِ انجم" انجم لدھیانوی کا مجموعۂ کلام ہے جس میں غزلیں، نظمیں، گیت اور مناجات وغیرہ سبھی کچھ شاملِ ہیں۔ انجم صاحب جواں سال شاعر ہیں اور آپ نے کہنہ مشق شاعر منور لکھنوی مرحوم سے فیض بھی اٹھایا ہے۔ پیشے کے لحاظ سے معلم اور مذہبی لحاظ سے مسیحی ہیں۔ اس لئے شاعری میں اخلاقی پہلو ہر جگہ نمایاں ہے۔ آپ نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی کوشش کی ہے۔ عوامی مذاق کا ہر سامان آپ کے کلام میں مل جاتا ہے مگر انجم صاحب کی اُردو شاعری سے دلچسپی کو دیکھتے ہوئے میرا نیک مشورہ ہے کہ انہیں شاعری سے اپنی وابستگی برقرار رکھنے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہوگا۔ اساتذہ کے کلام سے لے کر موجودہ شاعری کے رجحانات کا بغور مطالعہ بھی کرنا ہوگا اپنی شاعری میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کے لئے پوری اُردو شاعری کی تہوں میں جھانکنا ہوگا۔ پھر بھی اُن کی کاوش قابلِ قدر ہے۔ آخر میں جناب منور لکھنوی مرحوم کے مشورے کو دہراؤں گا جو انہوں نے مجموعہ کی ابتدا میں بطور تعارف لکھا تھا۔

"انجم صاحب کے کلام سے میں نے اندازہ لگایا کہ اُن کی طبیعت موزوں ہے۔ اُن میں شعر کہنے کی صلاحیت ہے اور اگر وہ احتیاط کے ساتھ شعر گوئی کی طرف مائل ہوں تو جلد ایک اچھے شاعر بن سکتے ہیں"

(شاہد ماہلی)


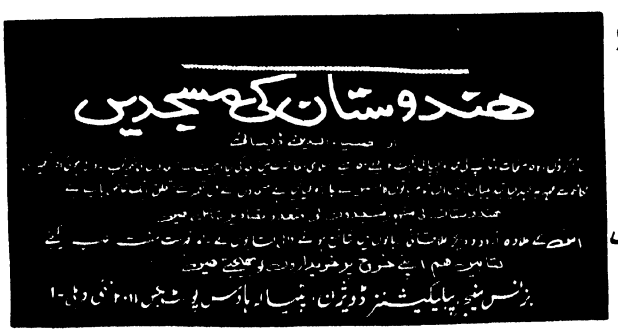

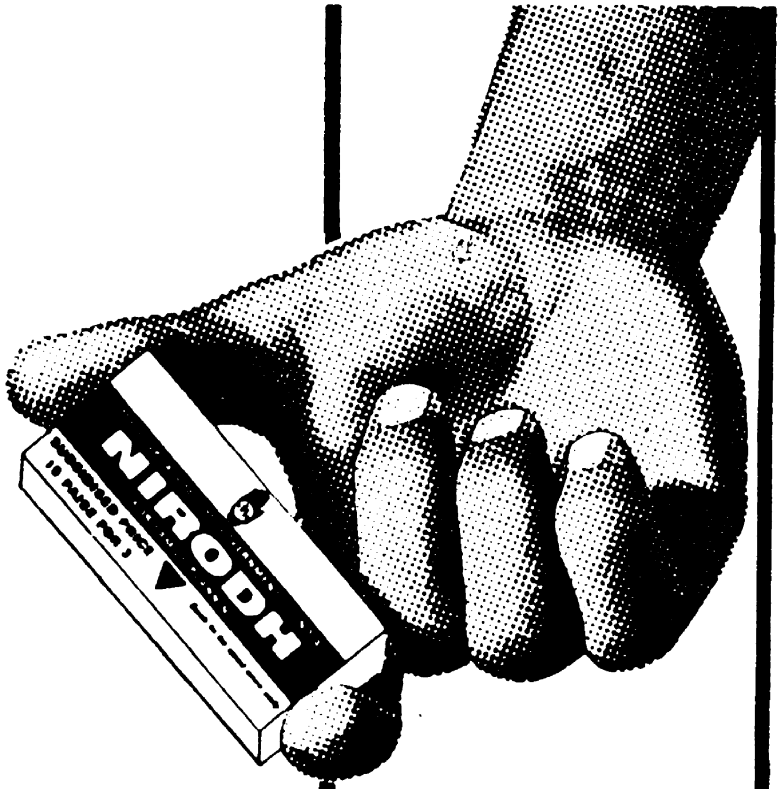


## بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

فی زمانہ بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچہ تبھی ہوگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔

## بچہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچے کی پیدائش ملتوی کر سکتے ہیں۔

نرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان، محفوظ طریقہ ہے۔ اس کے استعمال سے صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔

نرودھ ہر جگہ ملتا ہے:۔
پرویژن اسٹور، کرانہ فروش، کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔

# نرودھ استعمال کیجئے

فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
15 پیسے کے 3

سے کاری امداد سے کم دام

صرف
5 پیسے
خرچ کرکے
آپ
اپنے کنبے
کو
محدود رکھنے
کی طاقت
حاصل کر سکتے ہیں

70/61




دسمبر ۱۹۷۰ء کو نئی دہلی میں فرقہ پرستی کے خلاف چوتھے قومی کنونشن کا انعقاد ہوا جس کا افتتاح وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کیا
(تصویر میں) شریمتی اندرا گاندھی اجلاس کو خطاب کر رہی ہیں۔

۱۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کو عرس محل نئی دہلی میں حضرت امیر خسرو کا ۶۷۵ واں عرس منایا گیا جس میں حسب سابق پاکستانی زائرین بھی شریک ہوئے۔
(تصویر میں) ایک پاکستانی شاعر حضرت امیر خسرو کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے۔



# قابلِ مطالعہ

# کتابیں

| | |
|---|---|
| ہمارا جھنڈا | ایک روپیہ |
| بھارت آج اور کل | ۷۵ پیسے |
| دو شہروں کی کہانی (چارلس ڈکنس) | ۵ روپے |
| جوالا مکھی (ناول، اننت گوپال شیوڑے) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کا دستور | ۲ روپے |
| آئینہ غالب | ۵ روپے |
| آج کل کی کہانیاں | ۳ روپے ۵۰ پیسے |
| وطن کے نغمے | ایک روپیہ ۷۵ پیسے |
| امرجوت | ۲ روپے |
| سائنس کے چند پہلو | ایک روپیہ ۲۵ پیسے |
| ہمارے نہرو | ۳ روپے ۵۰ پیسے |
| گنجینہ غالب | ۴ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کی مسجدیں | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| مہاتما گاندھی کی کہانی (رنگین تصویروں میں) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| اچھا شہری (بچوں کے لئے) | ایک روپیہ |
| نہرو راد ھاکرشنن کی نظر میں | ایک روپیہ |
| ابوالکلام آزاد | دو روپے |
| ہندوستان کی تاریخ (بچوں کے لئے) | ۳ روپے ۷۵ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ اوّل) | ۲ روپے ۲۵ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ دوم) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ سوئم) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| سوامی وویکانند (بچوں کے لئے) | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |
| جواہر لال نہرو (خراجِ عقیدت) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان میں تعلیم کی از سرِ نو تنظیم (ڈاکٹر ذاکر حسین) | ایک روپیہ ۲۵ پیسے |
| ہندوستانی ڈرامہ (صفدر آہ) | ۳ روپے ۷۵ پیسے |
| پنڈت نہرو سے بات چیت (ٹیبر منڈی) | ۲ روپے |
| ندیا کنارے (علی عباس حسینی) | ایک روپیہ |
| کلکی یا تہذیب کا مستقبل (ڈاکٹر رادھا کرشنن) | ۷۵ پیسے |

آج کل کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت ہوگی
محصول ڈاک ہمارے ذمہ ہوگا

علاوہ انگریزی، ہندی اور تمام علاقائی زبانوں میں کتابیں شائع ہوتی ہیں

فہرست کتب مفت طلب کیجئے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دلی



Vol. 29 No. 7 AJKAL (Monthly) February 1971

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55
Regd. No. D-509

# آجکل

مارچ ۱۹۷۱ء

۶۰ پیسے

Osmania University Library
HYDERABAD (DECCAN)

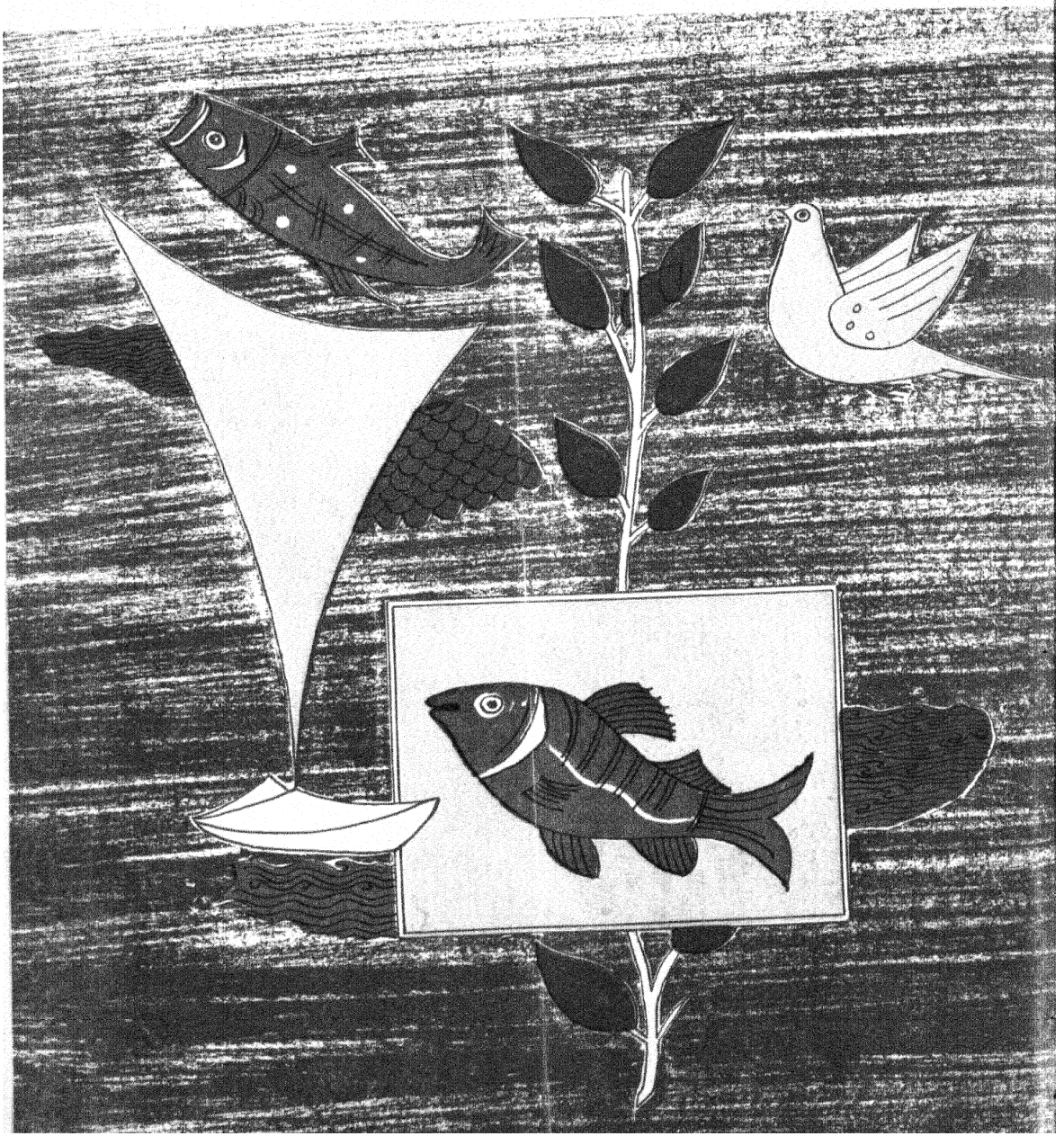

# پدم شری کا اعزاز پانے والے اُردو شعراء

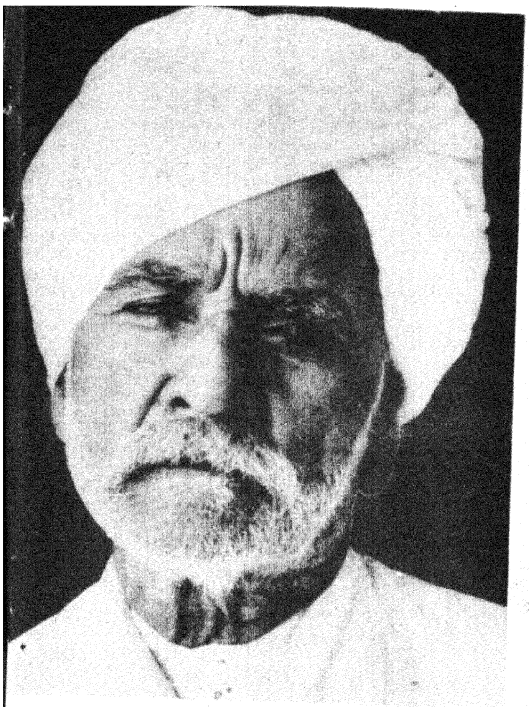

جوش ملسیانی



جناب حیات اللہ انصاری

آپ کے ناول "لہو کے پھول" کو ساہتیہ اکادمی نے اُردو کی بہترین تخلیق قرار دیا ہے



ساحر لدھیانوی



غلام ربانی تاباں

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

# آج کل

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

*

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۲۹ شمارہ ۸
مارچ ۱۹۷۱ء
پھاگن چیتر شک سمت ۱۸۹۲

سرورق: عل جیون اڈلجہ

سالانہ: ہندوستان میں: سات روپے
دیگر ممالک سے: ۱۰ شلنگ ۶ پینس یا ڈیڑھ ڈالر
فی پرچہ: ہندوستان میں: ۶۰ پیسے
دیگر ممالک سے: ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

## ترتیب


| | | | |
|---|---|---|---|
| ملاحظات | | | ۲ |
| خود کلامی | (نظم) | علی جواد زیدی | ۳ |
| غبارِ کارواں | (۱۳) | سعید احمد اکبر آبادی | ۴ |
| متوازی راستے | (نظم) | ساجدہ زیدی | ۱۰ |
| غزلیں | | اختر علی تلہری۔ غلام ربانی تاباں | ۱۱ |
| میر اور یقین | | نثار احمد فاروقی | ۱۲ |
| سامنا | (کہانی) | انور عظیم | ۱۸ |
| غزلیں | | بمل کرشن اشک، شہاب عراقی، وشوا ناتھ درد | ۲۴ |
| علی گڑھ چند یادیں | | ابنِ علی نقوی | ۲۵ |
| آواز ناشنیدہ | (نظم) | نجیب رامش | ۳۰ |
| غزلیں | | ضیاء فتح آبادی۔ مہدی پرتاب گڑھی، فیاض گوالیاری | ۳۱ |
| منو | (مراٹھی کہانی) | پی ایس ریگے | ۳۳ |
| غزلیں | | فضا کوثری۔ جگدیش مہتہ درد۔ عشرت انور، حسرت سہسرامی۔ ناظر الحسینی | ۴۱ |
| عرب اور علم کیمیا | | سعد الحسن آفاق | ۴۲ |
| غزل | | کلیم عاجز | ۴۶ |
| نئی کتابیں | | | ۴۷ |


مضامین اور ترسیل زر کا پتہ
شہباز حسین ایڈیٹر آج کل (اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

شائع کردہ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

# ملاحظات

۲۰ جنوری ۱۹۷۱ء کو وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی نے وشاکھاپٹنم میں فولاد کے ایک کارخانے کا سنگِ بنیاد رکھا۔ یہ کارخانہ ۵ ارب روپے کی لاگت سے تعمیر ہوگا اور اس سے لگ بھگ ۱ لاکھ ۵۰ ہزار افراد کو روزگار ملے گا۔ ملک میں تعمیر و ترقی کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے پیشِ نظر لوہے اور اسپات کی مانگ میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

آزادی کے وقت ملک میں فولاد کے صرف دو بنیادی کارخانے تھے جن کی سالانہ پیداوار پندرہ لاکھ ٹن تھی۔ اس کی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جنوری ۱۹۵۴ میں ہندوستان اسٹیل لمیٹیڈ کی داغ بیل ڈالی گئی جس کے زیرِ انتظام روڑکیلا، بھلائی اور درگاپور میں اسپات کے تین کارخانے کھولے گئے۔ پرائیوٹ سیکٹر کے دو فولاد کارخانوں کی پیداوار بڑھانے کے لئے مالی امداد دی گئی۔ اس طرح ۱۹۶۱ء تک ملک میں ۶۰ لاکھ ٹن فولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کی گئی۔ مزید ضرورتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تیسرے پلان کی مدت ۱۹۶۶-۱۹۶۱ء میں بھلائی کے کارخانے کی پیداواری صلاحیت ۲۵ لاکھ، اور روڑکیلا کی ۱۰ لاکھ ٹن اور درگاپور کی ۱۶ لاکھ ٹن مقرر کی گئی۔ سنگِ فولاد کی مانگ میں اضافہ جاری ہے لہٰذا بوکارو میں اسپات کا ایک بہت بڑا کارخانہ زیرِ تعمیر ہے۔ چوتھے پلان کے اختتام تک اسپات کی مانگ ۱۵۰ لاکھ ٹن تک پہونچ جانے کی توقع ہے۔ اس خیال کے تحت جنوبی ہندوستان میں ملیم ہو سپٹ اور وشاکھاپٹنم کے مقام پر تین متوسط درجے کے کارخانے کھولنے کی منظوری دی گئی ہے جس میں وشاکھاپٹنم کے کارخانے کی تعمیر شروع ہو گئی ہے ایسی بنیادی صنعتیں ملک کی خوشحالی کی ضامن ہیں۔

---

حال میں ساہتیہ اکادمی نے ہندوستان کی جن مختلف علاقائی زبانوں کے لئے انعام دینے کا اعلان کیا ہے ان میں اُردو کے ممتاز صحافی، افسانہ نویس اور ناول نگار جناب حیات اللہ انصاری کا ناول "لہو کے پھول" بھی شامل ہے۔

"لہو کے پھول" اُردو کا ضخیم ترین ناول ہے جو پانچ جلدوں میں ہے اور ۲۶ صفحات پر محیط ہے۔ اس قابلِ قدر تصنیف کو ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا تھا۔ ادارہ اس اعزاز پر موصوف کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

---

اچھے شاعر کے لئے اچھا انسان ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہو یا نہ ہو مگر جناب شاہد عزیز روشؔ صدیقی پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ وہ اردو کے ممتاز اور منفرد شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی دلنواز شخصیت کے مالک تھے اور سادگی اور شرافت، انکسار و استغنا، اور نیکی و اخلاص کا مجسمہ تھے۔ اس زمانے میں بہت کم انسان ایسے ہوتے ہیں۔

۲۲ اور ۲۳ جنوری کی درمیانی شب میں شاہجہاں پور (یوپی) کے ایک مشاعرے میں شریک تھے کہ دل کا دورہ پڑا جس سے جانبر نہ ہو سکے، ان کی موت واقعی ایک عظیم سانحہ ہے۔ ؎ ابھی تو گوش بر آواز تھی بزمِ سخن یہ کہاں پہ تو نے کہانی کا اختتام کیا (روشؔ)

---




پاکستان کے ممتاز اُردو ادیب اور شاعر جناب عابد علی عابد کا ۲۱ جنوری کو لاہور میں انتقال ہو گیا۔ آپ کی عمر ۶۵ سال تھی۔

آپ نے مختلف حیثیتوں میں اُردو کی جو قدر خدمت انجام دی ہے۔ اُن کی موت اُردو کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے

ادارہ اُردو کے ممتاز مصنف اور شاعر جناب احترام الدین شاؔغل کے انتقال پُر ملال پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے

مارچ ۱۹۷۱ء

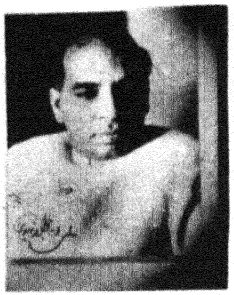

# نورکلائی

علی جواد زیدی

میں نہ کہوں تو کون کہے گا ؟
صحراؤں کے دُکھ کی کہانی، ذرّوں کے مایوس فسانے
ارض و سمٰوٰت کا دردِ جدائی، بستیوں کے جگ مگ ویرانے
پتی پتی سوکھی ہوئی سی، گوشہ گوشہ اُجڑا ہوا سا
بستی بستی گھائل سپنے، لاکھ شکاری، لاکھ نشانے
میں نے سمیٹے دامن دامن، کانٹوں میں مدفون تبسم
دل نے بکھیرے صحرا صحرا، پھولوں کے محبوس ترانے
دیدۂ نسیاں نے بھی دیکھی، سوکھے دریاؤں کی روانی
چشمِ تمنا میں بھی ناچے، اُلجھے ہوئے غمگین زمانے
بے خود محفل کیا سمجھے گی، تشنہ لبوں نے کیا کیا دیکھا
چھلکے ہوئے تو پھر بھی غنیمت، لیکن یہ چھلکے پیمانے!

میں نہ کہوں تو کون کہے گا ؟
میں نے بچپن بھی دیکھا ہے، ولولۂ فکرِ سرکش کا
یہ میری گودی میں کھیلا ہے، میں نے اِسے چلنا سکھلایا
یہ روٹھی تو منایا میں نے، مچلی تو بہلایا میں نے
روئی تو گانا گایا میں نے، گرنے لگی تو میں نے سنبھالا
اس کی خاطر تتلایا ہوں، اور خود بچہ کہلایا ہوں
مہد سے محفل تک لایا ہوں، طفلِ تابہ شبابِ دانا
بات کرے گی سب سے چھپا کر، راز کہے گی کانوں میں جا کر
بھولی بنے گی باہر آ کر، مصلحتوں کا ڈال کے پردا
جس پہ یہ سب بیتی ہو وہ جانے، اس پاگل دُنیا کی کہانی
ڈوبنے والا ہی پائے گا، اِس اُلٹی گنگا کا کنارا
میں نہ کہوں تو کون کہے گا ؟
چھوٹی سی تھی دل کی انگنائی، جس میں گھٹا دکھ درد جہاں کا
سانس جلی جب اندر دیکھا تیر لگا جب باہر جھانکا
تیر چلیں یا پتھر برسیں، دِل جل جائیں، نظر چھنک جائے
پھر بھی کافر آس نہ ٹوٹے، حوصلہ تو دیکھو انسان کا
رام اور کرشن کی لے گونجے گی، سقراط و عیسیٰ اٹھیں گے
شبّیر و موسیٰ اُبھریں گے، میں شک کرنے والا کہاں کا
انسانی اُمید کے نغمے، ناتک اور گوتم چھیڑیں گے
گاندھی کی صورت دھارے گا، وقت کا تیور ترچھا بانکا!
آج بھی کوئی بہت باندھے، اِس سے اُلجھے اُس کو ٹوکے
آج بھی کوئی ہنس کر کرلے، استقبال غم و حرماں کا
میں نہ کہوں تو کون کہے گا ؟
ایک بھیانک خاموشی میں، چاند بچارا کھویا کھویا،
اک پیلی سی چادر اوڑھے، جاگا جاگا سویا سویا،
گھبرایا سا اُبھا اُبھا، ہانپ رہا ہے کانپ رہا ہے
اکثر شاید یہ بھی ہوا ہے، خود بھی رویا میں بھی رویا
جھوٹی محبت، جھوٹے ہی آنسو، عشق و محبت پہلو بہ پہلو
چاند! مگر پھر بھی تجھے سنخشا، تو نے غبارِ غم بھی تو دھویا
تاریکی میں لپٹی دُنیا، سہمی سہمی ڈول رہی ہے
ڈول رہی ہے، بول رہی ہے "اب وہ کاٹو جو پہلے بویا"
میں نہ کہوں تو کون کہے گا، دنیا جھوٹی چاند بھی جھوٹا
یہ تاریکی فکرِ سحر ہے، یہ خاموشی اک لبِ گویا
میں نہ کہوں تو کون کہے گا ؟

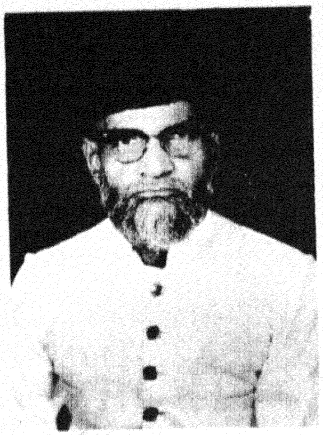

## سعید احمد اکبرآبادی

**میری** پیدائش آگرہ میں ۱۹۰۹ء میں ہوئی۔ میرے والد ڈاکٹر محمد ابرار حسین صاحب مرحوم کو اس کی بڑی فکر تھی کہ تعلیم کے ساتھ میری تربیت اور نگہداشت بھی خاطر خواہ طور پر ہونی چاہئے۔ اس بنا پر میری ابتدائی تعلیم مکان پر ہی ہوئی۔ ایک مولوی صاحب جو میرے اتالیق تھے فارسی عربی پڑھاتے تھے اور ایک کالسٹہ مسٹر مکٹ بہاری شام کے اوقات میں دو گھنٹہ انگریزی حساب اور جغرافیہ کی تعلیم دیتے تھے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ مولوی صاحب جن کا نام خورشید علی تھا اور ماسٹر صاحب دونوں ہی اُردو ادب و شعر کا ذوق رکھتے تھے اس سے خود مجھ میں اُردو شعر و شاعری اور اس کے ادب کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ لیکن اس زمانے میں میرے ادبی اور شعری مطالعہ کا شوق پرواز مرزا داغ دہلوی کے مختلف دیوانوں اور ہلکے پھلکے افسانوں اور ناولوں تک محدود رہا۔ مکان پر تین برس تک تعلیم پانے کے بعد والد صاحب نے فیصلہ یہ کیا کہ اب میں پہلے عربی اور اسلامی علوم و فنون کی تکمیل کروں اور اس کے بعد انگریزی کے امتحانات پاس کرکے اسے بھی پورا کروں۔ اس تجویز کے ماتحت مجھ کو پہلے مراد آباد اور پھر دیوبند بھیجا گیا جہاں چھ برس رہ کر میں نے نصاب کی تکمیل کی۔ یوں تو اللہ کا شکر ہے کہ دیوبند میں جس سے بھی درس لیا وہ اپنے فن کا مسلمہ استاد اور ماہر تھا لیکن یہاں سب سے زیادہ میں جن سے متاثر ہوا وہ تین استاد تھے ایک مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی۔ جو منطق اور فلسفہ کے امام تھے دوسرے مولانا محمد اعزاز علی جن کو عربی زبان اور اس کے صرف و نحو پر غیر معمولی عبور حاصل تھا اور تیسرے مولانا محمد انور شاہ الکشمیری رحمۃ اللہ علیہم اول الذکر دونوں اساتذہ کے فیض درس و تعلیم سے عربی زبان و ادب کے مطالعہ کا ذوق اور کسی مسئلہ پر بحث کرتے وقت منطقی اور فلسفیانہ استدلال کا سلیقہ تھوڑا بہت تو کچھ پیدا ہو ہی گیا تھا لیکن جب مولانا محمد انور شاہ الکشمیری درس بخاری میں پہنچا تو بالکل یہ محسوس ہوا کہ گویا ایک کوہ تنگ سے نکل کر اچانک ایک نہایت وسیع و عریض اور سرسبز و شاداب چمن میں آ پہنچا ہوں جہاں جلوۂ گل کی فراوانی، چشم کو سرنگ میں وا ہو جانے کی دعوت دے رہی تھی۔ کہنے کو یہ درس حدیث کی ایک کتاب (صحیح بخاری) کا تھا لیکن اسلامی علوم و فنون کا وہ کونسا شعبہ تھا جس کے مسائل زیر بحث نہ آتے ہوں اور شاہ صاحب ان پر نہایت سیر حاصل محققانہ گفتگو نہ کرتے ہوں۔ ان کا مطالعہ جس قدر وسیع تھا حافظہ بھی ایسا ہی تھا۔ دوران تقریر میں کتابوں کے حوالے کے ساتھ ان کی عبارتیں بھی نقل کرتے چلے جاتے تھے۔ پھر ان کے ہاں نقل ہی نہیں تھی، بلکہ مختلف کتابوں اور ان کے مصنفین سے متعارف کراتے اور ان کے کارناموں پر نقد و تبصرہ فرماتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب کی نجی گفتگو بھی علمی اور ادبی انداز کی ہوتی تھی۔ اس بنا پر موصوف کے درس اور اس کی صحبت کا اثر یہ ہوا کہ مجھ میں علمی اور فنی مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے اور تحقیق سے کام لینے کا جذبہ اور سلیقہ پیدا ہوا۔ نصاب تعلیم میں جو کتابیں درج تھیں اب میں انہیں کا پابند نہیں رہا بلکہ ہر فن کی درسی کتابوں کے ساتھ دوسری غیر درسی کتابیں بھی پڑھتا رہتا تھا۔ حصول علم کے لئے اگر بے تعصبی شرط اولین ہے تو مجھ کو اعتراف کرنا چاہئے کہ مجھ میں اس خو کا پیدا ہونا شاہ صاحب کی ہی دین ہے۔

شاہ صاحب کے درس سے ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ طبیعت وقت پسندی کی خوگر ہو گئی اور سوقیانہ شاعری اور سستے قسم کے افسانوں سے ابا کرنے لگی۔ اسی زمانہ میں میں نے اردو ادب کا مطالعہ کیا تو اُردو کے مناصر خمسہ میں سے کوئی نہیں تھا جس کی اکثر و بیشتر کتابیں میں نے نہ پڑھی ہوں۔ ان کے علاوہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد اور سیر کوہسار، عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناول، راشد الخیری کے مختصر افسانے، خواجہ حسن نظامی کے تخیلی مضامین اور نیاز فتحپوری کے انشائیے اور شہاب کی سرگزشت یہ سب کتابیں پڑھ ڈالیں لیکن سب سے زیادہ طبیعت جس سے متاثر ہوئی وہ مولانا شبلی نعمانی کی شخصیت ہے۔ میں نے مولانا کی اکثر و بیشتر کتابیں پڑھی ہیں لیکن الفاروق اور شعر العجم دو ایسی کتابیں ہیں جنہوں نے طبیعت پر بہت عمیق اور دور رس اثرات پیدا کئے۔ الفاروق تحقیق کا شاہکار تو

ہے ہی، زبان و بیان اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی اس کا کوئی جواب اب تک پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ رہی شعر العجم تو اس میں شبلی کا جو اصل کارنامہ ہے اور جس میں میرا خیال ہے ایران میں بھی ابھی تک ان کا کوئی حریف پیدا نہیں ہو سکا وہ شعر العجم کا چوتھا اور پانچواں حصہ ہے جن میں فارسی شاعری کا عہد بہ عہد ارتقاء اور ہر عہد کی لفظی و معنوی خصوصیات اور ان کے اسباب و عوامل پر شبلی نے اس مہارتِ فن، وسعتِ نظر دقتِ نگاہ سے اور پھر اس درجہ شستہ و رفتہ اور بے ساختہ اور برجستہ زبان میں بحث کی ہے اور اس میں زبان و بلاغت کے وہ عجیب و غریب نازک اور لطیف نکتے پیدا کئے ہیں کہ بے ساختہ سطر سطر پر احسنت اور مرحبا کی صدا نکلتی ہے۔ شبلی تاریخ کا ذوق اور اس کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ اور ساتھ ہی منطق اور فلسفے کے بہت اچھے عالم تھے۔ شعر و ادب کا ذوق فطری تھا۔ طبیعت میں جودت و شگفتگی بلا کی تھی۔ ان سب چیزوں کے بیک وقت اجتماع نے اردو زبان کے کلاسیکل مصنفین میں شبلی کی شخصیت کو بہت بلند اور نمایاں کر دیا ہے مجھے اس کا یقین ہے کہ دقیق سے دقیق علمی بحث کو جس قدرتِ کلام کے ساتھ دلآویز شگفتہ زبان میں شبلی لکھ سکتے تھے ان کے جانشین سید سلیمان صاحب ندوی اور تلمیذ خاص عبدالسلام ندوی کو بھی وہ بات نصیب نہ ہوئی۔ میرے شعبہ میں کوئی طالب علم پی ایچ ڈی میں داخلہ لیتا ہے تو میں اس کو شروع کے دو تین مہینوں میں مولانا شبلی کی خاص خاص کتابیں غور اور توجہ سے پڑھنے کا مشورہ دیتا ہوں تاکہ اُسے معلوم ہو سکے کہ کسی موضوع پر گفتگو کرتے وقت کس طرح اس کے مختلف اجزاء اور عناصر کا تجزیہ کر کے ہر ہر چیز پر الگ الگ بحث کی جاتی ہے اور اس کے لئے اسلوب نگارش کس قسم کا ہونا چاہئے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ حضرت شاہ صاحب نے مجھ میں جس علمی و تحقیقی ذوق کی تخم ریزی کی تھی اس کی آبیاری مولانا شبلی کی کتابوں نے کی۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ دیوبند کی طالب علمی کے زمانے ہی میں میں قاہرہ سے المقتطف اور الہلال جو بلند پایہ علمی ماہنامے تھے منگواتا اور بڑے شوق سے ان کا مطالعہ کرتا تھا اور اردو رسائل میں نگار اور معارف زیرِ مطالعہ رہتے تھے۔ جیسا کہ شروع میں عرض کر آیا ہوں، اُردو شعر و شاعری کے میرے مطالعہ کا آغاز داغ کے دواوین سے ہوا تھا لیکن اب غالب مومن اور میر کے کلیات و دواوین مطالعہ میں رہتے تھے۔ غالب کی متعدد شرحیں بھی پاس رہتی ہیں لیکن شعر کے معاملہ میں بجائے شرح کے خود اپنے ذوق پر بھروسہ کرنے کا عادی رہا ہوں۔ اس بناء پر شرح سے استفادہ کی نوبت کم ہی آتی تھی۔

جس زمانہ کا یہ ذکر ہے اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال دونوں کا غلغلہ بلند تھا۔ مجھ ایسے متجسس اور متفحص طالب علم کے لئے کیونکر ممکن تھا کہ ان سے بے اعتنائی برتتا چنانچہ ان دونوں کو بھی میں نے پڑھا اور بار بار پڑھا۔ مولانا ابوالکلام کا الہلال (دور اول) اور البلاغ تو کبھی کے بند ہو چکے تھے لیکن ان مجلات کے مختلف مضامین کتابی صورت میں طبع ہو کر ملتے تھے۔ ان کے علاوہ مولانا کا تذکرہ، مسئلہ خلافت اور ترجمان القرآن ان کا بھی بڑا چرچا تھا لیکن مجھ پر سب سے زیادہ اثر تذکرہ اور ترجمان کا ہوا۔ تذکرہ کہنے کو سوانح عمری ہے۔ ورنہ درحقیقت اردو ادب میں انشاء اور خطابت کا شاہکار ہے۔ یہی وہ انشاء ہے جس کی نسبت مولانا حسرت موہانی نے کہا تھا:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
شعرِ حسرت میں وہ مزا نہ رہا

تذکرہ کے بعض مقامات بار بار پڑھے یہاں تک کہ صفحے کے صفحے زبانی یاد ہو گئے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ میری تحریر میں بھی یہ رنگ جھلکنے لگا۔ میری عمر پندرہ ساڑھے پندرہ برس کی ہوگی۔ لاہور سے سید حبیب ایک روزنامہ سیاست کے نام سے نکالتے تھے۔ انہوں نے بقرعید کے موقع پر روزنامہ کا ایک خاص نمبر قربانی نمبر کے نام سے شائع کرنے کا اعلان کیا میں نے بھی ایک مضمون لکھا اور ڈرتے ڈرتے سید حبیب کو بھیج دیا۔ مضمون پر میں نے اپنا نام تو لکھا تھا لیکن کچھ خوف اور کچھ شرم اپنا پتہ نہیں لکھا تھا۔ جب یہ شاندار خاص نمبر چھپ کر آیا تو اب تک یاد ہے مجھے یہ دیکھ کر کس درجہ خوشی ہوئی ہے کہ میرا مضمون (جو عمر میں پہلی مرتبہ طبع ہوا تھا) بڑے اہتمام سے نمایاں طور پر شائع ہوا تھا اور میرے نام کے ساتھ حضرت مولانا لکھا تھا درحقیقت یہ سب کچھ نتیجہ تھا اس بات کا کہ مولانا ابوالکلام کی تحریریں مکرر سہ کرر پڑھنے کی وجہ سے میری تحریر میں ابوالکلامیت پیدا ہو چلی تھی لیکن یہ رنگ نبھ نہیں سکتا تھا۔ (اور سچ تو یہ ہے کہ خود مولانا سے نہیں نبھ سکا) اس لئے جب طبیعت علمی اور سنجیدہ مضامین پڑھنے کی طرف مائل ہوئی تو یہ رنگ دھلتا اور صاف ہوتا چلا گیا۔ رہا ترجمان القرآن تو اس میں سورہ فاتحہ کی تفسیر میرے نزدیک تفاسیر کے پورے ذخیرہ میں ایک گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے اور اُس نے فکری اعتبار سے ایک ایسی راہ دکھائی ہے جو درحقیقت ہے تو قرآن کی ہی راہ لیکن لوگوں نے اس کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ وحدتِ دینِ قرآن کا وہ موضوع گفتگو ہے جس کو بار بار مختلف پیرایۂ بیان سے بیان کیا گیا ہے اور دعوتِ محمدیہ میں اس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی ہے۔ لیکن کیسی عجیب اور سخت افسوسناک بات ہے کہ ہمارے علمائے تفسیر نے اس مضمون کو سب سے کم شائستۂ اعتنا سمجھا ہے و علمائے سلف میں سب سے پہلے شاہ ولی اللہ ہیں جنہوں نے اس موضوع پر اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں وضاحت اور تفصیل سے لکھا ہے اور شاہ صاحب کے بعد نمبر مولانا کا ہے حق یہ ہے کہ مولانا نے تو اس پر قلم ہی توڑ دیا ہے۔

اُردو شاعروں میں قدیم و جدید اچھے اور بُرے سب ہی پڑھ ڈالے ہیں۔ لیکن غالب اور اقبال دو ایسے شاعر ہیں جن کو میں نے صرف پڑھا نہیں ہے بلکہ میں نے انہیں زندگی کے سنگلاخ سفر میں اپنا رفیق ساتھی اور رہنما بنا لیا ہے۔ طبیعت پر جب کبھی رنج و غم فکر و تشویش یا اُداسی یا پژمردگی کی کیفیت طاری ہوئی ہے میں نے اقبال کی کوئی نظم یا غزل پڑھنی شروع کر دی ہے یا دیوانِ غالب ہاتھ میں لے کر گنگنانے لگا ہوں۔ اور میں نے محسوس کیا ہے کہ جیسے اُداسی اور دلگرفتی کے بادل چھٹ رہے ہیں اور دل میں عزم و حوصلہ اور ارمان و ولولہ کی چاندنی چھٹک رہی ہے۔ غالب نے "موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں" کہہ کر زندگی کا ایک رُخ بیان کیا ہے لیکن اقبال نے:۔

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

اور

"زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ ستیز" کا نعرہ لگا کر غم اور حوادث روزگار کا مقابلہ کرنے کا عزم اور حوصلہ بخشتا ہے گویا ایک شخص مرض کا تو دوسرا اس مرض کے لئے نسخہ شفا کی نشاندہی کرتا ہے۔ غالب اور اقبال دونوں زندگی اور اس کے معاملات و مسائل کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھنے کا سلیقہ پیدا کرتے ہیں۔ ایک ایسا خاص نقطۂ نظر جس کے آئینہ میں زندگی ایک بار گراں اور بوجھ نہیں بلکہ ایک عطیۂ خداوندی اور نعمت حقیقی نظر آتی ہے۔

میں نے تاریخ، فلسفہ، شعر و ادب اور اسلامیات پر عربی فارسی اردو اور انگریزی میں سینکڑوں کتابیں اعلیٰ اور بلند پایہ مصنفین کی پڑھی ہوں گی اور ظاہر ہے کہ کوئی عمدہ کتاب اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ ان سب کا ذکر نہ ممکن ہے اور نہ ضروری۔ عربی زبان و ادب میرا خاص اور محبوب مضمون رہا ہے۔ اور اس کا ذوق طبعی اور فطری ہے فارسی شعر و ادب سے بھی مجھے بڑی دلچسپی رہی ہے۔ خاقانی، انوری، عرفی، نظیری اور قاآنی کو خود پڑھا ہی نہیں بلکہ برسوں تک دلی یونیورسٹی میں آنرز اور ایم اے (فارسی) کی کلاسوں کو ان کا درس دیا ہے لیکن جہاں تک عقیدت اور ارادت کا تعلق ہے وہ مجھے سب سے زیادہ خواجہ حافظ سے رہی ہے۔ رنج و غم کی کیفیت ہو یا کسی قسم کی پریشانی اور تشویش کی ہر حالت میں دیوان حافظ میرا مونس و ہمدم اور غمخوار ثابت ہوا ہے بلکہ بعض مواقع پر حضرت لسان الغیب نے میری بروقت رہنمائی کر کے نقصان عظیم سے بچا لیا ہے اس سلسلے کے واقعات تو کئی ایک ہیں لیکن یہاں دو واقعے بیان کروں گا۔ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے۔ بدایوں کے ایک رئیس میرے بڑے بے تکلف اور عزیز دوست تھے۔ اس زمانہ کے رئیس عموماً جیسے ہوتے تھے سب کو معلوم ہے یعنی زندہ دل اور رنگین طبع۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھ کو آموں کی فصل میں انبہ خوری کے لئے بدایوں مدعو کیا اور میں وہاں پہنچ گیا۔ پہلا دن تو خیریت سے گزرا لیکن دوسرے روز کیا ہوا! شب کے دس ساڑھے دس بجے کا وقت ہوگا میں حسب معمول سونے کے لئے پلنگ پر لیٹ گیا تھا کہ اتنے میں یہ دوست آئے اور مجھے اپنے ساتھ ایک نہایت آراستہ و پیراستہ کمرہ میں لائے میں یہاں پہنچا تو دیکھا کہ عالم ہی کچھ اور ہے محفل نشاط سجی ہوئی ہے اور ایک ناطورۂ خوش جمال۔

برسر پندرد یاکہ سولہ کا سن
[illegible]

اپنے سازندوں کے ساتھ رونق بزم ہے۔ گانا شروع ہوا تو محسوس ہوتا تھا پوری فضا معطر ہو گئی ہے اور ؎ ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بنغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

کا منظر تھا۔ دوسرے دن میں بدایوں سے رخصت ہو گیا۔ لیکن یہ صحبت شب بلائے جان ہو گئی۔

دل میں آ کر نہ دل سے پھر نکلے
تم تو ارمان ہو گئے دل کے

میں نے اپنے دوست کو اس کیفیت سے مطلع کیا تو انہوں نے لکھا کہ اس میں پریشانی کی کونسی بات ہے۔ میرا گھر آپ کا گھر ہے۔ جب دل چاہے بے تکلف آ جائیے اور جب تک جی چاہے یہاں رہئے۔ میں نے سوچا کہ یہ سب کچھ ممکن ہے لیکن آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ عیب و الجھن زیادہ بڑھی تو حسب معمول حضرت خواجہ سے رجوع کیا۔ اب دیوان کھولتا ہوں تو پہلا شعر جو نظر آیا وہ یہ تھا۔ ؎ من گدا ہوس سر وقامتے دارم
کہ دست در کمرش جز سہم و زر نہ رسد

اس شعر کا نظر آنا تھا کہ کسی نے دل و دماغ کی مکمل تنقیہ اور تذکیہ کر دیا۔ اور پھر اس کے بعد نہ کبھی ادھر کا رخ کیا اور نہ کبھی خیال ہی آیا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ اینگلو عربک کالج دہلی میں جو اب دلی کالج کہلاتا ہے عربی کے ایک لیکچرر کی پوسٹ کا اشتہار ہوا۔ ایک درخواست میں نے بھی بھیجدی لیکن انٹرویو کے بعد کالج کی انتخابی کمیٹی میں اختلاف ہو گیا۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں جو چیئرمین تھے میرے حامی تھے اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی رائے ایک اور امیدوار کے حق میں تھی جب اختلاف زیادہ بڑھا اور مصالحت کی کوئی صورت ہی پیدا نہیں ہوئی تو فیصلہ یہ ہوا کہ اس پوسٹ کو فارسی کے لیکچرر کی پوسٹ میں تبدیل کر دیا جائے۔ یہاں مجھ کو مایوسی ہوئی تو طبیعت پر اس کا برا اثر پڑا۔ اسی پریشانی اور دل گرفتگی کے عالم میں دیوان حافظ سے فال نکالی تو یہ شعر نکلا

گرچہ منزل بسی خطرناک ست و مقصد ناپدید
تا بیچ راہے نیست کو رانیست پایاں غم مخور

یہ شعر پڑھتے ہی سکون سا ہو گیا، اور خدا کی شان چند روز کے بعد ہی میری درخواست اور کوشش کے بغیر سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی کے پرنسپل مسٹر کمرجی نے مجھ کو اپنے ہاں بلا کر کہا کہ کالج کو آپ کی ضرورت ہے۔ میں درخواست کرتا ہوں آپ ہمارے کالج میں لیکچرر کی پوسٹ قبول کر لیں۔ چنانچہ میں لیکچرر ہو گیا اور ایک برس کے بعد ہی جونیئر گریڈ سے سینئر گریڈ میں منتقل کر دیا گیا۔

دیوبند سے فراغت کے بعد میں مولانا محمد انور شاہ الکشمیری اور ان کی جماعت جو تحریک اصلاح مدرسہ کے سلسلے میں دارالعلوم سے مستعفی ہو گئی تھی۔ ان کے ساتھ ڈابھیل ضلع سورت کے مدرسہ جامعۂ اسلامیہ میں مدرس ہو کر ڈابھیل چلا گیا یہ ۱۹۲۸ء کی بات ہے یہاں میں کم و بیش تین برس رہا۔ یہیں کے زمانۂ قیام میں گاندھی جی نے نمک سازی کے لئے ڈانڈی کا مشہور مارچ کیا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۳۰ء کی بات ہے اس مارچ کے سلسلہ میں گاندھی جی ہمارے جائے قیام ڈابھیل سے دس گیارہ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے۔ اس وقت نام یاد نہیں آتا وہاں سے گزرنے والے تھے ہم لوگوں کو یہ معلوم ہوا تو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور یہ خاکسار ہم تینوں نے اس موقع پر

گاندھی جی کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کر لیا اور ہم وہاں پہنچ گئے۔ یہ گاؤں ایک بہت ہی معمولی اور چھوٹا سا گاؤں ہے لیکن آج یہاں ہزاروں انسانوں کا مجمع تھا۔ دکانیں لگی ہوئی تھیں جیسے کوئی بڑا میلا ہوتا ہے اور جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ گاندھی جی کی عظمت سے میں پہلے سے واقف تھا لیکن اس دن اندازہ ہوا کہ درحقیقت وہ اپنے علمی اور عملی قوا اور ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے کتنے بڑے انسان ہیں اور انہوں نے کس ریاض اور محنت سے اپنے آپ کو بنایا ہے۔ ہوا یہ کہ ہم جب اس گاؤں میں پہنچے تو گاندھی جی اس وقت تک نہیں آئے تھے تھوڑی ہی دیر کے بعد دُور سے چند انسانوں کا قافلہ آتا ہوا نظر آیا۔ اب غور سے دیکھا تو گاندھی جی آگے آگے لکڑی ہاتھ میں لئے تیز قدم اٹھاتے چلے آ رہے ہیں اور چند لوگ ہیں جو اُن کے ساتھ ہیں۔ خیال تھا کہ گاندھی جی بارہ میل پیدل چل کر آ رہے ہیں اس لئے یہاں پہنچکر وہ آرام کریں گے اور سُستائیں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ گاندھی جی کا اس وقت نہ سانس پھولا ہوا تھا اور نہ تھکن کے مارے ان پر اضمحلال کا کوئی اثر تھا۔ وہ یہاں پہونچے، نہائے دھوئے اپنی غذا کھائی (اس وقت دن کے بارہ بجے کا وقت ہوگا) اور پھر بالکل تازہ دم ہو کر ایک شامیانے کے نیچے جہاں پہلے سے اُن کی نشست کا انتظام تھا آ کر بیٹھ گئے۔ اس وقت عام ملاقات کی اجازت نہیں تھی لیکن ہم نے اطلاع کرائی تو انہوں نے فوراً بلا لیا ہم اندر گئے تو دیکھا ایک ٹانگ پر ٹانگ رکھے گاندھی جی بالکل سیدھے بیٹھے چرخہ کات رہے ہیں اور سیٹھ جمنالال بجاج اور تین چار اور اشخاص ان کے سامنے بیٹھے ہیں۔ کمال یہ تھا کہ اُن میں سے دو صاحبوں کو بیک وقت بعض ضروری خطوط املا کرا رہے تھے۔ باقی اصحاب سے تحریک کے سلسلہ میں بعض اہم معاملات پر گفتگو بھی کرتے جاتے تھے اور ادھر ہاتھ چرخہ چلانے میں مصروف تھے۔ یہ تینوں کام بیک وقت نہایت منظم اور باقاعدہ ہو رہے تھے۔ کیا مجال کہ کسی میں کوئی رخنہ پیدا ہو جائے۔ ہم تینوں خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے مسکراتے ہوئے ہمارا سواگت کیا اور اپنے قریب بٹھا لیا۔ شروع میں ہمارے مدرسہ کا کچھ حال اور ہمارے اساتذہ کی خیریت دریافت کی اور پھر بولے کہ میں نے اخبار میں پڑھا ہے کہ مولانا محمد انور شاہ صاحب نے پشاور میں تقریر کرتے ہوئے ایک حدیث بیان کی ہے جس میں پیغمبر صاحب نے فرمایا ہے کہ تین چیزوں پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا جا سکتا اور وہ ہیں نمک گھاس اور پانی۔ یہ کہنے کے بعد گاندھی جی نے ہم سے پوچھا کہ کیا یہ خبر صحیح ہے اور کیا سچ مچ حضرت محمد صاحب نے ایسا فرمایا ہے ہماری طرف سے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جواب دیا۔ ہاں گاندھی جی! یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔

یہ سُن کر گاندھی جی کا چہرہ خوشی کے مارے چمک اٹھا اور وہ بولے اب تو مجھ کو اور بھی اس بات کا یقین ہو گیا کہ میں نے جو قدم اٹھایا ہے وہ بالکل درست ہے اس کے بعد فرمایا اچھا، میں اپنا آدمی آپ کے ساتھ بھیج دوں گا۔ آپ وہ حدیث مع حوالہ کے اصل عربی کے لفظوں میں اور پھر اس کا اُردو ترجمہ لکھ کر میرے پاس بھیجدیں چنانچہ وہ آدمی ہمارے ساتھ آیا اور ہم سے وہ حدیث مع ترجمہ لے گیا گاندھی جی کو اس واقعہ سے اتنی خوشی ہوئی کہ جب سہ پہر میں تین بجے ایک عظیم الشان جلسہ عام میں انہوں نے تقریر کی (اور اس جلسہ میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے بھی تقریر کی تھی) تو انہوں نے ہم لوگوں کے یہاں آنے اور ہم سے اپنی بات چیت کا بھی ذکر کیا اور اس بات کو پھر دہرایا کہ پیغمبر صاحب کا یہ قول سنکر مجھ کو بڑی قوت حاصل ہوئی ہے۔

بہرحال اس روز میں نے گاندھی جی میں اُن کی بہت غیر معمولی حاضر جوابی۔ ذہنی اور روحانی طاقت و قوت کا جو مشاہدہ کیا میں اُسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ایک مرتبہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جو میرے قریبی رشتہ سے بڑے بھائی ہوتے اور مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے، بیان کیا کہ ایک موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد نے گاندھی جی کا ذکر آیا تو اگرچہ مولانا بڑے سے بڑے آدمی کی تعریف میں بے تحمل واقع ہوئے تھے لیکن اس وقت انہوں نے گاندھی جی کی ذہانت، دور رسی اور ان کی روحانی اور اخلاقی طاقت کا تذکرہ اس والہانہ انداز سے کیا کہ میں حیران رہ گیا۔ اس سلسلہ میں مولانا نے گاندھی جی کے متعدد چشمدید واقعات سنائے۔ ان میں ایک واقعہ یہ بھی تھا کہ جب گاندھی جی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں جا رہے تھے تو اس سلسلہ کے جو کاغذات اور دستاویزات وغیرہ تھے وہ سب انہوں نے روانگی سے چند گھنٹے پہلے مجھ سے لئے اور ایک دو گھنٹے میں ان کو پڑھ لینے کے بعد ہم سب ارکان ورکنگ کمیٹی سے گفتگو کی تو مولانا فرماتے تھے میں سخت حیران ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانفرنس میں جو مسائل زیر بحث آئیں گے، گاندھی جی نے ان سب کا مطالعہ بڑی وسعت اور دقت نظر سے کر لیا ہے اور اب کسی مسئلہ کا کوئی پہلو بھی ایسا نہیں ہے جس پر وہ بصیرت اور خود اعتمادی کے ساتھ گفتگو نہ کر سکیں۔

یہ تو خیر مولانا ابوالکلام آزاد کی بات تھی۔ وہ لوگ جو گاندھی سے سیاسی اختلافات رکھتے تھے اُن کی عظمت کا اعتراف اُن کو بھی تھا۔ چنانچہ میرے ایک دوست جو ایک روزنامہ کے ایڈیٹر اور مسٹر محمد علی جناح سے بہت قریب اور کسی حد تک بے تکلف تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ بمبئی میں گاندھی ۔ جناح گفت و شنید ختم ہو گئی اور جناح صاحب دہلی تشریف لائے اور میں ان کی خدمت میں حسب معمول حاضر ہوا تو انہوں نے بمبئی کی گفتگو کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے جہاں اور بہت سی باتیں کہیں یہ بھی فرمایا، گاندھی جی کی روحانی طاقت غیر معمولی معلوم ہوتی ہے۔ جب وہ بولتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ زبان کے ساتھ وہ اپنے دل کی طاقت بھی استعمال کر رہے ہیں اور مجھ کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ اس اثر سے بچے رہنے کے لئے مجھ کو بھی اپنی قوت ارادی سے بہت کچھ کام لینا پڑا۔

گاندھی جی کو اس روز دیکھ کر مجھ کو یقین ہو گیا کہ کوئی شخص یونہی بڑا نہیں بن جاتا بلکہ قدرت جس کو دنیا کی کوئی عظیم شخصیت بنانا چاہتی ہے تو اس میں کچھ غیر معمولی اوصاف و کمالات بھی ودیعت کر دیتی ہے۔ بدقسمتی سے آج بات بات میں ہندو مسلم کا سوال پیدا ہو جاتا ہے لیکن میری پیدائش اور پھر نشو و نما اور تربیت ایسے گھرانہ میں ہوئی جہاں اس قسم کی باتوں کا کہیں گزر ہی نہیں تھا۔ میرے والد ماجد آگرہ کے مشہور و معروف ڈاکٹر تھے۔ سرکاری ملازمت کے علاوہ ان کی پریکٹس جتنی ہندوؤں میں تھی مسلمانوں میں نہیں تھی۔

اس کے علاوہ مکان پر آنا جانا اور میل ملاقات کی رسم دونوں فرقوں کے لوگوں سے یکساں تھی کتنے ہی ہندو گھرانے تھے جن کے بچے بچیاں والد صاحب کو چاچا اور والدہ مرحومہ کو چاچی اور مجھے بھیا کہتے تھے جب میری بہن کی شادی ہوئی تو رات میں بارات کے ساتھ سینکڑوں عام ہندو مسلمان بھی مدعو تھے۔ کھانے سے فراغت پاکر سب لوگ رخصت ہو گئے لیکن چند عمر رسیدہ ہندو تھے جو بیٹھے رہے۔ جب رات زیادہ ہوئی اور والد صاحب نے ان سے کہا: اچھا! اب آپ بھی جائیے آرام کیجئے تو مجھے اب تک یاد ہے انہوں نے کس محبت سے ایک خاص تاثر کے لہجہ میں کہا تھا واہ! ڈاکٹر صاحب ابھی بنیا کا ڈر دلا تو اٹھا نہیں ہم گھر کیسے چلے جائیں چنانچہ کافی رات گئے جب بہن رخصت ہو گئی تو یہ بھی گھروں کو واپس لوٹے۔

اس ماحول میں اور ایسی سوسائٹی میں رہنے کا ہی یہ اثر تھا کہ ۱۹۳۶ء کے ماہ دسمبر کا ذکر ہے۔ ایک مرتبہ میں اور والد صاحب دہلی سے مراد آباد جا رہے تھے اور انٹر کلاس میں بیٹھے تھے۔ یہ ڈبہ اوپر تلے مسافروں سے بھرا ہوا تھا اور اس میں میرے اور والد صاحب کے علاوہ کوئی تیسرا مسلمان نہیں تھا۔ راستہ میں مغرب کی نماز کا وقت ہوا تو والد صاحب نے اسی عالم میں تکیہ سے جانماز نکالی اور وضو جو ہمارے ہی پاس بیٹھے تھے بڑی سادگی اور بھولے پن سے ان کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر والد صاحب نے فرمایا: بھیا ذرا کھڑے ہو جانا میں نماز پڑھ لوں والد صاحب کا یہ کہنا تھا کہ اس وقت کی فضا کے پیش نظر میرا دل دھک دھک کرنے لگا کہ خدا خیر کرے، سر پر کوئی اور قیامت نہ ٹوٹ پڑے۔ لیکن میری توقع کے بالکل برخلاف وہ دونوں فوراً کھڑے ہو گئے اور بولے: لیجئے! بڑے صاحب اب تو جگہ کافی ہو گئی نماز پڑھ لیجئے۔ اب میں نے یہ دیکھا تو اپنی سیٹ پر سے کھڑا ہو گیا اور ان دونوں سے کہا کہ آپ یہاں بیٹھئے والد صاحب جب تک نماز پڑھیں گے آپ کی بجائے میں کھڑا رہوں گا لیکن انہوں نے میری پیش کش بالکل قبول نہیں کی اور مسافروں میں سے دو تین ہندو ایک ساتھ بولے: ارے سب مسلمان ان بڑے صاحب جیسے ہوں جو بھگوان کی پوجا سچے دل سے کریں تو کون کمبخت ہوگا جو ان سے دشمنی کرے گا اس واقعہ کو دیکھ کر مجھ کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ حسد طرح بدی متعدی بیماری ہے اس طرح نیکی بھی متعدی ہے۔ یعنی اگر آپ کا دل کسی کی طرف سے صاف ہوتا ہے تو اس کے دل میں بھی آپ کی طرف سے میل نہیں ہوگا لیکن اگر آپ کے ہی دل میں کدورت اور عناد ہے تو پھر آپ کو اس سے صفائی قلب و خلوص کی امید رکھنا عبث ہے چنانچہ ایک روایت میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی ہے اگر تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ تمہارے دوست کا رویہ تمہارے ساتھ کیا ہے تو تم خود اپنا محاسبہ کر کے یہ دیکھو کہ تمہارا رویہ اس کے ساتھ کیا ہے۔

بہرحال میری تربیت ایسے گھرانے میں ہوئی۔ پھر عربی کی تعلیم دیوبند میں ہوئی۔ مدرسہ دیوبند میں جو تحریک آزادی میں کانگرس کے دوش بدوش رہا ہے اور اس کے بعد میں ایم اے میں طالب علم رہا سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی کا اور پھر برسوں تک اس کا اسٹاف ممبر رہا اور اس کالج کا حال یہ تھا (معلوم نہیں اب کیا ہے) کہ یہاں اساتذہ اور طلبا میں ہر مذہب کے لوگ ہوتے تھے لیکن سب آپس میں پیار محبت کے ساتھ ایک ہی خاندان کے افراد کی طرح رہتے تھے یہ کالج مشن کا ہے اس لئے سوشل معاملات میں یہاں نہ کسی کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے اور نہ اونچ نیچ کا معاملہ ہوتا ہے۔ کیمبرج چند رناگ اس کالج میں اقتصادیات کے پروفیسر تھے۔ تھے بنگالی مگر دلی میں رہتے ہوئے مدت ہو گئی تھی اس لئے اردو خاصی اچھی بول لیتے تھے۔ میں نے ان کو کبھی مغربی لباس میں نہیں دیکھا ایک کرتہ اور ایک صوتی اور ایک چادر ان کا ہمیشہ کا پہناوا تھا۔ رہن سہن اور کھانے پینے میں بھی کٹر قدامت پسند تھے۔ ہر بدھ کو ہمارے کالج میں شب ضیافت ( Guest Night. ) ہوتی تھی جس میں بیرونی مہمانوں کے علاوہ پورا اسٹاف شریک ہوتا اور اس روز ڈنر بھی بڑا شاندار ہوتا تھا لیکن ہمارے ناگ صاحب کا کھانا بغیر گوشت کے اور خالص گھی میں تیار ہوتا تھا، اس موقع پر بھی گھر سے تیار ہو کر آتا تھا۔ شاید آپ کو یہ سنکر تعجب ہو کہ اس درجہ قدامت پسندی اور کٹرپن کے باوجود ناگ صاحب میرے نہایت عزیز اور مخلص دوست تھے اور بے تکلف بھی اس درجہ کہ کشمیری گیٹ میں رہتے تھے بعض اوقات کالج سے واپسی میں میرا ان کا ساتھ ہو جاتا، تو وہ اپنے مکان پر پہنچکر مجھ کو بھی سواری سے اتار لیتے ان کی بیوی کا تو عرصہ ہوا انتقال ہو گیا تھا گھر میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ گھر میں پہونچتے ہی ناگ صاحب کے حکم سے لڑکیاں آلو کے چاپ تیار کرتیں اور گرم گرم کڑھائی میں سے نکال کر ہم دونوں کو کھلاتی رہتی تھیں ناگ صاحب کو سگریٹ کا بہت شوق تھا لیکن گھر پر حقہ استعمال کرتے تھے۔

. . . . . جب آلو کے چاپ اور اس کے بعد چائے سے فراغت ہو گئی تو ایک لڑکی جھٹ حقہ بھر لائی اور ہمارے سامنے رکھ دیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ سخت قدامت پرست ہونے کے باوجود ناگ صاحب اصرار کرتے کہ حقہ کا پہلا کش میں ہی لوں۔ مجھ کو اس کی فرمائش کی تعمیل کرنی پڑتی اس کے بعد وہ کش لیتے اور یہ دور اسی طرح گھنٹہ آدھ گھنٹہ چلتا رہتا۔ ابھی پانچ برس ہوئے ناگ صاحب کا انتقال ہو گیا جس کا مجھے بڑا صدمہ ہوا لیکن ان کی محبت، شرافت اور خلوص یہ وہ صفات ہیں جو مجھ کو رہ رہ کر یاد آتی اور تڑپا جاتی ہیں۔ میں اس کو کبھی بھول نہیں سکتا کہ ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء کی شام کو جب میں پرنسپل کلکتہ مدرسہ کے عہدہ کا چارج لینے کے لئے کالج سے تعلق منقطع کر کے احباب کالج سے رخصت ہوا ہوں تو میری طرح دل گرفتہ اور اداس تو سب ہی تھے لیکن ناگ صاحب پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور ان کی وجہ سے مجھ کو بھی اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس طرح میں ناگ صاحب کے علاوہ ہندو، مسلمان اور مسیحی اساتذہ اور طلبا میں اور بھی کتنے ہی ایسے اصحاب تھے جن سے میرے تعلقات گہرے اور مخلصانہ تھے ان کی داستان کے لئے ایک اور مقالہ درکار ہوگا۔ میری عمر کے کم و بیش اٹھارہ برس جو سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی اور اس کے ذریعہ سے دہلی یونیورسٹی اور اس کے بعد کلکتہ مدرسہ کلکتہ کے ساتھ تعلق میں مجموعی طور پر بسر ہوئے ہیں میری زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ اس زمانہ میں میری سوسائٹی بڑی متنوع ہو رہی ہے جس میں ہر مذہب

ت اور مشرب و مسلک کے لوگ شامل رہے ہیں اور اس بنا پر مجھ کو موقع ملا ہے کہ میں انسانی
یات کا مطالعہ زیادہ وسعت کے ساتھ کر سکوں۔ اس مطالعہ کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کا احترام
اس کی خدمت کا جذبہ جو مجھ میں پہلے سے موجود تھا مزید اور پختہ ہو گیا ہے اور میں انسان کے
یم مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ میری بڑی لڑکی کی کلکتہ میں شادی ہوئی اور میں نے کم و بیش آٹھ
آدمیوں کو مصرانہ دیا۔ تو ایک مقامی اُردو روزنامہ نے لکھا کہ آج تک ہم نے کلکتہ میں کوئی
ہی پارٹی نہیں دیکھی تھی جس میں حکومت کے افسر، وزیر، ہندو مسلمان، یورپین اینگلو انڈین
ر اور مولانا کانگریسی اور کمیونسٹ، پروفیسر اور تاجر، بنگالی اور غیر بنگالی اس درجہ مختلف مشرب
لک اور مذہب و زبان کے لوگ شریک ہوں۔

جب کلکتہ پہونچا تو اس زمانہ میں ڈاکٹر کاٹجو مغربی بنگال کے گورنر تھے۔ ان کے بعد پروفیسر
ی وہاں کے گورنر ہوئے۔ یہ عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے گورنر ہونے سے پہلے کلکتہ
ن یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر اور صدر شعبہ تھے۔ آزادی کے بعد جو دستور ساز اسمبلی بنی
اس کے نہایت فعال اور با اثر ممبر تھے چنانچہ دستور کی ترتیب اور اس کی زبان کی صحت
ں ان کا بڑا دخل رہا ہے۔ مذہباً عیسائی تھے لیکن عقیدۃً و عملاً مہاتما گاندھی کے نہایت سچے
رقص پیرو تھے۔ لباس اور غذا دونوں بہت سادہ رکھتے تھے۔ گورنر کی تنخواہ میں سے صرف
ڑھائی سو روپے ماہوار لیتے تھے۔ باقی رقم خیراتی کاموں اور خصوصاً تعلیم کے لئے مخصوص
دیتے تھے چنانچہ ان کے انتقال کے بعد اخبارات سے معلوم ہوا کہ انہوں نے عورتوں اور
ماندہ طبقات کی تعلیمی اعانت و امداد کے لئے پانچ لاکھ روپے کی اور بعض اور کاموں کے
تین چار لاکھ روپے کی وصیت کی ہے ۔ پروفیسر کرجی سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب
ں پرنسپل کلکتہ مدرسہ کی حیثیت سے ان سے راج بھون میں ملا اور ان سے کلکتہ مدرسہ کے جلسۂ
تقسیم اسناد کی صدارت اور خطبہ پڑھنے کی درخواست کی۔ موصوف نے نہ صرف یہ کہ
میری درخواست بڑی خوشی سے منظور کر لی بلکہ دیر تک مسلمانوں کے معاملات و مسائل پر
ی کمیونٹی اور قوم کے ساتھ گفتگو فرماتے رہے۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا میں
ایک ایسی جگہ پر ہوں۔ جہاں میں براہ راست مسلمانوں کی مشکلات
اُن کی دشواریوں سے واقف نہیں ہو سکتا لہٰذا جب کبھی ان معاملات
سائل کے سلسلہ میں میری امداد کی ضرورت ہو۔ آپ بے تکلف آکر مجھ کو ان سے
خبر کریں۔ اس کے بعد فرمایا۔ میں بہت خوش ہوں گا اگر آپ یوں بھی مجھ سے وقتاً فوقتاً ملتے
ہیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا اور چلا آیا۔ چنانچہ میں ان کے پاس گورنمنٹ ہاؤس کبھی کبھی یوں
ی جاتا تھا اور اس کے علاوہ بعض سرکاری اور غیر سرکاری تقریبات میں وہ بھی یاد فرماتے
تھے ان کی وضعداری کا عالم یہ تھا کہ کلکتہ یونیورسٹی کی ملازمت کے زمانے میں وہ جس محلہ میں رہتے
تھے اس میں ایک مسلمان نیچہ بند کی بھی دکان تھی پروفیسر کرجی کو حقہ پینے کا بھی شوق تھا اور
سے تقریب سے ان کا مسلمان نیچہ بند کے ہاں آنا جانا اور اس سے ملنا جلنا تھا۔ اپنی اس
ضعداری کو انہوں نے گورنر ہونے کے بعد بھی اس طرح قائم رکھا کہ عید بقرعید پر اس شخص کے
ج کو نئی دہلی

لئے اور اس کے بیوی بچوں کے لئے برابر تحفے تحائف بھیجتے اور کبھی کبھی کار بھیجکر اس کو اپنے ہاں
بلاتے۔ اور خاطر مدارات کرتے تھے۔

کلکتہ مدرسہ کا جلسۂ تقسیم اسناد جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ پروفیسر کرجی حسب
وعدہ اس میں تشریف لائے۔ صدارت کی، اسناد تقسیم فرمائیں اور پھر مسلمانوں کے تعلیمی مسائل
پر ایک نہایت بصیرت افروز خطبہ پڑھا۔ جلسہ کے بعد عصرانہ کا انتظام تھا۔ میں موصوف کے
پاس بیٹھا ہوا تھا جب میں نے چکن سینڈوچ اور پیسٹری وغیرہ کی پلیٹ ان کے سامنے پیش
کی تو انہوں نے ہنستے ہوئے معذرت کی اور فرمایا۔ اگر آپ اب سے بیس برس پہلے یہ پیش
کش کرتے تو میں ضرور قبول کر لیتا مطلب یہ تھا کہ اب ادھر بیس برس سے وہ صرف سبزی خور
ہی نہیں ہو گئے ہیں بلکہ کوئی ایسی چیز بھی نہیں کھاتے جس سے بدیشی پن کی بو آتی ہو۔ چنانچہ
بالائی مٹھائیاں اور پھل ان میں سے تھوڑا تھوڑا لے کر انہوں نے تناول فرمایا اور بس!

اب پروفیسر کرجی کا ذکر آیا ہے تو انہیں جیسے ایک اور بزرگ کا ہی تذکرہ سن
لیجئے۔ ڈاکٹر آر کے سوفٹ کلکتہ کے ایک نامی گرامی ڈاکٹر ہیں۔ اصلاً پنجابی ہندو ہیں لیکن ان
کا خاندان ایک عرصہ سے یہاں آباد ہے اور ان کا پورا گھرانا "این خانہ ہمہ آفتاب است" کا
مصداق ہے یعنی اُن کے علاوہ، ان کی بیوی، لڑکا، بہو، بیٹی اور داماد ماشاء اللہ سب ڈاکٹر
ہیں۔ اور خوش اخلاقی اور ملنساری میں ایک سے ایک بڑھ کر۔ کلکتہ کے ایک بہت مشہور
اور پرانے کانگریسی رہنما پروفیسر ام۔ اے رحیم میرے اور ڈاکٹر سوفٹ کے مشترک دوست تھے
میں ان سے اکثر ڈاکٹر صاحب کی انسان دوستی اور جذبۂ خدمت خلق کی داستانیں سنتا
تھا اور خوش ہوتا تھا لیکن میری پہلی ملاقات اس طرح ہوئی کہ ایک روز اچانک مغرب کے
بعد وہ میرے یہاں پہنچ گئے اور اپنا تعارف کرایا اور ساتھ ہی بولے مجھ کو پروفیسر رحیم
سے معلوم ہوا کہ آپ کا ایک لڑکا کئی برس سے ایک دماغی مرض میں گرفتار ہے آپ اس کی
وجہ سے بہت پریشان ہیں اور علاج پر روپیہ پانی کی طرح بہانے کے باوجود اب تک اس کو
افاقہ نہیں ہے تو میں آپ کے اس لڑکے کو دیکھنا چاہتا ہوں شاید میں آپ کی کچھ خدمت کر سکوں۔
میں ان کے اس بے محابا انداز کرم گستری سے شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا

——— ان کا بے حد شکریہ ادا کیا اور بچہ کو اندر سے بلوا کر ان کے سامنے پیش کیا۔
انہوں نے دیر تک اس کا معائنہ کیا حالات پوچھے اور تسکین اور تشفی کی باتیں کیں میں نے ڈرتے
ڈرتے فیس پیش کی تو بولے فیس کیسی؟ کیا آپ نے مجھ کو بلایا تھا؟ میں تو خود ہی آیا ہوں اور
صرف اسی قدر نہیں بلکہ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اب یہ بچہ آپ کا نہیں میرا ہے۔ چنانچہ انہوں
نے علاج شروع کیا اس سلسلہ میں کبھی ہفتہ میں ایک مرتبہ وہ اپنے صاحبزادے کو بھیجتے
تھے اور کبھی بچے کو خود اپنے گھر بلاتے تھے۔ بچہ جب کبھی ان کے ہاں جاتا تھا تو اُسے ایسا
معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے مکان میں آ گیا ہو۔ مٹھائی پھل اور
چائے سے اس کی تواضع ہوتی تھی۔ اور ڈاکٹر صاحب کی بیوی اولاد کا سا اور ان کی بہو

اور لڑکی کھالی جیسا سلوک کرتی تھی۔ فیس کا یا کار کے پٹرول کی قیمت کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ معاملہ تو وہ تھا جو انہوں نے خود میری ذات کے ساتھ کیا اور جس کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا اب ان کا ہی ایک اور واقعہ سنئے۔ پروفیسر ایم اے رحیم نے ایک دن سنایا کہ ڈاکٹر سوفٹ ایک دن میرے مکان پر بیٹھے گفتگو کر رہے تھے اسی اثنا میں ان کو معلوم ہوا کہ چور حجرے میں سے امام کا لحاف اور گدا اور ایک رضائی لے گئے ہیں اور اب پروفیسر صاحب چندہ کر رہے تھے کہ امام صاحب کے لئے وہ چیزیں مہیا کر دی جائیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اس کا علم ہوا تو وہ بہت بگڑے اور بولے آپ لوگ بھی غضب کرتے ہیں بھلا کب یہ چندہ پورا ہوگا اور کب اس سے یہ چیزیں خریدی جائیں گی۔ آخر امام صاحب آج کی رات اس سردی میں کیسے کاٹیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے پروفیسر صاحب سے کہا: رحیم یہ چندہ بند کرو اور جس سے وصول کیا ہے۔ اُسے واپس کر دو میں ابھی ان سب چیزوں کا انتظام کئے دیتا ہوں"۔ چنانچہ یہ کہہ کر فوراً اٹھے اور کلکتہ کے مشہور بازار اسپلینڈ سے نہایت عمدہ بنا بنایا ریشمی ایرہ کا لحاف، ایک گدا، ایک رضائی اور ایک تکیہ خرید کر ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد واپس پہونچے اور رحیم صاحب سے بولے بتایئے، مسجد کہاں ہے؟ رحیم صاحب نے ہر چند منع کیا کہ آپ خود نہ جائیے میں بھجوا دوں گا مگر ڈاکٹر صاحب بالکل نہ مانے اور آخر یہ سب چیزیں ٹیکسی میں لے کر خود مسجد میں پہونچے اور امام صاحب کے حوالے کیں تب ان کی بے چینی دُور ہوئی اور انہیں اطمینان ہوا۔

یہ تو بڑے لوگوں کی باتیں اور اُن کے اخلاق کا ذکر تھا اب ذرا معمولی درجے کے اور گمنام لوگوں کا بھی ایک واقعہ سُن لیجئے۔ کلکتہ کی ریاستی شاخ انجمن ترقی اُردو کی دعوت پر کل ہند انجمن ترقی اُردو کا سالانہ جلسہ تھا اور اس تقریب کے سلسلے میں انڈو پاک مشاعرہ بھی تھا۔ مشاعرہ جس کا داخلہ ٹکٹ سے تھا۔ شروع ہو چکا تھا۔ میں کانفرنس کے صدر استقبالیہ کی حیثیت سے جناب روشن صاحب صدیقی کو ایک ٹیکسی میں لے کر مشاعرہ گاہ پہنچا اور ٹیکسی کا کرایہ جو چار روپے کے لگ بھگ ہوتا تھا پیش کئے تو ٹیکسی کے ڈرائیور نے جو ایک سکھ تھا، مجھ سے پوچھا یہ اندر پنڈال میں کیا ہو رہا ہے"؟ انڈو پاک اُردو مشاعرہ میں نے جواب دیا۔ اب اس نے پوچھا یہ آپ کے ساتھ کون صاحب آئے ہیں" میں نے کہا "حضرت روشن صدیقی جو بہت مشہور اور مقبول شاعر ہیں"۔ بس یہ سننا تھا کہ سردار جی بولے "تو صاحب! اب میں آپ سے کرایہ نہیں لوں گا"۔ میں نے پوچھا "بھئی یہ آخر کیوں"؟ سردار جی نے جواب دیا "دیکھئے آج کل اُردو کی جو حالت ہے اس کی وجہ سے ہر اُردو بولنے والے کا فرض ہے کہ جو کچھ وہ اس زبان کے لئے کر سکتا ہے وہ کرے اور پھر یہ شاعر تو اُردو کا جھنڈا اونچا کئے ہوئے ہیں اور شاعر اپنے شعروں سے ہمارا دل خوش کرتے ہیں اس لئے ان کی خدمت کرنا ہمارا ویسے بھی فرض ہے۔ اس گفتگو کے بعد میں نے ہر چند اصرار کیا لیکن سردار جی ایک نہ مانے اور کرایہ نہیں لیا تب میں نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور مشاعرہ کا ایک اعزازی ٹکٹ ان کے حوالہ کیا کہ جہاں چاہیں بیٹھ جائیں۔

اس قسم کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ قومی یک جہتی پیدا کرنے کا سب سے زیادہ موثر ذریعہ یہ ہے کہ مختلف مذہب و زبان اور مختلف رنگ و نسل کے لوگوں میں باہم سوشل تعلقات ہوں تاکہ وہ ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کو اچھی طرح سمجھیں اور اس طرح ایک دوسرے کی عزت کرنا اور اس کے ساتھ ہمدردی اور خیر اندیشی کا معاملہ کرنا سیکھیں۔

## ساجدہ زیدی

کہیں پہ جلتے رہے دل کی آرزو کے دیئے
کہیں پہ بجھنے لگے دیپ بھی نگاہوں کے
سمٹ گئے کبھی جوشِ جنوں سے ویرانے
بکھر گیا کبھی تارِ نظر بھی راہوں میں
کبھی تھی وقت کے سینے میں آرزو پیوست
جھلس گئی کبھی دوپہرِ زیست میں ہر سانس
کبھی تو نالۂ شب چیرتا تھا سینۂ شب
گزر گئی کبھی اک عمر، جیسے مہر بہ لب
حکایتِ لب و رخسار گاہ شعلہ طراز
طویل شب کبھی، اور اپنے سانس کی آواز
وہ انتظار کبھی جس میں ہر نگاہ کے ساتھ
سمٹ کے آ گئی خود آرزو کی روحِ جمیل
وہ بے یقینی کا موسم کبھی کہ جس میں وجود
خود اپنے سائے کی مانند بے نشان رہا
کبھی وہ دل میں تمناؤں کا ہجوم کثیر
کہ جم گئی وہیں محفل جہاں قیام ہوا
کبھی وہ ذہن کا خالی مکاں کہ فکرِ حبیب
بھی اس دیار سے دامن کشاں رہی برسوں
کتابِ عمر کے کتنے ورق پلٹ ڈالے
مگر نگاہ پریشاں ٹھہرتی ہی نہیں!

## متوازی راستے

# غزل

## اختر علی تلہری

نہیں ہے بخشش تیغ جفا وہ میرے قاتل کی
نگاہِ حسرتِ آگیں دیکھ لی کیا اپنے بسمل کی

میرا عشقِ جنوں مشرب ستم سے دب نہیں سکتا
ہیں زندانِ بلا میں بھی وہی آزادیاں دل کی

ابھی گرداب کی طوفاں نفس موجوں سے لڑنا ہے
ابھی مجھ کو نہیں ہے فکر عشرت گاہ ساحل کی

مقدر اس کا ہے پامال گامِ رہروانِ ہونا
خبر کیا خاکِ جادہ کو طرب ہائے منازل کی

کہیں سے تیشۂ فرہاد مل جائے تو لطف آئے
بہت یاد آرہی ہے اُس بتِ شیریں شمائل کی

بچھاتا ہے زمانہ راہ میں کس شوق سے آنکھیں
ذرا توقیر دیکھو اپنے پابندِ سلاسل کی

بہارِ گلشنِ ہستی سمائے کیا نگاہوں میں
حیاتِ مختصر دیکھے ہوئے ہوں شمع محفل کی

گلوں کا رنگ و بو جنت بداماں ہی سہی لیکن
میرے کانوں سے ٹکراتی ہیں فریادیں عنادل کی

مٹا دی عشق نے آخر مری وہ شانِ خودداری
چلا ہوں پھر اُسی ظالم سے کہنے داستاں دل کی

خبر بھی ہے تجھے اے مہرِ طلعت کہکشاں رفعت
ترے جلووں کی ہیں مشتاق نظریں اہلِ محفل کی

ہے اختر ذوق خود ہی رہنما اس صعب منزل میں
مجھے حاجت نہیں فنِ قوافی و فواصل کی!

## غلام ربانی تاباں

آئینہ ٹوٹ گیا، عکس بھی ٹوٹا ہوگا
کس نے سوچا تھا یہ انجام تمنا ہوگا

رات آندھی ہی چلی آتی ہے طوفاں کی طرح
بجھ گئی درد کی قندیل بھی اب کیا ہوگا

سر چھپانے کا کوئی شوق کرے گا ساماں
زلف کا سایا نہ ہو دار کا سایا ہوگا

تیز تر وقت کی رفتار ہوئی جاتی ہے
دم بخود شام کہ پیغام سحر کیا ہوگا

مسکراتے ہوئے زخموں کے حسیں پھولوں پہ
بے نیازی کو تری پیار تو آیا ہوگا!

(۲)

تیری محفل نہ سہی درد کی محفل ہوگی
زندگی کے لئے کوئی تو سہارا ہوگا!

فکر ٹوٹے ہوئے خوابوں سے حرارت لے گی
دل پہ بیتے ہوئے ایام کا سایا ہوگا

کٹ رہی ہیں بس اک امید پہ راہیں تاباں
بے ٹھکانوں کا بھی کوئی تو ٹھکانا ہوگا!

# میر و یقین

نثار احمد فاروقی

میر نے ایک بار سرہند کا سفر کیا تھا یہ ۱۷۴۸ء (۱۱۶۱ھ) کا واقعہ ہے، اس زمانے میں وہ عظیم اللہ صوبیدار مالوہ کے بیٹے نواب رعایت خاں کی سرکار سے وابستہ تھے اس وابستگی کا واقعہ میر نے یوں لکھا ہے کہ ایک دن خان آرزو نے کھانے پر بہت برا بھلا کہا، میر بغیر کھائے اٹھ گئے اور ان کے گھر سے نکل کر جامع مسجد کا رستہ لیا۔ قاضی حوض پر ان کی ملاقات علیم اللہ نامی کسی شخص سے ہوئی اس نے خود ہی پوچھا "تم میر محمد تقی میر ہو؟" انہوں نے کہا تم نے کیسے پہچانا؟ وہ کہنے لگا "تمہاری سودائیانہ وضع تو مشہور ہے" رعایت خاں نے جو عظیم اللہ خاں کا لڑکا اور اعتماد الدولہ قمرالدین خاں کا بھانجا ہے، جب سے تمہارے اشعار سنے ہیں تم سے ملاقات کرنے کا بہت مشتاق ہے اگر تم میرے ساتھ چل کر اس سے ملو تو میرے لئے بھی باریابی کا بہانہ ہو جائے گا" میں جا کر ملا، بڑی شرافت سے پیش آیا اور مجھے اپنا رفیق بنا لیا اس کی ملازمت سے مجھے فائدہ پہنچا اور تنگ دستی سے چھٹکارا مل گیا"[1]

فارسی میں میر نے عظیم اللہ خاں کو "یزنہ قمرالدین خاں" کہا ہے[2] یزنہ کا مطلب ترکی زبان میں "شوہر خواہر" یعنی بہنوئی ہوتا ہے، اس رشتے سے رعایت خاں بھانجا ہوا۔ زیادہ صحیح رشتہ یہ ہے۔

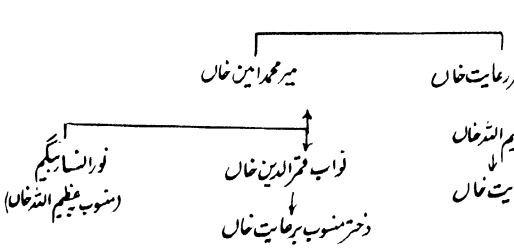


میر کا تعلق ملازمت ۱۷۴۷ء میں کسی وقت قائم ہوا، اسی زمانے میں لاہور کے گورنر شاہنواز

---

[1] میر کی آپ بیتی (طبع اول ۱۹۵۷ء) ص ۹۸-۹۹
ذکر میر (طبع اول) ص ۶۷
خواجہ احمد فاروقی نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے: "یہ عظیم اللہ خاں کا بیٹا اور قمرالدین خاں . . کا بہنوئی تھا" (میر تقی میر: حیات اور شاعری ص ۱۱۲) اسی طرح ص ۸۸ پر ہے: "میر رعایت خاں کے نوکر ہو گئے۔ یہ عظیم اللہ خاں کے بیٹے اور . . قمرالدین خاں کے بہنوئی تھے" حالانکہ میر نے فارسی میں یوں لکھا ہے "رعایت خاں کہ پسر عظیم اللہ یزنہ اعتماد الدولہ قمرالدین خاں باشد" (ذکر میر ص ۶۷) اس سے بھی ظاہر ہے کہ "یزنہ" کی نسبت عظیم اللہ اور قمرالدین کے بابین ہے، اگر رعایت خاں مراد ہوتا تو واو عطف آتی، کہ پسر عظیم اللہ خاں و یزنہ قمرالدین خاں، مگر اسی کتاب میں فاروقی صاحب نے ڈاکٹر عبدالحق پر اعتراض کیا ہے کہ مولوی عبدالحق نے یزنہ کا ترجمہ نواسا کیا ہے جو صریحاً غلط ہے" (ص ۵۴۴)

خاں نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت نامہ بھیجا کہ اگر آپ ہندوستان پر حملہ کریں تو میں اس شہزادہ کا ساتھ دوں گا کہ بعد حصول فتح مجھے عہدۂ وزارت دیا جائے۔ احمد شاہ ابدالی یہ دعوت پاکر وسط دسمبر ۱۷۴۷ء میں پشاور سے روانہ ہوا، ۸ جنوری ۱۷۴۸ء کو لاہور کے قریب شاہدرہ میں خیمہ زن ہوا[3] اس سازش کے خطرناک نتائج پر غور کرتے ہوئے شاہنواز خاں کے سسر نواب قمرالدین خاں نے شاہنواز خاں کو امداد دینے سے روک لیا مگر ابدالی نے پیش قدمی جاری رکھی اور شاہنواز خاں کو شکست دے کر قلعہ لاہور پر قبضہ کر لیا جب قلعہ دہلی میں لاہور کے سقوط کی خبر پہنچی تو محمد شاہ نے جوان دنوں بیمار تھا شہزادہ احمد شاہ، نواب قمرالدین خاں، راجا سوائی (جے پور کے لڑکے ایشور سنگھ وغیرہ کی نگرانی میں ڈیڑھ لاکھ فوج بھیجی اور جو ۲۵ فروری کو سرہند پہنچی، اسی لشکر میں رعایت خاں بھی تھا اور اس کے ہمراہ میر تقی میر شریک کارواں ابدالی نے ۲ مارچ ۱۷۴۸ء کو سرہند پر قبضہ کر کے لوٹ مار شروع کر دی۔ ۱۱ مارچ ۱۷۴۸ء (مطابق ۲۲ ربیع الاول ۱۱۶۱ھ) کو تقریباً دس بجے دن کے نواب قمرالدین خاں اپنے خیمہ میں چاشت کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ناگاہ توپ کا ایک گولا اُن کی ٹانگ میں آ کر لگا جو صدمے سے وہ جانبر نہ ہو سکے[4]

[3] احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی تفصیلات کے لئے فارسی میں سیر المتاخرین دیکھی جائے کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ انگریزی میں سرکار کی کتاب کے علاوہ گنیڈا انسٹی کی قا تصنیف "احمد شاہ درانی" ملاحظہ ہو۔ میر نے جس حملے کا یہاں ذکر کیا ہے۔ یہ ا پہلا حملہ تھا۔

[4] سیر المتاخرین ۱۹/۳ ۔ ماثر الامرا ۱/ ۴۵۸

نواب معین الملک نے اس خبر کو صیغۂ راز میں رکھا اور وہ خود نواب قمرالدین خاں کے ہاتھی پر سوار ہو کر مقابلے کے لئے نکلا۔ اتفاق سے ابدالی کے توپ خانے میں آگ لگ گئی اور اس کی فوج کے ہاتھی بھاگنے لگے، تقریباً ایک ہزار فوجی جل کر بھسم ہو گئے۔ مجبوراً ابدالی کو میدان سے ہٹنا پڑا اور شاہی فوج نے میدان مار لیا۔ اس واقعے کی تاریخ "فتح خداساز" (۱۱۶۱ھ) ہے۔ جب اس فتح کی خبر دہلی کو بھیجی گئی تو محمد شاہ نے ازراہ خوشنودی معین الملک کو لاہور کا گورنر مقرر کر دیا۔ وہ اپنی وفات تک (۳ رنومبر ۱۷۵۳ء) اس عہدے پر فائز رہا۔ رعایت خاں معین الملک کے ساتھ جنگ میں شریک تھا، جب وہ لاہور کو روانہ ہوا تو رعایت خاں نے صفدر جنگ کے ساتھ دہلی کا رخ کیا۔ ابھی یہ قافلہ پانی پت پہنچا تھا کہ محمد شاہ کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی۔ شہزادہ احمد شاہ ساتھ ہی تھا۔ صفدر جنگ نے اسے تخت نشین کیا، احمد شاہ نے اسے وزارت پر فائز کر دیا۔ [۵۳]

اسی زمانے میں جاوید خاں خواجہ سرا کا عروج شروع ہوا۔ اسے نواب بہادر کا خطاب مرحمت ہوا اور میر بھی اس کے دامنِ دولت سے وابستہ ہو گئے۔

اندازہ یہ ہے کہ رعایت خاں کی سرکار سے میر کا تعلق اواخر ۱۷۴۷ء سے اواخر ۱۷۴۸ء تک تقریباً ایک سال رہا۔ صفدر جنگ نے بخشی گری کا عہدہ نواب سادات خاں ذوالفقار جنگ کو دے دیا۔[۵۴] سادات خاں نے راجا ابھے سنگھ والیٔ جودھپور کے چھوٹے بھائی بخت سنگھ کو صوبہ اجمیر کی نیابت دے دی اور اس طرح دونوں بھائیوں کو آپس میں لڑوا دیا۔ بخت سنگھ نے اپنی فوج کی کمان رعایت خاں کے سپرد کر دی اور اسے اپنے ساتھ لے کر اجمیر کا سفر کیا۔ اس وقت بھی میر تقی میر رعایت خاں کے ہمراہ تھے۔ سانبھر کے مقام پر فوجوں میں مقابلہ ہوا۔ ابھے سنگھ نے میدان ہاتھ سے جاتا دیکھا تو ملہار راؤ ہولکر کو ثالث بنا کر صلح کر لی۔ اب میر سانبھر سے اجمیر آئے اور انہوں نے درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زیارت کی اور آس پاس کی سیر کر کے پھر سانبھر کو واپس ہو گئے جہاں رعایت خاں کا لشکر خیمہ زن تھا۔ [۵۵]

اس موقع پر رعایت خاں اور راجہ بخت سنگھ کی کسی معاملے میں بدکلامی ہو گئی۔ رعایت خاں کی طرف سے ستار قلی خاں کشمیری نے راجہ بخت سنگھ کو گالیاں دے ڈالیں اس سے رنجش اور بڑھی اور یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ رعایت خاں اور بخت سنگھ کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل نہ آ جائیں۔ رعایت خاں نے میر تقی میر کو بھیجا کہ بخت سنگھ سے معذرت کریں اور یقین دلائیں کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ سفارت کے یہ فرائض میر نے انجام دیئے[۵۶] مگر بخت سنگھ کا دل صاف نہیں ہوا۔ اس نے رعایت خاں کے رسالے کی تنخواہ بے باق کر کے رخصت کر دیا۔ رعایت خاں اپنے متوسلین کو لے کر دہلی آ گیا۔ میر بھی آ گئے۔

اسی زمانے میں ایک چاندنی رات کو رعایت خاں کے سامنے ڈوم کا لڑکا بیٹھا گا رہا تھا۔ خاں نے میر سے کہا کہ اسے اپنے ریختہ کے دو تین شعر یاد کرا دو۔ یہ دُھن بنا کر سنا دے گا۔ میر کو یہ بات ناگوار گذری کہ انہیں ایک ڈوم کے لڑکے کو تعلیم کی خدمت سپرد کر دی گئی۔ طوعاً و کرہاً اسے شعر تو یاد کرا دیئے مگر اگلے دن سے رعایت خاں کے دربار میں جانا چھوڑ دیا۔ رعایت خاں نے بطور تلافی میر کے چھوٹے بھائی میر محمد رضی کو اپنے پاس سے گھوڑا دے کر ملازم رکھ لیا۔ مدت کے بعد ملاقات ہوئی تو معذرت بھی کی، میر نے بھی گذشتہ پر صلوٰۃ کہی۔

کچھ زمانے کے بعد وہ اسد یار خاں کے توسط سے جاوید خاں خواجہ سرا کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔[۵۷] اسد یار خاں[۵۸] نے گھوڑے اور نوکری کی شرط معاف کرا دی گویا برائے نام خدمت رہی وظیفہ مقرر ہو گیا۔

یہ روداد ہے رعایت خاں سے وابستگی کی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رعایت خاں کا کچھ تعارف کرا دیا جائے۔ نظام الملک آصف جاہ اول کے مورث اعلیٰ شیخ سمرقندی صدیقی تھے۔ ان کے دو فرزند ہوئے ایک کا نام میر بہار الدین تھا۔ دوسرے میر عابد قلیچ خاں (متوفی ۱۰۹۸ھ) تھے۔ میر بہار الدین کے دو فرزند

---

۵۲ میر کی آپ بیتی ص ۱۰۱

۵۳ میر کی آپ بیتی ص ۱۰۲

۵۴ میر کی آپ بیتی ص ۱۰۲

۵۵ جاوید خاں خواجہ سرا نے احمد شاہ بادشاہ کی ماں کے ذریعے نواب بہادر کا خطاب حاصل کیا تھا۔ یہ امور سلطنت میں اس حد تک دخیل ہوا کہ صفدر جنگ نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اسے دعوت کے بہانے گھر بلایا (۲۸ رشوال ۱۱۶۵ھ/۲۸ راگست ۱۷۵۲ء) اور قتل کر کے لاش دریا میں پھنکوا دی۔ کئی ہزار متوسلین جو اس کی سرکار سے وابستہ تھے بے روزگار ہو گئے۔ ان میں میر تقی میر بھی تھے۔ اب میر نے مہاراجہ دیوان وزیر کی ملازمت کر لی۔ ذکر میر ص ۷۲۔ میر کی آپ بیتی ص ۱۰۶

۵۶ اگر یہ اسد الدولہ اسد یار خاں انسان تخلص ہیں تو ان کا انتقال ربیع الاول ۱۱۵۸ھ مارچ ۱۷۴۵ء میں ہو چکا تھا۔ (تاریخ محمدی: ۱۲۸) اور جاوید خاں کا عروج ۱۱۶۱ھ کے بعد ہوا ہے۔ غالباً یہ دوسری شخصیت ہے۔

۵۷ میر کی آپ بیتی (طبع اول) ص ۹۸ ـ ۱۰۰۔ ذکر میر (طبع اول) ص ۶۸ ـ ۶۹

تھے۔ ایک نواب رعایت خاں (متوفی ۱۱۵۳ھ) دوسرے نواب محمد امین خاں (متوفی ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء) پر رعایت خاں کو میر عابد قلیچ خاں کی دختر فاطمہ بیگم (وفات ۱۱۵۳ھ) منسوب ہوئی تھیں۔ ان کے بطن سے نواب ظہیر الدولہ عظیم اللہ خاں بہادر مجاہد جنگ صوبیدار مالوہ (وفات ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء) پیدا ہوئے تھے۔ اور انہیں میر محمد امین خاں (وفات ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء) کی بیٹی نور النساء بیگم منسوب تھیں۔ ان کے بطن سے رعایت خاں پیدا ہوا تھا جو میر تقی میر کا ماموں ہے۔ اس رعایت خاں کو میر محمد امین خاں کی پوتی یعنی نواب قمر الدین خاں (وفات ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کی بیٹی منسوب تھیں۔ قمر الدین خاں کی دوسری بہن نواب زکریا خاں (وفات ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء) کو بیاہی تھیں جن سے شاہنواز خاں پیدا ہوا تھا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

میر عابد قلیچ خاں کے ایک بیٹے میر شہاب الدین (غازی الدین خاں) فیروز جنگ تھے اور ان کے فرزند ریاست حیدر آباد کے بانی آصف جاہ اوّل (وفات ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) تھے۔ یہ ایک ہی خاندان کے کل افراد کا شجرہ نہیں ہے۔ چند اہم نام گنائے گئے ہیں[1] ان میں کوئی لاہور کا گورنر ہے کوئی مالوے کا، کوئی حیدر آباد کا، کوئی وزیر اعظم ہے۔ غرض اس خاندان کے تمام افراد معزز عہدوں پر فائز رہے اور شاہی خاندان کے بعد عزت و وجاہت اور اقتدار و ثروت میں انہیں کا درجہ تھا۔ مگر میر کی بد دماغی کا یہ عالم تھا کہ رعایت خاں کی ذرا سی فرمائش سے برافروختہ ہو گئے۔

سفر سرہند کا دوسرا حوالہ میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں دیا ہے، انہوں نے انعام اللہ خاں یقین کے حال میں لکھا ہے: "پدرش اظہر الدین خاں نام دارد، باجدّش در سرہند ملاقات کردہ بودم بسیار آدم با مزہ یافتہ، بسلوک پیش آمدہ و ضیافت فقیر کردہ تا دیر نشستہ صحبت مستوفی داشتم۔ شعر بطرزی گوید" [2] اس سے ظاہر ہے کہ سفر سرہند (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کے دوران میر نے یقین کے دادا سے ملاقات کی تھی۔ انہوں نے میر کی اچھی خاطر مدارات کی۔ غالباً کھانے پر بھی مدعو کیا۔ دیر تک گفتگو رہی۔ وہ اپنے طرز کے شعر بھی کہتے تھے۔ انعام اللہ خاں یقین کے لئے بیشتر تذکرہ نگاروں نے[3] "بنیرۂ شاہ گل وحدت" لکھا ہے۔ چنانچہ دیوان یقین کے مرتب مرزا فرحت اللہ بیگ بھی لکھتے ہیں۔

"یقین... کے دادا حضرت شیخ عبد الاحد نقشبندی مجددیؒ اپنے کمالات باطنی کی وجہ سے مرجع خلائق تھے۔ تو ان کے نانا نواب حمید الدین خاں اپنی شجاعت و بہادری کے باعث سلطنت کے رکن رکین مانے جاتے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب اگر دو ھیاں کی طرف سے چوتھی پشت میں حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ اور بتیسویں واسطے سے خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچتا تھا تو ننھیال کی جانب سے چوتھی پشت میں باقی خاں قلماق چیلہ شاہجہانی سے جا ملتا تھا۔ حضرت شیخ احمد سرہندی کے بعد آپ کے دو فرزند شیخ احمد سعید اور شیخ محمد معصوم و سادہ ہدایت وار شاد پر بیٹھے۔ شیخ احمد سعید کے بعد ان کے فرزند شیخ عبد الاحدؒ المعروف بشاہ وحدت، المتخلص بہ 'گل' سجادہ نشین ہوئے۔ یہ انعام اللہ خاں یقین کے دادا ہیں۔ آپ کی شہرت کا یہ حال تھا کہ میر تقی میر جیسا بد دماغ شخص ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔۔۔ شیخ عبد الاحدؒ کے فرزند شیخ اظہر الدین سرہند چھوڑ دہلی آئے۔ یہاں آپ کے خاندانی فضائل کا ہر شخص معتقد تھا۔ سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور نواب حمید الدین خاں نے اپنی صاحبزادی کی شادی آپ سے کر دی۔" [4]

زمانۂ مابعد میں میر کے مؤرخ اور نقاد ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے میر کے سفر سرہند کا علیحدہ عنوان کے تحت ذکر نہیں کیا اور اس بات کو سرے سے لائق اعتنا نہیں سمجھا کہ میر نے انعام اللہ یقین کے دادا سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے اور تذکرہ نگاروں نے ان کے دادا کا نام عبد الاحد عرف شاہ گل وحدت بتایا ہے۔ جنہوں نے مولف روضۃ القیومیہ کی روایت کے مطابق ۲۷ ذی الحجہ ۱۱۳۷ھ (مطابق ۱۴ دسمبر ۱۷۱۵ء) کو انتقال کیا۔ بندرابن خوشگو نے عہد فرخ سیری میں ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء وفات ہونا

---

[1] اسی خاندان کے ایک فرد اور نظام الملک آصف جاہ اول کے پوتے نواب عماد الملک نے (۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱ء میں) نواب صفدر جنگ سے سازش کر کے احمد شاہ سے امیر الامراء کا منصب حاصل کر لیا۔ احمد شاہ نے صفدر جنگ کی سازشوں سے عاجز آ کر نواب انتظام الدولہ پسر نواب قمر الدین خاں کو وزارت عظمیٰ دے دی جو عماد الملک کا ماموں بھی ہوتا تھا۔ عماد الملک نے احمد شاہ کو اندھا کر کے تخت سے اتار دیا جس کا بیان میر نے بھی کیا ہے (ذکر میر ص ۷۴) میر کی آپ بیتی ص ۱۰۹) اور عالمگیر ثانی کو اس کی جگہ بادشاہ بنا دیا۔ (۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ/۲ جون ۱۷۵۴ء)

[2] نکات الشعراء (طبع اول) ص ۸۵

[3] یقین کے سلسلے میں ملاحظہ ہوں: نکات الشعراء: ۸۴-۹۳، مخزن نکات: ۴۹، گردیزی ۴۶، چمنستان شعراء: ۱۶۱-۲۶۲، گلشن گفتار: ۴۴-۴۹، میر حسن: ۲۰۲، تذکرۂ ہندی: ۲۷۵، ۲۷۸، مسرت افزا: ۱۷۴-۱۷۹، مجموعہ نغز ۲: ۳۵۵، مجمع الانتخاب (قلمی) ورق ۷۸ ب (تین تذکرے: ۱۴۰) تذکرہ ضیغم قلمی: ۹۰، تذکرہ بے جگر قلمی ورق ۷۰ ب، تذکرۃ الشعراء قلمی ورق ۹۰۔ الف، رائج الشعراء قلمی ورق ۷۴ ب، دیوان جہاں: ۲۷۸، گلشن سخن: ۲۶۴، سرود: ۸۲۵، شیفتہ ۲۴۴، شمیم سخن: ۲۵۹، اشپرنگر: ۲۲۳ گلزار: ۲۵۹-۲۷۱

[4] دیباچہ دیوان یقین (طبع ۱۹۳۰ء) ص ۱۰-۱۱

بیان کیا ہے۔ لیکن زیادہ صحیح ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء ہے جو ایک قطعہ تاریخ وفات سے ثابت ہے۔ [1]

میر کی ولادت کا سنہ متفقہ طور پر ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء ہے اور وہ شاہ گل وحدت کی وفات سے کئی سال کے بعد عالم وجود میں آئے ہیں تو آخر ان کی ملاقات کس طرح ہوگئی۔

واقعہ یہ ہے کہ میر نے وحدت کو قطعاً نہیں دیکھا تھا۔ پھر انہوں نے نکات الشعراء میں غلط بیانی کیوں کی؟ انہوں نے یقین کے دادا کے دھوکے میں کسی اور سے ملاقات کی ہوگی؟ ایسا بھی نہیں ہے۔ وہ یقین کے دادا سے ملے تھے اور شاہ گل وحدت سے نہیں ملے تھے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

حضرت خواجہ محمد سعید (۱۰۵۰ھ - ۱۱۰۷ھ) کے سات فرزند تھے [2]: ۱۔ عبداللہ ۲۔ محمد خلیل اللہ ۳۔ محمد شاہ فرخ (۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء) ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء) ۴۔ شیخ سعدالدین ۵۔ شاہ عبدالاحد المعروف بہ شاہ گل وحدت (۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء - ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء) ۶۔ نام معلوم نہیں ۷۔ محمد یعقوب۔

شیخ عبدالاحد وحدت کے چار فرزند اور تین صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔ سب سے بڑے محمد ابوحنیف [3] تھے جن کے پوتے شیخ محمدی المعروف بہ شاہ بھیک ہوئے۔ دوسرے کا نام محمد جواد تھا۔ تیسرے محمد نقی اور چوتھے نورالحق تھے۔ خواجہ محمد سعید کے ساتویں فرزند محمد یعقوب کی اولاد میں عصمت اللہ تھے۔ ان کے چار فرزند اور ایک دختر تھیں۔ بڑے کا نام صفت اللہ تھا یہ لاولد فوت ہوئے دوسرے سلطان المشائخ تیسرے ولی اللہ، چوتھے غلام الٰہی تھے۔ دختر کا نام جاناں بیگم تھا۔ عصمت اللہ کے یہی تیسرے بیٹے اردو کے مشہور شاعر شاہ ولی اللہ اشتیاق دہلوی [4] ہیں۔ جن کا حال قدیم تذکروں میں ملتا ہے اور جنہیں غلطی سے شاہ ولی اللہ دہلوی فرزند شاہ عبدالرحیم دہلوی سمجھ لیا جاتا ہے۔ شیخ عبدالاحد وحدت کے تیسرے فرزند محمد نقی شاعر تھے۔ اور نقی تخلص کرتے تھے۔ ان کے دو فرزند ہوئے بڑے کا نام محمد ظہور اللہ تھا۔ یہ مجذوب تھے۔ اور غیر معقب رہے۔ دوسرے محمد اظہر الدین ہیں جنہیں خانی کا خطاب تھا اور نواب محمد اظہر الدین خاں [5] مبارز جنگ کہلاتے ہیں، انہیں نواب حمید الدین خاں نیچہ کی دختر منسوب ہوئیں۔

اظہر الدین خاں کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ بڑے محمد عرفان اللہ بچپن میں مرگئے تھے، منجھلے محمد احسان اللہ اور چھوٹے محمد انعام اللہ تھے۔ یہی اردو کے مشہور شاعر انعام اللہ خاں یقین ہیں۔ محمد احسان اللہ کے دو فرزند تھے محمد مشتاق تو بچپن میں فوت ہوئے اور دوسرے شاہ محمد آفاق، مشہور نقشبندی بزرگ ہیں جو ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ اور ۷ محرم ۱۲۵۱ھ/۵ مئی ۱۸۳۵ء کو انتقال کیا۔ شاہ محمد آفاق کے اولاد نرینہ نہیں تھی دو صاحبزادیاں بی بی عائشہ اور بی بی فاطمہ یادگار چھوڑیں۔

انعام اللہ خاں یقین کے تین فرزند اور دو دختر یادگار رہیں، مقبول النبی [6] صمصام اللہ [7] اور مرید حسین۔ ایک دختر مبارک بیگم تھیں دوسری کا نام معلوم نہ ہوا۔

سہولت کے لئے یہاں خاندان یقین کا شجرہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ باہمی قرابت

---

[1] گلشن وحدت (مرتبہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں)؛ مقدمہ تزہتہ الخواطر ۶/۱۳۵ میں ہے کہ ولادت ۱۰۵۰ھ میں ہوئی، انتقال ۲۷ ذی الحجہ ۱۱۲۶ھ کو دہلی میں ہوا۔ جسد سرہند لے جاکر دفن کیا گیا لیکن تاریخ ۱۱۲۶ھ ہی زیادہ صحیح ہے۔

[2] انساب الطاہرین (قلمی) مولفہ شاہ محمد عرفان نقشبندی مجددی

[3] ان کا نام "انساب الانجاب" وغیرہ میں محمد ابوحنیف بھی ملتا ہے۔ اور یہی زیادہ معروف ہے۔ شاہ محمد عرفان نے خود اپنے قلم سے ابوحنیف لکھا ہے۔

[4] اشتیاق کے لئے درگا داس نے تذکرہ سفینۂ عشرت (تالیف ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء) میں لکھا ہے: شاہ ولی اللہ اشتیاق تخلص، درویشے بود یعنی آشنا، در کوٹلہ فیروز شاہ واقع دہلی کہنہ اقامت داشت در ہزار و صد و چہل و چند داعی اجل را لبیک قبول گفت (قلمی نسخہ، کتب خانہ خدا بخش (پٹنہ) ورق ۵۰۔ الف) یہ عبدالغنی بیگ قبول کے شاگرد تھے (باغ معانی قلمی ورق ۳۵ ب)

مزید حالات کے لئے رجوع شود: نکات الشعراء: ۶، مخزن نکات: ۱۸، گردیزی: ۸ مسرت افزا: ۲۰، میر حسن: ۸، تذکرہ گلشن ہند (حمیدی): ۲۴

عیار الشعراء خوب چند ذکا (قلمی خدا بخش) ورق ۲۸۔ الف خمخانۂ جاوید ۱: ۳۰۸

رسالہ ہندوستانی (الہ آباد) ۱۹۳۸ء

[5] نواب اظہر الدین خاں بھی شاعر تھے۔ تذکرہ باغ معانی مولفہ نقش علی (قلمی نسخہ: خدا بخش پٹنہ) میں ورق ۳۵ ب کے حاشیے پر لکھا ہے: "اظہر الدین خاں اظہر تخلص نبیرۂ شیخ گل است از نبائر شیخ احمد مجدد۔ الف ثانی... بصاحبزادگی حمید الدین خاں بہادر معزز بود و در فن شعر شاگرد شاہ قابل مرحوم است پسر شش یقین تخلص از شعرائے شیوا بیان ہندی زبان زمان است" اظہر کا ایک فارسی شعر دیا ہے۔

پیشتر در وصل درد و غم نصیب ما شود
دل ز ما گم می شود دلدار تا پیدا شود

[6] مقبول النبی بھی شاعر تھے۔ ان کا حال تذکرۂ مسرت افزا (معاصر پٹنہ)، ص ۱۰۹ میں ملے گا۔

[7] عیار الشعراء خوب چند ذکا (قلمی نسخہ خدا بخش)، ورق ۸ ب

کا حال یک نظر واضح ہو جائے۔ اس کی تیاری میں کتاب انساب الانجاب (طبع ۱۳۴۰ھ) خواجہ محمد حسن اور شاہ محمد عمر نقشبندیؒ کی قلمی بیاض سے مدد لی گئی ہے جس کا نام انساب الطاہرین ہے۔ ان کے علاوہ الینابیع المغنی، تذکرۃ الانساب (مولفہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ)، نزہتہ الخواطر (مولفہ سید عبدالحیؒ) اور ہدیۂ احمدیہ بھی پیش نظر رہی ہیں۔ شجرے کے غیر ضروری افراد کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔

## انعام اللہ خاں یقین کا شجرۂ نسب

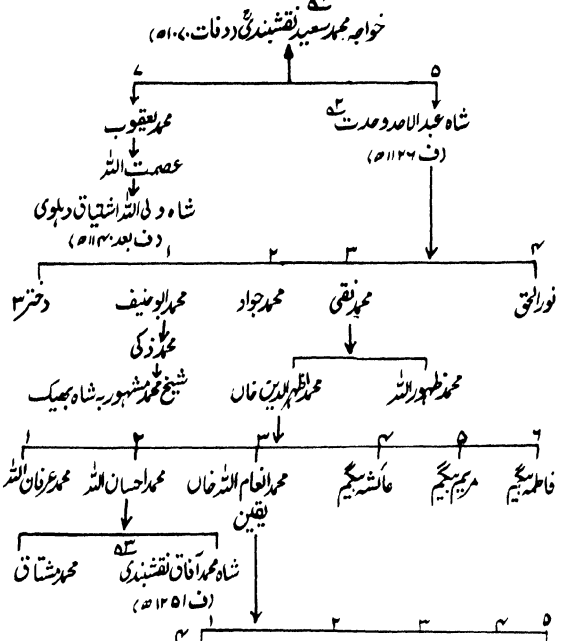


---

[1] خواجہ محمد سعید کے فرزند محمد فرخ شاہ کے صاحبزادے علی رضا سے ولی گجراتی بیعت تھے۔ (گلشن وحدت ص ۱۴۷)

[2] وحدت صاحب تصانیف تھے۔ (نزہتہ الخواطر ۶/۱۳۵) ان کے مکتوبات کا مجموعہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے ۱۹۶۶ء میں کراچی سے شائع کیا ہے جس کا نام "گلشن وحدت" ہے۔ اسے وحدت کے خلیفہ محمد مراد کشمیری نے فراہم کیا تھا جن کا ذکر ولی گجراتی کے اس شعر میں ہے: ؎

مقصود دل ہے اس کا خیال اے ولی مجھے
جو مجو زباں کا ورد محمد مراد ہے

اس شجرے سے پہلی بار یہ معلوم ہوگا کہ شاہ ولی اللہ اشتیاق دہلوی سے یقین کا کیا رشتہ ہوگا؛ یقین کے کتنے بھائی بہن تھے۔ اور ان کی اولاد ذکور و اناث کتنی تھی۔ نیز شاہ محمد آفاق دہلویؒ[3] ان کے بھتیجے تھے۔ اور یہ بات بھی روشن ہو جائے گی کہ سرہند میں میر تقی میر نے ان کے دادا محمد نقیؒ[4] سے ملاقات کی تھی۔ جو شاہ عبدالاحد المعروف بہ شاہ گل وحدت تخلص کے بیٹے تھے۔ اس شجرے کی روشنی میں دیکھئے تو فرحت اللہ بیگ کے محولہ بالا بیان میں اتنی باتیں محتاج اصلاح ہیں۔

(الف) یقین کا نسب شیخ مجدد الف ثانی تک چار واسطوں سے نہیں پانچ سے منتہی ہوتا ہے۔

(ب) شیخ عبدالاحد وحدت یقین کے دادا نہیں پردادا تھے۔ ان کے دادا کا نام محمد نقی تھا اور

(ج) میر نے ان سے ہی ملاقات کرنے کا حال نکات الشعرا میں لکھا ہے۔

مقدمہ دیوان یقین میں اس کے علاوہ بھی بعض امور اصلاح طلب ہیں۔ ان سے ہم نے دوسرے مضمون میں بحث کی ہے جو اس کے بعد آئے گا۔

## (۲)

مناسب ہوگا کہ یہاں یقین کی ننھیال کا بھی کچھ ذکر کر دیا جائے۔ نواب

---

نیز دیکھئے روضۃ القیومیہ ۱/۲۹۵، سفینۂ خوشگو: ۶۹، ہمیشہ بہار: ۲۶۰

[3] شاہ محمد آفاق نقشبندی کے لئے رجوع شود: آثار الصنادید (طبع ۱۹۶۵ء) ص ۴۷۴

[4] فرحت اللہ بیگ نے یقین کی صاحبزادیوں کا تذکرہ نہیں کیا۔ بظاہر وہ ان سے بے خبر ہیں۔ اولاد ذکور کی ترتیب بھی یوں لکھی ہے کہ بڑے فرزند مرید، منجھلے صمصام اور چھوٹے مقبول (مقدمہ دیوان یقین ۲۱) لیکن انساب الطاہرین (قلمی) سے معلوم ہوتا ہے کہ بالعکس صحیح ہے۔ یعنی بڑے لڑکے مقبول تھے اور چھوٹے مرید۔

[5] ان کا نام شیخ محمد عمر نقشبندیؒ نے اپنی بیاض میں محمد نقی ہی لکھا ہے۔ یہی قدرت اللہ شوق نے تکملۃ الشعرا (قلمی) ورق ۲۱۵۔ الف میں لکھا ہے (نسخہ رام پور) مگر نقش علی کے تذکرہ باغ معانی (قلمی نسخہ پٹنہ) میں ورق ۴۰۔ الف غلطی سے ان کا ترجمہ حرف ت میں درج ہے اور نام محمد تقی تقی بتایا ہے۔ محمد تقی تقی تخلص، خلف وحدت، این مطلع از و میر لطف اللہ سہرندی در تذکرہ خود نوشتہ:

مفت است یار طرفہ سیہ مست می رود
فردا قیامت است، شب اندوست می رود

حمیدالدین خاں نبیرہ[1] تو مشہور شخصیت ہیں۔ انہوں نے ۸ر صفر ۱۱۴۱ھ/۳ر ستمبر ۱۷۲۸ء کو ۶۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے باپ کا نام سردار خاں ہے۔ یہ ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۱ء میں فوت ہوئے اور دادا باقی خاں تھے۔

حمیدالدین خاں کے ایک فرزند عبدالباقی خاں[2] تھے اور دو صاحبزادیاں تھیں ایک نواب اظہرالدین خاں کو منسوب ہوئیں گویا انعام اللہ خاں یقین کی والدہ تھیں اور دوسری ہدایت اللہ خاں بن عنایت اللہ خاں[3] کشمیری کو بیاہی تھیں۔ ہدایت اللہ نے ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء میں بہ عمر ۳۵ سال انتقال کیا۔ یہ انعام اللہ خاں یقین کے خالو تھے۔

میر نے اپنے تذکرۂ نکات الشعراء میں لکھا ہے کہ "یقین کے بارے میں لوگ کہتے ہیں مرزا مظہر انہیں شعر لکھ کر دیا کرتے ہیں اور شاعری میں اپنا وارث بنالیا ہے۔ اس بات پر ہنسی آتی ہے کیوں کہ ہر شے وارث کو پہنچ سکتی ہے مگر شعر۔ مثلاً اگر کوئی اپنے باپ کے اشعار پر بھی متصرف ہو یا اس کا مضمون اڑالے تو اُسے بھی چور ہی کہا جائے گا" پھر آگے چل کر کہتے ہیں کہ ملاقات سے اتنا تو اندازہ ہو ہی جاتا ہے کہ "ذائقۂ شعر فہمی" مطلق نہیں ہے اسی وجہ سے لوگ ناموزوں ہونے کا گمان کرتے ہیں۔ ایک طبقے کا یہ بھی خیال ہے کہ یقین کے اشعار نقص سے خالی نہیں ہیں۔ پھر ایک شخص سے روایت کی ہے کہ عطیۃ اللہ خاں پسر عنایت اللہ خاں کے گھر یقین بیٹھے تھے اور کہہ رہے تھے کہ جب سے استاد نے میرے سر پر ہاتھ رکھا ہے میری شاعری میں نمایاں ترقی ہوگئی ہے۔ شخص مذکور (راوی) نے اس پر سب کے سامنے بلند آواز سے فغانی کا مصرع پڑھ دیا:

شد آں مرغ کو خایہ زریں نہاد

اس پر یقین بوکھلا گئے۔[4]

اور باتوں سے قطع نظر یہ دیکھئے کہ عطیۃ اللہ خاں کون تھے؟[5] عنایت اللہ خاں کشمیری (ف ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء) کا حوالہ اوپر آچکا ہے۔ ان کے پانچ فرزند تھے۔

۱۔ ہدایت اللہ خاں ۲۔ ضیاء اللہ خاں ۳۔ روح اللہ خاں ۴۔ عبیداللہ خاں ۵۔ عطاء اللہ خاں۔ ہدایت اللہ خاں کے بیٹے کا لقب بھی ہدایت اللہ خاں تھا جو یقین کے خالو تھے اور عطاء اللہ خاں کا لقب عطیۃ اللہ خاں تھا۔ بعد کو انہیں بھی عنایت اللہ خاں" خطاب خاندانی عطا ہوا اور کشمیر کی صوبیداری تفویض کی گئی۔ وہاں ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء میں کسی نے انہیں شہید کر دیا تھا[6] اس سے واضح ہوگیا ہوگا کہ عطیۃ اللہ خاں یقین کے خالو ہدایت اللہ خاں کے چچا تھے۔ یقین کی ننھیال کے یہ رشتے تو ہمیں معلوم ہیں۔ ممکن ہے کہ باہم رشتہ داری کا یہ سلسلہ اور وسیع رہا ہو اور خود یقین کی بیوی بھی اسی خاندان کی فرد ہوں۔ میر نے صرف عطیۃ اللہ خاں کے مکان پر یہ لطیفہ پیش آنے کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ خود عطیۃ اللہ خاں تو ۱۱۵۴ھ میں مر چکے تھے اور مرزا مظہر جان جاں (ف ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء) بقید حیات تھے۔ لطیفہ ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء کے بعد کا ہوگا۔ اگر اس میں نظامی کے مصرع سے مرزا مظہر کی وفات کا کنایہ نہیں ہے۔ بدیں صورت میر ۱۱۹۵ھ کے بعد لکھنؤ جا چکے تھے اور اس لطیفے کو زمانہ مابعد کا اضافہ ماننا پڑے گا۔ ترجمہ یقین اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ خود یقین بھی زندہ ہیں۔ ان کی وفات ۱۱۶۹/۱۷۵۵ء میں ہوئی ہے۔[7]

---

[1] حمیدالدین خاں کے لئے رجوع شود: مآثرالامراء ۱: ۶۰۵۔ تاریخ محمدی: ۶۸، ۱۹۹

[2] ان عبدالباقی خاں کے فرزند مرزا مغل جرأت شاگرد سودا تھے۔ یہ بریلی میں رہتے تھے۔ (عیارالشعراء قلمی ورق ۸۰ ب)

[3] عنایت اللہ کشمیری عہد اورنگ زیب کی مشہور شخصیت ہیں، ۷ ربیع الاول ۱۱۳۸ھ/۲ نومبر ۱۷۲۵ء میں فوت ہوئے، ۷۵ سال عمر پائی۔ ہفت ہزاری ہفت ہزار سواری ان کا منصب تھا۔ (مآثرالامراء ۲: ۸۲۸) دیکھئے: تاریخ محمدی ص ۶۱، ۱۹۵

[4] نکات الشعراء (طبع اول) ص ۸۵

[5] واقعات کشمیر: ۲۵۵ تاریخ محمدی: ۱۱۶، ۲۲۰

[6] واقعات کشمیر: ۲۵۵ میں قاتل کا نام "دیارام نوکر عمدہ ابوالبرکات خاں" بتایا ہے محمدی: ۲۲۰

[7] چمنستان شعراء (بحوالہ عبدالحکیم حاکم ۱۶۳) نیز تاریخ محمدی (قلمی: رامپور) تحت ۱۱۶۹ھ


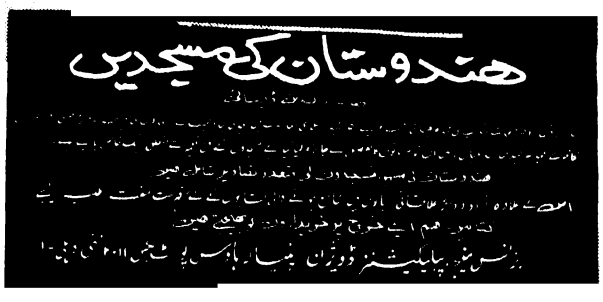

# سامنا



انور عظیم

ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ بے فکر، منہ سے دھواں اگلتا ہوا، بڑبڑاتا ہوا، بار بار سر کو جھٹکے دیتا ہوا۔

"تم قاتل ہو۔" میں نے اس کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔

"تم بڑے مکار ہو!" اس نے اپنی بڑی بڑی، جاگی ہوئی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔ میری آنکھوں میں کیکٹس اگنے لگے۔ اس کی آنکھوں نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا میں ڈر گیا۔ وہ کٹہرے میں تھا۔ مگر یہ کٹہرا الیوژن بھی تو ہو سکتا ہے۔ میں نے کٹہرے کو چھو کر دیکھا۔ سب ٹھیک تھا۔ میں محفوظ تھا۔

"بولو، بولو، تم کیا کہتے ہو۔" کٹہرے سے آواز آئی۔

"کیا کہوں؟"

"بتاؤ تم مکار ہو یا نہیں۔؟"

"میں پوچھتا ہوں تم نے قتل کیوں کیا؟"

"قتل میں نے کیا؟ قتل ہوا کون؟"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔"

کٹہرے سے پھر قہقہہ پھٹ پڑا۔ کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ نہ جانے کمرہ تھا یا کھلا میدان یا دریا۔ دریا ہی تھا۔ پانی کی سطح پر لاش تیر رہی تھی اور اندھیرے میں چاند کی طرح چمک رہی تھی پانی میں۔ جہاز کنارے سے بہت دور تھا۔ یہ سب تھا مگر سب کمرے میں تھا اور کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے کٹہرے کو چھو کر دیکھا۔ سب ٹھیک تھا میں محفوظ تھا۔

حفظ و امان کہرے کی طرح ہے۔ ہر چیز دھندلی ہے، سرد ہے، بے ضرر ہے، خاموش ہے، ایک کہرا سا ہوا میں چھلکوں کی طرح بکھرتا ہے، تیرتا ہوا آتا ہے اور مجھ سے لپٹ جاتا ہے۔ ٹھنڈی نمی مرے ہونٹوں اور آنکھوں کو چومتی ہے اور میری روح میں گھل جاتی ہے جس کی خاموشی خالی کنویں کی طرح گونج رہی ہے۔

بیئر کا مگ جھاگ سے بھرا ہوا ہے میں بیئر کا مگ اٹھاتا ہوں اور منہ سے لگاتا ہوں۔ جھاگ میری مونچھوں میں پھنس جاتا ہے۔ بیئر زبان پر تیرتی ہے۔ یہ بیئر نہیں ہے۔ جھاگ بھی نہیں۔ بس ایک مزا ہے جو زبان پر تیرتا ہے۔ نہ جانے بوتل کتنی دیر برف کے نیچے دبی رہی ہے لیکن اب بیئر گرم ہو رہی ہے۔ جھاگ بھی گرم ہو رہا ہے۔ موسم گرم ہے۔ ایر کنڈیشنر گھن گھن کر رہا ہے۔ اس کی ٹھنڈک قالین میں جذب ہو رہی ہے۔ اٹھا ڈنگ پیو پیو۔ میں پی رہا ہوں۔ مزا تلخ ہے۔ زبان تلخ ہے۔ تلخی تلخی میں گھل رہی ہے سمندر کے جھاگ کی طرح۔ شام کے وقت۔ شام پیو۔ تمہارے چہرے پر کتنی جھریاں ابھر آئی ہیں۔ تمہارا چہرہ ہنس دالان ہے۔ چہرہ پیش دالان ہے جس پر جھریاں ابھر آئی ہیں۔ وقت جھریاں ڈال دیتا ہے۔ وقت جھریاں مٹا دیتا ہے، وقت ہونٹ بھی ہے، بوسہ بھی ہے، وصال بھی ہے، وقت کھا سے بھرا درخت بھی ہے۔ وقت بیئر کا مگ ہے۔ جو خالی ہو چکا ہے۔ جس میں جھاگ بھرا ہوا ہے۔ وقت میرا بازو ہے۔ وقت کسی کی کمر ہے۔ نانسنس! مجھے نیند آ رہی ہے۔ پیو! او پیو۔ یہ تو بل زیادہ ٹھنڈی ہے۔ یہ تو بل زیادہ دیر تک برف میں دبی رہی ہے۔ ہر برف میں دب کر رہ جاتی ہے۔ برف میں یا مٹی میں۔ صرف وقت ہے جس کو نہ برف میں دبایا جا سکتا ہے۔ نہ مٹی میں۔ لیکن جب تم بیئر کا دسواں مگ بھی خالی کر لو گے تو میں تمہیں دبا دوں گا۔ مجھے؟ کیوں؟ کیونکہ تم وقت نہیں ہو۔ دبا دو۔ برف میں؟ ہنہ مٹی میں! کیوں کہ تم قتل ہو چکے ہو۔ جو قتل ہو جاتا ہے۔ اسے مٹی میں دبا دیا جاتا ہے۔

وہ اب بھی کٹہرے میں کھڑا تھا۔ وہ اپنے ہونٹوں کا جھاگ چاٹ رہا تھا۔ اس کا لمبوترا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔ زہر اس کی نس نس میں بس گیا تھا جھاگ تک کا رنگ نیلا میں سانپ کے زہر کا رنگ دیکھ رہا ہوں مجھے فیصلہ کرنا ہے۔ مجھے کنپٹی سے ہے میں اپنے زہر کو پہچانتا ہوں۔ مجھے اپنا زہر پینا ہے۔ مجھے اپنے زہر کے ساتھ سفر کر ہے مجھے نس نس میں بسنا ہے۔

شکار کٹہرے میں کھڑا تھا۔ شکار کا رنگ نیلا تھا۔ جھاگ سفر کر رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر پپڑیوں کی طرح جم رہا تھا۔ "تم کٹہرے میں بند ہو اور میں آزاد ہوں۔ اب میرا سر نہیں کچل سکتے۔ میں پھن پھیلا سکتا ہوں جہاں چاہوں رینگ کر جا سکتا ہوں ہونے کے بعد بھی چلتا ہوں۔ مگر یوں کہ آہٹ نہیں ہوتی۔"

آہٹ اور آہٹ !

شکار کے ہونٹوں پر جمی ہوئی پپڑیوں سے چھری کی دھار کی طرح روشنی پھوٹی مگوں میں ٹھنڈی ٹوٹلیں خالی کی جا رہی ہیں لیکن مگ خالی ہیں۔ بھی تالین پر تیر رہی ہے۔ خاموشی بول رہی ہے۔ کمرے میں سرگوشیوں کے سوا کچھ نہیں۔

تم جو کچھ کہہ رہی ہو میں سمجھتا ہوں۔ میں نے تم کو نہیں بلایا تم خود آئی ہو اور اس طرح آئی ہو، تم بھی انجان، میں بھی انجان۔ میں ہوں۔ تم ہو۔ ہمارے لباسوں کا ڈھیر ہے چند لمحوں کا ملبہ ہے ہم زندگی بھر لباسوں کے ڈھیر میں لمحوں کے ملبے تلے دبے رہتے ہیں لیکن اب ہم آزاد ہیں۔ ہمارے لباس بھی آزاد ہیں۔ ہم رات کی طرح ہیں جس نے اپنا چولا اتار دیا ہے ہم سُبک ہو گئے ہیں۔ خواب کی طرح۔ لباس ہمیں بھاری بنا دیتے ہیں۔ لباس جھوٹ کی طرح ہیں۔ لباس ہمارا وزن بڑھا دیتے ہیں۔ ہمارے جسم کتنے ہلکے ہیں۔ شعلے کی طرح۔ تم تھک رہی ہو اور شعلے بجھ رہے ہیں۔ پھر اپنی سانس کا بوجھ بڑھ رہا ہے اب رومانی باتیں نہ کرو لفظ بھیگے ہوئے لباس کی طرح ہیں۔ بوجھل۔ لباس کا بوجھ بڑھ رہا ہے وہ کیا چیز تھی جو تمہیں یہاں لائی۔ اس اندھیرے کمرے میں۔ اس اندھیرے میں جو بات تم نے سرگوشی میں کہی دیگستانی بگولے کی طرح ہے بگولہ اٹھا اور سو گیا۔ تم بھی سو گئیں صرف وہ بات جاگ رہی ہے جو تم نے سرگوشی میں کہی۔ وہ ہی ایک بات۔ پیاس۔ صدیوں پرانی پیاس۔ تمہارا چہرہ کتنے رنگ بدلتا ہے۔ تجربے نے تمہیں تھکا دیا ہے۔ تمہاری سانس اب بھی قابو میں نہیں۔ خاموش پڑی رہو۔ میں پھر سے جاگ رہا ہوں اور تم پر چھا رہا ہوں تم سے بے نیاز ہوں۔ لیکن میرا جسم آزاد ہے۔ تم بھی مجھ سے بے نیاز ہو۔ لیکن تمہارا جسم آزاد نہیں۔ کیونکہ تمہیں اپنے جسم کا احساس ہے۔ مجھے کوئی احساس نہیں احساس کے قیدی، احساس کے قیدی! میں انہیں نہیں جانتا۔ وہ مجھے نہیں جانتے۔ شعلے بجھ جاتے ہیں تو بوجھ بڑھ جاتا ہے لیکن میں بوجھ نہیں ہوں۔ میں اپنے بوجھ سے الگ ہوں میں الگ ہوں۔ اس لئے میں قیدی نہیں ہوں۔ قیدی! میں ٹھنڈی سانس لے رہا ہوں۔ لیکن میں اپنی ٹھنڈی سانس سے بلند ہوں، بلند !

یہ سب کتنا عجیب ہے ؟

دونوں، تھکے ہوئے، بیکار سے، لاشوں کی طرح، سیدھے، سیدھے، پڑے ہیں۔

یہ سب کتنا عجیب ہے۔ تم غلط سمجھے۔ میں اس لئے نہیں آئی تھی۔ ہاں! میں اکثر غلط سمجھتا ہوں اور میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں۔ تم اسی لئے تو آئی تھیں۔ اور اب سب کچھ تم ہو چکا ہے۔ ہم سیدھے سیدھے، پاس پاس، پڑے ہیں۔ ہمارے جسموں کا رنگ، جو دو سانچوں میں ڈھلا ہوا ہے، اندھیرے میں کافور کے ڈھیر کی طرح نظر آ رہا ہے۔ کیا کہا۔ ہا ہا۔ میں یہاں اس لئے نہیں آئی تھی۔ میں ہمیشہ لباس میں چھپی رہی ہوں۔ راز کی طرح۔ ب انتظار کرتی رہی۔ برسوں۔ کوئی آئے اور یہ راز کھول دے۔ کھول دے۔ کھول دے،

پالے۔ کوئی نہیں۔ میں نے اپنے آپ کو بچا بچا کر رکھا۔ الہامی کتاب کی طرح جزدان میں چھپا کر۔ میری بات مان لو۔ میں یہاں اس لئے نہیں آئی تھی۔ لیکن جب یہاں آئی تھی تو دیکھا تمہاری باتوں اور میری باتوں نے ایک سنگم سا بنا دیا ہے۔ ہمارے وصال کی سطح ہمارے جینے کی سطح ہے۔ ہمارے جینے کی سطح ہمارا ذہن ہے، ہماری سوچ جو موم بتی کی طرح لوٹے رہی ہے۔ وہی ہے اور باقی کچھ نہیں۔ باقی دو جسم ہیں۔ ہاں باقی دو جسم ہیں اور دو جسم پاس پاس لیٹے ہیں۔ تھکے ہوئے، ویران، خالی، ہم لیٹے ہیں اور اندھیرے میں اپنے پیروں کو دیکھ رہے ہیں۔ پیر چوہوں کی طرح منہ کھولتے ہیں۔ اور اونگھنے لگتے ہیں۔ پلنگ کے چرچر۔ ہم خوبصورت ہیں۔ ہم جی رہے ہیں۔ لیکن لگتا ہے ہم مر چکے ہیں۔

کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں قصاب ہوں۔ میری دکان میں ذبح کی ہوئی بکریاں کیلوں سے لٹک رہی ہیں اور میں باری باری سے ان کی کھال اتار رہا ہوں۔ خون سے لت پت رانوں پر ہاتھ پھیر رہا ہوں۔ سڈول اور سرخ رانیں جن سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ آہستہ آہستہ شام کے وقت جنگل کو چھوڑتی ہوئی روشنی کی طرح۔

"میں کب تک کٹہرے میں کھڑا رہوں گا۔؟"

" فیصلے کا انتظار کرو۔"

" میں کسی چیز کا، کسی کا، انتظار نہیں کر سکتا۔"

"انتظار نہیں کر سکتے۔ تو جہنم میں جاؤ۔"

"کیوں ؟"

" جو انتظار نہیں کر سکتے۔ وہ جہنم میں چلے جاتے ہیں۔"

اس نے کٹہرے کی ریلنگ کو زور سے دبوچ لیا اس کا ملبوتر اچہرہ اور لمبا ہو گیا اور تانبے کی طرح چمکنے لگا۔ اس کی مٹھیوں کی رگیں رسی کی طرح ابھر آئیں۔ اس کی آنکھیں ایک دہشت پر جم گئی تھیں وہ اسی ایک دہشت کو گھورے جا رہا تھا۔

" میں انتظار کروں گا آخر تک انتظار کروں گا۔ میں جانتا ہوں تم کبھی نہ کبھی اپنے جرم کا اقرار کرو گے۔"

"کرو، کرو انتظار۔"

" تم سکڑ رہی ہو۔ میں بھی سکڑ رہا ہوں۔ تم اور میں، دونوں کتے۔ ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ ہم اسی طرح لیٹے لیٹے کہرے کی طرح پگھل جائیں گے۔ مٹ جائیں گے۔

ہا ہا ہا :

" تم بڑے مکار ہو۔ اب جب مہینوں اور برسوں کا ڈھیر لگ چکا ہے۔ میں تم سے اپنا حساب چکانا چاہتا ہوں۔"

رات آہستہ آہستہ ٹھنڈ کے میں رس رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں کھڑکی کے باہر درختوں کی پھننگیں الجھی ہوئی لکیروں کے ڈھیر کی طرح خاموش نظر آئیں گی۔ جب پو پھٹتی ہے یہی ہوتا

ہے یکروں کے ڈھیر گھڑیوں کی طرح کھل جاتے ہیں۔

"جاڑے کی رات ہے اور تم کو پسینہ آرہا ہے۔" کٹہرے میں آواز گونجی اور دیواروں میں کیلوں کی طرح پیوست ہوگئی۔

گرم پانی کی لہر ہمارے اوپر سے گزر چکی ہے۔ اس کو بھی جانے صدیاں بیت گئیں۔ میں اس وقت قصاب کی دکان پر پڑا ہوا چھچھڑا ہوں۔ بلی میرے پاس خرخرا رہی ہے! اس کا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں میں، اس کی رُوح میں اور روئیں میں نیند ہے۔ میں اپنے آپ سے ہٹ کر اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ سکڑا ہوا، ہر تندی اور تموّج سے الگ، خجل، ٹھنڈا، باسی، بے جان گوشت کا ٹکڑا۔ آخر میں یہی ہوتا ہے۔ یہ ہے جولانی کا انجام۔ میں اس لئے نہیں آئی تھی۔ میں اس لئے نہیں آیا تھا۔ وہ سہم جاتی ہے اور سیدھی لیٹی لیٹی پوچھتی ہے۔ کچھ پوچھتی ہے۔ میرے پورے جسم میں جھرجھری سی دوڑ جاتی ہے۔ میرے جسم کے انگنت کان کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اور اگر کچھ ہوگیا۔ دیکھو۔ فرش پر۔ ہاہاہا! وہ کروٹ بدل لیتی ہے۔ اس کا جسم گرم ہوجاتا ہے۔ اس کے روئیں روئیں سے سُورج کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ حوّا نے آدم سے یہی پوچھا تھا۔ آدم بے چارا۔ تنہا خاموش، شکار، وہ مرے وجود کو انہی باتوں سے گرم کردیتا ہے۔ پگھلا دیتا ہے۔ یہ میری ٹریجڈی ہے۔ لیکن اس وقت میں اپنے آپ سے بلند ہوچکی ہوں۔ یہ بھی میری ٹریجڈی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں نے وہ کر دکھایا جو پہلے کسی سے نہیں ہوسکا۔ میں نے سیکس کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے۔

یہ معاملہ پرانا ہوچکا ہے۔ کئی دن ہوچکے ہیں اور میں اس عورت کو بھول چکا ہوں جو صرف اپنے ذہن کی سطح پر جیتی ہے۔ عورت، جو روزمرّہ کو ایک روحانی تجربہ اور معجزہ بنادیتی ہے۔ ہاہاہا! ایک سرسری سی ملاقات، ایک ہلکا سا اشارہ، ایک ذرا سا فلرٹیشن، ایک آدھ ادھورا فقرہ، ایک ذرا سی کھوئی کھوئی کیفیت، سگرٹ کے لگاتار کش، سورکا اور پکاسو کی باتیں، کچھ اسٹیج، کچھ کتابوں کا ذکر، اور سارا تجربہ کیا سے کیا ہوگیا وہ چلی گئی اور بالکل روایتی معشوقوں کی طرح کہہ گئی۔ خط لکھنا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ خط۔ اگر میں ایسے تمام تجربوں کے بعد خط لکھنا شروع کردوں تو ساری تنخواہ ٹی اے سمیت ڈاک خانے کے پیٹ میں چلی جائے۔ وہ دُھند لکے میں چلی گئی۔ بستر پر میرے پاس ایک شکن ہے اور کچھ بھی نہیں۔ میں قصاب ہوں اور ذبح کی ہوئی بکریوں کی کھال اتار رہا ہوں اور میرا کسی بکری سے جذباتی رشتہ نہیں ہے۔ میں غیر رومانی آدمی ہوں۔ میں نت نئے تجربوں میں جیتا ہوں۔ میری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ میں کسی عورت کو مایوس نہیں کرسکتا۔ اس میں میری مُکتی ہے شاید عورت کی بھی۔ ان ہی باتوں میں عمریں گزر جاتی ہیں۔ ان ہی باتوں میں صدیاں بیت جاتی ہیں یہ ثابت کرنے میں کہ میں تم سے مختلف ہوں۔ میں وہی ہوں جو تم نہیں ہو۔ بلکہ شاید، میں جو ہوں تم نہیں ہوسکتے۔ حالانکہ میں جو ہوں سو ہوں اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ میں وہی ہوں جو میں ہوسکتا تھا۔ جو میں ہوسکتا ہوں وہی ہوں۔ بتاؤ اس میں میرا کیا کمال ہے۔ ہے تو سہی، ہے تو سہی۔

ہلو ہلو ? How do you do ہلو ہلو۔ کہئے مسٹر سوا ینڈ سو رات کیسی کٹی۔ رات؟ کیسی رات؟ میری زندگی میں رات نہیں ہوتی۔ دن بھی نہیں ہوتا۔ وقت کو رنگوں میں تقسیم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جی ہاں کتنے کلر بلائنڈ ہوتے ہیں۔ سیاہ اور سفید سفید اور سیاہ کتے کتنے مزے میں ہیں۔ اُنہیں رنگوں اور رنگوں کے شیڈ سے کوئی مطلب نہیں۔ مجھے بھی رنگوں اور رنگوں کے شیڈ سے کوئی مطلب نہیں۔ اس لئے میں بھی مزے میں ہوں۔ ہلو ہلو۔ مسٹر سوا ینڈ سو۔ کمرہ آپ کے سگار کی وجہ سے کتنا خوشبودار ہورہا ہے۔ جی میں ہوائن سگار پیتا ہوں۔ میں ہوائن سگار پر مرتا ہوں۔ مجھے اس سے جنگل کی خوشبو آتی ہے۔ جنگلوں میں بسی ہوئی خون کی خوشبو۔ جنگل کتنا اندھیرا ہے۔ لیکن اس کے درختوں سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔ اس جنگل کا کیا نام ہے؟ مجھے ناموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وقت کے ساتھ یہ خوشبو بھی اُڑ جائے گی۔ ہر چیز گزر جاتی ہے۔ ہماری اچھی اچھی باتیں، ہماری وفاداریاں ہماری بغاوتیں۔ حماقت کی باتیں کرنے سے بہتر ہے کہ سگار پیؤ اور یوں بن جاؤ جیسے کچھ سوچ رہے ہو۔ داڑھی بڑھالو اور سمجھو تمہارا چہرہ جنگل ہے جس میں چھاپے مار رہتے ہیں جس میں اس صدی کے سارے چھاپے مار چھپے ہوئے ہیں۔ چھاپہ مار۔ اسی لئے تو میں ہوائن سگار پر مرتا ہوں۔ میں تمہاری داڑھی پر جان دیتا ہوں جس سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔ اس روشنی نے میرے چہرے کو مقدس بنا دیا ہے۔ روشنی جنگل کو مقدس بنا دیتی ہے جو آدم کی طرح قدیم ہے۔

"میں تمہارے پُراسرار ہونٹوں میں دبے ہوئے پراسرار سگار کے پراسرار مرغولوں میں چکر لگاتی ہوئی باتوں میں نہیں آؤں گا۔" کٹہرے میں کھڑے پُراسرار ملزم کے ہونٹ مُڑ گئے تھے۔ اس کا چہرہ یرقانی چہرے کی طرح ستا ہوا تھا۔ زرد، پہاڑی دھول کی طرح۔

"تمہیں سزا ہوچکی ہے۔ جس کو سزا ہوجاتی ہے۔ وہ سزا کاٹنے پر مجبور ہے۔ تمہاری انتقامی باتوں کا عدالت پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔" وہ گھبراہٹ کے بھنور سے نکل رہا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ وہ کٹہرے کے باہر تھا۔

مسٹر سوا ینڈ سو کے ہونٹ سوکھ رہے تھے۔ گلے میں کیکٹس اُگ رہے تھے۔

میں نے بہت کھیل کھیلے ہیں، جی نہیں پاپڑ آپ نے بیلے ہوں گے۔ مجھے پاپڑ بیلنے کا شوق نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے آپ بھیجے کے شوقین ہیں — بھیڑ کے بھیجے کے — جی ہاں بھیڑ کے — بھیڑ شریف جانور ہے۔ سر جھکائے۔ اپنی اُون میں لپٹی لپٹائی۔ آپ مسکراتے ہیں تو بالکل بھیڑ معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کے جسم پر اُون بالکل نہیں۔ اس لئے لوگوں کو شبہ ہوسکتا ہے کہ آپ بھیڑ نہیں۔ آپ کوئی اور جانور ہیں۔ بھیڑ کا اُون اُتر جائے تو کتنی گھناؤنی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی کھال۔ آپ کی معلومات بس کھال ہی تک ہے۔ میں بھیڑ کی اندر کا مسافر

وں۔ اچھے مسافر ہو۔ چلتے ہو تو تمہارے کھروں سے گرد اُڑتی ہے۔ اُڑتی ہوگی۔ میں دُور کا مسافر وں۔ یہ گرد بھی دُور تک جائے گی۔

مسٹر سوانڈسو کے منہ سے وہسکی کی بو آرہی ہے۔ آنکھیں دیکھو۔ چہرہ۔ اس کے ن میں وہسکی ملی ہوئی ہے۔

کیا نام بتایا آپ نے بھلا سا۔ مسٹر کون؟ خیر چھوڑیئے نام میں کیا دھرا ہے میری گوں میں خون ہے ہی نہیں۔ اس لئے ملاوٹ کا سوال نہیں اٹھتا۔ سنو تم اس چیک پر دستخط ردو۔ اگر تم اجازت دو تو آج یہیں منگوا لوں ایک بوتل۔ مسٹر سوانڈسو کا گلا سُوکھ رہا ہے ور آنکھیں پتھرا رہی ہیں۔ منگوانے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے سیف میں موجود ہے۔

Nothing like it تمہارے کمرے میں سب کچھ موجود رہتا ہے۔ سب چھ نہیں۔ بہت کچھ کمیشن میں نکل جاتا ہے لیکن یہ بوتل کمیشن نہیں ہے۔ دماغ کے کام کا ئی کمیشن نہیں ہوتا۔ ہاہاہا۔ تم بوتل خالی کرو۔ جب یہ بوتل خالی ہو جائے گی میں اس میں یہ کاغذ بھر دوں گا جس پر تمہارے ہاتھوں کی روشنائی پھیلی ہوئی ہے۔ اس سے۔ جو بشراب کشید ہوگی اس کی بات ہی اور ہوگی۔ تب میں کہوں گا Nothing like it ۔ اور میں امر ہو جاؤں گا۔ کیا میں تمہاری سیکریٹری کے ساتھ سو سکتا ہوں؟

Not that I am keen on it لیکن اس کی آنکھوں ں التجا مجھ سے انکار نہیں ہو سکتا۔ یار وہسکی بول رہی ہے۔ کمیشن بول رہا ہے دماغ کے ام کا کوئی کمیشن نہیں ہوتا۔ ہاہاہا۔ خیر اس کی بات چھوڑو۔ اس کی بات چھوڑو۔ ہاں سوئی تو ضرور وہ میرے ساتھ لیکن اس کا سونا انٹلکچول کا سونا تھا وہ میرے پہلو میں لیٹی تھی بالکل برابر برابر۔ لیکن مجھے پورے وقت یہ احساس تھا کہ میں اس کے دماغ کے ساتھ سو رہا ہوں۔ میرے پہلو میں اس کا دماغ تھا اور کچھ نہ تھا۔ تمہاری سکریٹری کی بات اور ہے میرے پہلو میں وہ ہو گی، سب کچھ ہوگا۔ That's fine. لیکن پہلے مسٹر سو انڈسو بلینک چیک پر دستخط کر دیجئے۔ پھر وہ آپ کے کمرے میں پہنچ جائے گی۔ وہ کون وہی، کوئی ہو کوئی ہو! فرق کیا پڑتا ہے اور یہ دستخط۔

اس کا یرقانی چہرہ اور زیادہ لمبوترا ہو گیا تھا جو اس کا جسم بھی کھنچ گیا تھا اس کا سر چھت کو چھو رہا تھا۔ عدالت کی چھت بہت نیچی ہوتی ہے۔ جب سٹ میں کیسی کیسی باتیں منہ سے نکل جاتی ہیں۔ اس کا سوٹ بہت ڈھیلا تھا۔ سر سی ڈھیلا ڈھالا سوٹ۔ دانت زرد تھے۔ تمباکو کی طرح وہ کھانس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھرائی تھیں اور ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ اس کے سر پر مچھروں نے چھتری سی بنا دی تھی۔ مچھر گھبرائے ہوئے سے تھے اور وہ مچھروں سے بھی زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔ عدالت میں فلیٹ کا چھڑکاؤ ہونا چاہیے۔

تم اسی طرح پڑی رہو تم پر کوئی نہ دوسرا آئے گا نہ جائے گا۔ میں سب سمجھتا ہوں تم جاگ رہی ہو۔ تم آرہی ہو۔ میں آرہا ہوں۔ زندگی ہوا کی موج کی طرح اڑی چلی جاتی ہے۔ اور میں مل رہا ہوں، تمہاری آگ میں۔

دیکھو ایسا ہے کہ تم میرے لئے اجنبی ہو۔ ہاں تم بھی اجنبی ہو۔ میں کسی رشتہ پر یقین نہیں رکھتی۔ میں بھی کسی رشتے کا پجاری نہیں ہوں۔ میں ہوا کی طرح ہوں آزاد۔ میں بھی آزاد اور گرم۔ آگ کی طرح۔ میں جلتی ہوں نہ بجھتی ہوں۔ بجھتی ہوں جلتی ہوں۔ یہ شاعری ہے ہاں یہ شاعری ہے۔

وہ ساری باندھ رہی ہے۔ الہامی کتاب کو جزدان میں رکھ رہی تھی۔ قرینے سے اس کے سامنے اس کے ہاتھ دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن کنگھا کٹی ہوئی زلفوں میں دوڑ رہا تھا۔ بالوں میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا کنگھا آرام سے سفر کر رہا تھا۔ چہرے پر غازے کی تہیں جم رہی تھیں۔ کھڑکی کے باہر سڑک پر گرد اُڑ رہی تھی۔ بھنگی جھاڑو دے رہا تھا۔ جھاڑو سے گرد اُڑ رہی تھی۔ کنگھے سے بال سنور رہے تھے غازے سے چہرہ دمک رہا تھا۔ چہرہ اس کی طرف مڑا وہ اب تک سہری کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ سر جھکائے۔ اس کے لمبے لمبے بال اس کے چہرے کو چھپائے ہوئے تھے۔ بالوں سے سگار کا دھواں چھن رہا تھا۔ اس کا چہرہ دھوئیں میں کھویا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی دھوئیں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ چہرہ جو اس کی طرف مڑا مسکرا رہا تھا۔

"تم پچھتا رہے ہو؟" آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

وہ اسی طرح بیٹھا رہا، سر جھکائے، اس کے لمبے بالوں سے دھواں چھنتا رہا۔

"وہ اجنبی دور تک ساتھ سفر نہیں کر سکے۔"

"کوئی دُور تک ساتھ سفر نہیں کر سکتا۔"

"کوئی نہیں؟"

"کوئی نہیں۔"

اس نے سر کو جھٹکا دیا۔ دروازہ کھولا۔ اور باہر نکل گئی۔ باہر روشنی تھی اور روشنی میں گرد تیر رہی تھی۔

جب آہٹیں دور حل گئیں اور دروازہ آہستہ آہستہ دوبارہ بند ہو گیا تو کمرہ اور روشنی آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔

وہ تھوڑی دیر جھکا رہا۔ تھوڑی دیر تک۔ یکایک شعلہ سا چمکا، شعلہ سا، وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے ہیولے کو آئینے میں دیکھا۔ آئینے میں اب وہ نہیں تھا۔ وہ تھا اکیلا۔ سانولا، میلا، بالوں سے بھرا ہوا، ریچھ جیسا ہیولا۔ وہ مڑا اور باتھ روم میں چلا گیا۔

تجربہ تجربہ اور تجربہ۔ بہت سے تجربے اس کی آنکھیں بند تھیں۔ پانی سر سے پاؤں تک بہہ رہا تھا۔ پانی کے ساتھ میل بہہ رہا تھا۔ میل۔ پسینے کی۔ غازے کی

خوشبو، زلفوں کی مہک، ہونٹوں کی گرمی، اجنبیت کی سپردگی، سب، دوری کا احساس، کچھ کھونے کچھ پانے کا وہم سب

رات ختم ہوئی۔ دن شروع ہوا۔

وہی پرانی فائل، وہی پرانا قلم، وہی پرانے نوٹ، وہی پرانے دستخط۔ رومال میں پٹرول کی بُو بس گئی ہے۔ وہی پرانی یو۔ نو نو یس یس۔ وہی پرانی نو نو، وہی پرانی یس یس، سوٹ تیا ہے۔ ٹائی نئی ہے میں وہی ہوں۔ وہی میں۔ مجھے زکام ہے۔ یہ پٹرول کی بو نہیں ہے۔ یہ یوکلپٹس کی بُو ہے۔ لیکن یہ میرے لئے ہے۔ جو کچھ ہے میرے لئے ہے، زکام، پٹرول اور یوکلپٹس کی بو اور رات کی یاد۔ یہ سب کتنا رومانٹک ہے۔ نو نو یس یس۔ میں نے سب طے کر لیا ہے۔ ہاں میں نے طے کر لیا ہے۔ میں دیمک ہوں۔ تم بھی دیمک ہو۔ میں کاغذ کو چاٹ رہا ہوں۔ میری رُوح بھی کاغذ کی طرح سفید ہے۔ قاعدے سے کٹی ہوئی۔ جو چاہو اس پر لکھ دو۔ میں اسی کاغذ پر لکھا ہوا ہوں میں چمک رہا ہوں روشنائی کی طرح۔ میں لکھا ہوا ہوں اور پھیل رہا ہوں۔

یہ روز روز کا قصہ ہے۔ اکتاہٹ یہاں سے شروع نہیں ہوتی۔ کہیں اور سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں تک پہونچتے ہے۔ شاید یہاں سے آگے تک جاتی ہے۔ شاید میں اپنے آپ کو اس اکتاہٹ سے الگ الگ رکھتا ہوں۔ اس اکتاہٹ سے ہر چیز سے۔

وہ میرا پیچھا کر رہا ہے میں اپنا پیچھا کر رہا ہوں۔ میں اور قاتل۔ دونوں ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے ہیں۔

وہ کئی پیالیاں کافی کی خالی کر چکا ہے۔ اس کے ہاتھ بہت سے کاغذوں، بہت سے چکوں پر دستخط کر چکے ہیں۔ اس کا رنگ اور سنولا گیا ہے۔ اس کے بال اس وقت بھی چہرے پر جھکے ہوئے ہیں۔ اب بھی بالوں سے سگار کا دھواں چھن رہا ہے اس کے سوٹ کا نیلا رنگ اس کے چہرے کے رنگ میں جذب ہو رہا ہے۔ اور سگار کے دھوئیں سے چھن رہا ہے۔

"تو یہ کام ہو جائے گا؟"

"ہو جائے گا۔"

Very nice of you.

"سوچ لیجئے کہیں آپ اپنی رائے کا اظہار کرنے میں جلد بازی سے تو کام نہیں لے رہے ہیں؟"

"میں نے سوچ لیا ہے۔"

خاموشی ہے۔ وقفہ ہے۔ ہاتھوں میں رعشہ ہے۔ قلم تھک رہا ہے۔ قلم جو صرف دستخط کرتا ہے۔ کتنی جلدی تھک جاتا ہے۔ کئی پیالیاں کافی کی خالی ہو چکی ہیں۔ وہ اٹھتا ہے اور اپنی کرسی کو پیچھے ڈھکیلتا ہے۔ کھڑکی کے پاس جاتا ہے نیچے سڑک کو دیکھتا ہے۔ انسان بہہ رہے ہیں۔ ٹرانسپورٹ کے ریلے جا رہے ہیں۔ گرد اڑ رہی ہے مکانوں کے بالائی محفوظ افق میں جذب ہو رہے ہیں۔ دھوپ ہے مگر سورج نہیں ہے۔ دھوپ ہر چیز کا شیڈ بدل رہی ہے۔ اس کا ہیولا، نیلے سوٹ میں، کمرے کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جاتا ہے۔ وہ بھی اُس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے عمارتیں اونچی ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ موسم بدل رہا ہے اور میں دستخط کر رہا ہوں۔ کاروبار اچھا چل رہا ہے۔ لیکن یہ کاروبار کس کا ہے۔ میں اس کاروبار کا کون ہوتا ہوں۔ میری رگوں سارا خون نکل چکا ہے۔ ایک دن اور ختم ہوا۔ جہاں دن ختم ہوتا ہے، وہاں رات شروع ہوتی ہے۔ ایک بار پھر۔ وہی پٹرول کی بو، وہی گرد، وہی راستے۔

کمرے کے سارے بلب جل رہے ہیں۔ لیکن کمرے میں اندھیری رات کا بسیرا ہے وہ ہے اور اس کا قاتل ہے اور کھڑا ہے۔ قاتل کا منہ بند ہے۔ مگر اس کی آواز گونج رہی ہے۔ تم سب کچھ دیکھ سکتے ہو، اپنے چہرے کی جھریاں نہیں دیکھ سکتے۔ دل کی جھریاں دکھائی نہیں دیتیں۔ چہرے کی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن تم یہ بھی نہیں دیکھ سکتے تم بہت تھک گئے ہو۔ تھکن نے تمہارا قد اور لمبا کر دیا ہے۔ قد اور تمہاری گردن اور تمہارا چہرہ۔ تمہارے ہاتھوں میں رعشہ ہے۔ تم کھنچ گئے ہو۔ آنکھوں میں بوسی جھلملا رہی ہے۔ بجھا ہوا سگار تمہارے ہاتھ سے جھوٹ کر قالین پر گر گیا ہے تم چپ ہو، یہ وقت بولنے کا ہے۔ مگر تم چپ ہو۔ تم تن کر کھڑے ہو گئے ہو تم زندگی بھر یہی کرتے رہے ہو۔ اب بھی تم تن کر کھڑے ہو۔ لیکن تمہاری کمر میں خم ہے۔ گردن سے سر بہت بڑی چٹان اٹھائے ہوئے ہو۔ چٹان دکھائی نہیں دیتی۔ مگر وہ سر پر دھری ہوئی ہے۔ کچھ اس کے بوجھ سے کھل جاتے ہیں۔ کچھ اسے ڈھکیل کر پہاڑ کی چوٹی تک لے جاتے ہیں۔ ہر رات۔

نکالو سیلے وہی بوتل جو آدھی بھری ہوئی ہے اور خالی کر دو۔

کیا سوچ رہے ہو بھلا یہ وقت سوچنے کا ہے۔ یہ وقت پینے کا ہے۔ آخری گھونٹ تمہارے ہاتھوں میں رعشہ بڑھ رہا ہے۔ لگتا ہے کوئی کنیلا تار آستین میں چھپا تمہاری رگوں کو نوچ رہا ہے۔ تمہاری جھریاں اور گہری ہو گئی ہیں۔ تمہاری آنکھیں ایک ہی نقطے پر جمی ہوئی ہیں تمہارے ہونٹ سوکھ رہے ہیں یہ ٹھنڈا گلاس، ہونٹوں کی خشکی دور نہیں کر سکتا۔

کس کا انتظار ہے تمہاری آنکھوں کو۔ دروازے کی طرف نہ دیکھو وہاں کوئی نہیں کسی کے قدموں کی آہٹ نہیں۔

میں کھڑے میں کھڑا ہوں اور تمہاری بے بسی کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔ تمہارے لمبے چہرے پر پسینے کی لہریں تیر رہی ہیں۔ تمہیں اور پسینہ۔ تم تو اتنے ٹھنڈے رہتے

زندگی بھر اور اب اس آخری لمحے میں اتنا پسینہ۔ تم میری باتوں کو مسکرا کر ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔ اب تم مجھے نہیں ٹال سکتے۔ بہت ٹالا تم نے۔ لیکن اب وقت اپنا کھیل کھیل چکا۔ تم ہار چکے ـــــ وہ ہونٹ چبا رہا تھا۔ وہ کھڑا ہوا اس کا قد اور لمبا ہو گیا اس کا سر چھت کو چھو رہا تھا۔ اس نے کپڑے اتار دیئے۔ جوتے، کپڑے، بنیان اور انڈرویر۔ وہ مسہری پر لیٹ گیا۔ سیدھا۔ اس کا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پھنک رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور کھڑے کی طرف دیکھا۔ کھڑے اور اس کے درمیان ایک تپائی تھی تپائی پر خالی بوتل تھی اور تپائی کو گھور رہی تھی۔

تم غلط سمجھے۔ میں ہار نہیں مانوں گا۔ تم میرے قاتل ہو۔ میں اپنے قاتل کو ساتھ لے جاؤں گا۔ میں ہمیشہ زندگی سے کترا تا رہا۔ کتراتا بھی بڑا آرٹ ہے لیکن زندگی اپنا سب کچھ مجھ پر لٹاتی رہی۔ یہ بھی بڑا آرٹ ہے۔ میں نے کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن بہتوں نے میرا ساتھ دیا۔ خود ہی بے وجہ لوگ آئے اور انہوں نے مجھ سے سمجھوتہ کیا۔ میں نے کسی سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

"جس سے سمجھوتہ کیا جاتا ہے وہ بھی کسی سے سمجھوتہ کرتا ہے۔"

اپنی نہ ہانکو۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔

"جانتا ہوں ہم وقت کی جیب میں ہیں۔ لیکن ہماری جیبیں خالی ہیں۔"

"میں نے کہا نا کہ چالاکی کی باتیں نہ کرو۔"

"Bloody Hoax"

اس نے اپنی مسہری کی سفید چادر سے اپنے جسم کو ڈھک لیا۔

یہ میرا کفن ہے۔ اپنی مسہری، اپنی چادر، اپنا کفن۔ بہت کم لوگ ہیں جو اپنی لاش کو یوں دیکھتے ہیں۔ مسہری پر رکھی ہوئی لاش اور اب میں تم کو نہیں دیکھ سکتا۔ نہ تو تم کو، نہ کھڑے کو جو میں نے خود بنایا ہے۔ تمہارے لئے۔

میں تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہوں لیکن میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔ تمہارا کفن بلور کی طرح چمک رہا ہے۔ تمہارا جسم ننگا ہے۔ سیدھا۔ تم نے نہ جانے کب سے شیو نہیں کیا ہے۔ تمہارے چہرے پر داڑھی اُگ آئی ہے۔ حیرت ہے۔ شام تک تو تم کلین شیو تھے اس وقت بھی جب تم آخری گلاس کا آخری گھونٹ پی رہے تھے۔ تم نے سینے پر ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔ تمہاری آنکھیں بند ہیں۔ ہونٹ خاموش ہیں۔ دل ساکت ہے۔ نبض چھوٹ چکی ہے۔ تمہارے چہرے پر پسینہ موم کی طرح خشک ہو گیا ہے۔ موم کی تہہ نے تمہیں ممی بنا دیا ہے۔ اگر میں تمہیں اٹھاؤں اور لے جا کر تمہارے آفس کے ایر کنڈیشنڈ کمرے میں تمہاری گھومتی ہوئی کرسی پر تمہیں بٹھا دوں تو کل صبح کیا ہو ـــــ تمہاری سکریٹری شیشے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھتی بھی نہیں۔ وہ بے تکلف ہے اور تمہارے موڈ کے موسم کو جانتی ہے۔ وہ دھڑ سے دروازہ کھولتی ہے اور بے ساختہ کہتی ہے۔ "گڈ مارننگ سر!" اور تمہاری کرسی کی طرف لپکتی ہے۔ اور جب وہ تمہاری گود میں بیٹھتی ہے تو کرسی خود بخود گھوم جاتی ہے اور وہ گرتے گرتے تمہارا چہرہ دیکھتی ہے۔ وہ بے ہوش ہو جاتی ہے اور تمہاری زرد ممی اس کے اوپر گر جاتی ہے۔ منہ کے بل۔

میرے پاس ایسی مہمل باتیں سننے کا وقت نہیں۔

"وقت میرے پاس بھی نہیں۔ لیکن تمہاری آواز آج بھی میرا پیچھا کر رہی ہے۔"

میری آواز۔ میری کوئی آواز نہیں۔ اب تم آزاد ہو۔ میری آواز کے ساتھ وہ کٹہرا بھی مٹ گیا جو میں نے تمہارے لئے بنایا تھا۔ اب آسانی کرو۔ مجھے اٹھاؤ اور راتوں رات لے چلو۔ اپنے ہاتھوں سے قبر کھودو۔ اور مجھے اس میں ڈال دو۔ مجھے اور وہ سب کچھ جسے تم ہوکس کہتے ہو۔ میں چاہتا ہوں۔ میرے بعد وہ سب کچھ، جو مجھ میں ہے، دنیا میں نہ ہو۔

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

کوئی دروازے سے کان لگائے کھڑا ہے اور خاموشی کی صدا سن رہا ہے۔ صدا کا چہرہ روشن ہے، آنکھیں پھیلی ہوئی ہیں، بال سیاہ ہیں اور سرکالی بلی کی طرح چمک رہا ہے ـــ ایک پیکر ساجو شعلے کی طرح لپک رہا ہے لیکن دروازہ بند ہے۔ اندر خاموشی ہے۔ مسہری پر سفید چادر کفن بن چکی ہے۔ اب دستک سے کیا ہوگا۔

یہ شخص مر کر بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ دروازہ کھل جائے تو میں اس سے صرف اتنا کہوں۔ تم اب بھی جھوٹ بول رہے ہو۔ اور جب تم مجھ سے جھوٹ بول رہے تھے، تب بھی میں یہ جانتی تھی۔ تم سمجھ رہے تھے۔ میں تمہارے لئے جی رہی ہوں۔ تب میں اپنے لئے جی رہی تھی۔

کفن میں وہ مسکرایا۔ اس نے چادر منہ سے ہٹائی۔ اس نے قاتل کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ قاتل اس کے سینے میں جذب ہو گیا۔ اس نے کفن نوچ کر پھینک دیا۔ وہ بھوکے کتے کی طرح مسہری سے تڑپا۔ لپک کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ کمرہ خوشبو سے بھر گیا۔

ممی کے چہرے پر موم کی زردی دوپہر کی دھوپ کی طرح چمک رہی تھی۔ ہاتھ کا رعشہ ختم ہو چکا تھا۔ گلاس پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔

اس نے خوشبو کے کان میں کہا

"میں نے قاتل کو اپنے سینے میں دفن کر دیا ہے۔"

خوشبو کا چہرہ خون کی طرح سرخ ہو گیا۔

"تم کتنے بڑے قاتل ہو!"

اس کے چہرے پر پھر موم کی تہیں جم گئیں۔ اور اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس کا ہاتھ لرزنے لگا۔ گلاس خالی تھا۔

مسہری پر سفید چادر کفن بن چکی تھی۔

# غزلیں





## شہاب عراقی

کبھی جو چاند سے سورج قدم ملا کے چلا
سیاہ پڑتا گیا چہرہ پھول سے دن کا

یہ جھلملاتے ستارے بھی ڈوب جائیں گے
نہ کھینچ دن کے طلب گار رات کا پردا

بجھی ہوئی ہے نظر زہر کی تمازت سے
چمک رہا ہے اندھیرے میں سانپ کا چہرا

اُبل رہی ہے ندی کپکپائی پلکوں پر
بہاؤ تیز ہے پگھلی ہوئی چٹانوں کا

سمندروں کا لہو خشک ہو گیا شاید
بہا رہا ہوں خیالوں میں ریت کا دریا

نگاہ لعل و گہر کی تلاش میں نکلی!
ہتھیلیوں کی ہے قسمت میں سُرخ انگارا

وہاں نہ جاؤ کہ رنگوں کے امتزاج کے ساتھ
کھڑا ہے دن کے اُجالے میں رات کا سایا

تنہائی میں دُکھتے لمحے جب کچھ یاد دلاتے ہیں
سائے سائے کتنے چہرے آنکھوں میں پھر جاتے ہیں

اب تو اچھے دل والوں کا قحط سا پڑتا جاتا ہے
لیکن نقلی چہرے والے دل اپنا بھرماتے ہیں

چھو جاتی ہے جب بھی آکر یادوں کی پُروائی سے
ننھے ننھے کتنے دیپک پلکوں پر جل جاتے ہیں

اپنوں میں بیگانہ بن کر زندہ رہنا مشکل ہے
لیکن دیکھ زمانے ہم کو، ہم جی کر دکھلاتے ہیں

جانے کب سے ہم بیٹھے ہیں سوچوں کے چوراہے پر
چوری کا میلہ ہے جگ، ہم بھی دیکھے جاتے ہیں

وشوانا تھ








۱۹۱۴ء میں جب میں ایم اے۔ او کالج علی گڑھ میں داخلہ کے لئے آیا تو میرے ہم وطن، ہم سبق اور دوست حضور عالم بھی میرے ساتھ تھے۔ ہم دونوں کے والد میر محفوظ علی اور محمد اکرام عالم بھی سرسید کے زمانے کے اولڈ بوائے تھے۔ ہم پہلی مرتبہ گھر سے نکلے تھے اور بورڈنگ کی زندگی ہمارے لئے بالکل نئی تھی۔ سرسید ایسٹ کے کمرہ نمبر ۱۰ میں جگہ ملی جس سے ایک کمرہ اُدھر نمبر ۱۳ کرکٹ کپتان کا کمرہ تھا۔

اُس زمانے میں الہ آباد یونی ورسٹی جس سے علی گڑھ ملحق تھا، امتحانات کے نتائج کا اعلان شروع میں کر دیا کرتی تھی اور نئے کلاسوں میں داخلہ مل جاتا تھا۔ جون میں پڑھائی تو کچھ نہیں ہوتی البتہ دھما چوکڑی حسب بچی رہتی تھی۔ جو لڑکے اپنے اسکول سے اور بالخصوص باہر سے آتے ان کی کبھی گرم اور کبھی ٹھنڈی فاختہ اڑتی تھی۔ چارپائیاں اُلٹی جاتی تھیں اور سب سے بڑھ کر موسم کی پہلی بارش میں ہڑبڑاہٹ ہوتا تھا۔ جون ختم ہوتے ہی کالج بند ہو جاتا اور تین مہینے بعد یکم اکتوبر کو کھلتا تھا۔

اس کا تو کوئی سوال نہیں کہ جن لوگوں نے یہ چیزیں دیکھی ہیں۔ انہیں یہ باتیں سُنکر ایسا معلوم ہوگا جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے وہی ماحول وہی فضا وہی گہما گہمی اور وہی چہل پہل موجود ہے جو اُن کے زمانہ میں تھی۔ سوال صرف یہ ہے کہ کیا وہ لوگ یہی یقین کریں گے جنہوں نے اس مادر علمی کی آغوش میں تعلیم نہیں پائی اور جن کو یہ نہیں معلوم کہ یہاں کے زمین و آسمان کچھ اور ہی ہیں۔ میرا مطلب ہے سرزمین علی گڑھ سے، زندہ باد علی گڑھ۔

اُس زمانہ میں بہت سے کام "ٹریڈیشن" کی بنا پر کیا جایا کرتے تھے۔ کالج کی زندگی میں اُس ٹریڈیشن کو ضابطہ فوجداری اور قانون تعزیرات سے زیادہ اہمیت تھی۔ تحریک ترکِ موالات سے علی گڑھ کی زندگی میں ایک بھونچال آگیا تھا۔ سب پُرانے طلبار کے بیک وقت نکل جانے کی وجہ سے وہ تمام خصوصیات بڑی حد تک زائل ہوگئیں، جو بڑی محنت اور مصیبت سے پیدا کی جا سکی تھیں اور جو سینہ بہ سینہ چلی آرہی تھیں۔

جس ٹریڈیشن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، اُس کے اعتبار سے قاعدہ یہ تھا کہ پکی پارک کے ہر کمرے میں دو پُرانے لڑکوں کے ساتھ ایک نئے کو رکھ دیا جاتا تاکہ نہ صرف یہ کہ وہ گھبرائے نہیں بلکہ پڑھنے لکھنے سے بڑھ کر وہ بیٹھنا اٹھنا اور بات چیت کرنا سیکھ جائے اور اُس میں وہ تمام خصوصیات پیدا ہو جائیں جن کی وجہ سے علی گڑھ والا چشم بد دُور آج بھی دُور سے دیکھ کر پہچان لیا جاتا ہے۔

یوں تو اُس زمانے کے علی گڑھ کے ہر بات نرالی تھی اور متاع عزیز کی طرح دل اور دماغ کے گوشوں میں رچی بسی ہے مگر دو واقعات ایسے ہیں جو بھولتے ہی نہیں۔ ایک تو بہو بنچتے ہی پیش آیا اور دوسرا ایک سال بعد وقوع پذیر ہوا۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی کی سی بات ہے کہ اب سے چھپن برس پیشتر یعنی ۲۵ ر

۲۶ جون ۱۹۱۳ء کو جب کہ شدید گرمی پڑ رہی تھی صبح دس گیارہ بجے کے وقت ایک دم گھٹا چھا گئی اور دیکھتے دیکھتے موٹی موٹی بوندیں گرنی شروع ہو گئیں دس منٹ کے اندر اندر خوب بارش ہونے لگی اور لوگ اپنے اپنے کمروں سے نکل کر برآمدے میں جمع ہونے لگے۔ صحن کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں جو پانی جمع ہو گیا تھا اس کی وسعت بڑھتی گئی اور دیکھتے دیکھتے پورا صحن زیرِ آب ہو گیا جل تھل بھر گئے۔ نہ آسمان نظر آ رہا تھا نہ زمین، اُمنڈ اُمنڈ کے بادل آ رہا تھا اور بارش ہو رہی تھی۔ اتنے میں کمرہ ۳۳ کی طرف کچھ گڑبڑ ہوئی اور میں نے دیکھا کہ سَرور خاں، اسد، انور، آغا مرزا، فتح محمد وغیرہ کسی شخص کو حلقہ میں لئے ہوئے برآمدے میں سے صحن میں کود پڑے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ بیچ کے بچو ندیا بیٹا جھانگیر تھے جن پر کوئی پانی اچھال رہا تھا اور کوئی مٹی پھینک رہا تھا۔ ایک طرف سے کسی نے اُن کی ٹانگ پکڑ کر ایسا گھسیٹا کہ یہ اس تن و توش وہ زمین بلکہ پانی ناپنے لگے۔ ان لوگوں کا بارش میں اس طرح کود پڑنا گویا ایک سگنل تھا جس کے بعد ہر شخص نے کسی نہ کسی کی دستگیری فرماتے ہوئے اُس کو پانی میں ڈھکیل دیا۔ حضورِ عالم اور میں اس عجیب منظر کو پوری طرح دیکھ ہی نہ پائے تھے کہ قریب کے کمروں سے زین العباد، مرزا اختر حسین، حبیب بخش پھونکا برآمد بھی ہوئے اور ہم دونوں کو پانی میں پہونچا بھی دیا۔ جن لوگوں نے بھاگنے کی کوشش کی یا کمروں میں بند ہو گئے اُن کے ساتھ "پا بدستِ دگرے دست بہ دست دگرے" والا عمل ہوا اور اُن کو پانی میں خوب خوب غوطے دیئے گئے۔ ایک گھنٹہ سے زیادہ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا اور مڈ رائٹ بخیر و خوبی ختم ہوا۔

سرسیدایسٹ کی اس ڈنگ میں ان دنوں ننھے خاں بیرر متعین تھے۔ اس وقت ننھے خاں کی صورت آنکھوں میں پھر گئی۔ ۱۹۱۳ء میں اونکی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ پیرانہ سالی کے باوجود سینہ تان کر یوں چلتے تھے جیسے کڑی کمان کا تیر۔ دُبلا پتلا جسم، لمبے لمبے ہاتھ پاؤں کوئی پونے چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، کھلا گندمی رنگ، مونچھوں کی لبیں کٹی نہیں بلکہ منڈی ہوئی اور شرعی تل چکی ڈاڑھی، سر پر تو گھٹا ہوا یا بہت چھوٹے چھوٹے کھچڑی بال جن کے اوپر تن زیب کی ایک دوپلی ٹوپی رکھی جس میں خاصے یا نینوں کی سجاف لگی ہوئی، ململ کا کرتا اور ڈھیلا ڈھیلا چوڑی دار پاجامہ، ہمیشہ پہنے رہا کرتے تھے۔ شہر کو جاتے تو کبھی سفید اور کبھی کسی اور رنگ کی شیروانی پہنتے تھے۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو ننھے خاں کے پیر میں ہر مہینہ ایک نیا جوتہ نظر آتا۔ کبھی ڈاسن کا ولایتی جوتہ تو کبھی کانپوری بروگ شو، کبھی آگرے کا پمپ تو کبھی فلکس کا فل سلیپر، کسی زمانہ میں دلی کی سلیم شاہی جوتی تو کبھی لدھوڑے خاں کا دیا ہوا سچے کام کا پوٹھواری جوتہ، حد یہ تھی کہ میں نے انہیں ٹینس شو اور بغیر تسموں کا کرکٹ بوٹ تک پہنے دیکھا۔ لوگوں سے سنا تھا کہ ننھے خاں بہت قدیم ملازم ہیں۔ جتنے دن وہ ہماری سائیڈ میں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ہم اُن کی سائیڈ میں رہے، ان کا طرزِ عمل ہم فرسٹ ایر والوں کے ساتھ کچھ ایسا تھا کہ اُس کو الفاظ کا جامہ پہنانا بھی مشکل ہے۔ وہ گستاخ نہیں تھے، عدول حکمی نہیں کرتے تھے اور غیر حاضر بھی نہیں ہوتے تھے لیکن اُن میں متانت اور سنجیدگی اس غضب کی تھی کہ ہم لوگ

---

لہ سرفراز خاں صاحب کے چھوٹے بھائی چھوٹے ہونے کی وجہ سے دس سیر کم یعنی دو من سے کچھ اُوپر ہوں گے۔ ڈکشنری پر طبلہ بہت ہی عمدہ بجاتے تھے ۔ علی گڑھ کے مایۂ ناز ہاکی کے لیفٹ اِن پلیئر ۔ اسد کے چھوٹے بھائی رائٹ آؤٹ ہاکی پلیئر ۔ آغا مرزا گول کیپر تھے اور عمر بھر یعنی کم از کم بارہ سال ہاکی کے گول کیپر رہے، کپتان ہوئے، ڈپٹی کلکٹر اور سٹمنٹ کمشنر ہو کر ریٹائرڈ ہوئے۔ اپنے وطن بریلی میں دو سال قبل اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ ہاکی فرسٹ الیون میں اسد کا سیدھا بازو، رائٹ اِن کھیلتے تھے۔ فرنٹیر پراونس کے رہنے والے تھے سنا ہے پاکستان گورنمنٹ میں ٹرانسپورٹ کے وزیر ہو کر ریٹائر ہوئے ۔ سلطنت مغلیہ کے حکمرانوں کے مشیم و چراغ اُن کے مورث شہزادہ برجیس قدر دہلی سے لکھنؤ آ کر بس گئے تھے۔ بات کرتے ہوئے ہکلاتے تھے مگر گاتے وقت بالکل نہیں۔ شاہی خاندان سے متعلق تھے اس لئے گانے ناچنے میں اپنے والد سے سبقت لے گئے تھے۔ فنی واقفیت بڑے سے بڑے گویئے سے بڑھ کر تھی مگر کوئی شخص اُن کا گانا سننے کو تیار نہ ہوتا تھا کیونکہ آواز انتہائی کریہہ تھی اور گلے میں نہ لوچ تھا اور نہ تاثیر۔ سنا ہے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے۔ سنا ہے وہ بھی جنت کو سدھارے ۔ آگرہ کے رہنے والے نہایت ممتاز کرکٹ پلیئر اور ٹیم کے وائس کپتان۔ محکمۂ جنگلات میں بہت اونچے عہدے پر تھے ۔ مغل بادشاہوں کی اولاد میں سے جو بنارس میں قیام پذیر ہو گئی تھی۔ سینیر فوڈ مانیٹر ہوئے سنا تھا کہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں رجسٹرار ہو گئے تھے۔ دوست نواز اور بڑی محبت والے ۔ کرکٹ پلیئر پھونکا نام رکھ دیا گیا تھا۔ نواب صاحب بھوپال ساتھ لے گئے اور وہیں ملازمت کی۔

مرعوب ہوجاتے تھے۔ اُن کا رکھ رکھاؤ، اُن کی بُردباری، اُن کی کم سخنی، اُن کا رعب داب اور دُوسرے ملازموں کے دلوں میں اُن کی وقعت اور عزت ننھے خاں کی ایسی خصوصیات تھیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ سرسید کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں۔ غالباً بلکہ یقیناً وہ خود بھی ان چیزوں کو سمجھتے اور کبھی کبھی اُن سے فائدہ بھی اٹھا لیتے تھے۔

مُڈرائٹ کے بعد کپڑے بدل کر حضورِ عالم اور میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ننھے خاں باہر سے آئے اور بیک رُوم میں چلے گئے۔ پانچ منٹ بعد واپس ہوئے ہمارے بھیگے ہوئے کپڑے اُن کے ہاتھ میں تھے۔ باہر جاتے ہوئے ایک سیکنڈ کے لئے ٹھہر کر فرمایا "قاعدہ ہے کہ پہلے مڈرائٹ کے کپڑے جو بھیگتے ہیں ہمارے ہوتے ہیں، اس لئے میں یہ کپڑے لئے جاتا ہوں۔ اُن کا فقرہ سُن کر حضورِ عالم اور میں ایک دُوسرے کی صورت دیکھنے لگے جب تک ہم سمجھیں کہ اُن کے کہنے کا کیا مطلب ہے ننھے خاں کمرے سے باہر جا چکے تھے ہم لوگ ننھے خاں کو نہ جھوٹا سمجھ سکتے تھے نہ سچا۔ کبھی خیال ہوتا کہ انہوں نے سچ کہا ہوگا۔ پہلے مڈرائٹ کے بھیگے ہوئے کپڑے واقعی بیرے لوگوں کو ہی ملا کرتے ہوں گے اور کبھی سوچا کہ ننھے خاں ایکٹوٹی (ACTIVITY) کر گئے۔ ایسا بھی کیا کہ بیرے کپڑے ہی لے جائیں۔ آخر دل کو یوں سمجھا لیا کہ انہوں نے کوئی درخواست تو کی ہی نہ تھی جو نامنظور کر دی جاتی، وہ تو استحقاقاً کپڑے اٹھا کر چل دیئے۔ یہی مہربانی کیا کم تھی کہ انہوں نے ہم کو قاعدہ بتا دیا، اگر اتنا بھی نہ بتاتے تو ہم ان کا کیا بگاڑ لیتے۔ بہرحال ہم دونوں نے یہی تصفیہ کیا کہ اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہ کریں اور اپنے کو شماتت ہمسایہ سے بچا لیں۔

خیال فرمائیے کہ جس زمانے میں ننھے خاں جیسے بیرے کام کرتے ہوں، اُس زمانہ میں طالب علم کیسے ہوتے ہوں گے۔

اب سنئے جون ۱۹۱۵ء کا واقعہ۔ فرسٹ ایر اور تھرڈ ایر کے داخلے ختم ہوتے ہی بورڈنگ کی وہی زندگی شروع ہوئی جس کا ایک ورق تو آپ ملاحظہ فرما چکے۔ دوسرے ورق پر ایک مرض اور اس کا علاج درج ہے جس کی نظیر کہیں مل سکتی ہو تو بتائیے۔

پکی بارک کے کمرہ نمبر ۵۴ میں جو تین طالب علم جمع ہوئے اُن میں سب سے سینئر ایک تھرڈ ایر کے طالب علم تھے۔ نام کی مناسبت سے حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کا وہ سرکاری خطاب یاد آجاتا ہے جو انہوں نے واپس کیا اور جس کے بعد قوم نے اُن کو مسیح الملک بنا دیا تھا۔ گفتگو، وضع قطع اور نشست و برخاست میں کچھ لکھنوئیت پائی جاتی تھی۔ حالانکہ دل اور لکھنؤ سے اُن کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا، آڑو، لیچی، خوبانی، سردلی اور بالخصوص پونڈا ہی ایسی چیزیں ہیں جو اُن کے وطن کا اتہ پتہ دیتی ہیں غرضکہ یہ صاحب تو تھے تھرڈ ایر میں اور میں تھا سیکنڈ ایر میں۔ داخلے کے وقت انہوں نے بہت کوشش اور پیروی کر کے ——— اپنے ہم وطن اور شاید کچھ لگے تگے والے کو اپنے کمرے میں لے لیا جو کالجیٹ اسکول ہی سے میٹرک پاس کر کے آیا تھا۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ایسے طالب علم جو یہیں کے سکول سے پاس ہو کر کالج میں آتے تھے۔ باہر سے آنے والوں کے مقابلہ میں زیادہ امپارٹنٹ (Important) زیادہ پُرمذاق اور بطورِ خاص ممتاز خیال کئے جاتے تھے۔ کبھی کبھی یہ چیز اس وجہ سے نبھ جاتی کہ بڑا بھائی یا کوئی اور عزیز کالج میں موجود ہوتا اور کچھ لوگوں سے پہلے ہی جان پہچان ہو جاتی۔ لیکن ہر چیز اپنے حدود ہی میں رہ کر اچھی معلوم ہوتی ہے۔ تجاوز کرتے ہی مصیبت شروع ہو جاتی ہے۔ اب سنئے کہ کمرہ نمبر ۵۴ ایس ایس ویسٹ میں کیا ہوا۔

جن لوگوں کا اوپر ذکر آچکا ہے اُن کا نام صاف تو نہیں بتاؤں گا یوں سمجھ لیجئے کہ اُن کا نام لفظ "طاہر" کا افضل التفضیل تھا جس کے شروع میں خواجہ اور آخر میں حسن "لگا لیجئے۔ رہنے والے وہ بھی سینئر صاحب ہی کے وطن کے تھے اور سُنا ہے کہ آئندہ زندگی میں انہوں نے پونڈے یعنی شکر ہی کا کاروبار بھی کیا۔ بہرحال کی خاطر میں اس گفتگو میں اُن کو خواجہ کے نام سے یاد کروں گا۔ خواجہ صاحب پڑھنے لکھنے کے معاملے میں خاصے ذہین اور طباع تھے۔ ساتھ ہی تیز و طرار بھی واقع ہوئے تھے۔ لیکن ایک مصیبت یہ تھی کہ اُن پر اگر کسی شخص کی نگاہ پڑ جائے تو اُس نگاہ کا ٹھہر جانا بھی یقینی تھا۔ پندرہ سولہ برس کا سن، نہایت موزوں قد، سڈول جسم گورا رنگ، صراحی دار گردن، کتابی نقشہ، پتلے پتلے ہونٹ ستواں ناک، بھرے ہوئے رخسار، کشادہ ابرو، اور اونچی سی پیشانی۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ میں نے آنکھوں کا ذکر نہیں کیا بس یہیں مار کھا گئے تھے۔ اتنے اچھے اور دیدہ زیب چہرے پر آنکھ چھوٹی رہ گئی تھی۔ بُری تو ضرور معلوم ہوتی تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ اڑوس پڑوس اور سائیڈ والے آتے جاتے کھنکارتے

نہ ہوں اور موقع ملنے پر فقرہ چُست نہ کر دیتے ہوں۔ خواجہ صاحب کو فقرہ چُست کرنا اور کھنکارنا نہایت ناگوار گزرتا اور وہ خیال کرتے کہ کالجیٹ اسکول سے آنے والے طالب علم کی اس سے بڑھ کر اور کیا توہین ہو سکتی ہے کہ اس کو بنایا جائے۔ چنانچہ ہمت کر کے کبھی فقرہ کا جواب دیتے اور کبھی فقرہ چُست کرنے میں خود سبقت فرماتے۔ یہی سبقت اُن کے لئے بلائے بے درماں ثابت ہوئی اور اُس نے وہ رنگ دکھایا کہ توبہ ہی بھلی مجھے بورڈنگ میں رہتے ایک ہی سال گزرا تھا لہٰذا فقرہ اور پھبتیوں وغیرہ کے معاملے میں بھلا اُن کی کیا مدد کرتا۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مجھے خود اپنی فکر پڑی رہتی اور میں جہاں تک ہو سکتا ہر ایسے موقع کو بچاتا ہی رہتا۔ البتہ ہمارے سینیئر صاحب ہمیشہ خواجہ کی دستگیری فرماتے۔ چارپائی الٹی جانے کا اندیشہ ہوا تو اُنہوں نے رکھوالی کی خاطر رات رات بھر آنکھوں میں گزاری اور مجھے بھی نہیں سونے دیا۔ ٹھنڈی فاختہ اُڑنے کا اندیشہ ہوا تو ساری ساری رات کرسی یا پلنگ پر بیٹھ کر حقہ پیا جس کے تیز خمیرہ کی خوشبو مجھ حقہ نہ پینے والے کی نیند کافور کر دینے کے لئے کافی تھی۔ ہمیشہ خواجہ کو اپنے ساتھ رکھا اور اپنے رعب اور اثر سے جہاں تک ہو سکا فقرے اور پھبتیوں کا موقع نہ آنے دیا۔ اُن کا رعب اور اثر یہ تھا کہ تھے تو وہ تھرڈ ایر میں مگر دو سال ایف اے میں فیل ہوئے تھے اور ۱۹۱۰ء اور ۱۱ء کا "آئینے"[1] والا پُرآشوب زمانہ دیکھے اور بھگتے ہوئے تھے۔ بقول شخصے اتنی مشکلیں پڑی تھیں کہ آسان ہو گئی تھیں۔ نک سُک سے بہت درست تھے اور خواجہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوش قسمت واقع ہوئے تھے۔ اس لئے کہ آنکھ نہ صرف یہ کہ چھوٹی تھی بلکہ اُس میں بادام اور نرگس والی سب باتیں موجود تھیں۔ پہلی بارک میں مدت سے رہتے تھے اور تھرڈ ایر میں آنے کے بعد سیکنڈ سینیئر فوڈ مانیٹر اور رائڈنگ کپتان بنا دیئے گئے تھے۔ اب بتایئے کہ جب وہ اتنے امپارٹنٹ آدمی ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ جو "جانور" اُن کی نگرانی میں ہو اس کو آنکھ اٹھا کر بھی کوئی دیکھ سکے۔ لیکن ہوا یہ کہ حفاظت اور بچاؤ کی تدبیروں میں جس قدر شدت اور زیادتی ہوتی گئی دوسری طرف ایکٹوٹی کرنے کا جذبہ اسی قدر ترقی کرتا چلا گیا۔ ہر کوشش جو ناکام ہوئی ایک نئی صورت میں نمودار ہوتی گئی مگر خواجہ کے گارجین سب کا کاٹ کرتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پڑوسی تک دشمنوں سے جا ملے۔ پکی اور کچی بارک کے جتنے چوٹی کے بانی کار تھے اُن سب نے ایک مکمل اور منظم سازش کی اور کامران[2] بخت، بشیر حیدر[3]، صوفی احمد بخش[4]، اشفاق علی[5]، معین[6]، رفیع قدوائی[7]، جہانگیر قدر[8] لدھوڑے خاں[9]، اُستاد وزیر[10]، آغا مرزا[11] نے سر سید ویسٹ کے رہنے والے ظہیر بلگرامی[12]، صغیر عباسی[13]، جعفر کاظمی[14]، قیوم خاں نمازی[15]، چھوٹے خاں[16] اور فجی[17] کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اندر ہی اندر یہ مواد پکتا رہا اور کچھ اس ڈھب اور سلیقہ سے تیاریاں کی گئیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ خواجہ پر فقرے بازی کم ہو گئی۔ اُن کے گارجین کو بھی مغالطہ ہوا کہ اُن کا رعب گھٹ گیا اور لوگ ڈر گئے۔ لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ سکوت ہمیشہ طوفان کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ کسی کا مصرع ہے۔ ؎ 'بارش کی علامت ہے جو ہوتی ہے ہوا بند'

---

[1] ۱۹۱۰ء میں صدیق حسن بدایونی وائس پریسیڈنٹ یونین سوسائٹی اور فاروق دیوانہ نے ایک اردو پرچہ نکالا تھا جس میں حسینوں اور حُسن پرستوں کے کچے چٹھے چھپتے اور ان کو خطابات دیئے جاتے تھے۔ [2] مغلیہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ فیل ہونے میں ماہر تھے۔ کپڑے سے زیادہ جوتہ کے شوقین تھے۔ بیالیس، تینتالیس جوڑے دیوار میں ٹنگے رہتے تھے۔ [3] کالے بھجنگ، اکڑو خاں تحصیلدار ہو گئے تھے۔ [4] امرتسر کے رہنے والے۔ چارپائی الٹنے میں مشاق۔ [5] پٹیالی والے کرکٹ کپتان۔ مولانا شوکت علی کے سکریٹری ہوئے، بھوپال چلے گئے تھے۔ سنا ہے پاکستان میں ہیں۔ [6] ہمیشہ ہاکی کی سیکنڈ الیون میں رہے مگر اکسٹرا۔ گاتے اور ڈھولک بجاتے تھے۔ حیدرآباد کی فوج میں بریگیڈیر ہو کر ریٹائر ہوئے بریلی کے تھے مگر حیدرآباد میں بس گئے۔ [7] اُن کو کالج میں تو بہت ہی کم لوگ جانتے تھے۔ صرف الیکشن لڑاتے اور شطرنج کھیلتے تھے مگر عملی زندگی میں پہونچ کر ہندوستان کے مایۂ ناز مسلمان لیڈر اور فوڈ منسٹر ہوئے۔ [8] ان کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ [9] اسحٰق خان نام تھا۔ ہمیشہ ٹرکش کوٹ اور ڈھیلی شلوار پہنتے تھے خود بھی بھاری اور آواز بھی بھاری۔ لدھوڑی استر جوتے کی مناسبت سے لدھوڑے خاں نام رکھ دیا گیا تھا۔ [10] سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے تھے۔ کرکٹ فرسٹ الیون کے بہت اچھے بولر اور وائس کپتان، گھڑا بہت ہی عمدہ بجاتے تھے۔ [11] پہلے ذکر آچکا ہے۔ [12] قد چھوٹا مونچھیں بڑی، اپنے کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ [13] کرنجی آنکھیں۔ قدرے ہکلاتے تھے۔ ظہیر کے رُوم فیلو تھے۔ نواب صاحب چھتاری کے یہاں تھے، ان کے ساتھ حیدرآباد بھی گئے۔ [14] سیدھے سادھے، فٹ بال پلیر۔ [15] لانبا قد، گورا رنگ بڑے بال، فٹ بال، فرسٹ الیون کے حیدرآبادی کھلاڑی۔ حیدرآباد میں اونچے عہدہ پر رہے۔ پاکستان چلے گئے۔ [16] شاہجہاں پور کے رہنے والے، بڑے خاں کے چھوٹے بھائی، فضل الرحمٰن خاں نام، ہاکی پلیر، بہت کامیاب وکیل خان بہادر اور میونسپلٹی کے چیرمین ہوئے۔ [17] فضل الرحمٰن نام، فجی تخلص، لکھنؤ کے قرب و جوار کے رہنے والے چھوٹی سی داڑھی، اچھے شاعر تھے۔

ڈائننگ ہال میں انگلش ڈنر ہونے والا تھا۔ ہمارے سینیر صاحب چونکہ فوڈ مانیٹر تھے اس وجہ سے انہوں نے میرے اور خواجہ کے لئے دو ٹکٹ خرید لئے تھے انگلش ڈنر ہمیشہ نو بجے سے ہوا کرتا اور اُن لوگوں کو جو ڈنر میں شرکت نہیں کر رہے ہوتے پہلے کھانا کھلا دیا جاتا چنانچہ گھنٹی بجی اور ڈنر میں شریک نہ ہونے والے کھانے کی میزوں پر پہونچ گئے۔ خواجہ اور میں برآمدے کے سامنے کھلے میدان میں پلنگ پر لیٹے گپ لڑا رہے تھے۔ ڈائننگ ہال ختم ہونے کے بعد سب لوگ یا تو کمروں میں یا باہر چارپائیوں پر لیٹے اور بیٹھے تھے۔ ایک دم سلام علیکم کی آوازیں آنے لگیں اور لوگوں کی نظریں مسجد کی سمت اُٹھ گئیں۔ میں نے بھی مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس طرف سے ایک مجمع چلا آرہا ہے۔ خواجہ بھی اس طرف دیکھنے لگے۔ لیکن ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا کہ معاملہ کیا ہے۔ کمروں کے سامنے برآمدے میں خداداد[1] خاں، سرتاج عالم[2]، عبدالرشید[3] اور رؤف پاشا[4] کھڑے تھے۔ رؤف پاشا کہنے لگے "ابنِ علی صاحب ہوشیار ہو جائیے" میں نے جواب دیا "میرے مقابلے میں آپ کا ہوشیار ہونا زیادہ ضروری ہے" فقرہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ آناً فاناً مجمع نے مجھے اور خواجہ کو گھیر لیا۔ ایک طرف اشفاق[5] علی نظر آئے جن کے ساتھ ایک صاحب مشجر کی شیروانی پہنے عمامہ باندھے۔ پھولوں کا سہرا لٹکائے کھڑے تھے۔ پیر میں سچے کام کا دلی کا جوتہ تھا اور ہاتھ میں سُرخ رنگ کا ریشمی رومال۔ اشفاق علی کے بازو میں بشیر حیدر بھی شیروانی پہنے، عمامہ باندھے، بانس کی چھڑی ہاتھ میں لئے موجود تھے۔ تماشائیوں کا ہجوم ایک سو سے کم نہ تھا۔ آتے ہی کسی نے کہا "نیک کام میں دیر کرنے کی ضرورت نہیں اشفاق علی نے بشیر حیدر کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "بندہ زادہ عبدالجلیل خاں حاضر ہے۔ اس کو اپنی فرزندی میں قبول فرمائیے" بشیر کہنے لگے، "مجھے کوئی انکار نہیں، بسم اللہ کیجئے" اس پر ایک

---

[1] فٹ بال فرسٹ الیون کے بہترین فل بیک، سوا چھ فٹ اونچے، فرنٹیر کے رہنے والے۔ [2] سرتاج حسیناں مشہور تھے۔ بڑی آنکھیں سانولا رنگ، حیدرآباد پولس میں سپرنٹنڈنٹ ہو گئے تھے، مٹاپے کے باوجود ریٹائر ہوتے وقت اداؤں کی دلکشی اور عادات میں کوئی فرق نہ تھا۔ لاہور ہی میں ہوں گے۔ [3] عبدالرشید، سعیدالزماں اور عنایت خاں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ سرتاج سانولے مگر یہ گورے تھے پشاور کے تھے، وہیں ہوں گے [4] مدراس کے رہنے والے، سب سے کم عمر تھے۔ چھوٹا

لحیم شحیم پونے چھ فٹ کے کوئی صاحب بڑا سا پگڑ باندھے، لمبی سفید ڈاڑھی لٹکائے آگے بڑھے جن کو پہلے تو میں پہچان نہ سکا لیکن آواز سُن کر پتہ چلا کہ وہ توقیر مرزا[6] تھے۔ جب انہوں نے آمنت باللہ شروع کی تو خواجہ صاحب جو اس وقت تک کافی گھبرا گئے تھے۔ بھیڑ کو چیرتے ہوئے برآمدے میں سے ہو کر کمرے کی طرف جانے لگے۔ خیرات[7] علی بابا نے فرمایا "دلہن شرمیلی ہے۔ گوشہ پسند کرتی ہے، چلئے اندر چلیں" چنانچہ سب لوگ کمرے کی طرف ٹوٹ پڑے۔ چونکہ پہلے سے سب انتظامات مکمل کر لئے گئے تھے اس وجہ سے فرش فروش، قالین، گاؤ تکئے، کرسیاں وغیرہ سب دم بھر میں سجا دی گئیں اور دلہن کے پڑوس والوں نے جو بمنزلہ میکے والوں کے تھے۔ باراتیوں کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ سوڈا، لیمنڈ، آرنج، راسپ بیری، جنجر، آئس کریم وغیرہ وغیرہ تقسیم ہونا شروع ہو گیا۔ ایوب احمد[8] آثم، فجی[9] اور دوسرے شعراء نے خوب خوب دادِ سخن دی۔ شاید اقبال سہیل کا کہا ہوا سہرا بھی کسی نے پڑھا۔ اُدھر صحن میں آتشبازی شروع ہو گئی۔ پھل جھڑیاں پٹاخے، مہتابیاں، طریاں، بچھو انار

---

ساقد، سانولا سلونا رنگ، قیوم کے ساتھ رہتے تھے، سنا تھا کہ بہت بڑے ایجوکیشنسٹ ہوئے اور داڑھی بھی رکھ لی تھی [5] اُن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ [6] دہلی کے رہنے والے، کرکٹ پلیر، داڑھی رکھتے تھے حیدرآباد میں منصف ہو گئے تھے [7] حیدرآباد میں تھے۔ اسکول کی ابتدائی جماعت میں شریک ہو کر ظہور وارڈ میں رہے۔ کالج پہونچے کوئی درجہ دوسری یا تیسری کوشش سے پہلے پاس نہیں کیا۔ بڑی مصیبت سے علی گڑھ چھوڑا، کرکٹ کھیلتے تھے۔ سب سے پہلے فلالین کا پتلون اور کرکٹ بوٹ پہن کر ماریجر سے پہلے گراؤنڈ پر پہونچ جاتے تھے مگر ساری عمر نہ کسی ٹیم میں آسکے نہ کلر ملا۔ حیدرآباد واپس پہونچ کر محکمہ امورِ مذہبی میں ملازم ہو گئے تھے۔ [8] سہارنپور کے رہنے والے، شاعر تھے لہٰذا حسن پرست تھے چونکہ داڑھی تھی اس وجہ سے کالج میں اپنے کو بہت چھپائے رکھا۔ وکالت پاس کر کے سہارنپور لوٹے تو کھلم کھلا رندِ شاہد باز بن گئے۔ بہت دلچسپ آدمی تھے [9] اُن کا ذکر بھی پہلے آچکا ہے۔ [10] پروفیسر رنیل ہسٹری کے پروفیسر تھے بہت قابل اور لائق مگر سخت مزاج تھے۔ ڈائننگ ہال کے پریسیڈنٹ تھے ایک مرتبہ کھانے کے وقت ڈائننگ ہال میں موجود تھے۔ اُن کے قریب کی میز پر کسی نے روٹی مانگنے کے لئے بہت زور زور سے اور دیر تک ٹیبل پر ہاتھ

شیرینی، چرخ، غرضکہ ہر قسم کی آتشبازی چھوٹنے لگی۔ ایک طرف سے تو کچھ گنجنین، چکیاں اور ہوائیاں بھی اڑائی گئیں۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ ڈائننگ ہال کی طرف سے کچھ لوگ آتے ہوئے نظر آئے جن کے آگے آگے گارجین فوڈ مانیجر اور پروفیسر رنیل تھے۔ رنیل کو دیکھ کر مجمع کالی کی طرح پھٹ گیا۔ انہوں نے ناراضی کے ساتھ کرخت لہجے میں کہا "سب لوگ کمرے سے باہر ہو جاؤ"۔ جو لڑکا رنیل کے قریب کھڑا تھا اس سے انہوں نے دریافت کیا کہ یہ لوگ کیوں جمع ہیں۔ وہ تو جلدی میں کچھ نہ کہہ سکا۔ البتہ جلدی اور بدحواسی میں گارجین بول اٹھے کہ میرے رُوم فیلو کی شادی ہو رہی ہے"۔ رنیل اُن کی صورت دیکھنے لگا۔ حیران ہو کر اُس نے پوچھا "کیا مطلب کیسی شادی" ساری حذاقت ختم ہو گئی۔ جواب نہ دے پائے یہی کہہ کر جان چھڑائی کہ "یہ لوگ میرے رُوم فیلو کو ستا رہے ہیں"۔ دو چار منٹ بعد رنیل واپس ہو گیا لیکن ان بزرگ کی یہ حرکت کہ رنیل کو موقع پر نے آئے بہت ناپسند کی گئی اور کچھ عرصہ کے بعد جب وہ یونین سوسائٹی کی سکریٹری شپ کے لئے کھڑے ہو گئے تو ناکامی کی صورت میں اُن کو سزا بھی مل گئی۔ البتہ ایک عرصہ بعد اُن کی خطا معاف ہوئی اور وہ سکریٹری بن سکے۔

رنیل غریب کو کسی نے نہ بتایا کہ کالج میں جب کوئی طالب علم ایسا آجائے جسے کسی قسم کا مغالطہ ہو تو اولاً چھوٹے موٹے علاج کر کے اس کو درست کیا جاتا ہے لیکن اگر یہ نسخے کارگر نہ ہوں تو قطعی اور مجرب علاج یہ ہے کہ شادی کر دی جاتی ہے جس سے اس کا دماغ بالکل ٹھیک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ خواجہ کی عقل بھی ٹھکانے آ گئی۔ اُن کے ڈنک گر گئے اور ساری اکڑفوں خاک میں مل گئی۔

کیا آپ کو یقین آیا کہ اس عجیب بیماری کا علاج کس قدر عجیب تر تھا۔

---

مارے۔ رنیل نے اس کو ڈائننگ ہال سے نکال دیا۔ اُس زمانے کے لوگوں کو یاد ہو گا کہ یوسف قمرالدین بدایونی اور رفیع احمد قدوائی وغیرہ نے اسٹرائک کرادی اور لڑکے اس وقت تک ڈائننگ ہال میں نہ گئے۔ جب تک رنیل نے معافی نہ مانگ لی۔


خصوصی رعایت

آج کل کے سالانہ چندے میں رعایت سے فائدہ اُٹھائیے

۲ سال کے لئے ۱۲ روپے یا ۱۸ شلنگ یا ۲٫۷۵ ڈالر

۳ سال کے لئے ۱۷ روپے یا ۲۵ شلنگ ۶ پنس یا ۳٫۵۰ ڈالر


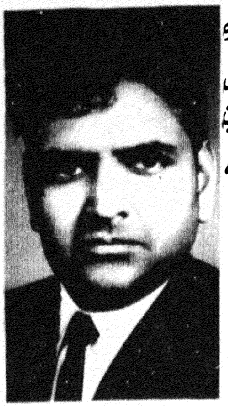

# آواز

میں ایک دریا تھا۔ بے حد تیز رو، بیباک آوارہ
کہیں میری سطح جیسے کوئی شفاف سا درپن
کہیں میری جبیں پر نکہت افشاں کتنے چندن بن
کہیں کھیتوں میں، میں بچھلے ہوئے سونے کا فوارہ

مری موجیں رہی ہیں مختلف جلووں کا گہوارہ
مری باہنوں میں مچلا ہے ہر اک تہذیب کا بچپن
گلے مل مل کے کھیلا ہے مری موجوں پہ بن بندھن
شوالوں کے کلس سے مسجدوں کا سبز مینارہ

مگر اس عہد لونے مجھ کو دو اطراف میں موڑا
نہ جانے کیوں مری موجوں کے نازک جسم کو توڑا
اُدھر اک باندھ باندھا، اسطرف دیوار اٹھوائی

# ناشنیدہ

ملی اس کو بھی تنہائی، ملی مجھ کو بھی تنہائی
کلس میرے لئے چھوڑے، وہ میناروں کا شیدائی
اب ان حالات میں جو کچھ نہ ہو جائے وہی تھوڑا

کیلاہ کے وہ کیا بن سکا، کیا بن سکوں گا میں
کہ اس کے بعد بربادی کا ہر سامان آگے ہے
نہ جانے کس پہ کیا گذرے کہ اک طوفان آگے ہے
بہت ممکن ہے کھو جائے اکیلا وہ، اکیلا میں

بغیر اختلاطِ دل ادھورا وہ، ادھورا میں
کٹھن ہے راہ، لٹ جانے کا ہر امکان آگے ہے
سلگتی جا رہی ہے دھوپ، ریگستان آگے ہے
وہ اک بے رنگ سی تصویر، سُونا حاشیہ سا میں

کہو اس سے کہ اب وہ توڑ ڈالے اپنے سب پہرے
ادھر میں بھی کئے دیتا ہوں اس دیوار کے ٹکڑے
ہزاروں انقلاب آئے مگر یہ سچ نہیں بدلا
کہیں پانی الگ ہوتا ہے لاٹھی مار دینے سے
کہیں تنہا رہا ہے جسم سے اس جسم کا سایہ
کہیں تشنہ دہن صحرا، سمندر خشک کر پایا!

نجیب رامش

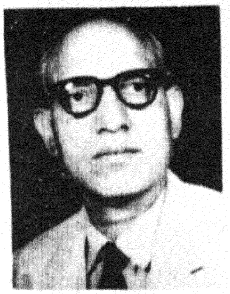

ضیاء فتح آبادی

## غزلیں

### ضیاء فتح آبادی

رہ رہ تیشہ لگا رہی ہے دھوپ
بوڑھی دیوار ڈھا رہی ہے دھوپ

نرم و نازک دلہن کوئی جیسے
چاندنی سے لجا رہی ہے دھوپ

آسماں سے اُتر کے دھرتی پر
سوئے فتنے جگا رہی ہے دھوپ

گردشِ خوں کو تیز تر کر کے
گرمیٔ دل بڑھا رہی ہے دھوپ

شب گزیدوں کو کیا خبر اس کی
آ رہی ہے کہ جا رہی ہے دھوپ

سائے سے بے نیاز و بے پروا
دشت میں گھر بنا رہی ہے دھوپ

دلِ اندھیروں سے ڈرنے لگتا ہے
گھر کے اندر تک آ رہی ہے دھوپ

کیوں نہیں پھونک دیتی پاس آ کر
دور سے کیا جلا رہی ہے دھوپ

آتشِ گل ہے اجنبی ہم سے
مدتوں آشنا رہی ہے دھوپ

نعشِ خورشید اُٹھائے کندھوں پر
چل رہی ہے، جلا رہی ہے دھوپ

سُنیئے، کوئی ضیا کی تازہ غزل
زیرِ لب گنگنا رہی ہے دھوپ

آج کل نئی دہلی

---

ٹوٹتے دیکھے ہیں پندار کے شیشے کتنے
وقت کی دھوپ نے پگھلا دیئے چہرے کتنے

صرف اک چہرے کو مہتاب بنانے کیلئے
کس کو معلوم بجھائے گئے تارے کتنے

ہم ہی دیوانے تھے ہر حال میں چاہا اس کو
زندگی ہم سے ملی روپ بدل کے کتنے

ٹکڑے ٹکڑے نظر آتا ہے ہر اک چہرے کا عکس
راہ میں بکھرے ہیں ٹوٹے ہوئے شیشے کتنے

آج کے دور میں بدلا ہے فضاؤں نے چلن
یوں صبا آئی کہ مرجھا گئے غنچے کتنے

امن کے نہر کی ہے وقت کی شیریں طالب
دیکھنا یہ ہے کہ اب اٹھتے ہیں تیشے کتنے

کون اب پوچھے ہے کیفیتِ زخمِ پنہاں
کس کو معلوم کہ ہیں درد کے مارے کتنے

اپنی بیدار نگاہی پہ بھروسہ ہے جنہیں
آج اس بزم میں ہیں ایسے جیالے کتنے

کبھی اعزاز دلایا، کبھی رسوا بھی کیا
مہدی اس دل نے مرے نقش ابھارے کتنے

مہدی پرتاب گڈھ

---

وجہِ طولِ داستاں، رنگِ بیاں سمجھا گیا
خون کی بوندوں کو زیبِ داستاں سمجھا گیا

حسن کا دل سے جو رشتہ تھا کہاں سمجھا گیا
اک حقیقت تھی، جسے اک داستاں سمجھا گیا

میری خاموشی کو بھی میرا بیاں سمجھا گیا
میں وہاں تھا ہی کہاں مجھ کو جہاں سمجھا گیا

دل کو دل کی طرح کب دیکھا کہاں سمجھا گیا
مدتوں حدِ نظر کو آسماں سمجھا گیا

جانے کیا ہوتا، اگر ہوتا گریباں چاک چاک
کچھ نہ ہونے پر تو دامن دھجیاں سمجھا گیا

ایک نا سمجھی کو سجدے در بدر کرنا پڑے
ایک کمزوری کو زورِ آسماں سمجھا گیا

دیر و کعبہ کے دوراہے پر سنا واعظ کا وعظ
اس نے جو جانا کہا، میں نے جہاں سمجھا گیا

وہ پری بن کر اُتر آئی مرے شیشے میں آج
آسماں پر جس کو برقِ بے اماں سمجھا گیا

کی گئی زحمت بقدرِ فرصت و پندار و ظرف
مجھ کو اے فیاض کب دیکھا کہاں سمجھا گیا

فیاض گوالیاری





آج سے اکیس برس پہلے بھارت جمہوریہ بنا...
ہر طرف خوشی ..... بھاری جوش و خروش...
ترقی و خوشحالی کی طرف ایک طویل سفر کا آغاز
... یہ بات تو ہے پرانی ...
آج ... کئی مقاصد حاصل ہو گئے ہیں ...
ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے .. کل کا بھارت ہوگا
ہماری تمناؤں کا بھارت ... بھارتی لوگوں کیلئے
قابلِ فخر ....

# آج اور کل

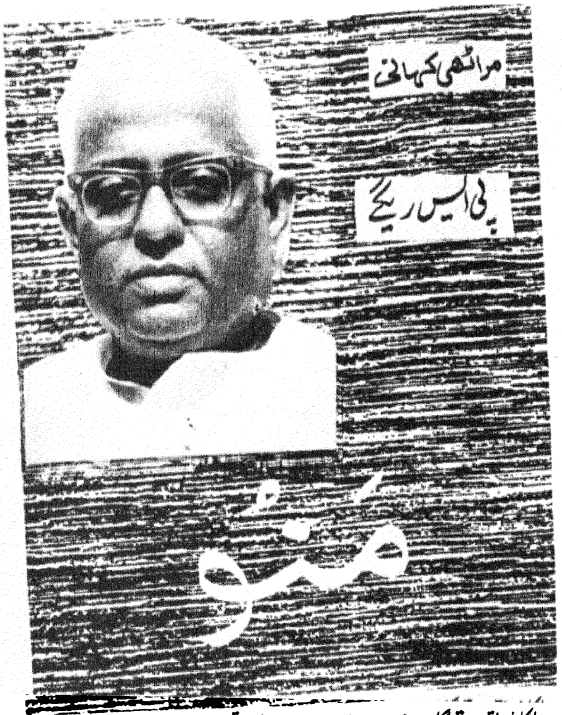
مراٹھی کہانی
پی ایس ریگے
منو

منو ـــ اس کا پورا نام ہے، منو ایلا۔ اُسے میں نے پہلی بار کہاں دیکھا، کوشش کے باوجود بھی یاد نہیں آیا۔ جب بھی کوشش کرتا ہوں کئی مناظر ایک ساتھ دماغ میں اُبھر آتے ہیں ـــ لندن کی ایک کہر آلود شام اور نیٹن ہیم کورٹ سڑک کی چہل پہل نظروں میں گھوم جاتی ہے۔ شاید وہیں نومبر دسمبر کے دنوں میں، بس کے انتظار میں کھڑی منو کو میں نے پہلی بار دیکھا ہوگا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد آتا ہے کہ موسم بہار میں صبح سویرے ہمپسٹیڈ ہیتھ پر جھیل میں تیرتے ہنسوں کی طرف ڈبل روٹی کے ٹکڑے پھینکے ہوئے کھڑی منو کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ پھر اسٹول، سینما کے پاس، ایک ہاتھ میں کتابیں سنبھالے دوسرے میں سینڈوچ کا ایک ٹکڑا لئے، کھڑی کھڑی ہی کھاتی ہوئی منو کی تصویر نظروں میں تیر جاتی ہے۔ اور محسوس ہوتا ہے کہ میں نے سب سے پہلے اسے وہیں دیکھا تھا ـــ اور تاریخ وار سچائی میری گفت میں نہیں آتی۔

وہ کہاں اور کب نظر آجائے گی۔ یہ کہا نہیں جا سکتا تھا اسی لئے اس کا کہیں بھی نظر آجانا میرے لئے خلافِ توقع یا باعثِ استعجاب نہ ہوتا۔ اور جب بھی دیکھا اُس کی ادا نرالی ہی دیکھی۔ کبھی وہ اتنی بے تعلقی سے اپنے ماحول کا جائزہ لیتی نظر آئی کہ مانو اس کے اندر کائنات کے آغاز و انجام پر غور و فکر میں مستغرق کوئی مفکر موجود ہو اور کبھی اتنے ہی الھڑپن سے اسی ماحول میں گھل مل گئی ہوتی مگر ہر حالت میں اس کا انداز اتنا فطری اور معصوم ہوتا کہ شکایت یا صفائی کی گنجائش ہی نہ رہتی مجھے محسوس ہوتا کہ ان متضاد کیفیتوں کے باوجود منو میں کوئی خاص بات ہے۔ وہ کیا ہے یہ میں بتا نہیں سکتا، مگر رہ رہ کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ بات صرف میں ہی جان سکا ہوں جب بھی وہ نظر آتی، پل بھر میں سب کچھ بھلا دینے کو جی چاہتا۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا کہ وہ پھر کبھی نظر نہیں آئے گی۔ اس کے ساتھ ایک دائمی رشتہ قائم کر لینے اور نہ لینے کی آرزوئیں ایک ساتھ میرے من میں ہچکولے لینے لگتیں۔ یہ نہیں کہ میں اس کی وجہ جان پاؤں ـــ کسی چیز کو پانے کی شدید آرزو کے ساتھ ہی اس کے نہ ملنے کا ڈر بھی شامل ہو تو اس چیز کو پا لینے اور نہ پانے کی کشمکش کا پیدا ہو جانا بالکل غیر فطری نہیں۔ مگر منو کے بارے ایسا کبھی سوچ نہیں سکا۔ شاید آج بھی ایسا نہیں کر سکوں گا۔

ابتدائی دنوں میں وہ جب بھی مجھے نظر آتی محسوس ہوتا کہ وہ مجھے بلا رہی ہے جی چاہتا کہ اس کے پاس چلا جاؤں کسی بہانے اس سے بولوں لیکن فوراً مجھے خیال آجاتا کہ میں نے ایسا کیا تو، پھر وہ کبھی دکھائی ہی نہیں دے گی۔ اور اسی خیال سے میں اتنا گھبرا جاتا کہ کچھ کرنے کی ہمت ہی نہ رہ جاتی۔ پھر بھی مجھے محسوس ہوتا کہ جو طوفان میرے دل میں بپا ہے اس کا منو کو علم ہے اور میں اس کو دیکھنے، ہنسنے، بلکہ اس کی ہر حرکت کا مطلب اپنی مرضی کے مطابق نکال لیتا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے یہ مطالب بالکل غلط تو نہ تھے گو کہ وہ محض میری قیاس آرائی کا نتیجہ تھے۔

جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی تو لگتا کہ اب وہ پھر کبھی نظر نہ آئے گی۔ من کڑا کر کے اسے بھول جانے کی کوشش کرنا۔ بھول بھی جاتا۔ مگر وہ اچانک پھر کہیں نظر آجاتی اور وہی سلسلہ پھر سے جاری ہو جاتا۔ شروع کے اُن تین چار مہینوں میں میں نے اُسے صرف آٹھ دس بار ہی دیکھا ہوگا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ کئی بار دیکھا ہے۔

یونہی ایک دفعہ، شام کو چھ بجے کے قریب میں کالج لائبریری سے گھر لوٹ رہا تھا وہ بس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اُسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اُس نے مجھے پاس بلایا۔ دو کتابیں میرے ہاتھ میں تھمائیں اور "میں ابھی آئی" کہتے ہوئے بغل والی گلی میں غالب ہو گئی۔ اور مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ پھر آئے گی، مجھ سے بولے گی، ہماری جان پہچان ہوگی۔ مجھے یوں صرف اس لئے محسوس نہیں ہوا تھا کہ اس کی کتابیں میرے ہاتھ میں تھیں۔

میں ماحول سے تو بے خبر ہو ہی چکا تھا، اس اُمید پر کہ اس کا نام پتہ معلوم ہوگا، میں نے اوپر کی کتاب کھولی ـــ منو ایلا ہارٹ من، وین ـــ تو یہ آسٹرین ہے ویانا کی ـــ منو ایلا ـــ منو ایلا ـــ اور میں نے اس نام کو فوراً ہندوستانی روپ میں ڈھال لیا۔ ـــ منو ـــ منو ویلا ـــ اتنے میں وہ آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلی تھی۔ "میں کچھ سینڈوچ لے آئی ہوں۔ چلو ہیتھ میں گھومنے چلیں۔" اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چلنے لگی ـــ

منو ــــــ منو ــــــ منو ــــــ میرا من جاپ کرنے لگا۔ بیٹھ جانے کے لئے بس کے مقابلے میں زمین دوز ریل گاڑی آرام دہ ہوتی ہے، اس کا علم تو مجھے بعد میں ہوا۔

اس کے بعد ہم اکثر ملنے لگے۔ کب اور کہاں ملنا ہے، یہ وہی طے کرتی۔ اور ایک بار طے کرتی تو ٹھیک وقت پر وہاں پہنچ جاتی۔ ان ملاقاتوں میں اکثر وہی بولا کرتی اور میں چپ چاپ بیٹھا سنا کرتا۔ اور اس کا لب ولہجہ اتنا انوکھا اور پر لطف تھا کہ جی چاہتا، انگریزی زبان کے سارے مستعمل لہجے (Accents) فراموش کر دیئے جائیں اور اسی کا اسلوب اختیار کر لیا جائے ــــــ وہ باتوں کے درمیان تالی بجا کر، پلکیں جھپکاتے ہوئے ای یا۔ ای یا (ہاں۔ ہاں) کہتی اور دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ کر ہنسنے لگ جاتی ــــــ جب وہ اس طرح بولنے لگتی تو مجھے جنوبی کنسر کی عورتوں کا لب ولہجہ یاد آجاتا۔ وہ بھی ایسی ہی ہوتی ہیں، پیاری پیاری اور معمولی جملوں میں بھی مٹھاس گھول دیتی ہیں۔

منو کے پاس موضوعات کی کمی نہ تھی، اور ہر بات میں اس کی رائے منفرد ہوتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ آسمان ایک وسیع نیلا سمندر ہے۔ اسے میرا کالا رنگ بے حد پسند تھا۔ اس کی ایک تھیوری یہ بھی تھی کہ یورپ کے باشندوں کے آبا پہلے ہندوستان میں تھے۔ پھر وہ وہاں سے یورپ چلے آئے۔ اپنی تھیوری کو ثابت کرنے کے لئے وہ دلیل پیش کرتی ــــــ جہاں قدرت نے اتنی فیاضی سے اپنے خزانے لٹائے ہوں، وہاں سب سے پہلے انسان کا پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ بالآخر، میرے ہاتھ اپنے گلے سے لگا کر بہ ظاہر یہ بتاتے ہوئے کہ اس طویل عرصہ میں وقت نے ہمارے رنگوں میں کتنی تبدیلی پیدا کر دی ہے اپنی بات ختم کر دیتی۔ جب وہ ایسی باتیں کرنے لگتی تو اس کے ساتھ بحث کرنا بے کار ہوتا، کیونکہ اگر میں ذرا بھی اختلاف کرتا یا ناپسندیدگی کا اظہار کرتا تو وہ ایک دم موضوع ہی بدل دیتی، اس سے تو یہی اچھا ہوتا کہ اس کے خیالات کی رو میں بہہ کر سب کچھ بھلا دیا جائے۔ ایسے ضبط اور صبر کا معقول پھل بھی ملتا، ہر دفعہ بالکل انوکھا اور غیر متوقع!

متعدد ملاقاتوں کے باوجود میں یہ نہ جان سکا کہ وہ کرتی کیا ہے۔ اسی سے صاف صاف پوچھنا بھی مشکل تھا۔ ایک دفعہ اس نے خود بخود کہا تھا "میں مصوری جانتی ہوں۔ اسی کے مطالعہ کے لئے انگلینڈ آئی ہوں" اور میں سوچتا، جو شخص سچ مچ مصوری کی مشق کرنا چاہتا ہے وہ پیرس اور اٹلی کے مختلف شہروں میں جائے گا انگلینڈ کیوں آئے گا؛ میرا مطلب یہ نہیں کہ اس نے یوں ہی کچھ کہہ دیا ہو مگر وہ تصورات کو واقعات میں کچھ اس طرح ملا دیتی کہ اس کی باتوں کے لفظی مطالب پر اکتفا کرنا نہ صرف مشکل تھا بلکہ کبھی کبھی تو ایسا کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔

ایک بار یوں ہی خیال آیا، ممکن ہے وہ موڈل کا کام کرتی ہو، اور میں پریشان ہو گیا۔ کیوں کہ میں نے ناولوں اور افسانوں میں فن کاروں کے موڈلس کے بارے میں کئی بری بھلی باتیں پڑھی تھیں۔ اور اس کام کے لئے منو تھی بھی بے حد موزوں۔ اس کے چہرے پر جس سادگی سے جذبات بدلتے تھے اسی سادگی سے وہ کسی بھی جذبے کو گھنٹوں اپنے چہرہ پر قائم رکھ سکتی تھی۔ دوران گفتگو، کبھی کبھی، وہ اپنا نچلا ہونٹ ذرا داہنی طرف کر کے آنکھیں پھیلا کر کتنی ہی دیر ویسی ہی رہ جاتی۔ ایک بار تو وہ اتنی دیر تک سانس روک کر ساکن رہ گئی تھی کہ میں گھبرا گیا تھا۔ ایسے بے مثال موڈ کو کون پسند نہیں کرے گا!

سات آٹھ دن بعد جب وہ ملی تو اس کے ہاتھ میں کاغذ کی ایک تھیلی تھی۔ اس نے تھیلی سے ایک تصویر نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔ لائن اینڈ واش کی جاپانی مصوری کے ڈھنگ کی ایک سیدھی سادی تصویر۔ جس میں ایک سفید مور، پر پھیلائے، دایاں پاؤں اٹھائے محوِ رقص تھا۔ یہ تو بس اس تصویر کی بہت خشک تشریح ہو گی۔ دراصل وہ تصویر اتنی حسین تھی کہ محسوس ہوتا کہ وہ مور ابھی اپنا اوپر اٹھا پاؤں نیچے رکھ، دوسرا اٹھا کر سچ مچ ہی ناچنے لگ جائے گا۔ دیر تک میں تصویر کو دیکھتا رہا۔ پھر جو نہیں کرنا چاہیئے تھا ــــــ منو کے ساتھ کبھی نہیں کرنا چاہیئے تھا ــــــ وہی میں نے کیا۔ میں نے پوچھا۔

"یہ تصویر تم نے بنائی ہے؟"

اس نے ہولے سے تصویر میرے ہاتھ سے لی اور پھاڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اس وقت اس کا چہرہ جذبات سے بالکل عاری تھا۔ تب اگر وہ ناراض ہو جاتی، طیش میں آکر مجھے ذلیل کر دیتی تو مجھے اچھا لگتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

اس کے بعد وہ مجھے پھر کبھی نہیں دکھائی دی۔

افسانہ ہی لکھنا مقصود ہوتا تو اسے یہاں ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن حقیقی زندگی کی باتیں اس طرح ختم نہیں ہو جاتیں۔ ایک سے دوسری بات پیدا ہوتی ہے۔ بالکل بانس کی طرح اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اصل کہانی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے۔ ہیتھ کی دوب پر لیٹے لیٹے منو نے ایک بار مجھ سے کہا تھا، "سبھی باتیں ایک ہی وقت ہوتی رہتی ہیں" میں حالاں کہ فلسفہ کا طالب علم تھا پھر بھی اس جملہ کا مطلب فوراً نہیں سمجھ سکا تھا۔ خود اس کے الفاظ میں اس کا مطلب یوں تھا، میں بولتی ہوں اور ہوا میں لہریں اٹھتی ہیں۔ وہ کہاں جاتی ہیں؛ اِدھر اُدھر۔

کچھ اٹک جاتی ہیں، کچھ ٹھٹک جاتی ہیں۔ لیکن کوئی ضائع نہیں ہوتی کیونکہ فطرت کا اصول تحفظ ہے۔ مٹانا نہیں اور سبھی لہریں ہوا میں ایک ساتھ تیرتی رہتی ہیں، ہر وقت جو سننا چاہتا ہے اسے سنائی دیتی ہیں۔ بولتے بولتے وہ اتنی سنجیدہ ہوگئی کہ مانو کائنات کی ان تمام لہروں کو سن رہی ہو۔

"تمہیں اس وقت کیا سنائی دے رہا ہے؟" میں نے بہت دھیرے سے پوچھا (اس کی بے خودی کا خیال رکھتے ہوئے۔)

اس نے فوراً جواب دیا۔ "چودہ سال کی عمر میں، ایک دفعہ، تم سمندر کے کنارے ریت میں بھٹک گئے تھے، راستہ بھول گئے تھے اور تمہاری توقع سے پہلے ہی رات ہوگئی تھی اور اندھیرا چھانے لگا تھا۔ تب گھبرا کر تم مجھے پکارنے لگے تھے۔ وہی پکار میں سن رہی ہوں۔"

میں ایک دم چونکا کیوں کہ اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ چھ سال پہلے پیش آیا تھا۔ گنڈالپور، میرے ننھیال میں، دیر سے لوٹنے کے سبب ڈانٹ بھی سننی پڑی تھی۔ تفصیل میں فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت میری عمر چودہ کی بجائے سولہ کی تھی اور میرے ساتھ میری پڑوسن نرملا۔ نما۔ تھی۔ میں نے پکارا تو کسی کو نہیں تھا مگر خوف زدہ من سے نما کے بارے میں ــــ اس سے بھی زیادہ اس کے پتا کے بارے میں ــــ سوچ رہا تھا۔ منو دیلا اور نرملا۔ ان ناموں میں کتنی مناسبت ہے۔

اور مجھے یقین ہوگیا کہ ہستیاں اور واقعات چند ہی ہوتے ہیں۔ اور ان میں ہی جدت پیدا کرنا ہمارا کام ہے۔ انہی چند سروں سے نئی نئی راگنیاں بنانی پڑتی ہیں یہ بات منو کے لئے بالکل آسان تھی۔ کوئی بھی واقعہ اسے غیر متوقع نہیں لگتا تھا۔ بہرحال کو وہ بے ساختہ قبول کر لیتی ہے۔ انگریزی میں وہ آل اِن اے ڈیز ورک (All in day's work) کہتے ہیں۔ بالکل ویسے ہی۔ نتیجتاً اس کے دل میں کبھی تذبذب یا ہچکچاہٹ پیدا ہی نہ ہوتی تھی۔ یہ تذبذب یا ہچکچاہٹ جو ہے، پیش نظر حقیقت کے انکار کے مترادف ہے۔ یہ اسے ناپسند ہی نہیں بلکہ اس کے لئے ناممکن سی بات تھی۔

کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے، منو کے برتاؤ کا جو مطلب میں نکال رہا ہوں کیا وہ صحیح ہے؟ کیا خود منو اس سے آگاہ تھی؟ دراصل ان سوالوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ گیان ہمیشہ بعد میں آتا ہے۔ اس سے پہلے تمام پہلوؤں پر کافی غور کرنا پڑتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی اس کے لئے کبھی رک نہیں سکتی۔ منو یہ جان گئی تھی۔

چوانگ ژو اور ہوئی ژو ایک دن گھومتے گھومتے ہاؤ ندی کے پل پر آ پہنچے۔ چوانگ ژو نے کہا۔ "دیکھو یہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں کس طرح اِدھر اُدھر تھرک رہی ہیں۔ ان کو بڑا لطف آ رہا ہوگا، اس میں۔"

ہوئی ژو نے کہا۔ "تم مچھلی تو نہیں ہو، پھر تم یہ کیسے جان سکتے ہو کہ مچھلیوں کو کس بات میں لطف آتا ہے؟"

چوانگ ژو نے کہا۔ "تم 'میں' نہیں ہو۔ پھر یہ کیسے جانتے ہو کہ مچھلیوں کو کس بات میں لطف آتا ہے یہ میں نہیں جان سکتا۔"

ہوئی ژو نے کہا۔ "میں 'تم' نہیں ہوں، اس لئے اگر میں یہ نہیں جان سکتا کہ تم جانتے ہو کہ نہیں، تو واضح ہے کہ تم بھی یہ نہ جان سکو گے کہ مچھلیوں کو کس بات میں لطف آتا ہے۔ آخر میری ہی بات سچ نکلتی ہے نا؟"

چوانگ زو نے کہا۔ "ہم پھر پہلے سے شروع کریں گے۔ تم نے مجھ سے پوچھا کہ میں یہ کیسے جان سکا کہ مچھلیوں کو کس بات میں لطف آتا ہے۔ لیکن جب تم نے یہ سوال کیا تبھی تم اس کا جواب بھی جان گئے تھے۔ اتنا ہی نہیں، ہاؤ ندی کے پل پر اس طرح کھڑے ہوتے ہی تم وہ سب کچھ سمجھ چکے تھے۔"

عام زندگی کے فلسفہ کا بھی یہی حال ہے۔ وہ بحث کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔

شاید اسی لئے منو، خود کوئی سوال نہ کرتی تھی۔ اور اگر کبھی کر بھی دیتی تو سوال نہ صرف خود کلامی کے انداز میں ہوتا بلکہ ساتھ ہی جواب بھی اسی کی زبان سے نکل جاتا۔ سوال کے معنی ہیں وہم، وسوسہ، اسی لئے وہ سوالوں سے پرہیز کرتی تھی۔ صرف ایک بار اس نے میرے بارے میں ایک سوال کیا تھا۔ "تم کیا بننے والے ہو؟"

میں نے سادگی سے جواب دیا۔ "میسور لوٹنے کے بعد میں مہاراجہ کالج میں پروفیسر بننے والا ہوں۔ اسی لئے ہماری سرکار نے مجھے اسکالرشپ دے کر یہاں بھیجا ہے اور میں فلسفہ سے متعلق بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔"

دیر تک وہ کچھ نہ بولی۔ میں سمجھا کہ وہ اداس ہوگئی ہے۔ کیوں کہ میرے جواب میں ہماری جدائی کی طرف اشارہ تھا۔

"تم روپ بتانا نہیں چاہتے۔" تھوڑی دیر بعد وہ صرف اتنا پوچھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور چلنے کی تیاری کرنے لگی۔

اس سوال کا مطلب کئی دنوں بعد میری سمجھ میں آیا۔ بن جانے کا مطلب ہے، جو ہے اسے پھولنے پھلنے کا موقع دینا۔ اس کے لئے محنت کی ضرورت نہیں ہوتی، پر انتخاب ٹھیک ہونا چاہیئے۔ من پسند کام کرتے ہوئے تکان کا احساس نہیں ہوتا۔ سب کچھ جیسے خود بخود ہو جاتا ہے۔ ساری قوتیں مل کر کام کرتی ہیں۔ ریل گاڑی کا پانچ منٹ کا انتظار برداشت سے باہر ہوتا ہے۔ لیکن محبوب کا انتظار کتنی بھی دیر کیوں نہ کرنا پڑے، چاہے ہم کو تشویش ہو لیکن تکان محسوس نہیں ہوتی۔ ایسے ہی ایک دفعہ مجھے ہوبرن سٹیشن پہنچنے میں آدھ گھنٹے کی دیر ہوگئی۔

میں من ہی من میں بہت ڈر گیا تھا۔ لیکن منو کے رویہ میں میرے پریشان من کو جیسے سہلا کر شانت کر دیا۔

"مجھے کتنی دیر ہو گئی؟" میں نے کہا۔

اس نے کہا: "نہیں تو۔ تم تو یہیں تھے۔ تھوڑی دیر تم دستون بنے اس ستون سے آنکھ مچولی کھیلتے رہے تھے۔ کئی بار تو تم نے میرے پاس کی ٹکٹ مشین بن کر مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ ابھی ابھی تو تم ایک ننھا سا بچہ بن کر میری ٹانگوں سے لپٹ گئے تھے۔"

اور وہ یہ سب اتنی سادگی اور خلوص سے کہہ گئی کہ ہم دونوں کھلکھلا پڑے۔

اس کا برتاؤ ہمیشہ ہی اس طرح بے ساختہ اور بے لوث ہوتا۔ اسی وجہ سے کبھی کبھی یہ سمجھ میں نہ آتا کہ اس سے کس طرح پیش آیا جائے۔ ہمارے تجربات میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا ہے ویسے ویسے ہمارے عمل اور تعلقات میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے ساری جد و جہد معاشرے کے مسائل حل کرنے اور ان حلوں کو آزمانے کے لئے ہو۔ ہم اپنے آپ کو سمجھا لیتے ہیں کہ اس کے بغیر سماج کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ہر بات پر ہر بار نئے سرے سے غور کر کے فیصلہ کرنا ہو تو کوئی بھی پاگل ہو جائے لیکن منو کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب بے کار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنی مرضی پر چلنا ہو تو بہانے تراشنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی مگر اوروں کی مرضی پر چلنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ تب ہمیشہ یہی دیکھتے ہیں کہ کون سی بات کس رواج کی رو سے بالکل ٹھیک ہے۔ وہ بات ہمیں پسند ہے کہ نہیں، یہ خیال ہی نہیں آتا۔

ان دنوں ہم آئرلینڈ گئے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ منو باتیں کرتے کرتے یوں ہی اٹھی اور بلا جھجک اپنے سادے کپڑے اتار لاک آلن (۱) کے پانی میں اتر گئی۔ تیرنا تو مجھے بھی آتا تھا لیکن اس کی اس حرکت سے اتنا حیران ہوا کہ کچھ دیر تک مجھ سے ہلا بھی نہ گیا۔ کوئی دیکھ لے گا تو کیا ہو گا؟ اس خیال سے میں اتنا گھبرا گیا کہ وہ پانی میں کتنی حسین لگ رہی تھی اور پانی سے باہر آنے کے بعد جب وہ بڑے اطمینان سے کچھ دیر تک آنگرے کی لاسوڈس کی طرح جو کھڑی ہو گئی تو کس طرح حسین تر لگ رہی تھی۔ یہ سب مجھے صرف ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ نتیجتاً جو حقیقت میرے سامنے تھی اسے قبول کر لینے کی ہمت نہ ہوئی۔ اگر وہ ویسے ہی دوڑ کر مجھ پر نہ آ گرتی، تو یہ حقیقت کبھی میرے ہاتھ نہ آتی.....

---

۱ آنگرے کی ایک مشہور پینٹنگ

ایک متقی برہمن تھا۔ اتفاقاً، ایک دن، بھگوان اس سے خوش ہو گئے۔ بھگوان نے اس سے پوچھا۔ "بولو، تم کیا چاہتے ہو؟"

اس غیر متوقع کرم سے وہ برہمن اتنا گھبرا گیا کہ اس نے کہا۔ "ہے، بھگوان، مجھے تو کچھ بھی نہیں سوجھتا۔ میں سوچ کر کل بتاؤں گا۔ مجھے اپنی گھر والی سے پوچھنا ہو گا، بڑوں کی رائے لینی ہو گی۔"

بھگوان نے کہا: "ٹھیک ہے۔"

دوسرے دن وہ برہمن بھگوان کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا مگر ایک بار خوش ہونے والے بھگوان دوبارہ نہیں آئے۔ منہ دکھائی کے موقع پر آئینہ کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے والا تاجرانہ ذہن بھی اسی قسم کا رہا ہو گا۔

منو ماضی یا مستقبل کا ذکر شاذ و نادر ہی کرتی۔ شاید اسے اس کا مکمل احساس تھا کہ ہر لمحہ دوسرے لمحے سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور اسے ویسے ہی ہونا چاہیئے۔ اور اسی لئے وہ ہمیشہ خوش رہتی تھی۔ اس کی گفتگو میں بے ساختگی ہوتی اور اسی وجہ سے وہ مناسب بھی ہوتی۔ مور کی تصویر والے حادثے کے بعد وہ مجھ سے کیوں نہیں ملی؟ اس سے متعلق میں جب بھی سوچتا ہوں، مجھے یہی لگتا ہے کہ اس کی یہ حرکت اس کے عام رویہ کے خلاف تھی۔ میرے سوال نے اس کی انا پر چوٹ کی۔ مجھ پر سے اس کا اعتماد اٹھ گیا۔ اس نے جو خوابوں کی دنیا سجائی تھی وہ بکھر گئی۔ ایسے عمومی خیالات تو آتے ہیں لیکن گہرائی سے غور کرنے پر اس کا کچھ اور ہی مطلب نکلتا ہے۔ اس کی نظر میں اہمیت اس بات کی نہ تھی کہ تصویر کس نے بنائی تھی مگر اہمیت ان باتوں کی تھی کہ وہ کیسی تھی، کیا بتاتی تھی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے نہیں ملی۔ اس کا اس حادثہ سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا ہو گا۔ نہیں تھا، ایسا محسوس ہوتا ہے۔

منو کی اس غیر متوقع جدائی سے مجھے دنیا خالی خالی نظر آنے لگی۔ کیا کیا جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس وقت، خوش قسمتی سے میرا امتحان قریب آ پہنچا تھا۔ میں نے مطالعہ میں من لگا کر سب کچھ بھلا دینے کا مصمم ارادہ کیا۔ کسی حد تک میں اس پر عمل بھی کر سکا۔ لیکن چین کہاں، کبھی لگتا کہ اس کی تلاش کرنا میرا فرض ہے۔ اتنے گہرے مراسم کے باوجود، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، اس طرح حالات کے سامنے گھٹنے ٹیک دینا احسان فراموش لگتا۔ یہ بھی خیال آتا کہ کہیں وہ اس دنیا کو ہی چھوڑ کر تو نہیں چلی گئی اور میں مغموم ہو جاتا۔ اور کبھی کبھی لگتا کہ اب قسمت کے کھیل دیکھنے سے کیا فائدہ، میری انا بھی اس خیال کا ساتھ دیتی۔ میں نے ایسا کیا کیا تھا کہ وہ یکایک سارے رشتے ہی توڑ دینے پر تل گئی؟ اس کے جنون کی تال پر میں ہمیشہ کیوں ناچتا رہوں؟ پہلے خیال میں محبت کی وسعت کی گواہی تھی تو دوسرے میں اس کی کوتاہی جھانک رہی تھی۔

میں سمجھتا ہوں، جب تک سب ٹھیک طرح چلتا رہتا ہے غور و خوض کی

ضرورت محسوس نہیں ہوتی یا خیالات آتے بھی نہیں۔ جب گاڑی رک جاتی ہے تو فلسفیانہ باتیں بجھائی دیتی ہیں۔ میں منو کا قائل اس وجہ سے ہوں کہ اسے ایسے فلسفوں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ویسے دیکھا جائے تو اس کی زندگی "جیو دھرم" کی راہ پر گامزن تھی۔ جیو دھرم کا راز صدا کی بازگشت اور سوال کا جواب مہیا کرنے میں پنہاں ہے۔ اس میں یہ میرا ہے یہ پرایا، اس قسم کے خیالات کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ شکار اور شکاری کی، پیرو مرید کی، عاشق و معشوق کی، قاتل و مقتول کی یکتائی اس دھرم کا بنیادی اصول ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس کا سلوک کبھی بے جا نہ لگے ہمیشہ ہی معقول و مناسب ہو وہ شخص اس راز کو سمجھ سکتا ہے۔ ایسے شخص کے قول و فعل میں اکثر تضاد نہیں ہوتا۔ منو جب گھنٹوں گھاس پر لیٹی رہتی، یا بچوں کی بھیڑ میں مل کر خود ایک بچہ بن جاتی یا اپنی کچھ موٹی سی انگلیوں کی قینچی میں میرے بال پکڑ کر ایک ساتھ ہنستے اور روتے ہوئے نیچے جھک کر میری جان ہی لے لیتی تب میں اس راز کو کچھ کچھ سمجھ پاتا۔ وہ ہر لمحہ کو اپنا لیتی اور اس میں ایک انوکھا حسن بھر دیتی۔

ایک دفعہ اس نے کہا تھا: "مجھے بہت کچھ سیکھنا ہے۔"

میں نے پوچھا: "کیا سیکھنا ہے؟"

اس نے کہا: "سب۔ سبھی سے۔ سیکھنے کے لئے کسی خاص موضوع کی ضرورت ہے، ایسا تو نہیں۔ کل میں نے ایک لڑکے سے کاغذ کا ہوائی جہاز بنانا سیکھا۔ ٹھہرو، ابھی ایک تمہیں بنا کر دیتی ہوں۔ اور وہ میری میز پر سے کاغذ اٹھا کر سچ مچ جہاز بنانے لگی۔ اس وقت وہ بالکل ایک سات آٹھ سال کا بچہ لگ رہی تھی۔

"مجھ سے تم نے کیا سیکھا؟" میں نے پوچھا۔

"خود فراموشی۔" اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے زانو پر رکھ کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں کی گہرائیوں میں مجھے ڈبو لیا اور کہا۔ "ایک زمانہ تھا، روپ، جب میں بہت مغرور تھی لیکن تمہیں دیکھا اور بدل گئی، ہمیشہ کے لئے۔"

میں نے کہا: "تم سدا سے یوں ہی ہو۔ مجھے معذرت میں بزرگی دے کر میرا افتخار بڑھاتی ہو۔"

اس نے کہا: "تم ابھی میرے بارے میں نہیں جانتے۔ کبھی نہ کبھی جان جاؤ گے۔ جو سچ مچ دیتا ہے وہ اپنے احسان کو نہیں پہچانتا۔"

پھر میں نے کہا: "میں نے بھی تم سے سیکھا ہے۔"

اس نے کہا: "ہاں میں جانتی ہوں۔ فضول گوئی۔"

"نہیں۔ پریوں کی کہانی والی سب سے چھوٹی شہزادی کی طرح معصوم رہنا۔"

میں نے کہا۔

سنکردہ صرف مسکرائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کو کوٹ بنائے ہوئے اس کے بائیں کندھے پر اپنی ٹھوڑی ٹکا دی۔ لمحہ بھر کو اس نے میرا بایاں ہاتھ لے کر اپنے دل پر زور سے دبایا اور اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے میرا بایاں گال سہلا دیا اور چلی گئی۔ ایسا سکھ میں نے کبھی نہیں پایا تھا.....

خوشی اگر ایک دلی کیفیت ہے تو راحت زندگی کا لمحاتی عرفان ہے۔ کوشش سے خوشی کو پایا جا سکتا ہے۔ مگر راحت، وہ کہاں اور کب نصیب ہو گی نہیں کہا جا سکتا۔

امتحان کے ختم ہونے پر میں منو کی تلاش میں ویانا جا رہا تھا۔ سفر کے دوران کے ایک واقعہ کی یاد آتی ہے۔ گاڑی میں کافی بھیڑ تھی۔ میرے ساتھ میں ایک سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی بیٹھی تھی۔ اتنی دور کا سفر، وہ بھی تنہا، شاید وہ پہلی بار کر رہی تھی۔ اندھیرا چھانے لگا تو سبھی مسافر بیٹھے بیٹھے جھپکیاں لینے لگے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ویسے مجھے ریل گاڑی میں کبھی نیند نہیں آتی۔ پھر بھی لگتا ہے میں کچھ دیر سو گیا تھا۔ کیونکہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی میرے کندھے پر سر رکھ کر گہری نیند سو گئی ہے۔ یکایک مجھے لگا کہ اس کے ساتھ ایکدم غائب ہو جاؤں ——— اپائیت کی باڑھ میں بہہ جاؤں۔ میں ویسے ہی بیٹھا رہا۔ ہلا تک نہیں۔ تاکہ اس کی نیند نہ ٹوٹ جائے۔ مجھے یاد آیا کہ کرن[1] نے پرشورام کو سونے کے لئے اپنا زانو پیش کیا تھا۔ ساری رات میں نے ویسے ہی بتا دی۔ اس وقت میں نے جو کچھ محسوس کیا اور آج صرف اس کی یاد سے بھی جو کچھ محسوس کرتا ہوں اسے میں راحت کہوں گا۔ یہ واقعہ اگر منو کو سناتا تو وہ خوش ہوتی، مجھے سراہتی۔

میں ویانا میں چار پانچ دن رہا۔ وہاں کے محلات، میوزیم سبھی دیکھے، عام لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ سب کیا ——— کچھ بھی باقی نہ رہا۔ اور ایک دن اچانک راحت کا ایک لمحہ اور آیا۔ شہر ویانا ڈینوب کے ساحل پر واقع ہے۔ جرمنی کے گھنے جنگلوں میں جنم لے کر خلیج اسود میں جا ملنے تک یہ دریا اتنے خطوں سے گزرتا اور اسے سرسبز و شاداب کرتا ہے کہ اسے مادر یورپ وسطی کہنا چاہیئے۔ آریوں کے لئے تو وہ مادر اول ہے۔ کیونکہ، تاریخ شاہد ہے کہ اس کی وادیاں آریوں کا گہوارہ رہی ہیں۔

---

[1] پرشورام کرن (karn) کے گرو ہیں۔ ایک دن وہ کرن کے زانو پر سر رکھ کر سو گئے۔ جب وہ گہری نیند میں تھے تب کرن کی زانو میں ایک بھنورے نے کاٹ لیا اور خون بہنے لگا۔ لیکن کرن نہ ہلا تاکہ گرو کی نیند نہ ٹوٹ جائے۔

دریا میں تفریح کے لئے چھوٹی بڑی کشتیاں ملتی ہیں۔ اس دن علی الصبح، میں ہوٹل کے سامنے ساحل پر کھڑا لہروں کا کھیل دیکھ رہا تھا اور ناؤ کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں پیچھے سے کسی نے کہا: "ہمارے ساتھ چلیں گے آپ؟ ہمیں بہت خوشی ہوگی۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ کشتی میں ایک جوان جوڑا تھا۔ لڑکی کے پیلے لباس پر نیلے اور قرمزی پھول تھے۔ بالوں پر ہلکے جامنی رنگ کا ایک ریشمی رومال بندھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہمپر (HAMPER) تھا۔ وہ دونوں بہت خوش تھے، ان کے چہروں پر اتنا پیار بھرا اصرار تھا کہ میں بلا پس و پیش کشتی میں سوار ہو گیا۔ کسی بھی طرح کی نجی پوچھ تاچھ کئے بغیر اتنے پیار اور سلیقے سے پیش آنے والے لوگ یورپ میں اکثر مل جاتے ہیں۔ یہ ان کی خوش اخلاقی کی عظمت ہے۔ کشتی پر ہم نے خوب باتیں کیں بڑا فراخ دل تھا۔ وہ نوجوان۔ ہم لوگ جنگلے پر جھکے باتیں کر رہے تھے۔ اس نے درمیان میں مجھ سے پوچھا۔ "دریا کا پانی آپ کو کس رنگ کا دکھائی دے رہا ہے؟"

"میں نے کہا: "نیلا"۔"

"تب تو واقعی آپ عاشق مزاج ہیں۔" وہ چہکا۔

"مجھے تو یہ پانی سبز نظر آتا ہے۔" لڑکی نے ایک نقلی آہ بھر کر کہا۔ "مجھ سے کوئی بھی پیار نہیں کرتا۔"

اس پر وہ دونوں کھلکھلا پڑے۔ تب تک میں ان سے کافی گھل مل گیا تھا۔ میں بھی ہنس پڑا۔ ہڈسن ٹیلر کی یہ شاعری کتنی سادہ مگر کتنی موثر ہے، دل کو چھو لینے والی! دریا کا پانی تو ہر کسی کو نیلا ہی نظر آتا ہے۔ مگر روایت یہی ہے کہ وہ صرف عاشق مزاجوں کو ہی نیلا نظر آتا ہے۔ جس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ سبھی پریمی ہیں۔ کیا یہ آفاقی محبت حسین شاعری کی عظیم مثال نہیں؟ اس وقت سے میں محسوس کرنے لگا کہ منو میرے پاس ہی ہے یا میرے آس پاس چل پھر رہی ہے۔ ہر طرف اس کا روپ نظر آنے لگا۔ اور میرا من شانت ہو گیا۔ مجھ پر سب کچھ واضح ہو گیا۔ اور میں اپنے جوان دوستوں کی صحبت میں سب کچھ بھول گیا۔ کشتی جب کنارے پر پہنچی تو پھر ملنے کا وعدہ کر کے ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے۔ جاتے جاتے، اچانک، اس لڑکی نے جھک کر میرا بایاں گال چوم لیا۔ پیار کا ایسا فیر مصنوعی ردپ میں نہیں جانتا تھا۔

منو اب صرف میری ہی نہ رہی تھی، سب کی ہو گئی تھی۔ اور اسی سبب میں اس سے قریب تر ہو گیا تھا۔ فوراً ہوٹل لوٹنے کی چاہ نہ رہی۔ میں محسوس کرنے لگا کہ میں کائنات کے ذرے ذرے میں موجود ہوں ——— ہر ایک کا بھید جانتا ہوں۔ گاڑیوں کی ریل پیل، ٹرک کی چہل پہل اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتے ہوئے جوڑوں کے دل کی دھڑکنوں کو میں محسوس کر رہا تھا۔ دونوں ہاتھ نیکر کی جیبوں میں ڈال کر، سیٹی بجاتے ہوئے اپنی ہی شان سے چلتا ہوا لڑکا، ٹرک پر گن گن کر قدم رکھتے ہوئے درمیان میں رک رک کر پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوا، نحیف جوان، ساری دنیا کا بوجھ مانو اس پر ہے، یوں سمجھ کر جلد جلد قدم اٹھاتے نوکری پر جاتی ہوئی ٹپ ٹاپ لڑکی ——— ان سب کے احساسات کو میں محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ان سب میں جذب ہو کر حظ حاصل کرنا تھا۔

منو کی زندگی کے راز کو میں نے اسی لمحے جانا۔ ساڑھے چار مہینے کے عرصے میں اس نے مجھے جنت اور دوزخ کے تمام راستے بتا دیئے تھے۔ دینے لینے کے عرصے میں کچھ بھی باقی نہیں رکھا تھا۔ طوفانی سمندر کا ہنگامہ اور سرما کی رات کا سکوت، مونالزا کی مسکراہٹ اور ٹیس کے آنسو۔ آسمان سے باتیں کرتے اونچے پیڑ اور صبح کی اوس میں بھیگی گھاس کے پھول ——— ان سب کے راز اس نے مجھ پر فاش کر دیئے تھے۔ ایک طرف منو میرا کرشن تھی۔ کرشن، رادھا کی ہر ذہنی کیفیت میں اس کا ساتھ دیتے تھے۔ اس کے لئے چھوٹے بنتے تھے اور بڑے بھی۔ منو کے سلوک میں بھی وہی خصوصیت تھی۔ کرشن متھرا چلے گئے اور رادھا کی زندگی ختم ہو گئی ——— ختم ہو گئی، ایسا ہم سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقتاً ایسا ہوا نہیں، تب رادھا خود کرشن بن گئی تھی۔ دراصل اس کی حقیقی زندگی کا آغاز وہیں سے ہوا تھا۔

میں ہوٹل میں داخل ہو کر، لفٹ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ پورٹر نے ایک لفافہ اور ایک چھوٹا سا پارسل مجھے تھما دیا۔ میری بینک نے یہ دونوں چیزیں اس پتہ پر بھجوائی تھیں۔

کمرے میں بیٹھ کر اطمینان سے میں نے لفافہ کھولا۔ خط میں دن یا مقام کا ذکر نہیں تھا۔ پیلا سا، چکنا کاغذ اور اس پر پیارے پیارے حروف جن کا میں اتنا عادی ہو گیا تھا کہ وہ مجھے اپنے سے لگتے تھے۔ اتنا لمبا خط منو نے پہلے کبھی لکھا نہیں تھا۔ دوسرا جملہ بھی وہ شاذ و نادر ہی لکھا کرتی۔ تصویری کارڈ پر صرف پتہ اور نیچے بہت سادی حسین لکیروں کے درمیان نازک پھولوں کی طرح جھانکتے ہوئے اس کے نام کے حروف، بس! لیکن آج خط بالکل مختلف تھا، دونوں طرف لکھے آٹھ ورق، جن میں مانو اس کی زندگی کا نچوڑ تھا۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ اس خط کو پڑھ کر تمہیں حیرت نہ ہوگی۔ اب تک تم متوازن ذہن سے دنیا سے سنگھرش کرنے کو تیار ہو چکے ہو گے اور شاید مجھے بھول بھی چکے ہو گے۔ لیکن جہاں میں ہوں، وہاں تم ہی تم ہو۔

"آج میں جو کچھ لکھنے والی ہوں، اسے تم شاید خط نہ مانو گے۔ کبھی میں نے اپنے دل سے جو وعدہ کیا تھا، اسے آج پورا کر رہی ہوں۔

"میری ماں مجھے جنم دیتے ہی اس دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ پچھلی لڑائی کے

دن تھے۔ جب میں دو سال کی تھی تو پتا جی بھی چل بسے۔ اس لئے میری پرورش میری خالہ کے ہاں ہوئی، سالزبرگ میں۔ اور میں بھی اسی کنبہ کا ایک فرد بن گئی۔ میری زندگی کے وہ دن ایسے تھے کہ ہر کسی کو رشک آئے۔ میری ہر چاہ پوری کی جاتی تھی۔ خالہ کے اپنے بھی بچے تھے ——— دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ لیکن کسی نے کبھی ہم میں امتیاز نہیں کیا۔ میں سب سے چھوٹی تھی اس لئے میرا لاڈ پیار زیادہ ہوتا تھا۔ خالو آرکیٹیکٹ تھے۔ جنگ ختم ہوئی تو انہیں اچھے کام ملنے لگے۔ سکھ کے دن آگئے۔ کارل، میرا بھائی، ویانا میں پڑھ رہا تھا۔ میری بہنوں کی شادی جلد ہی ہوگئی اور وہ اپنے شوہروں کے ساتھ چلی گئیں۔ اس وقت طے پایا کہ مجھے سوئٹزرلینڈ کی ایک مشن سکول میں بھیجا جائے۔ اس وقت میرا پندرہواں سال ختم ہو چکا تھا اور میں سولہویں میں قدم رکھ چکی تھی۔

"یہ سکول انٹرلاکن کے پاس بستی سے تھوڑی دور ہے۔ اس سکول میں میں نے صرف دو ہی باتیں سیکھیں ——— چوری چھپے تیرنا اور فرنچ ٹیچر سے پیار کرنا۔ سسٹر ہیلینا اتنی خوبصورت تھیں کہ ہر بار، ان کی طرف دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن بند ہو جاتی ——— اور پھر دوگنی تیزی سے شروع ہو جاتی۔ دنیس دے میلو کو اگر راہبہ کا لمبا گاؤن پہنا دیا جائے تو وہ جیسی لگتی، ویسی ہی تھیں وہ۔ ان کے بولنے کا انداز اتنا شاندار اور پُروقار تھا کہ جب وہ بولنے لگتیں تو جی چاہتا کہ ان کے گاؤن کی بانہہ پر گال ملتے سنتے ہی رہ جائیں۔ اور ان کا سلوک، ہر ایک کے ساتھ، اتنا پیار بھرا ہوتا کہ سبھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے کہ وہ صرف اسی سے پیار کرتی ہیں۔ بس! اس بات کو لے کر، لڑکیوں میں، آئے دن جھگڑے بھی ہوا کرتے تھے۔

ایک رات جب سناٹا چھا گیا تو میں کھڑکی سے کود کر جھیل کے کنارے، اپنی مخصوص جگہ پر پہنچ گئی، تیرنے کے لئے۔ گرمی کے دن تھے۔ اس موسم میں من ہی من ارمانوں کی دنیا سجانے اور رات کو جھیل کے پانی میں دھینگا مشتی کر کے سب کچھ بھلا دینے سے بڑھ کر کون سا سکھ ہو سکتا ہے؟ ایسے وقت پانی کے ذرات جیسے جسم کے ہر مسام کو کھول کر زندگی میں ایک انوکھا پن بھر دیتے ہیں۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ مقام بالکل خفیہ ہے، صرف میرا۔ لیکن اس دن وہاں کوئی اور آ گیا تھا۔ مجھ سے بھی پہلے۔ کیونکہ پانی میں چل رہے مشاق ہاتھوں کی آواز سنائی دے رہی تھی میں گھبرا تو گئی لیکن لوٹتے نہیں بن رہا تھا۔ اور اس نئے شخص کو دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ میں ایک درخت کی اوٹ سے، چھپ کر، دیکھنے لگی ——— آواز رک گئی۔ پھر ساحل پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ دور سے اسے پہچاننا ممکن نہ تھا۔ لیکن اتنا صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی میری طرح آئی ہوئی تنہا عورت ہے۔ دھیرے دھیرے وہ میرے قریب آنے لگی، میں بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ دفعتاً میرے دل کی دھڑکن رک گئی۔ پھر دوگنی تیزی سے شروع ہو گئی۔ میرے پاؤں جیسے زمین میں گڑ گئے۔ جی چاہا کہ چلا اٹھوں، زور سے ..... غیر ارادی طور پر دوڑ کر سسٹر ہیلینا کے پیروں سے لپٹ گئی تھی۔

وہ نہ چونکیں نہ گھبرائیں بلکہ بڑے اطمینان سے مجھے اوپر کھینچ لیا۔ اور ذرا بٹھا کر کپڑے پہننے چلی گئیں۔ پہلے تو میں نے گھٹنوں میں سر چھپا لیا۔ پھر جانے کیوں بلا جھجک سب دیکھنے لگی۔ رومال جیسے چھوٹے تولیے سے انہوں نے اپنا بدن دھیرے دھیرے پونچھا۔ پھر کپڑے پہننے لگیں۔ ایک کے بعد ایک، جلدی جلدی مگر باقاعدہ۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ گرجا میں رہنے والی عورتوں کے لئے اتنے سارے کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر ان ڈھیر سارے کپڑوں کے باوجود سسٹر ہیلینا ایک تازہ پھول کی مانند شاداب نظر آتی تھیں۔ کپڑے پہننے کے بعد بوٹ اور موزے اٹھا کر وہ میرے قریب آ گئیں۔ جی چاہا کہ جھپٹ کر ان کے ہاتھوں سے موزے اور بوٹ لے لوں اور انہیں پہنانے کے بہانے ان کے لال لال تلوؤں پر اپنے گالوں کو ملوں اور انہیں ہلکے سے چوم لوں۔ انہوں نے جیسے میرے دل کی بات جان لی ہو۔ بوٹ میرے سامنے رکھ دیئے اور تولیہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا میں نے ان کے پیر پونچھے، اپنی آرزو پوری کی پھر جوتے پہنا دیئے۔

پھر انہوں نے کہا۔ "تم پانی میں اترنا چاہتی ہو، چاہو تو اترو۔ میں یہیں ٹھہروں گی۔ میں نے پہلے سر ہلا کر انکار کر دیا..... پھر ایکدم کہہ اٹھی، پھر کسی دن ہم دونوں ساتھ نہائیں گے۔"

اس کے بعد دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھے رہے (اس رات کے بعد میں پھر پانی میں اتری تو لاک النن میں، جب تم میرے ساتھ تھے۔)

دوسرے دن میں جیسے ہوا میں تیر رہی تھی۔ میری ہر حرکت ایسی تھی جیسے میں نے دنیا بھر کی تمام خوشیاں پا لی ہوں۔ جماعت میں جب ہماری نظریں ملتیں میں من ہی من ناچ اٹھتی..... میں ایک عالم بے خودی میں ڈوبی رہی۔

اس دن شام کی عبادت کے بعد سسٹر ہیلینا اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔ سب کی نظریں بچا کر میں ان کی طرف دوڑتی چلی گئی۔ رات کو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پچھلے میدان میں جی کے پاس آ جانا۔ صرف اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئیں۔ تب تک کیسے انتظار کروں، میں بے تاب ہو گئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں وہاں پہنچ گئی۔ ایک منٹ..... دو منٹ..... کیوں نہیں آئیں سسٹر ہیلینا.....؟

آخر وہ آئیں۔ ایک البم نما کتاب میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے انہوں نے کہا ــــ اسے اپنے پاس رکھو، تمہارے لئے ہے۔ اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی انہوں نے بڑے پیار سے میرے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور چلی گئیں۔ مجھے کچھ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔ میں نے وہ کتاب کس کر دل سے لگائی پھر گاؤن میں چھپالی۔ رات کو کتاب نکال کر دیکھ نہ سکی کیونکہ ڈارمٹری میں سبھی لڑکیوں کی موجودگی میں، ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ رات بھر کتاب میرے سینے سے لگی چبھتی رہی۔

اگلے دن دوپہر کے کھانے کے دوران، میری نظر بڑی میز پر گئی۔ وہاں سسٹر ہیلینا نہیں تھیں۔ میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ کل جو البم یا کتاب ملی تھی وہ بھی تو نہیں دیکھ سکی تھی۔ کھانے کی رسم ادا کر کے نوکرانی ایلسا کے پاس دوڑی۔ اس نے بتایا کہ اسی دن صبح کو سسٹر ہیلینا کو سپین کے کسی گرجا میں بھیج دیا گیا ہے۔ سنکر میرے ہوش اڑ گئے۔ ایلسا کو اور کچھ معلوم نہ تھا۔ کسی اور سے پوچھنا بھی ممکن نہ تھا۔

اسی رات کو مجھے بخار آ گیا۔ جب وہ نہ اترا تو گھر تار بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد مجھے سالزبرگ لے جایا گیا ہوگا۔ ان سات آٹھ دنوں کی یاد بالکل دھندلی ہے۔ پوری طرح صحت یاب ہوتے ایک مہینہ لگ گیا۔ ان دنوں میں ایک ہی کام کرتی تھی۔ سسٹر ہیلینا کی البم۔ ڈائری (میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا نام دیا جائے) کا نظارا۔ میں نے تمہیں ایک مور کی تصویر دکھائی تھی۔ اُسے میں نے اسی ڈائری کے ایک سکیچ سے بنایا تھا۔ اس ڈائری میں الفاظ سے بڑھ کر ایسی چھوٹی موٹی تصویریں ہی ہیں۔ یہ تو تم دیکھو گے ہی۔

اور ایک دن میں نے مصوری سیکھنے کا تہیہ کر لیا۔ میرے لئے وہ سسٹر ہیلینا کا پیغام ہی تو تھا۔ مجھے مشق کے لئے ساری چیزیں مہیا کر دی گئیں۔ آسٹریا کے سبھی میوزیم نہلائے گئے۔ پھر یہ طے ہوا کہ پہلے مجھے لندن بھیجا جائے اور بعد میں پیرس۔ جب ہم ملے تب میں سلیڈ سکول میں زیر تعلیم تھی۔

سسٹر ہیلینا نے اپنی ڈائری میں ایک جگہ لکھا ہے۔ پھول کے باطن میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرو، وہاں خلا کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور وہی اس کا سنوبھاگیہ ہے۔ پھول کی تمام تر رنگینیاں جس کے دل میں سمی ہوں، یہ بے نام خالی پن بھی اسی کے لئے ہے۔ پہلی بار تمہیں دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ میرے دل کا پھول تمہارے پاس ہمیشہ محفوظ رہ سکے گا۔

تم نے شاید یہ سمجھا ہو کہ میں نے تمہاری زندگی کے ساتھ مذاق کیا ہے لیکن سچ کہتی ہوں، روپ، میں نے ایسا نہیں کیا، سسٹر ہیلینا نے مجھے اپنا جانشین چنا اور اپنے دل کی دھڑکنیں میرے حوالے کر دیں۔ وہی اس خط کے ساتھ، میں تمہیں بھیج رہی ہوں۔ تم میرے جانشین ہو۔ تم میں غور و فکر کرنے کی صلاحیت ہے اور پھر نتیجہ کو آسان الفاظ میں پیش کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ یہ سب کو بتلانا، جو سمجھ جائیں گے، وہ کل ہمارے جانشین بنیں گے۔

میں آج کہاں ہوں ــــ؟ یہ تم پوچھو گے۔ میں ٹرولی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوں۔ خوب گھومتی ہوں۔ کھیت میں کام کرتی ہوں اور تصویریں بناتی ہوں۔ ایک دن تم مجھے بری طرح چاہنے لگو گے۔ میرے بغیر نہ رہ سکو گے، تب میں تمہارے پاس آؤں گی۔ تب تک کے لئے خدا حافظ.....؟

منو کے اس خط کو آئے سولہ سال بیت چکے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی یادیں اور گہری اور واضح ہوتی چلی جا رہی ہے۔ وہ اب تک تو نہیں آئی..... اس کی ٹیچر سسٹر ہیلینا کی ڈائری میں دل کی دنیا اتنی پیچیدہ ہے کہ اتنے برسوں بعد بھی وہاں پوری طرح قدم نہیں جم سکے ہیں۔ ایک دن مجھے یہ ڈائری شائع کرنی پڑے گی۔ مگر اس دن، جب اس کا ہر لفظ، ہر نقش میرا اپنا بن جائے گا۔

(مترجم :- محمد شرف الدین)


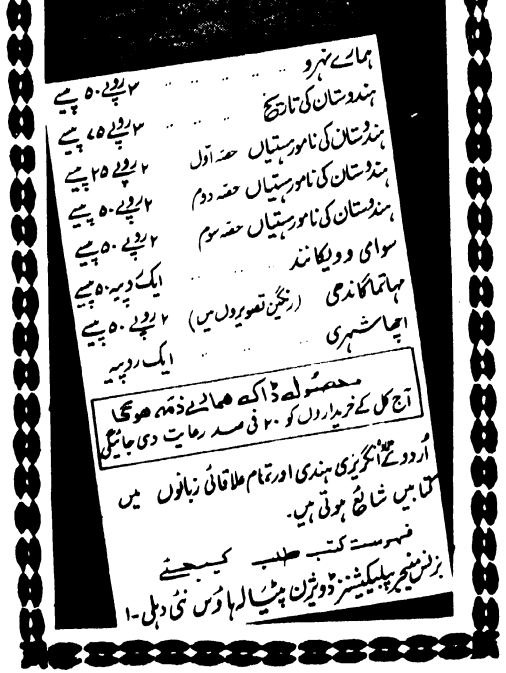

# غزلیں

## فضا کوثری

جو سنگ سار بدن چُور چُور اپنا ہے
کیا ہے پیار سراسر تصوّر اپنا ہے
بس ایک میں ہوں اور اپنے وجود کا احساس
نہ پاس ہے نہ کوئی دُور دُور اپنا ہے
لرز رہا ہوں اسے بھی نہ چھین لے کوئی
یہ آسرا بھی کہ ربِّ غفور اپنا ہے
یہ اعتبارِ نظر بھی نہ ہو کہیں مفلوج
کرن کرن یہی کہتی ہے نور اپنا ہے
اکیلے پن کا یہ احساس مٹ گیا ہوتا
اگر فضا کو سمجھتے حضور اپنا ہے



## جگدیش مہتہ درد

کسی کی یاد بڑھتے بڑھتے دردِ دل نہ بن جائے
خداوندا یہ آسانی کہیں مشکل نہ بن جائے
نگاہِ شوخ ہی تیرے لئے قاتل نہ بن جائے
کہیں بیٹھے بٹھائے جان پر اے دل نہ بن جائے
میرا ہر اشک وہ دامن سے اپنے پونچھ دیتے ہیں
کہ ہے یہ محنتِ دل مٹی میں مل کر دل نہ بن جائے
وہ جب سے آئے ہیں دل میں نظر سے دُور رہتے ہیں
مجھے ڈر ہے کہ دل ہی پردۂ محمل نہ بن جائے
اثر پڑ کر رہے گا ایک دن رندوں کی صحبت کا
یہ دردِ پارسا بھی میکشِ کامل نہ بن جائے

## عشرت انور

دردِ عالم سے ہے گرچہ ساری دنیا آشنا
آج کل ہے کون دُنیا میں کسی کا آشنا
گویا شیرازہ چمن کا اب بکھر جانے کو ہے
"سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا"
آشنا سب ساتھ تھے اپنے فقط اک موڑ تک
موڑ پہ پہونچے تو سب تھے آشنا نا آشنا
دوستوں کی مہربانی دشمنی سے کم نہیں
کیسے ممکن ہے تمیزِ آشنا نا آشنا
دوستوں کی دشمنی اور بہت ہے دل شکن
دوست دشمن عمر بھر ہم سے رہے نا آشنا

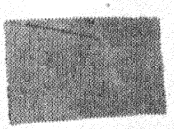



## حشر سہسرامی

گلشن میں بلبلوں کا ہے میلہ لگا ہوا
شاید کوئی اسیر قفس سے رہا ہوا
پرہیز اُن سے ہو نہیں سکتا بہار میں
توبہ کا خون منہ کو ہے جن کے لگا ہوا
سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں ہے نگاہ میں
یہ آگیا کہاں میں تمہیں ڈھونڈھتا ہوا
اس کو بھی تم نے بھانپ لیا میری شکل سے
جو رہ گیا تھا بات کا پہلو دبا ہوا
اُن کی نگاہ پھرتے ہی آیا یہ انقلاب
سارا زمانہ حشر ہے مجھ سے پھرا ہوا

## ناظر الحسینی

تیری محفل سے کہاں جائیں گے دیوانے لوگ
خاک اُڑائیں گے تو بن جائیں گے افسانے لوگ
ہم نے خود پاؤں میں زنجیرِ وفا ڈالی ہے
ایسے عالم میں عبث آتے ہیں سمجھانے لوگ
بتکدہ کم نہیں جنت سے جنابِ واعظ
آہی جاتے ہیں دلِ زار کو بہلانے لوگ
جب گلستاں میں اماں کی کوئی صورت ہی نہیں
کیوں نہ آباد کریں شوق سے ویرانے لوگ
کتنا بدلا ہوا دستورِ جہاں ہے ناظرؔ
ہو کے کعبے سے چلے جاتے ہیں میخانے لوگ

## بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

فی زمانہ بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نِرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچے تبھی ہوگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔

## بچہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت سنبھالنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نِرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچے کی پیدائش ملتوی کرسکتے ہیں۔

نِرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان، محفوظ طریقہ ہے۔ اِس کے استعمال سے صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔

نِرودھ ہر جگہ ملتا ہے:۔
پرویژن اسٹور، کرانہ فروش، کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔

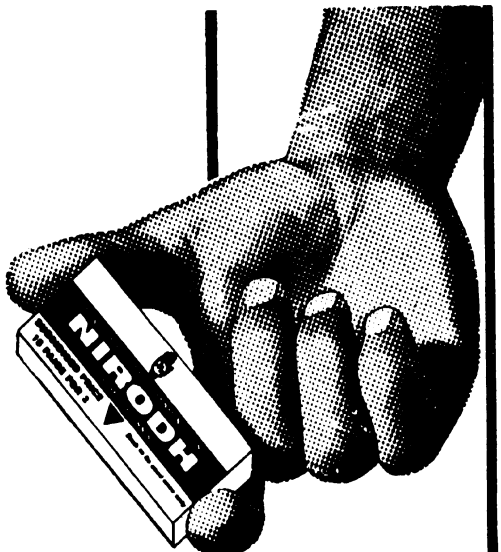


صرف 5 پیسے خرچ کرکے آپ اپنے کنبے کو محدود رکھنے کی طاقت حاصل کرسکتے ہیں

# نِرودھ استعمال کیجئے

فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
15 پیسے کے 3
سرکاری امداد سے کم دام

70/61




## جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

۱۔ ناشر:۔ مجلس اشاعت ادب، ۴۹۱ باڑہ ہندو راؤ دہلی
صفحات:۔ ۴۱۰ ، قیمت:۔ ۲۰ (بیس) روپے
ملنے کا پتہ:۔ مجلس اشاعت ادب دہلی اور ادارہ ادب ۳۹۶ جواہر نگر سرینگر کشمیر

زیر نظر مقالے پر ڈاکٹر حامدی کاشمیری کو کشمیر یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا ہوئی ہے مقالہ نگار اس لحاظ سے قابلِ تحسین ہیں کہ انہوں نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا جس پر اُردو میں کم لکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے بڑی چھان بین کر کے اس مقالے میں خاصا کارآمد مواد بھی اکٹھا کیا ہے۔ لیکن مواد اکٹھا کرنا محض آدھا کارنامہ ہے۔ ناقد کی خوبی یا خامی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ اس مواد کو کس طور پر ترتیب دیتا ہے اور اس سے کیا نتائج اخذ کرتا ہے۔ مقالہ نگار کے نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

جہاں تک دوسری اصناف سخن مثلاً غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی وغیرہ کا تعلق ہے۔ انہیں زیرِ مطالعے سے خارج کیا گیا ہے کیونکہ یہ موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے حد درجہ روایتی فرسودہ اور کہنہ ہیں۔ (صفحہ ۸)

"مرتب مقالہ نے اُردو نظم کے اس مطالعے میں جو تنقیدی اسلوب اختیار کیا ہے وہ مغرب اور مشرق کے ادب اور شاعری کے درمیان کوئی فرق یا تمیز روا نہیں رکھتا۔ (صفحہ ۹)

"مرثیہ کی صنف میں نظم نگاری کے بہت سے امکانات پوشیدہ تھے لیکن ان امکانات کا سُراغ کسی شاعر نے نہیں لگایا ہے سلے دے کے صرف ایک مرکزی موضوع شہادت امام حسین کو استعمال کیا گیا ہے اور وہ بھی روایتی انداز سے۔ مرثیہ کی صنف بذاتِ خود بری نہیں۔ یہ نظم کے تخلیقی عناصر کی حامل ہے۔ انگریزی میں گرے کی ایلیجی، یا ٹینی سن کی ان میموریم، مرثیہ کے ذیل ہی میں آتی ہیں اور دونوں بلند پایہ نظمیں قرار دی گئیں ہیں۔ لیکن اُردو میں اس پائے کی ایک بھی نظم نہیں ملتی۔" (صفحہ ۹۵)

یہ بات مسلّم ہے کہ فیض نے جدید نظم کی فنی تراشیدگی، تنظیم اور تعمیر میں اپنی بہترین خلّاقانہ صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ اور چند ایسی اعلیٰ پایہ کی نظمیں تخلیق کی ہیں جو مغربی نظموں کا طرزِ تفکر اور اندازِ نگارش کی حامل معلوم ہوتی ہیں اور فکر و فن کی نئی سمتوں کا تعین کرتی ہیں۔ جہاں تک اُن کے دائرہ فکر کا تعلق ہے وہ بدقسمتی سے بہت ہی محدود رہا ہے۔ اُن کے افکار میں تنوع ہے اور نہ وسعت اُن کے اسلوب اور ہیئت میں بھی ایک طرح کی یکرنگی اور یکسانیت پائی جاتی ہے"

(صفحہ ۸۴)

"اُردو شاعری اپنی پیدائش کے زمانے ہی سے مسلسل طور پر یا تو بدیسی روایات کے تلے دبی رہی ہے یا مختلف ادوار میں مروجہ تصورات اور اصناف کی غلام بنی رہی۔ سچ تو یہ ہے کہ ایرانی زبان و خیال کے حاوی اثر سے ہماری شاعری ابھی تک آزاد نہیں ہوئی ہے۔" (صفحہ ۴۰۶)

"نئے نظم نگار فنی اصولوں کی اہمیت سے واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ یورپی شعر و ادب کے حالیہ رجحانات کا دلچسپی سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ آزاد نظم اب تک علیحدہ اور مکمل صنف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور نظم کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے۔"

"مختصر یہ کہ نئی اُردو نظم موجودہ دور میں جس سرعت کے ساتھ عالمی تحریکوں، ادبی نظریوں اور نئے اسالیب سے ہم آہنگ ہوتی جاتی ہے وہ اس

کے مستقبل کے امکانات کے لئے فالِ نیک ہے۔" (صفحہ ۴۱۰)

مندرجہ بالا اقتباسات اور متعدد دیگر بیانات میں سے ہر ایک محلِ نظر ہے اور اگر کسی ذمہ دار ناقد نے یہ بیانات دلائل اور امثال کے ساتھ پیش کئے ہوتے تو ان پر مفصل بحث بھی ہو سکتی تھی لیکن مقالہ نویس نے چونکہ یہ اور ایسے دیگر بیانات بغیر دلیل و شواہد کے پیش کئے ہیں لہٰذا وہ محض ان کی ذاتی رائے کے مظہر ہیں اور زیادہ سے زیادہ انگریزی ادب سے ان کی ذہنی مرعوبیت کی غمازی کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ذاتی رائے پر کوئی بحث نہیں ہو سکتی۔

سنجیدہ قاری کو ایک علمی مقالے میں "اشارے" کی کمی گراں گزرتی ہے اور یہ معمہ بھی کشمکش و پیچ میں ڈال دیتا ہے کہ "جدید اردو نظم" کا عہد صرف ۱۸۵۷ء ۱۹۴۷ء تک کیوں محدود رکھا گیا ہے۔ کیا گزشتہ بیس سال کی شاعری جس کا محض ضمنی طور پر آخری باب میں ذکر ہے "غیر جدید" ہے؟

ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس مقالے کے باوجود "جدید اردو نظم اور یورپی اثرات" کا موضوع ابھی تک تشنہ ہے۔

(مہدی عباس حسینی)

## عہد جہانگیر و شاہجہاں میں ہندوستان کا فارسی ادب (انگریزی)

مصنف: پروفیسر لطف الرحمٰن

فارسی سینکڑوں برس تک ہندوستان کی زبان رہی ہے اور اس طویل عرصہ میں یہاں تقریباً ہر علم و فن میں فارسی میں کتابیں لکھی جاتی اور ترجمہ ہوتی رہی ہیں لیکن ہندوستان سے باہر رہنے والے جب فارسی ادب کی تاریخ لکھتے ہیں تو ہندوستان کے اس صدیوں کے ذخیرہ کو تقریباً نظر انداز کر دیتے ہیں۔ خود ہمارے ملک میں اب تک اس پر دل کھول کر کام نہیں ہوا ہے۔ پھر بھی انگریزی میں اس سے متعلق کچھ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال حسین صاحب نے امیر خسرو کے پہلے کے ہندوستانی فارسی شعراء پر ایک کتاب لکھی تھی۔ پٹنہ یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر عبدالغنی نے مغلوں سے پہلے کے عہد اور بابر، ہمایوں اور اکبر کے زمانے کے فارسی ادب پر تین جلدوں میں ایک کتاب شائع کی تھی مگر اس کے بعد کے فارسی ادب پر کوئی کتاب موجود نہ تھی جس کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔

۱۹۷۰ء میں بڑودہ یونیورسٹی نے پروفیسر لطف الرحمٰن کی ایک کتاب شائع کی ہے جس میں جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ کے فارسی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں متوسط سائز کے تقریباً دو سو صفحات ہیں۔ اس میدان میں ایک بڑی کمی تھی جس کو اس تالیف نے دور کر دیا ہے۔

اس امر کی نشان دہی ضروری ہے کہ کتاب کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے مولف نے تناسب کا خیال نہیں رکھا ہے۔ یعنی بعض کے ذکر میں ضرورت سے زیادہ طول دیا گیا اور بعض کو ضرورت سے زیادہ مختصر رکھا گیا ہے۔ جہانگیر پر اکتیس صفحوں پر مشتمل دو باب ہیں۔ جبکہ صرف ایک باب اور اس سے کم صفحوں میں کام چل سکتا تھا۔ عرفی کا ذکر عمداً جہانگیر کے عہد میں کیا گیا ہے جبکہ وہ اس کی تخت نشینی سے پہلے مر چکا تھا۔ صرف اس وجہ سے کہ اس کی شاہ زادی کے زمانہ میں عرفی نے اس کی مدح میں قصیدے لکھے، اسے جہانگیر کے عہد کے شعراء میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح ابوطالب کلیم اور شیدا جیسے شاعروں کو جہانگیر کے عہد کے شعراء میں شمار کرنے کے بجائے شاہجہاں کے عہد میں شامل کرنا چاہئے تھا، اس لئے کہ کلیم شاہجہاں کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ نیز شیدا کا اسی زمانہ کے شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ کچھ گمنام قسم کے شعراء کا ذکر ہے جن کو صرف ایک سرسری فہرست میں شامل کیا جا سکتا تھا۔ علاوہ بر ایں بعض شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے کلام کا کوئی نمونہ پیش نہیں کیا گیا ہے۔

اقتباسات طولانی ہیں۔ خاص کر جب کہ فارسی کے ساتھ اُن کے انگریزی ترجمے بھی دئے گئے ہیں۔ حواشی غیر ضروری طریقہ سے طولانی ہو گئے ہیں۔ چند کتابوں کا پورا پورا نام بار بار دہرایا گیا ہے۔ جبکہ ان کے مخففات سے کام نکالا جا سکتا تھا۔ چھپائی کی غلطیاں بھی کافی ہیں۔

ہندوستان میں فارسی ادب کے مطالعہ میں ملکی عناصر کا خیال رکھنا ضروری ہے، بلکہ ان پر اصرار ہونا چاہئے۔ داراشکوہ اور جہاں آرا دونوں کو اس کتاب میں برابر سے ایک ایک صفحہ دیا گیا ہے جبکہ داراشکوہ نے فارسی ادب میں اپنی تخلیق، تحریر اور سرپرستی سے ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ اس عہد میں بہت سی ہندوستانی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا اور مقامی داستانوں کو فارسی کا لباس پہنایا گیا ہے جنہیں پورے طریقے سے اب تک منظرِ عام پر نہیں لایا گیا ہے۔

(امیر حسن عابدی)

جواب طلب امور کے لئے مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک ٹکٹ ضرور بھیجیں



گزشتہ دنوں جمہوریہ گویانا کے وزیراعظم عزت مآب لینڈن فارلس سیمپن برہم اور شریمتی وائلا برہم ہندوستان کے سرکاری دورے پر تشریف لائے تھے آپ نے ہندوستانی رہنماؤں سے مشترکہ دلچسپی کے مسائل پر بات چیت کی۔ (تصویر میں) ۲۸ جنوری کو آپ دونوں نے مہاتما گاندھی کی سمادھی پر پھول چڑھائے۔

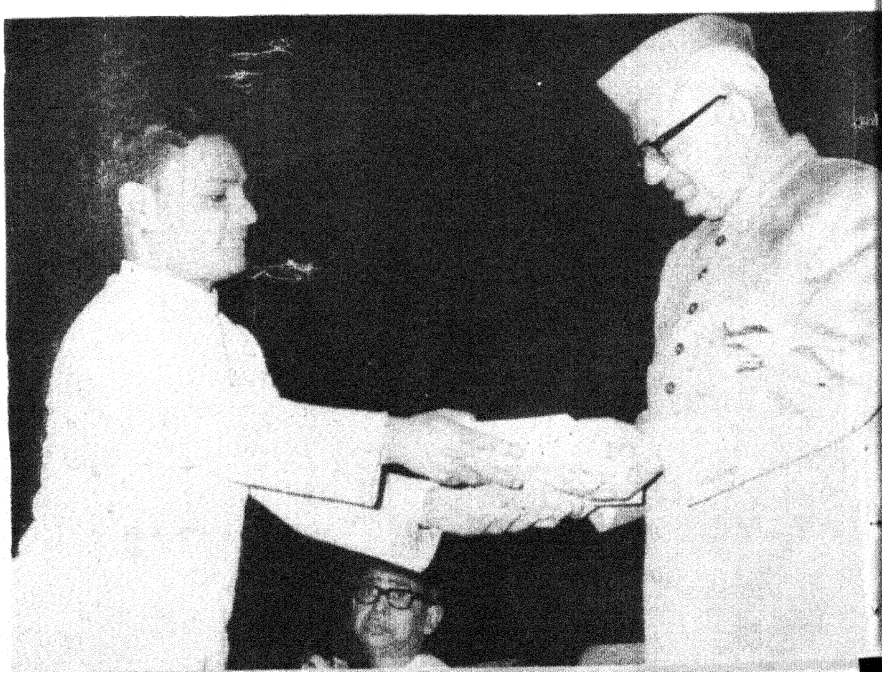

حکومتِ ہند ہر سال ہندوستانی زبانوں
شائع ہونے والی کتابوں کو بہترین طباعت،
کاری اور گٹ اپ کے مختلف زمروں کے
انعامات دیتی ہے۔ ۱۹۶۹ء کے دوران میں
اور شائع ہونے والی ہندوستانی زبانوں کے
قومی مقابلے میں نسخۂ عرشی زادہ دیوان غالب
غالب کو دو انعامات کا مستحق قرار دیا۔
(تصویر میں) ۳ فروری ۱۹۷۱ء کو شری گوپال
پاٹھک نائب صدر جمہوریہ ہند نے وگیان بھ
دلی میں منعقدہ ایک تقریب میں شری مودود علی
امروہوی کو پروڈکشن کا انعام دیا۔ دوسرا
شری اکبر علی خاں کو دیا گیا جو ڈیزائننگ
تھا۔



روشن صدیقی

۱۰ جولائی ۱۹۳۶ء - ۳ جنوری ۱۹۷۱ء

Vol. 29 No. 8 AJKAL (Monthly) March 1971

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55
Regd. No. D-509

Osmania University Library
HYDERABAD (DECCAN)

# آج کل

۷۰ پیسے

اپریل ۱۹۷۱ء

۱۹۶۱ء




مارچ ۱۹۷۱ء میں ہندوستان میں لوک سبھا اور بعض اسمبلیوں کے وسطِ مدتی انتخابات ہوئے آزاد اور غیر جانبدارانہ انتخابات جمہوریۂ ہند کا طرۂ امتیاز رہے

تصویر میں :- (اوپر) سرینگر کے ایک پولنگ بوتھ کے سامنے ووٹروں کی قطار

(نیچے) کام روپ (آسام) کے ایک پولنگ بوتھ پر ووٹ ڈالنے والی خواتین اپنی باری کے انتظار میں کھڑی ہیں۔

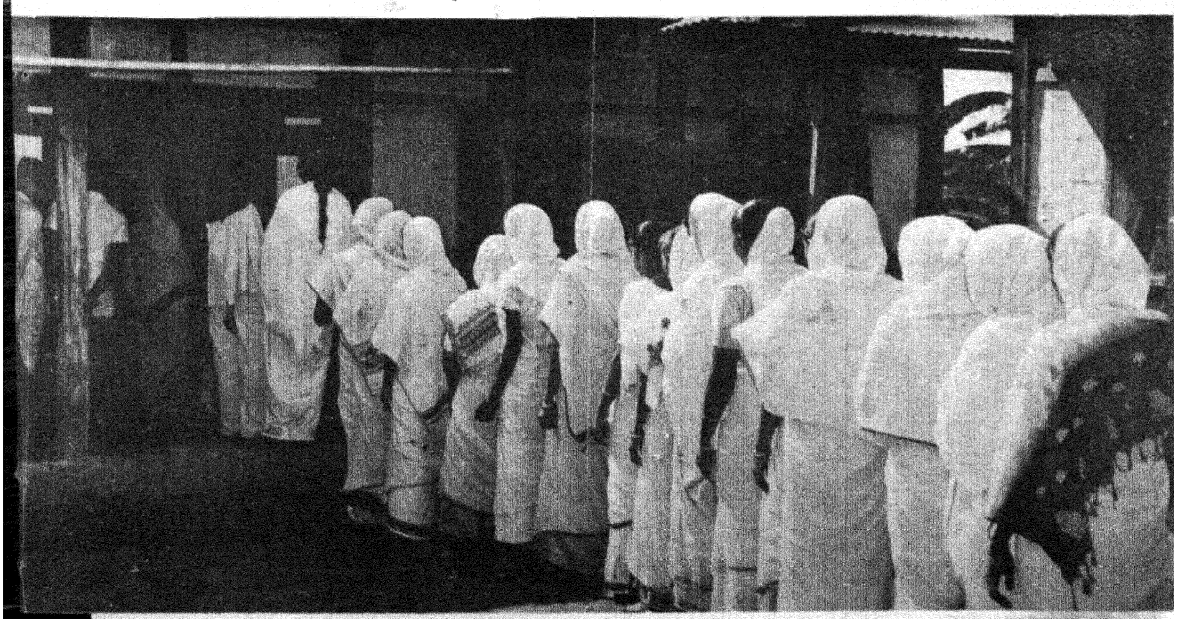

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

# آج کل

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۲۹ — شمارہ ۹
اپریل ۱۹۷۱ء
چیتر بیساکھ شک سمت ۱۸۹۳

سرورق — عمل: مدن موہن ملک

## ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ملاحظات | | ۲ |
| غزل | جمیل مظہری | ۳ |
| غبار کارواں (۱۴) | محمد حسن | ۴ |
| غزل | نذیر بنارسی | ۷ |
| غزلیں | وحید اختر، بشیر بدر، من موہن تلخ | ۸ |
| میرے زمانے کا علی گڑھ | عصمت چغتائی | ۹ |
| ان کہی (نظم) | بشر نواز | ۱۱ |
| کہانی (کہانی) | سہیل عظیم آبادی | ۱۲ |
| امیر خسرو کا کلام۔ ایک تاریخی ہیت | ظ۔ انصاری | ۱۵ |
| کام اور چام (کہانی) | کرتار سنگھ دگل | ۱۹ |
| حسن اور وفا (نظم) | جگدیش سہائے سکسینہ | ۲۱ |
| نظریات کا تصادم | محسن عظیم آبادی | ۲۲ |
| غزل | اختر بستوی | ۲۶ |
| بولتے منہ کی پہلی نظم | صلاح الدین پرویز | ۲۷ |
| زور نمو (نظم) | مشتاق علی شاہد | ۲۷ |
| تہوار (نظم) | جوہر بھارتی | ۲۷ |
| ایک ڈوبتا جزیرہ (کہانی) | رفعت سروش | ۲۹ |
| دو غزلیں | مظہر امام۔ غلام مرتضیٰ راہی | ۳۲ |
| منیر شکوہ آبادی | سعادت علی صدیقی | ۳۳ |
| غزلیں | منشاء الرحمن خاں منشا۔ خاطر حافظی<br>علیم اختر مظفر نگری۔ دھرم پال عاقل | ۳۷ |
| میگھالیہ | راج نرائن راز | ۳۸ |
| وقت کا تقاضہ ہے (نظم) | اعجاز فاطمہ | ۴۳ |
| اردو افسانہ کل آج اور کل (تبصرہ) | دیویندر اسر | ۴۴ |


شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آج کل (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی




یکم مارچ سے دس مارچ کے درمیان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں وسط مدتی انتخابات ہوئے۔ لوک سبھا کی ۵۱۸ اور تامل ناڈو، مغربی بنگال اور اُڑیسہ کی ۴۶۵ اسمبلی نشستوں کے لئے ووٹ ڈالے گئے۔ ووٹروں کی مجموعی تعداد لوک سبھا کے ۲۷ کروڑ ۵۰ لاکھ تھی جس میں سے تقریباً ۵۰ سے ۶۰ فی صد ووٹروں نے ووٹ ڈالے۔

متعدد سیاسی پارٹیوں کے علاوہ بہت سے آزاد امیدواروں نے چناؤ لڑا اور ووٹروں کے سامنے مختلف نوعیت اور پروگراموں کے منشور رہے لیکن رائے دہندوں نے اکثریت رائے سے شری جگجیون رام کی صدارت والی کانگرس کو کامیاب بنایا ہے۔ یہ الیکشن برسر اقتدار کانگرس نے شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت میں لڑا اور ملک سے غریبی، بیکاری اور پسماندگی دُور کرنے کے اُن کے پروگرام کو قبولیت عام نصیب ہوئی۔ اُن کو جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عوام ایک مستحکم اور پائیدار حکومت کے خواہاں ہیں تاکہ ایسی حکومت اعتماد کے ساتھ ملک میں ترقی پسند طاقتوں کو آگے بڑھائے اور جمہوریت، سیکولرازم اور سوشلزم کو فروغ دے۔

یہ انتخابات کئی لحاظ سے بڑے اہم ہیں۔ ووٹروں کی اکثریت نے ذات پات مذہب و فرقہ اور علاقائی عصبیت سے بالاتر ہو کر مسائل کی بنیاد پر ووٹ دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ووٹروں کا سیاسی شعور اب پختہ ہو گیا ہے اور وہ سمجھنے لگے ہیں کہ اصل مسائل کیا ہیں اور اُن کے حل کرنے میں وہ کس طرح مددگار ہو سکتے ہیں شریمتی اندرا گاندھی کی جو ملک گیر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ معمول علاقائی اختلافات سے قطع نظر تمام ملک کے بنیادی مسائل ایک ہیں۔ اور سارے ملک کی قسمت ایک ہی دور سے بندھی ہے۔ ووٹروں نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ ملک کی ترقی اور خوش حالی تشدد، مذہبی منافرت اور علاقائی عصبیت میں نہیں ہے بلکہ ایک متوازن اور سنجیدہ سیاسی پروگرام میں ہے جس کے ذریعے بتدریج ملک کے مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے ہندوستان میں آزادی سے پہلے لوگوں کو بڑے محدود پیمانے پر ووٹ ڈالنے کا حق حاصل تھا۔ جمہوریہ ہند کے قیام کے بعد تمام بالغوں کو ووٹ ڈالنے کا حق دینا ایک بڑا جرأت مندانہ قدم تھا اور ہندوستان کے دستور سازوں نے یہ بڑا انقلاب آفریں فیصلہ کیا تھا۔ مگر گزشتہ چار انتخابات اور حالیہ انتخاب سے ظاہر ہو گیا کہ ان پر جو اعتماد کیا گیا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔

آزادانہ اور بالکل غیر جانبدارانہ انتخابات کے لئے الیکشن کمیشن نے بڑے پیمانے پر تیاریاں کی تھیں۔ ایک اندازے کے مطابق الیکشن کے مختلف کاموں میں تقریباً ۲۰ لاکھ سرکاری کارکن مصروف رہے۔ ۵۱۸ انتخابی حلقوں میں ۳ لاکھ ۴۰ ہزار سے زائد پولنگ بوتھ قائم کئے گئے۔ ان بوتھوں پر دس لاکھ بیلٹ بکس پہنچائے گئے۔

نئے انتخابات نے ملک میں امید و اعتماد کی ایک فضا پیدا کی ہے۔ جمہوری طریقہ کار، سیکولرازم، اور پُرامن طریقہ کار میں لوگوں کا اعتماد بڑھا ہے اور دُنیا کے سامنے ایک اچھا اور مثالی نمونہ آیا ہے۔ ضرورت ہے کہ عوام بھی سچی لگن، محنت اور خلوص سے کام کریں اور ملک کو آگے بڑھانے میں بھرپور حصہ لیں۔

ویسٹ انڈیز کے اپنے حالیہ دورے میں ہندوستانی کرکٹ ٹیم نے ویسٹ انڈیز کے ساتھ اپنے دوسرے میچ میں ویسٹ انڈیز کو سات وکٹوں سے شکست دی ہے۔ گزشتہ ۲۲ سال میں ویسٹ انڈیز کے خلاف ہندوستان کی یہ پہلی جیت ہے۔ اس سلسلہ کا پہلا میچ برابر رہا ہے۔

کرکٹ کے کھیل میں ہندوستان کی یہ شاندار کامیابی ہے گزشتہ ایشیائی کھیلوں میں بھی ہندوستانی کھلاڑیوں نے خاصا نام پیدا کیا ہمیں امید اور توقع رکھنی چاہئے کہ آئندہ بھی ہمارے کھلاڑی مزید کامیابیاں حاصل کریں گے۔



جمیل مظہری

یہ شراب خانوں میں جا بسے، وہ حرم تک آ کے ٹھہر گئے
وہی رہ گزر پہ ہیں چپ کھڑے جو اِدھر گئے نہ اُدھر گئے

جو حرم میں آئے تھے دیر سے، وہ حرم سے لوٹ کے گھر گئے
جنہیں گھر کی راہ نہ مل سکی وہ خبر نہیں کہ کدھر گئے

وہی تشنگی کو بتا سکیں گے سراب و آب کا فاصلہ
جو دیارِ نکہت و رنگ سے یہ مقامِ فکر و نظر گئے

ہے ستم و کرم کی بحث کیا، چلی تند و تیز سی اک ہوا
جو نکھر گئے سو نکھر گئے، جو بکھر گئے سو بکھر گئے

ترے ذہن کا یہ فشار ہے کہ اس آئینے پہ غبار ہے
جنہیں تھا سنورنے کا حوصلہ اسی آئینے میں سنور گئے

نہ خفا ہو میرے دماغ سے، نہ بہل سکوں گا چراغ سے
تو اُنہیں میں مجھ کو شمار کر جو لئے اُمیدِ سحر گئے

نہ ہوں کیوں کہ اس پہ نثار ہم، ہوئے تیرگی میں شرار ہم
ہیں وہ کرمکِ شبِ تار ہم جو نمودِ صبح سے ڈر گئے

نہ غبارِ دوشِ صبا بنے، نہ شمیمِ زلفِ رسا بنے
نہ خروشِ بانگِ درا بنے، بڑی خامشی سے گزر گئے

کوئی نقشِ پا نہ بنا سکے، کوئی راستہ نہ بنا سکے
یہ سفر تو کوئی سفر نہیں کہ مثالِ گردِ سفر گئے

گزر اس مقام سے سرسری، یہ دیارِ عشق ہے مظہری
جو گزر گئے سو گزر گئے، جو ٹھہر گئے سو ٹھہر گئے

محمد حسن



# ہمارے کارواں

( ۱۴ )

اپنے بارے میں کیا لکھوں۔ واقعات اور شخصیات جنہوں نے متاثر کیا وہ ہیں جن میں گفتنی درج گزٹ باقی جو ہیں ناگفتنی۔ ناگفتنی کو کہنے میں فسادِ خلق کا اندیشہ اور ہر اندیشہ اندیشہ ہائے دور دراز سے عبارت ہے۔ پھر بہت سے اثرات ایسی شخصیتوں اور ایسے واقعات کے ہوتے ہیں، جو کسی گزٹ میں درج نہیں جن کو پہچاننا خود میرے لئے بھی دشوار ہے۔

ایک واقعہ جو ابھی یاد آیا ہے اس کے کردار بھی اسی نوعیت کے ہیں۔ ہیوٹ مسلم ہائی اسکول مراد آباد میں زیرِ تعلیم تھا۔ زمانہ وہ تھا جب انگریز ہندوستان پر حکمراں تھے اور سر محمد یعقوب جو اس زمانے کی اہم شخصیتوں میں تھے ہمارے اسکول کے طلباء کو اطیعو اللہ واطیعو الرسول واولی الامر منکم کا یہ مطلب سمجھا جاتے تھے کہ ہر ایک مسلمان پر خدا رسول کے علاوہ حکمرانوں کی اطاعت بھی فرض ہے۔ نواب صاحب رامپور باہر کے دورے سے واپس آتے اور اسکول کے سامنے والے کٹ گھر اسٹیشن سے ان کا اسپیشل گزرتا تو اسکول کے لڑکے سلامی کے لئے جمع کئے جاتے اور مٹھائی تقسیم ہوتی۔ اسکول کے چار اساتذہ کی شخصیتوں کا نقش میرے لئے آج بھی ناقابلِ فراموش ہے۔ ان میں ایک تھے محمد طیب، جن سے اچھا اُستاد مجھے زندگی میں میسر نہ ہوا۔ ان کا ہنر یہ تھا کہ مشکل سے مشکل اور خشک سے خشک مضمون کو ایسا دلکش اور دلچسپ بنا دیتے تھے کہ اس کے بغیر جینا دشوار ہو جاتا تھا۔ اُن کی ذہانت ہر مضمون میں نئی کشش پیدا کرتی اور تعلیم کو ایک جیتا جاگتا تجربہ بنا دیتی تھی۔ دوسرے تھے حلیم صاحب جو ہم سب کو یورپین ہسٹری پڑھاتے تھے۔ سیدھے سادے پان کھانے والے سیاہ شیروانی پہننے والے بید کی چھڑی ہلاتے ہوئے کلاس میں آتے، لڑکے اُن کے کلاس میں شور مچاتے اور وہ پورے خلوص سے پڑھاتے رہتے، پھر ایک دن معلوم ہوا کہ وہ نوکری سے الگ ہو گئے۔ لڑکے اُن کے پاس گئے تو انہوں نے لڑکوں کو ڈانٹ پلائی "جاؤ اپنا کام کرو تمہیں ان مخمصوں سے کیا مطلب۔ منیجر صاحب چاہتے ہیں کہ میں تم لوگوں پر سختی کر کے ڈسپلن قائم رکھوں۔ تم ہی تو میرے بچے ہو۔ اگر میرا بیٹا زندہ رہتا تو کیا تمہاری طرح شرارتیں نہ کرتا؟ کیا میں اس کے ساتھ سختی کرتا۔ مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ جاؤ اپنا کام کرو۔"

تیسرے تھے اسفندیار بیگ صاحب جو ہمیشہ کھوئے کھوئے سے رہتے۔ حساب کا کوئی سوال مروجہ قاعدوں سے شاید ہی کبھی حل کرتے ہوں ہمیشہ انوکھا زاویہ نکالتے اور حساب اور ریاضی کے سوالوں کے انہی زاویوں میں گم رہتے تھے نت نئی باتیں جودتِ ذہن سے پیدا کرتے اور باقی تمام باتوں کو ذہن سے ایسا محو کر دیتے جیسے ریاضی حساب کے مسائل کے علاوہ زندگی کے باقی تمام مسائل محض اضافی ہوں اور چوتھے تھے ضیاء الرحمٰن صاحب جو تاریخ کے اُستاد تھے۔ خاموش متدین اور سنجیدہ، کھدر کی شیروانی اور ٹوپی پہنتے اور پورے اسکول میں اکیلے معتبر اور مستند کانگرسی سمجھے جاتے۔ گفتگو ہمیشہ مدھم آوازیں کرتے اور غصہ شاذ و نادر ہوتے تھے۔ کلاس میں البتہ تاریخ کی تعبیر وہ اسی نہج سے ضرور کر دیتے تھے جس سے اپنی سیاسی غلامی اور انگریز دشمنی کا نقش جاگزیں ہوتا جاتا تھا۔

ان چار کرداروں نے میری شخصیت کی تصنیف و تالیف کی۔ طیب صاحب نے علم و ادب سے گہری شیفتگی پیدا کرائی۔ اسفندیار بیگ صاحب نے اس شیفتگی میں محویت کا سبق دیا۔ حلیم صاحب سے دردمندی سیکھی اور ضیاء الرحمٰن صاحب سے انگریز دشمنی اور سیاسی غلامی کے خلاف نفرت کا سبق ملا۔ میں نے کھدر پہننا شروع کیا۔ سیاسیات کی ابتدائی معلومات حاصل کیں اور اخبارات کے مطالعے کی ابتدا ہوئی۔ اسفندیار بیگ صاحب کسی دوسرے صاحب کا کلاس لے رہے تھے انہوں نے اُسے بیت بازی کے لئے

وقف کر دیا۔ میرے ہم جماعتوں میں ایک نہایت خوش رو اور تنومند طالب علم غفران تھا جو تنہا پورے کلاس سے بیت بازی کا مقابلہ کر رہا تھا۔ گھنٹہ ختم ہو گیا بیت بازی ختم نہ ہوئی۔ دوسرے دن غفران کو سنانے کے لیے میں نے اپنے والد سے پہلی بار دیوان غالب کا نظامی ایڈیشن حاصل کیا اور ذ۔ ض۔ ظ۔ ط وغیرہ پر ختم ہونے والے اشعار رٹ لیے۔ دوسرے دن بھی میدان غفران ہی کے ہاتھ رہا مگر دیوان غالب سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ دیوان کوئی دس سال پہلے تک میرے قبضے میں رہا اور ہر بار اس کے مطالعے سے ایک خاص قسم کی زندگی اور روشنی ملتی رہی۔ ادب زندگی کے ایک شعبے بلکہ ایک لازمی حصے کی طرح میرے سامنے آیا اور اس کا جادو اتنا گہرا ہوتا چلا گیا کہ جب نویں جماعت میں سائنس یا عربی لینے کا سوال تھا تو میں نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف سائنس سے دامن کشی اختیار کی اور ادب کے کوچے میں رہ نوردی کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس کے بعد کی یادیں بڑی منتشر سی ہیں۔ مراد آباد کا گنج بازار لال جھنڈے اٹھائے ہوئے گرشیش ماتھر اور مصور حسین نجم کچھ میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے لوگ۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے میرے لیے یہ سب کچھ بہت اجنبی تھا۔ میرا خاندان مراد آباد کے نہایت متشرع خاندانوں میں تھا۔ دھیرے دھیرے فکری اور عملی بغاوت کی یہ آنچ تیز ہوتی گئی۔ اسباب و محرکات کی فہرست طولانی ہے مگر ۱۹۴۱ء شروع ہوتے ہوئے اس نوعمر لڑکے نے جس نے کبھی اپنے گھر سے تنہا قدم باہر نہیں نکالا تھا فکر کے تمام مسلمات و اقدار پر سوالیہ نشان قائم کرنے شروع کر دیے، اور جب پرائیوٹ انٹرمیجیٹ پاس کرنے کے بعد اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے کسی دوسری یونیورسٹی جانے کا سوال تھا تو میری آزاد روی مجھے علی گڑھ کے بجائے لکھنؤ لے گئی، جو ان دنوں باغیانہ فکر کا مرکز تھا۔

۱۹۴۲ء میں لکھنؤ پہنچا تھا اور ۱۹۵۴ء تک وہیں رہا۔ عمر عزیز کا اچھا خاصا بڑا حصہ وہیں گزرا۔ نیا ادب مکمل کے بند ہو چکا تھا۔ سردار جعفری اور مجاز دونوں وہاں سے جا چکے تھے۔ ڈاکٹر رشید جہاں اور ان کے شوہر صاحب زادہ محمود الظفر البتہ تھے۔ یونیورسٹی سیاسی آزادی کے نعروں سے آباد تھی۔ کانگریس کے چلائے ہوئے انفرادی ستیہ گرہ میں ڈاکٹر عبدالعلیم اور ڈاکٹر حسین ظہیر بھی جیل گئے تھے غرض لکھنؤ ملک کی فکری اور سیاسی فضا کا آئینہ تھا۔ جولائی میں لکھنؤ پہنچا تھا۔ اگست ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک چلی اور طلبا کے جلوس پر فائرنگ ہوئی۔ پوری فضا جیسے برق رفتار تیزی سے بدل گئی اور نوجوان طلبا کی زندگی میں آزادی کے جذبے کے سوا باقی ہر چیز فضول سی معلوم ہونے لگی۔

اسی موڑ پر میری ملاقات ان چار شخصیتوں سے ہوئی جنہوں نے میری زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں ان میں پہلا نام اسرار الحق مجاز کا ہے۔ دوسرا نصیر حیدر کا تیسرا پروفیسر احتشام حسین کا اور چوتھا پروفیسر آل احمد سرور کا۔ مجھے تصنیف و مطالعہ کا مرض تو ایام طالب علمی ہی میں لاحق ہو چکا تھا لیکن مجاز نے پہلی بار ادب کو زندگی بنا کے گزارنے کی تصویر میرے سامنے پیش کر دی۔ آج اس شخصیت کے سارے دل نواز گوشوں کو چند لفظوں میں بیان کرنا بھی ممکن نہیں جو لوگ مجاز سے نہیں ملے وہ صرف اُن کے کلام سے شخصیت تک پہنچنے میں دشواری محسوس کریں گے۔ "دیوداس" فلم کے بعد جو ایک نسل ہندوستانی نوجوانوں میں اُبھری تھی جو عشق کو خود سوزی کا ذریعہ جانتی تھی اور تصور پرستی کی قربان گاہ پر مادی راحتوں اور آسودگیوں کی قربانی دینے کا کس بل رکھتی تھی اسی کی ایک خاموش تصویر مجاز تھے۔ بذلہ سنجی، لطیفہ بازی اور شانِ کج کلاہی میں ایک عجیب شان تھی جو زندگی کی ظاہری چمک دمک اور آسودگی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ شراب اس راہ کی آتش نمرود تھی۔ جس میں بقول مجاز "جل بجھے کتنے خلیل، آگ گلستاں نہ بنی" مگر مجاز سے خفیف الحرکاتی اور گھٹیا ادبی اور غیر ادبی سازشوں سے نفرت کا سبق سیکھنے کی کوشش کی۔ مجھے مجاز کی سی رندی ملی نہ بانکپن مگر مجاز کی زندگی اور اُس کے کرب و اضطراب نے یہ ضرور دکھا دیا کہ ایک شعر ترکے لئے تجربات کے کتنے جہنموں سے گزرنا ہوتا ہے اور زندگی کو شاعری اور شاعری کو زندگی بنانے کی ہفتخواں کیسی دشوار ہے۔

نصیر حیدر کو بہت کم لوگ جانتے ہیں لیکن اس شخص نے شعری کیفیات کو زندگی بنانے کا جو تجربہ کیا تھا اس کی نظیر میرے نزدیک بہت کم ہوگی۔ نصیر حیدر ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہونے کے باوجود زندگی کی معنویت کی جان کاہ تلاش میں اس طرح سرگرداں پھرا کہ پھر اپنی منزل تک نہ پہنچا۔ زندگی کے تجربات جو حسی کیفیات چھوڑتے ہیں ان کی اصل کیا ہے اور نشاط و الم کے ان لمحوں میں انسانی زندگی کی تکمیل کا احساس مضمر ہے یا نہیں؟ کیا نشاط اور مسرت کی تلاش آرزوؤں کی تکمیل کے ذریعے ممکن ہے؟ یا مسرت کوئی اور شے ہے؟ اور ان سوالوں کے جواب میں نصیر حیدر نے اپنی زندگی کو اسی طرح تار تار کر ڈالا جیسے کوئی سائنس داں معمل میں کسی شے کا کیمیاوی تجزیہ کرتا ہو۔ نصیر حیدر شاعر تھا اور ہے مگر زندگی کی اصلی صلابت اور حقیقی معنویت کی تلاش میں وہ اتنی دُور جا چکا تھا کہ اسے اپنے کلام کی اشاعت کا عمل بھی مہمل نظر آنے لگا تھا۔ زندگی کے خلا کا ایسا بامعنی احساس، انسانی Predicament کا ایسا بھرپور تجربہ شاید ہی اس سے قبل اس طرح پیش کیا گیا ہو۔ چند شعر سنئے۔

کچھ ہوا تیز تھی کھلی تھی کتاب ❊ ایک پچھلا ورق الٹ آیا

---

یہ کھنڈر دیکھو اسی طرح کے کتنے نقشے
اہلِ تعمیر ابھی بیٹھے بناتے ہونگے

---

اسی یہ اہلِ ہوس پھر رہے ہو اترائے
وہ اک کرم جو ہمیں بارہا میسّر تھا

اب ڈھونڈھئے تو اس کا نشاں بھی نہ پائیے
وہ موج جو سفینۂ دل کو ڈبو گئی

پھر احتشام صاحب کا نام ہے جنہوں نے کلاس میں اور اس کے باہر مجھے فکر کی نئی جہتوں کی طرف متوجہ کیا۔ مارکسزم سے میرا تعارف مراد آباد ہی میں ہو چکا تھا مگر اسے علمی اور فلسفیانہ راہ کے اعتبار سے یہ تعارف احتشام صاحب کی وساطت سے ہوا۔ احتشام صاحب نے ادب کو علم و دانش کا ایک حصہ بنا کر پیش کیا اور اس کا رشتہ تمام انسانی علوم سے اس طرح ملا دیا کہ ادب کی راہ سے انسانی فکر و دانش کے سبھی شعبوں کے دروازے کھلتے نظر آنے لگے۔ ان کے اندازِ بیان سے اثر قبول کرنے میں میں نے عمداً بہت احتیاط سے کام لیا ہے لیکن اُن کے اندازِ فکر کے نقوش میری تحریروں میں اور شاید میری شخصیت میں بھی ملیں گے۔ مجروح کا ایک شعر ہے شعر بہت بعد کا ہے لیکن ان تینوں شخصیتوں کے اثرات کا لب و لباب اسی ایک شعر میں آجاتا ہے۔

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

آل احمد سرور سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۴ء کے لگ بھگ ہوئی تھی ۱۹۴۶ء میں ان کے لکھنؤ آنے کے بعد سے لے کر علی گڑھ سے میرے دہلی آنے تک ان کے قریب ہونے کا موقع ملا ــــ ــــ ــــ ــــ ــــ سرور صاحب کی شخصیت میں دل نوازی اور کشش بے پناہ تھی اور ان کے اندازِ گفتگو میں نرمی، انداز تحریر میں شگفتگی اور چاشنی تھی اور ایک خاص قسم کا توازن اور رجائیت میرا اپنا خیال ہے کہ لکھنؤ میں قیام کے دوران میں یہ سب خوبیاں اپنے عروج پر تھیں۔ اُن سے بھی میں نے بہت کچھ سیکھا اور پایا۔

جہاں تک کتابوں کا سوال ہے مجھے ان سب کتابوں نے متاثر کیا ہے جن میں "شیریں دہوانگی" کے نقوش ہوں خاص طور پر گوئٹے کے ناول (Sorrow Of Weather) میں ورتھر کی داستان غم کے اثرات مدت تک میرے ذہن پر مرتسم رہے پھر واں گو کی سوانح پر مبنی ایرا ہم اسٹون کا ناول (Lust For Life) نے ایک مدت تک میرے ذہن پر غلبہ قائم رکھا تصور پرستی کی ایک آگ تھی جو ان ناولوں نے روشن کی اس آگ کے ناچتے شعلوں میں زندگی کی مادی آسائشوں اور ظلمتوں کی تلاش مہمل نظر آنے لگی اور وجود میں ایک حقیقی معنویت کی تلاش کے لیے اضطراب پیدا ہوا۔

۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۵۴ء تک کی روداد لکھنؤ کی ہے جسے میرا تشکیلی دور کہا جا سکتا ہے۔ اسی دوران ملک تقسیم ہوا۔ فرقہ وارانہ فسادات نے ملک میں خون کی ندیاں بہا دیں۔ اُردو سے آسانیاں چھین لی گئیں، زمینداریاں ختم ہوئیں اور میرا خاندان امارت سے غربت کی طرف آیا۔ میں اُردو میں ایم اے اور کچھ سال بعد پی ایچ ڈی کر کے انگریزی اخبار "پائنیر" کی نائب مدیروں کی صف میں شامل ہو گیا چند سال ان کی نیم ماہی فلم میگزین "فلم ملی" کا مدیر بھی رہا۔ مگر اس دوران اُردو میں تنقیدی مضامین اور ڈرامے لکھتا رہا اس لئے کہ ان ذرائع سے اپنی شخصیت کا اظہار کر سکے اپنے کو مجبور پاتا تھا۔ تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "ادبی تنقید" کے نام سے اور ڈراموں کا پہلا مجموعہ "پیسہ اور پرچھائیں" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے کچھ دنوں بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں بحیثیت لیکچرار تقرر ہوا اور ۱۹۶۳ء تک وہیں رہا۔

علی گڑھ میں جن شخصیتوں نے مجھے متاثر کیا ان میں سرفہرست پروفیسر رشید احمد صدیقی کا نام ہے جو ان دنوں شعبہ اُردو کے صدر تھے۔ لندن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اسرارِ رموز بہت دھیرے دھیرے کھولتا ہے۔ رشید صاحب کا یہی حال ہے۔ وہ اپنے حیرت انگیز اور اعلیٰ ترین انسانی اور فنی جوہروں کو زرگل کی طرح چھپائے رہتے ہیں۔ جب تک کسی کو اُن سے قریب ہونے کی سعادت حاصل نہ ہو اس وقت تک ان کی صحیح عظمت کا اندازہ لگانا مشکل ہے لفظ کی جیسی پرکھ اور اندازِ بیان کی لطیف ترین پرتوں کی جیسی پہچان انہیں ہے کبیر کے بعد شاید ہی کسی کو ملی ہو۔ اُردو نثر کا ایسا مزاج داں شاید ہی کبھی پیدا ہوا ہو۔

پھر ایک عجیب و غریب شخصیت مسعود حسین خاں کی ہے جنہوں نے ایک محترم رفیق اور شفیق دوست کی حیثیت سے اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ مسعود صاحب قائم گنج کے پٹھان ہیں۔ شمشیر زنی کا فن کب کا چھوٹ چکا ہے البتہ سپاہیانہ وراثت سے بات کا کھرا پن انھیں ملا ہے۔ بات کے کھرے اور کردار کے شفاف۔

۱۹۶۳ء میں دہلی آیا۔ اس سے دو چار سال پہلے کی بات ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب سے پہلی بار غائبانہ حاصل ہوا۔ قاضی صاحب ہمارے دور کے ابوالفضل ہیں۔ ان کی علمیت، ذکاوت، اور قوتِ حافظہ کی معدودے چند ہی مثالیں اس دور میں ملیں گی انہوں نے ادبی تحقیق سے جس معیار کا مطالبہ کیا اور خود جو اعلیٰ معیار قائم کیا وہ اُردو تو کیا تمام ہندوستانی زبانوں میں سب سے اعلیٰ تھا۔ یہ بات میرے نزدیک کبھی اہم نہیں رہی کہ قاضی صاحب کس مصنف اور اس کی کس کتاب پر معترض ہوتے ہیں۔ ان کی گرفت یقیناً سخت اور لہجہ اکثر تند و تیز ہوتا ہے مگر جو بات اہم ہے دراصل وہ ذخیرۂ معلومات ہے جو وہ اس نکتہ چینی کے دوران فراہم کرتے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سب سے زیادہ اہمیت میرے نزدیک اس ذہنی تربیت کی ہے اور اس طرزِ استدلال کی ہے جس کا

مقالہ قاضی صاحب اُردو کے محققین سے کرتے ہیں۔ یہ ذہنی تربیت صرف قانون ریاضی اور فلسفہ و منطق کے ڈسپلن سے حاصل ہو سکتی ہے جن میں استنباط نتائج کا اسلوب دوسرے علوم کے مقابلے میں زیادہ متعین ہے اس طرز استدلال اور ذہنی تربیت کا چلن ہمارے یہاں ہو جائے تو ہندوستانی سماج آج سے کہیں بہتر سماج ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں معاملات جذباتی تاثر اور تعصب کے بجائے دلائل و براہین کے ذریعے زیادہ معروضی انداز سے پیش ہو جایا کریں گے

پھر سید مسعود حسن رضوی کی شخصیت ہے جن کی شائستگی، نرمی اور ملائمت نے مجھے انسانیت کے نئے تصور سے آشنا کیا اُن کے ہاں علم کی وہ انکساری ملتی ہے جو صرف سچے عالم کی پہچان ہے میں نے زندگی میں مسعود صاحب کے علاوہ دوسرا کوئی اُردو دان نہیں دیکھا جو گفتگو میں بھی اس قدر احتیاط برتتا ہو کہ اس کی زبان سے کوئی غلط لفظ، غلط لفظ یا غلط نحوی ترتیب کے ساتھ نہ نکلے یہ سب میرے محترم بزرگ ہیں جن میں ہر ایک خصوصیات روزگار میں سے ہے اور جن کی نظیر قرنوں میں جا کر پیدا ہوگی۔ ان کے علاوہ بے شمار لاتعداد شخصیتیں ہیں جن کا کوئی نام نہیں جانتا ان میں سے بعض کا تفصیلی تعارف ممکن ہے مگر شاید اس کا یہ محل نہیں۔ پھر وہ شخصیتیں بھی ہیں جن کا نام مجھے بھی معلوم نہیں بعض کا اصلی نام تو تھے مگر میرے تخیل نے انہیں کچھ کا کچھ بنا دیا۔ ان کا ایسا نقشہ اپنے ذہن میں قائم کر لیا کہ وہ کچھ کا کچھ ہو گئیں اور بقول اقبال "تراشیدم، پرستیدم، شکستم" منزلوں سے گذریں اور اس عمل کے دوران خود میں بھی تراشیدن، پرستیدن اور شکستن منزلوں سے انہیں کے ساتھ ساتھ گزرا اور ہر نئی شکست سے میں نے نیا حوصلہ بھی پایا نئی افسردگی بھی ملی جو زندگی کو نئی آگہی بخشتی ہے۔

میری دلچسپیاں متنوع رہی ہیں۔ تھوڑا بہت ادبی تحقیق و تنقید میں سر کھپایا ہے ڈرامے لکھے اور اس ضمن میں ریڈیو۔ ٹیلی وژن اور اسٹیج تک پہونچا صحافت کی تھوڑے دن کڑی جھیلی ہے اور ان میں سے ہر ایک میدان میں ایسی دلآویز قامت شخصیتیں نعمات اور تصانیف میری راہ میں آئی ہیں جنہوں نے میری تربیت بھی کی ہے اور گہرے اثرات بھی چھوڑے ہیں۔ مگر یہ سب قابل احترام ہستیاں جن میں کئی ایسی ہیں جنہیں میں نے ہیرو سمجھا ہے میری راہوں سے کٹتی ملتی ہوئی چلی ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کی شخصیت کے کسی پہلو سے میری راہ الگ نہ ہوتی ہو کیونکہ میری اقتاد طبع ان سے مختلف تھی اور میں جن راہوں سے ہوتا ہوا ان تک پہنچا تھا وہ بھی الگ تھیں اس لحاظ سے ان شخصیتوں کا پورا عکس میرے ہاں نہ ملے گا۔ البتہ جن شخصیتوں کو میں نے جس زاویے سے دیکھا اور سمجھا ہے اس زاویے سے ان کی روشنی سے اکتساب کی کوشش کرتا رہا ہوں۔



## غزل

نذیر بنارسی

آنکھ بربادیٔ دشمن پہ بھی بھر آتی ہے
کوئی گھر اُجڑے ادا سی مرے گھر آتی ہے
آج آرام کی کیوں شکل نظر آتی ہے
کیا بلا کوئی بہ انداز دگر آتی ہے
جب گلے مل کے بچھڑتا ہے کسی سے کوئی
میرے سینے کی دبی چوٹ اُبھر آتی ہے
بزم میں ان کی نظر دیکھوں کہ جادو ئے نظر
سب سمجھتے ہیں جدھر میں ہوں اُدھر آتی ہے
شاید اس دشت میں چلتی ہے ہوا میرے خلاف
کیوں مرے منہ پہ مری گرد سفر آتی ہے
میری مشکل ہو کہ ہو سارے جہاں کی مشکل
سب کا حل صرف محبت ہی نظر آتی ہے
ہے خیال اسکا کہ شرمندہ نہ ہو عہد وفا
ورنہ آرام کی صورت تو نظر آتی ہے
صبح کی خندہ زنی سے تو بچا لو آ کر
زلف دوشیزۂ شب تابہ کمر آتی ہے
دل مرا ڈوب گیا تم نے سہارا نہ دیا
ورنہ ایک ڈوبتی کشتی بھی اُبھر آتی ہے
اتنا مایوس نہ ہو اے دل بیتاب ٹھہر
جب نہیں آتی تو اب اتنی خبر آتی ہے
اسی رستے پہ کہیں وہ تو نہیں محو خرام
لڑکھڑاتی ہوئی کیوں باد سحر آتی ہے
یوالہوس طالب دیدار نہیں بن سکتا
سیکھنے سے کہیں تہذیب نظر آتی ہے
اس طرح یاس کے عالم میں وہ بیٹھے ہیں نذیر
سر بہ زانو مری تقدیر نظر آتی ہے



## وحید اختر

خوشادہ تیرہ جو دل کا ارادہ رکھتے ہیں
جو سر بلند ہیں، سینہ کشادہ رکھتے ہیں
ہے درد دولتِ دنیا و دیں سے دُنیا خوش
فراخ حوصلہ غم بھی زیادہ رکھتے ہیں
ہماری سطح تک آکر زمانہ ہم سے ملے
نہ آنکھ نیچی نہ ہم دلِ اُفتادہ رکھتے ہیں
مگر تراشے کوئی تو نئے خیال کی راہ
نظر میں ہم بھی عقیدے کا جادہ رکھتے ہیں
متاعِ بے حسی ارزاں ہے ہم کو بھی مل جائے
کہ ہم بھی جینے کا کچھ دل ارادہ رکھتے ہیں
نہ کوئی میکدہ اُن کا، نہ کوئی پیرِ مغاں
جو پیاس ظرفِ جہاں سے زیادہ رکھتے ہیں
ہمیں یہ ضد ہے کہ پتھر پہ بھی کتاب اُترے
بہت سے لوگ ورق دل کا سادہ رکھتے ہیں

## بشیر بدر

خوشبو کی پلک، رنگ کے لب چوم رہا ہوں
میں ہاتھ میں اک چاند لئے جھوم رہا ہوں

میں روزِ ازل سے تری آواز کے پیچھے
آوارہ ستارے کی طرح گھوم رہا ہوں

جن پر ترے اشکوں نے میرا نام لکھا تھا
اُن خستہ کتابوں کے ورق چوم رہا ہوں
دریا مرے ہونٹوں کو ترستا ہی رہے گا
پانی کے لئے اصغرِ معصوم رہا ہوں

اس دھوپ کو دیوار میں روزن نہیں ملتے
احساس ہوں الفاظ سے محروم رہا ہوں

## من موہن تلخ

ہوا کے ساتھ نہ اُڑنے کو چھوڑ جا مجھ کو
سمیٹ لوں گا میں خود کو اُٹھا تو لا مجھ کو
اُجاڑ سنگراؤں صبحوں کا ہوں میں اے سورج
ترا بھلا ہو کہ گھر میں کبھی بسا مجھ کو
میں اپنے دھیان سے خود ہی اُتر گیا ہر بار
یہ سب غلط ہے کسی نے نہیں سنا مجھ کو
تو میری بات ہے تو گونج جا مرے اندر
میں تیری چپ ہوں تو پھر توڑ کر دکھا مجھ کو
یہ راستہ کبھی اتنا تو گرد گرد نہ تھا
یہ کیا ہوا ہے بچھڑ کے اور کیا ہوا مجھ کو
میں سلسلہ ہوں صداؤں کے حرف بننے کا
تو سوچ کر ہی دوبارہ صدا بنا مجھ کو
مرا خیال ہے گھر کے بہت قریب ہوں میں
ہر ایک لمحہ نہ یوں ورنہ دیکھتا مجھ کو
یہ اب جو دیکھتا ہوں تجھ کو اپنے آپ میں خوش
تو جیسے دکھ میں بھی کچھ سہل ہو گیا مجھ کو
میں ایک شام ترے ساتھ رہ کے لُٹ سا گیا
کہ زندگی میں یہ لہجہ نہیں ملا مجھ کو
یہ روکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر نہ گزر
بنا کے اپنی توجہ نہ یوں ہٹا مجھ کو
میں دیکھ کر تجھے ایک سمت ہو سا جاتا ہوں
یہ لمبے لمبے ترے کیسے کر دیا مجھ کو
یہ موج موج سی آواز کشتیوں کی سی چپ
قدم بنا ہوں اندھیروں کا، اب بڑھا مجھ کو
پھر آج گھر مجھے لے آئی جوں کی توں یہ بات
کہ تلخ کوئی کھڑا دیکھتا رہا مجھ کو

# میرے زمانے کا

# علی گڑھ



*

عصمت چغتائی

علیگڑھ! میرے زمانے کا علی گڑھ جو تھا وہ ہے، اور وہی رہے گا۔ ممکن ہے کچھ پرانی کوٹھیاں ڈھا کر نئی بنا دی جائیں۔ ایک آدھ نئی سڑک کوٹ دی جائے، کچھ اور کالی پھندنے لگا دیئے جائیں، علی گڑھ کی رُوح نہیں بدلے گی۔

سن اٹھائیس میں جب ہم لوگ آگرے سے ہجرت کر کے علی گڑھ آئے تو ایسا لگا تھا جیسے پیرس پہونچ گئے۔ پتلی پتلی گلیوں اور ملی ہوئی چھتوں والے محلہ پنجہ شاہی سے ایک دم سول لائنز علی گڑھ میں پہونچ جانا اور حواس قائم رکھنا آسان کام نہیں اور خاص طور پر جبکہ شروع میں نواب مزمل اللہ خاں صاحب کی کوٹھی مزمل منزل میں قیام کا اتفاق ہو جائے۔ اتنے ڈھیر سارے بچے ساری کوٹھی میں اتنی گھمسان مچا بیٹھے کہ نواب صاحب کو اخلاج کا دورہ پڑ گیا اور بوکھلا کر بھیکم پور بھاگے۔ کبھی دبے سہمے رات برات کو ایمرجنسی سے مجبور ہو کر آجاتے نہایت خوشامد سے والد صاحب سے درخواست کرتے کہ ذرا بچے کم دوڑیں اور وہ دروازے نہ دھڑدھڑائیں تو بڑا کرم ہو۔ سخت مارشل لا رنافذ ہو جاتی اور مانگیں توڑ دیئے جانے کا الٹی میٹم مل جاتا، مگر ٹانگیں بھلا قابو میں آنے کے لئے بنی ہیں اور وہ بھی بچوں کی۔

نواب صاحب خودکشی کے قائل نہیں تھے لہٰذا ہم لوگ وہاں سے منتقل ہو کر مسعود محل میں رہنے لگے جو اس وقت صرف محل تھا ہوٹل نہیں بنا تھا۔ یہاں بھی ہم لوگ زیادہ دن نہ جیل پائے تو ڈگی کے پاس دو بنگلے تھے اُن میں رہنے لگے۔ دونوں بنگلوں کو ترچھی بانٹی دیوار سے جوڑ دیا گیا اور ایک لق و دق صحن بچوں، کتوں، بلیوں اور مرغیوں کی جنت بن گیا۔ پاس ڈگی تھی اس کے علاوہ بھی کئی گڈھے بنگلوں سے ملحق موجود تھے۔ ہر طرف کیچڑ اور اونچی اونچی گھاس سانپوں مینڈکوں اور مچھروں کی اڈا اٹ بستیاں۔

یونی ورسٹی قریب ہی تھی۔ شورٹ کٹ کے لئے صبح سے شام تک کالی شیروانیوں کا تانتا لگا رہتا۔ پرے کے پرے سائیکلوں پر اُڑے چلے جاتے۔ گرلز اسکول بھی کھیتوں بہت دور نہیں پڑتا تھا۔ سب بچوں کے نام فرداً فرداً لکھا دیئے گئے اور برسوں اسکول جاتے رہے۔ زنانے اور مردانے اداروں کی طرح دو ٹکڑے سوسائٹی کے بھی موجود تھے۔ جب تک پردا نہیں ہوا یونی ورسٹی میں کوئی ایٹ ہوم یا پارٹی ہوتی تو سارے بچے والد کی سخت منادی کے باوجود پہونچ جاتے پیچ پیچ کر پیسٹریاں اور نمکپارے کھاتے اور جیبوں میں بھر لاتے۔ باقی باتیں تفصیل سے یاد نہیں کیا ہوتا تھا۔ کیوں ہوتا تھا یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایک جھلک مولانا شوکت علی کی یاد ہے۔ بے حد لمبے چوڑے، زور زور سے بولتے اور قہقہے لگاتے ہوئے پھر

جب پردہ ہوگیا یعنی نوکر اور گنوار قسم کے لوگوں سے نہیں کوئی شریف آدمی آئے تو باہر کُرتہ کڑے لگانا منع ہوگیا تب سے زندگی بالکل ہی زنانی حدوں تک بندھ گئی۔ گرلز کالج کے ہنگاموں اور ڈراموں کا انتظار رہتا۔ وہ خلقت جمع ہوتی کہ توبہ بھلی سارا شہر اُمڈ پڑتا۔ بیاہ شادیوں کے جوڑے نکل پڑتے اور بڑی گہما گہمی رہتی۔

اس کے بعد دنیا اور بھی محدود ہوگئی۔ بورڈنگ میں اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے جو کچھ بھی ہنگامہ ممکن ہوسکتا ہے برپا رہتا تھا۔ ڈے اسکالر لڑکیوں کے ذریعے اُن کے بھائیوں اور بھائیوں کے دوستوں کے ناک نقشے پر بھی اندھا دُھند تنقیدیں ہوا کرتی تھیں۔ جن خوش نصیبوں کے چاہنے والے یا منگیتر ہوتے ان کا ذکر کرکے منہ کا مزہ بدلا جاتا۔ باہر کیا ہو رہا ہے بہت کم پتہ چلتا تھا۔

ہاں ایک قیامت خیز وقت آتا تھا جس کا سال بھر انتظار رہتا تھا، وہ تھی نمائش۔ ساجھے کے تانگے اور شکرمیں کرکے ٹوٹ پڑتے تھے ٹکے تو ہوتے تھے کم اور طبیعتِ بلا کی شوقین۔ خریداری کم اور چٹکس زیادہ۔ یہ اور بات تھی کہ جہاں کالج کی لڑکیاں چوڑی والے یا بندوں نکلیس والے کی دوکان پر پہنچیں اور کالی شیروانیوں کے پرے جمع ہونے لگتے۔ کہنے والے کہتے تھے کہ کتنے ہی نہایت کامیاب عشق چلے ہیں کتنی ہی شادیاں ہوئیں زیادہ تر تو دلِ ٹوٹا کرتے تھے جب نمائش اُٹھ جاتی سب کچھ اُٹھ جاتا۔ سب کچھ ہوتا بھی کتنا تھا۔ بس فہقہوں کی اَدل بدل۔ کبھی کوئی پرچہ ورچہ بھی چل جاتا تھا۔ زیادہ تر ٹھنڈی آہیں ہی بھرنی پڑتی تھیں۔

مرد ذات کی بڑی دہشت تھی، خاص طور پر کالج کے لڑکے تو زہر میں بجھے تیر ہوا کرتے ہیں۔ بڑی بوڑھیاں پولیس کے سپاہیوں سے زیادہ چوکس لڑکیوں کی رکھوالی کرتیں۔ ذرا سی بات کا یہ بڑا پہاڑ بنا کر کھڑا کر دیا جاتا۔ نہ جانے کتنی لڑکیاں آوارہ اور بدمعاش مشہور ہوجاتی تھیں۔ بہت سے بدنام لڑکے تھے جن کے ناموں کو سُن کر کانوں پر ہاتھ دھرے جاتے تھے۔ بدرو، بٹو وحید ..... اور نہ جانے کون کون! جہاں آگ اور مٹی کے تیل کا گودام پاس پاس ہوں وہاں لوگ دھماکوں سے ڈرنے ہی لگتے ہیں۔ زنانہ مردانہ تعلیمی اداروں کا وجود کافی دہشت انگیز ہے۔ دنیا کتنی بھی ترقی کرجائے۔ علی گڑھ کی فضا سے یہ خوف نہیں مٹے گا۔ آج بھی علیگڑھ میں کم و بیش اتنا ہی سخت سنسر ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس ماحول میں کچھ رومان سانس لے رہا ہے۔ بھٹی کی کھٹ پٹائی فضا میں تو دم چھوڑ چکا۔ جیسے یہاں لوگ فلسٹار ڈیز کے اسکینڈل کی تاک میں رہتے ہیں، وہاں سب کی نظریں زنانہ اور مردانہ کالجوں پر جمی رہتی ہیں۔ کون کس سے ملا؟ کون مسکرایا؟ کس کی آنکھیں ڈبڈبائیں غرض چال چلن پر بے حد زور ہے۔

علی گڑھ اتنا آہستہ بدلا ہے کہ میں نے بالکل محسوس نہیں کیا۔ میں جب بھی وہاں جاتی ہوں۔ لوگوں سے ملتی ہوں، کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ وہی مروّت اور محبت خاطر داری۔ دعوتیں اور بلاوے۔ گرلز کالج کا کوئی فنکشن بالکل ویسا ہی جیسا تیس برس پہلے ہوا کرتا تھا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے لڑکیاں بھی وہی ہیں ہاں عمارتیں بہت بڑھ گئی ہیں اور دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ حالانکہ پندرہ بیس منزلہ عمارت نہیں بنی۔ اونچے ہوٹل اور سینما گھر نہیں بنے۔ وہی پرانے شہر کے میلے سینما ہیں۔

پہلے ایک زنانہ کلب بھی تھا۔ جہاں خواتین ٹھاٹ کے کپڑے پہن کر جمع ہوتی تھیں۔ جی بھر کر اسکینڈل ڈسکس ہوتے تھے۔ سارے شہر کی خبریں مل جاتی تھیں۔ پھر آئے دن کے نئے کپڑوں کے خرچ سے تنگ آکر کلب بند کر دیا گیا اور اب شاید کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں سب آزادی سے مل بیٹھ سکیں۔

میرے زمانے میں گرلز کالج صرف ایف اے تک تھا۔ اس لئے بی اے کے لئے لڑکیوں کو علی گڑھ سے باہر جانا پڑتا تھا۔ میرے جانے کے دوسرے سال علی گڑھ میں بی اے کی کلاس کھل گئی۔

بی ٹی کے لئے علی گڑھ میں کوئی انتظام نہ تھا اور نہ گرلز کالج میں اتنا دم تھا کہ گنتی کی چھ طالبات کے لئے بی ٹی کلاس کھول سکے۔ لہٰذا ہم قریشی صاحب کے پاس گئے جو پرووائس چانسلر تھے۔ . . . . . کہ ہمارے لئے کوئی انتظام کیجئے۔ ہمیں بھی کلاس میں بیٹھنے کی اجازت دیجئے۔ قریشی صاحب نے کہا یہ اسلامی ادارہ ہے۔ مسلمانوں کو مخلوط تعلیم پر اعتراض ہوگا۔

"پھر ہم کیا کریں؟"

"لکھنؤ یا الہ آباد جائیے۔"

"وہاں بھی مخلوط تعلیم ہے تو کیا مسلمانوں کو اعتراض نہیں ہوگا اگر مسلمان لڑکیاں لڑکوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھیں گی؟"

"الٹی بحثیں مت کیجئے۔" قریشی صاحب رکھائی سے بولے

اتنے میں ٹریننگ کالج کے پرنسپل حبیب الرحمٰن صاحب آگئے۔ انہیں جوش آگیا کہ تھوڑے سے خرچ سے انتظام ہو سکتا ہے۔

ہفتہ بھر کے اندر حبیب صاحب نے آخری سیٹوں کے آگے ایک لوہے کی جالی لگوائی اُس پر دوہرے پردے ڈال دیئے گئے اور اُس کے پیچھے ہم چھ طالبات بیٹھ گئیں۔

اب وہ جالی کلاس میں سے ہٹا دی گئی ہے۔ اب لڑکے لڑکیاں ساتھ بیٹھتی ہیں اور بڑی سنجیدگی سے پڑھتی ہیں۔ پردے کے پیچھے بیٹھ کر ہم کبھی کبھی کیا کرتے تھے، لڑکوں کو تاکا کرتے تھے اور دوسرے پر بدنیتی کے بہتان لگایا کرتے تھے۔ بڑا احساس کمتری ہوتا تھا پردے کے پیچھے بیٹھ کر اور اس پر فتح پانے کے لئے ہم لوگ بھونڈے مذاق میں وقت گنواتے تھے۔

باوجود سنسر کے اب لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے ہیں سائیکلوں پر گھومتے ہیں۔ فضا ہزار درجہ زیادہ صحت مند ہو گئی ہے اب علی گڑھ کے لڑکے دوسرے کالج کے لڑکوں کی طرح ہیں۔ میرے زمانے کے لڑکوں کی طرح برقع دیکھ کر سائیکل سے لڑکھڑا کر نہیں گرتے۔ علی گڑھ کے لوگ بھی اب کچھ عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ پردہ قریب قریب ختم ہو گیا ہے۔ بہت کم گھرانوں میں باقی ہوگا۔

میرے زمانے میں جب کالج میں کوئی لیکچر یا مشاعرہ ہوتا تھا تو لڑکیاں بند گاڑیوں میں بند کر کے لے جائی جاتی تھیں۔ برقعوں میں لپٹی ایک بالکونی میں جس کے آگے چکیں بندھی ہوئی ہوتی تھیں، ٹھونس دی جاتی تھیں۔ اور پردے کے اُدھر سے لڑکے کہنیاں اڑاتے تھے چٹکیاں بھرتے تھے۔ لیکچر اک پلے نہیں پڑتا تھا۔ پورے وقت کھی کھی چلتی تھی۔ پچھلی بار جب مجھے سی ہال میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں زنانہ انتظام نہیں تھا۔ سب عورت رد ساتھ بیٹھے تھے، چند خواتین برقعے میں بھی تھیں مگر نہ کوئی ہلچل تھی نہ ہنگامہ۔

علی گڑھ کی فضا سے گھٹن دُور ہو رہی ہے اور مطلع صاف ہوتا ار ہا ہے۔ چوبچے اور گندے نالے بھی بہت کچھ سوکھ گئے ہیں پھر بھی اس کے نہیں۔ مکھیاں اور چیونٹے بھی یونی ورسٹی اور گرلز کالج کی طرف زیادہ ہیں ہیں۔

مگر پھر بھی بہت سا علی گڑھ وہی کا وہی ہے۔ وہی کٹھ پلا،



# ان کہی

بشر نواز

اور پھر ہونٹ ہی کانپے نہ کوئی بات ہوئی
صرف آنکھوں پہ گھٹا چھا گئی، برسات ہوئی
ایک اک بار کئی خنجر خونخوار لئے
کسی ڈائن کی طرح آگئی دہلانے کو
صرف دھوکوں سے بہل سکتا تھا دل تو اپنا
لیکن اب وہ بھی سہارا نہیں بہلانے کو
رُوح کے آخری گوشوں سے پکارا جن کو
جن کے ہر درد پہ یوں پھوٹ کے روئے سو بار
کوئی رگ ٹوٹ گئی اپنے ہی دل کی جیسے
وہ بھی بربادیٔ جاں دیکھ کے رونا تو کجا
اک تعلق بھری جھوٹی ہی ہنسی ہنس نہ سکے
سوچتا آپ ہی ہوں۔ آپ ہی ہنس پڑتا ہوں
زندگی تیرے بھرے گھر سے ملا کیا مجھ کو؟
صرف کچھ کھونے کا احساس فقط کرب کی آگ
چند ٹوٹے ہوئے خواب، انکی ہزاروں کرچیں
ایک اک رگ میں جو پیوست ہوئی جاتی ہیں
اپنے ہی جسم سے بہتے ہوئے خوں کو کب تک
تیری راہوں کا دیا جانوں بہلتا جاؤں
اشک تیزاب ہیں تیزاب میں ڈھلتا جاؤں
زندگی، زندگی پتھر کی او بے حس مورت!!
اب تو شانوں سے الگ کر لے یہ باہیں اپنی
دھوپ میں رکھی ہوئی برف کی صورت کب سے
پگھلا جاتا ہوں، ہٹا اب تو نگاہیں اپنی

مٹھائیوں کی دکانوں پر مکھیوں کے چھتے اور میلے گندے بازار جہاں دو رکشہ ساتھ نہیں گزر پاتے اور گائیں اور سانڈ بے تکلفی سے ٹہلتے ہیں گلیوں میں بے شک تنگی ہے لیکن علی گڑھ کے باسیوں کے دلوں میں اتنی وسعت ہے کہ سارا جہاں سما سکتا ہے۔

# کہانی



سہیل عظیم آبادی

"ردی والا"

وہ لکھنے بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر آواز سنائی دی۔ اس کی طبیعت جھلا اٹھی کئی دنوں تک سوچتے رہنے کے بعد تو اس کی طبیعت موزوں ہوئی تھی اور وہ لکھنے بیٹھا تھا: بیچ میں یہ کم بخت ردی والا نہ جانے کہاں سے آ ٹپکا۔ اور کوئی وقت نہیں تھا اس کے پاس۔ اُس نے بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

"آج نہیں، پھر آنا ــــ"

لیکن ردی والا گیا نہیں۔ اُس نے چمکار کر کہا۔

"دُور سے آنا ہوتا ہے بابو ــ جو ہو دے دیجئے۔"

اس کی طبیعت اور جھلا گئی اور وہ ذرا تیز ہو کر بولا۔

"پھر آنا۔ آج فرصت نہیں ــ"

ردی والا کئی برسوں سے ہر مہینے دو مہینے پر ردی لے جایا کرتا تھا اور ذرا ڈھیٹ تھا اُس نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

"دو مہینے پر آیا ہوں بابو۔ ردی بہت ہوگی۔ آج ہی دے دیجئے۔"

اس کی ڈھٹائی پر اُسے غصہ آگیا اور وہ سختی کے ساتھ بولا۔

"نہیں آج نہیں۔ کام کر رہا ہوں کل آنا۔"

ردی والا چپ ہونے والا کب تھا۔ بولا۔

"نہ جانے کل موقع ملے یا نہ ملے ــ"

"جب موقع ملے آنا ــ"

اس نے جواب دیا۔ ردی والا چلا گیا۔ اور اُس نے لکھنے کے لئے قلم اٹھایا۔ پہلا جملہ لکھا۔

"اس دن دھوپ تیز تھی۔"

اسی وقت اس کی بیوی آ گئی۔ اور بولی

"ارے آپ نے ردی والے کو چلا دیا۔ میں کب سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ گھر میں ردی کا ڈھیر لگا ہوا ہے کوڑا بھی صاف ہو جاتا اور کچھ پیسے بھی نکل آتے۔"

اس کے سارے خیالات بکھر گئے۔ ردی والے سے زیادہ غصہ اس کو اپنی بیوی پر آیا اس کی آدھی زندگی اس کے ساتھ بیت گئی تھی مگر اب تک اس نے پہچانا نہیں تھا تیکھے انداز میں وہ بولا۔

"تم نے خود روک لیا ہوتا۔"

بیوی نے تنک کر جواب دیا۔

"میں کیسے روکتی۔ کیا اُس کے سامنے جاتی۔ لڑکے اسکول گئے ہیں سامان بازار گئی ہے۔"

"میں کیا کروں؟"

اس نے بے رخی سے جواب دیا۔ بیوی نے سادگی سے کہا

"ساری ردی نکال کر دیدیتے۔ گھر بھی صاف ہو جاتا اور کچھ روپے بھی مل جاتے۔"

وہ بھبھک اٹھا اور بولا۔

"ساری ذمہ داری مجھی پر ہے؟"

بیوی بولی

"ردی اٹھتا بھی تو آپ ہی کرتے ہیں۔ میں تھوڑے کرتی ہوں۔ جدھر دیکھو کاغذ ــ کاغذ ــ"

بیوی کے جواب میں بھی تیکھا پن تھا۔ اس نے بیوی کو گھور کر دیکھا وہ سہم گئی اُسے

بیوی پر رحم آگیا اور نرم ہو کر بولا۔
"ابھی لکھنے بیٹھا تھا۔"

اس کی بیوی منہ بنکائے چلی گئی۔ وہ پھر لکھنے کے لئے بیٹھ گیا مگر سارے خیالات بکھر چکے تھے خیالات جو اڑتے ہوئے سرخاب کی طرح پر جمائے اس کے دماغ میں آرہے تھے نہ جانے کدھر بھٹک گئے۔ وہ بیٹھا بیٹھا پھر خیالات کو اکٹھا کرنے لگا مگر بکھرے ہوئے خیالات جلدی اکٹھا تھوڑے ہوتے ہیں۔ وہ سوچتا رہ گیا لیکن خیالات پھر اکٹھا نہ ہوسکے۔

کتنا مشکل کام ہے کہانی لکھنا۔ اس کی بیوی کو اس کا احساس ہی نہ تھا اُسے کیا معلوم کہ ایک ادھی کہانی لکھنے کے لئے دماغ کو کس طرح چلانا پڑتا ہے وہ سمجھتی ہے کہ ایک وقت کا کھانا پکا لینا کہانی لکھنے سے بڑا کام ہے سینکڑوں مرتبہ اُسے سمجھا چکا تھا کہ لکھنے کے وقت اسے بیچ میں آکر نہ ٹوکے لیکن سمجھانا بے کار تھا لکھنا اس کی بیوی کی نظر میں سب سے فضول کام تھا۔ اس وقت بھی اس نے ٹوک کر کہانی کے تانے بانے کو الجھا دیا تھا وہ پھر لکھنا چاہتا تھا لیکن کہانی کہاں سے شروع اور کہاں ختم کرنی تھی۔ ساری باتیں اس کے دماغ سے نکل گئی تھیں بہت دیر تک دماغ سے سوچتا رہا مگر ساری باتیں اس کے دماغ سے نکل گئی تھیں۔ وہ بستر پر لیٹ گیا، اور ایک کتاب اٹھا کر دیکھنے لگا دو دن پہلے خرید کر لایا تھا لیکن ختم نہیں کر سکا تھا "مرد اور عورت کے تعلقات"

مرد اور عورت کا تعلق ۔ دُنیا کا سب سے پرانا موضوع ۔ جائز اور ناجائز ۔ یہ بحث شاید اس وقت سے چل رہی ہے جب انسان دنیا میں آیا اور اُسے عقل آئی۔ بحث صرف جائز اور ناجائز کی ہے تعلق ضروری ہے۔ لیکن کون سا طریقہ جائز اور کون سا ناجائز ہے۔ ایک زمانے میں جو طریقہ جائز تھا اُسے ناجائز قرار دیا گیا اور جو ناجائز تھا اُسے جائز کہا گیا طریقے بدلتے رہے اور بحث چلتی رہی مرد اور عورت کا تعلق بھی رہا دونوں طرح کا تعلق۔ جائز بھی اور ناجائز بھی۔ اگر جائز اور ناجائز بحث میں یہ تعلق ختم ہو جاتا تو یہ دُنیا آج اتنی آباد نہیں ہوتی۔ ایک زمانہ تھا کہ یورپ میں عورتیں فخریہ طور پر کہتی تھیں کہ وہ فلاں نائٹ کے ساتھ سوتی ہیں اور یہ کہ اس کا بیٹا فلاں نائٹ کا بیٹا ہے۔ ایک بڑے بادشاہ کو اس پر فخر تھا کہ وہ ایک نائٹ کا بیٹا ہے حالانکہ اس کی ماں کا بیاہ نہیں ہوا تھا اور یہ بھی کہ بہت سے اچھے اور قابل لوگوں کو بادشاہ صرف اس لئے نہ بننے دیا گیا کہ وہ تخت کے جائز وارث نہ تھے اور اُن کی جگہ نالائقوں کو بادشاہ بنایا گیا ۔ یہ بحث کبھی ختم بھی ہوگی۔

کہانی اس کے دماغ سے بالکل نکل گئی۔ اور وہ دیر تک کتاب پڑھتا رہا۔ جب کتاب رکھ کر اٹھا تو پھر کہانی کا خیال آیا لیکن کہانی تو اس کے دماغ سے نکل کر نہ جانے کہاں چلی گئی تھی ۔ اُسے بالکل یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کیا لکھنا چاہ رہا تھا۔ اُسے خیال آیا عورت اور مرد کا تعلق، کہانی کے لئے اچھا مرکزی خیال ہے۔ انسانی سماج کا بے حد اہم مسئلہ ہے ۔ پہلے بھی تھا اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ اتنا ہی الجھا ہوا جتنا پہلے تھا۔

وہ پھر کہانی لکھنے بیٹھ گیا۔ ایک سوال پھر اس کے سامنے آگیا۔ اگر یہ لکھے کہ فطرت کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ مرد اور عورت کے تعلقات ہوں۔ باقی سب کچھ تہذیب کے ڈھکوسلے ہیں۔ تہذیبیں خواہ مخواہ انسان کی ایک فطری ضرورت پر رسموں کی پابندیاں لگا رکھی ہیں اور قانون کے پہرے بٹھائے ہیں۔ ایک ہی فعل کو پاک اور ناپاک کے خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ ایک ہی فعل کو ضروری بھی قرار دیا ہے اور جرم بھی۔ انسان کا دماغ بڑا فتنہ انگیز اور فتنہ پرور ہے۔ سب کچھ اس کی پیداوار ہے سارے تماشے اسی کے کھڑے کئے ہوئے ہیں۔

وہ سوچنے لگا سماج ایسی باتیں سوچنے کو تیار نہیں۔ اُس نے مرد اور عورت کے تعلقات کی حدیں مقرر کر دی ہیں، قوانین بنا رکھے ہیں سزائیں مقرر کی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جس آدمی میں طاقت ہوتی ہے وہ قوانین کو ٹھکرا دیتا ہے من مانی کرتا ہے اور سماج اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ بلکہ بے بسی کے ساتھ اُسے دیکھتا رہ جاتا ہے اور کبھی کبھی اسی کا ساتھ دیتا ہے البتہ سائے قوانین کمزوروں کو دباتے ہیں۔

اس نے محسوس کیا وہ بہک رہا ہے۔ اسے کہانی لکھنی ہے۔ بیاہ شادی میں حصہ لینا نہیں ہے اور وہ مباحثے میں اُلجھ رہا تھا۔ اس موضوع پر بھی کہانی لکھی جاسکتی ہے لیکن اس طرح نہیں اور ایسی نہیں ہوگی کہ پڑھنے والوں کے دل کروٹ لیں۔ دماغ میں ہلچل ضرور پیدا ہو سکتی ہے اور اس کا دماغ الجھ کر رہ گیا۔

وہ قلم بند کر کے پھر بستر پر لیٹ رہا اور پہلے سوچی ہوئی کہانی کے تانے بانے پھر سے درست کرنے لگا لیکن اور چھور کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ پہلی کہانی دماغ سے نکل چکی تھی صرف اس کے نشانات باقی تھے، جیسے راستے میں کسی مسافر کے پاؤں کے نشان ۔ اُس نے بڑی بے چینی محسوس کی کہانی پڑھنے والوں کو کیا معلوم کہ لکھنے والے کو کن حالات سے گزرنا پڑتا ہے کبھی پھولوں بھری وادی سے اور کبھی کانٹوں بھری راہ سے۔ اس کا دماغ سوچتے سوچتے تھکن محسوس کرنے لگا۔ پاس پڑا ہوا ایک رسالہ اس نے اٹھا لیا لیکن پڑھنے میں جی نہیں لگا۔ اس نے رسالے کو بے پروائی سے ایک طرف ڈال دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا ایک نیند سو کر اٹھے گا تو دماغ تازہ ہوگا اور لکھ سکے گا۔

مگر نیند نہیں آئی۔ دماغ انسان کے جسم کا سب سے آوارہ حصہ ہے۔ نہ خود چین سے رہتا ہے اور نہ جسم کے دوسرے حصوں کو چین سے رہنے دیتا ہے۔ کہانی اب بھی دور تھی بس کبھی کبھی بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح راستے سے بھٹک کر اس کے دماغ میں آجاتی اور پھر غائب ہو جاتی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹا رہا اور سوچتا رہا کہانی خوبصورت تتلی کی طرح چمکیلے پر پھڑپھڑاتی اُڑی پھر رہی تھی، اور وہ بچے کی طرح اسے پکڑنے کے لئے دوڑا پھر رہا

تھا تبلی تک وہ ہاتھ لے جانا ہے بگڑ تبلی اڑ جاتی ہے۔ ہاتھ نہیں آتی مگر اس بھاگ دوڑ میں آسے مزا آرہا تھا۔

بیوی کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"آج چائے بھی نہیں پی آپ نے؟"

اور وہ اُٹھ بیٹھا۔ کاغذ اور قلم سامنے دھرا تھا۔ اس نے بیوی کو دیکھا اور بولا۔

"ردی والے نے آکر سب چوپٹ کر دیا۔ کیا لکھوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

اس کی بیوی ہنس پڑی۔

"آپ تو مشہور لکھنے والے ہیں۔ سینکڑوں کہانیاں لکھ چکے ہیں۔ لکھ ڈالئے۔"

اس نے بڑی بے بسی کے ساتھ بیوی کو دیکھا۔ اور بولا۔

"چائے دیجئے۔"

بیوی چلی گئی اور اس نے تازہ اخبار اٹھالیا۔ ایک دلچسپ خبر تھی۔ وہ اسے پڑھنے لگا۔ پچھلی شام کا ایک واقعہ تھا۔ اور اخبار نے اُسے بڑی اہمیت دے کر پہلے صفحے پر شائع کیا تھا۔

شہر کے سب سے بڑے پارک میں بڑی رونق تھی۔ پارک میں سینکڑوں آدمی تھے۔ شام کے وقت سیر کرنے والے مرد ٹہل رہے تھے یا بنچوں پر بیٹھے تھے۔ عورتیں میدان میں بیٹھی تھیں بچے کھیل رہے تھے۔ ہر طرح کے لوگ تھے۔ یکایک پارک کے ایک کونے سے ایک عورت کی آواز سنائی دی: "مدد۔ مدد" اور بہت سے لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ ایک ادھیڑ عمر کا شریف صورت مرد تھا اور ایک خوبصورت سی جوان عورت۔ مرد نے عورت کی کلائی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی۔ اور اسے گھسیٹ کر لے جانا چاہتا تھا۔ عجیب نظارہ تھا۔ لوگوں کو دیکھ کر عورت نے کہا۔ میں ادھر ٹہلتی ہوئی آگئی تھی یہ مرد میری عزت لوٹنا چاہتا تھا۔" اور مرد نے کہا: "یہ عورت بدمعاش ہے۔ دیر سے مجھے تنگ کر رہی ہے۔ مجھ سے سو روپے مانگتی ہے جب میں نے انکار کر دیا تو اس نے مجھے دھمکی دی کہ شور مچا کر مجھے ذلیل کر دے گی۔ میں نے بار بار انکار کیا سمجھایا اور یہ نہیں مانی۔ میں اسے تھانے لے جاؤں گا۔" اور عورت کہتی رہی کہ یہ میری عزت لوٹنا چاہتا تھا۔ مجمع میں سے کچھ لوگ عورت کے ہمدرد بن گئے۔ اور مرد کو مارنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور کچھ لوگ مرد کے ہمدرد بن گئے اور ہنگامہ سا ہو گیا۔ پارک میں پہرہ دینے والے پولیس کے سپاہی آگئے اور دونوں کو پکڑ کر لے گئے۔

خبر عجیب سی تھی اس میں کون سچا تھا اور کون جھوٹا۔ اس میں مجرم کون تھا، اور بے گناہ کون ــــ پھر کیا ہوا اخبار میں اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ اس کے دل میں کرید پیدا ہوئی۔ یہ تو معمہ ہو گیا۔ لیکن کہانی کا پلاٹ اچھا تھا۔ دونوں باتیں ممکن تھیں مرد اس عورت کی عزت لوٹنے کی کوشش بھی کر سکتا تھا۔ اور عورت بدمعاش بھی ہو سکتی تھی۔ دھونس ڈال کر روپے وصول کرنے کی کوشش بھی کر سکتی تھی۔

اس نے سوچا۔ دلچسپ کہانی بن سکتی ہے ــ اور سوچنے لگا کس طرح شروع کی جائے اور کس طرح ختم کی جائے اور کہانی کا تانا بانا بننے لگا کہ اس کی بیوی چائے لے کر آگئی تو وہ اس کا چہرہ اس طرح دیکھنے لگا جیسے کہانی اس کے چہرے میں لکھی ہو۔ وہ گھبرا سی گئی اور چائے کی پیالی رکھ کر جلدی سے جانا چاہتی تھی کہ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میرے پاس بیٹھو ــــ"

وہ بڑی نرمی سے بولا

"آج کہانی نہیں لکھ سکا لکھ لیتا تو . . . . ."

"اب تو چھٹی ہو گئی ہو گی یا بوجی ــ"

"کون؟ ــــ"

"ردی والا ــــ"

اس نے بیوی سے کہا

"بھئی جلدی سے ساری ردی نکال دو خدا کرو اس کا قصہ چین نہیں لینے دیگا۔"

اس کے ہاتھ میں ستائیس روپے بارہ آنے دیئے ــ تو وہ چونک گیا ــ روپے لاکر اس نے بیوی کے ہاتھ میں دیئے اور وہ خوش ہو کر بولی ــ

"دیکھئے اتنے روپے مل گئے نا ــ"

اور اُسے محسوس ہوا کہ کہانی لکھنے سے زیادہ فائدے کا کام ردی بیچنا ہے۔


# اُجرتِ اشتہار

| | ایک ماہ | چار ماہ سے زائد |
|---|---|---|
| پورا صفحہ | ۱۲۵/- | ۱۰۰/- |
| آدھا صفحہ | ۶۵/- | ۵۵/- |
| چوتھائی صفحہ | ۳۵/- | ۳۰/- |

سرورق صفحہ ۲ اور ۳ کے لئے ۲۵ فی صد زائد

پشت کے لئے ۵۰ فی صد زائد

تفصیلات کے لئے:-

ایڈورٹیزمنٹ منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

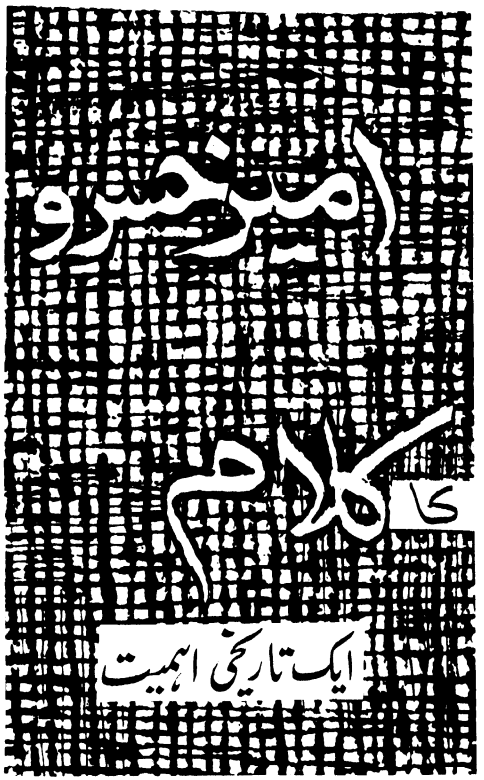


ظ۔ انصاری

ہندوستان میں قرونِ وسطیٰ کی نمایاں خصوصیات اور اہم تبدیلیوں کو سمجھنے کے لئے بلبن کے عروج (۱۲۵۰ء) سے محمد تغلق کی ناکامی (۱۳۳۰ء) تک کا دور فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ علاء الدین خلجی (۱۲۹۶ - ۱۳۱۶ء) اور محمد تغلق اس دور کی سب سے اہم شخصیتیں ہیں اور امیر خسرو کی نظم و نثر اس عہد کی تاریخ کا سب سے معتبر ماخذ ہے۔

امیر خسرو "تہتر" برس جئے (۱۲۵۲-۱۳۲۵ء) دس درباروں سے تعلق رہا۔ برائے نام گیارہ ورنہ اصل میں نو بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ آپ اس علاقے کے ترک تھے جو اب ازبکستان کا حصہ ہے اور جہاں ایک ہندوستانی امیر کی بیٹی تھیں اسی نسبت سے وہ خود کو ترک ہندوستانی کہتے ہیں اور اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے ہیں یہاں تک کہ سنسکرت کو عربی کے علاوہ دنیا کی تمام زبانوں سے افضل بتاتے ہیں اور ہندوستان کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ملک "مولد و ملجا و ماویٰ و وطن" انہوں نے نو دس برس کی عمر سے شاعری شروع کی۔ ترکی اور فارسی کے علاوہ مقامی زبانوں میں مہارت پیدا کی۔ آگرے سے دہلی تک کی "زبان ہندوی" ان کی مادری زبان تھی، چار لاکھ کے قریب شعر کہے جن میں سے کم و بیش ایک لاکھ آج سات سو برس بعد بھی محفوظ ہیں: ترک تین بڑی کتابیں لکھیں لڑائی کے میدان، امراء کی محفل، شاعروں، عالموں اور صوفیوں کی صحبت انھیں عمر کے ہر حصے میں میسر تھی۔ بنگال سے لے کر ملتان اور سندھ تک اور ہماچل سے غالباً ساحلِ ناڈو تک جنگی قافلوں اور ادب کے قدر دانوں تک کے درمیان سفر کیا، فطرت اور معاشرت کے رنگا رنگ منظروں کو ان میں شریک ہو کر دیکھا اور جو کچھ دیکھا یا برتا یا بھروسے کے لوگوں سے سنا اس کو شاعرانہ حسن بیان سے بناسنوار کر ہمارے لئے محفوظ کر دیا۔

ہمارے پاس اس دور کی معاصرانہ تاریخیں موجود ہیں جن میں بعض جگہ واقعات کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تاج المآثر، طبقات ناصری، چچ نامہ، خلجی دور سے پہلے کی باقاعدہ ایسی تاریخی سندیں ہیں جن کو بعد کے مورخین نے پیش نظر رکھا۔ محمد شاہ بن تغلق کے آخری دنوں میں عصامی کی مثنوی فتوح السلاطین لکھی گئی۔ اس زمانہ کا شہرہ آفاق مصنف ضیاء الدین برنی ہے جس نے تاریخ فیروز شاہی لکھ کر آئندہ مورخین کی رہنمائی کی۔ تغلق خاندان کے عہد حکومت میں ہی دوسری تاریخ فیروز شاہی، شمس سراج عفیف نے ترتیب دی، پھر فوراً ہی "تاریخ مبارک شاہی" لکھی گئی۔ ان ساتوں مورخین کا تعلق درباروں سے تھا۔ عصامی آبائی جائداد ضبط ہو جانے پر محمد شاہ بن تغلق سے ناراض ہو کر دکن کی طرف نکل جاتا ہے اور علاء الدین حسن گنگو بہمنی سے قدر دانی کا امیدوار ہے، ضیاء الدین برنی جو ستر سال تک محمد بن تغلق سے وابستہ رہا۔ اس کا سخت نکتہ چیں ہے۔ بعد کے مورخوں نے زیادہ تر انہی چراغوں سے اپنے چراغ جلائے اور تحقیق کے عمل میں ان افسانوں کو بھی سند کا درجہ دے دیا جو وقتاً فوقتاً شاعری یا مداحی کی زبان سے پھیل گئے تھے۔ دکن کے ہندو شاہ استرآبادی (مصنف تاریخ فرشتہ) اکبر کے درباری نکتہ چیں عبدالقادر بدایونی (مصنف منتخب التواریخ) اور نظام الدین بخشی (مصنف طبقات اکبری) اسی گروہ میں آتے ہیں۔ جس کے بیانات نے اپنے سے پہلے کی تواریخ اور اپنے زمانے کے زبان زد افسانوں کو ملا جلا کر تاریخی سرحیشوں کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اور ۱۹ویں، ۲۰ویں صدی کے مغربی مصنفین مثلاً سر ہنری ایلیٹ، لین پول، ونسنٹ اسمتھ، الفنسٹن جیمس ٹاڈ، گارڈنر براؤن اور کرنل ہیگ نے انہی کو اپنا رہنما بنایا ہے۔

اس کے برعکس امیر خسرو دہلوی کے پاس عاشق کا دل، شاعر کا حسن بیان اور ایک مورخ کی بے لوچ (یا Objective) نظر ہے۔ جب وہ اپنے سے پہلے کے یا اپنے زمانے کے اُتھل پتھل پر تبصرہ کرتے ہیں تو کہیں جان بوجھ کر نقطوں پر ایسا باریک سا پردہ ڈال دیتے ہیں کہ اصلیت چھن کر باہر نکل آئے مثلاً:

جب خسرو خاں گرفتار ہو کر غازی ملک کے سامنے لایا جاتا ہے تو وہ قیدی سے سوال کرتا ہے کہ جس آقا نے تجھ پر اتنے احسانات کئے تھے، اس کا خون کیوں کیا۔ مورخ برنی نے جا بجا اور بہت ہی کھول کر بیان کیا ہے کہ بادشاہ قطب الدین مبارک شاہ اپنے خاص مصاحب اور وزیر سے ہم جنسی ( Homeo-Sexual ) تعلقات رکھتا تھا۔ امیر خسرو اس کی زبان سے جواب دیتے ہیں ؎

اگر نا رفتنی بر من نہ رفتے
زمن نا آمدے دیں فن نہ رفتے

(شعر ۲۸۸۲ تغلق نامہ)

کہیں قصیدوں، رباعیوں یا مثنویوں میں حالات کی صاف جھلک دکھا جاتے ہیں جیسے "ہشت بہشت" مثنوی کے بعض بیانات سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ شرفا کا لباس اس زمانے میں کیا تھا۔ سماج میں عورت کی حیثیت کیا تھی۔ یا جلال الدین خلجی کے قصیدے اور شہر آشوب کی رباعیوں سے پتہ چلتا ہے کہ دشمن پر آگ پھینکی جاتی تھی، شب برات پر آتش بازی کا استعمال ہوتا تھا۔ لیکن بارود کا نہیں بلکہ "نفط" یا ( Crude Oil ) کا آتش بازی کی بہت سی قسموں کے نام آجاتے ہیں جن میں سے ہوائی مہتاب اور فتیلہ آج تک موجود ہیں۔

کہیں اپنے دیباچوں اور اعجاز خسروی کے مضامین کی لپیٹ میں وہ ایسی اطلاعیں بہم کر دیتے ہیں جن سے تاریخی مسلمات کی تردید یا تصدیق نکلتی ہے۔ مثلاً "دوسرے دیوان وسط الحیوٰۃ اور تیسرے دیوان ..... غرۃ الکمال کا دیباچہ محض ان کی سوانح حیات نہیں بلکہ اپنے گرد و پیش کی سوانح عمری کا اہم حصہ ہے۔ کہیں عشق کے افسانے میں تاریخی سربستہ رازوں پر سے پردہ اٹھا دیتے ہیں، جیسے "دول رانی خضر خاں" کے عشقیہ افسانے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ علاء الدین خلجی کو ملک کافور نے ٹھیک اسی طرح دغا بازی سے ختم کیا جیسے علاء الدین نے اپنے مہربان چچا جلال الدین کا خاتمہ کیا تھا۔ ملک کافور کو "دہ ہدی کُش"، "کافور بے فور" کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔

اپنے پیش رو آذر بائیجانی شاعر نظامی گنجوی کی تقلید میں انہوں نے جو ۸۹۰ء استرہ ہزار آٹھ سو نوے شعر کا خمسہ لکھا، مطلع الانوار، مجنوں لیلیٰ، خسرو شیریں، آئینہ سکندری، ہشت بہشت اس کے علاوہ پانچ ایسی مثنویاں بھی تھوڑے تھوڑے وقفے سے تصنیف کیں جن کی بنیاد ہی تاریخی واقعات پر ہے اور خود شاعر کا دعویٰ ہے کہ اس نے اچھی طرح چھان بین کی ہے۔

امیر خسرو کی نظم و نثر سادہ طرز پر نہیں ہے، اس میں کنایوں اور استعاروں کی کافی بھرمار ہے۔ لیکن ان پانچوں مثنویوں میں، جہاں انہیں تاریخی واقعات بیان کرنا تھے نقلی نوک پلک کے بجائے بیان واقعہ کو اہمیت دی ہے۔ مثلاً مفتاح الفتوح "مثنوی میں جو دیوان "غرۃ الکمال" کا حصہ ہے۔ خود کہتے ہیں کہ شاعرانہ مبالغہ اور جھوٹ سے اگرچہ خوب صورتی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن جھوٹ یا مبالغے سے پاک کیا ہوا سچا بیان Realism بھی ایک دل فریبی رکھتا ہے

## پدماوت محض افسانہ

امیر خسرو چتوڑ کے قلعے پر علاء الدین خلجی کے حملے کے وقت خود موجود تھے اس کی ساری تفصیلات نثر میں بیان کی ہیں۔ راجپوتوں کی دلیری اور شیرانہ حملے کی داد دی ہے مگر کہیں بھی ان افسانوں کا پتہ نہیں چلتا جو ملک محمد جائسی کی نظم پدماوت کے بعد اتنے مشہور ہو گئے کہ بالآخر ابوالفضل نے "آئین اکبری" میں جگدیو اور کرنل ٹاڈ نے اسے قطعی تاریخی واقعہ تسلیم کر لیا ہے حالانکہ خود ملک محمد کو شاعری اور تخیل کا دکھانا مقصود تھا ورنہ بقول اُن کے "کہاں کی رانی اور کہاں کا راجہ" مزے کی بات ہے کہ ہمارے زمانے کے ایک مشہور مورخ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے History Of Muslim Rule In India مطبوعہ ۱۹۴۰ء میں) امیر خسرو کے بیان "خزائن الفتوح" سے حوالہ بھی دیا تو یہ نہیں بتایا کہ شیر شاہ کے زمانے سے پہلے علاء الدین خلجی تک یعنی امیر خسرو اور ان کے بعد ڈھائی سو سال تک کسی تاریخ میں رانی پدمنی وغیرہ کے افسانے کا ذکر نہیں ہے۔

ان پانچوں مثنویوں میں مفتاح الفتوح، خضر خاں دول رانی اور تغلق نامہ کی زبردست تاریخی اہمیت ہے۔ مفتاح الفتوح (نظم) اور خزائن الفتوح (نثر) تو پہلے خلجی بادشاہ کے زمانے اور فتوحات کی ایسی ہم عصر تاریخیں ہیں کہ بعد کے تمام قابل ذکر مورخوں نے ان سے فیض اٹھایا ہے۔

اس "ترک ہندوستانی" کی نظر ہندوستان کے ہر ایک منظر پر بے لاگ پڑتی ہے علاء الدین خلجی نے اپنے سپہ سالار ملک کافور کی سرکردگی میں جو فوج جنوبی ہندوستان کی طرف بھیجی تھی، اس کا سفر نامہ ہمیں امیر خسرو کے بیانات میں ملتا ہے وہ دیوگری یا دیوگڑھ قلعے کی، اس علاقے کی، وہاں کی کاریگری اور ہنرمندی کی بڑھ چڑھ کر تعریف کرتے ہیں۔ اسی طرح رنتھمبور قلعے کے استحکام کا انہوں نے نقشہ کھینچ دیا ہے۔

لباس کی تفصیلات ملتی ہیں۔ پھلوں اور پھولوں کا بیان ملتا ہے، کاغذ امپورٹ بھی ہوتا تھا۔ اور ہندوستان میں روئی اور کپڑے کو پانی میں گلا کر، کوٹ کر بنایا بھی جاتا تھا۔ دیوگری میں جو باریک ریشمی کپڑا بنتا تھا۔ اس کا دس گز کا تھان ناخن پر لپیٹا جا سکتا تھا (اور یہ کپڑا اکسپورٹ کیا جاتا تھا، اس کا نام ہی دیوگری تھا)

المیہ مثنوی "خضر خاں دول رانی" جب لکھی گئی ہے تب اس خونی ڈرامے کے سارے کردار زندہ تھے، غلط بیانی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ امیر خسرو کی ہمدردیاں اس میں دول رانی کے ساتھ ہیں۔ وہ خضر خاں کے ساتھ کھیل کر بڑی ہوئی ہے اور دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے ہیں۔ اس ڈرامے کو منظوم کرتے وقت امیر خسرو نہ

صرف درباروں اور محلوں کی اندرونی سازشوں کو بے نقاب کرتے ہیں بلکہ شادی کی رسموں کا بھی تفصیلی نقشہ کھینچ دیا ہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ صرف ایک صدی پہلے باہر سے آئے ہوئے ترک تاجیک اور پٹھان قبیلوں میں خاص ہندوستانی طرز کے رسم و رواج چل پڑے تھے۔

لباس کے علاوہ ہتھیار، اوزار، جوتشیوں اور درویشوں کے مرتبے، مختلف پیشہ ورانہ گروہوں کی سماجی حیثیت اور دہلی کے خوش حال طبقے کی دولت کی کثرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ بعض لفظوں اور محاوروں کی قدامت کا پتہ لگتا ہے مثلاً "ھُن برسنا" آج تک زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ امیر خسرو کے بیان سے خیال گزرتا ہے کہ علاء الدین خلجی جب اپنا شاہی جلوس لے کر دہلی کی طرف بڑھا ہے تو روزانہ ۵ من سونا منجنیق (گوپھن) سے رکھ کر آس پاس کی بستیوں پر پھینکا جاتا تھا۔ خضر خاں کی پہلی شادی کے موقع پر بھی دونوں طرف اشرفیاں دُور دُور تک منجنیق سے پھینکی جاتی تھیں۔ دن، تاریخ، وقت اور صورت حال کی بعض ایسی تفصیلات اُن کے اشعار میں مل جاتی ہیں جن کا کسی معاصرانہ تاریخ میں پتہ نہ تھا، اور اس لحاظ سے ان کا تغلق نامہ (جو ابھی ۴۰ سال پہلے دستیاب ہوا ہے) ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔

## تغلق کی فوج میں ترک اور رُوسی

تغلق نامہ نامکمل حالت میں ملا ہے۔ اس کے ۲۹۲۰ شعر محفوظ ہیں۔ شاعر نے جس احتیاط سے تفصیل کے ساتھ واقعات اور کرداروں کا ذکر کیا ہے اس سے کئی اہم نتیجے نکلتے ہیں۔

(الف) خسرو خاں گجرات کا ایک نومسلم اور بڑا منتظم آدمی تھا۔ اس کے قبیلے کا نام پرمار یا بھرار نہیں، "براوُ" تھا۔ اور یہ گجرات کا ایک زبردست جنگی قبیلہ تھا جس کے جوانوں کی بڑی تعداد دہلی میں رکھی گئی تھی اور وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ عین ممکن ہے کہ "پرمار" ذات کے لوگ اُن کے ساتھ شریک ہوں۔

(ب) ملک غازی تغلق کی فوج میں باہر کے سپاہی اور امیر زیادہ تھے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس میں ہمالیہ پار کے جنگجو کس طرح دو مہینے کی تیاری میں آکر شریک ہو گئے تھے۔ ان کی تعداد بھی خسرو خاں کی ہندوستانی فوج سے بہت کم تھی اور اس میں روسی سپاہی بھی تھے۔

سپاہش ارچہ بود اندک نہ بسیار ؛ ولے بسیار اندک بود و پُر کار
سواراں بیشتر ز اقلیم بالا ؛ نہ ہندوستانی و ہندو والا
غزُ و تُرک و مُغل، رومی و روسی ؛ چو باز جرّہ در جنگ خروسی
دگر تاجک خراسانی و پاک اصل ؛ نگشتہ اصل بد با اصل شان وصل

(ج) اس مثنوی سے یہ بھی صاف صاف ثابت ہوتا ہے کہ دونوں طرف کی فوجوں میں مسلم اور غیر مسلم شریک تھے خود ملک غازی کے لشکر میں مسلمانوں کی پلٹنیں "اللہ اکبر" پکارتی تھیں اور ہندو پلٹنوں سے "نارائن" کے نعرے بلند ہوتے تھے اس میں پنجاب کے کئی ہزار بہادر کھوکھر شامل تھے اسی طرح خسرو خاں کے لشکر میں مسلمان پلٹنیں موجود تھیں جنہوں نے آخر تک اس کی طرف سے جنگ کی اور خسرو خاں کے کئی مسلمان سردار مارے گئے مگر سالار کی "براوُ" ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔

(د) اس سے لشکروں کی ترتیب کا بھی پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اگر جلال الدین خلجی سے لے کر تغلق خاندان تک ان جنگی مہموں کی وہ تفصیلات نظر میں رکھی جائیں جو امیر خسرو کے بیان سے ثبوت کو پہنچتی ہیں تو یہ نتیجہ نکالنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ:

تیرھویں صدی سے ہی ہندوستان کی جنگیں مذہبی نہیں بلکہ قبائلی غلبہ، نسلی برتری قائم رکھنے اور زرخیز علاقوں پر قبضہ کرنے کی جنگیں ہو چکی تھیں۔ مذہب کا نام صرف اسی حد تک استعمال کیا جاتا تھا کہ ان جنگی قبیلوں یا امیروں کو ساتھ لیا جا سکے جو کسی ایک یا دوسرے مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ تاتاری اور منگول حملوں کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے "بار بار کفار منغول" کے جہاد کا نعرہ لگایا گیا اور جب یہ منغول اسلام قبول کر چکے تھے تب بھی ان کی یلغار جاری تھی انہیں کفار ہی کہا گیا جو بالآخر بابر کی فتح پر تمام ہوئی۔

(ہ) امیر خسرو کے بیانات کی روشنی میں یہ راز بھی کھلتا ہے کہ ہندوستانی پیشہ وروں میں اسلام پھیلتا جا رہا ہے اور سماج میں کاری گروں مثلاً جلاہوں نقاشوں اور برتن بنانے والوں کی اہمیت بڑھنے لگی تھی جن میں متھای کاریگروں کے علاوہ نو وارد ولایتی بھی شامل تھے۔

فریڈرک اینگلس نے بالزاک کے افسانوی ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے جو یہ کہا تھا کہ انقلاب فرانس کے پس پشت حالات کو میں نے مورخوں سے بہتر بالزاک کی تحریروں میں سمجھا ہے تقریباً وہی نکتہ لارڈ جسٹر ٹن نے ڈکنس کے ناول "دو شہروں کی کہانی" (A TALE OF TWO CITIES) کے دیباچے میں دُہرایا ہے کہ کارلائل نے انقلاب فرانس کی عالمانہ تاریخ بڑی محنت سے لکھی لیکن اس تاریخی واقعے کی جیتی جاگتی تصویر ڈکنس کے یہاں ملتی ہے۔

امیر خسرو نے آج سے ساڑھے چھ سو سال پہلے، ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ کی گہری تبدیلیوں کو جو تیرھویں صدی کے آخر اور چودھویں صدی کے شروع میں، سطح کے نیچے کام کر رہی تھیں۔ شاعرانہ صداقت کے ساتھ پیش کر کے ہمیں یہ سراغ لگانے میں مدد دی ہے کہ چنتیہ، کبیر اور نانک کے ذہنی اور سماجی پیغام کی تہہ میں کون سے عناصر کام کر رہے تھے ہم کہہ سکتے ہیں کہ امیر خسرو کی نظم و نثر میں صرف بادشاہوں کی فتح و شکست کا بیان نہیں بلکہ ایک بھرپور تصویر ملتی ہے۔ اُن عناصر کی فتح و شکست کی جو زندگی کے تبدیل ہوتے ہوئے منظر میں کارفرما تھے ـــــ تاریخ کے ورق اور شاعری کے ایسے امتزاج کی مثال اگر امیر خسرو کے سوا کہیں اتنی عظمت اور گہرائی کے ساتھ ملتی ہے تو فردوسی طوسی کے ہاں یہ فرق اتنا ہے کہ فردوسی نے داستان پاستان سے "نامہ خسروان" سے ریزے چن چن کر تاریخی داستان سجائی تھی۔ امیر خسرو نے اپنے دل کے ٹکڑے جنگی میدانوں میں تڑپتے دیکھے ہیں اپنے محبوبوں کو خاک خون میں ملے دیکھا ہے اور اُن کی آرزوؤں اور حسرتوں کو بٹور کر آئندہ کے مورخ کے لئے سر و سامان محفوظ کر دیا ہے۔

آج کل نئی دہلی

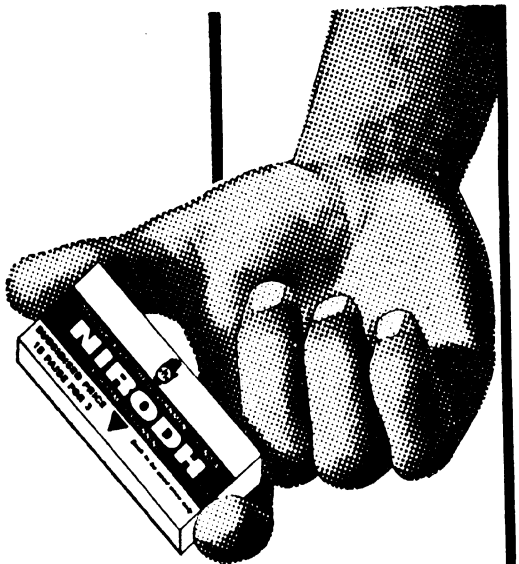


## بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

فی زمانہ بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نِرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچے تبھی ہوگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔

## بچہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نِرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچے کی پیدائش ملتوی کر سکتے ہیں۔

نِرودھ (کنڈوم)، اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اِسے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان، محفوظ طریقہ ہے۔ اِس کے استعمال سے صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔

نِرودھ ہر جگہ ملتا ہے:۔
پرویژن اسٹور، کرانہ فروش، کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔

# نِرودھ استعمال کیجئے

فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
15 پیسے کے 3

حکومت کی امداد سے کم دام

صرف 5 پیسے خرچ کرکے آپ اپنے کنبے کو محدود رکھنے کی طاقت حاصل کر سکتے ہیں

70/61

# کام اور چام



کرتار سنگھ دُگل

پھر وہی بات ہوئی تھی، لاکھ احتیاط سے وہ دورے کا پروگرام بناتا، کون سی گاڑی، ہوائی جہاز کی کون سی پرواز، کب کہاں پہنچے گا، کہاں قیام کرے گا، کتنے دن رُکے گا، پھر بھی کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو جاتی۔ کوئی خرابی ضرور تھی۔ اس بار جب وہ گاڑی سے اُترا، اُس کے استقبال کے لئے، آئے کارکن نے جھجکتے ہوئے بتایا، "حضور! سرکٹ ہاؤس میں آپ کے لئے کمرہ ریزرو کیا تھا لیکن اس میں کچھ تبدیلی . . . . " وہ چُپ رہا۔ اپنے میزبان سے کوئی اُلجھنا تھوڑے ہی ہے۔ جب باہر موٹر میں وہ بیٹھا، مقامی کارکن نے ڈرائیور کو ایم ایل اے ہوسٹل چلنے کے لئے کہا اور اُس نے پھر خود بخود بولنا شروع کر دیا، بات یوں ہوئی، ہم نے سرکٹ ہاؤس میں دو ہفتے پہلے ہی کمرہ ریزرو کروا دیا تھا لیکن کچھ دن ہوئے ایک اعلیٰ سطح کی میٹنگ یہاں کرنے کا فیصلہ ہوا اور سرکٹ ہاؤس باہر سے آئے وی آئی پی مہمانوں کے لئے خالی کروا لیا گیا۔ یہ غنیمت ہے کہ ہمارا ایم ایل اے ہوسٹل آج کل خالی ہے جب سے اسمبلی ٹوٹی ہے، شہر میں رہنے کی جگہ کی کوئی تکلیف نہیں رہی۔ اتنا بڑا ایم ایل اے ہوسٹل خالی پڑا ہے اور پھر ہمارا یہ ہوسٹل شہر کے درمیان واقع ہے، سرکٹ ہاؤس تو شہر کے باہر ہے — کوئی سات میل آگے جانے میں ہی آدھا دن بیت جاتا ہے . . . "

اس طرح کی کہانی وہ بیان کر رہا تھا کہ موٹر ایم ایل اے ہوسٹل کے سامنے جا رُکی۔

انتہائی خوبصورت پانچ منزلہ عمارت۔ ایک نظر دیکھ، وہ کھل اُٹھا — "اس میں کیا خرابی ہے؟ یہ ہوسٹل تو بہت بڑھیا ہے۔" موٹر سے اُترتے ہوئے اس نے اپنے میزبان سے کہا۔ "اس میں کیا خرابی ہے؟" مقامی کارکن خاموش تھا۔ سر ہلا کر اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا پھر وہ جلدی جلدی تیار ہو ناشتہ کر کے کام پر نکل گیا

دوپہر، کھانا کھانے کے بعد جب وہ لوٹا تو بہت اُمس تھی۔ ہر کوئی کہتا — ان دنوں جب ایسی اُمس ہوتی ہے تو بارش ضرور آتی ہے۔ لیکن بارش کا کہیں دُور، دُور تک نشان نہیں تھا۔ اور وہ ہوسٹل کے اپنے سوٹ میں کوارٹر بند کر کے نیچے فرش پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اُسے محسوس ہوا جیسے ڈریسنگ رُوم کی الماری میں سے اُسے کیچڑے کی سڑاند آ رہی ہو۔ الماری بند تھی۔ ڈریسنگ روم کا دروازہ بند تھا۔ پھر بھی جیسے بدبُو آ رہی تھی۔ یونہی اُس کا وہم ہے، اس نے سوچا۔ بدبُو تو آ رہی تھی۔ پھر وہ اُٹھا اور اُس نے سامنے والی کھڑکی کا پٹ کھول دیا۔

آسمان پر جیسے غبار چھا رہا تھا۔ عجیب موسم ہو رہا تھا۔

کھڑکی کے باہر خالی جگہ میں کسی نے مکئی بو رکھی تھی۔ پودے کندھے کندھے تک بڑھے ہوئے تھے۔ لیکن ابھی اُن میں بھٹے نہیں لگے تھے اور سامنے کوارٹر تھے نیچے موٹروں کے لئے گیراج۔ اوپر نوکروں کے گھر۔ گھروں کے سامنے گیلری تھی۔ اس طرف سیڑھیاں تھیں جہاں کوڑے کا ڈھیر لگا تھا لیکن جہاں وہ لیٹا ہوا تھا۔ وہاں سے کوڑے کا ڈھیر نہیں دکھائی دیتا تھا۔ مکئی کے پودے دکھائی دیتے تھے، گیراج کے چھجے دکھائی دیتے تھے اور نوکروں کے کوارٹروں کی گیلری۔

اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اُمس بھی کتنی تھی! اور پھر اُس نے دیکھا — سامنے نوکروں کے کوارٹروں کے باہر گیلری میں کوئی آ کھڑی ہوئی۔ اس گرمی میں۔ پہاڑن

کھی کوئی۔ پان کے پتے جیسا مُنہ، گورا رنگ، کہیں کہیں چیچک کے داغ، سوئی سوئی آنکھیں کھلے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے، میلی چکٹ دھوتی، گیلری میں آکر کھڑی ہوئی کہ اس کی نظریں جیسے ایم ایل ہوسٹل کے پچھواڑے کی کھڑکیوں پر تیرنے لگیں۔ ایک، دو، تین، چار۔۔۔ دس۔۔۔ بیس۔۔۔ پچاس۔۔۔ سو کھڑکیاں پانچویں منزل کی۔ ایک، دو، تین، چار۔۔۔ دس۔۔۔ بیس۔۔۔ پچاس۔۔۔ سو کھڑکیاں چوتھی منزل کی۔ پھر تیسری منزل، دوسری منزل، پہلی منزل اور اب نچلی منزل کی کھڑکیوں پر گھومتی ہوئی اس کی نظریں اُس کھڑکی پر آکر رک گئیں، جس سوٹ میں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ کھڑکی کھلی تھی۔ باقی کھڑکیاں بند تھیں۔ تیسرے پہر کی اُس میں باقی سب کھڑکیاں بند تھیں اور اس کھڑکی میں اس کی نظریں جیسے جم گئی ہوں۔ آگے نہیں اُٹھ سکیں۔ اُس نے بازو اٹھا کر ایک جمائی لی جیسے اس کا سارا جسم اینٹھ گیا ہو۔ اب وہ اپنے بالوں کو اکٹھا کر کے، اُن کا جوڑا بنا رہی تھی اور اندر پنکھے کے نیچے لیٹے ہوئے اُس نے دیکھا، اُس کی چار اُنگل چولی اُس کے انگ کو ڈھانپنے کے بجائے ان کی گولائیوں کو مزید بے نقاب کر رہی تھی۔ اور پھر وہ زیرِ لب مسکرانے لگی۔ سامنے وہ لیٹا ہوا تھا سفید چادر پر۔ پنکھا تیز چل رہا تھا۔ اُس کے بال اُڑ اُڑ کر اُس کے چہرے پر گر رہے تھے۔ وہ بار بار اپنے بالوں کو پیچھے کر رہا تھا اور ایک ٹک اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس بے موسم میں باہر گیلری میں کھڑی آنکھوں ہی آنکھوں سے جیسے وہ قدم قدم چلتی اس کے کمرے میں چلی آرہی ہو۔ بدتمیز عورت! اور اس نے کروٹ بدل کر دیوار کی طرف مُنہ پھیر لیا۔ کتنی دیر تک وہ یونہی پڑا رہا۔

گرمی بہت تھی۔ اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔ باہر گیلری میں کتنی اُمس ہوگی! اور اُس نے کروٹ بدل کر دیکھا، جوں کی توں وہ کھڑی تھی۔ اب اُس کی گود میں بچہ تھا مدبل سا مکھیاں اس کے مُنہ پر بھنبھنا رہی تھیں۔ ایک جانب جونک سی لڑکی اُس کی دھوتی کے پلّو کو پکڑے ہوئے کچھ مانگ رہی تھی۔ پھر ایک اور بچہ آیا۔ وہ بھی کوئی فرمائش کرنے لگا۔ پھر ایک اور، پھر ایک اور۔ اور تلے پانچ بچوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا، کوئی کچھ مانگ رہا تھا۔ کوئی کسی چیز کے لئے مُصر کر رہا تھا۔ اور وہ سامنے کھڑکی میں پھر اُسے اپنی جانب جھانکتے ہوئے دیکھ کر کھل سی گئی۔ اس کی گود میں بچہ رونے لگا تھا۔ اُسے اس نے سب سے بڑے بچے کو سونپا اور باقی بچوں کو جیسے سمجھانے لگی۔ باہر بہت گرمی ہے۔ تم اندر کوارٹر میں جا کر کھیلو اور پھر جیسے یہ بات بچوں کی سمجھ میں آگئی ہو۔ ایک ایک کر کے وہ چلے گئے اور اب وہ پھر اکیلی تھی کس طرح کا یہ آدمی ہے! بٹ بٹ اُسے گھورے جا رہا ہے لیکن مُنہ سے مس نہیں ہو رہا۔ شاید اُس میں اب وہ تمنا طلبی قوت نہیں رہی ہے۔ کوئی دن تھے، کوئی اُسے دیکھتا تو ریشہ خطمی ہو کر رہ جاتا۔ اور اوپر تلے ہوئے پانچ بچوں نے اس کا سب کچھ نچوڑ لیا تھا اور اُس کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ چھل چھل آنسوؤں میں سے ہنسنے لگے۔ یہ تو رو رہی ہے! اور اندر پنکھے کے نیچے لیٹا، اس کا جی پارے کی طرح پگھل گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا اور اُس نے اُسے اشارہ کیا وہ، اُس کے کمرے میں آسکتی تھی۔ اُس نے اسے اشارہ کرتے ہوئے دیکھا تو جیسے اُس کے لئے چاند نکل آیا ہو اور دیسی کی دیسی ننگے پاؤں، دیسی کی دیسی میلی چکٹ، دھوتی میں ویسے کے ویسے بے سنورے بال، وہ سیڑھیوں کی طرف چل دی ——

دو منٹ، تین منٹ، چار منٹ، اور وہ اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی دروازہ کھلا تھا اور وہ کمرے کے اندر تیز چل رہے پنکھے کے نیچے آ کھڑی ہوئی —— گڑیا سی، معصوم، مجبور، مظلوم۔

"پہلے باتھ روم میں۔۔۔۔" اس سے پہلے کہ وہ اپنا جملہ پورا کرتا، وہ بولی، "میں ابھی ابھی نہائی ہوں، بال بھی دھوئے تھے۔ ابھی سوکھے بھی نہیں!"

"باتھ روم میں کپڑے پڑے ہیں، اُنہیں دھو دو!" اُس نے مسکراتے ہوئے اپنا جملہ پورا کیا۔

اور اُنہی قدموں، وہ باتھ روم کی جانب چل دی۔ کواڑ بند کئے، کتنی دیر کپڑوں کو صابن لگانے، کو ٹنے، کھنگالنے کی آواز آتی رہی۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وہ باتھ روم سے باہر نکلی اور سامنے ڈرائنگ روم میں اُس کا کرتہ، پاجامہ، جانگیہ، بنیان سب کو ایک ایک کر کے کیلوں کے ساتھ، کھڑکی کے پٹ کے ساتھ، کرسیوں کی پشت پر "ٹانگ" دیا اور پھر اپنے ہاتھوں کو دھوتی کے پلّو سے پونچھتی ہوئی وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی "اب ڈرائنگ روم کی الماری کو صاف کر دو!" وہ مڑ کر ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئی الماری میں سے بُو آرہی تھی۔ اُس نے بیچ کا دروازہ بند کر لیا۔ ایسا لگتا تھا، الماری کو کسی نے برسوں سے صاف نہیں کیا تھا اور وہ ایک ایک کر کے ہر خانے کو جھاڑتی، پونچھتی صاف کرتی، کتنی دیر اس میں مصروف رہی۔ کام کرتی جاتی اور ساتھ ساتھ کسی لوک گیت کی دھن بھی گنگناتی جاتی۔ الماری کو صاف کرنے، کوڑا اکٹھا کرنے، کوڑا باہر پھینکنے میں کوئی ایک گھنٹہ بیت گیا۔ اب پھر وہ اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس بار وہ صابن سے ہاتھ منہ دھو کر آئی تھی۔ اُجلی، اُجلی لگ رہی تھی۔ فاختہ سی، پرسکون کھوئی کھوئی دیسی کی دیسی وہ کھڑی تھی جیسے کوئی دھرتی سے ابھی ابھی پھوٹی کنبھی ہو کہ وہ اُٹھ کر تیزی سے باتھ روم کی طرف نکل گیا۔ اُس نے اندر سے کنڈی لگا لی۔ کچھ دیر کے بعد اس کے نہانے کی آواز آنے لگی۔ اتنے میں بے کار کھڑی اس نے اس کے سونے کے کمرے کی صفائی شروع کر دی۔ پہلے کمرے کو بوہارا، پھر جھاڑا پونچھا۔ پھر پلنگ کے پائے میز، کرسیاں، کھڑکی کے شیشے صاف کئے۔ جو میلے تھے۔

وہ نہا کر نکلا۔ وہ ابھی تک کھڑکی کے شیشے صاف کر رہی تھی جتنی دیر تک وہ ڈریسنگ

روم میں کپڑے بدلتا رہا، وہ ویسی کی ویسی شیشے صاف کرتی رہی۔ اب اس کی پلنگ کی چادر جھٹک کر بچھا رہی تھی۔ اتنے میں وہ تیار ہو کر اُس کمرے میں آگیا۔

چادر کے ایک سرے میں سے سلوٹیں نکالتے ہوئے اُس نے اس کی طرف دیکھا۔ کتنا بانکا آدمی تھا۔ اونچا، لمبا، گندمی رنگ، تازہ سنورے بال، ایک نظر اس نے اسے دیکھا اور جیسے کچھ ہو گیا ہو۔ جیسے اُس کا انگ انگ ٹوٹنے لگا ہو۔ اُسے دیکھتی ہوئی اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

اُسے لگا، ایک لمحہ اور وہ اُس کے بھرپور آغوش میں ہو گی۔ اس کے ماتھے پر، اس کے گالوں پر ایک جھنجھناہٹ سی محسوس ہوئی، چکر چکر . . . . اندھیرا اندھیرا اور اس نے دیکھا اس کا ہاتھ اس کے کوٹ کے اندر کی جیب میں گیا۔ اور اس نے دس روپے کا ایک نوٹ اس کی ہتھیلی پر دھر دیا۔

"بہت بڑھیا صفائی تم نے ان کمروں کی کی ہے۔" وہ اُس کی تعریف کر رہا تھا۔

دس روپے کا نوٹ اس کی مٹھی میں تھا اور وہ باہر جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ اس بات کا احساس جب اُسے ہوا تو گوری سی اُس پہاڑن کا جی چاہا کہ اُس کے قدموں میں وہ اوندھی جا گرے۔ ممنونیت کے تحت، پھول جیسے لطیف اپنے انگوں کو سمیٹتی وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ دروازے سے گذرتے ہوئے اس نے دھوتی کے پلو سے اپنے سر کو ڈھک لیا۔

کچھ دیر کے بعد اس نے دیکھا، وہ سامنے نوکروں کے کوارٹروں کے گیلری میں کھڑی تھی۔ جیسے اڑ کر وہاں پہونچ گئی ہو۔ جب آئی تھی تو کتنی دیر اس نے لگائی تھی، اب کیسے اتنی جلدی اپنے گھر پہونچ گئی تھی۔ اس کے بچوں نے اسے گھیر لیا تھا اور سب سے چھوٹے کو ہوا میں اچھال کر وہ دُلا رہی تھی۔ بچہ کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔ بانہیں اٹھائے بچے کو اچھالتے ہوئے، ماں نے اس کے پاؤں کی انگلیوں کو اپنے دانتوں میں لے لیا۔ جیسے اُنہیں نہیں چبا رہی ہو اور اس کی آنکھیں ایک ناقابلِ بیان نشاط سے سندھ گئیں کچھ دیر رجم جھم پھوار پڑنے لگی۔


## پبلیکیشنز ڈویژن

نے طے کیا ہے کہ اس ادارے کی طرف سے شائع ہونے والے رسائل کے خریداروں کو ہماری مطبوعات کی خریداری پر ۲۰ فیصد کی رعائت دی جائے گی۔ آرڈر پانچ روپے سے کم نہ ہو۔ اور آرڈر کے ساتھ خریداری نمبر لکھنا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں اُردو، ہندی، انگریزی کے علاوہ علاقائی زبانوں کی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں۔ کتابوں کے انتخاب کے لئے فہرست طلب کیجئے جو آپ کی خدمت میں مفت ارسال کی جائے گی۔

بزنس منیجر: پبلیکیشنز ڈویژن پیالہ باؤس نئی دہلی ۱


# حسن اور وفا

## جگدیش سہائے سکسینہ

آہ اے گل اے سراپا رنگ و بُو
شاخ گلبن کی ہے چرخِ اخضری
اور تو ہے کوکبِ رنگیں جمال
تجھ پہ قرباں ہے ادائے دلبری
کس کے تیرِ ناز کا پیکاں ہے تو
کس قدر جاں بخش ہے منظر ترا
گل ہے تو یا رنگ و بو کے درمیاں
کوئی پیمانِ وفا باندھا گیا
جس سے روشن ہے جہانِ آرزو
تیرے دل دادہ ہیں مرغانِ ارم
داستانِ مستیٔ حسن و شباب
ہے ترے اوراقِ رنگیں پر رقم
اے جوانی کی بیاضِ مشکبو
کس کے ہونٹوں کا چرایا تو نے رنگ
کس کے گیسو کی اُڑائی ہے مہک
خاک میں پنہاں ہیں لاکھوں شوخ و شنگ
مہ جبین و مہ جمال و ماہرو
حیف تیری نرم و نازک پتیاں
جن پہ نازاں ہے عروسِ نو بہار
شام کو ہو جائیں گی نذرِ خزاں
اے دلِ بلبل کی رنگیں آرزو
سوچتا ہوں کس طرح دامن ترا
دستِ بیدادِ خزاں سے دور ہو
میرے لفظوں میں ہے تاثیر بقا
جلوہ فرما ہو مری نظموں میں تو
میں سخنور ہوں مرا حسنِ بیاں
کھینچ کر صورت تری الفاظ میں
تجھ کو بخشے گا حیاتِ جاوداں
غیر ممکن ہے کہ پژمردہ ہو تو

# نظریات کا تصادم

محسن عظیم آبادی

دوسرے افراد و اشیا کا بلاواسطہ علم ہمیں مشاہدے کے ذریعے ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی باور کرتے ہیں کہ مشاہدہ اشیا افراد کے حقیقی اوصاف کی عکاسی کرتا ہے۔ مشاہدہ ان کی اصل خصوصیات پر ہی مبنی ہوتا ہے اس صورت میں اگر کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ دوسرا شخص اپنی اشیا یا حالات کا مشاہدہ دوسری طرح کر رہا ہے تو وہ بلاشبہ ایسا سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ اس دوسرے شخص کا مشاہدہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ اپنے مشاہدے کی صداقت پر اُسے کسی شبہ کی گنجائش نہیں معلوم ہوگی کیونکہ اپنے مشاہدے میں اس نے کوئی کسر بیوقت نہیں کی ہے بلکہ اس کے حواس خمسہ نے انہیں جس صورت میں پیش کیا تھا اس نے من وعن قبول کر لیا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ دُوسرے شخص کے مشاہدے کو غلط نہ سمجھے اور اسے یہ شبہ نہ ہو کہ دوسرے شخص نے واقعہ اپنے مشاہدے میں تحریف کر دی ہے تماشہ یہ ہے کہ دُوسرا شخص بھی سراسر اپنی وجوہات کی بنا پر اپنے مشاہدے کو درست اور صحیح باور کرتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی شئے یا حالت کے مشاہدے میں ہم نظریات کے تصادم سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ ہر فرد کو اس بات کا یقین ہے کہ دُوسرا شخص غلط ہے، اس لئے نظریات کے تصادم کی گتھی الجھی ہوئی رہ جاتی ہے۔ دوسرے شخص کو مخالفت کے حق سے اس لئے محروم کر دیا جاتا ہے کہ نہ تو خارجی اشیاء کی مستقل اور پائیدہ خصوصیتوں سے انکار ممکن ہے اور نہ اپنے مشاہدے کی حقیقت سے۔ ایک دوسرا تصور بھی عام طور پر ہم پر حاوی ہے کہ ہمارے افعال ہمارے مشاہدوں پر مبنی ہوتے ہیں یعنی کسی شئے کے ساتھ ہمارا فعل اسی انداز میں ہوتا ہے جس رنگ میں ہم اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ سامنے رکھی ہوئی چیزوں میں ایک چیز کو ہم اٹھا کر منہ میں ڈال لیتے ہیں اس لئے کہ وہ ہمیں کھانے کی چیز دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً چاکلیٹ دوسری چیز کو اُٹھا کر ہم کاغذوں کی تہوں کے اوپر رکھ دیتے ہیں اس لئے کہ ہمارا مشاہدہ اسے پیپر ویٹ بتاتا ہے ان دو مختلف اشیاء کی بابت ہمارے افعال کی نوعیت مختلف ہے جس کا سبب یہی ہے کہ ان کا مشاہدہ بھی مختلف ہے۔ اس طرح ہمیں یقین ہے کہ مختلف مشاہدے ہمارے اندر مختلف افعال کی تحریک پیدا کرتے ہیں اور اس بناء پر مشاہدہ ہی کسی شئے کے ساتھ مناسب فعل کا اصل سبب سمجھا جاتا ہے اگر کسی ایک شئے یا حالت کے مقابلے میں دو افراد سے دو مختلف افعال سرزد ہوتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کسی ایک فرد کا فعل غیر مناسب یا غلط ہے۔ اس شخص کو ہم غیر تربیت یافتہ یا عجیب تصور کرنے لگتے ہیں۔ یہاں بھی ہمارے استدلال کی بنیاد وہی ہے۔ "فعل مشاہدے سے اثر پذیر ہوتا ہے حقیقی مشاہدے کا نتیجہ مناسب عمل ہونا چاہئے۔ غلط مشاہدہ ناموزوں عمل پیدا کرتا ہے" اس طرح دوسرے افراد کے اعمال و کردار کی بابت بھی نظریات کا تصادم رونما ہونے لگتا ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشاہدہ اور فعل سبب و نتیجے کے رشتے میں منسلک کر دئے جاتے ہیں اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس رشتے کی سمت بدلی نہیں جا سکتی یعنی ہم مشاہدہ کے رشتے سے فعل کی طرف رخ کر سکتے ہیں لیکن فعل سے مشاہدہ کی سمت نہیں جا سکتے۔ دوسرے لفظوں میں فعل مشاہدہ سے اثر پذیر ہوتا ہے لیکن مشاہدہ پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی کہے کہ ان دونوں کا تعلق محض یک طرفہ نہیں ہے بلکہ بعض صورتوں میں فعل، سبب اور مشاہدہ نتیجہ بھی بن سکتا ہے تو یہ بات لایعنی تصور کی جائے گی اس لئے کہ یہ بیان دو بنیادی عقیدوں سے انحراف کرتا ہے (۱) مشاہدہ کو فعل کا سبب قرار دیا جانا (۲) سبب اور نتیجے کے تعلق میں عدم بازگشت۔ اگر "الف" "ب" کا سبب ہے تو کسی حالت میں "الف"، "ب" کا نتیجہ نہیں بن سکتا یہ ممکن ہے کہ "الف" کسی دوسرے سبب کے تعلق سے نتیجے کی شکل اختیار کرے لیکن جو کسی ایک وقت میں "الف" کا نتیجہ بن چکا ہے۔ کبھی "الف" کا سبب نہیں بن سکتا۔ عام طور پر سبب

اور نتیجے کا رشتہ مندرجہ ذیل طریقے سے ہی پیش کیا جاتا ہے ۔

الف ⟵ ب ⟵ ج ⟵ س نہ کہ الف ⟷ ب ⟷ ج ⟷ س ⟷

حقیقت میں سبب اور نتیجے کے باہمی عدم بازگشت کا تصور اس حالت میں صحیح نہیں ہوتا جب فکر و مطالعہ کا موضوع ایک جاندار شئے ہو۔ مشاہدہ اور فعل جاندار یعنی جانور اور انسان کی خصوصیتیں ہیں۔ ان کے سلسلے میں جو کسی وقت سبب رہا ہو، دوسرے موقع پر اسی کا نتیجہ بن سکتا ہے جسے ہم اول الذکر کا نتیجہ سمجھ چکے ہیں اگر ایک حالت میں سبب نتیجے پر اثر انداز ہو سکتا ہے تو دوسری حالت میں وہی سبب اپنے نتیجے سے اثر پذیر بھی ہو سکتا ہے۔ دوستی اور محبت کے رشتے کی طرح سبب اور نتیجے کا تعلق بھی یک طرفہ نہیں ہوتا۔ ایک موقع پر تجزید کی ضرورت اگر تجزیہ فراہم کر سکتا ہے تو دوسرے موقع پر تجزیہ کی ضرورت بھی تجزید کے ذریعہ پوری ہو سکتی ہے۔ مشاہدے کی اثر اندازی فعل پر ہوتی ہے۔ مشاہدے کی رہنمائی میں موضوع مشاہدہ کی بابت فعل سرزد ہوتا ہے لیکن فعل کے ظہور پذیر ہو چکنے کے بعد ہم آئندہ اس شئے کا مشاہدہ کس صورت میں کریں گے اس کی نشاندہی ہمیں اس کے سلسلے میں کئے ہوئے فعل سے ہی ملے گی۔ اس طرح فعل مشاہدے پر اثر انداز ہوگا۔ وہی جو کبھی سبب تھا، بغیر تیسرے واقعہ کی مداخلت کے نتیجہ بن سکتا ہے۔ بلی جب کسی بچے کو ایک خوفناک شئے دکھائی دیتی ہے تو وہ اس سے دور بھاگتا ہے۔ مشاہدہ سے فعل کی تحریک ہوتی ہے لیکن اگر آپ اسی بچے کو بلی کے ساتھ کھیلنے کی مشق کرا دیں تو پھر اس کی نگاہ میں بلی ایک کھلونا دکھائی دینے لگے گی۔ پہلے موقع پر بلی کا مشاہدہ بچے کے اندر عمل فرار پیدا کرتا ہے۔ مشاہدہ فعل کا سبب ہے۔ دوسرے موقع پر بچے کی، بلی کیساتھ، خوش فعلی، اس کے مشاہدہ میں انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ فعل مشاہدہ پر اثر انداز ہو جاتا ہے۔ ایک دوسری مثال لیجئے۔ جب کوئی شخص کسی ایسے محلے میں بود و باش اختیار کرتا ہے جہاں پہلے سے اس کی آمد و رفت نہیں تھی تو محلے والے اسے اجنبی دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن جب کچھ عرصے میں محلہ والوں کے ساتھ اس کا اور ردِ عمل کا موقع اسے مل جاتا ہے تو وہ محلے والوں کو دوسری نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اسے اجنبی کی جگہ جانے پہچانے نظر آتے ہیں۔

سماج کے اندر ہر فرد کا جو رول یا سماجی حیثیت ہوتی ہے اس کا اثر دوسرے فرد کے مشاہدے پر پڑتا ہے۔ ہر سماج چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹا ہوتا ہے۔ سماج کا ہر فرد ہر ٹولی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ مختلف افراد مختلف ٹولیوں سے وابستہ ہوتے ہیں لیکن ہر ٹولی کے اندر سب ممبروں کی حیثیت یکساں نہیں ہوتی۔ ہر رکن کی ذات کے ساتھ خصوصی فرائض اور ذمہ داریاں منسلک ہوتی ہیں جو اس کی حیثیت یا رول کی نشاندہی کرتی ہیں اور جن کی بنا پر اس ٹولی کا ہر رکن اس سے ایک خاص نوع کے افعال و کردار کی توقع رکھتا ہے۔ ایک کنبے کی مثال سامنے رکھئے جو ایک چھوٹی سماجی اکائی ہے۔ کنبے کے رکن کی حیثیت سے والدین کا رول کنبے کے دوسرے افراد سے جداگانہ ہے۔ والدین کے اندر بھی باپ کی حیثیت ماں کی حیثیت سے مختلف ہے۔ سماجی اکائی کی دوسری مثال اسکول یا کالج کا ادارہ ہے۔ ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل کی حیثیت دوسرے اساتذہ سے مختلف ہے۔ اساتذہ کی حیثیت طلباء سے جداگانہ ہے۔ اسی طرح ان سبھوں کی حیثیت اسکول کے غیر تعلیمی اسٹاف سے الگ ہے۔ سماجی اکائی کا ہر فرد دوسرے افراد کا مشاہدہ ان کی سماجی حیثیت کی روشنی میں کرتا ہے۔ ہر فرد سے جس نوع کے کردار کی توقعات وابستہ ہوتی ہیں، انہی کے مطابق دوسرے افراد اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک طالب علم دوسرے طالب علم کا جس رنگ میں مشاہدہ کرتا ہے اور اسی طالب علم کا استاد جس طرز سے اس کا استاد کرتا ہے، دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ طالب علم کی وہی بات دوسرے طالب علم کو معقول اور مناسب نظر آتی ہے، جو اس کے اساتذہ کی نگاہ میں غیر معقول اور نامناسب ہے! استاد کی جماعتی حیثیت یا، دوسرے لفظوں میں، اس کی عملی خصوصیتیں اس کے مشاہدہ پر اثر انداز ہوتی ہے۔

مشاہدہ پر افعال کی اثر اندازی کی مثال ہمیں اس فرق کے اندر بھی ملتی ہے جو کلچر کے فرق کے ساتھ ایک ہی شے یا ایک ہی حالت کے مشاہدہ میں ہوا کرتا ہے۔ کلچر کی تعریف ان لفظوں میں کی جا سکتی ہے: "ان سیکھے ہوئے افعال اور ان کے نتیجوں کی ایک ترتیب جو کسی خاص سماج کے افراد میں مشترک پائے جاتے ہیں۔ اور اس طرح ایک پیڑھی سے دوسری پیڑھی میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔" وہی چیز جو ایک کلچر والوں کو بُری دکھائی دیتی ہے، دوسرے کلچر کے افراد کے لئے منظر قریب ہو سکتی ہے۔ کھانے کے بعد مسلسل ڈکار کی آواز ایک کلچر کے افراد کے لئے خوش آیند ہے تو دوسرے کلچر والوں کے لئے سمع خراش۔ اپنی ماں یا بہن کے چہرے کا بوسہ ایک کلچر کے افراد کے لئے ایک خوش گوار منظر پیش کرتا ہے تو یہی نظارہ دوسرے کلچر والوں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگتا ہے ــــ مشاہدہ اور فعل ایک دوسرے کے ساتھ باہمی تعلق رکھتے ہیں۔ باہم دگر اثر اندازی اُن کی خصوصیت ہے مشاہدہ فعل سے اسی حد تک اثر پذیر ہو سکتا ہے جتنا فعل مشاہدہ سے لیکن صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ ان دونوں کے اوپر ایک دوسرا اثر بھی کام کرتا ہے سبب اور نتیجے کی کڑی اشیاء سے مشاہدہ کی طرف اور مشاہدہ سے فعل کی جانب نہیں جاتی۔ بلاشبہ خارجی اشیاء مشاہدہ پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور ان کی وساطت سے فعل پر۔ لیکن خارجی اشیاء اور خارجی حالات کے علاوہ کچھ دوسرے اسباب کا عمل مشاہدہ اور فعل پر یکساں ہوتا ہے۔ ان اسباب کا تعلق ہماری داخلی ذات سے ہے اور ان کا عمل وقوع مشاہدہ اور فعل کے مابین ہے۔ اس طرح دونوں پر ان کا اثر پڑتا ہے ان داخلی اثرات میں میلانِ طبع کی اہمیت سب سے زیادہ سمجھی جاتی ہے اس بات کے

سمجھنے سے پہلے کہ میلان طبع مشاہدہ اور فعل پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے ہمیں میلانِ طبع کی ماہیت پر روشنی ڈالنی ہوگی۔ میلان یا رجحان جیسی اصطلاحیں جن کے لئے انگریزی میں Attitude کا لفظ مستعمل ہے اپنے استعمال کی عمومیت کی بنا پر ہمیں اس فریب میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ ہم انہیں اچھی طرح جان پہچان چکے ہیں۔ ہم میلانات الفت، نفرت، احترام، اہانت، بدگمانی وغیرہ وغیرہ جیسے الفاظ کا استعمال روزمرہ کرتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم میلانِ طبع کو ایک خاص نوع کے احساسات وجذبات کے مترادف سمجھتے ہیں لیکن اگر ہم کسی شخص کے میلان طبع کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس کے اجزاء صرف احساسات وجذبات تک محدود نہیں ہیں۔ ان میں ہمیں اور بھی نفسی عناصر کے نشان ملیں گے۔ مثلاً جب آپ اپنے اندر کسی شخص سے بدگمانی کا میلان پاتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس شخص کے متعلق آپ کچھ خاص تصورات بھی رکھتے ہیں آپ اسے غیر معتبر سمجھتے ہیں، آپ باور کرتے ہیں کہ اس کے اندر آپ کے لئے اُنس وہمدردی کا کوئی جذبہ نہیں ہے، موقع ملنے پر وہ آپ کو مشکلات میں ڈال دے گا اور اسی سے ملتے جلتے دوسرے تصورات بھی۔ اگر آپ کبھی اس سے دوچار ہو جاتے ہیں تو اس سے کترانے کی تحریک آپ کے اندر پیدا ہونے لگتی ہے۔ اگر آپ کی بدگمانی کا پارہ بہت اونچا ہے تو اس کی اہانت اور اس کے ساتھ نارواسلوک کرنے کے اقدام رونما ہونے لگتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ میلان طبع صرف ایک خاص نوع کے احساسات یا جذبات کا دوسرا نام نہیں ہے بلکہ اس کی تہہ میں چند تصورات وعقائد بھی ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اقدام عمل کی تحریکیں۔

میلان طبع کے اجزائے ترکیبی کے عناصر یعنی احساسات وجذبات، تصورات وعقائد اقدام عمل وتحریک فعل کی حیثیت منفی اور مثبت دونوں ہی ہو سکتی ہے۔ پہلی حیثیت کو جانبدارانہ اور دوسری کو معاندانہ میلان کہا جائے گا۔ مثال کے طور پر اگر کسی سیاسی جماعت کے لئے ایک شخص کے اندر جانبدارانہ میلانات ہوں تو اس جماعت کی نسبت اس کے احساسات خوشگوار ہوں گے۔ وہ اس جماعت کی کامیابیوں پر مسرور اور ناکامیوں پر ملول ہوگا۔ اس کے تصور میں یہی جماعت ملک کے بنیادی مسائل کا مفید حل پیش کر سکتی ہے اور اس بات پر اسے کامل یقین بھی ہوگا۔ اس جماعت کے فروغ کی کوشش میں اپنا وقت اور دوسرے وسائل صرف کرنے کے لئے وہ ہمہ تن مستعد رہے گا۔ معاندانہ میلانات کی عکاسی ان محسوسات وجذبات، ان تصورات وعقائد، ان اقدام وحرکات کی صورت میں ہوگی جو اس پارٹی کے مفاد سے متصادم ہوں گے۔

میلان طبع اور موڈ میں کچھ ملتی جلتی کیفیتوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک بڑا فرق ہے۔ موڈ کی ایک ہنگامی اور عارضی کیفیت ہے۔ میلانِ طبع دیرپا اور مستقل ہوتا ہے۔ اس بنا پر میلانات طبع شخصیت کا جزو بن جاتے ہیں۔ میلان طبع کی مختصر تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے: "میلان طبع دوسرے افراد، اشیاء اور حالات کا ایک خاص رنگ سے مشاہدہ اور ان کی جانب ایک خاص طرز عمل کے لئے داخلی مستعدی کا نام ہے۔" اگر آپ کے اندر کسی خاص شے کی طرف میلان کا وجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ پہلے ہی سے اس شے کا مشاہدہ اور اس سے متعلقہ افعال کی ایک خاص نہج سے ظہور پذیری کے لئے آمادگی رکھتے ہیں۔ اس تشریح کے مطابق میلان طبع کی اثر اندازی مشاہدہ اور فعل دونوں ہی پر ہوتی ہے۔ میلان طبع کا فعل پر اثر شاید آسانی سے مان لیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ دشمنی کا میلان رکھتا ہے تو یہ قرینۂ غالب وہ اسے نقصان، نہ کہ فائدہ پہنچانے کی کوشش میں سرگرم ہوگا۔ لیکن یہ بات آسانی سے باور نہیں کی جائے گی کہ میلان طبع مشاہدہ پر بھی اثر انداز ہے۔ ہم جو کچھ دیکھتے یا سنتے ہیں وہ بھی اس کے اثر سے بری نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ مشاہدہ کا جو تصور ہم نے گھڑ رکھا ہے اس کے آگے یہ بیان باطل ہو جاتا ہے۔ جیسا ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، ہم یہی سمجھتے ہیں کہ مشاہدہ خارجی اثرات کے تحت ہوتا ہے۔ اس کو ہماری داخلی ذات سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہمیں اس خیال کی تصحیح کرنی ہوگی۔

یہ بات کہ مشاہدہ کرنے والے کے داخلی اثرات اس کے مشاہدے پر اسی حد تک اثر انداز ہو سکتے ہیں جتنے خارجی، ایک جامع نفسیاتی کلیہ کی صورت میں پیش کی گئی ہے جو بادی النظر میں کچھ عجیب سا نظر آتا ہے لیکن دراصل ایک عظیم حقیقت کا ترجمان ہے۔ "اشیاء ہمیں ویسی نہیں معلوم ہوتیں جیسی وہ ہیں بلکہ جیسے ہم ہیں۔" یہ کلیہ متواتر تجربوں کی روشنی میں قبول کیا جا چکا ہے۔ ہماری حاجتیں، ہمارے مطالبات، ہماری خواہشیں، یہ سب وہ اثرات ہیں جو ہماری ذات کے اندر کارفرما رہتے ہیں۔ مشاہدہ پر ان کی اثر اندازی کی مثالیں عام ہیں۔ ایک بھوکا آدمی اشیاء خوردنی کا صرف تصور ہی نہیں کرتا بلکہ کبھی کبھی ان کے غائبانے میں بھی اسے ان کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے۔ ایک تجربہ میں دو گروہوں کے افراد کو کچھ مبہم نقوش ایک لمحے کے لئے دکھائے گئے۔ ایک گروہ کے افراد کو بھوکا رکھا گیا تھا اور دوسرے گروہ کے افراد کو بھرپیٹ کھانا کھلا دیا گیا تھا ان سے کہا گیا کہ جو کچھ انہوں نے ان نقوش میں دیکھا اس کی وضاحت کریں۔ بھوکے گروہ کے بیان میں اشیاء خوردنی اور ان سے متعلقہ اشیاء کے نام، دوسرے گروہ کے بیان سے کہیں زیادہ تھے۔ اس طرح کے ان گنت تجربوں سے اس کی مستقل تصدیق ہو گئی کہ مشاہدہ حاجتوں، خواہشوں اور مقاصد کی اثر اندازی سے بے نیاز نہیں رہتا۔

مشاہدے پر موڈ کی اثر اندازی کس حد تک ہوتی ہے اس سلسلے میں ایک دلچسپ تجربے کی رپورٹ پیش کرتا ہوں:۔ حسب خواہ موڈ پیدا کرنے کے لئے معمو پر پہلے ہپناٹزم کا عمل کیا گیا۔ اس کے بعد اس پر ایک خاص موڈ طاری کیا گیا۔ تجر میں تین مختلف موڈ کا استعمال کیا گیا تھا۔ (۱) سرور و نشاط (۲) تنقید و نکتہ چینی (

خوف و اندیشہ ـــــــ آپ جانتے ہوں گے کہ کسی شخص پر ہپناٹزم کا عمل کر کے آپ اپنی خواہش کے مطابق اس سے ہر بات تسلیم کرا سکتے ہیں اور اس پر ہر نوع کی کیفیت طاری کر سکتے ہیں۔ آپ اگر کہیں کہ "تمہارے بائیں ہاتھ میں سخت درد ہو رہا ہے اور تم اسے ہلا تک نہیں سکتے" تو وہ ایسا سنتے ہی درد کے احساس سے کراہنے لگے گا اور باوجود کوشش کے ہاتھ اٹھانے میں ناکام رہے گا۔ آپ اگر کہہ دیں کہ اس کی مرحومہ بیوی کی یاد اسے غمگین و افسردہ بنا رہی ہے تو وہ غم کی اور افسردگی کے سارے اثرات کا بے ساختہ اظہار کرنے لگے گا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ بعض ماہران مریض پر ہپناٹزم کا عمل کر کے اور اس حالت میں اسے یقین دلا کر کہ آپریشن کی کوئی تکلیف نہیں رہی ہے اس پر بڑا سے بڑا عمل جراحی کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اسی طرح اس تجربے میں بھی جس کا میں ذکر کر رہا تھا مختلف افراد پر مختلف موڈ طاری کر دیئے گئے۔ اس کے بعد ہر ایک کو کچھ ایسی تصویریں دکھائی گئیں جن میں چند افراد کسی کام میں مشغول نظر آ رہے تھے پھر ہر ایک سے کہا گیا کہ وہ جو کچھ تصویر میں دیکھ رہا تھا بیان کرے۔ موڈ کی مناسبت سے بیان میں اتنا زیادہ فرق تھا کہ ان کی بنا پر تصویروں کو ایک دوسرے سے تمیز کرنا ایک دشوار عمل بن گیا۔ وہی تصویر جو نشاط کی کیفیت میں ایک خوشگوار نظارہ پیش کر رہی تھی، نکتہ چینی کے موڈ میں اخلاق سوز اور ناگوار منظر پیش کرتی ہوئی دکھائی دی۔

اسی طرح خوف و اندیشہ کے موڈ میں وہی تصویر پرخطر اور سنسنی خیز نظر آئی۔ موڈ ایک عارضی کیفیت کا نام ہے۔ یہ کسی شخص کی خصوصیت نہیں بن سکتا لیکن جب مشاہدہ پر میلان طبع کی اثر اندازی کے سلسلے میں اسی قسم کے تجربے کئے گئے تو ان کے نتیجے بھی ایسے ہی پائے گئے۔ ایک تجربے میں کچھ افراد کی جانچ کر کے اس کا پتہ لگا لیا گیا کہ مزدوروں کی نسبت ان کا میلانِ طبع کیا تھا۔ اس بنیاد پر ان میں سے دو گروہ چن لئے گئے۔ (۱) مزدوروں کے شدید طرفدار (۲) مزدوروں کے شدید مخالف۔ اس کے بعد دونوں گروہوں کے ہر ایک فرد کو ایسی تصویریں دکھائی گئیں جو غریبوں کے محلے میں ایک گھر کے اندرونی حصے کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ ہر ایک سے کہا گیا کہ وہ جو کچھ تصویریں دیکھ رہا تھا اس کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی رائے پیش کرے۔ مزدوروں کے جانبدار گروہ کے لئے تصویریں مزدوروں کی زندگی کی دشواریاں، ان کی بدحالی، ان کے مسائل کے ساتھ انتظامیہ کی عدم توجہی وغیرہ وغیرہ کے مناظر پیش کر رہی تھیں۔ مزدوروں کے مخالف گروہ کو انہیں تصویروں میں مزدور طبقہ کی گندی عادتیں، غیر صحتمندانہ رہائش، ناگوار طریقوں کے مرقع نظر آ رہے تھے۔

مشاہدے پر میلانِ طبع کا اثر ہم صرف تجربہ گاہوں میں ہی نہیں دیکھ پاتے۔ اگر ہم اپنے روزمرہ افعال پر یک گونہ علیحدہ ہو کر نظر ڈالیں تو وہاں بھی ان اثرات کے نشان ہمیں دکھائی دیں گے۔ یہ ایک عام بات ہے کہ اپنے خاندان یا اپنی ذات والوں کی خوبیوں اور خامیوں پر ہماری نگاہ اس طرح نہیں پڑتی جیسے دوسرے خاندان یا دوسری ذات والوں کی اچھائیوں اور برائیوں پر، یہ گمان غالب ہماری نگاہ اپنی ٹولی کے افراد کی خوبیوں پر زیادہ اور ان کی خامیوں پر کم پڑتی ہے۔ اس رجحان کو انگریزی میں Ethnocenterism کہتے ہیں جس کا ترجمہ ہم "نسلی ارتکاز" کر سکتے ہیں۔ سماجی تعصب اسی رجحان کی پیداوار ہے۔ غیر جماعتوں کے افراد کا مشاہدہ ہم ان کی حقیقی خصوصیتوں کی روشنی میں کرنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ ہم ان کا مشاہدہ اپنے ان داخلی میلانات کے تحت کرتے ہیں جو ہم نے ان کے متعلق اخذ کر لئے ہیں۔ اکثر و بیشتر ہم نے افراد و اشیا کی جانب ایک خصوصی زاویئے سے نگاہ کرنے کی عادت بنا رکھی ہے جماعتی حیثیت سے ہم فرد کی انفرادی خصوصیتوں کو نظر انداز کر دینے کے عادی ہوتے ہیں اور ان کی جگہ ان اوصاف کو رکھ دیتے ہیں جنہیں ہم اس جماعت کی خصوصیت سمجھتے ہیں جس کا فرد وہ ہے۔ ان جماعتی خصوصیتوں کو جن کی روشنی میں ہم غیر جماعتوں کے افراد کا مشاہدہ یا ان کے اوصاف کی پرکھ کرتے ہیں۔ اسٹیریو ٹائپ Stereo-type کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسٹیریو ٹائپ وہ جماعتی خصوصیتیں ہیں جو ہم کسی جماعت کے ہر فرد پر بلا تامل لاگو کر دیتے ہیں۔ عام طور پر کسی ایک جماعت کے افراد دوسری جماعت کے افراد کی توصیف کرنے میں جن خصوصیتوں کا استعمال کرتے ہیں ان میں یکسانیت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم میں سے ہر ایک بحیثیت قوم کے انگریز کو زمانہ ساز، قوم پرست، قدامت پسند، کم آمیز، باوقار وغیرہ وغیرہ تصور کرتا ہے۔ اس کے برخلاف امریکن کے متعلق ہمارے ذہن میں زود آمیز، جدت پسند، مادیت پسند، انفرادیت کا علمبردار وغیرہ وغیرہ خصائل ابھر آتے ہیں۔

میلانِ طبع مشاہدہ اور فعل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشاہدہ اور فعل کی اثر اندازی میلانِ طبع پر ہوتی ہے یا نہیں؟ میلانِ طبع کوئی جبلی خصوصیت نہیں ہے۔ ہم اپنی نشوونما کے ذریعہ اس کا اکتساب کرتے ہیں۔ میلانِ طبع کا اشیا اور افراد سے قریب ترین رشتہ ہوتا ہے۔ پہلے پہل بچے کو اشیا اور افراد کا تجربہ مشاہدہ اور فعل کے ذریعہ ہی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے اندر اشیا اور افراد کی نسبت جو میلانات بنتے ہیں ان میں مشاہدہ اور فعل کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ بچے کی چند گنی چنی بنیادی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ بھوک، پیاس، بول و براز وغیرہ۔ بچے کی صحت بلکہ زندگی کا دارومدار ان ضرورتوں کی تسکین پر ہے۔ اشیا اور دوسرے افراد ان ضرورتوں کی فراہمی کے لئے آلۂ کار بنتے ہیں۔ اس سلسلے میں بچے کے اندر ان اشیا اور افراد سے کچھ توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ان اشیا اور افراد کا جانبدارانہ مشاہدہ کرنے کی آمادگی اور ان کی نسبت مثبتی اقدام کی تیاری بچے کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ جو اشیا اور جو افراد بچے کی حاجتوں کی تسکین میں رخنہ انداز ہوتے ہیں ان کی نسبت معاندانہ میلانات کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ ہر بچہ ایک خاص

سماج میں پیدا ہوتا، پلتا اور رہتا ہے۔ اپنی نشوونما کے سلسلے میں وہ ان سماجی قدروں اور فکر و عمل کے معیار کو اپنا لیتا ہے جو اس جماعت کے لئے مخصوص ہیں، جس کا وہ ممبر ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی جاتی ہے اور اس میں پختگی آتی جاتی ہے، وہ اپنے خاندان کی مختصر اکائی کے علاوہ بڑی بڑی سماجی اکائیوں کا رکن بنتا جاتا ہے۔ جیسے ہمسائے، اسکول، کالج، ہم پیشہ اشخاص، تفریحی اور کلچرل ادارے، سماجی اور سیاسی گروہ، قومی بلکہ بین الاقوامی تنظیمیں۔ ان جماعتوں کی وسعت کے ساتھ ساتھ جن کے رکن ہونے کا اُسے شرف ہوتا ہے وہ علم و عمل کے ایک وسیع تر دائرے سے بھی آشنا ہونے لگتا ہے جس کی وجہ سے اُس کے میلانات طبع میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوتی جاتی ہے۔ وہ نت نئے میلانات کا اکتساب کرتا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے اولین میلانات میں تغیر بھی رونما ہوتا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ مشاہدے اور فعل کے نتیجے میں ہی ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہوگا کہ سبب و نتیجے کے باہمی بازگشت کا اطلاق صرف مشاہدہ اور فعل تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ یہ ایک طرف مشاہدہ اور فعل اور دوسری طرف میلان طبع پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ میلانات طبع کی ساخت مشاہدہ اور فعل کی کارفرمائی کے تابع ہے لیکن جب ان کی بنیاد پڑ چکی ہوتی ہے تو یہی میلانات طبع مشاہدہ اور فعل کے ڈھنگ پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔

میلان طبع، مشاہدہ اور فعل کے ربط باہمی کو ہم اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک فرد کو دوسرے فرد سے یا ایک جماعت کو دوسری جماعت سے جو نت نئی غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں ان کی تہہ میں اسی فروگذاشت کی کارفرمائی ہے۔ نظریات کے تصادم کی اصلی بنا یہی ہے کسی شخص کے مشاہدے اور فعل کو پرکھنے کے وقت ہم اس کے مشاہدے، فعل اور میلانات طبع کے پس منظر پر نظر نہیں ڈالتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا مشاہدہ اور فعل ہمارے لئے بے معنی بن جاتے ہیں۔ اس شخص پر ہمیں فریب کاری کا شبہ ہوتا ہے۔ اور ہم اس پر حقیقت اور انصاف سے روگردانی کا الزام عائد کرنے لگتے ہیں۔ ہم اس کے فعل اور مشاہدہ کی جانچ اپنے مشاہدہ، فعل اور میلانات طبع کے پس منظر میں کرتے ہیں۔ اپنا داخلی دائرۂ منسوبیت (Frame of Reference) ان پر نافذ کر کے ہم ان افعال و میلانات کی تحصیل و تنقید کرنے لگتے ہیں۔ دائرہ منسوبیت کسی ایک فرد یا جماعت کے تصورات، خیالات، معتقدات، احساسات و جذبات، مشاہدات، عادات، تحریکات عمل اور میلانات طبع کا ملا جلا داخلی پس منظر ہے۔ کسی شخص کے انفرادی فعل کا صحیح ادراک ہمیں اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم اس شخص کے داخلی دائرۂ منسوبیت میں اس فعل کو رکھ کر اس پر نگاہ کریں۔ یعنی اس کے داخلی پس منظر کو متشکل کر کے اس فعل کی نوعیت پر غور کریں۔ کسی دوسرے شخص یا دوسری جماعت کے ادراک کے لئے لازم ہے کہ اس شخص یا جماعت کے داخلی دائرۂ منسوبیت کا خاکہ ہمارے سامنے موجود ہو۔ ہمیں چاہیئے کہ دوسرے شخص کی پوزیشن میں اپنے آپ کو رکھ کر ہی ہم اس کے افعال و کردار کی جانچ پڑتال کریں۔ اس کے ماضی اور حال کی تصویر اپنے سامنے کھڑی کر کے ہم اس کے قول و فعل پر تبصرہ کریں۔ دوسرے لفظوں میں پہلے ہم اس کے داخلی دائرۂ منسوبیت کا ہیولا تیار کر لیں۔ جب تک ہر فرد اپنے اندر اس بات کی صلاحیت نہ پیدا کر لے، ایک دوسرے کا صحیح ادراک اور ایک دوسرے سے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں نظریات کا تصادم حائل ہو کر رہے گا۔ اس طرح یہ ٹکراؤ صرف ایک فرد اور دوسرے فرد، ایک سماج اور دوسرے سماج، ایک قوم اور دوسری قوم کے اندر نت نئے مسائل ہی نہیں پیدا کرتا رہے گا بلکہ ان مسائل کے حل کی ساری کوششوں کو ناکام بنا دے گا۔

# غزل

اختر بستوی

دہر کے دشت میں اک مسافر بنی روح روزِ ازل سے بھٹکتی رہی
خارِ تاریخ سینے میں چبھتا رہا، وقت کی پھانس دل میں کھٹکتی رہی
بحرِ تشکیک کی وسعتوں میں کہیں ہاتھ آیا نہ عرفاں کا ساحل کبھی
تلملاتی رہی عقل کی لہر بھی، موجِ ادراک بھی سر پٹکتی رہی
سونا سونا تخیل کا گلزار تھا، گلشنِ فکر پر مُردنی تھی مگر
ایک انجان خواہش کی ننھی کلی ذہن کی کیاریوں میں چٹکتی رہی
لے کے دیوانگی کا سہارا کبھی کر سکا میں نہ بیتابیاں اپنی کم
کچے دھاگے میں شمشیرِ ہوش و خرد سر پہ ہر وقت میرے لٹکتی رہی
علم کے پھول اخترؔ نے جتنے چنے، سب وہ جی جان سے نذر کرتا رہا
فن کی دیوی مگر ایسی ناراض تھی اپنا دامن ہمیشہ جھٹکتی رہی

# لولتے منہ کی یہ پہلی نظم

صلاح الدین پرویز

وہ کسی نم دیدہ دل پر
اپنے جرموں کی سیاہی کو
لگانے کی بڑی کوشش میں
پاگل ہوگیا
ریڈیو کے کالے مکرے سے
کسی بچے نے اپنے باپ سے رو کر کہا
" ہوک جو جاگی ہے من میں
اس کو چادر پر سجا کر
تم کسی ویراں نحور پر
شرارت کا تبسم
اپنی دو موٹی بڑی آنکھوں پر رکھ لو"
پتیاں رکھ کر گلاسوں میں
رعونت اپنی بغلوں میں چھپا کر
وہ پرانی خواب گاہِ عیش و عشرت میں
تھکے آنچل پہ مہندی کو رچا کر
ہنس پڑی
اور پھر ساری ہوائیں
اس کے ماتھے سے نکل کر
پالنے کے اُجلے بستر پر
سمٹ کر سو گئیں
اور میں بھی سوچ کر
رکھ کر پرندوں کے سنہرے خوبصورت پر
کسی مندر کے آنگن میں
ہمک کر سو گیا
میرے بچے نے مرے سارے خیالوں اور اندیشوں پر اپنا
چاند جیسا پاک چہرہ رکھ دیا

# زورِ نمو

مشتاق علی شاہد

بوڑھا پیپل
حیراں حیراں
دیکھ رہا ہے . . . .
اس کے تن پر — سوکھی چھال
جگہ جگہ سے
تڑخ گئی ہے —
وہ بیچارہ
سوچ رہا ہے :
" شاید کوئی رگ لگا ہے ! "
اور حقیقت —
مجھ سے پوچھو :
نئی، توانا، تازہ چھال
موسم گل کے آتے ہی
بے چین ہوئی ہے —
زورِ نمو میں
سوکھی چھال کے ٹکڑے کر کے
— اُبھر رہی ہے :

# جوہر بھارتی

آج کیا بات ہے
کس لئے
سامنے والی کھڑکی
بڑی دیر سے بند ہے
چوڑیوں کی کھنک —
گھنگھروؤں کی جھنک —
روشنی
قہقہے
شور و غل
آج کچھ بھی نہیں
موت کی بے کراں خامشی کے سوا

اوہ ! یاد آگیا
آج سے کچھ برس پہلے
اس نرتکی کا کوئی آشنا
تیج کے دن
اسے چھوڑ کر چل دیا تھا
نہ جانے کدھر

آج تہوار ہے تیج کا
اس لئے
سامنے والی کھڑکی
بڑی دیر سے بند ہے
چوڑیوں کی کھنک
گھنگھروؤں کی جھنک
روشنی
قہقہے
آج کچھ بھی نہیں
موت کی بے کراں خامشی کے سوا

# قابلِ مطالعہ

# کتابیں

| | |
|---|---|
| ہمارا جھنڈا | ایک روپیہ |
| بھارت آج اور کل | ۷۵ پیسے |
| دو شہروں کی کہانی (چارلس ڈکنس) | ۵ روپے |
| جوالا مکھی (ناول، انتشت گوپال شیوڈے) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کا دستور | ۲ روپے |
| آئینہ غالب | ۵ روپے |
| آج کل کی کہانیاں | ۳ روپے ۵۰ پیسے |
| وطن کے نغمے | ایک روپیہ ۷۵ پیسے |
| امرجوت | ۲ روپے |
| سائنس کے چند پہلو | ایک روپیہ ۲۵ پیسے |
| ہمارے نہرو | ۳ روپے ۵۰ پیسے |
| گنجینہ غالب | ۴ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کی مسجدیں | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| مہاتما گاندھی کی کہانی (رنگین تصویروں میں) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |

| | |
|---|---|
| اچھا شہری (بچوں کے لئے) | ایک روپیہ |
| نہرو راد حاکرشنن کی نظر میں | ایک روپیہ |
| ابوالکلام آزاد | دو روپے |
| ہندوستان کی تاریخ (بچوں کے لئے) | ۳ روپے ۷۵ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ اول) | ۲ روپے ۲۵ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ دوم) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ سوئم) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| سوامی وویکانند (بچوں کے لئے) | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |
| جواہر لال نہرو (خراج عقیدت) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان میں تعلیم کی از سرِ نو تنظیم (ڈاکٹر ذاکر حسین) | ایک روپیہ ۲۵ پیسے |
| ہندوستانی ڈرامہ (صفدر آہ) | ۳ روپے ۷۵ پیسے |
| پنڈت نہرو سے بات چیت (ٹیبر منڈی) | ۲ روپے |
| ندیا کنارے (علی عباس حسینی) | ایک روپیہ |
| کلی یا تہذیب کا مستقبل (ڈاکٹر راد حاکرشنن) | ۷۵ پیسے |

آج کل کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت ہوگی
محصول ڈاک ہمارے ذمہ ہوگا

اُردو کے علاوہ انگریزی، ہندی اور تمام علاقائی زبانوں میں کتابیں شائع ہوتی ہیں

فہرستِ کتب مفت طلب کیجئے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

# ایک ڈوبتا جزیرہ

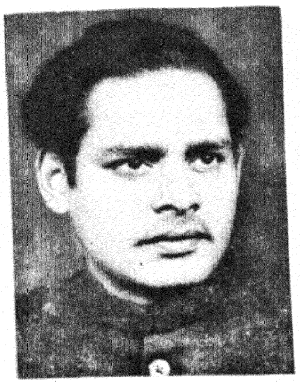

رفعت سروش

یونہی بے ترتیب سے گھونگھریالے بال — سوتی ساڑی — سادہ چہرہ، ستا ہوا گندمی رنگ، باتیں کرنے کا بے جھجک لیکن شریفانہ انداز —

جب میں نے اس عورت کو پہلی بار دیکھا تو یہ گمان بھی نہ ہوا کہ وہ ایک کروڑپتی باپ کی ی اور ایک لکھ پتی شوہر کی بیوی ہوگی۔ ہنر کی صنعتی نمائش میں ایک کوی سمیلن تھا جس میں ہندی دو، گجراتی، مراٹھی — چاروں زبانوں کے شاعر ایک اسٹیج پر جمع تھے۔ اس کھچڑی کوی سمیلن میں کسی ایک زبان کے شعر بھی سننے کا لطف نہ آیا کیونکہ سب شاعروں کی یہی کوشش ی کہ ایسے استعارا در نظمیں سنائی جائیں جو سب کی سمجھ میں آسکیں ظاہر ہے یہ کام ایک کوی سمیلن میں نہیں ہوسکتا تھا اور نہ کوئی ایسی جادو کی چھڑی تھی جو سخن فہمی کی دولت بانٹ ے۔ میں نے بھی بے دلی سے اپنے رد کھے پھیکے شعر سنا کر بلا ٹال دی اور اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

ایک آٹو گراف بک گھومتی ہوئی مجھ تک آئی۔ میں نے اپنا نام لکھ کر آگے بڑھا دی۔ ب آواز اسٹیج کے اس کونے سے آئی جہاں دو تین شاعرات سر جوڑے بیٹھی تھیں — — اپنا کوئی شعر بھی لکھ دیجئے — مگر ہندی میں" — میں نے پلٹ کر دیکھا — ازہ دینے والے کے چہرے پر تحکم بھی تھا اور التجا بھی —

— میں اس التجا کو ٹھکرا نہ سکا — ہندی میں ایک شعر لکھ دیا۔ اور ساتھ یہ عبارت بھی " اُردو شاعری کا صحیح لطف اٹھانے کے لئے اُردو رسم الخط جاننا ضروری ے — آٹو گراف بک آگے بڑھ گئی اور جانے کتنے لوگوں نے کس کس زبان میں اس پر کیا کچھ لکھا — کوی سمیلن ختم ہوگیا۔ لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

دہلی میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا۔ میں بھی اس میں شرکت کے لئے بمبئی سے دہلی آیا۔ لال قلعہ کے دیوان عام میں مشاعرہ تھا۔ اسٹیج پر اُردو کے سبھی مشہور شعراء موجود تھے۔ کچھ لوگوں سے میری ملاقات نہیں تھی۔ کچھ بہت دن بعد ملے تھے۔ میں نئے پرانے احباب سے ملنے میں منہمک تھا۔

ایک چھوٹا سا پرچہ کئی ہاتھوں سے ہوتا ہوا مجھ تک پہونچا — "اگر ہو سکے تو کل صبح ۱۰ بجے کچنر روڈ تشریف لائیے — شانتا" — میں نے پرچہ پڑھ کر متجسس نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا کوئی نہ تھا — پھر حاضرین پر نظر ڈالی — تو سامنے صوفوں پر دوسری قطار میں وہی بکھرے ہوئے گھونگھریالے بالوں والی عورت نظر آئی — نظر ملی اور اس کے ہونٹوں پر ایک ایسا تبسم کھل گیا جسے محبت کے سوا اور سب کچھ کہا جاسکتا تھا۔

مشاعرہ ختم ہوگیا۔ رات گزر گئی۔ اگلی صبح نئی مصروفیتیں لے کر آئی اور میں کچنر روڈ نہ جاسکا حالانکہ رات کو ارادہ کر کے سویا تھا۔ ویسے بلی ماران اور کچنر روڈ میں فاصلہ بھی بہت تھا۔

ادھر اُدھر گھوم کر میں بمبئی واپس چلا گیا اور پھر وہی دفتر کے معمولات — اور بہت سے نئے لوگوں سے ملنا اور بہت سے پرانے لوگوں کو بھول جانا — یادوں کی محفل سجانے کا نہ مجھے اس زمانے میں سلیقہ تھا نہ فرصت۔

— "ہلو" — ایک سادہ اور بے تکلف آواز نے مجھے چونکا دیا — "جی میں پہچان گیا۔" — اور وہی گھنگریالے بالوں والی عورت میری نظروں میں پھر گئی — — مجھے افسوس ہے میں دہلی میں کچنر روڈ حاضر نہیں ہو سکا۔" — "بہت اچھا — مجھے یہ سزا منظور ہے اور آج شام کو ۵ بجے میں منتظر رہوں گا" —

اور شام کو ٹھیک ۵ بجے ایک لمبی سی سیاہ موٹر میرے دفتر کے نیچے میرے انتظار میں کھڑی تھی۔ میں بے جھجک گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کوئنس روڈ سے موٹر نے فراٹا بھرا اور پلک جھپکتے میرین ڈرائیو پہونچ گئی ـــــ اب تک میں میرین ڈرائیو پر سمندر کے کنارے والی دیوار پر بیٹھا تھا۔ آج چار منزلہ بلڈنگ سے سمندر کے اتار چڑھاؤ کو دیکھوں گا۔ یہ سوچتا ہوا میں درویش منیشن کی لفٹ میں داخل ہوا۔ بٹن دبایا اور آن کی آن میں چوتھی منزل پر پہونچ گیا۔ کال بیل بجائی دروازہ کھلا اور اُسی مسکراہٹ نے بے تکلفی سے میرا استقبال کیا جس میں محبت کے سوا اور سب کچھ تھا۔

اس بڑے ڈرائنگ روم کے بڑے صوفہ پر بیٹھ کر مجھے اجنبیت کا بالکل ہی احساس نہ ہوا کیونکہ اس عورت کی گفتگو میں کوئی رسمی بات ہی نہ تھی۔ نہ یہ کہ آپ کے اشعار پسند آئے نہ یہ کہ آپ کا نام بہت دنوں سے سنا تھا اور ملنے کا اشتیاق تھا ـــــ نہ یہ کہ آپ کچھ زرد ڈیکوں تشریف نہیں لائے ـــــ بس بغیر کسی تمہید کے پہلے ایک گلاس پانی آگیا پھر چائے آگئی ـــــ اور پکوڑیاں ـــــ کئی طرح کی ـــــ کئی ذائقوں کی پکوڑیاں ـــــ مجھے ایسے بھی تکلف کی عادت نہیں، اور وہاں تو تکلف کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ میزبان نے اتنا موقع ہی نہ دیا۔ حد یہ ہے کہ میں پکوڑیوں کی تعریف کرنا بھی بھول گیا۔ ادھر اُدھر کے بے ربط جملوں سے اچکتی ہوئی بات اُردو رسم الخط تک آگئی ـــــ اور میں نے کہا کہ اُردو سیکھنا تو بہت آسان ہے۔ اتنا آسان کہ میں ایک ہفتہ میں لکھنا پڑھنا سکھا سکتا ہوں" ـــــ تو آپ مجھے پہلی کتاب لا دیجیے۔"

"نہیں اگر آپ پڑھنا چاہتی ہیں تو میں آپ کو بغیر کتاب کے پڑھا دوں گا۔ کتابی طریقے میں بڑا جھنجھٹ ہے۔ وہ کتابیں اور قاعدے تو چھوٹے بچوں کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ اگر واقعی آپ سنجیدگی سے کہہ رہی ہیں تو میں آپ کے لئے ایک نیا قاعدہ بنا کر دوں گا۔"

وہ بے حد سنجیدہ تھی اور ذہین بھی۔ میں نے اسے ہندی کی ماتراؤں کے ذریعہ اُردو حروف کی حرکتیں سمجھائیں اور اس نے بہت تیزی سے اُردو لکھنا اور پڑھنا سیکھ لیا۔ روز شام کو دفتر کے بعد کبھی میں خود پہنچ جاتا۔ کبھی بلا لیا جاتا۔ اور اُردو کا شغل جاری رہتا۔ بیچ میں ادھر اُدھر کی گپ شپ ـــــ لطائف و ظرائف ـــــ کبھی کبھار ہندی اُردو ادبیات پر گفتگو، کبھی کبھی سمندر کے کنارے ڈرائیو ـــــ مگر محبت اور شاعری ـــــ دونوں کا وجود ہم دونوں کے درمیان نہ تھا ـــــ ہاں اس کے گھر کے اور افراد بھی آہستہ آہستہ متعارف ہو گئے۔ مثلاً اس کا شوہر، اس کی بہن، مثلاً اس کی جٹھانی ـــــ "اُردو کلاس" اب ڈرائنگ روم سے اٹھ کر بیڈ روم میں چلی گئی تھی۔

ایک روز شانتا کی جٹھانی رادھیکا نے، جو شانتا کے مقابلہ میں نہایت مسکین مزنجار مزنج اور کم سخن نظر آتی تھی ـــــ مجھ سے بڑے ادب و احترام کے ساتھ پوچھا "آپ مجھے بھی اُردو پڑھا دیا کریں گے؟" ـــــ میں نے بہت روکھا جواب دیا ـــــ یہ بات آپ شانتا سے پوچھئے۔" وہ خاموش ہو گئی مگر اس کی خاموشی بہت معنی خیز تھی۔ میرا جواب سنکر اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور معنی خیز ہو گئیں۔

میں کچھ روز کے لئے بمبئی سے باہر چلا گیا۔ لوٹنے پر جب ایک شام درویش منیشن پہونچا تو معلوم ہوا کہ شانتا کچھ دنوں کے لئے بمبئی سے باہر گئی ہے ـــــ مرے آئے پاؤں لوٹ رہا تھا کہ رادھیکا نے آواز دی وہی ادب و احترام میں بھیگا ہوا لہجہ ـــــ "چائے پی کر جایئے۔"

ـــــ میں رک گیا چائے کا انتظار تھا اور اچھی چائے پینے کا موڈ تھا ـــــ

ہم لوگ بالکنی میں بیٹھ گئے۔ سامنے سمندر موجیں مار رہا تھا ـــــ چائے آئی ـــــ زیادہ سلیقہ سے، زیادہ پرتکلف۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ آج میں کسی نئی جگہ اور کسی نئے ماحول میں آیا ہوں ـــــ رادھیکا نے دھیمے دھیمے لہجہ میں کئی سوالات پوچھے جن کا تعلق میری ذاتی زندگی سے تھا ـــــ میں عام طور پر اس طرح کے سوالات غیر ضروری سمجھتا ہوں اس لئے میں نے نہایت مختصر اور روکھے پھیکے جواب دے کر وقت کاٹنا چاہا ـــــ اس نے اپنا چشمہ صاف کرتے ہوئے پوچھا ـــــ "شانتا کو آپ کس طرح پڑھاتے ہیں؟" ـــــ اس سوال کے پس پردہ مجھے اپنی خودداری پر چوٹ ہوتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں نے ذرا واضح الفاظ میں جواب دیا ـــــ شانتا میری دوست ہے، میں اُسے ٹیوشن نہیں پڑھاتا اور نہ پڑھانا میرا پیشہ ہے۔ میں اپنے دوستوں سے برابری سے ملتا ہوں۔ اور اس رتبہ کو میں کسی قیمت پر قربان نہیں کر سکتا ـــــ"

وہ لاجواب نہیں ہوئی ـــــ بلکہ مسکرائی ـــــ "میں نے یہ سب تو نہیں پوچھا تھا۔" اس کے اس جملہ نے مجھ پر کچھ ایسا وار کیا کہ میں گھبرا کر چائے پینے لگا ـــــ پھر اس نے گفتگو کا رخ بدلا ـــــ "آپ اپنی کوئی پسندیدہ غزل میری غزلوں کی کاپی پر لکھ دیجئے۔"

ـــــ ظاہر ہے اس میں انکار کی گنجائش نہ تھی ـــــ اس نے ایک کاپی لا کر مجھے دی اور میں اپنی ایک غزل ہندی میں لکھنے لگا ـــــ میں نے شاید کوئی لفظ غلط لکھا ـــــ وہ ایک دم ہنسی۔

ـــــ "بس آپ کو اتنی ہی ہندی آتی ہے۔" اس میں یہ غلطی ہے، اس میں یہ غلطی ہے۔"

ـــــ اور میں کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا ـــــ

اس نے اُردو میں دو چار غلط سلط لفظ لکھے اور کہنے لگی ـــــ دیکھئے مجھے بھی تھوڑی بہت اُردو آتی ہے ـــــ اب غلطی نکالنے کی باری میری تھی۔ میں نے اپنی علمیت جھاڑنی شروع کر دی۔ اور اس نے زانوئے ادب تہہ کر لیا ـــــ میں بے ارادہ ہی اُسے اُردو پڑھانے لگا۔

میں روز شام کو درویش منیشن پہونچ جاتا ـــــ اور بات شام کی چائے سے بڑھ کر رات کے کھانے تک جا پہونچی ـــــ آہستہ آہستہ اس نے مجھے اپنا عادی بنا لیا۔ اُردو کے سبق چلتے رہے۔ اس کی کاپی پر میری بہت سی غزلیں اور نظمیں منتقل ہو گئیں اور اس نے بھی مجھے ہندی کے کچھ گُر سکھا دیئے۔

اُسے خود موٹر چلانی نہیں آتی تھی اس لئے کچھ دن تو سیر و تفریح سے گریز کیا، پھر ایک دن شام کو حکم ملا کہ آج فلاں پکچر دیکھنے چلنا ہے۔ پکچر دیکھی گئی اور ڈرائیور کو بھی ایک نچلے درجہ کا ٹکٹ دلا دیا گیا۔ اب دوسرے تیسرے دن ایسے پروگرام بننے لگے ــــ کھانا اونچے درجے کے ہوٹلوں میں کھایا جانے لگا۔ غیر محسوس طور پر میرا معیار زندگی بھی اونچا ہونے لگا ــــ میرے کوٹ کی جیبوں میں نوٹ ہی نوٹ کھنکنے لگے ــــ اور میں بھانتے ہوئے بھی انجان ہو گیا کہ یہ کس دست غیب کی کرامات ہے۔ فضول خرچی عادت میں داخل ہونے لگی ــــ اور کیوں نہ ہوتی جب روپیہ سوچنے سے پہلے جیب میں آجاتا تھا۔

پھر ایک دن۔ بیچ چوراہے پر رادھیکا کی "اُردو خوانی" کا بھانڈا پھوٹ گیا ڈرائیور گھر کا بھیدی ثابت ہوا اور اس نے وہ سب کچھ ہم دونوں سے منسوب کر دیا جو عام طور پر ایسے افسانوں میں ہوتا ہے (حالانکہ ناگوار گزرنے والی بات کا افسانہ میں ذکر ہی نہ تھا)

نتیجہ اس کا یہ ہونا چاہئے تھا کہ درویش مینشن کے دروازے ہم پر بند ہو جاتے مگر ہوا اس کے برعکس ــــ درویش مینشن کی بلندی جھک کر اور نیچے آگئی ــــ اور ایک ڈرائیور کی جگہ ان گنت ٹیکسی ڈرائیوروں نے لے لی۔

ــــــ میں خود ایک کٹھ پتلی بن گیا اور وقتی طور پر یہ غرور ہو گیا کہ یہ ہے ہماری خود داری کی فتح کہ آسمان جھک کر زمین پر آیا ہے ــــ مگر آسمان زمین کی جڑیں کھوکھلی کر رہا تھا ــــ افسانے پھیلتے رہے ــــ ٹیکسیاں سڑکوں پر دوڑتی رہیں

پھر وقت نے کروٹ لی ــــ شانتا بمبئی واپس آئی اور جب اس نے شام کو مجھے گھر آنے کے لئے فون کیا تو میں نے بہانہ کر دیا ــــ مجھے تو دوسری چاٹ لگ چکی تھی ــــ شانتا کو ضرور یہ بات بُری لگی ہوگی مگر اس نے اس وقت مجھ سے کچھ نہ کہا اور شاید درویش مینشن کے در و دیوار سے پوچھ لیا کہ قصہ کیا ہے ــــ قصہ کوتاہ تھا اور اس کی عقل تیز ــــ

دو چار دن بعد میں شانتا سے ملنے گیا تو اس کے انداز میں وہ گرم جوشی اور بے تکلفی نہ تھی۔ بجھا بجھا سا لہجہ ــــ "بیٹھئے" ، باتیں شروع ہوئیں ــــ بے مقصد ــــ بے ہنگم ــــ وقت گزاری کی باتیں۔ اردو ہندی کا تو اب جھگڑا ہی ختم ہو گیا تھا ــــ جب میں اٹھنے لگا تو اس نے صرف اتنا کہا ــــ "آپ سوچ لیجئے ــــ غلط راستہ پر جا رہے ہیں۔"

ــــ میں نے انجان بنتے ہوئے اس سے وضاحت چاہی اور اس نے پھیکی ہنسی میں بات ٹال دی ــــ اب شانتا اور میں ، دونوں ہی ایک دوسرے سے کترانے لگے مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے غافل نہیں ہے۔ کیونکہ بعض اوقات اس کی کار بے موقع گزرتی ہوئی نظر آجاتی۔

رادھیکا کے التفات میں کوئی کمی نہ آئی۔ بلکہ اس کی عنایات بڑھتی ہی گئیں۔ بے ضرورت روپیہ مل جاتا۔ بے ضرورت عیش و عشرت کے سامان، بے ضرورت رفاقت۔ اور اس نے اس قدر ناز بیجا اُٹھانے شروع کر دیئے کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میری عمر کم ہوتی جا رہی ہے اور میں ایک ذمہ دار نوجوان سے ایک ضدی بچہ بنتا جا رہا ہوں آہستہ آہستہ میں اس شخص کو بھول گیا جس نے پہلی بار نہایت وقار اور خود اعتمادی سے درویش مینشن میں قدم رکھا تھا۔

ایک دن جب میری ٹیکسی کا ہارن نیچے سے بج رہا تھا۔ درویش مینشن کی بلندی سے قہقہے بکھرتے ہوئے میرے کانوں تک پہونچے ــــ صرف قہقہے ــــ نہ کوئی ہاتھ ہلانا نہ کوئی آنچل لہرایا ــــ اور میں جھنجھلا کر "نریمان پوائنٹ" کی طرف بڑھ گیا ــــ جانے کب تک کہاں کہاں اور کدھر کدھر بھٹکتا رہا۔ اس رات ــــ اور صبح جب ٹیلیفون پر برسنا چاہا تو جیسے تاروں کی آواز کسی نے گھونٹ دی ــــ "اس قدر بننے کی ضرورت نہیں، آخر آپ بگڑ کیوں رہے ہیں۔ اور کس بات پر۔" ــــ کوئی بات نہیں بنی تو میں نے فون پٹخ دیا ــــ

شام کو پھر ٹیکسی کا ہارن چیخا ــــ لیکن آج قہقہوں نے بھی اس کا جواب نہ دیا۔ خاموشی ــــ مکمل خاموشی ــــ بادلِ ناخواستہ اوپر چڑھا تو معلوم ہوا کہ نوکروں کے علاوہ گھر کے مکینوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے ــــ بہت جھلایا۔ اور پھر خود انتقامی کا جذبہ مجھے نہ جانے کہاں کہاں لئے پھرا۔ جیب کو روز بھرنے اور خالی ہونے کی عادت پڑ گئی تھی۔ مگر اب خالی ہی ہوتی چلی گئی تو اور چڑچڑاہٹ بڑھی ــــ روپیہ ــــ مجھے روپیہ چاہئے ــــ روپیہ چاہئے ــــ میں اپنی بے بسی پر پاگل ہوا جا رہا تھا مگر وہاں پر اسرار خاموشی اور گم شدگی کے سوا کچھ نہ تھا ــــ نہ شانتا کا پتہ تھا، نہ رادھیکا کا ــــ

شانتا سے تو خیر سروکار کیا تھا۔ مگر رادھیکا ــــ !! وہ میرے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کا حوصلہ رکھنے والی رادھیکا ــــ وہ کہاں ہے؟؟ اور ایک دن ایک ایجنٹ کے ساتھ اُسے ڈانٹنے کا ارادہ کیا۔ اپنے سب تیور نشتر سنبھال کر درویش مینشن پہونچا معلوم ہوا رادھیکا گھر پر ہے۔ بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ میں بے صبری سے برآمدہ میں ٹہلنے لگا تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا ــــ اور بے تکلف قہقہوں کی آواز آئی ــــ میں اُدھر بڑھنے ہی والا تھا کہ رادھیکا اندر سے برآمد ہوئی۔

"آپ" ــــ اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی اور مجھے اس طرح دیکھا جیسے کوئی شکاری اپنے زخمی شکار پر نظر ڈالے۔ میں تڑپ کر رہ گیا "ــــ ہاں میں ــــ" میں نے اپنے حواس سمجھا کرتے ہوئے مصنوعی رعب اپنی آواز میں پیدا کرتے ہوئے کہا ــــ

"آپ بغیر اطلاع کے کیسے تشریف لے آئے" ـــــ وہ اور بھی سنبھل کر بولی ـــ میں اس قسم کے سوالات کے لئے تیار نہ تھا اور یہ سوچتا ہوا اوپر گیا تھا کہ مجھے دیکھتے ہی راد ھیکا رایشہ خطمی ہو جائے گی۔ ہزار ہزار معافی مانگے گی اور اتنے دن نہ ملنے کے جھوٹے سچے عذر پیش کرے گی۔ میں بگڑوں گا تو وہ منائے گی۔ ـــــ مگر آج اس کے تیور ہی اور تھے بلکہ چڑھتے جا رہے تھے ـــ مجھ سے کچھ نہ بن پڑا سوائے اس کے کہ اپنے آپ کو ملائم کر کے مسکرانے کی کوشش کروں ـــــ

ـــــ مگر اس کی نظریں اپنے سوال کا جواب تلاش کر رہی تھیں ـــــ

ـــ "مجھے ـــ مجھے ـــ ضرورت ہے" ـــــ آج پہلی بار میں دستِ سوال دراز کرنے کی کوشش کر رہا تھا ـــ

"ضرورت ـــ کاہے کی ضرورت" ـــــ وہ غرائی ـــــ

"آپ خوب جانتی ہیں مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے" ـــــ

مگر اس کے چہرے پر اور صلابت آگئی ـــــ "جلدی کہئے کیا کہنا ہے ـــــ میرے احباب بیٹھے ہیں ـــ"

"مجھے روپیہ چاہئے" ـــــ میں نے جلدی سے جملہ اگل دیا ـــ وہ اس طرح ہنسی جیسے میرے منہ پر تھوک رہی ہو ـــــ اور بے حد سنگین لہجہ میں بولی ـــــ

"اب آپ کے لئے میرے پاس ایک پیسہ نہیں ہے"

"آپ کی اکڑ، خودداری اور خود پرستی اور بے نفسی کی جو قیمت میں نے مقرر کی تھی، وہ میں ادا کر چکی۔ شانتا بھی مات کھا چکی اور آپ بھی بے سر و سامان ہو چکے۔ اب آپ اپنی لاش لے جا سکتے ہیں"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے بڑھی اور میں نے محسوس کیا جیسے میری غیرت اور حمیت کی میت کو درویش مینشن کی بلندی سے سمندر کی موجوں میں پھینک دیا گیا ہے ●●


آج کل کا اگست ۱۹۷۱ء کا شمارہ

خاص نمبر ہوگا

اس خصوصی شمارے میں ہندستانی فلمی صنعت کے تمام پہلوؤں کا مکمل اور بھرپور جائزہ شامل ہوگا۔ مشہور فلمی ناقدین کے علاوہ فلمی صنعت کے ممتاز افراد کے مضامین بھی شامل ہونگے دیدہ زیب ضخامت، متعدد تصاویر، خوبصورت سرورق اور آفسیٹ کی طباعت کے باوجود قیمت ایک روپیہ ہوگی اور سالانہ خریداروں سے زائد قیمت نہیں لی جائے گی

"آج کل" کے سابقہ نمبروں کی طرح یہ شمارہ بھی آپ کو بے حد پسند آئے گا




منظر امام

## ۲ دو

ترے خیال پہ بیتے دنوں کی مالا ہے
مگر وہ دورِ تمنا جو آنے والا ہے
ہر ایک لاش پہ عائد ہے قتل کا الزام
یہ حادثہ ہے، مگر حادثہ نرالا ہے
سبھی سے ٹوٹتے لمحوں کی گرد اڑنے لگی
یہ راستہ تو بہت دور جانے والا ہے
وہی تو ہیں کہ جنہیں بولنا نہ آتا تھا
یہ کون لوگ ہیں اب جن کا بول بالا ہے
اسی امید پہ اربابِ شہر زندہ ہیں
کہ اُس پہاڑ کے آگے بہت اُجالا ہے
اب اس کے بعد کوئی حادثہ نہ ہوگا کبھی
مرے وجود کا یہ آخری سنبھالا ہے

غلام مرتضیٰ راہی

آخر میں بے نقاب سرِ آئینہ ہوا
تھا تلخ تجربہ جو نفس آشنا ہوا
آثارِ تشنگی، سرِ آسودگی نہ پوچھ
صحرا کا نقش تھا لبِ دریا بنا ہوا
پھر ہاتھ اپنی نبض پہ رکھتا ہوں بار بار
پھر مجھ سے کوئی فعل خلافِ انا ہوا
وابستہ مجھ سے رہتی تھیں کیا کیا پہیلیاں
میرے لئے غلط ہی انھیں بوجھنا ہوا
انجام کو پہنچنے پہ مجھ کو پتہ چلا
خود میرے ہاتھ ہی میں تھا نقشہ بنا ہوا
بے چہرگی میں ڈھونڈتے ہی رہ گئے مجھے
ایسے بھی آئینوں سے مرا سامنا ہوا
غارتِ گرِ وجود ہی کہیئے اُسے مگر
جو ہر وہ اس میں کیا تھا جو کھلکر فنا ہوا

سعادت علی صدیقی

# منیر شکوہ آبادی

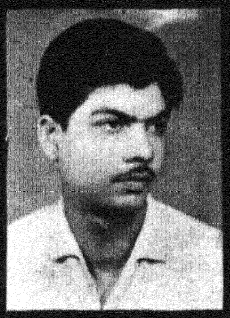

سیّد اسمٰعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی، سیّد احمد حسین شادؔ شکوہ آبادی کے بیٹے تھے۔ شاد اعلیٰ پائے کے فقیہہ و محدث تھے ان کا سلسلۂ نسب حضرت علیؓ سے ملتا ہے منیر ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۳ء) میں پیدا ہوئے[1] شعر و سخن کا ماحول ورثے میں پایا۔ منیر کے بڑے بھائی سیّد اولاد حسین بھی عالم باعمل تھے اور چھوٹے بھائی سیّد حسین مظہرؔ بھی شاعر۔ منیر کا اپنے ماحول سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا۔ وہ بچپن ہی سے شعر کہنے لگے اور تھوڑے عرصہ میں ہی اپنے کمالِ فن سے لوگوں کو متوجہ کر لیا۔

منیرؔ پیدا شکوہ آباد میں ہوئے مگر محبت انہیں لکھنؤ سے تھی۔ لکھنؤ کی رعنائیاں اور دلچسپیاں اُن کے دل میں گھر کئے تھیں۔ لیکن یہاں مستقل قیام کی کوئی صورت نہ تھی۔ روزگار کی تلاش میں وہ کلکتہ، مرشد آباد، الہ آباد وغیرہ گھومتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ آگرے کے ایک مشاعرے میں نواب نظام الدولہ ان کی غزل سے بہت متاثر ہوئے اور وہ انہیں لکھنؤ لے آئے اور ناسخ کا شاگرد بنا یا۔ غازی الدین حیدر کی تخت نشینی کے بعد ناسخ کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ ان کی خواہش پر منیرؔ علی اوسط رشک سے اصلاح لینے لگے۔ منیرؔ نے جا بجا ان دونوں کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے۔

جناب رشکؔ و ناسخؔ کے تلمذ سے بڑھا رتبہ
منیرؔ اوستاد کہلایا عنایاتِ الٰہی سے

منیرؔ کی پوری زندگی کسی نہ کسی رئیس یا نواب کی مصاحبت میں بیتی۔ وہ نواب نظام الدولہ کے ساتھ لکھنؤ آئے تھے۔ ان کے بعد نواب اصغر علی خاں نے اپنی مصاحبت میں لے لیا۔ چند دنوں بعد یہ صحبت بھی برہم ہوئی اور تیرہ بختی نے آگھیرا۔ مولانا احمد حسین خان عروج نے قدردانی کی۔ پھر سیّد محمد ذکی خاں نے طلب کر لیا اور اپنا استاد مقرر کر دیا۔ دو سال نواب صاحب کے ساتھ لکھنؤ کی رنگ رلیوں میں گزرے۔ اسی عرصہ میں نواب تجمل حسین خاں بہادر ظفر جنگ معروف بہ حشمت جنگ[2] نے انھیں اپنے پاس بلا لیا اور ان کی قدر و منزلت کی۔ تھوڑے عرصہ بعد منیرؔ پھر لکھنؤ چلے آئے۔ راجہ اودے نے سفر خرچ بھیج کر انہیں بلانا چاہا لیکن منیرؔ نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد نواب علی بہادر والی ریاست بانده نے منیرؔ کو دو سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا اور اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ بانده میں انہوں نے کافی عرصہ قیام کیا اور یہیں ان کے دونوں دواوین 'منتخب العالم' اور 'تنویر الاشعار' مرتب ہوئے۔[3] اور یہیں سے منیرؔ کی زندگی میں قید و بند کا آغاز ہوا۔

---

[1] منیرؔ کے سن پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے۔ محمود الہ آبادی نے ۱۲۳۵ھ (صحیفہ تاریخ اردو صفحہ ۲۴۳) سید ہادی حسن جعفری نے ۱۲۳۴ھ (ہادی اردو مطبوعہ نامی برقی پریس میرٹھ ۱۹۳۷ء) حافظ محمد جلال الدین احمد جعفری نے ۱۲۳۳ھ (اردو ترمیم شدہ ایڈیشن صفحہ ۳۱۸) اور جناب محمد علی خاں اثر رام پوری نے ۱۲۲۹ھ (ہماری زبان علی گڑھ ۲۲ ستمبر ۵۹ء) منیر شکوہ آبادی کا سالِ ولادت تحریر کیا ہے۔ لیکن منیرؔ نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ "سمند عمر تا حال سی و پنج مرحلہ از مراحل زندگی طے کردہ توفیق اتمام ایں دیوان (منتخب العالم) دادہ است۔" (منتخب العالم صفحہ) منیرؔ نے یہ دیوان ۱۲۶۴ھ میں مرتب کیا اس وقت ان کی عمر ۳۵ برس تھی اس اعتبار ان کا سن پیدائش ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۳ء) قرار پاتا ہے۔

[2] یہ وہی نواب تجمل حسین خاں ہیں جن کے لئے غالب نے کہا تھا۔ بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے۔

[3] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی

منیر نے اپنی لیاقت سے نواب علی بہادر کو اس درجہ گرویدہ کر لیا تھا کہ وہ ریاست کے مسائل پر منیر سے مشورہ لینا ضروری سمجھنے لگے۔ ۱۸۵۷ء میں جب جذبۂ آزادیٔ حریت نے ہر سینے کو شعلہ زار اور ہندوستان کو کوہِ آتش فشاں بنا دیا اور آزادی کے پروانے دہلی اور بادشاہ دہلی پر نثار ہونے لگے، فرخ آباد، لکھنؤ، بہادر گڑھ، بلب گڑھ اور دوجانہ وغیرہ کے فرماں رواؤں نے علم بغاوت بلند کیا اور جب رانی جھانسی کے دلیرانہ کارناموں نے ملک کے کونے کونے میں احساسِ آزادی بیدار کر دیا، تو نواب علی بہادر خاں بھی خاموش نہ رہ سکے۔ انہوں نے اپنے وزیر ولایت حسین اور صلاح کار منیر شکوہ آبادی سے مشورے کئے۔ دونوں نے انگریزوں کے خلاف معرکہ آرائی کی ترغیب دی چنانچہ نواب نے فوجوں کو صف آرا کر کے راج گڑھ کے قلعہ پر حملہ کیا اور فتح حاصل کی۔ فتح کی خوشی میں منیر نے تاریخ کہی۔

چوں فوج بندیلہ بہ باندہ رسید
ز حصن اجے گڑھ برائے فساد
بر ایشاں ظفر یافت نواب ما
دل اہلِ انصاف گردید شاد
چنیں گفت تاریخ نصرت منیر
خدا فتح علی بہ نواب داد

۱۲۷۴ھ

۱۵ جون ۱۸۵۷ء کو کاک ویل گرفتار کر کے نواب کے سامنے پیش کیا گیا، منیر نے ایک قطعہ کہا جس کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

ہوا محبوس دوا باندہ میں آکر اجے گڑھ سے
پھنسا دامِ مصیبت میں سیانا گرچہ کوا ہے[1]

۲۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو جب باندہ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تو نواب کو بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ولایت حسین[2] اور منیر شکوہ آبادی فرخ آباد سے مدد حاصل کرنے کے لئے روانہ ہوئے لیکن راستے میں ہی گرفتار کر لئے گئے۔ جنگ میں منیر کی شرکت اور اُن کے قطعات انھیں مجرم قرار دینے کے لئے بہت کافی تھے، لیکن انگریزوں کو ایک اور بہانہ بھی ہاتھ آگیا۔ منیر کے دوستوں میں ایک صاحب، مصطفےٰ بیگ بھی تھے۔ انہوں نے ایک طوائف مسمی نواب کو قتل کر دیا تھا۔ سرکار نے مصطفےٰ بیگ کو گواہ بنا کر منیر کے اوپر قتل کا جرم عائد کر دیا، اور سزا کے طور پر انہیں سات سال کے لئے انڈمان بھیج دیا گیا[3]۔ منیر فرماتے ہیں۔

غربت میں وطن خانہ بدوشوں کو ملا
زہر غربت شکر فروشوں کو ملا
جب لخت جگر کھائے لگی پیاس منیر
کالا پانی سفید پوشوں کو ملا[4]

مصطفےٰ بیگ کے بارے میں مزید تفصیلات نہیں ملتیں، کہا جاتا ہے کہ یہ منیر کے دوستوں میں تھے اور نواب جان فرخ آباد کی طوائف تھی، جس سے منیر کے بھی تعلقات تھے۔ نواب جان کے قتل کے بعد، منیر بھی مورد الزام ٹھہرائے گئے۔ بشن نرائن حامی بریلوی نے لکھا ہے

"صحیح سبب تو بیان کرنا مشکل ہے مگر اتنا ضرور ہے جیسا کہ واقف کاروں سے سُنا ہے کہ مقتولہ نواب صاحب کی محبوبہ بھی تھی"[5]

بشن نرائن حامی بریلوی کی یہ عبارت قابلِ توجہ ہے کیونکہ ان کے والد دیبی پرشاد عرف دیبی سہائے صادق منیر کے شاگرد تھے جن کا ذکر منیر نے اپنی غزل کے ایک مقطع میں کیا ہے۔

ان تنگ قافیوں میں نہ کہتا غزل منیر
مجبور ہے کہ خاطرِ دیبی سہائے ہے

نواب جان کا منیر سے تعلق ناممکن بات نہیں ہے، منیر کو اس طرح کے معاملات سے دلچسپی تھی۔ اُن کے دیوان میں تین تاریخی قطعات محبوبہ کی وفات پر ملتے ہیں۔ ان کی محبوبہ کا انتقال ۱۲۶۴ھ میں ہوا۔ جب وہ فرخ آباد میں تھے۔ ان کی محبوبہ حسین، ماہر موسیقی اور شعر و سخن کی دلدادہ تھی۔ ایک قطعہ تاریخ کا یہ شعر ملاحظہ ہو

وہ پری مر کے بھی مجھے مار گئی
زیست میں جان کی تلمنی ہے

ممکن ہے نواب جان سے بھی منیر کا تعلق رہا ہو اور اس بنا پر یہ قتل کے الزام میں دھر لئے گئے۔ اور مصطفےٰ بیگ نے سرکار برطانیہ کو ان کی طرف سے بدظن دیکھ کر اس موقع سے فائدہ اٹھایا ہو۔

منیر اس قتل میں شریک رہے ہوں یا نہیں لیکن مقتولہ سے انہیں ہمدردی ضرور تھی

---

[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری، از ڈاکٹر ابو محمد صدیقی

[2] مرزا ولایت حسین خاں کو سزا بہ عبور دریائے شور ہوئی اور انڈمان بھیج دیا گیا۔
(غدر کے چند علماء، مفتی انتظام اللہ شہابی صفحہ ۵۷)

[3] قند اردو ترمیم شدہ ایڈیشن صفحہ ۳۲

[4] کلیات منیر صفحہ ۴۷۳

[5] منیر شکوہ آبادی، بشن نرائن حامی: آج کل ۱۵ ستمبر ۱۹۴۹ء صفحہ ۶

کیونکہ وہ اس حادثہ کا تذکرہ اپنے قطعہ میں "خون ناحق نواب جان" کے الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور مصطفےٰ بیگ کے اس فعل کو "تزویر" سے تعبیر کرتے ہیں۔

میرؔ نے ایک خط حکیم محمد حسن خاں صاحب طبیب اعلیٰ سرکار مہاراجہ گوالیار کو ان کی والد کی تعزیت کے سلسلے میں لکھا ہے۔ اظہار افسوس کے ایک مخصوص مسئلہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک نامعقول عورت اور اس کی لڑکی اپنی بدکرداریوں کی وجہ سے سرکاری نوکری سے معزول کر دی گئی ہے۔ اور اس کو اس شہر (رام پور) میں رہنے کی ممانعت کر دی گئی ہے اور وہ مراد آباد منتقل ہو گئی ہے اور اب سننے میں آیا ہے کہ دوران مدت میں ہی کچھ لوگ آپ کے ذریعے سے ان دونوں بدکرداروں کا تعلق مہاراجہ (گوالیار) سے کروانا چاہتے ہیں۔ یہ صورت حال آپ کی دور اندیشی اور تاں بینی سے بہت دور معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا امکان ہے کہ ان میں سے کسی ایک نے فرخ آباد وطن ہونے کے رشتہ سے یا اپنی دل ربائی کی وجہ سے ایسی صورت پیدا کر لی ہو لیکن اس قسم کی تحریک دونوں ریاستوں (رام پور اور گوالیار) میں خوش گوار تعلقات کے لئے سمِ قاتل رساں ہو سکتی ہے۔ اگر اس کی ذمہ داری آپ پر ہے تو اس کا تدارک جلد از جلد ضروری ہے اور اگر کسی دوسرے کی یہ حرکت ہے تو بھی اپنی امکانی کوشش اس کے لئے کریں۔ خدا کی قسم کہ دیرینہ اخلاص نے مجھے اس دردسری پر مجبور کیا ہے۔ وگرنہ مجھے اس خرافات سے کیا تعلق۔ ہر کسے ناصح برائے دیگراں" [1]

اس خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میرؔ اس کوچے سے ناواقف نہیں تھے اور نواب جان کے قتل کے الزام کے پس پشت کوئی نہ کوئی بات ضرور پوشیدہ ہے

خود میرؔ نے ان واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

فرخ آباد اور یاران شفیق
چھٹ گئے سب گردش تقدیر سے
آئے باندہ میں مقید ہو کے ہم
سو طرح کی ذلت و تحقیر سے
اک مرا شاگرد تھا اس شہر میں
پھل وہ پائے گلشن توقیر سے
لفظ خاں کا جزو اول کر وزیر
نام اس کا جان اس تقریر سے
کیں سعادت مندیاں اس نے بہت
رہ گیا عاجز مری تقدیر سے
جس قدر احباب خالص تھے وہاں
درگزر کرتے نہ تھے تدبیر سے
پر کہوں کیا کاوش اہل نفاق
تھے وہ خوں ریزی میں بڑھ کر تیر سے
شہر کا خنجر زبانیں ان کی تھیں
قتل کرتے تھے مجھے تزویر سے
مصطفےٰ بیگ ایک صاحب ان میں ہیں
کج روؤں میں بڑھ کے چرخ پیر سے
کر کے خون ناحق نواب جان کا
مجھ کو بھی پھنسوا دیا تزویر سے
خون میرا وہ سمجھتے تھے حلال
تھا جو میں ذریت شبیر سے

باندہ کے زندان کے ستم، وہاں کی کوٹھری کا قبر کی طرح تاریک ہونا، گوبر جیسی روٹیاں اور بھینس کی سانی سے بدتر دال کا ملنا، ٹاٹ کمبل کا بستر، باندہ سے الہ آباد اور الہ آباد سے کلکتہ تک کا پاپیادہ سفر اور حالت یہ کہ

ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں
ناتواں ترقیس کی تصویر سے
بے حواس و بے لباس و بے یار
دل گرفتہ جور چرخ پیر سے

میرؔ کلکتے سے کالے پانی پہنچتے ہیں۔ ان پر وہاں کیا کچھ گزرتی ہے، اس کا حال ایک قطعہ میں لکھتے ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

اسیر ہو کے جو ہم آئے کالے پانی میں
ہوئی مصائب و آلام کی فراوانی
محال شرح ہے ادنیٰ سی بھی مصیبت کی
اگر بیان کریں مل کے انسی وجانی

قید میں میرؔ کے کیا مشاغل تھے؟ اُن کے ذمہ کیا کام سپرد تھا ان کے دل و دماغ کی کیا کیفیت تھی اور وہاں اُن کے جذبات و احساسات پر کیا گزرتی تھی۔ ان تمام تفصیلات کا ذکر میرؔ کے قطعات میں مل جاتا ہے۔ وہاں انھیں پانی کھینچنے یا گھوڑ بیل باندھنے کا کام سپرد نہیں ہوا تھا اور نہ چکی کی مشقت اُنہیں سونپی گئی تھی۔ بلکہ وہ مکنٹر کے محکمہ میں

---

[1] نظم میرؔ صفحہ ۶۳۴ (بحوالہ میرؔ شکوہ آبادی مقالہ برائے ڈاکٹریٹ از زیرایاسین صاحب لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری۔)

منشی تھے۔ ظاہر ہے یہ کام ان کے لئے دقت طلب نہ تھا۔
منیرؔ پہلے چھ روپے ماہوار پر ملازم ہوئے پھر تنخواہ میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔
محکمے کے کاموں سے فراغت ملنے کے بعد منیرؔ اپنا وقت مولانا فضل حق خیرآبادی کی صحبت میں گزارتے تھے یا حضرت علیؓ و حضرت حسینؓ کی شان اقدس میں قصیدے اور قطعات کہتے تھے اور اپنی رہائی کے لئے دعائیں مانگتے۔ تھے یہ مولانا فضل حق سے منیر کو خاص عقیدت تھی۔ قید کے زمانے میں منیرؔ نے ان کی شان میں ایک قصیدہ بھی کہا تھا۔
منیرؔ کو انڈمان میں جسمانی محنت و مشقت نہ اٹھانی پڑتی تھی لیکن عزیزوں سے جدائی اور لکھنؤ کی یاد اُن کے دل پر تیر کا کام کرتی تھی۔ اُن کے کلام میں اگر کہیں سوز و گداز ہے تو صرف چند رباعیوں، قطعوں اور نظموں میں ہے، جو انہوں نے انڈمان کے قیام کے دوران کہی ہیں ؎ جس روز سے دخل بے بسی نے پایا
ہونٹوں کا نہ قرب ہنسی نے پایا
اپنا ساتھی تمام دنیا میں منیرؔ
ڈھونڈھا تو بھی کو بے بسی نے پایا

ایک پُر اثر اور درد انگیز نظم کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے۔
ظاہر کمال رحم خدا داد کیجئے
قید ملال و رنج سے آزاد کیجئے
برباد ہے غلام اب آباد کیجئے
گھبرا رہا ہوں جلد مجھے شاد کیجئے
للہ یا علی میری امداد کیجئے

آخر کار منیرؔ کی دعا قبول ہوئی اور ۱۸۸۷ء میں وہ رہا کر دیئے گئے۔ کلکتہ واپس جاتے ہوئے لکھتے ہیں۔
بارے آئی نجات کی باری ؛ کھل گیا عقدۂ گرفتاری
ہم کو منصب ملا رہائی کا ؛ قید کو جا ملا دے کاری
کوچ کھٹکا مقام غربت سے ؛ اب وطن چلنے کی ہے تیاری
رخصت اے دوستان زندانی ؛ الوداع اے غم گرفتاری

منیرؔ ۱۹ صفر ۱۲۸۲ھ کو رہا ہوئے دو برس میعاد قید میں کم کر دیئے گئے تھے منیرؔ نے لکھا ہے
انعام میں معاف ہوئے ہم کو دو برس
شکر خدا رہا ہوئے کام نہنگ سے
ہندوستاں میں آکے رہے ہم پراگ میں
اب کانپور جاتے ہیں دل کی امنگ سے
فضل خدا سے سال رہائی کہو منیرؔ!

اب ہم گھر آئے چھوٹ کے قید فرنگ سے

کہا جاتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور کے ہاں ایک دن محفل رقص و سرود منعقد تھی کہ ایک گویئے نے منیرؔ کی مشہور غزل "مترنمدہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے" پڑھی۔ نواب صاحب اس غزل سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے اس زمین میں ایک غزل کہی۔
ناظم منیرؔ آئے یہاں ہم ہیں قدر داں
شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ منیرؔ کو عبور دریائے شور کی سزا ہوگئی ہے تو انہوں نے منیرؔ کی رہائی کی سفارش کی اور جب منیرؔ رہا ہو کر آئے تو انہیں نواب صاحب کی کرم فرمائی کا علم ہوا۔ انہوں نے نواب صاحب کے مصرع "شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے" کی تضمین کی۔ مشہور خلق آپ کی ہیں قدر دانیاں
حسب طلب منیرؔ بھی آتا ہے اب وہاں
یہ حکم خاص ہے دل و جاں پہ مرے رواں
"ناظم منیرؔ آئے یہاں ہم ہیں قدر داں
شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

منیرؔ قید سے رہا ہونے کے بعد الہ آباد پہونچے تھے اور وہاں سے نواب صاحب کے شفقہ کا جواب لکھا اور رامپور جانے کے لئے لکھنؤ آئے یہاں انہیں نواب رام پور کے انتقال کی خبر ملی عالم حزن و یاس میں منیرؔ نے ایک بند اور کہا
آیا منیرؔ چھٹ کے جب قید سے یہاں
تھا قصد رام پور کو ہو جا دس میں رواں
لیکن حضور ہو گئے راہی سوئے جناں
اب کس کے پاس جاؤں ہے کون قدر داں
نادم رہا میں اپنے کمالوں کے سامنے

منیرؔ پہلے ہی پریشان حال تھے، اس حادثہ نے انہیں نڈھال کر دیا اور وہ بہت مایوس ہو گئے۔ اتنے میں ولی عہد رامپور کی تخت نشینی کی خبر آئی۔ امیدوں نے پھر انگڑائی لی تہنیت نامہ مع تاریخ کہا۔ نواب کلب علی خاں نے انہیں رامپور بلا لیا۔ یہاں ان کی زندگی سکون و اطمینان سے گزرنے لگی۔ خود کہتے ہیں۔
نواب پاک کلب علی خاں نے اے منیرؔ ؛ بلوا کے رام پور میں کیں بخششیں کثیر
صد شکر آئے راہ پہ اب طالع فقیر ؛ ہے قدر داں سراپا امیر فلک سریر
اب سرخ رو ہوں اپنے کمالوں کے سامنے

منیرؔ آخر عمر تک دربار رامپور سے وابستہ رہے اور ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں رام پور میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال منیر علی قدرؔ سے ہجری سال وفات کا تعین ہوتا ہے۔

# غزلیں

## خاطر حافظی

درد کی چوٹ پہ آکر یوں صدا دیتا ہے کون
رات کے پچھلے پہر مجھ کو جگا دیتا ہے کون
خون کے دریا فضاؤں میں بہا دیتا ہے کون
روز سورج کو یہاں سولی چڑھا دیتا ہے کون
میرے کمرے کا اجالا سوچتا رہ جاتا ہے
رات ہوتے ہی یہاں دیپ گرا دیتا ہے کون
مجھ کو بستر سے اٹھا کر، صبح ہونے کے قریب
دن کی ساری تلخیاں مجھ کو پلا دیتا ہے کون
دیکھتے ہی دیکھتے دن کے سجھرے بازار میں
آخر آخر شب کی مشعل سی جلا دیتا ہے کون
چونک اٹھتا ہے خدا بھی آسمانوں کا زوال
عرش اعظم کو بھی اکثر یوں ہلا دیتا ہے کون
خون روتے جایئے ہر اک گھڑی خاطر یہاں
ناشناسوں کی ہے بستی خوں بہا دیتا ہے کون

## رحمٰن خاں منشا

چلے دل سے سنایا جائے
لے کو ذرا اور بڑھایا جائے
فکر و نظر ہاتھ جب آئی ہے تو پھر
شعر کا اعجاز دکھایا جائے
ہیں اس کے سوا تیرہ نصیبی کا علاج
ایقان رگ و پے میں بسایا جائے
رگانی کے حقائق کو سمجھنے کے لئے
دۂ وہم نگاہوں سے ہٹایا جائے
شنی کی جو ضرورت ہے سر راہ حیات
دوستو! اپنا ہی دل کیوں نہ جلایا جائے
پھر کبھی چاند پہ چلے کی کریں ہم باتیں
پہلے انسان کو انسان بنایا جائے
زندگی ایک حسین بت کی طرح ہے یارو
اس کا ہر ناز سلیقے سے اٹھایا جائے
موسم گل کے تقاضوں پہ نظر رکھتے ہوئے
جذبہ و جوش جنوں کام میں لایا جائے
خون دل خون جگر خوب لٹا کر منشا
صحن گلشن کو بہر طور سجایا جائے

## دھرم پال عاقل

جب سے پیتے ہیں مئے وحدت کے پیمانے کو ہم
جانتے ہیں ایک سا اپنے کو بیگانے کو ہم
ہر قدم پر ایک دھوکا، ہر نظر میں اک سراب
دیکھتے ہیں زندگی کے آئینہ خانے کو ہم
وہ تو گزری خیر، جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا
کس گھڑی نکلے تھے گھر سے اُنکو سمجھانے کو ہم
زندہ جل مرنا اسی کا، ہاں اسی کا کام ہے
دیر تک دیکھا کئے حیرت سے پروانے کو ہم
ٹوٹے پھوٹے جام و مینا، دل شکستہ بادہ خوار
کیا کریں ساقی بتا! اس تیرے میخانے کو ہم
اُن کی شوخی دیکھئے کہتے ہیں کس انداز سے
دل سے کیوں کر دُور کر دیں اپنے دیوانے کو ہم
صورت سیماب اے رہتا ہے ہر دم اضطراب
اب الٰہی کیا کریں اس دل کے بہلانے کو ہم
دیدۂ باطن نہ ہونے سے رہے ناکامیاب
گو بہت سمجھا کئے دُنیا کے افسانے کو ہم
ہم فقیروں کو تعلق سے کیا، لیکن حضور!
آپ کہتے ہیں تو چل پڑتے ہیں میخانے کو ہم
یہ پُرانی بات ہے، کچھ آج کا قصہ نہیں.
وہ اگر ہیں جی جلانے کو تو غم کھانے کو ہم
کیا طلب کرتے کسی سے، جب سمجھتے ہی رہے
باعث شرم و خجالت، ہاتھ پھیلانے کو ہم
عمر ساری عارضی لذات ہی میں کٹ گئی
خاک سمجھیں ایسے جینے اور مر جانے کو ہم
میکدے میں کام اپنا تو نہیں عاقل کوئی
آگئے ہیں میکشوں کو راہ پر لانے کو ہم

## سید ضمیر جعفری

آؤ کہ رنگ خون وفا دیکھتے چلیں
اس بے وفا کا حال ہے کیا دیکھتے چلیں
سنتے ہیں آج ہوش میں دیوانہ آگیا
اک حادثہ ہے کیسے ہوا دیکھتے چلیں
سونی پڑی ہوئی ہیں وفاؤں کی بستیاں
یارو یہ آج بات ہے کیا دیکھتے چلیں
آئینہ ان کے ہاتھ میں دیکھا ٹھہر گئے
سوچا کہ ہم بھی اپنی ادا دیکھتے چلیں
کس کس کو ان کی بزم میں ہے ہم سے کچھ گلہ
ہے کون کون ہم سے خفا دیکھتے چلیں
ہم تو رہِ خلوص میں دیوانہ ہو گئے
ان کو بھی کچھ ملال ہوا دیکھتے چلیں
شاید یہیں کہیں مرا نقش قدم بھی ہے
اس نقش کو بھی راہ نما دیکھتے چلیں
ظلم و ستم کی تند ہواؤں کے درمیان
کس نے جلا دیا ہے دیا دیکھتے چلیں
اچھا تو خانقاہ میں، آخر نہیں ملے
آؤ تو میکدے میں ذرا دیکھتے چلیں

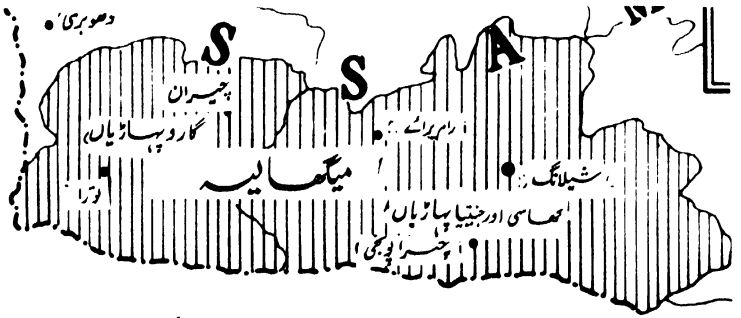


# میگھالیہ

راج نرائن راز

**گارو** جینتیا اور کھاسی قبائلیوں کی دھرتی میگھالیہ اپنے باشندوں کے رہن سہن لباس، زبان، عقائد، رسوم و رواج وغیرہ کے اعتبار سے ایک "مجموعہ اضداد" ہے۔ تاہم یہ بھارت کی دیرینہ روایات کے عین مطابق متضاد ہوتے ہوئے بھی متصادم نہیں، بلکہ مربوط ہے۔ میگھالیہ کی دھرتی اور لوگ گوناگوں دلچسپیوں کے حامل ہیں اور ملک کے دوسرے علاقوں کے رہنے والوں کے لئے اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتے ہیں۔ میگھالیہ کی اہمیت کا محض ایک یہی سبب نہیں میگھالیہ کا قیام بھی بھارت کی دیرینہ روایتوں کا آئینہ دار ہے اور ہماری خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

میگھالیہ کا قیام اپریل ۱۹۷۰ء میں ریاست آسام کے اندر ایک ذیلی خود اختیار ریاست کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ یہ آسام کے پانچ میں سے دو پہاڑی اضلاع گارو اور کھاسی و جینتیا ہلز پر مشتمل ہے۔ اس کے جنوب میں مشرقی پاکستان اور شمال میں وادی برہم پتر ا ہے۔ مشرق میں شمالی کچھار اور مکیر ہلز اضلاع ہیں۔ یہ ۸۰۷۰ مربع میل علاقے پر محیط ہے۔ اس کی آبادی لگ بھگ دس لاکھ ہے۔

اس ذیلی ریاست کی تشکیل کئی پہلوؤں سے آزادی کے بعد سے، ملک کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ یہ غالباً واحد انتظامیہ اکائی ہے جو اس کے عوام کی خواہش اور منشا پر، بنیادی طور پر، بغیر کسی تشدد کے، وجود میں آئی ہے۔ یہ میگھالیہ کے عوام اور سیاسی رہنماؤں کی بائیس تئیس برس کے عرصے پر محیط کوششوں کا نتیجہ ہے۔ میگھالیہ کے تعلق سے یہ امر بھی خصوصی توجہ چاہتا ہے کہ یہ بھارت کی دوسری ریاستوں کی طرح کوئی لسانی ریاست نہیں۔ یہاں کے باشندوں کی خاص زبانیں گارو اور کھاسی ہیں۔ ذریعہ تعلیم انگریزی ہے، جسے لوگوں نے باہمی رضامندی سے اختیار کیا ہے۔

میگھالیہ کا قیام اس اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ بھارت کے آئینی نظام میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ ہے۔ یہ ذیلی ریاست روس کی یونین جمہوریتوں کے نمونے پر بنائی گئی ہے۔ لیکن اسے اختیارات اور آئین بھارتی پارلیمنٹ کے ایک قانون سے حاصل ہیں۔ یہ قانون بھی اپنی جگہ اس اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اسے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے ضابطوں کو معطل کرتے ہوئے محض ایک روز میں پاس کیا ہے۔ نظم و نسق کی بعض مدات براہِ راست اس ذیلی ریاست کے زیر اختیار ہیں۔ جبکہ بعض کی انجام دہی و تکمیل آسام سرکار کی نگرانی میں ہے۔

اتنے سارے اعتبارات سے اہم میگھالیہ کی ذیلی ریاست اپنے عوام کے رہن سہن، لباس، عقائد اور رسوم و رواج کے اعتبار سے منفرد اور عجیب و غریب ہے۔ ان سے متعلق حقائق اپنے اندر افسانے کا سا افسوں اور دلکشی رکھتے ہیں۔ یہاں کے خاص باشندے کھاسی، گارو اور جینتیا ہیں۔ ممکن ہے بادی النظر میں یہ سارے قبائلی ایک جیسے لگیں۔ لیکن واقعتاً یہ قبائلی ہی جانتے ہیں کہ ان میں کہاں کہاں مماثلت ہے اور کہاں کہاں اختلاف۔

آغاز ان قبائل کی ابتدا ہی سے کرنا مناسب ہوگا۔

گارو اپنے آپ کو اُچک مانڈے (پہاڑی آدمی) کہتے ہیں۔ ان کا اوّلین وطن نامعلوم ہے لیکن اُن کا اپنا یقین یہ ہے کہ وہ تبت کے رہنے والے ہیں۔ تبتی اور گارو

زبانوں میں کچھ مشابہت پائی جاتی ہے۔ گارو بہنیں کی طرح گھڑیال کا احترام کرتے اور یاک کی دم کی قدر کرتے ہیں۔ گو یہ جانور گارو ہلز میں کبھی نہیں پایا گیا۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ آسام کے میدانی قبائلیوں کی طرح وہ چین اور بالائی برما سے شمال مشرقی راستوں کے ذریعے اپنے موجودہ مسکن تک آئے۔ لسانی اور جسمانی اعتبار سے گارو کچھاریوں سے بڑے مشابہ ہیں، لیکن ان کی موت کی اور نیز بعض دوسری اور بالخصوص سرکاشکار کھیلنے کی رسومات ناگاؤں جیسی ہیں۔ قرینِ قیاس ہے کہ گارو ابتداً دیماپور کے قریبی علاقے میں رہے ہوں گے۔ اور اس علاقائی قرب کی وجہ سے بعض ناگا رسومات ان کی زندگی میں راہ پاگئی ہوں گی۔

گارووں کی طرح، اس ذیلی ریاست کے دوسرے خاص باشندوں جینتیاؤں کے بارے میں بھی خیال یہ ہے کہ وہ باہر سے ـــــ مشرقِ بعید یا چین سے، برما کے راستے اپنے موجودہ مسکن تک آئے اور انہوں نے اس پہاڑی علاقے میں سلطنت قائم کرلی تھی، جو اب جینتیا ہلز کے نام سے موسوم ہے۔ یہ سلطنت ۱۸۳۵ء میں ختم ہوئی جب انگریزوں نے اس کے آخری راجہ راجندر سنگھ کو معزول کر دیا تھا۔

اس علاقے کے تیسرے خاص باشندے کھاسی ہیں۔ کھاسی اور جینتیا ایک ہی نسل سے ہیں۔ اُن کی متعدد رسمیں ایک جیسی ہیں اور وہ کئی پہلوؤں سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ کچھ مشابہت کھاسیوں اور چھوٹا ناگپور کے ہوسنڈا قبائلیوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ جو ان کے گہرے روابط کی مظہر ہے۔ ممکن ہے کھاسی اور ہوسنڈا قبائلیوں نے اپنا ثقافتی ورثہ ایک ہی وسیلے سے پایا ہو۔

آج کی متمدن دنیا میں ان قبائلیوں کے ماضی پر ایک نظر ڈالنے سے رگوں میں خون منجمد ہونے لگتا ہے۔ یہ قبائل ابتداً بڑے وحشی تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ماضی قریب تک گارووں کو بے حد ظالم، خون کے پیاسے اور وحشی سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کا ثبوت ان کے اپنے نواحی میدانی اضلاع پر متعدد اور مسلسل حملے ہیں۔ ہر حملے میں متعدد لوگ ہلاک اور زخمی ہوتے تھے۔ گارو قبائلی ناگاؤں کی طرح مرے ہوئے لوگوں کے سر کاٹ کر اپنے ہمراہ لے جاتے تھے کہ یہ اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ محض تفریح کے لئے کئے جانے والے اس قتل و خون کے علاوہ انہیں قربانی کی غرض سے بھی انسان درکار ہوتے تھے۔ یہ قربانیاں بُرے شگون والے واقعات کے بعد، دیوتاؤں کو مہربان کرنے کی غرض سے دی جاتی تھیں۔ اسی طرح انسانی قربانی کا رواج متحد کھاسی و جینتیا ہلز کے جینتیا قبائلیوں میں بھی تھا، جو انہوں نے غالباً آسام کے میدانی علاقوں کے تانترک ہندوؤں سے لیا تھا۔ جینتیا قبائلی جن پتھروں پر انسانوں کو قربان کیا کرتے تھے وہ جینتیا ہلز میں گرم پانی کے قریب دریائے کوپیلی کے کنارے آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ قربانیاں کوپیلی دیوی کو خوش کرنے کے لئے دی جاتی تھیں۔ ان قبائلیوں میں سرکاشکار کھیلنے کا رواج ۱۸۷۶ء تک رہا۔ اسی برس اس کی موثر روک تھام ہو پائی تھی۔ اس برس گارو قبائلیوں نے کئی سو انسانی کھوپڑیاں ڈپٹی کمشنر یا اس کے عملے کی تحویل میں دیں۔

سرکاشکار اور انسانی قربانی اپنی جگہ چونکانے اور حیرت میں ڈالنے والے امور ہیں۔ تاہم گارو اور کھاسی قبیلوں میں جرم و سزا اور جھوٹے و سچے کی آزمائش کے طریقے اور معیار بھی اتنے ہی انوکھے اور حیرت انگیز ہیں۔ گارووں کے بارے میں ایک بہت دلچسپ روایت یہ ہے کہ ہر گارو کی زندگی دائی (معاوضہ) دیتے اور طلب کرتے ہوئے گزر جاتی ہے۔ معاوضے کی طلبی کا سلسلہ نسل در نسل چلتا ہے۔ فرض کیجئے، ایک شخص کے دادا، پردادا کا قتل پچاس برس پہلے ہوا تھا۔ وہ قتل کا معاوضہ، پچاس برس گزر چکنے پر بھی قاتل کے وارثوں سے طلب کرتا ہے اور اگر معاوضہ نہیں ملتا تو پھر اس کے وارث، قاتل کے وارثوں کے معاوضہ اس وقت تک طلب کرتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ ادا نہیں ہو جاتا۔ گارووں کے تعلق سے یہ امر بھی دلچسپی کا حامل ہے کہ مقدمات میں متعلقہ فریقین ہی نہیں، بلکہ سارا گاؤں حصہ لیتا ہے اور جب مقدمے کا فیصلہ زبانی شہادتوں کی بنا پر نہیں کیا جاسکتا تو حلف و آزمائش کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے آزمائش دو نوعیتوں کی ہوتی ہے۔ پہلی سِل سوا کہلاتی ہے اس آزمائش کے لئے دھات کا ایک ٹکڑا آنچ میں تپایا جاتا ہے۔ پھر پجاری لوہے کے اس گرم ٹکڑے کو گواہ کی روئی اور پتوں سے ڈھکی ہتھیلی پر سے گزارتا ہے خیال ہے کہ اگر وہ سچا ہے تو اس کی ہتھیلی جلے گی نہیں۔



سیگھا لیہ کے لوگ

دوسری آزمائش چوکیلا سوا ہے۔ اس آزمائش میں اُبلتے ہوئے پانی والے کٹورے میں ایک انڈا ڈال دیا جاتا ہے۔ اور سچے شخص سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ کوئی زک اُٹھائے بغیر ہاتھ سے انڈے کو باہر نکال لے گا۔ پرانے زمانے میں سچے شخص کی ایک پہچان یہ بھی تھی کہ رات کو اُسے جنگل میں ایک درخت سے باندھ دیا جاتا تھا اور صبح تک اگر کوئی چیتا پھاڑ نہیں کھاتا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ سچا ہے۔ یہ طریقہ آج بھی اپنایا جاتا ہے لیکن ایک بنیادی فرق کے ساتھ یعنی آدمی کی جگہ کسی بکری یا سور کو جنگل میں درخت سے باندھا جاتا ہے۔

ناگا قبائلیوں کی طرح گارو بھی چیتے کے دانت کو کاٹتے ہوئے حلف اٹھاتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ جھوٹ بول رہا ہے تو چیتا اُسے کھا جائے۔ چیتے کا کسی شخص کو کھا جانا آفت کے نزول کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ ایسے میں کنبے کے دوسرے افراد اور رشتے داروں کو چیتے سے محفوظ رکھنے کے لئے مویشیوں اور پرندوں کی قربانیاں دینا ہوتی ہیں۔

گارو قبائلیوں کے مقابلے میں کھاسی زیادہ امن پسند ہوتے ہیں اور اخلاق، قانون اور ضابطے کا بڑا پاس لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کے بعض قاعدے عہدِ قدیم کی شدت لئے ہوئے ہیں۔ اور شعور و احساس کو بے طرح جھنجھوڑتے ہیں۔ یہ شدت بھی غالباً اسی سبب سے ہے کہ کھاسی بڑے امن پسند واقع ہوئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ قانون شکنی کرنے والوں سے بڑی سختی سے پیش آتے ہیں۔ وہ جُرم کے اعادہ کو کسی طرح برداشت نہیں کرتے۔ قتل کی سزا میں قاتل کو اس بے دردی سے پیٹا جاتا تھا، کہ وہ بالآخر جاں بحق ہو جاتا تھا۔ بدچلنی کی سزا عمر قید یا گیارہ سو روپے اور ایک سور جُرمانہ ہوتی تھی۔ خاوند اپنی بیوی کو کسی دوسرے کے ساتھ ہم بستری کرتے ہوئے دیکھ لے تو وہ دونوں کو موت کے گھاٹ اُتار سکتا تھا اور اس پر بھی وہ قاتل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ شادی شدہ عورت کے اغوا کی سزا بھاری جرمانہ اور ایک سُور کی ادائیگی ہوتی تھی۔ ترویج محرمات کی مخالفت اور ورزی کرنے والے کو برادری سے خارج کر دیا جاتا تھا اس طرح کہ بالآخر اُسے گاؤں چھوڑتے ہی بنتی تھی۔ آتش زنی کی سزا عمر قید یا دیس نکالا ہوتی تھی۔ لوگوں کو ارواحِ بد کا اسیر بنانے والے کو سزا کے طور پر، محمودی چٹان سے نیچے پھینک دیا جاتا تھا۔ چوری ڈاکے کی سزا میں مجرم کو جرمانہ مویشیوں کی صورت میں ادا کرنا ہوتا تھا یا مجرم کو بانسوں سے بنے ایک مچان پر بٹھا کر سرخ مرچوں کی ایک دھونی دی جاتی تھی۔ ایسی سزا کا نتیجہ سوچا تو جا سکتا ہے۔ شاید بیان نہیں کیا جا سکتا۔

جرم و سزا اور جھوٹ سچ کی آزمائش کے انوکھے طریقوں کی طرح، ان قبائلیوں کی وراثت، شادی اور طلاق کی رسُومات بھی عجیب و غریب اور تاریخ کا کوئی پارینہ ورق لگتی ہیں۔ ان تینوں قبائل میں کنبہ مونگ پر مبنی یعنی ماں کا ہوتا ہے گویا تمام افراد کا سلسلۂ نسب ماں سے ملایا جاتا ہے۔ جنتیا قبائلیوں کے معاملے میں باپ کی صورت عجیب اور انوکھی ہوتی ہے۔

گارُوؤں میں شادی قبیلے کے اندر قطعی نہیں ہو سکتی۔ خاوند اور بیوی کا دو مختلف قبیلوں سے ہونا بے حد ضروری ہے۔ بچے ماں کے قبیلے میں شامل تصور کئے جاتے ہیں۔ شادی کی تجویز ہمیشہ لڑکی والوں کی طرف سے ہوتی ہے اور عام طور پر لڑکی اپنے خاوند کا انتخاب خود آپ کرتی ہے۔ صرف ایک یا سب سے چھوٹی لڑکی پھوپھا زاد یا چچا زاد بھائی سے بیاہی جاتی ہے جو شادی کے بعد اپنی بیوی کے والدین کے پاس آکر رہتا ہے۔ اپنے سُسر کا نوکر رام یعنی ماں کے گھر میں باپ کے قبیلے کا نمائندہ بن جاتا ہے یہاں تک تو شادی میں کچھ انوکھا پن نہیں لیکن یہ فی الواقع ایک عجیب رسم ہے۔ اس داماد کو اپنے سُسر (جو اس کا چچا یا پھوپھا بھی ہوتا ہے) کے انتقال کے بعد اپنی بیوہ ساس سے شادی کرنا ہوتی ہے اس طرح وہ بیک وقت ماں اور بیٹی دونوں کا خاوند بن جاتا ہے۔ بات اس پر ختم نہیں ہوتی نوجوان خاوند اور بوڑھی بیوی سے اولاد کا ہونا بھی لازمی تصور کیا جاتا ہے۔ ادھر روشن خیال گارو قبائلی اس رسم کو تیزی سے ختم کر رہے ہیں۔

جن صورتوں میں نیک رام نہیں ہوتا ان میں بیوہ کو متوفی خاوند کے کنبے کی رضامندی کے بغیر دوبارہ شادی کی اجازت نہیں ہوتی۔ ایک مرد جتنی شادیاں چاہے کر سکتا ہے لیکن اگر اُسے دو بہنوں سے شادی کرنی ہو تو اُسے پہلے بڑی بہن سے شادی کرنی ہوگی۔ دوسری عورت سے شادی کرنے سے پہلے مرد کو اپنی پہلی بیوی سے اجازت حاصل



کرنا ہوتی ہے۔ برعکس صورت میں اُسے پہلی بیوی کو معاوضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ پہلی بیوی جیک ہیمونگ یعنی خاص بیوی اور دوسری بیویاں جیک گاٹس کہلاتی ہیں لیکن سماجی طور پر ان کا مرتبہ معمولی نہیں ہوتا۔ لیکن جب کوئی شخص اپنے چچا کی بیوہ سے شادی کرتا ہے تو وہ جیک ہونگ بن جاتی ہے اور اگر کوئی بیوہ اپنے خاوند کے بھتیجے سے شادی کرنے سے انکار کرتی ہے۔ تو اُسے بھتیجے کو والی یعنی معاوضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ شادی کی قیمت کا کوئی رواج گارو ؤں میں نہیں جبکہ یہ رسم میزو ؤں میں عام ہے۔

طلاق عام ہے اور بدچلنی وغیرہ کی بنیاد پر بڑی آسانی کے ساتھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مرد یا عورت بغیر کسی وجہ کے بھی طلاق حاصل کرسکتے ہیں۔ ایسی صورت میں طلاق حاصل کرنے کے خواہشمند کو دوسرے فریق کو ایک رسمی معاوضہ ادا کرنا ہوتا ہے جو ساٹھ روپے ہوتے ہیں۔

جنتیا اور گارو قبائیلوں کی طرح کھاسیوں میں بھی کنبہ ماں کا ہوتا ہے اور وراثت کا حق بھی لڑکی ـــــ سب سے چھوٹی لڑکی کو پہونچتا ہے۔ کھاسیوں میں شادی کے بعد مرد اپنی بیوی کے گھر پر آکر رہتا ہے۔ گھر گرہستی کی ذمہ داری تین حصوں میں بٹی ہوتی ہے۔ گھر بھر کی ضروریات کے لئے خاوند کو کمانا ہوتا ہے۔ قبیلے کے امور کا انتظام چچا کرتا ہے اور گھریلو معاملے تمام تر بیوی کے انتظام و اختیار میں ہوتے ہیں۔ مرد شادی سے پہلے جو کچھ کماتا ہے ماں کو دیتا ہے اور شادی کے بعد اپنی تمام کمائی اپنے بچوں کو دیتا ہے۔ لیکن جنتیا قبائیلوں میں صورت بالکل مختلف و برعکس ہے وہ جو کچھ کماتا ہے بیوی کو نہیں بلکہ اپنی ماں اور بہنوں کو دیتا ہے وہ زندگی میں ماں کے گھر کا فرد سمجھا جاتا ہے اور موت پر بھی اُسے بیوی کے رشتہ دار نہیں، اُس کے اپنے رشتے دار جلاتے اور اس کی ہڈیاں گھرانے کے برتن میں محفوظ کرتے ہیں۔

گارو اور کھاسی قبائیلوں کی طرح جنتیا قبائیلوں میں بھی شادی قبیلے سے باہر ہوتی ہے بچے بھی ماں کا قبیلہ اختیار کرتے ہیں لیکن شادی کی تجویز ہمیشہ لڑکے والے کی طرف سے آتی ہے۔ لڑکا اپنے لئے بیوی خود پسند کرتا ہے۔ اس میں ماں باپ کی پسند کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ شادی کے بعد لڑکا گھر کے ایک فرد کی طرح بیوی کے گھر پر رہنے کو نہیں آتا۔ اُسے مہمان شبینہ کہنا مناسب ہوگا وہ سورج ڈوبنے کے بعد بیوی کے گھر آتا ہے واقعتاً وہ ٹھیک سے مہمان شبینہ بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اگلی صبح سورج نکلنے پر وہ کام طعام کے لئے اپنے کھیتوں اپنی ماں کے گھر کو روانہ ہوجاتا ہے لیکن ادھر اس صورت حال میں تبدیلی واقع ہونے لگی ہے عیسائیت اختیار کرنے والے جنتیا قبائیلوں نے اس رسم کو قطعی خیرباد کہہ دیا ہے دوسرے بھی اس رسم کو دھیرے دھیرے ترک کر رہے ہیں۔ یہ بدلتے ہوئے سماجی حالات کا نتیجہ ہے لیکن اس سے سماجی ڈھانچہ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

جرم و سزا، وراثت اور شادی کی عجیب و غریب رسموں کی طرح ان قبائیلوں کے مذہبی عقائد بھی عجیب و غریب ہیں۔ کھاسیوں کا عقیدہ ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب خدا اور اس کے بندوں کے درمیان رابطہ براہ راست تھا اور خدا انسان اور حیوان سکل ہم آہنگی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے وہ اس بات میں بھی یقین رکھتے ہیں کہ مذہب اُنہیں خدا نے عطا کیا ہے۔ اُن کے نزدیک دراصل یہ ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے وہ خدا سے منقطع رشتے کو دوبارا استوار کرسکے ہیں۔ کھاسیوں کے مذہب میں مرغ کو بڑا مقام حاصل ہے کہتے ہیں کہ جب اس دھرتی پر گناہ حد سے زیادہ بڑھے تو سورج نہ نکلا کسی کو اتنی جرات نہ ہوئی کہ وہ خدا کے پاس جائے اور معاملے کی وضاحت کرے۔ بالآخر ایک پرندہ روانہ ہوا۔ اُس نے اپنی خدمات پیش کیں اور خدا کے حضور میں حاضر ہوا۔ خدا نے پرندے سے خوش ہوکر اس کی دعا اور درخواست قبول کرلی۔ مرغ نے تین بار اذان دی اور سورج نکل آیا۔ اس پر مرغ کو شوخ رنگوں والے پَر اور کلغی عطا ہوئی کھاسی آج بھی اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ اگر مرغ تین بار اذان نہیں دے گا تو سُورج نہیں نکلے گا۔

کھاسیوں کے مذہب کے تعلق سے یہ بات بلاخوف تردید کی جاسکتی ہے کہ ان کا تمام تر نظریہ رسوم پسندی کا آئینہ ہے اور رسومات کی ادائیگی کا سلسلہ صبح آنکھ کھلنے اور چولہا جلنے سے شروع ہوتا ہے اور بستر میں جانے تک، مختلف اوقات میں مختلف صورتوں میں جاری رہتا ہے۔ تاہم یہ رسوم اور رسمیات کچھ پیچیدہ نہیں اور روزمرہ کے کھاسی معمولات میں شامل ہیں۔

بہانگ گارو ؤں کے مذہب کا تعلق ہے، اُن کی ایک خاصی معقول تعداد امریکی مشنریوں کی کوششوں سے عیسائی بن گئی ہے۔ تاہم ہندو دست کی خام شکل ہی گارو ؤں کا مذہب ہے۔ گارو متعدد دیوی دیوتا ؤں کو مانتے ہیں۔ یہ دیوی دیوتا قدرت کے مختلف مظاہر بارش، بجلی، کڑک، ہوا، بھوسچال وغیرہ سے متعلق ہیں سورج چاند اور ستارے موسموں کا پھیر بدل کرنے والے دیوتا سمجھے جاتے ہیں۔ گوئرا قوت کا دیوتا سوسائم۔ دولت کی دیوی، سل گونگ زرخیزی کا اور چوراڈوبی فصلوں کا محافظ دیوتا ہے۔ ان دیوی دیوتا ؤں کو مہربان کرنے کے لئے بکریوں اور مرغیوں وغیرہ کی قربانیاں دی جاتی ہیں۔

فصلوں کے محافظ اور زمین کی زرخیزی سے متعلق دیوتا ؤں کے تذکرے سے یہ امر بھی مسلم ہوجاتا ہے کہ گارو، کھاسی اور جنتیا قبائیلوں کی طرح بنیادی طور پر زراعت پیشہ ہیں تاہم اُن کے زندگی کے دوسرے شعبوں کے طور طریقے کے ساتھ ساتھ زراعت کے طور طریقے مختلف اور قدرے انوکھے ہیں۔

گارو قبائل کا رشتہ دھرتی سے بہت گہرا ہوتا ہے اس کے لئے زندگی کا کام دھرتی جوتنے سے شروع اور دھرتی جوتنے پر ختم ہوتا ہے وہ اپنی تمام تر قوت اسی پیشے پر صرف کردیتا ہے آسام کے دوسرے پہاڑی قبائیلوں کی طرح وہ بھی کھیتی

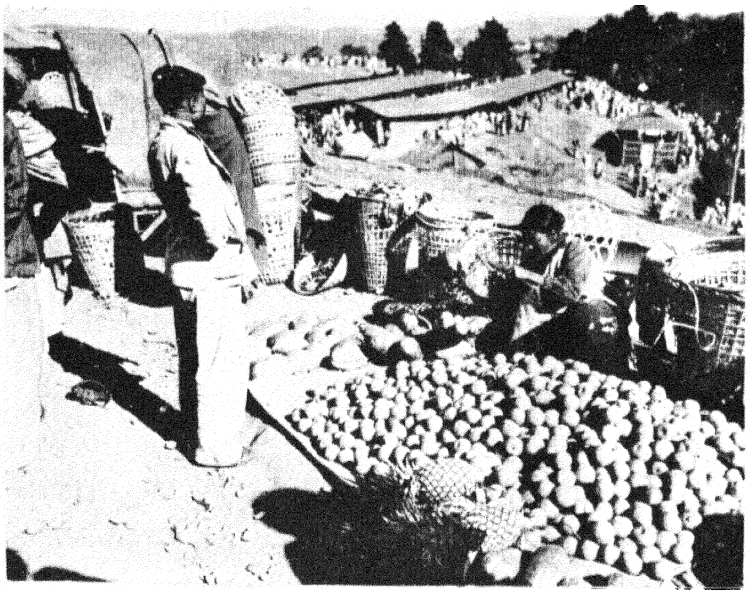

میگھالیہ کا ایک بازار

عجیب تخریبی انداز سے کرتا ہے۔ ہر برس ایک سرسبز علاقہ گاؤں بھر کے لئے منتخب کر لیا جاتا ہے۔ اس علاقے کے سارے درخت کاٹ گرائے جاتے ہیں پھر ان پیڑوں کو سوکھنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور پھر سوکھے پیڑوں کو آگ لگا دی جاتی ہے اور اس طرح سارا علاقہ کھیتی کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ ایک علاقہ میں کھیتی صرف ایک برس کی جاتی ہے۔ اگلے برس اس غرض سے دوسرا علاقہ چنا جاتا ہے۔ چونکہ ہر گاؤں کے پاس علاقہ بڑا محدود ہوتا ہے لہذا چند برس بعد اس زمین میں کھیتی کی جاتی ہے جس میں کہ چند برس پہلے کی گئی ہوتی ہے اور ایک بار پھر اس علاقہ میں پیڑ پودوں کو نظر آتش کر دیا جاتا ہے۔

جینتیا کاشتکاروں کا معاملہ برعکس ہے۔ وہ جگہ بدل بدل کر نہیں بلکہ مستقل کھیتی کرتے ہیں۔ اُن کا سینچائی کا طریقہ بہت ڈھنگ کا ہے اور ایک ہنرمندی کا مظہر ہے لیکن جہاں تک کھیتی باڑی کا تعلق ہے کوئی پہاڑی قبیلہ بھی کھاسیوں کی ہنرمندی کا جواب نہیں لاسکتا۔ ان کا طریقۂ کاشت بڑا مفصل اور زمین کی پیداواری صلاحیت سے تطابق رکھتا ہے۔ یہاں کی خاص فصلیں، چاول، مکئی، آلو، شکر قند، جوار، باجرہ کپاس وغیرہ ہیں۔ چاول ان قبائلیوں کی خاص خوراک ہے۔ دوسری خاص خوراک گوشت ہے۔ اس ذیل میں گارو قبائلیوں کا کوئی جواب نہیں — ایک چیتے کو چھوڑ کر وہ باقی سبھی چیزیں بکری، سور، بطخ، مرغ، کتا، بلی، سانپ۔ چھپکلی۔ چمگادڑ اور حد تو یہ ہے کہ اڑنے والی سفید چیونٹیاں تک کھا جاتے ہیں۔ ہاتھی کے گوشت کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے سوکھی مچھلی روزانہ کی خوراک ہے۔

دوسرے پہاڑی قبائلیوں کی طرح گارو شراب کے بے حد شوقین ہوتے ہیں۔ شراب کشید تو نہیں کی جاتی۔ البتہ چاول باجرے اور مکئی سے تیار اور روزانہ استعمال کی جاتی ہے۔ دن تہواروں اور خاص خاص مواقع پر مذہبی رسومات کی ادائیگی کے وقت شراب کثرت سے پی جاتی ہے منتیات کا رواج جینتیاؤں میں بھی عام ہے وہ افیون تو نہیں کھاتے لیکن جوار یا چاول سے کشید کی گئی شراب بڑی مقدار میں استعمال کرتے ہیں۔ تقریبات میں چاول سے تیار کی گئی بیئر کثرت سے پی جاتی ہے اور یوں بھی یہ روزانہ کی اشیائے خورد و نوش میں شامل ہے جینتیا بچے، عورتیں اور مرد سپاری اور پان چبانے کے بڑے شوقین ہیں۔ اس ضمن میں یہ امر شاید دلچسپی کا باعث ہو کہ جینتیا فاصلے کی پیمائش سفر میں چبائی گئی سپاریوں کی تعداد سے کرتے ہیں۔

گو یہ قبائل ایک ہی ذیلی ریاست کے باشندے ہیں لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ ان کی سماجی ثقافتی زندگی کے طور طریقوں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً گارُوں میں شراب کے ساتھ رقص اور بھینس کے سینگ، بانسری اور ڈھول کا سنگیت تمام مذہبی اور سماجی تقریبات کا جزو خاص ہے۔ مرد ہاتھوں میں تلوار اور ڈھال لے کر رقص کرتے اور بیچ بیچ میں کائی کائی کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ مرد اور عورتیں مل کر اور الگ الگ بھی رقص کرتے ہیں۔ ناگا اور لوشائی قبائلیوں کے رقصوں کی بہ نسبت گارو قبائلیوں کے رقص بے نمک ہوتے ہیں۔ بجز شراب نوشی و رقص انہیں اجتماعی تفریح کا کوئی سامان میسر نہیں۔ کھیل بالعموم جسمانی طاقت کے مظاہرے کے لئے ہوتے ہیں۔ ان میں کسی مہارت یا ہنرمندی کی گنجائش نہیں ہوتی شکار اور مچھلی کا شکار لوگوں کے دلپسند مشغلے ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ شکار ہتھیار سے نہیں کھیلا جاتا۔ یہ طریقہ بسا اوقات خود شکاریوں کے لئے سمان کا خطرہ پیدا کر دیتا ہے۔ مچھلی کے شکار کے لئے بھی گارو مروج طریقے نہیں اپناتے۔ وہ بانس کے نیزوں سے بھی مچھلی کا شکار کھیلتے ہیں۔

گارُوں کے برعکس کھاسیوں کی سماجی ثقافتی زندگی زیادہ رنگین اور دلکش ہے۔ وہ گھر کی چار دیواری سے باہر کی زندگی کے بڑے شیدائی اور دلدادہ ہوتے ہیں۔ شکار، مچھلی کا شکار اور تیر اندازی اُن کے محبوب مشاغل ہیں۔ تیر کمان اُن کے بے مثل ہتھیار ہیں اور وہ ان کے استعمال میں بے مثل مہارت بھی رکھتے ہیں۔ ایسی ہی مہارت اور شغف وہ رقص اور سنگیت میں رکھتے ہیں۔ کھاسی لڑکیاں ہاتھ سے بنے ریشم

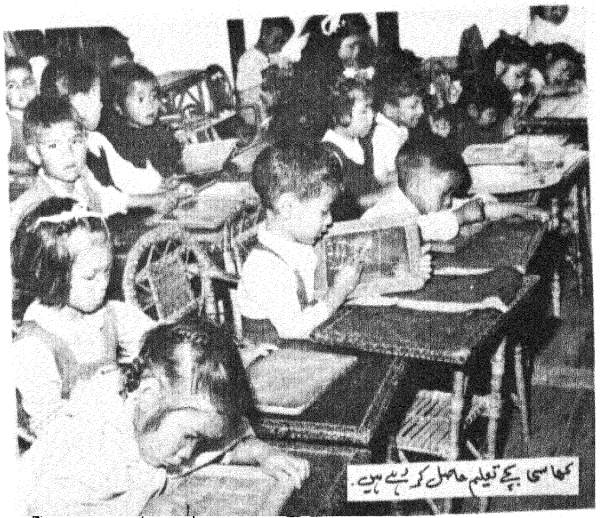

کھاسی بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

کے کپڑے اور سونے کے زیور پہنے ہوئے، سبک اور تیز قدموں سے موسیقی کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر رقص کرتی ہیں۔ مرد بھی گہرے شوخ کپڑوں میں خاندانی تلواروں سے آراستہ لڑکیوں کو حلقے میں لئے ہوئے رقص کرتے ہیں اور رقص و رنگ کا ایک عجیب رُوپ پیش کرتے ہیں۔

کھاسیوں کی طرح جینتیا بھی بڑے خوش باش ہوتے ہیں۔ وہ کھیل تفریح ہنسی مذاق اور خوش فعلیوں کے بڑے دلدادہ ہوتے ہیں۔ شکار اور مچھلی کا شکار اور کشتی اُن کے محبوب تفریحی مشاغل ہیں۔ ان کا سب سے اہم مقبول و رنگین تہوار، بیہہ دین کھلم ہے۔ یہ ماہ جولائی میں جوائی اور نواحی دیہات میں منایا جاتا ہے۔ اس میں صرف مرد رقص کرتے ہیں۔ اس رقص کو مغرب کے رقصوں راک اینڈ رول اور ٹوئسٹ کی ابتدائی شکل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ناچنے والے ڈھول اور لے کے سنگیت سے ہم آہنگ ہو کر سروں اور پیروں کو حرکت دیتے ہیں۔ ہفتہ بھر دھوم دھام سے منائے جانے والے اس تہوار کی آخری رسوم بھی مردہی ادا کرتے ہیں۔ جنوبی ہند کے تہوار رتھ یاترا سے مشابہ اس تہوار پر عورتوں اور بچوں کی خوش پوشی و جامہ زیبی دیدنی ہوتی ہے

مختصر اَسیگھالیہ کی دھرتی نئے اور پُرانے کے عجیب و غریب امتزاج کی آئینہ ہے۔ اس دھرتی کے لوگ، ملک کے دُوسرے حصوں کے عوام کی طرح مختلف اور گوناگوں رنگوں میں رنگے ہوئے ہونے کے باوجود یک رنگی کا ایک عجیب نقش لئے ہوئے ہیں۔ ابتداً ضلع کونسلوں اور اب میگھالیہ کی ذیلی ریاست کے قیام سے ان قبائلیوں کے لئے ایک نئی زندگی کا باب وا ہوا ہے، ترقی کی راہیں کھلی ہیں اور آج وہ قومی زندگی میں برابر کے شریک اور ملک کے دیگر عوام کے ہم دوش و ہم رکاب ہیں۔

# وقت کا تقاضہ ہے

اعجاز فاطمہ

وقت کا تقاضا ہے آج اے خردمندو!
زیست کے گلستاں میں حُسن ہو، تبسّم ہو
نُور ہو، اُجالا ہو، کیف ہو، مسرت ہو
نغمگی ہو، راحت ہو، جاوداں ہو شادابی
اور حُسن و شادابی
زیست کے گلستاں میں
راحتوں کے آنگن میں
مختصر سی خوشیاں ہیں

مختصر سی یہ خوشیاں
مختصر سا کنبہ ہے
جو سکونِ لافانی
اور تصورِ دلکش
آج اے خردمندو! وقت کا تقاضا ہے
مت بڑھاؤ کنبے کو
دو یا تین ہی بچے زیست ہی کا مقصد ہیں
نور ہیں، اُجالا ہیں، کیف ہیں، مسرت ہیں
حُسن ہیں تبسم، نغمگی ہیں، راحت ہیں
وقت کا تقاضا ہے آج اے خردمندو!
زیست کے گلستاں میں، حُسن ہو تبسم ہو

# نئی کتابیں

# اُردو افسانہ
# کل، آج اور کل

دیویندر اسر

کسی فن پارے کی تخلیق کیسے اور کیوں کر عمل میں آتی ہے؟ اس کے بارے میں ماہرین نفسیات اور سماجیات اور اہل علم و دانش کئی بار اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں لیکن کسی ایک نظریئے کو مکمل طور پر حتمیت کے ساتھ صحیح قرار دینا تخلیقی عمل کی پیچیدگیوں کو نظر انداز کرنا ہے۔ ادبی تنقید میں بارہا ایسا دیکھا گیا ہے کہ ادبی مسائل کو سہل پسندی کا شکار بنا کر انہیں چند سکہ بند فارمولوں میں بند کر دینے کی کوشش کی جاتی رہی ہے کسی افسانے کی قدر متعین کرتے ہوئے جب کوئی تخلیقی افسانہ نگار اس کے بارے میں یقینی طور پر کوئی فیصلہ صادر کرتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کیونکہ افسانہ نگار میں اگر تخلیقی صلاحیت موجود ہے اور اس کا احساس و تجربہ مستند ہے تو وہ اپنے افسانے یا اپنے تخلیقی عمل کے باعث ہی کچھ کہہ سکتا ہے ضروری نہیں کہ اس کی رائے دوسرے افسانوں کے بارے میں بھی صحیح ہو اس لئے جب کوئی نقاد کسی افسانہ نگار یا عام طور پر مختلف افسانہ نگاروں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایک مخصوص طرز کے افسانے کیوں نہیں لکھتے تو ظاہر ہے کہ وہ تخلیقی عمل کے اصولوں کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔

افسانہ کسی بھی موضوع پر لکھا جا سکتا ہے۔ کسی افسانے میں سیاسی مسائل کے حل کی تلاش ملتی ہے یا اس کا کوئی مخصوص حل پیش کیا جاتا ہے اور کوئی سماجی پہلو کو اُجاگر کرتا ہے۔ کسی کے لئے معاشی بحران زیادہ اہم ہے تو کسی کے لئے اخلاقی یا اصلاحی نقطہ نظر۔ کوئی من کی دنیا میں ڈوبا ہوا ہے تو کوئی لاشعور کی گتھیوں کو سلجھانا چاہتا ہے۔ کوئی حسن کا پجاری ہے تو کوئی انقلاب کا نقیب ـــــ لیکن افسانوی ادب کو اس طرح مختلف خانوں میں تقسیم کرنا ادب کو چند بندھے ٹکے فارمولوں میں تبدیل کرنا ہے۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ ہر افسانے کا محور "انسان" ہوتا ہے جس کے گرد ساری زندگی گھومتی ہے۔ افسانے کا یہ انسان ہی ہے جو سیاسی اور معاشی زندگی بسر کرتا ہے۔ ضمیر کی چبھن محسوس کرتا ہے یا اس کا گلا گھونٹتا ہے۔ لاشعور کا کلام بن کر عمل کرتا ہے یا شعوری طور پر کوئی قدم اُٹھاتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ زندگی کے بارے میں اس کا تمام تر رویہ غیر استدلالی ( Arational ) یا غیر اخلاقی یا غیر معمولی (Abnormal) ہو ـــ

اس پس منظر میں ماہنامہ "کتاب" لکھنؤ کے دو جلدوں پر مشتمل افسانہ نمبر کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس نمبر میں افسانوں، ڈراموں، ناولٹ، طنزیہ جو مزاحیہ مضامین اور افسانوی ادب پر مقالوں کے علاوہ اُردو افسانے پر تین سمپوزیم بھی شامل ہیں جو اُردو افسانے کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کے لئے مفید مواد فراہم کرتے ہیں۔ پہلے سمپوزیم میں ـــ اُردو افسانہ "کل آج اور کل" میں حصہ لینے والے صرف نقاد اور افسانہ نگار ہیں۔ دوسرے سمپوزیم میں افسانوی ادب پر ایک مذاکرہ شامل ہے جس میں مراٹھی اور اُردو کے چند افسانہ نگاروں اور نقادوں نے شرکت کی ہے۔ تیسرے سمپوزیم میں اُردو افسانے کے چند مسائل پر اشاعتی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے جس میں قاری افسانہ نگار اور ناشر نے حصہ لیا ہے۔ ان کے علاوہ افسانوی ادب سے متعلق چند فکر انگیز مقالے بھی شامل ہیں۔ اس نمبر کے مطالعہ سے اُردو افسانے کی "کرشن چندر سے لے کر حمید سروری تک پوری تین نسلیں لپیٹ میں آجاتی

ہیں۔ یہ افسانہ بحران تینوں نسلوں کی بھی کہانی ہے کہ انہوں نے کن کن زاویوں سے دُنیا، حقیقت اور افسانہ کو دیکھا ہے۔" (پہلا ورق)

اِن افسانوں کا مطالعہ اور سمپوزیم میں پیش کئے گئے نکات اور مقالوں میں زیرِ بحث لائے گئے خیالات دراصل حقیقت اور افسانے کے باہمی رشتے پر نہ صرف ایک جامع بحث کو پیش کرتے ہیں بلکہ دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں۔ بنیادی مسئلہ تو یہ ہے کہ جب ہر افسانہ نگار یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اپنے دور کی حقیقت کی ترجمانی کر رہا ہے تو پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان کے افسانے ایک دُوسرے کے افسانوں سے مختلف کیوں ہوتے ہیں کیا یہ فرق محض تکنیک اور اسلوب بیان کا ہے؟ یا وہ حقیقت کے ادراک اور زندگی کے شعور میں ایک دوسرے سے الگ ہیں جو افسانہ نگار ادب کے جمالیاتی پہلو پر زیادہ زور دیتا ہے وہ بھی اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس کے افسانے بھی زندگی کی حقیقت کے کسی پہلو کو کسی نہ کسی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ادب برائے ادب یا برائے حسن کے نظریئے میں بھی حقیقت کی عکاسی شامل ہے۔ بظاہر وہ زندگی سے فرار کر کے رومان کی تخلیق کرتے ہیں اور افسانے کو طلسماتی فضا، الفاظ کی شیشہ بازی اور مینا کاری اور رومان پرستی کے حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

ادب کے اس مفروروں نظریئے کے خلاف پریم چند نے بغاوت کی تھی اور افسانے کو زندگی کی دھڑکنوں کے قریب لا کھڑا کیا۔ پریم چند نے افسانے کو نہ صرف سماجی زندگی سے گہرے طور پر منسلک کر دیا بلکہ اس میں آدرشوں کی تکمیل کی خواہش بھی شامل کر دی۔ اُردو میں نئے افسانے کی تحریک صحیح معنی میں پریم چند کے افسانوں سے ہی شروع ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شروع شروع میں پریم چند کے افسانوں میں مقصدیت اور داستانی رنگ غالب رہا لیکن جلد ہی انہوں نے زندگی کی حقیقت کو ہم عصر ماحول سے اخذ کر کے اسے فنی مہارت سے پیش کرنا شروع کر دیا۔ ہندوستان کی قومی تحریک نے جس نئے سماجی شعور اور ذہن کی پرورش کی پریم چند نے اُسے اپنے افسانوں کی شکل میں ڈھال دیا۔ علی عباس حسینی، سدرشن، اوپندر ناتھ اشک سہیل عظیم آبادی وغیرہ پریم چند کی اس روایت کو لے کر آگے بڑھے۔ اس دور میں مقصدی اور اصلاحی افسانوں کے علاوہ رومانیت کے پروردہ ادب کو بھی جگہ ملی جسے سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، ل احمد اکبر آبادی، مجنوں گورکھپوری اور امتیاز علی تاج نے پروان چڑھایا۔

یہ تھی وہ ذہنی فضا جس میں نئے ادب کے رجحان کو تقویت ملی۔ اس نئے ادب ترقی پسند ادب کے نام سے موسوم کیا گیا۔ آدرش، حقیقت نگاری، رومانیت اور ن کا جمالیاتی احساس آپس میں خلط ملط بھی ہوئے۔ کرشن چندر، حیات اللہ انصاری حمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ کے افسانوں میں حقیقت اور رومان کے امتزاج کو بخوبی پیش کیا گیا ہے۔ غلام عباس نے اپنے مشہور افسانہ آنندی میں اس احساس کو اجتماعی سطح پر لا کر ایک ایسی فینٹیسی کو جنم دیا جو حقیقت سے بھی زیادہ حقیقی ہے لیکن انگارے کی اشاعت نے سماجی ناہمواری، معاشی عدم مساوات اور جنسی گھٹن سے پروردہ زندگی کے مسائل کو کچھ اس انداز سے پیش کیا کہ اُردو افسانہ جیسے ایک دم خواب سے چونک اُٹھا۔ بغاوت و تخریب کا شور اٹھا ادب برائے انقلاب کا نعرہ بلند ہوا۔ جس میں اختر حسین رائے پوری کی تحریروں اور افسانوں نے اہم رول ادا کیا۔ یہی وہ دور تھا جب مارکس اور فرائیڈ کے نظریات نے ادیبوں کے ذہن میں جگہ بنالی۔ مارکسیت کے زیرِ اثر سماجی حقیقت نگاری کو افسانے میں پیش کیا گیا اور ادب میں تبلیغی جذبہ زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ ان افسانوں میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کی تفصیلات اور جزئیات نگاری پر زیادہ زور دیا گیا۔ افسانوں میں ایسے کردار ملنے لگے جو زندگی میں جدوجہد کرتے ہیں۔ ایک خوش آئند مستقبل کی خواہش اور اس کے لئے مجاہدانہ جذبہ کی فراوانی ان افسانوں کا خاصہ بن گئی۔ کردار، انسان کی خوبیوں اور کمیوں کا مجسمہ نہیں بلکہ آدرش کا پیکر بن گیا۔ پروپیگنڈہ، نعرہ بازی اور غیر ضروری تفصیلات کی حامل ان کہانیوں میں عام طور پر محاسن اور تخلیقی اشاریت کا فقدان تھا۔ اصل افسانہ سیاست، سماج یا معاشی تنظیم کے بارے میں نہیں لکھا جاتا بلکہ اس کا مرکزی موضوع ہوتا ہے فرد۔ فرد جو کبھی اکیلا ہوتا ہے اور کبھی دوسرے لوگوں کے ساتھ گروہ میں۔ فرد ہی اس خارجی دنیا سے متاثر ہوتا ہے اور خارجی دنیا کو متاثر کرتا ہے اس متاثر ہونے یا متاثر کرنے کے فرق پر ہی شاید ترقی پسند افسانے اور جدید افسانے کی تقسیم کو سمجھا جا سکتا ہے۔ فرد اگر متاثر ہی ہوتا ہے اور متاثر نہیں کرتا تو وہ وبائے عام میں مرتا ہے لیکن اگر وہ محض متاثر کرنا چاہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ متاثر نہیں ہو رہا تو وہ شہید کا رتبہ پا سکتا ہے سچی ٹریجڈی ان دونوں کی کشمکش میں جنم لیتی ہے۔ اب یہ ساری کیفیت اتنی مضمر اور خیز معلوم ہوتی ہے کہ اسے لغو اور لایعنی قرار دیا جانے لگا۔

فرائیڈ کے نظریات اس لغو اور لایعنی کیفیت کو مزید تقویت بخشتے ہیں ان نظریات کے تحت افسانے میں جنسی اور لاشعوری حقیقت کو پیش کیا گیا۔ عصمت چغتائی نے "ملم ماٹر" میں جنسی گھٹن اور کجروی کو مخصوص منفرد انداز میں پیش کیا۔ اس روایت کو ماجدہ مسرور، خدیجہ مستور، جیلانی بانو اور واجدہ تبسم نے آگے بڑھایا۔ جس عسکری جو فرانسیسی فطرت نگار اور بعد میں سمبالسٹ ادب سے متاثر ہوئے، لاشعور کی اس گہری دنیا کے عکاس ہیں۔ عصمت چغتائی بعد میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر سماجی حقیقت نگاری پر زیادہ زور دینے لگی۔ ممتاز مفتی نے لاشعوری حرکات کا مطالعہ اور تجزیہ نفسیاتی اور علمی نقطۂ نظر سے پیش کیا۔ اُن کے افسانے میں کوالف مرض کی صورت زیادہ نمایاں ہے۔

لیکن منٹو ہی وہ تنہا افسانہ نگار تھا جس نے افسانے میں ایک جاندار اور منفرد طرز کی بنا ڈالی۔ اور سماجی و معاشی اور جنسی مسائل کو ایک ایسی اکائی کے رُوپ میں پیش کیا

جس کی تفسیر فرائیڈ اور مارکس کے نظریات کی اصطلاحات میں نہیں کی جا سکتی۔ منٹو محض ایک روایت شکن ادیب ہی نہیں تھا بلکہ اس کی تحریریں گہرے انسانی جذبات اور خیر و شر میں جانبدارانہ مداخلت کی حامل تھیں۔ فرائیڈ کے نظریے کے زیر اثر تکنیک کے نئے نئے تجربے ہوئے۔ حسن عسکری، احمد علی، قرۃ العین حیدر اور کسی حد تک عزیز احمد نے تحلیل نفسی خواب شعور کے بہاؤ، آزاد تلازمہ خیال، لاشعوری محرکات کے مرکب سُر ریلسٹ طرز کے افسانے لکھے۔ جدید افسانہ کاسکا سے متاثر ہے لیکن اس دور میں بھی احمد علی کے افسانوں میں کاسکائی ماحول کی تصویر کشی ملتی ہے۔ اُن کے افسانوں میں فلسفیانہ گہرائی گہری رمزیت، اور ماورائے حقیقت کی عکاسی، مشرقی مزاج اور مغربی اسلوب خصوصیت رکھتے ہیں۔ درحقیقت جدید افسانہ احمد علی کے افسانوی ورثہ سے انکار نہیں کر سکتا ایک اور افسانہ نگار جس نے شعور کے بہاؤ کی تکنیک میں اور برگساں کے تصورات سے متاثر ہو کر حیات و کائنات اور انسانی تہذیب و معاشرے کا فلسفیاتی شعور پیش کیا ہے وہ ہے قرۃ العین حیدر ——

افسانہ نگاروں کی دوسری نسل اس پہلی نسل کے افسانہ نگاروں کی روایت کو ہی لے کر آگے بڑھی۔ یہ نسل دو نسلوں کی درمیانی کڑی ہے۔ انور عظیم، رام لعل، اشفاق احمد، غیاث احمد گدی وغیرہ میں ترقی پسند روایات کی پختگی اور انحطاط اور جدیدیت کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ آزادی کے بعد جو نئی نسل سامنے آئی اور تقسیم وطن اور فسادات کے ہنگاموں سے اُبھر کر نکلی اس کے لئے ترقی پسند تحریک بے معنی ہی نہیں بلکہ سدِ راہ ثابت ہوئی۔ ترقی پسند تحریک لبرل انسانیت پرست عناصر سے عاری ہو کر شعوری طور پر اشتمالی سیاست کی روزمرہ بدلتی ہوئی پالیسی کی غلام ہو گئی اس کا فائدہ ان لوگوں نے اٹھایا جو ادب کو ہر قسم کی Commitment کے خلاف خالصتاً جمالیاتی تخلیق سمجھتے ہیں۔ ان کا نعرہ تھا کہ ادب علاج الغرباء نہیں۔ ازالہ سحر کے بعد ادیب کئی گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ اشتمالیت کے دشمن، انسانیت پرستی کے لبرل علمبردار اور فن برائے فن کے پیروکار جدید افسانہ نگاروں میں آخری رجحان زیادہ تر نمایاں ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سیاست سے کنارہ کش ہو کر ہر قسم کے سیاسی خیال کے لئے غیر جانبدار ہو گیا اس لئے آمریت یا جمہوریت، اشتمالیت یا فسطائیت بے معنی اصطلاحیں ہیں۔ جدیدیت کے نام پر زندگی کی لغویت فرد کی تنہائی دہشت ذات کی تلاش یا گم شدگی اور اقدار کے بحران کو افسانوں کا موضوع بنایا گیا اور اس کا انجام یہ ہوا کہ جدید افسانہ نگار کہنے لگے کہ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کسی ادیب کا سیاسی نظریہ کیا ہے؟ وہ فرقہ پرست ہے یا قوم پرست، اشتمالی نظریئے کا حامی ہے یا فسطائیت کا یا جمہوریت کا علمبردار۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کے افسانوں میں ادبیت موجود ہے یا نہیں۔ اس نظریے کا بنیادی خاصا یہ ہے کہ یہ موضوع اور مواد اور فارم اور اسلوب کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیتے ہیں (حالانکہ ان کا کہنا ہے کہ ہیئت اور موضوع کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا) سوال اٹھتا ہے کہ کیا موضوع اور مواد کا تعلق محض ادبیت سے ہے۔ زندگی کے گوناگوں پہلوؤوں اور اس کی حقیقت سے نہیں۔ اگر زندگی کے کسی بھی پہلو سے بھی ہے تو کیا اس کو سماجی، سیاسی یا معاشی ماحول سے الگ کر کے محض تجربہ گاہوں میں ہی دیکھا جا سکتا ہے کیا انسان کی نفسیات پر اس ماحول اور خارجی حقائق کا اثر نہیں پڑتا اور کیا ادب محض ہیئت یا اسلوب کا ہی مسئلہ ہے۔ دراصل ایسی جدیدیت ادب برائے ادب کی ہی بدلی ہوئی شکل ہے۔ یہی باعث ہے کہ جو ادیب اس نوع کی جدیدیت کے نام پر افسانوں کی تخلیق کرتے ہیں وہ انجام کا حسن کاری اور ایسی علامت پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں جو حقیقت کو آشکار کرنے کے بجائے اس کی پردہ داری کرنے کا باعث بنتی ہے۔ چند جدید افسانے جنہیں علامتی افسانے قرار دیا گیا ہے، احمد علی کی نہیں سجاد حیدر یلدرم کی یاد دلاتے ہیں۔ دیویندر ستیارتھی کے حالیہ افسانے، سریندر پرکاش کا افسانہ "تلقارمس" اسی نوعیت کے حامل ہیں۔ اس کے برعکس بلراج مین را کی رمزیت میں خارجی زندگی کی حقیقت کے تہہ در تہہ پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش ملتی ہے۔

آج اُردو افسانہ انگریزی کے ایک محاورے کے مطابق پورا دائرہ گھوم گیا ہے یعنی جس حسن پرستی اور طلسماتی خط اور رومانیت کے خلاف افسانے نے جہاد کیا تھا آج افسانہ اسی رُومانیت، حُسن پرستی اور ہیئت نگاری اور طلسماتی ماحول کو رمزیت اور تجریدیت کے نام پر پیش کر رہا ہے اور افسانے میں تجریدیت کے رجحان کا ذکر بھی بہت سے افسانہ نگاروں نے کتاب میں شامل سمپوزیم میں کیا ہے۔ کم از کم میری نظر میں اُردو میں کوئی ایسا افسانہ نہیں گزرا جو تجریدی ہو۔

۱۹۵۵ء کے آس پاس اُردو افسانے میں جو تبدیلیاں رُونما ہوئیں وہ نئے فکر و احساس کی ترجمانی کرتی ہیں لیکن ان افسانوں میں ترقی پسند فکر کی کٹر پرستی سے انحراف ہی نہیں بلکہ ایک معنی میں مراجعت بھی ہے۔ کچھ افسانہ نگار جمال پرستوں اور گوشہ نشینوں کی زبان میں زندگی کی حقیقت سے فرار کرنے کے لئے تاویلیں پیش کرنے لگے وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس سوال ہیں، جواب نہیں لیکن یہ صحیح نہیں، ان کے پاس جواب ہیں وہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ آمریت خونریزی جنگ، فرقہ وارانہ فسادات، جابر اور نااہل نوکر شاہی سرمایہ پرستی نفع خوری، کالا بازار وغیرہ انسان کی بہت سی پریشانیوں ذلتوں اور حیوانیت کا باعث ہیں۔ کیونکہ وہ ان مسائل کا سامنا نہیں کرنا چاہتے۔ حالانکہ وہ اپنے مقالوں میں جدید دور میں ٹکنالوجی اور منظم اداروں کے مضر اثرات کا بار بار ذکر کرتے ہیں جس کے باعث انسان "انسانیت" کے حقائق سے عاری ہو رہا ہے لیکن جب وہ کسی افسانے کی تخلیق کرتے ہیں یہ سب کچھ اس میں غائب ہو جاتا ہے اور رہ جاتی ہے ذات کی تلاش اس لئے وہ سوال کرتے ہیں اور جواب سے کتراتے ہیں۔ ہر انقلاب آمریت کو جنم دیتا

اس لئے موجودہ آمریت کو برداشت کرتے جاؤ۔ یہ نہیں کہ ہر آمریت کے خلاف نبرد آزما ہو جاؤ اور اسے مستقل حیثیت اختیار نہ کرنے دو، شہید ہو جاؤ، شکست قبول نہ کرو لیکن یہ سارے مسائل غیر ادبی ہیں۔ فن برائے فن کی یہ بدترین صورت ہے جس غیر ادبی مسئلہ نہیں، دہشت غیر ادبی مسئلہ نہیں۔ ذات کی تلاش غیر ادبی ہے نہ بھوک، قحط، جنگ، افلاس یا انقلاب۔ افسانے کی تخلیق میں سماجیات، نفسیات، تواریخ، سائنس، فلسفہ، فنون لطیفہ سب سے استفادہ کیا جا سکتا ہے خالص ادبی افسانہ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ افسانہ نگار یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خالص ادبی افسانے کی تخلیق کرتا ہے۔ وہ کسی ایک افسانے کی نشاندہی کرے جو خالصتاً ادبی ہو اور جس کی پرکھ خالصتاً ادبی اصولوں پر ہی کی جا سکے (ویسے یہ خالص ادبی اصول کیا ہوتے ہیں۔)

ان تمام خامیوں کے باوجود نئے افسانہ نگاروں نے گزشتہ پندرہ برسوں میں افسانے کو نئی وسعت دی ہے۔ فنی طور پر ان میں پختگی آئی ہے اور شگفتگی کا احساس ملتا ہے۔ انہوں نے فطرت پرست نقطۂ نظر کے خلاف شخصیت کے پیچیدہ اور شیدہ عناصر کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں میں انفرادی احساسات نفسیاتی ردِ عمل کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ کردار نگاری میں بھی گہرائی ملتی ہے جدید افسانے میں سب سے زیادہ نمایاں رجحان سلاست نگاری کا ہے۔ کتاب کے زیر نظر سے میں شامل شہزاد منظر نے اپنے مضمون "افسانے میں رمز و علامت کا استعمال" اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ایک اہم مضمون کر چکے ہیں جس کا حوالہ زیر تبصرہ مضمون میں بھی دیا گیا ہے۔ شہزاد منظر رقم طراز ہیں "یہ غلط ہے کہ افسانے میں رمز نگاری آج کا مقبول رجحان یا ادبی خصوصیت ہے حقیقت ہے کہ برصغیر کی آزادی سے بہت قبل کئی افسانہ نگاروں نے علامتی افسانے لکھنے کی کوشش کی ہے بعض لوگوں کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ان افسانہ نگاروں میں احمد علی بعد کرشن چندر کا نام آتا ہے۔ کرشن چندر اردو کا سب سے بڑا تجربہ پسند افسانہ نگار جس نے مغرب کے مختلف ادبی رجحانات کا غائر مطالعہ کیا ہے اور اپنے مختلف ادوار ان سے متاثر ہو کر افسانے بھی لکھے ہیں لیکن وہ کسی ایک متعلقے پر کسی ایک رجحان سے ٹر ہو کر زیادہ دیر تک ٹھہرا نہیں ہے اس کا ادبی اور فنی سفر اور شعوری ارتقاء جاری ہے۔ بقول ممتاز شیریں "ان کے لئے کوئی نیا تکنیکی یا کسی اور طرح کا تجربہ کرنا کھیل سا تھا۔ اور انہوں نے ایک سریلی تصویر بھی کھینچی تھی اور ایک افسانے میں الفاظ کو بدل کر زبان بنانے کا صوتی تجربہ بھی کیا تھا۔ صرف آنا ہی نہیں بلکہ انٹی پلاٹ کے عارضی تصور ت افسانے میں نقطۂ عروج اور کلائمکس کے بغیر "پل کے سائے میں" جیسے افسانے لکھے ادھ کا لیچہ" "بت جاگتے ہیں" "پانی کا درخت" جیسے تمثیلی و علامتی افسانے بھی۔ ان افسانوں ما تاثر ہی نہیں شدت تاثر بھی موجود ہے۔ اس نے افسانے کے فارم اور تکنیک میں نئے اور

انوکھے تجربے ضرور کئے لیکن اس کا تجربہ محض تجربہ نہیں تھا۔ اس نے اگر اپنے افسانوں کے فارم اور تکنیک میں کوئی تجربہ کیا بھی تو صرف اپنے مافی الضمیر اور موضوع کے فن کارانہ اور مؤثر اظہار کے لئے۔ جدید افسانہ نگاروں کی طرح صرف قارئین کو چند لمحوں کے لئے چونکانے کی غرض سے نہیں۔"

علامتی افسانوں کے ضمن میں ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ صرف علامتی افسانہ ہی جدید افسانہ نہیں، دوسرے یہ کہ علامتی افسانے صرف آج کی ہی ادبی خصوصیت نہیں۔ اس سے قبل کرشن چندر کے علاوہ احمد علی "قید خانہ" "ہمارا کمرہ" اور "موت سے پہلے" اور ممتاز شیریں "میگھ ملہار" جیسے اعلیٰ افسانوں کی تخلیق کر چکے ہیں۔ جدید دور میں انتظار حسین اور سجاد اور بلراج کومل اور کمار پاشی نے معنی خیز علامتی افسانوں میں قابل قدر اضافے کئے ہیں۔ میں بلراج کومل کی اس رائے سے متفق ہوں کہ "افسانہ بہر حال افسانہ ہوتا ہے۔ تجریدی یا تمثیلی یا علامتی محض الفاظ ہیں۔ ان کے استعمال سے کسی افسانے کا کردار تخلیقی سطح پر بلند نہیں ہو سکتا۔ اردو کے اکثر نئے ادیب محض الفاظ کے اسیر ہیں۔ ہر اچھا افسانہ انسانی تجربے کے کسی ایک پہلو کا عزیز ترین گوشہ پیش کرتا ہے اور پڑھنے والا اس عزیز ترین گوشے کو پہچاننے کے بعد افسانے کی گہرائیوں میں اترتا جاتا ہے تجریدی اور علامتی محض فیشن ساز تنقید کے Catch Words ہیں۔

(سمپوزیم میں سے)

"کتاب" کے افسانہ نمبر میں افسانے سے متعلق کچھ دیگر مسائل پر بھی بحث کی گئی ہے۔ کیا اردو کا موجودہ عہد مختصر افسانہ کا عہد ہے؟ مختصر افسانہ سالوں میں اس قدر مقبول کیوں ہے؟ مختصر افسانہ کی اس قدر مقبولیت کے باوجود افسانوی مجموعے کم تعداد میں کیوں شائع ہوتے ہیں افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے کے باوجود لوگ افسانوی مجموعے کیوں نہیں خریدتے! اس دور کو مختصر افسانے کا دور کہا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود افسانوی مجموعے پہلے کے مقابلے میں کم تعداد میں شائع ہوتے ہیں اور جو شائع بھی ہوتے ہیں وہ زیادہ تر پبلشروں کی الماریوں کی زینت بنے رہتے ہیں۔ اس صورت حال کے لئے کیا ناشر ذمہ دار ہے یا قاری یا آج کے افسانہ کی وہ کیفیت جس میں قاری اپنے دل کی بات کم اور مصنف کا من زیادہ نظر آتا ہے۔

یہ سوالات بڑے اہم ہیں۔ درحقیقت ان کا تعلق محض تجارتی پہلو سے نہیں بلکہ تخلیقی پہلو سے بھی ہے۔ اقدار کے خلاء میں زندگی کی حقیقتوں سے کنارہ کش ہو کر کوئی بھی افسانہ زندہ نہیں رہ سکتا اور قارئین اس سے اپنی ذہنی وابستگی قائم نہیں کر سکتے۔ سوال صرف ابلاغ تک محدود نہیں بلکہ بنیادی طور پر اقدار کی تلاش اور فلسفہ حیات سے تعلق ہے۔ زندگی کتنی بھی لغو اور لایعنی کیوں نہ ہو پھر بھی اہم ہے کیونکہ وہ زندگی ہے اور اس میں معنویت کی تلاش تخلیقی عمل کا ایک اہم فریضہ ہے۔ افسانہ نگار کا فریضہ محض تجربات اور احساسات میں گہرائی اور بصیرت عطا کرنا ہی نہیں بلکہ ان کی اہمیت اور معنویت کے دائرے میں اقدار حیات کو تلاش کرنا اور زندگی سے وابستگی قائم کرنا ہے کیونکہ انسان سے پرے اور بالاتر کسی افسانے کی تخلیق کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اگر کوئی ایسا افسانہ تخلیق بھی ہوتا ہے تو وہ جگنو کی لمحاتی چمک کے سوا اور کوئی روشنی عطا نہیں کر سکتا۔

**ادب اور تنقید**:۔ اسلوب احمد انصاری ایسے معلّم۔ ناقد ہیں جن کے تنقیدی مقالے ادب کے نئے طالب علم نظر انداز نہیں کر سکتے۔

"ادب اور تنقید" اسلوب احمد انصاری کے سترہ مقالوں کا مجموعہ ہے جسے سنگم پبلشرز الہ آباد نے شائع کیا ہے، قیمت آٹھ روپے ہے۔

"ادب اور تنقید" کے ناقد کے تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلوب صاحب انگریزی زبان و ادب کے معروف اُستاد ہیں، انگریزی میں ولیم ہلیک پران کی کتاب اردو تنقید کو بھی روشنی عطا کرتی ہے

"ادب اور تنقید" کے مضامین کے بعض موضوعات بہت اہم اور قابلِ تجزیہ ہیں مثلاً "شعری صداقت" "تنقید اور تخلیق" "اور نثر کا آہنگ" ان موضوعات پر جو مضامین مجموعے میں شریک ہیں وہ دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔ اسلوب احمد انصاری نے کئی اہم پہلوؤں کی وضاحت کی ہے اور بہت سے پہلوؤں کی طرف معانی خیز اشارے کئے ہیں۔ "غزل میں فراق کا کارنامہ" "علی گڑھ اور رومانی نثر کے معمار" اور "بیدی کا فن" اہم مضامین ہیں۔

پیش لفظ میں اسلوب صاحب نے تحریر فرمایا ہے :۔

"شعر و ادب کے تجزیئے سے ہمیں جو عرفان حاصل ہوتا ہے اسے کسی فارمولے کے ذریعے بیان کرنا ممکن نہیں البتہ اس کے اثرات پڑھنے والے کے ادراک کی ایک نئی، صالح اور محکم تنظیم کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں"

اس خیال سے جس نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے وہ اس دور میں بہت اہم ہے۔ اس طرح سوچنے والوں کی کمی ہے اس حقیقت کے باوجود انہوں نے اپنے ابتدائی مضامین میں جو کلیے اور فارمولے بنائے ہیں۔ اپنی عملی تنقید کی بنیاد اُن ہی پر رکھی ہے۔ اکثر جب تجزیئے کے عرفان کا احساس نہیں ہوتا اور ناقد کے وجدان کی روشنی نظر نہیں آتی تو ایک خلش سی محسوس ہوتی ہے۔

اگرچہ اسلوب احمد انصاری کا مطالعہ وسیع ہے لیکن مجھے اکثر محسوس ہوا کہ ضروری اور غیر ضروری حوالوں اور اصطلاحوں کے ساتھ وہ بیسویں صدی کی تحریکوں اور اس صدی کے بنیادی رجحانات کی خبر نہیں دیتے، انگریزی کے ایسے مستند معلم کو ایک ایسا ذریعہ بن جانا چاہئے کہ آگے چل کر اس کی حیثیت ایک سرچشمے کی ہو جائے

"ادب کی قدریں" کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھا تاکہ ناقد کا بنیادی نقطۂ نظر اور اس کے بنیادی رجحان کو سمجھ سکوں۔ ادب کے بارے میں طالسطائی اور شوسکی کے خیالات کی تفصیل میرے نزدیک کئی لحاظ سے غیر ضروری ہے۔ ادب کی بنیادی قدروں سے متعلق ان فنکاروں کے خیالات قطعی، اتنے اہم نہیں کہ ان کا ذکر اس طرح کیا جائے اور اُن کے نظریوں کو معتبر سمجھا جائے۔ اسلوب صاحب حسن اور عظمت اور ان کے ساتھ معروضیت کی بات کرنا چاہتے تھے کاش وہ اس بحث کو زیادہ واضح دلچسپ اور فکر انگیز بنا سکتے۔ ناقد کا اپنا زاویہ نگاہ گم ہو گیا ہے اور یہی ایسے مضامین کی ٹریجڈی ہے اکثر مضامین میں چند آخری جملوں میں دوسروں کے خیالات اور حوالوں کے درمیان ناقد اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی ایک ناکام کوشش کرتا ہے۔

عملی تنقید میں اسلوب احمد انصاری کے وہ جملے جو پڑھنے والوں سے واقعی بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں بامعانی خیز سرگوشی نہیں کرتے۔

"غالب بہت کچھ پرانے ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ نئے ہیں"

"اقبال کی غزلیں ارضی محبت کے ترانے کب ہیں وہ تو اس عظیم مفکر کے آفاقی پیغام کی اشاعت کا صرف ایک ذریعہ ہیں"

"فراق کی غزلیں اُن کے انفرادی جذبات سے بوجھل ہیں"

"رشید صاحب کی ظرافت عام طور پر وزن دار اور خیال انگیز ہوتی ہے لیکن بسا اوقات وہ اپنی مزاحیہ غایت کی طرف مکمل طور پر اشارہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس سے نہ صرف شدید قسم کا ابہام پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ بھی گمان گزرتا ہے کہ غالباً وہ اس خاص نمونے کے مزاحیہ امکانات کو پوری طرح گرفت میں نہیں لا سکے ہیں"

"معیار اور فن دونوں کے اعتبار سے اگر اُردو کے دو بڑے افسانہ نگاروں کا نام لیا جائے تو وہ بلاشبہ پریم چند اور راجندر سنگھ بیدی ہی ہیں"

منٹو اور کرشن چندر، عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی، بیدی سے (مواد اور فن دونوں کے پیش نظر) کتنے "چھوٹے" ہیں۔ یہ بھی معلوم ہو جاتا تو اچھا تھا۔

ان باتوں کے باوجود اس کتاب میں مجھے ایک انتہائی سنجیدہ ناقد ملا ہے جس کی ہر خبر پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ادب اور تنقید کئی اعتبار سے ایک اہم تنقیدی کتاب ہے۔ امید ہے کہ ادب کے چاہنے والے اسے ضرور پسند کریں گے۔

**گلوب** اس قابلِ قدر مجموعے کا کوئی اور خوبصورت نام رکھا جا سکتا تھا اس لئے کہ یہ نئے شعری تجربوں کا ایک اچھا انتخاب ہے۔ میرے نزدیک اس نام سے اس اہم انتخاب کی اہمیت واضح نہیں ہوتی۔ اس میں اُردو کے ممتاز شعراء کے کلام کا عمدہ انتخاب ہے ہر شاعر کا ایک ہلکا تعارف بھی شامل ہے۔ سید احمد شمیم اور شمس فریدی نے بڑی محنت کی ہے اور اس بات کی ہر ممکن کوشش کی ہے کہ نمائندہ نظموں کا انتخاب کیا جائے

اس مجموعے میں بہت سی بکھری ہوئی نظمیں یکجا ہو گئی ہیں، ایک ساتھ اتنے شاعروں کے کلام کو پڑھتے ہوئے جدید اُردو نظم کے کئی رجحانات بہت واضح ہو جاتے ہیں۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے مگٹ اپ خوبصورت ہے۔ ۱۸۶ صفحات کی ۲۱ خوبصورت کتاب کی قیمت پانچ روپے ہے جسے اُردو سرکل، دین محمد ہاؤس جمشید پور نے شائع کیا ہے۔ (شکیل الرحمان)

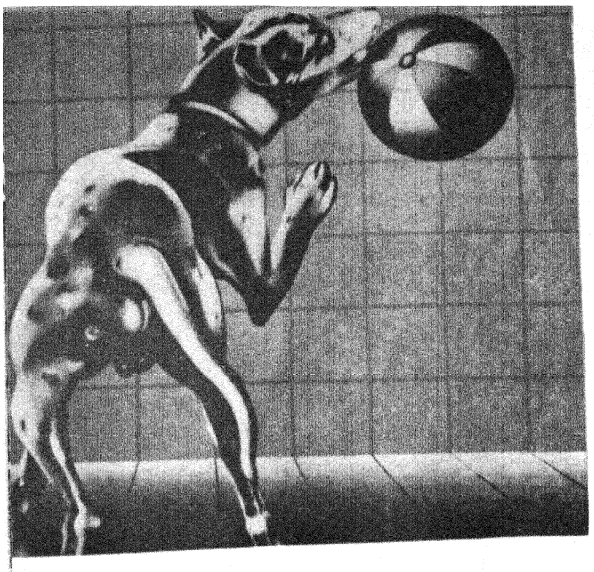

دوسری جنگ عظیم کے بعد سائنس اور ٹکنالوجی میں انقلاب آفریں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ میں بھی بڑی دُور رس تبدیلیاں آئی ہیں۔ مصوری، تراشی اور مجسمہ سازی میں دنیا کے مختلف ممالک میں نئے نئے تجربے کئے گئے ہیں۔ یہ تجربے مقامی اور اپنی قومی خصوصیت کے حامل ہونے کے باوصف آفاقی اقدار کے حامل بھی ہیں۔

مصوری کے جدید رجحانات سے واقف کرانے کے لئے دنیا کے مختلف ملکوں میں مصوری کی نمائش کی جاتی ہے جس میں دُنیا کے بہت سے فن کار حصہ لیتے ہیں۔ ایسی نمائش ہندوستان میں پہلی بار ۱۹۶۸ء میں منعقد کی گئی تھی۔ تین سال بعد (اسی لئے اس نمائش کو ٹرینالے کا نام دیا گیا ہے) جنوری ۱۹۷۱ء میں نئی دہلی میں دوسری نمائش کی گئی ہے جس میں ۴۷ ملکوں کے ۳۶۰ فن کاروں نے حصہ لیا ہے ہم میں اُن کے ۸۰۰ شاہکار پیش کئے گئے ہیں۔

ایسی نمائشیں تہذیبی لین دین اور بین اقوامی مفاہمت میں مدد دیتی ہیں

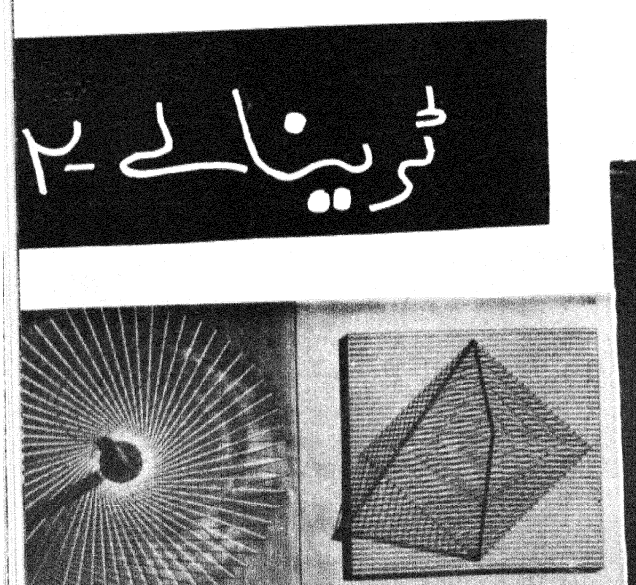

# ٹرینالے ۔۲





تصویر (اوپر) مغربی جرمنی کے ہنز نیگل کا شاہکار

(دائیں طرف) "سیلف پورٹریٹ عمل:۔ جرزی پینک (پولینڈ)

(بائیں طرف) فرانس کے یووارال جین پیری کا پلاسٹک اور تاروں سے بنایا شاہ کار



Vol. 29 No. 9 AJKAL (Monthly) April 1971

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55

d. No. D-509

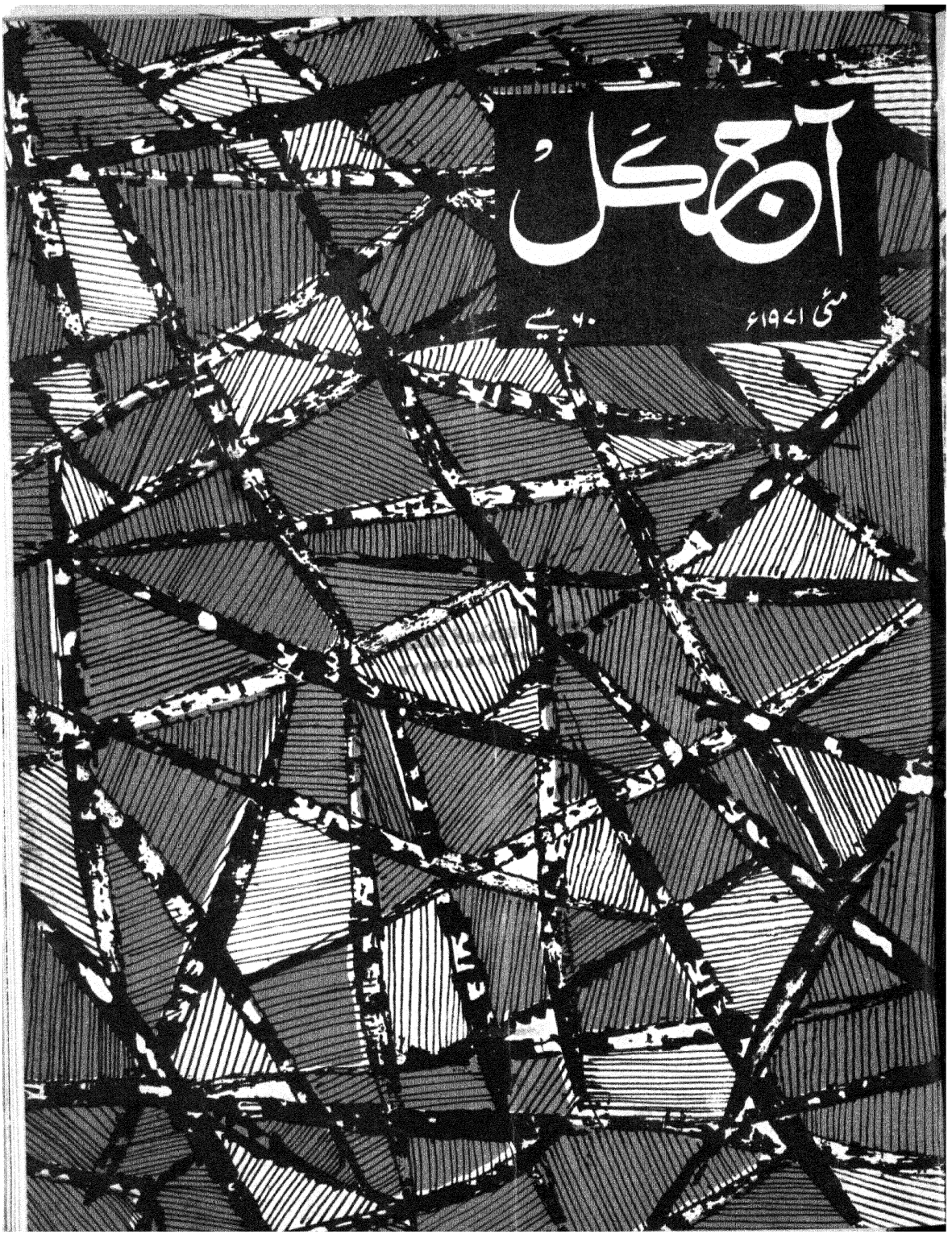
آجکل
مئی ۱۹۷۱ء
۶۰ پیسے



پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم (۱۹۷۱ء-۱۹۰۶ء)

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

# آج کل

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

*

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۲۹ شمارہ ۱۰
مئی ۱۹۷۱ء
بیساکھ جیٹھ شک سمت ۱۸۹۲

سرورق: عمل مدن موہن ملک

شرح چندہ
سالانہ: ہندوستان میں: سات روپے
دیگر ممالک سے: ۱۰ شلنگ ۶ پینس یا ڈیڑھ ڈالر
فی پرچہ: ہندوستان میں: ۶۰ پیسے
دیگر ممالک سے: ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

## ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ملاحظات | | ۲ |
| آج (نظم) غزل | سکندر علی وجد | ۳ |
| غبارِ کارواں (۱۵) | عرش ملسیانی | ۴ |
| غزل | مخمور سعیدی | ۱۱ |
| عبدالقادر سروری | خواجہ احمد فاروقی | ۱۲ |
| غزل | مظفر حنفی | ۱۴ |
| ایک درخت کا قتل (کہانی) | اختر اورینوی | ۱۵ |
| غزل | مغیث الدین فریدی | ۱۷ |
| تبصرہ نگاری کا فن | شمس الرحمن فاروقی | ۱۸ |
| انا کا پرندہ (نظم) | حرمت الاکرام | ۲۲ |
| ایک روش | علی جواد زیدی | ۲۳ |
| زندگی کا رقص (کہانی) | م۔م راجندر | ۲۹ |
| رباعیات | امیر چند بہار | ۳۱ |
| جس محلے میں ہمارا گھر ہے | احمد جمال پاشا | ۳۳ |
| غزلیں | ظفر ادیب، عبدالحمید حمید عظیم آبادی، دلِ ایوبی | ۳۵ |
| مقالہ کیا ہے؟ | محمد حسنین | ۳۶ |
| پنڈت نہرو (نظم) | روشن پٹیالوی | ۴۱ |
| دو ہاتھ پانچ کھیت (پنجابی کہانی) | بالی چوپڑہ | ۴۲ |
| چھٹی حس | سیوک شرما | ۴۴ |


مضامین اور ترسیلِ زر کا پتہ
شہباز حسین ایڈیٹر آج کل (اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

شائع کردہ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

پانچویں لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند نے کہا کہ عام انتخابات نے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ جمہوریت میں پائیدار سیاسی اقتدار کا صرف ایک ہی منبع ہے اور وہ ہیں عوام۔ انتخابات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ لوگوں کو اپنے پر اور جمہوریت کے عمل پر کتنا اعتماد ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے دیش واسیوں نے اپنے فیصلے کا اظہار کر دیا ہے۔ رائے دہندگی کے حق کے استعمال کے ذریعے انہوں نے اپنی خود مختاری کا بھرپور طریقے سے اظہار کیا ہے۔ انہوں نے تبدیلی کے لئے بہت موثر فیصلہ دیا ہے ایسی پرامن تبدیلی کے لئے جس کے ذریعے تیزی کے ساتھ ملک میں پائی جانے والی غربت کا خاتمہ کیا جا سکے۔

شری گری نے کہا کہ جلد ہی سرکار رائے دہندگان کے فیصلے پر مبنی پالیسیاں اور پروگرام بنائے گی۔ جو تھے منصوبے کا وسط مدتی جائزہ لیا جائے گا۔ اس جائزے سے اس کا اندازہ ممکن ہو سکے گا کہ منصوبے کو کیا شکل دی جائے جس سے کہ اقتصادی ترقی کے لئے سرمایہ کاری کی رفتار بڑھ سکے اور اس کا موثر استعمال کیا جا سکے ساتھ ہی ساتھ سرکار یہ بھی فیصلہ کر سکے گی کہ ترقیاتی پروگراموں کو کس طرح مضبوط بنایا جائے تاکہ بے روزگاری کے مسئلے کے حل میں مدد مل سکے۔ - - - - - - - - - - - -

ایک وسیع پروگرام پر آئندہ مالی سال سے کام شروع ہوگا جو کھیتی کی پیداوار بڑھانے کی اسکیموں سے متعلق ہوگا اور اس کے مطابق سنچائی کے چھوٹے وسیلوں کی تعمیر اور مرمت اور پینے کا پانی مہیا کرنے اور سڑکوں کی تعمیر ایسی بنیادی سہولتوں کو بھی فروغ دیا جائے گا۔ تعلیم یافتہ بیروزگاروں کو روزگار دلانے کے لئے مخصوصی کوششیں کی جائیں گی۔ راشٹرپتی نے کہا کہ سرکار دیہی علاقوں میں بجلی فراہم کرنے کے کام کو اور بالخصوص سنچائی کے لئے بجلی کے استعمال کو خصوصی اہمیت دیتی ہے۔ گاؤں میں بجلی پہنچانے کے پروگراموں میں تیزی لائی گئی ہے۔ اس پنچسالہ منصوبے کے پہلے برس میں ۲ لاکھ ۶۶ ہزار پمپنگ سیٹوں کے لئے بجلی مہیا کی گئی تھی۔ رواں سال میں یہ کام اور بھی تیزی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ گاؤں کو بجلی پہنچانے کی کارپوریشن نے لگ بھگ ستر کروڑ روپے کی اسکیمیں منظور کر کے اپنے کام کو شروع کر دیا ہے اس پروگرام کو اور بھی تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا جائے گا۔

شری گری نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ سرکار کو اچھی طرح معلوم ہے کہ شہروں میں غریب لوگ کس قدر ناقابل برداشت حالات میں رہ رہے ہیں۔ مالی اور سماجی اصلاحات کے پروگراموں کی فہرست میں گندی بستیوں کی صفائی اور ان کے سدھار کو خصوصی اہمیت دی جائے گی۔ اور ان کے لئے سرکار زیادہ سے زیادہ وسائل فراہم کرنے کی کوشش کرے گی۔ حال ہی میں تعمیر مکانات اور شہری ترقی کی مالیاتی کارپوریشن قائم کی گئی ہے اور اس کے ذریعے بڑے شہروں اور شہری علاقوں میں مکانات کی سہولتوں میں اضافہ ہو سکے گا۔

راشٹرپتی نے کہا کہ ملک کے کچھ حصوں میں فرقہ وارانہ کشیدگی کا جاری رہنا اور وقتاً فوقتاً تشدد کا بھڑک اٹھنا ہمارے سیکولرازم اور جمہوریت نیز ہماری تہذیب زندگی کی بنیادی اقدار کے لئے ایک خطرہ ہے حکومت نے اس خطرے پر قابو پانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ قومی وجود کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس مسئلے کو قومی اہمیت کا کام تصور کیا جائے۔

راشٹرپتی نے کہا کہ والیان ریاست کے وظائف اور مراعات موروثی آئینی اقدامات کے ذریعے ختم کرنے کے حکومت کے عزم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے

شری گری نے کہا کہ ہمارے اردگرد وسیع تر دنیا میں امید و یاس دونوں موجود ہیں۔ مغربی اور مشرقی یورپ کے درمیان کشیدگی میں کمی ہوئی ہے۔ ہم وفاقی جمہوریہ جرمنی اور روس و پولینڈ کی حکومتوں کے درمیان طے پائے معاہدے کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

راشٹرپتی نے کہا کہ انڈوچائنا کی صورت حال اور زیادہ بگڑ گئی ہے۔ لاؤس اور کمبوڈیا میں جنگ مسلسل جاری ہے اس مسئلے کا حل جنیوا معاہدے کے دائرے کے اندر پرامن اور گفت و شنید کے ذریعے تصفیہ میں پنہاں ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ بہترین حل یہ ہوگا کہ تمام بڑی بڑی طاقتیں اور اس خطے میں دلچسپی رکھنے والے دیگر حلقے ایک بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کریں۔

مغربی ایشیا میں جنگ بندی کے باوجود بے چینی پائی جاتی ہے میری حکومت امید رکھتی ہے کہ سکیورٹی کونسل کی ۲۲ نومبر ۱۹۶۷ء کی قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنی دلی خواہش کے اظہار کے طور پر متحدہ عرب جمہوریہ نے حال ہی میں جو متعدد اقدامات کئے ہیں ان کا مثبت جواب ملے گا۔

راشٹرپتی نے کہا کہ میری حکومت بدستور غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل جاری رکھے گی جب بھی پرامن اور خود مختار حکومتوں کی آزادی کو خطرہ لاحق ہوگا میری حکومت آواز اٹھائے گی اور نوآبادیاتی نظام کی مخالفت کرے گی۔

---

اُردو کے ممتاز ناقد اور محقق پروفیسر عبدالقادر سروری کا ۱۱ مارچ کی شب کو سرینگر میں انتقال ہو گیا آپ پر قلبی دورہ پڑا جس سے جانبر نہ ہو سکے۔ آپ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کے صدر تھے۔ آپ نے دینیات، لسانیات اور اردو تحقیق میں قابل قدر کام انجام دیا۔ آپ بہت دنوں تک آج کل کی مجلس ادارت سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کی موت اُردو کے لئے واقعی ایک سانحہ ہے۔

# ملاحظات

# آج اور کل

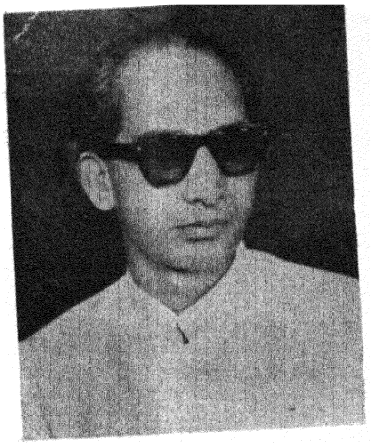

سکندر علی وجدؔ

آج کی طرف دیکھو
اصل زندگی ہے یہ ؛ دور مختصر اس کا
تابناک و بے پایاں ؛ وقت کے اندھیرے میں
گم ہوا، گزشتہ کل ؛ اک سراب اگلا کل
آج کی طرف دیکھو
اس طلسم حیرت میں ؛ عہد آفریں ماضی
جاندار مستقبل ؛ ارتقار کا ہر منظر
قافلے بہاروں کے ؛ نغمہ خواں جواں دنیا
آج کی طرف دیکھو
آج کی مسرت سے ؛ یادگار پچھلا کل
خوش گوار اگلا کل ؛ ہر نظر میں اک جلوہ
ہر قدم پہ اک منزل ؛ خواب دیکھنے والو
آج کی طرف دیکھو

کاشانۂ دل میں جب سے تو ہے
ہر وقت خوش گفتگو ہے
جلوؤں میں اسیر ہیں نگاہیں !
فردوسِ خیال روبرو ہے
کل تک جسے تیری جستجو تھی
آج اُس کو خود اپنی جستجو ہے
اے موجِ صبا، ادب سے چلیو
گلزار حریمِ رنگ و بو ہے
کانٹوں میں جو ہنس رہا ہے پیہم
وہ پھول، چمن کی آبرو ہے
وہ نقش حسیں، غزل سراپا
ہر خط میں رواں جواں لہو ہے
آئینہ رُخوں کی بے نیازی
اے وجد، حجابِ آرزو ہے



# غبارِ کارواں

(۱۵)

عرش ملسیانی

رات دن سبک خرامی سے سفید بیں رہتی اس ندی کا پانی گہرا نہیں تھا۔ اس لئے لوگ اُس کے آر پار دن رات آتے جاتے رہتے۔ ملسیاں کے پاس یہی ایک قدرتی منظر تھا جس پر ملسیاں کے لوگ ناز کرتے۔ رات بھر یہ دھیمی میں گنگناتی بعلی الصبح لوگ اس میں اشنان کے لئے آتے۔ اشنان کر کے کنارے پر ہی سنت تیجا سنگھ کی کٹیا میں داخل ہوتے جہاں سنت جی اپنی سُریلی آواز میں گورگرنتھ صاحب کا پاٹھ کرتے۔ صبح کی بانی آسادی وار سنتے اور مگن ہو جاتے۔ ایک آتا اور ایک جاتا۔ اس وقت کے لوگوں میں عقیدت تھی بستجائی تھی۔ دلوں میں میل نہیں تھا۔ واپسی پر راستے میں آرائیں اور مسلمان راجپوت کسان ہل اور بیلوں کے ساتھ آتے ہوئے ملتے، صاحب سلام، سے ہر ایک کو بلاتے۔ مذہبی تفریق سے بری یہ دنیا آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے ایک ایسی معصوم اور بھولی بھالی دُنیا تھی کہ آج اُسے یاد کرتا ہوں تو دل میں ہوک سی اُٹھتی ہے۔

میں ۱۹۰۸ء میں ملسیاں میں پیدا ہوا۔ والد سے پہلے خاندان میں کیا سارے قصبے میں نہ کوئی صاحب علم تھا اور نہ قابل ذکر صاحب جاہ وحشم۔ انیس بیس کا فرق تھا۔ کوئی کھاتا پیتا تھا، کوئی محنت کش اور کوئی دوسروں کا دست نگر، چھوٹا سا بازار مشمولات میں بنی ہوئی بستی جس اتفاق سے ہم شمولہ عاقل پور کے باشندے تھے۔ خرم پور حویلی صالح نگر، قصبہ دیگر مشمولات تھے مسلم راجپوت چودھریوں کا زور تھا۔ ذیلدار بھی انھیں میں سے ہوتا اور قصبے کی سربراہی سرکاری حلقوں میں بھی وہی کرتے۔

دلچسپ کردار کے لوگ تھے، علیا خوجہ، چانن چوڑی گر، راد ھا کیھیاں والا، بھائی مُولا اور چوہدار، ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خصوصیت تھی۔ ۱۹۱۲ء میں جب میں چار سال کا تھا۔ میں نے چوہدار کو دیکھا۔ چاق چوبند، گندھی ہوئی سفید داڑھی، میرے ہمجولی اس کے گرد ہو گئے، پالو سب سے بڑا تھا اس نے کہا کہ چوہدار کی عمر سو سال سے زیادہ ہے۔ مہتہ جی میرے تایا بولے کہ ایک سو پانچ سال۔ میں حیرت میں تھا آج حساب لگاتا ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ بابا سرکھیم سنگھ بیدی اور ان کے خاندان کا یہ چوہدار ۱۸۰۷ء میں پیدا ہوا ہوگا اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت اس کی عمر پچاس سال کی ہوگی۔ غالب کی موت اور مہاتما گاندھی کی پیدائش کے وقت یہ ساٹھ سال کا ہوگا۔

مہتہ جی کی بیٹھک ہر وقت اُن کے سائلوں سے بھری رہتی۔ وہ دستیقہ نویس تھے۔ دوسرے درجے تک پڑھے تھے لیکن ہر قسم کا وثیقہ لکھنے میں طاق تھے تمسک، رہن نامہ، بیع نامہ، وصیت نامہ، طلاق نامہ وغیرہ۔ سعدی کا ایک شعر یاد تھا جب اُجرت وثیقہ پر جھگڑا ہوتا تو سائل پر رعب طاری کرنے کے لئے وہ پڑھ دیتے ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

شعر پڑھتے ہی منہ مانگی اُجرت مل جاتی۔ اس لئے نہیں کہ سننے والا شعر سمجھتا تھا بلکہ اس لئے کہ اس پر مہتہ جی کی علمیت کا سکہ بیٹھ جاتا تھا۔ ہندو مسلمان سکھ اس بیٹھک میں جمع رہتے، بیٹھک کے باہر ان کی سواریاں گھوڑی یا اونٹ بندھے۔ مہتہ جی بڑے فیاض تھے۔ جانوروں کو چارہ دیتے اور ان کے مالکوں کو کھانا۔ تمباکو کا بھی زور رہتا۔ اُجرت میں سب کچھ وصول کر لیتے۔ دُور دُور کے گاؤں والے ان پر اعتماد رکھتے تھے۔ ان کی مہارت، برخود غلط قانون دانی اور جعل سازی سے اُن کے بروئے کار آتی۔

پہلی جماعت میں مقامی مدرسے میں داخل ہوا۔ خلیفہ حیدر علی ہمیں پڑھاتے تھے

عمر دیکھنے میں ساٹھ کے قریب لگتی تھی۔ کھجور کی ایک چھوٹی سی چھڑی داہنے ہاتھ میں لے کلاس میں ہر وقت گھومتے رہتے سوائے نماز کے وقت کے محنت سے پڑھاتے۔ پیٹتے کبھی نہیں تھے۔ گالی بھی نہیں دیتے تھے۔ گھر پر تعویذ بھی دیتے اور دم بھی کرتے تھے۔ وظیفہ پڑھتے اور تسبیح ہاتھ میں رکھتے۔ شرعی شلوار اور دوپلی ٹوپی پہنتے۔ ہر شخص اُن کی عزت کرتا۔ سال میں ایک دو بار بیٹیں کے پار اپنی زمین دیکھنے جاتے۔ بازار سے گزرنا پڑتا۔ ہر شخص دکان سے اُٹھ کر انہیں سلام کرتا۔ خلیفہ جی سلام، خلیفہ جی سلام کی آوازیں آتیں۔ خلیفہ جی سر جھکائے آنکھیں نیچی کئے ہوئے بڑی لجاجت سے سب کا سلام قبول کرتے تیزی سے نکل جاتے۔ اتنا پاک نفس، نیک نہاد عجز اور علم کا پتلا انسان آج کے زمانے میں ڈھونڈو بھی تو نہ ملے۔

قاضیوں کی مسجد کے پاس سے ایک تنگ گلی گزرتی ہے اس کے آخری موڑ پر ہندوؤں کے تین مکان تھے ایک ہمارا، ایک مہتہ جی کا اور ایک کانشی رام مجام کا۔ اردگرد دس بیس مکان مسلمانوں کے تھے۔ سب مل جل کر آپس میں رہتے، شادی کہار، جنگی خوجہ، عمرا راونت مولانائی، بیگم رنگریزن، بلھا سنار یہ تھے ہمارے ہمسائے بے خوفی سے دن گزرتے۔ نہ ڈر نہ خطرہ

رہتے تھے بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح

دیوی دوارہ، لبشن مندر ہم سے دُور تھے۔ اذان کی آواز کان میں آتی رہتی اور ایسے لگتی کہ واقعی اللہ اور اس کے اکبر ہونے کا ہمیں یقین دلا رہی ہو ـــــ الفاظ میں کیا رکھا ہے۔

ایشور اللہ تیرے نام

سیاست کسی کو چھو نہیں گئی تھی۔ چھوت چھات جہالت کی وجہ سے زوروں پر تھی لیکن نفرت کا موجب نہیں تھی۔ یونہی طرز زندگی سی بن گئی تھی۔ سُود خوروں کی وجہ سے کاشتکار طبقہ دبا رہتا تھا۔ اس سے کبھی بغض و عداوت کے شعلے نہیں بھڑکتے تھے۔

قصبے کی معاشی اور اقتصادی حالت اچھی نہیں تھی۔ ایک زمانے میں یہ بیدیوں کی جاگیر تھی اُن کی بارہ دری، بُرج، طویلہ اور مکانوں کے کھنڈر میں نے دیکھے ہیں۔ اب اس سارے جاہ و جلال کی نشانی وہی سکہ چوہدار تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

چوہدری اللہ بخش، ڈاکٹر جھنڈے خاں، سید شہ سوار حسین، بسنتا (بسنت سنگھ) سفید پوش گوپی چند اگروال پرانے پڑھے لکھے لوگ تھے جن میں سے کوئی مڈل سے آگے نہیں گیا تھا۔

میرے دادا پنڈت موتی رام پشاور کے قصہ خوانی بازار میں حلوائی کی دکان تے تھے۔ شراب پیتے تھے۔ کچھ کما کے لاتے تو ناؤ نوش میں خرچ کر کے واپس چلے تے قطعی اَن پڑھ تھے۔ والد اس خاندان میں پہلے شخص تھے جنہوں نے قاعدہ تعلیم حاصل کی۔ فارسی میں بہت اچھی دسترس حاصل کی۔ معلمی پیشہ اختیار کیا۔ شعر سخن کی طرف توجہ ہوئی تو معلوم ہوا کہ ایک فطری قوت ظہور میں آرہی ہے۔ عروض، علم بیان اور زبان کا مطالعہ کرتے کرتے منتہی بن گئے۔ ۱۹۰۳ء میں داغ کے شاگرد ہوئے اور آج ستاسی سال کی عمر میں بھی شعر کہتے ہیں۔ داغ کے دو ہزار کے قریب شاگردوں میں تنہا رہ گئے ہیں! انہیں کا ایک شعر ہے۔

جینے کا کیا لطف یہاں اب یار گئے غمخوار گئے
جو دو چار رہے تھے وہ بھی تیر جگر پر مار گئے

تقسیم بنگال کی تحریک اور پنجاب میں نہری مالیانے کی تحریک سے انہیں ہمدردی تھی اور وہ سیاسی نظمیں کہنے لگے۔ اسی شبہ میں ۱۹۰۸ء میں ان کی تلاشی ہوئی۔ پولیس کو کچھ ملا تو نہیں لیکن سزا کے طور پر انہیں ایک ایسے مدرسے میں تبدیل کر دیا جو قریب قریب ویران جگہ پر اور آبادی سے دُور تھا۔ وہ دل برداشتہ ہو کر مستعفی ہو گئے اور ریاست جیند میں مفیدوں کے مقام پر ایک اسکول میں چلے گئے۔ چند سال بعد نکودر اینگلو سنسکرت ہائی اسکول میں آگئے۔ یہ قصبہ ملیاں سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے میں پانچ سال کا تھا کہ ہم یہیں منتقل ہو گئے اور آج تک یہی ہمارا وطن ہے۔ ملیاں کو والد خراب آباد کہا کرتے تھے۔ تین چار سال ہوئے ہیں ملیاں دو تین گھنٹے کے لئے گیا بازار وغیرہ تو ترقی پذیر ہے لیکن تقسیم کے بعد آبادی بہت کم ہو گئی ہے۔ قاضیوں کی مسجد کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ سب مکان صاف ہو چکے ہیں اور میں یہ بھی نہ پہچان سکا کہ ہمارا گھر کس مقام پر تھا۔ ہمارے لئے زمانے میں وہی گھر ایک ایوان تھا اس کی بربادی اور ناپیدی کو دیکھ کر ایک فارسی شاعر کا یہ شعر بغداد کی بربادی پر یاد آگیا۔

ہاں اے دلِ عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں
ایوان مرایں را آئینۂ عبرت داں

مسلمان اب وہاں کوئی نہیں۔ ہندو سکھ بظاہر مل جل کر رہتے ہیں لیکن خلوص نہ ہندو ہندو میں ہے اور نہ سکھ میں۔ بچوں میں مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ پڑھنے لکھنے میں بہت اچھا تھا کئی مضامین میں سو فیصد نمبر حاصل کئے لیکن ذہانت کا فائدہ نہ ملا۔ میٹرک کے لئے جالندھر گیا اور انٹر کے لئے کپورتھلہ۔ ۱۹۲۱ء میں تحریک عدم تعاون جاری ہوئی تو دل جذبۂ آزادی سے کھولنے لگا۔ ہر جلسے اور جلوس میں شامل ہوتا۔ اخباری نظمیں جلسوں میں پڑھتا۔ واہ واہ ملنے لگی۔ غلط سلط شعر بھی کہنے لگا۔ لالہ لاجپت رائے نکودر میں ملک سوراج فنڈ جمع کرنے آئے۔ امتحان کا دن تھا تین گھنٹے کا پرچہ آدھ گھنٹے میں حل کر کے اسکول کے پیچھے سے بھاگا اور لالہ جی کی جائے قیام پر پہنچ گیا۔ اُن کو دیکھا قدم چومے اور اس سعادت پر آج تک نازاں ہوں۔

کالج میں گیا تو شعر و شاعری کے چرچے بہت تھے۔ ہم جماعت سمجھتے تھے کہ میں بہت بڑا شاعر ہوں۔ ایک نظم ڈرتے ڈرتے والد کی خدمت میں اصلاح کے لئے

بھیجی۔ اصلاح تو کجا ایک سرزنش آمیز خط ملا کہ اس طوق کو اتار ڈالو یہ تمہارے گلے میں تنگ ہے۔ اُن کے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ جوش صاحب خوش تو بہت تھے لیکن کہتے تھے کہ شعر کہنے لگا تو تعلیم سے غافل ہو جائے گا۔ اس لئے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے تو اچھا ہوگا۔ اس کے بعد ایک دوست نے میرے سامنے والد کو میرا یہ شعر غالب کی مشہور زمین میں سنایا ؎

مر کر بھی گرفتارِ سفر ہے مری ہستی
دُنیا مرے پیچھے ہے تو عقبیٰ مرے آگے

بہت خوش ہوئے اور شعر کی برجستگی کی بڑی تعریف کی۔ میری تسکین ہوگئی اور میں آزادانہ شعر کہنے لگا کسی لفظ یا ترکیب پر شبہ ہوتا تو اسے والد سے پوچھ لیتا۔ اصلاح نہ لیتا۔ اس سے مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی توفیق حاصل ہوئی۔ نوسر یا رام درد (نریش کمار شاد کے والد) والد کے شاگرد تھے۔ انہوں نے میرا حوصلہ بڑھایا کہ بس کہتے جاؤ۔ نہ رکنے کا مقام ہے نہ ڈرنے کا۔

انٹر میں پڑھ ہی رہا تھا کہ بلائے ناگہانی مجھ پر نازل ہوئی۔ میں والد کے مجبور کرنے پر گورنمنٹ انجینئرنگ کالج رسول کے داخلے کے امتحان میں بیٹھ گیا اور امتیاز سے کامیاب ہوا۔ ناچار علم و ادب کی فضا کو چھوڑ کر انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ دو سال رو رو کر گزارے مگر بُرا ہو اس ذہانت کا کہ وہاں بھی امتیاز سے کامیاب ہوا۔ ملازمت نہر کے محکمے میں ملی۔ دیکھا کہ چاروں طرف بھڑوئے منہ کھولے بیٹھے ہیں۔ رشوت کا بازار گرم ہے۔ جہالت ہی جہالت چھائی ہوئی ہے۔ ایک سال کی مدت میں تین بار مستعفی ہوا۔ ملازمت چھوڑ کر گھر پر آتا تو وہاں سرزنش ملتی۔ ملازمت پر جاتا تو ضمیر ملامت کرتا آخری بار جب مستعفی ہوا تو یہ کہہ کر مستعفی ہوا کہ خواہ بھوکا مروں اس پُرآشوب ملازمت کا نام نہ لوں گا جہاں اتنی جہالت ہے کہ مزدور اوورسیر کو بلاتا ہے تو کہتا ہے 'اوئے' اوئے بابو جی اوئے' یعنی دونوں طرف تعظیماً اوئے، کہتا ہے تعلیم نامکمل، جو پیشہ اختیار کیا اس سے نفرت، گھر کی مالی حالت خستہ، چار بہنوں کی شادیاں یکے بعد دیگرے سر پر، رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ اسی زمانے میں لاہور میں کانگرس کا تاریخی اجلاس منعقد ہوا جواہر لال نہرو کے جلوس سے لے کر سالانہ اجلاس اور متعلقہ تقریبات دیکھتا رہا۔ اور درد صاحب کے پاس پندرہ بیس دن ٹھہرا۔ وہاں گاندھی سردار پٹیل، موتی لال نہرو، سروجنی نائڈو، سبھاش چندر بوس اور بہت سے اکابر کو دیکھا۔ یہ بات ۱۹۲۹ء کے آخر کی ہے۔ جنوری ۱۹۳۰ء کے پہلے تین چار دنوں میں بہت سی تقریریں سنیں۔ وہیں پہلی بار عطاء اللہ شاہ بخاری کو سنا۔ کیا تقریر تھی۔ گاندھی سے جوشِ عقیدت، انگریز کے خلاف شعلہ افشانی، طلاقت، فصاحت بلاغت، برموقع لحن سے شعر خوانی، لطائف و ظرائف، اللہ کی پناہ ایسا مقرر میں نے عمر بھر نہیں دیکھا۔ بہادر یار جنگ کے باب میں بھی ایسی ہی باتیں سنی ہیں لیکن ان کو میں نے نہیں دیکھا۔

پنجاب کی بساطِ سیاست پر اس زمانے میں ڈاکٹر ستیہ پال، ظفر علی خاں، ڈاکٹر محمد عالم، چودھری افضل حق، ڈاکٹر کچلو، ماسٹر تارا سنگھ اور بہت سے قائدین چھائے ہوئے تھے۔ سرکار کے کاسہ لیسوں کا کوئی عزت سے نام نہیں لیتا تھا۔ اُردو صحافت اپنی متقل بک بک جھک جھک میں مصروف تھی۔ نظموں کے جواب میں نظمیں اداریوں کے جواب میں اداریے لکھے جاتے پھلجھڑیاں چھوٹتیں۔ زندہ دلانِ پنجاب جو بھی کرتے کم تھا۔ لالہ کرم چند کا ہفتہ وار اخبار پارس اپنی وضع کا نرالا اخبار تھا۔ ادبی حصہ بڑا پُرلطف ہوتا۔ نمکدان پنڈت ہری چند اختر لکھتے، حفیظ، تاثیر فرضی ناموں سے مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی کی طرف داری میں نظمیں لکھتے۔ رچھپال سنگھ شیدا کاتل، مظفر حسین خاں کا شاعری کا لیج، تاجور نجیب آبادی کی انجمن ارباب علم پنجاب سیتلا مندر کے مہنت کی بداعمالیاں، سب پر پھبتیاں کسی جاتیں۔ بانگِ درا میں زبان و فن کے اغلاط پر مسلسل مضمون "اقبال کی خامیاں" اسی "پارس" میں چھپتا رہا

ان ہنگاموں سے کہاں پیٹ بھرتا۔ گھوم پھر کر گورنمنٹ انڈسٹریل اسکول میں ڈرائنگ ماسٹر کی ملازمت حاصل کی۔ دوست احباب طعنہ زن تھے کہ اوورسیری چھوڑ کر یہ کیا کرنے چلا ہے۔ لیکن ستر روپے کی قلیل تنخواہ پر میں نے لدھیانے میں بارہ سال گزار دیئے۔ وہیں ایف اے اور بی اے کے امتحان پرائیوٹ طور پر پاس کئے۔ جی بھر کے پڑھا، جی بھر کے شعر کہے، مشاعروں میں شمولیت کی۔ پاٹ دار آواز، لحن سے پڑھنا۔ دور و نزدیک شہرت پھیلی۔ بالکل ایک مشاعرے باز شاعر کی حیثیت سے۔ بزم اُردو شملہ کے مشاعروں میں جا کر داد سخن لی۔ حسرت موہانی، جگر، جوش بیخود، سائل، پنڈت امر ناتھ ساحر، اور پنڈت کرشن کانت مالویہ سے داد سخن پائی مشاعروں کو لوٹا اور سمجھنے لگا کہ اب میں ہی شاعرِ اعظم ہوں۔ مشاعرے کی داد شاعر کو برخود غلط بنا دیتی ہے۔ یہی حال میرا بھی تھا۔ ہارڈنگ لائبریری دلی نے تین بڑے مشاعرے کئے۔ ایک مشاعرے میں چار نشستوں کے صدر تیج بہادر سپرو، نواب رامپور سر رضا علی اور رائے بہادر رام کشور تھے۔ ڈی پی کمشنر انجینئرنگ تھے مسٹر ایونز نام تھا۔ شعراء کا خیر مقدم انہوں نے فارسی میں پڑھا۔ لہجہ بھی ایرانی تھا۔

شملے کے مشاعروں میں یوں تو بہت سے اکابر ملے لیکن ایک تعلق خاطر سید غلام محمد سے ہوگیا۔ انہوں نے ۱۹۴۱ء میں دلی میں مشاعرہ کیا۔ اسی میں میری غزل بہت سرسبز ہوئی۔ غلام محمد تو ناچنے لگے۔ مشاعرے کے بعد مجھ سے کہا دلی آؤ لدھیانہ میں پڑے کیوں سڑ رہے ہو۔ قصہ کوتاہ مجھے وہ ماہ فروری ۱۹۴۲ء میں دلی لے آئے اور میں سپلائی کے محکمے میں پہلے سے زیادہ تنخواہ پانے لگا۔

لدھیانے میں جب تھا تو بہت سے شعراء تھے لیکن اکثر غلط گو اور برخود غلط تھے۔ ان کے امام نور لدھیانوی خود کو مصور جذبات لکھتے تھے۔ ان کا ایک مصرعہ آج تک یاد ہے "ڈر ڈپٹی و خوف لاٹ نہ کر" میری گلی میں نظیر لدھیانوی رہتے تھے انھیں کے پاس اٹھنا بیٹھنا تھا تنے میں گوپال متل آ گئے اور وہ بھی اسی گلی میں مقیم ہو گئے۔ ویکفیلڈ گنج لدھیانہ میں یہ ارباب ثلاثہ جمع ہو گئے گوپال متل بڑے ذہین تھے۔ طبیعت میں براقی تھی، بزعم میں الجھ پڑتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ زیر بحث موضوع خود انھیں کا مضمون ہے۔ ان کے ساتھ جو وقت گزرا اس سے لدھیانہ میں رہتے رہتے بجھی ہوئی اور گندہ طبیعت میں ایک طوفان سا آگیا اور نظیر لدھیانوی کے مکان کے باہر فی البدیہہ اشعار ہوتے۔ ادھر ادھر کی ادبی باتیں ہوتیں، بے ادبی پر بھی اتر آتے۔ گوپال متل ایک رسالہ صبح امید کے نام سے نکالتے تھے۔ دو تین شمارے نکلے اور وہ بند ہو گیا۔ متل صاحب لاہور چلے گئے۔ غالباً ۱۹۳۵ - ۳۶ کی بات ہوگی۔

شملے کے ایک مشاعرے میں سر سکندر حیات خاں صدر تھے۔ اقبال کا مصرعہ طرح تھا، میرا ایک شعر تھا

دو روزہ عظمت و شوکت پہ بھولنے والے
اجل سے پوچھ کہ شان سکندری کیا ہے

داد دینے کے موڈ میں آ گئے۔ وزیر اعلیٰ پر شعری چوٹ۔ اس کے بعد جلد ہی ان کا انتقال ہوا۔ مجھے اس بات کا علم بعد میں ہوا کہ عظمت حیات اور شوکت حیات ان کے بیٹوں کے نام ہیں۔

دلی آیا تو لدھیانے کی صحبتیں یاد آنے لگیں۔ وہاں کی ادبی چودھراہٹ دلی میں یہاں میسر تھی ایک نظم کہی جس کے دو شعر یہ ہیں

دنیا کی نگاہوں میں بھلا ہوں کہ برا میں
ارباب محبت کا ہوں پابند وفا میں
لدھیانے سے نکلا صفت بلبل ناشاد
دلی کی فضاؤں میں ہوا نغمہ سرا میں

میر درد روڈ نئی دہلی کے قریب ہی پریس بلیس میں رہنے لگا۔ دفتر شاہ جہاں روڈ پر تھا۔ مٹیا محل میں خواجہ محمد شفیع کے دولت کدے پر ہر اتوار کو اردو مجلس منعقد ہوتی۔ وہیں کبھی کبھی پرانے احباب اسد ملتانی اور عبدالمجید حیرت کے ساتھ میں بھی جاتا۔ منور صاحب بھی کبھی آجاتے اس زمانے کا تاثر ان قطعات میں ہے۔

یہ بھی ہے اے عرش حسن اتفاق ؛ ملسیاں اور دہلی میں قیام
اس ستارے کو چمکنے کی ہوس ؛ جس کے گرد اک شمسی نظام

خوبیٔ قسمت وہاں لائی مجھے ؛ ہے جہاں دل کے لئے اکسیر درد
اور اس پر میرے مسکن کے قریب ؛ چین سے سوتے ہیں خواجہ میر درد

از سر نو دل ہوا ہنگامہ زار ؛ پھر خیال و فکر کے لشکر چلے
پھر ہے ایماٹے مئے شعر و سخن ؛ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

لال قلعے کی وہی دلی جہاں ؛ سجدہ کرتا ہے ہر اک ذی احتشام
وہ نظام الدین کی درگاہ پاک ؛ جس جگہ جھکتا ہے ہر عالی مقام

خوبیٔ قسمت وہاں لائی مجھے ؛ ہیں جہاں کے ذرے رشک آفتاب
اور اس پر میرے دفتر کے قریب ؛ غالب و خسرو ہیں دونوں محو خواب

خسرو ملک سخن کا فیض ہے ؛ غالب نام آورم، سنتا ہوں روز
سر بسر گم ہو کے فکر شعر میں ؛ خوبیٔ قسمت پہ سر دھنتا ہوں روز

ان قطعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں میرے ذہن کی ساخت کس طرح ہوئی۔ میں روایت کا باغی نہیں تھا۔ قدامت کا پرستار تھا لیکن کچھ ایسا بھی تھا کہ قدامت کا طوق گلے میں تنگ نظر آتا تھا۔ میں نے بہت سی نظمیں مختلف موضوعات پر کہیں۔ کرشن اور رام پر نظمیں لکھیں۔ رسول کریم کی تعظیم میں نعتیں کہیں۔ گورو نانک اور گورو گوبند سنگھ کی بھی مدح کی۔ دل اپنے بچپن کے زمانے کو یاد کرتا اور رواداری کے مسلک پر چلتا۔ ملک میں فسادات ہوئے تو ملتان، ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور کانپور کے فسادات پر دل دوز نظمیں کہیں۔ فرقہ پرست لیڈر کو مخاطب کر کے اسے خوب سنائیں۔

میرے ضمیر کی یہ بات نہیں تھی کہ مذہبی عصبیت کا شکار ہوں۔ دلی آئے ابھی پانچ سال ہی نہیں ہوئے تھے کہ تقسیم ملک کا حادثہ ہوا۔ اس نے ہر درد مند دل پر چوٹ لگائی۔ آدمی وحشی ہو گیا۔ اس حادثے نے میرے دل کو بہت مجروح کیا۔ اس زمانے کے کلام میں آدمی کی وحشت اور بربریت پر نوحہ خوانی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ ایک طویل مسدس میرے مجموعے چنگ و آہنگ میں اسی کی یادگار ہے۔ رام پور کے مشاعرے میں سہمے ہوئے لوگوں کے سامنے جب میں نے اپنی غزل پڑھی تو لوگوں میں یقین اور اعتماد کی لہر پیدا ہو گئی اس کا پہلا مصرعہ ہی اس آدم کش زمانے پر بھرپور وار تھا۔

یہ دور خرد ہے دور جنوں اس دور میں جینا مشکل ہے

پوری غزل اسی خیال کی ترجمان ہے۔ صرف تین شعر درج کرتا ہوں۔

جب ناخن وحشت چلتے تھے روکے سے کسی کے رک نہ سکے

اب چاک دل انسانیت سیتے ہیں تو سینا مشکل ہے
جو دھرم، یہ بیتی دیکھ چکے 'ایماں' یہ جو گزری دیکھ چکے
اس رام و رحیم کی دنیا میں انسان کا جینا مشکل ہے
وہ مرد نہیں جو ڈر جائے ماحول کے خونیں منظر سے
اس حال میں جینا لازم ہے جس حال میں جینا مشکل ہے

آخری شعر پر نوسامعین تڑپ اُٹھے۔ درد انگیز شور تحسین بلند ہوا۔ مایوس دلوں کے لئے یہ حوصلہ مندی کا پیغام تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ شعر پڑھتا ہی چلا جاؤں۔

یہ جذبہ ہندوستان اور پاکستان کی خونریزی تک ہی محدود نہ رہا۔ نظر ذرا اور آگے بڑھی۔ دُنیا میں جنگ جوئی کے ارادے دیکھے تو نسل آدم کی بدعنوانیوں پر قلم رانی کی۔ جنگ کو رپا پر نظم لکھی۔ ایشیا کی مظلومیت پر ایک ترکیب بند "ایشیا کو چھوڑ دو" کے عنوان سے لکھا۔ چند شعر اس جذبے کی یادگار ہیں۔

عجیب درد ہے یہ دورِ ارتقائے جدید ؛ کہ سب کی قدر بڑھی قدر آدمی نہ رہی
بھلے گلہ ہے یہ حکمت فروش دُنیا سے ؛ کہ بُوعلی تو بہت ہیں قلندری نہ رہی

ہم صفیروں کی نواؤں کا اثر ہے شاید ؛ ہر گرفتار قفس کوششِ پرواز میں ہے

عقل کی صبح کہاں جہل کی ہے رات ابھی ؛ ذہن انساں میں ہیں فرسودہ خیالات ابھی
آسماں امن کا لب تک نہیں مسجو دلبشر ؛ آسماں جنگ کا ہے قبلۂ حالات ابھی
عرش کیوں خواب سے بیدار ہوا جاتا ہے ؛ بند کر آنکھ کہ باقی ہے یہاں رات ابھی

۱۹۴۸ء میں آج کل کی ادارت ملی۔ مدیر اعلیٰ جوش ملیح آبادی تھے جوش کا ساتھ سات سال تک رہا اور اس کے بعد اُن کی کرسی عرش کو ملی۔ جوش رنگا رنگ مزاج کے آدمی ہیں۔ اُن سے مسلسل تعلق نے ذہن کو جلا دی شعر میں میرے نقطۂ نظر میں تبدیلی آئی اُن سے بحثیں ہوئیں۔ وہ شگوفے چھوڑتے ہماری زبان و بیان کی غلطیاں ہمیں سمجھاتے۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ وہ خالص بورژوا ہیں، کبھی وہ پرولتاری نظر آتے۔ اصل میں وہ کچھ اور ہی ہیں۔ اُن کی قدرت کلام نے ہمیں مرعوب کیا اس لئے جائز و ناجائز وہ اپنی بات منوا لیتے۔ اکثر معاملات میں وہ میری رائے کی قدر کرتے۔ فنی امور میں بھی کبھی شکست مان لیتے۔ اُن کے ہوتے کتنے شعرا اور ادیبوں کا جمگھٹ اُن کے گرد دیکھا۔ ایک سے ایک دلچسپ، ایک سے ایک اپنے اپنے رنگ کا مالک، مجاز، فراق، حکیم محمود، مخدوم، پرویز شاہدی ایسے بادہ آشاموں کے ساتھ ساتھ جعفر علی خاں اثر، گوپی ناتھ امن، منور، مانی جائسی، پروفیسر اجمل خاں، یونس سلیم ویاس یگانہ، حیرت بدایونی، امجد حیدر آبادی، صفی لکھنوی کے علاوہ بہت سے صوفیائے صافی طینت سے بھی ان کو بہت ربط ضبط تھا۔ سات سال میں اس ادبی اور شعری ماحول کا بہ نظر غائر مطالعہ کرتا رہا اور اس ماحول سے کسب فیض بھی کرتا رہا۔ جوش صاحب کی شراب کی محفلوں میں تنہا اُن سے اور اُن کے احباب کے تیر ہائے مطاعن کا شکار ہوتا رہا۔ عالم بوشش میں وہ حیرت کا اظہار کرتے تھے کہ تم کس مٹی کے بنے ہو کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

اُن کو فراق سے محبت تھی لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ ظاہری زیادہ تھی اور باطنی کم۔ وہ کسی ہم عصر کو اپنے سے بہتر نہیں سمجھتے تھے۔ جگر اور فانی میں کسی کے باب میں اُن کی رائے اچھی نہ تھی۔ فراق کی ذہانت کے بہت مداح تھے۔ اقبال کی وساطت سے یہ حیدر آباد میں ملازم ہوئے تھے۔ لیکن اس کی شاعری پر چوٹیں بھی کرتے تھے۔ اس کے مداحوں کو شاہین بچے کہتے تھے۔ اب یہ بات چل پڑی ہے تو ذرا اس پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کروں تو بے جا نہ ہوگا۔

شاعر کو خام یا پختہ شدم سوختہ، نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بات اقبال میں تھی۔ کہ خام تھے اور پختہ ہو گئے۔ داغ کے شاگرد ہوئے، بڑی فرسودہ غزلیں کہتے تھے۔ پھر نیا شوالہ اور ہندوستان ہمارا کہنے پر مائل ہو گئے۔ اور تصویر درد کھینچی۔ اس کے بعد رُخ بدلا تو اسرار و رموز پر آئے۔ لوگ اسرار و رموز کو بہت بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں لیکن سنائی، عطار، اور رُوم اس میدان میں ان کے رہنما ہی ہیں۔ ہندوؤں کا فلسفہ ویدانت بہت آگے ہے۔ اس کے بعد نئے شوالے کا پجاری مسجد قرطبہ پر نوحہ زن ہوا تو پنجاب کے مسلمان اُسے ترجمان حقیقت کہنے لگے۔ شکوہ اور جواب شکوہ پہلے ہی انہیں دائرۂ اسلام میں محدود کر چکا تھا۔ پھر تو اپنی نظموں میں اسلامی تلمیحات اور ترکیبات بھرنے لگے "عورت" کے متعلق ان کے خیالات ان کی ذہنی بلندی کا ثبوت نہیں دیتے۔ گورونانک، سوامی رام تیرتھ، رام، بھرتری ہری، گوتم بدھ یہ سب کچھ ان میں ہے لیکن ان کے پورے کلام کو دیکھیں تو عشر عشیر بھی نہیں۔ انہوں نے الہ آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کی اور پاکستان کے تصور کو ہوا دی جناح کے نام ان کے خطوط پڑھے تو بجز اس کے کچھ ظاہر نہیں ہوتا، کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ کرنا چاہتے تھے۔ یہ کہاں کی بین الاقوامیت ہے؟

ان کی شاعری کمال کی حدوں کو چھوتی تھی۔ ان کا اسلوب بیاں ان کا اپنا ہے۔ وہ فکر انگیز شاعر ہیں لیکن پنجاب والوں نے اُن کو بانس پر ذرا زیادہ ہی چڑھایا۔ یہ جذباتی ستائش تھی جو اعتدال کی حدوں سے نکل گئی۔

فراق اور جوش الگ الگ ڈھرّوں کے شاعر ہیں۔ مارکس کے دونوں قائل۔ جوش میں کلاسکیت زیادہ ہے اور وہ اس میں رچے ہوئے ہیں۔ حکیم آزاد انصاری تو ان

نظموں پر تغزل کا اثر دیکھتے تھے اور جب جوشِ غزل کی مخالفت کرتے تھے تو وہ کہہ اٹھتے
کہتے ہو کہ مجھتی نہیں شانِ غزل ؛ ممکن ہو تو ڈھا دیجئے ایوانِ غزل
سرکارِ غزل میں پل کے غزل سے یہ بیر ؛ افسوس ہے اے نمک حرامانِ غزل

فراق کلاسیکی دنیا سے نکلے تو ہندوستانی تہذیب اور کلچر کی نمایندگی کرنے لگے
سانچہ اُن کی شاعری میں ویدکی رچاؤں، گیتا کے اشلوکوں، سنت کبیر اور سورداس کی بانیوں
اہتزاج ملتا ہے۔ یہ مال سرودر، ہنس، بھیروں وغیرہ قسم کے ناموں سے تشبیہات
رتب کرتے ہیں غزل میں بالکل انفرادی رنگ ہے۔

"ہم زندہ ہیں ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے" کی قسم کی نظمیں بھی کہتے ہیں، مزدور
ور دہقان کی عظمت کا راگ جوش کی طرح ہی گاتے ہیں۔

شاید اقبال کے لئے ان دونوں کی رائے اتنی اچھی اور عقیدت مندانہ نہ ہوتی
شاہین بچوں کی ہے جذباتی عقیدت مندی وقت کے ساتھ ساتھ مٹ جایا کرتی
۔ اقبال کا مقام بحیثیت فلسفی اور پیغامبر ابھی نہیں مقرر کیا جا سکتا اس کے لئے
ت چاہیئے۔

جوش و فراق کا اس میں قصور نہیں، نظیر اکبرآبادی کو اس دور کے ثقہ لوگوں
زندکرہ نویسوں نے مبتذل اور سادہ گو قرار دیا تھا آج یہ حالت ہے کہ خود جوش کو
نے یہ کہتے سنا ہے کہ نظیر ہندوستان کا اصل عوامی اور فلسفی شاعر ہے اور بڑا شاعر ہے۔

غبارِ کارواں میں کارواں کے امیروں کا ذکر آ گیا۔ غالباً یہ ناموزوں نہیں۔ جوش
ستان چلے گئے، اور قریۂ نال جب مجھ دیوانے کے نام پر پڑا تو زیادہ سنجیدگی آ گئی۔
رع سے اب تک مشاعرہ بازی نے سوچ سمجھ کر شعر کہنے کا ایک انداز خیال پیدا ہونے دیا
ستوں اور بزرگوں نے واہ واہ تو کی لیکن شاعری میں وہ مجھے آگے بڑھنے سے روکتے
ہے۔ اس لئے واہ واہ کا نشہ جب اُترتا تو پھر چڑھ جاتا عالمِ ہوش میں آنے کا
قع نہ ملا۔

مجموعے تو کئی چھپ گئے۔ نثری کتابیں بھی چھپیں۔ فارسی سے برابر اُنس رہا
ر کی رباعیوں کا اُردو رباعیوں میں ترجمہ کیا۔ قاضی عبدالودود نے میری رہنمائی کی۔
وف مجھ سے عمر میں بڑے اور علم میں بہت بڑے ہیں۔ تحقیق کے میدان میں اُن
ئی مدِمقابل نہیں بہت بڑے انسان بھی ہیں اس زندگی میں قاضی صاحب، مالک رام
یکش اکبرآبادی سے بہتر انسان مجھے شاید ہی ملے ہوں۔ ذوق تو کسی ہمدم دیرینہ
لاقات کو مسیحا و خضر کی ملاقات سے بہتر جانتے تھے۔ میں بزرگ، ہمدرد، ہم خیال
نیک دوستوں سے ملاقات کو نعمت غیر مترقبہ سمجھتا ہوں۔ یہ لوگ پریشان حالی اور
ماندگی کے ہی دوست نہیں، ہر حال، ہر رنگ اور ہر ساعت کے دوست ہیں۔ ان
دل کی محبت بڑی ہموار ہے، یہ حبِ علی یا بغضِ معاویہ کے اصول پر نہیں چلتے۔

ان تین ناموں کے ساتھ پنڈت ہری چند اختر کے نام کا اضافہ ضروری ہے۔ وہ اب
اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی انسان دوستی اور نیکیوں کا اختر تابندہ پوری
طرح روشن ہے۔ وہ صاحبِ دل تھے، صاحبِ علم و فضل تھے، نہ جانے کتنی خوبیوں
کے مالک تھے۔ ان کا مجموعہ ان کی زندگی کے بعد 'کفر و ایماں' کے نام سے چھپا تھا۔ افسوس
ہے کہ اس صاحبِ کفر و ایماں کو ہندو و مسلمان بھول گئے۔ مالک رام دلی میں
میرے انسائیکلوپیڈیا تو ہیں ہی۔ یوں بھی دل کو دل سے راہ ہے۔ ان کی محبت میری
زندگی کا عزیز ترین سرمایہ ہے۔ جس دردِ انسانی کی جھلک بچپن میں دیکھی تھی وہ
میری ذات میں زندگی بھر نمایاں ہوتا گیا۔ مالک ام اور دوسرے احباب نے اپنے طرزِ
تعلقات سے اسے اور استوار کیا۔ زندگی کا یہ جوہر جسے میں نے اوّل اوّل والدِ محترم
کی زندگی سے پایا، احباب کی مخلصانہ نوازشات سے پالا اور اپنی انفرادیت سے قائم
رکھا، ایک ایسی واحد نعمت ہے جس پر میں فخر کر سکتا ہوں۔ شاعر سینکڑوں مجھ سے
بہتر ہیں۔ نثر لکھنے والے سینکڑوں مجھ پر فائق ہیں۔

میری زندگی اور ذوقِ ادب کی تشکیل کس طرح ہوئی اس کا ایک مختصر سا خاکہ
میں نے پیش کر دیا۔ کچھ لوگ اس کی تفصیل پیش کرتے ہیں تو نام و نسب سے شروع
کرتے ہیں۔ میں تو صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ میرا اصل شجرۂ نسب تو صرف والدِ محترم سے
شروع ہوتا ہے۔ اُن کا ذوقِ ادب، ان کی شرافت، اُن کی پاکیزہ نفسی نے
میری رہنمائی کی۔ اُن کے باب میں جوش ملیح آبادی کہا کرتے تھے کہ ایک گاؤں اور
وہ بھی پنجاب کے گاؤں میں رہ کر انہوں نے دلی اور لکھنو کی زبان کہاں سے سیکھی۔
بے علموں میں بیٹھ کر فن کیسے حاصل کیا۔ بہرحال یہ سب خدا کی دین ہے۔ انہوں نے
عمر بھر ریاض کیا۔ اُردو کی خدمت کی۔ نہ کوئی فلسفۂ عمل اُن کے پاس ہے جس کی وہ
تشہیر کرتے۔ نہ کسی مجذوب فرنگی کو انہوں نے پڑھا جسے 'مقامِ کبریا' تک پہنچا
دینے کا دعویٰ کرتے۔

میں نے بھی اتنا مطالعہ نہیں کیا جتنا آج کل کے ادیب کے لئے ضروری ہے۔
سعدی، حافظ، عطار، سنائی، رُوم، ادھر اُدھر سے دیکھے۔ نظیری اور صائب پر آیا،
شبلی و گرامی پڑھے یہ دونوں ہندوستان کے آخری کلاسیکل شاعر ہیں جنہوں نے
فارسی میں داد سخن دی۔ اقبال، جوش، فراق کو جی بھر کے پڑھا۔ انگریزی میں معرکۃ الآرا
ناول پڑھے، سیاسی اور غیر سیاسی موضوعات پر کتابیں پڑھیں۔ جستہ جستہ معتبر شعرائے
انگریزی کا مطالعہ کیا۔ کبیر، تلسی، بہاری، جائسی کو پڑھا۔ اُردو نظم و نثر کی کتابوں کی
فہرست لکھوں تو دفتر ہو جائے۔

غالبیات سے مجھے خاص اُنس رہا اور مالک رام سے ربط و ضبط بڑھا تو یہ
شوق خبط ہو گیا۔ ہندی میں ایک کتاب غالب بہ حیثیت شاعر اور انسان لکھی۔ رقعات

غالب کا انتخاب ہندی میں کیا۔ آج کل کے ماہ فروری کے شمارے میں ہر سال غالب سے متعلق نادر مضامین شائع کئے۔ اب بھی فرصت ہوتی ہے تو کلیات غالب فارسی لے کے بیٹھتا ہوں اور اس ستم کے شعروں پر سر دھنتا ہوں

بامن میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش کند

تو اے کہ معتقد شاعران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

یہ شعر اس زمانے کے شعر نظر آتے ہیں۔ اور غالب کی ترقی پسند ذہنیت کے آئینہ دار ہیں۔ علم و فضل میں مولانا آزاد سا نابغہ اس دور میں نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین اور سید مسعود حسن رضوی ادب کے ستون ہیں۔ خواجہ غلام السیدین جدید و قدیم علوم کا مجموعہ ہیں اور کس کس کا نام گناؤں۔ میں نے ان سب کی تحریروں سے فیض پایا ہے۔

تقسیم سے پہلے لاہور اردو کا مرکز تھا۔ کتنے ادیب جمع تھے۔ تاجور نجیب آبادی کی کوششوں سے اردو مرکز قائم ہوا تو جگر، یگانہ، اصغر، فہیم کو الیاری سیفی سیوہاروی اور نہ جانے کون کون وہاں پہنچ گیا۔ حفیظ، تاثیر، تبسم اور ہری چند اختر کی چار یاری، سالک و تہر کی صحافتی ہم رکابی، چراغ حسن حسرت اور پطرس کی بذلہ سنجی اور مزاح نگاری، ظفر علی خاں کی نظم و نثر کا طنطنہ، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور میاں بشیر احمد کی دوستی، سر عبدالقادر اور دیوان بہادر راجہ نریندر ناتھ کی علم دوستی اور ادب پروری، پنڈت راج نرائن ارمان کی ہمہ دانی، شیو برت لال دامن اور محمد اسلم کی ناول نگاری، امتیاز علی تاج کی ڈرامے سے محبت، خواجہ دل محمد کی ہمہ رنگی، کس کس کا ذکر کیا جائے، اقبال تو ان سب کے سرخیل تھے ہی۔ یہ تو بڑ کا درخت تھے۔ ان کے سایے میں کوئی شاعر اونچا نہ اٹھ سکا سوائے حفیظ کے جس نے الگ راہ اختیار کی اور شعر و نغمہ کا امتزاج کیا۔ اب میاں بشیر احمد، حفیظ، تبسم اور ایم اسلم کے سوا سب عالم بقا کو سدھار چکے ہیں۔ ان سب نے اردو کا پرچم بلند کیا۔ فیض احمد فیض نے بھی نئی شاعری کی شاہراہ پر گامزنی کی اور نئی راہ نکالی۔ ایک محفل میں راجہ نریندر ناتھ، سر عبدالقادر اور جوگی کے عنوان سے مشہور نظم کے خالق مونشی محمد ناظر جیسے بزرگوں کو دیکھا وہ آپس میں چہلیں کرتے اور سامعین خوش ہوتے۔

اولاد حسین شاداں بلگرامی محمود شیرانی، پرنسپل محمد شفیع اور ی انٹیل کالج کی جان تھے۔ ان اکابر کو میں نے دیکھا، ان کی تصنیفات، ان کی گفتگو، ان کی علم دوستی سے رہنمائی حاصل کی۔ لیکن زمانے میں پائداری کسے نصیب ہے۔ تقسیم کے بعد اردو کا انحطاط شروع ہو گیا۔ سیماب، آرزو لکھنوی، اختر حیدرآبادی اور بعد میں نیاز فتحپوری پاکستان گئے اور جاتے ہی عالم فانی کو چھوڑ گئے۔ اب مہاجرین میں صرف جوش ہیں جو قریب قریب گوشہ تنہائی میں ہیں۔

ادھر بھی پنجاب میں اردو نے دم توڑ دیا۔ اب اس کا حال اس شعر کے مصداق ہے ؎

نہ پوچھ حال میرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

اتنا بڑا انقلاب آنکھوں سے دیکھا۔ سخت جانی بروئے کار آئی۔ اردو کا دامن اب بھی تھامے ہوئے ہوں۔ ہندی میں لکھتا ہوں تو اردو ہی سے متعلق لکھتا ہوں۔ یہ خوبصورت دوچار زبان کیوں سیاست کی نظر ہو گئی۔ اس المیے کی تشریح کون کرے۔ اب تو پاکستان میں بھی حفیظ اور فیض یہ کہہ رہے ہیں کہ پنجاب کی زبان پنجابی ہے۔ انھیں مبارک ہو پنجابی میں صوفی شعرا گزرے ہیں۔ بلھے شاہ وارث شاہ اور غلام رسول کی دین سے کیے انکار ہے۔ لیکن اردو نے بھی تو بہت کچھ بخشا ہے۔ یہ بھی سلامت رہے تو کیا برا ہے۔

ادھر ہندوستان میں دیوناگری رسم الخط اختیار کیے جانے کی آوازیں بھی اٹھ رہی ہیں۔ اس بحث میں کون پڑے۔ مجھے امید ہے کہ کہ اردو کی خدمت کرنے والے خدمت کرتے رہیں گے۔ ہم لوگ تو قریب قریب اپنا کام کر چکے۔ وہ اچھا تھا یا برا اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔

اب نئی تعلیم کے زیور سے آراستہ نوجوان نئی آن بان سے نکلے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ن۔م راشد اور میراجی پرانوں کی فرسودگی کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوئے۔ وہ زمانہ بھی گزر گیا۔ ترقی پسند تحریک چلی وہ وقت بھی اب نہیں رہا۔ اب جدید ادب کا زمانہ آیا ہے۔ شاعری نئی، افسانہ نگاری نئی، تنقید نئی حتیٰ کہ تحقیق بھی نئی۔ پڑھے لکھے نوجوان جو سوجھ بوجھ سے جدیدیت کا نعرہ لگاتے ہیں ان کا نعرہ قبول۔ ان کی تخلیقات میں بھی جان ہے۔ ان کی باتیں بھی فکر انگیز ہیں لیکن ایک بھیڑ بے راہ رو نوجوانوں کی بھی ہے جو کاتا اور لے دوڑی کے اصول پر چلنا چاہتے ہیں۔ جن کی تخلیقات میں نہ فکر کی گہرائی ہے اور نہ بیان کی عمدگی۔ ان کو کون سنبھالے گا۔ ہر نئی چیز پرانی ہو جاتی ہے۔ اس نئے ادب کے بعد جو ادب آئے گا۔ وہ کیا ہو گا۔ اس سے بھی بدتر ہو گا یا بہتری کی تصویر ہو گا۔ ہم تو بساط بھر جو کرنا تھا کر چکے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ سیلاب سب کو خس و خاشاک میں بہالے جائے گا یا کہیں تھم جائے گا ——

نئے علوم، نئے فنون، نئی طرز معاشرت سب ادب پر اثر انداز ہوتے ہیں اردو ادب اس سے مبرا نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ آہستہ روی اور اعتدال پسند

---

* حال میں اُن کا انتقال ہو گیا ہے (ادارہ)

سے آگے بڑھا جائے۔ تیز روی میں ٹھوکر کھانے کا خطرہ بھی ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ غزل ایسی مردود صنفِ سخن میں بھی جدید نگار، قابلِ تعریف اور لائقِ صد داد باتیں نئے انداز سے کہہ جاتے ہیں۔ یہ فالِ نیک ہے لیکن ہر نئے دور میں روایت بشرطیکہ وہ خوش آئندہ ہو قائم رہی ہے۔ روایت کہ محض روایت کہہ کر گردن زدنی قرار دینا بصیرت کی بات نہیں۔

میں نے اپنے گرد و پیش کی بہت سی نئی اور پرانی باتیں کہہ دیں۔ میرے نزدیک یہ باتیں حق ہیں ناحق نہیں ؎

بُت پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
یاس کس دن کے لئے ناحق پرستی کیجئے

شعر و ادب کی کوئی منزل آخری منزل نہیں۔ اس دولت میں جس نے جو بھی تھوڑا بہت اضافہ کیا ہے یا کر رہا ہے قابلِ صد مبارکباد ہے۔

میں زندگی بھر یہ سوچتا رہا کہ ملازمت سے سبک دوش ہو کر سیاسی ہواؤں پر بھی اڑ کر دیکھوں گا اور اس طریقے سے تحریر و تقریر دونوں کے ذریعے ادب کی خدمت کروں گا لیکن ایسے وقت میں کنجِ قفس سے نکلا کہ بال و پر کمزور ہو چکے تھے اب سمجھ میں آیا کہ ادیب کے لئے سیاسی فضا کی ہوا بادِ سموم سے کم نہیں اس لئے منقار زیرِ پر ہونا ہی بہتر سمجھا۔

کارواں آگے نکلتا جا رہا ہے۔ میں ابھی راہ ہی میں ہوں، اور اس شعر کا مصداق بن گیا ہوں ؎

خدا جانے کہاں ہے میری منزل ؛ غبارِ کارواں ہے اور میں ہوں


## ہندوستان کی مسجدیں

از : ضیاء الدین ڈیسائی

سائز کراؤن، ۵۲۰ صفحات آفسٹ کی عمدہ چھپائی، قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے، اسلامی معاشرت میں مسجد کی کیا اہمیت ہے، مسجدوں کی تعمیر کب شروع ہوئی اور تعمیراتی لحاظ سے عہد بہ عہد کیا تبدیلیاں آئیں ان تمام باتوں کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ مسجدوں کے فنِ تعمیر سے متعلق ایک خاص باب ہے

ہندوستان کی مشہور مسجدوں کی متعدد تصاویر شامل ہیں

کے علاوہ اردو و دیگر علاقائی زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں کے لئے مفت فہرست طلب کیجئے

کتابیں ہم اپنے خرچ پر خریداروں کو بھیجتے ہیں

بزنس منیجر :- پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس پوسٹ بکس ۲۰۱ نئی دہلی ۱




## غزل

### مخمور سعیدی

بھیڑ میں ہے مگر اکیلا ہے
اس کا قد دوسروں سے اونچا ہے
دل میں جو چٹکیاں سی لیتا ہے
یہ سیہ، سرد ہاتھ کس کا ہے
اپنے اپنے دکھوں کی دنیا میں
میں بھی تنہا ہوں وہ بھی تنہا ہے
منزلیں غم کی طے نہیں ہوتیں
راستہ ساتھ ساتھ چلتا ہے
ساتھ لے کر سپر محبت کی
اس کی نفرت کا وار سہنا ہے
جس سے ٹوٹا جو اک تعلق تھا
اب تو سارے جہاں سے رشتہ ہے
خود سے مل کر بہت اُداس تھا آج
وہ جو ہنس ہنس کے سب سے ملتا ہے
اب مراسم میں وہ تپاک نہیں
ملنا جلنا یہ چند دن کا ہے
اور تو یاد ہے اسے سب کچھ
وہ مگر خود کو بھول بیٹھا ہے
غم دل کو عزیز رکھتا ہوں
یادگارِ نشاطِ رفتہ ہے
سب چلے، تم بھی اٹھ چلو مخمورؔ
میکدہ بند ہونے والا ہے

# پروفیسر
# عبدالقادر
# سروری

خواجہ احمد فاروقی

آہ یہ دُنیا یہ ماتم خانۂ برنا و پیر
آدمی ہے کس طلسم دوش و فردا میں اسیر

۱۳ مارچ کی رات کو شنکر وشاد کی یاد میں مشاعرہ تھا۔ اُس روز صبح کو کشمیر گرلز کالج کی لیکچرار بلقیس فاطمہ نظیر اللہ کا ٹیلیفون آیا کہ پروفیسر عبدالقادر سروری کا ناگہانی سرینگر میں انتقال ہوگیا اور قضا و قدر نے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ علاج ہو سکتا ؎ چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

سروری صاحب ہندوستان کی تین مشہور و معروف یونی ورسٹیوں میں اُردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہ چکے تھے اور یہ معمولی اعزاز نہیں ہے حیدرآباد اور میسور کی ملازمت ختم کرنے کے بعد وہ کشمیر یونی ورسٹی کی کرسی پر فائز ہوئے۔ سرینگر نسبتاً دُور ہے لیکن اُردو کا کوئی کام اور کوئی تحریک ایسی نہیں تھی جس سے قریبی طور پر وابستہ نہ رہے ہوں۔ انجمن ترقی اُردو ہند، ترقی اُردو بورڈ، ساہتیہ اکادمی اور جشن غالب کمیٹی کے ممبر رہ چکے تھے۔ ۲۹ اور ۳۰ جنوری سنہ ۱۹۷۱ء کو ہمارے شعبہ میں اُردو رسم الخط پر سے می نار تھا اس کی ان کو بے انتہا خوشی تھی اور انہوں نے شرکت کا وعدہ فرمایا تھا لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے شرکت نہ ہوسکی مجھے ۷ فروری سنہ ۱۹۷۱ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ (یہ انکی آخری تحریر ہے جو میرے پاس محفوظ ہے)

حیدرآباد ۷ فروری سنہ ۱۹۷۱ء

محب مکرم

آپ کا خط رسم خط کے سلسلہ میں سرینگر ہوتا ہوا یہاں ایسے وقت ملا کہ آپ کے لئے مضمون لکھنا ممکن نہ تھا۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ فوراً جواب بھی نہ دے سکا یہ سوچ رہا تھا کہ عزیزی رفعت کی شادی کے دعوت نامے کے ساتھ خط بھی لکھ دوں گا۔ یہ ذرا ملتوی ہوگئی۔ ۱۵ فروری ۱۹۷۱ء مقرر ہوئی ہے۔ مجھے توقع ہے آپ اور احتشام صاحب شادی میں شریک ہوسکیں گے۔

ہم ۲۰ مارچ کو انشاء اللہ آپ کے شعبے میں ملیں گے۔ پروفیسر احتشام حسین نے آپ کو خط لکھ دیا ہے۔

۲۲ دسمبر کو میں نے گھر پر فون کیا تھا۔ صاحب زادی سے بات ہوئی تھی۔ پتہ نہیں آپ کو اطلاع ہوئی یا نہیں۔ خط حیدرآباد ملتا تو مضمون لکھ دیتا۔

آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ جموں اور کشمیر میں اُردو کی ادبی تاریخ میرے نے مکمل کرلی ہے۔ تین جلدوں میں لکھی ہے۔ ریاست کی کلچرل اکادمی اُسے چھاپنا چاہتی ہے۔ دیکھئے کب تک چھپ جاتی ہے۔

سب کی خیر و عافیت کا متمنی

مخلص

عبدالقادر سروری

اس خط کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ۲۰ فروری کو ہمارے شعبہ میں ترویتی یونی ورسٹی کا زبانی امتحان تھا۔ اس میں پروفیسر عبدالقادر سروری۔ پروفیسر احتشام حسین اور پروفیسر گیان چند آئے تھے۔ میں اس روز دہلی میں موجود نہیں تھا اس لئے ان دوستوں سے نیاز حاصل نہ کرسکا۔ لیکن حسن اتفاق سے سروری

سے ۲۲ فروری کو حیدرآباد میں ملاقات ہوگئی۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ کے مکان "پھول بن" پر دوپہر کے کھانے کی دعوت تھی۔ اس میں وہ بھی مدعو تھے۔ میں نے کبھی ان کو اتنا خوش وخرم اتنا صحت مند اور اتنا مطمئن نہیں دیکھا! اطمینان کا سبب غالباً یہ تھا کہ رفعت کی شادی کے فرض سے سبک دوش ہو گئے تھے اور کشمیر کی ادبی تاریخ تین جلدوں میں مکمل کر چکے تھے کہنے لگے: "فاروقی صاحب میں نے آپکے حکم کی تعمیل کر دی ہے۔ کشمیر میں اُردو کی ادبی تاریخ تین جلدوں میں مرتب ہوگئی۔ اب اس کے چھپوانے کی ذمہ داری آپ کی ہے۔" یہ میری اُن سے آخری ملاقات تھی۔

۸ مارچ کو حیدرآباد سے سرینگر جاتے ہوئے وہ ذرا دیر کو دہلی میں رُکے اور مجھے اسٹیشن سے ٹیلی فون کیا۔ میری بدقسمتی کہ اس روز ایسا گھرا ہوا تھا کہ ان کی خدمت میں اسٹیشن نہیں پہنچ سکا لیکن جو گفتگو ٹیلی فون پر ہوئی۔ وہ بھی کچھ کم اہم نہیں تھی۔ میں نے عرض کیا کہ سروری صاحب اب آپ میرے پاس دہلی آجائیے۔ ایک صورت نکلی ہے۔ خواہ مخواہ کے بہانے مت کیجئے گا میں آپ کی جگہ ہوتا تو جنت سے بھی بھاگ کھڑا ہوتا۔

بہ فردوس ہم دل نیا سا یدم

کہتے بڑے بڑے سفر کرتے ہیں آپ اس عمر میں، اور جی نہیں گھبراتا آپکا۔" کہنے لگے زندگی تو ذوقِ سفر ہی ہے لیکن حضرت یہاں بھی تو آپ ہی نے بھیجا تھا۔

چہ می کردم اے بندہ پرور خدائے

مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اس سے بڑے سفر پر جانے والے ہیں اور ان کا ذوقِ عمل موت کو بھی ماندگی کا ایک وقفہ سمجھے گا۔

سروری صاحب زندگی بھر علمی کاموں میں مصروف رہے۔ مقالات کو چھوڑ کر جن کی تعداد تین سو کے قریب ہے ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں۔

۱۔ جدید اُردو شاعری
۳۔ پھولبن
۵۔ سراج سخن { ۲۔ کلیات سراج ۴۔ قصۂ بے نظیر } کی ترتیب اور تصحیح
۶۔ زبان اور علم زبان ۷۔ اُردو مثنوی کا ارتقاء ۸۔ دُنیائے افسانہ
۹۔ اُردو کی ادبی تاریخ
۱۰۔ سراج سخن { شاہ سراج اور بہادر شاہ ظفر کے کلام کا انتخاب
۱۱۔ انتخاب ظفر
۱۲۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ
۱۳۔ کشمیر میں اُردو کی ادبی تاریخ۔ تین جلدوں میں

لیکن اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ وہ ہر علمی کام کرنے والے کی فیاضی سے مدد کرتے تھے اور اس معاملہ میں بخل نہیں کرتے تھے۔ وہ مجھے تین جون ۱۹۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

حیدرآباد دکن
مورخہ ۳۔ ۶۔ ۵۹ء

"محب مکرم"

کرم نامہ مورخہ ۲۳ مئی عنایت ہوا۔ شبہ اور اہلِ محبت سے، پرستاروں کی لغت میں کفر کے مترادف ہے۔ آپ کی دی ہوئی بشارت ایک ضخیم مقالہ کی شکل میں مجسم ہوئی۔ اب اس کو پڑھنا ہے۔

محولہ "چار درویشوں" کے بارے میں آپ کو کس طرح کا مواد درکار ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں ان کے بارے میں شاید کچھ زیادہ مواد نہ مل سکے لیکن کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں مل جائے گا۔ کتب خانہ آصفیہ میں دیوان اثر کا ایک قلمی نسخہ ہے ان "چار درویشوں" کے بارے میں وہاں جو مواد چاہئے انشاء اللہ اس کی سبیل نکل آئے گی۔"

سروری صاحب انجمن اساتذہ اُردو جامعات ہند کے بانیوں میں سے تھے۔ اور اس کے سب سے پہلے صدر۔ ان کی صدارت میں انجمن کے تین سالانہ جلسے ہوئے۔ سب سے پہلا اجلاس دہلی میں ہوا۔ دوسرا سرینگر میں اور تیسرا علی گڑھ میں ـــــ ان کو اس کا سخت رنج تھا کہ چوتھا اجلاس اب تک نہیں ہوا۔ وہ برابر اس کی کوشش اور پیروی میں لگے رہتے کہ ہم کہیں سر جوڑ کر بیٹھیں۔ مجھے ان کے ساتھ بحیثیت جنرل سکریٹری انجمن اساتذہ کام کرنے کا شرف حاصل ہوا اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ بے مثل تنظیمی صلاحیت کے مالک تھے اور اُن کو اُردو سے گہری اور سچی محبت تھی جس میں جذبات کم اور علم و عمل کا دخل زیادہ تھا۔

سن ۱۹۶۱ء میں میں یورپ اور امریکہ گیا اور اٹھارہ مہینے کے بعد واپس آیا۔ میری واپسی پر سروری صاحب نے لکھا۔ "رام چندر جی کی غیر حاضری میں ان کے بھائی بھرت تخت و تاج کو سنبھالے رہے۔ اب آپ آگئے ہیں حضرت انجمن اساتذۂ اُردو کو سنبھالئے اس کے ضروری کاغذات آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں"۔

سروری صاحب بڑے اصرار و کوشش سے سرینگر بلواتے تھے اور جو بھی اُردو کے حلقہ کا دوست یا عزیز وہاں پہونچ جاتا تھا اس کے ساتھ بیشتر وقت صرف کرتے تھے۔ میرے حال پر غیر معمولی کرم تھا۔ ۱۸ جون ۶۴ء کے گرامی نامے میں سرینگر سے لکھتے ہیں۔

"محب مکرم

آپ کا تار تین چار دن پہلے عنایت ہوا تھا۔ جواب کی جلدی نہیں تھی۔

اس لئے میں نے کچھ تاخیر سے کام لیا۔ آپ کے نہ آسکنے کا بہت افسوس ہے میں نے خط لکھنے کے بعد آپ کے گھر پر ٹرنک کال کی۔ بیگم صاحبہ سے معلوم ہوا کہ آپ دلّی میں نہیں ہیں۔ کئی دن انتظار کے بعد چونکہ رجسٹرار کو جلدی تھی۔ اس لئے . . . صاحب کو بلوایا۔ یہ بہت اچھا موقع تھا۔ آپ اور بیگم صاحبہ سب یہاں آسکتے تھے اب ایک اور صورت نکالنے کی کوشش کی ہے غالباً اس کا تذکرہ میں نے آپ سے کیا تھا۔ میں نے ایک سمی نار غالب پر مقرر کرنے کی تحریک یونیورسٹی کو بھیجی ہے۔ اس میں آپ کا سرور صاحب، احتشام صاحب اور نورالحسن ہاشمی کا نام بھی تجویز کیا ہے۔"

لیکن میں پانچ برس کے بعد ۱۹۶۹ء کی گرمیوں میں کشمیر پہنچ سکا اور نگین جھیل کی ایک باوسس بوٹ "پی کاک" میں ٹھہرا۔ اس موقع پر انہوں نے مجھے ایک توسیعی لیکچر دینے کے لئے مدعو فرمایا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لئے "شکارے" میں بیٹھ کر آیا کرتے تھے۔ اور خال مرزا ئیف پوری جھیل کو تیر کر پہنچتے تھے۔ وہ اس موقع پر ایک قدیم اُردو شاعر کا شعر پڑھا کرتے تھے جو مجھے یاد نہیں رہا لیکن جس کا مفہوم یہ تھا کہ تم تک رسائی ہو سکے تو یہ بحر و بر کچھ بھی نہیں۔

ایسی محبت اور شفقت کے لوگ اب کہاں؟ اُن کے یہاں نہ "ڈاکٹر زور کی سی شان و شوکت تھی اور نہ عبدالحق صاحب کی سی وسعت اور بے پایانی ایک اُستاد کی سادگی اور بے ریائی تھی جو دلوں کو موہ لیتی ہے۔

ایک فقط ہے سادگی بس پہ بلائے جان ہے تو
عشوہ کرشمہ کچھ نہیں۔ آن نہیں ادا نہیں

اُردو والوں پر یہ الزام تھا کہ وہ زندگی میں کسی کی قدر نہیں کرتے مرنے کے بعد پرستش کرتے ہیں۔ ہم نے ڈاکٹر عبدالحق، سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی اور جگر مرادآبادی کے لئے کیا کیا جواب کچھ کریں گے۔؟ میرے خیال میں اس الزام سے اب اس قبیلۂ عشق کو بری کر دینا چاہئے۔


## خصوصی رعایت

آج کل کے سالانہ چندے میں رعایت سے فائدہ اُٹھائیے
۲ سال کے لئے ۱۲ روپے یا ۱۸ شلنگ یا ۲٫۵ ڈالر
۳ سال کے لئے ۱۷ روپے یا ۲۵ شلنگ ۶ پنس یا ۳٫۵۰ ڈالر


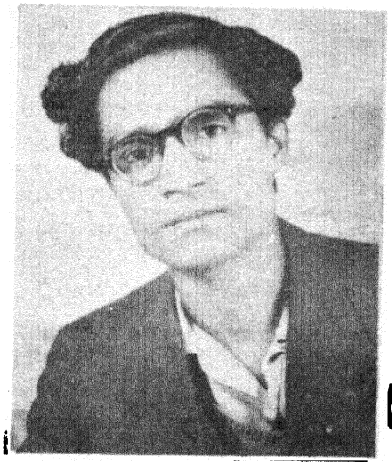

# غزل

مظفر حنفی

حالانکہ وہ حسین نہ تھا کج اداؤں سا
پھر بھی ہمارے ساتھ رہا دھوپ چھاؤں سا

جس شہر میں گیا ہوں لگا مجھ کو اجنبی
جو گاؤں بھی ملا وہ لگا اپنے گاؤں سا

مرمر کے رات دن جو تراشا ہے ایک بُت
وہ بھی ہے پُرجلال پُرانے خداؤں سا

تم سے بھی مل کے جی کو تسلی نہیں ہوئی
تم نے بھی سبز باغ دکھایا وفاؤں سا

ہم دیوتا سمجھ کے جسے پوجتے رہے
دیکھا تو اس کا پاؤں تھا مٹی کے پاؤں سا

فردوس گمشدہ سے بھی شاید نہ بھر سکے
وہ سلسلہ جو ہے مرے اندر خلاؤں سا

میں معذرت طلب تو نہیں ہوں مگر یہ دیکھ
اعمالنامہ ہے کوئی میری خطاؤں سا

فکرِ معاش، فن کی طلب جستجوئے حق
ایک غول میرے پیچھے لگا ہے بلاؤں سا



# ایک درخت کا قتل

اختر اورینوی

**ایک** کوارٹر کے پہلو میں ایک بہت ہی اونچا، مضبوط، گھنیرا اور خوبصورت درخت شہر کے مشہور باغ کو بڑی بد سلیقگی سے کاٹ کاٹ کر بے ربط اور بدوضع کوارٹر کھڑے کیے گئے تھے بے ہنگم، نہ ناک دست نہ نقشہ۔ صرف ایک کوارٹر اسی چھتنار اور بلند درخت کی وجہ سے بہت بھلا لگتا تھا، ہرا بھرا، سایہ دار۔ ماحول کے بے کیف سپاٹ پن اور بدآہنگی کو دور کرنے والا۔ گہری جڑیں، سڈول، بھاری بھرکم، اونچا تنا، پھیلی ہوئی صحت مند شاخیں، سرسبز کونپلیں، سندر ہرے بولتے ہوئے پتے۔ اس پیڑ کی سربلندی کو دیکھ کر جی خوش ہو جاتا تھا اور آسمان کی طرف نظریں اٹھ جاتی تھیں۔ دل میں بڑا اعتماد اور حوصلہ پیدا ہوتا تھا جس مٹی سے ایسا وشال درخت اُگے وہ مقدس محسوس ہوتی تھی۔ اس پرانے باغ کے نہ جانے کتنے خوبصورت اور پھل دار درخت کاٹ کر پھینک دیئے گئے ہوں گے۔ آم، لیچی، جامن، امرود اور شریفے کے پیڑ۔ اُفتادہ زمینوں اور بنجر قطعوں کی کمی نہ تھی لیکن نہ جانے کس جبلت کی تسکین کے لیے یہی حسین باغ قتل گاہ بنایا گیا۔

اس پرانے باغ کی ایک تاریخ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شاہی وقت کا باغ تھا۔ ایک فراخ دل نواب نے اپنے جگری دوست ایک مہاراجہ کو تحفتاً یہ باغ پیش کیا تھا۔ انہیں دنوں ایک کامل فقیر باغ کے ایک گوشے میں دھونی رمائے بیٹھا۔ مہاراجہ نے کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ اسے نیک شگون سمجھا اور پہلو میں ایک قطعہ اراضی بھی شاہ صاحب کو دیدی۔ آج بھی اس احاطے میں قبریں موجود ہیں۔ خدا رسیدہ فقیر کا سالانہ عرس ہندو مسلمان سب دھوم دھام سے مناتے ہیں جس عظیم الشان درخت کا ذکر ہے شاہ صاحب کی قبر پر سایہ کیے ہوئے تھا جیسے چتر لگانے کی سعادت حاصل کر رہا ہو۔ لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ یہ درخت بھی متبرک ہے اور اس خطے کی خاک پاک ہے جب انگریزوں کا راج ہوا تو لیفٹننٹ گورنر بہادر نے سخت دباؤ ڈال کر یہ باغ مہاراجہ سے اونے پونے خرید لیا یہیں سرکار بہادر کی کوٹھی بنی مگر باغ کا بڑا حصہ قائم رہا۔ اور وقت پر پھل دیتا رہا۔ قبریں رفتہ رفتہ منہدم ہو گئیں اور ان کے نشانات بھی مٹتے گئے لیکن پیر صاحب کی قبر جیسی تھی ویسی ہی رہی۔

۱۸۵۷ء کے ناکام ہندوستانی انقلاب کے بعد اسی باغ میں کئی مجاہدوں کو سولی پر لٹکا کر شہید کر دیا گیا۔ انگریزی راج محل خون اور گوشت کے گارے سے تعمیر ہوا۔ اس وشال پیڑ نے یہ خونیں ڈرامہ دیکھا تھا۔

خلقت کہتی ہے کہ اس عجیب درخت کی خون شہداء سے آبیاری ہوتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر درخت کے پتے یا شاخیں کوئی توڑتا تو ان سے سرخ خون ٹپکنے لگتا تھا۔ اسی وجہ سے جب نئے کوارٹر باغ کے درختوں کو کاٹ کاٹ کر بنائے جانے لگے۔ تو کسی بڑھئی کی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ اس متبرک زندہ جاوید درخت پر آرا چلائے۔

یہ درخت عجوبۂ روزگار تھا۔ اس کا نام کوئی صحیح طور پر نہیں جانتا تھا کوئی کچھ کہتا تھا اور کوئی کچھ۔ نہ پھول نہ پھل۔ مگر سریالی وشادابی میں سکھ اور سکون دل و جان۔ یہ بھی مشہور تھا کہ انقلاب ۱۹۵۷ء کے پہلے پھول لگتے تھے۔ پھل لگتے تھے اس بات کی شہرت بھی تھی کہ فرنگیوں کی حکومت کے بعد تین چار بڑے خوشبودار پھول کھلے اور لال لال پھل آئے اور فرنگیوں کو بڑا تعجب ہوا، ادھر سالوں سے کسی نے پھول دیکھے نہ پھل کھائے۔ شہر بھر میں ایسا کوئی پیڑ نہ تھا۔ ریاست اور ملک بھر میں لاثانی اور فرد ہو تو عجب نہیں مجھے اس درخت کے دوارے بڑی تسکین ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آندھیوں اور طوفانوں کو آڑے لگا۔ وہ ہمارا سپر تھا، سہارا تھا، مربی تھا، ہمسایہ تھا۔ ساتھی تھا، دوست اور غمگسار تھا۔ وہ قطب نما تھا۔ ایک عظیم و رفیع علامت تھا۔ پورے احاطے کی انفرادیت اس سے قائم تھی۔ میں پہروں اُسے دیکھتا رہتا تھا۔ ہر موسم میں اس کی الگ بہار تھی۔ صبح دوپہر شام جب دیکھئے وہ دلکش تھا۔ چاندنی راتوں میں اس

کا حُسن دیدنی تھا۔ اندھیری راتوں میں وہ ایک بلند و بالا اور قوی جاگتا ہوا سنتری دکھائی دیتا تھا اور اس کی حفاظت میں ہم سب لوگ سکھ کی نیند سوتے تھے۔ اس کی خاموش ہم کلامی میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ کبھی تو میں یہ محسوس کرتا کہ اس درخت کا بیج میرے دل میں ہے۔ کبھی نہ کبھی وہ آنکرائے گا، اور ایک عظیم و سرفراز شجر بن جائے گا۔

اس شاداب درخت کو کاٹ کر گرانے کی برسوں سے کوششیں ہو رہی تھیں لیکن اس کی تقدیس جاننے والے بڑھئی اور مزدور اُسے کاٹنے سے ڈرتے تھے۔ درخت کی رگوں میں لال لہو تیرتا ہے اور اس کا سایہ پیر صاحب کی خدمت گزاری کرتا ہے وہ قبر کے کنارے جیتے جاگتے پاسبان کی طرح چوکس کھڑا تھا کبھی کوئی ٹھیکہ دار دُور کے شہروں سے مزدور لا کر اس پاک پیڑ کو کاٹ کے اس کی لکڑیاں بیچ کر نفع کمانا چاہتا تھا لیکن یہ دیکھا گیا کہ درخت کے کسی تنے یا شاخ پر تبر چلاتے ہی سرخ عرق ٹپکنے لگتا اور کارندوں پر دہشت طاری ہو جاتی اور کام رُک جاتا۔ ایک بار کوئی کلہاڑا چلانے والا درخت کی کسی اونچی شاخ سے گر کر مر گیا۔ کبھی کوئی مزدور خطرناک طور پر بیمار پڑ جاتا۔

غرض یہ کہ حیات اور رحمت کا علمبردار درخت فضا کی رفعتوں پر لہلہاتا رہا اور اس کا ماحول امن کا گہوارہ بنا رہا۔ اُسے دیکھ کر شکتی اور شانتی کا احساس ہوتا تھا۔

پچھلی گرمیوں میں نہ جانے کہاں سے ایک سخت دل اور بے باک ٹھیکہ دار کو انجان اور ڈھیٹ کارندے مل گئے۔ اور ایک نئی ترکیب سے اس شاندار پیڑ کا قتل شروع ہوا۔ بڑے بڑے لانبے اور موٹے رسّوں سے اُسی درخت پر پھانسیاں بنائی گئیں۔ بالائی پتلی شاخوں کو کاٹ کاٹ کر پھانسی چڑھایا جانے لگا۔ پھر بڑے تنوں کی باری آئی اور اُنہیں آرے سے کاٹ کاٹ کر پھانسی پر لٹکایا گیا۔ کئی مزدور کٹے مُوئے تنوں کو آہستہ آہستہ جھلاتے ہوئے زمین پر لے آتے۔ یہ اہتمام اس لئے تھا کہ کواڑوں کو نقصان نہ پہونچے۔ یہ پیڑ جڑ کے پاس سے گرایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کا وقار و جلال لرزہ پیدا کرتا تھا اس میں زمین کا جان بخش رس تھا، بلند آسمان کے کرنوں کی روشنی اور دھڑکتی ہوئی زندگی کی شادابی تھی۔

پندرہ دنوں تک اس درخت کو پھانسی دی جاتی رہی۔ عضو بہ عضو لال لال عرق بہتا رہا پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد خون کے چکتوں کی طرح جم جاتا۔ اس کے عرق کا رنگ ببول کے گوند کی طرح پیلا نہ تھا۔ کواڑوں کی نالیوں میں لال لوتھڑے کیچڑ کے ساتھ مِل کر بہہ رہے تھے۔

اچانک کئی مزدور بیمار پڑ گئے اور کئی موٹے موٹے رسّے پارہ پارہ ہو گئے۔ پندرہ دنوں کے لئے کام رُک گیا۔ لانبے لانبے بالوں اور چڑھی ہوئی آنکھوں والے ٹھیکہ دار کو بڑی تشویش ہوئی۔ محلّے کے لوگوں میں چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں اور پیر صاحب کی کرامات کے چرچے ہونے لگے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو چاہتے تھے کہ یہ اونچا جھما ت درخت کٹے تو وہ اپنے کواڑوں کے چھوٹے چھوٹے احاطوں میں مولی، گوبھی، آلو اور چقندر اُگا کر کچھ پیسے حاصل کر لیں۔ اس عظیم درخت کی قلمرو میں مولی اور چقندر کہاں اُگ سکتے تھے۔ ہاں امن، سکون، طمانیت، راحت اور حُسن کی نشو و نما ہوتی رہتی تھی اور چین کی برکھا برستی تھی۔

کام پھر شروع ہو گیا۔ درخت کے بڑے بڑے موٹے تنے کٹنے لگے۔ کئی تنوں سے جہازی رسّے کئی سمتوں میں باندھے جاتے تھے اور اُن کے سرے درجنوں مزدور زمین پر کھڑے تن کر پکڑے رہتے تھے۔ درخت کے تنوں پر کلہاڑے اور آرے سے تیز دست مزدور اُس کے جوڑ بند کاٹتے جاتے تھے اور مضبوط رسّوں سے باندھ کر انہیں آہستہ آہستہ جھلا جھلا زمین پر کواڑوں سے بچا بچا کر گرایا جاتا تھا۔ دُور سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے گھٹیلے بدن کے پہلوانوں کو پھانسی دی جا رہی ہے۔ اور ان کی جسیم لاشیں زمین پر پڑی ہیں روزانہ دو ہی تین تنے کاٹے جا سکتے تھے اور اُنہیں نیچے لانا بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ رسّے کئی پہلوؤں سے باندھے جاتے اور کئی سمتوں سے کھینچے جاتے تھے اور مرکزی رسّے کو دھیرے دھیرے ڈھیل دے کر اس حساب سے دیو قامت تنوں کے ٹکڑوں کو کواڑوں کی چھتوں اور دیواروں سے بچا بچا کر زمین پر گرایا جاتا تھا کہ ان پر ضرب نہ پڑے۔ پھر بھی زور کا دھماکہ ہوتا تھا اور در و دیوار لرز جاتے تھے۔

چند دنوں میں جیتے جاگتے، شاداب و مسرّت بار درخت کا عضو عضو کاٹ ڈالا گیا جیسے پہلے لوگوں کو صلیب پر چڑھانے کے بعد اُن کی ہڈیاں توڑ دیتے تھے۔ میرا ذہن ہمیشہ بھر تک سولی پہ چڑھتا رہا اور میرے دل کو صلیب دی جاتی رہی۔

اب ایک محیط رعب دار جڑ ہلا تنا اور اسی سے نکلے ہوئے دو شاخوی تنوں کے ٹکڑے بے برگ و بار بے دم ہو کر رہ گئے۔ اوپر کے دونوں تنوں سے بندھے رسّے جھول رہے تھے۔ ایک صبح میں اپنے احاطہ میں ٹہل رہا تھا۔ میری نظر اس ٹھنٹھ درخت پر پڑی۔ زمین پر تنوں کی لاشیں بے سدھ بکھری پڑی تھیں۔ بہت سے تنے اور شاخیں ٹھیکہ دار بیل گاڑیوں میں لے جا چکا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سامنے ایک دیو قامت علیل ہے۔ اس کا عظیم دو شاخہ آسمان تک بلند ہونا چاہتا تھا اور مہیب دستہ دھرتی کے ہاتھوں میں ہے۔ اور اب شکتی شالی دھرتی کے ہوئے تنے کے چھوٹے چھوٹے ٹونوں کو چوٹی پر جما کر شست باندھے گی اور قاتلوں پر بھرپور نشانہ لگائے گی ——

ایک روز دو شاخہ بھی کاٹ دیا گیا۔ مگر گرتے گرتے دو شاخہ کے ایک بازو نے ایک کواڑ کی دیوار سے ٹکرا کر اُسے شق کر دیا اور دوسرے بازو نے دوسرے کواڑ کی گیراج کی چھت کو پارہ پارہ کر ڈالا۔

نہ جانے کیوں مہینوں قتل و غارت کا کام پھر ٹھیکیدار نے روک دیا اور وسطی جڑ بیلا تنا دیوار سے اٹکی ہوئی لاش کی طرح کھڑا رہا۔

ہفتوں یہ دردناک تناقتول امن و شادابی کی علامت بن کر میرے دل میں تیر نیم کش کی طرح پیوست رہا۔ اور دو شاخے کے دونوں بازو کسی عظیم ٹوٹی ہوئی بیساکھی کے بالائی حصوں کی مانند اُس سرو تن بُریدہ درخت کی لاش کے سامنے زمین پر پڑے رہے۔

بیساکھ اور جیٹھ کے مہینے ختم ہو گئے اور اساڑھ آگیا۔ وقفے وقفے سے بادل کے ٹکڑے آئے اور کچھ پھڑکاؤ ہوتا رہا۔ ایک صبح رُوح پرور معجزہ رُونما ہوا اُسے دیکھ کر ہم سب خوشی سے نہال اُٹھے۔ چند ہی دنوں بعد ٹھیکیدار پھر نمودار ہوا اور درخت کے وسطی تنے پر مزدوروں کو آرا چلانے کے لئے آمادہ کیا۔ پہلے کلہاڑیاں چلنے کی آوازیں آئیں ہم چوکنا ہو گئے! اور بھاگتے ہوئے مقتول درخت کی طرف دوڑ پڑے دیکھا کہ درخت کو جڑ سے کاٹا جا رہا ہے۔

ہم لوگوں نے ٹھیکیدار اور عملوں سے پرزور احتجاج کیا اور انہیں صاف صاف کہہ دیا کہ جڑ والا تنا ہرگز نہیں کٹے گا۔ جو زمین پر تنوں کے گرے ہوئے ٹکڑے ہیں اُنہیں چاہو تو اٹھا کر لے جاؤ۔ جڑ میں اب ہرگز ہاتھ لگانے نہیں دیا جائے گا۔ تند و تیز مجادلے کے بعد ٹھیکیدار اور اس کی ذریت دفع ہوئی اور دُوسرے دن وہ لوگ تنوں کے افتادہ ٹکڑے لاد کر لے گئے۔

مجروح جڑ بیلا تنا صبر، استقلال، اطمینان اور اُمید کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بالائی پہلو میں سرسبز نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں اور کواڑوں کی چھتوں سے اُونچی چند نئی ہری بھری شاخیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔

وہ رحمت نشاں درخت مر کر پھر جی اٹھا تھا۔


## پبلیکیشنز ڈویژن

نے طے کیا ہے کہ اس ادارے کی طرف سے شائع ہونے والے رسائل کے خریداروں کو ہماری مطبوعات کی خریداری پر ۲۰ فیصد کی رعائت دی جائے گی۔ آرڈر پانچ روپے سے کم نہ ہو اور آرڈر کے ساتھ خریداری نمبر لکھنا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں اُردو، ہندی، انگریزی کے علاوہ علاقائی زبانوں کی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں۔ کتابوں کے انتخاب کے لئے فہرست طلب کیجئے جو آپ کی خدمت میں مفت ارسال کی جائے گی۔

بزنس منیجر: پبلیکیشنز ڈویژن پیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱


# غزل

## مغیث الدین فریدی

بے شوق طلب، بے ذوق نظر، بے رنگ تھی اُن کی گل بدنی
یہ کوہکن مجنوں کی نظر شیریں بھی بنی لیلیٰ بھی بنی

دیکھے ہوئے اُن کو دیر ہوئی ہر نقش ابھی تک تازہ ہے
بے گانہ دشی، مستانہ روی، جادو نظری، شیریں سخنی

اپنا بھی گریباں دیکھ ذرا، پھر میرے جنوں پر ہنس لینا
عادت میں تری ہیجان شکنی فطرت میں مری زنداں شکنی

ہم اپنے ہی گھر میں رہتے تھے جب تیری نظر میں رہتے تھے
اب روز ہمیں ترپاتی ہے اے دوست وطن میں بے وطنی

پھولوں میں جھلکتے ہیں چہرے شاخوں پہ گماں آغوش کا ہے
کچھ ایسی بسی ہے نظروں میں گل پیرہنی، نازک بدنی

شعلوں میں بکھرتے ہیں جو سر قسمت پہ فریدی طنز نہ کر
غم ایسی ہی نعمت ہے جس کو پاتے ہیں یہاں قسمت کے دھنی



# تبصرہ نگاری کا فن

شمس الرحمٰن فاروقی

تبصرے کے بارے میں چھان بین کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ اخلاقی، کمتی، علمی، اخلاقی پہلو سے بات کی جائے تو اس طرح کے سوال اٹھائے جائیں گے۔ تبصرے میں غیر جانب داری کا کیا مقام ہے؟ مبصر کے لئے کتاب سے کس حد تک واقف ہونا ضروری ہے؟ تبصرہ نگار کو کتاب کے نقائص کی نشان دہی اور اس کے محاسن کی تعریف میں کیا تناسب رکھنا چاہئے وغیرہ کمتی چھان بین میں کچھ اس طرح کے سوالوں سے بات شروع ہوگی۔ تبصرہ فن ہے یا مشق یعنی Art ہے یا Skill دوسرے الفاظ میں، کیا تبصرہ نگار بھی شاعر کی طرح تلمیذ الرحمٰن ہوتا ہے یا مشق و مزاولت کے بل بوتے پر ہر شخص تبصرہ نگار بن سکتا ہے؟ تبصرہ کتنا طویل ہونا چاہئے؟ تبصرہ نگاری اور تاثرات نگاری میں کیا فرق ہے؟ کیا مبصر کے لئے ضروری ہے کہ وہ بھی اس فن کو برتتا ہو جس کا اظہار کتاب میں کیا گیا ہے؟ یعنی کیا شعری مجموعے کے مبصر کا شاعر ہونا ضروری ہے؟ علمی نقطۂ نظر سے گفتگو میں صرف ایک ہی سوال ہوگا یعنی یہ کہ تبصرہ اور تنقیدی مضمون میں کیا فرق ہے۔

میں اس مختصر سے مضمون میں تبصرہ نگاری کی تاریخ اور اردو کے اچھے یا مشہور تبصرہ نگاروں کے بارے میں کچھ نہ کہوں گا۔ حالی سے لے کر آل احمد سرور محمد حسن عسکری سے لے کر محمود ایاز تک اردو میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں رہی ہے جنہوں نے بہت اچھے تبصرے لکھے ہیں۔ ان مسائل پر معلومات حاصل کرنے کے اور بھی ذرائع ہیں۔ میں تبصرہ نگاری کے صرف اخلاقی اور علمی مسائل پر کچھ ضروری اشارے کروں گا۔

اخلاقی مسائل کو میں نے اس لئے اہمیت دی ہے کہ یہی مسائل تبصرے کے قاری، کتاب اور مبصر سے براہ راست متعلق ہیں۔ اور یہ رشتہ نہ صرف براہ راست ہے بلکہ بہت گہرا اور اصلی بھی ہے۔ بحیثیت ایک قاری میری دلچسپی صرف یہ ہے کہ میں کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل کروں مجھے اس بات سے چنداں سروکار نہیں ہے کہ تبصرہ نگار کسی فن کا مظاہرہ کر رہا ہے یا کسی مشق یعنی Skill کا؟ مجھے اس سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے کہ جو تبصرہ میں پڑھ رہا ہوں اس میں اور کسی تنقیدی مضمون میں کیا فرق ہونا چاہئے۔ یہ کمتی سوالات تو محض طالب علموں کی دلچسپی کے ہیں، علمی سوالات کی اہمیت صرف تبصرہ نگار کے لئے ہے لیکن اخلاقی سوال میں تینوں شرکا (قاری، کتاب اور مبصر) پوری طرح الجھے ہوئے ہیں اس لئے اس سوال کو حل کر لیا جائے تو تبصرہ نگاری کے بارے میں بہت سی بنیادی باتیں صاف ہو جائیں گی۔

کچھ دن ہوئے ایک معروف شاعر نے اپنے دیوان کے دیباچے میں لکھا کہ تبصرے کی نوعیت محض ایک اشتہار کی ہوتی ہے اس افسوسناک نظریے پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم

ہوگا لیکن حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے کہ ادبی برادری کا ایک بڑا اور سنجیدہ طبقہ تبصرے کے اخلاقی مسائل سے اس درجہ بے خبر ہے کہ وہ اسے محض ایک جانب دارانہ تقریظ سمجھتا ہے۔ بلکہ تقریظ تو پھر بھی کتاب کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کر کے ہی لکھی جاتی تھی۔ لیکن اشتہاری عبارت بنانے والے کو تو اکثر یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ وہ کس چیز کی تعریف کر رہا ہے۔ عبارت بنانے والے سے کہہ دیا جاتا ہے کہ بھائی ایک نیا صابن بازار میں آنے والا ہے، اس کے لئے عبارت بنا دو، وہ اپنی جودتِ طبع کو کام میں لا کر کوئی دلچسپ یا توجہ انگیز عبارت گھڑ دیتا ہے۔ اگر تبصرہ اتنے ہی پست درجے کی چیز ہے تو پھر ادیب اور قاری (ادیب خاص طور پر، قاری عموماً) اپنی پسند کا تبصرہ نہ پا کر اتنے برہم کیوں ہوتے ہیں۔؟

ہماری جدید ادبی صورت حال کا ایک عبرتناک پہلو یہ ہے کہ ہم ایک طرف تو اپنے اوپر اچھے سے اچھا تبصرہ دیکھنے کے مشتاق رہتے ہیں اور اس کے لئے سعی بھی کرتے ہیں، اور دوسری طرف تبصرے کو اشتہار بازی کی سی گھٹیا چیز بھی کہنے پر مصر رہتے ہیں۔ یہ رویہ خود اعتمادی اور فنی ایمان داری کے فقدان کی دلیل ہے۔ اردو میں آزاد اور بے خوف تبصرہ نگاری کی روایت کے عدم استحکام کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ادیبوں نے اکثر تبصروں سے اشتہار کا سا کام لیا ہے یا لینا چاہا ہے۔ چنانچہ اب بھی اگر کسی کتاب پر تعریفی یا تنقیصی تبصرہ ذرا بھی ہٹ سے ہٹا ہوا نظر آئے تو فوراً یہ افواہ اڑ جاتی ہے کہ مبصر یا رسالے کا مدیر مصنف کا دشمن یا دوست ہے۔ دراصل ہمارے یہاں تقریظ، دیباچہ اور تبصرہ ایک ہی قبیل کی چیز سمجھ لئے گئے ہیں، بس اس فرق کے ساتھ کہ تقریظ میں تعریف زیادہ مبالغہ آمیز ہونا چاہیئے۔ دیباچے میں تعریف تو ہو لیکن مبالغہ کی آرائش ذرا کم ہو، تبصرے میں تعریف تو دیباچہ نما ہو لیکن ساتھ ہی کتاب کی قیمت، پبلشر کا نام، اور دیگر تفصیلات بھی درج ہوں۔ اگر تبصرہ نگار یا مدیر مصنف سے ناراض ہے تو مستقل عنوانات (قیمت، پبلشر کا نام وغیرہ) تو ویسے ہی رہیں۔ بس مبالغہ آمیز تعریف، مضحکہ آمیز تنقیص میں بدل جائے۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ تبصرہ اگر تعریف پر مبنی نہ لکھا جانا ہو تو تقریظ کی روایت کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ غالب نے جب آئینِ اکبری پر تقریظ لکھی تو سرسید کی مبالغہ آمیز عیب جوئی نہیں کی تھی بلکہ عیب جوئی سرے سے کی ہی نہیں تھی اور صرف یہ لکھا تھا کہ زمانہ بدل رہا ہے، لیکن تم ابھی تک پرانی باتیں لئے پھر رہے ہو۔ انگریزوں کو دیکھو، وہ کس طرح پانی پر دھوئیں کے جہاز چلاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ گویا غالب نے اصولی اختلاف کیا تھا، جوتیاں لے کر پل نہیں پڑے تھے۔ لیکن میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو کے مصداق جب ہمارے اردو ادب کے شیروں نے تقریظ کی روایت کو پرانے ادب کے چنگل سے اکھاڑ کر نئے ادب کی کھیتی میں تبصرے کے نام سے آباد کیا تو آسانی سے یہ بات نظر انداز کر دی کہ تقریظ میں اگر عیب چینی بھی ہو تو اصولی اور علمی ہوتی ہے۔ چنانچہ تعریف کے تیور تو وہی رہے صرف ظاہری رکھ رکھاؤ بدل گیا۔ لیکن اظہار ناراضی کے لئے اصولی اور علمی متانت کو بالائے طاق رکھ کر وہ کڑوے تیور اختیار کئے گئے کہ کتاب کا پتہ پانی ہونے لگا۔ لہٰذا جہاں اس طرح کے جملے ہمارے تبصروں میں بہت عام ہیں کہ کتاب اردو ادب میں اضافہ ہے، لازوال ہے، غیر معمولی کارنامہ ہے، شاعر/افسانہ نگار/تنقید نگار نے اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے فنی نزاکتیں اور فکری باریکیاں موصوف پر ختم ہیں وغیرہ۔ وہاں ایسے بھی خشمناک اور سنگین فیصلے بھی دکھائی دیتے ہیں: مصنف جاہل ہے، شاعری/تنقید/افسانہ نگاری کے فن سے قطعاً بے گانہ ہے، تعجب ہے کہ موصوف اس قدر کم علم ہیں کہ ..... وغیرہ۔

یہاں پر یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ اگر ہمارے تبصروں کی بیشتر تعداد ایسی ہی سطحی، کم کوشش، تقریباً جھوٹی (اور اگر جھوٹی نہیں تو حد سے زیادہ تعمیم زدہ) تحریروں پر مشتمل ہو تو قاری ایسی چیزوں کو برداشت کیوں اور کیسے کرتے ہیں؟ احتجاج کیوں نہیں کرتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بہت کم زور، نیم جان سا احتجاج کبھی کبھی ضرور ہوتا ہے، لیکن عموماً قاری یا تو بے خبری کی وجہ سے تبصرے کو صحیح سمجھتا ہے اور اس سے اتفاق کرتا ہے، یا پھر جان بوجھ کر ایسی تحریر کو قبول کرتا ہے، کیوں کہ وہ بھی مصنف کے لئے اسی قسم کا معاندانہ رویہ رکھتا ہے جیسا کہ مبصر یا مدیر کا تھا۔ لاعلم قاری بے چارہ تو دونوں طرف سے مارا جاتا ہے کیوں کہ اگر وہ مصنف اور مدیر/مبصر کے تعلقات سے بے خبر ہے تو تبصرے کو بالکل صحیح سمجھ کر قبول کرتا ہے، اور اگر وہ مصنف سے بالکل بے خبر ہے، یا اس کے بارے میں محض ایک دھندلا سا تصور رکھتا ہے تو اس کی تمام تر رائے اس تبصرے کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے جو اس نے پڑھا ہے۔ لیکن بڑا قصور تو باعلم قاری کا ہے، جو اپنی رایوں، اپنے تعصبات، اپنے جہل کا انعکاس تبصرے میں دیکھنا پسند کرتا ہے اور اس طرح انتہا پسندانہ تبصرہ نگاری کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ جس طرح جمہوریت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جمہوریت میں ہمیں ویسی ہی حکومت ملتی ہے جس کے کہ ہم مستحق ہوتے ہیں۔ اسی طرح تبصروں کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ قاری کو تبصرے بھی ویسے ہی ملتے ہیں جن کا کہ وہ مستحق ہوتا ہے۔ آج کا قاری پچاس برس پہلے کے لوگوں کی طرح ادبی مسائل

اور صورت حال سے کلیتہً بے خبر نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے تعصبات ہوتے ہیں۔ بیشتر معروف لکھنے والوں کے بارے میں اس کی ایک ذاتی رائے بھی ہے جو ہمیشہ ادبی بنیادوں پر نہیں قائم کی جاتی۔ چنانچہ اگر مجھے شاعر الف سے کسی وجہ سے کد ہے تو میں اس کی کتاب پر سخت تبصرہ پڑھنا پسند کروں گا۔ اور ایسا تبصرہ پڑھ کر خوش ہوں گا، یہ نہ سوچوں گا کہ مبصر نے کتاب کو غور سے پڑھا بھی ہے کہ نہیں۔ چنانچہ اگر مبصر نے لکھ دیا ہے کہ شاعر زیر بحث کا اسلوب دوسرے شعرا سے مستعار ہے تو میں اس رائے کو فوراً قبول کروں گا اور اس بات پر اعتراض نہ کروں گا کہ مبصر نے مثالیں نہیں دی ہیں۔ لیکن اگر مجھے شاعر سے کسی وجہ سے ہمدردی ہے تو میں فوراً اعتراض کروں گا کہ دوسرے شعرا سے کھلے استقادے کی مثالیں کیوں نہیں دی گئیں۔

لیکن تبصرے میں جانب داری کا مسئلہ اتنا آسان اور سادہ نہیں ہے جتنا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ اوپر کی بحث سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ تبصرے میں غیر جانب داری بہت بڑی چیز ہے، اور تبصرہ دیباچے یا تقریظ سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ لیکن یہ نتیجہ پوری طرح درست نہ ہوگا۔ کیوں کہ واقعہ یہ ہے کہ تبصرے میں مکمل جانب داری نہ ممکن ہے نہ مستحسن۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ کسی رسالے میں جو مضامین چھپتے ہیں وہ لازماً ادارے کی پالیسی کے آئینہ دار نہیں ہوتے، لیکن جو تبصرے چھپتے ہیں وہ یقیناً اس کی پالیسی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یعنی یہ تو ممکن ہے کہ کسی ترقی پسند پرچے میں جدیدیت پر مضمون چھپ جائے، جو یک گونہ تعریفی ہو، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اس میں کسی جدید شاعر کے کلام پر تبصرہ بھی چھپ جائے تو توصیفی اور تحسین آمیز ہو۔ مضمون نگار کو تو آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرے، چاہے وہ خیالات ادارے کے نظریات سے مکمل طور پر ہم آہنگ نہ ہوں۔ لیکن تبصرہ نگار ادارے کے ذہن کا نمائندہ ہوتا ہے، تبصرہ ہی پڑھ کر یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس پرچے کے ارباب حل و عقد کس قسم کا ادب پسند کرتے ہیں۔ کسی پرچے میں شاعر الف کی نظم یا افسانہ نگار ب کا افسانہ چھپ جانا لازماً یہ معنی نہیں رکھتا کہ یہ رسالہ شاعر الف یا افسانہ نگار ب کے ادبی نظریات و اسالیب اظہار کو نظر استحسان سے دیکھتا ہے۔ لیکن اگر اس میں شاعر الف یا افسانہ نگار ب پر تحسینی تبصرہ چھپے تو یقیناً ایسا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا تبصرہ نگاری میں کلی طور پر جانب داری کا دعویٰ صرف وہی کر سکتا ہے جو یا تو دیوتا ہو یا بہت بڑا احمق۔ اگر کوئی مبصر ہر طرح کی کتاب پر ایک ہی طرح کا تبصرہ کرتا ہے تو یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ یا تو اس کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے یا پھر اس نے وہ کتابیں پڑھی نہیں ہیں بلکہ محض فارمولے کا استعمال کر کے تبصرہ نگاری کی داد دے رہا ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ ہر رسالے کا اپنا مزاج ہوتا ہے (یا ہونا چاہیئے) اور کتابوں پر تبصرے رسالے کے مزاج اور کردار کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر "معارف" میں افتخار جالب کے مجموعۂ کلام پر تحسینی تبصرہ نہیں ہو سکتا، اور نہ ہونا چاہیئے۔ یہ ہاں میں عشقیہ گیتوں کے مجموعے پر تبصرہ اگر ہوگا تو محض مختصراً تذکرۃً ہوگا یا نکتہ چینی سے مملو ہوگا۔ شاعر میں کسی ایسی کتاب پر توصیفی تبصرہ نہیں ہو سکتا جو اردو زبان یا سیماب اکبر آبادی کی مخالفت کرتی ہو، وغیرہ۔ ان تبصروں میں اس بات کا لحاظ نہ رکھا جائے گا۔ (اور نہ رکھا جانا چاہیئے) کہ یہ کتابیں اصلاً کتنی اچھی، کتنی مدلل، خوب صورت یا پر زور ہیں۔ لہٰذا اس حد تک تو تبصرہ جانب داری کا اعلان ہوتا ہی ہے۔

دوسری طرف ہر مبصر کا بھی نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ فرض کیجئے اردو مخالف کتاب جو شاعر میں تبصرے کے لئے آئی اسے ایک ایسے شخص کے پاس بھیجا گیا جو اردو مخالفوں کے بارے میں جذباتی رویہ نہیں رکھتا، بلکہ عقلی اور استدلالی سطح پر ان سے اختلاف رائے رکھتا ہے۔ ایسے شخص کا تبصرہ اس شخص کے تبصرے سے مختلف ہوگا جو اردو کے مخالفوں کے بارے میں جذباتی رد یہ رکھتا ہے۔ اول الذکر مبصر کتاب کی علمی اور استدلالی خامیوں کا تذکرہ کرے گا، موخر الذکر مبصر، ممکن ہے، مصنف کتاب کو ملک دشمن، فاشسٹ، مجرم اور بے ایمان کہہ دے۔ دونوں تبصروں میں اصول تو ایک ہے لیکن رویہ اور نقطۂ نظر کے اختلاف نے تبصروں میں زمین آسمان کا فرق کر دیا۔ ممکن ہے اردو مخالف مصنف نے اپنی رائے کا اظہار علمی اور سائنسی ایمانداری کے ساتھ کیا ہو اور اس میں تنگ نظری، بے ایمانی اور شر انگیزی کا شائبہ تک نہ ہو۔ لیکن جذباتی نقطۂ نظر والے مبصر نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ عقلی نقطۂ نظر والے مبصر سے مختلف تھا۔ اور اس نے مصنف کی نیت کو بھی معرض بحث میں لے کر اسے بدنیتی سے متہم کیا۔

یہ صورت حال تخلیقی ادب کی کتابوں پر تبصروں میں اور زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ افتخار جالب کی ہی مثال پر لیجئے۔ افتخار جالب ایک جدید لیکن انتہا پسند شاعر اور نقاد ہیں۔ بہت سے پرچے ایسے ہیں جو جدیدیت کے مخالف نہیں ہیں لیکن انتہا پسندی کے اس اظہار سے خوف کھاتے ہیں جو افتخار جالب کے یہاں نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں افتخار جالب پر تبصرہ کسی اور نہج سے ہوگا۔ وہ ان کے نکالے ہوئے نتائج سے اتفاق تو کریں گے لیکن احتیاط کے ساتھ۔ وہ انہیں جدید تو مانیں گے لیکن گم راہ، یا کم سے کم گمراہی کی طرف مائل۔ قدامت پسند رسالے میں مبصر افتخار جالب کو مہمل گو بتائے گا، لیکن وہ افتخار جالب کے

حوالے سے ساری جدید شاعری کو مطعون و مسترد کرے گا۔ ترقی پسند رسالہ افتخار جالب کے وجود سے ہی شاید انکار کر دے۔ لیکن کسی بھی مبصر پر آپ بے جا جانبداری یا تعصب کا الزام نہیں رکھ سکتے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی روشنی میں کتاب کو پرکھا ہے اور اپنے اپنے نظریات کے حوالے سے صحیح رائے دی ہے۔ جو لوگ ان مبصروں کو ایمان داری سے عاری کہیں گے وہ خود ایمانداری سے عاری ٹھہریں گے کیوں کہ وہ اپنی ایمانداری دوسروں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں، یہ رویہ بے ایمانی کی پہلی منزل ہے۔

تو پھر تبصرے میں جانب داری اور تعصب کیا شے ہے؟ جب ہر سنجیدہ رسالے کی ایک پالیسی ہوتی ہے اور ہر سنجیدہ مبصر کا ایک نقطۂ نظر اور دونوں کے رنگوں کا انعکاس تبصرے میں لازم، مستحسن اور متوقع ہے، تو پھر غیر جانب داری سے کیا مراد ہے؟

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنے پہلے قضیے کی طرف واپس جانا ہوگا۔ جہاں میں نے اس ذہنیت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ بعض سنجیدہ لوگ بھی تبصرے کو اشتہار سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ یعنی غیر جانب داری تو مبصر کے لئے سم قاتل اور تبصرے کے لئے موت ہے۔ کیوں کہ پھر تو تبصرہ یا تو بالکل بے رنگ ہوگا یا بالکل یک طرفہ بیان سے زیادہ نہ ہوگا۔ لیکن انفرادی غیر جانب داری مبصر کے لئے یقیناً از حد ضروری اور اس کے فن کا پہلا تقاضا ہے۔ انفرادی غیر جانب داری سے میری مراد یہ ہے کہ تبصرہ لکھتے یا لکھواتے وقت مبصر اور مدیر اس کو نظر انداز کر دیں کہ مصنف سے ان کے تعلقات کیسے ہیں؟ مصنف کی ادبی شہرت اور حیثیت کیا ہے؟ ورنہ وہ غیر جانب داری تو کچھ نہ ہوئی جو چھوٹے موٹے ادیبوں یا اجنبی مصنفوں کی کتابوں کے ساتھ تو پورا پورا تجزیہ و تحسین و تنقیص روا رکھتی ہے لیکن بڑے ادیب کی کتاب یا اپنے کسی دوست شناسا کی تحریر دیکھ کر اس کے منہ میں آبلے پڑ جاتے ہیں اور وہ بولنے سے قاصر ہو جاتی ہے۔ تبصرہ نگاری آبگینوں کو ٹھیس سے محفوظ رکھنے کا نام نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ایسی باتیں نہ لکھیئے جن سے مصنف یا پبلشر کو تکلیف پہنچے۔ مصنف اور پبلشر سے میری درخواست یہ ہے کہ جب اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسل سے ڈرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اگر آپ کی کتاب میں مبصر کو عیوب یا نقائص یا خامیاں نظر آئیں تو وہ لامحالہ ان کا تذکرہ کرے گا، اس پر برا ماننے کی کیا بات ہے؟ لیکن آج کل مصنف اور پبلشر بھی اسکول کے بچوں کی طرح ہو گئے ہیں جو نتیجہ خراب ہونے پر ممتحن اور اسکول کے دوسرے ارباب حل و عقد کو گالیاں سناتے ہیں بلکہ مار بیٹھنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ غیر ادبی، غیر فن کارانہ اور عمومی ایمان داری کے خلاف ہے۔ اس خصوصی اور مشکل ایمان داری کا تو ذکر ہی کیا جسے ہم فن کارانہ ایمان داری کہتے ہیں۔

لیکن تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔ کسی ادیب پر تبصرہ صرف اس وجہ سے سخت لکھنا کہ ہمارے اس کے تعلقات اچھے نہیں ہیں، یا اس نے ہماری کتاب پر سخت تبصرہ لکھا تھا، یہ بھی مبصر کی انفرادی ایمان داری کے منافی ہے۔ اور یہ رویہ بھی اتنا ہی غیر ادبی ہے جتنا وہ رویہ جو خیال خاطر احباب پر آزادئ رائے کو قربان کر دیتا ہے۔ مبصر اگر تبصرہ موافقانہ لکھتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ مصنف کا دوست ہے، اور اگر مخالفانہ لکھتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ مصنف اس کا دشمن ہے۔ یہ تصور اگر ہمارے درمیان میں عام ہو جائے تو غیر ذمہ دارانہ تبصرے جن میں فن کارانہ ایمان داری کا فقدان ہے۔ خود بہ خود کم ہو جائیں گے۔ اس وقت تو قاری کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تبصرہ اگر اچھا ہے تو دوست نے لکھا ہے اور اگر خراب ہے تو دشمن نے۔ جب مبصر کو یہ بات معلوم ہے تو پھر وہ بھی اس رسم کی پابندی کرتا ہے۔ مجھ سے اکثر یہ پوچھا گیا ہے کہ آپ نے فلاں بڑے ادیب پر سخت تبصرہ کیا تھا، کیا آپ میں اور ان میں کوئی اختلاف رائے ہے؟ اس کا الٹا بھی ہوا ہے کہ اگر کسی کتاب کی تعریف میں نے کی ہے تو لوگوں نے فرض کر لیا ہے کہ مصنف خود ان حضرت کا دوست ہوگا۔ کئی سال کی مسلسل محنت کے بعد یہ فضا ایک حد تک بدلی ہے لیکن وہ بھی صرف چند مبصروں کے حق میں۔ عام طور پر مصنف خود تبصرہ لکھ کر کسی دوسرے کے نام سے چھپوا دیتا ہے، لہٰذا تبصرہ نگاری میں جانب داری کی مسموم جڑ پوری طرح اکھڑی نہیں ہے۔ اس کو اکھاڑنے میں قاری اور پھر مصنف سب سے زیادہ کام کر سکتے ہیں، کیونکہ جس دن یہ محسوس ہونے لگا کہ نہ قاری اور نہ مصنف جھوٹے تبصروں کو قبول کرنے پر راضی ہے، اسی دن سے ان مبصروں کی ضرورت ختم ہو جائے گی جو مصنف یا مدیر یا پبلشر کی رضا کو مقدم جانتے ہوئے قاری کو جہل اور اندھی تعریف کا گاڑھا میٹھا محلول تبصرے کے گلاس میں پیش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

میں نے تبصرہ نگاری کے اخلاقی پہلو کو اس وقت خاصی اہمیت دی ہے کیوں کہ حالات حاضرہ کا تقاضا یہی ہے، ورنہ بہتر فضا اور صورت حال میں سب سے اہم سوال یہ ہوتا کہ تبصرے اور تنقیدی مضمون میں کیا فرق ہے؟

اس سوال کا جواب طوالت اور اختصار، محدود یا غیر محدود دائرہ کار، وغیرہ کے حوالے سے نہیں دیا جا سکتا۔ کیوں کہ ممکن ہے کہ تبصرہ بیس صفحے کا ہو کر بھی تبصرہ ہی رہے اور تنقیدی مضمون دو ہی صفحے کا ہو لیکن تنقید کہلائے۔

(یہاں میں میکالے اور اس کی قبیل کے دوسرے تبصرہ نگاروں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو کتاب کا نام، مصنف کا نام اور دیگر تفصیلات اوپر لکھ کر اپنے طور سے ایک پورا مضمون لکھ ڈالتے تھے) دراصل تبصرے اور تنقیدی مضمون کی روح میں فرق ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ تبصرے کی ایک مخصوص ہیئت ہوتی ہے، یعنی یہ کہ تبصرہ جس کتاب پر کیا جاتا ہے اس کا نام، مصنف کا نام، پبلشر، سائز، قیمت صفحات، گیٹ اپ وغیرہ تمام تفصیلات اس میں درج ہوتی ہیں، بنیادی بات یہ ہے کہ تبصرہ نگار کا رویہ نقاد کے رویے سے مختلف ہوتا ہے۔ سب سے پہلا فرق تو یہ ہے کہ تبصرہ نگار کا مخاطب بہت فوری اور سامنے کا قاری ہوتا ہے۔ تبصرہ اس لئے نہیں لکھا جاتا کہ اسے دس سال بعد کا قاری پڑھے گا، تبصرہ اس لئے لکھا جاتا ہے کہ جو قاری اس وقت موجود ہے اسے کتاب سے متعارف کیا جائے۔ تنقیدی مضمون کا مخاطب آج کا بھی قاری ہوتا ہے اور کل کا بھی۔ لہٰذا اس میں ایسے فیصلے اور رائیں دینے سے احتراز کیا جاتا ہے جن کی درستگی Validity آئندہ زمانے میں مشکوک ہو سکے یا ہو جائے۔ مثلاً ضرب کلیم پر تنقید لکھنے والا یہ تو کہہ سکتا ہے کہ یہ کتاب ناکام ہے، لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ اقبال کی شاعری ناکام ہو گئی ہے یا ختم ہو چکی ہے۔ اس کے برخلاف مبصر ضرب کلیم کو ناکام کتاب کہہ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ اقبال کی شاعری میں دم نہیں رہا[1]۔ تبصرہ ایک لمحاتی اور فوری چیز ہوتی ہے۔ تنقید ایک مستقل اور پائدار تحریر ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تبصرہ دس سال بعد نہیں پڑھا جا سکتا۔ یقیناً پڑھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسے فوراً پڑھا جائے۔ اس کے پڑھنے والے وہ لوگ ہوں جو مصنف کے اپنے عہد میں رہتے ہیں، جو مصنف کو عصری ماحول کے تناظر میں دیکھ سکتے ہوں۔ اچھے تبصرے بہت دیر تک زندہ رہتے ہیں، اور رہے ہیں، لیکن یہ اتفاقی امر ہے۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ تبصرہ نگار اپنے موضوع کے ساتھ ایک انتہائی ذاتی اور تاثراتی رشتہ رکھتا ہے۔ کتاب پڑھتے وقت اسے اس بات سے زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی کہ مصنف کے ذاتی حالات کیا ہیں، وہ کیا محرکات ہیں جنہوں نے اس کتاب کو جنم دیا ہے۔ اس کا تعلق کتاب کے Gestatt سے زیادہ ہوتا ہے، پس منظری تفصیلات سے کم۔ مثلاً کسی نظم کو پڑھ کر وہ اس کے ذریعے پیدا ہونے والے فوری تاثر کو تبصرہ میں بیان کرتا ہے، لیکن نقاد صرف اسی پر بس نہیں کرتا۔ وہ نظم یا مجموعۂ کلام کو پڑھ کر اس کا رشتہ مصنف کی دوسری کتابوں اس کے ہم عصروں، اس کے ماضی و حال سے بھی قائم کر سکتا ہے۔ تنقید محرکات و عوامل، اصل الاصول اور تخلیق کی گہرائیوں سے بھی بحث کر سکتی اور کرتی ہے، تبصرہ خود صرف تخلیق زیر بحث کے زیر اثر پیدا ہونے والے ذاتی ردعمل تک محدود رکھتا ہے۔ تنقید نگار کی بہت سی شخصیات بہ یک وقت کارفرما ہو سکتی ہیں، مورخ، نفسیات داں، عروضی، فلسفیانہ تجزیہ کار، وغیرہ۔ یا اگر یہ سب نہ بھی ہو تو اس کا کم سے کم ایک مخصوص نقطۂ نظر ہوتا ہے جسے ایک فکری نظام و استدلال کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف تبصرہ استدلال اور Argument کے ذریعہ کوئی نظریہ نہیں خلق کرتا بلکہ کسی بنے بنائے نظریہ یا نقطۂ نظر کی روشنی میں کسی مخصوص کتاب کا جائزہ لیتا ہے۔

[1] ان جملوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ضرب کلیم کو ناکام کتاب سمجھتا ہوں یہ نام محض مثالاً اٹھایا گیا ہے۔ عہد حاضر کا کوئی نام لیا جاتا تو اس میں غلط فہمی کے امکانات زیادہ تھے۔

# انا کا پرندہ

سمٹتے ہوئے سایوں کے فرش پر
دیر سے یونہی بیٹھا ہوا ہوں
کہ گزرے کوئی قافلہ جادۂ روز و شب سے
تو پوچھوں کہ درماندگی کی سزا کیا ہے؟ مجھ کو بتاؤ!
مگر ڈر رہا ہوں کہ کوئی مسافر
مری بات پر مسکرایا تو میں کس طرح جی سکوں گا؟
مری زندگی ایک سرکش انا ہے
پرندے کی صورت عناصر کے زرکار پنجرے کی زینت
مری رُوح بھی (جادوگر کی طرح)
اس انا، اس پرندے کے قالب میں خلوت نشیں ہے

کسی کو (وہ دشمن ہو یا دوست)
میں پنجرے کی تیلیوں تک پہونچنے دوں
یہ کس طرح ہو سکے گا؟
کسے یہ خبر ہے کہ میں خود کو بھی
اپنا دشمن سمجھنے لگا ہوں

حرمت الاکرام

# ایک روشن

علی جواد زیدی

عروج وزوال کی بات کرتے ہوئے شاعر نے کہا تھا کہ ع

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس

لیکن روشؔ صدیقی کی زندگی ایک ہی طرح پر بسر ہوگئی۔ شروع سے آخر تک ان کی یک ہی روش رہی۔ متبسم نگاہیں، مسکراتے ہوئے ہونٹ، بڑا سا قد، چھریرا جسم، بیچ کی مانگ سے دو حصوں میں بٹے ہوئے بال، پُراطمینان چہرہ، لیکن جسمانی اور ذہنی اعتبار سے ہر وقت متحرک، ایک نیم اضطرابی اور سیمابی کیفیت کا مرقع! میں نے انہیں ہمیشہ اسی حال میں دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان پر سرد وگرم زمانہ کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ ظاہری طور سے ان کے عروج وزوال کا پتہ لگانا ناممکن تھا۔ وہی شیروانی لی گڑھ کاٹ کا یا ادھی پاجامہ اور کشتی نما ٹوپی، اس لباس میں کبھی تبدیلی نہیں آئی زادی کے پہلے وہ سر سے پیر تک کھدر پہنتے تھے، آزادی کے کچھ دنوں بعد خود کو س قید سے آزاد کر لیا۔ ہاتھ میں چمڑے کا ایک بیگ بھی ہمیشہ رہا۔ ان علامات ظاہری میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ صرف ٹوپی پہننے کے معاملے میں زیادہ شدت پسند نہیں تھے۔ اکثر شعر سناتے وقت ٹوپی اتار لیا کرتے تھے اور کبھی کبھی ایک خاص قلندرانہ ادا سے ہاتھ میں ٹوپی لئے ہوئے شعر سناتے تھے۔ اس سربرہنگی کے عالم میں پتہ چلتا کہ چالیس پینتالیس کے سن تک بالکل کالے رہنے والے بال ساٹھ کی عمر تک آتے آتے کچھ کچھ رنگ بدلنے لگے ہیں۔ یہ بھی بڑی احتیاط سے، بڑی آہستگی سے ہو رہا تھا۔ عمر بہت دبے پاؤں آگے بڑھ رہی تھی۔ شعر پڑھنے کا انداز بڑا پرجوش اور والہانہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ انقلابی نظمیں سناتے وقت وہ مٹھی باندھ کے داہنا ہاتھ باغیانہ انداز سے بار بار بلند کرتے تھے۔ آخری عمر میں بغاوت پر قلندری غالب آنے لگی لیکن ہاتھ اب بھی فضا میں بار بار بلند ہوتا تھا۔ طرز خواندگی میں قدیم طرز کا ہلکا ترنم بھی ملا ہوتا تھا۔ آواز کے اتار چڑھاؤ سے وہ ردمان سے انقلاب تک کے تمام مراحل طے کر لیا کرتے تھے۔ خلوص، تپاک، حفظ مراتب، آداب مجلس کا خیال یہ سب ان کی طرح داری اور وضعداری کے سنگ میل تھے۔ ایسے لوگ شاذ ہوتے جاتے ہیں۔

بہت کم لوگوں کو روشؔ کے پورے نام یا ان کی صحیح عمر کا علم ہوگا۔ انہیں سب ان کے تخلص ہی سے جانتے پہچانتے تھے۔ نام جاننے کی شاید ہی کسی نے کوشش کی ہو۔ کچھ کم باسٹھ برس کی عمر پائی لیکن کاٹھی ایسی مضبوط تھی کہ دیکھنے والا چالیس پینتالیس برس کا اندازہ کرتا۔ "نگار" لکھنؤ نے جنوری۔ فروری ۱۹۴۱ء کا شمارہ غزل نگاروں کے تذکرے اور انتخاب اشعار کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ اس کے لئے چند شاعروں نے اپنے حالات خود لکھے تھے۔ روشؔ کے خودنوشت حالات صفحہ ۱۲۸ پر درج ہیں۔ اس کے اعتبار سے تاریخ ولادت ۱۰ر جولائی ۱۹۱۱ء ہے۔ لیکن خود روشؔ نے مالک رام سے بیان کیا تھا کہ ان کی عمر سے دو برس کاتب نے چرا لئے تھے۔ انہوں نے ۱۹۰۹ء لکھ کر بھیجا، کاتب نے نہ جانے کس طرح ۱۹۱۱ء کر دیا اور اب یہی غلط تاریخ سند ہوگئی۔ لیکن صحیح تاریخ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۹ء ہے۔

ان کا نام شاہدؔ عزیز تھا۔ ان کے والد مولوی طفیل احمد شاہدؔ کو غلیمتؔ کنجاہی کی مثنوی "نیرنگ عشق" بے حد پسند تھی۔ اُس کے پہلے شعر سے انہوں نے خود اپنا تخلص اور اپنے بیٹے کا نام اخذ کیا۔ شعر یہ ہے:

بنام شاہد نازک خیالاں
عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں

روشؔ تخلص کے بارے میں بھی ایک روایت سنی۔ روشؔ کا وطن جوالاپور (ضلع سہارن پور، یو۔پی) اپنے مناظر قدرت اور مشہور دانش گاہ گورو کل (کانگڑی)

کے لئے معروف ہے۔ ابتدائی زندگی میں روشؔ کو اس دانش گاہ سے قریبی ربط رہا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے ہندی میں بڑی مہارت پیدا کر لی تھی اور سنسکرت سے بھی لگاؤ تھا۔ گورو کل کی علمی فضا پر گھر کے ادبی ماحول نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور روشؔ سات برس کے سن سے شاعری کرنے لگے۔ والد فارسی کے عالم اور اچھے شاعر تھے۔ روشؔ نے شروع میں انہیں سے مشورۂ سخن کیا۔ لیکن تخلص گورو کل کی دین ہے۔ ابھی روشؔ کس داصلاح سے بے نیاز طفلانہ شاعری ہی میں مصروف تھے کہ گورو کل والوں کو ان کے ذوقِ شعری کا پتہ لگ گیا اور انہوں نے ان کے لئے ایک تخلص "روشیش" جو سنسکرت میں روی (سورج) اور ایش (خدا) کا مرکب ہے تجویز کیا۔ 'روشیش' اردو میں چل نہیں سکتا تھا اس لئے غالباً والد کی ہدایت پر یہ روشؔ ہو گیا۔

اگرچہ ابتدا میں روشؔ نے اپنے والد سے اصلاح لی لیکن سچ یہ ہے کہ وہ تلمیذ رحمان تھے کیوں کہ انہوں نے شاعری میں اپنی ڈگر خود بنائی۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے اور ان کا ذہنی سلسلہ تلمذ چکبست و سرور و اقبال کی قومی شاعری سے جا ملتا ہے۔ بلکہ انہوں نے اس میں جوشؔ و احسانؔ کی طرح انقلاب کی گرمی بھی حل کر دی۔ جب انہوں نے ۱۹۱۶ء میں غزل کی شاعری شروع کی تو وہ کچھ اس طرح کے شعر کہتے تھے:

یہ میرے ضبطِ محبت کی تھی عجب تاثیر
کہ ان کو ضبطِ محبت کا حوصلہ نہ رہا
ہے روز میرے گریباں سے گفتگوئے رفو
بہار کے لئے کیا کوئی مشغلہ نہ رہا

۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۴ء تک روشؔ برابر غزلیں کہتے رہے۔ ۱۹۲۴ء سے وہ نظموں کی جانب متوجہ ہوئے اور ان کی سب سے پہلی نظم "انتظار" رسالہ 'ہمایوں' لاہور میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ان کی نظمیں ملک کے مقتدر رسالوں میں چھپتی رہیں اور اتنی مقبول ہوئیں کہ ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۵ء تک آتے آتے مشاعروں میں ان سے نظمیں ہی پڑھنے کی فرمائش ہونے لگی۔ وہ خود بھی بیشتر نظمیں سناتے۔ غزلیں عموماً طرحی مشاعروں، آغاز خواندگی یا مختصر نشستوں کے لئے مخصوص تھیں۔ ۱۹۳۵ کے بعد کا زمانہ نظموں کے عروج کا زمانہ ہے۔ ۱۹۴۰ء تک نوبت یہ پہنچ گئی تھی کہ لکھنؤ جیسے شہر کے غزل گو 'تقدم و تاخر' کا خیال ترک کر کے، مشاعروں میں غزل کا دور پہلے کرا لینے کی فرمائش کرنے لگے تھے۔ حصولِ آزادی کے بعد حالات نے ایک اور پلٹا کھایا اور غزل پھر بزمِ مشاعرہ میں صدر نشین ہو گئی۔ روشؔ اس مدد میں بیشتر غزلیں لکھنے اور پڑھنے لگے۔ یہ ان کی غزل نگاری کا کامیاب تر دور تھا۔ اس زمانے میں انہوں نے کئی غزلیں آہنگ و طرحِ غالب میں لکھیں اور یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوا۔

میں یہ بات بار بار دہراتا رہا ہوں کہ ہمعصر رائیں اکثر جلد بازی کی رائیں ہوتی ہیں۔ ۱۹۴۲ء کے آغاز میں کلیم الدین احمد اور آل احمد سرورؔ کے رتبے کے ناقدوں نے روشؔ کو خالصتہً نظم کا شاعر قرار دیا تھا اور ان کی غزل گوئی کو نسبتہً کم مایہ ٹھہرایا تھا۔ آج ان کی نظموں کا کوئی مجموعہ ہمارے سامنے موجود نہیں ہے اور لوگ انہیں صرف "محرابِ غزل" کی وساطت سے جانتے ہیں!

اکثر شاعر کچھ ایسے جہاں گرد ہوتے ہیں کہ انہیں کسی ایک شہر سے وابستہ کرنا مشکل ہے۔ روشؔ بھی مختلف شہروں سے متعلق رہے ہیں لیکن جوالاپور میں زیادہ قیام رہا اور وہی ان کا وطن ہے۔ یہاں شروع شروع میں روشؔ بانسوں کا کاروبار کرتے تھے۔ آزادی کے پہلے انہوں نے ایک دار الاشاعت بھی قائم کیا تھا۔ اور کوئی رسالہ بھی نکالا تھا۔ لیکن یہ دونوں زیادہ دنوں نہ چل سکے۔ کچھ دنوں لاہور میں علامہ تاجور کے بھی شریک کار رہے لیکن ان سے نہ نبھی اور وہاں سے بھی چلے آئے۔ آزادی کے فوراً بعد جو اندوہناک ہنگامے ہوئے، ان کی زد میں بانسوں کا کاروبار بھی آ گیا اور اس میں شک نہیں کہ کئی برس انہوں نے خاصی تکلیف لیکن بڑے صبر و استغنا سے گزارے۔

روشؔ کی شادی کافی کم عمری میں ہو گئی تھی لیکن بہت جلد شریکِ حیات نے داغِ مفارقت دیا۔ روشؔ ان سے بے حد مانوس تھے۔ اس ناوقت موت کا اتنا شدید صدمہ ہوا کہ پھر مدتوں تا حالی زندگی سے کنارہ کش رہے۔ جب سن چالیس سے متجاوز ہو گیا تو زندگی کا یہ خلا ناقابلِ برداشت نظر آنے لگا۔ احباب و اقارب نے بھی اصرار کیا تو انہوں نے اسی شرط پر رضامندی ظاہر کی کسی بیوہ سے عقد کریں گے۔

اس سلسلے میں مجاز کا ایک لطیفہ مشہور ہے۔ ایک مجلس میں لوگوں نے روشؔ سے شادی کا ذکر چھیڑا تو کہنے لگے کہ کسی بیوہ سے عقد کرنا چاہتا ہوں۔ مجاز نے کہا کہ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ آپ سے شادی کرنے کے بعد بیوی تو بیوہ ہو ہی جائے گی۔ بہر حال روشؔ کی یہ شرط پوری نہ ہو سکی اور بالآخر سینتالیس اڑتالیس برس کے سن میں انہوں نے مراد آباد کے مولوی مظہر جلیل کی صاحبزادی سعیدہ سے شادی کر لی۔ اس سے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ بڑا لڑکا بہت ذہین ہے۔ اس کو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے سال کے بہترین طالب علم ہونے کا انعام ملا۔ اب علی گڑھ میں ایم، ایس، سی کا طالب علم ہے۔

شادی کے بعد روشؔ کا قیام کچھ دنوں مراد آباد میں بھی رہا لیکن آبائی کاروبار سے محروم ہو کر انہیں اب فکرِ معاش ہوئی۔ مولانا آزاد جیسے گوشہ نشین کو اس کی

خبر ہوئی تو انہوں نے وزیر اطلاعات ڈاکٹر کیسکر سے تحریک کی ۱۹۵۹ء ان کا تقرر آل انڈیا ریڈیو میں ڈپٹی چیف پروڈیوسر اردو سپوکن ورڈ کی حیثیت سے ہوگیا۔

مولانا آزاد، روش کی ناقابل تسخیر قوم پروری سے بہت متاثر تھے مسلم لیگ کے ہنگامہ پرور دور میں اور بعد آزادی کے ہنگاموں میں کبھی بھی روش کے پائے استقلال کو لغزش نہ ہوئی۔ پاکستان سے کئی بار ان کو ملازمت وغیرہ کی پیش کش ہوئی لیکن جوش دینا آزاد کے برعکس، روش نے اپنے وطن کی خدمت کو فرض اولین جانا اور یہیں کی خاک پاک سے پیوند ہونے کو باعث سعادت سمجھا۔ ان کی قومیت "وفاداری بشرط استواری" کے معیار پر پوری اترتی تھی اور واقعتہً اصل ایمان تھی۔

۱۹۵۹ء میں جب دلی آئے تو شروع شروع میں کاکا کالیلکر کے یہاں مقیم ہوئے۔ یہاں ریحانہ بہن سے ملاقات ہوئی اور وہ ان پر بے حد شفقت کرنے لگیں۔ ریحانہ بہن خود عالم اور علم دوست ہونے کے علاوہ روحانیت سے خاص لگاؤ رکھتی ہیں اور دلی میں بہت سے معززین ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہیں۔ انہوں نے روش کو اپنا بیٹا بنالیا اور کہنے لگیں کہ میں اگلے جنم میں ان کی ماں تھیں۔ جب روش کو سرکاری مکان مل گیا تو یہ پنڈارہ روڈ منتقل ہوگئے اور ملازمت سرکاری کے خاتمے کے بعد تک وہیں مقیم رہے۔ آخر میں وہ میرٹھ جا بسے۔

میرٹھ میں مستقل قیام رہا اس کے علاوہ لکھنؤ بھوپال ہاؤس میں اور الہ آباد مسلم بورڈنگ ہاؤس میں بھی روش ہفتوں قیام کیا کرتے تھے۔ ان دونوں شہروں کی ادبی فضا نے ان کو اور انہوں نے وہاں کی محفلوں کو بہت کچھ دیا۔ سلسلہ فرنگی محل سے بھی ارادت رکھتے تھے۔ ان کے والد سلسلۂ قادریہ رزاقیہ میں شمس العلما مولانا عبدالحمید مرحوم فرنگی محلی کے مرید تھے اور یہ خود بھی اسی سلسلے سے منسلک تھے بغرض

ع چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری

روش کی رسمی تعلیم زیادہ نہ تھی لیکن گھر کے علمی ماحول اور ذاتی مطالعے سے روش نے یہ کمی بڑی حد تک پوری کرلی۔ بالخصوص ادب و تصوف پر ان کی نظر گہری تھی۔ اور وہ تصوف کے رموز و غوامض سے خاص طور پر واقف تھے۔ معلومات ہی کی حد تک ہی نہیں بلکہ کیفیت کے اعتبار سے بھی وہ صوفی مشرب تھے۔ ان کے قریبی دوست پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کا بیان قابل نقل ہے کہ "ان کی زندگی اور معمولات پر تصوف اور اس کی جاندار و اعلیٰ قدروں کا بہت گہرا اثر تھا۔ ان کی کتابوں کے بیش قیمت ذخیرے میں تصوف اور صوفیائے کرام سے متعلق بڑی نادر کتابیں ہیں۔ ان میں سے بعض کتابوں کو تو انہوں نے بار بار پڑھا تھا اور ان کا جب ذکر کرتے تو بڑے گہرے احساس سے کرتے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی روحانی کیفیات کچھ اور ہیں۔"

روش نے گھر پر اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر گورنمنٹ سے ہندی اور ابتدائی سنسکرت کا علم حاصل کیا۔ کام چلانے بھر کو انگریزی سے بھی واقفیت حاصل کرلی لیکن سچے ادیب اور شاعر کی طرح وہ زندگی بھر طالب علم رہے۔ فارسی کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے اور شعر فارسی کی نوک پلک سے واقف تھے۔ فارسی کا ذوق شعری اور غزل فارسی کا احساس جمال ان کے کلام میں پوری آب و تاب و متانت و فن کاری سے جھلکتا ہے۔

روش سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں ہوئی جب وہ ایک مشاعرے کے سلسلے میں لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد لکھنؤ اور لکھنؤ کے باہر مشاعروں میں اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ جب سے میں نے مشاعروں میں شریک ہونا تقریباً ترک کر دیا یہ ملاقاتیں کم ہوگئیں۔ لیکن جب آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوئے تو میرا دفتر بھی قریب ہی تھا۔ اس لئے ان سے برابر سر راہے ملاقات ہو جایا کرتی تھی کبھی مخصوص نشستوں میں بھی ساتھ رہا۔ یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا جب وہ ریڈیو کی ملازمت ترک کر کے میرٹھ جا بسے تھے۔ مشاعروں کے سلسلے میں یا کسی اور کام سے برابر دلی آتے رہتے تھے اور یا تو خود مجھے ملاقات کا شرف بخشتے یا کہیں نہ کہیں ملنے کا بہانہ مل جاتا۔ عمر بڑھتی جا رہی تھی، لیکن ان کی آن بان، طبعی شگفتگی، متصوفانہ سکون طبع، اور ظاہری صحت میں کوئی فرق نمایاں نہیں تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کاروان عمر ان سے کترا کر نکل جاتا ہے۔ لیکن موت غریب الوطنی کا ماحول ڈھونڈ رہی تھی۔ ایک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے شاہجہاں پور گئے ہوئے تھے۔ وہیں یکایک دل کا سخت دورہ پڑا اور پلک جھپکاتے یہ شاہد محبی اور یار عزیز ہم سے چھن گیا۔ ۲۳ جنوری ۱۹۷۱ء کی صبح کو پہلے ریڈیو سے اور پھر مشترک دوست زنجانی صاحب سے معلوم ہوا کہ گزشتہ شب میں روش دائمی مفارقت کا داغ دے گئے۔ ایک دور، ایک عہد، جواب پلٹ کے آنے والا نہیں ہے، دم توڑ گیا۔ دشت جنوں سے سر پر خار کو تیز رکھنے کی فرمائش کیا کی جائے اب شاید ہی کوئی آبلہ پا ادھر سے گزرے۔ روش کی طرح کے لوگ ایک عہد، ایک تحریک اور ایک روایت کی دین تھے اور اسی اعتبار سے دیکھے اور پرکھے جائیں گے۔

روش میں بڑی خوبیاں تھیں۔ وہ خلوص کا مجسمہ اور وفائے بے ریا کا سراپا تھے۔ یہ کہنا شاید غلط ہو کہ وہ سب سے ایک انداز سے ملتے تھے لیکن پہلی بار جس خلوص و محبت سے ملتے تھے اسے آخر تک نبھاتے تھے۔ اس خلوص میں گرمی بھی تھی اور خودداری بھی، وضعداری بھی تھی اور دینداری بھی، لیکن دنیاداری نہیں تھی۔ دل کے صاف تھے۔ جو بات ناگوار ہوتی اسے بے تکلف

اور بے تامل کہہ دیتے تھے۔ اس سلسلے میں زنجانی صاحب نے ایک واقعہ ان کی جوانی کا سنایا۔ ایک محفل میں اقبال کے کلام پر گفتگو ہو رہی تھی۔ یکایک روش نے اقبال کو نارواالفاظ سے یاد کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کی یہ دریدہ دہنی شان الٰہی میں برداشت نہیں کر سکتا۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزّاقی نہیں ہے

زنجانی صاحب اقبال کے غالی مداحوں میں تھے۔ زور آزمائی پر آمادہ ہو گئے۔ اگر روش کے قد کو مدنظر رکھا جائے تو نتیجہ بھی ظاہر تھا۔ اس کے بعد دونوں میں گفتگو بھی بند ہو گئی، لیکن وضعداری یہ تھی کہ روش الہ آباد میں بدستور زنجانی صاحب کے مہمان ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ کدورت رفع ہو گئی اور خود روش کا یہ حال ہوا کہ وہ اقبال کے پرستاروں میں شامل ہو گئے!

اسی طرح قوم پروری کے معاملے میں وہ بے حد متشدّد تھے۔ انہوں نے جنگ آزادی میں عملی حصہ تو نہیں لیا لیکن کانگریس کے جلسوں میں وہ ضرور جاتے اور اپنی قومی نظمیں سناتے تھے۔ عالمی جنگ کے زمانے میں جب کئی شاعر متعدد بہانے بنا کر جنگی ترانے گانے اور نظمیں لکھنے لگے تھے، اس وقت بھی وہ کنارہ کش رہے اور مسلم لیگی فرقہ واریت سے بھی وہ برسرپیکار رہے۔ یہ پیکار فکری اور ذہنی تھی، مگر تھی غیر متزلزل۔ ان کے پائے ثبات میں اس وقت بھی لغزش نہ ہوئی جب فرقہ واریت کی لپٹوں نے جوالا پور تک کو گھیر لیا تھا۔ ان کی قوم پروری دکھاوے سے بہت دور تھی۔ جب آزادی ملی تو بہت سے شاعر اور ادیب وزراء کے در دوں کے چکر کاٹنے لگے لیکن روش کی خودداری، فقیری اور مستی میں فرق نہیں آیا، جب آخر میں ریڈیو کی ملازمت پائی تو بھی مولانا آزاد خود متوجہ ہوئے۔ انہیں دست سوال دراز نہ کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نمائشی قوم پرستوں سے روش کی طبیعت اکراہ کرتی تھی۔ حکومت پرستوں کو تو وہ علی الاعلان ٹوک دیا کرتے تھے جب حفیظ جالندھری کو زمانۂ جنگ میں برطانوی سامراج کی حمایت کے صلے میں غالباً 'خان صاحب' کا خطاب ملا تو روش نے اقبال کے شعر سے استفادہ کرتے ہوئے لکھا:

رقّاص حکومت کی معراج یہ کہتی ہے
طاؤس و رباب آخر، اعزاز و خطاب آخر

ان کے ہم عصروں میں جوش بزرگ تر اور ساغر و احسان ہم عصر تھے اور یہ تینوں اپنی قومی اور سیاسی شاعری کے لئے شہرت رکھتے تھے۔ جوش شاعر انقلاب مشہور تھے لیکن انقلاب کا نعرہ ان تینوں نے بھی اپنایا۔ ساغر کا تصور انقلاب، ایک محبوبہ کے تصور سے ہم آہنگ تھا، احسان خود کو مزدور شاعر کہتے تھے اور وہ انقلاب کے تخریبی عناصر کو نمایاں کرتے تھے لیکن روش کے یہاں کوری جذباتیت اور طمطراق الفاظ کم ہے۔ وہ انقلاب کی بھی بات کرتے ہیں اور بغاوت کی بھی لیکن وہ الفاظ کے استعمال کے معاملے میں محتاط ہیں اور بے جا جوش و خروش سے حتی المقدور بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیداری ہند کے ساتھ وہ بیداری ایشیا کے بھی نقیب ہیں لیکن یہ بیداری قومی اور علاقائی بیداری ہے۔ اقبال کی بیداری مشرق کی طرح تہذیبی، فکری یا ملّی بیداری نہیں ہے۔ وہ ایشیا کی بات کرتے ہوں یا ہند کی۔ ان کا تصور انقلاب احسان دانش کے تصور انقلاب کی طرح بنیادی طور پر صرف خون و تباہی نہیں ہے۔ تصور انقلاب کے لئے اس دور میں کچھ تخریب اور جبری تبدیلی تو لازمی ہے اور روش بھی ایسی تعمیری تخریب کی طرف اشارے کرتے ہیں۔ لیکن اساسی طور پر وہ ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کے پیامی ہیں۔ وہ خواب خرگوش سے نیزے چبھو کر یا ٹھوکریں مار کر بیدار نہیں کرتے بلکہ پیار سے جگاتے ہیں اور کبھی کبھی جلا بھی لیتے ہیں۔

ہم نے اپنی نوجوانی سے روش کی نظمیں سنی ہیں اور ان کی نظموں پر ہم جھومے ہیں۔ وہ اس دور کے نوجوانی کے لہجے میں ضرور بولتے تھے لیکن ان کا آہنگ بزرگوں کو بھی گوارا تھا۔ بعض اوقات تو وہ دونوں ہی کے جذبات کے ترجمان نظر آتے تھے۔ یہ غالباً فارسی ادب میں رچے بسے ہونے کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔ انہوں نے قومی نظموں کے علاوہ کچھ رومانی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ رومانی نظموں سے مراد وہ نظمیں ہیں جو حسن و عشق کے محور پر رقص کرتی تھیں ورنہ ان کی قومی نظمیں بھی رومانی تصورات سے آزاد نہیں تھیں۔ ان رومانی نظموں پر ٹیگور کا اثر (مثلاً "نہ جا") صاف جھلکتا ہے۔ یہ نظمیں اپنے زمانے میں خاصی مشہور بھی ہوئیں لیکن ان کی رومانی نظموں کو وہ رتبہ نہ مل پایا جو اختر شیرانی کے حصے میں آیا۔ قومی نظمیں یقیناً ہمارے قوم پرورانہ ادب کا حسین ورثہ ہیں۔ ان میں عصری مسائل و کوائف کا ذکر آیا ہے۔ روش نے ان میں آفاقی عناصر ڈھونڈھنے کے لئے شاعرانہ انتخاب اور خوش مذاقی سے کام لیا ہے، اس لئے یہ کافی مدت تک تازہ رہیں گی اور دوسری جذباتی تخلیقات کی طرح کسی خاص عہد کی فضا میں چمک کر بجھ نہ جائیں گی۔ یہاں ان کی نظموں پر تفصیل سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ بدقسمتی سے ان کی نظمیں یکجا ملتی بھی نہیں ہیں۔ ذہن میں فوری طور سے "باردولی"، "بیداری مشرق" اور "مہاتما گاندھی" وغیرہ نظمیں آتی ہیں۔

روشؔ نظموں میں شبلیؔ، ظفر علی خاں، چلبستؔ و سرورؔ جہاں آبادی کے بعد کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ جوش و شیرانی سے بھی کم عمر ہیں۔ غزلوں میں بھی اُن کا شمار حسرتؔ، صفیؔ و فانیؔ و جگرؔ و فراقؔ کے بعد کے گروہ سے ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ کسی خاص اُستاد کے شاگرد یا کسی طرزِ خاص سے وابستہ نہیں رہے لیکن وہ بیشتر پھولوں پر لہرائے ہیں اور بعض سے کسبِ شہد بھی کیا ہے۔ پھر بھی نظم و غزل دونوں ہی میدانوں میں اُن کی آواز جانی پہچانی جاتی ہے۔ جو خصوصیت اُنہیں اُن کے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اُن کا رچا ہوا ذوقِ فارسی ہے۔ ویسے تو ان کی نسل میں دو ایک مستثنیات کے علاوہ سبھی فارسی سے بخوبی واقف تھے لیکن روشؔ تراکیب فارسی ، استعمال اور تراش و تخلیق میں زیادہ کوشاں رہتے تھے۔ اُن کے یہاں زبان بیان کا یہ فارسی انداز ارادی اور اسی لئے زیادہ نمایاں ہے۔ کہیں تو وہ بطِ بے نغمہ" اور "ساغرِ بے بادہ" جیسی ترکیبیں تراش لیتے ہیں اور کہیں سرمۂ بینائش" ر بصد ہزار انواع" جیسی ترکیبوں کو بھی غزل کے لئے روا رکھتے ہیں۔ ایسے مقامات ذہیں مگر ہیں۔ روشؔ کا فن ہمہ جہاتی نہیں ہے اور فکری عنصر بھی ان کے یہاں دبا سا ہے۔ لیکن گہرے متصوفانہ اندازِ نظر (تصوف نہیں) اور تغزل کی متوازن کی بدولت اُن کی غزلوں تک میں ایک فکری ماحول ضرور ملتا ہے جو جگر و ساغر ، زیادہ نمایاں ہے۔

اُن کے یہاں خمریات کے بھی تمام لوازم ملتے ہیں۔ میکدہ، مینا، جام، سبو ر، تشنگی اور (بفیضِ غالب) زہر اور بزم کا ماحول بھی شمع، ہمنشیں، پروانہ وغیرہ ، تعمیر ہوتا ہے وہ تلاطم و باد و ساحل سے بھی باتیں کرتے ہیں اور منزل و سفر جادہ ، بہار و چمن بھی ہے منصور و طور و موسیٰ بھی ہے۔ لیلا و سلما بھی سینکڑوں برس سے مضامین کے گرد رقاصۂ غزل ناچتی رہی ہے لیکن روشؔ ان فرسودہ مضامین میں بھی اپنی فن کاری سے ایک تازگی پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ بزم و انجمن سے زیادہ خلوت و تنہائی کے شاعر ہیں۔ اُن کا عشق ایک "ربطِ پنہاں" ہے۔ اُن کا "شوقِ فراواں" ہر لمحہ ز دل" بھی ہوتا ہے، اس میں "گلہ و شکایت" حرف و حکایت" بھی ہے اور عشرت کیف و طرب کے ساتھ اشک و غم و درد بھی ہے لیکن اُن کی شخصیت "منزلِ احساس فراموش میں زیادہ ابھرتی ہے انہیں حسرتِ آغوش بھی ہے لیکن وہ بیگانہ نگاہی پر بھی جان چھڑک سکتے ہیں۔ وہ "آئینِ حجاب" کے پرستار ہیں . . . . . "آوارگیٔ غربت" میں بھی لذت محسوس کرتے ہیں۔ اکثر بیتاب گزارش۔ (ترکیب کی غرابت پر نہ جائیے) رہتے ہیں اور تماشائے بیتابیٔ دل کے مزے لیتے ہیں۔ جب سطحِ عشق اور بلند ہوتی ہے تو زندگی "حجابِ رخِ امکاں" ن جاتی ہے اور وہ "رسمِ اظہار" سے بے گانہ ہو کر "نالۂ خاموش" سے کام لینے لگتے ہیں۔ وہ "نظارہ" کی مسرتوں سے بھی آشنا ہیں، لیکن یہ نظارہ انھیں حیرت و ح کل نئی دہلی

حیرانی کی منزلوں کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ راہِ تصوف کے جادوں سے آگاہ ہیں لیکن اُن کا اندازِ قیام و سفر ذہنی ہے۔

وہ اکثر تضادات سے بھی کام لیتے ہیں۔ جیسے صبح و شام، طرب و غم، دیر و حرم، شوق و تغافل، سکوت و گفتگو، سوال و جواب، وفا و جفا، اور کبھی تسلسل کلام سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن تازگی اور شگفتگی کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اُن کے اشعار میں سیاسی اور سماجی رمزیت بھی پائی جاتی ہے۔ ابتدا میں روشؔ پر شبلیؔ و اقبالؔ کا اثر نظر آجاتا تھا لیکن بعد میں وہ ارادی طور پر "بطرزِ غالب" لکھنے لگے تھے۔ کئی غزلیں غالب کی طرحوں میں لکھی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بڑی حد تک ہم آہنگی پیدا کر لی ہے روشؔ موجودہ دور کے ممتاز غزل گو تھے اور صادق لہجہ نظم گو۔ اُن کے کلام کا بہت سا حصہ غیر مطبوعہ پڑا ہے۔ ضرورت ہے کہ اُسے یکجا کر لیا جائے۔ غزلیں تو "محرابِ غزل" کی بدولت پھر بھی مل جاتی ہیں لیکن نظمیں صرف حافظوں یا اخبارات و رسائل کے صفحات میں محفوظ رہ گئی ہیں ضرورت ہے کہ انہیں فوراً یکجا کر لیا جائے۔ یہاں کوئی انتخاب منظور نہیں ہے لیکن چند اشعار غزل پیش ہیں۔

فریبِ آرزو کی انتہا ہے ؛ کسی افسردہ دل کا مسکرانا
گمانِ بادۂ عشرت میرے سیو پہ نہ کر ؛ ہے اس میں زہر بھی شامل مرے لہو کے سوا
حریصِ عیش نہیں ہوں مگر خوشی یہ ہے ؛ تری نگاہ سے پنہاں رہا ملال مرا
ہاں زندگی ایک پیغامِ لغزش ؛ جینا پڑے گا کب تک سنبھل کر
خدا شناس ہے زاہد، مگر نہیں معلوم ؛ کہ آدمی کو جگاتی ہے آدمی کی پکار
ہائے اب اُن بستیوں کا ذکر ہی کیا ہم نشیں ؛ جو ابھی بسنے نہ پائی تھیں کہ ویراں ہو گئیں
سکونِ دل جو ملا بھی تو آہ کیا ہوگا ؛ سکونِ دل تو مرے درد کا مآل نہیں

روشؔ کے یہاں زبان و بیان کی غلطیاں نہیں ملتیں لیکن "محرابِ غزل" میں غزل کے بارے میں جو نظم یا غزل ہے اُن میں کچھ تسامحات نظر آئے مثلاً یہ اشعار

دیکھتا کون رُخِ شاہدِ معنی کی بہار ؛ گر یہ پیراہنِ خوش زیب نہ پہنائے غزل
ہوش رہتا کسے اس دور میں حق گوئی کا ؛ اگر افسانہ منصور نہ دہرائے غزل
لب کشا کیا کوئی ہوتا اگر اُس محفل میں ؛ ترجمانِ دلِ خاموش نہ بن جائے غزل
آتشِ وعظ و خطابت کا بھرم کیا کھلتا ؛ تختہ دار سے گر پھول نہ برسائے غزل

پہلے مصرعوں میں خط کشیدہ الفاظ کا قوافی سے ربط نہیں۔ اگر علی الترتیب یوں ہوتا تو یہ عیب جاتا رہتا (۱) دیکھے پھر کون (۲) پھر کسے ہوش ہو (۳) لب کشا کیسے کوئی ہو (۴) کیسے کھلے۔ اِن معمولی لغزشوں سے جو معدوم کی حد تک شاذ ہیں روشؔ کی عظمتِ شاعری میں فرق نہیں آتا۔ وہ اس دور کے صفِ اول کے ممتاز شاعر ہیں اور ہمارے ادب میں اُن کے لئے مستقل جگہ محفوظ ہے۔

## بچّوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

فی زمانہ بچّوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نِرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچّے تبھی ہوگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔

## بچّہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچّے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچّے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نِرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچّے کی پیدائش ملتوی کر سکتے ہیں۔

نِرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان، محفوظ طریقہ ہے۔ اِس کے استعمال سے صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔

نِرودھ ہر جگہ ملتا ہے:۔
پرویژن اسٹور، کرانہ فروش، کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔

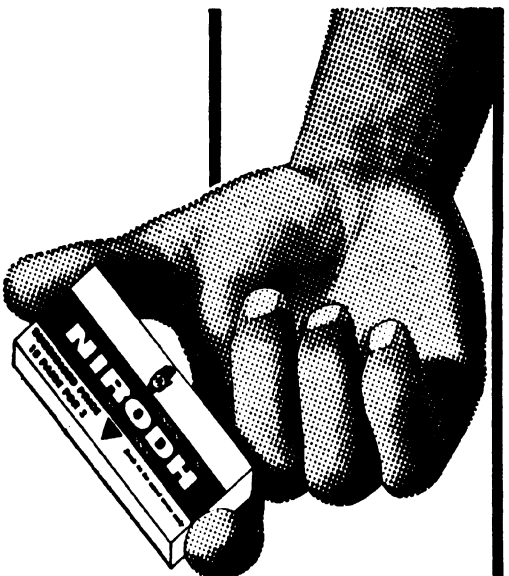


صرف 5 پیسے خرچ کرکے آپ اپنے کنبے کو محدود رکھنے کی طاقت حاصل کر سکتے ہیں

نِرودھ استعمال کیجئے

فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم

15 پیسے کے 3

سرکار کی اِدارہ سے کم دام

70/61

# زندگی کا رقص

م م راجندر

وہ اٹھ گیا اور ندی کے اس پار ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھنے لگا۔ سہ پہر کی نرم بے جان دھوپ ڈھل چکی تھی اور افق میں کانپتے ہوئے زرد سونے کے سوا تمام فضا میں ایک دھندلکا چھا گیا تھا تیزی سے سمٹتی ہوئی روشنی ایک اندھیرے کی گود میں گم ہو رہی تھی اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ ایک زندگی موت سے ہم کنار ہو رہی ہے۔

اور موت کا خیال آتے ہی اس کے بوڑھے جسم میں کپکپی دوڑ گئی، اور وہ سوچنے لگا۔ کسی بھی لمحے وہ بھی اسی طرح ایک اندھیرے کی گود میں کھو جائے گا۔ وہ خوف زدہ سا ہو گیا اور جلد جلد اپنے گھر کی طرف چلنے لگا جو یہاں سے پاس ہی تھا۔

گھر پہونچ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اُسے دیکھتے ہی نوکر دوڑ کر آیا اور اس نے اس کے کمرے کی بتی جلائی، اس کے ہاتھ سے اس کی چھڑی لی اور اس کا لمبا کوٹ اُتارنے لگا۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گیا اور اس نے نوکر کو چائے لانے کے لئے کہا اور بستر پر لیٹ کر اور لحاف اپنے پاؤں پر ڈال کر پھر سوچنے لگا یہاں اس کمرے میں کتنا سکون تھا باہر پھیلی ہوئی لامحدود وسعت کتنی بھیانک تھی جیسے موت ہی پھیل کر یہ وسعت بن گئی ہو۔ جب تک سورج سروں پر چمکتا ہے، چاروں طرف ایک گہما گہمی رہتی ہے اور سرگرمی اور دوڑ دھوپ کا چکر چلتا رہتا ہے۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ چکر کبھی نہیں رکے گا لیکن شام ہوتے ہی زندگی کی چکی کا یہ شور کتنا کم ہو جاتا ہے۔ اور جب درختوں کے سائے ڈھلتے ہیں اور دھرتی پر ایک کاٹنے والی اُداسی اور ٹھنڈک کا غلاف پڑ جاتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب زندگی پھر جاگے گی۔ یہ چکر پھر نہیں چلے گا۔

وہ سوچنے لگا کہ وہ ستر برس کا ہو گیا ہے اور کسی بھی دن اور کسی بھی لمحے ایک بھگدڑ اور شور و غوغا سے چلا جائے گا۔ اس کے اعضا تقریباً جواب دے چکے تھے اور دن بھر اپنے مکان کے برآمدے یا لان میں آرام کرسی پر بیٹھے اور سہ پہر کو اپنی چھڑی کے سہارے ندی تک چلے آنے اور ایک پتھر پر بیٹھنے کے سوا وہ کوئی اور کام کرنے کے قابل نہیں رہا تھا لیکن اس لاچاری کے باوجود اُسے موت سے ڈر لگتا تھا وہ موت کو ایک ایسی اتھاہ گہرائی سمجھتا تھا جس میں گر کر وہ ہمیشہ کے لئے معدوم و نابود ہو جائے گا۔

نوکر چائے لے آیا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چائے کی گھونٹوں میں گرمی اور زندگی تھی، اور وہ اس گرمی اور زندگی کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یکایک اُسے ٹھنڈک کا احساس ہوا اور اُس نے مڑ کر دیکھا تو کھڑکی کو کھلا ہوا پایا۔ کھڑکی کے باہر موت کی سی خاموشی اور اندھیرا تھا۔ اُس نے نوکر کو کھڑکی بند کرنے اور پردہ ڈالنے کے لئے کہا اور جب کھڑکی بند ہو گئی۔ اور نوکر دروازہ بند کرتا ہوا چلا گیا تو وہ اطمینان سے چائے پینے لگا اور چائے پی کر لیٹ گیا۔ اب اس کے کمرے میں کوئی نہیں آئے گا کیونکہ وہ شام کو کچھ نہیں کھاتا تھا اُس نے لحاف سینے تک اوڑھ لیا۔ اس کے کمرے میں بتی ساری رات جلتی تھی کیونکہ وہ گھپ اندھیرے کو ہی موت کی آمد سمجھتا تھا۔ کچھ دنوں سے تو جب وہ سونے لگتا تو اُسے یہ خیال آتا کہ وہ شاید صبح نہیں جاگے گا اور نیند میں ہی اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ وہ ہر صبح جاگ کر پہلے اپنے آپ کو ہی محسوس کرتا تھا۔

اگلے روز اٹھ کر اور چائے وغیرہ پی کر وہ معمول کے مطابق اپنی چھڑی لے کر باہر برآمدے میں آ گیا اُس کا بیٹا دفتر جاتا ہوا ہمیشہ کی طرح اُس سے ملنے آیا اور اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھتا ہوا چلا گیا۔ بیٹے کے جاتے ہی اُس کے دل میں اپنے

مکان میں پیچھے کی طرف لگے ہوئے امرودوں کے درختوں کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ دراصل درختوں سے زیادہ اُن خرگوشوں کو دیکھنا چاہتا تھا جو اس کے پوتوں منّو اور چنّو نے پال رکھے تھے وہ اندر گیا اور اس نے اپنی الماری میں سے بسکٹیں نکال کر اپنی جیبوں میں بھر لیں۔ وہ جب کبھی مکان کے پیچھے کی طرف جاتا تھا وہ اپنی جیبیں اسی طرح بسکٹوں سے بھر لیتا تھا کیونکہ اُدھر کھیلتے ہوئے چنو اور منو اپنے بابا کو دیکھتے ہی اس کی ٹانگوں سے چپٹ جاتے اور بسکٹ مانگتے۔ وہ اپنی چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ نیچے اُتر آیا اور پیچھے کی طرف پہنچ کر چنو، منو اور اُن کے دوستوں کو بسکٹیں دیتا ہوا امرودوں کے درختوں کے پاس آکر رک گیا۔

یہ درخت اُسے بہت پسند تھے۔ ایک بڑا درخت تھا جو کچے امرودوں سے لدا پڑا تھا۔ ایک اس سے چھوٹا تھا جس پر ذرا بڑے کئی امرود لگ گئے تھے اور دو تین تو تقریباً پودے ہی تھے جو پچھلے ہی سال لگائے گئے تھے اور ہرے بھرے پتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اُس نے بڑے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اپنے بائیں ہاتھ کو آنکھوں پر رکھتے ہوئے اوپر کی طرف جھانکا اور اُس کے جھانکتے ہی ٹہنیوں پر بیٹھی ہوئی دو تین چڑیاں اُڑ گئیں پھر وہ خرگوشوں کی طرف بڑھ گیا۔ یہ خرگوشوں کا جوڑا پچھلے سال مالی نے اُس کے لڑکے کو لا کر دیا تھا اور کوئی ایک ماہ کے بعد ہی اُن میں دو ننھے ننھے روئی سے بھی زیادہ سفید اور نرم بچوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اور اب تو وہ بھی پورے خرگوش تھے۔ اور اُن کے لئے ایک علیحدہ گھر بن گیا تھا وہ خرگوش کے گھر کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا اور اندر جھانکنے لگا۔ اس کے بیٹھتے ہی خرگوش دبک کر ایک کونے میں بیٹھ گئے اس نے جالی کے سوراخوں میں سے دو بسکٹ توڑ کر اندر پھینک دیئے، اور پھر زمین پر سے ہری گھاس کے چند تنکے توڑ کر اندر ڈال دیئے۔

وہ اُٹھ گیا اور مکان کی دیوار کے ساتھ دھوپ میں چلنے لگا۔ یہ مکان اس نے پچیس برس ہوئے چالیس ہزار روپے کی لاگت سے بنوایا تھا اور دس بارہ کمروں کا ایک شاندار بڑا مکان تھا جس کے چاروں طرف ایک اچھا خاصا باغ تھا اب اس لمبے چوڑے مکان میں جو کبھی اس کے خوابوں کی تعبیر تھا وہ تنہا ایک چھوٹے سے کمرے میں اپنی زندگی کی شام گزار رہا تھا۔ اس کی بیوی پندرہ سال ہوئے چل بسی تھی اور وہ اس سفر کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ وہ اس دنیا کی بے ثباتی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا ایک بھری پری بارونق زندگی کا یہی المناک انجام ہے۔ اس کی تمام زندگی چند سمٹے ہوئے ملبے بن کر اس کے سامنے سے گزر گئی۔ کتنا شوریدہ لڑکپن کتنی بھرپور جوانی، کتنی طاقت کتنا آرام، اور سکھ اس کی زندگی میں رہا تھا اور افسوس کہ وہ سب کچھ اس طرح مٹنے والا اور مٹ کر کبھی نہ بننے والا تھا۔ زندگی کا یہ انجام اور زندگی میں یہ موت کیوں تھی۔

سہ پہر کو تین بجے کھانا کھانے اور کچھ دیر لیٹنے کے بعد وہ اپنا کوٹ پہن کر اور چھڑی لے کر ندی کی طرف چل پڑا۔ آج اُسے کچھ زیادہ تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ صبح اُٹھ کر مکان کے پیچھے کی طرف چلا گیا تھا اور کچھ دیر وہاں رہا تھا۔ کمزوری کی اب یہ حالت تھی کہ اگر وہ ذرا سا بھی فالتو چل لیتا تو بڑا تھک جاتا تھا لیکن یہ تھوڑا بہت چلنا ہی تو اس کی زندگی تھی اور وہ اُسے چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ دن کے وقت کمرے کے باہر ندی کے کنارے کھلے آسمان کے نیچے اور سورج کی کرنوں میں زندگی محسوس کرتا تھا اور شام کو اپنے کمرے کے اندر۔ اُسے یہ وسیع دنیا اندھیرے میں ڈوبی ہوئی بڑی خوفناک لگتی تھی۔ وہ ندی پر پہنچ کر دھوپ میں بیٹھ گیا اور سورج کی کرنیں اس کے ناتواں جسم میں گرمی بھرنے لگیں۔ ہوا صاف شفاف پانی ایک خوشگوار خنکی کا احساس دے رہا تھا حرارت اور خنکی یہ امتزاج زندگی کا کتنا پرمسرت پہلو تھا اور وہ چند لمحوں کے لئے اپنے آپ کو بھول سا گیا۔

مگر جاڑے کی دھوپ بھی زندگی کی مانند کتنی مختصر ہوتی ہے گھنٹے دو گھنٹے میں ہی سہانی دھوپ کی یہ چادر سمٹ گئی اور ہوا میں خنکی سرسرانے لگی۔ وہ اُٹھ گیا کیونکہ درختوں کے سائے سمٹنے لگے تھے اور ایک زندگی ایک موت سے ہمکنار ہونے والی تھی ایک دہکتا ہوا آگ کا گولا ایک ٹھنڈی نارنجی گیند بن کر ڈوبنے والا تھا اور دھرتی پر ایک ڈسنے والی تاریکی کا غلاف پڑنے والا تھا وہ گھر اکر گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ نہیں، وہ ڈوبتے ہوئے سورج کو نہیں دیکھے گا نیچے پھیلاتے ہوئے سایوں پر نظر نہیں ڈالے گا۔ وہ بغیر موت کو دیکھے ہوئے اُس زندگی کی طرف لوٹ جائے گا۔ جو اب اُس کے کمرے کی چار دیواری میں بجلی کی ایک روشنی میں سمٹ جائے گی۔ وہ کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ ہانپتا ہوا گھر پہونچا۔

اس روز اُسے پتہ نہیں لگا کہ کب نیند آگئی یا آئی بھی یا نہیں۔ یہ زندگی کیا تھی اور موت کیوں تھی۔ اس پر وہ بہت دیر تک سوچتا رہا تھا۔ اور جتنا وہ سوچتا رہا تھا اس کا دل ڈوبتا سا گیا تھا اس نے اپنے دل کو کئی بار کڑا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی اُداسی دور نہ ہوئی تھی وہ ایک ایسی بے مقصد لمبی چوڑی زندگی کو جس کا انجام موت تھا ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ یہ ایک بڑا غیر یقینی اور بھیانک انجام تھا۔

اگلی صبح وہ چائے وغیرہ پی کر باہر برآمدے میں نہیں آیا بلکہ اپنے پلنگ پر لیٹا رہا۔ اُس نے آج اپنے اندر اُٹھنے اور باہر جانے کے لئے کوئی بھی جوش محسوس نہیں کیا دراصل وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کے لئے کوئی بھی سرگرمی چوبیس گھنٹے کے لئے ضروری نہیں ہے بے معنی سی تھی اس کا بیٹا حسب معمول دفتر جاتے ہوئے اُس سے ملنے کے لئے آیا اور اسے برآمدے میں نہ پا کر تیزی سے اندر آیا۔ باپ کو پلنگ پر لیٹے ہوئے دیکھ کر وہ بالکل اس کے قریب سرہانے کی طرف بیٹھ گیا اور اُس کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے

لگا۔ اُس نے بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک تھا۔ اس کا بیٹا دو تین منٹ تک بیٹھا رہا اور کچھ کہہ کر اور مسکرا کر چلا گیا

اس کا بیٹا چلا گیا مگر وہ کچھ ٹھٹک کر رہ گیا وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اس کا بیٹا ہو بہو اس کی تصویر تھا اور جب وہ بھی چالیس سال کا تھا تو بالکل ایسا ہی تھا اور اب جو اس کا بیٹا مسکرایا تھا تو بالکل اُسی کی طرح۔ تو کیا اُس کے بیٹے میں وہ خود موجود تھا۔ اور اس کا بیٹا جو ابھی دفتر گیا تھا تو کیا اُس کی شکل میں وہ خود گیا تھا؟

اس کے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا جیسے کوئی نئی روشنی پھوٹنے والی ہو۔ وہ لپک کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے اپنا کوٹ پہنا۔ چھڑی اٹھائی اور باہر برآمدے میں آگیا پھر وہ نیچے اتر کر پھاٹک کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اور باہر کی طرف دیکھ کر مسکرا اُٹھا کیوں کہ چند لمحے ہوئے وہ خود چالیس سال کا جوان بن کر اس پھاٹک میں سے نکل دفتر گیا تھا!

وہ اپنے کمرے میں آگیا اور اس نے اپنی جیبوں میں بسکٹیں ٹھونس لیں اور پھر باہر نکل کر چنو اور منو کو بسکٹیں دیتا ہوا امرودوں کے درختوں کی طرف ہو لیا اور انکے تلے چند لمحے کھڑا ہو کر خرگوشوں کے خاموش مگر خوش و خرم کنبے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ اس روز کافی خوش تھا اور اُسے تھکاوٹ کا احساس تک نہیں ہوا وہ لوٹ کے اپنے کمرے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور اُدھر سے چنو گزرا تو اُس نے اُسے بلا کر پوچھا کہ کیا وہ بابا کے ساتھ ندی پر چلے گا چنو نے جواب میں بابا سے پوچھا کہ کیا اس کی جیبوں میں بسکٹ ہیں اور جب اُس نے بسکٹ دکھائے اور ایک پہلے ہی دیدیا تو چنو خوشی سے بابا کے ساتھ ہو لیا۔

آج ندی پر بڑی روپہلی اور خوش گوار دھوپ تھی اور ندی کا پانی چندن کی طرح سفید اور اجلا تھا درختوں کے بلے سائے چمکتی دھرتی پر اپنے جسموں کی شکل بنے لہلہا رہے تھے ندی کے اوپر آسمان کی نیلگوں پہنائی میں پرندوں کی کتنی ہی ڈاریں اُڑان میں مصروف تھیں چاروں طرف ایک نہ مٹنے والی زندگی تھی۔ وہ دھوپ میں نیچے بیٹھ گیا تھا اور اُس نے چنو کو دو بسکٹ دے کر اپنے پاس ہی کھیلتے رہنے کو کہدیا تھا۔

تھوڑی دیر میں چنو اپنے ہاتھ میں گول گول بجریاں اکٹھی کر کے لے آیا اور جب اُس نے اُنہیں نیچے رکھ کر بابا سے آئس کریم کے پیسے مانگے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چنو کی شکل بھی اس سے بہت ملتی تھی اور اُس کے کان اور آنکھیں تو بالکل ہی اُس پر تھیں۔ اس کے ذہن میں اُس کا بچپن جھلملانے لگا اور وہ چنو کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ تو کیا وہ اپنے بعد اپنے بیٹے کی صورت میں اور پھر اس کے بعد اپنے پوتے کی صورت میں زندہ رہے گا اور کیا زندگی ایک ایسا دائرہ ہے جو کبھی نہیں ٹوٹے گا۔؟

اس نے چنو کو پیسے دیئے اور چنو آئس کریم لینے دوڑ گیا۔ وہ بے اختیار ہنس پڑا اور نیچے بیٹھ کر چنو کی بجریوں سے کھیلنے لگا۔ پھر چنو بابا کی چھڑی لے کر بابا کی طرح چلا اور اس کی

---

خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ وہ دونوں دیر تک ندی پر رہے اور جب درختوں کے سائے سمٹ گئے اور گرمی اور روشنی کو خنکی اور اندھیارے نے ڈس لیا تو بھی وہ نہیں گھبرایا۔ وہ اطمینان سے سورج کو افق میں کانپتے اور ڈوبتے دیکھتا رہا اور اُسے محسوس ہوا کہ ایک زندگی دوسری زندگی میں ڈھل رہی تھی، موت کا کہیں نام و نشان نہیں تھا اور لاتعداد دائرے ایک دوسرے میں جذب ہو کر مسلسل گھوم رہے تھے۔

# رباعیات

امیر حیدر بہار

(۱)

انسان کی دو روزہ زندگی کیا ہے
کیا چیز بڑھاپا ہے، جوان کیا ہے
جاتی ہے کہاں روح بشر بعد فنا
آنے جانے کی یہ کہانی کیا ہے

(۲)

کرتی ہے ہمیں عقل اشارہ کچھ اور
لیکن ہے طبیعت کا تقاضا کچھ اور
مجبور ہے کس درجہ زمانے میں بشر
کرتا ہے وہ کچھ، اور ارادہ کچھ اور

(۳)

نالاں ہے غم دہر سے انسان بہت
اٹھتے ہیں یم زیست میں طوفان بہت
اے دوست نظر الجھ کے رہ جائے نہ کیوں
افسانۂ ہستی کے ہیں عنوان بہت

(۴)

مانا کہ میں ہوں دیر و حرم سے بیزار
اخلاص و محبت ہے مگر میرا شعار
ناراض نہ ہوں شیخ و برہمن مجھ سے
میں اپنی ضمیر کا ہوں فرماں بردار

(۵)

تسکیں نہ ملے جس سے وہ ایماں کیا ہے
بخشے نہ گناہ جو وہ یزداں کیا ہے
جو درد سے معمور نہ دل کیسا؟
اوروں کے نہ کام آئے جو انساں کیا ہے

## قابلِ مطالعہ

# کتابیں

| | |
|---|---|
| ہمارا جھنڈا | ایک روپیہ |
| بھارت آج اور کل | ۷۵ پیسے |
| دو شہروں کی کہانی (چارلس ڈکنس) | ۵ روپے |
| جوالا مکھی (ناول، اننت گوپال شیوڑے) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کا دستور | ۲ روپے |
| آئینہ غالب | ۵ روپے |
| آج کل کی کہانیاں | ۳ روپے ۵۰ پیسے |
| وطن کے نغمے | ایک روپیہ ۷۵ پیسے |
| امرجوت | ۲ روپے |
| سائنس کے چند پہلو | ایک روپیہ ۲۵ پیسے |
| ہمارے نہرو | ۳ روپے ۵۰ پیسے |
| گنجینہ غالب | ۴ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کی مسجدیں | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| مہاتما گاندھی کی کہانی (رنگین تصویروں میں) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |

| | |
|---|---|
| اچھا شہری (بچوں کے لئے) | ایک روپیہ |
| نہرو راد ھاکرشنن کی نظر میں | ایک روپیہ |
| ابوالکلام آزاد | دو روپے |
| ہندوستان کی تاریخ (بچوں کے لئے) | ۳ روپے ۷۵ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ اوّل) | ۲ روپے ۲۵ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ دوم) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ سوئم) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| سوامی وویکانند (بچوں کے لئے) | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |
| جواہر لال نہرو (خراج عقیدت) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان میں تعلیم کی از سرِ نو تنظیم (ڈاکٹر ذاکر حسین) | ایک روپیہ ۲۵ پیسے |
| ہندوستانی ڈرامہ (صفدر آہ) | ۳ روپے ۷۵ پیسے |
| پنڈت نہرو سے بات چیت (میبر منڈی) | ۲ روپے |
| ندیا کنارے (علی عباس حسینی) | ایک روپیہ |
| کلکی یا تہذیب کا مستقبل (ڈاکٹر راد ھاکرشنن) | ۷۵ پیسے |

آج کل کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت ہوگی
محصول ڈاک ہمارے ذمہ ہوگا

اُردو کے علاوہ انگریزی، ہندی اور تمام علاقائی زبانوں میں کتابیں شائع ہوتی ہیں

فہرستِ کتب مفت طلب کیجئے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

# جس محلے میں ہمارا گھر ہے

احمد جمال پاشا



جس محلے میں ہے ہمارا گھر وہیں بقول مرزا شوق دہلوی رہتا ہے ایک سوداگر
یں اس بات کا پکا یقین ہے کہ شوق مرحوم کے زمانے میں ضرور اس علاقہ میں کوئی
وداگر رہتا ہوگا۔ مگر اب تو سمجھئے واقعی لوگ کم رہتے ہیں اور سوداگر زیادہ۔
روں کے آگے یہاں یادش بخیر کبھی ڈرائنگ روم، دیوان خانے اور مہمان خانے
ہوا کرتے تھے۔ ان کے بجائے اب دُکانیں اور صرف دُکانیں ہوا کرتی ہیں۔ اور
دکانیں بھی ایسی کہ گھر کے سامنے دکانیں، گھر کے پیچھے دکانیں، گھر کے دائیں
دکانیں، گھر کے بائیں دکانیں، یہاں تک کے گھر کے اوپر اور نیچے دکانیں۔
چنانچہ ہمارا گھر اچھا خاصا بساط خانہ اور محلہ بازار معلوم ہوتا ہے۔ غرض جب ہم اپنے
گھر کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنے بچپن میں پڑھی ہوئی ایک نظم 'The Charge of the Light Brigade' بے اختیار یاد آجاتی ہے جس میں ٹیپ کا بند تھا۔!

"Canon to the left of them,
Canon to the right of them,
Canon in the front of them,
Canon behind of them".

بس فرق یہ ہے کہ اس فوجی بریگیڈ کے چاروں طرف توپیں ہی توپیں اور اس کشتۂ بازار کے ہر طرف دکانیں اور بس دکانیں ہیں۔

ان دکانوں میں دکانداری سے زیادہ شور وغل کی آوازیں دن تو دن، رات تک میں ہمارا جینا اور سونا دوبھر کئے رہتی ہیں۔ یہ آوازیں مول تول سے لے کر مار پیٹ اور ریکارڈنگ تک کی ہوتی ہیں۔ اور اس بازار کا ہر سودا با آواز بلند طے پاتا ہے۔

آپ مانیں یا نہ مانیں مگر اب ہم اس دھماکوں، ہنگاموں اور آوازوں کی دنیا کے شور شرابے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اگر ٹھیک سے شور نہ ہو رہا ہو تو آرام سے سو نہیں پاتے، اور اگر بازار وغیرہ بند ہونے کی وجہ سے کچھ سناٹا ہو، تو عجب الجھن اور بے چینی سی رہتی ہے۔

مگر اس شور وغل کے فائدے بھی ہیں۔ مثلاً حال ہی میں ہمارے ایک عزیز مع اپنے خاندان لکھنؤ کی سیر کے لئے ہم پر اس طرح نازل ہو گئے جیسے گنہ گاروں پر عذاب اور کمزوروں پر موسمی بخار۔ ہم اس مہنگائی میں مہمانداری کے بوجھ سے دبنے ہی والے تھے اور ہمارا بجٹ فیل ہونے میں کوئی خاص کسر باقی نہیں رہ گئی تھی ہمارے معزز مہمان کئی دن اور دو رات مسلسل شور وغل کی وجہ سے سو نہ سکنے کے بعد اپنا بوریا بستر باندھا اور شہر کے باہر ڈاک بنگلے میں قیام کے لئے ہمارے ظاہری روکنے کے باوجود چل دیئے۔ اور ہمارا بجٹ فیل ہونے سے اور ہم محض اس دن رات کے شور کی وجہ سے بال بال بچ گئے۔

اس شور وغل سے ایک اور فائدہ یہ ہے کہ ہمیں صبح صبح بلا اخبار پڑھے دنیا جہاں کی خبریں معلوم ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر اہم خبر کے بارے میں مختلف قسم کی رائیں اور بے لاگ تبصرے مل جاتے ہیں۔ کیونکہ زیادہ تر کاروباری حضرات اخبار بھی اس طرح پڑھتے ہیں گویا اخبار پڑھ نہیں، چلا چلا کر بیچ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ پاس پڑوس کے لاتعداد ریڈیو اور ٹرانسسٹر پل پل کی خبریں ہمارے کانوں میں پہنچاتے رہتے ہیں۔ فری خبروں کے بعد ہمیں صبح سے رات گئے تک عام طور پر، اور خاص طور پر تہوار تقریب کے موقع پر دن بھر کے علاوہ رات بھر بھی بالکل مفت تازہ ترین فلمی گانے اور فرمائشی پروگرام سنائی دیتا ہے۔

کرکٹ میچ کی کمنٹری، ۱۵ اگست اور ۲۶ جنوری کے موقع پر جشن جمہوریہ کے پروگرام، اہم اعلانات اور بازار کے بھاؤ کے لئے ہمیں کبھی سننے کا کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑا ہم اپنے معمولات میں مصروف رہے مگر ہر پروگرام کی تفصیلات سے خود بخود آگاہ بھی ہوتے رہے۔

اسی کے ساتھ ایک زبردست فائدہ گھر میں بازار لگنے کا یہ بھی ہے کہ ہمیں ہمیشہ معلوم رہتا ہے کہ کون سی چیز بازار سے غائب ہے؟ کس چیز کے دام چڑھے یا گرے۔ کون چیز کہاں اچھی ملتی ہے اور کون کہاں خراب؟

چوں کہ ہمارا گھر بیچ شہر میں واقع ہوا ہے۔ اس لئے ہمارا ہر عزیز، شناسا اور جگری دوست، خواہ کہیں بھی رہتا ہے مگر شہر کے اس بارونق بازار کا ضرور رُخ کرتا ہے اور جو لوگ یہاں تک آجاتے ہیں وہ گھڑی دو گھڑی کے لئے غریب خانے کو بھی رونق بخش جاتے ہیں۔ اس زمانے میں جبکہ جناب کرایے اتنے مہنگے ہیں اور رکشا والے ٹیکسی والے کا کرایے میں مقابلہ کرتے ہیں، ہم کرایے اور آنے جانے کی زحمت اور خرچ سے بالکل صاف بچے رہتے ہیں کیونکہ جائیں تو جائیں کہاں۔ سب تو خود یہیں آجاتے ہیں۔

آنے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو محض وقت گزارنے یا ادھار مانگنے آتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو کھڑے کھڑے آتے ہیں اور الٹا ہم ہی سے پوچھ لیتے ہیں۔ "ہمارے لائق کوئی خدمت؟" تو ہم اس آخر الذکر قسم کی مخلوق سے ملنا زیادہ پسند کرتے ہیں جو خیر سے مخلص کے علاوہ خدمت گزار بھی واقع ہوئی ہے۔ لہٰذا جن لوگوں سے ہم نہیں ملنا چاہتے فوراً پردے کی آڑ میں سے زنانی آواز بنا کر خود ہی کہہ دیتے ہیں۔

"میاں! بھیا نہیں ہیں۔"

اور اگر کسی نے کہا۔

"کون ہو؟ باہر تو آؤ۔"

تو نہایت عاجزی کے ساتھ کہتے ہیں۔

"میاں! کیسے آجائیں؟ پردے دار جو ٹھہرے۔"

اس کے بعد وہ غریب لاجواب ہو کر رفو چکر ہو جاتا ہے۔ اور جب کبھی راستے گلی ان سے صاحب سلامت ہوتی ہے اور وہ بتاتے ہیں کہ "جناب کے دولت خانے پر حاضر ہوا تھا" تو ہم بڑی لاعلمی کے ساتھ دریافت کرتے ہیں

"کب؟"

اور جب وہ گا چکتا ہے تو اسے کل پھر بلاتے ہیں۔

ہمارے بہت سے دوستوں کو حیرت ہے بلکہ تعجب ہے آخر ہم سینما کیوں نہیں دیکھتے۔ لیکن شاید انہیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ اتنے فلمی ماحول میں دن رات رہنے کے بعد فلم دیکھنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کیونکہ ہمیں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، صبح شام اور دن رات اپنے محلے اور پڑوس نما بازار کے مکالمے، گانے اور مفت کی موسیقی سننے کے ساتھ ساتھ ان کی گھریلو اور بازار و مار دھاڑ والی زندگیوں کی پوری پوری تاکی فلمیں اور آنے والی فلموں کے ٹریلر تک سننے کو مل جاتے ہیں۔ جس کے بعد الگ سے سینما دیکھنا آخر بدذاتی نہیں تو پھر کیا ہے؟

پھر بھی آخر میں ہم یہی عرض کریں گے کہ غرض زمانے کو دیکھتے ہوئے جہاں بھی ہمارا گھر ہے۔ بہت غنیمت ہے۔ جس کے لئے ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ خدا اسے آباد اور ہمیں شاد رکھے۔


غالبیات سیریز اضافہ

غالب کے فکر و فن اور زندگی سے متعلق دو اہم کتابیں

آئینۂ غالب :- ۲۲ مقالات۔ بڑا سائز
ٹائپ کی عمدہ چھپائی۔ صفحات ۲۷۸۔ قیمت ۵ روپے

گنجینۂ غالب :- ۱۴ مقالات۔ بڑا سائز۔ ٹائپ کی عمدہ چھپائی، صفحات ۱۸۶۔ قیمت ۴ روپے

محصول ڈاک ہمارے ذمے۔ تین روپے اور اس سے زائد کی کتابیں بذریعہ وی پی منگوائی جا سکتی ہیں۔

بزنس منیجر: پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱

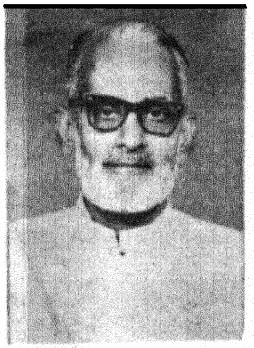

## ظفر ادیب

لھوں ہی آرزوئیں ہیں ہر آدمی کے سا تھ !
یکن یہ قافلہ ہے فقط زندگی کے سا تھ
نگینیاں بھی تو ہیں غم عاشقی کے سا تھ
باکیا خوشی نہیں ہے اس آرزدگی کے سا تھ
یسا نہ دور میں ہے تو ہے زندگی کا دوَر
رایک بات میں ہے کشش مے کشی کے ساتھ
ولا نہیں ہوں میں تو نہیں وہ بھی بھولیں گے
ل کی لگی بھی ہوتی ہے کچھ دل لگی کے ساتھ
ن کی جفا کا ردِّ عمل ہے میری وفا
نا یہ ہمیشہ وہ نہ رہیں برہمی کے ساتھ
ہم ہی تھے کہ سہتے رہے تیری بے رُخی
باکیا زخم اُٹھائے ہیں ہم نے خوشی کے ساتھ
س اک نگاہ لُطف کی ہے تجھ سے آرزو
خر طلب ظفر کو ہو کتنی کمی کے ساتھ



## عبدالحمید حمید عظیم آبادی

دل میں سوزش ہے مرے آگ لگی ہو جیسے
اور دھواں بھی ہے کوئی چیز جلی ہو جیسے
دل کو پژمردہ زمانے نے کیا ہے ایسا
شاخ گل میں کوئی مرجھائی کلی ہو جیسے
مُسکراتا تری محفل سے رقیب اٹھا ہے
اس کے مطلب کی کوئی بات بنی ہو جیسی
پی کے آنکھوں سے تری مست ہیں میکش ساقی
ساری مستی تری آنکھوں میں بھری ہو جیسے
تیری تصویر سے ہو جاتی ہے دل کو تسکیں
ہے تو تصویر مگر بول رہی ہو جیسے
جس گلی سے میں گزرتا ہوں جنوں میں جب بھی
وہ گلی لگتی ہے تیری ہی گلی ہو جیسے
آنکھیں پتھرائیں مگر جانبِ در ہیں پھر بھی
اُن سے ملنے کی ابھی آس لگی ہو جیسے
ضبطِ غم پر کوئی کیونکر نہ کرے رشک حمید
ہنستے رہتے ہو تم ایسے کہ خوشی ہو جیسے

## دِل ایّوبی ٹونکی

منظرِ دیدۂ نمناک ہے جل تھل کی طرح
دِل سے گزری ہے تری یاد ابھی بادل کی طرح
دوستو صبح کے آثار مبارک لیکن
آج بھی شام نہ ہو جائے کہیں کل کی طرح
سرفروشوں کو دعا دے کہ انہیں کے دم سے
سرخرو ہے ترا کوچہ کسی مقتل کی طرح
شام ہوتے ہی اندھیرے مری تنہائی میں
پھیل جاتے ہیں تیری آنکھ کے کاجل کی طرح
لبِ سے واہیں میری آنکھوں کے دریچے ظالم
کب سے ویران ہے دِل بیت مقفّل کی طرح
ڈھانے والے درو دیوارِ تمنا یہ نہ بھول
دِل مقدّس ہے مراقبۂ اول کی طرح
اُن کے دَم سے جو کبھی رشکِ ارم تھا اے دِل
وہی گھر ہے کسی سنسان سے جنگل کی طرح

# مقالہ کیا ہے

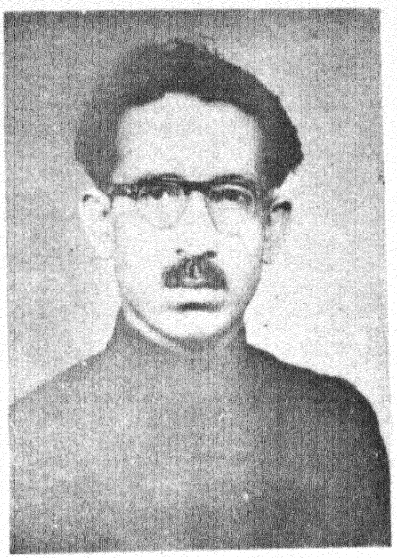

ہماری زبان کے نثری حصّے میں جس صنف ادب کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ افسانے کے بعد مقالہ ہے ـــ اگر پچھلے پونے دو سو سال کی ادبی کائنات کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں اپنے ادبی سرمایہ کی بے بضاعتی شدید طور پر محسوس ہوگی۔ یہ کہنا بڑی حد تک صحیح ہوگا کہ پچھلا سرمایہ نظم، داستان اور مضمون جیسی مقبول اصناف نگارشات پر مشتمل تھا۔ ہر نوع کے جذبی و فکری کوائف کی شعری قلم بندی کی صورت "نظم" تھی، وہ نظم جو نثر کی ضد سمجھی جاتی اور جس میں مختلف شعری سانچے داخل تھے۔ اخلاقی، مذہبی و نیم مذہبی واقعات و حکایات کی نثری قلم بندی کی صورت "داستان" تھی، وہ داستان جو فرضی اور غیر فطری، قیاسی اور غیر حقیقی واقعات کا مجموعہ تھی۔ مختلف قسم کے علمی و ادبی سنجیدہ اور اہم موضوع و مسائل کے بیان و اظہار کا اسلوب "مضمون" تھا۔ بساطِ ادب پر صنفی لحاظ سے نگارشات کی یہی تین شعری و نثری قسمیں بحیثیت مجموعی، ہمارے اہلِ قلم کا سرمایۂ ذہن و زبان تھیں۔

مقالہ "مضمون" کی ایک قسم ہے، مگر منفرد اور مہتم بالشان قسم ہے عام زبان میں ہر بات یا خیال جو نثر میں پیش کیا جائے، مضمون سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ پر، ہر نثری تحریر کو ہم مقالہ نہیں کہہ سکتے ـــ مقالہ تحریر کی ایک منظم و مستحکم صورت ہے، جو انشائیہ، سوانح، خاکہ اور رپورتاژ جیسے دیگر نثری اصناف کی طرح ادب میں اپنا خاص مرتبہ و منصب رکھتا ہے۔ مقالہ نگار ایک بھرپور علمی و ادبی شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ یہ صاحبِ قلم ہوتا ہے اور صاحبِ فکر و نظر بھی۔ مقالہ نگاری میں صنفی ضوابط اور فنی شرائط کا التزام ضروری ہے۔ یہ کسی عالم و فاضل کی قلم کاری ہے جو پارۂ ادب کہے جانے کی مستحق ہے۔

ـــ مقالہ ایوانِ ادب میں روزن کی مثال ہے، روشن، کھلا اور ہوادار؛ اچھے اور معیاری مقالوں سے ہمیں ذہنی تابانی حاصل ہوتی ہے۔ یہ ہمارے ذہن کی تاریکی کو دور کرتے اور دماغ کے بند دریچے کھول دینے کی قوت رکھتے ہیں۔ ایک کامیاب مقالہ کلیدِ گنجینۂ علم ہوتا ہے۔ یہ وہ صاف و شفاف شیشہ ہے جو نہایت اعتماد کے ساتھ دور بینی اور خورد بینی میں کام آتا ہے۔

(الف) علمیت مقالہ کی بنیادی خصوصیت ہے۔ علمیت اس تحریر کا وہ اساسی وصف ہے جو اس صنف کو دوسری نثری تحریروں سے حسّاً و نسباً مختلف کر دیتا ہے ـــ اچھے اور اونچے مقالوں کے مطالعہ سے ہمیں علم و دانش کی دولت حاصل ہوتی ہے یہ مفید اور اہم معلومات کی زرّیں دولت ہے۔ یہ علمیت کا بیش بہا خزانہ ہے اور غیر فانی خزانہ بھی۔ مقالہ کا نفس کسی مخصوص بات یا خیال سے معمور رہتا ہے۔ ایسی بات یا خیال مسئلہ، نکتہ یا پہلو جو ہماری ذات یا زندگی سے علاقہ رکھتا ہے، کبھی بالواسطہ اور کبھی بلاواسطہ وہ خاص بات جس کی جان پہچان اس چلتی پھرتی اور بنتی بگڑتی دنیا میں ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔ وہ اہم بات جسے جانے پہچانے بغیر کبھی زندگی گزارنا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔

علمیت مقالہ کا جوہر ہے۔ کامیاب مقالہ قلم کار کی ذہنی علم شخصیت اور اس کے تبحّر علمی کا پرتو ہوتا ہے۔ اس تحریر میں اس کے شعور و نظر کی بلندیاں ابھرتی ہیں۔ وہ عالم ہوتا ہے اور طلبِ علم کا جذبہ صادق رکھتا ہے مطالعہ اور کثرتِ مطالعہ اس کا

محبوب مشغلہ ہوتا ہے کہتا ہیں، اچھی کتابیں اس کی مونس وہمدم رہتی ہے۔ مقالہ نگار کے مطالعہ میں جس قدر وسعت و گہرائی ہوگی، موضوع تحریر پر جس قدر اس کی ذاتی نظر ہوگی، مقالہ میں اسی قدر علمیت کا زور، وزن اور روشنی ہوگی۔

مقالہ کا ماخذ قول ہے، جس سے مراد بیان، کلام، گفتگو یا بات چیت ہے ـــــ یہی گفتگو یا کلام مقالہ نگار کا مقصد و مدعا ہے۔ وہ ہمیں کچھ کہتا یا سُناتا ہے ـــــ یہ "کچھ" واقعہ نہیں۔ یہ شاعری نہیں ـــــ یہ گپ شپ بھی نہیں ـــــ یہ کچھ کوئی مفید علمی بات ہوتی ہے تسکین بخش اور فکر انگیز ـــــ یہ ایسی اہم اور سود مند بات ہوتی ہے جسے ہم نہیں جانتے یا کم جانتے ہیں۔ جس کے نہ جاننے سے ہماری خواندگی یا خردمندی پر حرف آتا ہے اور ہم ذہنی مفلسی کا شکار ہو جاتے ہیں ـــــ

علمیت مقالہ کی بنیادی خصوصیت یہ ہے۔ مقالہ نگار کسی موضوع پر عالمانہ اور فاضلانہ اظہار خیال کرتا ہے۔ لیکن انداز گفتگو یعنی موضوع تحریر کے بیان کے طریقۂ کار سے علمیت کی ماہیت بدل جاتی ہے، اور علمیت کی تاثیر و عمل میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے ـــــ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھئے کہ علمیت مقالہ میں ایک رقیق مادّہ کی مثال ہے جس سے قاری کی تشنگی دور ہوتی ہے۔ یہ رقیق مادّہ کہیں صرف ٹھنڈا پانی ہے، کہیں کیف افزا شربت اور کہیں حیات بخش عرق ـــــ علمیت کی اس نوعیت اور خاصیت کے بموجب مقالوں کو تین مختلف طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ معلوماتی مقالے
۲۔ تاثراتی مقالے
۳۔ فکری مقالے

معلوماتی مقالے علوم یا سائنس سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ تاریخ، فلسفہ، منطق، سیاست، عمرانیات، نفسیات، اخلاقیات جیسے سنجیدہ علوم سے علاقہ رکھتے ہیں۔ نیز یہ کیمیات، طبعیات، فلکیات، ریاضیات، نباتیات و دیگر سائنسی موضوعات پر بھی مبنی ہوتے ہیں۔ بنفسہٖ ہر معلوماتی مقالہ میں کسی علمی یا سائنسی بات پر اظہار خیال کیا جاتا ہے جس طرح کسی شعبہ کی نمائش گاہ کی سیر و مشاہدہ سے ہم اس شعبہ کے وجود کی اہمیت اور اہل شعبہ کی کارکردگیوں سے اچھی طرح روشناس ہو جاتے ہیں اسی طرح معلوماتی مقالوں کے ذریعے ہمیں علوم اور سائنس کی سیر و سیاحت کے مواقع نصیب ہوتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے ہم مختلف علمی یا سائنسی مسائل و امور سے باخبر اور آگاہ ہو جاتے ہیں۔

معلوماتی مقالے قاری کے لئے ابتدائی اسباق کی مثال ہیں۔ معلوماتی مقالوں میں عموماً قلم کار کا اپنا زاویۂ نظر یا نقطۂ نگاہ نہیں ہوتا۔ ان تحریروں میں اس کی ادبی شخصیت کا عکس و نقش نہیں ملتا۔ وہ ایک ذی علم لائق اور مشفق مدرس کی طرح سنجیدگی کے ساتھ مصروف تعلیم و تدریس رہتا ہے۔ مقالہ کی سب سے عام قسم معلوماتی ہے۔ معلوماتی مقالے، بالخصوص ابتدائی منزل و منہاج کے معلوماتی مقالے، کثرت سے لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔

(۲) مقالوں کی دوسری قسم تاثراتی ہوتی ہے۔ ان مقالوں کے مطالعے سے بھی ہمیں علمیت حاصل ہوتی ہے۔ مگر ان میں علمیت کی خاصیت و تاثیر مختلف ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی بات کا جاننا اور کسی بات کا پہچاننا ایک نہیں ہوتا، یا کسی چیز کو دیکھنا اور اس کو سمجھنا علم و آگہی کی دو منزلیں ہیں، جیسے گھڑی پر اک نظر ڈالنا اور گھڑی کی دو سوئیوں کے عدوی قیام کو دیکھنا: ـــــ مقالہ معلوماتی ہو یا تاثراتی، بلاشبہ اس کے مطالعہ سے ہمیں کچھ حاصل ہوتا ہے۔ مگر معلوماتی مقالے کی علمیت ظاہری شناسائی ہے، محض چلتی پھرتی۔ تاثراتی مقالے کی علمیت گہری ہوتی ہے اور دیرپا۔ کہہ سکتے ہیں معلوماتی مقالوں میں علمیت کی تاثیر کسی شخص سے چند ساعتوں کی ملاقات کی مثال ہے اور تاثراتی مقالوں میں یہ تاثیر اس شخص سے رفاقت کی مثال ہے۔

علمیت کی یہ تاثیر یا گہرائی تاثراتی مقالہ میں قلم کار کے داخلیتی طریقۂ کار سے پیدا ہوتی ہے۔ ان تحریروں میں وہ اپنی شخصیت کو علیحدہ رکھ کر قلم نہیں اٹھاتا، بلکہ قلم بندی میں اس کی عالمانہ شخصیت کے ساتھ ادبی مزاج بھی حرکت میں آجاتا ہے۔ اظہار خیال میں وہ خارجیت اور داخلیت دونوں سے مصرف لیتا ہے۔ اس طریقۂ کار سے باتوں کی خشکی روکھے پن اور بے کیفی میں کمی ہو جاتی ہے۔ ان میں جذبی کوائف کی نمی آجاتی ہے۔ اور تحریر میں نت نئے رنگ پھوٹ پڑتے ہیں۔ معلوماتی مقالے میں خارجیت کی تیزی ہوتی ہے اور موضوع کے ساتھ قلم کار کا ایسا شعوری ضبط و احتیاط جس سے باتیں زیادہ سنجیدہ اور ارتکازی ہو جاتی ہیں۔

معلوماتی مقالہ ہمارے علم میں اضافہ کا سبب فی الفور ہوتا ہے۔ یہیں بیدار و ہوش مند بناتا ہے۔ تاثراتی مقالہ ہماری پسند و خاطر میں استواری و پائیداری لاتا ہے تاثراتی مقالوں سے بینائی کو مشاہدہ کی قوت اور بصارت کو بصیرت کا زور حاصل ہوتا ہے۔ معلوماتی مقالے ہمیں راہ بتاتے ہیں۔ تاثراتی مقالے اس راہ پر چلنے کی توانائی اور توفیق بخشتے ہیں۔

(۳) مقالوں کی تیسری قسم فکری ہے۔ فکری سے یہ مراد نہیں کہ اس نوع کے مقالوں کا موضوع فلسفہ و حکمت ہوتا ہے بلکہ یہاں قلم کاری کا انداز فلسفیانہ ہوتا ہے یعنی موضوع تحریر پر مقالہ نگار عالمانہ اور مفکرانہ انداز سے قلم اٹھاتا ہے اس کی علمی شخصیت اوسط نہیں، غیر معمولی ہوتی ہے اس کی ذہنی قوتیں قدرت کی فیاضی کا نمونہ ہوتی ہیں۔ اسے بصیرت ہوتی ہے اور ژرف نگاہی بھی۔ علاوہ بریں، اس کا اپنا مطمح نظر ہوتا ہے، واضح اور روشن۔ یہ مطمح نظر کثرت مطالعہ، غور و خوض اور تفکر سے پیدا ہوتا ہے۔

داخلیت فکری مقالوں میں بھی ہوتی ہے۔ یہ داخلیت تاثراتی مقالوں

جیسی سریع التاثیر نہیں ہوتی۔ یہ معتدل اور مناسب ہوتی ہے۔ صنفِ مقالہ ہمیں نہ بھولنا چاہیے۔ ادب کی نہایت سنجیدہ صالح اور دقیع تحریر ہے جس میں قلم کار کے لئے ضبط، صبر اور متانت اوّلین شرط ہے۔ جذبی کو الف کے اظہار میں اس نے مقالہ نگار کو انتہائی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ جذبات کی تیزی، جوش و خروش یا شدت سے مقالے کی تاثیر میں فرق آجاتا ہے۔ جس طرح انتشارِ خیال سے نظم کی رَو فوراً گھٹ جاتی ہے یا کثرتِ واقعات سے افسانہ کا حلیہ بدل جاتا ہے، جذبات کے افراط و افزونی سے یہ صاف ستھری تحریر بھی بدصورت اور بدانجام ہو جاتی ہے۔

فکری مقالوں میں داخلیت کی وجہ سے کبھی ہجو و طنز اور درد و رقت کی کیفیتیں بھی نمودار ہو جاتی ہیں۔ یہ مناسب نہیں۔ پر اُن میں اعتدال ضروری ہے بلند پایہ فکری مقالوں میں اُن کا استعمال نہایت ماہرانہ ہوتا ہے۔ ان میں بالخصوص ہجو اور طنز کے براق و براّق نمونے ملتے ہیں جیسے شگفتہ لبوں پر خفیف سا تبسم اور چشمے گوں میں آنسوؤں کی نمی۔

فکری مقالے مقالوں کی سب سے بزرگ و اعلیٰ قسم ہیں معلوماتی یا تاثراتی مقالوں کی طرح یہاں قلم کار کا مقصد علمیت کی تدریس و تعظیم ہے۔ علمیت کی نوعیت ان تحریروں میں نہایت ارفع و ادق ہوتی ہے۔ یہ ایسی معنویت ہوتی ہے جسے تحریر میں تحلیل کرنا ہر مقالہ نگار کے بس کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فکری مقالوں کے قاری عوام نہیں خواص ہوتے ہیں۔ یہ وہ غذائیں نہیں جو ہر دل و دماغ کو راس آجائیں — اُن کا لکھنے والا ایک بیدار دماغ انسان ہوتا ہے، بڑا مفکر اور زمانہ شناس عالم جس کی پیری میں جھلکتا ہے سحر مثلِ شباب! — یہ حکمت کو ادب اور ادب کو حکمت میں تبدیل کرنے کا سحر جانتا ہے۔ معیاری فکری مقالے زبان و ادب کی وہ قیمتی دستاویزیں ہیں۔ جو ادب و تہذیب کو لازوال بناتے ہیں۔

(ج) سنجیدگی اور متانت مقالے کی تیسری اہم خصوصیت ہے۔ یہ تحریر بنفسہٖ نہایت سنجیدہ ہوتی ہے۔ یہ تفریحی یا انشائی نہیں ہوتی۔ نثری ادب کے تمام اصناف کے مقابلے میں اس لحاظ سے مقالہ کا وجود منفرد ہے۔ مقالہ نگار کسی علمی موضوع جو ادبی یا سائنسی ہو، پر سیر حاصل گفتگو کرتا ہے اور عالمانہ اور فاضلانہ انداز سے کرتا ہے سنجیدگی اور سنجیدہ بیانی اس کی خلقی صفت ہے۔

مقالہ کی سنجیدگی دراصل مقالہ نگار کے مزاج و طبع کا پرتو ہوتی ہے یہ سنجیدگی اس کی شخصیت کے وہ رُخ سامنے لے آتی ہے جس میں بزرگی ہوتی ہے اور بلندی بھی، ایثار ہوتا ہے اور عاجزی بھی۔ اخلاص و دیانت اور راستی فی الحقیقت اس کی سیرتی اوصاف میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں کچھ بخشتا ہے بے مانگے دیتا ہے اور ہمارے ظرف کے بموجب دیتا ہے۔ جتنا وہ جانتا ہے، بتاتا ہے اور ہمیں جتنا جاننا چاہئے اس کے بتانے میں دریغ نہیں کرتا، قاری کو اپنی برتری سے مرعوب کرنا اُس کے ذہن کو غیر متعلق باتوں میں اُلجھانا، اس کی ذہانت اور فراست کو تھکانا، اس کا شعار و شرافت نہیں۔ وہ الجھنوں کو سُلجھاتا ہے، گرہوں کو کھولتا ہے، لاعلموں کو بیدار، کم علموں کو باخبر اور ذی علموں کو ہوشیار و کاردار بناتا ہے۔ یہی مقالہ نگار کی دیانت راستی اور اخلاص ہے۔

مقالہ نثری ادب کی واحد تحریر ہے جو قلم کار کی عالمانہ و مفکرانہ شخصیت کی ضامن ہوتی ہے۔ یہ تحریر قلم کار کے تبحر علمی، وسعتِ نظری، نکتہ رسی، دقیقہ رسی حافظہ اور خیال آفرینی کی صحت و ثبات کا آئینہ ہوتی ہے۔ اس تحریر میں قلم کار کا صاف ستھرا ذہن، واضح مطمحِ نظر اور نکتہ حق بیں ریڈیو میں ڈائل کے نقش کی مثال ہیں — مقالہ معلوماتی ہو، یا تاثراتی ہو یا فکری، اگر مقالہ نگار طبعاً و خلقاً سنجیدگی و متانت کے اوصاف سے مبرّا ہے تو وہ مقالہ نگار کے فرائض انجام دینے کا اہل نہیں۔ ایسے مقالہ نگار بجھے چراغ ہوتے ہیں، جن کی جگہ اس معمورہ علم میں ممکن نہیں۔

وہ مقالے جو تحقیقی یا تنقیدی ہوتے ہیں اور جن میں اس نوع کے موضوعات پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ ان میں خصوصاً اس خصوصیت کی تب و تاب پر پہلی نگاہ جاتی ہے۔ تحقیقی و تنقیدی مقالوں میں قلم کار کے اخلاص و دیانت کی وہی حیثیت ہے جو نمازی کے لئے تازہ وضو کی یا زنِ پاکدامن کے لئے حیا و حجاب! ان مقالوں میں عدم اخلاص و دیانت سے مقالہ نگار سطحی جذبات کا اسیر ہو جاتا ہے۔ وہ عصبیت، ریا، پاسداری اور تنگ نظری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس میں سہل انگاری، عجلت روی، اور کج بینی آجاتی ہے وہ محنت و مشقت اور عدل و انصاف کی راہ سے دُور اور رعایت و مروّت کا بندہ ہو جاتا ہے — ادبی تنقید میں مقالہ نگار عادل و منصف کی طرح قلم اٹھاتا ہے وہ دو ٹوک اور بے لاگ باتیں کہتا ہے اور نہایت تیقن کے ساتھ کہتا ہے۔

مقالہ کسی سنجیدہ موضوع پر سنجیدہ تحریر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تحریر دیگر اصناف سے صورتاً و مزاجاً مختلف نظر آتی ہے کہ ان جیسی دل کشی یا جذب و جمال اس میں نہیں ہوتا، لیکن اس غیر شاعرانہ یا غیر فسوں کارانہ سرشت کے باوجود یہ تحریر ادبی رنگ و آہنگ سے معرّا نہیں ہوتی۔ تعمیم علم اس کا فریضہ ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونا واقعی آسان نہیں — اس کا کام محض بلند و بالا اور انجانی و غیر معمولی باتوں کی تفہیم و تشریح نہیں بلکہ ان باکار و سودمند باتوں کو قاری تک حسن و خوبی پہنچانا ہے یعنی ایسی ترسیل کہ یہ باتیں قابل قبول ہو جائیں، یہی مقالہ نگار کی کامرانی اور سلیقۂ قلم کاری ہے — یہ دشوار کام مقالہ نگار انشا کے ذریعہ انجام دیتا ہے۔ انشا کے چٹخاروں سے وہ سوکھی اور بے سواد باتوں کو رس دار بنا دیتا ہے۔ ان کی خشکی اور بے رونقی کو زائل کرتا ہے۔ انہیں عسیر الفہم ہونے سے بچاتا اور اُن کی پذیرائی کو بڑھاتا ہے۔

صنفِ مقالہ میں اس طرح قلم کار کی دُہری شخصیت ہوتی ہے اور عموماً یہ ہم کار نظر آتی ہے اولاً وہ ایک عالم و دانش ور ہوتا ہے۔ دوئم ایک ہوش مند انشا پرداز۔ اس کی ناموری اور برآری کے دو اسباب ہیں، دولتِ علم اور قوتِ قلم ۔ انشا پردازی ہر مقالہ نگار کے لئے عمل ناگزیر ہے۔

انشا، شاعری و نثر کی ایک اعلیٰ لیاقت ہے۔ یہ قدرتی مُنہ ہے اور قابلِ قدر سلیقہ بھی جس کے عمل سے قلم کاری آرٹ کا منصب حاصل کرتی ہے مگر انشا تحریر کے لئے عیب بھی بن جاتی ہے جب یہ تحریر کے مقدور اور اس کے صنفی ضابطے کی پابند نہیں ہوتی ۔۔۔ مقالہ میں انشا کا غیر مستحسن عمل عموماً دو مواقع پر نظر آتا ہے۔ اولاً جب مقالہ نگار کا ذخیرۂ علم عامیانہ ہوتا ہے، مختصر اور اوسط۔ اُسے زبان و بیان کی قدرت تو حاصل ہوتی ہے، مگر ذہنی طور پر وہ نادار ہوتا ہے کسی سنجیدہ موضوع پر وہ سنجیدگی کے ساتھ اظہار خیال شروع کرتا ہے۔ بات سامنے آتی۔ یہ آگے نہیں بڑھتی، محض گھومتی رہتی ہے اور دُور از کار امور کے جلو میں گھومتی ہے نفسِ تحریر میں کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ عبارتیں خوش نما دل افروز عبارتیں، لکھ ہائے ابر کی طرح صفحہ قرطاس پر گرتی رہتی ہیں ۔۔۔ یہ انداز قلم کاری مقالہ نگاری نہیں، عبارت آرائی ہے۔ یہ خیالات کی تحریری زیب و زینت ہے، محض سج دھج، اور یہی انشا کا ناقص عمل ہے جو اس صنف کے لئے قطعاً مناسب نہیں۔

دوئم جب مقالہ نگار جذباتی ہو جاتا ہے اور انشا جب اس کی قلم کاری پر مسلط ہو جاتی ہے۔ مقالہ نگار کی رہبری پھر دماغ کے عوض دل کے سپرد ہو جاتی ہے۔ وہ خیالات کی بجائے جذبات کی طرف راغب اور بات سے زیادہ بیان کا بندہ ہو جاتا ہے۔ یہ صورت بھی انشا کی بے اعتدالی کا نتیجہ ہے جو اس صنف کے لئے معیب ہے تاثراتی مقالوں میں انشا کے دخیل ہونے کا بڑا خطرہ رہتا ہے۔

انشا گری مقالہ نگار کی قلم کا ایک رُخ ہے۔ یہ رُخ ہمیں نہ بھولنا چاہئے، ضمنی ہے اساسی و اصلی نہیں۔ اس صنف میں انشا کا دخل و عمل ملبوسات میں نفاست کی مثال ہے۔ انشا کے استعمال میں اگر پاسِ احتیاط نہ ہو تو پھر انشا تحریر کے لئے کاجل نہیں کالکھ بن جاتی ہے ۔۔۔!!

(۲) مقالہ سنجیدہ اور بلند و برتر خیالات و افکار کا نہایت مرتب و مستحکم تحریری اسلوب ہے اس صنف کی امتیازی خصوصیت جو اس کے اسلوب کو دوسری تمام نثری تحریروں سے منفرد کر دیتی ہے، سالمیت و جامعیت ۔۔۔ یہ خیالات کی یکجہتی ہے جو ترتیب ذہنی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مقالہ کی کامیابی کا راز باتوں کی تنظیمی خوش سلیقگی اور تحریری بُستگی ہے۔ ہر اچھا مقالہ، خصوصاً فکری مقالہ، ایک پختہ کار اور تربیت یافتہ دماغ کا عمل ہوتا ہے۔

مقالہ نگار چند مخصوص ذہنی قوتوں کا مالک ہوتا ہے۔ یہ قوتیں حافظہ، استدراک تسویہ اور ذہانت ہیں۔ اس کی قوتِ نقد درجہ اوسط سے بالا ہوتی ہے اور اس میں صبر و ضبط کا مادّہ بدرجۂ اُتم ہوتا ہے۔ دُوسرے قلم کاروں کی طرح مقالہ نگار کسی عنوان پر بے ساختہ قلم نہیں اٹھاتا۔ قلم برداشتہ اظہارِ خیال اس کا شعار نہیں۔ وہ احتیاط، اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اپنی باتیں سُپردِ قلم کرتا ہے ذاتی مطالعہ کی روشنی میں وہ اس عنوان پر اچھی طرح غور و خوض کرتا ہے۔ دماغ میں باتیں آتی ہیں۔ یہ جوش و خروش کے ساتھ نمودار ہوتی ہیں اور کبھی ہجوم و انبوہ کے ساتھ بھی آتی ہیں۔ لیکن مقالہ نگار ان کے نمود اور ورود سے غافل نہیں ہوتا۔ ان کی یورش اور شورش کو روکتا ہے۔ انہیں ربط و یالبس سے پاک کرتا ہے۔ باتوں کو قلم بند کرنے سے پہلے ان کی یکتائی و یکسانی اور پیوستگی و پذیرائی پر وہ اچھی طرح توجہ دیتا ہے ۔۔۔ حافظہ تسویہ و تمیز جیسے عوامل سے لایق و سود مند مواد کی فراہمی اور انتخاب کے کام سرانجام پاتے ہیں۔ دلائل اور باکار مثالوں کے ذریعہ باتوں کو تنومند اور قابلِ قبول بنایا جاتا ہے ۔۔۔ یوں، اس اہتمام و التزام کے ساتھ ساری مبسوط باتیں عالمِ خیال سے عالمِ وجود میں لائی جاتی ہیں۔ بالترتیب و بتدریج یہی خیالات و افکار کی وہ شیرازہ بندی اور تنظیمی خوش سلیقگی ہے جو اس صنف میں سالمیت و جامعیت پیدا کر دیتی ہے اور اس نثری تحریر کو نہایت صاف ستھرے سجل اور ہموار اسلوب کا حامل بنا دیتی ہے۔ جیسے فرش پر بچھی ہوئی نئی اور بے داغ سپید چادر!

مقالہ کے اس پختہ و مستحکم اسلوب کا اصل سبب وحدتِ خیال ہے ۔۔۔ اس صنف میں باتوں کا اتحاد ہوتا ہے۔ انتشار نہیں ہوتا۔ انشائیہ کی طرح۔ مقالہ میں باتیں وحشی و پرفشاں یا آزاد و مختار نہیں ہوتیں۔ یہ وابستہ و پیوستہ ہوتی ہیں اور پھول کی پنکھڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے الگ ہو کر بھی ایک واحد مرکز سے ملحق رہتی ہیں۔ باتیں جو بظاہر مختلف پیراگرافوں میں منقسم نظر آتی ہیں، ان میں نظام عصبی جیسا گہرا عضویاتی تعلق ہوتا ہے۔ یہ تعلق جسے مقالے کا بنیادی خیال کہئے، جوہر مقالہ ہوتا ہے اور اسی جوہر میں مقالہ نگار کا مطمحِ نظر محلول رہتا ہے۔

مرکزی خیال اس تحریر اور تحریر کے رگ و ریشے میں پیوست رہتا ہے۔ یہ باتوں کے مختلف حصوں کو قابو میں رکھتا ہے اور انہیں مطلق العنان نہیں ہونے دیتا۔ آپ غور کریں، جب ہم مقالہ شروع کرتے ہیں۔ اور ہماری نگاہیں تحریر کے مختلف پیراگراف سے گزرتی ہیں اور خیالات کے تانے بانے اُبھرنے شروع ہونے لگتے ہیں۔ باتیں کھلتی ہیں، زیادہ کھلتی ہیں اور اختتام پر نفسِ تحریر کے سارے نقوش نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہماری وہ نگاہ جو ابتدار میں محض عنوانِ مقالہ سے آشنا ہوئی تھی، بعد مطالعہ یہ اس نکتہ نہاں کو

بھی دیکھ لیتی ہے جو حاصلِ مقالہ یا جوہرِ مقالہ ہے ـــ اس لمحۂ طمانیت و آسودگی میں آپ اتفاق کریں گے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ نے کچھ پایا، نئی بات، راحت خیز اور فکر بخش زرّیں بات ـــ !!

اچھے اور کامیاب مقالوں میں خیالات کی مختلف منزلیں ہوتی ہیں۔ یہ منزلیں بالترتیب و بتدریج سامنے آتی ہیں اور قاری اُنہیں زینہ بہ زینہ طے کرتا ہے۔ مقالہ کا چھوٹے چھوٹے متعدد پیراگرافوں میں منقسم ہونا نہ صرف قلم بند خیالات کی نفیس ذہنی تنظیم کی دلیل ہے بلکہ یہ مقالے کے فورم یا اسلوب کی مضبوطی اور استحکام کی علامت بھی ہے۔ مقالے کے اس مستحکم اسلوب کی وضاحت نظم اور غزل کے اسلوب کے موازنہ سے کی جاسکتی ہے۔ غزل کے فورم میں جیسی لچک اور ملائمیت ہے وہ نظم میں نہیں ہوتی۔ اشعار غزل کی ترتیب میں تبدیلیاں اور من موجی تبدیلیاں ہمیشہ ممکن ہیں مگر نظم کے اشعار کے مصرعوں میں بھی ردّ و بدل دشوار ہے۔ خیالات کا جیسا ارتقاء اور سیلِ جذبات کی جیسی متوازن روانی صنفِ نظم میں ہوتی ہے تقریباً اسی پایہ کی ساخت مقالے کے اسلوب میں بھی شرط ہے۔

کامیاب اور معیاری مقالہ میں اچھی نثر کے تمام محاسن موجود ہوتے ہیں چھوٹے نرم رو جملے، ہلکا آہنگ، سادہ و سہل عبارت، متوازن انشاء اور تیقن پذیر انداز اس تحریر کے شمائل و خصائل ہیں۔

مقالہ میں کوئی بات مبسوط بات، قلم بند کی جاتی ہے مگر اس صنف کا اسلوب طول و طویل باتوں کا متحمل نہیں ہوتا۔ اس تحریر کا سانچہ مختصر ہوتا ہے جیسے قطعہ یا رباعی کی اراضی۔ یہاں باتوں کثرتِ صفات کی حاجت نہیں۔ طول بیانی اور تفصیلات سے مقالہ نگار کو احتراز لازمی ہے۔ طویل مقالے مقالے نہیں ہوتے یہ بذاتِ خود سالم تصنیفات کی حیثیت رکھتے ہیں جنہیں پڑھنے سمجھنے اور ذہن نشین کرنے سے زیادہ وقت اور زیادہ محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔ مقالہ اس کے برعکس، ادب کی وہ مختصر و بستہ جامع تحریر ہے جو قارئین سے کم از کم وقت کی طالب ہوتی ہے اور اس کے دماغ کو عمدہ و اعلیٰ باتوں سے روشن کر دیتی ہے۔

(۵) نثری ادب میں جو صنف آج سب سے زیادہ معروف و مقبول ہے، وہ افسانہ کے بعد مقالہ ہے۔ اس مقبولیت کا سبب اس صنف کی ذہن پذیری اور جذب و اثر ہے۔ یہ وہ خُم خانۂ ادب ہے جس کا دروازہ ہر مئے نوش کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور جہاں بادۂ قدح خوار دیکھ کر بڑھایا جاتا ہے ـــ فی زمانہ مسائلِ حیات کے ہجوم اور نت نئی باتوں کی کثرت نے مقالہ کو نہایت کشادہ اور وسیع کر دیا۔ مقالہ نگاری وقت کا ایک اہم مطالبہ ہوگئی ہے جیسے یہ ہماری خواندگی کا ایک تقاضہ ہوگئی ہو۔ وقت کی برق روی سے آج صدیاں دھائیوں میں سمٹتی جارہی ہیں۔ گوناگوں بدلتے ہوئے حالات نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم زمانہ کی روش و رفتار سے باخبر رہیں گرد و پیش کے معاملات و مرحلات کو جانیں اور سوچیں۔ ان اہم تبدیلیوں سے جو بابرکات ہیں استفادہ حاصل کریں، انہیں اپنی بقاء اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی ترقی کے لئے تجویز کریں ـــ اس عظیم مقصد کے لئے مقالے اور صرف مقالے ہی ہمارے کام آسکتے ہیں۔ کائنات کے موجود و مشہود کا نقشہ ہو یا سیرت و سرشت کی تعمیر و تشکیل کا مسئلہ ہو ہر نقشہ اور ہر مسئلہ مقالہ کے براق شیشے سے صاف صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صنف ہر ہوشمند کے معمولات کا ایک جزو لاینفک بن گئی ہے۔ ہر طبقہ اور طبیعت کا انسان مقالہ کا مطالعہ ضرور کرتا ہے، خواہ یہ مقالہ سیرِ دنیا کی دعوت دے یا سفرِ آخرت کا پیغام سنائے ـــ !

موضوع کے بموجب مقالہ نگار کے لئے کوئی پابندی نہیں۔ وہ مکمل آزاد ہوتا ہے۔ ادبی تخلیقات و تحقیقات علمی مضامین، سائنسی ضابطے و مسائل، فنون اور اُن کی صورتیں غرض ہماری متمدن زندگی کا ہر باب کبیر و صغیر مقالہ نگار کے لئے وا رہتا ہے۔ وہ اگر ان باتوں کو سمجھتا ہے۔ اپنی سمجھی بوجھی بات کو دوسرے تک پہنچاتا ہے، اُسے باتوں کی پہچان اور پرکھ کی تمیز ہے، تو وہ مقالہ نگار کے فرائض بحسن و خوبی انجام دے سکتا ہے۔

موضوعات کے اس تنوّع اور رنگا رنگی کی وجہ سے مقالے آج کئی مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے ہیں۔ صفحاتِ گزشتہ میں مقالہ کی جن قسموں (یعنی معلوماتی، تاثراتی اور فکری) کا ذکر کیا گیا تھا۔ یہ تقسیم قلم بند باتوں کی مخصوص نوعیت کے تحت کی گئی تھی۔ اس تقسیم سے دراصل علمیت کی اس خاصیت کا بیان مقصود تھا جو مزاجاً اور کچھ حد تک سیرۃً ان سنجیدہ تحریروں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیتی ہے ـــ بادی النظر میں ہر مقالہ اپنے موضوع اور عنوان کے تحت کسی ذیلی گروپ میں داخل رہتا ہے۔ مثلاً مذہبی مقالہ، سیاسی مقالہ، تاریخی مقالہ، تنقیدی مقالہ، تحقیقی مقالہ، سیرتی مقالہ، وغیرہ اور علیٰ ہذا القیاس مختلف سائنسی مضامین سے متعلق مقالے۔

مقالوں کی مقبولیت اور مقالہ نگاروں کے فروغ کے کئی اسباب ہیں۔ اولاً طباعت کی جدید سہولتیں ہیں یعنی، ہر طرح کی نئی و غیر معمولی باتیں نہ صرف واضح اور مکمل طور پر ضبط تحریر میں آجاتی ہیں۔ بلکہ مطبوعہ نقش و تصویر اور جدول و خاکہ کی مدد سے ان انجانی و ادق باتوں کو مقبولِ عام اور موثر بھی بنا دیا جاتا ہے۔ دوئم، نشر و اشاعت کی آسانیاں ہیں جن سے باتوں کو ترسیل و رسائی کی نئی قوت حاصل ہوگئی ہے۔ اب ہمیں عمدہ اور اعلیٰ مقالات نہ صرف پڑھنے کو بہ آسانی مل جاتے ہیں، بلکہ ان بلند و برتر باتوں کو باطمینان سننے کے مواقع بھی نصیب ہیں ـــ اس ضمن میں ٹیپ رکارڈ کا ذکر ضروری ہے جس سے اس صنفِ ادب کو مستقبل قریب میں خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ اس جدید ایجاد کے ذریعہ متکلم کی باتوں اور خیالات کو محفوظ کر لینا مطلق دشوار نہیں ان لفظ بہ لفظ

باتوں کو تحریر میں منتقل کرکے مقالہ کی صورت دیدینا بھی سہل ہے، اور یوں ہر تقریر یا خطبہ یا فی البدیہہ گفتگو مقالہ کا اسلوب حاصل کرسکتی ہے ــــ مگر، یہ طریقہ کار اس صنف ادب کے زوال کا سبب بن جائے گا۔ ہمیں نہ بھولنا چاہئے کہ مقالہ نگار مقرر یا خطیب یا صحافی نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ مقرر، خطیب یا صحافی کی طرح مقالہ نگار بھی کسی مخصوص موضوع پر اظہار خیال کرتا ہے اور عالمانہ انداز سے اس موضوع پر روشنی ڈالتا ہے، مگر ان دونوں کی شخصیتیں اور منصب علیحدہ ہیں اور ان کے اغراض و اسالیب بھی مختلف ہیں۔ مقالہ نگار کسی وقتی مطالبہ یا مسلک کے تحت اظہار خیال نہیں کرتا اور نہ وہ فی البدیہہ گہرافشانی کرتا ہے اس کا اسلوب تحریری ہوتا ہے تکلمی نہیں ہوتا۔

نئے علوم و معاصر کی دریافت سے بھی مقالہ کے عروج و مقبولیت میں بڑی مدد ملی ہے۔ ہماری زندگی اس قدر پھیل گئی ہے اور مادی ترقی نے زندگی کو اس قدر میکانکی بنا دیا ہے کہ انسان کا دماغ کل کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ مجبوراً اب ہم جزو کی جانب زیادہ مائل ہوگئے ہیں۔ ہماری خردمندی، یہ ایک تلخ حقیقت ہے، اب خود بین ہوگئی ہے اور لازماً ہم تخصیص کار کی طرف ضرورت سے زیادہ متوجہ ہوتے جارہے ہیں۔ ادب میں بھی یہ روش جڑ پکڑ چکی ہے۔ صنف مقالہ میں تخصیصیت عام ہوگئی ہے۔ جمنیات، معاشیات، اور سائنس جیسے مخصوص رسائل کے اجرا سے مقالہ کو زیادہ توانائی نصیب ہوسکتی ہے۔ جو اس صنف ادب کے لئے بڑی اچھی علامت ہوگی۔

ان سازگار حالات کے باوجود ایسے مقالوں کی تعداد آج بھی حوصلہ شکن ہے جو ایوان ادب میں روزن کی مثال ہوں جنہیں کلید گنجینۂ علم کہا جاسکے اور ادبی دستاویز کا مرتبہ پاسکیں۔

بات یہ ہے کہ جس طرح پچھلی تین چار دہائیوں تک ہمارے شعراء "نظم" کے صنفی اور فنی تصور سے نابلد تھے اور طبعاً و خلقاً یہ غزل نگار تھے۔ تقریباً یہی صورت ہمارے نئے اور جدید مقالہ نگاروں کی ہے۔ "مقالہ" اور "مضمون" کے امتیاز و افتخار کی بات ان کے لئے جیسے بے معنی بات ہے ــــ اگلے شعراء جس طرح بے معنی اشعار پر محض ایک سرخی دے کر اس شعری تخلیق کو نظم سمجھ لیتے ہیں۔ اسی طرح کسی سنجیدہ علمی و ادبی موضوع پر مختصر نثری قلم بندی عام طور پر "مقالہ" کے موسوم کردی جاتی ہے ــــ بدترتیبی، انتشار خیال، طوالت، رمزیت، انتشار، افراط تفریط، ارتقائے خیال کا فقدان، غیر واضح زاویہ نظر، نیم پختہ و مبہم، نارسا اور عامیانہ باتیں، لاحاصل حوالے اور مثالیں، شخصیت کی نمود و نمائش، بے جا مبالغہ آمیزیاں ــــ آج کے مقالوں کی عام روپ ریکھا ہیں۔

# پنڈت نہرو

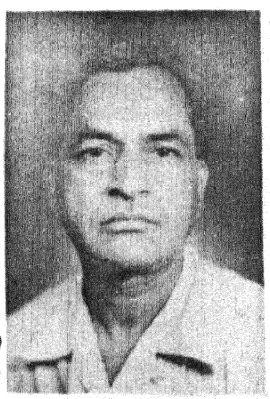

روشن پٹیالوی

امن عالم کے عقیدے سے تھا نہرو جی کو پیار
امن کی خاطر انہوں نے زندگی کر دی نثار
انکے دم سے اہل بھارت کا ہوا رتبہ بلند
ذات اُن کی تھی یقیناً باعث صد افتخار
ملک کی عزت کا رہتا تھا انہیں ہر دم خیال
وہ فدائے ملک و ملت تھے وطن کے جاں نثار
پیار کی خوشبو سے دُنیا کو معطر کر دیا
ان کی ہستی واقعی تھی اک شگفتہ لالہ زار
خوش بیاں، شیریں دہن، رنگیں نوا، جادو رقم
اُن کے اوصاف حمیدہ کا نہ تھا کوئی شمار
وہ کسی حالت میں بھی تفریق کے حامی نہ تھے
سب سے یکساں تھا سلوک اُن کا، محبت تھا شعار
رہنمائی جو خلوص دل سے دنیا کی کریں
ہستیاں ایسی نہیں آتیں جہاں میں بار بار
چپے چپے پر تھا رقصاں انکے دم سے رنگ و نور
فیض سے ان کے گلستان وطن تھا پُر بہار
ہر قدم اُن کا رہا دُنیا میں یکسر کامیاب
وہ تھے میدان سیاست کے پُرانے شہسوار
سب کے سب ملکی مسائل اُن کے تھے پیش نظر
جن کو حل کرنے کی خاطر رہتے تھے وہ بے قرار
زندگی سادہ تھی ان کی اور اونچا تھا خیال
وہ تھے ایثار مجسم اور سراپا انکسار
چالبازی اور ریاکاری سے وہ رہتے تھے دُور
انکی ہستی صدق کے انوار سے تھی جلوہ بار
پھول جو پژمردہ تھے وہ مسکرانے لگ گئے
باغ قومی پر اُنہیں کے دم سے آیا تھا نکھار
کر دیا روشن انہوں نے پھر محبت کا چراغ
نور سے جس کے ہوئی ہے بزم ہستی جلوہ زار

# دو ہاتھ پانچ کھیت

بالی چوپڑا

راجو کی ماں نے دو چار پونیاں کات لیں تو لَو سے کہنے لگی: "بیٹا اگر دال پک گئی ہو تو اپنے بھیا کے لئے تھوڑا سا آٹا گوندھ لے۔ راجو کی روٹی بہت خوش ہو کر نہیں کھاتا۔ سویرے بھی اُس نے مشکل سے آدھی روٹی کھائی تھی بھوک نہیں بھوک نہیں جب بھی پوچھو یہی بات کہتا ہے۔ بنجانے کس چیز کے سہارے جی رہا ہے یہ ــــ کو دال کو دیکھتے ہوئے کہنے لگی "ماں مجھے تو کچھ بیمار دکھائی دیتا ہے زیادہ تر چپ چاپ ہی رہتا ہے۔ پہلے تو ایک پل کے لئے بھی چین سے نہیں بیٹھتا تھا۔ پر اب تو صبح سویرے ہی کھیتوں کو نکل جاتا ہے اور شام ڈھلے گھر لوٹتا ہے۔ ماں چاہے نہ مان راجو رات کو بھی جاگتا رہتا ہے۔ نہ جانے کن خیالوں میں ڈوبا رہتا ہے اس کو کوئی نہ کوئی فکر ضرور ہے ــ"

اور یہ سچ ہے کہ راجو کو ایک نہیں کئی فکر تھے اس کی بھوک ختم ہو گئی تھی اُس کا دل بجھ چکا تھا اس کی نیند حرام ہو گئی تھی وہ زیادہ چُپ ہی رہتا تھا اس کی آنکھوں کی چمک مدھم پڑ چکی تھی اُس کے چہرے کی سُرخی پھیکی پڑ چکی تھی وہ کسی گہری سوچ میں ہمیشہ ڈوبا رہتا تھا۔ اُس کی آنکھوں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی رویا ہو

راجو کی مرجھائی صورت اور بگڑی حالت نے گاؤں والوں کو غلط فہمی میں ڈال دیا تھا کہ شاید راجو کو کسی سے پیار ہو گیا ہے۔ اُس کے دوست اس کو مذاق ہی مذاق میں مجنوں بھی کہنے لگے مگر کوئی بھی راجو کی خاموشی کے بارے میں کچھ نہ جان سکا۔

راجو کو چنتا کسی ہیرے بچھڑنے کی نہیں بلکہ اپنی ماں کی صحت کی تھی۔ اس کے دل میں جو غم تھے کسی لڑکی کے جھوٹے وعدوں کے نہیں بلکہ اپنی جوان بہن کی شادی کے تھے۔ اس کی نیند حرام تھی کسی کے آنے کے خیال سے نہیں بلکہ شاہ کے قرض کی چبھن سے، وہ قرض جو اُس کے باپو نے آج سے ۲۰ برس پہلے لیا۔ وہ قرض جس کو چکانے کے لئے راجو نے اپنی بہن کا بیاہ روک رکھا تھا۔ ماں کا علاج نہ کرا سکا تھا اور اُسی قرض نے راجو کی اُمنگوں کو جوان ہونے سے پہلے ہی مرجھا دیا تھا۔

راجو کے پانچ کھیت شاہ کے پاس گروی پڑے تھے۔ شاہ کو فکر تھی کھیت ہڑپ کرنے کی اور راجو کو چنتا تھی اپنی دھرتی کو شاہ کے کھاتے سے آزاد کرانے کی۔ دونوں ہی اپنی اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ لوگ کہا کرتے۔ یہ تو شیطان اور انسان کا مقابلہ ہے دیکھیں جیت کس کی ہوتی ہے۔ کچھ دنوں بعد راجو نجانے کیا سوچ کر شاہ کی حویلی گیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ شاہ جی میں آپ کے پاس ایک عرض لے کر آیا ہوں۔ اگر آپ مان جائیں تو میں آپ کا احسان جیون بھر نہ بھولوں گا" شاہ نے بے پروائی سے جواب دیا "بول کیا کہنا چاہتا ہے تو ــ" راجو اور بھی نرمی سے بولا ــ "شاہ جی میری بہن جوان ہے اور شادی کے لئے ایک لڑکا بھی اچھا سا مل گیا ہے مگر اس کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے میرے پاس پیسے نہیں ہیں" شاہ نے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا "تو کیا میرے پاس کوئی خزانہ رکھا ہے۔ میں تم لوگوں کی ہر روز کی ضرورت کہاں تک پورا کروں گا ــ" راجو بولا "میں آپ سے اُدھار مانگنے نہیں آیا بلکہ یہ کہنے آیا ہوں کہ اگر آپ ایک سال کے لئے مجھ سے قرض وصول نہ کریں تو میں اسی رقم سے لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دوں گا۔ بہو کی شادی ہو جائے تو پھر مجھے کوئی فکر نہیں ہم دونوں ماں بیٹے سوکھی روٹی کھا کر آپ کی رقم چکا دیں گے" شاہ نے راجو کی بات سُن کر گرگٹ کی طرح کئی رنگ بدلے اور کہنے لگا کیوں بھئی کیا ہمارا مال چوری کا ہے۔ میں تو ایک سال کیا ایک مہینے کے لئے بھی نہیں رک سکتا"

راجو کے دل پر گہری چوٹ لگی اور وہ اپنے سپنوں کی ارتھی سمیٹ کر حویلی سے باہر نکل آیا ــ اُس دن سے راجو اور بھی چُپ رہنے لگا۔ گاؤں والے اُس کے چُپ کو پیار کا نام دینے لگے۔ اور ماں اُسے بیمار سمجھتی مگر کسی کو بھی اُس کے اصلی روگ اور دل کے درد کا پتہ نہ چل سکا۔

راجو شام ڈھلے تک اپنی کھیتوں کی مینڈھ پر بیٹھا رہتا اور کیاریوں کی طرف

دیکھتا رہتا مگر اُس کے دل کو تسکین اور آنکھوں کو ٹھنڈک کبھی نصیب نہ ہوتی آخر ربیع کی فصل بونے کا وقت آگیا۔ راجو نے اپنے بیلوں کو ہاتھ کی تھاپ دے کر پچکارا۔ بھگوان کا نام لے کر ہل چلانا شروع کر دیا۔ بیلوں کے گھنگروؤں کی آواز میں راجو نے اپنے لوک گیتوں کی آواز کو شامل کر دیا۔ ہل چلتا گیا۔ پسینہ بہتا گیا اور مٹی مکھن بنتی گئی۔ اُس نے دیسی اور ولایتی کھاد ڈالا۔ بیج چھڑکا اور پلیٹا پھیر دیا۔

فصل نے جنم لیا تو راجو نے گوڑائی کر دی۔ اس کی فصل ناگ کی طرح اُٹھی اور کسی البیلی جوانی کی طرح جھومنے لگی۔ راجو نے اپنی فصل کو دیکھا تو اُسے یوں لگا جیسے اُس نے زندگی میں پہلی بار نشہ کیا ہو۔

راجو اپنی فصل کو جوں جوں پانی دیتا توں توں اُس کی فصل ہری بھری نکلتی آتی۔ اُس کی فصل نے سارے علاقے میں دھوم مچا دی۔ اب تو راجو خوش تھا۔ اُس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی رونق لوٹ آئی تھی وہ سوچنے لگا اگر بھگوان نے سب ٹھیک کر دیا تو اس دفعہ شاہ کا اُدھار ضرور چکا دوں گا۔ کمو کے ہاتھ پیلے ہو جائیں گے اور ماں کا علاج کسی امرتسری حکیم سے کراؤں گا۔ وہ مستی میں آکر گنگنانے لگا۔

جو علاقہ تھا کبھی ساگر بڑا ایک ریت کا
آج نقشہ بن گیا ہے لہلہاتے کھیت کا

راجو دیر تک مینڈھ پر بیٹھا اپنے کھیتوں کی ہریالی کو کسی مندر کے پجاری کی طرح دیکھتا رہتا۔ لمبی لمبی گیہوں کی فصل اُس کو کبھی کبھی بالکل اُس حسینہ کی طرح لگتی جو اپنے گیلے بالوں کو سکھانے کے لئے کھیتوں میں آگئی ہو۔

ایک دن راجو اپنے بیلوں کے ساتھ بیٹھا دکھ سکھ کی باتیں کر رہا تھا کہ چودھری جی زراعت آفیسر کو لے کر اُس کے کھیتوں میں آگئے۔ چودھری جی کہنے لگے "راجو تمہاری فصل کی تعریف سُن کر اپنے زراعت انسپکٹر صاحب بھی آگئے ہیں۔ راجو ہاتھ جوڑ کر بولا "چودھری جی سب بھگوان کی کرپا ہے۔ ورنہ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں"

زراعت انسپکٹر ہنسنے لگا اور راجو کی پیٹھ تھپتھپاتا ہوا بولا "راجو ہم تمہاری فصل کے ایک نئے تجربے میں سے گیہوں کی بالیاں توڑ کر لے جانا چاہتے ہیں۔ ذرا دیکھیں تو فی ایکڑ کیا پیداوار ہوتی ہے تمہاری فصل کی۔ راجو بولا "آپ مالک ہیں چاہے ساری بالیاں ہی توڑ کر لے جائیں ـــــ اور زراعت والے اپنے حساب سے بالیاں توڑ کر لے گئے۔ راجو لوک گیت گاتا اور بیلوں کو متا متا کرتا ہوا گھر لوٹ آیا ـــــ

کچھ دنوں بعد بیساکھی آئی۔ ڈھول بجا۔ کسانوں نے لوک گیت کے ساتھ بھنگڑا لیا اور فصل کی کٹائی شروع ہوئی۔ راجو نے بھی کٹائی کر کے اپنا کھلیان بنا دیا۔ گھر لوٹتے ہوئے راستہ میں اُس نے اپنے خیالوں کی دُنیا میں شاہ کا اُدھار چکا دیا۔ کمو کا بیاہ کیا اور ماں کا علاج بھی کسی اچھے حکیم سے کرا لیا۔ اُس نے خیالوں میں ہی اپنے بیلوں کے نئے گھنگھرو خریدے اپنے نئے کپڑے بنوائے اور رامو حلوائی کی دکان سے گرم گرم جلیبیاں کھائیں۔ اُس کو لگا جیسے وہ سنسار میں سب سے زیادہ سکھی ہو۔

گھر پہونچا تو ماں اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ کمو نے راجو کو خوش دیکھا تو کہنے لگی۔ بھیا فصل بیچ کر مجھے سونے کے بُندے لے کر دینا نہیں تو میں رُوٹھ جاؤں گی۔ راجو کو اپنی بہن کی باتیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ وہ کمو کی چٹیا کھینچ کر کہنے لگا۔ کمو اس بار تمہارے لئے سب کچھ آئے گا۔ کپڑے، گہنے اور ایک چھیل چھبیلا دولہا بھی۔

کمو کچھ نہ بولی اور بھیا کے لئے تھالی پروس کر لے آئی۔ راجو ہاتھ منہ دھو کر بیٹھ گیا۔ ابھی اُس نے روٹی کا نوالہ منہ میں ڈالا ہی تھا کہ کچھ کاؤں والے بھاگے بھاگے آئے اور کہنے لگے۔ راجو تمہارے کھلیان کو کسی نے آگ لگا دی ہے یہ سنتے ہی راجو کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا۔ اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ دماغ نے چکر کھایا اور وہ بیہوش ہو کر گر گیا۔ بہت دیر بعد جب اس کو ہوش آیا تو وہ بھاگا بھاگا اپنے کھیتوں کو گیا مگر وہاں راکھ کے سوا اب بچا ہی کیا تھا۔ راجو کی اُنگلیاں ایک بار پھر کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئی تھیں۔

سارا گاؤں راجو کے دُکھ میں شامل تھا اکیلا راجو نہیں رو رہا تھا۔ شیطان نے انسان کی کمر توڑ دی تھی۔ مگر بڑ کے درخت کے نیچے بیٹھا سادھو برابر یہی کہہ رہا تھا کہ جیت انسان کی ہوگی۔ کمو کا پھول جیسا چہرہ رو رو کے مرجھا گیا تھا اور ماں مر مر کے جی رہی تھی۔

راجو اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا تھا۔ کہ چودھری بھاگا بھاگا آیا اور کہنے لگا۔ راجو بدھائی ہو۔ چودھری کی بدھائی سُن کر راجو تڑپ اُٹھا اور تلملا کر کہنے لگا۔ کیوں چودھری جی کیا کچھ کسر باقی رہ گئی تھی جو جلے پر نمک چھڑکنے آئے ہو۔ چودھری ہنس پڑا اور کہنے لگا تم جو چاہو کہہ سکتے ہو کیونکہ جتنے دکھ تمہیں اُٹھانے پڑے ہیں کسی اور کو نہیں مگر اب تمہارے دُکھ ہمیشہ کے لئے کٹ جائیں گے۔ راجو تمہارے کھیتوں کی فی ایکڑ پیداوار دیش بھر میں سب سے زیادہ ہوتی ہے اس لئے سرکار نے تمہیں پانچ ہزار روپیہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جلدی کرو محکمہ زراعت والے تمہیں دہلی پہنچانا چاہتے ہیں۔

راجو کے چہرے پر کھیتوں کی ہریالی پھر چھا گئی۔ اُس کا دل بلیوں اچھلنے لگا وہ خوشی سے جھومتے ہوئے بولا ـــ چودھری جی لگتا ہے بھگوان کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں اور دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

# ایگ مارک کیوں؟

رنگ برنگے ڈبوں میں بند گھی میں ملاوٹ
ہو سکتی ہے۔

باسمتی چاولوں کی بوری میں
بہت سی مٹی اور دیگر ایسی ہی فالتو
چیزیں ہو سکتی ہیں۔

اچھے نظر آرہے انڈے اندر سے گندے
نکل سکتے ہیں۔

بہترین مال خریدنے کے لئے
**ایگ مارک کی مہر ضرور دیکھئے**

**ایگ مارک**
چیز کے بڑھیا ہونے کا
ثبوت ہے
پوری جانچ پڑتال کے بعد
یہ گارنٹی دی جاتی ہے

AGMARK

تمام ایگ مارک مصنوعات کی لیبل
پر چھپے نمبروں کے مطابق درجہ
بندی کی جاتی ہے۔
بڑھیا اور خالص اشیاء کیلئے
**ایگ مارک**
مصنوعات ہی خریدیئے۔

70/600

# چھٹی حس

سیوک شرما

**غیب** میں جھانکنے کی خواہش انسان میں ازل سے رہی ہے اور اس تمنا کی تکمیل کے لئے انسان نے کئی قسم کے پاپڑ بیلے ہیں جبکہ اس کے حصول کا بہترین ذریعہ چھٹی حس کے روپ میں خود انسان کے اندر موجود ہے۔

چھٹی حس، حواسِ خمسہ سے بالاتر، انسان کی وہ مخفی صلاحیت ہے جو غیب کے اسرار ظاہر کرتی ہے۔ کچھ ہی برس پہلے چھٹی حس کے بارے میں کچھ کہنا سُننا اپنے آپ پر حماقت اور توہم پرستی کا لیبل لگوانے کے مترادف تھا مگر اب تو سائنسی طور پر نہایت ترقی یافتہ ممالک میں سرکاری سطح پر اس سلسلے میں تحقیق اور تجربات کے پروگرام جاری ہیں۔ امریکہ میں ڈیوک یونیورسٹی کے ڈاکٹر جے۔ بی۔ رائن DR. J. B. Rhine اور دوسرے ماہرینِ نفسیات نے چھٹی حس سے متعلق ٹھوس اور گراں قدر تحقیق کی ہے اور روسی سائنس دانوں نے روزا کلیشوا نامی روسی خاتون پر، جس میں آنکھوں کے علاوہ ہاتھ کی انگلیوں سے بھی دیکھنے کی صلاحیت ہے، آزمائشی تجربات سے سائنسی تحقیق کی دنیا میں نئے باب کا آغاز کیا ہے۔

دنیا کے بارے میں ہماری واقفیت کا دارومدار ہمارے حواسِ خمسہ یعنی دیکھنے، سُننے، سونگھنے، چھونے اور چکھنے کی حسوں پر ہے۔ زمانہ حال میں ہمارے آس پاس جو کچھ موجود یا ظاہر ہے اس کا علم ہمیں حواسِ خمسہ کے ذریعہ ہوتا ہے لیکن جو ظاہر نہیں ہے یا جو ابھی مستقبل کے شکم میں ہے وہ ہمارے حواسِ خمسہ کی پہنچ سے باہر ہے۔ لہٰذا اس سے متعلق ہم بالکل بے بہرہ ہیں۔ جو کچھ ہمارے حواسِ خمسہ کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا اس کے وجود یا حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے ہم تیار نہیں ہوتے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ حقیقت ہمارے علم ہی کی حد تک محدود ہو بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جو کچھ ہمیں معلوم نہیں وہ اس کی نسبت کہیں زیادہ ہے جس کا ہمیں علم ہے۔ نیوٹن کی طرح دُنیا کے بڑے سے بڑے مفکروں سائنس دانوں کو زندگی بھر کے مطالعہ اور تحقیق کے بعد یہی کہنا پڑا کہ وہ علم کے بے پایاں سمندر کے کنارے صرف کنکر ہی چن سکے ہیں۔

جہاں پر ہماری پانچوں حسیں بے بس ہو کر رہ جاتی ہیں، وہاں سے چھٹی حس کی فرماں روائی شروع ہوتی ہے۔ یہ ہماری چھٹی حس ہے جو غیب یعنی نامعلوم دُنیا کے اسرار سے ہمارے لئے پردہ ہٹاتی ہے اور مستقبل میں پیش آنے والے واقعات سے ہمیں آگاہ کرتی ہے۔ مثال کے طور پر مشہور جرمن جرنیل رومیل کی زندگی کا یہ واقعہ ہی لیجئے۔

دوسری جنگِ عظیم میں جنرل رومیل ایک بار لیبیا کے صحرا میں اپنے ایک ماتحت افسر کے ساتھ جنگی صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے۔

کہ اچانک جنرل رومیل نے اپنے ساتھی کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ "بھاگو یہاں خطرہ ہے" تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ انہیں اپنے پیچھے ایک دھماکہ سنائی دیا۔ پیچھے مڑ کر انہوں نے دیکھا کہ ایک بم عین اس جگہ پر گرا تھا جہاں چند لمحے قبل وہ دونوں کھڑے تھے۔ اگر وہ وہاں سے نہ ہٹتے ہوتے تو دونوں کے پرخچے اڑ گئے ہوتے۔ محض اتفاق؟ ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن انگریز بریگیڈیر ڈیسمنڈ ینگ نے جنرل رومیل کی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ جنرل موصوف کی زندگی میں ایسا اتفاق بارہا ہوا کہ انہیں ناگہانی آفت کا عین وقت سے پہلے علم ہو گیا اور وہ موت کا شکار ہونے سے بال بال بچ گئے۔ اس میں ان کی عقل یا ہوشیاری کا دخل نہیں تھا بلکہ یہ کرامات جنرل رومیل کی غیر معمولی طور پر تیز چھٹی حس کی تھی۔

چھٹی حس کیا ہے اس کی صحیح تعریف یا تشریح مشکل ہے اس کا تعلق نہ تو دل سے ہے اور نہ دماغ سے۔ نہ تو اس کا دلیل یا منطق سے کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی جذبات سے کوئی سروکار۔ اس لئے اسے کوئی مخصوص تکنیکی نام دینے کی بجائے سمجھنے کی غرض سے اگر ہم اسے اندر کی آواز کہیں تو زیادہ آسان اور بہتر ہوگا۔ اور عام بول چال میں اسے دل کی آواز کے نام سے ہی پکارا جاتا ہے۔ آپ چاہے اسے تحت الشعور کے ساتھ منسلک کر دیں یا روح اور ضمیر کے ساتھ اس کا رشتہ جوڑ دیں، بہرحال یہ اپنے اندر کی آواز ہے جو بڑی غیر مبہم اور واضح ہوتی ہے۔

اس اندر کی آواز یا چھٹی حس کی بنیاد تو بہت یا اٹکل پچو قیاس آرائیوں پر نہیں بلکہ ٹھوس اور مسلمہ سائنسی حقائق پر ہے۔ سائنس یہ مانتی ہے کہ ہماری دنیا لہروں کا ایک مجموعہ ہے۔ مسلسل اور متواتر حرکت کرنے والے ذرات پر مشتمل اس دنیا کی ہر جاندار اور غیر جاندار شے سے ہر وقت لہریں یا شعاعیں ابھرتی رہتی ہیں۔ ان میں سے کچھ، بلکہ بہت سی، لہریں اس قدر لطیف ہوتی ہیں جنہیں دیکھنے، سننے یا چھو کر محسوس کرنے کی اہلیت انسانی آنکھ، کان یا کھال میں نہیں ہے۔ مثلاً مقناطیس کی جو شعاعیں لوہے کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، وہ انسانی آنکھ کو دکھائی نہیں دیتیں لیکن مقناطیسی شعاعوں کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اینسی فالوگرافک میٹر Encephalographic meter آلے کے ذریعے دماغ میں ابھرنے والی خیالات کی لہروں کو ریکارڈ کیا جا چکا ہے۔ اب تو ڈاکٹر کلنر Dr. Kilner نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جس طرح آگ سے گرمی کی شعاعیں نکلتی ہیں اسی طرح ہمارے جسم کے ہر عضو سے ہر وقت لہریں نکلتی رہتی ہیں۔

فضا میں ان گنت لطیف لہریں تیرتی رہتی ہیں۔ ان میں ہماری اپنی دنیا کی ہر شے سے ہر لمحہ نکلنے والی لہریں بھی شامل ہیں۔ گوناگوں قسم کی ان لہروں کے ملاپ یا ٹکراؤ سے فضا میں تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ ہماری دنیا میں بھی ہر لمحہ تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اگرچہ ہمارے حواس خمسہ ان لہروں کا علم حاصل کرنے سے قاصر ہیں مگر جس طرح روشنی اور آواز کی لہروں کی پہچان کے لئے ہمارے جسم میں آنکھ اور کان جیسے اعضا ہیں اسی طرح قدرت نے لطیف تر لہروں اور ان کے اثرات کو محسوس کرنے کا بندوبست بھی انسانی جسم میں کر رکھا ہے۔ یہ کام ہماری چھٹی حس انجام دیتی ہے۔

ماہرین کے خیال میں انسانی جسم میں چھٹی حس کا اہم ٹھکانہ ریڑھ کی ہڈی کے دونوں طرف بچھے ہوئے اعصابی ریشے ہیں۔ عصبی ریشوں کا یہ سلسلہ جسے Sympathetic nervous system کہتے ہیں ماحول میں منڈلاتی ہوئی مختلف قسم کی لطیف لہروں اور شعاعوں کا علم ہمارے دماغ تک پہنچاتا ہے اور ہمارا دماغ ایک ایسا ریڈیو ہے جو پیغامات نشر بھی کرتا ہے اور موصول بھی۔

چھٹی حس کا ظہور مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ مثلاً عام طور سے دکھائی نہ دینے والی اشیاء جیسے روحوں وغیرہ کا دیکھنا، غیبی آوازیں سننا، دوسروں کے خیالات جاننا اور اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانا۔ خواب کے ذریعے مستقبل اور مخفی موجودات کا علم اور اچانک احساس یا خواہ مخواہ آنے والے خیال کے ذریعے غیب کا علم ہونا۔

پہلی نظر میں شاید یہ باتیں شعبدہ بازی یا کالے علم کا تذکرہ معلوم ہوں لیکن ذرا غور کرنے پر یہ واضح ہو جائے گا کہ ہم ایک حقیقی انسانی قوت کا ذکر کر رہے ہیں جو عجیب و غریب اور ناقابل یقین اس لئے لگ رہی ہوگی کیونکہ انسان نے اپنی اس حیرت انگیز صلاحیت کی طرف بہت کم توجہ دی ہے۔

غیبی اشیا دیکھنے یا آوازیں سننے اور دوسروں کے خیالات جاننے یا اپنے خیالات دوسروں تک منتقل کرنے کی اہلیت قدرت کے خاص عطیے کے طور پر خال خال اشخاص ہی میں پائی جاتی ہے لیکن ایسے اشخاص کی تعداد خاصی ہے جنہیں ان کے ساتھ پیش آنے والے اہم واقعات کی پیش آگاہی خواب میں ہو جاتی ہے اور خواہ مخواہ کے خیال یا اچانک احساس کے ذریعے غیبی خیالات کا علم ہونے کی کم و بیش صلاحیت تو قدرت نے ہر انسان کو دے رکھی ہے۔ زیر نظر مضمون کا تعلق خاص طور پر موخر الذکر حالتوں سے ہے۔

لارڈ ڈفرن کا وہ خواب کافی مشہور ہو چکا ہے جس کی وجہ سے وہ موت کے منہ میں جانے سے بچ گئے تھے۔ ہندوستان کا وائسرائے بننے سے پہلے لارڈ ڈفرن فرانس میں انگلستان کے سفیر تھے۔ فرانس میں سفیر کا عہدہ سنبھالنے سے پیشتر وہ آئرلینڈ میں اپنے ایک دوست کے پاس چند روز قیام کرنے کے لئے گئے۔ دوست

ہاں پہلی ہی رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص لڑکھڑاتا ہوا اُن کے کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ اس نے اپنی پیٹھ پر ایک بکس اٹھا رکھا تھا جس میں ایک لاش تھی۔ بوجھ کی وجہ سے وہ شخص دوہرا ہو کر چل رہا تھا۔ جب وہ کمرہ پار کر کے باہر نکلنے لگا تو لارڈ ڈفرن نے ہمت کر کے اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلا کر پوچھا "تم کون ہو اور یہ کیا لے جا رہے ہو؟" اس پر اس شخص نے مڑ کر دیکھا تو لارڈ ڈفرن خوف کے مارے دم بخود ہو کر رہ گئے کیونکہ انہوں نے ایسا بھیانک چہرہ اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

کئی برس بعد ایک دن لارڈ ڈفرن پیرس کے گرانڈ ہوٹل میں ایک تقریب میں شرکت کے لئے گئے۔ گیٹ پر خیر مقدم کرنے کے بعد ان کا میزبان انہیں لفٹ کی طرف لے کر چلا۔ لارڈ ڈفرن لفٹ کے اندر داخل ہونے ہی کو تھے کہ ان کی نظر لفٹ چلانے والے ملازم کے چہرے پر پڑی۔ ایک لمحے کے لئے وہ کھڑے کے کھڑے ہی رہ گئے۔ یہ اسی کفن بردار کا خوفناک چہرہ تھا جسے انہوں نے خواب میں دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنے سیکریٹری کو، جو لفٹ میں قدم رکھنے والا تھا، ایک طرف کھینچ لیا۔ لفٹ سواریوں سے بھر گئی اور بالائی منزلوں کے لئے روانہ ہو گئی۔ لارڈ ڈفرن تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے منیجر کے کمرے کی طرف چل دیئے۔ حیرانی کے عالم میں ان کا میزبان بھی ان کے پیچھے ہو لیا۔ لارڈ ڈفرن نے منیجر سے پوچھا کہ اُس لفٹ کو چلانے والا شخص کون تھا۔ اس سے پیشتر کہ منیجر کوئی جواب دیتا ہوٹل کی عمارت ایک خوفناک دھماکے سے لرز اٹھی۔ لفٹ کا رسّہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے لفٹ کا خول دھڑام سے نیچے فرش پر گر گیا تھا۔ لفٹ میں سوار مسافروں میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔

دوسری صبح اس سانحہ کی خبر فرانس اور انگلستان کے اخباروں کی نمایاں سرخی تھی۔ کچھ اخباروں نے اس حادثے کو ایک سیاسی سازش قرار دیا جس کا مقصد لارڈ ڈفرن کو قتل کرنا تھا لیکن کسی کو بھی یہ پتہ نہیں چل سکا کہ لفٹ چلانے والا شخص کون تھا۔؟

بعض اوقات چھٹی حس مہلک حادثوں سے خبردار کرنے کی بجائے ایسے واقعات کی محض اطلاع ہی دیتی ہے۔ امریکہ کے صدر ابراہیم لنکن کا خواب اسی نوعیت کا تھا۔ صدر لنکن کو قتل ہونے سے کچھ دن پہلے اپنی آخری گھڑی کی خبر مل گئی تھی۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ وائٹ ہاؤس کے کمروں میں گھوم رہے ہیں۔ تمام عمارت خالی پڑی ہے لیکن ہر ایک کمرے سے سسکیوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ایک کمرے میں انہیں کفن میں لپٹی ہوئی ایک لاش دکھائی دی جس کے گرد فوجی پہرے دار چپ چاپ کھڑے تھے لیکن پہرہ داروں کے قریب کھڑے دوسرے کچھ لوگ رو رہے تھے۔ صدر لنکن نے پوچھا "وائٹ ہاؤس میں کس کا انتقال ہو گیا ہے؟" جواب ملا صاحب صدر کا۔ انہیں قتل کر دیا گیا تھا۔

صبح ہونے پر ابراہیم لنکن نے اپنی اہلیہ اور اپنے قریبی دوست وارڈ ہیمن کو یہ خواب سنایا اور کہا کہ اگرچہ یہ محض ایک خواب ہی تھا لیکن اس وقت سے یہ دہشت آمیز خیال ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا کہ ان کا وقت اب آ گیا ہے۔

نہ صرف اپنے آپ کے بارے میں بلکہ اپنے عزیزوں، دوستوں یا محض واقف کاروں اور پڑوسیوں تک کے بارے میں اس قسم کے الہامی خواب لوگوں کو اکثر آتے رہتے ہیں۔ کچھ کو تو ان کی روزمرّہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات خواب میں پہلے سے ہی دکھائی دے جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو معمولی واقعات بھی جوں کے توں نظر آ جاتے ہیں۔

چھٹی حس کا کام موت اور مہلک حادثوں جیسے ہولناک واقعات کی اطلاع دینا ہی نہیں ہے بلکہ یہ تو روزمرّہ کی زندگی میں ہماری پاسبانی کے فرائض انجام دیتی ہے اور اپنی خاموش لیکن صاف طور پر سمجھ آنے والی آواز میں قدم قدم پر ہماری رہنمائی کے لئے ہمیں قیمتی مشورے دیتی ہے۔ ان مشوروں کو نظر انداز کر کے اگر کوئی کف افسوس ملنا چاہتا ہو تو یہ اور بات ہے۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اپنی چھٹی حس کے اشاروں پر عمل کر کے ہم بہت سی پریشانیوں سے بچ سکتے ہیں۔ ایک عام فہم مثال کے مطابق اگر ہم پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیرتے ہیں تو تھوڑی محنت سے ہم کافی فاصلہ تیر کر طے کر سکتے ہیں۔ جبکہ پانی کے بہاؤ کے خلاف تیرنے سے کافی محنت کرنے پر بھی ہم ایک تو مقابلتاً کم فاصلہ طے کر پائیں گے اور دوسرے تھک بھی جائیں گے۔ عین اسی طرح چھٹی حس کے اشاروں کے مطابق چلنے سے راحت اور کامیابی اور خلاف چلنے سے تکلیف اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

روزانہ زندگی سے متعلق نیچے دی گئی مثال پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ کس طرح اچانک خیال یا خواہ مخواہ کا احساس ہماری رہنمائی کے لئے مستقبل کی پیش آگاہی کرتا ہے۔

آپ ایک کمرے میں داخل ہوتے ہیں جہاں پر موجود کچھ اشخاص کے ساتھ آپ کا تعارف پہلی بار کرایا جاتا ہے۔ ان میں دو ایک افراد آپ کو کچھ اچھے لگتے ہیں اگرچہ ظاہر اشکل و صورت اور اداو اطوار کے لحاظ سے ان میں دلآویزی یا دلکشی کا کوئی پہلو دکھائی نہیں دیتا پھر بھی وہ آپ کو اچھے لگ رہے ہیں۔ ان میں آپ کو کچھ اپنا پن سا محسوس ہوتا ہے۔ اور آپ ان سے مل کر واقعی خوش ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس وہاں پر موجود ایک دو اشخاص آپ کو پسند نہیں آتے کیوں؟ یہ آپ نہیں جانتے۔ لیکن یہ لوگ آپ کو اچھے نہیں لگے۔ ان سے ملتے وقت "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی"

کا رسمی فقرہ آپ نے عادتاً اُگل دیا تھا۔ ورنہ خوشی کی بجائے ان اشخاص کی موجودگی سے آپ کچھ بیزاری سی محسوس کرتے ہیں۔

پہلی ملاقات پر مختلف اشخاص کی طرف متضاد ردِّ عمل کی وجہ شعوری طور پر آپ نہیں جان سکتے۔ (تجربے اور مشاہدے کی بنا پر شعوری فیصلہ تو بعد کی بات ہے) لیکن آپ کی چھٹی حس کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ آئندہ زندگی میں اول الذکر افراد آپ کے دوست یا معاون ثابت ہوں گے۔ اور موخر الذکر مخالف یا دشمن۔ لہٰذا آپ کی چھٹی حس نے مختلف نوعیت کے احساسات کے ذریعے آپ کو یہ جتانے کی کوشش کی کہ مستقبل میں آپ کو ان اشخاص سے کس کس قسم کے رد عمل کی توقع رکھنی چاہیئے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ احساسات بالکل صحیح ثابت ہوتے ہیں۔

روزانہ زندگی میں چھٹی حس کی کارفرمائی کی ایسی بیسیوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ آپ یقین جانئے کہ آپ کی چھٹی حس کو اتنا کچھ معلوم ہے کہ آپ گمان بھی نہیں کر سکتے۔

چھٹی حس کی تھوڑی بہت صلاحیت تو تقریباً ہر شخص کو میسر ہے لیکن کبھی کبھی قدرت ایسے نادر شاہکار پیدا کرتی ہے کہ عقل دنگ رہ جائے۔ مثال کے طور پر امریکہ کے ایڈگر کیس EDGAR CAYCE ہی کو لیجئے۔ کیس ایک نیم خواندہ شخص تھا جسے علم طب سے کسی طرح کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا لیکن قدرت نے اسے ایسی خوبی عطا کر رکھی تھی کہ کسی بھی قسم کے مرض میں مبتلا کسی شخص کا نام اور پتہ سن کر وہ اس کی بیماری کی صحیح تشخیص کرنے کے علاوہ اس مرض کو دور کرنے کی بے خطا دوا بھی بتا دیتا۔ ناک کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک کے امراض کے ماہرین کے اس دور میں لاعلاج قرار دیئے گئے دنیا بھر سے ہزاروں مایوس مریض ایڈگر کیس کی اس خداداد نعمت سے فیضیاب ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں ایڈگر کیس کی وفات سے گویا دنیا سے لاعلاج اور مایوس مریضوں کا ایک مسیحا اٹھ گیا۔

روسی خاتون روزا کلیشوا Roza Kuleshova بھی اپنی مثال آپ ہی ہے۔ روزا روس میں کوہسار یورال کے علاقے میں نیز ہنی کے مشہور صنعتی شہر کی باشندہ ہے۔ وہ اس وقت تیس برس کی ہے۔ انسان کیا ہر جاندار میں دیکھنے کا کام آنکھ ہی کرتی ہے۔ لیکن روزا کلیشوا کے ہاتھوں کی انگلیوں میں بھی قوت بینائی موجود ہے۔ اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے وہ اسی طرح دیکھ سکتی ہے جس طرح عام انسان اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ یہ بچوں کا دل بہلانے والی پریوں کی کسی کہانی کا قصہ نہیں بلکہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جسے روس کے ڈی۔ ڈی۔ فیڈوٹو D.D.FODOTOV اور پی۔ کے۔ انوخن P.K.ANOKHIN اور امریکہ کے ڈاکٹر گریگوری رازران Gregory Razran جیسے ممتاز ترین سائنس دانوں نے ۱۹۶۳-۶۴ء کے دوران روزا پر سینکڑوں آزمائشی تجربات کے بعد تسلیم کیا ہے۔

۱۹۶۴ء میں امریکہ کے مشہور رسالے لائف انٹرنیشنل کے نامہ نگار باب برگھم Bob Brigham نے روزا سے انٹرویو کیا۔ باب برگھم کی موجودگی میں روزا نے نہ صرف ہاتھ کی انگلیوں بلکہ اپنی کہنی سے اخبار پڑھ کر سنایا۔

ہالینڈ کے پیٹر ہرکوس Peter Iurkos کا ذکر کئے بغیر عجائب روزگار کا تذکرہ ادھورا رہ جائے گا۔ ایک حادثے میں دماغی چوٹ کے باعث ان حضرت کی کوئی ایسی رگ بیدار ہو گئی کہ یہ ولی بن گئے۔ کسی شخص کو دیکھ کر اس کا ماضی اور مستقبل انہیں نظر آنے لگا۔ اس وقت کئی ممالک کی پولیس قاتلوں کا سراغ لگانے کے لئے ہرکوس کی امداد طلب کرتی ہے۔ مقتول کی فوٹو دیکھ کر یہ قاتل کا پورا حلیہ بتا دیتے ہیں اور بعض اوقات نام بھی۔ اور تو اور پیٹر ہرکوس کی آنکھ زمین کی تہ کے نیچے بھی دیکھ سکتی ہے۔ شاید یہ الف لیلیٰ کی کہانی معلوم ہو لیکن یہ بالکل سچ ہے کہ ان دنوں پیٹر ہرکوس صاحب سونے کی ایک بہت بڑی کان سے ملنے والی رائلٹی پر شان سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہرکوس نے سونا تلاش کرنے والی ایک کمپنی کو اس کان کا پتہ بتایا تھا۔

قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ سب کچھ چھٹی حس ہی کی بدولت ہے تو پھر ایسے کرشمے ہم سب میں کیوں رونما نہیں ہوتے۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ جیسے مختلف انسانوں کی جسمانی اور دماغی صلاحیتوں میں فرق ہے اسی طرح چھٹی حس بھی ہر شخص میں یکساں نہیں پائی جاتی۔ بعض اشخاص میں چھٹی حس غیر معمولی طور پر تیز اور بعض میں نسبتاً کم ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر آپ اپنے ایک بازو کو ایک برس کے لئے پلاسٹر آف پیرس میں باندھ دیں اور ہلانا جلانا بالکل بند کر دیں تو ایک برس کے بعد آپ کے چاہنے کے باوجود آپ کا یہ بازو حرکت نہیں کر سکے گا۔ بے کار رہنے سے یہ بازو سوکھ کر مفلوج ہو چکا ہوگا۔ یہی حال چھٹی حس کا ہے جسے پیدائش سے ہم نے استعمال کرنے کے بارے میں سوچا ہی نہیں بلکہ اس کے اشاروں کو محض اتفاق یا وہم سمجھ کر ٹالتے رہے ہیں۔

مشاہدے سے ثابت ہوا ہے کہ کسی بھی برس میں اٹھارہ فروری سے لے کر پچیس مارچ، بائیس اکتوبر سے اٹھائیس نومبر، اور بائیس جون سے پچیس جولائی کے درمیان پیدا ہونے والے افراد میں چھٹی حس مقابلتاً تیز ہوتی ہے۔

اسی طرح سات کے ہندسے کو بھی چھٹی حس سے خاص تعلق دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً کسی بھی سال کے کسی بھی مہینے میں سات، سولہ اور پچیس (سولہ اور پچیس کے ہندسے جمع کرنے سے سات کا ہندسہ بنتا ہے) تاریخ کو پیدا ہونے والے اشخاص کی چھٹی حس نمایاں طور پر تیز ہوتی



شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۸ مارچ کو وزیراعظم ہند کے عہدے کا حلف لیا۔ صدر جمہوریہ آپ کو حلف دلا رہے ہیں۔

صدر جمہوریۂ ہند شری وی وی گری پارلیامنٹ کے مشترکہ اجلاس (منعقدہ ۲۳ مارچ) سے خطاب کرنے کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں۔ آپ کے آگے (بائیں طرف) نائب صدر ہند شری گوپال سروپ پاٹھک اور (دائیں طرف) لوک سبھا کے سپیکر سردار گوردیال سنگھ ڈھلوں ہیں۔

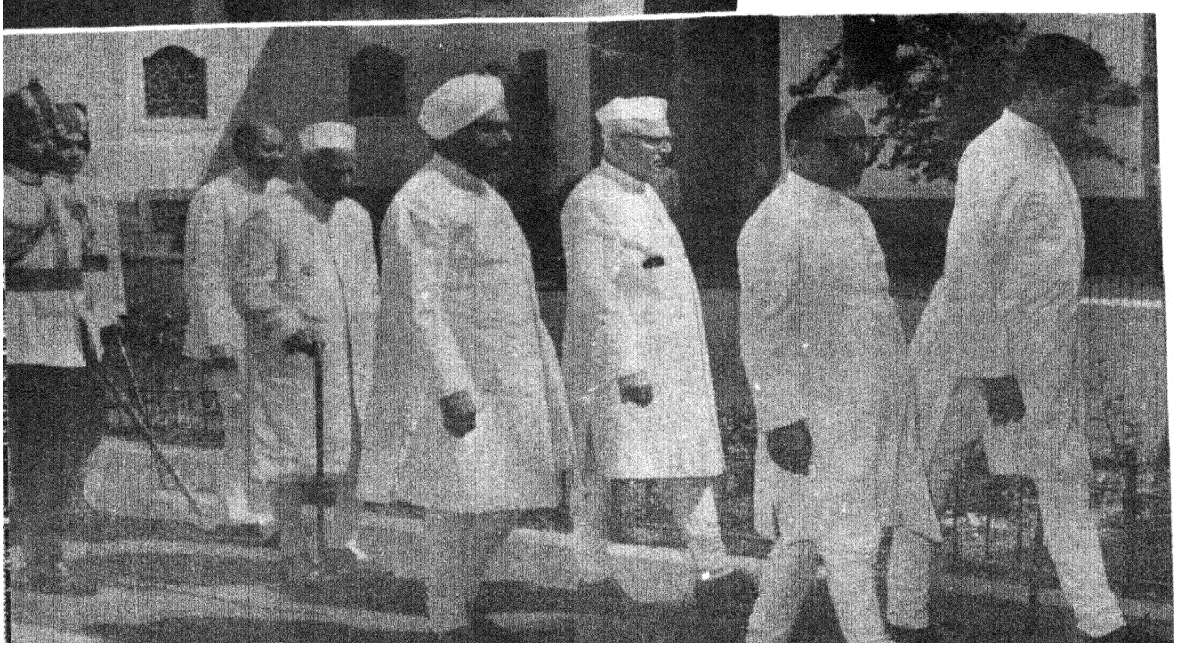

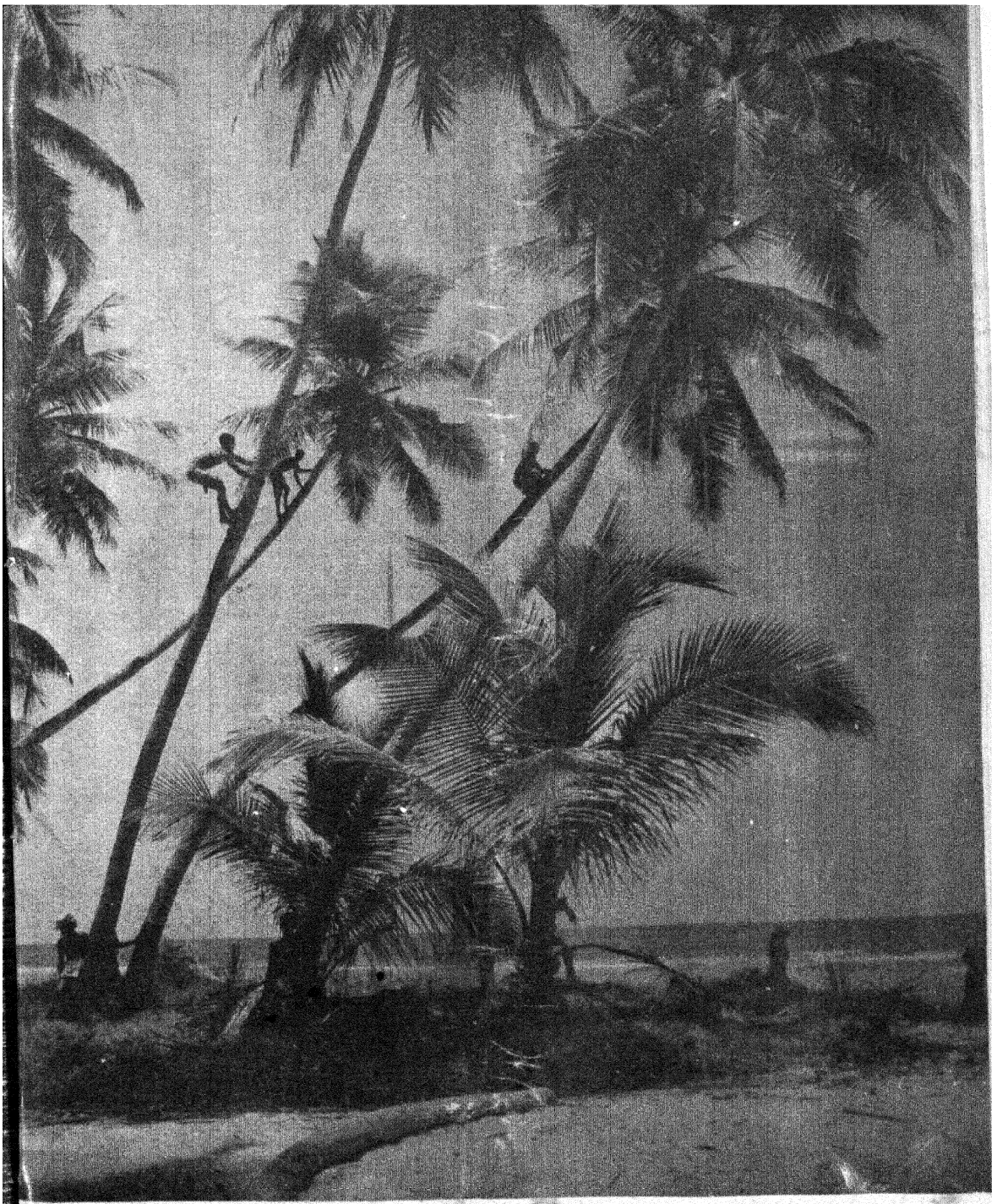

Vol. 29 No. 10 AJKAL (Monthly) May 1971

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55.

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

# آج کل

نئی دہلی

شہباز حسین

ایڈیٹر

نند کشور وکرم

جلد ۲۵ شمارہ ۱۱
جون ۱۹۶۵ء
جیشٹھ شک ۱۸۹۳
مودرف عمل: قیصر سرمست

## ترتیب


| | | | |
|---|---|---|---|
| ملاحظات | | | ۲ |
| غزل | | سردار جعفری | ۳ |
| فیار کارواں | (۱۶) | حمیدہ سلطان | ۴ |
| غزل | | عزیز قیسی | ۶ |
| میر انیس کی غزل گوئی | | مسعود حسن رضوی | ۷ |
| بنگلہ دیش کا مسئلہ اور دانشور | | خواجہ غلام السیدین | ۱۲ |
| غزل | | سلام مچھلی شہری | ۱۴ |
| پرستان | (کہانی) | صالحہ عابد حسین | ۱۵ |
| کچھ اسد اور غالب تخلص کے بارے میں | | عابد پشاوری | ۲۱ |
| غزل | | حیات لکھنوی | ۲۶ |
| شیخ یعقوب صرفی کشمیری | | غلام نبی خیال | ۲۷ |
| کیا ہوا اے صبا | (نظم) | تو بان فاروقی | ۳۱ |
| ٹیکسی ڈرائیور | (کہانی) | گوز بخش سنگھ | ۳۲ |
| مانگے کا اجالا | (نظم) | مہیش پٹیالوی | ۳۴ |
| کنک | | حفیظ اللہ نیولپوری | ۳۴ |
| غزل | | سجاد بخاری | ۴۰ |
| دمدار ستارے اور شہابیے | | قیصر سرمست | ۴۱ |
| غزلیں | — کریم اسعدی، میکش بدایونی، مانی ناگپوری تاباں واسطی | | ۴۵ |
| نئی کتابیں | | | ۴۶ |


مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آج کل (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

# ملاحظات

مشرقی بنگال میں "سالمیت" اور قومی اتحاد کے نام پر جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ دنیا میں اتنے بڑے پیمانے پر بہتے اور بے گناہ لوگوں پر ظلم و ستم ڈھانے کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ یہ سب کچھ جس انداز سے ہوا اور جس شدت سے ہوا اس سے یہ بات بخوبی سامنے آجاتی ہے کہ پاکستان کی فوجی آمریت نے مجبوری میں نہیں بلکہ ارادی طور پر یہ قدم اُٹھایا جس کا مقصد فوجی اقتدار کو برقرار رکھنا تھا۔

ہندوستان کی یہ روایت رہی ہے کہ اس نے ہمیشہ ہی مظلوموں کا ساتھ دیا ہے۔ خلافت کا مسئلہ رہا ہو یا تبت میں چینی جارحیت کا یا مغربی ایشیا میں اسرائیل کی توسیع پسندی کا، ہر موقع ہندوستانی عوام نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی ہے لہٰذا اس دردناک انسانی المیئے سے متاثر ہونا جو بالکل ہمارے پڑوس میں ہے ایک قدرتی امر تھا لہٰذا کروڑوں عوام کی ترجمانی کرتے ہوئے لوک سبھا نے ۳۰ مارچ کو ایک قرارداد منظور کی جس میں مشرقی بنگال کے حالیہ واقعات "پر گہری تشویش اور رنج و غم" کا اور مشرقی بنگال کے عوام سے "دلی ہمدردی" کا اظہار کیا گیا۔ قرارداد میں کہا گیا "حکومتِ پاکستان نے نہ صرف قانونی طور پر منتخب شدہ نمائندوں کو اختیارات منتقل کرنے سے انکار کیا ہے بلکہ من مانے طور پر قومی اسمبلی کو اپنے جائز اور مقتدر حیثیت کو اختیار کرنے سے بھی باز رکھا ہے۔ مشرقی بنگال کے لوگوں کو سنگینوں، مشین گنوں، مینکوں، توپوں، اور ہوائی جہازوں کے ذریعے دبایا اور کچلا جا رہا ہے"

"حکومتِ ہند اور ہندوستانی عوام ہمیشہ اس بات کے خواہش مند اور کوشاں رہے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ پُرامن اور برادرانہ تعلقات قائم ہوں تاہم ہندوستان اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے اور اس پورے برصغیر کے لوگوں کے درمیان صدیوں پرانے تاریخی اور ثقافتی بندھن اور روایات کی بنیاد پر اس دردناک المیئے کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہے جو اس کی سرحدوں کے اتنے قریب ہو رہا ہے۔ ملک کے طول و عرض میں ہمارے عوام نے ان مظالم کی سخت مذمت کی ہے جو بہتے اور معصوم لوگوں پر اتنے وسیع پیمانے پر کئے جا رہے ہیں جس کی مثال نہیں ملتی۔

"ہندوستان کو ہمیشہ امن و امان سے دلچسپی رہی ہے اور ہم انسانی حقوق کو باقی رکھنے اور اس کے تحفظ کرنے کا وعدہ کئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ ایوان مطالبہ کرتا ہے کہ طاقت کا استعمال اور بہتے اور بے یار و مددگار لوگوں کا قتل عام فوراً بند کیا جائے یہ ایوان دنیا کے تمام لوگوں اور تمام حکومتوں کو متوجہ کرتا ہے کہ وہ فوری اور تعمیری قدم اٹھائیں اور حکومتِ پاکستان پر زور ڈالیں کہ وہ بے گناہ عوام کی باقاعدہ قتل غارت گری سے، جو نسل کشی کی مترادف ہے، باز آئے"

مشرقی بنگال کے عوام کو اس قرارداد میں یقین دلایا ہے کہ اُن کی اس جدوجہد میں انھیں ہندوستانی عوام کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ دنیا کے متعدد ملکوں اور دانشوروں کے ردِ عمل سے ہندوستانی موقف کی پوری پوری تائید ہوتی ہے۔

---

اقلیتوں کے مسائل شروع سے ہی حکومت ہند کی توجہ کا مرکز رہے ہیں اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً مناسب کارروائیاں ہوتی رہی ہیں جس سے ان مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے میں مدد ملتی ہے

اپریل کے آخری ہفتے میں نئی دہلی میں انڈین لا انسٹی ٹیوٹ (ادارۂ قانون) نے "قانون اور اقلیتیں" کے عنوان سے ایک سے می نار منعقد کیا تھا جس میں ملک کے ممتاز ماہرین قانون، حکومت کے نمائندے اور دانشور شریک ہوئے متعدد مقالے پڑھے گئے۔ اور اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔ اس سے می نار کا افتتاح کرتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ ہند شری گوپال سروپ پاٹھک نے فرمایا کہ اقلیتوں کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ عوام کو تعلیم دی جائے، رائے عامہ ہموار کی جائے اور لوگوں کے اندازِ فکر میں تبدیلی لائی جائے۔ آپ نے مزید کہا "دستور میں اقلیتوں کے تحفظ کے لئے کافی دفعات موجود ہیں لیکن اقلیتوں سے متعلق مختلف رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان قوانین سے خصوصی واقفیت نہ ان لوگوں کو ہے جو متاثر ہوتے ہیں اور نہ ہی اُن لوگوں کو جن میں قانون کے نفاذ کی ذمہ داری ہے۔

آپ نے فرمایا کہ سماج کی اخلاقی اور سیاسی کارگزاری کی کسوٹی یہ ہے کہ آپس کے بھید بھاؤ ختم ہوں اور اقلیتوں کے مسائل کا حل کچھ تو خود اقلیتوں پر ہے مگر بڑی حد تک غالب گروہوں پر ہے۔ نائب صدر جمہوریہ نے کہا کہ فرقہ واریت اور چھوت چھات کو ختم کرنے کے لئے قانونی پہلو کے ماسوا ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف فرقوں اور غالب گروہوں میں آپسی تعاون اور میل جول ہو۔

سیمی نار میں بہت سی مفید باتیں زیرِ بحث آئی ہیں۔ مرکز اور ریاستی سرکاروں کے نمائندوں نے ان اقدامات کا بیورا دیا جو اس سلسلے میں اٹھائے جا رہے ہیں اس طرح توقع کی جاتی ہے کہ مناسب رائے عامہ اور چوکس انتظامیہ کے تال میل سے ملک میں انتشار پسند طاقتوں کی بیخ کنی کی جا سکے گی۔

••

# سردار جعفری



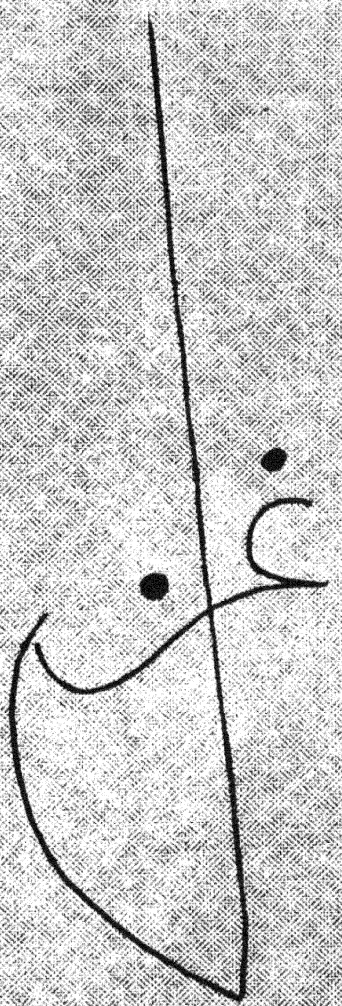

شاخِ گل ہے کہ تلوار کھنچی ہے یارو
باغ میں کیسی ہوا آج چلی ہے یارو

کون ہے خوف زدہ جشنِ سحر سے پوچھو
رات کی نبض تو اب چھوٹ چلی ہے یارو

تاک کے دل سے، دلِ شیشے و پیمانے تک
ایک اک بوند میں سو شمع جلی ہے یارو

چوم لینا لبِ لعلیں کا رندوں کو روا
رسم یہ بادۂ گلگوں سے چلی ہے یارو

صرف اک غنچے سے شرمندہ ہے عالم کی بہار
دلِ خوں گشتہ کے ہونٹوں پہ ہنسی ہے یارو

وہ جو انگور کے خوشوں میں تھی مانندِ نجوم
ڈھل کے اب جام میں خورشید بنی ہے یارو

یہ زمیں جس سے ہے ہم خاک نشینوں کا عروج
یہ زمیں چاند ستاروں میں گھری ہے یارو

جرعۂ تلخ بھی ہے جامِ گوارا بھی ہے
زندگی جشنِ گہہ بادہ کشی ہے یارو

# غبارِ کارواں



(۱۶)

## حمیدہ سلطان

سالہا سال کی گرد جھاڑ کر جب میں نے اپنے لڑکپن پر بھرپور نظر ڈالی تو احساس ہوا کہ میری شخصیت بنانا جس عظیم ہستی کا کارنامہ ہے وہ میری نانی اماں کی ذاتِ گرامی ہے،

رات کو کھانے کے بعد ان کے پاس لیٹ کر کبھی میں ۱۸۵۷ء کی شہر آشوب کی کہانی سنتی جس کو وہ یوں شروع کرتیں۔

"اماں، شہر آبادی کے زمانے میں جب جہاں پناہ تھے لال قلعہ آباد تھا، دلی کا راج سہاگ قائم تھا اور اس کی گود ہری بھری تھی۔"

یا پھر حضرت غالب کے لطیفے مزے لے لے کر بیان کرتیں۔ نانی اماں بیاہ کر غالب کے گھر گئیں۔ مرزا صاحب نے نئی نویلی دلہن کے وہ تمام چاؤ چونچلے کئے جو بڑے خاندان کا طرۂ امتیاز ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو اپنی آن برقرار رکھنے اور ایک اللہ تلّو میں پرورش پاتی ہوئی نواب زادی بہو کے لئے کتنا کچھ کرنا پڑا ہوگا۔

---

لہ نواب معظم زمانی بیگم بنت نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں بیگم باقر علی خاں کامل

مجھے مرزا سے لگاؤ اور اُن پر کام کرنے کی دھن محترمہ موصوفہ کی بدولت ہوئی۔ دوسری بزرگ ہستی جس نے مجھ پر اثر ڈالا وہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ مولانا بہت کم آمیز تھے لیکن والدہ صاحبہ اور مولانا آزاد کی دونوں بہنیں فاطمہ بیگم، آبرو بیگم سے بہت دوستی تھی۔ آپس میں ربط اتنا گہرا تھا کہ بیگم آزاد بالکل سگی نندوں کی طرح والدہ صاحبہ سے برتاؤ کرتیں اور یہ بھی سگی بھاوج ہی کی طرح ان سے چہل اور مذاق کرتی رہتیں۔

مجھے پڑھنے کی لت اوائل عمری سے ہے ۱۹۳۴-۳۵ء میں جب ہم لوگ کلکتہ میں تھے برابر مولانا آزاد کے ہاں آنا جانا تھا۔ مولانا اس زمانے میں بالی گنج کی ایک وسیع دو منزلہ کوٹھی میں رہتے تھے۔ میں جب بھی جاتی۔ ان کی لائبریری میں گھس جاتی اور پڑھتی رہتی تھی۔ وہیں میں نے مولانا کو ایک دن مطالعے میں مصروف پایا۔ انہوں نے بڑی محبت سے مجھے مخاطب کیا اور میری پسند کی کتابیں مجھے نکال کر دیں۔

مرثیۂ انیس اور طلسم ہوش ربا اوائل عمری سے لے کر اب تک میرے لئے دلچسپی کا باعث ہیں۔ بچپن کی لت مجھے طلسم ہوش ربا کو پڑھنے کے بعد بارہ سال کی عمر سے لگی۔ افسانوں کی دنیا سے مجھے میرے محترم استاد ڈاکٹر وزیر حسن عابدی صاحب نے نکالا اور ادبی ذوق کو اُن کی تربیت نے صحیح راستہ پر ڈالا۔ عابدی صاحب سے تبادلہ خیال کرنے کے بعد میں نے پے در پے ادبی مضامین لکھے، نواب زین العابدین خاں عارف پر بھاری بھرکم مقالات تحریر کئے۔ یہ تعلّی نہیں حقیقت ہے کہ میری ذات کے بنانے میں اس پرفسوں ماحول کا بہت زیادہ اثر ہے جس میں میرا شعور بالغ ہوا۔ میں نے اپنے بچپن میں نواب احمد سعید خاں طالب کو بیت الضیاء میں بزمِ شعر و ادب میں سرگرم سخن دیکھا ہے، شائل صاحب سے وہ دلِ پذیر ترنم

سنا جس کو محسن داؤدی کہا جائے تو بجا ہے، سائل کی طرح کا ترنم کسی اور شاعر کو نہ مل سکا، مشاعروں میں سائل صاحب کی وجیہہ صورت، دلکش شخصیت اور دلپذیر ترنم ایسا چھا جاتے کہ مشاعرہ اکثر ان کے ہاتھ رہتا۔

ہندوستان کے اور گھرانوں سے ہمارا ماحول بالکل مختلف تھا۔ نانی اماں کی محلسرا میں بیگمات سینے پرونے، کشیدہ کاری ہی میں مصروف نہیں رہتی تھیں بلکہ ادبی لگاؤ بھی ان سب میں تھا۔ والدہ صاحبہ کی فرمائش پر سائل صاحب نے نورجہاں جہانگیر، پر مثنوی لکھی، جس میں بارہ ہزار شعر تھے۔ یہ مثنوی اکثر سائل صاحب اپنے دلکش لحن میں سناتے تھے، اُن کے بھانجے نواب[۵] لوہارو اپنی مثنوی کے بند جب بھی لوہارو سے آتے ضرور سُنا کر جاتے۔

بسنت رُت آتے ہی ڈومنیاں سرسوں کے پھول لے کر بسنت کی مبارکباد دینے آتیں، ہولی کے دنوں میں روزانہ رات کو ہولیاں گاتیں۔ اور ساون کی پھوار پڑتے ہی رات گئے تک اناثیں ملہلایاں کجری گاتیں اور لڑکیوں بالیوں کو جھولے جھلاتیں۔ محرم کے آتے ہی سوگ کی فضا محلسرا پر طاری ہوجاتی، روزانہ عصر کی نماز کے بعد مراثی انیس منجھلی خالہ صاحبہ بہت سوز و گداز سے پڑھتیں۔ دس دن تک برابر مجلس عزا ہوتی اور شربت اور کھانوں پر نیاز دے کر شہداء کی نذر دی جاتی۔

میرے لڑکپن میں اس اُجڑے دیار کی شام تھی۔ وہ لوگ ابھی باقی تھے۔ جنہوں نے لال قلعے کی بہاریں دیکھی تھیں، یہاں ہر فن کے باکمال موجود تھے۔ میں نے باقر داستان گو کی داستان بھی سنی ہے اور قلعے کی شاہی ڈومنی دلدار جان کی پوتی بسم اللہ کے گلے سے مور چہنا بھی نکلتے سنا ہے۔ بسم اللہ نے ایک ٹھمری کا نرت پورے آدھے گھنٹے کیا تھا۔ سچ پوچھئے تو وہ زمانہ بہت حسین تھا جب نہ ریڈیو تھا نہ ٹیلی ویژن۔ شریف گھروں کی خواتین سینما اور تھیٹر سے بیگانہ تھیں۔ لیکن ہر فن مولا لوگ دلی میں موجود تھے جب کسی کی یہاں ولادت ہوتی تو چالیس دن تک ناچ گانا ہوتا، باہر ہیجڑے بھانڈ گاتے اندر ڈومنیاں چونے والیاں نقلیں اُتارتیں زچہ گریاں گاتیں۔ گھر گھر سٹورا اور پان بتاشے بانٹے جاتے۔ شادیاں ہوتیں تو مہینوں پہلے شادی والے گھر میں مہمان داری کا سلسلہ شروع ہوجاتا انہیں خوشبو سے بسایا جاتا۔ ڈھول چھپتا۔ پندرہ بیس روز پہلے سے باقاعدہ مہمان داری شروع ہوجاتی۔

میرے لڑکپن میں جینے کے علاوہ مرنے کا بھی لُطف تھا اگر کوئی بیمار ہوتا تو عیادت کا سلسلہ دنوں چلتا جو کوئی دوست رشتہ دار آتا گھڑی دو گھڑی کے لئے نہیں، سارے دن نہیں تو چار پانچ گھنٹے ضرور بیٹھتا اور تیمارداری میں گھر والوں کا ہاتھ بٹاتا کسی گھر میں غمی ہوجاتی تو قریبی رشتہ دار اور دوست تین دن تک بیٹھے رہتے۔ اپنے گھر سے کھانا پکوا کر لاتے اور سوگ والوں کو خوشامد کر کے کھلاتے۔ تین دن کے بعد بھی چہلم تک برابر تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا اس موقع پر اُمراء کے گھروں میں اتنی خیرات کی جاتی کہ بہت سے لوگ مہینوں کے لئے روٹی کی فکر سے آزاد ہوجاتے۔ لیکن دوسری جنگِ عظیم نے پرانی قدروں میں دیمک لگا دی اور رہی سہی آن ۱۹۴۷ء نے ختم کر دی۔ اب تو ان باتوں کی طرف اس گرانی کے زمانے میں کوئی دھیان ہی نہیں دے سکتا۔ میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس میں مشرق و مغرب کا بڑا حسین امتزاج تھا۔ کیونکہ ابا جان مرحوم پہلے مسلمان آئی۔ ایم۔ ایس تھے اور اس وقت لیفٹننٹ کرنل ہوئے تھے۔ جب انگریزوں کے علاوہ یہ عہدہ کسی ہندوستانی کو مشکل ہی سے نصیب ہوتا تھا۔ اس لئے ہمارے گھر کا انداز نیم مغربی تھا میرا بچپن زیادہ دلی کے سول لائن میں گزرا، یہاں ڈرائنگ روم، بیرہ، خانساماں اور دوسرے لوازمات زندگی مغربی تھے۔ ابا جان مرچ مسالہ بالکل نہیں کھا سکتے تھے اس لئے کھانا ہمارے یہاں انگریزی ہندوستانی دونوں وضع کا پکتا تھا۔

والدہ صاحبہ کے میکے والے ان بیچاری سیدھی سادی ہوی کو ملنز سے میم صاحبہ اور بچوں کو بابا لوگ کہتے تھے۔ میں اپنے کو بھی کے وسیع گراؤنڈ میں درختوں میں بھائیوں کے ساتھ چڑھتی، گھوڑے کی سواری کرتی اور بیڈمنٹن کھیلتی تھی۔ ابا جان کی فرمائش پر اکثر ان کے دوستوں کو کرکٹ اور خالق باری جو مجھے از برتھی سناتی تھی غرضیکہ دونوں طرح کی زندگی مجھے میسر رہی، لیکن نانی اماں کی محل سرا کے عجائبات اب نظروں سے بالکل غائب ہوچکے ہیں۔ اُن کی مصاحب عزیز خانم سے کالی پری کی کہانی ہم نے ڈیڑھ مہینے تک سُنی جس کو وہ دو مہوں کے ساتھ روزانہ ایک گھنٹہ رات کے کھانے کے بعد سُناتیں۔ بڑی خالہ اماں کی مصاحب عائشہ خانم کو طلسم ہوش ربا کی ساتوں جلدیں زبانی یاد تھیں۔ ان عورتوں کی ذہانت حاضر جوابی، بذلہ سنجی اب بی اے۔ ایم اے خواتین میں بھی نظر نہیں آتی۔ میں نے

---

۵ نواب احمد سعید خاں طالب خلف اکبر نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں

۵ بیت الضیاء نیر رخشاں کا دیوان خانہ تھا۔

۵ مرزا سراج الدین خاں سائل ابن نواب شہاب الدین خاں ثاقب میری والدہ کے ماموں زاد بھائی

۵ نواب اعزّ الدین اعظم مرزا خلف سر امین الدین خاں ابن نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی بخوش گو شاعر تھے۔ ایک دیوان اور مثنوی گلزار اعظم اپنا ادبی ترکہ چھوڑ کر ایام جوانی میں وفات پائی۔

اپنی دونوں بڑی بہنوں کی طرح تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ابا جان باوجود آزاد خیال ہونے کے یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ اُن کی بیٹیاں عام لڑکیوں کی طرح اسکول جائیں۔ گھر پر اُردو فارسی مولوی صاحب سے اور انگلش گورنس سے پڑھی، میٹرک بعد میں پرائیوٹ میں نے اپنے شوق سے انیس سال کی عمر میں کیا۔ پھر ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی[1] صاحب سے پڑھ کر ادیب فاضل کا امتحان ۲۱ سال کی عمر میں دیا۔

میرے لڑکپن میں گھر گھر مشنری یورپین عورتیں خوشامد کرتی پھرتی تھیں کہ مسلمان شریف گھرانے کی لڑکیوں کو وہ مفت پڑھا سکیں۔ مگر آخر بزرگ خواتین ناک بھوں چڑھا کر انکار کر دیتی تھیں۔ یہ خیال ان کو رہتا تھا کہ ہماری لڑکیاں کرسٹان عورتوں سے پڑھ کر مذہب سے بیگانہ ہو جائیں گی۔ کنواری لڑکیوں پر اس زمانے میں بہت نظر رکھی جاتی تھی۔ میں نے جب ادبی مصنون رسالہ ہمایوں میں دیا۔ تو ایک قریبی رشتہ دار خاتون نے طنز کی: "اوئی توبہ! اب ہمارے خاندان کی لڑکیاں بھی اخباروں میں چھپنے لگیں اور کسی کو کیا نام رکھیں" مگر میرے آقا بھائی نے ہمیشہ میری ہمت افزائی کی اور میرے ادبی شغف کو تحسین کی نظر سے دیکھا۔

مجھے شعر و ادب سے فطری لگاؤ ہے، اس لئے سولہ سال کی عمر میں نے اپنی ہم سن لڑکیوں کی ایک انجمن بنائی۔ جس کے ماہانہ جلسے ہوتے تھے۔ ان جلسوں میں ادبی مضامین پڑھے جاتے، بیت بازی ہوتی، تقاریر کا مقابلہ ہوتا تعلیم نسواں پر مباحثے ہوتے طرحی مشاعرے کئے جاتے۔ ہم سب تک بندی کر کے خوب غزل سرائی کرتے تھے۔ ان طرحی مشاعروں میں ایک مرتبہ میں نے طرح کا مصرع جو دیا تھا وہ اب تک یاد ہے،

"آیا ہے ابر جھوم کے رحمت خدا کی ہے"

میرا لڑکپن ہندوستان کی سیاسی بیداری کا زمانہ تھا۔ ان دنوں حکیم اجمل خاں کو دلی کا بے تاج بادشاہ کہا جاتا تھا۔ ڈاکٹر انصاری کا بھی یہاں طوطی بول رہا تھا اور ہر گھر میں عورتیں یہ نظم بہت جوش و خروش سے گاتی تھیں۔

"بولیں اماں محمد علی کی۔ جان بیٹا خلافت میں دیدو"

کانگریس کی میٹنگیں حکیم اجمل خاں کی حویلی شریف منزل کے دیوان خانے میں ہوا کرتی تھیں۔ مولانا آزاد کا قیام بھی یہیں رہتا تھا ایک مرتبہ سُنا کہ گاندھی جی نے جامع مسجد میں تقریر جمعہ کی نماز کے بعد کی اور ہندو مسلمانوں نے دوش بدوش بیٹھ کر سُنی، لیکن افسوس ہے کہ یہ بھائی چارے کی فضا زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکی۔ انگریز اس قومی یکجہتی سے گھبرا گئے انہوں نے ایسی شاطرانہ چالیں چلیں اور

---

[1] فخرالدین علی احمد

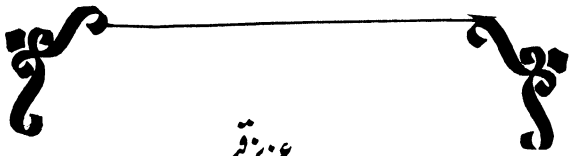

## عزیز قیسی




دشت میں شور ہا و ہو بھی نہیں
وحشتیں، سُرمہ در گلو بھی نہیں
اُجلی اُجلی قبا ہے قاتل کی
دامنِ تیغ پر لہو بھی نہیں
زخم ہی زخم ہے۔ نگاہ کرم!
دل میں گنجائشِ رفو بھی نہیں
اُن سے ملئے تو کس لئے ملئے
اب تو جینے کی آرزو بھی نہیں
حبس ہی حبس دل سے آنکھوں تک
ہائے وہ دشتِ حبس میں لُو بھی نہیں
کس پہ الزام دیں تباہی کا
بے وفا میری جان تو بھی نہیں
آبرو رفتہ بھی نہیں قیسی
شہر میں اس کی آبرو بھی نہیں

مذہبی تعصب کو وہ ہوا دی کہ فضا پھر ایسی بگڑی کہ آزادی ملنے کے اتنے سال بعد بھی یہ بہکے ہوئے فرقہ پرست ابھی تک راہ راست پر نہ آسکے۔

۱۹۵۰ء سے میں نے انجمن ترقی اُردو کا کام کرنا شروع کیا تو علامہ کیفی کو قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے ملا۔ پنڈت جی کے ہمت و حوصلے کو بڑھاپے میں دیکھ کر مجھ پر کافی اثر ہوا اور اُردو کے لئے ان کا عزم و ولولہ مجھے حوصلہ دیتا رہا۔ دیکھنے میں یہ نزار و نزار جسم کا بوڑھا انسان جب اُردو کے حقوق کے لئے اٹھتا تو مرد میدان بن جاتا۔ کیفی صاحب کی دھیمی اور سحر انگیز آواز میں اُردو کی وکالت کرنے کے لئے ایسا کرارپن آجاتا اور لہجہ اتنا تند ہو جاتا تھا کہ ان کے گرد و پیش کے لوگوں کا حوصلہ بلند ہو جاتا تھا اور وہ کام کرنے کی دھُن میں مگن ہو جاتے۔

# میر انیس کی غزل گوئی



مسعود حسن رضوی

میر انیس نے عام دستور کے موافق شاعری غزل سے شروع کی۔ اُن کے والد میر خلیق مرثیہ گوئی کے علاوہ غزل گوئی کے بھی اُستاد سمجھے جاتے تھے۔ رند اور رشک جب تک فیض آباد میں رہے اپنی غزلوں پر میر خلیق سے اصلاح لیتے رہے۔ لکھنؤ میں آنے کے بعد رشک ؔ ناسخ ؔ کے اور رند ؔ آتش ؔ کے شاگرد ہو گئے۔[1] میر انیس نے بھی اپنی غزلوں پر میر خلیق سے اصلاح لی ہوگی۔ مرزا قادر بخش صابر دہلوی نے انیس کے بارے میں لکھا ہے: "غزل گوئی میں دست گاہ تمام اور قدرت مالا کلام ہے۔" اور اُن کی غزل کا یہ مطلع بھی نقل کیا ہے ؎

ہوا ہے، ابر ہے، ساقی ہے، مے ہے
پر اک تو ہی نہیں افسوس ہے ہے

ناسخ کا قول ہے کہ انیس "سوائے مرثیے کے کسی اور صنف میں مطلق دخل نہیں رکھتے۔"[2] مگر انیس کی غزلوں کے تین شعر نقل کر کے اپنے قول کو خود ہی رد کر دیا ہے۔ ان تین شعروں میں ایک تو وہی مطلع ہے جو مرزا صابر دہلوی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے اور اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ باقی دو شعر اس غزل کے ہیں جو کلب حسین خاں نادر نے اپنے مجموعہ مخمسات مسمّٰی بہ دیوان غریب میں درج کیا ہے اور یہاں نقل کی جاتی ہے۔

وجد ہو بلبل تصویر کو جس کی بُو سے
اس سے گل رنگ کا دعویٰ کرے پھر کس رُو سے

شمع کے رونے پہ بس صاف ہنسی آتی ہے
آتشِ دل کہیں کم ہوتی ہے چار آنسو سے

کس سے اے شوخ ہوئی رات کو ہاتھا پائی
نورتن آج جو ڈھلکے ہیں ترے بازو سے

کل تو آغوش میں شوخی نے ٹھہرنے نہ دیا
آج کی شب تو نکل جاؤ مرے قابو سے

ایک دن وہ تھا کہ تکیہ تھا کسی کا زانو
اب سر اٹھتا ہی نہیں اپنے سرِ زانو سے

نزع میں ہوں مری مشکل کرو آساں یارو
کھولو تعویذ شفا حبلد مرے بازو سے

شوخیٔ چشم کا تو کس کی ہے دیوانہ انیسؔ
آنکھیں ملتا ہے جو یوں نقش سُم آہو سے[3]

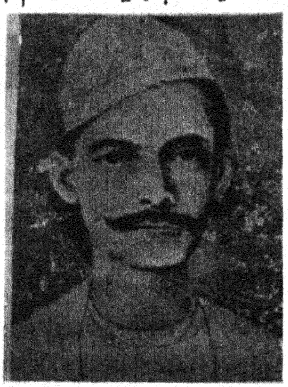

میر انیس

تذکرہ بزم سخن کے مولف نے انیس کو مرثیہ گوئی میں شہرۂ آفاق اور مرثیہ خوانی میں یگانہ و طاق لکھ کر ناسخ کی طرح یہ لکھا ہے کہ "اما بر دیگر اصناف سخن دستے نہ داشت۔"[4] پھر ناسخ کے پیش کیے ہوئے غزل کے دو شعروں میں سے ایک شعر پیش کر کے ناسخ کی طرح اپنے قول کو خود رد کر دیا ہے۔

سعادت خاں ناصر نے تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں میر انیس کے حال میں لکھا ہے:

"عالم شباب میں چندے مشق غزل گوئی رہی اور اصلاح اس کی اپنے پدر بزرگوار سے لی۔ ہنگام زبان تائب اور دل مرثیہ گوئی پر راغب۔"

---

[1] خوش معرکۂ زیبا قلمی [2] گل دستۂ عشق ص۱۶۸ [3] گلستان سخن ص۱۶۹
[4] سخن شعرا ص۵۶ [5] دیوان غریب ص۶۲ [6] بزم سخن ص۱۹

یہ رزمیہ شعر معرفت میر علی اوسط صاحب کے ہاتھ آئے

یہی باعث ہے اس بے رحم کے آنسو نکلنے کا
دھواں لگتا آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

رہا تن میں نہ خون باقی گیا موسم جوانی کا
شتاب آخر ہوا روغن چراغ زندگانی کا

جو میں رگڑا سر ترے پاؤں پر مرا دفعتہً گیا درد سر
یہ خواص صندل مُرغ ہے مری جان رنگ خانہیں[1]"

راقم نے پہلے شعر کا مصرع اولیٰ معتبر بزرگوں سے یوں سُنا "کھلا باعث یہ اس بے درد کے آنسو نکلنے کا" تیسرے شعر میں "میں رگڑا" انیس کی زبان نہیں۔ ممکن ہے بالکل ابتدائی مشق کا کلام ہو۔

تذکرۂ خوش معرکہ زیبا کا جو قلمی نسخہ پٹنہ میں ہے اس کے حاشیے پر یہ عبارت ملتی ہے:

عہد شباب میں جب کہ فیض آباد میں تھے اوائل میں چند غزلیں بھی کہی ہیں جب سے لکھنؤ تشریف لائے۔ شوق مرثیہ گوئی کا ہوا۔ وہ سب غزلیں یک قلم دھو ڈالیں، منیا منیا کیں . . . غزل میر صاحب کی صفت عنقا نایاب ہے۔ بہت تلاش سے ایک غزل دستیاب ہوئی ہے

شہید عشق ہوئے قیس نام ور کی طرح
جہاں میں عیب بھی ہم نے کئے ہُنر کی طرح

کچھ آج شام سے چہرہ ہے فق سحر کی طرح
ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح

سیاہ بختوں کو یوں باغ سے نکال اے چرخ
کہ چار پھول تو دامن میں ہوں سپر کی طرح

تمام خلق ہے خواہاں آبرو یا رب
چھپا مجھے صدف قبر میں گہر کی طرح

تجھی کو دیکھوں گا جب تک ہیں برقرار آنکھیں
مری نظر نہ پھرے گی تری نظر کی طرح

آنیس یوں ہوا حال جوانی و پیری
بڑھے تھے نخل کی صورت گرے ثمر کی طرح

اس غزل کے بعد یہ دو شعر بھی لکھے گئے ہیں۔

خموش اے بلبل شوریدہ اس میں کیا ہے بس میرا
یہ اپنی اپنی قسمت ہے چمن تیرا قفس میرا

بنے ہیں یوں یہ در دریا کے اندر
کہ شش در ہوگئی سد سکندر

اخبار صدائے دون، دہرہ دون مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۲۹ء میں میر انیس کی ایک غزل شائع کی گئی ہے۔ جس کے ابتدائی دو شعر تو وہی ہیں جو خوش معرکۂ زیبا کے نسخۂ پٹنہ سے اوپر نقل کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد تین شعر اور ہیں۔

ہماری قبر پہ کیا احتیاج عنبر و عود
سلگ رہا ہے ہر اک استخواں اگر کی طرح

نحیف و زار ہیں کیا زور باغباں سے چلے
جہاں بٹھا دیا بس رہ گئے شجر کی طرح

تمہارے حلقہ بگوشوں میں ایک میں بھی ہوں
پڑا ہے یہ سخن کان میں گہر کی طرح

آخری شعر ذرا سے لفظی تغیر کے ساتھ جلال کی ایک غزل میں بھی موجود ہے۔

ایک قلمی بیاض یا کشکول چنتان بلاغت میں لکھا ہے: "مطلع بطور رسیاں انیس مرحوم ؎

مجھے ثبات نہیں ایک دم شرر کی طرح
پھٹکنے پر ہے دل مضطرب ثمر کی طرح

اور تیرہ شعر کی میر انیس کی غزل نقل کی ہے جس میں سات شعر تو وہی ہیں جو اوپر آچکے ہیں اور چھ شعر یہ ہیں ؎

تم اس جہاں میں وہ بلقیس ہو کہ خط جو لکھو
تو سر پہ رکھ لے سلیماں ہما کے پر کی طرح

نہیں ہیں کام کے قابل اُٹھائے کون ہمیں
گرے ہیں خاک پہ سوکھے ہوئے شجر کی طرح

بلا تو بھیجئے دوری ہے آپ کے نزدیک
ابھی پہنچتے ہیں ہم ڈاک میں خبر کی طرح

خدا رکھے تجھے آباد خلق میں اے قبر
کہ سوئے پاؤں کو پھیلا کے اپنے گھر کی طرح

بتا تو دیجئے صاحب کہاں کا بوسہ لیں
دہن بھی آپ کا ملتا نہیں کمر کی طرح

---

[1] : خوش معرکۂ زیبا قلمی

[ یہ مصرع پڑھا نہیں گیا ]

کہ بند بند کو باندھے ہوں نیشکر کی طرح

اور مقطع ذرا سے لفظی تغیر کے ساتھ یوں لکھا گیا ہے ؎

انیس یہ ہوا حال جوانی و پیری
بڑھے شجر کی طرح اور گرے ثمر کی طرح

سید علی حیدر نظم طباطبائی شرح دیوان غالب میں رقمطراز ہیں۔

میر انیس مرحوم کے سامنے ایک صاحب نے یہ مصرع پڑھا، چیختے چیختے بلبل کی زبان سوکھ گئی، میر صاحب نے یہ مصرع لگا دیا۔

عرق گل ہے مناسب اُسے دینا صیاد
چیختے چیختے بلبل کی زباں سوکھ گئی

اس کا چرچا لکھنؤ میں ہوا، اکثر لوگوں نے طبع آزمائی کی۔"[1]

افضل حسین ثابت مصنف حیات دبیر نے اپنے خط بنام حامد علی خاں بیرسٹر مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۱۲ء میں میر انیس کا یہ مطلع نقل کیا ہے۔

نہ روکا ہم کو پھولوں نے چلے خالی ہی گلشن سے
گلوں سے خار ہی بہتر کہ لپٹے آکے دامن سے[2]

مولوی مہدی حسن رضوی[3] نے اپنے والد مولوی حامد علی صاحب سے میر انیس کی غزل کے متعدد اشعار سنے تھے، جن میں سے صرف ایک شعر یاد رہ گیا۔

پہلے سے ہلال جھک گیا ہے ؛ آمد آمد کمال کی ہے

اُنہیں مولوی مہدی حسن نے میر امجد حسین شاگرد میر مونس سے میر انیس کی ایک غزل کا یہ مطلع سنا تھا

چُن کے افشاں نظر اس مہ نے جو کی تاروں پر
آسمان شام سے لوٹا کیا انگاروں پر

---

[1] شرح دیوان غالب ص ۱۸۵ [2] یادگار حامد ص ۱۸۴

[3] لکھنؤ کے ذی علم، ذی اثر اور حکام رس بزرگ خان بہادر نواب مولوی مہدی حسن رضوی نے ۲۳ رضوی ۱۹۵۵ء کو پچاسی ۸۵ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے والد میر حامد علی میر انیس سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے اور روزانہ رات کو دو تین گھنٹے اُن کی صحبت میں صرف کرتے تھے وہ میر انیس کا بہت ذکر کرتے تھے مولوی مہدی حسن کو چند باتیں یاد رہ گئی تھیں جو انہوں نے آج سے کوئی تیس برس پہلے میرے دریافت کرنے پر بیان کر دی تھیں۔ ایک مدت کے بعد میں نے ان کا بیان ایک مضمون کی صورت میں ہفت روزہ سرفراز لکھنؤ مورخہ ۹ نومبر ۱۹۶۵ء میں شائع کر دیا تھا مضمون کا عنوان ہے "کچھ میر انیس کے بارے میں" اور ذیلی سرخی ہے "ایک عقیدت مند رفیق کا بیان"۔

آج کل نئی دہلی

سید محمد عباس جنوں نے اپنے استاد نامی شاعر اور مرثیہ گو سید محمد کاظم جاوید سے میر انیس کا یہ شعر سنا تھا

ہلال و ماہ دونوں ہیں تری تصویر کے خاکے
وہ نقشہ ہے لڑکپن کا یہ صورت ہے جوانی کی

مندرجہ ذیل اشعار بھی میر انیس سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

دل لے لیا ہے یار نے مٹھی میں بند ہے
کھلتا نہیں پسند ہے یا ناپسند ہے

جب مسیحا دشمن جاں ہو تو ہو کیونکر علاج
کون رہبر ہو سکے جب خضر بہکانے لگے

رکھ کے منہ سو گیا ان آتشیں رخساروں پر
دل کو چین آیا تو نیند آگئی انگاروں پر[1]

سید زوار حسین مرحوم جو میر انیس کی بہن کے حقیقی پوتے تھے۔ انہوں نے مجھ کو نہایت قابل قدر کاغذات عنایت کئے تھے۔ جو اُن کو اپنی دادی سے وراثت میں ملے تھے۔ ان کاغذات میں ایک پرچے پر غزل غالباً میر انیس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اس غزل کا ایک شعر یہ تھا۔

دیکھ کر شکل اُس کی اسکندر کو یہ حیرت ہوئی
بن گیا آئینۂ تصویر پشت آئینہ

اس شعر کے پہلے مصرع کو ذرا سا بدل کر اور مونس کا تخلص ڈال کر غزل کا مقطع کر دیا یہ طولانی غزل ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

کھینچتے ہیں آپ وہ تصویر پشت آئینہ[2]
ہے چمک پر ان دنوں تصویر پشت آئینہ

گر پسند آئے تمہیں تصویر پشت آئینہ
رو سے ہو جائے سوا توقیر پشت آئینہ

دیکھ کر شکل اس کی مونس کو زبس حیرت ہوئی ؛ بن گیا آئینہ تصویر پشت آئینہ

---

[1] اسی زمین میں آتش کا مطلع ہے: پڑ گئی آنکھ جو ان آتشیں رخساروں پر + لوٹتے کبک نظر آگئے انگاروں پر ۔۔۔ [2] تصویر پشت آئینہ۔ میر انیس اس وقت ۱۹۷۰ء میں ستر برس کا ہے۔ دس بارہ برس کی عمر میں مجھ کو اپنی دادی صاحبہ مرحومہ کے سامان میں ایک منہ دیکھنے کا آئینہ ملا تھا۔ قلعی دار طبی شیشے کی پشت پر ایک ہی چوکھٹے میں ایک دوسرا شیشہ تھا جس میں سنہری اور رنگین تصویر ایک درخت کی تھی جس پر چڑیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ تھی تصویر پشت آئینہ۔ غالباً اس زمانے میں آئینے کی زینت کے لئے اس کے ساتھ ایسا با تصویر شیشہ لگانے کا عام رواج تھا اور آئینے کو لٹکانے کے لئے اس کی پشت پر ایک زنجیر بھی ہوتی تھی۔



اسی غزل کا ایک اور شعر جو انیس سے ہی منسوب ہے ؎ جون ۱۹۷۱ء

بال بکھرائے ہوئے نکلے جو وہ گلشن میں
آسماں لوٹا کیا رات بھر انگاروں پر

زلف پیچاں کو رخ روشن کے پیچھے دیکھ کر
میں نے یہ جانا کہ ہے زنجیر پشت آئینہ

زانوئے خوش بو پہ رکھ کر تم نے دیکھا ہے جو منہ
کیا مہکتے ہیں گل تصویر پشت آئینہ

سلسلہ حیرت زدوں کی قید کا اچھا نہیں
کہہ رہی ہے صاف یہ زنجیر پشت آئینہ

دُور کیا ہے گر تمہارے دیکھنے کے شوق میں
پھوٹ نکلے اس طرف تصویر پشت آئینہ

عہدۂ آئینہ داری تو اگر بخشے اُسے
گردنِ یوسف میں ہوں زنجیر پشت آئینہ

گر نظر آئے تمہارے گلشن رخ کی بہار
مثل طوطی بول اُٹھے تصویر پشت آئینہ

حال اسکندر نظر آجائے جس کو دیکھ کر
چاہئے اس رنگ کی تصویر پشت آئینہ

ہنس کے وہ بولے جو بکھرے پیٹھ پر چوٹی کے بال
دیکھ گر دیکھی نہ ہو زنجیر پشت آئینہ

سخت حیراں ہوں کہ روئے یار دیکھا کس طرح
- - - - - - تصویر پشت آئینہ

اس کے پیچھے رات دن رہتا ہوں میں حیرت زدہ
بن گیا ہوں آج کل تصویر پشت آئینہ

دیکھتے ہیں آپ اس کو اور مجھے آتا ہے رشک
ڈھانپ دیجے دیدۂ تصویر پشت آئینہ

اس کو آئینہ دکھانے میں عجب نقشہ ہوا
بن گیا حیرت سے میں تصویر پشت آئینہ

آپ کوئی بات تو کیجئے لب جاں بخش سے
بول اٹھے گی ابھی تصویر پشت آئینہ

دولت عکس رخ محبوب سے محروم ہے
پڑھ لیا ہم نے خط تقدیر پشت آئینہ

آپ کے چہرے سے ہم چشمی کا دعویٰ واہ واہ
لائیے کو ڑا اپنے تعزیر پشت آئینہ

شاہ نصیر دہلوی مشکل طرحوں میں غزل کہنے میں بڑے مشاق تھے وہ ایک زمانے میں لکھنؤ آئے تو یہ طرح کی "تصویر پشت آئینہ، تقدیر پشت آئینہ"۔ اس طرح اکثر شعراء نے طبع آزمائی کی، جن میں سے بارہ شاعروں کی ہم طرح غزلیں تذکرہ سراپا سخن میں درج کر دی گئی ہیں۔ ان شاعروں کے تخلص یہ ہیں۔ وزیر، رشک، افضل، نصیر، ثاقب، آباد، شاگرد ان ناسخ، محسن۔ شاگرد وزیر، شمس، شاگرد ثاقب امانت شاگرد دیگر، قمر، شاگرد نسیم دہلوی، اسیر و فاضل، شاگرد ان مصحفی۔ ان غزلوں کے علاوہ مسلم عظیم آبادی کا بھی ایک شعر اسی طرح میں ہے۔ امانت کو فخر تھا کہ شیر، نجیر، تکبیر، گل گیر، تدبیر کے قافئے ان کے سوا کسی اور نے نہیں کہے [1]

اس زمین اور ان غزلوں کا بڑا چرچا رہا ہوگا اور اس زمین میں غزل کہنا شاعر کی قادر الکلامی کا امتحان قرار پایا ہوگا۔ اس صورت حال سے میر انیس کا چھوٹا ہوا شوق پھر ابھرا اور انہوں نے اس مشکل زمین میں بہت سے شعر کہہ ڈالے لیکن چونکہ خود غزل گوئی ترک کر چکے تھے اور غزل گویوں سے مقابلہ کرنا منظور نہ تھا۔ اس لئے ایک شعر کا پہلا مصرع بدل کر اس میں میر مونس کا تخلص ڈال دیا۔ بہرحال یہ قیاسات ہیں۔ اصل حقیقت تک پہنچنے کی بظاہر کوئی صورت نہیں ہے۔

انیس کے غزل گوئی ترک کرنے کے بارے میں آزاد نے لکھا ہے کہ میر خلیق نے انیس کی ایک غزل سُن کر کہا کہ "اب اس غزل کو سلام کرو" اس جملے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اسی زمین میں سلام کہو، دوسرے یہ کہ اب غزل گوئی ترک کرو۔ سعادت مند فرزند نے ان دونوں معنوں میں باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ یہ کسی نے نہیں لکھا ہے کہ وہ کون سی غزل تھی۔ لیکن میر انیس کی ایک غزل کے چند شعر اور اسی طرح میں ان کا ایک سلام ملتا ہے غزل کے اشعار حسب ذیل ہیں۔

اشارے کیا نگہ ناز دل ربا کے چلے ؛ ستم کے تیر چلے نیمچے قضا کے چلے
پکارے کہتی تھی حسرت سے نعش عاشق کی ؛ صنم کدھر کو ہمیں خاک میں ملا کے چلے
مثال ماہی بے آب موجیں تڑپا کیں ؛ حباب پھوٹ کے روئے جو تم نہا کے چلے

سلام میں چودہ شعر ہیں۔ چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اُٹھا کے چلے ؛ خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے [2]
مقام یوں ہوا اس کارگاہ دُنیا میں ؛ کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آکے چلے
ملا جنھیں انھیں افتادگی سے اوج ملا ؛ انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے
ملی نہ پھولوں کی چادر تو اہلبیت امام ؛ مزار شاہ پہ لخت جگر چڑھا کے چلے

اس سلام کا مقطع بہت مشہور ہوا۔
انیس دم بھر کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ ؛ چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

---

[1] سراپا سخن ص ۳۳۱-۳۳۵ [2] آب حیات ص ۵۴۲

قیاس کہتا ہے کہ شاید یہی میر انیس کی آخری غزل ہو۔

میر خلیق کی طرح میر انیس نے بھی اپنی غزلوں کو شہرت نہیں دی اور غالباً تمام غزلیں خود تلف کر دیں۔ غزل کے جتنے متفرد اور نقل کئے گئے ہیں اُن کے علاوہ کسی اور شعر کے وجود کا مجھ کو علم نہیں ہے۔ البتہ میر صاحب کے سلاموں میں ایسے بہت سے شعر ملتے ہیں جو غزل کی زینت کا باعث ہو سکتے ہیں۔ مولوی اشہری نے اپنی کتاب حیاتِ انیس میں انیس کے سلاموں سے متعدد غزلیں بنا کر پیش کی ہیں[1] مگر ان میں تغزل کا خاص عنصر یعنی حُسن اور عشق کے معاملات کا ذکر معدوم ہے۔ اس لئے کہ سلام کی متانت اُن کے بیان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ مرثیوں میں تغزل کا موقع اور بھی نہ تھا مگر غزل کا مذاق عام طور پر دلوں میں ایسا بس گیا تھا کہ مرثیوں میں بھی تغزل کا محل پیدا کر لیا گیا، خاص کر تلوار کی تعریف میں، جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہے۔

چلنے میں مزہ قامت معشوق حسیں کا
انداز ہر اک ناب میں تھا چین جبیں کا

کیا قہر تھا شمشیر کے ابرو کا اشارہ
اک چشم زدن میں اسے مارا سے مارا

کج ہو کے وہ چلنا، وہ ٹھہرنا، وہ لچکنا
شعلہ تھا اجل، گرد تھا بجلی کا چمکنا

ندی کے قریں خون کا دریا سا بہا تھا
کیا چال غضب تھی کہ ہر اک لوٹ رہا تھا

حوروں میں یہ گرمی نہ لگاوٹ یہ پری میں
بے دم کیا لاکھوں کو اسی عشوہ گری میں

بسمل ہوا جس کو لچک اس کی نظر آئی
ٹھوکھلیاں کرتی اِدھر آئی اُدھر آئی

چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارہ جیسے

اس کرشمے سے وہ لیلیٰ ظفر راہ چلی ؛ گہہ تھمی، گاہ رکی، گاہ بڑھی، گاہ چلی
زخم سینوں کے گریباں کی طرح پھٹتے تھے ؛ چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے

میر انیس کے غزل گوئی ترک کرنے کا سبب جو اوپر بیان کیا گیا ہے یعنی ان کے والد میر خلیق کا حکم، وہ وقتی اور ظاہری سبب تو ہو سکتا ہے لیکن اصلی سبب تو وہ غیر معمولی ملکۂ شاعری تھا جس کا اظہار غالب نے یوں کیا ہے۔

بقدر شوق نہیں ظرف تنگ نائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

بعض غزل گویوں اور غزل کے شعروں کے بارے میں میر انیس کے چند جملے جو ہم تک پہنچے ہیں وہ بھی سن لیجئے۔ محمد حسین آزاد نے ذوق کے بارے میں میر انیس کی رائے دریافت کی: "فرمایا کہ میاں سید میر کے بعد پھر دلی میں ایسا شاعر کون ہوا ہے[2]"۔

ایک دن آزاد نے میر انیس کے سامنے ذوق کا یہ مطلع پڑھا۔

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھہرے گا
مگر تو بھی اگر چاہے کہ میں ٹھہروں نہ ٹھہرے گا

میر صاحب نے یہ مطلع دو مرتبہ پڑھوایا اور کہا "صاحب کمالوں کی یہ بات ہے کہ جو لفظ جس مقام پر اس نے بٹھا دیا ہے اسی طرح پڑھا جاوے تو ٹھیک ہوتا ہے نہیں تو شعر رتبے سے گر جاتا ہے[3]"۔

میر قربان علی سالک شاگرد غالب نے اپنی بیاض میں ۱۸۶۱ء کی یادداشت میں میر انیس سے اپنی ملاقات کا حال بیان کیا ہے اور اس سلسلے میں لکھا ہے "مرزا غالب کو لگاتار فن کے لفظ سے یاد کیا اور ذوق و مومن کی نسبت فرمایا کہ ذوق شاہی دربار کے شاعر اور مومن اپنی طبیعت کے بادشاہ ہیں۔ پھر حکیم مومن خاں کا یہ شعر پڑھا۔

نہ کچھ شوخی چلی باد صبا کی ؛ بگڑنے میں بھی زلف اسکی بنا کی

پڑھنے کے بعد ایک چپ سی لگ گئی۔ جیسے کوئی حسین صورت سامنے ہے اور ہوا سے اس کی زلف اُڑ رہی ہے اور میر صاحب اس کو دیکھ دیکھ کر کلام کے مزے لے رہے ہیں۔ "ایک روز فرمانے لگے دلی کا کچھ کلام سناؤ میں نے مرزا غالب کی یہ غزل پڑھی۔

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے ؛ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر ؛ کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

پھر اپنی غزل پڑھی اس کا ایک شعر یہ ہے۔

دنیا میں مجھے خاک اُڑانے نے ڈبویا ؛ ہر بار نکل آتا ہے دریا مرے آگے

اس شعر پر فرمایا خوب کہا ہے۔ یہ کہہ کر فرمانے لگے لکھنؤ والے روکے ہے، کھینچے ہے نہیں لوٹتے۔

میر انیس کے ایک عقیدت مند رفیق مولوی میر حامد علی کا ذکر اوپر آ چکا ہے ایک مرتبہ انہوں نے میر انیس کے سامنے یہ شعر پڑھا۔

روشن ہے اسطرح دلِ ویراں میں داغ ایک ؛ اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

میر صاحب لیٹے تھے یہ شعر سُن کر اُٹھ بیٹھے، ایک اُف کی اور فرمایا کہ اب میں بڑھاپے میں ایسے شعروں کی تاب نہیں لا سکتا اس سن میں ایسے تیر نہیں کھا سکتا پھر میر صاحب نے اس شعر کی شرح کے سلسلے میں فرمایا کہ پرانے زمانہ میں جب کسی بستی پر شاہی عتاب نازل ہوتا تھا تو وہ بستی ویران کر دی جاتی تھی اور اس میں کسی نمایاں مقام پر ایک چراغ جلا دیا جاتا تھا۔

---

[1] حیات میر انیس ص ۱۳۸-۱۴۴

[2] آبِ حیات ص ۵۴۳ ، [3] آبِ حیات ص ۴۷۵ ، [4] حیاتِ انیس ص ۲۵۴-۲۵۵

خواجہ غلام السیدین

# مشرقی بنگال کا مسئلہ اور دانشور

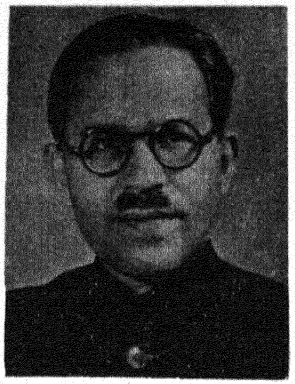

آج کل جو کچھ مشرقی پاکستان میں ہو رہا ہے اس کی ہر شریف اور حساس شخص کے دل پر گہری چوٹ ہے۔ اگر یہ اس قسم کا واقعہ ہوتا جس کو سیاست کی مروجہ زبان میں ملک کا اندرونی معاملہ کہا جاتا ہے۔ تو مغربی پاکستان کے ریڈیو اور اخباروں کا یہ ناٹھیک ہوتا کہ بین الاقوامی قانون کے مطابق ہندوستان یا کسی دوسرے ملک کو اس میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔

لیکن مشرقی پاکستان کا معاملہ کس طرح ایک اندرونی معاملہ ہو سکتا ہے وہ تو انسانیت کا معاملہ ہے۔ شرافت کا معاملہ ہے۔ انصاف کا معاملہ ہے۔ فوجی ظلم و ستم اور بظاہر نسل کشی کو روکنے کا معاملہ ہے۔ چاہے بنگلہ دیش پاکستان کے ساتھ رہے یا نہ رہے۔ پاکستان کی فوجی حکومت کو حق نہیں پہونچتا کہ اس کے خلاف انسانیت سوز سلوک کرے۔

اس وقت ضرورت یہ ہے کہ پاکستان کے حساس اور دانشور لوگ جو قومی ضمیر کے امانت دار ہیں احتساب نفس کریں اور قومی حالات کو سختی اور غیر جانب داری کے ساتھ پرکھیں۔ سقراط نے کہا تھا کہ وہ زندگی جس کی پرکھ نہ کی جائے۔ انسان کے شایانِ شان نہیں اور قوموں کی کامرانی اور ناکامی کا معیار شاعر نے یہ بتایا ہے کہ

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

میں ادھر یا اُدھر کی تمام خبروں کا یقین نہیں کرتا۔ جانتا ہوں کہ جب جنگ شروع ہوتی ہے تو اس کا سب سے پہلا وار راست گوئی پر پڑتا ہے لیکن خدا کو دیکھا نہیں تو عقل سے پہچانا ضرور ہے اور اس عقل کے ذریعہ اور بین الاقوامی نامہ نگاروں اور غیر ملکی باشندوں کی معرفت یہ صاف ہو گیا ہے کہ بنگلہ دیش میں اس وقت امن نہیں ہے۔ قبرستان کا امن بھی نہیں۔ پاکستان ریڈیو کا یہ دعویٰ کہ چند شورش پسندوں کی گڑبڑ تھی جس کو فوج نے بالکل ختم کر دیا ہے اور اس کارِ خیر میں اُسے تمام وطن دوستوں کی جن میں گویا دونوں حصّوں کے لوگ شامل ہیں تائید حاصل ہے، گلے سے نہیں اُترتا مگر دنیا میں غیر مصدقہ اور مبالغہ آمیز خبریں گشت کر رہی ہیں تو ذمہ داری کس کی ہے؟ پاکستان کی فوجی حکومت نے تمام ملکوں کے اخباری نمائندوں کو بیک بینی و دوگوش نکال دیا اور ازراہِ احتیاط اُن کے نوٹس تصویریں اور کیمرے بھی ضبط کر لئے اگر کوئی اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ وہ ان گستاخ، غدار، سات کروڑ بنگالیوں کو ایک ایسا سبق پڑھانا چاہتی ہے جس کو وہ برسوں تک نہ بھول سکیں لیکن اس تعلیمی تجربے کی خونی تفصیلات کو دُنیا کی نظر سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے تو کیا یہ بہت بعید از قیاس ہوگا

ایک دن تو صدر یحییٰ خاں عوامی لیگ کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن سے گفت و شنید کر رہے تھے اور خیال ہوتا تھا کہ جلد سمجھوتہ ہو جائے گا۔ یا دفعتاً

شام کو صدرِ محترم اپنے مغربی پاکستان کے مشیروں کے ساتھ وہاں سے تشریف لے گئے اور اگلے دن ایک تقریر نشر کی جس میں فرمایا کہ "مجیب (اور اب شیخ مجیب الرحمٰن بھی نہ رہے تھے) غدار ہے اور میں نے فوج کو حکم دے دیا ہے کہ وہ اس کی پارٹی کو کچل دے"۔ اور گویا بزورِ شمشیر صوبۂ بنگال میں مکمل امن قائم کر دیا جائے۔ خود مرکزی حکومت کی زیرِ نگرانی جو انتخابات ہوئے تھے اُن میں اس پارٹی نے تقریباً سو فیصدی ووٹ حاصل کئے تھے اور اُس کے ممبر اپنے صوبے کی قانونی نمایندگی کرتے تھے لیکن اس پوری پارٹی کو بیک جنبشِ لب اور جنبشِ قلم خلافِ قانون قرار دے کر تمام صوبے کو فوج کے حوالے کر دیا۔ اگر مارشل لاء کے احکام پہلے سے تیار نہ تھے تو قابلِ داد ہے۔ اہلکارانِ دفتر کی کارگزاری کہ چند گھنٹے کے اندر اندر مارشل لاء کے شاید سو سے زیادہ احکام تیار کر کے جاری کر دیئے گئے۔ لوگوں کے خیال پر، اظہارِ خیال پر، نقل و حرکت پر، لکھنے پڑھنے پر تقریباً سانس کی آمد و شد پر اور خدا کی دی ہوئی ہر آزادی پر سخت ترین پابندیاں لگا دی گئیں۔ تعلیم گاہیں بند کر دی گئیں۔ کیونکہ تعلیم ظلم کے خلاف بغاوت بھی سکھا سکتی ہے کیا اچھا موقع تھا پاکستانی حکومت کے پاس کہ گفت و شنید کے دوران میں گزشتہ پالیسی کی غلطیوں کو ایمانداری کے ساتھ تسلیم کر لیتی (ایک دفعہ تو یادش بخیر بھٹو صاحب نے بھی از راہِ مصلحت کہہ دیا تھا کہ بنگالیوں کے ساتھ ماضی میں زیادتی ہوئی ہے) اور آئندہ کے لئے انصاف کی پالیسی اختیار کرتی اس طرح شاید پاکستان کی سالمیت بھی قائم رہتی اور اس خون کے غسل کی نوبت بھی نہ آتی "دوستو، تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بندوقوں اور توپوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے کروڑوں انسانوں کی محبت، وفاداری اور تعاون حاصل کیا گیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ جبر و طاقت کے ذریعے اس تحریک کو عارضی طور پر دبا دیا جائے لیکن فوجی حکومت کی اس پالیسی نے پاکستان کی سالمیت پر جو ضرب لگائی ہے۔ وہ ہندوستان کیا دنیا کے تمام ملک بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ بنگالی تو اُردو کم جانتے ہیں اگر جانتے تو آپ کے شاعر فیض کے ان اشعار سے انہیں کس قدر تقویت ملتی۔

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے نکلے
یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی!

یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ اُن کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

اگر مغربی پاکستان کے لوگ اُن کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا ٹھیک اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو اس کا ایک سہل طریقہ یہ ہے کہ وہ خود کو اُن کی جگہ رکھ کر دیکھیں۔ اگر خدانخواستہ بنگالیوں کے پاس ایک باضابطہ اور مسلح فوج ہوتی اور مغربی پاکستان کے باشندے نہتے ہوتے اور اُن کی فوج اُن کے یہاں دھاوا بولتی۔ ہزاروں بچوں کو یتیم اور ہزاروں عورتوں کو بیوہ بناتی اور خاص کر نوجوانوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسروں اور دانشوروں کو نشانہ بناتی تو اُن کے دل پر کیا گزرتی؟ انسانیت کے رشتے سے وہ اور اہلِ بنگال ایک ہی خدا کے بندے اور آدم ہی سے بیشتر ہی خدا کے ماننے والے ہیں۔

اہلِ بنگال غالباً پاکستان میں اس نیت سے شریک ہوئے تھے کہ ایک اسلامی ملک کے آزاد شہری بنیں گے اور اپنا کلچر اور اپنی سماجی اور اقتصادی زندگی کو اپنی جبلت کے مطابق تشکیل دیں گے۔ کوئی ملک بھی جو اس قسم کی جبر کی پالیسی اختیار کرے وہ قابلِ شرم ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سیکولر حکومت ایسا کرے تو خود کو ذلیل کرتی ہے۔ اگر کوئی مذہبی ریاست خواہ وہ اسلامی ہو یا مسیحی یا اسرائیلی، ایسا کرے تو وہ اپنے مذہب کو بھی ذلیل کرتی ہے۔ ایک اسلامی حکومت ایسا کرے تو وہ اسلام کی ایک غلط تصویر دنیا کے سامنے پیش کرے گی۔ اسلام جو دینِ امن ہے جو دنیا کے لئے پیغامِ رحمت ہے۔ جو اخوت، دوستی اور مساوات کی تبلیغ کرتا ہے جس نے قرنِ اوّل کے مسلمانوں سے کہا تھا کہ اس نے تمہارے دل میں ایک دوسرے کی الفت ڈال دی۔ اس طرح کے لوگ، جو ایک دوسرے کے دشمن تھے، صبح کو بیدار ہوئے تو وہ آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ اسلام تو زندگی کا اس درجہ احترام کرتا ہے کہ اس نے کہا ہے کہ "جو شخص ایک آدمی کو ناحق قتل کرتا ہے وہ گویا تمام بنی نوع انسان کا خون کرتا ہے اور جو ایک آدمی کی جان بچاتا ہے گویا تمام نسلِ انسانی کی جان بچاتا ہے"۔ اسلام میں تو جنگ کی اجازت ہی نہیں سوائے اس کے کہ وہ آزادیٔ ضمیر کا حق قائم رکھنے یا جارحانہ حملے کی مدافعت میں کی جائے۔ اگر آپ روزِ قیامت پر یقین رکھتے ہیں۔ (جیسا میں سمجھتا ہوں) تو اس روز جواب دہی صرف فوجی حکومت کے اراکین اور افسروں اور سپاہیوں کو نہیں کرنی ہوگی۔ بلکہ ہم آپ سب کو بھی جنہوں نے ظلم کو دیکھا اور خاموش رہے جب آپ کے مذہبی عالموں اور دانشوروں اور اربابِ اختیار و سیاست سے سوال کیا جائے گا۔ تو آپ کیا جواب دیں گے۔ کیا یہ کہیں گے کہ "بارِ الٰہا" ہم نے تو سیاسی اغراض سے ایسا کیا تھا، ہم نے تو اپنی سالمیت کو شمشیر کے زور سے قائم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ خدا کے دربار میں کوئی عذر، کوئی دلیل قابلِ قبول

نہیں ہوتی جو انسانیت شرافت اور رحم کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ اور اگر آپ کی فوجی حکومت محض قوت اور سیاست کا کھیل کھیل رہی ہے جس میں ہزاروں بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی ہے تو خدارا اس میں اسلام کے مقدس نام کو ہونٹوں پر نہ لائیے۔

ریڈیو پاکستان کہتا ہے کہ یہ سب شورش ہندوستانیوں نے کرائی ہے۔ غیب کا علم خدا کو ہے۔ اور نہ میں حکومت کا رازداں ہوں نہ اس کا وکیل لیکن اتنا جانتا ہوں کہ یہ خیال دانش مندی کا ثبوت نہیں تعصب کی دلیل ہے دنیا کی کوئی خارجی طاقت اس قدر زبردست قومی تحریک کو جنم نہیں دے سکتی اس کے لئے مکمل جذباتی یک جہتی کی ضرورت ہے جس کا مشرقی بنگال نے ایک بے نظیر ثبوت دیا ہے۔ اگر ان کو مرکزی حکومت کی پالیسی سے واقعتاً شدید شکایتیں نہ ہوتیں، تو لاکھوں مرد عورتیں نوجوان کس طرح اپنی جان کی بازی لگا سکتے تھے۔ اور حکومت کس منہ سے انہیں چند شورش پسند کہہ سکتی ہے۔ میں کوئی درس اخلاق پڑھانے یا سیاسی تقریر کرنے کا آرزومند نہیں۔ صرف جذبۂ خیر خواہی سے متاثر ہوں اور اس کے تحت حق گوئی کے لئے کوشاں ہوں۔ قرآن شریف میں لکھا ہے۔ "سچ بولو۔ خواہ وہ خود تمہارے خلاف ہو۔" حق گوئی سے ملک کے اندر آزاد تنقید کا دروازہ کھلتا ہے اور اس کی سیاسی اور اخلاقی نجات کی راہیں سنورتی ہیں۔ یہ صرف ایک جمہوری راج میں ہو سکتا ہے لیکن جہاں تنقید کی آواز گھونٹ دی جاتی ہے۔ جہاں اس کو حق کی حمایت میں بلند نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں وہ جبر کے سامنے ادب سے چپ ہو جاتی ہے۔ وہاں ملک کے سچے خیر خواہوں کا فرض ہے کہ وہ خطرے کا الارم بجائیں اور وہیں دراصل احتجاج کا لطف ہے۔ اگر اب بھی حکومت پاکستان قوت کے عریاں تصور کو سینہ سے لگانے کے بجائے انصاف اور رواداری اور انسانیت کا سہارا نہ لے گی تو سات کروڑ بندگان خدا کی قوت ارادی اور خواہش آزادی کو وہ دیر تک نہیں دبا سکتی۔ فوج کے مظالم کو نگاہ عالم سے پوشیدہ رکھ سکتی ہے اور زبان خنجر کو چپ کیا جا سکتا ہے لیکن لہو بھری آستین کا کیا ہوگا۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی)


خصوصی رعایت

آج کل کے سالانہ چندے میں رعائت سے فائدہ اٹھائیے

● دو سالہ کیلئے : ۱۲ روپے یا ۱۸ شلنگ یا ۵ر۲ ڈالر

● تین سال کیلئے : ۱۷ روپے یا ۲۵ شلنگ ۶ پنس، یا ۵۰ر۳ ڈالر


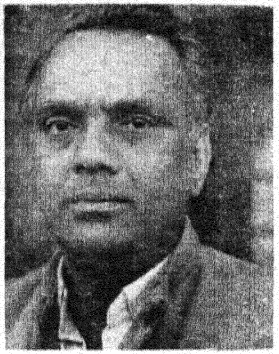

# غزل

سلام مچھلی شہری

امیدوں، حوصلوں، بے تاب ارمانوں کا شہزادہ
مبارک ہو کہ ہوں میں اب بھی افسانوں کا شہزادہ
خرد مندانِ شہر زر کو حیرت بھی ہے الجھن بھی
ابھی تک جی رہا ہے کیسے، مے خانوں کا شہزادہ
وہ لمحہ غور کے قابل بھی ہے، جب بزم دانش میں
یونہی بس مسکرا دے کوئی دیوانوں کا شہزادہ
میں ان لوگوں میں ہوں، جن کو طلا طم راس آتا ہے
ہمیشہ ہی رہا ہوں سخت طوفانوں کا شہزادہ
"مشینی دور" نے آدم کو بھی حیواں بنا ڈالا
پرستش اس کی — جو اب بھی ہو انسانوں کا شہزادہ
مداوائے کام و لب ہیں تیشوں میں پریم بھرنا ہے
ابھی مرنے نہ پائے آپ کے بالوں کا شہزادہ
میں کہتا ہوں، اگر کردار غربت خوبصورت ہو
تو "بن جارہ" بھی بن سکتا ہے ایوانوں کا شہزادہ
بس اک افواہ تھی، "پر باغباں" اب تک ہیں افسردہ
— بھلا گلشن میں کیوں آئے گا ویرانوں کا شہزادہ
گلابوں سے کہو ٹوٹے دلوں میں رقص فرما ہوں!
وگرنہ آنے ہی والا ہے، پیمانوں کا شہزادہ
سلام! اب پوچھتے ہیں مہ رخان بزم پاکستاں
کہاں ہے، "لکھنؤ" کے ان شبستانوں کا شہزادہ



# پرستان

صالحہ عابد حسین

اس سے پہلے تو زندگی اتنی بوجھل نہ تھی !!

بچے کو ایک کولھے سے دوسرے پر منتقل کرتے ہوئے بھی "پرستان" ہی کو گھورے جا رہی تھی سال بھر کا بچہ کسی طرح سنبھل ہی نہ رہا تھا۔ بار بار کھسک جاتا، بار بار وہ شلوار اور بچے دونوں کو اوپر کھسکاتی۔

سرخ اور زرد اور کاسنی پھولوں سے بھرے باغیچے کے لمبے پھندے پیڑوں کے پیچھے سونے کی گول تھالی دھیرے دھیرے سرک رہی تھی —— کتنی گول، کتنی سُندر جیسے تنور سے نکلی گول گول سُرخ سُرخ روٹی !

پیٹ میں زور سے مروڑ اٹھی۔ کئی روز سے یہ روٹی بھی تو پیٹ بھر کر نہیں کھائی تھی۔ اس نے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی —— وہ —— وہ دیکھ بھیا جیسے اپنے ساتھ بچے کا بھی دھیان بٹانا چاہتی تھی سورج سے رنگ اور روشنی چُرا کر بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ "آج یہ سب لڑکے لڑکیاں کیا مر گئے ؟" اس نے چاروں طرف پڑوسی بچوں کو ڈھونڈا۔ جانے وہ سب شریر چھوکرے جو اُسے دیکھ کر آوازیں توازے کستے تھے، وہ ہم عمر لڑکیاں جو اپنے اپنے بھائی بہنوں کو گود میں لٹکائے اسی کے ساتھ باتیں ملکایا کرتی تھیں، وہ اُن کے چھوٹے بہن بھائی —— کہاں گئے یہ سب ؟ بس ایک ننھی سی سُرخ دم کی نیلی چڑیا اِدھر سے اُدھر پھُدک رہی تھی —— اس کی طرح تنہا —— مگر وہ اُداس نہ تھی ! کیسی چہک رہی ہے —— اس کے کولھے پر کوئی بچہ نہیں ہے نا اُسے اس خوبصورت رنگین سنہری نقش و نگار بنے جھولے پر اچکنے سے کوئی روکنے والا ہے —— سارے ارے —— وہ تو ان ریشمی گدوں اور تکیوں پر بیٹھ گئی جن سے ٹک کر وہ فیشن والی —— سندر سندر چھوکریاں، اور وہ خوبصورت لونڈا اور اس کے یار دوست بیٹھ کر دھیرے دھیرے جھولا جھولتے ہیں اور پھر کبھی کالی گول بڑی سی میز یا غیچہ میں بچھ جاتی اور کیرم" —— ہاں ہاں شانو نے یہی نام تو اُسے بتایا تھا —— کھیلیں تھے —— کتنا اچکیں ہیں، کتنا کودیں، قہقہے لگا دیا اور چیخیں ماریں ہیں۔ —— اور جانے وہ کیا کھیل ہے —— ؟ لمبی سی میز، بیچ میں چھوٹا سا جال اور سفید سفید گیند اور چھوٹے چھوٹے بلے ! شانو کو اس کا نام تو یاد نہیں رہا —— کنگ کانگ —— یا جانے کیا کہے تھی ! اور کیسے کیسے سندر کپڑے پہنے ہیں یہ لونڈیاں —— مگر نانی کہے ہے یہ ننگی رہویں ہیں !! ننگی ! ہنہ ! ننگی تو وہ ہے —— اس نے اپنی دس جگہ سے پھٹی اور سلی شلوار، تار تار اوڑھنی اور پھٹے پرانے پھٹے جمپر پر حسرت بھری نظر ڈالی ! بڑی آئیں انھیں ننگی کہنے والی ! کیسی کیسی خوبصورت فراکیں، کیسی کیسی چمکتی پھولدار قمیض پہنے ہیں۔ وہ تو —— کیا ہوا باہیں نہیں —— ان کرتوں میں —— یا ننگیں ننگی ہوں ہیں —— یہ تو سبھی میموں کا، سبھی بڑے آدمیوں کا پہناوا ہے ! دادی کا کیا ہے۔ باتیں بناتی ہے "یہ شریف زادیوں کا پہناوا ناہے —— نہ یہ ہُڑدنگا پن، یہ ناچ گانا، یہ اُچھل کود شریف زادیاں اور بھلے گھر کے لونڈے دیں ہے —— تو یہ تو بہ —— اس سے تو اپنے قصبے میں بھلے تھے —— دیکھ عزیزن —— اپنی بیٹی کو سنبھال کر رکھ —— تیرہ برس کی جوان چھوکری —— اس محلے میں بگڑا نہ جاوے ——" ماں چپ چاپ دادی کو دیکھتی . . . . سامنے لیٹے کھانستے ہوئے دادا پر نظر ڈالتی —— اپنے پانچ چھوٹے چھوٹے بچوں کا دھیان کرتی اور اس مفلسی میں کنکوے کی بیل کی طرح بڑھنے والی اپنی اس بیٹی کو دیکھتی جو اس حال میں بھی غضب کا رنگ روپ نکالا رہی تھی اور ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو جاتی ——"

"تو اسے گھر سے نکلنے نہ دیا کر۔ دادی اور جلے پر نمک چھڑکتی — خود تو سارے دن کھوپڑی پر برقعہ کی ٹوپی لٹکائے گھر گھر پھرتی رہتی ہے — اور ہمیں گھونٹ کر مار دینا چاہتی ہے!

"ماں جی — یہ ذرا سی تو کوٹھری ہے — اور ہم چھ سات دم — دن میں دو چار گھنٹے بچے باہر سڑک اور میدان میں بھی نہ کھیلیں تو گھٹ کر مر نہ جاویں گے!" دبی زبان سے ماں نے کہا — میں تو پہلے ہی نہیں چاہتی تھی۔ اپنے قصبے سے اس شہر میں آنا — پر سبھی سر ہو گئے — اور سب سے زیادہ تم — کہ شہر میں چلیں، چار روپے روز مزدوری ملے گی پر آٹا کتنا مہنگا ہے — پانی تک پیسوں سے ملے ہے — ہوا بھی نصیب نہیں — نمک، مرچ، دال ترکاری کو ترس ترس کر بچے رہ جاویں ہیں — اور وہ جب سے یہاں آئے — مزاج اور بھی خراب . . . . "

ماں نے رونا شروع کر دیا تھا۔ دادی بڑبڑانے لگی — وہ چپکے سے پھر کوٹھری سے باہر نکل آئی۔

بھیا کندھے سے لگ کر سو گیا تھا۔ "پرستان" میں بڑی چہل پہل نظر آ رہی تھی — اونچی سرخ دیوار جس پر پیلے، نیلے اور گلابی پھولوں کی بیلیں چڑھی تھیں اس کو چھپائے تھیں مگر دو سرخ سرخ بڑے بڑے پھاٹک اس کی جھلک دکھا دیتے تھے — وہ اکثر بھیا کو لے کر پھاٹک کے سامنے سڑک کے دوسری طرف میدان میں بیٹھی یا کھڑی اُدھر تکا کرتی تھی۔

"پرستان" کے دونوں چھوٹے حسین بچے آیا کے ساتھ جھولے کے پاس کھیل رہے تھے اور ان کے ارد گرد آس پاس کی کوٹھیوں کے کئی صاف ستھرے بچے رنگ برنگے سندر سندر کپڑے پہنے ہنس کھیل رہے تھے۔ اس نے سوچا — اسی طرح کھیلنا کبھی اُس کی قسمت میں نہ تھا؟ ہوش سنبھالتے ہی ایک نہ ایک بچہ اس نے اپنی گود یا کندھے یا کولھے پر پایا تھا — ایک پیروں چلنے لگتا تو دوسرا اس کی جگہ آن موجود ہوتا! مگر وہاں — اپنے گاؤں میں یہ بات بُری نہ لگتی تھی۔ اس کی سب ہم عمر لڑکیاں اور لڑکے یونہی بھائی بہنوں کو لئے کھیلا کرتے تھے۔ — ان کی ہنسی اُن کی پیاری پیاری باتیں، اُن کی معصوم شرارتیں، اُن کی چہلیں — اُسے اچھی لگا کرتی تھیں۔ سب بچے کھیلتے کودتے، شرارت کرتے، پاس گزرتی سائیکل یا تانگے پر کنکر پھینکتے، کبھی کوئی ٹرک یا لاری گزر جاتی تو دُور تک اُس کی دھول کے پیچھے بھاگتے — اور اگر کوئی موٹر کار آ جاتی تو — واہ وا — سب مل کر اُسے گھیر ہی لیتے تھے — وہ منگلو بدذات تو پتھر پھینکا کرتا تھا۔ بھاگتی کار پر —

— کتنا مزا آتا تھا . . . .

مگر یہاں — اس بڑے شہر کی یہ بڑی بڑی کوٹھیاں اور بنگلے — یہ محل نما مکان — یہ ہزاروں موٹریں اور ٹیکسیاں اور اسکوٹر اور سائیکلیں . . . اور یہ جھلملاتے ریشمی اور جانے کیسے کیسے رنگوں اور وضع کے کپڑے پہنے حسین حسین لڑکیاں جن کی کمر میں سونے کی چھن چھن کرتی زنجیریں اور ننگی ننگی ٹانگوں میں کھٹ کھٹ کرتے جوتے اُسے بہت ہی اچھے لگتے تھے — اور لڑکے! توبہ — یہ لڑکے ہیں یا لونڈیاں؟ رنگین ریشمی کرتے یا بنیان اور اونچی اونچی پھنسی پھنسی پتلونیں یا غرارے جیسے پاجامے پہنے اور غضب یہ کہ زیور بھی تو پہنے ہیں۔ زیور! اپنے قصبے کے لالہ جی کے کانوں میں مندریاں تو دیکھی تھیں اور بڑی حویلی کے رائے صاحب کے لڑکے کے گلے میں سونے کا کنٹھا بھی۔ مگر یہ عورتوں کے سے زیور، انگوٹھیاں اور ہار — بس اُسے تو "پرستان" کا "شہزادہ" اچھا لگتا تھا۔ عمر میں شاید اس سے دو ایک سال چھوٹا ہی ہوگا — کیسا بھولا بھالا چہرہ ہے اس کا — مگر ماشاء اللہ سے — اتنا موٹا تازہ، اتنا لال لال — دن بھر کھاتا بھی تو رہتا ہے۔ سیب، کیلے اور انگور اور مٹھائی اور کیک اور جانے کیا اور کیا — مگر بھئی ان لڑکیوں اور دوسرے لونڈوں کی طرح بد دماغ تو نہیں ہے — وہ جب بھی سڑک پر سے گزرتا اس کو اور اس کے بھائی بہنوں کو بائی بائی یا ہاؤ ہاؤ یا کچھ اور کہہ کر ضرور مسکرا دیتا — کتے، کھلونے تھے اس کے پاس۔ بندوق اور تیر کمان، اور سائیکل، ہوائی جہاز اور ریل گاڑی اور جانے کتنی اور چیزیں۔ کبھی کبھی وہ اپنی لمبی لمبی ٹانگوں پر اچک کر دیوار پر بیٹھ جاتا اور وہاں کھڑے بچوں کو زور سے "باؤ" کر کے ڈرا دیتا — مگر اُسے دیکھ کر ہمیشہ ہنس دیتا تھا — اے لڑکی — اے بیوٹی فل گرل — یہ بچہ — یہ تمہارا بچہ ہے؟" وہ شرما جاتی — "توبہ توبہ" — یہ تو میرا بھتیلا ہے"

"بھتیلا ہے؟ تو اسے آیا کیوں نہیں رکھتی — آؤ تم میرے ساتھ کھیلو"

"آیا — آیا کون؟"

وہ حیران ہو کر پوچھتی ہے وہ خود بھی حیران سا ہو جاتا ہے "آیا — آیا ہے اور کون" اور دھم سے دیوار پر سے سڑک پر کود پڑتا — کتنی کتنی پیاری ہو تم لڑکی — بیوٹی فل —" وہ شوخ نظروں سے اُسے دیکھتا۔ وہ گھبرا جاتی ہے — شرما جاتی ہے اور عین اس وقت کسی لمبے تڑنگے گورے چٹے جوان آدمی کا چہرہ دیوار پر اُبھرتا ہے "پرنس، ڈارلنگ — وہیر آر یو — کم ان —" اور اُسے پاس کھڑا دیکھ کر یہ محبت و مسرت بھرا چہرہ ایک دم سرخ اور خوفناک ہو جاتا ہے "کم ان کم ان — وہاں کہاں کھڑے ہو —

یہ سڑک گلی کے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ کھیلنا . . . "

مگر "شہزادہ" اپنے ابا کی بات مانتا ہی کب تھا ـــــ جب کبھی موقع ملتا کبھی پھاٹک کے پاس آکر، کبھی دیوار پر چڑھ کر، کبھی نظر بچا کر اپنی چھوٹی سی موٹر سائیکل سڑک پر لا کر اس سے اور دوسرے لڑکے لڑکیوں سے باتیں کرنے لگتا تھا: "کتنا پیارا ہے یہ لڑکا ـــ جیسے شہزادہ ہو ـــ" ایک دن اُس نے کہا تھا اور شانو نے بتایا تھا اس کا انگریزی نام جو ہے اس کا مطلب شہزادہ ہی ہے مگر شہزادہ کا چھوٹا سا بھائی اور منی بہن اور بڑی آپا ـــ اور وہ سب تو بڑے ہی خر دماغ تھے ـــ بات بے بات ان لوگوں پر غراتے ـــ سڑک پر کھڑا ہونا مشکل تھا ـــ ایک دن تو اس کے بھیا کو غصہ آگیا: "سڑک تمہارے باپ کی ہے کیا ـــ ہم تو ضرور کھیلیں گے ـــ" وہ اُسے گھسیٹتی رہی ـــ مگر بھلا جمّو کس کے قابو میں آنے والا تھا ـــ بڑی اچھل کود مچائی اس گھر کے بچوں نے بھاگتے انگریزی میں کیا کیا کہا ـــ جمّو نے اپنی دیسی زبان میں خوب گالیاں بکیں اور پھر کئی آدمی اڑوس پڑوس سے نکل آئے۔ باپو نے جمّو کے دوچپت ماری ماں نے اُسے بُرا بھلا کہا اور کئی دن تک وہ لوگ اِدھر آنے کی ہمت نہ کر سکے۔ اصل میں جمّو سے سب یوں بھی تو جلے ہوئے تھے کہ وہ غلیل سے اُن کے باغ کی چڑیاں مار گراتا تھا اور اپنے ایک پتنگ سے ان کے دس پتنگ کاٹ چکا تھا ـــ اور جب شہزادا اور چھوٹا لڑکا چیخا چلّایا تو اُن کے نوکر نے سمجھایا "صاحب یہ تو قاعدہ ہے ـــ کوئی بھی کسی کی پتنگ کاٹ سکتا ہے ـــ آپ بھی کاٹ لیجئے گا اُن کی پتنگ!"

وہ پھر خیالوں میں کھو گئی تھی مگر گود کے بچے کی ٹیں ٹیں نے اُسے چونکا دیا ـــ جب بھی وہ کچھ اچھی اچھی باتیں سوچنے لگتی ہے یہ منحوس رونا چلانا شروع کر دیتا ہے ـــ اس نے بھیا کو کندھے سے لگایا اور پھاٹک میں سے اندر کی طرف جھانکا!

سبز سبز لان پر لال، پیلی، نیلی اور سبز کرسیاں اور میزیں بچھی تھیں۔ ریشمی اور بنارسی ساڑھیاں پہنے عورتیں ان پر بیٹھی تھیں، مرد سوٹ اور اچکن پہنے ہنس رہے تھے ـــ ان میں شہزادے کی ممی، ڈیڈی، بہنیں اور اُن کی سہیلیاں اور بہت سے لڑکے بھی تھے۔ ہائے اللہ ـــ کتنا شور مچاتے ہیں یہ! باجے پر ریکارڈ چڑھا رکھا تھا اور کئی لڑکے لڑکیاں ناچ رہے تھے ـــ توبہ ـــ ناچ رہے ہیں کہ بندر اچک رہے ہیں ـــ کبھی اکیلے اکیلے کودتے کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتے کبھی ایک دوسرے کو چپٹا لیتے ـــ اس کا منہ سرخ ہو گیا ـــ جو کہیں دادی دیکھ لیتی تو مار ہی ڈالتی۔ اس نے گھبرا کر رُخ بدلا ـــ

ـــ اب سب عورتیں اور مرد ایک میز کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ کیسے سندر سندر برتن ہیں یہ ـــ اور کھانے کی کتنی بہت سی چیزیں میز پر لگی ہیں ـــ یہ بیچ میں بڑا سا مکان سا کیا بنا ہے جس پر موم بتیاں جل رہی ہیں ـــ ہاں ہاں ـــ شانو نے بتایا تھا نا ـــ کہ سالگرہ کا کیک بننے والا ہے جس پر موم بتیاں جلیں گی اور چھوٹی بی بی اُسے پھونک سے بجھا دیں گی ـــ ہاں ـــ یہ دیکھو وہ سب تالیاں بجا رہے ہیں ـــ اور کچھ گا رہے ہیں ـــ کیا گا رہے ہیں؟ سمجھ میں نہیں آرہا وہی انگریزی گانا ہوگا اور کیا ـــ اپنے یاں تو ڈھولک پر ایسے سندر سندر گیت گائے جاتے ہیں۔

اُس نے پھر اندر جھانکا ـــ سب کی پلیٹوں میں کھانے کی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ پوریاں اور کباب اور مٹھائی اور پکوڑے اور جانے کیا اور کیا ـــ بیرے سب کے پاس اور چیزیں لے کر جا رہے ہیں اور وہ انکار کر رہے ہیں۔ ـــ وہ ہوتی تو ـــ وہ ہولی تو ـــ پیٹ میں زور سے آگ کا گولہ اٹھا ـــ آج دوپہر پیاز کی ڈلی اور چٹنی کے ساتھ ایک ہی روٹی تو کھائی تھی ـــ آٹا ختم ہو گیا تھا . . . باپو کو مزدوری نہ ملی تھی ـــ راشن کے لئے قرضہ بھی تو نہ ملا تھا ـــ

ایک لڑکے نے کتے کو دو کباب ڈالے جو وہ گرنے سے پہلے ہی ٹرپ کر گیا

ایک عورت نے بلی کو کچھ دیا اور وہ لپ لپ کھانے لگی۔

شہزادہ کے چھوٹے بھیا کے ہاتھ سے پلیٹ گر گئی۔ وہ رونے لگا۔

"کوئی بات نہیں ڈارلنگ ـــ کوئی بات نہیں ـــ بیرا اور پلیٹ لاؤ بابا کے لئے ـــ اور یہ صاف کر دو سب۔"

"اے ہے قالین خراب ہو گیا" موتی چھوٹی کالی آیا نے کہا

"ہو گیا تو ہو گیا بلا سے ـــ کیا میرے بچے سے زیادہ ہے" ممی نے بدمزاجی سے کہا ـــ

جانے منہ میں یہ اتنا پانی کہاں سے بھر آیا ـــ اور پیٹ میں مروڑ سی کیوں اُٹھ رہی ہے؟

اس نے پیٹھ موڑ لی ـــ اگر کہیں دادی سن لے؟ ہائے اللہ ندیدہ پن ـــ کتنی بُری بات ہے ـــ جس دن اُن کے گھر روٹی نہیں پکتی اس دن تو ماں گھر سے چھوٹے بچوں کو بھی نکلنے نہیں دیتی۔

"اے لڑکی یہاں کیوں کھڑی ہے" مالی نے جھڑکا

"کھڑے ہیں ـــ تم سے مطلب ـــ سڑک ہے ـــ سب کھڑے ہوتے ہیں" اُس نے گھور کر کہا ـــ مگر پھر آہستہ سے کھسک کر شانو کی ماں

کے کوارٹر میں گھس گئی۔ شانو کا باپ "محل" میں باورچی تھا اس لیے تو شانو، زیبو اور شریف ان کے ہاں بے تکلف آتے جاتے تھے!

"کیا پکا رہی ہو خالہ" چولھے پر دھری ہنڈیا کھولی۔

"ارہر کی دال ہے بچی" شانو کی ماں نے روٹیاں سینکتے ہوئے کہا۔ "لے کھالے ذرا سی"

وہ کبھی کسی کے ہاں کھانا نہ تھی مگر اس وقت اس کے اصرار کے سامنے دو نوالے اُسے کھانے ہی پڑے۔ "ہائے خالہ کتنی مزے کی دال ہے" اُس نے تعریف کی۔

"خالہ یہ شانو، زیبو سب کہاں گئیں۔ خالہ کا گھر ہمیشہ اپنے اور پڑوس کے بچوں سے بھرا رہتا تھا۔ یہ آج خالی خالی کیوں ہے؟"

"چھوٹے بچوں کو اُن کا چاچا لے گیا ہے ——— اور شانو اور زیبو ——— صاحب کے ہاں تماشا دیکھنے گئی ہیں۔"

"تم نہیں جاتیں خالہ تماشا دیکھنے؟"

"نا بچی ——— مجھے کہاں فرصت ———"

اس کا دل مچل اُٹھا ——— سب جاتے ہیں۔ سب دیکھتے ہیں۔ شانو، زیبو، شریف ——— اور یہ ساری گٹ پٹ کرنے والی لڑکیاں .... پھر وہ کیوں نہیں جاسکتی؟ مگر ماں خفا ہوگی، پھر دادی نے کئی بار سمجھایا تھا "بیٹی اپنی عزت اپنے ہاتھ ——— ان امیروں رئیسوں سے بچ کر رہنا چاہئے ——— جانے کب جھڑک دیں۔ ڈانٹ دیں ——— پھر ہم غریب لوگ ہمارا ان کا کیا مقابلہ؟"

"شانو اور زیبو جو جاتی ہیں۔" اس نے روہانسی ہو کر کہا تھا۔

"بھاڑ میں ڈال انہیں ——— وہ تو ان کی باورچی کی لڑکیاں ہیں ——— پھر دیکھا نہیں کیسی بگڑتی جارہی ہیں اُترن سترن پہن کر ——— منہ ٹیڑھا کر کے بولنے لگی ہیں، اللہ ماریاں ——— ایک دن ماں سر پہ ہاتھ رکھ کے رووے گی ———" اور دادی نے اپنا راگ شروع کر دیا تھا ———

ہُنہ یہ نانی دادیاں ———

وہ باہر نکلی تو سڑک سنسان پڑی تھی صرف پرلی کوٹھی کا نوکر لڑکا کھڑا تھا۔

"آج سب کہاں گئے جمیل؟"

"وہی بنگلہ میں تماشہ دیکھنے ٹی۔ وی کا ———"

"کیسا ہوتا ہے؟"

"بس جیسا سینما کا تماشہ ——— ہم نے تو شہر میں دیکھا تھا ———"

"ہم نے سینما بھی نہیں دیکھا ——— باپو نے ہمیں فلم بھی نہیں دکھایا ———" روہانسی ہو کر اُس نے کہا اور روتے بھیا کو زمین پر بٹھا دیا اس نے اور زور سے رونا شروع کر دیا۔

لڑکا دوسری طرف جا چکا تھا۔ اُس نے بھاٹک پر سے اُچک کر دیکھا کہیں سے نیلی اور پیلی اور سُنہری روشنی لان پر پڑ رہی تھی اور دُوسرے بڑے گیٹ سے رنگ برنگی پتلونیں، بل بوٹم۔ جھلملاتے فراک، رنگین چھپے ہوئے کرتے، ریشمی ساڑھیاں "پرستان" میں جارہی تھیں۔ سب جاتے ہیں ——— تو وہ کیوں نہیں جاسکتی؟ مگر ——— مگر .... اُس نے گھبرا کر خود پر نظر ڈالی۔ شاید اس لیے کہ اس کی شلوار میلی ہے جس میں کئی پیوند لگے ہیں۔ کرتا پھٹا ہوا ہے اور دوپٹہ کا رنگ کچھ ایسا ہے کہ وہ خود بھی پتہ نہیں چلا سکتی ——— اس کے سنہری بکھرے بال پھٹے دوپٹے سے جھانک رہے تھے ——— ہُنہ!

بچہ بلک کر رویا ——— ایک کُتا اس کا پاؤں چاٹ رہا تھا ——— لپک کر بھیا کو گود میں اُٹھایا ——— اور پھر یہ روتا بسورتا بھیا ——— بھلا مجھے کون گھسنے دے گا" اس نے بھاٹک پر سر ٹیک دیا۔

پرلی سڑک کے اُدھر ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے والی خالہ بی جس سے وہ قرآن پڑھنے جاتی تھی اس طرف آرہی تھیں ——— "کیا ہے گلابو" ؟ اس کا نام تو جمیلہ تھا مگر خالہ بی اُسے گلابو کہتی تھیں۔ بالکل گلاب کا سا رنگ ہے اس بچی کا ——— اور آنکھیں جیسے جھیل کے کنول ——— بڑی ہو کر نور جہاں نکلے گی بالکل ———" انہوں نے اپنی سہیلی سے کہا تھا۔

"رو کیوں رہی ہے۔ ٹی۔ وی دیکھنا چاہے ہے؟" اس نے جلدی جلدی گردن ہلائی۔ اندر سے آنے والی چھم چھم کی آوازیں دل چھینے لے رہی تھیں۔

"آجا میرے ساتھ ——— آج میں بھی جارہی ہوں ———" اور وہ ان کے ساتھ یوں کھنچی چلی گئی جیسے لوہا مقناطیس کے ساتھ۔ لان اور باغیچہ پار کر کے بڑے سے برآمدے میں ایک بہت بڑا سا ریڈیو رکھا تھا ——— مگر اس کے بیچ میں کپڑا نہ تھا ——— اس میں سے روشنی اور آوازوں کی پھواریں سی نکل رہی تھیں ——— سامنے فرش پر بہت سے بچے اور لڑکے اور لڑکیاں بیٹھے تھے۔ بڑے لوگ سب باہر کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ خالہ بی اُدھر چلی گئیں اور وہ چپکے سے فرش کے ایک کونے میں ٹک گئی۔ کیسا گدگدا فرش ہے۔ بچے ہنس رہے تھے۔ شرارتیں کر رہے تھے۔ اچھل کود رہے تھے۔ لڑکیاں قہقہے لگا رہی تھیں ——— کبھی وہ پیچھے مُڑ کر بڑے آدمیوں کو دیکھ لیتی، کبھی ان لڑکے لڑکیوں کو جو تماشہ کم دیکھ رہے تھے اور چیخ چلا زیادہ رہے تھے۔ کئی بار اس کی نظر "پرستان" کے شہزادے کی طرف اُٹھ گئی جو اِدھر اُدھر بھاگتا دوڑتا، کھاتا پیتا، لڑکیوں

کوستاتا، لڑکوں سے جھگڑتا پھر رہا تھا — مگر اس کے ہونٹوں کی مدھر مسکراہٹ اُس کے دل میں اُترتی چلی جاتی تھی۔ مگر یہ کیا بات ہے۔ اُسے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ سب ہنستے رہتے ہیں۔ وہ یا چھوٹا بھیا شرارت کریں تو ماں بابا پو مارنے لگتے ہیں۔

ذرا دیر میں اس کی توجہ "ریڈیو" نے کھینچ لی۔ ایک بڑی سندر لڑکی، خوبصورت کپڑے اور زیور پہنے ایک پیڑ کی ڈالی پکڑے گا رہی ہے۔ ایک لمبا سا لڑکا پھنسی پھنسی پتلون اور اُونچا اُونچا بنیان پہنے درخت کے آس پاس گھوم گھوم کر اس کی آواز میں آواز ملا رہا تھا۔ جانے کب وہ فرش کے سرے سے اُٹھ کر بچوں کے بیچ میں جا بیٹھی، جانے کب وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ ہنسنے لگی ..... وہ تو سب کچھ بھول گئی تھی۔ اپنے کو گود کے بھیا کو، ارد گرد کے ان شاندار لوگوں — سُندر شہزادے اور پرستان کو — اور پیٹ میں اُٹھتی آگ کو . . . .

"ارے رے — یہ کیا ہے — کیا ہے بھئی؟"

"کون بچہ رو رہا ہے؟"

"نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا —"

"آخر یہ ہے کون کم بخت؟"

آوازیں کان میں آتی رہیں مگر وہ اپنی جنت میں گم تھی۔

ایک کالی، موٹی، چھوٹی، عورت نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا — ارے چھوکری — کون ہے تو۔

"اے ہے بیگم صاحب جانے کون بادلی سی چھوکری ہے —"

"آیا جی — یہ میرے ساتھ آئی ہے —" پیچھے سے خالہ بی کی آواز سنائی دی —

"جو ہے وہ منھ اُٹھائے چلا آتا ہے۔ جانے کیا کیا انفکشن ساتھ لاتے ہیں یہ گلی کوچوں کے بچے۔" ایک بھاری مردانی آواز کان میں آئی:

"اے ہے غضب — اس موٹے چھوکرے نے قالین پر موت دیا۔

"آخر یہ ہے کون —؟"

"گٹ آؤٹ — یو ڈرٹی تھنگ"

وہ آسمان سے زمین پر آ پڑی — بھیا اس کی گود سے قالین پر پڑا تھا اور ایک گول گیلا نشان اس کے جرم کو افشاں کر رہا تھا — اس نے گھبرا کر بچے کو گود میں اُٹھا لیا!

کون ہے — کہاں سے آئی ہے؟ بیگم صاحبہ نے سب کو کھلی چھوٹ دیدی — چلو — نکلو باہر — بھانت بھانت کی آوازیں اس کے کانوں میں آ رہی تھیں —

"پڑوس کی کوئی بچی ہوگی" ایک مہربان سی آواز سنائی دی۔

"پڑوس میں تو ہزاروں بچے ہیں — فیملی پلاننگ کے باوجود —" کسی نے طنز کیا۔ "کیا سب یہاں آکر روز پریشان کیا کریں گے؟"

"اے یہ مائیں جن جن کر چھوڑ دیں ہیں۔ انہیں فکر ہی کیا ہو ہے؟" موٹی آیا کی زبان چلے جا رہی تھی۔

لڑکیاں قہقہے لگا رہی تھیں۔ لڑکے سیٹیاں بجا بجا کر کچھ کہہ رہے تھے۔ عین اس وقت کہیں سے "شہزادہ" اس کے پاس آکر کھڑا ہوگیا "اوہ بیوٹی — کیسی سنگی پکچر —؟"

مگر اس نے جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں دھندلا چکی تھیں۔ اور وہ اندھا دھند سب کو الانگتی پھلانگتی باہر کی طرف دوڑ رہی تھی — پیچھے سے خالہ بی پکار رہی تھیں۔

گلابو — اری گلابو — ذرا ٹھہر تو سہی —" مگر اس نے کچھ نہیں سُنا — گلاب کی جھاڑیوں سے اُلجھتی، نرم کیاریوں میں گرتی وہ پھاٹک کے باہر جا چکی تھی۔

گھر میں گھسی تو ماں کی گالیاں سواگت کو موجود تھیں!

اس نے بھیا کو جھلنگے پلنگ پر دے مارا اور زمین پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دس دن تک وہ بخار میں پھنکتی رہی۔ غفلت میں اول فول بکتی رہی — پرستان شہزادہ۔ ریڈیو — سیب، مٹھائی — خالہ بی — منا — مرجانے منا بھیا — جاؤ — جاؤ — نکل جاؤ — کہاں سے آکر مرجاتے ہیں یہ لوگ گٹ آؤٹ، گٹ آؤٹ . . . . ڈرٹی تھنگ . . . .

ماں رو رو کر دعائیں مانگتی رہی، باپ قرض لے کر علاج کرتا رہا، خالہ بی اس کے لئے دودھ اور پھل بھیجتی اور دعائیں دم کرتی رہیں۔ اور منا بھیا اپنی ننھی سی ماں کے لئے پھڑکتا رہا۔ . . .

اور کوٹھیوں کی چہل پہل بدستور رہی:

بنگلوں میں دعوتیں ہوتی رہیں۔

پرنس سائیکل اڑاتا، کرکٹ کھیلتا رہا۔

"شہزادیاں پنگ پونگ کھیلتی اور ڈانس کرتی رہیں۔

ریڈیو بجتے رہے:

ٹی۔ وی دیکھے جاتے رہے۔

پکوان اور پلاؤ پکتے رہے۔

شیشے چھنکتے رہے۔

گلاس ٹکراتے رہے!

اور وہ بخار میں جلتی بڑبڑاتی رہی۔ ان دیکھے پرستان کے خواب —

دیکھتی رہی —

اور آج وہ اپنے باپو اور بڑے بھیا اور چھوٹی بھنو کے ساتھ سچ مچ کے پرستان کی سیر کر کے آئی تھی۔

باپو نے بیماری میں اس سے وعدہ کیا تھا، کہ وہ اُسے فلم دکھائے گا اور جب وہ ٹکٹ لایا تو دادی نے بہت صلواتیں سُنائیں، ماں روئی پیٹی کہ دو وقت کی روٹی چلے اتنے روپوں میں — مگر باپو نے بیمار بچی سے وعدہ کیا تھا — ضرور پورا کرے گا —

اور تین گھنٹے وہ سچ مچ کے پرستان کی سیر کرتی رہی تھی۔

اتنے سُندر گھر، ایسی خوبصورت عورتیں اور مرد، اتنے جھلملاتے کپڑے اور زیور ایسے پیارے پیارے بچے، اتنے بہت سے میٹھے گانے اور دیہاتی ناچ — اور پھر پھُول لدا باغ، سبز سبز پہاڑ اور سفید سفید برف، بڑی بڑی موٹریں — اور وہ دولہا، دُولہن — اور وہ پھُولوں سے لدا چھپر کھٹ — اور وہ شہزادہ . . . .

وہ آپ ہی آپ شرما گئی تھی اُسے دیکھ کر :

واپس آئی تو نہ روکھی روٹی پری تھی جو ماں نے غصے میں پٹخ کر رکھی تھی اور نہ تنگ کوٹھری میں دم گھٹا نہ بھائی بہنوں کی چیں چیں نہ ماں کی گھڑکیاں —

صبح وہ پھر بھیا کو گود میں لئے کوٹھی کے پھاٹک کے سامنے کھڑی تھی :

شانو اور زیبو اُسے رحم بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

اس کے سر کے سُنہری لمبے لمبے بال جھڑ گئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ گڈھے پڑ گئے تھے۔ گلابی رنگ سنولا گیا تھا — اور ہاتھ پاؤں سوکھی لکڑی جیسے ہو گئے تھے۔

پرستان میں آج بھی لڑکے لڑکیاں ٹی۔ وی دیکھنے جا رہے تھے۔ مگر اس نے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا —

اور پھر اچانک شہزادہ سامنے آگیا — ہنہ — نقلی شہزادہ !

" ارے رے — تم — تم — ؟ " وہ حیران ہو کر اُسے دیکھ رہا تھا۔

" تم — وہ ہونا — جس کے بچے نے — پیشاب کر دیا تھا — " اس نے منہ پھیر لیا۔

" مگر — وہ — وہ تو بڑی پرتی — ہوئی تھی — اے گنجی کالی لڑکی ! وہ خوبصورت لڑکی کہاں ہے " اس نے چڑایا !

" تمہیں کیا مطلب ! "

" آج آؤ گی فلم دیکھنے ہمارے ہاں " اس نے صلح کا ہاتھ بڑھایا۔

" ہنہ — کیا دھرا ہے تمہارے گندے ریڈیو — میں — کالی کالی لونڈیاں، ذرا ذرا سی موٹریں — ہم خود اپنے باپو کے ساتھ رنگین پکچر دیکھ کر آئے ہیں — اب ہم روز پکچر دیکھا کریں گے — پرستان کی — " اس نے منہ چڑھا کر انگوٹھا دکھایا اور پیٹھ موڑ کر چلدی !

" پرنس — ڈارلنگ — وہیر آر — یو — ادھر آؤ — وہاں کہاں کھڑے ہو — "

" نہیں نہیں ڈیڈی — ہم تو — اس گنجی کالی لڑکی کے ساتھ رنگین پکچر دیکھیں گے " شہزادے نے بچوں کی طرح مچل کر کہا۔ وہ اپنی کوٹھری کی طرف جاتے جاتے ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک، ہونٹوں پر ایک مُدھر مسکراہٹ تھی ! ننھا بھیا جھلنگے پر پڑا رو رہا تھا۔ اُس نے آہستہ سے اُسے گود میں اُٹھایا اور اپنے برگِ گل سے ہونٹ اُس کی چاند ایسی پیشانی پر رکھ دیئے۔


آج کل کا اگست ۱۹۷۱ء کا شمارہ

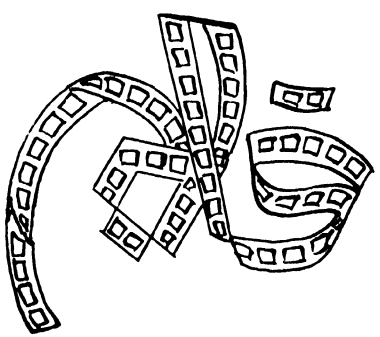

نمبر ہوگا

اس خصوصی شمارے میں ہندستانی فلمی صنعت کے تمام پہلوؤں کا مکمل اور بھرپور جائزہ شامل ہوگا۔ مشہور فلمی ناقدین کے علاوہ فلمی صنعت کے ممتاز افراد کے مضامین بھی شامل ہونگے۔ رنگین ضمیمہ، متعدد تصاویر، خوبصورت سرورق اور آفسیٹ کی طباعت کے باوجود قیمت ایک روپیہ ہوگی اور سالانہ خریداروں سے زائد قیمت نہیں لی جائے گی۔

" آج کل " کے سابقہ نمبروں کی طرح یہ شمارہ بھی آپ کو بے حد پسند آئے گا۔

# کچھ اسد اور غالب تخلص کے بارے میں

عابد پشاوری

**جناب** اکبر علی خاں عرشی زادہ نے دیوانِ غالب نسخۂ عرشی زادہ میں استدلال کیا ہے کہ مرزا غالب نے ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء میں اسد تخلص ترک کر کے غالب تخلص اختیار کیا ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ مرزا نے ۱۲۳۱ھ میں یکے بعد دیگرے دو مہریں نقش کرائیں۔ ایک پر:

اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ ۱۲۳۱ھ

اور دوسری پر: —— اسد اللہ الغالب ۱۲۳۱ھ

کندہ ہوا۔ ایک ہی سنہ میں دو مختلف مُہریں نقش کرانے کا جواز ہونا چاہیے۔ ایک وجہ اس عمل کی یہ ہو سکتی ہے کہ پہلی مہر گم ہو گئی ہو اور نئی مہر کی ضرورت پیش آئی ہو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ صاحب مہر کو کسی بھی ضرورت سے پہلی مہر کی عبارت میں کوئی ترمیم منظور ہو۔[1] پہلی وجہ اس لئے درست نہیں کہ ان کے قول کے مطابق پہلی مہر غالب کے پاس ۲۸ جمادی الاول ۱۲۳۹ھ تک بہرحال موجود تھی۔ "اب دوسری صورت باقی رہ جاتی ہے کہ غالب کو عبارت میں ترمیم کرنا تھی۔ اس ترمیم کی وجہ یہ تھی کہ ۱۲۳۱ھ کی کسی تاریخ کو انہوں نے غالب تخلص اختیار کیا تو تخلص مہر نقش کرانے کا بھی خیال آیا۔"[2] اس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ مرزا غالب نے ۱۲۳۱ھ میں کسی وقت بجائے اسد، غالب تخلص اختیار کیا۔

جناب مالک رام نے اس غلط فہمی پر ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔

"غالب نے ۱۲۳۱ھ میں دو مہریں تیار کروائی تھیں۔ اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ اور اسد اللہ الغالب۔ بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ اسد اللہ الغالب مہر سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اس سال (۱۲۳۱ھ میں) غالب تخلص اختیار کیا۔ حالانکہ نہ اُن کا نام اسد اللہ تھا اور نہ تخلص الغالب صحیح بات یہ ہے کہ اس مہر میں لفظ غالب بطور تخلص استعمال ہی نہیں ہوا، بلکہ یہ مہر انہوں نے بطور سجع تیار کروائی تھی۔ دراصل اسد اللہ الغالب، لقب ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا چونکہ میرزا کا نام اسد اللہ خاں تھا، اور وہ عقیدے کے لحاظ سے شیعی تھے، اس لئے انہوں نے یہ سجع والی مہر بنوا کر گویا حضرت علی سے اپنی عقیدت کا اعلان بھی کر دیا۔ غرض اس مہر سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ ۱۲۳۱ھ میں انہوں نے غالب تخلص اختیار کر لیا تھا۔"[3]

مالک رام کی پوری بحث دیکھنے سے نتیجہ نکلتا ہے کہ میرزا نے غالب تخلص ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء کے بعد اور ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء (تاریخ کتابت نسخہ بھوپال) سے پہلے اختیار کیا۔ لیکن اس ضمن میں عیار الشعراء مولفہ خوب چند ذکا دہلوی کے بیان سے کچھ شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ذکا کا بیان ہے۔

"مرزا اسد اللہ عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ولد مرزا عبد اللہ عرف مرزا دولہ نبیرۂ غلام حسین خاں کمیدان، ساکن بلدۂ اکبرآباد۔ شاگرد مولوی معظم۔ شاعر ہندی و فارسی:

اس بیان میں تین باتیں غور طلب ہیں: (۱) مرزا کا تخلص غالب ہے (۲) وہ اکبرآباد (آگرہ) میں مقیم ہیں اور (۳) وہ مولوی معظم کے شاگرد تھے۔ ۱ سے گمان ہوتا ہے کہ مرزا نے عام درسیات کے علاوہ مولوی معظم سے شعر میں بھی اصلاح لی ہو۔ نیز ذکا کا بیان سرور سے مقدم ٹھہرتا ہے۔ اس لحاظ سے پہلا تذکرہ ذکا کا ہے جس میں غالب کا ذکر آیا ہے نہ کہ سرور کا تذکرہ جیسا کہ اکبر علی خاں صاحب نے نسخہ عرشی زادہ میں لکھا ہے۔ خوب چند ذکا دہلی کے رہنے والے تھے اور مرزا کے معاصر بھی اس لئے ان کی

---

[1] [2] : نسخہ عرشی زادہ مرتبہ اکبر علی خاں، مباحث ص ۱۵-۱۶

[3] گل رعنا مرتبہ مالک رام مقدمہ ص ۳۵

مہیا کردہ اطلاع پر بھروسہ نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ جب ذکا نے غالب کا ذکر درج تذکرہ کیا، وہ آگرے میں مقیم تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ قیام آگرے کے دوران ہی مرزا نہ صرف غالب تخلص اختیار کر چکے تھے۔ بلکہ یہ تخلص اس قدر مشہور بھی ہو چکا تھا کہ تذکرہ نگار ان کا ذکر اسد کے بجائے غالب کے نام کے تحت کرتا ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے، عیار الشعرار کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن میں ہے اور دوسرا انجمن ترقی اردو، علی گڑھ کے کتب خانے میں۔ اس تذکرے کے تالیف کے زمانے سے متعلق محققوں کو اول تو اطلاع نہیں اور اگر ہے تو وہ غلط ہے پروفیسر محمود شیرانی مرحوم مجموعہ نغز کے مقدمے میں لکھتے ہیں: "۔۔۔۔ عیار الشعرار از خوب چند ذکا ۔۔۔۔ جو ۱۲۰۸ھ یا ۱۲۱۳ھ میں شروع ہوا اور مولف برابر تیس سال تک اس میں اضافہ کرتا رہا۔ آخری تاریخ ۱۲۴۷ھ بتائی جاتی ہے۔ اس تصنیف میں پندرہ سو شاعروں کا ذکر ہے اور ایک ہزار صفحات ہیں۔"[1]

اس بیان میں کئی باتیں محل نظر ہیں۔ عیار الشعرار پروفیسر شیرانی مرحوم کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس میں نہ پندرہ سو شاعروں کا ذکر ہے، نہ ایک ہزار صفحات ۱۲۰۸ھ یا ۱۲۱۳ھ میں درست نہیں۔ شیرانی مرحوم کا بیان اسپرنگر سے ماخوذ ہے اور اسپرنگر کی معلومات کا ماخذ گارساں دتاسی ہے۔ گارساں دتاسی نے اسکی تالیف کے بارے میں لکھا ہے:۔

"ذکا نے اپنا تذکرہ بہ زبان فارسی ۱۲۴۷ھ/۲-۱۸۳۱ء یا ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء سے لے کر ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء کے درمیان مرتب کیا۔"

یہ بیان واضح نہیں ہے خود دتاسی اس ضمن میں شکوک معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے بیان میں کوئی قطعی تاریخ نہیں دی۔ چنانچہ فرمان فتح پوری نے نگار تذکروں کا تذکرہ نمبر" میں لکھا ہے کہ:

"ذکا نے عیار الشعرار کے دیباچہ میں اس کے تکملے کا سال خود اس طور پر بیان کر دیا ہے:۔

تاریخ تذکرہ کہ بدیہہ خاطر گزشتہ ( ) نیز درج نمودہ باللہ التوفیق

اے ذکا، ہو چکا جس روز یہ نسخہ تیار
آگے ہاتف کے کیا پیر خرد نے مذکور
منصفی کر کے وہیں اس نے (اونے) یہ تاریخ کہی
آفریں کہہ کر کیا اسم سبھوں کا مشہور

چوتھے مصرعہ سے اس کا سال تصنیف یا تکمیل ۱۲۱۳ھ نکلتا ہے۔"

فرمان صاحب کے پیش نظر انڈیا آفس کے مخطوطے کا مائیکرو فلم تھا لیکن اس میں مندرجہ قطعہ نہیں ہے۔ چنانچہ عیار الشعرار کے زمانہ تصنیف سے متعلق ان کا بیان نسخۂ انجمن کے بارے میں ان معلومات پر مبنی ہے جو انہیں سیفی پریمی صاحب نے بھجوائی تھیں۔ چوتھے مصرع سے ۱۲۱۳ھ نہیں ۱۲۱۸ھ نکلتا ہے۔ آج سے تقریباً تین سال قبل محض چند لمحوں کے لئے مجھے نسخۂ انجمن کی زیارت ہوئی تھی۔ میری یادداشت میں اس قطعے کا آخری شعر درج ہے اور اس کے سامنے ۱۲۱۳ھ لکھا ہے۔ اس لئے یقین ہے کہ ۱۲۱۳ کا تب نسخہ نے لکھا ہو جسے میں نے بھی نوٹ کر لیا اور سیفی پریمی صاحب نے بھی یہی تاریخ لکھ کر فرمان صاحب کو بھجوا دی اور انہوں نے اُسے بعینہٖ شائع کر دیا اگر وہ چوتھے مصرعے کے اعداد خود شمار کرتے تو یہ غلطی واقع نہ ہوتی۔

جیسا کہ قطعہ ہذا میں بصراحت لکھا ہے، عیار الشعرار ۱۲۱۸ھ میں مکمل ہو گیا تھا لیکن اس میں اضافے یقیناً بہت بعد تک ہوتے رہے جس کی دلیل اس میں خود مرزا غالب کے ذکر کی موجودگی ہے۔ ۱۲۱۸ھ میں غالب چھ برس کے تھے اور اس عمر میں بہ حیثیت شاعر کسی تذکرے میں ان کا ذکر ہونا ممکن نہیں لہٰذا یہ بعد کا اضافہ ہے۔ اس کا ایک مزید ثبوت یہ ہے کہ قاسم نے مجموعہ نغز ۱۲۲۱ھ میں مکمل کیا۔ قاسم نے ذکا کے ترجمے میں لکھا ہے کہ "تذکرہ ہم تالیف کردہ" قاسم نے ذکا کا تذکرہ ضرور دیکھا ہوگا اور اگر نہ بھی دیکھا تو بھی اُن کے پیش نظر نواب اعظم الدولہ سرور کے عمدۂ منتخبہ کا مسودہ تھا۔ سرور نے بظاہر ۱۲۱۹ھ میں اپنا تذکرہ ختم کیا لیکن اضافے کم و بیش ۱۲۴۳ھ تک کرتے رہے۔ سرور نے مرزا کا ذکر اسد تخلص کے تحت کیا ہے لیکن انتخاب میں ایسے شعر بھی ہیں جن میں غالب بطور تخلص آیا ہے۔ تذکرہ سرور کے لئے اسپرنگر کا قول ہے کہ یہ عیار الشعرار کا ایک اصلاح یافتہ مرتبہ ہے" اور کہ قاسم کا تذکرہ سرور کے تذکرے پر مبنی ہے" لیکن چونکہ قاسم نے غالب کا ذکر کیا ہے نہ اسد کا۔ اس سے ظاہر ہے کہ نہ صرف ذکا نے بلکہ سرور نے بھی غالب کا ترجمہ ۱۲۲۱ھ کے بعد شامل تذکرہ کیا۔ سرِ دست اگرچہ یہ طے کرنا ممکن نہیں کہ ذکا نے کب تک اپنے تذکرے میں اضافے کئے اگرچہ اضافے کرنا طے ہے، تاہم مرزا غالب کا ذکر بہرحال ۱۲۲۸ھ سے پہلے داخل تذکرہ ہوا ہوگا۔ اس لئے کہ ۱۲۲۸ھ میں مرزا غالب آگرہ چھوڑ کر دلی میں مقیم ہو چکے تھے (کم و بیش غالب کے سب سوانح نگار اس پر متفق ہیں)

اب سوال یہ ہے کہ اگر مرزا قیام آگرہ ہی کے دوران غالب تخلص اختیار کر چکے تھے (اور ترک آگرہ ۱۲۲۸ھ کا واقعہ ہے) تو انہوں نے اسد اللہ الغالب والیٔ مہر (۱۲۳۱ھ) کندہ کروانے کے بعد کیونکر تخلص تبدیل کیا اور صاحب ذکر غالب کا یہ بیان کہ "وہ قیام دلی کے ابتدائی زمانے میں بھی اسد تخلص کرتے رہے" اور "یہ درست ہے کہ بعد کو انہوں نے اسد تخلص سے بیزار ہو کر غالب تخلص رکھنے کا فیصلہ کر

---

[1] مجموعہ نغز، مولفہ قدرت اللہ قاسم، مقدمہ از پروفیسر محمود شیرانی

تو اس سجع نے اُن کی مشکل حل کر دی اور انہوں نے یہ سامنے کا لفظ بطورِ تخلص اختیار کر لیا" (گلِ رعنا) کہاں تک درست ہے۔ ماہرینِ غالب و غالبیات اگر اس مسئلے پر اظہارِ خیال فرمائیں تو مجھ ایسے کتنے ہی طالب علموں کی رہنمائی ہوگی۔

یہ بحث تو عیار الشعراء کے بیان کی روشنی میں تھی۔ اس ضمن میں مرزا غالب کے اپنے بیانات کے علاوہ ان حقائق پر بھی نظر رہے تو فیصلہ کرنا اور آسان ہو جائے گا غالب نے اُردو اور فارسی شاعری کی ابتدا ساتھ ساتھ کی بلکہ ممکن ہے کہ فارسی گوئی کی ابتدا اُردو سے پہلے کی ہو۔ طالب علمی کے زمانے میں "کہ چہ" ردیف والی غزل کا ذکر ملتا ہے اگرچہ غزل دستیاب نہیں ہوئی اب تک محققینِ غالب کا یہ مذہب رہا ہے کہ مرزا اُردو میں اسد اور فارسی میں ابتدا ہی سے غالب تخلص کرتے تھے۔ لیکن نئی تحقیق کی روشنی میں یہ بات غلط ٹھہرتی ہے۔ اگر مالک رام صاحب کے اس بیان کو تسلیم کر لیا جائے (اور فی الحال تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں) کہ دیوانِ غالب کے دریافت مخطوطے کی تاریخ کتابت تک (جو ۱۲۳۱ھ طے کی گئی ہے مگر مشکوک ہے، اس کی بحث آگے آتی ہے) مرزا کا کُل فارسی کلام اُن ۱۳ رباعیوں پر مشتمل تھا جو مذکورہ مخطوطے میں شامل ہیں، تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ پہلے فارسی میں بھی اسد ہی تخلص کرتے تھے۔ رباعی میں تخلص کی گنجائش کم ہوتی ہے تاہم ان تیرہ میں سے ایک رباعی میں بھی لفظ اسد کا استعمال (ع گفتم کہ اسد؟ گفت دل آشفتۂ من) ہوا ہے جو ہمارے قول کی تصدیق کے لئے کافی ہے۔ مندرجہ دلائل کی روشنی میں یہ بیان نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں جب بعد کو انہوں نے اسد تخلص سے بیزار ہو کر نیا تخلص رکھنے کا فیصلہ کیا تو اس سجع نے اُن کی مشکل حل کر دی اور انہوں نے یہ سامنے کا لفظ بطور تخلص اختیار کر لیا" (گلِ رعنا مرتبہ مالک رام)

اس طرح یہ لطیفہ بھی بے وقعت معلوم ہوتا ہے کہ تخلص بیزاری کا سبب میرا مانی اسد کا ایک شعر ہوا۔ اگر مرزا فارسی میں غالب تخلص کرتے تھے تو اُردو میں اُسے اختیار کرنے میں کیا چیز مانع تھی جب فارسی میں کسی سجع کی ضرورت نہیں پڑی تو اُردو میں وہی تخلص جو فارسی میں پہلے ہی سے موجود تھا زیادہ سامنے کی چیز تھی یا مذکورہ سجع!

اسد تخلص کے بارے میں مرزا کا اپنا بیان ہے۔

"میں نے کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں۔ (بحوالہ غالب از غلام رسول مہر) اپنی شاعری کی ابتدا سے متعلق مرزا کے بیانات مختلف اور متضاد ہیں۔ کبھی انہوں نے پندرہ برس کی عمر سے شعر گوئی کی آغاز کی بات کہی ہے۔ کبھی بارہ، تیرہ برس کی کہیں دس برس کی عمر کا ذکر کیا ہے اور کہیں گیارہ برس کا۔ مالک رام صاحب موخر الذکر کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ مرزا نے ۱۱-۱۲ برس کی عمر میں شاعری شروع کی تو اُن کے اپنے بیان کے مطابق دو چار برس جس کی آخری حد چار برس ہے یعنی ۲۷-۱۲۲۸ھ تک وہ اسد تخلص کرتے رہے اور اس کے بعد (اغلباً ۱۲۲۸ھ میں) انہوں نے غالب تخلص اختیار کیا لیکن بقولِ خود چونکہ غالب کلمۂ رباعی ہے اور بعض بحور میں درست نہیں بیٹھتا۔ اس لئے وہ اسد کو جو اُن کے نام کا مخفف ہے، بہ طور تخلص تقریباً آخر عمر تک استعمال کرتے رہے۔

مندرجہ بحث کا ایک منطقی اور لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نو دریافت مخطوطۂ دیوان غالب کی تاریخ کتابت ۱۲۳۱ھ نہیں ہو سکتی۔ اکبر علی خاں صاحب نے اس سلسلے میں ذرا عجلت سے کام لیا ہے۔ انہوں نے جزوی تحقیق سے نتائج اخذ کئے ہیں۔ اس لئے اس قسم کی لغزش کچھ تعجب انگیز نہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے نثار احمد صاحب فاروقی نے "آج کل" جون ۱۹۶۹ء میں تقویم کی مدد سے طے کر کے اس نسخے کا سنہ کتابت ۱۲۳۳ھ لکھا تھا۔ لیکن جب آج کل کے جولائی ۱۹۷۰ء کے شمارے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا مضمون شائع ہوا اور انہوں نے ۱۲۳۱ھ کو تاریخ کتابت قرار دیا تو نثار صاحب نے اپنا پہلا بیان بدل دیا اور بغیر کسی مزید تحقیق کے ۱۲۳۱ھ کو شاید اس لئے تسلیم کر لیا کہ یہ ایک جید محقق اور ایک مستند ماہر غالبیات کی تحقیق تھی۔ مولانا عرشی کا مرتبہ تسلیم لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تحقیق میں کسی کا قول حرفِ آخر مشکل ہی سے ہو پاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ نثار صاحب کے پیشِ نظر جو تقویم تھی وہ صحیح نہیں تھی۔ (اگرچہ اس میں ۱۲۳۳ھ میں ۱۴ رجب کو منگل کا دن درج ہے) لیکن یہ بھی درست ہے کہ ۱۴ رجب کو منگل کا دن ۱۲۳۱ھ میں بھی نہیں ہے لیکن اگر بہ فرضِ محال یہ درست بھی ہوتا تو بھی نو دریافت دیوان کی کتابت اس سنہ سے پہلے ہی ہو جانی چاہئے کیونکہ ۱۲۳۱ھ کی بنیاد تخلص کی تبدیلی پر ہے اور یہ اس سنہ سے پہلے کا واقعہ ہے۔

یہاں بجا طور پر سوال کیا جا سکتا ہے کہ میں جو اس قطعیت سے نثار احمد فاروقی مولانا امتیاز علی عرشی اور اکبر علی خاں عرشی زادہ صاحبان کے پیشِ نظر تقاویم کو غلط قرار دے رہا ہوں، اس کا جواز کیا ہے؟ میرے پیشِ نظر آخر ایسی کون سی تقویم ہے جسے معتبر مانا جائے۔ مجھے اعتراف ہے کہ بدقسمتی سے میری دسترس کسی مشہور و معروف یا مستند تقویم تک نہیں ہو سکی۔ فی الحال پیشِ نظر "ایتہاسک تتھی پترک (ऐतिहासिक तिथि पत्रक) یا Historical Calander" ہے۔ یہ اگست ۱۹۶۲ء میں جودھ پور سے طبع ہوا ہے۔ اس میں فصلی، ہجری، عیسوی، شک، بکرمی اور کولم سمت درج ہیں۔ سنین کی ابتدا ۱۷۰۱ بکرمی سے اور اختتام سنہ ۱۹۰۰ پر ہوتا ہے گویا یہ دو سو برس پر مشتمل ہے۔ مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ اس میں عجیب افراتفری کا عالم ہے کہیں تاریخیں بالکل مطابق ہیں اور کہیں ایک سے چار دن تک کا فرق ہے۔ مجھے صحیح نتائج تک پہنچنے کے لئے خاصا طویل اور بالواسطہ طریقہ اختیار کرنا پڑا ہے۔ مثلاً جب میں یہ کہتا ہوں کہ ۱۲۳۳ھ میں ۱۴ رجب کو بدھ کا دن تھا نہ کہ منگل کا۔ جیسا کہ نثار صاحب نے جون ۶۹ء کے

آج کل میں لکھا تھا تو اس کے لئے مجھے مرزا قتیل کی تاریخ وفات کا سہارا لینا پڑتا ہے قتیل کی وفات ۲۳ ربیع الاول ۱۲۳۳ کو ہفتے کے دن ہوئی۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے دستور الفصاحت کے دیباچے میں اسے درست مانا ہے۔ نشترِ عشق میں قتیل کی وفات یہی درج ہے میرے پیشِ نظر تھتی پترک میں بھی یہ تاریخ اسی دن کے سامنے درج ہے یعنی ۲۳ ربیع الثانی کو ہفتہ درج ہے جس کا مطلب ہے کہ کم از کم ۱۲۳۳ھ کی حد تک تھتی پترک میں مندرج تاریخیں درست ہیں چنانچہ اس مضمون میں میں جتنی تاریخیں پیش کروں گا ان سب کی تحقیق و تصدیق اسی سال میں رونما ہونے والے کسی دوسرے واقعے کی تاریخ سے مطابقت کر کے کر لی گئی ہے۔ اس طرح غلطی کا امکان کم سے کم رہ گیا ہے۔ یوں میں بھی انسان ہوں اور اسی نسبت سے سہو و خطا کا پتلا۔ مجھے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ جو تاریخیں میں نے تجویز کی ہیں۔ وہی اور صرف وہی درست ہیں بلکہ میری یہ التماس ہے کہ ماہرین میرے شبہات اور دلائل کے پیشِ نظر ان تاریخوں کی چھان بین کر کے کسی صحیح نتیجے پر نہ صرف خود پہنچیں بلکہ اپنے نتائج کو شائع بھی فرمائیں۔ تاکہ مجھ ایسے طلبا مستفید ہو سکیں اور یہ کہ بظاہر ایک معمولی لیکن اہم مسئلہ طے ہو جائے اب میں اصل مسئلے کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ فی الوقت مسئلہ زیرِ بحث نو دریافت مخطوطۂ دیوانِ غالب کی تاریخِ کتابت ہے لیکن اس کے لئے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ایک بالواسطہ طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہوں۔

مرزا غالب نے اپنی تاریخ پیدائش یکشنبہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ بتائی ہے غالباً ۱۹۶۹ء فروری سے جب سے کہ سید محمد حسین رضوی نے "غالب کی صحیح تاریخ ولادت" کے عنوان سے مضمون لکھا اور ۸ رجب ۱۲۱۱ھ کو غالب کی تاریخ ولادت قرار دیا تو اس مسئلے پر از سرِ نو غور ہونا شروع ہوا اور محققینِ غالب کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی۔ مذکورہ مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے مالک رام صاحب نے "عیارِ غالب" کے مقدمے میں لکھا:

غالب نے بلا مبالغہ بیسیوں جگہ اپنی ولادت کی تاریخ ۸ رجب ۱۲۱۲ لکھی ہے۔ پھر اُس نے کلیاتِ نظم فارسی کی تقریظ میں اپنی ایک رباعی درج کی ہے جس میں تاریخِ ولادت دو مرتبہ آگئی ہے۔ رُباعی ہے۔

غالب: چو ز ناسازیِ فرجام نصیب ؛ ہم بیم عدو دارم و ہم ذوق حبیب
تاریخِ ولادت من از عالمِ قدس ؛ ہم شورشِ شوق، آمد و ہم لفظ غریب،

شورشِ شوق اور غریب دونوں سے ۱۲۱۲ برآمد ہوتے ہیں۔ اسی طرح کسی موقع پر حضرت صاحبِ عالم مارہروی نے کہا کہ میری تاریخِ ولادت لفظ تاریخ سے نکلتی ہے (جس کے عدد ۱۲۱۱ ہوتے ہیں) تو غالب نے بطورِ مزاح (؟ مزاح) لکھا:- ہاتفِ غیب سُن کے یہ چیخا ؛ ان کی تاریخ میرا تاریخا،

یعنی تاریخ پر الف کا ایک عدد بڑھاؤ تو میری ولادت (۱۲۱۲) نکل آئے گی۔" (مقدمہ عیارِ غالب) چنانچہ "آج کل" جولائی ۱۹۶۹ء میں جب مولانا امتیاز علی عرشی نے غالب کے نو دریافت مخطوطے پر مضمون لکھا تو حاشیے میں مرزا کی تاریخِ ولادت کے باب میں فرمایا۔

"یہاں ضمناً یہ عرض کرتا چلوں کہ مرزا صاحب نے اپنی تاریخ پیدائش یکشنبہ ۸ رجب بتائی ہے۔ نیز کلیاتِ فارسی میں شائع شدہ زائچے میں اسے ۱۷۹۸ء کے مطابق کہا ہے۔ از روئے حساب نہ تو ۸ رجب کو یکشنبہ پڑتا ہے اور نہ تاریخ آغاز ۱۷۹۸ء کے مطابق ہوتی ہے مختلف اہلِ علم نے اس بارے میں مختلف توجیہیں کی ہیں۔ میری دانست میں مرزا صاحب کی تاریخ پیدائش ہشتم نہیں بلکہ ہیژدہم رجب ہے اس تاریخ کو یکشنبہ بھی تھا اور یہ ۷ جنوری ۱۷۹۸ء کے مطابق ہوتی ہے جو بقول غالب آغازِ سال قرار دیا جا سکتا ہے (ص ۳)

لیکن یہ آغازِ سال بہ قول غالب نہیں بلکہ بقولِ نواب ضیاء الدین احمد خاں ہے، ملاحظہ ہو:

"کلیاتِ فارسی طبع دوم میں جو زائچہ شامل ہے وہ بہت بعد کی چیز ہے۔ خدا معلوم یہ کس نے تیار کیا تھا، لیکن میں نے طبعِ دوم کا اصل مسودہ دیکھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کے عنوان کی عبارت (زائچہ ولادت سعادت مطالع جناب غالب مدظلہ العالی کہ بوقت شب چار گھڑی پیش از طلوعِ صبح روز یکشنبہ ہشتم رجب ۱۲۱۴ھ مطابق آغاز ۱۷۹۸ء روی دادہ) نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جن کا یہ نسخہ تھا۔ یوں بھی غالب اپنے نام کے ساتھ مدظلہ العالی اور جناب کے الفاظ کیونکر لکھ سکتے تھے۔" (مقدمہ عیارِ غالب) مندرجہ تبصرے سے برسوں پہلے نواب ضیاء الدین احمد خاں کے اسی بیان پر تنقید کرتے ہوئے مالک رام صاحب نے لکھا تھا۔

"اس تحریر میں کئی غلطیاں ہیں۔ ہجری تاریخ اور مہینا ٹھیک ہے، البتہ سال میں کاتب کی مہربانی سے ۱۲۱۲ کی جگہ ۱۲۱۴ لکھا گیا ہے۔ یہ ہجری تاریخ جو یقیناً میرزا نے انھیں بتائی ہوئی درست ہے۔ اس کی تائید اور کئی جگہ سے ہوتی ہے باقی سب باتیں نیر رخشاں نے اضافہ کیں، اور بدقسمتی سے سب غلط ہیں۔ دن یکشنبہ نہیں بلکہ چہار شنبہ تھا۔ عیسوی سال ۱۷۹۷ چاہئے اور وہ بھی اواخر۔ غالب نے اپنے جو حالات تذکرہ مظہر العجائب کے لئے لکھے تھے۔ (احوالِ غالب بلاک محولہ فوق) وہاں نیر رخشاں ہی کا تتبع کرتے ہوئے انہوں نے بھی یومِ ولادت یکشنبہ لکھ دیا ہے، اس سلسلے میں بنیادی چیز ۸ رجب ۱۲۱۲ کی تاریخ ہے۔" (ذکرِ غالب طبع چہارم حاشیہ ص ۲۵)

لیکن مولانا امتیاز علی عرشی نے اس کے برعکس یکشنبہ کے دن کو زیادہ اہم گردانا ہے اور اس سے جو نتائج اخذ کئے ہیں۔ ان کا اظہار ہماری زبان موشوعہ ۸ جولائی ۱۹۶۹ء

میں ذرا وضاحت سے کیا۔ فرماتے ہیں:

"مرزا غالب نے اپنی تاریخ پیدائش یکشنبہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ بتائی ہے نیز کلیات نظم فارسی میں شامل زائچے میں اسے آغاز ۱۷۹۸ کے مطابق کہا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ . . . . از روئے حساب نہ تو ۸ رجب کو یکشنبہ پڑتا ہے اور نہ یہ تاریخ آغاز ۱۷۹۸ کے مطابق ہوتی ہے . . . میں نے دو سال ہوئے ایک مضمون اس موضوع پر لکھا تھا . . . مگر اس وقت بھی اس اختلاف کا کوئی حل پیش نہیں کر سکا تھا۔

"حال ہی میں پھر یہ مسئلہ میرے زیر غور رہا ہے اور ایک حل سمجھ میں آیا وہ یہ کہ غالب کی تاریخ پیدائش ہشتم نہیں ہیژدہم رجب ہے اور مرزا صاحب کو اپنے بزرگوں سے سُنی ہوئی تاریخ میں التباس ہو گیا یعنی انھیں ۱۸ کی بجائے ۸ تاریخ یاد رہ گئی چونکہ سال عیسوی کا آغاز وہ نہ بھولے تھے اس لئے مذکورہ التباس کا پتہ چل گیا چنانچہ از روئے تقویم ۱۸ رجب کو یک شنبہ بھی تھا اور یہ ۷ جنوری ۱۷۹۸ء کے مطابق بھی ہے جسے بقول غالب آغاز ۱۷۹۸ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی التباس کی مثالیں اگر عام نہیں تو نادر بھی نہیں۔"

اصل یہ ہے کہ ایسی مثالیں نہ صرف نادر بلکہ معدوم ہیں ۱۸ کے ۸ یا ۸ کے ۱۸ رہنے کا کوئی قرینہ نہیں۔ یہ صرف ایک صورت میں ممکن ہے یعنی ۱۸ بزرگوں سے سُنا نہ ہو بلکہ کسی زائچے میں پڑھا ہو۔ اس صورت میں ایک کا ہندسہ دھندلا جانے یا مٹ جانے یا سرسری طور پر دیکھنے سے نظر چوک سکتی ہے اور ۱۸ کو ۸ پڑھا جا سکتا ہے۔ جہاں تک آغاز ۱۷۹۸ء کا تعلق ہے یہ بھی مشکوک ہے۔ آغاز سال یکم جنوری سے ہوگا نہ کہ ۶، ۷ یا ۸ جنوری سے، اس ضمن میں مالک رام صاحب کا قول زیادہ قرین قیاس ہے کہ یہ باتیں نواب ضیاء الدین احمد خاں نے خود اضافہ کی ہیں۔ تاہم عرشی صاحب کی حالیہ . . .

تحقیق کی روشنی میں (ذرا سی ترمیم کے ساتھ) یہ ممکن ہے کہ مرزا غالب نے جس زائچے سے اپنی تاریخ ولادت پڑھی اس میں ایک کا ہندسہ دھندلا گیا اور انہوں نے روا روی میں ۱۸ کو ۸ پڑھ لیا۔ اس صورت میں ان کی مشہور تاریخ ولادت پر دس دن کا اضافہ کرنا ہوگا اور جو نتیجہ برآمد ہوگا وہ عرشی صاحب کے بیان سے مختلف ہوگا۔ اس لئے مولانا عرشی کا یہ جملہ "از روئے حساب نہ تو ۸ رجب کو یکشنبہ پڑتا ہے . . . الخ" درست نہیں۔ یہ از روئے حساب کی بجائے از روئے تقویم ہونا چاہئے جیسا کہ محولہ بالا اقتباس کے خط کشیدہ جملے میں ہے اگر ۸ رجب کو چہار شنبہ تھا (اور یہ ہر لحاظ سے درست ہے، از روئے تقویم بھی، از روئے حساب بھی) اور یہ مطابق تھا ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کے، اس میں دس دن جمع کیجئے۔ حاصل جمع ۱۸ رجب روز شنبہ ۱۲۱۲ھ مطابق ۶ جنوری روز شنبہ ۱۷۹۸ء ہوگا نہ کہ یک شنبہ ۷ جنوری[1]

اب نسخہ عرشی زادہ میں غالب کی تاریخ ولادت کی طرف آیئے جناب عرشی زادہ نے مرزا کی تاریخ ولادت اس طرح درج کی ہے۔

تاریخ پیدائش: اگرہ، یک شنبہ ۱۸ رجب ۱۲۱۲ھ/ ۷ جنوری ۱۷۹۸ء

اور حاشیے میں لکھا ہے کہ تاریخ پیدائش مولانا عرشی کی تحقیق کے مطابق درج کی گئی ہے۔ خود مولانا عرشی نے اسے کسی تقویم سے مطابق کیا ہے۔

**ایک شبہ:** اگرچہ مولانا عرشی نے یہ نہیں لکھا کہ انہوں نے اس تاریخ کی مطابقت کے لئے کس تقویم کو پیش نظر رکھا ہے لیکن قیاس یہ ہے کہ ان کے پیش نظر وہی تقویم ہو جس سے بعد میں جناب عرشی زادہ نے ۱۴ رجب سہ شنبہ کا سنہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے اور اگر یہ قیاس درست ہے تو اس تقویم کا معتبر ہونا مشکوک ہے اس لحاظ سے ۱۴ رجب کو سنہ شنبہ کا ۱۲۳۱ھ میں واقع ہونا مشکوک بلکہ غلط ہے۔ اکبر علی خاں صاحب اس پر مزید غور فرمائیں، نو دریافت دیوان کی تاریخ کتابت کے سلسلے میں انہیں نہ صرف مرزا کے تخلص کی تبدیلی کی تاریخ پر مندرجہ دلائل کی روشنی میں غور کرنا ہوگا بلکہ کسی زیادہ مستند اور معتبر تقویم سے اس کی مطابقت بھی کرنا ہوگی۔ جیسا کہ بیان ہوا مرزا غالب کی مروجہ تاریخ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ روز چہار شنبہ ہے۔ تتھی پترک میں یہ دن تاریخ اور مہینا سب مطابق ہے۔ اس لئے کم از کم ۱۲۱۲ کی حد تک تتھی پترک معتبر رہا۔ چنانچہ ۷ جنوری ۱۷۹۸ اور ۱۸ رجب ۱۲۱۲ کو بھی شنبہ ہے یک شنبہ ۷ جنوری اور ۱۹ رجب کو پڑتا ہے جو از روئے حساب بھی درست اور تتھی پترک کے لحاظ سے بھی۔ مجھے ۱۲۳۱ھ میں رونما ہونے والے کسی دوسرے واقعے کی کوئی معتبر تاریخ نہیں مل سکی۔

بہو بیگم صاحبہ کا انتقال ۲۵ محرم ۱۲۳۱ھ کو ہوا لیکن اس تاریخ کی تصدیق مختلف

---

[1] ۸ جولائی ۱۹۶۹ء کے ہماری زبان میں مولانا عرشی کا مراسلہ جس روز میری نظر سے گزرا میں نے اسی وقت مرزا کی رائج تاریخ ولادت میں دس روز کا اضافہ کیا تو معلوم ہوا کہ انگریزی تاریخ ۶ جنوری ہونی چاہئے۔ مولانا عرشی کی تحقیق کی روشنی میں جس کا ذکر ابھی آیا ہے جب میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ مولانا کو دس دن کے جوڑ میں سہو ہوا ہے اصلاً ۶ جنوری ہونا چاہئے۔ چونکہ مولانا کا جملہ از روئے تقویم میرے ذہن سے اتر گیا تھا اس لئے میں نے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ اب جب کہ ضرورت پڑی تو میرے ذہن نے ۶ جنوری کو جو خود میرے حساب کے مطابق تھی۔ مولانا کی تحقیق سے منسوب کر دیا۔ نسخہ عرشی زادہ میں جب ۷ جنوری کو مولانا عرشی کی تحقیق سے منسوب پایا تو مولانا کے مضمون کی تلاش ہوئی۔ اور جب اس مضمون میں بھی ۷ جنوری لکھا پایا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک ذہنی التباس تھا۔

کتب تواریخ سے نہیں ہوسکتی ۱۵ محرم کو از روئے حساب بُدھ کا دن تھا۔ ہمائے تقمی پترک میں بھی یہی ہے لیکن سوانح حالات سلاطین اودھ میں جمعرات لکھا ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں اکثر غلط دن درج ہیں تاہم احتیاط کا تقاضا ہے کہ جب تک کوئی دوسری تاریخ نہ ملے اس پر اعتبار نہ کیا جائے لیکن میں نے ابھی از روئے حساب کی بات کی ہے اتفاق سے زیرِ نظر مضمون کی تکمیل کے بعد مجھے ایک مختصر رسالہ جسے مصنف ہلالیہ کا نام دیتا ہے اور جو نول کشو پریس سے ۱۸۸۷ء میں طبع ہوا ہے، دستیاب ہوگیا اس میں ایک نقشہ دیا ہے جو ۱۲۴۹ھ سے ۱۲۶۵ھ تک کے سنین کو محیط ہے۔ نقشے کے ساتھ ایک ضابطہ بھی بیان کیا ہے جس کی رُو سے ان برسوں میں پڑنے والے کسی بھی مہینے میں رویت ہلال کا دن معلوم کرسکتے ہیں۔ میں نے اس ضابطے کا اطلاق مذکورہ سنین کے علاوہ دوسرے سنین پر کیا تو معلوم ہوا کہ قاعدہ حیرت انگیز طور پر درست ہے میں نے اس قاعدے کی مدد سے ۱۲۲۸ھ سے ۱۲۳۶ھ تک ہر سال میں ۱۴ رجب کو پڑنے والا دن نکال کر دیکھا اور ان کی مطابقت تقمی پترک میں دی ہوئی تاریخوں اور دنوں سے کرکے اُن کی صحت کی تصدیق کرلی ہے۔ ذیل میں یہ نقشہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ ماہرین اسے دیکھ کر کسی صحیح تقویم کی مدد سے ان تاریخوں اور دنوں کی صحت و مطابقت طے کرسکیں اس ضابطے کے باب میں مجھے صرف اتنا اور کہنا ہے کہ میں نے بلا مبالغہ بیسیوں تاریخوں میں پڑنے والے دنوں پر اس کا اطلاق کیا اور ایک بھی غلطی واقع نہیں ہوئی۔ مثال میں صرف ایک تاریخ کا ذکر کروں گا۔ مالک رام صاحب نے غالب کے یومِ وفات کے لئے کہا ہے کہ ۲ ذیقعد ۱۲۸۵ھ بروز دوشنبہ واقع ہوئی لیکن تقویم میں نہ یہ ۲ ذی قعدہ ہے اور نہ دوشنبہ کا دن۔ بلکہ ہم عصر لوگوں نے چاند دیکھ کر شہادت دی ہوگی کہ آج ۲ ذی قعدہ ہے۔ میں نے ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ کا دن اس ضابطے کی رُو سے نکالا تو معلوم ہوا کہ یہ دوشنبہ ہی تھا اس لئے مجھے یقین ہے کہ ذیل کے نقشے میں دی ہوئی تاریخیں اور ایام درست ہیں۔

| سال | مہینا | تاریخ | دنے |
|---|---|---|---|
| ۱۲۲۸ھ | رجب | ۱۴ | سہ شنبہ |
| ۱۲۲۹ھ | 〃 | 〃 | شنبہ |
| ۱۲۳۰ھ | 〃 | 〃 | پنج شنبہ |
| ۱۲۳۱ھ | 〃 | 〃 | دوشنبہ |
| ۱۲۳۲ھ | 〃 | 〃 | شنبہ |
| ۱۲۳۳ھ | 〃 | 〃 | چہار شنبہ |
| ۱۲۳۴ھ | 〃 | 〃 | یکشنبہ |
| ۱۲۳۵ھ | 〃 | 〃 | جمعہ |
| ۱۲۳۶ھ | 〃 | 〃 | سہ شنبہ |

جیسا کہ مندرجہ نقشے سے ظاہر ہے ۱۴ رجب کو سہ شنبہ صرف دو برسوں میں واقع ہوا ہے یعنی ۱۲۲۸ھ اور ۱۲۳۶ھ میں۔ اب یہ ماہرین پر ہے کہ وہ نو دریافت دیوانِ غالب کی تاریخ کتابت ۱۲۲۸ھ مانیں یا ۱۲۳۶ھ۔ فی الحال کسی مزید ثبوت یا مواد کی عدم دستیابی کی صورت میں ۱۲۲۸ھ قرینِ قیاس ہے۔

ان تاریخوں پر اکبر علی خاں صاحب خصوصاً غور فرمائیں اگر مرزا کی تاریخ ولادت سے (جسے کم از کم از روئے حساب غلط فہمی قرار دیا جاسکتا ہے) انہیں اتفاق ہو تو وہ نسخہ عرشی زادہ کے آئندہ اڈیشن میں اس کی تصحیح کردیں۔ اور اسی طرح تاریخ کتابت دیوان کی بھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

## غزل

حیات لکھنوی

میں زندگی کی تمنا میں در بدر تنہا
خبر نہیں کہ گیا ہوں کدھر کدھر تنہا
کچھ آج کل ہے مری یوں گزر بسر تنہا
کہ قافلے میں ہو خود جیسے راہبر تنہا
بس ایک بار مٹا دو ملالِ تنہائی
پھر اس کے بعد رہوں چاہے عمر بھر تنہا
نصیبِ عشق ہے آوارگی و کج راہی!
بھٹک رہا ہوں میں کب سے اِدھر اُدھر تنہا
میں زندگی کے تصوّر سے کیوں نہ گھبراؤں
کہ جیتے جی مجھے درپیش ہے سفر تنہا
گزارنے کی حدوں تک گزار آیا ہوں
میں امتحانِ محبت کی رہ گزر تنہا
مرا مذاق اُڑایا ہے اہلِ دُنیا نے
ترے بغیر گیا ہوں کہیں اگر تنہا
کچھ اس لئے بھی گراں ہے رہائیٔ زنداں سے
کہ میرے بعد رہیں گے یہ بام و در تنہا
وہ رنگِ لالہ و گل ہو کہ نورِ ماہ و نجوم
کرشمہ ساز ہے سب میں تری نظر تنہا
ترے بغیر ملی بھی تو یوں ملی ہے خوشی
کہ جیسے روئے کوئی اپنے حال پر تنہا
حیات جب سے ہوا ہے کوئی جدا مجھ سے
تمام شہر مجھے آتا ہے نظر تنہا

# شیخ یعقوب صرفی کشمیری

غلام نبی خیال

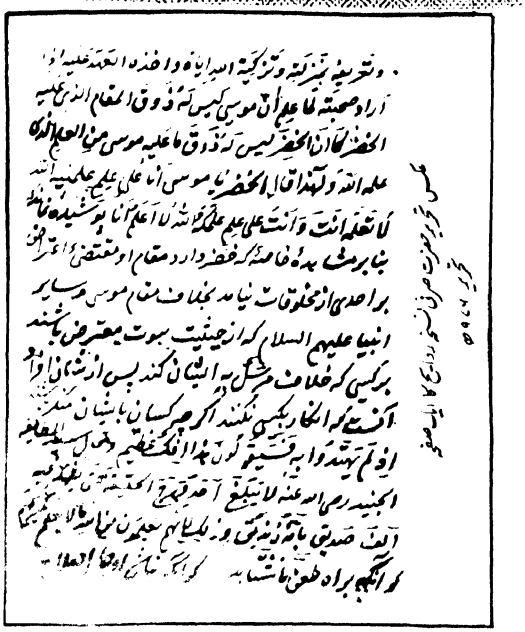

- از فنون شعر آگاہ و بگوناگوں دانش آشنا بود ـــــ ابوالفضل
- مجمع فضل و کمالات ـــــ مُلّا عبدالقادر بدایونی
- ملک سخن راست از و فتح یاب ـــــ مُلّا محسنے فانی
- یک سخنش فاتحہ صد کتاب

حضرت صرفی کی پیدائش کے وقت سرزمین کشمیر میں شاہ میری خاندان کے بارہویں بادشاہ محمد شاہ کی حکومت تھی جو چار سال قبل ۱۵۱۷ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ صرفی کا زمانہ وہ زمانہ تھا کہ انہوں نے اپنی عمر کے پچہتّر سال یعنی ۹۹۲ھ تک شاہ بریوں کے چھ حکمرانوں اور چک خاندان کے دو حکومت کے بھی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ ۹۹۴ھ میں مغلیہ حکام نے کشمیر کو اپنی سلطنت کے ساتھ ملا دیا اور ریاست میں مکمل طور پر مرکز کی حکومت قائم ہو گئی۔

اس عرصہ میں کشمیر کے نظام میں اتنی کمزوریاں اور اس نوع کی خامیاں پیدا پیدا ہو چکی تھیں کہ کوئی بھی فرمان روا شکل سے چند سال تک تخت پر قائم رہ سکتا۔ کئی بادشاہ اپنی بادشاہی کو صرف چند مہینوں تک سنبھالنے میں کامیاب ہوئے اور چکوں کے ایک حاکم حسین شاہ کو محض چار دن حکومت کرنا نصیب ہوئی۔ اس افراتفری کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ ملک حکام کے ہاتھوں باہمی رسہ کشی کا میدان بنا ہوا تھا اور وہ ہر لحظ ایک دوسرے کو مار گرانے کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ اس خانہ جنگی کے نتیجہ کے طور پر ملک کی اقتصادیات اور اس کے تحفظ اور عوامی خوش حالی کی طرف اُن کی توجہ مبذول نہ ہو سکی جس کی وجہ سے لوگ بھی اپنے حاکموں سے بدظن ہوتے گئے۔ عوام کی رگ رگ میں ایک ایسی غیر یقینیت اور تنفر کے جراثیم سرایت کرتے گئے کہ انہوں نے ہر صاحبِ اقتدار کو شک اور حقارت کی نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔

حضرت شیخ محمد یعقوب گنائی متخلص بہ صرفی ۹۲۸ھ مطابق ۱۵۲۱ء سری نگر (کشمیر) کے ایک آسودہ حال اور با وقار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کی ولادت کا سال "شیخ جی" سے بھی نکلتا ہے۔ صرفی کے اسلاف اعیانِ کشمیر میں سے تھے۔ اُن کے جدِ امجد سلطان زین العابدین کے دربار میں ایک عزت دار عہدے پر فائز تھے۔ صرفی کے والد کا نام میر حسن اور گنائی لقب تھا۔ وہ بھی شاہ میری دور میں درباری اور رئیس تھے۔ صرفی قبیلہ عاصی سے تھے اور لقب کے لحاظ سے آپ گنائی کہلاتے صرفی کے قبلہ گاہ میر حسن کے سات فرزند میر کمال۔ میر یعقوب۔ میر محمد شریف میر نوروز۔ میر محمد میر ابراہیم اور میر حیدر تھے۔ ان میں سے پانچ صرفی سے چھوٹے تھے اور اول الذکر کی عمر ان سے زیادہ تھی۔

ابتداء میں صرفی کی تربیت گھر پر خود اُن کے والد نے کی ؎

پدر یکہ مشفق بمن بودہ است ؛ میر علم و آداب فرمودہ است ـــ
بہ تعلیم خود بندہ را کرد خاص ؛ ز تشویش اُستاد و مکتب خلاص

صرفی نے چھ سال کی عمر میں گھر میں قرآن حفظ کیا۔ مولانا غلام رسول لاہوری کا بیان ہے کہ "در عمر دہ سالگی حفظ قرآن نمود" جب انہوں نے آٹھویں سال میں قدم رکھا تو فارسی زبان میں شاعری شروع کی اور پہلے پہل والد صاحب ہی سے اشعار پر اصلاح لیتے رہے۔ "مغازی النبی" میں خود فرماتے ہیں ؎

چو در سالِ ہشتم نہادم قدم ؛ ز طبعِ رواں گشت شعرِ عجم
پدر کرد اصلاحِ اشعار من ؛ باصلاح بودے مدد گار من

---

"شہنامہ کشمیر" کے مصنف عبدالوہاب شائق کا کہنا ہے کہ صرفی نے اوّل اوّل قصائد اور نعتیں لکھیں ؎

چو شد ہشت سالہ تصائد لگفت
بہ لغت پیمبر گہر ہا بسفت

---

خواجہ حبیب اللہ نوشہری نے "مقاماتِ حضرتِ ایشاں" میں بیان کیا ہے کہ صرفی نے ان ہی دنوں وہ غزل لکھی جس کا مطلع ہے۔

اے رُخِ مہ آئینہ روئے توام
میلِ خوباں در ہوائے روئے نیکوئے توام

ان دنوں مولانا جالی کے شاگرد ملا محمد آنی کشمیر میں مدرسۃ العلوم کے سربراہ تھے۔ جن کا شمار مولانا جالی کے ممتاز شاگردوں میں ہوتا تھا۔ صرفی کو والد نے ان کی خدمت میں بھیج دیا اور انہوں نے ملا آنی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ مولانا آنی سے صرفی نے علم معما میں مہارت حاصل کی۔ اور اس کم عمری ہی میں معما پر ایسے ایسے اشعار قلم بند کئے کہ استاد بھی حیران رہ گیا۔ خواجہ حبیب نے ان اشعار کی تعداد بیس بتائی ہے ؎

بیست بیت از معما گفت ؛ گفت اما بدیہہ آنرا گفت

شیخ صرفی نے علم صرف و نحو میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ اسی مناسبت سے حضرت آنی نے انہیں صرفی تخلص کرنے کی ہدایت کی۔ جب تحصیل علوم میں صرفی نے آنی کے سامنے اپنے جوہر کمال اور قابل داد صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تو استاد نے شاگرد کو "جامی ثانی" کا لقب عطا کیا۔ اس کے بعد آنی نے مولانا میر رضی الدین سے صرف و نحو میں مہارت نامہ حاصل کیا اور درس فقہ میں بھی ان سے استفادہ کیا۔ پھر ملا حافظ بصیر خنجہ بھونی کے شاگرد ہوئے۔ صرفی نے اس عالم سے علم صوفیہ منطق، بیان و معانی سیکھے۔ ۹۲۶ھ میں جب ملا بصیر نے سری نگر میں وفات پائی تو شاگرد رشید نے ایک پُر اثر مرثیہ لکھا جس کا آخری شعر یوں ہے ؎

"آں حافظ علم و ادب بود بصیر از فضل رب
تاریخ نوشتش زاں سبب شد عالم تفسیر دان"

اُنیس سال کی عمر تک ان تمام علوم سے بہرہ ور ہونے کے بعد صرفی زیادہ تر مطالعہ میں مشغول ہو گئے۔ لیکن اسی زمانے میں بدقسمتی سے اُن کا اٹھنا بیٹھنا چند اوباش قسم کے نوجوانوں سے ہوا جن کی صحبت سے صرفی کے اوصاف حمیدہ بگڑنے لگے۔ اسی دوران میں ہادیٔ حق نے اُن کی ہدایت کی اور ایک روز جب کہ وہ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے تو سنت ادا کرنے کے بعد دوسری رکعت کو اُٹھے ہی تھے کہ بیک زور سے نعرہ مارا اور بے ہوش ہو کر دھڑام سے زمین پر گر پڑے۔ بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے اُس عالم میں قطب ربانی حضرت سید میر علی ہمدانی کو سید خلیل اللہ محتسب کے ساتھ اپنے سامنے جلوہ گر ہوتے دیکھا تھا۔ حضرت رح نے محتسب کو حکم دیا تھا کہ وہ اس گریز پا کے پاؤں کاٹ دے تاکہ وہ دوبارہ راہِ معبود سے بھٹکنے نہ پائے۔ چنانچہ حضرت خلیل محتسب نے حکم کی تعمیل میں اُن کے پاؤں پر شمشیر سے ضرب لگائی تھی۔ اور اہل جماعت نے دیکھا کہ شیخ صرفی کے پاؤں واقعی زخمی ہوئے ہیں اور ان کا جامہ خون آلود ہو رہا ہے۔ چند روز بعد عالم خواب میں حضرت امیر کبیر رح پھر اُن کے سامنے آئے اور صرفی کو حکم دیا کہ وہ حضرت شیخ حسین خوارزمی رح کی خدمت میں پہنچ کر اُن سے تربیت لیں۔ حضرت شیخ کا قیام اُن دنوں خوارزم میں تھا۔

صرفی نے اس حکم کی تعمیل میں خوارزم کے سفر کا عزم کیا۔ والدین اور رفیقوں نے اس کٹھن سفر کی صعوبتوں اور دشوار گزار راستے کے خوف و خطر سے خبردار کیا لیکن جب صرفی اپنے ارادے پر بدستور قائم رہے تو انہوں نے بھی بادلِ ناخواستہ اجازت دے دی۔

حضرت صرفی اس طویل سفر پر سرما کے دنوں میں روانہ ہوئے وہ اپنے حقیقی برادر میر نوروز، یوسف کوکہ اور دو خدمت گاروں بوٹہ صوفی اور شیخ بہرام کو ہمراہ لے گئے۔ یہ چھوٹا موٹا قافلہ جب خوارزم پہنچا تو اُن دنوں جاڑے کا موسم زوروں پر تھا اور برف و باران اور تیز ہوا کے دن تھے۔ حضرت شیخ نے سب سے پہلے صرفی کو خانقاہ کے مطبخ کے لئے جنگل سے لکڑی لانے کے کام پر مامور کیا۔ کچھ عرصہ جب یہ کام بطریق احسن انجام دیتے رہے تو مرشد نے ان کو چلہ کش درویشوں کے غسل خانے صاف کرنے پر لگایا۔ صرفی یہ ذمہ داری بھی بڑی تن دہی کے ساتھ اٹھاتے رہے۔ پھر انہیں لنگر کے لئے پانی لانے پر تعینات کیا گیا۔ آخر میں صرفی نے اُستاد کے کہنے کے مطابق خانقاہ ہی کے ایک تنگ حجرے میں چلہ کشی اختیار کی اور حضرت شیخ سے علوم و فنون اور روحانی و دینوی مسائل میں جانکاری حاصل کرتے رہے۔ اس دوران میں حضرت خوارزمی نے زیارت حرمین کے لئے مکہ معظمہ کا عزم سفر کیا تھا اور صرفی بھی مرشد سے اجازت لے کر اپنے وطن روانہ ہوئے۔

حضرت صرفی جتنی دیر سفر میں رہے، اس دوران میں اُن کی شہرت کشمیر کے گوشے گوشے میں پھیل رہی تھی اور لوگ غائبانہ طور ان کے علمی و روحانی کمالات کا چرچا سُن کر گرویدہ ہو رہے تھے۔ چنانچہ جب آپ دارِ کشمیر ہوئے تو عقیدت مندوں نے جوق در جوق ان کی خدمت میں آنا شروع کیا اور صرفی انہیں اپنے ارشادات سے مستفید کرتے رہے۔

کشمیر اب بھی افراتفری میں مبتلا تھا اور ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ حضرت صرفی ملکی نظام کی اس برہمی کے مخمصے میں پھنسنے سے بچنے کی خاطر

سری نگر کے علاقہ درگجن میں شیخ سلطان کشمیری کی تعمیر کردہ خانقاہ میں جا گزیں ہوئے۔ یہاں انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری کیا اور اکثر طالبین یہیں آکر اُن سے فیض یاب ہوا کرتے۔ اِن ایام کا ذکر ہے کہ حاکم کشمیر یعقوب شاہ چک نے وزیر اعظم یوسف میر کے بیٹے میر محمد کو حکم دیا کہ وہ حضرت صرفی کو قتل کرے۔ میر محمد جب رات کے وقت خانقاہ میں پہنچا تو دیکھا کہ حضرت تہجد میں مشغول ہیں۔ صرفی نے سلام پھیرتے ہی میر محمد کی طرف نظر اٹھا کر اس سے کہا کہ وہ اپنا کام کیوں نہیں کرتا؟۔ حضرت کا چہرہ جلال اور روحانی نور سے منور چہرہ دیکھ کر میر محمد مبہوت رہ گیا اور دوسرے دن حضرت سے معافی مانگ کر اُن کے حلقہ ارادت میں شامل ہوا۔ ماحول کی اس ابتری اور زبوں حالی سے دل برداشتہ ہو کر صرفی نے پھر کشمیر سے ہجرت کا قصد کیا اور میر محمد ہی کو اپنا خلیفہ اوّل اور جانشین مقرر کر کے آپ دوبارہ کشمیر سے روانہ ہوئے۔ کچھ دیر گجرات میں ٹھہرنے کے بعد صرفی قندھار پہونچے اور پھر خراسان کی راہ لی۔ پھر کابل، بدخشاں اور بلخ و بخارا کا سفر کر کے جب شیخ صرفی سمرقند پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرت خواجہ زیارت حرمین الشریفین کو گئے ہیں۔ صرفی بھی یثرب روانہ ہوئے اور روضۂ رسول اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اس سفر میں آپ مشہد بھی گئے جہاں حضرت امام شاہ علی موسیٰ رضاؑ کا روضۂ پاک دیکھا۔ جام میں حضرت شیخ احمد جامی سے فیض پایا۔ انہی ایام میں حضرت صرفی نے بہت سے علمائے دین اور اولیاء اور مشائخ سے ملاقات کر کے ان کی صحبت کا شرف پایا۔ ایران میں حضرت صرفی نے شاہ طہماسپ سے ملاقات کی اور اُسے امورِ دینی اور فرمانِ الٰہی سے آگاہ کیا یہاں سے وہ پھر حج کو گئے اور مکہ معظمہ میں شیخ المحدثین حضرت علامہ شہاب الدین احمد بن حجر المکیؒ اور حضرت شیخ عبدالعزیز سے تفسیر حدیث کی سند حاصل کی اور پھر مدینہ مطہرہ تشریف لے گئے۔ اس سفر میں شیخ صرفی نے دیگر علماء و فضلاء کے علاوہ فتح پور سیکری میں شیخ الاسلام حضرت شیخ سلیم چشتیؒ سے بھی ملاقات کی اور سلسلہ چشتیہ کے اس عالم و فاضل کے ارشادات سے بہرہ ور ہوئے۔ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے اسی زمانے میں حضرت صرفی سے سرہند میں حدیث اور تصوف میں درس لیا۔

حضرت صرفی کی کشمیر میں واپسی کے زمانے میں بھی والیانِ کشمیر کی خانہ جنگیوں سے ملک میں تباہی کا بازار گرم تھا۔ یعقوب شاہ چک نے مخالفوں کو رفع دفع کرنے کے ساتھ ہی کسی قدر تنگ نظری کا ثبوت دیا اور بہت سے معاملوں میں اختلافات کو مذہبی نقطۂ نگاہ سے جانچا جس کی وجہ سے خاص کر اہل سنّت والجماعت اس سے متنفر ہو گئے۔ اور انہوں نے سلطان کو گرا دینے کی راہیں نکالنے کے لئے سازشیں کرنا شروع کیں۔ نتیجہ کے طور پر سرکار کی مخالفت کیلئے ایک خفیہ سیاسی جماعت وجود میں آگئی۔ جس میں ریاست کے وہ اہل قلم اور فضلاء اور مشائخ شامل ہوئے جو یعقوب شاہ کے طریقۂ کار سے اختلاف رکھتے ہوئے اور اس کی سیاسی پالیسیوں کے مخالف ہو کر کشمیر کے نظام میں اہم تبدیلیوں کے خواہاں تھے۔ اس گروہ کی سرکردگی صرفی کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد وہ چند ہم رائے مصاحبوں کو ساتھ لے کر اس خیال سے آگرہ چلے گئے۔ کہ دربار اکبری میں کشمیر کو چک حکومت کی فرمانروائی سے آزاد کروانے کی طرف کوئی خاطر خواہ قدم اٹھائیں۔ صرفی کے ہم عمر خالہ زاد بھائی حضرت بابا داؤد خاکی بھی ملتان سے آکر اس وفد کے ساتھ آملے۔ وفد کے دیگر اراکین میں چند رخاں، بہرام نایک اور فتح خاں شامل تھے وفد نے اکبر شاہ کو تسخیر کشمیر کی ترغیب دی اور اپنی طرف سے اُسے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ کشمیر پر دھاوا بولنے اور اُسے مرکز کے ساتھ ملانے کی خاطر وفد نے اکبر کے سامنے چند شرائط پیش کیں جنہیں اکبر نے فوراً قبول کیا۔ یہ معاہدہ یوں تھا۔

(الف) ریاست میں عبادت کرنے کی مکمل آزادی ہوگی اور مذہبی معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کی جائے گی۔

(ب) تجارتی اشیاء کی خرید و فروخت کا کام آزادانہ طور پر ہوگا اور اناج کے نرخ مقرر کرنے میں کوئی مداخلت نہیں ہوگی۔

(ج) کشمیریوں کو غلام نہیں بنایا جائے گا اور نہ ہی کشمیری عورتیں کنیزیں بنائی جائیں گی۔

(د) اہل کشمیر سے نہ تو بیگار ہی لی جائے گی اور نہ ہی انہیں کسی طریقے پر پریشان کیا جائے گا۔

(ہ) جن کشمیریوں نے ملک میں افراتفری پھیلانے والے عناصر کو ہوا دی ہے۔ ان کا ملکی نظام سے بلاواسطہ یا بالواسطہ کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ ان شرائط کے تحت اکبر نے پہلے مرزا شاہ رُخ کی سرکردگی میں ایک فوج کشمیر روانہ کی پھر فوج کی کمان مرزا قاسم خاں میر بحر یہ کو سونپ دی گئی۔ یہ فوج چالیس ہزار سواروں اور بیس ہزار پیادوں پر مشتمل تھی۔ جنگ میں ایک بار مغلوں کو شکست فاش ہوئی تو چک سرداروں کے ہاتھوں صرفی کے قید ہونے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ یعقوب شاہ نے آخر کار شکست کھائی اور اس طرح سے سلطنت کشمیر ذی قعدہ ۹۹۴ھ بموجب جولائی ۱۵۸۶ء میں مغلیہ حکومت کے ساتھ مدغم ہو گئی۔

اکبر کی عملداری کشمیر میں شروع ہونے کے بعد حضرت صوفی نے کسی قدر اطمینان کا سانس لیا اور پھر سے حرمین کی زیارت کا ارادہ کیا۔ اس سفر میں انہوں نے کم و بیش ایک سال گزارا اور جب واپس آئے تو اپنے ساتھ مختلف ملکوں سے تفسیر، فقہ و

وحدیث اور دیگر علوم کی بیش بہا کتابیں اور مشاہیر علماء کی چیدہ چیدہ تصانیف یہاں لائے۔ کہا جاتا ہے کہ صرفی کے ذاتی کتب خانے میں نوادرِ روزگار، مخطوطات کی تعداد پندرہ ہزار سے زیادہ تھی۔

اپنی عمر کے پچھتر سال بسر کرنے کے بعد حضرت صرفی نے ۱۲ ذی قعدہ ۱۰۰۳ھ بمطابق ۲۵ جولائی ۱۵۹۵ء بروز پنج شنبہ رات کو نمازِ عشاء ادا کرتے ہوئے انتقال کیا۔ اُن کی وفات کا سال "شیخ ام بود" "یدحافظ" "شیخ الباطن" "فخر الانام" اور "افضل انام" سے نکلتا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے جب اُن کی رحلت کی خبر سنی تو مرثیہ کا یہ قطعہ کہا ؎

یاراں ہمہ رفتند رہِ کعبہ گرفتند
ماست قدم بردرِ خمار بما ندیم!
ازنکتۂ مقصود نشد فہم حدیثے
لادین ولا دنیائے بکار بما ندیم

حضرت صرفی نے پڑھنے لکھنے میں اپنی زندگی گزار دی جب فارغ ہوئے تو اپنے ہم عصر علماء سے دینی و مذہبی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا کرتے اور اپنے شاگردوں کو درس دیا کرتے۔ اُن کے جامع الکمالات ہونے کی شہرت اُن کی زندگی ہی میں دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ چنانچہ کشمیر اور بیرونِ کشمیر کے ہزاروں طالبین اور شوقین شاگردوں نے اُن کی اُستادی سے فیض اُٹھایا۔ اس طرح سے اُن کے حلقۂ ارادت میں ایک ہزار سے زیادہ طلباء شامل ہے۔

حضرت صرفی اپنے عہد کے اُن بلند پایہ عالموں اور مفکروں میں شمار ہوتے تھے جو اپنی خداداد صلاحیتوں سے جس مضمون پر قلم اُٹھاتے ہیں تو اس کی فنی اور علمی باریکیوں کی گرہیں کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ صرفی نے تصوف و معرفت، دین و مذہب علم تفسیر و حدیث (اور شعر و شاعری) غرض ہر سنجیدہ مضمون پر خامہ فرسائی کی اور اپنے کمالِ تفکر اور ذہنی اُپج کی بدولت ہم عصر علماء اور اصحابِ قلم میں اس درجہ ممتاز ہوئے کہ "آئینِ اکبری" کے مصنف کے بقول "در تمام انواع شعر و علوم مختلف تسلط کامل داشت"۔

صرفی کی تصانیف کی تعداد دُو درجن کے قریب ہے جن میں سے اکثر تاحال زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی ہیں صرف قلمی نسخوں کی صورت میں کہیں کہیں منتشر حالت میں موجود ہیں۔ اس فہرست سے صرفی کی ان تصانیف کو خارج سمجھنا چاہئے جن کے مسودات یا تو زمانے کی دست برد کا شکار ہو چکے ہیں یا جو محض کرم خوردہ اوراق کی صورت میں طاقِ نسیاں کی زینت ہیں۔

نظامی کے پنج گنج، امیر خسرو کے خمسہ اور جامی کے سبعہ کے اتباع میں صرفی نے بھی ایک پنج گنج تصنیف کیا ہے جس میں ان کی پانچ مثنویاں، مسلک اخیار، دامق عذرا لیلیٰ مجنوں، مغازی النبی اور مقاماتِ مرشد شامل ہیں۔

خمسہ کے علاوہ حضرت صرفی کی یہ تصانیف ہیں:-

۱۔ شیخ فیضی نے اپنی بے نقط تفسیر سواطع الالہام دربارِ اکبری میں صرفی کو پیش کی تو انہوں نے فی البدیہہ اس کے آخری دو پاروں کی عربی زبان میں ایک ایسی تفسیر بکھ ڈالی جو مفسرانہ اصول اور رموز و نکات کا ایک خزینہ ہے۔

۲۔ صحیح بخاری کے احادیث کی مبسوط شرح و تفسیر

۳۔ مناسک الحج۔ صرفی نے اس کتاب میں قرآن اور حدیث کی روشنی میں حج کے اُن تمام مسائل اور فرائض پر عالمانہ بحث کی ہے جن سے واقف ہونا ایک مرد مومن کے لئے اشد ضروری ہے۔ یہ تصنیف عربی زبان میں ہے۔

۴۔ حاشیہ توضیح و تلویح۔ علامہ شیخ سعدالدین تفتازانی کی علم فقہ پر مشہور کتاب "توضیح و تلویح" پر حاشیہ۔

۵۔ اربعین۔ حضرت علی مرتضیٰ رضؓ اور اہلِ بیت کی شانِ اقدس میں صحاح ستہ سے احادیث جمع کر کے صرفی نے چالیس چالیس حدیثیں فارسی نظم میں پیش کی ہیں۔

۶۔ کنز الجواہر: فنِ تعمیر پر ایک محققانہ کتاب جس کا سن تصنیف ۱۰۰۱ھ ہے۔

۷۔ یدبیضا:۔ مولانا صرفی نے اپنے تمام مہمے اس کتاب جمع کر دیئے ہیں اس میں ان کی شرح بھی شامل ہیں۔

۸۔ ثلاثیاتِ بخاری کی تمہید اور شرح:۔ صحیح بخاری شریف کی تین راویوں والی احادیث کے معنی اور اُن کی شرح۔

۹۔ روایح:۔ یہ کتاب صرفی نے حضرت جامی کی روایح کی تقلید میں لکھی ہے۔ ان میں ۴۵ رایحہ ہیں جن میں معرفت کے راز اور سلوک اور تصوف کے مدارج کا بیان ہے۔ مولانا نے یہ کتابچہ ۹۷۶ھ میں قلمبند کیا۔

۱۰۔ رسالہ ذکریہ:۔ اس منظوم و منثور رسالہ میں بھی سلوک و تصوف کے رازوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔

۱۱۔ حضرت نے عمر کے آخری دنوں میں تفسیر کبیر کی طرز پر قرآن حکیم کی ایک شرح لکھنا شروع کی تھی۔ شیخ عبدالقادر بدایونی نے اس کے مسودہ کو دیکھ کر اس کام کی داد دی تھی لیکن ابھی صرفی نے اس کام کو ہاتھ لگایا تھا کہ دنیائے دنی نے وفا نہ کی اور آپ کا انتقال ہوا۔

۱۲۔ مناقب الاولیاء: اس مجموعہ میں حضرت صرفی کے وہ مناقب درج ہیں جو انہوں نے خلفائے راشدین۔ صحابۂ کبار، اہلِ بیت اور اولیائے کاملین کی شان

میں تحریر کیے ہیں۔

۱۳۔ قصائد مولانا صرفی نے وقتاً فوقتاً چار یارانِ باصفا حضرت امیر کبیرؒ، اولیائے کرام اور اپنے مرشد حضرت شیخ خوازمی کی تعریف و توصیف میں چند قصیدے لکھے جن کے ابیات کی تعداد ۱۲۰۰ سے زیادہ ہے۔

۱۴۔ رباعیات و قطعات:۔ ان میں سے اکثر سال ۹۶۲ھ کی تخلیق ہیں۔ رباعیات کی تعداد تین سو اور قطعات پچیس سے زیادہ ہیں۔ صرفی نے طوارف العارف فصوص الحکم نقد النصوص اور لمحات کے اعلیٰ مضامین کا مختصر ترجمہ بھی رباعیات کی شکل میں پیش کیا ہے اور اس پر اپنی طرف سے شرح بھی لکھی ہے۔

۱۵۔ دیوانِ صرفی:۔ مولانا کی فارسی غزلیات کا مجموعہ جو ساڑھے آٹھ سو غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۹۸۰ھ تک کی لکھی ہوئی غزلیات درج ہیں۔ ایک غزل ملاحظہ ہو۔

غزل

شد لالہ غدارے دگرم جلوہ گر امشب
دارم بر دلِ سوختہ داغِ دگر امشب
اورا زکفِ اغیار کشد ساغرِ مملگوں
مارا مئے گل رنگ زخونِ جگر امشب
خورشید اگر شب بدہد نور نخواہم
خواہم مہ رخسارِ ترا در نظر امشب
پروانہ بگرد سرِ آں شمع چہ گردی
از دود دلِ سوختہ ام کن حذر امشب
پیش از شبِ دیدار دلم بردی و جاں ہم
برپائے تو از دیدہ بریزم گہر امشب
غم گفت چہ جانکاہ بود صحبت ناجنس
باید کہ طرب راکنی از دلِ بدر امشب
صرفی دو ترش در قدم یار شب وصل
یارب کہ تیا بند رقیباں خبر امشب



گمال اسر بلندی مخاک رہی تا نجدار ست — مقام خاکساری تا بلندی کا ہے
مولانا کی مثنوی "واقعہ عذرا" کا ایک مصور صفحہ

مولانا صرفی کا مقام شعر و شاعری، فلسفہ و تصوف خاص کر دین و معرفت اور فقہ و حدیث کے میدان میں بلند اور برتر ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کو "جمع فضل و کمالات" اور مذہبی معاملات میں سب سے بڑی سند قرار دیا۔ صرفی نے تمام مضامین پر قلم اٹھاتے وقت حکمت و فراست کے وہ موتی پروئے ہیں کہ ان کو "علم ظاہر و باطن کے جامع" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان کا شمار آج بھی کشمیر کے جلیل القدر عالموں اور سخن وروں میں ہوتا ہے۔

# کیا ہوا اے صبا

## ثوبان فاروقی

ہاں اے صبا
مجھ کو معلوم ہے
تو سمندر کے اس پار کی صبح کا
ایک پیغام لے کر چلی تھی
تیرے ملبوس پر کالی موجوں نے تھوکا
تیرے رخسار پر تیز کرنوں کے نیزے سجائے گئے
اک تماشا ہوا
اور بھوری نوکیلی چٹانوں پہ کچھ گیت پائے گئے
اور سوکھے درختوں کی الجھی ہوئی ٹہنیوں پر
زرد پتوں میں لپٹی ہوئی آخری چیخ بھی مل گئی!

تو کیا ہوا
چاند کالی رتوں کی اداسی لئے، ہاں اداسی سہی
چمکتا تو ہے
صبح کی میز پر روزناموں کی ہلچل، ہلچل سہی
صبح ہوتی تو ہے
شام ہوتی تو ہے
رات آتی تو ہے
دن گزرتا تو ہے
میرے آنگن میں یوں بھی بلا ناغہ چھوٹے بڑے حادثے
وارداتیں، وقوعے،
گناہوں کے کمزور لمحوں کے، دہشت دھماکوں کے قصے
ہوتے رہتے ہیں، ہوتے رہیں گے

کیا ہوا آج کے دن کا آغاز بھی
زرد سورج کے لب کی فغاں بن گیا!




گوربخش سنگھ

"صاحب . . . صاحب . . . صاحب جی!"

رات کے بارہ بجے ہیں۔ کمل اسکوٹر کے ساتھ ایکسی ڈنٹ ہونے کی وجہ سے ایک ہفتہ ہسپتال میں رہ کر آج ہی آئی تھی اور اُسے گرم پانی والی بوتل کا سینک کرتے ہوئے یشونت کی آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا

"کیا ہے رامے؟"

"صاحب . . . ٹرنک کال . . . لدھیانہ سے۔"

"ہیلو . . . ہیلو . . . کون ستی . . . ایکسی ڈنٹ کہاں ہوگیا ہے۔ سیریس تو نہیں . . . او مائی گاڈ! . . . کیا کمل بھی آئے . . . وہ آج ہی ہسپتال سے واپس آئی ہے . . . امیتا کو ہوش تو ہے . . . اوہ مائی گاڈ! ہماری موٹر بھی ورکشاپ میں ہے . . . ٹیکسی منگواتا ہوں۔"

"کیوں یش جی . . . ایکسی ڈنٹ . . . امیتا کو مین بھیج نہیں رہی تھی . . . ."

"جا رامے . . . فوراً جا . . . جیسے بھی ملے ٹیکسی لے آ۔"

(پیچھے سے آواز دے کر) لیکن دیکھنا کسی سردار کی ٹیکسی نہ لانا۔ سردار بڑے رشیس ہوتے ہیں۔ جیسے کمل کہیں گئی۔ یشونت نے سوٹ کیس میں دونوں کا ایک ایک سوٹ ڈال دیا شاید ایک دن وہاں رہنا ہی پڑ جائے۔

ٹیکسی کا ہارن ہوا۔ ڈرائیور باہر نکل کر پانی کی بالٹی بھر کے ریڈی ایٹر میں ڈال رہا تھا۔ یشونت نے کھڑکی میں سے دیکھا۔

"اوہ! پاگل رامے کسی سردار کو ہی لے آیا ہے۔"

رامے سوٹ کیس اٹھانے کے لئے اندر آیا ——

"تجھے کہا تھا . . . سردار کی ٹیکسی نہ لانا۔"

"صاحب میں نے بڑی کوشش کی . . . دو اڈوں پر گیا ٹیکسی ڈرائیور کئی تھے لیکن کوئی جانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ ایک دو سرداروں سے بھی پوچھا سب انکار کر دیتے تھے۔ میں نے سو سو روپے بھی دینے کے لئے کہا . . . اتنے میں یہ سردار آگیا اور اپنی گاڑی اڈے کے منیجر کو دے ہی رہا تھا کہ میں نے اس سے منت سماجت کی۔ کہنے لگا نہیں جا سکتا مجھے ابھی گاؤں جانا پڑ رہا ہے۔" میں نے ساری بات بتائی، ہماری اکلوتی امیتا کے ساتھ خطرناک ایکسی ڈنٹ ہوگیا ہے۔ بروقت وہاں پہونچنے سے شاید وہ بچ جائے۔ سردار سوچ میں پڑ گیا میں نے ستر روپے سنائے لیکن اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ البتہ چابی منیجر سے مانگ لی اور مجھے ٹیکسی میں بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔ میں نے کہا کہ صاحب بہت اچھے ہیں۔ ستر سے بھی زیادہ دے دیں گے . . . اس نے پھر بھی کوئی توجہ نہ دی . . . اور کوٹھی کا نمبر پوچھ کر چل دیا۔"

"اچھا ہماری قسمت سے چکر پڑ گیا ہے۔ لیکن رامے! تو ہوشیار رہنا۔ اس کے ساتھ بیٹھنا۔ سونا بالکل نہیں۔ اس کی ہر حرکت پر نظر رکھنا۔ ان ٹیکسی ڈرائیوروں کی کہانیاں سنتا ہی رہتا ہوں کمل چابی دینا۔ اپنا ریوالور بھی ساتھ لے لوں۔ کمل ہی پڑھا تھا کہ راستہ میں ٹیکسی ڈرائیور نے سامان سنبھال کے سواریوں کو ٹیکسی سے نیچے اتار دیا اور چلتا بنا۔

یشونت اور کمل ٹیکسی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور رامے ڈرائیور کے ساتھ۔ ڈرائیور کچھ ضرورت سے زیادہ ہی خاموش تھا کسی بات میں حصہ نہیں لے رہا تھا۔ گاڑی چل دی۔

یشونت اور کمل ایک دوسرے کو بیدار رکھنے کے لئے آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے۔ امیتا خود بھی جانا نہیں چاہتی تھی۔ قسمت اُسے گھر کے لئے گئی مامی زور دے رہی تھی۔ انہوں نے ٹاس کیا۔ ٹاس مامی کے حق میں پڑ گئی۔ امیتا مجھے پیار دے کر چلی گئی۔ میری خوش مزاج امیتا!

"اتنا ظلم ہمارے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ ہماری اکلوتی امیتا اس دنیا میں ہے چوٹ ووٹ کی کوئی بات نہیں۔ بڑی سے بڑی چوٹ بھی ڈاکٹر ٹھیک کر لیتے ہیں۔"

ان کے خوف کے برعکس سردار۔ ڈرائیور گاڑی بڑی احتیاط کے ساتھ چلا رہا تھا لیکن کوئی پچاس ساٹھ میل طے کرنے کے بعد یک دم اُس نے ٹیکسی روک لی۔

" رامے! تو جاگ رہا ہے نا؟" یشونت نے یکدم محتاط ہو کر کہا۔ اور اپنا پستول ہاتھ میں لے لیا

"کیوں سردار جی، رُک کیوں گئے ہو؟ گاڑی تو ٹھیک ہے نا؟" یشونت نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

گاڑی ٹھیک ہے میں ہی آج کچھ ٹھیک نہیں ہوں۔ میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ میں آپ کے لئے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ ذرا رُک گیا۔ اب ٹھیک ہوں ——

ڈرائیور نے کچھ دیر رُک کے پھر ٹیکسی چلا دی۔

گاڑی چلتی رہی۔ لیکن پچاس میل چل کے پھر رُک گئی۔ اس مرتبہ ارد گرد دُور و نزدیک کوئی آبادی نہیں تھی اور اندھیرا بھی گہرا ہو گیا۔ یشونت نے پستول پرلے ہاتھ سے نہیں ہٹایا تھا۔ رامے کا کندھا تھپک کے اُسے ہوشیار کر دیا۔

"آپ فکر نہ کیجئے۔" ڈرائیور نے کہا۔ میری حالت کچھ ٹھیک ہو جائے تو چلتا ہوں جتنی دیر ٹیکسی رُکنے سے وقت ضائع ہوتا ہے۔ سب کی کمی پوری کر دوں گا۔ لیکن آپ کی حفاظت کی مجھے بہت فکر ہے۔ رات اندھیری اور سڑک سنسان ہے۔"

ڈرائیور کے الفاظ بڑے تسلی بھرے تھے لیکن یشونت کی پوری تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ اُس نے پستول کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔

انہوں نے ٹیلیفون پر معلوم کر لیا تھا کہ ایکسی ڈنٹ چنڈی گڑھ کے قریب ہی ہوا تھا بس امیتا کی کھل جیب ٹکرا گئی تھی۔ امیتا جیپ سے باہر گر پڑی تھی۔ اور بس کے کسی سخت حصے سے چوٹ لگنے کی وجہ سے اس کا سر پھٹ گیا تھا۔

ہسپتال پہنچ کر معلوم ہوا کہ امیتا کی موت موقع واردات پر ہی ہو گئی تھی۔ اٹھارہ برسوں کی خوبصورت لڑکی کی لاش تمام بستر پر پھیلی ہوئی تھی۔ کمل بس کے ساتھ لپٹ گئی۔ یشونت اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ اس نے منہ دوسری جانب کر لیا اور آنسو پونچھنے لگا۔

"اپنی امیتا دیوی کے آخری درشن کر لیجئے۔" کمل نے یشونت سے کہا۔

"نہیں! میں امیتا کا ہمیشہ خوبصورت اور ہنس مکھ چہرہ ہی اپنی آنکھوں میں رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ چہرہ موت کا نہیں اس ظالم بس ڈرائیور کا ہے جس نے ہماری امیتا کو مار کے پیچھے گھوم کے دیکھا تک نہیں۔ یہ چہرہ میری امیتا کا نہیں۔ تھا اسی کے ہیں میں ان خوبصورت ہاتھوں کو چوم لیتا ہوں۔"

سردار ڈرائیور کے رونے کی آواز تو نہیں آ رہی تھی لیکن رومال سے اس کا جلدی جلدی آنکھیں پونچھنا یہ بتا رہا تھا کہ اس سے اپنے آنسو روکے نہیں جا رہے تھے۔

امیتا کو اسٹریچر پر ڈال دیا گیا تھا۔ قریب ہی دو نرسیں بھی تھیں۔ اسٹریچر کو ایک طرف سے امیتا کے ماموں نے تھاما اور دوسری جانب سے سردار ڈرائیور نے اور ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بڑے احترام کے ساتھ لٹا دیا۔ اگلی سیٹ پر یشونت اور کمل ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ڈرائیور کے ہاتھ کئی مرتبہ کانپے مگر وہ رکا نہیں ہاتھوں کو مضبوط کر کے وہ گاڑی چلاتا رہا۔

لدھیانہ میں امیتا کے نہیں میں صبح امیتا کے داہ سنسکار کی تیاری ہو رہی تھی۔ تمام رشتہ دار اُس ہنس مکھ امیتا کی باتیں کر کے سسک رہے تھے۔ ایک طرف سردار ڈرائیور کے آنسو دوسروں کی طرح چھم چھم تو نہیں بہہ رہے تھے بلکہ ایک ایک کر کے ٹپک رہے تھے۔ اور وہ رومال سے پونچھ لیتا تھا۔

سب نے اس کے کھانے پینے کے لئے اصرار کیا اس کے سامنے کھانا لا کر بھی رکھا گیا، لیکن اس نے کوئی چیز منہ میں نہیں ڈالی۔ چتا پر امیتا کو لٹا دیا گیا۔ رشتہ دار چتا پر لکڑیاں چن رہے تھے۔ بھاری لکڑیاں سردار ڈرائیور نے چتا پر رکھیں اور جب آخری بار چہرہ دیکھا جا رہا تھا۔ تب سردار ڈرائیور بھی آگے بڑھا اور ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر لوٹ آیا۔

امیتا کا داہ سنسکار ہو گیا یشونت اور کمل جس طرح گئے تھے اسی طرح ٹیکسی میں واپس لوٹ آئے۔ لیکن اس بار یشونت نے پستول پر ہاتھ نہیں رکھا تھا سوٹ کیس میں اُسے بند کر دیا تھا نہ ہی اُس نے ڈرائیور کی ہر حرکت پر نظر رکھی۔ بلکہ وہ اور کمل ڈرائیور کی احتیاط خوبصورت ڈرائیونگ اور اُس کے درد بھرے دل کی من ہی من میں تعریف کر رہے تھے۔

ڈرائیور حسب معمول راستے میں کہیں رکا نہیں۔ کمل سارا راستے اُس کی چوڑی پشت کی جانب تاکتی رہی اور سوچتی رہی کہ اس سردار کی ہر ادا ٹیکسی ڈرائیوروں سے کتنی مختلف اور انوکھی بھی۔ یشونت نے سردار ٹیکسی ڈرائیوروں کے بارے میں بڑی غلط رائے قائم کر رکھی تھی۔

کوٹھی پہونچ کر ڈرائیور نے کمل کی طرف کا دروازہ خود کھولا۔ کمل کی آنکھیں پُر آب تھیں۔ شاید امیتا کی اس یاد کی وجہ سے کہ اب کبھی اس کی ہنسی کی روپہلی جھنکار اس بدقسمت کوٹھی میں سُنائی نہیں دے گی۔

یشونت نے اپنے بٹوے میں سے اسّی روپوں کے نوٹ نکال کر ڈرائیور کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ ڈرائیور نے دس دس کے پانچ نوٹ جیب میں ڈال کر باقی تین یشونت کو واپس کر دیئے۔

"نہیں سردار جی۔ یہ میں نے آپ کو انعام کے طور پر نہیں دیئے۔ یہ آپ کا حق ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

"میرا حق آپ پر بالکل نہیں بنتا۔" ڈرائیور نے مضبوط سی آواز میں کہا آپ کے لے جانے سے میں نے یک دم انکار کر دیا تھا صرف جب آپ کے نوکر نے بتایا کہ بروقت پہونچنے پر شاید کسی کی جان بچ جائے تو میں تیار ہو گیا۔

"آپ اسی کی طرف سے لے لیجئے۔" یشونت نے تین نوٹ ڈرائیور کی جیب میں ڈال دیئے لیکن اس نے جلدی سے نکال کر واپس کر دیئے۔

"وہ اگر بچ جاتی تو میں اس سے لے لیتا ۔ ۔ ۔ آپ سے میں نہیں لوں گا کیونکہ آپ کے لئے میں نے روکھا انکار کر دیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ وہ روکھائی کسی انعام کی حق دار نہیں۔"

یشونت ایک کوشش اور کرنے والا ہی تھا کہ کمل نے روک لیا۔ "یش جی انہیں مجبور نہ کیجئے ان کا احسان ہم تین نوٹوں سے ادا نہیں کر سکتے۔ ان کا یہ احسان میں انکو یقین دلاتی ہوں، ساری عمر امیتا کی ناقابلِ فراموش یاد کی طرح سنبھال کر رکھوں گی۔" اور کمل کا گلا بھر آیا۔

ڈرائیور کمل کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ یشونت کے ساتھ اس نے باتیں کی تھیں لیکن اس کے چہرے کی طرف ایک بار بھی نہ دیکھا تھا کمل کی طرف دیکھ کر اس نے ایک کاغذ اپنی جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ "میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ یہ کاغذ میں آپ میں سے کسی کو نہیں دکھاؤں گا۔ لیکن بی بی جی کے لفظوں میں ایسا کچھ ہے کہ میں اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکا۔"

کمل نے وہ کاغذ کھول کے پڑھا۔ وہ ایک تار تھا۔ پڑھتے ہی کمل کی آنکھیں یوں بہہ پڑیں جیسے آسمان سے کوئی بادل ٹوٹ پڑتا ہے۔ تار فرام بھیگ گیا — یشونت نے کمل کے ہاتھ سے تار پکڑ کے پڑھا۔

"پتا اچانک مر گیا — فوراً پہنچو۔"

• یہ تار ایک گھنٹہ قبل مجھے ملا اور گاڑی اڈے پر دے کر مجھے بارہ بجے کی ریل سے گاؤں جانا تھا۔ مگر جب آپکے نوکر نے بتایا کہ موقع واردات پر فوراً پہونچنے سے آپکی بیٹی کی جان بچ سکتی ہے۔ تو میں نے سوچا کہ پتا جی کو تو واپس نہیں لا سکتا لیکن اگر بی بی کی جان بچ جائے تو واقعی ایک بات ہوئی اور راستہ میں پتا کی یا گاڑی کی وصیل پر میرے ہاتھ مضبوط نہیں رہتے دیتی تھی۔

کمل اور سسک پڑی اور ساڑھی کے کونے سے آنکھیں اور منہ پونچھ کر اس نے ہاتھ جوڑے اور کہا "اچھے سردار جی کیا آپ مجھے اپنے چرنوں کو چھو لینے دیں گے" ڈرائیور نے کمل کے جڑے ہاتھوں کو پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا لیا اور اپنی آنکھیں

# مہیش پٹیالوی



کالے چشمے کی آنکھوں سے
آج کی دُنیا دیکھ رہا ہوں
اور سُکھی ہوں
دن کا خوف نہ رات کا غم ہے
اور نہ اس کی فکر ہے مجھ کو
کون ہے اپنا کون پرایا
کون ہے پیلا کون ہرا ہے
باغ میں جتنے پھول کھلے ہیں
سب پر ایک ہی رنگ چڑھا ہے
کالے چشمے کے شیشوں کا۔
ننگی آنکھ سے،
اس دنیا کو
اصلی روپ میں دیکھ سکیں جو
کس کے پاس ہیں ایسی آنکھیں؟
کس کے پاس ہیں اپنی آنکھیں؟

## سانگ کا اُجالا

---

پونچھتا ہوا وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

سڑک کی بجری پر پہیوں نے کرچ کرچ کی۔ کمل ٹکٹکی لگائے ٹیکسی کو دیکھتی رہی۔ ٹیکسی پھاٹک سے گزری۔ کمل کے پاؤں لڑکھڑائے۔ یشونت نے اُسے سہارا دینے کے لئے بازوؤں میں لے لیا۔ "اندر چلو کمل ۔ ۔ ۔"

لیکن کمل اتنی دیر تک وہیں کھڑی رہی جب تک ٹیکسی اُسے نظر آتی رہی۔

(ترجمہ: سرجیت)

# حفیظ اللہ نیولپوری



**کٹک** اڑیسہ کا بہت قدیم شہر ہے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں اس شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ شہر اُڑیسہ کی مشہور و معروف دریائے مہاندی کے کنارے واقع ہے — — — — — — اور شمال میں مہاندی سے لے کر جنوب میں کاٹھ جوڑی تک ۲۵ مربع میل کی سطح پر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں جنوبی مشرقی ریلوے شہر کٹک سے ہو کر گزرتی ہے۔ اس کے علاوہ کلکتہ سے مدراس تک کی گرینڈ ٹرنک روڈ بھی کٹک کی راہ سے گزرتی ہے۔ یہ سڑک کٹک میں دریائے مہاندی کو ہندوستان کے طویل ترین پُل "مہاندی برج" کے ذریعہ عبور کرتی ہے۔ تمام سہولتوں کی بنا پر زمانۂ قدیم سے کٹک اُڑیسہ کی راجدھانی رہا۔ کٹک کے شمال میں چودوار اور جنوب میں سارنگاگڑھ کے مسمار قلعوں کا نشان اب بھی باقی ہے۔ چودوار کا قلعہ بروپا ندی کے بائیں ساحل پر اور سارنگاگڑھ کا قلعہ کاٹھ جوڑی ندی کے داہنے ساحل پر واقع ہے۔ زمانہ قدیم سے شاہراہوں کی سہولت کے پیش نظر کٹک کو کافی تجارتی اہمیت بھی حاصل رہی ہے۔

سنسکرت میں کٹک کے معنی قلعہ، دارالسلطنت یا سرکاری مرکز کے ہیں جو فوجی حفاظت میں ہو۔ اُڑیسہ کے تخت پر تیرہویں صدی کے اوائل میں انگ بھیم دیو قابض ہوا۔ اس دور میں شمال کی جانب سے مسلمان حکمرانوں کی یورش کے پیش نظر انگ بھیم دیو کو اپنے ملک کی حفاظت کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس نے سلطنت کے لئے عظیم دریائے مہاندی اور کاٹھ جوڑی سے محصور خطۂ ارض کو منتخب کیا جو جغرافیائی نقطۂ نظر سے بے مثل تھی۔ انگ بھیم دیو نے اپنی راجدھانی کا نام نوواراناسی کٹک" رکھا۔

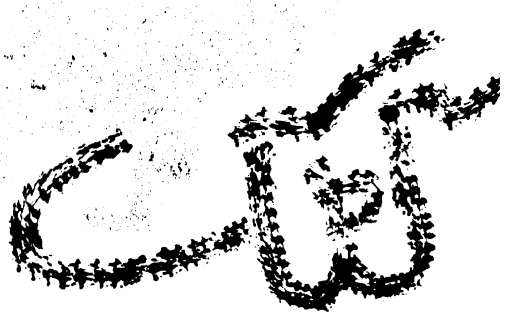

شہر کٹک کے قیام اور گھوڑے کی نعل نما اس کی وضع سے قدیم زمانے کے انجینیروں کے کمال کا اظہار ہوتا ہے۔ کٹک سے متعلق مہاندی اور کاٹھ جوڑی کے ساحلوں پر دیو ہیکل سنگی پشتوں کی بنیاد رکھی گئی ہے جو ایک طرف شہر کو فطرت کے سیلابی حملوں سے بچاتے ہیں تو دوسری طرف شہر کو فوجی نقطۂ نظر سے قابل اطمینان طور پر محفوظ رکھتے ہیں۔ انجینیرنگ کے اس عظیم کارنامے میں تیرہویں صدی کے اڑیا انجینیروں نے کونارک کی تعمیر کے ساتھ ساتھ شہر کٹک کی حفاظت کے لئے سنگی پشتے قائم کر کے یہ ثابت کر دیا کہ فطرت کے دہشت ناک حملوں سے کس طرح عوام کو بہ آسانی محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

انگ بھیم دیو کے بعد اس کا لڑکا نرسنگھ دیو اول ۱۲۳۶ء میں اڑیسہ کے تخت پر قابض ہوا اور ۱۲۴۳ء سے ۱۲۴۶ء تک بنگال کے مختناتی کے سلاطین سے برسرپیکار رہا۔ کونارک کا عظیم سوریہ مندر جو غالباً بنگال کے سلطان کے ساتھ جنگ کے بعد ہی تعمیر ہوا تھا نرسنگھ دیو اول کا ایک عظیم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ نرسنگھ دیو کی کل کارکردگی کا مرکز اڑیسہ کا دارالسلطنت "ابھی نوواراناسی کٹک" ہی تھا۔ اڑیسہ کے تخت پر فیروز شاہ اور اس کے بعد حسین شاہ بھی کچھ عرصہ تک قابض رہے لیکن بھانو دیو کے سپہ سالار کپلیشور دیو نے ۱۴۳۴ء میں اڑیسہ کے تخت پر قبضہ کر لیا بعد میں کپلیشور دیو نے خود کو ایک عظیم حکمراں ثابت کیا۔ اس نے نہ صرف اپنے دور حکومت میں داخلی امن و تحفظ بدرجۂ اتم قائم کیا بلکہ دُور دراز جنوبی ہند کے علاقوں پر بھی قبضہ کرتا چلا گیا اور مسلم سلاطین کے حملوں سے بھی اُڑیسہ کو بچائے رکھا۔ اس ضمن میں خود کپلیشور دیو کا تصنیف کردہ ایک ایکٹ کا سنسکرت ڈرامہ "پرسورام وجے" قابل ذکر ہے۔ اس ڈرامے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے گیت اڑیا ہی میں منظوم ہیں۔ اس کے علاوہ کپلیشور دیو کے عہد حکومت میں اڑیا زبان کے اولین شاعر اعظم سارلا داس

نے مکمل "مہابھارت" کو اڑیا میں نظم کیا تھا اس طرح سے ثابت ہوتا ہے کہ اڑیا زبان اور ادب کی ترویج و بقا کے لئے کپلیشور دیو کا عہد حکومت ایک زریں عہد تھا۔

ملک کی آزادی کے بعد شہر کٹک میں گنجان آبادی کے پیش نظر اڑیسہ کا دارالسلطنت کٹک سے بھونیشر منتقل ہوا۔ بھونیشر کٹک سے ۱۸ میل کی دوری پر واقع ہے۔ دریائے کاٹھ جوڑی اور کواکھائی پر دو پلوں پر سے ہوتی ہوئی پختہ سڑک کٹک سے بھونیشر کو منسلک کرتی ہے۔ اڑیسہ کی راجدھانی کے بھونیشر چلے جانے کے باوجود اب بھی شہر کٹک کو ثقافت، تجارت اور صنعت و حرفت کا ایک اہم مرکز سمجھا جاتا ہے پچھم کے پہاڑی علاقوں کے لئے کٹک کی حیثیت صدر دروازہ کی ہے۔ اس کے علاوہ شہر کے اطراف میں چھوٹی بڑی نہروں کا گویا کہ جال سا بچھا ہوا ہے جس کی وجہ سے زراعتی آبیاری کے لئے سہولتیں میسر ہیں اور کٹک کو تجارتی اہمیت بھی حاصل ہے۔ کٹک چاندی کی تارکشی، طرح طرح کے زیورات اور سینگ کی چیزوں کے لئے سارے ملک میں مشہور ہے۔

اڑیسہ کی راجدھانی کے بھونیشر منتقل ہونے کے باوجود اڑیسہ کا ہائی کورٹ اب بھی کٹک ہی میں ہے یہاں ایک میڈیکل کالج اور اس سے متعلق بہت بڑا اسپتال بھی قائم ہے "اتکل یونیورسٹی کے" بھونیشروانی بہار" میں تبدیل ہو جانے کے باوجود اب بھی کٹک کو تعلیمی مرکز سمجھا جاتا ہے۔ فی الحال کٹک میں ایک میڈیکل کالج کے علاوہ راونشا کالج، کرایسٹ کالج، اسٹیورٹ سائنس کالج، مدھوسودن لا کالج شیل بالا ویمنز کالج اور رادھا ناتھ ٹریننگ کالج درس و تدریس کا مرکز سمجھے جاتے ہیں۔ کٹک میں ایک انجینئرنگ اسکول بھی ہے۔ شہر میں قابل لحاظ تعداد میں ہائی اسکولز موجود ہیں۔ ان میں کرایسٹ کا بیجیٹ (مشن اسکول) سب سے قدیم سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کے اسکولوں اور کالجوں میں اسٹیوارٹ سائنس کالج اور کرایسٹ کالج کے ماسوا مخلوط تعلیم کا عام رواج ہے۔ لیکن لڑکیوں کے لئے الگ کئی اسکولز اور کالج بھی ہیں۔ یہاں عام طور پر سیکنڈری اسکول تک ذریعۂ تعلیم صوبائی زبان "اڑیا" ہے لیکن اڑیا بازار اردو گرلز اسکول" اور سعید سیمنری میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کے کئی اسکولوں میں اردو اور فارسی (بحیثیت اختیاری

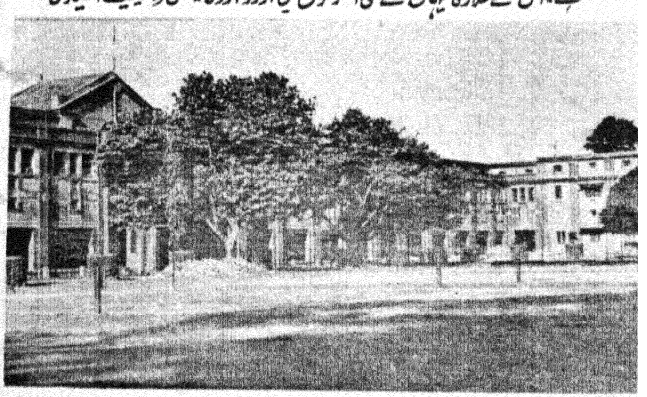

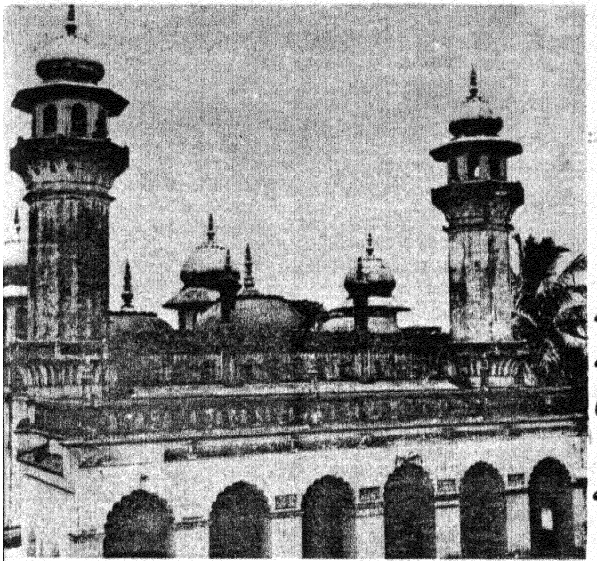

جامع مسجد کٹک

مضمون) کی تعلیم کا انتظام بھی ہے۔ راونشا کالج میں بی۔ اے تک فارسی میں "آنرز" کی تعلیم دی جاتی ہے اور پروفیسر سید مسیح الدین صدر شعبۂ اردو و فارسی کی کد و کاوش سے طلبا میں فارسی کی تعلیم کا رجحان یہاں اب بھی زندہ ہے۔ شہر کٹک میں اردو ٹیچرز ایلیمنٹری ٹریننگ اسکول زمانہ قدیم سے قائم تھا۔ جو آج کل سیکنڈری ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس اسکول میں پرائمری اسکول، مڈل اسکول اور ہائی اسکول کے لئے اساتذہ کو ٹریننگ دی جاتی ہے اس اسکول کا ذریعہ تعلیم بھی اردو ہے۔

کٹک میں قدیم طرز کی مسجدیں اور منادر ہیں۔ یہاں کی مسجدوں میں دیوار بازار کی مسجد، قلعہ کی شاہی مسجد، اجابی خاں کی مسجد اور جامع مسجد سب سے قدیم تصور کی جاتی ہیں۔ ان سے دیوان بازار کی مسجد، شاہجہاں کے دور حکومت میں قلعہ کی شاہی مسجد شاہ عالم ثانی کے دور حکومت میں اور جامع مسجد انگریز کے دور حکومت میں تعمیر ہوئی تھیں۔

شہر کٹک کے درگاہ بازار میں "قدم رسول" بہت بڑی اہمیت کا حامل مقام ہے۔ ۱۷۵۰ء میں شاہ عالم کے دور حکومت میں نواب شجاع الدین محمد خاں نے اس زیارت گاہ کی تعمیر کروائی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نقش پا حاصل کر کے یہاں محفوظ کیا۔ قدم رسول کا احاطہ بہت ہی وسیع و عریض ہے۔ اس احاطہ میں نواب محمد تقی خاں کا مزار بھی ہے۔ اس کے علاوہ یہ حصہ قبرستان کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور عرف عام میں ایک عظیم زیارت گاہ بن کر رہ گیا ہے۔

راونشا کالج

امریسور مندر

اسی احاطہ کے اندر ایک مسجد بھی موجود ہے اور داخلے کے بیرونی پھاٹک پر ایک غربت خانہ بھی ہے جہاں ہر وقت فقیروں کا اژدہام ہوا کرتا ہے

کٹک کے مشہور علاقہ بخشی بازار کے پہلے نکڑ پر اڑیسہ کے مشہور و معروف اسٹوڈیو فوٹو لائف کے پاس امریسور مندر واقع ہے۔ یہ مندر ایک بہت ہی قدیم مندر ہے اور ہر تہوار کے موقع پر یہاں میلہ بھی لگتا ہے۔ کٹک میں دوسرا مشہور مندر چنڈی کا ہے اور اس مندر کی مناسبت سے اس علاقہ کا نام کٹک چنڈی ہو گیا ہے بخشی بازار سے کٹک چنڈی کو متصل کرنے والی سڑک (مشن روڈ) پر مدھوپور ہاؤس میں آل انڈیا ریڈیو کے اسٹوڈیوز ہیں اور اس کا ٹرانسمیٹر بارا بائی قلعہ کے اندر نصب ہے۔ بارا بائی کا یہ قلعہ اننگ بھیم دیو کے دورِ حکومت میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اور مختلف ادوار میں حکمرانوں کے قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا تھا۔ اس قلعہ کے چاروں طرف حفاظتی نقطۂ نظر سے گہری کھائی کھدی ہوئی ہے جو ہمیشہ پانی سے لبریز رہا کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کبھی اس قلعہ کے دیو ہیکل دروازے پر کافی کشادہ آہنی کواڑ لگے ہوئے تھے۔ اس قلعہ کے اندر بھی ایک شاہی مسجد موجود ہے جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے مسجد کے علاوہ اس قلعہ کے اندر بخاری بابا کا مزار بھی ہے جو لوگوں کے لئے زیارت گاہ کا درجہ رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پرتاپ رودر دیو کو اس کی حکومت کے اولین دور سے ہی والیٔ بنگال حسین شاہ سے زبردست مخاصمت رہی بنگال میں حسین شاہ سے جنگ کے دوران پرتاپ رودر کے وزیر گووند ودیا دھر نے اس کے خلاف بغاوت کر دی لیکن پرتاپ رودر نے کسی نوع اس سے سمجھوتہ کیا اور



بالآخر حسین شاہ کو شکست دی لیکن حسین شاہ کو شکست دینا ہی پرتاپ رودر کے اطمینان کا باعث نہ بن سکا — دوسری جانب جنوب میں اس کے دو عظیم دشمنوں یعنی وجے نگر کے کرشن دیوریا اور گول کنڈا کے قلی قطب شاہ نے اڑیسہ پر زبردست حملہ کیا اور نتیجہ کے طور پر پرتاپ رودر کو اپنی سلطنت کا وہ علاقہ جو دریائے گوداوری کے اس پار تھا، اپنے دشمنوں کے حوالہ کرنا پڑا۔ پرتاپ رودر کی وفات کے بعد اس کے سرکش وزیر گووند ودیا دھر نے پرتاپ رودر کی کل اولاد نرینہ کو ہلاک کر دیا اور خود اڑیسہ کے تخت پر قابض ہو کر کٹک کے اسی قلعہ میں رہنے لگا۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ گووند دیو کی وفات کے بعد اس کے وزیر مکند دیو نے اڑیسہ کی عنان حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ مکند دیو کے دورِ حکومت میں سلیمان کرانی کے افغان جنرل کالا پہاڑ نے اڑیسہ پر بہت ہی دہشت ناک حملہ کیا جس سے متعلق آج بھی اڑیا میں ایک کہاوت مشہور ہے۔

"آسی لاکلا پہارو، بھانگی لا لوہارو بارو، پی یلا مہاندی پانی،
سوبر نو تھالی رے ہیرہ پرسی لے مکند دیسنک رانی"

(کالا پہاڑ نے کٹک میں داخل ہو کر قلعہ کے آہنی دروازہ کو توڑ دیا، مہاندی سے پانی پیا اور مکند دیو کی رانی نے طلائی طشت میں اس کے سامنے ہیرے پیش کئے۔)

شہر کٹک قدیم اور جدید اقدار کا امتزاجی نمونہ ہے۔ بارا بائی قلعہ کے سامنے ایک بہت بڑا میدان ہے جس میں ہر سال نومبر کے وسط میں کارتک پورنیما کے موقع پر "بالو جاترا" کے نام سے ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے اور اس وسیع و عریض میدان میں ملک کے قومی رہنماؤں کی آمد پر جلسے ہوتے ہیں۔ اس میدان کے مقابل سڑک کی دوسری جانب بارا بائی اسٹڈیم ہے۔ اس اسٹیڈیم کی عمارتیں اور گلریز کافی خوبصورت اور نہایت دلکش ہیں اور اس اسٹیڈیم کا شمار براعظم ایشیا کے عظیم ترین اسٹیڈیمز میں ہوتا ہے۔ اس اسٹیڈیم میں ہر طرح کے میچ اور کلچرل پروگرامز ہوا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی مرتبہ ہندوستان کے قومی کھیل بھی یہاں ہو چکے ہیں۔

کٹک چنڈی سے ایک سڑک شمال سے جنوب کی جانب

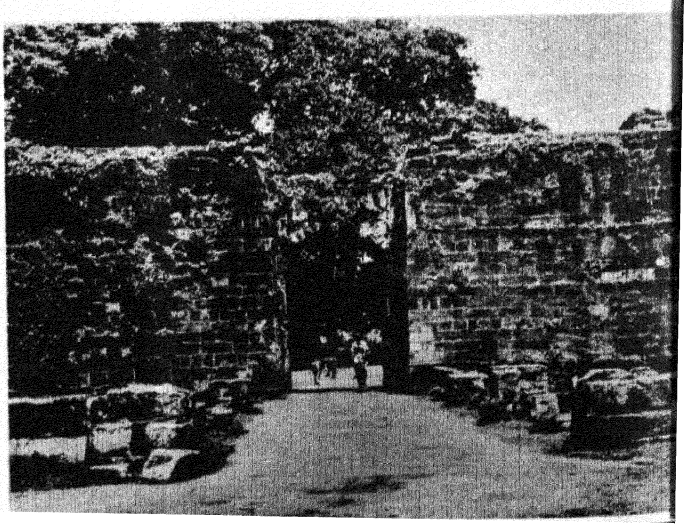

کٹک کا بارا بائی قلعہ —— بیرونی دروازہ

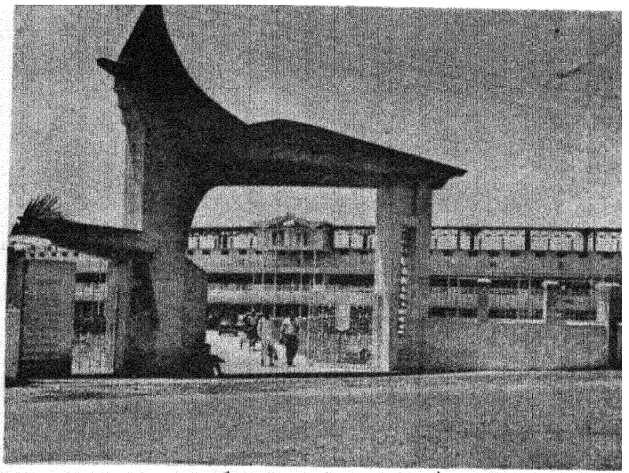

بارا باٹی اسٹیڈیم (مشرقی بلاک) — کٹک

بڑھتی ہے اور آگے بڑھ کر چاندنی چوک کو متصل کرتی ہے۔ اسی چاندنی چوک میں دریائے کاٹھ جوڑی کے ساحل پر عظیم سنگی پشتوں سے متصل کٹک کی مشہور تاریخی عمارت "لال باغ" واقع ہے۔ اڑیسہ کے مغل گورنر متعقد خاں مرزا مکی نے ۱۶۳۳ء میں اپنی شہرت اور مقبولیت کی ایک عظیم یادگار کے طور پر "لال باغ" تعمیر کروایا تھا۔ لال باغ محل ۱۷۵۱ء تک مغل صوبے داروں کے زیر استعمال رہا اور اس کے بعد ناگپور کے بھونسلہ صوبے دار ۱۷۹۱ء سے ۱۸۰۳ء تک اس محل پر قابض رہے۔ ۱۸۰۳ء میں بھونسلہ راجہ رگھوجی ثانی پر فتحیابی کے بعد لال باغ انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔ اس کے بعد مختلف دور میں لال باغ کٹک کے کمشنروں اور کلکٹروں کی رہائش گاہ بنا رہا۔ پھر ۱۹۴۲ء سے ۱۹۶۰ء تک یہ محل اڑیسہ کے گورنر کی قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ ۱۹۶۱ء میں گورنر ہاؤس نئی راجدھانی بھونیشور منتقل ہوجانے کے بعد اس عظیم عمارت میں بچوں کا ہسپتال اور "بال بھون" قائم ہوا جو اب تک جاری ہے۔

لال باغ محل کے بعد کٹک کی دوسری عظیم عمارت اڑیسہ ہائی کورٹ کی ہے۔ ہائی کورٹ کی اس عظیم عمارت کی تعمیر ۱۹۱۲ء میں ہوئی تھی لیکن اس وقت سے اس میں صرف سول کورٹ قائم تھا۔ اب ۱۹۴۸ء میں یہاں ہائی کورٹ کا قیام عمل میں آیا، اور ۱۹۶۲ء میں کلکتہ ہائی کورٹ کی وضع پر ایک برج قائم کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس عمارت کی دلکشی دوچند ہوگئی ہے۔ یہ علاقہ شہر کا سب سے گنجان علاقہ ہے جہاں ہر وقت بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔

کچہری کا علاقہ ختم ہونے پر نیم چوڑی کا بازار ہے۔ جہاں زیادہ تر صرافوں کی بڑی بڑی دکانیں ہیں اس سے متصل بالو بازار کا علاقہ ہے۔ جہاں زیادہ تر کتابوں کی دکانیں ہیں۔ کٹک کی مشہور و معروف

اڑیسہ ہائی کورٹ — کٹک

جامع مسجد بھی شاہراہ، بالو بازار پر واقع ہے۔ بالو بازار کے فوراً بعد جو بازار ہے عرف عام میں "بنیا سٹرک" کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں سڑک کی دونوں جانب ملبوسات کی بڑی بڑی بارونق دوکانیں ہیں اور اس کے علاوہ چند کھوک فروش فرم بھی اسی بازار میں ہیں۔ یہاں سے آگے بڑھتے تو چودھری بازار کا علاقہ جسے عرف عام شہر کی حیثیت حاصل ہے، اپنے ازدہام کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ یہ علاقہ اسٹیشنری، ملبوسات، جوتے، ادویات اور بینکوں کا تجارتی مرکز ہے۔ چودھری بازار کے اختتام پر سڑک سے متصل ایک قدیم و وسیع پارک ہے جو "گوری شنکر پارک" کے نام سے موسوم ہے۔ کٹک کا دوسرا بڑا پارک "گوپ بندھو باغ" ہے جو بخشی بازار مارکیٹ سے متصل اڑیسہ کی قدیم عربی درس گاہ "مدرسہ سلطانیہ" کے مقابل واقع ہے۔ یہاں سڑک کی دوسری جانب اڑیسہ کے مشہور و مقبول اڑیا روزنامہ "سماج" کا اشاعتی دفتر گوپ بندھو بھون میں واقع ہے۔ گوپ بندھو بھون سے پچاس قدم آگے اسی سڑک پر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی بلڈنگ ہے۔ وائی۔ ایم سی۔ اے کی بلڈنگ کے اختتام پر شاہراہ سے ایک پختہ سڑک پولیس لین کی طرف جاتی ہے اور ایک بہت ہی وسیع و عریض مخصوص میدان "پولیس گراونڈ" کے نام سے موجود ہے۔ اس گراونڈ میں عموماً پولیس پریڈ اور خصوصاً یوم آزادی کی تقریبات انجام پاتی ہیں۔

مندروں اور مسجدوں کے ساتھ ساتھ شہر کٹک میں کئی گرجے بھی ہیں اور شہر کے ایک سرے میں مہاندی کے کنارے کالیا یودہ کے پاس ایک گوردوارہ کی تعمیر بھی عرصۂ دراز سے عمل میں آئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گورو نانک جی پوری جاتے ہوئے کچھ دیر کے لئے اس مقام پر ٹھہرے تھے اور انہوں نے وہاں مراقبہ بھی کیا تھا۔ اور اسی جگہ پر اپنا مسواک بھی گاڑ دیا تھا۔ اس لئے یہ گوردوارہ "داتون صاحب"

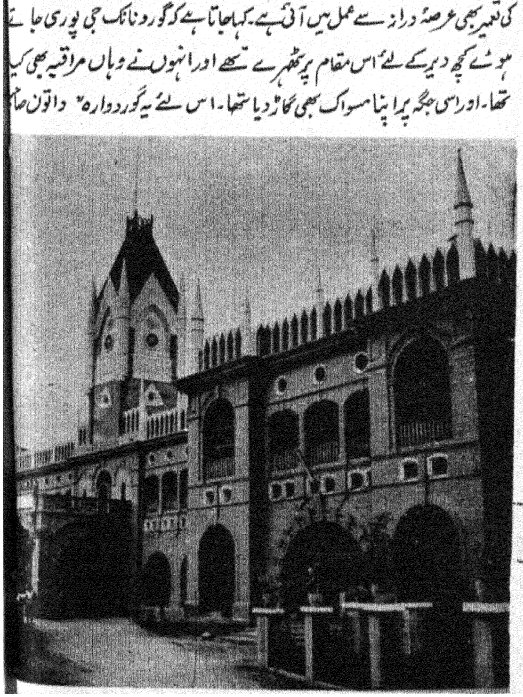

کے نام سے معروف ہے :

شہر کٹک میں کئی دارالمطالعے اور لائبریریاں بھی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی لائبریری کٹک کا لائبریری ہے جو راونشا کالج سے متعلق ہے۔ اس میں بیش قیمت کتابوں کا ایک عظیم ذخیرہ موجود ہے۔ ابھی چند سال ہوئے اڑیسہ کے مشہور پنڈت اور اُتکل پردیش کانگریس کمیٹی کے سابق صدر (۱۹۴۱-۱۹۴۰ء) پنڈت پران کرشن پرھیاری کے نام پر گوری شنکر پارک کے پاس "پرھیاری لائبریری" قائم ہوئی ہے جس کے ساتھ ایک خوبصورت دارالمطالعہ بھی موجود ہے۔ عرصہ دراز سے قدم رسول کے احاطہ میں اُردو کی لائبریری "اقبال میموریل لائبریری" کے نام سے موجود ہے۔ ادھر جناب معین الدین احمد (ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس) اور دوسرے کئی علم دوست حضرات کی بے لوث کد و کاوش کی وجہ سے "اُردو لائبریری آف اُڑیسہ" کے نام سے ایک عظیم لائبریری کی تعمیر زیر انتظام ہے۔ یہ لائبریری صرف شہر کٹک ہی نہیں بلکہ پورے صوبہ کے لئے قومی یک جہتی علمی و ادبی خدمات کے علاوہ ثقافتی فرائض بھی ادا کرے گی۔

شہر کٹک سے سماج، کلنگا، پرجاتنتر اور مارو بھومی جیسے موقر روزنامے اڑیا زبان میں شائع ہوتے ہیں اس کے علاوہ بہت سارے ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہوار، ادبی، سیاسی، ثقافتی اور فلمی رسالے شائع ہوتے ہیں۔ ان رسائل میں صوبہ کا واحد اُردو رسالہ شاہنار قابل ستایش ہے جو اُڑیسہ کے بزرگ شاعر اور ادیب جناب اعجاز نجمی کے زیر ادارت چھ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ پروفیسر کرامت علی کرامت نے اڑیسہ کے اُردو شعراء کا تذکرہ "آب خضر" کے نام سے تالیف کیا ہے جس سے یہاں کی ادبی سرگرمی کے ساتھ یہاں کی شاعری کے مزاج کا بھی پتہ چلتا ہے۔ علمی و ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ کٹک سیاسی سرگرمیوں کی بھی آماجگاہ بنا رہا ہے اب ادھر چند سال سے فلمی صنعت میں بھی کٹک کو خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے یہاں کئی فلم ساز کمپنیاں موجود ہیں جنہوں نے اُڑیا کی اچھی اچھی فلمیں تیار کی ہیں اور قبول عام کا شرف بھی حاصل کیا ہے۔ اس شہر میں اچھی تعداد میں سینما ہال موجود ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ کئی تھیٹر ہال بھی ہیں۔ جن میں عام طور سے اُڑیا ڈرامے منعقد ہوا کرتے ہیں اور کبھی کبھی اُردو ڈرامے بھی اسٹیج ہوتے ہیں۔

کٹک کے شمالی مغربی گوشہ کا دور افتادہ علاقہ تلسی پور کے نام سے موسوم ہے اور دریائے مہاندی کے بالکل کنارے واقع ہے۔ یہاں کی دوسری خوبی یہ ہے کہ قدیم کٹک کی آبادی کا مرکز بھی یہی علاقہ تھا کٹک کے مشرقی کنارے پر جو یرا آئی کٹ طلوع آفتاب کے وقت بڑا ہی دلکش منظر پیش کرتا ہے۔ زمانہ قدیم میں یہی جگہ اڑیا تاجروں کے بحری سفر کی آماجگاہ تھی۔

کٹک شہر کی آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ڈیڑھ لاکھ سے اوپر تھی جو اب تخمیناً دو لاکھ ہو چکی ہے۔ یہاں عام طور پر علاقائی زبان اُڑیا بولی جاتی ہے۔ اور دوسرے نمبر پر تیلگو اور تیسرے پر اُردو کا شمار ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ بنگلہ اور ہندی سے بھی آشنا ہیں خصوصاً ہندی زبان کی اشاعت کے لئے یہاں مدت مدید سے اتکل پرانتی راشٹر بھاشا پرچار سبھا" کام کر رہی ہے۔ اس سبھا کے زیر اہتمام ہندی کے امتحانات ہوا کرتے ہیں۔ اڑیا کتابوں کا ہندی ترجمہ کیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ اس سبھا کا ایک اشاعتی شعبہ بھی ہے جس کا ترجمان ایک ہندی ماہنامہ یہاں سے شائع ہوتا ہے۔ ادھر چند سال ہوئے "گاندھی بھون" کے نام سے ایک عظیم ہال کی تعمیر عمل میں آئی ہے۔ شہید بھون کے بعد یہ کٹک کا عظیم ترین ہال سمجھا جاتا ہے۔

یہاں شہر کے اندر آمد و رفت کی سہولت کے لئے بسیں، ٹیکسیاں اور بے شمار رکشے موجود ہیں جہاں اس شہر کی دوسری کئی خصوصیتیں ہیں وہاں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس نے بیتاجی سبھاش چندر بوس جیسے عظیم قومی رہنما اور بین الاقوامی شہرت یافتہ تیراک مہر سین کو پیدا کیا۔ یہاں کے مقامی رہنماؤں میں آنجہانی بیرسٹر مدھوسودن داس کا سارا صوبہ معترف ہے۔ موصوف کی اُڑیسہ میں صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے کد و کاوش کی یادگار کے طور پر کٹک کے صنعتی علاقہ کا نام مدھوپٹنہ رکھا گیا ہے۔ یہاں کی صنعتی پیداوار میں لکڑی کے نہایت ہی نفیس فرنیچرز، اسپورٹس کا سامان، طباعت کے لئے بلاک اور دیگر لوہے کے اوزار وغیرہ بہت ہی مشہور ہیں۔ اسی علاقہ میں ایک سرے پر اڑیسہ گورنمنٹ پریس اور دوسرے سرے پر انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کی عمارتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔

مرکزی کٹک سے ذرا ہٹ کر سینٹرل رائس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی عمارتیں دور دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ہر قسم کے دھان کے پودوں اور دھان کی مجموعی اقسام پر ابتدائی تحقیق کا کام ہوتا ہے اور اناج کی پیداوار کے سلسلہ میں معلوم فراہم کی جاتی ہیں۔ ادھر حال ہی میں اس انسٹی ٹیوٹ میں دو اور شعبے کھلے ہیں جن میں سے ایک Rice Technology سے متعلق ہے اور دوسرا Soil Technology سے۔

اڑیسہ کے قدیم دارالسلطنت کٹک کو نئی راجدھانی بھونیشور سے قریب تر لانے کے لئے دول منڈائی چوک کے بعد راجہ باغیچہ کے قریب تعمیر شدہ لنک روڈ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اڑیسہ میں بسنے والوں کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں دگھتا نامی ایک مشہور و معروف سادھو رہتا تھا۔ اس کے پانچ لڑکے تھے۔ انگ، بنگ، کلنگ، پونڈرا اور سہم۔ سادھو کے تیسرے لڑکے کلنگ نے ہندوستان کے جنوب کی طرف کوچ کیا اور مشرقی ساحل پر آپہنچا۔ یہاں ایک پہاڑ کی چوٹی پر سے اس نے اس علاقہ کی

دلکش فضا اور سرسبز اراضی کو دیکھا۔ اس علاقہ میں فطرت کے دلکش نظارہ نے اس کا دل موہ لیا اور بالآخر کلنگ نے اپنے لوگوں کے ساتھ اس علاقہ میں بسنے کا تہیہ کر لیا لیکن آثار قدیمہ کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اوڈرا (UDRA) نامی ایک غیر آریہ نسل کے لوگ اس علاقے کے سب سے قدیم باشندے ہیں۔ مختصر یہ کہ اڑیسہ کے ساحلی علاقوں میں بسنے والے لوگ نسلی اعتبار سے زیادہ تر آریہ ہیں اور دیگر مقامات پر بسنے والے لوگوں میں سے بڑی تعداد قبائیلیوں کی ہے۔ اڑیسہ کے باشندے نسلی اعتبار سے فی الحال اس قدر مخلوط ہو چکے ہیں کہ انہیں ہندوستانی مخلوط تہذیب کا ایک نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ مختلف تاریخی ادوار میں یہاں مختلف قوم اور نسل کے لوگ شمالی ہند سے بغرض تجارت اور مشنری تبلیغ کے یہاں آئے۔ اور اس علاقے میں بس گئے۔

اڑیسہ کی راجدھانی بھونیشر سے پانچ میل کی دوری پر "ندی کے کنارے دھولی پہاڑ واقع ہے۔ اس پہاڑ پر اشوک کے کلنگ پر حملہ کر کے فتحیابی کے بعد کئی سنگی کتبے نصب کئے گئے ہیں ان کتبوں میں سے ایک کتبے پر مہامنتروں کے نام اشوک کا پیغام موجود ہے اور دوسرے میں شہزادہ (توشالی کے گورنر) کے نام ایک پیغام ہے۔ ان کتبوں میں بالائی حصے میں ایک ہاتھی کا خاکہ منقش ہے۔ یہ کتبے ۲۶۰ ق م اڑیسہ کی قدیم ترین تاریخ کا ماخذ سمجھے جاتے ہیں۔

اڑیسہ میں بسنے والے عوام نوے فی صدی دیہات میں بستے ہیں اور عام طور پر اُن کی معیشت کا ذریعہ کاشتکاری ہے۔ ادھر تجارت کو بھی فروغ حاصل ہوا ہے

اڑیسہ کی اہم زرعی پیداوار دھان ہے۔ اس کے علاوہ آلو، مونگ پھلی اور گنا بھی پیدا ہوتا ہے۔ آبیاری کی موجودہ سہولتوں کی بنا پر ان دنوں یہاں سال میں دھان کی دو فصلیں ہوتی ہیں اور یہاں سے دوسرے صوبوں کو چاول برآمد کیا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کی مرغوب غذا چاول ہے۔

کٹک اپنی قدامت اور ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ ساتھ ملک میں ہونے لی ترقیوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہا ہے۔ ●●


ہمارے مطبوعات

| | |
|---|---|
| گنجینۂ غالب | ۴ روپے ۵ پیسے |
| آئینہ غالب | ۵ روپے |
| دو شہروں کی کہانی (ناول) | ۵ روپے |
| ہندوستان کی مسجدیں | ۲ روپے ۵۰ پیسے |

ملنے کا پتہ
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی


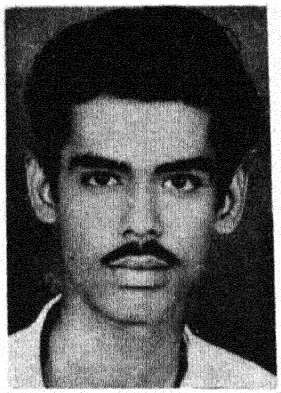

# غزل

وہ نہ آئے ادھر ہوا کیا ہے
بات اتنی سی ہے گلہ کیا ہے؟

بھول کر آ گیا تھا محفل میں
میں نے آخر گنہ کیا کیا ہے؟

ایک دو پل گزر ہی جائیں گے
آنے جانے کا فاصلہ کیا ہے؟

جس کو کہتے ہیں زندگی اے دوست
تیری یادوں کے ماسوا کیا ہے؟

حسنِ زیبا! مرے جنوں کی قسم
میں ترا ہوں تو پھر مرا کیا ہے؟

ہم تو وعدہ وفا کریں گے مگر
کون جانے حدِ جفا کیا ہے؟

آج ہنستے ہو کیوں بخاری تم؟
روتے روتے تمہیں ہوا کیا ہے؟

سجاد بخاری

# دُمدار تارے اور شہابیے

قیصر سرمست

جو دُمدار ستارہ ۲۴ مارچ ۱۹۷۰ء کو دہلی اور بلاسپور میں نظر آیا تھا وہی ۳۰ مارچ کو صبح کے پانچ بجے حیدرآباد میں بھی نظر آیا۔ رصدگاہ نظامیہ کی اطلاع کے مطابق یہ دُمدار ستارہ مشرقی افق سے تقریباً ۲۰ ڈگری کی بلندی پر نظر آرہا تھا۔ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس ستارہ کی دُم اتنی طویل نہیں ہے جتنی کہ ۱۹۶۵ء میں دکھائی دینے والے "اکیا سیکی" ستارہ کی تھی۔

یہ حقیقت بھی ہے اس لئے کہ میں نے بھی ۳۰ مارچ کی صبح سوا پانچ بجے دُمدار ستارے کو دیکھا تھا۔ مناسب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دُمدار ستارے شہابیوں کے متعلق اظہارِ خیال سے پہلے کیوں نہ آپ کو کائنات کی وسعت کے بارے میں کچھ بتاتا چلوں۔ ہم میں سے کون ایسا ہوگا جس نے کبھی نہ رات کے وقت آسمان کی طرف نہ دیکھا ہوگا اور آسمان کی نیلگوں چادر پر بے شمار ننھے منے تارے ٹنکے دیکھ کر حیرت زا نہ ہوا ہوگا۔ مگر بہت کم ہیں جنھوں نے حقیقی معنوں میں اُن پر غور کیا۔ دُنیا کا کوئی بھی انسان سادہ سے سارے آسمان کو محیط نہیں کر سکتا۔ ہم صرف آسمان کے نصف حصہ ہی دیکھ سکتے ہیں اور نصف حصہ ہماری آنکھ سے اوجھل رہتا ہے جو حصہ ہماری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے اس میں ستاروں کی تعداد تخمینہ لگایا گیا ہے اور اگر اسی نصف حصے کو دُوربین سے دیکھیں تو ستاروں کی تعداد ۳۵۰۰ سے بڑھ کر ایک لاکھ بیس ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی حصے کو مونٹ ولسن کی رصدگاہ میں جو ۱۰۰ انچ والی دُوربین نصب ہے دیکھیں تو یہ تعداد ۱۵۰۰ ملین (ایک ارب ۵۰ کروڑ) ہوجاتی ہے مگر اس وجود بے شمار ستارے ایسے رہ جاتے ہیں جہاں تک کسی بڑی سے بڑی دوربین کی رسائی ممکن نہیں۔

"بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اتنے ستاروں کی موجودگی سے فضا میں تنگی ہوگی سمجھو گی لیکن اربوں ستاروں کے ہوتے ہوئے بھی فضا کی وسعت ایسی ہے جیسے تمام کرۂ ارض پر چند مکھیاں پرواز کر رہی ہوں۔"

کرۂ ارض کی تباہی کی جو مختلف وجوہات بیان کی جاتی ہیں ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ وہ کسی بھی دُوسرے کرۂ سے ٹکرا جائے گی۔ فضائے بسیط میں بکثرت چھوٹے بڑے دُمدار ستارے گردش کر رہے ہیں۔ ازل سے یہ ستارے نحوست کی علامت متصور کئے جاتے ہیں اور اُن کے نظر آنے کے معنی یہ ہوتے تھے (اور اب بھی بعض حضرات کے پاس ہوتے ہیں) کہ دنیا میں کوئی تباہی آنے والی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عہدِ قدیم میں کئی ستارے کرۂ ارض سے ٹکرا کر تباہیاں مچا چکے تھے چنانچہ عہدِ قدیم کی بعض تصاویر سے اس کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ ان تصاویر میں تباہی کے فرشتہ کو دُمدار ستارے کی شکل میں دکھلایا گیا ہے۔

آج سے کوئی ساڑھے چار سو سال پہلے ڈنمارک میں ایک نجومی اور سائنسداں ٹائیکو براہی ( Tychobrahe ) نے بتایا تھا کہ اس وقت جتنے بھی دُمدار ستارے کائنات میں موجود ہیں وہ سب زمین کی کشش سے باہر ہیں۔ اس لئے ان کے ٹکرائے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے، اور اب یہ بھی سنئے کہ جدید تحقیق ٹائیکو براہی کے اس خیال کی تائید نہیں کرتی۔ جدید سائنس نے دمدار ستاروں کی ماہیت اور اصلیت بھی دریافت کر لی ہے۔ یہ تمام ستارے چھوٹے چھوٹے ذرات پر مشتمل ہوتے ہیں اور اُن کی گردش کا مدار زمین سے چونکہ بہت دُور ہے اس لئے وہ نظر نہیں آتے اُن کی دُم کے بارے میں ماہرینِ فلکیات کا

یہ کہنا ہے کہ جب کوئی دُمدار ستارہ سورج کے قریب آتا ہے تو سورج کی گرمی اس کے مادّے کے بڑے حصے کو گیس کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہے چنانچہ سورج کی گرمی کا دباؤ جب ستارے پر پڑتا ہے تو وہ مادہ جو سورج کی شدید حرارت کی وجہ سے گیس میں تبدیل ہو چکا تھا سورج سے پرے ہٹنے کی کوشش کرتا ہے مگر بالکل الگ تو نہیں ہو سکتا اس لئے دُم کی شکل اختیار کر لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ سورج کے مخالف سمت میں رہتا ہے۔ خیال ہے کہ دُمدار ستارے کے یہ ذرات سوئی کے سرے سے

(تصویر۔۱)




دُمدار تارے کی دم ہمیشہ سورج کی مخالف سمت میں ہوتی ہے

زیادہ بڑے نہیں ہوتے۔ لیکن اس کے برخلاف مرکز کے اجزاء چند من سے لے کر چھوٹے چھوٹے گرد کے ذرات کی طرح کے ہوتے ہیں" دُمدار ستاروں کی ماہیت اور تحریک دریافت کرنے کے لئے ان میں طیف پیمائی کی گئی اور شہابی ٹکڑوں کی نوعیت کو جانچا گیا تو اس بات کا پتہ چلا کہ یہ بھی ایسے ہی عناصر سے بنے ہیں جن سے زمین بنی ہے۔

آپ نے زحل کے اطراف جو حلقے ہیں اُن کے بارے میں سُنا ہوگا جب کوئی جسم سیارے سے ایک معینہ فاصلہ پر آجاتا ہے تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں"۔ اس طرح خیال ہوتا ہے کہ سیاروں کی پیدائش کے وقت وہ چھوٹے چھوٹے اجرام بھی وجود میں آئے ہوں گے جو بعد میں ٹوٹ پھوٹ کر دمدار ستارے بنے۔ پھر بڑے دُمدار ستاروں کے ٹوٹنے سے چھوٹے چھوٹے دمدار ستارے بنے"۔ چنانچہ ہمارے نظام شمسی کے بارے میں خیال ہے کہ اس کے تحت سوا لاکھ سے زیادہ دُمدار ستارے ہیں۔

دُمدار ستارے حقیقتاً ٹوٹتے ہیں اس بات کی تصدیق ۱۸۴۶ء میں بیلا Biela کے دُمدار ستارے سے ہوئی۔ یہ ستارہ سورج سے اتنا قریب آگیا تھا کہ ٹوٹ کر دو حصّوں میں بٹ گیا دُمدار ستارے کا جسم دو حصّوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک مرکزہ یعنی سر اور دوسرا حصّہ دُم کہلاتا ہے۔ مرکزہ کا حجم بڑھتا گھٹتا رہتا ہے لیکن عام طور سے اس کا حجم زمین کے قطر کے چار گنے سے لیکر پچیس گنے تک ہوتا ہے لیکن بعض ستاروں کے مرکزے بہت بڑے بھی دیکھے گئے ہیں چنانچہ ۱۸۶۱ء میں دیکھے گئے۔ دمدار ستارے کا مرکز سورج سے بھی بڑا تھا ستارہ کا یہی حصّہ بہت زیادہ روشن ہوتا ہے جو سورج کی روشنی کی وجہ سے چمکتا ہے۔ مگر بعض ایسے بھی دُمدار ستارے ہیں جو خود اپنی روشنی سے منور نظر آتے ہیں۔ اس کی دُم نہایت لطیف اور باریک ذرات پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ اتنی لطیف ہوتی ہے کہ دُوسری طرف کے ستارے صاف طور پر نظر آتے ہیں ایک مرتبہ تو ہماری زمین خود اس کے درمیان سے نکل گئی تھی لیکن کسی کو خبر نہیں ہوئی۔ سوائے ماہرین فلکیات اور سائنسدانوں کے۔ اس کے مرکزہ کی طرح دم کی لمبائی بھی مقرر نہیں ہوتی۔ بعض دُمدار ستاروں کی دُم ۶ لاکھ میل لمبی بھی دیکھی گئی ہے اور بعض دمیں اتنی بھی بڑی دیکھی گئی ہیں کہ اگر سورج کو اس کے مقام سے ہٹا کر دُمدار ستارے کو اس کی جگہ رکھ دیں تو اس کی دُم ہماری زمین تک باسانی پہنچ سکتی ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ زمین سے سورج کا فاصلہ ۹ کروڑ انتیس لاکھ میل ہے۔ اب یہ بھی سنئے کہ دُمدار ستارے روز کیوں نظر نہیں آتے۔ یہ سمجھنے کے لئے آپ کو خاکہ ۲ پر غور کرنا ہوگا آپ نے دیکھا کہ زمین کا مدار گول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایک ہی فاصلے پر سورج کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس شمسی دمدار ستارے کا مدار انتہائی بیضوی ہے۔ چنانچہ اس کا ایک حصّہ سورج کے بہت قریب ہے تو دوسرا حصّہ لامحدود فاصلہ پر ہے یہی وجہ ہے کہ دُمدار ستارہ اپنے مدار پر گردش کرتے ہوئے جب سورج کے قریب آجاتا ہے تو ہمیں اس کی زیارت ہو جاتی ہے اور جب وہ اربوں میل کے فاصلہ پر چلا جاتا ہے تو ہماری آنکھیں اور دُوربینیں اس کے دیکھنے سے محروم رہ جاتی ہیں اور پھر یہ طویل ترین فاصلہ طے کرنے

(۲)

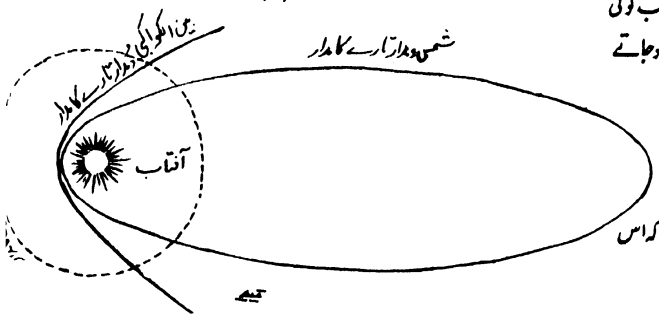


میں ایک مدت لگ جاتی ہے۔

اس کے مدار کی وسعت کا اندازہ اس سے باسانی لگایا جا سکتا ہے

نیپچون ستیارے کا مدار سورج سے ..... ۲۷۹۳۵ میل دور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سیارے کو سورج کے گرد ایک چکر پورا کرنے کے لیے ۱۶۵ سال لگ جاتے ہیں لیکن دُمدار ستارے کا مدار سیاروں کے مدار سے کوئی بیس گنا دُور ہے آپ ہی اندازہ لگا لیجئے کہ ۲۰ گنا بڑے مدار والے سیارے کو ایک چکر مکمل کرنے میں کتنا عرصہ درکار ہوگا ایسے ہی دُمدار ستاروں کو سورج کے گرد ایک چکر پورا کرنے میں چالیس پچاس ہزار برس لگ جاتے ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کا مدار خاصا چھوٹا ہے اِن نے چوتھے یا پانچویں سال دکھائی دے جاتے ہیں۔ اِن سے ہٹ کر بین الکواکبی دُمدار تارے بھی ہیں جن کا مدار ٹوٹا ہوا ہے یعنی اُن کے دونوں سرے کہیں نہیں ملتے۔ ایسے دمدار تارے قطعی مہمان ہوتے ہیں۔ اور اس مدار کو مسافر خانہ سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ نظر آجانے کے بعد کائنات کی بے کراں وسعتوں میں گم ہو جاتے ہیں اور پھر کبھی نظر نہیں آتے۔

بیلا Biela کے دُمدار تارے کے بارے میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ وہ ٹوٹ کر دو حصّوں میں تقسیم ہو چکا تھا چار مہینے تک اس ستارے کے یہ دونوں حصے دو دمدار ستاروں کی صورت میں آگے پیچھے تقریباً ڈیڑھ لاکھ میل کے فاصلے پر چلتے رہے۔ مگر ۱۸۵۲ء میں یہ پھر جب نظر آئے تو اُن کا درمیانی فاصلہ بڑھ کر ۵ لاکھ میل ہو گیا تھا۔ وقت مقررہ پر لوگ انہیں دیکھنے کے لئے بے چین تھے کہ دُمدار ستارے کے بجائے انہیں شہابیے نظر آئے اُس سے ماہرین نے یہ قیاس قائم کیا کہ یہ دُمدار ستارے کسی دُوسرے سیارے کی زد میں آکر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور "مسلسل" نامی شہابی جھنڈ میں تبدیل ہو گئے۔ اس طرح ۱۹۱۲ء میں ٹیلر Taylor کا دمدار ستارہ ٹوٹ کر دو حصّوں میں بٹ گیا اور ۱۸۸۲ء میں ایک اور دُمدار تارہ ٹوٹ کر چار ہو گیا۔ اسی طرح دمدار ستارے ٹوٹ پھوٹ کر وہ اجرام وجود میں آتے ہیں جنہیں ہم شہابیہ یا شہاب ثاقب کہتے ہیں۔

یہ شہابات دو قسم کے ہوتے ہیں ایک لوہے سے مرکب ہوتے ہیں اور دوسرے پتھر سے۔ سائنسدانوں نے دونوں ہی شہابیوں کا کیمیاوی تجزیہ کر کے یہ معلوم کیا کہ ان میں اولالذکر شہابات مین نکل کے ساتھ ایک آمیزہ کی شکل میں لوہا ہوتا ہے اور یہ دھات ایسی ہے کہ ہماری زمین پر قدرتی حالت میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ اِن کے علاوہ ایک درجن مادّی اجزا ایسے بھی ہیں جو زمین پر نہیں پائے جاتے اور صرف شہابات میں پائے جاتے ہیں۔ لوہے کے شہابات میں نکل میگنیشم، آکسیجن، سلکان، المونیم، گندک اور فاسفورک موجود ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان کے علاوہ میگنیز، ٹانبہ، قلعی، ہیڈروجن، نیٹروجن اور کوبالٹ کی بھی قلیل مقدار پائی گئی ہے۔ شاذ ہی شہابات کی صورت میں پلاٹینم، سونا اور ایریڈیم بھی پائے گئے ہیں اس کے برخلاف پتھر کے شہابات کا بیشتر حصہ پتھر ہی پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ ان ہی اجزا سے مرکب ہوتا ہے۔ جولاوا وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ ان دونوں قسموں سے ہٹ کر کچھ شہابات ایسے بھی ہوتے ہیں جو پتھر اور لوہے سے مرکب ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض شہابات میں کاربن بھی پائی گئی ہے چنانچہ ایک شہابیے میں ۱/۵ انچ قطر کا ہیرا برآمد ہوا تھا اور بعض شہابات سیاہ ہیرے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے مزین بھی ہوتے ہیں۔ تاب کاری ذرائع سے دونوں قسم کے شہابات کی عمر کا جو اندازہ لگایا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی شہابیے کی عمر زمین کی عمر سے زیادہ نہیں ہے۔ چنانچہ اسی خیال نے ماہرین کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ شہابات ہمارے نظام شمسی کے پیدا کردہ ہیں اور اُن کی پیدائش کا ان اجرام فلکی سے قطعی کوئی تعلق نہیں جو ہمارے نظام شمسی کے حدود سے باہر ہیں۔

اکثر آپ نے دیکھا ہوگا کہ آسمان پر ایک تارا ٹوٹ کر روشن لکیر بناتا ہوا تھوڑی دُور پر ختم ہو جاتا ہے بعض اوقات تو ایسے مناظر بڑے ہی دیدہ زیب اور شاندار ہوتے ہیں۔ اسی کو عرفِ عام میں "تارا ٹوٹنا" کہتے ہیں۔ مگر حقیقتاً کوئی تارا ٹوٹتا نہیں بلکہ زمین اور دوسرے سیاروں کی طرح بیسیوں چھوٹے چھوٹے اجسام بھی سورج کے گرد چکر لگا رہے ہیں جب کبھی ان چھوٹے چھوٹے اجسام میں سے ایک آدھ زمین کے قریب آجاتا ہے تو زمین اُسے پوری قوت سے اپنی طرف کھینچتی ہے اور یہ اجسام اتنی تیزی سے زمین کی طرف آتے ہیں کہ فضا میں سے گزرتے وقت ہوا کی رگڑ سے پہلے وہ گرم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد مشتعل ہو کر چمکنے لگتے ہیں۔ مگر اکثر ایسے ہیں جنہیں زمین دیکھنا نصیب بھی نہیں ہوتا اور درمیان ہی میں چمکدار راکھ ہو جاتے ہیں اور یہ راکھ فضا میں منتشر ہو جاتی ہے مگر جو بڑے بڑے شہابیے ہیں۔ وہ جلنے کے باوجود زمین تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔ ایسے شہاب ثاقب کو "حجر شہابی یا شہابیہ" کہا جاتا ہے۔ اس وقت وہ بہت زیادہ گرم اور انگارے کی طرح روشن ہوتے ہیں۔ بعض اوقات اُن کا بیرونی حصّہ اس قدر گرم ہو جاتا ہے کہ وہ زبردست دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہزاروں کی تعداد میں آسمان پر کسی نے آتش بازی چھوڑ دی۔ چنانچہ ۱۹۴۳ء میں اجمیر کے قریب ایک بہت بڑا اور چمکدار شہابیہ مشرق سے مغرب کی طرف گزرا اور اس سے سفید چنگاریاں نکل رہی تھیں اُس کے بعد ایک زبردست دھماکہ ہوا اور اس دھماکے کی آواز تیس بتیس میل تک سنائی دی۔ ۱۸۰۳ء کو فرانس کے علاقے نارمنڈی میں ایک شہاب تیزی سے گزرتا ہوا نظر آیا اس کے بعد ہی زبردست دھماکے سے پھٹ پڑا۔ اس دھماکے کی آواز اسّی میل تک سنی گئی۔ اکثر و بیشتر وہ گر کر زمین میں دھنس جاتے ہیں اور سطح زمین پر وہ دھانے وجود میں آجاتے ہیں



اری زونا کا
"شہابی دہانہ"
(ہوائی جہاز سے لی گئی
تصویر کی نقل)

جنہیں "شہابی دہانے" کہتے ہیں گرے ہوئے شہابئے جو اب تک دستیاب ہوئے ہیں اُن کا وزن چند سیر سے لے کر سینکڑوں من تک ہے۔ کوئٹہ میں ایک شہابیہ ۱۹۳۵ء میں گرا تھا جس کا وزن چھ ٹن تھا۔ تاریخی عہد کا سب سے بڑا شہابیہ "ہوبا" کا شہابیہ ہے جس کا وزن ساٹھ ٹن کے قریب تھا۔

شہابی دہانے اکثر ممالک میں پائے گئے ہیں ان تمام شہابی دہانوں میں سب سے بڑا دہانہ امریکہ کے علاقے "اری زونا" میں پایا گیا ہے جو تین میل کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے اور ۵۷۰ فٹ گہرا ہے۔ اب یہ بھی سنئے اتنا عظیم اور زبردست دہانہ بنانے والے شہابیہ کے بارے میں کہ یہ کب گرا، اس کے گرنے سے اطراف واکناف کے علاقوں کی کیا حالت ہوئی ہوگی اور یہ کن مرکبات پر مشتمل تھا اس کا وزن کتنا تھا اور یہ زمین میں دھنسنے کے بعد اتنے رقبہ زمین کی کیا حالت ہوئی وغیرہ کچھ معلوم نہیں۔ ابتدا میں جن لوگوں نے یہ غار دیکھا تو اُن کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ اتنا زبردست غار زمین میں کس طرح بن گیا لیکن کھوج کرنے پر اس کے اطراف میں شہابی لوہا پایا گیا۔ تب لوگوں کو شبہ ہوا کہ شہابئے کے گرنے کی وجہ ایسا ہوا ہو۔ مزید تحقیقات نے شک وشبہ کو یقین میں بدل دیا۔ اس یقین کی وجہ یہ ہوئی کہ "دہانے کے اطراف کی چٹانیں افقی حالت میں ہیں لیکن غار کے کنارے کی بعض چٹانیں عمودی حالت میں سیدھی کھڑی ہیں جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ کسی زبردست چیز کی ٹکر سے یہ چٹانیں اُٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ غار میں جو نرم چٹانیں تھیں وہ پس کر سفوف ہوگئیں۔ . . . . اس جگہ سے اتنا شہابی لوہا جمع کیا گیا کہ دُنیا بھر کے جمع شدہ شہابی لوہے سے زیادہ تھا"

غار کی چوڑائی اور گہرائی سے اندازہ لگایا گیا کہ اس شہاب کا وزن کم از کم . . . . . ۱۴ ٹن ہوگا اور ۵۰۰ فٹ یقیناً چوڑا تھا جب لوگوں کو یہ یقین ہوگیا کہ غار شہاب ثاقب کی وجہ سے بنا ہے تو اس شہاب سے لوہا، پلیٹینم وغیرہ جیسی قیمتی دھاتیں نکالنے کی سوجھی۔ چنانچہ غار کی تہ میں کھدائی کا کام شروع ہوا تاکہ نمونے نکال کر اس کی جانچ کر سکیں۔ مگر ۲۹ سوراخ کرنے کے باوجود جب کچھ نہ نکلا تو لوگ متعجب ہوئے کہ شہابیہ کہاں غائب ہوگیا۔ بعد کی تحقیقات نے لوگوں کو سمجھایا کہ شہابیہ عموداً نہیں بلکہ ترچھا گرا ہے۔ چنانچہ غور کرنے سے پتہ چلا کہ غار کا جنوبی کنارا اور کناروں کی بہ نسبت تقریباً سو فٹ زیادہ اٹھ گیا ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت بھی تھی کہ شہاب یا مدار تارہ شمالی سمت سے گر کر جنوبی سمت میں دھنس گیا تھا۔ جنوبی کنارے کو پون میل تک اُدھیڑ ڈالنے کے بعد تب کہیں جا کر شہابیہ کا پتہ چلا۔

اس واقعہ کے تعلق سے ماہرین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ کچھ تو اسے پانچ ہزار برس پہلے کا کہتے ہیں اور کچھ اس بات پر مصر ہیں کہ دو ہزار برس سے زیادہ کا نہیں جس وقت یہ گرا ہوگا تو اطراف کے علاقوں کی کیا حالت ہوئی، کس قدر بھیانک آواز سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔ اس کا صحیح اندازہ لگانے سے سائنسداں عاجز ہیں۔ ایک دوسرا واقعہ سنیئے اور خود ہی اندازہ لگانے کی کوشش کیجئے۔

یہ واقعہ شمالی سائبیریا کے علاقے کانسک میں ۱۹۰۸ء میں پیش آیا تو اس دھماکے کی آواز چار سو میل تک سُنی گئی تھی۔ ہوا میں جو موجیں پیدا ہوئیں ان کا اثر کیمبرج تک پہنچا۔ ہزاروں، لاکھوں درخت جل گئے، تیس میل تک پودے جھلس کر رہ گئے اور جس مقام پر یہ گرا چند میل تک کی حالت ایسی ہوگئی تھی جیسے بڑی بڑی توپوں سے گولہ باری کی گئی ہے۔ کانسک ایک غیر آباد علاقہ تھا۔ اگر اس کی جگہ گنجان آبادی ہوتی تو آج کل کی جنگ کے نقصانات اس کے سامنے ہیچ ہوتے۔

اب یہ بھی سُن لیجئے کہ شہابیوں اور مدار تاروں کا کیا تعلق ہے۔ شہاب ثاقب کے بہت سے مشہور جھنڈ مختلف مدار تاروں کے مدار پر چلتے ہیں خیال کیا جاتا ہے کہ سورج، زمین اور مختلف سیاروں کی زد میں آکر مدار تارے ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں اور اس کھینچ تان اور توڑ پھوڑ کے عمل سے کچھ چھوٹے بڑے ذرے اور ٹکڑے جو آزاد ہو جاتے ہیں وہ شہابوں کی شکل میں فضا میں اپنے پرانے مدار ہی میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی ہم تک پہنچتے ہیں۔

ماہرین کا خیال ہے کہ شہابی بوچھاڑ کا منبع وہ مدار تارے ہیں جن کا وجود قریب الختم ہوتا ہے۔ اُن کے جسم کے ذرات علیحدہ ہو کر خلا میں منتشر ہونے لگتے ہیں۔ یہ عمل آہستہ آہستہ ہونے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ پورا مدار تارہ فنا ہو جاتا ہے۔ اس عمل کے مکمل ہونے کے لئے لاکھوں سال درکار ہوتے ہیں۔

کیا ہے میرے ہی لئے درد کا ساغر تنہا
تیری محفل میں جو پیتا ہوں برابر تنہا
کچھ خبر اس کی ہے قاتل تجھے، کتنے دل کو
کر گیا قتل ترے ناز کا خنجر تنہا
کون اٹھائے گا ستم بعد مرے اس کا ہے غم
ہو نہ جائے کہیں دنیا میں ستمگر تنہا
کیوں کیا ترک تعلق دلِ ناداں اس سے
ہم نہ کہتے تھے کہ رہ جائے گا ہو کر تنہا
کارواں چھٹنے پہ بھی عزم تو دیکھے کوئی
چل پڑے ہیں رہ منزل پہ ہم اکثر تنہا
دیکھا کیا ہے تو اے موجۂ طوفان بلا
کتنی طغیانی سے گزرا ہے یہ لنگر تنہا
اے کریم اب تو ہے بس لاج جنوں کے ہاتھوں
سنگ صدہا ہیں اُدھر اور اِدھر سر تنہا

کریم اسعدی

چشمِ لطف ایک طرف، لطفِ ستم سے بھی گئے
ایک تبسم ہی نہیں دیدۂ نم سے بھی گئے
جانے کیا بات ہے اٹھتے ہی نہیں دستِ طلب
لیجئے آج تماشائے کرم سے بھی گئے
بیدلی ہائے تمنا کا یہ عالم ہے کہ ہم
عشرتِ زیست تو کیا لذتِ غم سے بھی گئے
اپنی سوگند نہ کھانے کی قسم دیتے ہیں
لو گنہگارِ وفا اُن کی قسم سے بھی گئے
سنتے ہیں عشق میں مرنا ہے حیاتِ جاوید
یہ اگر سچ ہے! تو ہم خوابِ عدم سے بھی گئے
خود پرستی نے کہیں کا بھی نہ رکھا ہم کو
اُنکے در سے بھی گئے دیر و حرم سے بھی گئے
رامش و رنگ میں گم ایسے ہوئے ہیں میکش
صاحبِ سیف و قلم، سیف و قلم سے بھی گئے

میکش اکبرآبادی

چشمِ میگوں نے نہ چاہا کوئی زنہار گرے
اپنی افتادِ طبیعت سے قدح خوار گرے
ہوں سزایاب نہ اعدائے مسیح مصلوب
ہم نہیں چاہتے اوجِ رسن و دار گرے
جشنِ معمارِ حرم، عالمِ پیما نے پر
صنمِ کبر وہ ٹوٹے بتِ پندار گرے
دورِ تیرہ سے نہ انسان کی قیمت مانگو
شام کے وقت کا دستور ہے بازار گرے
مستیِ فصلِ بہاراں کو ذرا چونکا دو
گل کا منصب یہ نہیں برقدمِ خار گرے
عزتِ نفس پہ اس دورِ جنوں کے ہاتھوں
وقت آیا ہے کہ دامن کا ہر اک تار گرے
مسندِ گل کو دی ترجیح ہوسکاروں نے
آگ میں سوزِ محبت کے پرستار گرے
لب پہ آئی ہے شگوفوں کے دعائے سحری
برق در یا پہ گرے یا سرِ کہسار گرے
اُن کے آنسو نہیں مانی مرے دامن کے لئے
بجھ گئے راہ میں تارے جو شبِ تار گرے

تاباں واسطی

سمٹ گئے جو شرارے تو آفتاب بنے
بھٹک گئے تھے خلاؤں میں ہم سحاب بنے
وہ سانپ بن کے جو دوڑا رہے تھے پانی میں
وہی تو بیٹھے ہیں ساحل پہ مرغِ آب بنے
بسرتے بھولتے لمحات کا تناؤ نہ پوچھ
خلا میں تیرتے ذرّے بھی آفتاب بنے
کسی نے مڑ کے نہ دیکھا پھر ان نظاروں کو
وہ ریگزار میں تڑپا کئے سراب بنے
ہزار حلقۂ انجم ہے پھر بھی ہم تاباں
بھٹکتے پھرتے ہیں تنہا سے ماہتاب بنے

مانی ناگپوری

# نئی کتابیں

## بمبئی میں اُردو (۱۹۱۴ء تک) از ڈاکٹر میمونہ دلوی

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی۔ ۲۵

صفحات: ۴۳۲ قیمت ۱۲ روپے ۵۰ پیسے

بمبئی میں اُردو ڈاکٹر میمونہ دلوی کی کتاب ہے جس میں انہوں نے ۱۹۱۴ء تک بمبئی میں اُردو شعروادب کی نشوونما کا جائزہ لیا ہے اُردو زبان اس معنی میں ہندوستان گیر زبان ہے کہ یہ کسی ایک خطے یا علاقے تک محدود نہیں۔ اُردو ادب نے کئی علاقائی جائزے، مثلاً دکن میں اُردو، بہار میں اُردو، بھوپال میں اُردو، اب تک شائع ہو چکے ہیں بمبئی اگرچہ مرہٹی کا علاقہ ہے لیکن اس کی شہری آبادی میں اُردو جس طرح مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان لسانی رابطے کا کام دیتی رہی ہے۔ اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ بمبئی کی اولین تصنیف قاسم مہری کی طویل مثنوی عروس المجالس ہے جو ۱۷۹۴ میں لکھی گئی۔ ڈاکٹر میمونہ دلوی نے لگ بھگ اس زمانہ سے اپنی معلومات مخطوطات اور مطبوعات کی روشنی میں پیش کی ہیں۔ قدیم دور میں بمبئی کے گہرے تعلقات گجرات اور دکن سے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے قدیم مصنفین اپنی زبان کو دکنی کہتے ہیں۔ اگرچہ لسانی اعتبار سے ان کی زبان دکنی سے مختلف ہے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں بمبئی کو اُردو کے مرکز کی حیثیت حاصل نہیں تھی، اس وقت اُردو کے نام کا ڈنکا دہلی لکھنؤ اور شمالی ہندوستان کی بعض ریاستوں میں بج رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس جائزے میں اعلیٰ پایہ کے ادبیات کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر ہے بمبئی کی ادبی اہمیت ۱۹۱۴ کے بعد بڑھی ہے۔ جب یہاں فلمی صنعت کو فروغ ہوا ہے اور اُردو کے کئی ادیب اور شاعر یہاں پہنچ گئے۔ کتاب میں نثر، نظم، صحافت، تھیٹر، تعلیمی ادارے، علمی تحریکیں ہر پہلو پر محنت سے لکھا گیا ہے اس دور میں اگر بمبئی کا کوئی کارنامہ ہے تو وہ دراصل تھیٹر ہے۔ مصنفہ نے اُردو ڈرامہ نگاروں کا تو تذکرہ کیا ہے چاہئے تھا کہ ڈراموں کا تجزیہ بھی شامل کیا جاتا۔ اس کتاب کی اہمیت، بہرحال اس میں ہے کہ بیسویں صدی میں اُردو کا مرکز بننے سے پہلے بمبئی میں اُردو کی جو روایت اور تاریخ تھی وہ اس کتاب کی مدد سے سامنے آگئی ہے۔

(گوپی چند نارنگ)

## سیاہ، سُرخ، سفید

ناشر:۔ نیشنل بک ڈپو، چملی کمان، حیدرآباد۔ ۲ قیمت: چار روپے

پچھلے تین چار برسوں میں اُردو میں جو ناول شائع ہوئے ہیں۔ اُن میں آمنہ ابوالحسن کا ناول "سیاہ، سرخ، سفید" غالباً پہلا ناول ہے جو اپنے موضوع اور اچھوتے Treatment کے اعتبار سے قارئین کی توجہ فوری طور پر اپنی جانب کھینچنے میں کامیاب ہو سکا ہے۔ ناول میں قاری کو چونکانا بہت آسان کام ہے۔ لیکن ایک بار اُسے چونکا دینے کے بعد ناول کے دائرے سے نکلتے وقت قاری کے اچنبھے پن کو فطری سکون یا منطقی طمانیت عطا کرنا بہت مشکل ہے اور یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں بہت سے قاری ناول نگار کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ آمنہ ابوالحسن کے ناول کی بنیادی خوبی یہی ہے کہ انہوں نے اپنے قاری کو غیر ضروری Strains اور دھماکوں سے گزرنے نہیں دیا ہے۔

آمنہ ابوالحسن کے ناول کا تھیم ویسے تو کوئی نیا نہیں ہے۔ فرانسیسی ناول نگاروں نے اس موضوع پر شاہکار ناول لکھے ہیں۔ یہ داستان ایک مثلث کی داستان ہے اور مثلث جب انسانی رشتوں کی بنیاد بنتا ہے تو ایک بھیانک رُوپ اختیار کر لیتا ہے یا پھر اس کی شکل بگڑ جاتی ہے لیکن آمنہ ابوالحسن کے ناول کا جو مثلث ہے وہ بگڑنے کی منزل پر پہنچ کر بھی اپنے زاویوں کو باقی رکھتا ہے۔ داستان کے سارے کردار انتشار میں اتحاد کی ایک تلاش میں مصروف ہیں جس میں وہ ٹوٹتے پھوٹتے ہیں بشدید ہیجانوں سے گزرتے ہیں لیکن انجانے طور پر اس مثلث کو نقصان نہیں پہونچانا چاہتے۔ مثلث جب مر بھی جاتی ہے تو الطاف اور فرخ صرف اپنے ذہن کے بل بوتے پر اس مثلث کو باقی رکھنا چاہتے ہیں اور اس کا مرکز صرف نشاط ہی ہوتی ہے جو اس دُنیا میں موجود نہیں ہے۔

ناول کے تینوں بنیادی کرداروں کے علاوہ ایک اور کردار بھی اس ناول میں موجود ہے۔ وہ ہے اس ناول کا "میں"۔ اس "میں" کا کوئی مادّی وجود نہیں ہے بلکہ یہ اصل میں نشاط کا "ضمیر" ہے جو سایہ کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اور زندگی کے ہر پیچیدہ موڑ پر اس کے مقابل آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کردار کی وجہ سے اظہار بیان میں بڑا تنوع اور شدت پیدا ہو گئی ہے اور یہی کردار بالآخر نشاط کے کردار کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

"سیاہ سرخ سفید" اپنے مخصوص موضوع اپنے اچھوتے Treat ment کے باعث اُردو ادب میں یقیناً ایک اہم مقام حاصل کرے گا۔

(حسن عسکری)

## کینسر وارڈ

مصنف: الیکزنڈر سولنسٹین۔ مترجم: گوپال متل۔ سائز: ۲۰×۳۰/۱۶
ضخامت: ۴۵۸ صفحات۔ قیمت: تین روپے۔ ناشر: نیشنل اکاڈمی، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۶

روسی مصنف الیکزنڈر سولنسٹین کی شہرت ایک ناول نگار کی حیثیت سے ۱۹۶۲ء میں اُن کے ناول "آیون ڈینی سووچ کی زندگی کا ایک دن" کی اشاعت کے ساتھ شروع ہوئی اور بعد میں ان کے دوسرے ناولوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ بیرونِ روس تک جا پہنچی۔ زیرِ تبصرہ ناول ان کی ان تصنیفات میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے جن پر انہیں ۱۹۷۰ء میں سویڈش اکاڈمی نے ادب کا نوبل پرائز دیا۔ یہ ناول روس کے ایک دُور افتادہ صوبائی ہسپتال کے اندرونی ماحول کی تصویر کشی سے شروع ہوتا ہے اور مختلف سماجی سطحوں پر زندگی بسر کرنے والے پارٹی ممبروں کی نفسیات اُن کے باہمی تضادات اور تعصبات، معانی کے دور میں جبری مشقت کے کیمپوں سے رہائی پانے والے ان لوگوں کے احساسات جن کی عمر کا بہترین حصہ کیمپوں میں بسر ہوا، کے ذہنی تذبذب کا عکاس ہے۔ شہری اور دیہی معیشت کے فرق زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا مریضوں کے اندیشے اور خواہشات اور موت کے سرد ماحول میں بھی گاہ بہ گاہ محبت، زندگی اور اُس کی خوبصورتی سے محبت کی نیم جاں چنگاریوں کا بھڑک اُٹھنا ——— ان سب باتوں کو ناول میں اس طرح ایک لڑی میں پرو دیا گیا ہے کہ عام انسانی زندگی کے بارے میں بہت سے بنیادی سوالات بھی قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتے ہیں۔

ترجمہ شگفتہ، سلیس اور بامحاورہ اُردو میں ہے۔

فضل الرزاق

## منزل کی طرف (شعری مجموعہ) دواکر راہی

قیمت: پانچ روپے، ناشر: بزمِ شعراء رام پور۔ دو محلہ روڈ رام پور

زیرِ تبصرہ مجموعۂ کلام "منزل کی طرف" میں جناب دواکر راہی نے ایک طرف معاشرتی حالات کو اپنی محسوسات میں شامل کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے تو دوسری طرف اپنے داخلی محسوسات اور جذبات کو بے خلوص سے بیان کیا ہے کہ قاری کی محسوسات سمجھ بیٹھے ایک طرف غمِ جاناں کی تاریخ میں زخموں کے چراغ جلائے یا تو دوسری سمت غمِ دوراں کی چیخ بھی سُنائی پڑتی ہے۔ ان کے اشعار میں گیان دپارسا، تصوف و فلسفہ، اخلاق و تہذیب، راز و نیاز، ہجر و وصال اور شوق انتظار جیسے تمام موضوعات ملتے ہیں۔ مگر کہیں بھی غزل کی کیفیت کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ راہی صاحب کی شاعری میں کہیں بھی مایوسی اور کم حوصلگی نظر نہیں آتی بلکہ جگہ جگہ حوصلہ اور اُمید ملتی ہے۔

کلام میں پختگی اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ دلکشی اور رندانہ سرمستی بھی ہے راہی صاحب شاعری کو صرف تفریح کا مشغلہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ جذبات ابھارنے اور بیدار کرنے کا ذریعہ بھی مانتے ہیں۔

مجموعے کی کتابت اور طباعت بہت اچھی ہے۔ گٹ اپ اور سرِ ورق بھی دیدہ زیب ہے متعدد تصاویر اور اہلِ قلم کی رائیں شامل ہیں۔ امید ہے ادبی حلقوں میں یہ مجموعہ مقبول ہوگا۔

(شاہد ماہلی)


بچوں کے لئے مفید کتابیں

| | |
|---|---|
| ہمارے نہرو | ۳ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کی تاریخ | ۳ روپے ۷۵ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں حصہ اوّل | ۲ روپے ۲۵ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں حصہ دوم | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| ہندوستان کی نامور ہستیاں حصہ سوم | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| سوامی وویکانند | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |
| مہاتما گاندھی (رنگین تصویروں میں) | ۲ روپے ۵۰ پیسے |
| اچھا شہری | ایک روپیہ |

محصول ڈاک ہمارے ذمہ ہوگا
آج کل کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت دی جائیگی

اُردو کے علاوہ انگریزی ہندی اور تمام علاقائی زبانوں میں کتابیں شائع ہوتی ہیں۔

فہرست کتب طلب کیجئے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی-۱



ہندوستان کی مسجدیں

از ضیاء الدین ڈیسائی

مآذن کلاں، وہ صفات، نام کی عمدہ چھپائی، قیمت وہ بے حد اسلامی ساخت میں سجی کیا ہیت ہے مسجدوں کی تعمیر کے ہوئے اور تعمیر کے کلام کے بعد مہر کیا تبدیلیاں آئیں ان تمام باتوں کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے مسجدوں کے فن تعمیر کے متعلق ایک نایاب ہے۔

ہندوستان کی مشہور مسجدوں کو متعدد رنگا رنگ تصاویر شامل ہیں

اس کے علاوہ اُردو و دیگر علاقائی زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں کے نئے فہرست طلب کیجئے۔

کتابیں ہم اپنے خرچ پر خریداروں کو بھیجتے ہیں

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس پوسٹ بکس ۱۱۰۲ نئی دہلی-۱

.... کنووکیشن کا دن۔ منجو کو اس بات کی خوشی ہے کہ
اُس کا بیٹا گریجویٹ ہوگیا۔
سب مائیں یہ خواہش کرتی ہیں کہ ان کے بیٹوں کو تعلیم اور عزت ملے۔
لیکن تعداد زیادہ ہونے پر سبھی ماں باپ اپنے بچّوں کو
زندگی میں یہ مواقع فراہم نہیں کر سکتے۔
اگر آپ اپنے خاندان کو دو یا تین تک محدود رکھیں تو اپنے
بچّوں کو بہتر تعلیم دلا سکتے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کے لئے مُفت مشورے اور خدمات آپ کو فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹرس سے دستیاب ہیں۔ اُن کی پہچان لال تکون سے ہو سکتی ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی بہتر تعلیم کے لئے

# پُرمسرّت دن



DAVP 70/242

# آجکل

جولائی ۱۹۷۱ء

۷۰ پیسے

Osmania University Library
Hyderabad-7 (A.P.)





۲۷ مئی ۱۹۷۱ء کو ملک میں شری جواہر لال نہرو کی ساتویں برسی منائی گئی۔ اس دن صبح شانتی ون (دہلی) میں پرارتھنا سبھا کی گئی مجلس میں صدر جمہوریۂ ہند شری وی وی گری اور وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے شرکت کی۔ اُس دن تین مورتی (نئی دہلی) میں بھی شری نہرو کی یاد میں کئی پروگرام منعقد کئے گئے۔ اس موقع پر نابینا لوگوں کے لئے تیار کی گئی شری نہرو کی سوانح عمری کا اجرا بھی کیا گیا۔

(تصویر میں) شریمتی اندرا گاندھی نابینا لوگوں کی تنظیم کے ایک نمائندے کو سوانح عمری کی جلد عطا کر رہی ہیں۔

# آج کل

دہلی

شہباز حسین

ہندکشور وکرم

جولائی ۱۹۷۱ء

۱۸۹۳

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن


| | | | |
|---|---|---|---|
| ملاحظات | | ادارہ | ۲ |
| غبار کارواں | (۱۷) | خواجہ احمد عباس | ۳ |
| شملے کی سیر | (نظم) | عرش ملسیانی | ۱۰ |
| حساب کتاب | (کہانی) | جیلانی بانو | ۱۱ |
| غزل | | آزاد گلاٹی | ۱۵ |
| نیا ساز، نیا انداز | | نازش پرتاب گڈھی | ۱۶ |
| جدید ایران | | نورالحسن انصاری | ۱۷ |
| احساس | (نظم) | شمس کامٹوی | ۲۲ |
| غزلیں | | احتشام اختر حامد حسین حامد<br>دور آفریدی | ۲۳ |
| نیا چہرہ | (کہانی) | نشاط قیصر | ۲۴ |
| راستہ | | آفتاب شمسی | ۲۶ |
| کچھ غالب اور اسد تخلص کے بارے میں (۲) | | عابد پشاوری | ۲۷ |
| غزل | | فخر رضوی | ۳۱ |
| تصویر اور جھوٹ | (ڈرامہ) | ابراہیم یوسف | ۳۲ |
| غزل | | محمد یعقوب اسلم | ۳۷ |
| کولمبو پلان | | نریندر نشچل | ۳۹ |
| غزل | | محمد یٰسین | ۴۱ |
| نئی کتابیں | (تبصرے) | | ۴۲ |



مضامین اور ترسیلے زر کا پتہ

شہباز حسین ایڈیٹر آج کل (اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

سالانہ: ہندوستان میں: سات روپے

دیگر ممالک سے: ۱۰ شلنگ ۶ پینس یا ڈیڑھ ڈالر

فی پرچہ: ہندوستان میں: ۶۰ پیسے

دیگر ممالک سے: ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

# ملاحظات

گزشتہ دنوں وزیر خزانہ شری وائی بی چوان نے پارلیمنٹ میں اقتصادی سروے برائے ۷۱-۱۹۷۰ء پیش کرتے ہوئے بتایا کہ اس سال چوتھے پنجسالہ منصوبے میں مقرر کئے گئے نشانے کے مطابق قومی آمدنی میں تسلی بخش اضافہ ہوا ہے اور اس کی دو اہم وجوہات زرعی اور صنعتی پیداوار میں اضافہ ہیں۔

سروے کے مطابق پچھلے دو برسوں میں زرعی پیداوار میں اضافہ کی شرح رفتار کافی زیادہ رہی ہے۔ ۷۰-۱۹۶۹ء میں ۶٫۵ فی صد کا مجموعی اضافہ ہوا ہے اور ۷۱-۱۹۷۰ء میں بھی کافی تسلی بخش اضافے ہونے کی امید ہے ایک خوش گوار پہلو یہ ہے کہ ۷۱-۱۹۷۰ء میں تقریباً تمام اناجوں کی پیداوار بڑھی ہے —

سروے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پیداوار میں اس اضافہ کی وجوہ اگرچہ موافق موسمی حالات تھے لیکن نئی حکمت عملی کے پھیلاؤ کے نتیجہ کے طور پر بھی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ اس سلسلے میں نئی حکمت عملی کو خشک کھیتی باڑی کے علاقوں میں پھیلانے، اہم مالی فصلوں اور دالوں کے لئے زیادہ اناج اگانے والی قسموں کی تلاش اور زمین کی ملکیت کے نظام میں کچھ ضروری تبدیلیاں لانے کے وسائل کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

۱۹۷۰ء کے پہلے چھ مہینوں میں ۱۹۶۹ء کے مماثل اسی عرصے کے مقابلہ میں صنعتی پیداوار کا عدد اعشاریہ ۴ء۶ فی صد زیادہ تھا اس کے بعد سے اضافہ کی رفتار سست پڑ گئی۔ پچھلے برس کے مقابلے میں ۱۹۷۰ء میں سالانہ شرح ترقی کی اوسط کم سے کم پانچ فیصد رہنے کی امید ہے جہاں تک چھوٹے پیمانے کے سیکٹر کا تعلق ہے، ریزرو بنک آف انڈیا نے اندازہ لگایا ہے کہ اس سیکٹر میں ۷۰-۱۹۶۹ء میں نمایاں یعنی ۱۱٫۲ فی صد پیداوار بڑھی ہے جبکہ ۶۹-۱۹۶۸ء میں اس سیکٹر کی پیداوار میں ۸٫۲ فی صد کا اضافہ ہوا تھا۔ ۷۱-۱۹۷۰ء میں پچھلے برس کے مقابلے میں ترقی کی رفتار میں مزید اضافہ ہونے کا امکان ہے۔

سروے میں بتایا گیا ہے کہ پرائیوٹ سرمایہ کاری کے لئے مقتضا اچھی نظر آتی ہے اس کا ثبوت حصص بازار میں مضبوطی سے ملتا ہے۔ چھوٹے پیمانے کے سیکٹر میں سرمایہ کاری اچھی خاصی مقدار میں ہو رہی ہے۔ بنکوں اور دیگر اداروں سے حاصل کئے گئے قرضے اس بات کا ثبوت ہیں۔ بڑے پیمانے کے سیکٹر کا جہاں تک تعلق ہے اس میں سرمایہ کاری میں اضافہ کا ثبوت سرمایہ کے ان اعداد و شمار سے جو حقیقی طور پر قائم کیا جا چکا ہے نیز عوامی معاملات کی طرف توجہ اور انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بنک آف انڈیا اور انڈسٹریل فنانس کارپوریشن جیسے قرضہ دینے والے اداروں کی طرف سے منظور اور تقسیم کی گئی امداد میں نمایاں اضافہ سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ۷۱-۱۹۷۰ء میں جتنے صنعتی لائسنس اور اجازت نامے جاری کئے گئے پچھلے برس کے مقابلہ میں ان کی تعداد لگ بھگ دوگنی ہے۔

علاوہ بریں ۷۰-۱۹۶۹ء کے دوران منظم سیکٹروں میں روزگار کی حالت میں بہتری ہوئی ہے مجموعی طور پر روزگار میں چار لاکھ یا ۲٫۴ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ پرائیوٹ مینوفیکچرنگ سیکٹر نے پچھلے برس ۶۸ ہزار اشخاص کے مقابلے میں ۷۰-۱۹۶۹ء میں سوا لاکھ فاضل اشخاص کو روزگار مہیا کیا۔

دوسرے منصوبے کے بعد سے پہلی بار بھارت انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ کو مختصر المدت قرضے چکانے کے اہل ہوا ہے چنانچہ ۷۱-۱۹۷۰ء کے خاتمے پر بھارت کے ذمے مذکورہ فنڈ کی کوئی رقم واجب الادا نہیں تھی مزید برآں فنڈ مذکور میں بھارت کے کوٹے میں مزید ۱۹ کروڑ ڈالر کا اضافہ کر دیا گیا ہے اس میں سے چوتھائی حصہ سونے کی صورت میں واجب الادا ہے۔

۷۱-۱۹۷۰ء کے دوران برآمدات میں اضافہ کی شرح ۸ سے ساڑھے آٹھ فی صد تک رہی۔ جبکہ منصوبے میں برآمدات میں سالانہ اضافے کا نشانہ ۷ فیصد رکھا گیا ہے۔

۷۱-۱۹۷۰ء کے دوران غیر ملکی امداد کا حجم بھی گھٹا۔ ۶۸-۱۹۶۷ء میں شروع میں یہ امداد ۱۵۱۴ کروڑ روپے تھی جو ۷۱-۱۹۷۰ء کے شروع میں ۸۷۲ کروڑ روپے رہ گئی۔ ۷۱-۱۹۷۰ء کے دوران اس میں ۱۵۷ کروڑ روپے کی مزید کمی آئی۔

---

یکم جولائی ۱۹۵۱ء کو جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کی ترقی و خوش حالی کے نظر کو لمبو پلان کا آغاز ہوا تھا لہٰذا اس برس یکم جولائی کو اس سے وابستہ ممالک اس ترقیاتی منصوبے کی بیسویں سالگرہ منائی جا رہی ہے۔ قارئین آج کل کی دنیا کے لئے اس سلسلے میں ایک مضمون کولمبو پلان صفحہ ۳۰ پر پیش کیا جا رہا ہے۔ ہے اسے پسند کیا جائے گا۔



# غبارِ کارواں

(۱۷)

## "میں ایک جزیرہ نہیں ہوں"

خواجہ احمد عباس

لوگ کہتے تھے انسان مٹی سے بنا ہے بشیطان آگ سے۔

سائنس داں کہتے ہیں انسان مٹی سے نہیں پانی سے بنا ہے یعنی اس کے بدن ں، اُس کے خون میں، اُس کے گوشت اور اُس کی ہڈیوں میں سب چیزوں سے زیادہ حصّہ پانی کا ہے۔

لیکن انسان اگر صرف گوشت پوست کا پتلا ہی نہیں ہے، صرف ایک جاندار (یا جانور) ہی نہیں ہے، اگر اس کی ہستی میں اُس کی عقل کی، اُس کے خیالات ور محسوسات اور جذبات کی بھی کوئی اہمیت ہے تو میں کہوں گا، انسانوں کی شکیل میں بہت سی سماجی، تاریخی، تمدّنی، اور اقتصادی قوتوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ سب انسانوں میں سے ایک انسان میں بھی ہوں۔

جن شخصیات نے میری تشکیل کی، وہ ایک دو نہیں سینکڑوں، ہزاروں لکہ شاید کروڑوں ہیں، کیونکہ انسان کی زندگی اپنے ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں ردوستوں یا نمایاں سیاسی لیڈروں ہی کا اثر نہیں قبول کرتی، اُس کی زندگی اور ں کے کردار کی تشکیل میں اُس کے تمام ہم قوم اور ہم عصر بھی حصّہ لیتے ہیں جو ماحول ل انسان کی تربیت کرتا ہے، اس میں وہ جسمانی اور نفسیاتی ورثہ تو شامل ہوتا ا ہے جو اُسے اپنے ماں باپ سے ملتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بدلتے ہوئے ماجی حالات اور سیاسی اور اقتصادی انقلابات بھی اُس کے ترکے میں شامل ں جو ہر انسان کو ملتا ہے۔ چاہے وہ اُسے قبول کرنا چاہے یا نہ چاہے۔ انسانی زندگی داخلیت اور خارجیت دونوں کے تانے بانے سے بنتی ہے اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا چاہے وہ مارکس کا چیلہ ہو یا فرائڈ کا پیرو ہو بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی کی بناوٹ میں نفسیات کا تانا زیادہ اہم ہے یا معاشیات کا بانا۔

اس لئے نہ تو میں ان تمام شخصیات کے نام گنا سکتا ہوں جنہوں نے میرے کردار اور نقطۂ نظر کی تشکیل کی۔ اُن میں سے بہتوں سے تو میں صرف لاشعوری طور پر متاثر ہوا ہوں گا اور نہ یقین کے ساتھ ان مختلف اثرات کا مول تول کر سکتا ہوں کہ اُن میں سے مقابلتہً کون زیادہ اہم تھے اور کون کم اہم۔ صرف اپنی یاد کی مدّم روشنی میں چند شخصیات اور واقعات کی تلاش کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے میری پچپن سالہ زندگی میں مجھے متاثر کیا اور جن کی نفسیاتی چھاپ میرے شعور اور میرے کردار پر آج تک موجود ہے۔

سب سے پہلی اور میرے بچپن میں سب سے اہم شخصیت جس نے مجھے متاثر کیا وہ میرے نانا خواجہ سجاد حسین مرحوم تھے۔ وہ ہمارے خاندان ہی میں نہیں بلکہ ہمارے سارے قصبے میں سب سے نمایاں ہستی تھے۔ میرے بچپن کی اولین یادیں اُن کی شخصیت سے وابستہ ہیں۔ تیس برس ہوئے لگ بھگ اسّی برس کی عمر میں انہوں نے وفات پائی لیکن بچپن ہی سے ہم سب بھائی بہن اُن کو بہت بوڑھا سمجھتے تھے حالانکہ اس وقت ان کی عمر پچاس پچپن ہی کی تھی اور ان کی مختصر ڈاڑھی پوری طرح سے سفید نہیں ہوئی تھی اور اُن کے گورے چہرے پر جھریوں کا بھی کوئی نشان نہیں تھا لیکن پھر بھی ہمارے ذہن میں اُن کی شخصیت الف لیلہ کے کسی دراز ریش بزرگ کی سی تھی جو اپنی عقل اور دور اندیشی سے انسانی زندگی کے الجھے

ہوئے مسئلوں کو سلجھاتا ہے اور خواجہ خضر کی طرح ظلمات کے اندھیرے میں سند باد جہازی کو راستہ بتاتا ہے۔

جب میں چار پانچ برس کی عمر میں گھر کی چار دیواری سے سکول کی دُنیا میں آیا اُس وقت مجھ پر اپنے بابا کی شخصیت کے دوسرے اہم پہلو روشن ہوئے۔ یہ اسکول ہمارے پڑنانا خواجہ الطاف حسین حالی کے نام پر حالی مسلم ہائی سکول کہلاتا تھا اور خواجہ سجاد حسین اس کے بانی سکریٹری اور کرتا دھرتا تھے۔ ان کی زندگی تمام تر اس سکول کے لئے وقف تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اپنے ہم قوموں میں نئی تعلیم رائج کرنے کے لئے انہوں نے کتنی بڑی قربانیاں کی تھیں۔ ساٹھ برس پہلے وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے بڑھے ہوئے پہلے چار مسلمان نوجوانوں میں تھے جنہوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بی اے کی سند دولت اور اقتدار کی سنہری کنجی سمجھی جاتی تھی۔ یوپی کے گورنر نے چار مسلمان نوجوانوں کو بلا کر کہا کہ گورنمنٹ سروس کے کسی اعلیٰ عہدے کے لئے بھی وہ درخواست دے سکتے ہیں انہیں صرف یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ کس محکمے میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ سول سروس، فوج، پولیس، جوڈیشری یا تعلیم۔ ایک نے سول سروس کو چُنا اور دس برس میں کمشنر کے درجے تک پہنچ گیا جو اُس زمانے میں ہندوستانی سویلین کی معراج تھی۔ دوسرے نے پولیس کا محکمہ چُنا اور انسپکٹر جنرل کے عہدے تک ترقی کی، تیسرا جوڈیشری میں گیا اور سیشن جج ہو کر ریٹائر ہوا لیکن سجاد حسین نے وہ محکمہ پسند کیا جو سرکاری ملازمتوں میں ان دنوں سب سے گھٹیا سمجھا جاتا تھا یعنی تعلیم۔ ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر سے انسپکٹر ہوئے اور انسپکٹر سے انسپکٹر جنرل مقرر ہی ہوئے تھے کہ نوکری سے استعفےٰ دے کر چوتھائی تنخواہ پر پنشن لے لی اور جائیداد بیچ کر اس کے روپے سے اپنے قصبے میں اسکول چلانے لگے اور اس کے بعد نہ صرف اپنی ساری پنشن بلکہ اپنی ساری باقی عمر اور اپنا تمام وقت اور تمام ہمت اور صحت اس سکول کے چلانے، بڑھانے اور ترقی دینے میں صرف کر دی۔

اپنے نانا کے بعد جس ہستی سے میں اثر پذیر ہوا وہ میرے والد خواجہ غلام السیدین کی تھی۔ اگر بابا کی زندگی ایثار اور خدمتِ قومی کا ایک روشن نمونہ تھی تو ابا (جیسا ہم اپنے والد کو کہتے تھے) کے کردار سے میں نے بچپن ہی میں انسان دوستی اور جمہوریت پسندی کے اُن اصولوں کو سمجھا اور سیکھا جو آخر مجھے اشتراکیت کی سرحد تک لے آئے۔ جس خاندان اور جس ماحول میں میں پیدا ہوا تھا اس میں چھوٹی موٹی زمینداری کی بنیادوں پر کتنی ہی چھوٹی قدروں کے کھنڈر ڈگمگا رہے تھے۔ جسب نسب، شرافت، رزالت، اونچے خاندان، نیچ خاندان، سید، انصاری، شیخ، مغل اور پٹھان کے امتیازات، شادی بیاہ کی رسوم میں فضول خرچیاں، قبر پرستی، توہم پرستی، تعویز گنڈے، پیری مریدی، نذر نیاز، عرس اور قوالیاں، مجلسیں اور ماتم، اگر میں شروع ہی سے ان اقدار کے غلط اثرات سے محروم یا محفوظ رہا تو اس کی صرف ایک وجہ تھی کہ میرے والد ایک ایسے اسلام کے پیرو تھے جس میں توہمات اور تعصبات دونوں کے لئے جگہ نہیں تھی اور جس کی بنیاد عقل اور انسان دوستی پر تھی۔ پانچ برس کی عمر میں میں نے جمہوریت کا نام بھی نہیں سُنا تھا: انسانی برادری کا مسئلہ کسی نے مجھے سمجھایا تھا لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ایک بار گھر کے ملازم چھوکرے کو (جو میرا ہی ہم عمر تھا۔) "اُلو کا پٹھا" کہنے کی یہ سزا ملی تھی کہ بارہ گھنٹے تک اندھیرے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ نہ کھانا نہ پانی جب تک ہاتھ جوڑ کر اُس ملازم سے معافی نہ مانگی۔

ابا کٹر حد تک سادگی پسند (Puritan) تھے نہ اُنہیں انگریزی فیشن اچھے لگتے تھے اور نہ وہ ہندوستانی ٹیپ ٹاپ کو ہی پسند کرتے تھے۔ نہ وہ اپنی بیٹیوں کو زیور گہنے بنوا کر دیتے تھے، نہ بیٹے کو انگریزی طرز کے بال رکھنے دیتے تھے۔ عرس میں جا کر قوالی سننے کو بھی بُرا سمجھتے تھے اور سینما، ناچ گانوں کو بھی۔ نہ ہمیں چائے پینے کی اجازت تھی نہ پان کھانے کی۔ اُن کی خواہش اور کوشش تھی کہ اُن کی اولاد سادہ اور جفاکش زندگی کی عادی ہو؛ توہمات اور غیر ضروری رسومات سے آزاد ہو اور تعلیم اور صحت کی طرف پورا توجہ دے۔

اپنے عقیدے میں وہ بہت سخت گیر تھے مگر اُن کے مزاج میں ایک عجیب شگفتگی اور مزاح کی چاشنی تھی جو اُن کی اصول پرستی کو کٹھ مُلاؤں کی سی روکھم پھندونصیحت سے بچائے رکھتی تھی۔ کسی کو پان سے ہونٹ رچائے ہوئے دیکھتے تو سنجیدہ چہرہ بنا کر کہتے "خیریت تو ہے؟ کیا چوٹ لگ گئی ہے کہ منہ سے خون جا رہا ہے؟" "چائے کو بھنگ کہتے تھے لیکن کوئی چائے کا شوقین دوست ملنے آجاتا تو کہتے" ارے اندر جا کر کہو ایک بھنگڑا آیا ہے اس کے لئے تھوڑی سی بھنگ گھول کر بھیج دیں۔"

ابا جتنے اپنے عقیدوں میں پکے تھے اتنی ہی حد تک آزادیٔ رائے کے حامی بھی تھے۔ آخر میں وہ مسلم کانفرنس میں شامل ہو گئے۔ (جو مسلم لیگ کی طرح فرقہ وارانہ جماعت تھی) اور میں اس وقت تک کانگرس کو بھی پیچھے چھوڑ کر سوشلزم کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن کبھی انہوں نے اپنے اُصول مجھ پر زبردستی عائد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سیاسی بحث ضرور کرتے۔ گرما گرمی بھی کبھی کبھی

جاتی لیکن جیسی برابر کے دوستوں میں ہوتی ہے۔ ان کے کئی دوستوں نے ربار انہیں سمجھایا کہ اپنے بیٹے کو انقلابی تحریکوں کا ساتھ دینے سے روکیں ن ایک بار بھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ کانگرس اور سوشلسٹ پارٹی کا ساتھ چھوڑ ۔ دراصل وہ دل ہی دل میں اس بات سے بہت خوش تھے کہ ان کا بیٹا پنے اصولوں پر اٹل رہنے کی ہمت رکھتا ہے (خواہ وہ اُن اصولوں کو نا ہی غلط سمجھتے ہوں۔)

یہ تو ہمیں بچپن ہی سے معلوم تھا کہ ہماری اماں (ہر ماں کی طرح) اپنے وں سے بے پناہ محبت کرتی ہیں اور وقتاً فوقتاً ہم اس کا جائز اور ناجائز فائدہ بھی اٹھایا کرتے تھے لیکن اُن کی زندگی کے صرف آخری دنوں میں مجھے اپنی اماں کے کیرکٹر کی مضبوطی، ان کی انسان دوستی اور رواداری کا پورا احساس ہوا۔

جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوا اس وقت (والد کا انتقال ہو چکا تھا) میری اماں اور بہنیں پانی پت میں تھیں اور میں بمبئی میں جب مغربی پنجاب کے زخم خوردہ ہندو سکھ شرنارتھیوں کے آنے کے بعد پانی پت میں مسلمانوں کا رہنا مشکل ہو گیا اور وہ سب پاکستان ہجرت کی تیاری کرنے لگے تو میری ماں پر بھی دوسرے عزیز، رشتے داروں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ ان کے ساتھ پاکستان چلیں اور مجھے بھی لکھیں کہ میں بمبئی سے کراچی آجاؤں مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ہم اپنا وطن نہیں چھوڑیں گے۔ میرے بیٹے نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے میں میں اس کے ساتھ ہوں"

فسادات کے بیس بائیس دن انہوں نے پانی پت میں گزارے۔ سات سات دن کا کرفیو لگتا مگر میں چٹنی روٹی کھا کر گزارہ کرنا پڑتا اور پان جو اماں کی زندگی کا اہم جزو تھا، روپے میں ایک پتہ نصیب ہوتا جس کے دس چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے وہ دن بھر گزارہ کرتیں۔ پھر ایک ملٹری ٹرک ان سب کو نکالنے کے لئے دہلی سے پانی پت بھیجا گیا اور راتوں رات برقعہ پوش عورتوں کو اپنا وطن اور اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ میں دن وہ سب دہلی میں رہے تیس آدمی ایک کمرے میں بند اور اس عرصے میں خبر آئی کہ پانی پت میں ہمارے مکان لٹ گئے اور شرنارتھیوں نے اُن پر قبضہ کر لیا ہے۔

ان حالات میں وہ ہوائی جہاز سے بمبئی آئیں۔ زندگی میں پہلی بار جان بچانے کے لئے برقعہ ترک کرنا پڑا۔ میں ڈر رہا تھا کہ ان سب باتوں کا اثر ان کے مزاج پر نہ جانے کیسا پڑا ہوگا مگر پہلے الفاظ جو ایئرپورٹ پر میں نے ان سے سنے وہ یہ تھے "بھئی میں تو اب ہمیشہ ہوائی جہاز میں سفر کیا کروں گی۔ بڑے آرام کی سواری ہے۔"

اور اس رات پانی پت اور دہلی کے حالات سناتے ہوئے انہوں نے کہا

" نہ یہ اچھے، نہ وہ اچھے، نہ مسلمانوں نے کسر اٹھا رکھی ہے نہ ہندوؤں نے اور سکھوں نے۔ سب کے سروں پر خون سوار ہے۔ مگر مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں تو مسلمانوں کو زیادہ الزام دوں گی کہ انہوں نے اپنی حرکتوں سے اسلام کا نام ڈبو دیا۔"

شخصیات جنہوں نے مجھے متاثر کیا ؟ یہ فہرست تو لمبی ہوتی جا رہی ہے کس کس کا نام گناؤں ؟ اپنے رشتہ داروں میں ایک اور ہستی کا ذکر کرنا ضروری ہے وہ ہیں میرے چچازاد بھائی خواجہ غلام السیدین جو گورنمنٹ آف انڈیا کی ایجوکیشنل منسٹری کے سکریٹری تھے لیکن میں بچپن سے آج تک انہیں "بھائی جان" ہی کہتا آیا ہوں۔ میرے خیال میں بچپن میں ہر کسی کا ایک ( Ideal ) ہوتا ہے اور عام طور سے وہ اس کا بڑا بھائی ہوتا ہے جس کو دیکھ کر بچہ اُس کی نقل کرنا چاہتا ہے۔ جیسے "کیو" میں اگلے آدمی کی نقل و حرکت کی ہم پیروی کرتے ہیں اس طرح بچپن میں لاشعوری طور پر چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے۔ میرا اپنا کوئی سگا بھائی نہیں تھا اس لئے بچپن سے ہی اپنے چچازاد بھائیوں ہی کو میں سگا بھائی سمجھتا تھا۔ بھائی جان مجھ سے دس برس بڑے ہیں جب میں پانی پت کے پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا تو وہ علی گڑھ یونی ورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ چھٹیوں میں جب وہ آتے تو اُن کی موٹی موٹی انگریزی کی کتابوں اور ٹینس کے ریکٹ کا مجھ پر بڑا رعب پڑتا۔ وہ اپنے یونی ورسٹی میگزین کے لئے کبھی بیٹھ کر کوئی مضمون لکھتے تو میرا بھی جی چاہتا کہ میرے قلم میں بھی کسی دن ایسی طاقت آجائے کہ میں یوں بے تکان مضمون لکھ سکوں اور پھر وہ انگلستان پڑھنے گئے اور وہاں سے ان کے خط اور تصویر والے پوسٹ کارڈ آنے لگے تو ہمارے لئے اور بھی دلچسپی اور حیرت و رشک کا سامان ہو گیا۔ لندن، لیڈز، کیمبرج، آکسفورڈ، پیرس، برلن جینیوا ہم اپنے اٹلس میں ان شہروں کو ڈھونڈنے لگے اور وہاں سے آئی ہوئی تصویروں کو سنبھال کر البم میں لگانے لگے اور دل ہی دل میں سوچتے کیا کوئی دن ایسا بھی آئے گا کہ ہم بھی اس وسیع اور رنگین دنیا کی سیر کر سکیں گے۔

اور پھر وہ ولایت سے واپس آ گئے۔ فرسٹ کلاس ڈگری لے کر۔ اور علی گڑھ میں پروفیسر بھی ہو گئے۔ اس سال علی گڑھ یونی ورسٹی کی جوبلی تھی۔ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے اپنے نانا کے ساتھ میں بھی اصرار کر کے علی گڑھ پہونچا۔ یونی ورسٹی کی شاندار عمارتوں اور جوبلی کے ہنگاموں کا رعب تو پڑا ہی لیکن سب سے زیادہ رعب پڑا اُس ڈبیٹ کا جو جوبلی پنڈال میں ہوئی اور جس کے ہیرو ہمارے بھائی جان قرار پائے۔ اگر میں کسی واقعہ کو یاد کروں جس نے میری زندگی پر سب سے گہرا اثر ڈالا ہے تو وہ یہی ڈبیٹ ہوگی۔

کوئی پانچ چھ ہزار کا مجمع ہوگا۔ اسٹیج پر ہندوستان کے مسلمانوں کے سب

ہی مشہور سیاسی اور غیر سیاسی لیڈر موجود تھے۔ مسٹر محمد علی جناح، سر آغا خاں، سر محمد اقبال، سر علی امام، ڈبیٹ کا مضمون تھا کہ "ہندوستان کے مسلمانوں کو قومی سیاست میں دوسری قوموں کے دوش بدوش کام کرنا چاہیئے یا اپنی سیاسی تنظیم علیحدہ نہیں کرنی چاہیئے"۔ یہ تجویز ہمارے بھائی جان نے پیش کی اور اس کی مخالفت کی اُن تمام مشاہیرین و قائدین نے جو وہاں موجود تھے میں تو اس وقت انگریزی نہیں کے برابر سمجھتا تھا لیکن یہ میں دیکھ سکتا تھا کہ بھائی جان نے تقریر کی تھی۔ اسٹیج کی داہنی طرف سے اور سب بڑے لوگ بول رہے تھے اُن کی مخالف سمت سے جب اُن سب کی تقریریں ختم ہوگئیں تو تجویز پیش کرنے والے نوجوان کو جواب الجواب دینے کا حق دیا گیا۔ اس وقت بھائی جان نے وہ تقریر کی جو علی گڑھ کی تاریخ میں آج تک یادگار ہے اور جس نے میری زندگی کا رخ موڑ دیا۔ کتنا خلوص اور کتنا جوش تھا اُن کے بیان میں کہ جب اُن کی تقریر ختم ہوئی تو سارا پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا اور مسٹر علی امام جنہوں نے تجویز کی مخالفت کی تھی اُٹھے اور اپنے نوجوان حریف کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے بعد جب حاضرین کی رائے لی گئی تو کثرت رائے سے تجویز پاس ہوگئی اور میرے دھڑکتے ہوئے دل نے مجھ سے کہا "کتنے قابل ہیں میرے بھائی جان، کتنی اچھی تقریر کی انہوں نے، ایک دن میں بھی اُن جیسا بنوں گا، اُن جیسی تقریریں کروں گا۔ مگر اس کے لئے بہت کچھ پڑھنا پڑے گا لکھنے اور بولنے کی کوشش کرنی پڑے گی۔ بڑے آدمیوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ . . . مگر میں سب کچھ کروں گا، سب کچھ کروں گا"۔

اور میں جو کبھی انجن ڈرائیور بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا، پھر ڈاکٹر بننا چاہتا تھا، پھر جج، پھر ڈپٹی کمشنر، اب صحافی اور مقرر اور سیاست داں بننے کے خواب دیکھنے لگا۔

اُن کے علاوہ وہ شخصیتیں بھی ہیں جن سے میں ہی نہیں میری نسل کے کروڑوں ہندوستانی متاثر ہوئے ہیں اور جن کی "چھاپ" ہم سب کی زندگی اور کردار پر موجود ہے۔

مہاتما گاندھی۔ اُن کو پہلی بار جب میں نے دیکھا تھا اس وقت میری عمر پانچ یا چھ برس کی تھی لیکن اس وقت بھی اُن کی مقناطیسی شخصیت نے مجھے متاثر کیا تھا۔

بھگت سنگھ جس کی شہادت کے دن میں اور میرے بہت سے کالج کے ساتھی اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے جیسے ہمارا سگا بھائی پھانسی پر چڑھا دیا گیا ہو۔

جواہر لال نہرو جن کو کالج کے دنوں میں ہم نوجوانوں کا لیڈر سمجھتے تھے اور جن کی انقلابی اور اشتراکی تقریروں اور تحریروں کا ایک ایک لفظ مجھے یاد ہوتا تھا۔

منشی پریم چند جن کی کتابوں سے میں نے سیکھا کہ ادب میں صرف رومان اور فرار ہی نہیں ہوتا۔ انسانی زندگی کی سچی عکاسی بھی ہوتی ہے اور واقعات؟

پہلا ناقابل فراموش واقعہ۔ ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے جب میں صرف چار پانچ برس کا تھا اور پانی پت میں پرائمری اسکول کی پہلی جماعت میں پڑھتا تھا جلیانوالہ باغ کا خونی ڈرامہ کھیلا جا چکا تھا اور تمام پنجاب کی آبادی کو اطاعت اور وفاداری کا سبق پڑھایا جا رہا تھا۔ سڑک اعظم (جو دہلی سے پشاور جاتی ہے) کے کنارے بسنے شہر اور قصبے تھے اُن کے تمام اسکولوں کو حکم ملا کہ اپنے بچوں کو سڑک کے کنارے قطاریں بنا کر کھڑا کریں کیونکہ وہاں سے انگریزی گھوڑ سوار فوج کے رسالے گزرنے والے تھے۔ صبح سویرے سے سہ پہر تک ہم گرمیوں کی دھوپ میں وہاں پر کھڑے رہے کئی بچوں کو تو لُو لگ گئی۔ ایک بھوک اور دہشت سے بیہوش ہوگیا۔ تب جا کر انگریز فوجیوں کے لال لال چہروں کے درشن ہوئے۔ اس زمانے میں ایٹم بم اور راکٹ تو ایجاد نہیں ہوئے تھے لیکن انگریزی فوج کے پاس جتنے بھیانک ہتھیار تھے وہ سب ہی تو اس جلوس میں ہمارے سامنے سے گزارے گئے توپیں، مشین گنیں، رائفلیں، بندوقیں، پستول، بھالے، تلواریں ہمارے دلوں پر برطانوی سامراج کی ہیبت بٹھانے کے لئے یہ جلوس تین گھنٹے تک سڑک اعظم سے گزرتا رہا اور ہم کھڑے دیکھتے رہے لیکن جس مقصد سے یہ مظاہرہ کیا گیا تھا اُس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی کیوں کہ بچوں کے دلوں میں اس رعب یا خوف سے کہیں زیادہ نفرت بھری ہوئی تھی۔ شام کو جب ہم بھوکے پیاسے نڈھال ہو کر گھر لوٹ رہے تھے تب بچے یا تو ہنس ہنس کر کہہ رہے تھے "ارے کیسے لال لال منہ کے انگریز تھے جیسے بندر ہوں بندر" اور یا تحریک خلافت اور نان کوآپریشن کے گیت گا رہے تھے۔ جیسے ؎

"کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو"

اور اس دن ایک چار پانچ برس کے بچے نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ "میں ان انگریزوں کی سرکاری نوکری نہیں کروں گا" اور اب پچاس برس بعد بھی جب انگریز سرکار ختم ہو چکی ہے اور آزاد ہندوستان کی اپنی قومی حکومت قائم ہو چکی ہے نہ جانے کیوں میں اب بھی سرکاری نوکری سے گھبراتا ہوں۔

دوسرا ناقابل فراموش واقعہ شاید ۱۹۳۲ء کی بات ہے میں علی گڑ

یونی ورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ نیا نیا سائیکل چلانے کا شوق ہوا تھا۔ چند دوستوں نے طے کیا کہ سائیکلوں پر آگرے جائیں گے جو علی گڑھ سے کوئی اسّی میل ہے۔ دُھن تو تھی تاج محل کو چاندنی رات میں دیکھنے کی لیکن راستے میں بسی کی سائیکل کا ٹیوب پھٹ گیا۔ اُسے ٹھیک کرنے کے لئے ایک گاؤں میں دوپہر بھر ٹھہرنا پڑا۔ اس گاؤں کی غربت کی تصویر آج تک میرے دل و دماغ پر نقش ہے۔ ٹوٹے پھوٹے کچّے مکان، لوگوں کے پھٹے پُرانے میلے کچیلے کپڑے جھونپڑوں کے بیچ میں سے بہتا ہوا گندا نالہ جس پر کروڑوں مچھر بھنبھنا رہے تھے، دُبلے پتلے سوکھے جسم کے ننگے بچے جو بھیک مانگنے کے لئے ہمارے سامنے ہاتھ پھیلا رہے تھے اور ہر چہرے پر نہ صرف افلاس بلکہ اس سے بھی زیادہ بھیانک ایک عمیق مایوسی کی چھاپ جیسے اُسے یقین ہو کہ اُن کی حالت کبھی بہتر نہیں ہو سکتی۔

اُس وقت تک میں نے سوشلزم پر دو چار کتابیں پڑھی تھیں لیکن اُس دن میں قطعی طور پر اشتراکیت پر ایمان لے آیا۔

اگست ۱۹۴۲ء میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں ہماری جنگِ آزادی کا آخری دَور شروع ہوا۔ اُس زمانے کے دو واقعات نے مجھے ازحد متاثر کیا۔

۸ اگست کو کانگرس نے برطانوی سرکار کو الٹی میٹم دیدیا۔ اُسی رات کو سب لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ اگلے دن اعلان ہوا کہ شیواجی پارک میں ایک عام جلسہ ہوگا جس میں کستوربا گاندھی بھی تقریر کریں گی۔ وہ شام مجھے آج تک یاد ہے۔ پارک کا سارا میدان، میدانِ جنگ کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ مگر یہ "جنگ" اس جنگ سے کتنی مختلف تھی جو یورپ میں ہو رہی تھی۔ یہاں ایک طرف لگ بھگ ایک لاکھ نہتے مرد، عورت، بچے، دوسری طرف ہزاروں مسلح پولیس والے اور اُن کے درجنوں، انگریز اور اینگلو انڈین افسروں کے پاس ہر قسم کے ہتھیار، لاٹھیاں، بندوقیں، رائفلیں، ریوالور، لاریوں پر چڑھائی ہوئی مشین گنیں اور رُلانے والی گیس کے بم۔ کئی گھنٹے یہ "جنگ" جاری رہی۔

لاٹھیاں برسائی گئیں، رائفلوں سے فائر کئے گئے، رُلانے والی گیس کے سینکڑوں بم چھوڑے گئے، جن سے چاروں طرف زہریلے بادل چھا گئے۔ جن کے قریب آتے ہی بے اختیار آنکھوں میں مرچیں لگ کر آنسو بہنے لگتے تھے اور انسان تقریباً اندھا ہو جاتا تھا لیکن مجمع نے ہار نہیں مانی۔ اگر ایک جھنڈا بردار لاٹھی کھا کر گرا تو دالنٹیر اُسے فوراً اٹھا کر لے گئے اور اس کی جگہ دوسرے نے لی۔ گیس کا مقابلہ کرنے کے لئے کسی نے یہ نسخہ نکالا کہ رومال پانی میں بھگو کر چہرے کو ڈھانک لیا جائے تو گیس کا اثر نہیں ہوتا۔ پھر کیا تھا۔ چاروں طرف کی عمارتوں سے عورتیں بالٹیاں لے کر نکل پڑیں اور نہتے سویلین ایک بار پھر پولیس اور فوج کے مقابلے میں ڈٹ گئے، جھنڈے لہراتے گئے۔ پولیس کے باوجود پارک کے کونے کونے میں جلسے ہوئے۔ آزادی کا ریزولیوشن بار بار پڑھا گیا۔ تقریریں ہوئیں۔ "انقلاب زندہ باد" کے نعرے بلند ہوئے اور ایک لاکھ بمبئی نواسیوں نے اس شام عدم تشدد پر قائم رہتے ہوئے بھی سامراجی پولیس اور فوج کو شکست فاش دی۔

"یہ جنگِ آزادی" یہ دو لفظ تو بچپن سے سنتا آیا تھا، سینکڑوں بار اپنی تقریروں اور مضامین میں بھی یہ لفظ دہرائے تھے لیکن اس شام میں نے اپنی آنکھوں سے اس "جنگِ آزادی" کو دیکھا، اور اس میں شرکت کی۔ میری کمر پر بھی لاٹھی کی ایک ضرب لگی۔ زہریلی گیس کے اثر سے میں بھی وقتی طور پر اندھا ہو گیا اور جب لوگوں نے دیکھا کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے تو کوئی دو انجانے ہاتھ مجھے سہارا دیتے ہوئے ایک بلڈنگ کی دوسری منزل پر لے گئے اور مرہٹی زبان میں نہ جانے کیا کہہ کر نہ جانے کس کے سپرد کر گئے۔ اس گھر کے کسی فرد نے میرا ہاتھ پکڑ کر پلنگ پر لٹا دیا اور میری آنکھوں پر پانی میں بھیگا ہوا رومال رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں میں نے محسوس کیا کہ آنکھوں کی چرچراہٹ کم ہو رہی ہے۔ رومال ہٹا کر میں نے دیکھنا چاہا تو پہلے تو ہر چیز دھندلی نظر آئی جیسے گیلے شیشے میں سے دیکھ رہا ہوں لیکن جلد ہی آنکھوں کا فوکس ٹھیک ہو گیا، کہ دیکھا کہ دیواروں پر بھگوان کرشن، شو مہاراج دیوی لکشمی اور شیواجی کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ ایک کونے میں پوجا کی جگہ ہے جہاں مورتی رکھی ہوئی ہے۔ چراغ جل رہے ہیں، پھول کھلے ہیں اور ایک بوڑھی عورت پوجا کر رہی ہے۔

تیس برس پہلے تو چھوت چھات کا کافی خیال رکھا جاتا تھا۔ میں اتنے مذہبی پوجا پاٹھ کے ماحول میں ہوں، یہ دیکھ کر میں سٹ پٹا کر اُٹھ بیٹھا۔

پلنگ کی چوں چوں سن کر بڑی بی نے مڑ کر دیکھا، پھر مورتی کی طرف جلدی سے سر جھکا کر پوجا کو بیچ میں چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

میرے پاس آکر مرہٹی میں بولیں "کیوں اُٹھ کیوں گیا، بیٹا۔ کچھ دیر اور آرام کر۔"

میں تھوڑی سی مرہٹی سمجھتا ہوں مگر بول نہیں سکتا، سو میں نے جواب ہندوستانی میں دیا۔ میں نے کہا:-

"نہیں اب میں ٹھیک ہوں۔ رات ہو گئی ہے، اب مجھے جانا چاہئے۔"

"نہیں نہیں پہلے دُودھ پی لے" اور یہ کہہ کر وہ اندر گئیں اور ایک تانبے کے گلاس میں گرم گرم دودھ لے کر آئیں۔

میں نے سوچا اتنی مہربان دیوی کے دھرم کو کیوں بھرشٹ کروں، سو میں نے دُودھ کا گلاس نہیں لیا اور کہا

"ماں جی میں مسلمان ہوں۔"

میرا خیال تھا کہ یہ سُن کر وہ سوچ میں تو ضرور پڑ جائیں گی کہ اب اس ملیچھ سے کیسے برتاؤ کیا جائے مگر انہوں نے ایک سیکنڈ بھی توقف نہیں کیا اور بولیں

"تو پھر کیا ہوا؟" اور یہ کہہ کر مجھے دودھ کا گلاس پکڑا ہی دیا۔

میں نے دودھ کا ایک گھونٹ پی کر کہا "شما کرنا ماں جی، میری وجہ سے آپ کی پوجا پوری نہ ہو سکی۔"

اُس بوڑھی، گنوار، شاید اَن پڑھ مرہٹہ خاتون کا جواب سُن کر میں ششدر رہ گیا۔ بولیں۔

"سو کیا ہوا، بیٹا۔ یہ بھی تو پوجا ہی ہے۔"

اور اس وقت میں نے دیکھا کہ ایک کونے میں گاندھی جی کی تصویر بھی لگی ہوئی ہے اور اس تصویر میں وہ مسکرا رہے ہیں اور اُن کی مسکراہٹ مجھ سے کہہ رہی ہے۔

"دیکھا تم نے۔ انقلاب یوں بھی آتا ہے۔ دھیرے دھیرے دل کے راستے"

ابھی پندرہ اگست کے نعرے فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ شمال مغرب اور شمال مشرق سے فرقہ وارانہ قتل و خون کی خبریں آنے لگیں۔ بمبئی میں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ گئی، پیدل راہ چلنے والوں پر قاتلانہ حملے ہونے لگے۔ اس ہولناک زمانے کے کئی واقعات نے مجھے از حد متاثر کیا اور ان میں سے اکثر کے بارے میں اپنے مضامین اور افسانوں میں لکھ چکا ہوں۔ مگر ایک واقعہ ایسا ہے جس کا میں نے اب تک کسی سے ذکر نہیں کیا۔

شیواجی پارک کے علاقے میں جو چند مسلمان خاندان رہتے تھے وہ سب اپنے اپنے گھر چھوڑ کر "محفوظ مسلم علاقوں" میں چلے گئے۔ صرف میں اور میری بیوی اپنی سمندر کے کنارے والی فلیٹ میں اکیلے رہ گئے۔

چند فرقہ پرست ہندوؤں نے کوشش کی کہ ڈرا دھمکا کر ہمیں بھی مجبور کیا جائے کہ یہ علاقہ چھوڑ دیں۔ لیکن میں نے سوچا اگر شیواجی پارک میں میرے لئے زندہ رہنا ناممکن ہے تو زندہ رہنا ہی بیکار ہے۔ میں وہیں رہا۔ ایک شام کو اندھیرا ہونے کے بعد دادر کے اسٹیشن پر ریل سے اترا تو دیکھا بازار سب اندھیرے اور سنسان ہیں معلوم ہوا کہ قتل کی چند وارداتیں ہو چکی ہیں اس لئے کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے اور نو بجے کے بعد کسی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس وقت تقریباً پونے نو بجے تھے، میں نے معلوم جلدی جلدی قدم بڑھائے کہ کرفیو کے وقت سے پہلے اپنے گھر پہونچ جاؤں۔

راستے میں دادر کی ایک اندھیری سی گلی میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی پیچھے چلا آ رہا ہے (میں فطرتاً کوئی بہت بہادر نہیں ہوں، اگر میں اس خطرناک زمانے اور اس خطرناک علاقے میں اندھیرے اُجالے اس طرح اکیلا گھومتا تھا تو اس میں بہادری سے زیادہ ضد کو دخل تھا) میں نے سوچا آج ضرور میری موت آ گئی۔ مگر اب تو بھاگنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ وہ شخص جو بھی تھا مجھ سے چند قدم پیچھے ہی چلا آ رہا تھا مرنا ہے تو پیٹھ میں چھرا کھا کر کیوں مروں۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے قدم دھیمے کر دیئے اور جب مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے بالکل قریب آ گیا ہے تو میں ایک دم ٹھہر کر مڑا۔ ایک لمحے کے لئے، تو وہ بیچارہ ڈر کر ٹھٹک گیا کہ شاید میں اُس پر حملہ کرنے والا ہوں۔

اس کو اطمینان دلانے کے لئے میں نے پوچھا "کیوں کرفیو لگا ہے کیا؟"

اُس نے کہا۔ "ہاں — نو بجے کا کرفیو ہے اِدھر۔ مگر شیواجی پارک میں نہیں ہے۔"

اب ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے مگر کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے جا رہے تھے۔

"کیوں بھئی تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا

"شیواجی پارک۔ اور تم؟"

"میں بھی شیواجی پارک"

"وہاں رہتے ہو کیا؟"

"ہاں۔"

"کون ہو تم؟ نام کیا ہے تمہارا؟"

میں اس سوال کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اور اس سوال سے ڈر بھی رہا تھا اب کیا جواب دوں؟ کہوں کہ میرا نام گوپال راؤ ہے یا موہن لال ہے یا دیسائی ہے اور اگر اس نے جرح شروع کر دی اور بھانڈا پھوٹ گیا تو؟ یا یہ کہوں کہ تم کون ہوتے ہو میرا نام پوچھنے والے۔ اس سے تو اسے شبہ کرنا یقینی ہو جائے گا کہ میں اپنا نام چھپا رہا ہوں۔

سو میں نے کہا "میرا نام ہے احمد عباس۔ خواجہ احمد عباس"

اس نے کہا۔ "تم پیر میں کام کرتے ہو نا؟"

میں نے کہا۔ "ہاں بمبئی کرانیکل میں۔"

"اور تم ابھی تک شیواجی پارک میں رہتے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں کئی برس سے یہیں رہتے ہیں ہم"

اور اتنے میں ہم پولیس کے سپاہیوں کے ایک گروہ کے قریب سے گزر کر کرفیو کی حدود سے گزر کر شیواجی پارک والی سڑک پر آ گئے۔

میرے ہم راہی نے کہا "میٹنگ میں چل رہے ہو عباس بھائی؟"
میں نے کہا "کون سی میٹنگ؟"
"سورکشن دل بنا رہے ہیں نا۔ سب شیواجی پارک کے رہنے والے اکٹھے ہونگے"
میں نے کہا "تو ضرور چلتا ہوں"
سو ہم دونوں اکٹھے اُس جلسے میں داخل ہوئے۔ سو سوا سو آدمی موجود تھے۔ اور ان میں سے اکثر مجھے جانتے تھے "آؤ آؤ عباس بھائی۔" چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔

تجویز پیش کی گئی کہ فسادات کی روک تھام کے لئے اور شیواجی پارک کے علاقے میں امن قائم رکھنے کے لئے ایک سورکشن دل (خود حفاظتی دستہ) بنایا جائے۔ کمیٹی کے ممبروں کا چناؤ ہوا۔ پہلا ممبر جس کو چنا گیا اس کا نام تھا ——
— خواجہ احمد عباس۔

اور جن لوگوں نے میرے نام کی موافقت میں ہاتھ اٹھائے اُن میں وہ آدمی بھی تھا جس کو چند منٹ پہلے میں اپنا قاتل سمجھ رہا تھا۔

میں نے ارادہ کیا کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد اس سے ضرور ملوں گا، اس کا نام پتہ پوچھوں گا لیکن جلسے کے خاتمے پر جو بات چیت اور بحث مباحثہ اور افرا تفری ہوتی ہے اس میں وہ کھو گیا اور آج تک مجھے اس کا نام نہیں معلوم ....

۱۹۶۲ کے بعد میں بدترین فسادات کے دوران میں بمبئی کے ہر علاقہ میں گھوما، دہلی اور پانی پت گیا، کشمیر گیا جب سارا ہندوستان اور پاکستان نفرت اور غصے اور انتقام کے خونی سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا لیکن جہاں کہیں بھی میں گیا خود میں نے تو معمولی انسان ہی دیکھے۔ ہندو، سکھ، مسلمان۔ نہ مجھے کسی سے خوف ہوا نہ کسی نے مجھ پر حملہ کیا اور مجھے ایسا لگا کہ دراصل یہ فسادات، یہ خون خرابے، یہ لوٹ مار، یہ مار دھاڑ، اس وقت ہوتی ہے جب تعصب اور نفرت کا اندھیرا چھایا ہوتا ہے اور اس اندھیرے میں ہر راستہ چلتا ایک خونی اور ڈاکو نظر آتا ہے اور ایک دوسرے کا خوف ایک دوسرے پر حملہ کراتا ہے ایک دوسرے کا خون کراتا ہے۔

اپنی یادداشت کے اندھیرے میں اب بھی میں اس گمنام، انجانے ہم راہی کے قدموں کی آواز سنتا ہوں اور جب میں مڑتا ہوں اور ہم آمنے سامنے ہوتے ہیں تو اس کی آواز سُنائی دیتی ہے۔

"کون ہو تم؟ نام کیا ہے تمہارا؟"

اور میں بے خوفی اور کسی قدر فخر سے جواب دیتا ہوں۔ احمد عباس۔ خواجہ احمد عباس جو پچپن برس ہوئے پانی پت میں پیدا ہوا تھا۔ پانی پت جو اب بھی ہندوستان میں ہے۔ اور میرے نانا تھے خواجہ سجاد حسین جنہوں نے بچوں کی تعلیم کے لئے اپنی ساری دولت، ساری عمر اور ساری طاقت خرچ کر دی، اور میرے والد تھے خواجہ غلام السبطین جنہوں نے مجھے سچ بولنا سکھایا، کسی کے سامنے سر نہ جھکانا سکھایا اور سیاسی اختلافات میں رواداری سکھائی۔ اور میری والدہ تھیں مسرور النسا بیگم جنہوں نے سکول کالج میں تعلیم نہیں پائی تھی نہ کسی سیاسی جلسے میں شریک ہوئی تھیں لیکن جو آخری دم تک اپنے ملک ہندوستان کی وفادار رہیں۔ ..... مگر میں اپنے خون کے رشتہ داروں ہی کی اولاد نہیں ہوں میں اپنے ملک اور قوم کی اولاد بھی ہوں۔ گاندھی اور نہرو کے خاندان میں سے ہوں اور انسانیت اور سوشلزم کے ناتے سے میرے رشتہ دار ساری دنیا میں —— روس میں، امریکہ میں، انگلستان میں، اور چین میں —— پھیلے ہوئے ہیں اور جو کچھ ہوتا ہے وہ مجھ پر (اور ہر شخص پر) اثر انداز ہوتا ہے۔ کیونکہ جیسا ایک یوروپین شاعر جان ڈان ( John Donne ) نے کہا ہے۔

"کوئی انسان جزیرہ نہیں ہے۔"
"ہر انسان سمندر میں ایک قطرہ ہے"
"ہر انسان زمین کا ایک ذرہ ہے"
"ہر انسان کی موت میری موت ہے، کیونکہ میں اور انسانیت جدا نہیں ہیں ——"

..... اور اسی طرح دن اور مہینے اور برس گزرتے ہیں اور شخصیات اور واقعات کا لامتناہی جلوس گزرتا رہتا ہے اور جس طرح کیمرے کی فلم پر ہر منظر کا عکس (خواہ وہ صاف ہو یا دھندلا) پڑنا ضروری ہے۔ اسی طرح ان واقعات اور شخصیات کا اثر قبول کرنا بھی میرے لئے (اور ہر کسی کے لئے) ضروری ہے۔ یہ سلسلہ ہر انسان کی پیدائش کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور موت سے پہلے ختم نہیں ہو سکتا۔


## ضروری اعلان

پبلیکیشنز ڈویژن نے یہ طے کیا ہے کہ اس ادارے کی طرف سے شائع ہونے والے رسالوں کے خریداروں کو ہماری مطبوعات کی خریداری پر ۲۰ فیصد کی رعایت دی جائے گی آرڈر کے ساتھ خریداری نمبر لکھنا ضروری ہے۔

# شملہ کی سیر

عرش ملسیانی

بہار شملہ کیا کہوں ؛ ہے سر پہ چرخِ نیلگوں
نجوم و کہکشاں بھی ہیں ؛ حسیں رواں دواں بھی ہیں
قمر پہ مستقر ہیں کیوں ؛ یہ پُر خطر سفر ہیں کیوں
ہزاروں چاند دلستاں ؛ ہیں مال پر رواں دواں
بوقتِ شام دیکھئے ؛ اک اژدہام دیکھئے
قدم کہاں کہ اُٹھ سکے ؛ نظر کہاں کہ لڑ سکے
جگہ نہیں کہ چل سکیں ؛ پلٹ کے رُخ بدل سکیں
مچل سکیں سنبھل سکیں
میں دیکھتا چلا گیا

چھتیں یہ لال لال سی ؛ عبیر سی گلال سی
درخت یہ فلک نما ؛ یہ سائیں سائیں یہ ہوا
یہ دھوپ چھاؤں کا سماں ؛ یہ زندگی کی داستاں
یہ ریل پیل یہ پھبن ؛ یہ پھول پھل چمن چمن
کھلا ہوا ہے میکدا ؛ مسرتوں کا موج کا
تمازتوں کی موت ہے ؛ ہوائے گرم فوت ہے
جہنموں کو چھوڑ کر ؛ بہشت میں ہوا گزر
کرامتوں کا یہ اثر
میں دیکھتا چلا گیا

یہ خوش گوار زندگی ؛ یہ پُر بہار زندگی
یہ رنگ کو ہار کے ؛ یہ نغمے جو نثار کے
یہ مہ وشوں کی ٹولیاں ؛ یہ بولیاں یہ ٹھولیاں
فلک نما عمارتیں ؛ سکون کی بشارتیں
بلند ہیں یہ مستقر ؛ تجھے تو کس طرح نظر
ہر اک طرف ہجوم ہے ؛ ہر ایک سمت دھوم ہے
یہ مستِ نازِ زندگی ؛ یہ جاں گداز زندگی
یہ حُسن ساز زندگی
میں دیکھتا چلا گیا

نشیب تازگی بھرے ؛ فراز یہ ہرے بھرے
یہ دلِ فریب گھاٹیاں ؛ یہ بادلوں کے کارواں
یہ کوہ کی بلندیاں ؛ نظر کی دل پسندیاں
یہ رفعتیں یہ پستیاں ؛ یہ بستیوں پہ بستیاں
نمونے قدرتِ حسیں ؛ فلک سے لے کے تا زمیں
درخت دیودار کے ؛ نمونے اک وقار کے
سڑک یہ گھومتی ہوئی ؛ نشے میں جھومتی ہوئی
قدم کو چومتی ہوئی
میں دیکھتا چلا گیا

بوقتِ شب فضاؤں پر ؛ ہے ایک خامشی مگر
عجیب ہے یہ خامشی ؛ مہیب ہے یہ خامشی
خموش شہر کی فضا ؛ خموش اوج کوہ کا
شجر حجر کے سلسلے ؛ رہینِ خواب ہو گئے
یہ طائروں کا شور ہے ؛ یہ زندگی کا زور ہے
نہ میکدوں میں ہا و ہو ؛ نہ شور ہائے واشر لو
نہ جانے جوئے کو ہ کیوں ؛ بجا رہی ہے ارغنوں
یہ اضطراب یہ جنوں
میں دیکھتا چلا گیا

کباب سیخ کے مزے ؛ اُڑا رہے ہیں منچلے
بھٹورے اور پُوریاں ؛ بھری ہوئی ہے ہر دکاں
وہ گاہکوں کا زور ہے ؛ کہ اک عجیب شور ہے
جگہ نہیں جہاں ذرا ؛ کھڑے کھڑے ہی ناشتا
پھلوں پہ رنگ رُوپ ہے ؛ یہ رنگ بھی اوپ ہے
شراب تلخ انگبیں ؛ کہیں جو ہے تو ہے یہیں
کہاں صدا الست کی ؛ کہاں ہے رندِ مست کی
یہ شان بود وہست کی
میں دیکھتا چلا گیا

مناظر ایسے ہیں کہاں ؛ نہ یہ زمیں نہ آسماں
مشوبرا کی یہ ہوا ؛ یہ بابو گنج کی فضا
یہ جاکھو کی بلندیاں ؛ بلند ارجمندیاں
یہ کفڑی کا مقام ہے ؛ بہت بلند بام ہے
یہ وقت برف دیکھئے ؛ تماشے کھیل کود کے
یہ نالدیرا کی فضا ؛ یہ نارکنڈا خوش نما
ہمالیہ کے سلسلے ؛ فلک سے بس ملے ملے
زمین کے یہ حوصلے
میں دیکھتا چلا گیا

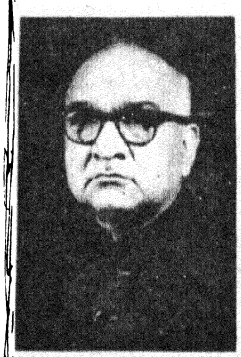

عہ سے مراد مضافات شملہ کے حسین مقامات



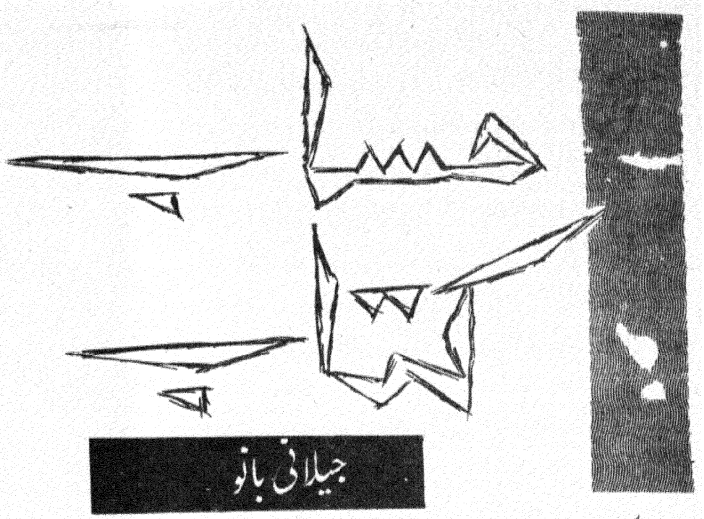

# جیلانی بانو

پکّے کاغذ پر اسٹامپ کہیں نہیں لگا تھا۔

اور یہ بات اتنی بودی تھی ــــ : اس بات پر قادر صاحب کو بھی یقین نہیں آتا تھا۔

بھئی دُنیا کا قاعدہ ہے کہ ہر بات کا کوئی ثبوت ہوا کرتا ہے۔ چار آدمیوں کی گواہی ضروری ہوتی ہے مگر آج تو قادر صاحب کو ایسا لگ رہا تھا جیسے خود ان کا دل بھی گواہی دینے کو تیار نہ ہو۔

جبھی تو رام پیاری بار بار ان سے کہا کرتی تھی۔

"صاب میں نے ایک گلتی کی ہے کہ کوئی بات کبھی پکّے کاگج پر نہیں لکھوائی۔"

اور قادر صاحب سوچتے۔ جو عورت پکّا کاغذ لکھوانا بھول جاتی ہے۔ وہ رنڈی، رکھیلی کہلاتی ہے، اُسے رام پیاری کی طرح ہر طرف سے دھکّے دئے جاتے ہیں۔ اب وہ اپیل کرے تو کون سی عدالت میں، انصاف کرے تو کس برتے پر ــــ : قادر صاحب خود ہی یہ باتیں سوچتے اور خود ہی پاگل ہوا جاتے۔ آج پھر رام پیاری نے وہی بات دُہرائی۔

"میرے پاس تو کوئی بھی ثبوت کسی بات کا نا ہیں ہے" جبھی تو گھیسٹے کے بھائی مجھ کو گھر سے نکال رہے ہیں۔ جبھی تو آج بیگم صاب نے مجھے گالیاں دیں۔

ملکہ قادر صاحب کو تو اس بات کا سرا بھی نہیں ملتا تھا کہ وہ کب رام پیاری کے جھمیلے میں اُلجھے تھے۔

جب قادر صاحب کی شادی ہوئی ہے تو اُن کے ہاں رام پیاری کی ساس پھول دئی کپڑے دھوتی تھی۔ بوڑھی، بدمزاج اور کام چور دھوبن تھی مگر وہ چونکہ قادر صاحب کی والدہ کے زمانے سے اس گھر میں آتی تھی اس لئے بہو بیگم کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اُسے نکال باہر کریں۔ پھر پھول دئی اچانک مرگئی۔ اب یہ ہونے لگا کہ اس کا آوارہ، ناکارہ، نکمّا لڑکا گھیسٹا کپڑوں کی گٹھری لے کر جاتا تو مہینوں اس کی صورت نظر نہ آتی۔

دلہن بیگم دوسری دھوبن کی تلاش میں تھیں کہ ایک دن گھیسٹا نے خود ہی اس کا انتظام کر دیا۔

وہ پندرہ سولہ برس کی ایک چنگتی مٹکتی لڑکی کو لے کر آیا کہ اب یہ کپڑے دھوئے گی۔ اتنی پیاری پیاری۔ گوری گوری سی اس کی جروا۔ دلہن بیگم کو بہت بھائی۔ سُرخ کپڑوں اور چاندی کے زیوروں میں لپٹی وہ برفی کی مزیدار ڈلی لگ رہی تھی۔

جب وہ صاب کے پاؤں چھونے تگے بڑھی تو قادر صاحب جھجک کے پیچھے کو ہٹے اور ہنس کر گھیسٹا سے کہا۔

"ارے گھیسٹے میاں، بہو تو تمہاری بہت اچھی ہے۔ ایسی کوئی اور ملے تو ہمارے لئے بھی لادینا۔"

صاب کے اس مذاق پر گھونگھٹ میں لپٹی دُلہن بھی کھی کھی کر کے ہنس پڑی تھی۔

مگر اُسے کپڑے دیتے ہوئے سب ڈرے کہ اتنی سی لونڈیا اتنی ذمہ داری کا کام کیسے سنبھال سکے گی:

پھر اس لڑکی نے بڑے چاؤ سے کپڑے دھونا شروع کئے۔ جیسے وہ

گھسیٹا سے اپنے عشق کا اظہار اُن کپڑوں کو چمکا کر ہی کرنا چاہتی ہو۔ ہر کپڑا ابرک سے چم چم کرتا . . . دودھ کی طرح سفید استری اور کلف سے لیس۔

وہ صاب کے کپڑے بڑے ادب اور احترام کے ساتھ الگ اٹھا کر دیتی تھی اور بار بار تشویش بھرے لہجے میں دلہن بیگم سے پوچھتی۔

"صاب ہم پہ کھیا تو ناہیں ہوت ــــ؟"

بعد میں معلوم ہوا گھسیٹا اُس لڑکی کو کہیں سے بھگا کر لایا تھا۔ اپنی برادری میں جھوٹ موٹ مشہور کر دیا ہے کہ رام پیاری بھی ذات کی دھوبن ہے۔ حالانکہ وہ کسی بنئے کی لڑکی تھی۔ پیدائشی دھوبن بننے کے لئے بیچاری رام پیاری کو اپنی کمر توڑنا پڑتی تھی۔ ہاتھ زخمی ہو جاتے۔ اور وہ رو رو کر گھسیٹا سے کہتی تھی کہ میرے ساتھ پھیرے لے کر کہیں دُور جا بسو مجھ سے محنت کا کام نہیں ہوتا۔

رام پیاری کے ہاں پہلا بچہ ہوا تو بیگم صاب نے بچے کو دیکھ کر رام پیاری کی گود کپڑے چاولوں سے بھری۔ بچے کو نیا کرتا ٹوپی دیا۔ مگر وہ بچہ مر گیا پھر اور ہوئے۔ ہر سال رام پیاری کی گود بھرتی اور بچہ مرجاتا تھا۔

چند ہی برس بعد وہ شرماتی لجاتی برفی کی ڈلی جیسی میٹھی رام پیاری میوہ بھری ڈالی بن گئی تھی کہ کوئی پھل اُدھر جھکتا، کوئی ادھر لڑھکتا۔

اب وہ خوب کپڑے پھاڑتی، کھو دیتی۔ اور زیادہ میلے کر کے لاتی اور سب کو قایل کر دیتی تھی، کہ یہ دُھلے ہوئے کپڑے ہیں۔ دلہن بیگم اب خود بھی چار بچوں کو سیانا کر کے تھک سی گئی تھیں۔ اس لئے نئے نئے لوگوں سے انہیں وحشت سی ہوتی تھی۔ اس لئے رام پیاری اس گھر میں بھگتی جاتی۔ حالانکہ دلہن بیگم کا ڈاکٹری میں پڑھنے والا لڑکا جاوید، کالج جانے والا لڑکا ماجد، عاصمہ اور ناظمہ خوب شور مچاتیں کہ اس دھوبن سے کپڑے مت دھلواؤ ــــ قادر صاحب بھی بغیر کلف کے پاجاموں پر صبر کر کے بیٹھ رہتے۔

مگر انہوں نے کبھی رام پیاری کو برطرف کرنے کی تجویز نہیں رکھی تھی بلکہ وہ تو رام پیاری کے آتے ہی حساب کی کاپی لے کر اس کے سامنے جا بیٹھتے اور ہنسی مذاق شروع ہو جاتا۔

"بھئی کپڑے تو تو دھوتی نہیں ہے پھر کرتی کیا ہے دن رات؟"

"کیا کروں صاب، وہ گھسیٹا مجھے چین بھی لینے دے؟" وہ منہ پر گھونگھٹ کھینچ کر بڑی ادا سے کہتی۔

"جھوٹی کہیں کی۔" قادر صاحب سچ مچ خفا ہو جاتے۔

جس عورت کے بیاہ کو پندرہ برس گزر جائیں تو اس کا میاں کون سے جھمیلوں میں گھسیٹے گا اُسے۔ اور پھر رام پیاری کے چندری میں سے چمکتے جھلکتے خوبصورت بدن کو دیکھ کر وہ آنکھیں چُرا لیتے۔

"کیوں بچارے گھسیٹے کو بدنام کرتی ہے۔ وہ بچارا تو بھنگ کے نشے میں پڑا رہتا ہے دن رات۔ تو خوب مزے اُڑاتی پھرتی ہے۔ پرسوں کہاں جا رہی تھی ــــ سُرخ چندری اوڑھے ــــ خوب بناؤ سنگار کئے ــــ"

"لو اور سنو دُلہن بیگم ــــ" رام پیاری منہ پر انگلی رکھ کر چلاتی ــــ "جو بھنگ کے نشے میں دن رات پڑا رہے وہ تو ہوا بچارہ ــــ اور میں دکھیا جو دن رات محنت کروں ہوں۔ سو اُس کے بارے میں یہ کہت ہیں صاب ــــ ہے بھگوان ــــ پُرکھوں نے سچ کہا ہے کہ مردوا تو مردوے کی ہی پشتی لے گا۔"

"بس بس بہت ہو چکا ہنسی مذاق ــــ" دلہن بیگم جھنجلا کے کہتیں۔

"یہ بتا میری وائیل والی ساری کہاں ہے!"

"ہے ہے تو بس جوان مرے پھر ان کی ساری بیچ ڈالی ــــ ارے اُٹھے اس نامراد کی ــــ جب بڑھاپے میں مستی چڑھے تو ایسی ہی مت ماری جائے ہے آدمی کی ــــ" وہ گھسیٹے کو کوستی پیٹتی ہوئی جلدی سے باہر بھاگتی۔"

کسی دن قادر صاحب اُسے چھیڑتے ــــ

"اری رام پیاری کل بڑکو کہہ رہا تھا کہ تجھے گھسیٹا نے خوب پیٹا ــــ؟"

"آگ لگے اس بڑکو نامراد کی دُکان میں ــــ" وہ غصہ کے مارے بھنّا جاتی ــــ "میرا مرد مجھے سو بار مارے کسی کو کیا گرج ــــ اور پھر جب اُس نے دودھ جلیبی لا کر کھلائی تھی وہ نہ دیکھا اُس جنم کے اندھے نے ــــ؟" وہ اترا کے کہتی تو سارے گھر کا ہنسی کے مارے بُرا حال ہو جاتا تھا۔

اب یہ ہوتا کہ شام کے وقت کوئی کام وام تو ہوتا نہیں۔ یوں بھی آدمی جب پچاس برس کا ہو جائے تو کیسی شدید بے کاری آگھیرتی ہے! قادر صاحب کو اس بے کاری ایک عادت ڈال دی تھی۔ بس یہی کہ شام کو ذرا میراثیوں کی گلی تک ٹہل لیتے تھے۔ یا پھر بقول دلہن بیگم کے جب تک وہ میراثیوں کی گلی کا ایک چکر نہ لگا لیتے ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ میراثیوں کی گلی سے گھر کی طرف لوٹتے وقت وہ بڑکو پان والے کی دکان پر ذرا ٹھہرتے۔ اس دُکان سے ملا ہوا رام پیاری کا گھر تھا۔ کبھی رام پیاری اپنی کوٹھریا کے سامنے بیٹھی چاول بینتی، کبھی اپنے لمبے لمبے بال کھولے بیٹھی جوئیں مارا کرتی تھی لیکن جس دن گھسیٹا اُسے مارا کرتا تھا تو جانے کہاں سے اچانک صاب آجاتے اور بیچ بچاؤ کر کے گھسیٹے کو دس پانچ سُنا دیتے تھے۔ کسی دن رام پیاری نظر نہ آتی تھی تو انہیں تشویش ہو جاتی تھی کہ آج اس گھسیٹے کے بچے نے ضرور اس کی ہڈی

بلی توڑی ہوگی وہ بچاری اندر پڑی ضرور کراہ رہی ہوگی۔"

ایک دن صبح میراثیوں کی گلی میں بڑا شور مچا۔ معلوم ہوا رات گھسیٹا مر گیا۔ بہت دنوں پہلے ہی ڈاکٹروں نے اُسے بھنگ پینے کو منع کر دیا تھا مگر وہ نہ مانا۔ بلکہ پاس پڑوسی تو کہتے تھے کہ وہ نہ مانگتا تھا تو رام پیاری خود اُسے پلاتی تھی۔ کہتی تھی کہ وہ صرف نشے میں میرا ہو جاتا ہے۔ ہوش میں رہے تو اِدھر اُدھر کی باتیں نکال کر مارنے لگتا ہے۔

از راہِ ہمدردی قادر صاحب بھی رام پیاری کے گھر تک گئے کہ دس پانچ رُوپے گھسیٹے کی ارتھی اٹھانے کو دے آئیں۔ آخر وہ اُن کا پُرانا نمک خوار تھا۔

رام پیاری اپنی برادری کی عورتوں میں گھری رو رہی تھی۔ صاب کو دیکھ کر اٹھی اور اُن سے لپٹ گئی۔

"صاب ہمرا گھسیٹا چلا گیئو۔ ہے ہے صاب میں رانڈ ہو گئی۔ یہ سب جے کہت ہیں کہ میں اپنی بندیا مٹا دیئوں اپنی چوڑیاں توڑ دیئوں۔"

"خبردار جو کسی نے بچاری کی چوڑیاں توڑیں۔" صاب للکارے، اس وقت بھی وہ رام پیاری کے اچانک پٹنے سے حواس باختہ سے ہو گئے تھے۔ وہ ان معصوم اور احمق مردوں میں سے تھے جنہوں نے زندگی بھر بیوی کے سوا کسی عورت کو نہ چھوا تھا۔

"دیکھو تم سب سے کہے دیتا ہوں جو کسی نے رام پیاری کی بندیا یا چوڑیوں پر ہاتھ لگایا۔ اتنا سمجھ لو کہ وہ مر جائے گی یا پاگل ہو جائے گی۔"

اب رام پیاری کے مرنے کا ڈر تھا یا اس کے پاگل ہونے کا کہ دھوبی برادری کی کسی خرانٹ بڑھیا کی پھر ہمت نہ ہوئی کہ رام پیاری کی چوڑیاں چھوتی۔

دو چار دن بعد سب اپنے اپنے گھروں کو سدھارے اور رام پیاری اپنی چوڑیوں اور بندیا سمیت گھر میں اکیلی رہ گئی۔ منت تو وہ جب بھی تنہا ہی کرتی تھی جب ہٹا کٹا گھسیٹا دن رات گھر میں پڑا گالیاں بکے جاتا تھا۔ اکیلے رام پیاری مستقبل کی کسی کو فکر نہ تھی۔

ایک بار رات کو تقریباً آٹھ بجے قادر صاحب میراثیوں کی گلی سے گزرے تو دیکھا کہ رام پیاری کے گھر میں اندھیرا ہے۔ اسی دن تو وہ کپڑے لے گئی تھی لیکن کم بخت بھاگ تو نہیں گئی! اپنے کپڑوں کی خیریت معلوم کرنے کے لئے انہوں نے دروازے پر جا کر پکارا تو ایسا لگا جیسے اندھیرے میں کوئی چیز سی اٹھی ہو۔ پھر وہ روشنی کی کرن بولی۔

"ہے بھگوان! اس سمے صاب کیوں آئے گیئو۔"

"اری چراغ کیوں نہیں جلایا! اندھیرے میں ڈر بھی نہیں لگتا تجھے!"

"اب مجھے اپنا آپ کیسے دکھانا ہے جو دیپ جلاؤں صاب!" اندھیرے میں اُس کی آواز پھر چمکی۔

"اچھا اچھا — بہت ہو چکا رونا دھونا — چراغ جلایا کر ورنہ پاگل ہو جائے گی روتے روتے۔"

دوسرے روز شام جھٹ کی تو جانے کیوں قادر صاحب کے دل میں اندھیرا بڑھنے لگا۔ لوٹ پھیر کے دھیان ادھر ہی جاتا کہ جانے رام پیاری نے چراغ جلایا ہے یا نہیں!

کھانا ختم کرنا دوبھر ہو گیا۔ جلدی جلدی حقے کے دو چار کش لگائے۔ پان منہ میں دبا — وہ میراثیوں کی گلی تک ٹہلنے چل دیئے۔

ایک دن بڑکو پان والے نے قادر صاحب کو وہاں کھڑے دیکھا تو کھنکار کے بولا —

"صاب رام پیاری تو آج گنگا پور گئی ہے کیا بات ہے۔ یہیں بتا دیجئے ہم کہہ دیں گے۔"

"کچھ نہیں اصل میں سالن بچ رہتا ہے۔ بیگم کہتی ہیں رام پیاری سے کہہ دینا — لیتی جائے —"

جمعہ کے دن نہانے کے بعد قادر صاحب نے کرتا پہنا تو اکھٹے تین بٹن غائب تھے — ایک آدھ ہوتا تو صبر کر لیتے۔ غصہ کے مارے بھنّائے ہوئے پہنچے رام پیاری کے گھر —

"گھسیٹا مر گیا ہے تو کیا ہمارے کپڑوں سے کشتیاں لڑتی ہے۔ ذرا دیکھو تو میرے کرتے کی حالت!"

مگر رام پیاری نے خالص دھوبیانہ انداز میں کرتے کو نظر انداز کر کے کہا۔

"ارے اس منگو کی چتا کو آگ لگے۔ کہت ہے کہ یہ گھر میرے بھائی کا ہے میں لوں گا۔ کہت ہے کہ میں گھسیٹا کی رکھیلی ہوں۔" صاب آپ ہی کچھ انچھاپ کرو ہمرے سنگ۔"

"مگر تیرے پاس تو بیاہ کا کوئی ثبوت ہوگا — ؟"

"آپ بھی کیسی بات کرتے ہیں صاب۔ غریب آدمیوں میں بھی کہیں لکھا پڑھی ہوت ہے وہ کیا اپنی بات سے پھر جاتا جو میں بے اعتباری کرتی؟"

اونہہ — کیا بے وقوف عورت ہے! قادر صاحب نے جھنجلا کے سوچا۔ یہ بیاہ کے بعد گھسیٹا کے ساتھ چاہے کتنے ہی برسوں رہی ہو مگر

قانون تو اُسے گھسیٹا کی بیوی نہیں مانے گا۔

"مگر سرکار بھی تو تجھے گھسیٹا کی بیوی نہیں مانے گی۔

"ہے رام، تو کیا پکّا کاگج لکھوانا ضروری تھا؟ رام پیاری نے بے بسی سے کہا اور گھر اکے صاب کے پاؤں پہ گر کے رونے لگی۔

تیس بتیس برس کی رام پیاری جانے کیوں آج قادر صاحب کو اتنی معصوم سی لگی جیسے وہ اس دن تھی جب پہلی بار گھسیٹا اُسے لے کر آیا تھا۔ انہوں نے گھر اکے رام پیاری کو اُٹھایا تو اُس کے کئی آنسو کرتے پر گر گئے جو صاب کے ہاتھ میں تھا۔ گھر آنے کے بعد قادر صاحب نے اس کرتے کو خوب مَل مَل کے دھویا اور پھر کسی کونے میں چھپا آئے جیسے سارا گھر اس کرتے پر چمکتے ہوئے آنسوؤں کو پہچان لے گا۔ رات کو سونے سے پہلے انہوں نے کئی بار ہاتھ دھوئے۔ انہیں کچھ شبہ سا تھا کہ تھوڑی بہت رام پیاری ان کے ہاتھوں کو چپکی نہ رہ گئی ہو۔

مگر ایسا لگتا تھا جیسے رات میں دلہن بیگم نے رام پیاری کی خوشبو اُن میں سونگھ لی تھی کیونکہ صبح ہی انہوں نے اعلان کیا کہ اب رام پیاری کے بجائے کوئی دُوسرا دھوبی آئے گا، وہ کپڑے بہت خراب دھونے لگی ہے۔

رام پیاری کپڑے لے کر آئی تو دو کپڑے اور کم تھے۔ اُسے یقین تھا کہ اب دلہن بیگم بہت غصّہ میں آئیں گی۔ اس لئے وہ فوراً صاب سے ہنسی مذاق میں لگ گئی اور بڑے ناز سے بولی کہ مجھے دس رُوپے اُدھار دیدو۔ قادر صاحب حسب عادت رام پیاری کو دیکھتے ہی کپڑوں کی گٹھڑی کے پاس آ بیٹھے تھے فوراً اُٹھ کر اندر گئے اور دس روپے لاکر رام پیاری کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

بس پھر تو اللہ دے اور بندہ لے۔ جانے کب سے رکا ہوا بند ھ ٹوٹ گیا اور دُلہن بیگم غصّہ کے مارے آپے سے باہر ہوگئیں۔ رام پیاری کو ہزار ہزار سنا ڈالیں کہ اس نے آج صاب سے پیسے کیوں مانگے: آج سے اس کا گھر میں آنا بند — دنیا جہاں کی چوب زبان رام پیاری کو بھی جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا — وہ گردن جھکائے سیڑھیوں پہ بیٹھی روتی رہی۔

"یہ لٹّوے بہانا اپنے ہونے سوتے کے آگے۔ ہمارے گھر میں سیانے لڑکے ہیں یہاں اپنی ادائیں مت دکھاؤ۔

معاملہ بگڑتے دیکھ کر قادر صاحب کمرے میں چلے گئے سب سے زیادہ شرمندگی انھیں اس بات سے تھی کہ بیگم نے ان سے ایک لفظ نہ کہا — وہ پاندان کھول کر پانوں کی ڈبیہ بھرنے لگے۔ بھرتے چلے گئے۔ کتھے کی پچھی چونے میں گھولتے رہے۔ اُن کے آگے کالے کالے دھبے اُبھر رہے تھے ڈوب رہے تھے۔

"آج تمہیں کیا ہو گیا ہے امّی — اتنی زور زور سے چلا رہی ہو"

جاوید شیو کرتے کرتے کمرے سے باہر چلا آیا۔

"کیا کروں ہم سب کی عزت کے لئے چلا رہی ہوں۔ ہمارا سیل دھونے والی دو کوڑی کی دھوبن ہمارے منہ پہ کالک لگانے بیٹھی ہے"! دلہن بیگم جیسے آج سب کہنے پر تُلی بیٹھی تھیں۔

قادر صاحب کا سر کچھ اور نیچے جھک گیا۔ کئی بار اُن کا جی چاہا کہ اُٹھ کر بیگم کو ڈانٹ دیں۔ آج اُن کی اتنی جرأت ہو گئی تھی کہ اس طرح قادر صاحب پر الزام لگائیں مگر نہ جانے کیوں کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ اور پھر وہ اپنی صفائی میں آخر کیا کہتے! بقول رام پیاری۔ کوئی ثبوت تو تھا ہی نہیں کسی بات کا۔

اچانک کتھے کی بھری اُن کے ہاتھ سے چھوٹ کر سفید پاجامے پر گر گئی — وہ چونک پڑے مَل مَل کر کتھے کے دھبے چھٹانے کی کوشش کی تو وہ اور پھیل گئے۔ وہ پریشان ہو گئے کہ اب اس داغ کو کیسے چھپائیں! اس دن گھر میں بڑا سناٹا سا رہا۔ حد ہو گئی کہ آج ماجد نے چلا چلا کے فلمی گانے نہیں گائے۔ ناظمہ نے پھر سر پہ بالوں کی ٹوکری سی سجائی مگر دلہن بیگم نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ قادر صاحب آفس جانے کے لئے اُٹھے تو بیگم نے رخصتی پان دیا نہ خدا حافظ کہا اور وہ شادی کے بعد پہلی بار اپنے گھر سے غیروں کی طرح رخصت ہوئے۔

البتہ شام کو کھانے کے بعد انہوں نے ٹہلنے کی عادت نہ چھوڑی۔ بُرکو کی دکان تک پہنچے تھے کہ سامنے جانے کہاں سے اچانک ماجد آ کھڑا ہوا۔

"رام پیاری گھر میں نہیں ہے" اس نے اطلاع دی تو قادر صاحب پر گھڑوں پانی پڑ گیا وہ نومبر کی خنکی میں پسینے پسینے ہو گئے مگر فوراً سنبھل کر بولے —

"لیکن اب کیا کام ہے رام پیاری سے تمہیں۔ آج تمہاری امّی نے اس کا حساب کتاب ختم کر دیا ہے! اور وہ فوراً بُرکو سے ایک بڑھیا پان بنانے کی فرمائش کرنے لگے۔

"مجھے تو کوئی کام نہیں ہے" ماجد گھبرا گیا اور آگے چل دیا۔

دوسرے دن قادر صاحب کے سر میں خوب درد ہونے لگا۔ آفس سے جلدی اُٹھ گئے۔ بس اسٹینڈ سے گھر کی طرف جا رہے تھے کہ بُرکو پان والے کی دکان پر نظر گئی۔

سامنے ہی رام پیاری بیٹھی نظر آئی۔ اپنے دروازے میں بیٹھی جیسے کسی کی راہ تک رہی ہو۔ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے جانے کیا سوچ رہی تھی — سڑک بالکل خاموش تھی۔ بُرکو بھی دُکان بند کر کے کہیں چلا گیا تھا مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ قادر صاحب اب طے کر چکے تھے کہ رام پیاری کے گھر

کبھی نہیں جائیں گے۔ آخر اُن کی بھی کوئی پوزیشن ہے۔ عزت ہے۔ اور پچاس سے نکل چکے ہیں۔ کیا اب یہی کام رہ گیا ہے کہ اُن کی بیوی اپنے جوان بچوں کے سامنے ایک ادنیٰ دھوبن کا نام لے کر انہیں ذلیل کریں۔

پھر خیال آیا کہ بیگم نے رام پیاری کو گھر میں آنے سے تو منع کر دیا ہے مگر یہ نہیں کہا کہ اس کا حساب کتاب بھی ختم کر دیں یہ بھی کوئی انصاف ہے۔"

انہیں دیکھ کر رام پیاری چونک پڑی اور سلام کر کے خوف بھری آواز میں بولی۔

"کیا بات ہے؟"

پتہ نہیں کیوں قادر صاحب پر بھی لرزہ سا چڑھ رہا تھا۔ اس لئے وہ رام پیاری کو ایک طرف ہٹا کر کوٹھری میں چلے گئے۔ جہاں سخت بدبو پھیلی تھی۔ میلے کپڑوں کی چھپاند گوبر کی سڑاند اور جانے کاہے کی ناگوار بو پھیلی تھی۔ پوری کوٹھریا بھری تھی کاٹھ کباڑ سے۔

"میں یہ کہنے آیا تھا۔" ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر بیٹھ کر انہوں نے غور سے رام پیاری کو دیکھا۔

شاید وہ رات بھر روتی رہی تھی کیونکہ اس کے چہرے پر بڑی موہنی سی اداسی تھی چہرہ سرخ، بھبھوکا ہو رہا تھا۔ آنکھیں سوجی سوجی سی تھیں۔

"تمہارا حساب کتاب کیا ہے؟ کچھ نہیں معلوم ہے۔"

"میں کیا جانوں ——؟" وہ اُن کے پاؤں کے پاس آبیٹھی اور جوتوں کے تسمے چھوتے ہوئے بولی۔

"میں نے تو کبھی کاغج پر لکھوایا ہی نہیں کچھ۔ جو جس کے جی میں آیا دیدیا۔"

وہ پھر رونے لگی۔

"مگر میں —— میں تمہارا —— قرض دار —— اچھا تم اطمینان رکھو —— میں تمہاری پائی پائی ادا کر دوں گا۔"

اور وہ جھک کر پہلی بار رام پیاری کا حساب بے باق کرنے لگے ——

••


## غالبیات میں اضافہ

غالب کے فکر و فن اور زندگی سے متعلق دو اہم کتابیں

**فنیہ غالب** ۲۲ مقالات، بڑا سائز، صفحات ۲۷۸، قیمت ۵ روپے

**نجیبۂ غالب** ۱۴ مقالات، بڑا سائز، صفحات ۱۸۶ قیمت ۴ روپے

محصول ڈاک ہمارے ذمہ ۵۰ روپے اور اس سے زائد کی کتابیں منگوائی جا سکتی ہیں

بزنس منیجر سپلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی




جب سے سُلگتی پیاس کا صحرا ہوا ہوں میں
اُڑتی ہوئی گھٹاؤں کا سایہ ہوا ہوں میں
آئینہ دیکھتا ہوں تو یہ سوچتا ہوں میں
ایسا کبھی نہ تھا، یہ بھلا کیا ہوا ہوں میں
کیا پوچھتے ہو مجھ سے، کیوں چٹخا ہوا ہوں میں
اپنے سلگتے جسم میں بجھتا رہا ہوں میں
پہنچے گا کون گردِ تخیل کو اب مری
برسوں ترے خیال میں سوچا گیا ہوں میں
اُڑتا ہوں آتی جاتی ہواؤں کے ساتھ ساتھ
ٹوٹا ہوا پیڑ سے جو وہ پتہ ہوا ہوں میں
اے دوست! پڑھ بھی لے ترے دل کی کتاب پر
اپنے لہو کی بوند سے لکھا ہوا ہوں میں
میں آئینہ ہوں خواب کا، پلکوں پہ تھام لے
اب ٹوٹنے کا وقت ہے ڈر نے لگا ہوں میں
تم جانتے ہو، پہلے تو میں سنگ دل نہ تھا
تنہائیوں کے خوف سے پتھرا گیا ہوں میں
پھیلا ہوں میں زمان و مکاں کی حدوں سے دُور
جب سے خود اپنے آپ میں سمٹا ہوا ہوں میں
گونجے کا خامشی کا یہ گنبد بھی ایک روز
تحت الشعور میں ابھی سویا پڑا ہوں میں
اس درجہ ظلمتوں سے میں مانوس تھا، کہ اب
آیا ہوں روشنی میں تو اندھا ہوا ہوں میں
جب سے کیا ہے اس نے مرے غم کو اختیار
جس پر یقیں نہ آئے، وہ قصہ ہوا ہوں میں
سوچا تو ہوگا تو نے بھی خلوت میں بارہا
کیوں تیری خواہشوں کا تقاضا رہا ہوں میں
بن کر ہزار بار کسی لمس کا لباس
برسوں تمہارے جسم پہ پہنا گیا ہوں میں
بکھرا ہوا تھا کرب میں تخلیق کی میں آج
اب یہ غزل کہی ہے تو یکجا ہوا ہوں میں
آزاد! جب سے دُور ہوا وہ، یہ حال ہے
سردی میں پرتبوں کا سویرا ہوا ہوں میں

جولائی ۱۹۷۱ء

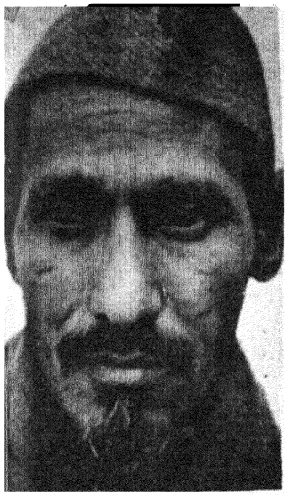

# نازش پرتابگڈھی

سخن ورو! کس طرف ہو، آؤ میں تم کو آواز دے رہا ہوں
تمہارے نغموں کے واسطے آج اک نیا ساز دے رہا ہوں
تمہاری فکرِ سخن کی خاطر اک اور انداز دے رہا ہوں
تمہارا ہر شعر بول اُٹھے گا، تمہیں وہ اعجاز دے رہا ہوں

بلندیٔ فرشِ خاک پر آسماں کی رفعت نثار کر دو
دیارِ ہندوستاں پہ یارو! بہارِ جنت نثار کر دو

نقوش ایلورا کے پتھروں پر کہ چشمِ گیتی میں خواب جیسے
قطب کی یہ لاٹ۔ عزمِ آدم کی صورتِ کامیاب جیسے
یہ جامع مسجد کا حسنِ سادہ، دُعا کوئی مستجاب جیسے
یہ تاج۔ انساں کی حسن کاری اُلٹ رہی ہو نقاب جیسے

کمالِ فن کی کرشمہ سازی سے ایک اک رنگ بول اٹھا ہے
نظر اجنتا کی سمت اُٹھاؤ جہاں دلِ سنگ بول اُٹھا ہے

اُڑی ہے سنگم سے جب بھی خوشبو تو آبروئے ختن گئی ہے
ہنسی ہے جب رات مالوے کی تو روشنی دل میں چھن گئی ہے
پٹھار ارضِ دکن کے ہیں یا نگاہِ محبوب تن گئی ہے
کوئی اماوس کی رات لہرا کے زلفِ بنگال بن گئی ہے

نگارِ دلی کی یہ سجاوٹ، کتھاکلی کا ہو روپ جیسے
یہ لکھنؤ کی حسین شامیں گلابی جاڑے کی دھوپ جیسے

یہ لال قلعے کی سُرخ تعمیر — جم گیا ہو گلال جیسے
ہمالیہ کی بلندیوں میں زمین کا ہو جلال جیسے
یہ ارضِ کشمیر۔ ایک شاعر کی منتہائے خیال جیسے
زمین کا روپ پا گیا ہو مغنیہ کا کمال جیسے

وسیع جھیلوں کی صورتوں میں نگارِ فطرت کے آئینے ہیں
عظیم کہسار۔ جیسے بھارت کے لوگ ڈٹ کر کھڑے ہوئے ہیں

یہ رودِ سرجو ہے یا تقدس کی آنچ میں روح گل گئی ہے
پوتر جمنا کے روپ میں بانسری کی اک تان بہہ رہی ہے
یہ پاک گنگا کہ جس سے قلب و نظر کو آسودگی ملی ہے
ہماری دھرتی نے ہاتھ پھیلا کے ہم کو آشیرباد دی ہے

یہ ننھی موجیں ہیں یا کسی منہ جبیں کے ابرو کی جنبشیں ہیں
یہ نرم لہروں کا ہے ترنم کہ دل کی معصوم دھڑکنیں ہیں

یہ دھان کی بالیاں کہ جس طرح کوئی نازک سی آرزو ہو
جھکے ہوئے خوشہ ہائے گندم کہ جیسے چشمِ بہانہ جو ہو
یہ پھیلی بکھری ہوئی سی بیلیں کہ جیسے عاشق کی گفتگو ہو
یہ پھولے سرسوں کے کھیت آنگن میں جیسے بیٹھی ہوئی بہو ہو

یہ کیاریاں ہیں کہ اک مصور کے شاہکاروں کا سلسلہ ہے
یہ کونپلیں ہیں کہ سینۂ آدمی میں جینے کا حوصلہ ہے

یہاں کی صناعیوں میں دستِ بشر کی محنت لہک رہی ہے
بنارسی ساڑیوں کی تہہ میں ہنر کی مستی جھلک رہی ہے
چکن کی وہ چاندنی کہ تخلیقِ فن کی دنیا چمک رہی ہے
یہ جامدانی کا روپ ہے یا چمن میں جو ہی مہک رہی ہے

یہ کامدانی کی بوٹیاں، کہکشاں سے جن کو خراج آئے
زری کی یہ دھوپ چھاؤں جیسے کسی سہاگن کو لاج آئے

یہاں خیالوں کی جلوہ گاہوں میں امن کے دیپ جل چکے ہیں
یہاں نگاہوں کی بانسری سے خوشی کے نغمے اُبل چکے ہیں
دیارِ گوکل میں حسن و اُلفت کے سرمدی گیت پل چکے ہیں
یہ وہ زمیں ہے جہاں فضا میں غزل کے اشعار ڈھل چکے ہیں

فریب نے جب بھی سر اٹھایا تو بھیم و ارجن چلے ہیں تن کر
جو ظلم کی کوئی آگ بھڑکی تو لوگ اُٹھے پرہلاد بن کر

ملے گا بدھ کے پیامِ حق میں وہی سکونِ حیات اب بھی
گیا کے ذرّے دکھا رہے ہیں جہاں کو راہِ نجات اب بھی
اجودھیا کی فضاؤں میں ہے وفائے سیتا کی بات اب بھی
مصیبتوں کے گھنیرے جنگل میں رام لچھمن ہیں ساتھ اب بھی

کریدو ماضی کی راکھ اس میں شعور کا جام جم ملے گا
انہیں روایات کے خزانے سے تم کو زورِ قلم ملے گا

وہی ادائیں ہیں گوپیوں کی تو کرشن کی بانسری وہی ہے
وفائے شاہِ جہاں نے کی تھی جو مرمریں شاعری وہی ہے
ہزار لُٹ کر بھی اپنی دھرتی پہ جلوۂ زندگی وہی ہے
پھٹا ہے پنجاب کا کلیجہ مگر لبوں پر ہنسی وہی ہے

انہیں میں موضوعِ نظم ڈھونڈو، یہیں پہ مینارہ ادب ہے
زمیں ہی مرکزِ سخن ہے۔ وطن ہی گہوارۂ ادب ہے

نیا ساز نیا انداز

# جدید ایران

نورالحسن انصاری



تیل صاف کرنے کا کارخانہ — تہران

دنیائے اسلام میں ہمیشہ ایران کی ایک مرکزی حیثیت رہی ہے ایرانی دانشوروں نے اپنی ذہانت اور فطانت، اپنی فن کاری اور شاہکاری اور اپنی لطافت و ظرافت سے دنیائے اسلام کو خصوصاً اور دُنیائے عام کو عموماً متاثر اور مسحور کیا ہے یہی وہ حسین سرزمین ہے جہاں حافظ و خیام نے شراب و شاہد کے نغمے چھیڑے۔ فردوسی نے رستم و سہراب کی داستان سُنائی، سعدی نے انسانیت کا زیر و بم سمجھایا اور رومی نے عرفان و تصوف کی باریکی بتائی۔ یہیں کی سرزمین سے بوعلی سینا اور فارابی اُٹھے جن کی فلسفیانہ عرق ریزیوں نے مشرق و مغرب کے فلاسفہ کو پانی پانی کر دیا اور یہیں کی مٹی میں غزالی اور رازی دفن ہیں جن کے اخلاقی اور اصلاحی افکار نے بھٹکے ہوئے معاشرہ کو اُمید کی کرن دکھائی۔ ساحر الموت نے اسی سرزمین پر اپنی شعبدہ کاری کی جنت بنائی اور یہیں باب اللہ اور بہاء اللہ نے پیغمبری کے دعوے کئے۔

ایشیا کے سینے میں ایران دِل کی طرح دھڑکتا ہے اور البرز و ماند کی برف پوش چوٹیاں اور بحر خضر کی نیلگوں گہرائیاں ایک طرف ایرانی جنت کی نعمتیں ہیں تو دوسری طرف دشت کویر اور دشت لوط کی پنہائیاں وہاں کی لعنت بھی ہیں۔ کبھی ایران کا دارالخلافہ اصفہان نصف جہان تھا اور شیراز کا گلگشت مصلیٰ جنت الماوی سے زیادہ وقیع تھا۔ اس جنت میں جو آیا، کھو گیا اس پاک زمین کی مٹی جسے نصیب ہوئی وہ اُسے آنکھوں سے لگا کر یہیں کا ہو رہا۔ یونانیوں نے یہاں قدم رکھا تو یہاں کی رومانیت میں یونان کا جمال بھول گئے، مسلمان یہاں پہونچے تو بغداد اور دمشق سے آنکھیں موند لیں۔ ترک یہاں آن کر معشوق بن گئے، چنگیزی اور تاتاری تمدن اور ثقافت کی سرپرستی فرمانے لگے۔ ایران نے دنیائے تمدن کو جو کچھ دیا ہے اس کا حد و حصر تقریباً ناممکن ہے۔

یہاں کی بے پناہ دلکشی یہاں کی فطری بوقلمونی اور یہاں کے باشندوں کی رنگا رنگی میں ہے۔ جدید ایران مہذب ترین افراد اور قدیم ترین قبائل کا ایک حسین شیرازہ ہے۔ یہاں کے بہت سے قبائل آج بھی اپنے قوانین کی سختی سے پابند ہیں۔ ایران میں تقریباً ۲۹ لاکھ قبائلی رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ شہر کی طرف آرہے ہیں اور اپنے قدیم مرکز سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ قدیم قبائل میں سب سے مشہور کرد قبیلہ ہے جو شمال مغرب میں آباد ہے۔ کردستان کے جنوب میں لر قبیلہ آباد ہے جس کے نام پر وہ صوبہ لرستان کہلاتا ہے۔ ان کی زبان لری کہلاتی ہے اور اس کا شمار ایران کی قدیم ترین بولیوں میں کیا جاتا ہے۔ بختیاری اور بلوچ قبیلے اپنی بے پناہ بہادری کے لئے مشہور ہیں۔ اوّل الذکر نے ایران کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ شمال مشرق میں افشار اور ترکمان قبیلے آباد ہیں۔ نادر شاہ اول الذکر قبیلہ کا فرد تھا۔ ترکمان قبیلہ کا بہت بڑا حصہ دریائے اترک کے اس پار سوویت یونین میں رہتا ہے۔

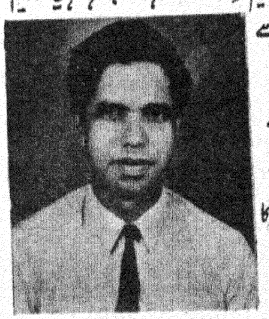

ان قبائل کے علاوہ اور بھی دلچسپ قومیتیں ہیں۔ ایک طرف آرمینیا کے عیسائی ہیں تو دوسری طرف قدیم زردشتی اور بھولے بھٹکے یہودی، تیل کے کارخانوں کی بدولت امریکہ اور برطانیہ کے لوگوں کی کافی تعداد یہاں بس گئی ہے، تجارت پر پارسی اور یہودی اور موٹر کے کام پر سکھ چھائے ہوئے ہیں۔

ایران صدیوں سے انقلاب کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، بعض ایرانی مسلمانوں

کی آمد کو بھی عرب حملہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ تیرہویں صدی کے آغاز میں چنگیز اور ہلاکو نے ایران کو قیامت زار بنا دیا اور چودھویں صدی کے اواخر میں تاتاریوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ ان دونوں حملوں میں ایران راکھ اور خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ منہدم محلوں کی جگہ انسانی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کئے گئے۔ حسینوں کے چمن بوم و کرگس کا وطن بن گئے۔ صفوی دور پر امن اور پر سکون رہا۔ ایران میں پہلی بار ایرانیوں کی حکومت ہوئی۔ اس کے بعد نادر شاہ افشار ایران کے تخت پر جلوہ افروز ہوا لیکن۔ وہ نادر جو دہلی پر عذاب بن کر نازل ہوا تھا، ایرانی آزادی کا محافظ اور ایرانی قوم کا عظیم ہیرو ہے، قاچاری دور ایران کا سب سے بدقسمت دور ہے کیونکہ اب ایران پر جو تباہی آئی وہ خود ایرانیوں کے ہاتھوں آئی تھی۔ ایران بیرونی طاقتوں کی تجربہ گاہ بن گیا، روسیوں اور انگریزوں نے ایران کو مال غنیمت کی طرح بانٹ لیا۔ شمالی حصہ پر روس قابض ہو گیا اور جنوبی حصہ کو انگریز نوچتے رہے۔ احمد شاہ قاچار کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔ آخر کار ۱۹۲۱ء میں ایران کے حریت پسندوں نے رضا شاہ پہلوی کی قیادت میں علم انقلاب بلند کیا اور مرکزی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

ایران کا دور جدید درحقیقت رضا شاہ مرحوم کے عہد سے شروع ہوتا ہے اب ایرانی قوم نے صحیح معنوں میں آنکھ کھولی اور کروٹ بدلی۔ رضا شاہ میں فوجی عزیمت بھی تھی اور عمرانی بصیرت بھی، ان میں بہادری اور شرافت کا حسین امتزاج بھی تھا، وہ مشرقی اقدار کے قائل اور مغربی نعمتوں کے قدردان تھے۔ انہوں نے بہت جلد یہ محسوس کر لیا کہ ایرانی معاشرہ کے ناسور کہاں کہاں رس رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فوجی عزم اور اخلاقی جرأت کے ساتھ بے باک قدم اٹھائے مگر وہ اپنے انقلابی پروگرام میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے۔ دوسری جنگ عظیم میں بڑی طاقتوں کے آگے انھیں سرنگوں ہونا پڑا اور حالات سے مجبور ہو کر ۱۹۴۱ء میں وہ اپنے بیٹے محمد رضا شاہ پہلوی موجودہ فرماں روائے ایران کے حق میں تخت سے دست بردار ہو گئے۔

ایران کا رقبہ چھ لاکھ اسی ہزار مربع میل ہے اور آبادی تقریباً ڈھائی کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔ ہندوستان کی طرح ایران میں بھی آبادی کا بڑا حصہ دیہاتوں میں رہتا ہے۔ ایران کی بیشتر آبادی ملک کے چاروں طرف سرحدی پٹیوں پر آباد ہے۔ بیچ کا وسیع علاقہ دشت کویر اور دشت لوت پر محیط ہے۔ اس وسیع و عریض صحرا میں کہیں کہیں نخلستان کی شادابی نظر آجاتی ہے لیکن ان صحراؤں کے علاوہ ایران کا زرخیز اور آباد علاقہ ہرے بھرے درختوں اور رنگ برنگ پھولوں سے لبریز ہے۔ قدرت نے ایران کو نفیس ترین پھولوں سے نوازا ہے۔ لالہ صحرائی سے لے کر نرگس بیمار تک ہر پھول دامن دل کھینچتا ہے۔ دنیا کے کسی ادب میں گلہائے رنگا

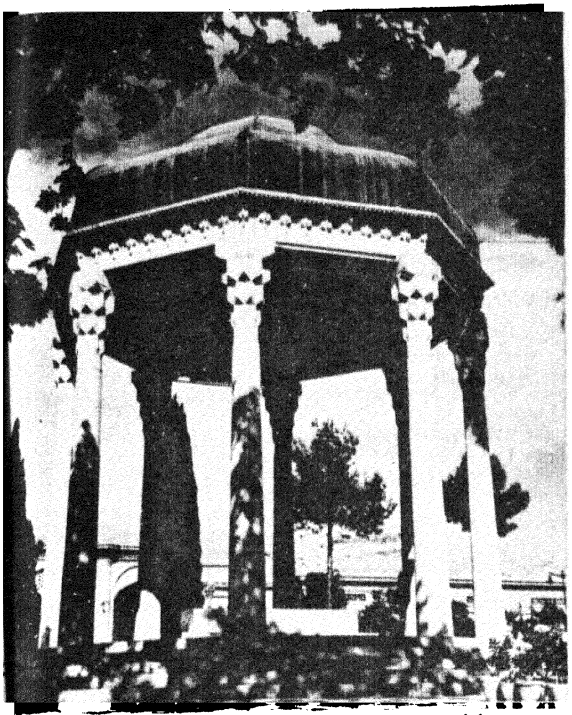

آرام گاہ — حافظ شیرازی

رنگ کا اتنا ذکر نہیں ہے جتنا فارسی ادب میں۔ اور یہ محض فارسی شعراء کی خیال آرائی نہیں ہے بلکہ موسم بہار میں ایک ایک چپہ دامان گل فروش معلوم ہوتا ہے۔ سرو و شمشاد تو اور جگہ بھی ہوتے ہیں مگر شیراز کے قرب و جوار میں جو سرو ناز، ہوتا ہے اس کی خوبصورتی اور تناسب کا یہ عالم ہے کہ 'قد دلبر' کی اس سے عمدہ تشبیہ ممکن نہیں۔

ہندوستان کی طرح ایران بھی بنیادی طور پر ایک زراعتی ملک ہے لیکن ہمارے یہاں آب پاشی کا جو معقول انتظام ہے، ایرانی کاشت کاری اس سے بڑی حد تک محروم ہے۔ جنوب مغرب میں دریائے کارون کے علاوہ پورے ملک میں کوئی بڑا دریا نہیں ہے۔ یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ ایران کے لوگ عموماً تیراکی اور پانی سے بہت ڈرتے ہیں اور ذرا سی بارش کو سیل سے تعبیر کرتے ہیں، حافظ جب ہندوستان کے سفر کے لئے جہاز پر سوار ہونے آئے تو سمندر دیکھ کر ڈر گئے اور یہ شعر کہتے ہوئے شیراز واپس ہو گئے۔

چہ آسان می نمود اول غم دریا بہوی سود
غلط کردم کہ این طوفان بصد گوہر نمی ارزد

شہنشاہ ایران نے جنوری ۱۹۶۳ء میں جب انقلاب سفید نافذ کیا تو سب سے زیادہ زور زرعی اصلاحات پر دیا گیا۔ ایران میں تمام زمین پر (بشمول جنگلا

زیبا ایک ہزار خاندانوں کا قبضہ تھا یہی ایک ہزار زمیندار حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک تھے کسان کو کرایہ پر زمین دی جاتی تھی اور ذرا سی بات پر اسے بے دخل کر دیا جاتا تھا چنانچہ زمینداری کو ختم کرنے کے لئے سب سے پہلے شہنشاہ نے اپنی ذاتی اراضی کاشت کاروں میں تقسیم کی اور انہیں اس کا حق ملکیت دیا اس کے بعد سارے ملک سے زمینداری کا خاتمہ کیا گیا۔ چراگاہیں اور جنگلات سرکاری ملکیت میں لے لی گئیں اور زمین کاشت کاروں کی ملکیت میں دیدی گئی۔

ایران میں زیادہ تر گیہوں، جو اور چاول کی کاشت ہوتی ہے لیکن آب پاشی کی دقت اور افتادہ زمین کی فراوانی سے ایران غذائی معاملہ میں خود کفیل نہیں ہے گیہوں اور چاول کی بڑی مقدار درآمد کی جاتی ہے پچھلے چند سالوں سے حکومت کپاس اور گنے کی کاشت پر زیادہ زور دے رہی ہے اس کی وجہ سے بھی گیہوں وغیرہ کی پیداوار میں خاص اضافہ نہیں ہوا ہے۔ اب حکومت نے اصلاح اراضی کے لئے ایک خاص فوجی دستہ مقرر کیا ہے اور جگہ جگہ بند بنا کر آب پاشی کا بہتر انتظام کیا جا رہا ہے۔ گاؤں والوں کی بہتری کے لئے ایک اہم کام یہ ہوا ہے کہ پنچایت کے نمونے پر عوامی عدالتیں قائم کی گئی ہیں تاکہ گاؤں کے لوگ اپنے نزاعی معاملات کا فیصلہ خود ہی کر سکیں۔ اور شہر کی کچہری کے چکر سے محفوظ رہیں۔

ایران ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے اور ملک کے کونے کونے سے علم و ادب کے نئے پھوٹتے رہے ہیں مگر علم کا یہ فیض صرف شہروں تک محدود ہے۔ دور افتادہ دیہات اور خانہ بدوش قبایل آج بھی علم کی دولت سے محروم ہیں۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ دیہات کے ۸۰ فیصد لوگ ناخواندہ ہیں۔ ناخواندگی کو ختم کرنے کے لئے انقلاب سفید کے زیر اہتمام ایک بہت مفید اسکیم پروگرام کا رلائی گئی ہے جس کی پیروی اگر ہندوستان میں بھی کی جائے تو کم سے کم خرچ پر چند سالوں میں ہمارے یہاں سے بھی ناخواندگی دور ہو سکتی ہے۔ ایران میں سپاہ دانش کے نام سے ایک دستے کی تشکیل کی گئی ہے۔ یہ دستہ یونی ورسٹی کے فارغ التحصیل طلبہ پر مشتمل ہے اس دستے کے افراد کو کسی دور افتادہ گاؤں میں متعین کیا جاتا ہے جہاں وہ دیہات کے باشندوں کو پڑھنا اور صاف ستھری زندگی گزارنا سکھاتا ہے اس طرح امید کی جاتی ہے کہ پورے ملک سے چند سال کے اندر ناخواندگی دور ہو جائے گی۔

اس وقت ایران میں سات دانش گاہیں (یونی ورسٹی) ہیں۔ دو مزید دانش گاہیں جلد ہی کھولی جائیں گی سب سے قدیم اور بڑی دانش گاہ تہران ہے جس میں تقریباً سولہ ہزار طلبا زیر تعلیم ہیں۔ یہ دانش گاہ ۱۹۳۴ء میں قائم کی گئی تھی۔ ایران کی بیشتر عظیم شخصیتیں کسی نہ کسی حیثیت سے تہران یونی ورسٹی سے وابستہ رہی ہیں۔ پورے ملک کے تقریباً پچاس فیصد طلبہ اسی یونی ورسٹی میں تعلیم پاتے ہیں۔ طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ۱۹۶۰ء میں تہران میں ایک دوسری یونی ورسٹی دانش گاہ ملی کے نام سے قائم کی گئی ہے جس میں فلسفہ اور ادبیات کے بجائے سماجی علوم طب اور سائنس کی تعلیم پر زیادہ زور ہے۔ دارالخلافہ کے علاوہ صوبوں میں جو دانش گاہیں ہیں ان میں سب سے قریب آذربائیجان کی راجدھانی تبریز کی یونی ورسٹی ہے۔ تبریز یونی ورسٹی کا ایک بڑا ادارالاشاعت بھی ہے جو اب تک ایک سو سے زیادہ سائنس کی کتابیں چھاپ چکا ہے وہاں دو ہزار سے زائد طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ تبریز یونی ورسٹی میں دو خاص انسٹی ٹیوٹ کام کر رہے ہیں۔ ایک تاریخ اور کلچر کا ادارہ ہے اور دوسرا میڈیکل ریسرچ کا۔

شیراز کی پہلوی یونی ورسٹی۔ تہران یونی ورسٹی کے بعد دوسری حیثیت رکھتی ہے اس کے وائس چانسلر ڈاکٹر لطف علی صورت گر غالب کے صد سالہ جشن میں ہندوستان تشریف لائے تھے ابھی حال میں ان کا انتقال ہو گیا صورت گر فارسی اور انگریزی کے بہت عمدہ نقاد تھے۔ ان کی انگریزی نے ایرانیوں کے بارے میں جو کتاب لکھی ہے وہ میرے خیال میں غیر ملکیوں کی کتابوں میں سب سے عمدہ اور دلچسپ ہے۔ اس کتاب کا عنوان ہے " I Sing In Wilderness " شیراز یونی ورسٹی میں ادبیات اور سائنسی علوم کے تمام شعبے ہیں۔ شیراز یونی ورسٹی سے تھوڑے فاصلے پر ساسانیوں کا ویران دارالخلافہ تخت جمشید ہے۔ شہنشاہ اور یونی ورسٹی کے ذمہ دار حضرات کی کوشش ہے کہ شیراز یونی ورسٹی

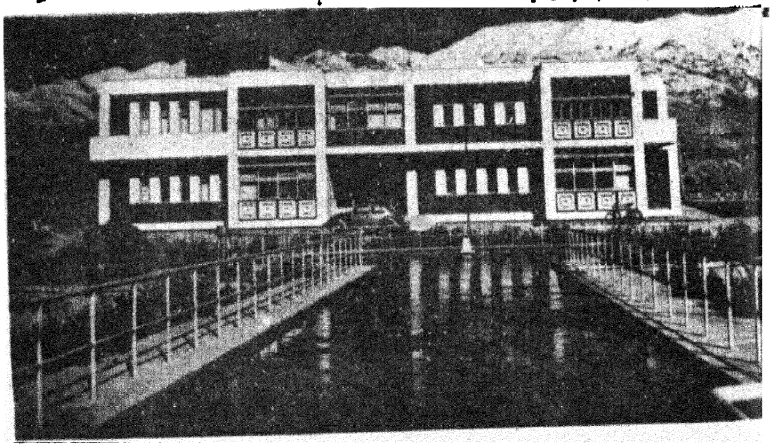

شعبہ جیو فزکس۔ ایرانی یونی ورسٹی

کا کیمپس اتنا شاندار تعمیر کیا جائے کہ وہ اپنی شان و شوکت میں تختِ جمشید کی عظمتِ رفتہ کا صحیح آئینہ دار ہو چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک ارب روپیہ منظور کیا گیا ہے جسے ایک طویل عرصہ میں خرچ کیا جائے گا۔

خراساں کے دارالخلافہ مشہد، خوزستان کی راجدھانی اہواز اور مرکزی ایران کے شہر اصفہان میں بھی یونی ورسٹیاں ہیں۔ ان میں مشہد یونی ورسٹی ادب اور مذہبیات کی تعلیم کے لئے ممتاز ہے۔ مشہد ایران کا سب سے مقدس شہر ہے۔ اور خراساں فارسی ادب اور ایرانی ثقافت کا قدیم ترین مرکز ہے۔ فردوسی بوعلی سینا، محقق طوسی، خیام اور نہ جانے کتنے عبقری اسی سرزمین کی مٹی سے اٹھے۔ مشہد یونی ورسٹی خراساں کے ممتاز علماء و فضلاء کے جشن مناتی ہے۔ ابھی حال میں جعفر طوسی اور ابوالفضل بیہقی کے جشن منائے گئے جس میں ہندوستان کے دانشوروں نے بھی شرکت کی۔

یوں تو ایران بالطبع ادب اور ثقافت کی طرف مائل ہوتا ہے اور انہیں علوم کی تحصیل کرتا ہے مگر حکومت تکنیکل ٹریننگ پر بہت زور دے رہی ہے۔ آبادان میں ایران کی قومی آئل کمپنی کے اشتراک سے ایک کالج قائم کیا گیا ہے جس میں آئل انجینئرنگ کی تربیت دی جاتی ہے مگر آج بھی تیل کی صنعت میں انجینیروں کی بڑی تعداد انگریز اور امریکیوں پر مشتمل ہے۔

ایران کی سب سے بڑی دولت تیل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایران کی سیاست بڑی حد تک تیل کے اردگرد گھومتی ہے۔ مغربی ایشیا کے دیگر ممالک کی طرح ایران میں بھی تیل کی بڑی حد تک اجارہ داری برطانیہ اور امریکہ کے ہاتھ میں تھی ۱۹۵۱ء میں مصدق نے تیل کو قومی ملکیت قرار دیا

اس کے بعد جو سیاسی داؤ پیچ شروع ہوا اس میں پہلے شاہ کو ملک چھوڑنا پڑا اور پھر مصدق ہمیشہ کے لئے نظر بند کر دیئے گئے لیکن ایرانی حکمرانوں نے یہ بہرحال محسوس کر لیا کہ تیل کی صنعت کو قومی ملکیت میں لئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ آخرکار ایک سرکاری ادارہ نیشنل ایرانین آئل کمپنی کے نام سے قائم کیا گیا تھا اب تیل کی آمدنی کا ۷۵ فیصد منافع اس کمپنی کے ذریعہ ایرانی عوام کو ملتا ہے اور غیر ملکی کمپنیاں صرف ۲۵ فیصد منافع کی حقدار ہیں۔ ۱۹۶۶ء کے اعداد و شمار کے مطابق تیل سے ایران کو ۲۱۶۷۸ ملین پونڈ کی آمدنی ہوئی جب کہ ۱۹۵۱ء میں یہ آمدنی صرف سات ملین تھی۔

تیل کے بعد حکومت ایران چینی اور کپڑے کی صنعت کو بڑھاوا دے رہی ہے۔ اس وقت ایران میں کپڑے کی کل نو ملیں ہیں لیکن ان کی پیداوار کوئی خاص اہم نہیں ہے۔ تمام سرکاری فیکٹریوں میں مزدوروں کے حصص مخصوص کر دیئے گئے ہیں تاکہ دست دولت آفریں دولت سے محروم نہ رہے۔ روس کے اشتراک سے اصفہان میں فولاد کی پہلی فیکٹری قائم کی گئی ہے۔ پچھلے چند سالوں میں ایران اور روس کے تعلقات بہت بہتر ہوئے ہیں۔ ایران سے روس کو ایندھن گیس کی برآمد بھی کی جا رہی ہے۔

ایران دراصل دست کاری کا مرکز ہے۔ ایران کے قالین شہرہ آفاق ہیں اندازہ ہے کہ ایران کے پچاس لاکھ افراد اپنی روزی قالین کے ذریعہ کماتے ہیں۔ اصفہان کے رنگین ٹائل اور برتنوں کی نقاشی بے مثال ہے۔ شیراز اور اصفہان میں چاندی کا بہترین کام ہوتا ہے۔ لکڑی پر کندہ کاری کا کام بھی یہاں کے فن کاروں کا شاہکار ہے۔ یہاں اور قم میں مٹی اور چینی کے سبک اور نفیس برتن بنتے ہیں۔ خراساں کے سنگ تراش پتھر میں شاعری کرتے ہیں۔

ایران کا سرکاری مذہب اثنا عشری شیعیت ہے۔ مگر جنوبی ایران کے عرب، مغرب میں کرد اور مشرق میں بلوچ سنی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب ملک سے شیعہ سنی کی وبا تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ درحقیقت قومیت کے احساس کے ساتھ ساتھ ایران میں زردشتیت یعنی ایران باستان کا عشق بڑھتا جا رہا ہے۔ ایک ترقی یافتہ ایرانی میں زردشتیت کے تمام عقائد پائے جاتے ہیں۔ پھر بھی عوام میں مذہبیت باقی ہے۔ ہر شہر میں کسی نہ کسی امام زادہ کا مزار ہے۔ جہاں ہفتہ میں لوگ ایک دن مراد مانگنے جمع ہو جاتے ہیں۔ مشہد کے مقدس شہر میں جمعرات کو اجتماع

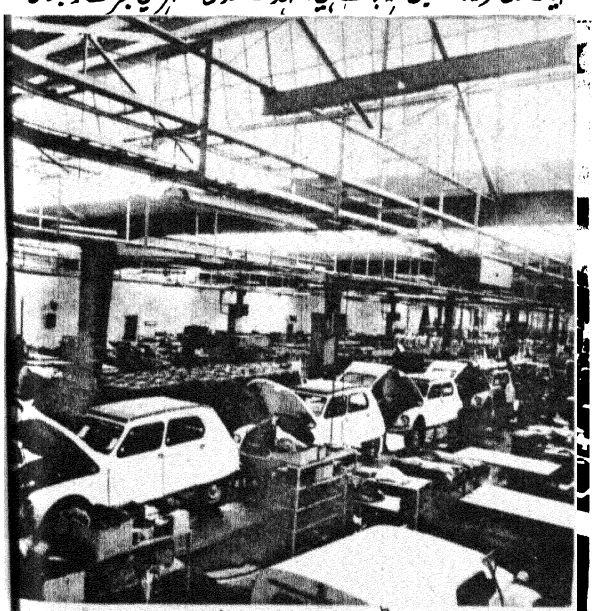

موٹر کا کارخانہ

یہی ملک کا معیاری لہجہ ہے۔ خراسانی اور آذربائجانی لہجے اس سے مختلف ہیں۔

ایران کا سب سے خوبصورت اور بڑا شہر دارالخلافہ تہران ہے۔ یہاں کے ہوٹل اور کلب، تفریح گاہیں اور رقص گاہیں، کالج اور یونی ورسٹی اور دفتر اور دکان سب کے سب مغرب کے رنگ میں ڈوبے ہیں۔ یہاں دولت اور عیش کی ریل پیل ہے۔ فیشن کی بیباکی آنکھوں کو چکا چوند کرتی ہے۔ تاجر اور اعلیٰ عہدہ داروں کی آمدنی بہت زیادہ ہے۔ سارے ملک کے دانشور یہیں رہنا پسند کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تہران ایران کی جان ہے۔ تہران کے بعد شیراز سے ایرانیوں کو سب سے زیادہ لگاؤ ہے۔ شیراز کی فضا میں ایک خاص رومانیت ہے۔ شیراز کی شراب اور سرو ناز پورے ایران میں مشہور ہیں۔ شیراز کے پاس ہی قدیم ساسانی سلطنت کا مرحوم دارالخلافہ تخت جمشید ہے جسے دیکھ کر ایرانی رو پڑتے ہیں۔ ایرانی بہت ذکی الحس اور رقیق القلب ہوتے ہیں۔ محفل شعر میں بھی واہ واہ کرنے کے بجائے آنکھیں بند کئے جھومتے ہیں اور اچھے اشعار پر رونے لگتے ہیں۔ ایران میں مشاعرے کا کوئی رواج نہیں، مخصوص نشستیں ہوتی ہیں۔ اب اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ پبلک مشاعرے کو رائج کیا جائے۔

مصدق کے انقلاب اور شاہ کی بحالی کے بعد جنوری ۱۹۶۳ء میں "انقلاب سفید" کا نفاذ کیا گیا۔ انقلاب سفید سماجی اصلاحات کا مجموعہ ہے اس کی پوری تفصیل خود شہنشاہ نے انقلاب سفید کے نام سے فارسی میں لکھی ہے۔ انقلاب سفید کے نفاذ کے بعد زمینداروں اور ملاؤں نے حکومت کی سخت مخالفت کی لیکن جب استصواب رائے کے بعد عوام نے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا تو وہ خاموش ہو گئے۔ انقلاب سفید نو دفعات پر مشتمل ہے۔ جس میں زمینداری کا اختتام، سپاہ دانش کی تشکیل اور عورتوں کو ووٹ دینے



ٹیلے ویژن کا کارخانہ

ہوتا ہے جہاں امام علی بن موسیٰ الرضا کا مزار ہے قم اور کاشان بھی مذہبی ماحول کے لئے مشہور ہیں۔ شیعہ اور سنی کے خلاف مسلمانوں کا ایک اور فرقہ بہائی بہت اہم ہے۔ بہائی حضرت بہاء اللہ کو اپنا پیمبر مانتے ہیں۔ پچھلی صدی میں انہوں نے ایران کی حکومت کے لئے خاصا دردِ سر کا سامان مہیا کیا ہے۔ اب بھائیوں کا مرکز ثقل ایران سے امریکہ منتقل ہو چکا ہے۔

ایران کی عام اور سرکاری زبان فارسی ہے۔ مگر آذربائجان میں ترکی کردستان میں کردی، لرستان میں لری، سیستان میں بلوچی اور جنوب ایران کے ساحل پر عربی بولی جاتی ہے۔ جدید فارسی کا لب و لہجہ ایک عام ہندوستانی فارسی داں کے لئے خاصا دقت طلب ہے۔ جدید ایرانی لہجہ میں واؤ مجہول، یائے مجہول اور نون غنہ کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ نون سے پہلے جو الف آتا ہے اسے عموماً واؤ سے بدل کر بولتے ہیں مثلاً نان کو نون، خانہ کو خونہ وغیرہ بول چال میں است کی جگہ یائے مجہول کا استعمال کرتے ہیں مثلاً خوب است کے بجائے "خوبے" بولیں گے۔ بعض مرتبہ تو جملہ اس قدر بگڑ جاتا ہے کہ اصل کا پتہ لگانا دشوار ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ جملہ "خانہ شمان خوب است" (تمہارا گھر اچھا ہے) بول چال میں خُن تُن خوبے، بن جاتا ہے۔ یہ لہجہ تہران کا ہے اور

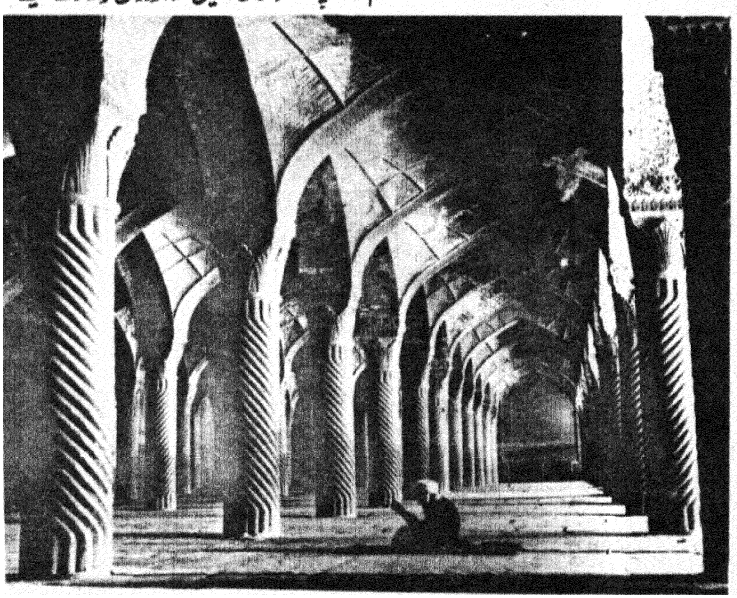

وکیلے مسجد شیراز

کا حق خاص دفعات ہیں۔ اوّل الذکر تو دو دفعات پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

ایران میں دستور (مشروطہ) کے اعلان کے بعد مجلس (لوور ہاؤس) اور سنا (سینٹ) کا قیام عمل میں آیا۔ مجلس کے لئے باقاعدہ الیکشن ہوتے ہیں مگر زمینداری کے اختتام سے پہلے الیکشن پر زمینداروں یا ملاؤں کی اجارہ داری تھی۔ الیکشن کا ناٹک ضرور ہوتا تھا مگر انتخاب ہمیشہ انھیں کے آدمی کا ہوتا تھا۔ عورتوں کو ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔ کسان اسی کو ووٹ دیتا تھا جسے اس کا آقا کہتا تھا۔ جب انقلابِ سفید میں عورتوں کو ووٹ کا حق دیا گیا تو سب سے زیادہ ملاؤں نے شور مچایا۔ تعجب ہے کہ جن ملاؤں نے منی اسکرٹ کو گوارا کر لیا انہوں نے ووٹ کے حق پر اتنا فیل کیوں مچایا۔ اب ایران کی عورتیں مردوں کے دوش بدوش ہیں۔ کئی خواتین مجلس اور سنا کی ممبر ہیں۔ چند جج اور ڈپٹی گورنر ہیں۔ ہندوستان کے مقابلہ میں ایرانی خواتین بہت تیز رو نظر آتی ہیں۔ وہاں کی لڑکیوں کا فیشن پیرس کے تازہ ترین ماڈل پر مبنی ہے۔ بحر خزر کے ساحل پر اُن کی بزم آرائیاں ثریا اور کہکشاں کو مات کرتی ہیں۔ وہ فاکس ٹراٹ، بیلے ڈانس اور ٹوسٹ بھی کرتی ہیں اور حافظ و خیام کے اشعار بھی گنگناتی ہیں۔ اُن کا دل مشرقی ہے اور دماغ مغربی۔ ان کی شاہ خرچی شہزادیوں کی یاد دلاتی ہے۔ لڑکے اور لڑکیوں میں عام اختلاط کے باوجود جدید ایران میں خاصی پختہ عمر میں شادی ہوتی ہے۔ یورپ کے اشتہارات کے انداز پر ایرانی اخبارات میں بھی عورتوں کی طرف سے شادی کے اشتہارات عام ہیں جن میں وہ اپنی آمدنی، خوبصورتی، تنہائی وغیرہ کا دلچسپ انداز میں ذکر کرتی ہیں۔

جدید ایران ایک مہذب اور متمدن، پاکیزہ اور شائستہ ملک ہے۔ وہاں کے لوگوں میں نرم خوئی بھی ہے اور گرم جوئی بھی، اُن کے آداب اور تکلفات مرحوم اَودھ کو مات کرتے ہیں لیکن ان کا اندازِ زندگی سراسر مغرب سے مستعار ہے۔ انہوں نے حافظ و خیام کو مغرب کی موسیقی سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ مشرقیت اور مغربیت کا یہی حسین امتزاج جدید ایران کا طرۂ امتیاز ہے۔


## خصوصی رعایت

آج کل کے سالانہ چندے میں رعایت سے فائدہ اُٹھائیے

۲ سال کے لئے ۱۲ روپے یا ۱۸ شلنگ یا ۲٫۷۵ ڈالر

۳ سال کے لئے ۱۷ روپے یا ۲۵ شلنگ ۶ پینس یا ۳٫۵۰ ڈالر


# احساس

شمس کامٹوی

پھر ہوئی شام ہرے ہو گئے پھر زخمِ جگر ؛ پھر رواں ہونے لگے دیدۂ خوں نابہ اشک
دُور تک پھیل گئے سایۂ دیوارِ الم ؛ زیست پر ہوتا رہا دیر تلک موت کا شک
کس سے غارتگریٔ وقت کی روداد کہیں ؛ مہلتِ یک دو نفس بھی ہے میسّر کس کو
حد ہے احساسِ زیاں تک بھی نہیں ہوتا ہے ؛ بس خورو خواب میں مصروف ہے دیکھو جس کو
ہائے یہ سلسلۂ عمرِ گریزاں ہمدم ؛ ایک ہی رنگ میں ہر روز سحر ہوتی ہے
دیکھتے دیکھتے کھل جاتے ہیں پھر گیسوئے شب ؛ اور یہ زیست نہ کچھ پاتی نہ کچھ کھوتی ہے
یہی ہونا تھا اگر عمرِ دو روزہ کا مآل ؛ سنگ و آہن ہی مجھے کاش بنایا ہوتا
زہرِ غم یوں نہ رگ و پے میں سرایت کرتا ؛ یوں نہ منہ ڈھانک کے دنیا میں مقدر سوتا
تھام سکتا جو گزرتے ہوئے لمحات کا ہاتھ ؛ اپنی بے جرم سزاؤں کے دکھاتا منظر
کچھ تو محرومیٔ قسمت کی کہانی کہتا ؛ کچھ تو ہوتا مری آہوں میں دعاؤں میں اثر
زندگی اک تری خاطر نہ ہے کتنے بستم ؛ کبھی نیلام کیا گو سرِ ایمان و یقیں
سرِ بازار کبھی بیچ دئے علم و ہنر ؛ خاک میں خود ہی ملا دی ہے کبھی غلطِ دیں
کیا ہوا اتنی تگ و دو کا نتیجہ آخر ؛ روز و شب یونہی گزر جاتے ہیں بے نیل و مرام
جلوۂ یار ہی دیکھا نہ تماشائے جہاں ؛ خوش ہوا آج تلک ہم سے نہ خلّاقِ انام
زندگی ہے کہ ہے جنگل میں پڑا کیسۂ زر ؛ یا ثمر دار شجر سونی گزرگاہوں میں
یا شبِ تار میں بھٹکی ہوئی اک ماہ جبیں ؛ یا مہکتے ہوئے کچھ پھول ہوں درگاہوں میں
نہ ہوئی کب کسی نقصاں کی تلافی ممکن ؛ کون سا زخم تھا ڈھونڈھا نہ گیا جس کا علاج
کیا کوئی رات رہی نورِ سحر سے محروم ؛ کیا کبھی گردشِ دوراں کا نہ بدلا ہے مزاج
کتنی بے دردی سے لوٹا گیا سرمایۂ عمر ؛ ایک پل بھی نہ ہوا حسبِ تمنا اپنا
بھر سکے رنگ نہ کچھ پیکرِ ایام میں ہم ؛ رہ گئی بن کے حقیقت بھی ادھورا سپنا
داد دے مجھ کو مرے ضبطِ نہاں کی مولیٰ ؛ ایک ایک کر کے مرے سائے سہارے ٹوٹے
دہر میں ایسے ہوں جیسے کسی صحرا میں درخت ؛ پھر بھی زندہ ہوں مقدر ہیں اگرچہ چھوٹے

# غزلیں



## احتشام اختر

ٹھہرے پانی میں نہاں ایک حسیں خواب بھی ہے
اُس کی جھیل میں عکس رُوئے مہتاب بھی ہے

دشتِ احساس کے تپتے ہوئے ویرانے میں
تیری یادوں کا ہے اِک پیڑ جو شاداب بھی ہے

پار کرنا بڑا مشکل ہے کہ یہ بحرِ ہوس
کہیں گہرا ہے بہت اور کہیں پایاب بھی ہے

اُس کی تصویر میں آنکھوں میں بسالوں کہ یہ شے
لاکھ ارزاں سہی میرے لئے نایاب بھی ہے

یوں تو لگتا ہے سمندر بڑا خاموش مگر
اِس کے سینے میں نہاں کرب کا سیلاب بھی ہے

پیاس تم اپنی بجھانے یہاں آئے ہو مگر
یہ کنواں پیار کا گہرا بھی ہے بے آب بھی ہے

یہ تمناؤں کی سوکھی ہوئی ندی اختر
اپنی آنکھوں میں سجائے ہوئے ایک خواب بھی ہے

## حامد حسین حامد

مرا حریف مری خواہشوں کا پیکر تھا
اسی لئے تو ہر اک آئینہ مکدر تھا

تمام رنگ معانی سے بے خبر نکلا
یہ حرفِ شوق شہنشاہِ ہفت کشور تھا

مرے بدن میں خلش کے بھول بوتا رہا
زمینِ خواب پہ آراستہ جو بستر تھا

کوئی بھی خواہش اظہار لب کشا نہ ہوئی
اگرچہ حرف و حکایت کا ایک دفتر تھا

پھر اس میں ڈوبنے والوں کو کیا قباحت تھی
خود اپنی ذات میں قطرہ اگر سمندر تھا

ہر ایک بات اثر کھو چکی تو بالآخر
ہمارے ہاتھ میں سر پھوڑنے کو پتھر تھا

ٹھہر سکے نہ کسی جا پہ ایک لمحے کو
تمہارے پاؤں میں حامد کہاں کا چکر تھا



## دُور آفریدی

تجھ سے بہتر کون ہوگا خود ادا ناآشنا
دِن تری آنکھوں کی چاندی، شام سرمہ آشنا

میں نے صحرا میں نے جنگل میں نے دیکھیں بستیاں
بوئے گُل کہتی پھری ہے: کون کس کا آشنا

زندگی کا حُسن جس کو ہم سمجھتے تھے وہی!
زندگی کا زخم نکلا وہ سراپا آشنا

دِن کا سورج مر چکا ہے رات کا مہتاب بھی
اور تنہا پھر رہا ہے زندگی کا آشنا

جانے پھر کب زندگی کو حُسن کی خوشبو ملے
جانے پھر کب رُوبرو ہو وہ سراپا آشنا

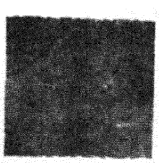

نشاط قیصر

# نیا چہرہ

ہوائیں بڑی ٹھنڈی اور تیز بہہ رہی تھیں۔ اور ابھی ابھی کچھ ہی دیر میں طوفان باد و باراں آیا ہی چاہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ہر طرف زرد سوکھے پتوں کا ایک ڈھیر ہے۔ کوئی آن میں اب درخت بھی گرا ہی چاہتے ہیں۔ اور میں نے انھیں حالتوں میں اس چہرے کی تلاش کے لئے شاہراہ پر اپنا سفر جاری کیا۔ میں شاہراہ پر چلتا رہا۔ ۔ ۔

شاہراہ جو آگے بھی جاتی تھی۔
شاہراہ جو پیچھے بھی جاتی تھی
آگے بھی پیچھے تھا ۔ ۔ ۔
پیچھے بھی آگے تھا۔

اور میں شاہراہ پر چلتا رہا ــــ
آگے بھی ۔ ۔ ۔ ۔ پیچھے بھی ۔ ۔ ۔ ۔ دونوں کے درمیان ــــ
جہاں شاہراہ ختم ہو جاتی ہے ۔ ۔ ۔ اس سے آگے کیا ہے ۔ ۔ ۔ ؟ اس سے آگے کیا ہے ؟ ۔ ۔ ۔ اس سے آگے بھی کچھ ہونا چاہئے
اماں کے آگے صرف ایک ہی سوال ــــ پیسہ ــــ پیسہ ۔ ۔ ۔ ۔
اماں بھی عجیب ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

ابا کہتے ہیں ۔ ۔ ۔ اماں دوزخ میں جائیں گی
لیکن اُن سے پہلے وہ خود اس شاہراہ پر چل پڑے جو آگے جا کر جنت اور جہنم کو جاتی تھی ۔ ۔ ۔ ابا کہتے تھے جس حال میں رہو خوش رہو۔
اماں بیچاری تو بہت اچھی ہوتی ہے ؟ (یہ دس سالہ پرویز ہے)
جاڑا اب آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔
یہ پرویز بھی کتنا شریر ہے۔ شاہدہ یک بیک کھلکھلا کر ہنس پڑیں ۔ ۔ ۔
اور ہنستی ہی رہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔
وہ انھیں پونچھتی جاتیں اور ہنستی جاتیں ــــ
کچھ دیر بعد اماں بھی ان کا ساتھ دینے لگیں ۔ ۔ ۔ ۔"
میں شاہراہ پر چلتا رہا جنون کی منزلوں کو طے کرتا ہوا ۔ ۔ ۔ ۔
مگر وہ چہرہ ؟ میں نے آسمان کی طرف دیکھا ــــ کوئی ستارا میری رہنمائی نہیں کر رہا تھا ــــ !!!
مسیح ــــ ؟
مسیح ــــ ؟ ؟
مسیح ــــ ؟ ؟ ؟
اندھے اور گہرے کنوئیں میں صدیوں کا قید مینڈک کب سے اُچھل کود رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
آداب ــــ
آداب ۔ ۔ ۔ آداب ۔
کہاں ــــ

یہ آکاش ہے ۔ ۔ ۔ یوں تو بڑا خاموش طبع ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مگر جب کبھی جوش میں آتا ہے تو بے اختیار باتیں کئے جاتا ہے ۔ ۔ ۔ رکنے کا نام ہی نہیں لیتا ۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت بھی وہ جوش ہی میں تھا۔ اور بے اختیار باتیں کئے جا رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ مختلف قسم کی باتیں ۔ ۔ ۔ ۔ اس مختصر سے عرصے میں اس نے کئی موضوع بدل ڈالے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ اُسے موضوع بدلنے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ بولتے بولتے وہ تھک گیا تو اُٹھ کر جانے لگا۔ لیکن جاتے جاتے اس نے جھک کر بڑے ہی رازدارانہ لہجے میں مجھ سے کہا کہ ۔ ۔ ۔
پگلے ــــ جانتے ہو جب زندگی کی باہنیں تنگ ہو جاتی ہیں تو عقل و شعور کا وجود ان تنگ باہنوں میں جکڑا جایا کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔
وہ چلا گیا ــــ

میں اُسے دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا تو میں نے سوچا
زندگی کی باہیں تنگ ہوتی ہی کیوں ہیں .... ؟
کیوں ہوتی ہیں تنگ ..... ؟
لیکن ——
جواب کمزور ہے .... ؟
جواب ڈر کر سوال سے سامنا نہیں کرنا چاہتا ہے .... ؟؟؟
" ارے سنو ! سنو ——

میں نے پیچھے کی طرف مڑکر دیکھا —— آگے کی طرف اسلام چلا آرہا تھا۔
" یہ اسلام بھی عجیب آدمی ہے .... لوگ کہتے ہیں کہ نام ہے اسلام اور
کام چھی چھی .... پتہ نہیں لوگوں کے اس چھی چھی .... میں کیا نہاں ہے ؟"
آتے ہی اس نے شکایت کی کہ تین بار کہہ چکا ہوں —— اب تک تم نے
مجھے اُس مڈل اسکول میں (جس کے ہیڈ ماسٹر سے میرے تعلقات ہیں) ٹیچری کی
درخواست تک نہیں دی —— کمال کرتے ہو۔ بھٹکنے سے تو اچھا ہے —— میں نے
اُسے حیرت سے دیکھا ....
وہ بگڑ کر چلا گیا ....
اُف یہ کاریں بھی تیز رفتاری سے نکل جاتی ہیں .....
اگر سواریاں پیدل ہی چلیں —— تو کیا فائدہ .... ؟
اندھے گہرے کنوئیں کا مینڈک تھک ہار کر اب خاموش ہو چکا تھا ...
اماں خاموش خاموش رہنے لگی تھیں ——
شاہدہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔
نسرین بڑی تیز اور ذہین ہے —— آخر چودہ کی ہو بھی تو گئی ——
اماں اُسے ہمیشہ قرآن شریف، حدیث اور دیگر مذہبی کتابیں پڑھنے کی تلقین
کیا کرتی تھیں .... اور وہ بھی ان کتابوں کو پڑھ پڑھ کر اماں سے بڑی تیز تیز گرم گرم
بحثیں کیا کرتی ——

میں نے شاہ راہ پر اپنا سفر اور بھی تیزی سے شروع کر دیا تھا .....
میں نے آسمان کی طرف دیکھا —— آسمان پر بے شمار ستارے تھے مگر ان
میں سے کوئی میرے ساتھ نہیں چل رہا تھا۔
"کہاں ہے مسیح ابن مریم —— ؟
میں نے پیچھے کی طرف (جو کبھی آگے تھا) مڑکر دیکھا —— ایک لمبی سنسان
سڑک لیٹی تھی .... کچھ تو نہ تھا ہاں کبھی کبھی ایک دھواں سا اٹھتا اور فوراً ہی فضا
میں تحلیل ہو جاتا ——

یامین بیگ کی عجیب سی عادت تھی .... ملتا تو چپ چاپ اور جب تک
بیٹھا رہتا چپ ہی رہتا .... لیکن جب جانے لگتا تو کوئی ایسی بات کہہ جاتا جیسے یہی
بات کہنے کے لئے اب تک بیٹھا تھا —— اس کی یہ پہلی اور آخری بات بڑی ہی
عجیب ہوتی —— ایک بار اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ .... اس نے اس دن اور
اُس گھڑی پہلی بار اس دنیا میں جنم لیا تھا —— جس دن جس گھڑی اسے یہ وشواس
ہوا تھا کہ وہ اس دُنیا میں عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا ہے اور یہ کہ اسی دن اُس
نے اپنے پہلے وجود کو قتل کر دیا تھا۔ اور پھر اُس نے کہا تھا —— عورت جو دنیا کے
تمام مردوں کو آگ بنا دینا چاہتی ہے تاکہ اس آگ سے اپنے جسم کی جیوتی جلا کر ——
اپنے اندر کے اندھکار کو ختم کر دے ——

میں شاہراہ پر آگے کی طرف چلتا رہا۔ لیکن وہ چہرہ .....
وہ بہ ضد تھا کہ موچی کو موچی سمجھو —— اس کے خلاف کئی تھے —— میں
بھی —— وہ بھی تو آدمی ہے ——
نہیں —— موچی صرف موچی ہے ——
اس کا دعویٰ تھا ——
میرے گھر میں مذہب کا دور دورہ ہے۔
میں مذہب کی گود میں پلا ہوں ... اُسے فخر تھا .....
میرے گھر میں کسی نے نیچی ذات والے کو عزت نہیں دی ....
موچی ۔ موچی ہے۔
دھوبی ۔ دھوبی ہے
درزی ۔ درزی ہے
لیکن میں خاموش رہا .....
میں نے کسی بات کا برا نہیں مانا ہے ... مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس
کا کوئی تصور نہیں ہوتا جو کہ بات کہتا ہے ——
لیکن ہاں میں نے زندگی میں صرف ایک شخص کی بات کا برا مانا ہے ....
وہ جانے کہاں چلا گیا .. بغیر کچھ کہے سنے —— میں نے اس دوران اسے کافی
تلاش کیا —— اگر وہ رہتا تو شاید اتنی دشواری سفر میں پیش نہ آتی ——
وہ ہر وقت میرے ساتھ ہی رہا کرتا تھا ... میرے گھر میں سوتا بھی تھا ——
اماں اُسے بے حد مانتی تھیں ... اس نے ایک بار اماں سے کہا تھا ...
" مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔ روٹی جلدی دیجئے نا ——"
جس دن اس نے یہ بات کہی تھی۔ اس دن سے مہینوں میں نے اس سے
گفتگو تک نہیں کی تھی —— اور اُسے نظر انداز کرتا رہا ....

اس کی لمس درگی سے مجھے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں آسمان اور زمینوں کے درمیان ٹنگا ہوا ہوں خلاؤں میں معلق .....

میں اس شاہراہ پر چلتے چلتے اکتا سا گیا تھا ــــ

میں نے آگے کی طرف دیکھا ــ آگے بہت آگے تھا۔

اچانک ایک دن میں نے شاہراہ کے کنارے جو مجھ سے کھو گیا تھا ــ پڑا ہوا پایا .... بالکل خستہ حال، نیم جان، آنکھیں نقاہت سے بند ــ میں نے اُسے جھنجھوڑ کر بیدار کیا ــ وہ بمشکل اپنی پلکیں جھپکانے میں کامیاب ہوا۔ میں نے اُسے سہارا دے کر بٹھایا ــ اس نے مجھے پہچاننے میں دیر نہ کی اور میرے سینے سے لگ کر رونے لگا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے اُسے تسلی دی۔ اور جو کچھ کہ میرے پاس تھا اس میں سے اُسے کھانے کو دیا "ــ جب فارغ ہوا تو طبیعت قدرے سنبھلی لیکن پھر بھی وہ اس قابل نہ تھا کہ اپنے پیروں چل سکے۔ میں نے احتیاط سے کاندھے پر لادا ــ اور پھر چل پڑا۔

ابھی اگلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ اس نے کہا ــ میں آگے بہت آگے جا چکا ہوں اب اس شاہراہ پر آگے جانے سے کوئی فائدہ نہیں ــ میری سنو اور اس طرف کو چل پڑو اگرچہ نئی سمت دشوار گزار ہے مجھے یقین تھا کہ تم ایک دن یہاں سے ضرور گزرو گے۔ تب ہم دونوں اس دشوار گزار راستے کو مل کر عبور کریں گے۔

اور دوسری سمت ایک پتلا سا اونچا نیچا پگڈنڈی نما راستہ تھا ــ جس کے دونوں جانب دُور تک خاردار جھاڑیاں تھیں اور دونوں جانب کی جھاڑیاں کچھ اوپر جا کر ایک دوسرے سے اس طرح مل گئی تھیں کہ گزرنا سہل نہیں تھا ــ میں ہچکچا کر پیچھے کی طرف مڑا ــ میرا مڑنا تھا کہ وہ میرے کاندھے سے کود پڑا اور نقاہت کے باوجود مجھے میرا بازو پکڑ کر آگے کی طرف کھینچا .... جب کافی دور چلنے کے بعد جھاڑیوں کا سلسلہ ختم ہوا تو ہمارے جسم لہولہان ہو چکے تھے اور جسم سے خون تیزی سے خارج ہو رہا تھا۔ اور پھر یہ پگڈنڈی آہستہ آہستہ چوڑی ہوتی گئی۔ اور پھر آگے جا کر ایک سڑک کی شکل اختیار کر گئی .... میں نے اپنے آپ کو کافی ہلکا محسوس کیا ــ کافی ہلکا ــ میرے قدموں کے آگے آگے ستاروں کا ایک ہجوم تھا۔ شاہراہ کافی روشن تھی۔ اور جلد ہی مجھے وہ چہرہ بھی مل گیا ....


**ہمارے ایجنٹ**

۱۔ بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ بہار
۲۔ مکتبہ جامعہ اُردو بازار جامع مسجد دہلی۔ ۶
۳۔ مکتبہ شرقیہ، ابراہیم پورہ، بھوپال


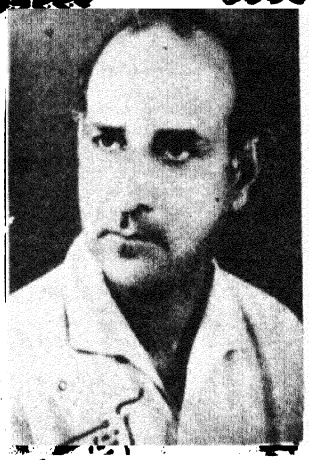

آفتاب نبی

میرے سینے پہ، جو ہے خاک آلود
کتنی صدیوں سے رواں ہیں یونہی
عورتیں، بچے، جوان اور بوڑھے
فکر و احساس میں غلطاں، پیچاں
کوئی بیتے ہوئے لمحوں پہ ملول!
کوئی فردا کے تصور میں مگن
کوئی امروز کے غم میں بے حال
وصل کے سائے میں کوئی شاداب
ہجر کی دھوپ میں کوئی مغموم
میتیں لے کے گزرتے ہیں لوگ
شادیانے بھی سنا کرتا ہوں
سب کے غم ہیں مرے سینے میں نہاں
سب کی خوشیوں کا امیں بھی ہوں میں
روزِ اوّل سے ہوں یونہی پامال
ٹھوکریں سہتا ہوں سب کی، پھر بھی
سب کو منزل کا پتہ دیتا ہوں

# کچھ غالب اور اسد تخلص کے بارے میں

(۲)

عابد پشاوری

## استدراک

کچھ دن پہلے میرے محترم کرم فرما ڈاکٹر گیان چند نے ازراہِ کرم اُردو نامے کا ۳۷ واں شمارہ خصوصاً اس لئے عنایت فرمایا کہ میں سید قدرت نقوی کا مضمون "نو دریافت دیوانِ غالب کا سنِ کتابت جس میں سید موصوف نے علمِ ہیئت کو بنیاد بنایا ہے، بھی دیکھ لوں اور اس کی روشنی میں اپنے مضمون میں اگر چاہوں تو ضروری ترمیم کر لوں چنانچہ مذکورہ مضمون کا بغور و بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ میرے مضمون میں ترمیم کی گنجائش تو نہیں لیکن سید قدرت نقوی کے مضمون پر دو چار لفظ لکھنے کی ضرورت ہے خصوصاً اس لئے کہ میرے مضمون میں نو دریافت دیوان کی تاریخ کتابت کے بارے میں اب تک بیان کئے گئے مختلف نظریات و بیانات کا احاطہ ہو جائے تاکہ آئندہ اس موضوع پر قلم اٹھانے والے کے سامنے تمام حقائق موجود ہوں اور اس خیال سے کہ زیرِ نظر مضمون میں فلاں نظریئے یا خیال کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، کوئی صاحب جزوی اور ادھوری باتوں پر خامہ فرسائی کر کے اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ یہاں اس امر کا اعتراف کر لینا مناسب ہوگا کہ میں علمِ ہیئت اور نجوم دونوں سے نابلد ہوں چنانچہ ہیئت سے متعلق سید قدرت نقوی کے بیانات کو عام سمجھ اور منطق کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے چنانچہ اس میں تکنیکی نکتہ نظر سے غلطی ہو سکتی ہے اور ہیئت دانوں کو میرے دلائل سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن میری گزارش یہ ہے کہ میرے دلائل کو خالص علمی اور عقلی نظر سے دیکھا جائے اور اگر اس کے بعد بھی کوئی صاحب انہیں غلط سمجھیں تو انہیں اس کا حق ہوگا اور میں ان صاحب یا اصحاب کا ممنون ہوں گا جو مجھے میری غلطیوں سے آگاہ فرمائیں گے۔

اُردو نامہ ۳۷ بابت جون تا ستمبر ۱۹۷۰ء کے شمارے میں سید قدرت نقوی نے نو دریافت دیوانِ غالب کی تاریخ کتابت کی تعین میں علمِ ہیئت کے علاوہ بھی کئی طرح سے اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ ان میں ضروری باتوں کا جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے مخطوطے کی تاریخ کتابت کی آخری حد متعین کرتے ہوئے نقوی صاحب نے بھی "لعل خاں" والی یادداشت کو بنیاد بنایا ہے جو زیرِ بحث مخطوطے کے ورق ۱۴۱ الف پر موجود ہے۔ اس ضمن میں نقوی صاحب کی دلیل یہ ہے۔

> "اس یادداشت کے درمیان میں ہونے کی صرف ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ یہ صفحہ زیرِ عمل تھا، لعل خاں کی ملازمت کا معاملہ طے ہو گیا تو یہیں لکھ لیا گیا۔ اب زیرِ عمل ہونے کی دو صورتیں ہیں کہ یا تو یہ صفحہ لکھا جا رہا تھا یا کسی اور دیوان سے نقل ہو رہا تھا۔ لکھا جاتا تو اس لئے محلِ نظر ہے کہ یہ یادداشت یکم صفر کی ہے اور ترقیمہ ۱۴ ربیع کا۔ یہ مدت ایک سال ساڑھے پانچ مہینے کی ہے بقایا صفحات کل ۴۵ ہوتے ہیں اتنی طویل مدت میں ۴۵ صفحات کا لکھا جانا قرینِ قیاس نہیں۔ اب صرف یہی صورت رہ جاتی ہے کہ یہ صفحہ نقل کیا جا رہا تھا۔" (ص ۳۲)

نقوی صاحب کی مندرجہ دلیل خاصی مضبوط ہے اور بظاہر اس سے اختلاف کا کوئی جواز نہیں نکل سکتا لیکن یہ کیسے معلوم ہے کہ جس وقت ورق ۱۴۱ الف لکھا جا رہا تھا اور لعل خاں کی ملازمت کا معاملہ طے ہو گیا اور مذکورہ یادداشت لکھ لی گئی اس کے بعد کیا حالات پیش آئے اور نقل یا کتابت کا یہ کام کتنے عرصے تک ملتوی رہا۔

نقوی صاحب نے نثار احمد فاروقی کے طریقہ تعین تاریخ کتابت پر اعتراض کیا ہے میں نے اس ضمن میں نثار صاحب کے مراسلے تو پڑھے تھے لیکن نقوش غالب نمبر جس میں یہ دیوان شائع ہوا ہے، کا مقدمہ نہیں دیکھا تھا۔ نقوی صاحب کا اعتراض دیکھنے کے بعد اسے بھی دیکھا تو نثار صاحب کا بیان واقعی عجیب معلوم ہوا۔ نثار صاحب کا بیان یہ ہے :-

"اب دیکھنا یہ چاہئے کہ تقویم ہجری و عیسوی کی رُو سے ۱۴ رجب کس سال منگل کے دن واقع ہوئی تھی۔ تقویم کا حساب بتاتا ہے کہ ۱۲۳۱ھ میں ۱۴ رجب کو بدھ کا دن تھا واقعی تاریخ اور اس حساب میں ایک دن کا فرق رویت کی وجہ سے رہ جاتا ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ ۱۲۳۱ھ میں رجب کا چاند ۲۹ جمادی الثانیہ کو نظر آیا تھا تو ۱۴ رجب کو سہ شنبہ ہی پڑتا ہے۔ ۱۲۳۱ھ میں غالب کی عمر ۱۹ سال ہوتی ہے اور انہوں نے اپنی شاعری کے آغاز اور جمع دیوان کے بارے میں جو شہادتیں چھوڑی ہیں اُن سے اس سنہ کو تسلیم کرلینے میں کوئی تناقض یا تضاد نہیں ہے۔

اگر ۱۲۳۱ھ والے حساب کو از راہ احتیاط نہ بھی مانا جائے، (اور بظاہر ہمیں کوئی مانع نظر نہیں آتا) تو اتنا بالکل بدیہی ہے کہ غالب کا یہ دیوان صفحہ ۱۲۳۵ھ سے پہلے لکھا گیا ہے اور اس کی کتابت کا زمانہ ۱۲۳۱ھ سے ۱۲۳۵ھ کے مابین کوئی سال ہوسکتا ہے۔" (نقوش ص ۱۶)

نثار صاحب کا مندرجہ ذیل بیان اُن کے پہلے بیانات سے (جو مراسلوں کی شکل میں شائع ہوئے) میل نہیں کھاتا۔ یہاں عجیب تر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مخطوطے کی تاریخ کتابت طے کرتے ہوئے ان کی نظر سب سے پہلے ۱۲۳۱ھ پر ہی کیوں پڑی اور عجیب ترین یہ کہ جب تقویم کی رُو سے ایک دن کا فرق تھا تو بھی انہوں نے اسی کو ترجیح کیوں دی۔ اس کا صرف ایک ہی جواب ہے کہ ان کے ذہن میں یہ تاریخ پہلے سے موجود تھی (عرشی صاحب پہلے ہی یہ تاریخ طے کر چکے تھے) ہوا یوں ہوگا کہ جب نثار صاحب نے تقویم دیکھی تو انہیں ۱۲۳۳ھ میں (سہواً) ۱۴ رجب کو منگل کا دن دکھائی دیا تھا لیکن مولانا عرشی کے مضمون مطبوعہ آج کل جولائی ۱۹۶۹ء کے بعد انہوں نے اپنی رائے بدل دی اور اس کے بعد بغیر تقویم پر نظر ڈالے وہ اپنے ایک دن کے فرق والے بیان کو دہراتے رہے، ورنہ اگر وہ تقویم پر نظر ڈالتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ ۱۲۳۱ھ میں ایک دن کا فرق تو ہے۔ لیکن اُن کے بیان سے مختلف ہے۔ یعنی انجمن کی مطبوعہ تقویم میں یہ پیر کا دن ہے نہ کہ بدھ کا۔ نول کشوری تقویم میں مولانا عرشی و عرشی زادہ صاحبان منگل بتاتے ہیں۔ پھر یہ بدھ کا دن کس تقویم میں تھا۔ نثار صاحب کا یہ جملہ کہ "تقویم کا حساب بتاتا ہے" اشارہ کرتا ہے کہ ان کے پیش نظر انجمن والی ہی تقویم تھی کیونکہ اس میں صرف مہینے کا پہلا دن دیا ہوا ہے اور بقیہ کا حساب لگانا پڑتا ہے) یہاں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ اب تک جتنے سنہ گنوائے گئے ہیں ان سب میں رجب کا چاند ۲۹ جمادی الثانیہ ہی کو نظر آیا تھا۔ اگر نثار صاحب نے تقویم کو بغور دیکھا ہوتا تو انہیں معلوم ہوجاتا کہ غالب کی پیدائش ۱۲۱۲ھ سے لے کر آئندہ پچاس برسوں تک ہر برس میں جمادی الثانیہ ۲۹ ہی دن پر مشتمل تھا۔ ان حالات کی روشنی میں اُن کا یہ کہنا کہ "اگر رجب کا چاند ۲۹ جمادی الثانیہ کو نظر آیا ہو" نہ صرف عجیب معلوم ہوتا ہے بلکہ اس امر کا ثبوت بھی ہے کہ نقوش میں دیوان غالب پر مقدمہ لکھتے ہوئے انہوں نے کسی تقویم سے مدد نہیں لی بلکہ اپنی اور دوسروں کی گزشتہ تحریروں کی بنیاد پر جو کچھ اُن کے حافظے میں محفوظ تھا۔ انہوں نے اس پر اعتماد کیا۔

اب نقوی صاحب کے علم ہیئت کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ نقوی صاحب نے اپنے مضمون کی ابتداء ان الفاظ سے کی ہے۔

"دیوان غالب کے نو دریافت مخطوطے کی تاریخ و سن کتابت کے سلسلے میں اہل علم و تحقیق اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان حضرات نے قیاس سے کام لیا ہے یا جنتریوں سے مدد لی اور تاریخ یوم و کتابت کی تطبیق اس سنہ سے کردی جو جنتریوں نے بتادیا لیکن اُن کے پاس حتمی اور قطعی سن متعین کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں تھا۔ یہ اتفاق ہے کہ جنتری میں مندرج تاریخ و یوم میں اختلاف واقع نہیں ہوا۔" (ص ۳۱)

نقوی صاحب کا یہ بیان درست نہیں کہ جنتری میں تاریخ و یوم میں اختلاف واقع نہیں ہوا یا تو انہوں نے اس سلسلے میں لکھے گئے مضامین نہیں دیکھے یا مختلف جنتریوں کی ورق گردانی نہیں کی۔ اگر جنتریوں میں اختلاف نہیں تھا تو اس سلسلے میں خامہ فرسائی کرکے اپنا وقت اور انرجی ضائع کرنے کا کیا جواز تھا ظاہر ہے کہ نقوی صاحب کا مقصد اپنی معلومات ہیئت کی دھاک بٹھانا نہیں بلکہ ایک نزاعی تحقیقی مسئلے کا مسکت حل پیش کرنا ہے۔ اگر اہل علم و تحقیق سنہ اور یوم کی تطبیق جنتری سے نہ کرتے تو کیا کرتے؟ کیا ادب کے محقق کے لئے ضروری ہے کہ وہ نجوم اور ہیئت کا بھی ماہر ہو! اگر وہ ان علوم سے واقف ہے تو یہ اس کی بڑائی ہے لیکن اگر ناواقف ہے تو یہ اس کی کوتاہی نہیں ہے اور اس ناواقفیت کے لئے اس کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں پر حرف رکھنا ناانصافی ہے۔ ہیئت اور علوم دونوں سائنسی علوم ہیں اور دونوں کی بنیاد ریاضی پر ہے۔ دونوں فلکیات یعنی سیاروں کی گردش سے بحث کرتے ہیں۔

ہیئت محدود ہے اور نجوم قدرے وسیع، اس لئے کہ نجوم سیاروں کی گردش کے علاوہ اُن کے اثرات کا تعین بھی کرتی ہے۔ تاہم گردش کے حساب میں دونوں میں اختلاف نہیں ہونا چاہئے اور اگر ایسا ہے تو تقویم نجوم ہی کی نمائندہ ہے کی فراہم کردہ معلومات کو ناقابلِ اعتبار قرار دینے کا کوئی جواز نہیں۔ نقوی صاحب نے غالب کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں کہا ہے کہ "میں نے اس سلسلے میں مفصل لکھا تھا اور ثابت کیا تھا کہ ۱۲۱۲ھ صحیح سنِ ولادت ہے" (ص ۳۵ اُردو نامہ) لیکن حساب پھر حساب ہے، اس میں ہر آدمی سے غلطی ہو سکتی ہے۔ میری نظر سے نقوی صاحب کا مبینہ مضمون نہیں گزرا لیکن جو قاعدہ انہوں نے تعینِ تاریخ کتابت کے سلسلے میں اپنایا ہے میں نے اسی طریقے پر مرزا کی تاریخ پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو عیسوی سنہ سے مطابق کیا تو دو دن کا فرق آیا یعنی بہ تاریخ مطابق ہوتی ہے ۲۹ دسمبر ۱۷۹۷ء کے نہ کہ ۲۷ دسمبر کے جیسا کہ مشہور ہے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ضربِ تقسیم میں غلطی نہیں کی۔ نقوی صاحب کے مبنیہ قاعدے میں ہر جگہ دو رقوم مستقل ہیں جو شاید سنہ عیسوی اور ہجری کے آغاز سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً ۶۲۱ء۵۷۷۴ ہجری اور عیسوی سنین کا وہ فرق معلوم ہوتا ہے جو ابتدا میں تھا (عام طور سے یہ فرق ۶۲۲ سال مانا جاتا ہے۔ زیادہ قطعیت اور صحیح کے لئے شاید اہلِ ہیئت اعشاریہ روا رکھتے ہیں) لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسور اعشاریہ آخری نتائج پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ خود نقوی صاحب نے ایک جگہ ۶۲۱ء۵۷۷۴ھ کے بجائے ۶۲۱ء۵۷۷ سے حساب لگایا ہے اور نتیجہ وہی نکالا ہے جو اول الذکر رقم سے حساب لگانے کی صورت میں برآمد کرتے (حالانکہ اصولاً یہ لغزش ہی ہے) مقصد اس بحث سے یہ ہے کہ نقوی کا لگایا ہوا حساب ہر جگہ درست نہیں اس میں ایک سے دو دن تک کا فرق آسکتا ہے اور آتا ہے۔ جیسا کہ آگے ظاہر ہوگا۔ صحیح نتائج تک پہونچنے کے لئے ضروری ہے کہ نقوی صاحب اپنے حساب پر غور فرمائیں ممکن ہے اب ان کی نظر اس لغزش تک پہونچ جائے جو پہلے حساب لگاتے وقت اُن سے سرزد ہوئی تھی اب نقوی صاحب کا حساب ملاحظہ ہو۔

اس ضمن میں اُن کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ عیسوی تاریخ کو ہجری تاریخ سے مطابق کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ بنیاد تاریخ ہجری کو بنانا چاہئے کیونکہ ترقیمے میں ہجری تاریخ اور دن دیا ہے۔ بجائے یہ معلوم کرنے کے کہ ۱۴ رجب کو کیا دن تھا وہ گیارہ جون کا دن معلوم کرتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ مولانا عرشی نے ۱۴ رجب ۱۲۱۲ھ کو ۱۱ جون ۱۸۱۶ء لکھا تھا چنانچہ نقوی صاحب یہ فرض کر کے چلے ہیں کہ ۱۴ رجب ۱۱ جون کے مطابق ہے غالباً اسی لئے انہوں نے نثار احمد فاروقی پر بھی اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے ہجری تاریخ کے مطابق عیسوی تاریخ نہیں لکھی

۱۲۳۱ھ کو ۱۸۱۵ء سے مطابق آنے تک نقوی صاحب کا حساب درست ہے۔ ان کے حساب سے یکم محرم ۱۲۳۱ھ تک آغاز ۱۸۱۵ء کے بعد گزرنے والے دنوں کی تعداد ۱۵۶۰ء۸۰۳۶ ہوتی ہے۔ اعشاریہ کے بعد (دہنی طرف کے) اعداد کو شمار نہیں کیا گیا۔ گویا یکم محرم تک گزرنے والے دنوں کی تعداد ۳۳۶ ہوئی۔ انگریزی سال ۳۶۵ دن کا ہوتا ہے۔ ۳۶۵ - ۳۳۶ = ۲۹ دن۔ پورا سال گزرنے میں صرف ۲۹ دن باقی رہے۔ نقوی صاحب رقمطراز ہیں "۱۵۶۰ء۸۰۳۶ ایام سنِ رواں جو یکم محرم تک گزرے۔ اس طرح ۳ دسمبر ۱۸۱۵ء کو یکم محرم ۱۲۳۱ھ واقع ہوئی" (ص ۳۵) یہ درست ہے لیکن اس کے بعد کا حساب غلط ہے۔ یہاں سے غالباً ہیئت اور نجوم دونوں سے کام لیا گیا ہے۔ ۳ دسمبر ۱۸۱۵ء یا یکم محرم ۱۲۳۱ھ کو ایک شنبہ یعنی اتوار تھا۔ یکم محرم سے ۱۴ رجب تک معمول حساب کی رُو سے شمار کیا جائے تو ۱۹۱ دن ہوتے ہیں اور اس طرح ۱۴ رجب کو دوشنبہ ہوگا اور یہ مطابق ہوگا ۱۰ جون ۱۸۱۶ء کے۔ لیکن نقوی صاحب نے ۱۱ جون تک ۱۹۲ دن شمار کئے اور ۱۴ رجب کو اس سے مطابق کرنے کے لئے ہجری ایام کی تفصیل میں ایک دن کا اضافہ کر لیا۔ یہ بات ان کے پیش کردہ نقشے سے ظاہر ہوگی۔ ملاحظہ ہو

" ۱۴ رجب تک ایام کی تفصیل مع تفصیل ایام عیسوی درج ذیل ہے۔

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| محرم | ۳۰ | ۱۲۳۱ھ | دسمبر | ۲۹ | ۱۸۱۵ء |
| صفر | ۲۹ | ۰ | جنوری | ۳۱ | ۱۸۱۶ء |
| ربیع الاول | ۳۰ | ۰ | فروری | ۲۹ | 〃 |
| ربیع الآخر | ۲۹ | 〃 | مارچ | ۳۱ | 〃 |
| جمادی الاول | ۳۰ | 〃 | اپریل | ۳۰ | 〃 |
| جمادی الآخر | ۳۰ | 〃 | مئی | ۳۱ | 〃 |
| رجب | ۱۴ | 〃 | جون | ۱۱ | 〃 |
| کل ایام | ۱۹۲ | | | ۱۹۲ | |

نقوی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ آخر علمِ ہیئت کے کون سے قاعدے کی رُو سے انہوں نے جمادی الاول اور جمادی الآخر دونوں مہینوں میں تیس تیس دن شمار کئے ہیں یہ کہنا تو غلط ہے کہ انہوں نے اپنے حساب میں تقویم سے مدد لی ہوگی [illegible] سے مطابقت ہی اس بات کا ثبوت ہے [illegible] کے لئے تقویم کی مدد ناگزیر ہے۔ تقویم سے مدد لینے کا ایک اور ثبوت یہ بھی ہے کہ [illegible] نے نسخہ حمیدیہ کی اصل مخطوطہ بھوپال کے ترقیمے میں دی ہوئی تاریخ ۵ صفر ۲۳۰ھ کو تطبیق جمعہ ۲ نومبر ۱۸۲۱ء سے کی ہے اور یہ غلط ہے (یکم نومبر جمعرات ۱۸۲۱ء ہونا چاہئے اگر یہ سنہ کبھی تقویم سے مطابق کیا گیا ہے تو وہ تقویم نامعتبر ہے اور اگر علمِ ہیئت سے

معلوم کیا گیا ہے تو اس حساب کی صحت مشکوک ہے۔ ہجری مہینوں کا انحصار رویت ہلال پر بتایا جاتا ہے (پھر بھی سال میں ہمیشہ تقریباً ۳۵۵ ہی دن ہوتے ہیں) لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ چاند کی گردش معین ہے اس میں فرق واقع نہیں ہو سکتا پھر رویت کو کس خانے میں فٹ کیا جائے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی خاص دن اور خاص مقام پر چاند نظر نہ آئے اور دوسرے مقام پر نظر آجائے (اس کا تعلق اس مقام کے ارتفاع یا (ALTITUDE) سے معلوم ہوتا ہے) کیا اس صورت میں دونوں مقامات پر تاریخیں اور دن مختلف ہوں گے؟ شاید ایسا ہی ہو، لیکن آج سائنس نے جدید آلات فراہم کر دیئے ہیں جن کی مدد سے ہر مقام پر چاند کا دیکھ لیا جانا ممکن ہے رویت ہلال کی مذہبی اہمیت سے قطع نظر اگر خالص سائنسی نکتۂ نظر سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ چونکہ چاند کی گردش معین ہے اس لئے یہ ناممکن ہے کہ ایک سال کسی خاص مہینے کا چاند ۲۹ ویں دن دیکھا جائے اور دوسرے سال اسی مہینے کا چاند تیسویں دن نظر آئے تھوڑی دیر کو رویت ہلال ہی کو بنیاد مان لیا جائے تو بھی نقوی صاحب کو یہ بتانا چاہئے تھا کہ انہوں نے جمادی الاول اور جمادی الآخر ۱۲۳۱ھ میں رویت ہلال کا پتہ کس طرح لگایا۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اہل علم نے ایسے قاعدے بنائے ہوں گے جن کی مدد سے کسی بھی گزشتہ یا آئندہ سنہ میں مختلف مہینوں میں رویت ہلال کے وقوع کا دن معلوم کیا جا سکے (اور یہ تبھی ممکن ہے جب چاند کی گردش معین ہو) ایسے ایک قاعدے کا علم مجھے ہوا ہے (یہاں قاعدے کی تفاصیل فراہم کرنا نہ ضروری ہے نہ مفید، اس لئے اس سے صرف نظر کیا جاتا ہے)۔ نقوی صاحب نے جیسا کہ دکھایا جا چکا ہے، جمادی الآخر میں بجائے ۲۹ کے ۳۰ دن شمار کئے ہیں۔ جو غلط ہیں۔ اگر کسی تقویم پر نظر ڈالی جائے تو یہ بھرم کھل جائے گا۔ انجمن ترقی اردو نے ۱۹۳۵ء میں جو تقویم شائع کی اس میں سنہ ایک ہجری سے پندرہ سو ہجری یعنی ڈیڑھ ہزار برس کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان ۱۵۰۰ برسوں میں کسی ایک سال بھی جمادی الآخر میں ۳۰ دن نہیں دکھائے گئے، آخر کیوں؟ اس لئے کہ سائنسی اعتبار سے یہی درست ہے۔ خود نقوی صاحب نے ۱۲۳۱ھ میں ۱۳۰ اور ۱۲۳۶ھ کے اسی مہینے میں ۲۹ دن شمار کئے ہیں۔ سائنسی منطق سے قطع نظر، زیادہ کثر خیالات کے لوگوں کے اطمینان کے لئے میں نے تتمہ پترک (اس کا تفصیلی تعارف مضمون میں کرایا جا چکا ہے) کی ورق گردانی شروع کی اور ادھر اُدھر سے کئی سال کے نقشے دیکھ ڈالے لیکن ہر جگہ ماہ مذکور میں ۲۹ ہی دن ملے۔ زیادہ وضاحت کے لئے میں نے غالب کے سال پیدائش ۱۲۱۲ھ سے لے کر پچاس سال ادھر تک ہر سال میں جمادی الآخر پر نظر ڈالی سوائے ایک سال ۱۲۱۴ھ کے کہیں بھی جمادی الآخر میں تیس دن نظر نہ آئے اور اس سال میں بھی یہ خصوصیت ہے کہ جمادی الاول میں بجائے تیس کے ۲۹ دن درج ہیں گویا حساب برابر ہے۔ ضابطۂ ہلالیہ کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ میں نے ان ۵۰ برسوں میں اس ضابطے کی رو سے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ سرمرتبہ جمادی الآخر ۲۹ دن پر مشتمل تھا۔ او ۱۲۱۴ھ میں تتمہ پترک میں جو فرق تھا وہ درست نہیں۔ انجمن کی تقویم بھی میرے خیال کی تائید کرتی نظر آتی ہے۔ اس حساب کتاب کے دوران ایک اور انکشاف بھی ہوا کہ کسی خاص مہینے کی کسی خاص تاریخ کو پڑنے والا دن ٹھیک آٹھ سال بعد اس تاریخ کو دوبارہ واقع ہوگا۔ اس کی تصدیق معمولی سی محنت سے کی جا سکتی ہے کوئی تقویم اٹھا لیجئے، تصدیق ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر تتمہ پترک میں یکم صفر ۱۰۵۴ھ کو شنبے کا دن تھا اور ہر آٹھ سال بعد بھی یکم صفر یعنی ۱۰۶۲، ۱۰۷۰، ۱۰۷۸، ۱۰۸۶، ۱۰۹۴ و غیرہ شنبے ہی کو پڑی۔

مختصر یہ کہ نقوی صاحب نے ۱۲۳۱ھ میں جمادی الثانی کے ۳۰ دن غلط شمار کئے ہیں اصلاً یہ ۲۹ ہیں۔ اس طرح ۱۲۳۱ھ میں ۱۴ رجب کو پیر کا دن آتا ہے نہ کہ منگل۔ ۱۲۳۶ھ میں اُن کا شمار درست ہے۔ اس لئے ۱۴ رجب کو منگل کا دن آتا ہے نقوی صاحب نے جنتری میں ۱۲۲۸ھ (یہ نہیں بتایا گیا کہ کس جنتری میں، یہ انجمن کی شائع کردہ جنتری بھی ہو سکتی ہے) میں ۱۴ رجب کو منگل کا دن دیکھا لیکن مسلم ہیئت کی رُو سے وہ اس تاریخ کو جمعرات بناتے ہیں جو ظاہر ہے کہ درست نہیں اگر انہوں نے سابقہ تاریخوں کی طرح اس سال کا بھی تفصیلی عمل اور حل لکھا ہوتا تو یہ بتایا جا سکتا ہے کہ انہیں شمار میں کہاں سہو ہوا ہے لیکن تفصیلی عمل کی عدم موجودگی میں یہ ممکن نہیں۔ اگر ۱۲۳۶ھ میں وہ ۱۴ رجب کو منگل کا دن مانتے ہیں تو ۸ سال کے وقفے سے دیکھیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ جس تقویم نے ۱۲۳۶ھ میں منگل کا دن لکھا ہے (اور اُن کا اپنا قاعدہ اس کی تصدیق کرتا ہے) اسی میں ۱۲۲۸ھ میں بھی یہی دن ہوگا اس طرح ۱۲۲۰ کو بھی منگل ہوگا اور اگر آگے کی طرف آگے بڑھیں تو ۱۲۴۴، ۵۲، ۶۰، ۶۸، ۷۶، ۱۲۸۴ سب میں ۱۴ رجب کو منگل کا دن آئے گا۔ (۱۲۸۵ میں غالب فوت ہو گئے تھے لہٰذا ۱۲۸۲ سے آگے دیکھنے کی ضرورت نہیں) کسی بھی صحیح تقویم سے اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

نقوی صاحب نے عیار الشعرا اور عمدۂ منتخبہ میں غالب کے ذکر کی موجودگی سے بھی بحث کی ہے۔ لیکن چونکہ ان کی بحث ایک دوسرے ہی زاویئے سے ہے اس لئے اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا ان تذکروں سے بحث ہم پہلے ہی کر چکے ہیں اس لئے اس کو طول دینا غیر ضروری ہے۔

ایک آخری بات اور ۸ مئی ۱۹۷۱ء کے ہماری زبان میں محمد انصار اللہ نظر صاحب نے اپنا ایک مضمون مراسلات کے تحت شائع کیا ہے۔ مضمون کا آخری پیرا ہے۔

"بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ ۱۲۵۲ھ، ۱۲۵۳ھ، ۱۲۵۴ھ، ۱۲۵۵ھ، ۱۲۵۶ھ میں کسی نہ کسی سال ۱۴ رجب کو سہ شنبہ کا دن ضرور ہوگا اس لئے مجھے چاہئے کہ میں اُن سے کسی سال میں مخطوطے کا لکھا جانا تسلیم کرلوں۔ میں اپنے پچھلے مراسلوں میں ایک سے زائد بار یہ عرض کرچکا ہوں کہ میرے نزدیک (۱) مخطوط بخط غالب نہیں ہے (۲) اس کے ۱۲۵۲ھ سے پہلے لکھے جانے کا کوئی امکان نہیں اس لئے میں اس بحث کو غیر ضروری سمجھتا ہوں"۔ (ہمارے زبان ص ۶)

یہ نہیں معلوم کہ کن دوستوں نے نظر صاحب کو یہ مشورہ دیا لیکن انتہائی غیر معقول مشورہ ہے اگر وہ یہ مشورہ دیتے کہ آپ مذکورہ سنین میں تحقیق کرکے دیکھیں کہ ۱۴ رجب کو سہ شنبے کا دن ہے یا نہیں اور پھر اس کے پیش نظر اپنے نتائج اخذ کریں تو کچھ بات بھی تھی اس کے علاوہ ان میں ۱۲۵۲ھ اور ۱۲۵۶ھ کے علاوہ کسی بھی سنہ میں مغل کا دن مذکورہ تاریخ کو نہیں پڑتا۔ اچھا ہے کہ نظر صاحب نے ان سہل نگار دوستوں کے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ فی الحال مجھے اس سے بحث نہیں کہ مخطوط بخط غالب ہے کہ نہیں (اس کے حق میں اور خلاف بہت سی دلیلیں دی جاسکتی ہیں) اس وقت نظر صاحب کی توجہ ان کے دوسرے قول کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ اُن کا کہنا ہے کہ مخطوطہ ۱۲۳۷ھ سے پہلے کسی طرح نہیں لکھا گیا (لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ۱۲۳۷ کے بعد کب لکھا گیا؟ کیا محقق کا کام شک کرنا ہے اور حقائق کی چھان بین کرکے صحیح نتائج اخذ کرنا نہیں؟) لیکن انہیں یہ تو ماننا ہی پڑے گا (بشرطیکہ وہ ترقیمے کی عبارت کو جعلی اور فرضی نہ سمجھیں) کہ یہ مخطوطہ بخط غیر ہو یا بخط غالب ۱۴ رجب بروز سہ شنبہ بعد دوپہر مکمل ہوا۔ ۱۲۳۶ھ تک کے امکانات پر نظر صاحب غور کرنے کو تیار نہیں بلکہ انہوں نے ۱۲۳۷ھ سے پہلے کے امکانات رد کردیئے ہیں۔ بعد کے امکانات کے لئے کچھ میں عرض کرتا ہوں۔ نظر صاحب غور فرمائیں۔ ۱۴ رجب کو سہ شنبہ ۱۲۳۶ھ کے بعد ۱۲۴۴ھ میں پڑے گا جب غالب کلکتہ میں تھے اور نظر صاحب کو اس پر اصرار نہیں کہ یہ مخطوطہ کلکتہ میں تیار ہوا وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہاں تو کلام کا انتخاب کیا گیا تھا جب کہ مخطوطے گل رعنا کے نام سے نہ صرف مل چکے ہیں بلکہ ایک شائع بھی ہو چکا ہے دوسری بار مذکورہ تاریخ کو سہ شنبہ ۱۲۵۲ھ میں پڑے گا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب غالب کلکتہ سے آکر انتہائی پریشان اور مایوس کن حالات سے دوچار ہیں۔ غرض خواہوں کے ڈر سے دن میں گھر سے نہیں نکلتے رات کے اندھیرے میں نکلتے ہیں اور حکام سے مل کر لوٹ آتے ہیں۔ ولیم فریزر قتل ہو چکے ہیں۔ نواب شمس الدین احمد خاں کا ایک ملازم کریم خاں گرفتار ہو چکا ہے۔ خود شمس الدین احمد خاں پر پابندی ہے اور غالب پر ان کے خلاف مجسٹریٹ کے کان بھرنے کا الزام ہے۔ آخر اکتوبر ۱۸۳۵ء میں شمس الدین احمد خاں کو پھانسی دے دی جاتی ہے۔ ۱۲۵۲ھ کا آغاز ۱۸ اپریل ۱۸۳۶ء سے ہوتا ہے (اسی دن نواب شمس الدین احمد خاں قتل کے الزام میں گرفتار ہوئے تھے) کیا ان ایام پریشانی میں غالب نے یہ مخطوطہ لکھا یا لکھوایا؟ کیا اس وقت تک وہ بیدل سے اتنے ہی متاثر تھے جتنے اپنے بچپن کے زمانے میں؟ اس کے بعد یہ دن ۱۲۶۰ھ میں پڑے گا لیکن کیا اپنے پہلے دیوان کی اشاعت کے کم و بیش پانچ سال بعد طباعت دیوان اردو اول اڈیشن رمضان/شوال ۱۲۵۵ھ مطبع سید الاخبار جس کے مقدمے کی رو سے وہ اس سے باہر پائے جانے والے کلام کو اپنا کلام کہنے سے بھی منکر تھے۔ یہ مخطوط لکھا یا لکھوا سکتے تھے؟ اب یہ جناب انصار اللہ صاحب پر منحصر ہے کہ وہ ان میں سے کس برس میں اس مخطوطے کی کتابت ہونا تسلیم کرتے ہیں۔

## فخر رضوی



ایک میدان سا آتا ہے نظر گھر اپنا
چند بادل ہیں، کوئی چھت ہے نہ چھپر اپنا

گیند کی طرح پلٹ آئے گا پتھر اپنا
پھینکنے والے بچا پہلے ذرا سر اپنا

میں بہت غور سے ہر روز تکا کرتا ہوں
اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں مقدر اپنا

اب تو آواز سے پہچان سکو گے چہرہ
جانے کس وقت بدل لے کوئی تیور اپنا

جو بھی بادل تھے اُڑا لے گئی ساتھ اپنے ہوا
دیر تک جلتا رہا دھوپ میں پیکر اپنا

لمحے سے قتل ہوا کرتا ہے لمحہ رضوی
ہم بھی دیکھیں گے کسی روز یہ منظر اپنا



# تصویر اور جھوٹے

ابراہیم یوسف

افراد تمثیل :-

| | |
|---|---|
| مجاہد | ایک نوجوان |
| نجمہ | مجاہد کی بیوی |
| شہاب | مجاہد کا دوست |

منظر :-

ایک درمیانی جتنے کے مکان کا کمرہ جو مکان کے بالائی حصے میں ہے بظاہر ڈرائنگ روم ہے مگر کسی مہمان کے آجانے پر گیسٹ روم میں تبدیل کر دیا جاتا ہے صبح کا وقت ہے۔ نجمہ میز پر بکھرے ہوئے سامان کو ترتیب سے رکھ رہی ہے کچھ دیر بعد مجاہد کمرے میں آتا ہے نجمہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھتی ہے اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتی ہے۔ مجاہد سگریٹ جلا کر کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور کمرے کی طرف منہ کر کے کھڑکی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو کر خاموشی سے نجمہ کو کام کرتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ نجمہ میز پر سامان کو ترتیب دیکر میز پر رکھی ہوئی اپنی تصویر اٹھاتی ہے اسے غور سے دیکھتی ہے اور پھر کپڑے سے صاف کر کے اسی جگہ پر رکھ دیتی ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے پھر مجاہد سگریٹ کا دھواں چھوڑ کر

مجاہد : شہاب کہاں چلا گیا ؟

نجمہ :- ابھی ابھی تو یہیں تھے نہانے گئے ہیں

مجاہد :- چائے تیار کی ؟

نجمہ :- (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) چائے تو کب کی تیار ہے وہ نہا کر تو آجائیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) وہ آج جانے کا کہہ رہے تھے۔

مجاہد :- اچھا :- (کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) وہ جب سے یہاں آیا ہے۔ کچھ خاموش اور ڈسٹرب سا ہے۔ (نجمہ خاموشی سے اپنے کام میں مشغول رہتی ہے۔ مجاہد سگریٹ کا کش لے کر) تم بھی مجھے کچھ پریشان نظر آ رہی ہو۔

نجمہ :- "(مڑ کر مجاہد کو دیکھتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر) ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ (نجمہ پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتی ہے۔ مجاہد تپائی کے پاس جا کر ایش ٹرے میں سگریٹ ڈالتا ہے جس کا دھواں ایش ٹرے سے نکلتا رہتا ہے۔ مجاہد پھر کھڑکی کے پاس جا کر اسے کھولتا ہے اور پردہ ہٹا دیتا ہے۔ پھر نجمہ کی طرف دیکھ کر جو چارپائی پر بستر برابر کر رہی ہے۔)

مجاہد :- سنو نجمہ — (سوچتے ہوئے) خیر — (چند سیکنڈ رک کر) کوئی بات ضرور ہے جو تم کھوئی کھوئی سی ہو۔

نجمہ :- (اسی طرح کام میں مشغول رہتے ہوئے) کوئی بات بھی ہو۔ (چند سیکنڈ رک کر مجاہد کو دیکھ کر) کچھ مصروفیت بڑھ گئی ہے اس لئے تھکاوٹ ہو جاتی ہے

مجاہد :- (سوچتے ہوئے) تم تو اسے پہلے سے جانتی ہو گی۔

نجمہ :- ہاں اکثر انور بھائی اور — ثاقب صاحب اُن کا ذکر کیا کرتے تھے۔

مجاہد :- ثاقب بھائی ! — تم ثاقب بھائی کو بھی جانتی ہو۔

نجمہ :- ہاں۔ انور بھائی کے دوست تھے اور ہمارے یہاں آیا جایا کرتے تھے۔

(مجاہد خاموش رہتا ہے اور دوسری سگریٹ جلاتا ہے۔ نجمہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے) اب تو نہا چکے ہوں گے چائے لے آؤں۔

(مجاہد خاموش رہتا ہے نجمہ دروازے کے پاس پہنچتی ہے کہ شہاب کمرے میں آتا ہے۔ نجمہ خاموشی سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ شہاب ڈریسنگ ٹیبل کے پاس جا کر بال برابر کرتا ہے اور نجمہ کی تصویر کو غور سے دیکھتا ہے

اس دوران مجاہد برابر شہاب کو دیکھتا رہتا ہے۔ شہاب بال سنوار کر پلٹتا ہے تو مجاہد کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے اس طرح شرماجاتا ہے جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔ مجاہد کچھ دیر خاموش رہتا ہے پھر مسکرا کر)

مجاہد: یہ شادی سے پہلے کی تصویر ہے۔ اب بیگم صاحبہ کچھ موٹی ہوتی جارہی ہیں۔ (شہاب خاموش رہتا ہے۔ مجاہد سگریٹ کا لمبا سا کش لے کر) تم نے شادی سے پہلے بھی تو دیکھا ہوگا۔

شہاب: کسے۔؟ نجمہ بھابی کو؟ نہیں میں نے نہیں دیکھا۔

مجاہد: (کچھ دیر خاموش رہ کر مسکراتے ہوئے) وہ تو تم کو پہلے سے جانتی ہیں۔

شہاب: جانتی ہونگی۔ شاقب بھائی کا اُن کے یہاں آنا جانا تھا مگر۔۔۔ (کچھ دیر خاموشی سے سوچتا رہتا ہے پھر آہستہ سے) یہ تصویر شادی سے پہلے کی ہے،

مجاہد: ہاں۔ (ہنس کر) اُن کے آنے سے پہلے یہ تصویر میرے پاس آگئی تھی۔ تمہیں شک کیوں ہے؟

شہاب: شک! نہیں۔ شک کیوں ہونے لگا مگر یہ تصویر۔۔۔ (خاموش ہوجاتا ہے مجاہد سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہتا ہے۔ شہاب کچھ دیر خاموش رہ کر) میں نے یہ تصویر پہلے بھی کہیں دیکھی ہے۔

ضرور دیکھی ہوگی۔ (ہنستا ہے۔ شہاب حیرت سے اُسے دیکھتا ہے) پھر اس میں شک، حیرت یا پریشانی کی کونسی بات ہے۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) ممکن ہے کبھی تمہاری نظر نجمہ ہی پر پڑگئی ہو۔

شہاب: نہیں میں نے پہلے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ ایک دو مرتبہ ان کے گھر ضرور گیا مگر باہر ہی سے واپس آگیا (کچھ دیر رک کر سوچتے ہوئے) یہ تصویر میرے لئے عجیب کامپلیکس بنتی جارہی ہے۔

مجاہد: کیسا کامپلیکس؟

شہاب: عجیب سا۔ جس روز سے یہاں آیا ہوں برابر سوچ رہا ہوں کہ یہ تصویر کہاں دیکھی ہے مگر یاد نہیں آرہا۔ جانے میری یادداشت کو کیا ہوگیا ہے؟

مجاہد: (ہنستے ہوئے) تو پھر مارو گولی۔

نجمہ: (کمرے میں آتے ہوئے) کسے گولی ماری جارہی ہے۔

مجاہد: (ہنس کر تصویر کی طرف اشارہ کرکے) آپ کی اس تصویر کو

نجمہ: (چائے کا سامان میز پر رکھتے ہوئے) میری تصویر کو! (مڑ کر تصویر کو دیکھتے ہوئے) کیوں! بچاری نے ایسا کونسا قصور کردیا؟

مجاہد: (مسکراتے ہوئے) اس نے شہاب کو اس کامپلیکس میں مبتلا کردیا ہے کہ وہ اپنی یادداشت کھوتا جارہا ہے۔

نجمہ: یادداشت کھوتے جارہے ہیں!۔ وہ کیسے؟

مجاہد: اُسے یہ یاد نہیں آرہا ہے کہ اس نے یہ تصویر اور کہاں دیکھی ہے (نجمہ نظریں اٹھا کر مجاہد کو دیکھتی ہے مگر خاموش رہتی ہے اور ایک کرسی پر بیٹھ کر چائے بنانے لگتی ہے۔ مجاہد اس کے پاس دوسری کرسی پر بیٹھ کر شہاب سے) ارے آؤ بھئی (مسکرا کر) تصویر کے بارے میں پھر کبھی سوچ لینا اور پھر اس تصویر کے بارے میں سوچنا بھی کیا۔ (ہنستے ہوئے) اب تو اصل تصویر ہی تمہارے سامنے ہے (شہاب خاموشی سے آکر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے مجاہد ایک پلیٹ میں مٹھائی دے کر اس کی طرف اشارہ کرکے) یہ کس سلسلے میں ہے؟

نجمہ: (چائے کی پیالی شہاب کے سامنے رکھتے ہوئے) سلسلہ تو کوئی نہیں۔ آصفہ بیگم کی لڑکی کا رشتہ طے ہوا ہے، انہوں نے بھیجی تھی۔

مجاہد: اچھا (پلیٹ میں سے مٹھائی منہ میں رکھتے ہوئے) کہاں طے ہوا؟

نجمہ: کوئی انجینیر ہے مگر سنا ہے ابھی بے روزگار ہے۔

مجاہد: چلو ایک دن بارروزگار بھی ہوجائے گا۔ (ایک دم جیسے کچھ یاد آجانے پر شہاب کی طرف دیکھ کر) میں تمہاری بہن کی شادی میں نہ آسکا مجھے بہت افسوس ہوا۔

شہاب: تمہارا بہت انتظار رہا۔ تمہارے نہ آنے پر امی کو بھی بہت دکھ ہوا۔

مجاہد: پروگرام بالکل طے تھا (نجمہ کی طرف اشارہ کرکے) مگر عین موقع پر آپ کو بیمار پڑجانے کا شوق چرا گیا اور مجھے مجبور ہوجانا پڑا۔

شہاب: اگر تم آجاتے تو مجھے بڑا سہارا مل جاتا۔ اکیلے ہی وہ دوڑ بھاگ کرنا پڑی کہ دل ہی جانتا ہے۔

مجاہد: مجھے یقین تھا کہ تم ضرور ناراض ہوگے مگر کیا بتلاؤں کیسی مجبوری آن پڑی تھی۔ انہیں تنہا چھوڑ نہیں سکتا تھا (ہنس کر) مگر یقین کرو میں تمہاری شادی مس نہیں کروں گا۔ (شہاب پیالی میز پر رکھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ مجاہد اُسے دیکھ کر) کیوں خیریت تو ہے۔؟

شہاب: پروفیسر خانی سے ملنا ہے۔ میرے اوپر ہمیشہ مہربان رہا کرتے تھے۔

مجاہد: اچھا تو ابھی تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی

شہاب: دو مرتبہ اُن کے گھر جاچکا ہوں مگر ملاقات نہ ہوسکی۔ سوچا آج صبح صبح ہی ان کو پکڑ لیا جائے

مجاہد: نیچے ڈاکٹر صاحب کے کلینک سے فون کرلینا (مسکرا کر) یاد ہے ہم انہیں پروفیسر دخانی کہا کرتے تھے کیا تھکا نہ کہ بھاپ بنکر کب اور کدھر اڑجائیں اور تمہیں دو میل کی پریڈ کرنا پڑے (شہاب خاموشی سے کمرے سے چلا جاتا

ہے کچھ دیر خاموشی رہتی ہے (پھر مجاہد مسکرا کر) جھوٹ بولنا بھی ایک آرٹ ہے۔ مجھے شادی میں نہ جانے کا بہانہ بنانے میں کیسی الجھن ہو رہی تھی کہ دل ہی جانتا ہے۔

**نجمہ** :- اس میں جھوٹ کی کونسی بات تھی۔

**مجاہد** :- اور سچائی کونسی تھی۔ جانے تمہیں وہاں جانے میں کونسی قباحت تھی۔

**نجمہ** :- بس میرا جی نہیں چاہ رہا تھا۔

**مجاہد** :- اس لئے پہلے ٹال مٹول کرتی رہیں۔ بہانے بناتی رہیں پھر عین وقت پر بیمار پڑ گئیں (کچھ دیر خاموش رہتا ہے (سگریٹ جلا کر اس کا دھواں ہوا میں چھوڑتے ہوئے) اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم اس کے آنے سے خوش نہیں ہو۔

**نجمہ** :- آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں خوش نہیں ہوں۔

**مجاہد** :- دیکھ تو رہا ہوں کہ تم نے اپنے اوپر ایک ناخوشگوار موڈ طاری کر رکھا ہے (نجمہ نظریں اٹھا کر مجاہد کو دیکھتی ہے کچھ بولنا چاہتی ہے مگر پھر خاموش رہ کر چائے کے برتن کشتی میں رکھنے لگتی ہے (مجاہد کچھ دیر خاموش رہ کر) کیا شہاب بھی تمہارے ہاں آیا جایا کرتا تھا۔

**نجمہ** (غور سے مجاہد کو دیکھ کر) ایک دو مرتبہ ثاقب صاحب کے کسی کام سے آئے تھے مگر باہر ہی سے واپس چلے گئے تھے۔ میں کبھی اُن کے سامنے نہیں آئی ہاں اندر بھائی خود اُن کی تعریف کیا کرتے تھے۔

(مجاہد خاموش رہتا ہے۔ نجمہ چائے کے برتن اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ مجاہد سگریٹ کے دو چار کش لیتا ہے پھر آہستہ آہستہ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس جاتا ہے۔ غیر ضروری طور پر اپنے بالوں میں کنگھا کرتا ہے۔ چند سیکنڈ نجمہ کی تصویر دیکھتا رہتا ہے پھر مڑ کر سیٹی بجاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھتا ہے کہ شہاب کمرے میں آتا ہے (مجاہد شہاب کو دیکھ کر)

**مجاہد** :- کیوں پروفیسر خانی سے ملے نہیں گئے۔

**شہاب** :- میں نے فون کیا تو معلوم ہوا۔ وہ کل شام کہیں باہر چلے گئے ہیں۔

**مجاہد** :- میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اُن کا ملنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

**شہاب** :- مجھے اُن سے ملاقات نہ ہونے کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔

**مجاہد** :- ایک دو دن میں واپس آجائیں گے پھر ملاقات کر لینا

**شہاب** :- مگر مجھے آج واپس جانا ہے

**مجاہد** :- ایسی جلدی بھی کیا ہے ابھی نجمہ بھی کہہ رہی تھی کہ تم واپس جانے کے لئے پر تول رہے ہو۔

**شہاب** :- آٹھ دن ہو گئے ہیں — اور —

**مجاہد** :- کہاں کا غضب ہو گیا۔

**شہاب** :- غضب تو نہیں ہوا مگر اماں پریشان ہوں گی۔ ویسے بھی دو چار دن کا کہہ کر آیا تھا۔ (نجمہ پان لے کر کمرے میں آتی ہے) اب پورے گھر کی دیکھ بھال بھی میرے ہی ذمہ ہے۔

(مجاہد اس طرح خاموش رہتا ہے جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ شہاب پھر غیر اختیاری طور پر تصویر کو دیکھنے لگتا ہے مگر مجاہد اس طرف دھیان نہیں دیتا۔ نجمہ ضرور شہاب کے اس طرح تصویر دیکھنے سے کچھ بے چین سی نظر آتی ہے۔ پھر کچھ اس انداز سے جیسے وہ شہاب کی توجہ تصویر کی طرف سے ہٹانا چاہتی ہو۔)

**نجمہ** :- شہاب صاحب۔ ابھی تو آپ کو چند دن اور ٹھہرنا ہی پڑے گا۔

**شہاب** :- (ایک دم چونک کر) جی : — (پھر خود پر قابو پا کر) نجمہ بھابی نجمہ! میں ضرور ٹھہر جاتا مگر . . . .

**نجمہ** (بات کاٹ کر) کیا آپ کو یہاں کوئی تکلیف ہے۔

**شہاب** :- کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ اگر آپ لوگوں کے یہاں تکلیف ہوگی تو پھر آرام کہاں ملے گا۔

**نجمہ** :- (مسکرا کر) بھئی انہیں — (مجاہد کی طرف اشارہ کر کے) یہ شکایت ہے کہ میں آپ کی خاطر پورے طور پر نہیں کر رہی ہوں۔ خدا کی قسم اگر آپ یوں چلے گئے تو یہ تمام زندگی طعنے دیں گے۔

**شہاب** :- (ہنس کر) کیوں صاحب۔ (مجاہد کی طرف دیکھ کر) آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ بھابی میری خاطر نہیں کر رہی ہیں۔

**مجاہد** :- اس لئے کہ تم جب سے یہاں آئے ہو اُداس اور خاموش ہیں۔

**شہاب** :- (ہنس کر) تم خالص انسان ہو یا تھوڑے بہت چقندر بھی۔ (ایک دم سنجیدہ ہو کر) مجاہد سچ مچ ثاقب بھائی کی بے وقت موت نے جانے کیوں مجھے اس قدر اداس کر دیا ہے کسی بات میں دل ہی نہیں لگتا تھا (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ پہلے تو انہیں پی جانے کی کوشش کرتا ہے پھر رومال سے پونچھ کر) اب میں ہنستا بھی ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہنسی کا مذاق اڑا رہا ہوں۔

(ماحول ایک دم سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی ماحول پر چھائی رہتی ہے۔ کچھ دیر بعد مجاہد)

**مجاہد** :- ثاقب بھائی کی موت اس قدر غیر متوقع تھی کہ یقین ہی نہیں آتا کہ اس قدر ہنس مکھ اور زندہ دل انسان مر بھی سکتا ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔

**شہاب** :- (سوچتے ہوئے) ہاں مجھے تو ابھی تک یقین نہیں کہ وہ مر گئے ہیں! ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ میرے پاس کھڑے کہہ رہے ہیں۔ "شہاب تم بہت نالائق ہو۔"

**مجاہد:** ۔ان کے نالائق کہنے میں کس قدر خلوص ہوتا تھا۔ حالانکہ انہوں نے نالائق کبھی اس کے معنوں میں استعمال نہیں کیا (کچھ دیر خاموش رہ کر) پتہ نہیں چلا کہ انہیں بیماری کیا تھی؟

**شہاب:** ۔بس تمہاری شادی سے واپس آئے تو اُداس کھوئے کھوئے، اور کمزور نظر آئے۔ ہم نے سوچا شاید تھکاوٹ ہے۔ پھر بخار آیا معمولی سا اور یہ معمولی بخار موت کا پیغام بن گیا۔ (نجمہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں شہاب نجمہ کی طرف دیکھ کر) ارے بھابی آپ ــــ (بات ٹالنے کے انداز میں مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) میں بھی کہاں کا موضوع لے کر بیٹھ گیا۔

(نجمہ ایک دم ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ شہاب اور مجاہد ایک دم پریشان ہوجاتے ہیں۔ مجاہد نجمہ کو دیکھ کر)

**مجاہد:** ۔ارے نجمہ تمہیں کیا ہوگیا؟

**نجمہ:** (اپنی ہچکیوں پر قابو پاکر آنسو پونچھتے ہوئے) کچھ نہیں (کچھ دیر رک کر) مجھے اور بھائی کا خیال آگیا تھا وہ بھی ثاقب صاحب کی موت سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ ہم لوگ سوچنے لگے تھے کہ خدانخواستہ انہیں کچھ نہ ہوجائے۔

**شہاب:** ۔ثاقب بھائی کی موت سے یہ احساس پہلی مرتبہ ہوا کہ انسان کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں (خلا میں گھورتے ہوئے) ایک مرتبہ امی نے مجھے سبزی لانے کو بازار بھیجدیا اور مجھے کالج پہنچنے میں دیر ہوگئی تو بہت ناراض ہوئے اور کہنے لگے ابے نالائق کیا میں مرگیا تھا، جو تو بازار چلا گیا اور سچ مچ مجاہد پھر وہ مرگئے اب مجھے روز ہی سبزی خریدنے بازار جانا پڑتا ہے۔

**مجاہد:** ۔شہاب کبھی کبھی انسان دوسروں کو یوں بھی دھوکا دیتا ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) دوسروں کو نالائق کہنے والا خود ہی نالائقی کا ثبوت دیکر ہم سے جدا ہوگیا۔

(کچھ دیر مکمل خاموشی رہتی ہے۔ پھر مجاہد آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ شہاب اُسے جاتا ہوا دیکھ کر)

**شہاب:** ۔کہاں چل دیئے۔

**مجاہد:** ۔ابھی آتا ہوں۔ کل کے پروگرام کے سلسلے میں ذرا منیر کو فون کروں۔

**شہاب:** ۔مگر مجاہد ــــ

**مجاہد:** ۔(بات کاٹ کر) نہیں شہاب ابھی تم نہیں جاسکتے (کچھ دیر رک کر) اگر اب پھر تم نے جانے کے لئے کہا تو مجھے دکھ ہوگا۔ (دروازے پر دستک) کون صاحب ہیں؟

(دروازہ کھول کر باہر چلا جاتا ہے۔ نجمہ آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاتی ہے اور باہر دیکھنے لگتی ہے۔ شہاب کچھ دیر خاموش اپنی جگہ پر کھڑا رہتا ہے پھر اس کی نظر نجمہ کی تصویر پر پڑجاتی ہے۔ چند سیکنڈ اُسے دیکھتا ہے مگر فوراً ہی طنزیہ طور پر مسکرا کر اپنے سر کو اس طرح جھٹکتا ہے جیسے کسی خیال کو اپنے دماغ سے نکالنے کی کوشش کررہا ہو کہ مجاہد کمرے میں واپس آتا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں کاغذ ہے۔ نجمہ مڑکر سوالیہ نظروں سے مجاہد کو دیکھتی ہے مگر مجاہد خاموش رہتا ہے۔ نجمہ کچھ دیر خاموش رہ کر۔)

**نجمہ:** کون تھا؟

**مجاہد:** (انتہائی طنز اور نفرت سے) ملک الموت۔ (نجمہ اور شہاب دونوں خاموش رہتے ہیں۔ مگر سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتے ہیں مجاہد کچھ دیر بعد ٹھنڈی سانس بھر کر) میری چھٹی کینسل کردی گئی ہے۔ اور مجھے کل ہی ایک انکوائری کرنے باہر جانا ہے۔

**نجمہ:** ۔مگر یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ انکوائری کوئی دوسرا شخص بھی کرسکتا ہے۔

**مجاہد:** ۔(طنزیہ) کیسے کرسکتا ہے ابھی تو میاں مجاہد زندہ وسلامت ہیں۔ کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے پھر شہاب کی طرف دیکھ کر) شہاب! میں آفس فون کرتا ہوں کہ کسی دوسرے کو انکوائری کے لئے بھیجدیا جائے اگر انہوں نے اتفاق نہیں کیا تو تمہیں دو چار روز تو ٹھہرنا ہی پڑے گا۔

**شہاب:** ۔مگر مجاہد ــــ

**مجاہد:** ۔(بات کاٹ کر) یہاں نجمہ تو رہیں گی تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ویسے بھی یہ تنہائی میں گھبراتی ہیں۔

**شہاب:** ۔سوال تکلیف کا نہیں ہے بلکہ ــــ

**مجاہد:** تو پھر سوال کیا ہے۔ دیکھو مجھے یہ تکلف بازی پسند نہیں۔ آخر تم خود کو اس گھر میں غیر کیوں سمجھ رہے ہو۔

**شہاب:** ۔غیر کیوں سمجھنے لگا (سوچتے ہوئے) مجھے امی کا خیال ہے وہ پریشان ہورہی ہوں گی۔

**مجاہد:** ۔اُنہیں تار دیدو کہ ابھی تم چند دن اور نہیں آسکتے۔

**شہاب:** ۔مگر اب میرا گھر پہونچنا بے حد ضروری ہے۔ گھر پر کوئی نہیں ہے۔ امی کو کس قدر تکلیف ہورہی ہوگی۔

مجاہد :- دو چار دن کا کیا ہے (مسکرا کر) اور اتنی اتنی بات تو جانتی ہی ہیں کہ مہمان آتا اپنی مرضی سے ہے اور جاتا میزبان کی مرضی سے ہے۔

شہاب :- اور جب تم یہاں نہیں ہوگے تو میں پڑا پڑا بھی کیا کروں گا۔

مجاہد : (ہنس کر جس میں طنز کا احساس ہوتا ہے) کیوں، نجمہ کو کیا اس قدر اُن سوشل سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں گھاس بھی نہیں ڈالیں گی۔ (شہاب مشکوک نظروں سے مجاہد کو دیکھتا ہے۔ مجاہد اس پر دھیان نہ دے کر) اچھا میں تمہیں ایک کام بتلائے دیتا ہوں (شہاب خاموش رہتا ہے مگر سوالیہ نظروں سے مجاہد کو دیکھتا ہے۔ مجاہد نجمہ کی تصویر کی طرف اشارہ کرکے) تم یہ ریسرچ کر ڈالنا کہ یہ تصویر تم نے کہاں دیکھی ہے۔

نجمہ :- (غور سے مجاہد کو دیکھتی ہے پھر آہستہ سے) اگر امی وہاں تنہا ہیں تو آپ کو اصرار نہیں کرنا چاہئے۔

مجاہد :- ارے واہ گویا میرا اس پر کوئی حق ہی نہیں ہے۔

نجمہ : مگر حق کا یہ مطلب تو نہیں کہ :-

مجاہد (بات کاٹ کر) حق کا مطلب سب کچھ ہے۔

شہاب :- مگر اب میں ہر حالت میں واپس چلا جانا چاہتا ہوں۔ تم میری پوزیشن کو نہیں سمجھ رہے ہو۔

مجاہد :- میں سب پوزیشن سمجھ رہا ہوں (دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے) اچھا پہلے مجھے فون کر لینے دو۔

(شہاب خاموش رہتا ہے۔ مجاہد کمرے سے چلا جاتا ہے۔ شہاب آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاکر باہر دیکھنے لگتا ہے۔ نجمہ کچھ دیر خاموش کھڑی سوچتی رہتی ہے پھر نظر تپائی پر رکھے خاصدان پر پڑتی ہے)

نجمہ :- ارے آپ نے پان نہیں کھایا۔

شہاب :- (مڑکر نجمہ کو دیکھتے ہوئے) جی ——

نجمہ :- آپ نے پان نہیں کھایا (شہاب خاموش رہتا ہے۔ نجمہ خاص دان اٹھاکر شہاب کے پاس آتے ہوئے) کیا بات ہے آپ ایک دم خاموش کیوں ہو گئے۔

شہاب: (کھوئے انداز میں) کوئی بات نہیں۔ (خاصدان سے پان اُٹھاکر منہ میں رکھتا ہے اور پھر سوچتے ہوئے) شاید میں نے یہاں آکر غلطی کی ہے نجمہ بھابی۔

نجمہ :- (حیرت سے) کیوں

شہاب :- (مڑکر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے) مجاہد کا ایٹی چیوڈ سمجھ میں نہیں آرہا، اب مجھے واپس چلا جانا چاہئے۔ دیکھئے نا ——

(شہاب کچھ کہتے کہتے خاموش ہو جاتا ہے۔ نجمہ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتی ہے۔ مگر شہاب خاموش رہتا ہے۔ نجمہ کچھ دیر خاموش رہ کر۔

نجمہ :- شہاب صاحب ——

(شہاب سوالیہ نظروں سے نجمہ کو دیکھتا ہے مگر نجمہ خاموش رہتی ہے مگر اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں جنہیں وہ اپنے پلّو سے پونچھتی ہے۔ شہاب کچھ حیرت زدہ اور کچھ پریشان نظر آتا ہے۔ پھر آہستہ سے)

شہاب :- نجمہ بھابی —— (کچھ دیر خاموش رہتا ہے۔ نجمہ خاصدان تپائی پر رکھتی ہے پھر سنگھار میز پر رکھی ہوئی اپنی تصویر کو دیکھتی ہے) کیا بات ہے نجمہ بھابی۔

نجمہ :- (کچھ دیر خاموشی سے اپنی تصویر کو دیکھتی رہتی ہے پھر مڑکر شہاب کو دیکھ کر) اس طرح کی ایک تصویر اور بھی تھی۔

شہاب :- ایک تصویر اور تھی !؟

نجمہ :- ہاں —— اور وہ تصویر —— ثاقب صاحب کے پاس تھی۔

شہاب :- (انتہائی حیرت سے) ثاقب بھائی کے پاس !

نجمہ :- ہاں۔ انہوں نے مجھ سے مانگ لی تھی۔

شہاب :- (سوچتے ہوئے) تو کیا یہ تصویر میں نے انہی کے پاس دیکھی تھی مگر انہوں نے کیوں مانگ لی تھی —— (نجمہ خاموش رہتی ہے) تو کیا وہ —— میرا مطلب ہے کہ —— نجمہ بھابی کیا وہ ——

نجمہ :- (پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر) میں تو عورت تھی شہاب میاں —— مگر وہ —— وہ بھی خاموش رہے اور میں ——

شہاب :- مگر وہ خاموش رہے۔ کیا اس قدر بزدل تھے کہ ——

نجمہ :- نہیں وہ سوچتے رہے کہ کہیں انور بھائی یہ نہ سوچیں کہ مجھ سے ملنے کی اجازت دے کر انہوں نے غلطی کی۔ کہیں انور بھائی یہ نہ سوچیں کہ اُن کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی ہے اور بس وہ خاموش رہے —— حالانکہ انور بھائی خود —— (ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ شہاب حیرت زدہ خاموش کھڑا رہتا ہے۔ کچھ دیر بعد اپنی ہچکیوں پر قابو پاکر آنسو پونچھتے ہوئے) اب آپ مجھ پر ایک احسان کیجئے (شہاب کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انتہائی تکلیف میں مبتلا ہو چکا ہے مگر خاموشی سے سوالیہ نظروں سے نجمہ کو دیکھتا رہتا ہے نجمہ کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ وہ تصویر ضائع کر دیجئے۔

(کمرے میں آتے ہوئے) کونسی تصویر کی بات ہو رہی ہے۔ (نجمہ اور

شہاب دونوں مڑکر مجاہد کو دیکھتے ہیں جو بڑے معنی خیز انداز میں کھڑا مسکرا رہا ہے نجمہ اور شہاب دونوں خاموش رہتے ہیں۔ مجاہد آگے بڑھتے ہوئے) ہاں بھئی کونسی تصویر ضائع کی جارہی ہے۔ (شہاب کی نظریں غیر اختیاری طور پر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی تصویر کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ مجاہد اس کی نظروں کا پیچھا کرتے ہوئے) اس تصویر کو کیوں۔

شہاب :۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) اس کی وہ کاپی جو میرے گھر پر ہے۔

مجاہد :۔ اچھا۔ تمہارے گھر پر۔۔۔ (طنزیہ) مگر کیوں ہے۔

نجمہ :۔ (اپنے آنسو پونچھتے ہوئے) میری شادی سے پہلے اُس کی ایک کاپی آپ کو اور دوسری ثاقب صاحب کو بھیجی گئی تھی۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔

(خاموش ہوجاتی ہے۔ مجاہد اور شہاب حیرت سے نجمہ کو دیکھنے لگتے ہیں۔)

●●


آج کل کا اگست ۱۹۷۱ء کا شمارہ

# فلم نمبر ہوگا

اسی خصوصی شمارے میں ہندوستانی فلمی صنعت کے تمام پہلوؤں کا مکمل اور بھرپور جائزہ شامل ہوگا۔ مشہور فلمی ناقدین کے علاوہ فلمی صنعت کے ممتاز افراد کے مضامین بھی شامل ہوں گے۔

دُگنی ضخامت، متعدد تصاویر، خوبصورت سرورق اور آفسیٹ کی طباعت کے باوجود قیمت ایک روپیہ ہوگی۔ اور سالانہ خریداروں سے زائد رقم نہیں لی جائے گی۔

آج کل کے سابقہ نمبروں کی طرح یہ شمارہ بھی آپ کو بے حد پسند آئے گا۔


# غزل

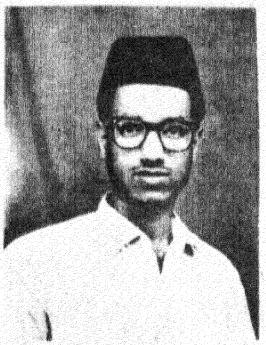


محمد یعقوب اسلم


کبھی ساغر، کبھی مینا کبھی صہبا سمجھتے ہیں
ترے دیوانے آنکھوں کو تری کیا کیا سمجھتے ہیں

مٹا کر مجھ کو کہتے ہیں حیاتِ جاوداں دے دی
وہ ہر اک بات کے مفہوم کو اُلٹا سمجھتے ہیں

جنوں نے نیک و بد کا فرق کچھ رکھا نہیں باقی
ہم اپنے گھر کو بھی تو آج کل صحرا سمجھتے ہیں

کچھ ایسے زخم بھی کھائے ہیں ہم نے ہمنواؤں سے
بھری محفل میں اپنے آپ کو تنہا سمجھتے ہیں

جنوں حدّت کا وہ چھایا ہے لوگوں کے دماغوں پر
یہ ہستی کو بھی اپنی نقشِ فرسودہ سمجھتے ہیں

یہ جب چڑھنے پہ آئے گا نہ لیگا نام رکنے کا
ہم ان اشکوں کے ہر قطرے کو ایک دریا سمجھتے ہیں

تعجب کیا ہے اسلم چاند تارے پھول برسائیں
ترے ہر بول کو جب فن کا شہ پارہ سمجھتے ہیں

# کولمبو پلان

نریندر نشچل

یہ ماضی بعید کا قصہ نہیں، ابھی چند برس پہلے کی بات ہے جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا کے بیشتر ممالک آزادی کی جدوجہد میں اُلجھے ہوئے تھے۔ پھر حالات کی صورت بدلی۔ ان ممالک کے عوام کی کوششیں بار آور ہوئیں۔ ملک آزاد ہوئے لیکن یہ ان ممالک کے مصائب کا نقطۂ اختتام نہیں تھا۔ اسے ایک زیادہ کڑی جدوجہد کے آغاز سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ انہیں یہ جدوجہد کرنا تھی، غریبی کا صدیوں پُرانا جُوا گردن سے اُتار پھینکنے کے لئے، ناخواندگی کے اندھیروں کو دُور کرنے کے لئے، اپنے عوام کا معیارِ زندگی بُلند کرنے کے لئے، ملک کو خوشحال اور قوم کو جدید، ترقی پذیر اور خوشحال بنانے کے لئے۔

اس مرحلے پر ایک عجیب صورت دیکھنے میں آئی۔ پیش منظر بالکل بدل گیا تھا۔ غیر ملکی حکمراں جو کل تک ان ملکوں کے لئے شمشیر برہنہ تھے، آج دستِ مسیحا بن گئے تھے۔ جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس وسیع و عریض خطے میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ خطہ دُنیا کے کُل رقبے کے چھٹے حصے کے برابر ہے۔ ماضی قریب تک دُنیا کے ایک چوتھائی لوگ اس خطے میں آباد تھے۔ اس خطے میں بڑی پُرامن انقلابی تبدیلیاں واقع ہونے لگی تھیں۔ یہ تبدیلیاں اُن کوششوں کا محض ایک حصہ تھیں جو اس خطے کے ممالک غریبی کی دلدل سے نکلنے اور اپنے عوام کے معیارِ زندگی کو بُلند بنانے کے لئے کر رہے تھے ان کوششوں کا ایک نمایاں پہلو بھی تھا ــــ یہ پہلو امداد باہمی کا تھا۔ اس خطے کے ممالک نہ صرف ایک دوسرے کی بلکہ ایشیا کی اقتصادی ترقی کے پروگراموں میں ممد و معاون تھے۔ یہی نہیں، اس کارِ تعمیر میں اُنہیں اس خطے کے باہر کے ممالک کی امداد بھی حاصل تھی۔ بہرصورت ان ممالک میں جاپان اور نیوزی لینڈ کے ماہرین مقامی طور پر بنی یا امریکہ و برطانیہ سے منگائی گئی مشینوں پر اپنے مقامی ساتھی کارکنوں کے ساتھ مصروف کار تھے۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مختلف ملکوں، مختلف روایتوں اور مختلف نسلوں کے لوگ مختلف ذرائع سے دستیاب ساز و سامان کے ساتھ، باہمی امداد سے ایک اور صرف ایک مقصد کے لئے اپنی کوششوں کو بروئے کار لا رہے تھے اور وہ مقصد تھا۔ ایشیا کے اس وسیع و عریض خطے کے کروڑوں عوام کی زندگی کو بہتر بنانا۔

اس مرحلے پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے: آخر یہ صورتِ حال کیسے پیدا ہوئی۔ یہ عطیہ تھا، کولمبو پلان کا۔ کولمبو پلان کیا ہے؟۔ اس کا دائرہ کار اور مقاصد کیا ہیں؟ ان مقاصد کو یہ پلان کیونکر حاصل کر رہا ہے۔ کون سے اور کتنے ملک اس پلان کے ممبر ہیں۔ اس کے ممبر ممالک کو کیا اور کتنا فائدہ پہونچا ہے اور پہونچ رہا ہے؟ نیز اس کا طریق کار کیا ہے؟ ان سب سوالوں کے جواب دینے سے پہلے اس پلان کی نوعیت، آغاز اور ارتقاء کے بارے میں عرض کر دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

کولمبو پلان اقتصادی ترقی کا ایک اجتماعی تصور ہے۔ اس پلان کے ممبر ممالک اپنی کوششوں اور ساتھی ممبروں کے تعاون سے اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کولمبو پلان بین الاقوامی امداد باہمی کا مظہر ہے، متعدد منفرد خصوصیات کا حامل ہے۔ اول، یہ کہ ممبر ملکوں کے دیئے ہوئے عطیے اور دیگر رقمیں کسی مرکزی فنڈ میں نہیں ڈالی جاتیں۔ دوم، یہ کہ امداد کی نوعیت ہر صورت باہمی بات چیت سے طے کی جاتی ہے۔ امداد پانے والا ملک پہلے اپنی ضروریات متعین کر لیتا ہے اور پھر اُن ضروریات کی تکمیل کے لئے امداد دینے والے ملک سے مدد چاہتا ہے۔ سوم، اس پلان کی شروع سے ایک نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ امداد باہمی اور مساوات کے تصور کو مقدم سمجھا گیا ہے۔ ابتداً متعدد ممالک کی معاونت کا نظریہ وضع اپنایا گیا تھا، لیکن اب دو فریقوں کے درمیان امداد و معاونت کا طریقہ مسلمہ قرار پا ہے۔ کولمبو پلان کوئی بین الاقوامی ترقیاتی تنظیم نہیں۔ اس کی حیثیت ایک سائبان سی ہے۔ دو طرفہ کارروائی نیز متعلقہ عوام کی حسیات اور اقدار کے باہمی احترام نے اس میں کولمبو پلان کو مقبول بنانے میں بڑی مدد دی ہے۔

اس کی مقبولیت کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ اور وہ ہے اس پلان کا علاقائی یعنی اس علاقے کا ہر ملک اس پلان کا ممبر ہے۔ ممکن ہے آج یہ بات کچھ زیادہ ا

دکھائی نہ دے لیکن زمانی پس منظر میں اس کی اہمیت سے انکار بڑا مشکل ہوگا۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے اوائل میں اس خطے کے بہت سارے ممالک بڑی طاقتوں سے نتھی ہوئے بغیر اپنی غیر جانب داری کی پالیسی پر عمل کر نا چاہتے تھے ایسے میں ان سب ممالک کا یہ اشتراک پلان کے تصور کی درستی و راستی کی ایک واضح علامت ہے۔ اس کی پشت پر دوستی اور خیر سگالی کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس میں کسی قسم کے دباؤ یا کھینچ تان کو روا نہ رکھا گیا تھا۔

کولمبو پلان کا کوئی مافوق قومی حاکم نہیں۔ سچ پوچھئے تو صحیح معنوں میں یہ پلان بھی نہیں۔ یہ اپنے ایشیائی ممبروں کے قومی منصوبوں کا مجموعہ ہے۔ کوئی ملک اپنے حالات کی روشنی میں اپنی ضرورتوں اور نشانوں کا تعین کیسے کرتا ہے یہ اس میں قطعی مخل نہیں ہوتا، نہ کوئی پابندی عائد کی جاتی ہے نہ جانچ اور معائنہ ہوتا ہے۔ اور نہ حساب ہی طلب کیا جاتا ہے۔ اس کے جلسوں میں ممبر ملکوں کی منصوبہ بندی یا اقتصادی ترقی کے بارے میں کوئی فیصلے صادر نہیں کئے جاتے بس ایسی فضا پیدا کی جاتی ہے جس میں کوئی ملک کسی ایک یا زیادہ ملکوں سے اپنی ضرورتوں کے مطابق امداد کا طالب ہوتا ہے۔ یہ تنظیم ایسی فضا اور متعلقہ عناصر کو ساز گار بنانے میں ہاتھ بٹاتی ہے۔ یہ مقصد دوستی، غیر رسمی بات چیت اور رابطے کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی توجہ چاہتی ہے۔ وہ یہ کہ بیرونی امداد اگرچہ اہم ہوتی ہے، لیکن وہ ایک ملک کے ترقیاتی اخراجات کے محض ایک حصے کو پورا کر پاتی ہے۔ یہ ترقیاتی اخراجات بڑے کثیر ہوتے ہیں یہ مختلف ملکوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ بیرونی امداد محض تکملہ ہوتی ہے ترقیاتی اخراجات کا بڑا حصہ تو قومی حکومتوں کو ادا کرنا ہوتا ہے۔

اس سے پہلے کہ کولمبو پلان کے دائرہ کار اور تنظیمی امور کا جائزہ لیا جائے۔ اس کی ابتدا کے بارے میں کچھ باتیں بتا دینا مفید ہوگا۔ اس پلان کی تشکیل کا خیال دولت مشترکہ کے وزراء خارجہ کی کانفرنس میں پیدا ہوا تھا۔ یہ کانفرنس جنوری ۱۹۵۰ء میں کولمبو میں ہوئی تھی۔ اس میں شریک وزراء خارجہ میں ایک سمجھوتہ ہوا جس کے مطابق، بعد کو سڈنی آسٹریلیا میں اور اسی برس لندن میں ہوئی میٹنگ میں، ایک مشاورتی کمیٹی بنائی گئی۔ تکنیکی امداد باہمی پہلی بار اس پلان کے تحت مارچ ۱۹۵۱ء میں آئی۔ اور جولائی ۱۹۵۱ء میں اس پلان پر پوری طرح عمل ہونے لگا۔ سرمایہ سے امداد کی جانے لگی اور قومی ترقیاتی منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جانے لگا۔

دھیرے دھیرے لوگوں کا پلان میں اعتماد بڑھا۔ اس کی امکانی صلاحیتوں کا ادراک پیدا ہوا۔ اس کے ممبروں کی تعداد بڑھی۔ نہ صرف اس خطے کے مزید ممالک اس کے ممبر بنے، بلکہ خطے سے باہر کے ممالک نے زیادہ تعداد میں اس کی ممبری قبول کی۔ ۱۹۵۰ء میں دولت مشترکہ کے کل سات ممالک اس کے ممبر تھے، آج اس کے ممبروں کی تعداد ۲۴ ہے۔ ان میں ۱۶ ملک ایسے ہیں جو دولت مشترکہ سے متعلق نہیں اب یہ پلان جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا کی حدوں کا پابند نہیں ہے۔ اب یہ مغرب میں ایران سے لے کر مشرق میں فلپائن تک اور شمال میں جمہوریہ کوریا سے لے کر جنوب میں انڈونیشیا تک کے علاقے کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس خطے کی آبادی ۱۱۶۹ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا: ۲۴ ملک کولمبو پلان کے ممبر ہیں۔ یہ ملک ہیں۔

خطے میں: افغانستان، بھوٹان، برما، سیلون، بھارت، انڈونیشیا ایران، کمبوڈیا، جمہوریہ کوریا، لاؤوس، ملائشیا، جمہوریہ مالدیو، نیپال پاکستان، فلپائن، سنگاپور، تھائی لینڈ اور جمہوریہ ویٹ نام۔

خطے سے باہر: آسٹریلیا، برطانیہ، کینیڈا، جاپان، نیوزی لینڈ اور امریکہ۔

اب کچھ باتیں کولمبو پلان کے دائرہ کار کے بارے میں۔ اس سلسلے میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ کولمبو پلان کا امدادی پروگرام سماجی اقتصادی ترقی کے سبھی شعبوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ امدادی پروگرام امداد باہمی سے عبارت ہے یہی وجہ ہے کہ ہر ملک اپنی صلاحیت، ترقی کی حالت اور مالی وسیلوں کے مطابق، دوسرے ملکوں کی مدد کرتا ہے۔ اس پلان کے تحت امداد سرمائے کی صورت میں دی جاتی ہے اور تکنیکی تعاون کی صورت میں بھی جن ملکوں نے، ان دونوں صورتوں میں پلان کے ممبر ممالک کو مدد دی ہے، ان میں، آسٹریلیا، برطانیہ، کینیڈا، جاپان، نیوزی لینڈ اور امریکہ شامل ہیں۔ اس خطے کے جن ملکوں نے ایک زیادہ ملکوں کو تکنیکی امداد دی، ان میں برما، سیلون، بھارت، انڈونیشیا، جمہوریہ کوریا ملائشیا۔ پاکستان، فلپائن، سنگاپور اور تھائی لینڈ شامل ہیں۔

تنظیمی طور پر کولمبو پلان اپنے تین اداروں کے ذریعے خدمات انجام دیتا ہے پہلا ادارہ مشاورتی مجلس ہے۔ پالیسی وضع کرنے والی یہ اعلیٰ جماعت ممبر حکومتوں کے وزیروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس مجلس کی میٹنگ ہر برس کسی ممبر ملک کی راجدھانی میں ہوتی ہے۔ اس مجلس کا کام اس خطے کی ترقی کا جائزہ لینا، ضرورتوں کا اندازہ کرنا، نیز اس بات کا تعین کرنا ہے کہ سرمایہ و تکنیکی معاونت کی صورت میں دستیاب بین الاقوامی تعاون سے قومی وسیلوں میں موجود کمی کو کیسے دور کیا اور ترقی کی رفتار کو بڑھایا جا سکتا ہے۔

دوسرا ادارہ کولمبو پلان کونسل ہے۔ یہ تکنیکی امداد باہمی سے متعلق ہے اس

کی باقاعدہ میٹنگیں کولمبو میں ہوتی ہیں۔ یہ کونسل کولمبو پلان ممالک کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ کونسل سرمایہ کی صورت میں دی جانے والی امداد کے سوال سے کوئی بحث نہیں کرتی۔ اس کا کام صرف اس خطے میں تکنیکی امداد کو بڑھاوا دینا اور مربوط بنانا ہے۔

تیسرا ادارہ کولمبو پلان بیورو ہے۔ پانچ فرائض کی ادائیگی اس بیورو کے ذمہ ہے۔ یہ مشاورتی مجلس کی میٹنگوں میں شرکت کرتا ہے۔ کونسل کی خدمت انجام دیتا ہے۔ اس خطے میں دی جانے والی ساری تکنیکی امداد کا حساب رکھتا ہے۔ تربیت کے بین علاقائی پروگرام بناتا ہے اور پلان کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔

اس پلان کی میعاد کا ابتدا آٹھ برس تھی بعد میں اسے بڑھا دیا گیا اور یہ ۱۹۵۷ء، ۱۹۶۱-۶۶ء، ۱۹۶۶ء اور ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۶ء کر دی گئی مزید توسیع کا مسئلہ ۱۹۷۴ء میں زیر غور آئے گا۔

یہ امداد ایک سرکار دوسری سرکار کو دیتی ہے۔ غیر سرکاری ادارے بھی امداد پا سکتے ہیں لیکن انہیں امداد کے لئے درخواست اپنی حکومت کی وساطت سے کرنا ہوتی ہے۔ یہ امداد دو صورتوں میں دی جاتی ہے۔

قومی ترقیاتی پروجیکٹوں، اشیا بشمول اناج کیمیا دی کھادوں، عام استعمال کی چیزوں، خاص آلات بشمول مشینوں، کھیتی اور لیبارٹری کے سامان، موٹر گاڑیوں وغیرہ کے لئے عطیوں یا قرضوں کی صورت میں مالی امداد۔

دوسری صورت تکنیکی امداد باہمی کی ہے، یہ امداد ماہرین اور ٹیکنیشنوں کی خدمات، بیرونی ملکوں میں مختلف میدانوں میں، اعلیٰ ٹیکنالوجی کے مطالعے کی سہولیات، تربیت، تحقیق اور بین علاقائی تربیت کے لئے درکار خاص ساز و سامان کی فراہمی کے ذریعے بہم پہونچائی جاتی ہے۔

مختلف صورتوں میں دی جانے والی امداد سے صاف ظاہر ہے کہ کولمبو پلان ممبر ملکوں کی سماجی، اقتصادی زندگی کے سبھی شعبوں کو ترقی دینا چاہتا ہے۔ کولمبو پلان کی بدولت جنوب اور جنوب مشرقی ایشیائی ملکوں نے زراعت کے شعبے میں سبز انقلاب کی صورت میں جو نمایاں کامیابی حاصل کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اسی طرح کولمبو پلان، ممبر ملکوں کی مجموعی ترقی کے پیش نظر صنعتوں کی ترقی، انسانی فلاح، تعلیم، صحت نقل و حمل، رسل و رسائل، پانی و بجلی کی بہم رسانی جن شکتی کے صحیح صحیح استعمال کو اپنا مطمح نظر بنائے ہوئے ہے۔ اس ضمن میں دو امور خاص توجہ چاہتے ہیں۔ اول، تربیت ہے۔ زراعتی اور صنعتی پیداوار بڑھانے اور دوسرے شعبوں میں ہونے والی ترقیوں کے ہم دوش رہنے کے لئے کارکنوں کا جدید ترین فنون اور فن کے جدید ترین طریقوں کا ماہر ہونا ضروری ہے۔ یہ امر تربیت کے بغیر ممکن نہیں۔ کولمبو پلان کے ممبر ممالک اپنے کارکنوں کو دوسرے ملکوں میں بھیج کر، تربیت کے مشترکہ مراکز میں بھیج کر سہولیات سے خوب خوب استفادہ کرتے ہیں۔ گزشتہ ۱۹ برسوں میں ۵۶۱۸ افراد کو تربیتی سہولیتیں خطے کے اندر ہی مہیا کی گئیں۔ یہ کولمبو پلان کے تحت تربیتی پروگرام کے نشانے کا ۶/۸ فی صد ہے۔

جن ملکوں نے سب سے زیادہ افراد کو تربیتی سہولیتیں مہیا کیں ان میں بھارت کا نام سرفہرست ہے اس کے بعد دوسرے ملکوں میں، کوریا، سنگاپور، پاکستان، ملائشیا، سیلون اور فلپائن شامل ہیں۔ کولمبو پلان کے تحت، ممبر ملکوں کے افراد کو خطے سے باہر کے کسی ملک میں بھی تربیت حاصل کرنے کی سہولیتیں مہیا کی جاتی ہیں۔

ان ترقیاتی پروگراموں سے جڑا ہوا ایک خاص مسئلہ آبادی کا ہے۔ اس خطے کی اب آبادی ۱۱۶۱۹ لاکھ ہے شرح پیدائش ۲٫۵ فی صد سالانہ ہے۔ اس تیز رفتار شرح پیدائش سے ۲۷ برس کے عرصے میں اس خطے کی آبادی دوگنی ہو جائے گی۔ ایسے میں ظاہر ہے آبادی میں اضافے کی روک تھام کے بغیر تمام ترقیاتی پروجیکٹ اگر سرے چڑھ بھی گئے تو بھی مفید ثابت نہ ہوں گے۔ اسی امر کے پیش نظر کولمبو پلان کے ممبر ممالک خاندانی منصوبہ بندی کی پالیسی پر بڑی شدت سے عمل کر رہے ہیں۔ اس کام میں کولمبو پلان بھی موثر ڈھنگ سے ہاتھ بٹا رہا ہے۔

اس سے پہلے کہ اس پلان کے آغاز سے مختلف ممالک کی جانب سے دی گئی امداد کا ذکر کیا جائے، ایک نظر ان تعمیری اور ترقیاتی کاموں پر ڈالنی مناسب اور مفید مطلب ہوگی، جو گزشتہ عرصے میں کولمبو پلان کے ممبر ممالک میں ہوئے ہیں۔ آیئے شروعات بھارت سے کریں۔ مغربی بنگال میں درگاپور کے مقام پر بنا فولاد کا کارخانہ کولمبو پلان کی کامیابی کا منہ بولتا نمونہ ہے اس کارخانے کے لگ بھگ دو سو انجینئروں اور ٹیکنیشنوں نے برطانیہ میں تربیت پائی تھی۔ اس کارخانے کے لئے آسٹریلیا اور امریکہ نے بھی امداد دی تھی۔ ریاست مدراس کا سب سے بڑا یعنی کندہ پن بجلی پروجیکٹ، ہیراکڈ باند، بابڑ میں بنا جدید ڈھنگ کا اناج گودام وغیرہ کولمبو پلان کی کامیاب کارکردگی کی علامتیں ہیں۔ اسی طرح پاکستان کا وارسک پن بجلی پروجیکٹ، گنگا گوہڈک پروجیکٹ، شتیر برقی اسٹیشن، ذیل پاک سیمنٹ فیکٹری، تھائی لینڈ کی ایسٹ ویسٹ شاہراہ، انڈونیشیا میں جوڈگ کے مقام پر بنی ہوا بازی کی اکادمی، نیپال میں بیرگنج کے مقام پر تلاوا بیرج؛ سیلون میں گل اویا ریزر واٹر، کیسل ریگ باند، ملایا کا کلانگ گیٹس باند، ملاکا

برقی اسٹیشن، فلپائن میں سوتی کپڑے کا کارخانہ اس کی محض چند مثالیں ہیں۔ تکنیکی امداد کے تحت ممبر ممالک نے ایک دوسرے کو جو ساز و سامان دیا اور ماہرین کی خدمات مہیا کیں، اس سے بھی ان ملکوں کی مجموعی ترقی میں اضافہ ہوا ہے مثلاً کینیڈا نے بھارت کو کینسر کے علاج کے لئے تھیراٹرون مہیا کیا۔ برطانیہ اور امریکہ نے نیویلی مگنائٹ پروجیکٹ کے لئے ساز و سامان دیا۔ آسٹریلیا نے سیلون کو ایکس رے کا سامان، برطانیہ نے لاؤس کو گشتی طبی دواخانہ، برطانیہ اور آسٹریلیا نے فلپائن یونی ورسٹی کو کتابیں، برطانیہ نے نیپال کو ڈیزل انجن، امریکہ نے سیگاؤں کی فیکلٹی آف میڈیسن کو خوردبینیں مہیا کیں۔ اس ضمن میں ایسی ہی اور بھی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

آئیے اب ایک نظر اس امداد پر ڈالیں جو کولمبو پلان کے مختلف ممبروں نے اس خطے کی مجموعی ترقی کے لئے دی۔

کولمبو پلان کے آغاز سے اب تک ۳۰۰ کھرب امریکی ڈالر کی امداد دی جاچکی ہے۔ اس میں تکنیکی امداد، سرمایہ کی امداد اور اشیاء وغیرہم شامل ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں ۲۴ کھرب امریکی ڈالر کی امداد دی گئی تھی جن ملکوں نے امداد کا ایک بڑا حصہ ادا کیا۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

آسٹریلیا۔ ۲۸۳۱ لاکھ آسٹریلیائی ڈالر — ۱۹۶۹ء میں اخراجات ۳۲۶ لاکھ آسٹریلیائی ڈالر، برطانیہ: پلان کے آغاز سے ۱۹۶۹ء کے آخر تک اخراجات: ۱۷۶۷۰ لاکھ امریکی ڈالر؛ ۱۹۶۹ء میں اخراجات، ۱۳۴۴۷ لاکھ امریکی ڈالر، کینیڈا: کل اخراجات ۹۱۹۰ لاکھ امریکی ڈالر؛ ۱۹۶۹ء میں دی گئی امداد ۱۳۴۱۷ لاکھ امریکی ڈالر؛ جاپان، ۱۹۶۹ء کے آخر تک کے اخراجات: ۲۴۸۵۱ لاکھ امریکی ڈالر؛ ۱۹۶۹ء میں اخراجات ۷۲۹۰ لاکھ امریکی ڈالر؛ نیوزی لینڈ: پلان کے آغاز سے اخراجات۔ ۳۷۰ لاکھ نیوزی لینڈ ڈالر۔ حسب معمول سب سے زیادہ امداد امریکہ نے دی ہے۔ ۱۹۷۰ء کے آخر تک امریکی امداد کی کل مالیت ۲۵۱۳۰۰ لاکھ ڈالر تھی۔ ۱۹۷۰ء میں اس کا خرچ ۱۸۰۷۰ لاکھ ڈالر رہا۔

کولمبو پلان کے علاقائی ممبروں میں سب سے زیادہ امداد بھارت نے دی ہے۔ اس ضمن میں اس کا نام حسب سابق سرفہرست ہے۔ پلان کے آغاز سے جون ۱۹۶۹ء تک بھارت نے اس خطے کے ممبروں کو ۳۷۳ لاکھ روپے کی تکنیکی امداد دی۔ اس رقم میں سے ۲۹۱ لاکھ روپے تربیت پانے والوں پر ۴۵ لاکھ روپے بھارتی ماہرین کی خدمات فراہم کرنے پر (نیپال کو چھوڑ کر) اور ۳۶ لاکھ روپے کی مالیت کے آلات و دیگر ساز و سامان کے مطیات پر صرف کئے گئے۔

کولمبو پلان کے آغاز سے بھارت میں پلان کے ممبر ملکوں کے ۴۱۶۱ افراد کو تربیت دی گئی۔ نیز ۱۵۱ بھارتی ماہرین کی خدمات مہیا کی گئیں۔ بھارت میکونگ پروجیکٹ میں بھی امداد دے رہا ہے۔

اپنے دو پڑوسی ملکوں نیپال اور بھوٹان کو بھارت نے جو امداد دی، وہ خاص طور پر توجہ چاہتی ہے۔ مثلاً نیپال کو لیجئے۔ مارچ ۱۹۶۹ء تک بھارت نے نیپال کو ۵۸۳۷ لاکھ روپے کی امداد دی تھی۔ اس میں ۱۱۰۰ لاکھ روپے کی وہ امداد بھی جو شامل ہے۔ نیپال کو ۶۹-۱۹۶۸ء (اپریل۔ مارچ) میں دی گئی تھی۔ نیپال نے اس بھارتی امداد سے نیپال میں سڑکیں اور پل تعمیر کرائے ہیں۔ نیز بجلی و سینچائی کی سہولتوں کو بہتر بنایا ہے۔

اسی طرح، بھارت سرکار نے بھوٹان کے دوسرے و تیسرے پانچ سالہ منصوبوں کے لئے ۴۲۷ لاکھ روپے کی امداد دی۔ دوسرے پلان کے لئے مدد دینے کے علاوہ بھارت سرکار نے بھوٹان کو سڑکیں بنانے، رسل و رسائل کی سہولتیں مہیا کرنے، ملیریا کی بیخ کنی وغیرہ کے لئے بھی امداد دی ہے۔ نیز بھوٹانی طلباء کو بھارت میں تعلیم پانے کے لئے وظائف بھی دیئے ہیں۔

آج کی ہر لمحہ سکڑتی ہوئی دنیا میں جب بقا اور ارتقا کا معاملہ کسی ایک ملک یا قوم کا مسئلہ نہیں، دنیا کی تمام اقوام اور تمام ملکوں کا مسئلہ بن گیا ہے، ایسے میں کولمبو پلان جیسی تنظیمیں ایک محفوظ مستقبل کی بصیرت اور بشارت دیتی ہیں۔

---

دل میں جھانکا تو تمنا کا خرابہ نکلا
میں جسے شہر سمجھتا تھا وہ صحرا نکلا

لوگ ہمراہ لئے پھرتے ہیں یادوں کے ہجوم
ڈھونڈنے پر بھی کوئی شخص نہ تنہا نکلا

مجھ سے پوچھو کہ سمندر کی حقیقت کیا ہے
اُس کی وسعت کو سمیٹا ہے تو قطرا نکلا

تیری آنکھوں میں کوئی عکس تھا مبہم مبہم
غور سے دیکھا تو وہ میرا ہی چہرا نکلا

تم کو دیکھا تو کہا دل نے کہ دیکھا ہے تمہیں
اور سوچا تو کسی یاد کا رشتہ نکلا




## خشتِ دیوار (شعری مجموعہ) مصنف : زبیر رضوی

زبیر رضوی کا یہ دوسرا شعری مجموعہ اُن کے ادبی سفر میں ایک ارتقائی مرحلے کا آئینہ دار ہے۔ اس مرحلے میں روایت اور رُومان کی دُھند ایک حد تک چھٹی ہے نیز موجبہ غالب رجحانات کو اختیار کرنے کی خارجی خواہش اور کوشش قریب قریب مفقود ہوئی ہے۔ یہ تبدیلی زبیر صاحب کی غزلوں میں کم اور نظموں میں زیادہ نمایاں ہے۔

زبیر رضوی کی نظمیں دیہی ماضی اور شہری حال کی کشاکش، شہری طریقۂ زندگی ماحول میں موجود متضاد، معاون اور مخالف عناصر کے درمیان تطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے شخص کی تصویریں ہیں۔ یہ مرقع ہیں بدلے ہوئے حالات میں، بدلے ہوئے رویّوں کے۔ اُن سے دیہی ذہن کی سادگی اور شہری انداز و اطوار کی پرکاری آئینہ ہے۔ یہ دونوں بذاتِ خود ان کا مقصود یا منتہا نہیں۔ ان کا مقصود اور منتہا دیہی ذہن کی سادگی میں موجود پُرکاری اور شہری انداز و اطوار کی پُرکاری میں موجود سادگی ہے موجود اور میسر کو غنیمت اور گوارا بنانے والی رُومانی خوش فہمی بھی اُن کے ایسے ہی رویّے کا پتہ دیتی ہے لیکن زبیر صاحب کی نظموں میں یہ دیہی معصومیت کوئی اوڑھی ہوئی شے معلوم نہیں ہوتی اور پھر انہوں نے محض اسی کو اپنا شیوۂ گفتار بھی نہیں بنایا، وجہ یہ کہ ماضی اور حال سے اُن کا تعلق محض جذباتی نہیں۔ وہ ایک ہوش مندی کا حامل ہے ان کے نزدیک ماضی کے اقدار نہ تمام تر صالح ہیں اور نہ حال تمام تر سنہرا اور سازگار اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے زبیر صاحب نے رویّوں اور کیفیتوں کے تضاد کو سخن کا وسیلہ بنایا ہے۔ ان کا یہ انداز اپنے اندر بالواسطہ طنز کی ایک دو دھاری کیفیت رکھتا ہے۔ اُن کا طنز غیر محسوس ہے اور چونکہ یہ مقصود بالذات نہیں، اس لئے لطیف اور موثر ہے۔

زبیر صاحب کی نظموں میں خیال کی رَو یعنی فطری لیکن کسی قدر بے ربطی کے ساتھ سوچتے ہوئے شخص کی خود کلامی وہم کلامی کا بالواسطہ انداز پایا جاتا ہے۔ اس سے اُن کی نظموں میں ایک ڈرامائی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس سے ان کی نظموں کی اثر انگیزی بڑھی ہے۔ اس اثر انگیزی میں اضافے کا ایک دوسرا سبب اُن کی نظموں میں پائی جانے والی محسوس اور غیر محسوس استہفامیہ کیفیت ہے۔ یہی کیفیات ایک اعتدال۔ خودی اور خود سپردگی کے ایک گوارا امتزاج کا پتہ دیتی ہیں جو ادھر زبیر صاحب کے شعری کردار اور رویّے میں پیدا ہو چلا ہے۔ اسی اعتدال کی بدولت وہ حالات سے فرار نہیں چاہتے۔ یہ بات الگ کہ وہ حالات سے محاربت کی سکت نہیں رکھتے۔ ہاں اس کی خواہش اُن کے یہاں البتہ موجود ہے۔ یہی اعتدال ہے جو چاہنے اور

چاہے جانے کی کامیاب خواہش کو بھی تکمیل کا سزاوار نہیں ہونے دیتا کہ اس کے نزدیک اپنی ہی نہیں اوروں کی خوشی بھی مقدم ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں

تعلقات میں سرمستی و سرشاری نہیں۔ ایک محرومی ہے جو کسک کے ایک عجیب احساس کو جنم دیتی ہے۔ یہ محرومی اطوار میں شائستگی، اور حالات اور عوامل سے بہرحال تطابقت بنائے رکھنے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔

خشتِ دیوار میں علاوہ نظموں کے غزلیں بھی شامل ہیں۔ لب و لہجے، بالواسطہ اسلوب، لفظوں کے پُرتکلف استعمال، ترکیبوں، تشبیہوں، علامتوں اور استعاروں کے اعتبار سے زبیر صاحب کی غزل، غزل کی روایت سے زیادہ قریب ہے لیکن جہاں جہاں وہ روایت سے پہلو بچا پائے ہیں وہاں وہاں انہوں نے اچھے اور نئے شعر تخلیق کئے ہیں۔ ایسے اشعار میں محسوسات کا نیا پن خاص طور سے متوجہ کرتا ہے۔ جو خصوصیات اور کیفیات زبیر صاحب کی نظموں میں پائی جاتی ہیں ان کے عکس اور نقش زبیر صاحب کی غزلوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں لیکن ان کی غزلیں بحیثیت مجموعی روایتی ہیں، تاہم ان کے بدلتے ہوئے رویے کا پتہ دیتی ہیں

۸۸ کے ۸۸ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ مکتبہ صبا، بیرد گاہ، معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد نے سلیقے سے شائع کیا ہے۔ قیمت چار روپے ہے۔

---

## اکائی (شعری مجموعہ) مصنف:- بشیر بدر

جدید نظم کی عام مقبولیت کے اس دور میں بشیر بدر کی غزلوں کا پہلا مجموعہ اکائی فوراً اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ محض اس لئے نہیں کہ یہ مجموعہ غزلیات کا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ بشیر بدر ہمارے اُن معدودے چند شعراء میں سے ہیں، جنہوں نے اُردو غزل کو جدید حس سے روشناس کرانے اور اُسے ایک نیا رنگ و آہنگ دینے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔

آج اُردو غزل کا شاعر نظم اور نئی نظم کے شاعر سے اپنے موضوعات، فکری ماحول کا رفرما رجحانات کے اظہار کے اعتبار سے مختلف نہیں ہے اور اس امر کی بڑی اچھی مثال بشیر بدر کی غزلیں ہیں۔ بشیر بدر کی غزلیں ایک سوچتے ہوئے ذہن کی تخلیق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اشعار میں ہمیں استفہام اور استعجاب کی ایک محسوس اور اکثر اوقات ایک غیر محسوس کیفیت ملتی ہے۔ جو اپنے اندر طنز کا ایک عجیب لطف رکھتی ہے۔

موجودہ مشینی دور کی تیز روی اُس کے ردِ عمل میں پیدا روا روی کے تعلقات، لاتعلقی، بے حسی، تنہائی، بجی اور عالمی مسئلوں، چھوٹی بڑی خوشیوں، خواب ناک خواہشوں اور اُن سے متصادم تلخ حقیقتوں کا بڑا موثر اظہار ہمیں بشیر بدر کی غزلوں میں ملتا ہے۔ اُن کی غزلوں میں سانس لینے والا ہمارے معاشرے کا فرد نہ یکسر ذہن ہے اور نہ سراسر جذبات۔ حالات کے نرم گرم نے اُسے مردِ پختہ کار بنا دیا ہے۔ وہ مایوسی میں منہ نہیں لپیٹتا اور خوشی میں جامے سے باہر نہیں ہوتا۔ اعتدال اُس کا خاصا اور خوبی ہے اور ایسے ہی اعتدال میں لایا ہوا شدتِ احساس بشیر بدر کی غزلوں کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ بشیر بدر کی غزلوں کی ایک دُوسری خصوصیت اُن کا کلاسیکی رچاؤ، حد درجہ شائستہ اور غنائی لب و لہجہ ہے۔ اُن کی غزلوں کی زبان، تشبیہیں، علامتیں اور استعارے یکسر نئے نہیں۔ تاہم یہ پُرانے بھی نہیں۔ اُن کے اندازِ نظر، مشاہدات اور محسوسات نے کلاسیکی رچاؤ، لب و لہجہ کی شائستگی اور غنائیت کے ساتھ اظہار کے جو پرائے اختیار کئے ہیں، وہ شاعر کی جدید حس کی بدولت فی الواقع ایک دُوسرے کی توسیع کا باعث بنے ہیں اور اس تنگنائے کے نئے امکانات کا پتہ دیتے ہیں۔ بشیر بدر کی غزلوں میں یہ امر متوجہ ہی نہیں کرتا، چونکاتا بھی ہے۔

بشیر بدر اشیاء اور عوامل پر نظر کرنے کا ایک اپنا انداز رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت نفسیاتی پس منظر کے ساتھ جدید ذہن، محسوسات کا نیا پن اور مشاہدے کی ندرت ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو اُن کی انفرادیت کو نمایاں کرتی اور اُنہیں منفرد بناتی ہے۔ بشیر بدر کی غزلوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے لفظوں کو محض لفظ سمجھ کر نہیں بلکہ اظہار کا وسیلہ سمجھ کر برتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزلوں کے بیشتر اچھے اشعار نظم جیسی تفصیل نہ رکھتے ہوئے بھی نظم جیسی رمزیت، وسعت اور معنویت رکھتے ہیں۔

اکائی میں ہمیں بعض غزلیں ایسی بھی ملتی ہیں جو پہلی نظر میں سطحی جدیدیت کی مثال دکھائی دیتی ہیں۔ اس کا احساس ہمیں اشعار میں موجود بے حد مانوس ردیفوں اور اُن کے اظہار کے لئے استعمال کئے گئے کسی قدر مانوس لفظوں سے ہوتا ہے یہاں ہمیں ایک بات اور بھی متوجہ کرتی ہے۔ وہ یہ کہ نئی شاعری کے ایک نام نہاد لوازمہ یعنی کھُردرے لب و لہجے کو بشیر بدر نے عیب ہی جانا ہے ہُنر نہیں سمجھا تاہم اِن غزلوں کی نوعیت مختلف ہے۔ یہ کسی فیشن یا تقلید میں نہیں کہی گئیں۔ یہ آج کی بدلتی ہوئی قدروں اور رویوں کے تئیں شاعر کے ردِ عمل کا کہیں سادا اور کہیں پُرپیچ اظہار ہیں۔ اُن کی پشت پر جو تخلیقی ذہن کارفرما ہے وہ مجرد تصویروں کے نقاش کی طرح ہیئتوں کو نہیں، خصوصیتوں کو پیشِ نظر رکھے اور مقدم سمجھے ہوئے ہے۔ ایسے میں ظاہر ہے معانی اور معنویت کا قدرے اوجھل ہونا اغلب ہے۔ تاہم بشیر بدر کی اس نوع کی غزلوں میں ایسا ابہام نہیں جو افکار کو فلسفہ اور اشعار کو

چیستاں بنا دے۔ ان کی ایسی غزلوں کے اچھے اشعار اپنے اندر ایک گہری معنویت اور معنی کی توسیع کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایسی غزلیں بشیر بدر کے بدلتے ہوئے شعری رویوں کا البتہ پتہ دیتی ہیں۔ گو ایسی غزلوں کی نوعیت تجرباتی ہے۔ تاہم بشیر بدر جیسے کلاسیکی رچاؤ، نیا ذہن اور جدید حس رکھنے والے شاعر سے ایسے تجربوں اور مستقبل میں مزید بہتر غزل کی توقع کچھ بے جا نہ ہوگی۔

مختصراً اکائی ہماری غزلیہ شاعری میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

سائز $22\frac{1}{8} \times 18$۔ صفحات: ۱۱۲، قیمت: ۴ روپے

ملنے کا پتہ: کالج اینڈ یونی ورسٹی بک اسٹال، بڑا بازار — علی گڑھ۔ یوپی

## لفظوں کا پل (شعری مجموعہ) مصنفہ: ندا فاضلی

۱۹۶۰ء کے بعد کے نمایاں شاعروں میں ندا فاضلی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ اُن کی شاعری کا رنگ آہنگ انفرادی اور انداز تمثیلی ہے۔ یہ اشیا کو ذی جان اور گویا بنانے اور خصوصیات کو شخص کرنے سے عبارت ہے۔ اس میں اُن کا اثر انگیز لب و لہجہ بہت معاون ثابت ہوا ہے جو اُن کی نظموں میں سانس لینے والی فضا کی طرح سادہ، بے تصنع اور نیا نیا ہے۔

ندا فاضلی اپنے مختصر سے دیباچے میں لکھتے ہیں: ــــ "لیکن اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا۔ اُنچی ہاتھ میں لے، جو سر جھکائے واپس آیا تھا وہ میں نہیں تھا۔ کوئی اور تھا، مجھ جیسا ہی۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔ اس کا نہ کوئی گھر تھا۔ نہ شہر تھا اور نہ رشتے دار تھے۔ کاغذ پر نہ جانے لکیریں کب بدلی تھیں۔ وہ اکیلا آدمی آج بھی اُسی طرح اکیلا اکیلا بھٹک رہا ہے۔ رات کے بھیانک اندھیروں میں، جس گھر کو اس سے چھین لیا گیا تھا، اُسے وہ آج تک ڈھونڈ رہا ہے۔۔۔"

غالباً یہ گھر کے لئے اُن کی شدید کسک کا نتیجہ ہے کہ اُن کے مشاہدات کا مرکز و محور بیشتر گھر آنگن، اس کے متعلقات، گھر گرہستی کے رشتے ناتے، باپ بچے، ماں بیٹے، بہن بھائی کے تعلقات ہیں۔ اور اسی مناسبت سے انہوں نے اپنے محسوسات چھوٹی بڑی خواہشوں اور خوشیوں، چھوٹے بڑے واقعات، شیریں تلخ یادوں اور صورت حال میں موجود کیفیات کے اظہار کے لئے گھر آنگن اور اس کے متعلقات کو ہی وسیلہ بنایا ہے۔ ندا نے اپنی نظموں کی خانگی و دیہی فضا ہوتی سے چنے برتنوں، شیشے سے ڈھلے چوکے، چارپائی کے بان، تھان میں بیٹھی بھیا، ٹین کی چھت، اُلی کے کنارے، خالی جگ، آنگن کے جامن، گلابی اون میں لپٹی کلائی، چوکا باسن کرنے، چکی پیسنے، چوپال، نیم، برگد، پیپل جیسے عام اور بظاہر معمولی مظاہر اور عوامل سے مرتب کی ہے۔ ندا نے ان عوامل اور مظاہر کو ایک شاعر کی طرح برتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے بنائے ہوئے نقش نویلے اور بڑے دل کش دکھائی پڑتے ہیں۔ جدت یہ ہے کہ ندا نے رویوں میں تبدیلی، اقدار کی فرسودگی، ماضی سے روابط کے انہدام، شہری طریقۂ زندگی، حالات کی ستم ظریفیوں اور اُن میں مضمر طنز کے اظہار کے لئے بھی، بنیادی طور پر انہیں وسیلوں سے کام لیا ہے جس کش مکش اور کرب کا اظہار ندا کی نظموں میں ہوا ہے، وہ ہمارے معاشرے کے عام انسان کا حصہ ہے۔ یہ اظہار ایک حد تک بے تعلق سا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس میں چبھن تو پاتے ہیں، کاٹ کی کیفیت محسوس نہیں کرتے۔ اور غالباً یہ نتیجہ ہے: آج کے مشینی دور کی تیز روی سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش میں رکنے اور سوچنے کے مواقع نہ ملنے کا۔

ندا فاضلی کی شاعری بنیادی طور پر اسلوب کی شاعری ہے۔ اُن کا اسلوب بڑا دل کش ہے۔ وہ نظموں سے چھوٹی چھوٹی تصویریں بنانے اور مختلف چھوٹی چھوٹی تصویروں کو مربوط کر کے ایک بڑی تصویر مکمل کرنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ "بھور" "سردی" "چھوٹے شہر کی رات" "ایک دن" "سحر" اور "شام" جیسی نظمیں اس امر کی اچھی مثالیں ہیں۔

ندا فاضلی نے اپنی نظموں میں جہاں گھر آنگن، اس کے متعلقات، گھر گرہستی کے رشتوں اور تعلقات کو موضوع اور سخن کا وسیلہ بنایا ہے، وہاں جنس کو اس دائرے سے باہر نہیں رکھا۔ جنسی جذبے نے اظہار کی جو شائستہ صورتیں ندا کی نظموں میں پائی ہیں وہ فی الواقع اُنہیں کا حصہ ہیں۔ وہ طبیعت کے اضطراب، اضطراری یا غیر اضطراری مگر بے ربط افعال کو گھر آنگن کے متعلقات یعنی کس کر آٹا گوندھنے، آنگن لیپنے وغیرہ جیسے قریبی وسیلوں سے سادگی اور سچائی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ایسے اضطراری افعال میں جو رمزیت مضمر ہے۔ وہ کہی اور ان کہی دونوں کا بخوبی احاطہ کرتی اور ایک اپنی لطف رکھتی ہے۔ "دو سہیلیاں" "دیوار کے پیچھے" جیسی نظمیں اس ضمن میں مثال کے طور پیش کی جا سکتی ہے۔

نظموں کے پل میں نظموں کے علاوہ غزلیں اور گیت بھی شامل ہیں۔ ندا کی غزلیں محسوسات کا نیا پن لئے ہوئے ہیں۔ ان میں بالعموم مزاج کی ایک سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس سے اِن کی غزلوں میں نظم کا سا تاثر پیدا ہو گیا ہے۔ جہاں تک گیتوں کا تعلق ہے، ندا ہمارے ان معدودے چند شعرا میں سے ہیں۔ جنہوں نے اس صنف پر خاطر خواہ توجہ کی، اور موضوع کے اعتبار سے اُسے نظم کی سی وسعت دی ہے۔

یہ مجموعہ نیو رائٹرس پبلی کیشنز، بمبئی ۹ نے شائع کیا ہے۔ $18\frac{1}{2} \times 22$ کے ۱۱۲ صفحات پر مشتمل اس مجموعے کے دام تین روپے پچاس پیسے ہیں۔

**لاہور کا جو ذکر کیا** " (آپ بیتی) مصنف : گوپال متل

یہ اُردو کے مشہور شاعر، ادیب اور صحافی گوپال متل صاحب کی آپ بیتی ہے جسے مکتبہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج، دہلی ۶ نے شائع کیا ہے۔

۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک کے عرصے پر محیط یہ آپ بیتی بیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں دہے کی ادبی تاریخ ہے لیکن یہ ادبی تاریخ متل صاحب کا براہِ راست یا بالواسطہ مقصد و موضوع نہیں۔ انہوں نے اس عہد کے تمام نقش، نقش اور عکس اپنی ذات کے آئینے میں دیکھے اور دکھائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی تاریخ میں عام طور پر جو نباتیں خشک اور غیر اہم حالات و حقائق کے بے تعلق بے ربط اور طول طویل بیانات کی صورت میں پائی جاتی ہیں، اس آپ بیتی میں کہیں نظر نہیں آتیں۔

متل صاحب کا مطمحِ نظر بیشتر معروضی ہے اور چونکہ انہوں نے اپنے آپ کو اپنے زمانی پس منظر سے الگ کر کے نہیں دیکھا اس لئے اس میں جگ بیتی کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ یہ جگ بیتی لاہور کی ہے۔ یہ تذکرہ ہے: لاہور کے ادبی حالات و واقعات صحافتی سرگرمیوں اور مقامی و ملک کی سیاسی کشاکش کا۔ یہ تعارف ہے، لاہور کے اُردو ادیبوں، صحافیوں اور سیاسی کارکنوں کا۔ یہ تنقید اور تجزیہ ہے: ان کے رویوں، روابط، اجتماعیوں اور سیاسی نظریوں کا بیک وقت تعارف، تذکرہ، تجزیہ اور تنقید کی یہ خوبیاں اور خصوصیتیں مطمحِ نظر کی معروضیت اور اندازِ سخن کی بے باکی کی دین ہیں اور یہی وہ اجزا ہیں جو باہم ہو کر اس کتاب کو اُردو کے بیشتر سوانحی ادب سے ممیز کرتے ہیں۔

متل صاحب کو زبان و بیان پر جو دسترس حاصل ہے وہ دیدنی ہے۔ ان کا اسلوبِ نگارش، موثر، تازہ و دلکش ہے۔

۲۰۸/۳۰/۱۶ کے ۱۶۵ صفحات پر مشتمل یہ کتاب صاف ستھری شائع ہوئی ہے۔ مجلد، سہ رنگا گرد پوش، قیمت : ۶ روپے

**کربل کتھا کا لسانی مطالعہ** "

مصنفین :۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم

کربل کتھا کا شمار اُردو کی اولین نثری تصانیف میں ہوتا ہے یہ کمال الدین حسین بن علی واعظ کاشفی کی کتاب روضۃ الشہداء کا آزاد ترجمہ ہے اس ترجمہ کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ اس کے زمانۂ تصنیف کا صحیح صحیح تعین ہو چکا ہے۔ فضلی نے یہ ترجمہ ۹۳۳-۹۳۲ھ/۱۵۲۷ء میں کیا اور اس پر نظرِ ثانی ۹۶۵ھ/۱۵۵۷ء میں کی۔ فضلی کی اپنی معلومات اور ان دنوں دستیاب معلومات کے مطابق یہ پہلی کتاب ہے، جو شمالی ہند میں، فارسی سے اُردو میں ترجمہ ہوئی۔ گو فضلی نے یہ ترجمہ کسی ادبی مقصد سے نہیں، بلکہ مذہبی ضرورت سے مجلسوں میں سنانے کے لئے کیا تھا، تاہم اُردو کے تاریخی لسانی مطالعے، اُردو نثر کی ابتدا اور اُردو زبان کے ارتقار کے مطالعے میں اُردو کا یہ قدیم ترین نثری نمونہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

اُردو زبان اپنے صوتیاتی ڈھانچے اور صرف و نحو کے اعتبار سے دہلی کے شمالی مشرق میں بولی جانے والی کھڑی بولی کے بہت قریب ہے۔ تاہم دہلی کے نواح میں بولی جانے والی دوسری زبانوں، برج بھاشا، پنجابی اور ہریانی کی بعض خصوصیات بھی اس میں شامل ہو گئی ہیں۔

کربل کتھا کا یہ لسانی مطالعہ اس امر پر اچھی روشنی ڈالتا ہے کہ اس عہد میں بولی جانے والی زبان صوتی، صرفی، نحوی، ذخیرہ الفاظ اور املا کے اعتبار سے آج بولی جانے والی اُردو زبان سے کیسے اور کتنی مختلف تھی۔ نیز اس نے اس تعلق سے، کھڑی بولی، برج بھاشا پنجابی اور ہریانی کی کن مختلف خصوصیات کو اپنایا یا قبول کیا۔ نیز یہ کہ کون سے عربی فارسی الفاظ اپنے اصل یا بدلے ہوئے معانی کے ساتھ اس زبان میں بار پا گئے، کون سے الفاظ کو چلن نصیب ہوا۔ کون سے الفاظ، ترکیبیں اور محاورے مسترد ہوئے۔

اس کتاب میں مصنفین نے کربل کتھا کی زبان کا تمام متعلقہ پہلوؤں سے بڑا سیر حاصل مطالعہ کیا ہے اس لسانی مطالعے کی افادیت طالب علموں اور لسانیات کے محققوں کے لئے مسلم ہے۔ تاہم اُردو کے عام اچھے قاری کے لئے بھی یہ کتاب اس اعتبار سے دلچسپی کا باعث ہوگی کہ اُردو زبان میں ادھر دو سو برس کے عرصے میں کیسی اور کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔

سائز ۱۸×۲۲/۸، صفحات : ۷۱، قیمت ۴ روپے

ناشر : مکتبہ شاہراہ، اُردو بازار، دہلی-۶

(راج نرائن راز)

**تنقید اور اندازِ نظر** ڈاکٹر سیدہ جعفر کے ۱۱ مضامین پر مشتمل مجموعے کا نام ہے جسے نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر اُردو کی معروف محقق اور ناقد ہیں اور دکنی ادب سے متعلق کئی قابلِ قدر کتابوں کی مصنف ہیں۔

زیرِ نظر مجموعے میں پہلا مضمون تنقید اور اندازِ نظر اہمیت کا حامل ہے جس میں تمام اہم تنقیدی رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کسی مخصوص کمیتہ تنقید سے تعلق رکھنے والا ناقد کن خصوصیات کا حامل ہوگا دوسرے مضامین میں دکنی غزل گوئی ایک اچھا مضمون ہے لیکن دیگر مضامین وضاحتی نوعیت کے ہیں اور غالباً طالب علموں کی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔

اس وقت جب کہ اُردو ادب سے دلچسپی کم ہوتی جارہی ہے ایسے مضامین ایک عام قاری کو ادب کے بعض اہم پہلوؤں سے روشناس کرانے میں مدد دیتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو کے بعض اہم اساتذہ مثلاً داغ اور ان کے اسکول کے دیگر شعراء کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے اور جدید تنقید کے اصولوں پر ان کو پرکھا جائے۔ بعض آسان کہنا کافی نہیں ہے کہ وہ اپنی معاشرت کے نمایندے اور اس کے عکاس تھے۔ ہمیں امید ہے کہ تنقید اور اندازِ نظر" کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

## بنگال کا اُردو ادب

انیسویں صدی میں بنگال کا اُردو ادب پر وفیسر جاوید نہال کی ڈی لٹ کا مقالہ ہے جو محنت اور کاوش سے لکھا گیا ہے۔ بنگال ایک ایسا علاقہ سمجھا جاتا رہا ہے جسے اُردو کے مرکز کی حیثیت سے کم جانا جاتا ہے لیکن کلکتہ کو اُردو کی تشکیل اور ارتقاء میں فورٹ ولیم کالج اور پھر انگریزی سرکار کے صدر مقام ہونے کی وجہ سے بعض ادیبوں اور ادب دوستوں کی آماجگاہ ہونے کی وجہ سے بڑی نمایاں حیثیت حاصل ہے فورٹ ولیم کالج کی خدمات تو منظرِ عام پر آچکی ہیں لیکن بنگال کے دوسرے اہم مرکزوں اور شخصیتوں پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ پروفیسر جاوید نہال کی یہ کتاب ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے اور اس کتاب کی اشاعت سے اُردو کے تقریباً تمام اہم مرکزوں کا جائزہ مکمل ہوجاتا ہے اُمید ہے کہ دوسری جلد کی اشاعت کے بعد جس کا مصنف نے وعدہ کیا ہے بنگال میں اُردو کی ایک مکمل اور مبسوط تاریخ مکمل ہوجائے گی۔

کتاب لگ بھگ ۲۶۰ سو صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت ۱۵ روپے ہے۔
اورینٹ رائٹرس گلڈس ۱۸/۱ فیرس لین، اسرار منزل کلکتہ - ۱۲ سے مل سکتی ہے

## مجلہ سیفیہ (سیفیہ کالج بھوپال میگزین) غالب نمبر

نگراں: عبدالقوی دسنوی ، مدیر: متین سید

علم و ادب کا ذوق بھوپال کی قدیم روایت ہے۔ اس کے فرماں رواؤں سے علماء و شعراء کی سرپرستی ہی نہیں کی ہے بلکہ خود بھی علم و ادب میں ممتاز شخصیت کے مالک رہے ہیں۔ دربار ہی سے نکل کر بازاروں اور درس گاہوں کا رخ کیجئے تو وہی علمی و ادبی فضا ملے گی۔ اسی میں سیفیہ کالج بھوپال بھی ہے جس نے اُردو ادب کے معیار اور وقار کو برقرار رکھا ہے۔ مجلہ سیفیہ اس کی نمایندہ مثال ہے۔ اس وقت اس کا غالب نمبر ہمارے سامنے ہے جو ایک طرف اپنی طباعت کے اعتبار سے منفرد ہے اور دوسری طرف مضامین کے لحاظ سے خاصے کی چیز ہے۔ مدیر نے اس کو حسن سلیقہ سے ترتیب دے کر اور بلند تر کر دیا۔ اس زمانے میں اگرچہ غالب پر متعدد عمدہ نمبر شائع ہو چکے ہیں مگر مجلہ سیفیہ نے ان میں اپنی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ اس میں کچھ اساتذہ اور طلبہ کے مضامین اور غالبیات سے متعلق سات نظمیں ہیں۔ اساتذہ اور ادیبوں کے مضامین تو قابلِ قدر ہونا چاہئیں۔ مگر لائق مبارک باد یہ امر ہے کہ اس میں طلبہ کا حصہ نمایاں بھی ہے اور قابلِ قدر بھی۔ ذہنوں کی یہ تربیت ہم کو نہ اُردو سے مایوس کر سکتی ہے اور نہ ادب کی طرف سے مضطرب کر سکتی ہے۔ یہ ادارہ قابلِ مبارک باد ہے اور اُمید ہے کہ وہ اپنی اس روایت کو قائم رکھے گا۔

(ادارہ)

## سکھ انجن (قبل ۱۶۳۵ء)

مصنف: ڈاکٹر سیدہ جعفر، ریڈر شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ
ناشر: لطف الدولہ، ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد - ۲۷
قیمت درج نہیں۔

دکن میں ابتدائی اُردو زبان دکنی کو عوام و خواص میں یکساں طور پر فروغ دینے کے سلسلے میں مذہبی رہنماؤں اور اولیائے کرام نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے ان کے ارشادات و ہدایات کا سلسلہ تقریری اور تحریری دونوں طرح سے جاری رہا۔ اس لئے ابتدائی دور کی تحریروں اور نگارشات کی نوعیت کم و بیش مذہبی ہی رہی ہے۔ علمی، ادبی اور لسانی اہمیت رکھنے والے ایسے مخطوطات اور ایسی تصانیف میں شاہ ابوالحسن کی عارفانہ رنگ اور تمثیلی انداز کی مثنوی "سکھ انجن" بھی ایک ہے جو ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی ایما پر دکن کی ممتاز محقق، اور نقاد ڈاکٹر سیدہ جعفر ریڈر شعبہ اُردو، جامعہ عثمانیہ نے بڑی محنت و کاوش سے ترتیب دے کر، حیدرآباد کی شرافت، رواداری وسیع النظری اور خلوص کے علمبردار مہدی نواز جنگ مرحوم کے نام بڑے دلچسپ پیرائے میں معنون کیا ہے جنہوں نے مرنے کے بعد بھی اپنی آنکھوں کے دان سے ایک بینائی اندھے نام دیو کی تاریک زندگی میں نئی جوت جلائی ہے۔ ساتھ ہی ۱۱۹ صفحات پر محیط ایک مفصل اور جامع مقالے میں مصنف کے حالاتِ زندگی، مسائل تصوف اور تصنیف کے ادبی اور لسانی پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور تاریخی و تحقیقی شواہد سے بھی مدلل بحث کی ہے ہر صفحے پر ہر غیر مانوس دکنی لفظ کے معنی معیاری اُردو میں دیئے ہیں۔ جس سے پڑھنے اور سمجھنے والوں کو بڑی مدد ملتی ہے۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر کے الفاظ میں "سکھ انجن" میں شاہ ابوالحسن

ے تصوف کے بعض مسائل کو تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے طفلانہ بازی، آنکھ مچانی کھیلنے والے لڑکے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی آنکھیں بند کر کے گرد و پیش سے بے خبر ہو جائے اس کے ذریعے سے شاہ ابوالحسن نے یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ جب تک طالب اشیاء کے اعتبارات، رنگ رُوپ، شکل اور کمیت وغیرہ کے احساس سے اپنی ہستی کو بلند نہ کرے اور زماں و مکاں سے آزاد نہ ہو جائے وہ سلوک کے راستے پر گامزن نہیں ہو سکتا، یافتِ حق کے مقصد تک پہونچنے کی پہلی شرط اپنی ہستی کی نفی کرنا ہے۔ اور اس تعلق سے خود شاہ ابوالحسن یوں رقمطراز ہیں ؎

کھیل میں ایسا کھیل ہووے
پیا ملن کا میل ہووے
جس کو یوں کھیل سوجے گا
ہیو کے مارگ بوجے گا

"سکھ انجن" کی ترتیب و تہذیب میں ڈاکٹر سیدہ جعفر نے نصیر الدین ہاشمی جیسے دکنی کے نامور محققین کی بھی لغزشوں پر گرفت کی ہے اور بڑی تلاش و کھوج کے بعد تحقیق کو صحیح سمت آگے بڑھاتے ہوئے اپنے منصب اور موضوع دونوں سے انصاف کیا ہے مگر پھر بھی بعض مقامات پر بعض باتیں کھٹکتی ہیں جیسے مقالے کے چند ابواب میں بعض غیر متعلقہ اور غیر ضروری امور سے بھی بحث کی گئی ہے اور لسانی خصوصیات کے عنوان کے تحت مثنوی "سکھ انجن" کی جو خصوصیات گنوائی ہیں اُن میں بیشتر خود زبان دکنی ہی کی لسانی خصوصیات ہیں لیکن اس تصنیف کے سلسلے میں ڈاکٹر سیدہ جعفر کی گہری نظر اور وسیع مطالعے کی بازیافتوں میں اور بھی کئی حقائق کے علاوہ دکنی کی بعض ایسی قدیم اصناف سخن اور ان کے نمونے بھی منظرِ عام پر آگئے ہیں جن تک اس سے پہلے کوئی باقاعدہ رسائی کا پتہ نہیں چلتا ان میں چکی ناموں کے علاوہ "سہاگن نامہ" "لگن نامہ" "شادی نامہ" "چرخہ نامہ" "بھنگ نامہ" "لوزی نامہ" اور پھگڑی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں جو دکنی ادب کی ہمہ گیریت اور تنوع کی آئینہ دار ہیں۔

بہرحال بہ حیثیت مجموعی ڈاکٹر سیدہ جعفر کی یہ قابلِ قدر تصنیف دکنیات کے تحقیقی اور لسانی مطالعے میں یقیناً ایک اہم مقام کی حامل ہے۔

ابوالفیض سحر

---

**یاد کی خوشبو** (خورشید احمد جامی کا کلام) مرتب: محمود خاور
ناشر: شالیمار پبلیکیشنز ۲۸۷ ملک پیٹھ جدید، حیدرآباد-۳۶
صفحات: ۸۰ ، قیمت: تین روپے

محمود خاور لکھتے ہیں "یاد کی خوشبو" میں وہ تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اشعار شامل ہیں جنہیں خورشید جامی مرحوم نے 'رخسار سحر' اور 'برگ آوارہ' میں کسی نہ کسی وجہ سے شامل نہیں کیا تھا" ——— یہ کام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

خورشید احمد جامی ایسے شاعر تھے جن پر بہت کچھ لکھا جائے گا۔ اُن پر تحقیقی کام کرنے والے کے لئے یہ کتاب جامی کے اس تنقیدی شعور کے تجزیے کے لئے پہلی رہنما ہوگی جو ہر اچھے شاعر کے اندر ہوتا ہے۔ غالب کی مثال سامنے ہے کہ انہوں نے اپنے کئی ایسے اشعار نکال دیئے جو آج اُن کے اچھے انتخاب میں جگہ پانے کے مستحق ہیں مثلاً ؎

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اب غالب کے ہر محقق کے لئے یہ ایک چیلنج ہے کہ وہ بتائے کہ غالب نے یہ شعر کیوں رد کر دیا تھا۔ ممکن ہے یہ غالب کا اپنا مکمل تجربہ نہ ہو۔ ——— تو وہ اور بخیل تجربہ کہاں ہے اور کس کا ہے جس سے شعر روشنی اخذ کرتا ہے اس طرح کی تمام قیاس آرائیاں لاحاصل ہیں جب تک کوئی قطعی بات سامنے نہیں آتی اسی طرح غالب کے کئی ہلکے اشعار شاملِ دیوان ہیں۔ ممکن ہے اس دور میں اُن میں بڑی جاذبیت رہی ہو۔ خورشید احمد جامی کے وہ تمام اشعار جو رخسار سحر اور برگ آوارہ کی اشاعت سے پہلے کے ہیں اور جامی نے جنہیں اپنے مجموعوں میں شامل نہیں کیا ایسے ہی سوال اٹھاتے ہیں۔ یہ کام کسی تبصرہ نگار کا نہیں کہ ان اشعار کا مقدمہ لڑے لیکن ذیل کی مثالوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جامی کو اپنی انفرادیت کا گہرا احساس تھا اور ممکن ہے کہ یہ اشعار انہوں نے اس لئے نہ شامل کئے ہوں کہ ان سے ملتے جلتے تجربے پہلے ہی سامنے آگئے تھے ؎ ایک شاعرِ بدنام نے کیا خوب کہا ہے ؛ پھولوں کو ترے پیار کا مکتوب کہا ہے
دیکھ کر پھولوں کے صفحات پہ شبنم کچھ لوگ ؛ میرا اشکوں بھرا مکتوب سمجھتے ہوں گے
اب اور کیا دیارِ ادب پر ہو تبصرہ ؛ جو سوچتے نہیں وہ یہاں بولتے رہے
رنگ یہ بھی بہت پرانا ہے ؛ سوچتا کوئی، بولتا ہے کوئی

جامی کے مندرجہ بالا اشعار اگرچہ براہِ راست متاثر شدہ بھی نہیں ہیں میں تو یہ ماننے کو تیار ہوں کہ اپنے مقابل اشعار سے یہ بہتر ہیں، لیکن مجھے اُن کے بے پناہ انفرادیت کے شعور کی طرف اشارہ کرنا تھا اور یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس طرح کے سینکڑوں گوشے اس مختصر سی کتاب کے سامنے آجانے سے جامی کے نقاد کے لئے وا ہوتے ہیں محمود خاور، جامی کے پرستار دوستوں میں ہیں۔ انہیں کام کرنے کا سلیقہ آتا ہے اس کتاب کو جس محبت اور لیاقت سے انہوں نے مرتب کیا ہے اس کی دل سے داد نہ دینا سراسر ناانصافی ہوگی۔

(بشیر بدر)

---

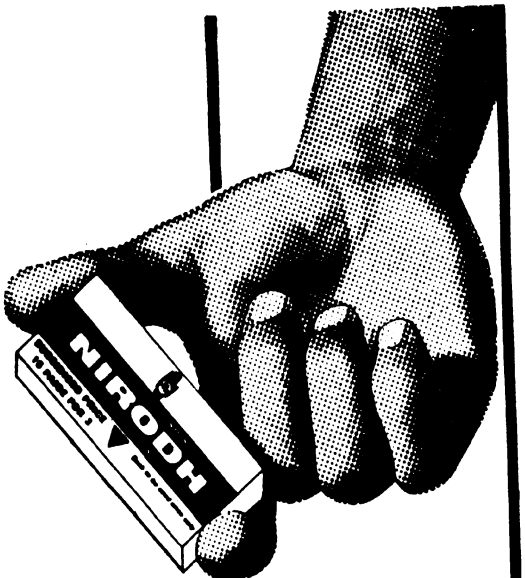


## بچّوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

فی زمانہ بچّوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نِرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچّے تبھی ہوگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔

## بچّہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچّے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچّے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نِرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچّے کی پیدائش ملتوی کرسکتے ہیں۔

نِرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اِسے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان، محفوظ طریقہ ہے۔ اِس کے استعمال سے صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔

نِرودھ ہر جگہ ملتا ہے:۔
پرویژن اسٹور، کرانہ فروش، گیسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔

## نِرودھ استعمال کیجئے

فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
15 کے 3 ₹
سرکاری امداد سے کم دام

صرف 5 پیسے خرچ کرکے آپ اپنے کنبے کو محدود رکھنے کی طاقت حاصل کرسکتے ہیں

70/61

# سونا ہی سونا

زمین بھرپور فصل دیتی ہے .... کسان کہتا ہے "دھرتی سونا اُگلتی ہے۔"

اب مُلک کے اکثر حصّوں میں فصلیں لہلہاتی ہیں .....
قحط کے لئے مشہور چند علاقے بھی آج ہرے بھرے ہو گئے ہیں .... ہر طرف سنہری دانوں کے انبار لگے ہیں ..... مٹی سونا بن گئی ہے۔

اچھی فصل کی وجہ کچھ ہی سہی .... بہتر بیج، زیادہ کھاد، زیادہ پمپ یا کھیتی باڑی کے بہتر طریقے .....

حقیقت یہ ہے کہ دو برس کی خُشک سالی کے بعد ہم نے اتنا اناج پیدا کیا جتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اسے سبز انقلاب کہیئے یا کچھ اور .... گذشتہ برس مُلک میں دس کروڑ ٹن سے زائد اناج پیدا ہوا .... 1950ء سے دُگنا۔

ہم آگے بڑھ رہے ہیں .... سائنس کی مدد سے ....



آج، کل سے کہیں بہتر ہے ✲
کام کیجیئے
کل، آج سے بھی بڑھ کر ہوگا

davp 71/39

✲ "آج کا بھارت" کتابچہ کی مُفت کاپی کے لئے ڈی۔اے۔وی۔پی، پی۔ٹی۔آئی۔ بلڈنگ، پارلیمنٹ اسٹریٹ۔ نئی دہلی۔ کو لکھیئے۔

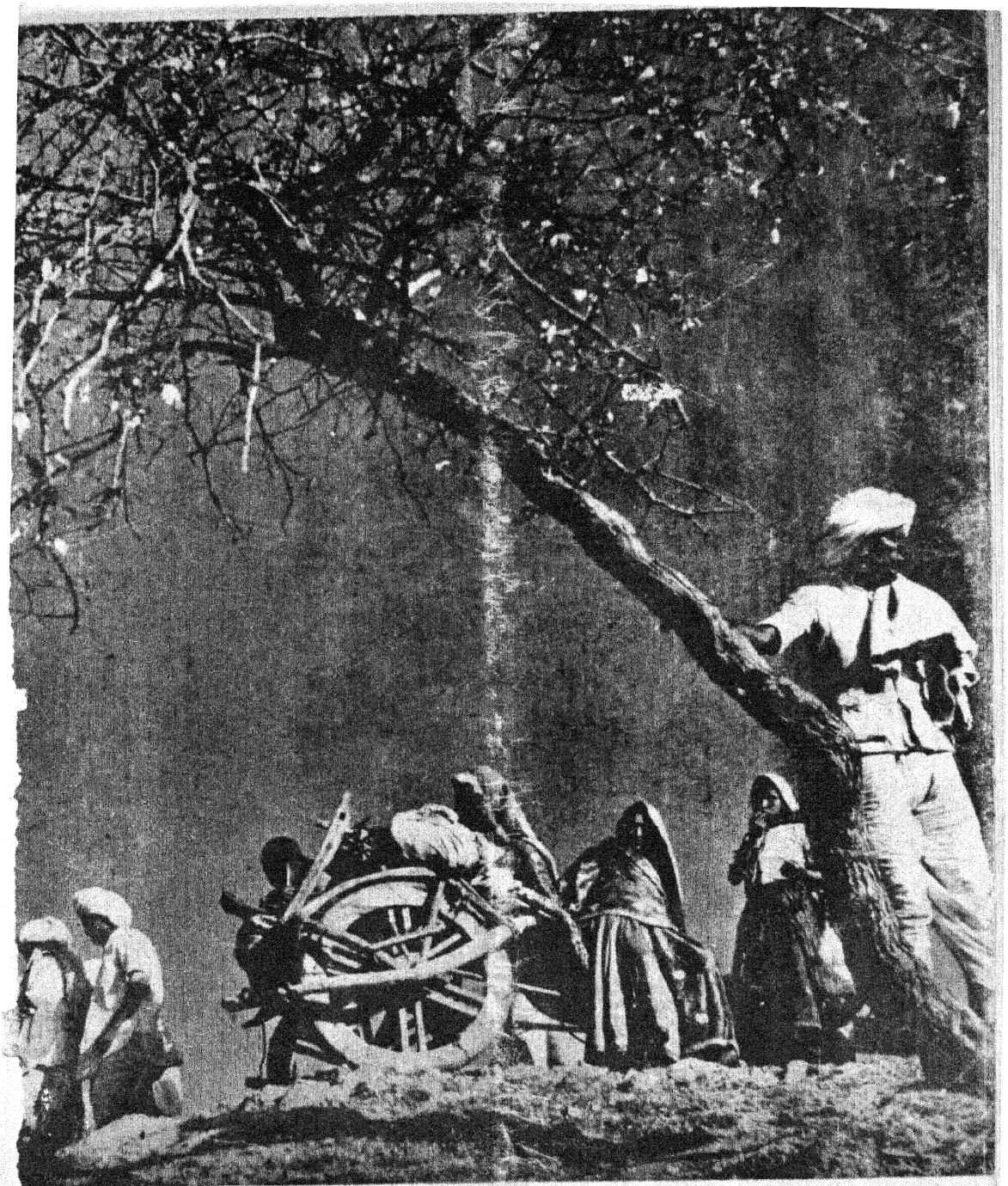

Vol. 29 No. 12 AJKAL (Monthly) July 1970

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55
Regd. No. D-509